ماہنامہ

کتاب نما

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید
پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا [illegible] ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید
حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات
ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کو مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف
شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ، اُردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

گول مال
شفیقہ فرحت

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/=

فی الفور
یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۳۰/=

مولانا آزاد کی کہانی
ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۸/=

دیگر اداروں کی کتابیں

مضامینِ سیدین
مرتبہ: ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی

ممتاز ماہرِ تعلیمات خواجہ غلام السیدین کے علمی، ادبی مضامین کا اہم مجموعہ۔ ۴۰/=

توفیق الحکیم
ناول نگاری کا جائزہ

ڈاکٹر بدر الدین الحافظ

اس کتاب میں عالمی شہرت یافتہ ناول نگار توفیق الحکیم کی ناول نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ۵/-

ماہنامہ

کتاب نما

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

فروری ۱۹۹۱ء جلد ۳۱ شمارہ ۲

فی پرچہ	5/=
سالانہ	45/=
غیر ممالک سے	
(بذریعہ بحری ڈاک)	110/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	230/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	65/=

ڈیٹو

شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
TELEPHONE. 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

کمپیوٹر کیا ہے؟ (سائنس) حکیم نعیم الدین زبیری -/۸

سیرت النبیؐ منظوم (سیرت پاک) سید عابد علی وجدی -/۲۵

کلاسیکی اردو شاعری کی تنقید (ادب) طارق سعید -/۷۵

جرنیلی سڑک (تاریخی مضامین) رضا علی عابدی -/۱۰۰

تاریخی مثنویاں (تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) کندن لال کندن -/۸۰

عالمی سائنس داں (سائنس) سبھاش چندر -/۴۰

موج سحر (شاعری) ڈاکٹر انجنا سندھیر -/۴۰

مغرب کے انشائیے (سائنسی مضامین) سلیم آغا قزلباش -/۵۰

میراجی کی نظمیں (شاعری) مرغوب علی -/۶۰

عملی انتقادیات (تنقید) ڈاکٹر سید محمد عقیل -/۹۰

جدید اردو تنقید پر مغرب کے اثرات (تنقید) علی حماد عباسی -/۵۰

ڈاکٹر رشید جہاں حیات اور کارنامے (سوانح) ڈاکٹر شاہدہ بانو -/۱۰۰

ظہیر دہلوی حیات و فن (سوانح) ڈاکٹر مختار شمیم -/۱۰۰

حرف حرف چہرے ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی -/۴۵

غالب احوال و آثار (غالبیات) ڈاکٹر حنیف نقوی -/۹۰

بولو مت چپ رہو (ناول) حسین الحق -/۵۰

اردو قواعد (نیا ایڈیشن) (اردو گرامر) س۔ع۔س -/۴

چار چہرے (ناولٹ) سہیل عظیم آبادی -/۲۰

خوشی بول اٹھی ہے عبدالاحد ساز -/۴۰

گجری مثنویاں (مثنوی) ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی -/۳۵

کچھ بچا لایا ہوں (مضامین) وارث علوی -/۵۱

سرورق: رفعت سروش
مصوّر: زیبا امروہوی

تذکرۃ الوجیہہ (تذکرہ) سید حسینی پیر علوی -/۴۷

ادبی اصناف (اصناف سخن) ڈاکٹر گیان چند جین -/۳۰

پیشہ تو سپہ گری کا بھلا (مضامین) وارث علوی -/۵۶

مضامین مدنی (مضامین) ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی -/۵۳

ساہر نامہ ۱۹۹۰ء (مجلہ) ڈاکٹر احمد حسین قریشی -/۲۶

مٹھائی کا راز (کہانی بچوں کے لیے) سید خوشحال زیدی -/۸

جنگل کا بادشاہ " " اندر جیت لال -/۱۵

گرم برف (کہانیوں کا مجموعہ) انل ٹھکر -/۵۰

سبز موسم کی صدا (غزلیات) ظہیر غازی پوری -/۲۵

سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ مدیر سید جلال الدین
سہ ماہی رسالہ فی شمارہ عام ایڈیشن -/۱۰

سنو بچو! (بچوں کا ادب) ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی -/۱۵

کرشن چندر کی افسانہ نگاری (تحقیق) ڈاکٹر شفیق اعظمی -/۱۰۰

عالمی اردو ادب " مدیر نند کشور وکرم -/۱۰۰

گل گیت (سنتھالی گیتوں کا اردو ترجمہ) مترجم احسن شفیق -/۴۰

طلسمی گھوڑا (طلسمی عجوبات کا مجموعہ) ایم یوسف انصاری -/۳۰

کلر بلائنڈ (افسانے) انور قمر -/۳۰

نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی (افسانے) ساجد رشید -/۴۰

مہمان مدیر
رفعت سروش
۲۔بی پاکٹ سی، سدھارتھ ایکسٹینشن
نئی دہلی

اشاریہ

تخلیقی معنویت

بہت زمانہ نہیں گزرا جب ادیب اور شاعر کی پہچان اس کی اپنی تخلیق کی بنا پر ہوتی تھی، شاعر کا کلام خود شاعر کے جذبات کا ترجمان بن کر سرِ محفل جلوہ فگن ہوتا تھا، اور سامعین و قارئین پر شاعر کے جوہر کھلتے تھے۔ شاعر اپنے شائقین سے براہِ راست آنکھ ملا کر بات کرتا تھا۔ بغیر کسی واسطے کے، بغیر کسی رابطے کے۔ اُس کے اور سامعین و قارئین کے درمیان کوئی پُل نہ ہوتا تھا۔ غالبؔ جب اپنے کلام و کمال کی بنا پر اپنے دور کی تلخیوں، کامرانیوں اور نامرادیوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے غالبؔ بن گئے تو ان کے سحرِ کلام اور ان کی عظمت کے طلسم کی تفہیم کی کوششیں کی جانے لگیں، اور آگہی نے ان کے مدعائے تقریر کو سمجھنے کے لیے دامِ شنیدن بچھایا، اور اس کے طفیل کچھ سخن فہموں نے ایوانِ ادب کے صحن میں اپنے خیمے لگائے۔ غالب کی زندگی، غالب کی آشفتہ حالی، غالب کا رہن سہن اور لباس، غالب کے شاگرد، غالب کا عشق۔ غرض ایک ایک زاویے سے غالب کو دیکھا اور ماہرینِ غالب کی فہرست طویل ہونے لگی، ان ماہرین نے ہزار انداز سے یہ بیان کیا کہ غالب کون تھے، کیا کہتے تھے، اور کس طرح کہتے تھے۔ یہ کہنے کا کسی کو مجاز نہ تھا کہ یہ کہیے اور اس طرح کہیے۔ ظاہر ہے غالب کے شعر پر ان کی مساعیِ جمیلہ اثر انداز نہیں ہوئیں، کیونکہ کلامِ غالب تو اپنا سحر انگیز وجود ذہنِ غالب سے حاصل کر چکا تھا۔ اقبال نے جب اپنی نوائے زمانے کو چونکا دیا تو اہلِ نظر کی توجہ ادھر مبذول ہوئی، شعرِ اقبال کی عظمت کے آفتاب کی کرنوں سے گرمیِ محفل ہوئی اور "اقبال شناسوں" کا کارواں بننے لگا۔ شعرِ اقبال اور فکرِ اقبال کی تشکیل میں ان اقبال شناسوں کا کوئی ہاتھ نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ ان کا منصب تو صرف تاویل کرنا ہے۔ اور اس واسطے سے اپنے جوہر کو نمایاں کرنا ہے۔

ہر فنکار اپنی تخلیقی دنیا خود بناتا ہے، اس کے "فن کی دنیا" "سوز و مستی و جذب و شوق" سے عبارت ہوتی ہے جس کا خالق وہ خود ہوتا ہے۔ ہاں کوئی اس کی دنیا کی سیر کرنے آئے تو آئے۔ مگر وہ اپنے تخلیقی عمل میں کسی کی مداخلت نہیں چاہتا۔ جوشؔ، جگرؔ، حفیظؔ اور ساغرؔ وغیرہ اپنے اپنے زورِ کلام اور قوتِ بیان کی بنا پر دنیائے ادب میں وارد ہوئے اپنے اپنے تخلیقی جوہر کی بساط کے مطابق عوام میں مقبولیت حاصل کی اور ان کا شعر براہِ راست سامعین و قارئین کے دل و نظر تک پہنچا، اور اسی مناسبت سے انھیں ایوانِ ادب میں جگہ ملی، ان کے "بد خواہ" ان کی مقبولیت کی بساط اُلٹنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور ان کے "طرفدار" انھیں آسمان پر نہ چڑھا سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ تخلیق خود ایسی قوت ہے جسے بروئے کار آنے اور نمو پانے کے لیے مصنوعی سہاروں کی ضرورت

نہیں۔ چشمہ پہاڑ کی کوکھ سے خود پھوٹتا ہے، ننھا پودا اپنی قوت نمو کے زور پر زمین کی چھاتی توڑ کر خود باہر نکلتا ہے ۔ اور یہی نہیں ۔ چشمہ اپنی راہ خود متعین کرتا ہے کہ اسے کس طرف بہنا ہے، اور پودا اپنی افتادِ طبع کے حساب سے پروان چڑھتا ہے۔ اس کی فطری بالیدگی میں کوئی رکاوٹ یا مداخلت فطری حسن کو مسخ کر دیتی ہے۔ شاعر اور ادیب اپنی تخلیقی قوت کے اعتبار سے اپنے ایک آزادانہ وجود کا اعلان ہوتا ہے۔ اس سرچشمۂ تخلیق پر اگر باندھ باندھنے کی کوشش کی جائے تو اس کی قوت ضائع ہو جاتی ہے اور اس کا فطری بہاؤ ختم ہو جاتا ہے۔ غالب و اقبال و جوش تخلیقی قوت کی وہ مثالیں ہیں جن کو ذہن میں رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ تخلیق کار کو تربیتی اسکول کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ بحیثیت نقاد کے یہ تو سوچ سکتے ہیں کہ فلاں شاعر نے کیا کہا اور کس طرح کہا۔ لیکن یہ نقاد کا منصب نہیں کہ وہ کسی تخلیق کار سے یہ کہے کہ "یہ کہیے" ۔ اور ۔ "اس طرح کہیے" تخلیق کاروں کے لیے تخلیقی ضابطے متعین کرنا مضحکہ خیز عمل ہے۔ لیکن افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ادب پر ایک ایسا وقت بھی پڑا جب ایسے تخلیقی ضابطے قائم کیے گئے اور جن ادیبوں اور شاعروں نے ان ضابطوں کی پابندی نہ کی انھیں رسوائی کا منہ دیکھنا پڑا کیونکہ ضابطہ کاروں کے ایک گروہ نے اشاعت و تشہیر کے وسائل اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اور اس کارنامے کی بنا پر ان کی شہرت ملکی سرحدوں کو عبور کر کے دور دراز ملکوں تک پہنچی۔ پھر تو ادب کے عالمی بازار میں پرستش تھی تو ان کی، عزت تھی تو ان کی، مقبولیت تھی تو ان کی، نمائندگی تھی تو ان کی، شاعر تو ایک 'خام مال' تھا۔ دیکھتے دیکھتے یہ عالم ہو گیا کہ بے چارہ تخلیق کار اس بچھڑے کی مانند ہو گیا جو بیل گاڑی کے پیچھے پیچھے چلنے کے لیے باندھ دیا جاتا ہے، اس صورت حال سے کچھ لوگ چھٹپٹائے بھی، مگر ضابطہ کاروں کی گرفت بہت مضبوط تھی، اور کم سے کم ادب کی تین نسلیں شکار ہوئیں، کتنے ہی ادیب اور شاعر بے موت مر گئے کہ انھیں بال و پر پرواز نہ مل سکا، کتنے ہی تخلیق کاروں نے اپنے چہرے مسخ کر لیے اور اپنی جودتِ طبع کا اپنے ہاتھوں خون کر دیا۔

ضابطہ کاروں اور گروہی نقادوں کے جارحانہ رویہ کی وجہ سے بہت سے ادیب اور شاعر بوکھلا گئے تھے۔ بعض میں خود اعتمادی کی کمی آگئی اور محض اپنی تخلیقی قوت پر بھروسا نہ رہا۔ اس کا ردِ عمل بعض اوقات اس طرح بھی ظاہر ہوا کہ جب کچھ شعرا نے دیکھا کہ ان کے ہم عصر ان سے آگے نکلے جا رہے ہیں تو انھوں نے تنقید کی بیساکھیاں لگائیں اور بقلم خود اپنی تعریف و تحسین میں مضامین لکھ کر گمنام لوگوں کے ناموں سے چھپوائے ایک بڑے "استاد" نے" جو شاعر ہونے کے علاوہ بالغ نظر نقاد بھی تھا، اپنی ناقدانہ متانت کو اپنے ہی اوپر آزمایا اور اپنے شاگردوں کو یہ شرف بخشا کہ ان کے نام سے وہ مضامین اشاعت پذیر ہوئے۔ ہماری ادبی تاریخ کا یہ ایک دلچسپ باب ہے۔

ہماری شاعری پر ایک دور وہ بھی آیا کہ وہ براہِ راست عوام سے آنکھ ملانے کے قابل نہ رہی۔ شاید اس لیے کہ یہ صنفِ لطیف کچھ ناپختہ ذہنوں کے ہاتھ پڑ گئی۔ کچھ ایسی چیستانی نظمیں لکھی جانے لگیں جن پر کھینچ تان کر کے معانی کا لباس پہنانے کا عمل شروع ہوا۔ ایسی نظمیں جب منظرِ عام پر آتی تھیں تو تنقید و تفہیم کی بیساکھیوں کے سہارے ۔ یعنی نظم کے ساتھ ایک نثر پارہ بہ عنوان ۔" اس نظم میں" شائع ہوتا تھا۔ اہلِ ادب جانتے ہیں کہ اس قسم کی نظمیں اور شاعر وقت کے تھپیڑوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ لیکن ایک خطرناک رجحان ضرور رواج پا گیا کہ بری شاعری بھی تنقید کی بیساکھیوں کے سہارے کچھ دور چل سکتی ہے۔ اور یہیں سے تخلیقی جوہر کی

بے آبروئی شروع ہوئی، اور نا شاعروں کو اپنی ناپختہ شاعری کے فروغ کے لیے نام نہاد ناقدوں کی خدمات کی ضرورت پڑی اور دیکھتے دیکھتے پیشہ ور نقادوں کا ایک گروہ پیدا ہوگیا۔ اب شاعر کی کوئی اہمیت نہ رہی تھی اس پیشہ ور نقاد کی۔ اور پھر یوں ہوا کہ جس کے ہاتھ میں بڑا نقاد آگیا وہ بڑا شاعر بن گیا۔ کل کا سب سے بڑا نقاد۔ یعنی وقت۔ اسے کس کسوٹی پر کسے گا، اس کی پروا کسے۔ یہاں تو معاملہ آج کا ہے۔ آج تو شہرت کے مینار پر چڑھ ہی گئے۔

ایسا نہیں ہے کہ ان عبرت ناک حقائق کا لوگوں کو علم نہیں ہے مگر ہمارے ادبی منظر نامے پر ایسی دھند چھائی ہوئی ہے کہ کچھ صاف نظر نہیں آتا۔ اگرچہ "ضابطہ کاروں" کی گروہ بندی ٹوٹ چکی ہے، اور ادیب و شاعر نے خود شناسی کا عمل شروع کر دیا ہے۔ اور وہ اپنے ضمیر کی آواز پر کان لگائے ہوئے ہے لیکن تخلیق کار آج بھی نقادوں کے نرغے میں ہے۔ ملکی اور غیر ملکی وسائل پر نقادوں کے گروہ کا قبضہ ہے۔ تخلیق کار کو اپنی آزادیٔ فکر کا احساس تو ہو گیا ہے اور وہ مقدور بھر لکھ بھی رہا ہے۔ لیکن وہ کیسے تو کیا۔ نقاد خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ تنقیدی اور تالیفی ادب کی کھپت سرکاری اداروں اور لائبریریوں میں ہے۔ مگر تخلیقی ادب کتب فروشوں کے گوداموں میں دیمک کی خوراک بن رہا ہے۔ ادبی رسائل کا فقدان ہے۔ ایک مشاعرہ رہ گیا ہے تو شعرا کے ایک مخصوص طبقے کی پذیرائی کرتا ہے۔

پھر ایک بات اور اردو چاہے پرائمری اسکولوں میں نہ ہو مگر یونی ورسٹیوں میں ضرور ہے۔ اردو کے شعبے ہیں، اردو کی مخصوص چیئرز ہیں اور اعلا درجات میں کہیں کہیں طلبہ کی تعداد کے برابر ہی اساتذۂ اردو کی تعداد ہے۔ طلبہ کی وہ تعداد دیکھتے دیکھتے اردو کے ڈاکٹروں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے اگرچہ اردو کی نقاہت بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ نوجوان محقق تو ہیں ہی، نقادوں کی تعداد میں بھی تیزی سے اضافہ کر رہے ہیں اور اپنی ناقدانہ حیثیت کو تسلیم کرانے کے لیے کسی نہ کسی شاعر یا افسانہ نگار پر مشق قلم کر رہے ہیں۔ اور ہوتا یوں ہے کہ شاعر یا افسانہ نگار کو چہ تخلیق میں قدم رکھتے ہی نقاد کے پھیر میں آجاتا ہے۔ اور ناقدین کرام کی فراوانی کے باعث اور ان کی فیاضیٔ نظر کے طفیل۔ "جدید لب و لہجے کا شاعر"۔ "صاحب طرز شاعر"۔ "منفرد رنگ و آہنگ کا شاعر"۔ وغیرہ وغیرہ قسم کے شاعروں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے اور دیکھتے دیکھتے یہ وغیرہ وغیرہ، تحقیق کا موضوع بنتے جا رہے ہیں۔ آخر یونی ورسٹیوں کے "تحقیقی تقاضوں" کو پورا کرنے کے لیے نئے نئے موضوعات کہاں سے آئیں۔

اس صورت میں سب سے بڑا نقصان ہے ادب و شعر کا۔ فن ریاضت چاہتا ہے ؎

خشک سیروں تن شاعر کا لہو ہوتا ہے
تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

لیکن جب اپنی ایک ہی کتاب پر دسیوں مضامین پڑھ کر سیروں خون بڑھ جائے تو پھر کیا ضرورت ہے مصرعۂ تر کی تلاش میں خون جلانے کی۔ بعض دفعہ تو نقاد کے ہاتھوں شاعر کا یہ حال ہوتا ہے کہ ؏

"اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے"

اس خطرناک رجحان کے سدباب کے لیے اشد ضروری ہے کہ تخلیقی فنکار اپنی ریاضت اور فنکارانہ خلوص کی بنا پر اپنی جودتِ طبع کو بروئے کار لائیں اور تخلیقی معنویت سے ہم کنار رہوں، اپنی قدر و قیمت کو پہچانیں

اور اپنے فن کو خود ناقدانہ نظر سے دیکھیں۔ خود اعتمادی فنکار کی سب سے بڑی قوت ہے جو ایک عجیب انداز کی بے نیازی عطا کرتی ہے۔ آج اُن اعلا ادبی اقدار کو نیا خون دینے کی ضرورت ہے جن کے باعث اردو کو میر و غالب، انیس و نظیر اور اقبال و جوش جیسے شاعر ملے اور سرشار و پریم چند اور رسوا و بیدی جیسے افسانہ نگار۔

نورالحسن نقوی
شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

شعاعِ امید

(ایک تجزیہ)

فن کار شاعری کے فن میں کامل دستگاہ رکھتا ہو تو اس کے قلم سے چھو کر فلسفہ و پیغام بھی مکمل شعر بن سکتا ہے۔ اقبال کے نظم شعاعِ امید اس کا زندہ ثبوت ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی دل آویز نظم ہے۔ اس کی دل کشی کا راز یہ ہے کہ رمزیت و اشاریت، احساس کی شدت، تخیل کی بلند پروازی، پیرایۂ بیان کی دل آویزی اور ان کے سوا بھی جتنے فنی وسائل ممکن ہیں شاعر نے ان سب کو انتہائی سلیقے کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ خیال کیسا ہی اچھوتا کیوں نہ ہو قاری کی توجہ کو صرف ایک بار جذب کر سکتا ہے اور شعاعِ امید کا مرکزی خیال تو ایسا اچھوتا بھی نہیں لیکن اس نظم کو جتنی بار پڑھئے اتنی بار پہلے سے سوا لطف حاصل ہوتا ہے سبب یہ کہ یہاں فکر و فن میں امتیاز باقی نہیں رہا۔ چار چار اور نو اشعار پر مشتمل تین بند کی یہ نظم شاعر کا پیامِ امید ہے جو تمثیل کے پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔

سورج کی مایوسی پہلے بند کا موضوع ہے۔ سورج ہزار ہا سال سے کرۂ ارض کو روشن کرنے کی کوشش میں مصروف ہے مگر یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوتی ہے کہ دنیا بھی عجب جگہ ہے کہ اس میں اجالا پھیلانے کی جتنی کوشش کرو اس کا اندھیرا اتنا ہی بڑھتا ہے۔ آخر کار وہ اپنی کرنوں کو حکم دیتا ہے کہ بس لوٹ آؤ۔ تمھاری کوششیں بے سود ہیں۔ دنیا کو منور کرنے کی خاطر تم نے اپنا مسکن چھوڑا، دربدر کی ٹھوکریں کھاتی پھریں مگر اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ واپس آؤ اور پھر سے میرے سینے میں سما جاؤ۔

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز! کبھی صبح، کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریِ ایام
نے ریت کے ذرّوں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلّی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

سورج کی شعاعیں بلا تاخیر اپنے آقا کا حکم بجا لاتی ہیں۔ دنیا کو خیرباد کہہ کے وہ سورج کی طرف لوٹ جاتی ہیں اور اپنی ناکامی کا اعتراف کرتی ہیں۔ سب کی یہی رائے ہے کہ ان کی اب تک کی محنت رائیگاں گئی۔

صنعت کاری نے مغربی ممالک کو مادہ پرست بنا دیا ہے اور مادی نفع نقصان کے سوا کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ مشرقی ممالک مادہ پرستی میں تو مبتلا نہیں مگر بے عملی نے وہاں ایک جمود کی سی کیفیت پیدا کردی ہے۔ اس لیے کامیابی کا یہاں بھی کوئی امکان نہیں۔ برسہا برس کی تھکی ہاری شعاعیں آرام کی خواہشمند ہیں اور سورج کی آغوش میں سما جانا چاہتی ہیں۔

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے: مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش!
مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم!
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش!
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپالے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش!

آخر کے تینوں شعر دراصل وہ مکالمے ہیں جو شعاعوں کی زبانی ادا ہوئے ہیں۔ "اک شور ہے" میں یہ اشارہ موجود ہے کہ سب شعاعیں یک زبان ہو کر مغرب و مشرق کی شکایت کرتی ہیں اور آرام کی طلبگار ہیں۔ امید کی ایک کرن ایسی بھی ہے جو ابھی مایوس نہیں۔ یہ ایک شوخ کرن ہے، بہت شوخ — پارے کی طرح بیقرار اور آرام سے ناواقف! مشرقی ممالک خصوصاً ہندوستان میں اجالا پھیلانے کی ذمّے داری اسے سونپی گئی تھی۔ ساری کرنیں مایوس ہو کر اپنے مرکز کی طرف لوٹ جاتی ہیں مگر اس شوخ کرن کے ہاتھ سے ابھی امید کا دامن نہیں چھوٹا۔ وہ اپنی کوشش جاری رکھنے کی اجازت چاہتی ہے اور اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ جب تک گہری نیند سوئے ہوئے ہندستانیوں کو بیدار نہ کر دوں میں اپنی جدوجہد جاری رکھوں گی۔ اس کے حوصلے ملاحظہ ہوں۔

بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب

اس کے بعد شعاعِ امید خاکِ ہند کی عظمت کا ذکر کرتی ہے کہ خاور کی امیدیں اسی سرزمین سے وابستہ ہیں۔ یہی وہ خاک ہے جسے اقبال نے اپنے آنسوؤں سے سیراب کیا ہے۔ یہ کوئی معمولی جگہ نہیں۔ اس نے کبھی چاند ستاروں کو روشنی بخشی تھی۔ یہاں کے کنکر پتھر موتیوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔ اس زمین پر بڑے بڑے شاعروں نے جنم لیا۔

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب!
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن

یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی

جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

مگر اب یہاں سناٹا ہے۔ وہ نغمے جو کبھی دلوں کو گرمایا کرتے تھے، آج خاموش ہیں۔

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں

محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب

اس کے بعد ہندستان کے ہندو اور مسلمان دونوں کی حالت پر اظہارِ افسوس کیا گیا ہے۔

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن

تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

اور اس پیغام پر نظم ختم ہو جاتی ہے۔

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر

فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اقبال کا پیغام اس نظم میں براہ راست نہیں بلکہ ایک طویل استعارے کی مدد سے اور سورج کی ایک کرن کی زبانی پیش ہوا ہے۔ براہِ راست اظہار سے خطابت کا انداز پیدا ہو جاتا ہے جو شاعری کے لیے مہلک ہے۔ اس نظم میں شاعر اپنا پیغام بالواسطہ طور پر دیتا ہے جس سے دل کشی میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔

جہدِ مسلسل کی ترغیب اس نظم کا اصل مدعا ہے۔ سعی و عمل کا جذبہ انسان میں اسی صورت میں برقرار رہتا ہے کہ کوشش کے بارآور ہونے کا یقین ہو۔ اسی لیے رجائیت اقبال کے فلسفے کا اہم پہلو ہے۔ اس نظم میں اقبال کا پیغام سورج کی جس کرن کی زبانی ادا ہوا ہے وہ برسہا برس سے معروفِ عمل ہے اور دنیا کے ایک حصے کو منوّر کر دینا چاہتی ہے۔ باقی تمام کرنیں سورج کا اشارہ پاتے ہی اپنے مرکز کی طرف لوٹ جاتی ہیں اور اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیتی ہیں مگر امید کی کرن ہمت نہیں ہارتی اور اپنا فیصلہ سنا دیتی ہے کہ جب تک گراں خواب ہندستانی بیدار نہیں ہو جاتے میں اس سرزمین کو خیرباد نہیں کہہ سکتی۔ گویا شاعر کا پیغام یہ ہے کہ کیسی ہی ناکامیوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے انسان کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ جدوجہد جاری رکھنے والے آخرکار کامیابی سے ہمکنار ہوتے ہیں (اسلامی تعلیم میں مایوسی کفر ہے)۔

فنی آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے شعر میں فلسفہ و پیغام پیش کر دینا آسان نہیں۔ یہ اقبال کا کارنامہ ہے کہ ان کی شاعری میں فکر و خیال جمالیاتی تجربے کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ شعاعِ امید میں شاعر اقبال ہمارے پیشِ نظر اور مفکر اقبال پسِ پردہ رہتا ہے۔ اس کا شمار ان نظموں میں ہے جن میں شاعر و فن کار، پیغامبر و مفکر پر غالب آ جاتا ہے۔

شعاعِ امید میں تجسیم (PERSONIFICATION) کا عمل شروع سے آخر تک کارفرما ہے۔ سورج اور اس کی کرنیں جسم کے ساتھ قوتِ گویائی بھی رکھتی ہیں۔ ان میں باہم گفت و شنید ہوتی ہے گویا تمثیلی پیرایۂ بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ اقبال کا پسندیدہ طریقِ کار ہے۔ اس مختصر سی تمثیل میں بہت سے کردار پیش کیے

گئے ہیں۔ سورج، اس کی لاتعداد شعاعوں کی فوج، ریگ زار و لالہ زار، مشرق و مغرب، مردانِ گراں خواب، ساز و مضراب، برہمن اور مسلمان، بت خانہ و محراب مسجد۔ ان میں بعض کردار ذی روح ہیں، بعض بے جان۔ ان میں صرف سورج اور اس کی شعاعیں متحرک اور مصروف عمل ہیں یا پھر مغرب ہے جس میں ساری خرابیوں کے باوجود زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ باقی تمام کردار انفعالی نوعیت کے ہیں۔ وہ یا تو محوِ خواب ہیں یا بے عملی کا شکار۔ ان میں سے بیشتر کرداروں کی حیثیت علامتوں کی ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں علامتوں سے بہت کام لیا ہے۔ بعض علامتیں انھوں نے اپنے پیش رو شعرا سے مستعار لیں اور انھیں مخصوص معانی و مفاہیم عطا کیے۔ بعض انھوں نے خود وضع کیں اور اپنی شاعری کی ضرورت کے مطابق انھیں استعمال کیا۔

قوتِ حیات کا مظہر اور روشنی کا سرچشمہ سورج علامت ہے اس سعی کی جو کرۂ ارض کو منور کرنے یعنی اسے خوشی اور خوش حالی کی آماج گاہ بنا دینے کی خواہشمند ہے۔ سورج کی کرنیں زمین پر سورج کی سفیر ہیں۔ یہ فرض شناس و جفاکیش شعاعیں محنتِ شاقہ کی علامت ہیں مگر ان کی ہزار سالہ محنت بے نتیجہ رہتی ہے تو یہ مایوس ہو جاتی ہیں۔ سورج جسے اپنی کامیابی کی کوئی امید نہیں رہی اپنی شعاعوں کو واپس آنے کی ہدایت کرتا ہے۔ شوخ کرن رجائیت اور سعیِ پیہم کی علامت ہے جو اس نظم میں سب سے اہم اور مرکزی کردار ہے۔ یہ دراصل اقبال کے خیالات کی ترجمان ہے۔

مشرق روحانیت پسندوں اور مغرب مادہ پرستوں کی نمایندگی کرتا ہے، مردانِ گراں خواب میں غافل و بے عمل ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل ہیں۔ ساز کنایہ ہے شعر و حکمت کے خزانوں اور مضراب شعرا و حکما سے، بت خانے سے ہندو دھرم اور محراب سے اسلام مراد ہے۔ ان دونوں مذاہب کے پیرو گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ویدانت کے فلسفے نے تعلیم دی کہ دنیا مایا جال اور نظر کا دھوکا ہے۔ اس کا نتیجہ بے عملی کی شکل میں برآمد ہوا۔ تصوف نے مسلمانوں کو ترکِ دنیا اور تقدیر پرستی کا درس دیا۔ ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ رموز و علائم سے نظم میں بہت کام لیا گیا ہے۔

استعارہ، تشبیہ، کنایہ اور دیگر فنی تدابیر نے بھی نظم کی دل کشی اور معنویت میں اضافہ کیا ہے۔ رنج و راحت کو دھوپ چھاؤں یا صبح و شام سے تشبیہ دینے کی روایت بہت پرانی ہے پہلے ہی شعر میں جب کہا جاتا ہے کہ "دنیا ہے عجب چیز، کبھی صبح کبھی شام" تو مطلب یہ ہے کہ دنیا کے مصائب کو دور کرنے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ ذرا دیر کو کامیابی کی آس بندھتی ہے مگر جلد ہی غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ اس سیدھی سی بات کو کنایے میں ادا کر کے شاعر نے ایک خیال کو لطیف شعری پیرایہ عطا کر دیا۔ "بے مہریِ ایام" سے بھی وہی مفہوم ادا کیا گیا ہے جو "شام" سے ادا کرنا مقصود تھا۔

نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام

اس شعر پر غور کیا جائے تو معنی کی کئی پرتیں کھلتی نظر آتی ہیں۔ "ریت کے ذروں" اور "گل و لالہ" میں ایک نوع کا تضاد بھی ہے۔ شعر کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جہاں کوشش کارگر ہوتی نظر آتی تھی (گل و لالہ) وہاں بھی اور جہاں اس کے رائیگاں جانے کا اندیشہ تھا (ریت کے ذروں پہ) وہاں بھی شعاعوں نے ہر ممکن کوشش کر دیکھی اور سیدھا سا مطلب یہ کہ چمن زار ہو یا بیابان۔ دنیا کے کسی گوشے کو انھوں نے فراموش نہیں کیا۔ راحت

وآرام کی رعایت بھی قابلِ توجہ ہے۔ دوسرے مصرعے میں شعاعوں کے سفر کو صبا کی گردش سے تشبیہ دی گئی ہے اگلے شعر میں "تجلی کدۂ دل" استعارہ ہے شعاعوں کے اصل مرکز اور ان کے بچھڑے ہوئے وطن سے۔

دوسرے بند میں جب شاعر کہتا ہے کہ ۔

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں

بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش

تو ایک متحرک تصویر اور ایک ڈرامائی کیفیت پیشِ نظر ہو جاتی ہے۔ شعاعوں کی اس سرزمین سے روانگی، طویل سفر اور منزل پر پہنچ کے خورشید سے بغل گیر ہونے کا منظر — چشمِ تصور کو یہ سب کچھ صاف دکھائی دیتا ہے شعر کو پڑھتے ہی یہ سوال دماغ میں آتا ہے کہ ان شعاعوں نے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی دیر نہ کی، فوراً روانہ ہو گئیں — آخر کیوں؟ اپنے آقا کے حکم کی بجا آوری مقصود تھی یا فرضِ منصبی ادا کرتے کرتے تھک گئی تھیں یا پھر اپنی کوششوں کی لاحاصلی کا شدید احساس ہو گیا تھا کہ ذرا بھی تامل نہ کیا اور جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ اس گرہ کو کھولنے کی کوشش سے ذہن لطف اندوز ہوتا ہے۔

اس بند کے باقی تین شعروں (اک شور ہے ......) کو شعاعوں کا کورس یا اجتماعی گلہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ شعاعیں کرۂ ارض سے تو چپ چاپ روانہ ہو گئیں مگر سورج سے بغل گیر ہوئیں تو ضبط کا بند ٹوٹ گیا، صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور بے اختیار گلے شکوے کرنے لگیں۔ یہی دنیا کا دستور بھی ہے۔ شکایت کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں ہماری کوششیں بارآور ہو سکیں۔ شعاعوں کا بیان اس درخواست پر ختم ہوتا ہے کہ اے مہرِ جہاں تاب! ہمیں فراموش نہ کر اور اپنے سینے میں چھپالے کہ تھک ہار کے اب ہم ابدی نیند سو جانا چاہتے ہیں۔ "سیہ پوش"، "صفتِ عالمِ لاہوت" اور "سینۂ روشن" تجسیم کے عمل میں معاون ہوتے ہیں۔

تیسرے اور آخری بند کو نظم میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے پہلے کے دونوں بند ایک ایسی فضا تیار کر دیتے ہیں کہ شاعر کے پیغام کے لیے قاری ہمہ تن گوش ہو جاتا ہے۔ یہ پیغام ایک شوخ کرن کی زبان سے ادا ہوتا ہے جو اپنا فرض ادا کرنے یعنی ایشیا اور خاص طور پر ہندستان میں اجالا پھیلانے کے لیے مضطرب ہے یہ جرات مند ہے اور سورج کا حکم بجا لانے میں اسے تامل ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ اس نے مایوس ہونا نہیں سیکھا۔ یہ کرن رجائیت کی علامت ہے بلکہ یہ کرن ایک نقاب ہے اور اس کے پیچھے شاعر کا چہرہ صاف نظر آتا ہے۔ گویا یہ شاعری کی تیسری آواز ہے۔ اقبال کے عزم کا اظہار اس امید کی کرن کی زبان سے ہوتا ہے اور اس کی زبانی اقبال کا پیغام قاری تک پہنچتا ہے۔

شاعر کا پیغام چونکہ اسی بند میں پیش ہوا ہے اس لیے یہاں پچھلے دونوں حصوں کی سی رمزیت و اشاریت موجود نہیں اور نہ ہو سکتی تھی۔ یہاں بیان کسی حد تک براہِ راست ہو گیا ہے اور یہی ضرورت کا تقاضا تھا۔ اس کے باوجود آدابِ فن کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور فنی تدابیر سے بھرپور کام لیا گیا ہے چنانچہ اس بند میں نہ شعریت کی کمی ہے اور نہ تاثیر کی۔ پہلے ہی شعر میں کرن کو شوخی میں نگہِ حور سے اور اضطراب میں جوہرِ سیماب سے تشبیہ دی گئی ہے، پھر مہ و پرویں کو چشم اور خاکِ ہند کو سرمۂ چشم کہا گیا ہے اور اس کے کنکر پتھروں کو سچے موتیوں کے ہم پلہ ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ کنایہ ہے ہندستان کی رفعت و عظمت سے۔

اس کے بعد کفایتِ لفظی سے کام لیتے ہوئے گویا بہت اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس دیس کی مٹی سے ایسے علما اور حکما پیدا ہوئے جنھوں نے علم و حکمت کے سمندر کھنگال ڈالے۔ اشارہ ہے گوتم، مہاویر، کپل، ویاس، بھرتری ہری اور شنکر اچاریہ جیسی عظیم ہستیوں کی طرف۔

آخر کے تین شعر عظیم فکر اور نادر فن کاری کے امتزاج یہ الفاظ دیگر مواد اور ہیئت کی کیمیا گری کا بہترین نمونہ ہیں۔ ایک شعر میں کہا گیا ہے کہ جس ساز کے نغمے دلوں کو گرماتے تھے آج اس کے تاروں کو چھیڑنے والی مضراب نایاب ہے۔ ساز و مضراب کا استعمال کنایاتی ہے اور ان سے کئی معنی برآمد ہوتے ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس دیس میں شعر و حکمت کے خزینوں کی کمی نہیں مگر انھیں اہلِ وطن تک پہنچانے والا کوئی نہیں۔ یا پھر یہ کہ یہاں اہلِ کمال تو موجود ہیں مگر کوئی ایسا محرک نہیں کہ ان کے کمالات نمایاں ہوں۔ ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ملک میں کوئی ایسی ہستی موجود نہیں جس کے اثر سے یہ صاحبانِ کمال اپنے کمال کا مظاہرہ کریں اور قوم اس سے فیض یاب ہو۔ یہاں اظہار برملا نہیں بلکہ ایک طرح کا ابہام پایا جاتا ہے اور اس ابہام سے شعر میں تہ داری پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے بعد یہ شعر ہے۔

بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلمان تہِ محراب

اس شعر کو فن کا اعجاز ہی کہا جا سکتا ہے۔ لفظوں کے کنایاتی استعمال سے اس کا رتبہ بہت بلند ہو گیا ہے۔ بت خانے کے دروازے سے مراد ہے ہندو دھرم اور برہمن سے اشارہ ہے ہندو قوم کی طرف۔ سونا کنایہ ہے بے عمل ہو جانے سے۔ مطلب یہ کہ فلسفۂ ویدانیت نے ہندوؤں کو یہ باور کرا دیا کہ دنیا محض فریبِ نظر ہے۔ نتیجہ یہ کہ وہ غافل اور بے عمل ہو گئے۔ دوسرے مصرعے میں محراب کنایہ ہے مسجد سے اور مسجد علامت ہے دینِ اسلام کی۔ فلسفہ وحدت الوجود بقولِ اقبال غیر اسلامی فلسفہ ہے مگر اسے جزوِ اسلام سمجھ لیا گیا۔ اس فلسفے نے مسلمان کو قناعت، تقدیر پرستی اور اس کے نتیجے میں بے عملی کی تعلیم دی۔ بے عملی نے اسے دنیا کی نعمتوں سے محروم کر دیا۔ آج وہ اس محرومی کے لیے تقدیر کو رو رہا ہے، قسمت کو الزام دے رہا ہے۔ "تقدیر کو رونا" یہاں دوہرے معنی دے رہا ہے۔ نظم کا آخری شعر ـــ

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اقبال کے بہت مشہور شعروں میں سے ایک ہے اور اس نظم کا ماحصل ہے۔ شب کو سحر کرنے سے مطلب ہے آلام و مصائب اور ہر طرح کی خرابیوں کو دور کر کے اس دنیا کو خوشیوں کا گہوارہ بنا دینا اور اس میں مشرق و مغرب کا کوئی امتیاز نہیں۔ زمین کا ہر خطہ شاعر کا اپنا گھر ہے اور اس کے دل میں ساری دنیا کا غم ہے۔ آخری مصرعے میں جب فطرت اس دنیا کی حالت کو منقلب کر دینے کا تقاضا کرتی ہے تو ایک متحرک جسم حاصل کر لیتی ہے تجسیم کا یہ عمل اس نظم میں شروع سے آخر تک کارفرما ہے اور اس کی دل کشی کو دوبالا کر دیتا ہے۔

آفاقیت و ابدیت فن پارے کی عظمت کی دلیل ہے۔ اس نظم میں جس تبدیلی کی آرزو کی گئی ہے وہ کسی ایک ملک یا کسی ایک قوم تک محدود نہیں، زمانے اور مقام سے بے نیاز سارے عالم کے لیے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ عظیم شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ زمان و مکاں سے بلند ہو کر آفاقی اور

ابدی ہو جائے۔ شعاعِ امید میں آفاقیت بھی ہے اور ابدیت بھی۔

ہیئت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بھی اس نظم کا شمار اقبال کی بہترین نظموں میں ہے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنی پسندیدہ فارم ترکیب بند کا انتخاب کیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نظم بغیر مطلع کی تین غزلوں کا مجموعہ ہے جو ایک ہی وزن و بحر میں کہی گئی ہیں لیکن غزل کے برعکس یہاں خیالات کا تسلسل موجود ہے۔ اس کی بحر ہے ہزج مثمن اخرب مکفوف، محذوف الآخر یعنی مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن (دو بار) یہ ایک مترنم اور مقبول بحر ہے۔ انتخابِ الفاظ کے علاوہ لفظوں کی تکرار جیسے "شوخ کرن شوخ" "خواب سے مردانِ گراں خواب" سے بھی موسیقیت پیدا کی گئی ہے۔

کلیم الدین احمد اقبال کی شاعری کے زیادہ قائل نہیں مگر انھیں بھی اعتراف ہے کہ شعاعِ امید ایک کامیاب تخلیقی تجربہ ہے۔ نظم کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "کیسی حسین و پاکیزہ نظم ہے، یہاں ارتقائے خیال ہے، اشعار میں ربط و تسلسل ہے۔ خیالات میں ابتدا، عروج اور پھر انتہا بھی ہے۔ یہ صحیح معنوں میں نظم ہے۔ غزل نے نظم کا بھیس نہیں بدلا ہے ...... خیالات میں تخیل کا رنگ ہے طرزِ ادا سادہ اور پاکیزہ ہے ...... بار بار پڑھنے سے اس کی دل کشی میں کمی نہیں، اضافہ ہوتا ہے۔ کاش اقبال اس قسم کی نظمیں اور لکھتے!"

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی اہم کتابیں

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور

اس مجموعے میں پروفیسر آل احمد سرور کے جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق زیادہ تر شاعروں اور شاعری کی خصوصیات سے ہے میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، حسرتؔ، فانیؔ، جوشؔ اور فراقؔ کی شخصیات اور شاعری پر بھرپور مضامین کا اہم مجموعہ۔ قیمت ۵۱/-

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم
ڈاکٹر سلامت اللہ

اس کتاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے جن مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے وہ مصنف کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے کہ اس کے تاریخی اور حالیہ شواہد موجود ہیں۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کی اہم ترین تصنیف۔
قیمت ۵۱/-

اقبال کا نظریۂ خودی — عبدالمغنی

اس کتاب میں نظریۂ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کر کے اقبال کے پورے نظام فکر کی تلاش کی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی شاعری کی حقیقی جہت واضح ہو اور دوسری طرف آج کی انسانیت کو اپنے ارتقا کی صحیح سمت دریافت کرنے میں سہولت ہو۔ قیمت ۱۵۰/-

پت جھڑ کی آواز — قرۃ العین حیدر

برصغیر کی ممتاز ترین افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کی اہم کہانیوں کا مجموعہ۔ یہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور زندگی کی صحیح عکاسی بھی کرتی ہیں۔ نیا اڈیشن قیمت ۷۵/-

جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔ قیمت ۳۶/-

لکھنوی تہذیب کا نمائندہ شاعر

قلندر بخش جرأت (خطبہ) — جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸ نومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سیمینار میں پیش کیا۔
قیمت ۱۰/-

غبارِ منزل (شعری مجموعہ) — غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا تازہ مجموعہ جس میں "سازِ لرزاں" "ذوقِ سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت ۴۵/-

تاریخ اودھ — قاسم علی نیشاپوری

"تاریخ اودھ" معروف بہ "تاریخ شاہیہ نیشاپوریہ" اودھ کی اہم تاریخ ہے۔ قاسم علی نیشاپوری نے اسے فارسی میں لکھا تھا ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے نہایت محنت سے اس کو اردو کا جامہ پہنایا۔ قیمت ۲۷/-

فی الحقیقت — یوسف ناظم

طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں یوسف ناظم کو اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی تحریریں نہایت ذوق و شوق اور توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔ "فی الحقیقت" آپ کے تازہ ترین طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔
قیمت ۴۵/-

حکیم محمود احمد برکاتی
۱۵/۲۴۶۔ دستگیر سوسائٹی کراچی ۳۸
(پاکستان)

جلاّب

ایک طبّی صنفِ سخن

طب قدیم میں اخلاط ردّیہ اور رطوبات فاسدہ کو اسہال کے ذریعے سے خارج کیا جاتا ہے۔ اور اسے استفراغ، تنقیہ اور مسہل کہا جاتا ہے۔ عوام اسے مسہل اور جلاّب کہتے ہیں۔ مسہل کسی بیماری کے علاج کے لیے بھی دیا جاتا تھا اور حفظِ ماتقدم کے طور پر بھی، ماضی میں مسہل پینے کا عام رواج تھا، خصوصًا امرا سالانہ مسہل پیا کرتے تھے۔ موسمِ ربیع (فصلِ بہار) میں اطبا مسہل پلایا کرتے تھے۔ اس وقت موسم معتدل ہوتا ہے نہ شدید گرمی نہ شدید سردی۔ اخلاط کا قوام بھی استفراغ (اخراج) کے لیے موزوں ہوتا ہے۔ مسہل پینے کا رواج عرب میں تھا۔ اور برّ عظیم میں اور خصوصًا یہاں کی ریاستوں میں دوسرے مقامات کی بہ نسبت زیادہ تھا اور بڑے اہتمام سے مسہل پیا جاتا تھا۔ عجم کے حسنِ طبیعت نے اس میں سالانہ تقریب کی سی شان پیدا کر دی تھی۔ حیدرآباد، بھوپال، رام پور، مالیر کوٹلہ، ٹونک جاورہ وغیرہ مسلم ریاستوں میں طب قدیم زیادہ عرصے تک مقبول رہی اور اس لیے وہاں طب قدیم کے اداروں میں زندگی نظر آتی تھی۔ جلاّب لینے کا شوق اور چلن یہاں عام تھا، والیانِ ریاست ان کے اعزہ، درباری امرا، اعلا حکام، جاگیردار اور ان سب کی تقلید اور حرص میں متوسط طبقے کے افراد بھی سالانہ باقاعدگی اور چاؤ سے جلاّب لیا کرتے تھے۔ اور یہ ایک معالجاتی عمل بھی تھا اور معاشرتی تقریب بھی، جس کے بہت سے لوازم اور آداب بھی بنتے چلے گئے تھے۔ پہلے سے تیاری کی جاتی تھی، اہتمام کیا جاتا تھا، کچھ مشاغل اور مصروفیات مقدّم و موخّر کیے جاتے تھے۔

منجش | مسہل پلانے سے پہلے، مواد کو قابلِ اخراج بنانے کو اصطلاح میں انضاج کہتے ہیں اور انضاج کے لیے دوائیں پلائی جاتی ہیں۔ انھیں منضج کہتے ہیں۔ اسی منضج کا عوامی تلفّظ منجش ہے، جو صاحب جلاّب لینا چاہتے تھے انھیں حکیم صاحب پہلے منضج لکھ کر دیتے اور حسب ضرورت ۵ یا ۷ یا ۱۵ دن پینے کی ہدایت کرتے، منضج پینے کے دوران اصولًا زیادہ چلنے پھرنے، جسمانی و دماغی محنت کرنے، خاص طور پر سفر کرنے کی ممانعت ہوتی، مگر ریاستوں کے ماحول کی فراغت کے اثر سے احتیاط زیادہ کی جاتی تھی اور گھر سے نکلنے کی پابندی بھی از خود عائد کر لی جاتی تھی۔ ثقیل و دیر ہضم غذاؤں سے پرہیز ہوتا، بے مرچ کھانا کھایا جاتا۔ اعزہ اور احباب کے

حلقے میں چرچے ہوتے کہ فلاں صاحب منضج پی رہے ہیں، اس لیے انھوں نے اپنا سفر ملتوی کر دیا ہے یا دفتر سے رخصت پر ہیں، گھر پر ہی فائلیں منگوا لیتے ہیں۔ شکار پر بھی نہیں جا رہے ہیں، دعوتوں میں شرکت سے بھی پرہیز کر رہے ہیں۔ متوسط درجے کے ملازمین، منضجوں کے آغاز میں تو نہیں مگر جلاّب سے دو تین روز پہلے دفتر سے رخصت لے لیتے تھے۔ مرزا غالب نے بہادر شاہ ثانی کے دربار سے رخصت کے لیے منظوم درخواست قطعے کی صورت میں لکھی تھی، اس کا دوسرا شعر ہے:

تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد
تین مسہل، تین تبریدیں، یہ سب کے دن ہوئے۔

مسہل

منضج پیتے ہوئے کچھ دن ہو جاتے تو حکیم صاحب اکثر نبض دیکھتے اور قارورے کا معائنہ کرتے پھر یہ فیصلہ کرتے کہ نضج تمام ہو گیا اور اب مسہل شروع کر دیے جائیں۔ چناں چہ دوسرے دن علی الصباح مسہل دوائیں پلائی جاتی۔ دوا پلانے سے پہلے دونوں بازو کس کر باندھ دیے جاتے کہ دواؤں کی تلخی سے الٹی ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔ دوا پینے کے چار گھنٹے بعد تک پانی پینے کی ممانعت ہوتی، چار گھنٹے کے بعد عرق بادیان پینے کی اجازت و ہدایت ہوتی۔ دوپہر تک حکیم صاحب کو اطلاع دی جاتی کہ اتنے اسہال ہو چکے ہیں۔ حکیم صاحب حسب ضرورت کوئی ہدایت دیتے مثلاً اگر یہ اطلاع ملتی کہ اسہال نہیں آ رہے ہیں یا کم آ رہے ہیں تو حکیم صاحب "وردِ مسہل" تجویز کرتے یعنی ماء العسل (آمیزۂ آب و شہد) یا شربت ورد مکرّر پلانے کی ہدایت کرتے۔ چوں کہ کئی جلاّب، (دست) آتے یا آنے کی توقع ہوتی اس لیے "مریض" کو بار بار بیت الخلا جانے کی زحمت سے بچانے کے لیے بستر کے قریب ہی ایک چوکی جو خاص اسی مقصد کے لیے بنی ہوئی ہوتی تھی اور ہر گھر میں موجود رہتی لگا دی جاتی۔ ؎۱ دوپہر تک کوئی ملازم یا عزیز چند بار حکیم صاحب کو اسہال کی تعداد بتانے کے لیے چکّر لگاتا، ایک دو بار حکیم صاحب بھی آ کر نبض دیکھ جاتے۔ دوپہر کو گوشت کی یخنی دی جاتی اور سہ پہر کو مونگ یا موٹھ کی کھچڑی کھانے کے لیے دی جاتی اس طرح مسہل کا پہلا دن گزرتا۔

ٹھنڈائی

دوسرا دن، وقفے کا ہوتا، اس دن تبرید پلائی جاتی جسے چاندی کے ورق میں لپیٹ کر کھلایا جاتا، اوپر سے ریشہ خطمی اور بہدانہ کا لعاب اور عناب کا شیرہ عرق گاؤ زباں میں نکال کر، شربت بنفشہ ملا کر اوپر سے تخم ریحان چھڑک کر پلایا جاتا۔

اگلے دن پھر اسی طریقے سے مسہل پلایا جاتا اور وقفے کے دن تبرید پلائی جاتی۔ اس طرح چند

؎۱ مستقل مریضوں یا سن رسیدہ اور ضعیف لوگوں کے لیے یہ انتظام مستقل ہوتا، یہ گویا آج کل کے بیت الخلاء متصل (اٹیچڈ باتھ روم) کی ایک دیسی شکل تھی۔ غالب کا ایک خط: "حاجتی (ظرف پیشاب) پلنگ کے نیچے دھری رہتی ہے اور "لگن" چوکی "پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے"۔

مسہل اور چند تبریدوں کے بعد جلاب مکمل ہو جاتا اور اس کے بعد حکیم صاحب مفرحات و مقویات استعمال کرنے کی اجازت و ہدایت دیتے جو اس سے پہلے ہی تیار کر لیے گئے تھے مثلاً خمیرہ مروارید، یاقوتی، معجون نقرہ عرق عنبر، ماء اللحم۔ اس کے صلے میں حکیم صاحب کو "مریض کی حیثیت کے مطابق خلعت، نقد رقم، اور دوسرے ہدیے پیش کیے جاتے۔ لال قلعے میں بھی یہی دستور تھا۔

"بادشاہ نے حکیم (احسن اللہ خاں) صاحب کی تجویز سے مسہل لیا،
حکیم صاحب کو خلعت عنایت فرمایا۔"[۲۱]

اودھ کے حکمرانوں اور روسا کے یہاں بھی یہی رواج تھا (اطبا کے یہاں) روسا کے یہاں سے علاوہ تنخواہ کے بیماری کے زمانے میں مختلف موقعوں پر تحفے اور ہدیے معین تھے۔ مسہل کے دن بڑے بڑے خوانوں میں پر تکلف کھانے بھیجے جاتے تھے۔"[۲۲]

ایک قسم کا جلاب تو معالجاتی عمل کے طور پر ایسے لوگوں کو دیا جاتا جو کسی خلطی فساد میں مبتلا ہوتے یعنی کسی حقیقی مریض کو اس کی شکایات دور کرنے کے لیے دیا جاتا تھا اور ایک قسم کا جلاب حفظ ماتقدم کی ایک تدبیر کے طور پر دیا جاتا تھا یعنی کسی مریض کو نہیں بلکہ صحت مند انسان کو احتیاطاً دیا جاتا تھا اور یہ ہر سال جلاب لینے کے عادی ہوتے تھے اور اس جلاب میں آرام ملتا اور جلاب کی تقریب میں جو رسوم ادا کی جاتی اس سے انا کی تشنگی رفع ہوتی تھی۔ اس لیے مریض ایسے جلاب کے منتظر اور آرزو مند رہتے تھے۔ فصل بہار کی آمد سے پہلے ہی حکیم صاحب کو متوجہ کرتے کہ "مارچ میں آپ مجھے جلاب بھی تو دیں گے۔ اب جلاب کے بعد مجھے یاقوتی کے بجائے لبوب کبیر بنادیں تو کیسا رہے گا؟" مختصر یہ کہ جلاب ایسا نسخہ نہیں ہوتا تھا جس کو مریض جبراً اور با دل ناخواستہ استعمال کرتا ہے۔ بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت استعمال کرتا ہے، بلکہ یہ ایسا نسخہ ہوتا تھا جس کے استعمال کرنے کا شوق ہوتا تھا، انتظار رہتا تھا:

خوش دوائے ست بیا تا ہمہ بیمار شویم

استعمال کرنے والا خوشی خوشی استعمال کرتا اور نادر شاہ کا ہم زبان ہو کر کہتا تھا:

حلوائے خوب ست باز بیارید

اس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی تھی کہ جلاب لینے والا مریض نہیں ہوتا تھا اور آنے والے موہوم اور فرضی امراض سے تحفظ کے لیے جلاب لیتا تھا، اور مریض ہونے کی صورت میں جو صورت حال ہوتی ہے اس سے دوچار نہیں ہوتا تھا۔ تکالیف کی کمی زیادتی، طبیب کے انتخاب کا مسئلہ، حصول صحت کی طرف سے فکرمندی۔ علاج کامیاب نہ ہونے کا خوف، ان میں سے کوئی پہلو بھی اس "علاج" میں نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ماحول بالکل مختلف ہوتا تھا۔ خود مطمئن اہل خانہ بے فکر اور تقریب کی تیاریوں میں مصروف، عیادت کے لیے آنے والوں کا انداز بھی بدلا

۲۱۔ "مشکات کی ڈائری" خواجہ حسن نظامی، دہلی، ۱۹۵۰ء۔ صفحہ ۵۲۔
۲۲۔ "لکھنؤ کی تہذیب" شمس باقر، کراچی، سن ندارد۔ صفحہ ۲۳۔

ہوا، دعا، اظہار ہمدردی، مشورے وغیرہ کے بجائے ایک نوع کی تبریک و تہنیت کا سا انداز پیدا ہوجاتا، ننہیال، سسرال، سمدھیانے، میکے والوں کی طرف سے بدھاووں کا سلسلہ، غرض ایک اچھی خاصی تقریب کا سا سماں بندھ جاتا تھا۔ آنے والے آرہے ہیں اور ہار پھول، پان، کلکادھینے کی گری، کھوپرے اور کدو کے بیج کی گری کا ایک مرکب) لا رہے ہیں۔ روزانہ کسی نہ کسی عزیز کے یہاں سے "جلاب" آرہے ہیں۔ کسی چہرے پر فکر کی پرچھائیں نہیں ہے۔ تبسّم ہے، تبریک ہے، تہنیت ہے، بھلا اسے "علاج" کون کہے گا، ایک چھوٹی موٹی تقریب ہے۔

جلاب | طبی نظریات اور اداروں نے اردو ادب کو بہت محاورے، روزمرے اور الفاظ دیے ہیں: رایشہ خطمی ہونا، سودا سمانا، سربیں سودا، سودائی، نبض ٹٹولنا (راز معلوم کرنا) نبض پر انگلی، نبض شناسی، مزاج درست کرنا جیسے بہت سے الفاظ اور محاورات کی طرح اس معالجاتی اور معاشرتی تقریب کے طفیل بھی اردو ادب میں چند تراکیب اور الفاظ کا اضافہ ہوا ہے جلّاب اصل میں گلاب کا معرب ہے مگر اردو میں اس لفظ کے ایک معنی اسہال (دست آنا) جلّاب لینا (دوائے مسہل پینا) جلّاب لانا (مسہل کے دوران بدھاوے لانا) جلّاب گانا (اس موقع پر مبارک باد کے اشعار گانا) جلّاب بگڑنا (دوائے مسہل پینے کے دوران بے احتیاطی اور بے پرہیزی سے عوارض کا پیدا ہوجانا)۔

صنفِ سخن | جس طرح سہرا ایک صنفِ سخن ہے، شادی کے موقع پر وہ نظم جس کی ردیف سہرا ہوتی ہے، سہرا کہلاتا ہے، اسی طرح جلّاب بھی ایک صنفِ سخن ہے جس میں ردیف جلّاب ہوتی ہے اور جس میں تبریک، اظہارِ مسرّت، دعا وغیرہ کے ساتھ اسہال کی مناسبت سے چند شعروں میں ہلکے سے مزاح کا رنگ بھی ہوتا ہے کبھی کبھی یہ رنگ گہرا ہوجاتا ہے۔ ایک جلّاب کے چند شعر سنیے، یہ جلّاب ایک بہن نے اپنے بھائی کے جلاب کے موقع پر شہر کے کسی شاعر سے لکھوایا تھا۔

پندرہ روز کے جب ہو گئے منجش پورے
تو حکیموں نے ترے واسطے لکھا جلّاب

سال بھر آنکھ بھی دکھے گی نہ انشاءاللہ
ہو مبارک مرے بھیّا کو یہ پیارا جلّاب

دور ہوئی اسی رفتار سے بیماری بھی
جس شتابی سے مرے بھائی کو آیا جلاب

اس کا پھل، اس کا اثر اتنا ہی میٹھا ہوگا
آج تو پی لو یہ کڑوا یہ کسیلا جلاب

بس اسی طرح سے امراض بھی بہہ جائیں گے ، بہہ گیا تشت میں جس طرح سے پتلا جلاب

ایک رگ رگ سے نکالے گا یہ سوداوی مواد
صاف کر دے گا ترا بلغم وصفرا جلاّب

بھابی بیگم نے کھلائی ہے ہمیں بھی کھچڑی
وہ سمجھتی ہیں کہ جیسے ہے سبھوں کو جلاّب

دوستوں اور عزیزوں کے بدھاوے آئے
مل کے بہنوں نے بڑے چاؤ سے گایا جلاّب

ان اشعار میں جلاّب ، دستوں کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ نسخۂ مسہل کے معنی میں بھی (ہا جلاّب) دوائے مسہل کے معنی میں بھی (کڑوا جلاّب) اور صنفِ سخن کے معنی میں بھی (گایا جلاّب)۔

ایک اور جلاّب کا ایک شعر ہمّت کر کے لکھ رہا ہوں:

ڈھونڈتا پھرتا ہے آنتوں میں مواد اور سُدے
ایسا دیکھا ہی نہیں ہم نے کیاڑی جلاّب

بدھاوے ایک صاحب نے جلاّب لیا ہے۔ ان کے بدھاوے آئے ہیں۔ آپ بھی ایک جھلک دیکھئے:

چند مرد اور عورتیں سروں پر کئی خوان رکھے ہوئے آتی ہیں، ان پر بڑے خوبصورت، [زری]ن اور گوٹے لچکے ٹکے ہوئے خوان پوش ڈھکے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی میں ہار پھول، [کس]ی میں پان کے بیڑے چاندی کے ورق لگے ہوئے، کئی خوانوں میں مصری، کھوپرا، بادام [و غ]یرہ خشک میوہ ہے۔ ایک خوان میں گڈکا ہے، ایک خوان میں بٹوے (چھالیہ اور الائچی [رکھ]نے کے لیے) اور رومال ہیں، ساتھ میں صدقے کے لیے ایک بکرا ہے، جس پر گوٹے ٹھپے لگی [ہو]ئی زرق برق جھول پڑی ہے۔ سینگوں پر رنگین کپڑے کا غلاف چڑھا ہوا ہے، اس بدھاوے [کے] ساتھ بھیلوں میں سوار جلاّب لانے والے گھرانے کی خواتین بھی آکر اتری ہیں۔ ان میں سے [کم]سن اور جواں سال لڑکیوں نے آتے ہی جلاّب گانا شروع کیا جو اس موقع کے لیے استاد [...] دولت سے لکھوایا ہے، گھر کی خواتین نے یہ سامان وصول کیا اور اس میں سے ایک حصّہ [حک]یم صاحب کے لیے الگ کر لیا گیا ہے جس میں اپنی طرف سے اضافہ کر کے حکیم صاحب کے [ی]ہاں بھیجا جائے گا، جس کے ساتھ نقد نذرانہ بھی ہوگا۔ ●●

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

کتاب	موضوع	مصنف	قیمت
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۱۱/-
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۱۱/-
پت جھڑ کی آواز	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۵/-
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	۵۰/-
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۷/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/-
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۱۵/-
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۱۴/-
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۱۱/-
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۱۵/-
قلندر بخش جرأت	(خطبہ)	جمیل جالبی	۱۰/-
عجائب گھر	(بچوں کی سائنسی کتاب)	قاسم صدیقی	۱۰/-
تاریخ اودھ	(تاریخ)	ترجمہ و ترتیب شاہ عبدالسلام	۲۶/-
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	(ادب)	ر۔ انصاری	۲۳/-
تنقید اور جدید اردو تنقید	(تنقید)	ڈاکٹر وزیر آغا	۱۰/-
مشقی تدریس، کیوں اور کیسے؟	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۲۵/-
آوازوں کا میوزیم	(افسانے)	ساگر سرحدی	۲۵/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو	(خاکے)	کشمیری لال ذاکر	۳۶/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	(خاکے)	اشرف صبوحی	۵۱/-
چند تصویر بتاں	(تاثرات)	مولانا عبدالسلام قدوائی	۲۵/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	(ادب)	پروفیسر آل احمد سرور	۸/-
صاحب جی سلطان جی	(تذکرہ)	ڈاکٹر اسلم فرخی	۲۰/-
نظام رنگ	(ادبی خاکہ حضرت نظام الدین اولیا)	″ ″	۱۵/-
شہید جستجو	(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/-
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست	(مذہب)	مشیر الحق	۸/-
ہمارے دینی علوم	(مذہب)	مولانا اسلم جیراجپوری	۱۸/-
تحقیقی مضامین	(تحقیق)	مالک رام	۶۰/-
آسان اردو، ورک بک	(تعلیم)	شکیل اختر فاروقی	۲۴/-

پروفیسر نعیم احمد
۔ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی
۔ گڑھ

سرسیّد کی معنویت

سرسید ہندستانی مسلمانوں کے تاریخی مقدر کی پیچیدگیوں اور تضادات کی ایک نمایاں علامت ہیں۔
ماضی کو چھان پھٹک کر تعلیم اور مذہب دونوں میں ایسی اصلاحات کے خواہش مند تھے جو سرمایہ دارترقی
کے تقاضے پورے کرسکیں۔ اسی سبب وہ راجا رام موہن رائے، دیانند سرسوتی اور کیشب چندر سین کی
اصلاحی تحریکوں کے مدّاح تھے۔ وہ قومیت کو ایک نیا مفہوم دینا چاہتے تھے۔ ملک، معاشرے اور
سیاست سے متعلق محرومیوں اور بدنصیبیوں کا مداوا ان کے خیال میں روشن خیالی کے ذریعے
ممکن تھا۔ روشن خیالی ہی کو وہ ترقی کا محرک سمجھتے تھے۔ تعلیم کی بنیاد وہ انسانی ذہن کی نئی
۔ حات قرار دیتے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ انسانی زندگی، معاشرے، ثقافت، اخلاقیات، سائنس
اور آرٹ نے اب تک جو ترقی کی ہے اسے گہرے غور و فکر کا موضوع بنایا جائے اور اس منتھن کے
۔ جو ہاتھ آئے صرف اسے امرت سمجھا جائے۔ وہ ثقافت اور ٹیکنولوجی کی ترقی کو ملک کی طاقت
اور خوش حالی کی ضمانت قرار دیتے تھے۔

سرسید درس گاہ کو انسانی شخصیت کو زرخیز اور جدید بنانے کا ایک وسیلہ قرار دیتے تھے۔
۔ ن کے عزائم کا عطر ان کے اس بیان میں موجود ہے:

> "اے دوستو مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی
> مسلمان نے بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرلی ہے۔ میری خوشی قوم کو
> قوم بنانے کی ہے۔"

یوں سرسید یہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا جائے
۔ ہ عام ثقافتی اور اخلاقی معیار بلند ہوں اور نئے عہد کے تقاضے پورے کیے جاسکیں۔

یہ کام وسیع پیمانے پر اور کامیابی کے ساتھ اسی طرح انجام دیا جاسکتا تھا کہ مادری زبان کو ذریعۂ
۔ م بنایا جائے۔ لیکن انگریزی نوآبادیت اور ہندستان کے قومی تقاضوں کے مابین جو تضادات تھے
۔ ل نے ایسی گتھیاں پیدا کیں جو آج تک سلجھائی نہیں جاسکیں۔ اردو اس صورت حال میں ایک ایسی
۔ بان نظر آتی ہے جو ڈیڑھ سو برس قبل ہی اپنے امکانات کا برسوں تک عملی ثبوت دینے کے باوجود آج
۔ ے جدید تعلیم کے لیے بے مصرف قرار دی جارہی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو زبان اور اسے جدید تعلیم کے لیے استعمال کرنے والوں نے برس ہا برس تک انگریزی زبان میں یہ تعلیم حاصل کرنے والوں پر اپنی برتری ثابت کی۔ ۷ مارچ ۱۸۳۵ء کو لارڈ بنٹنگ کی یہ بات تسلیم کی گئی کہ انگریزی ذریعہ تعلیم ہو۔ اس وقت جب اردو کو بھی جدید تعلیم کا ذریعہ بنانے کی وکالت کی گئی تو نفی کے لیے وہی دلیل دی گئی جس کا سلسلہ آج تک برقرار ہے، یعنی اس کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے کتابیں کہاں ہیں!

لیکن ۱۸۵۷ء سے قبل دہلی کالج میں اردو کے ذریعے جو کارنامہ انجام دیا جا رہا تھا، وہ آج بھی سبق آموز ہے۔ دہلی کالج میں مغربی علوم یعنی ہیئت، ریاضیات، فلسفہ، نیچرل فلاسفی اور تاریخ وغیرہ کی تعلیم کا ذریعہ اردو تھی۔ بات اتنی ہی نہیں تھی۔ پرنسپل کارگل نے ۱۸۵۲ء میں کالج کے بارے میں جو سالانہ رپورٹ تیار کی تھی، اس میں یہ حقیقت بھی درج تھی:

"مشرقی شعبے کا طالب علم اپنے مغربی شعبہ والے حریف سے سائنس میں کہیں بڑھا ہوا ہے۔"

اس رپورٹ کی صداقت کا اعتراف لیفٹیننٹ گورنر نے ان لفظوں میں کیا تھا:۔

"طلبہ (شعبۂ مشرقی) کی سائنس کی ترقی کے متعلق جو یقین دلایا گیا ہے، اس سے بے حد مسرت ہوئی۔"

یہ کوئی حادثہ یا اکلوتا واقعہ نہیں تھا۔ کونسل آف ایجوکیشن بنگال کے سکریٹری اور میڈیکل کالج کلکتہ کے فزیشین فریڈرک جان مواٹ نے دہلی کالج کے سائنس کے ان طلبا کی لیاقت کا امتحان لیا تھا جو اردو میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کی رپورٹ کے بعد تعلیم عامہ کی جنرل کمیٹی نے اپنی ایک قرارداد میں ان کی رائے اس طرح درج کی تھی:

"اردو کے ذریعے دہلی کالج میں جو سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کی مسٹر مواٹ نے بہت تعریف کی ہے۔"

۱۸۵۶ء تک یہی صورتِ حال تھی اور اردو کے ذریعے جدید علوم پڑھنے والے ان طالب علموں پر سبقت حاصل کر رہے تھے جو انگریزی کے ذریعے یہ علوم حاصل کر رہے تھے۔ اس حقیقت سے اس مفروضے کی بھی تردید ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

جدید علوم کی تعلیمی زبان بن کر اردو ایک اور اہم کام انجام دے رہی ہے اور وہ تھا روشن خیالی کو فروغ دینا۔ خود ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسر اس حقیقت کے معترف تھے۔ چنانچہ مغربی شمالی صوبوں کے ناظم تعلیمات نے ۱۸۵۶ کی اپنی رپورٹ میں یہ کہا تھا کہ دہلی کالج میں شعبۂ مشرقی برقرار رکھا جائے کیونکہ اس کے سبب اردو کے ذریعہ نہ صرف علوم کی اشاعت ہوتی ہے بلکہ روشن خیالی بھی پھیلتی ہے۔

لیکن انگریزی سامراجیت ہندستان میں نہ تو جدید علوم کی اشاعت چاہتی تھی اور نہ ہی روشن خیالی کا فروغ۔ اسی لیے اس نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا اور علم کے پر باندھے تاکہ نہ تو ہندستانی ذہن کشادہ ہو اور نہ ہی ہندستانیوں کی صلاحیتوں کو جلا نصیب ہو۔ انگریزی مسلط کر دیے جانے کے باوجود، ۱۸۶۷ء میں ورنیکلر یونی ورسٹی کی تحریک شروع کی گئی۔ اس میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا

مطالبہ بھی شامل تھا۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے وائسرائے کو جو عرض داشت بھیجی گئی تھی، اس میں یہ مطالبہ تھا کہ :۔

"اعلا درجے کی تعلیم کا ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں ہوا کرے۔"

سرسید مادری زبان اور اس وقت کے تہذیبی و لسانی نقشے میں اردو کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ اردو زبان نے جس طرح مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک لڑی میں پرویا، انھیں اس حقیقت کا بھی بخوبی احساس تھا اور اس لڑی کو توڑنے، کاٹنے اور بانٹنے کے خطرناک نتائج سے انھوں نے آگاہ بھی کیا تھا۔ صرف اقتصادی معاملات نہیں، بلکہ سماجی واقعات بھی، نفاق اور افتراق کی راہ ہموار کرتے ہیں، سرسید اس جدلیاتی حقیقت کی طرف متوجہ کر چکے تھے۔ زبان کا جھگڑا جس طرح مذہبی اور فرقہ وارانہ مخاصمتوں کا روپ لے رہا تھا، اس کی پیش گوئی ان لفظوں میں کر چکے تھے کہ :

"ہندو علاحدہ مسلمان علاحدہ ہو جاویں گے۔"

یعنی وہ مادری زبان کی، اردو کی سماجی، سیاسی اور تہذیبی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ مگر سامراجیت نے ہمارے ملک کی معیشت کی طرح ہمارے تہذیبی ڈھانچے کو بھی اپنے اغراض و مقاصد کے لیے مسخ کیا۔ انگریزی کو اسی لیے تعلیم کا ذریعہ بنایا گیا تاکہ ایک ایسی نوکر شاہی وضع کی جائے جو عام لوگوں سے ہر اعتبار سے کٹی ہوئی ہو۔ سرسید کے زمانے کی طرح یہ مسئلہ آج بھی لاینحل ہے کہ اپنی تہذیبی خوبو برقرار رکھتے ہوئے سائنس اور ٹیکنولوجی کی برکتوں سے کیسے فائدہ اٹھایا جائے؟ روشن خیالی کو کس طرح فروغ بخشا جائے؟ انگریزی اور ہندستانی علاقائی زبانوں کے مابین تعلیم سمیت زندگی کے ہر شعبے میں استعمال کی کش مکش اب ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے کہ ہندستانی زبانوں کی فیصلہ کن فتح سامنے نظر آرہی ہے۔ ایسے میں اردو کو کہاں استعمال کیا جائے جو ڈیڑھ سو برس قبل نام نہاد مغربی علوم کی تعلیم کا کامیاب ذریعہ بننے کا ثبوت فراہم کر چکی ہے؟ اپنے اردگرد کے معروضی حقائق اور بدلتی ہوئی سماجی۔ نظریاتی صورتِ حال میں کیا ہم یہ نہ سوچیں کہ اردو کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں وہ مقام دے دیا جائے جو اسے قدیم دہلی کالج میں حاصل تھا؟

(یہ مضمون ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۰ء کو شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ کے زیرِ اہتمام یومِ سرسید کے موقع پر پڑھا گیا۔)

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی اور اہم کتابیں

تنقید اور جدید اردو تنقید — ڈاکٹر وزیر آغا

ڈاکٹر وزیر آغا اردو تنقید میں ایک مکتب کہلاتے ہیں۔ ان کا منفرد انداز فکر و نظر اور موقف زیر نظر مجموعہ میں بھی جھلکتا ہے۔ اردو تنقید پر کام کرنے والے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ۶۰/-

مشقی تدریس۔ کیوں اور کیسے؟
ڈاکٹر محمد اکرام خاں

ڈاکٹر محمد اکرام خاں نے استادوں کی ٹریننگ کے عملی پہلو کی اہمیت کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور اس کے پیش نظر "مشقی تدریس" پیش کی۔ یہ کتاب آپ کے طویل تجربے، عمیق مطالعے اور تحقیق کا نچوڑ ہے۔ ۴۵/-

دلّی کی چند عجیب ہستیاں — اشرف صبوحی

میر امّن سے شاہد احمد دہلوی تک دلّی کے قلم کاروں کا جو طویل سلسلہ ہے۔ اشرف صبوحی اس کی نہایت اہم کڑی ہیں۔ ان کی دلّی کا مرکز لال قلعہ نہیں، شاہجہاں آباد کے عوام ہیں، اس میں کبابی بھی ہیں، بھٹیارے بھی، بوڑھے تکیہ دار بھی ہیں اور رنگ ریز بھی۔ دلّی کی ٹکسالی زبان میں لکھے ہوئے یہ دلچسپ خاکے اعلا اور جاندار نثر کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ۵۱/-

کچھ مولانا آزاد کے بارے میں — مالک رام

مالک رام صاحب نے گذشتہ تیس برسوں میں مولانا آزاد کے بارے میں مختلف موضوعات پر گیارہ مضامین قلمبند کیے تھے۔ یہ کتاب انھیں مضامین کا مجموعہ ہے۔ ۵۱/-

آوازوں کا میوزیم — ساگر سرحدی
(افسانے)

ساگر سرحدی کے افسانے دلوں کے تار کو جھنجوڑتے ہیں اور لاشعوری طور پر اپنے پڑھنے والوں کی توجہ اس مسئلے کی اہمیت کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ ۴۵/-

اپنی ہواؤں کی خوشبو — کشمیری لال ذاکر
(خاکے)

اس کتاب میں اردو کے ممتاز ادیبوں، شاعروں اور اردو دوستوں کے ہلکے ہلکے نقوش ہیں۔ مکمل تصویریں نہیں۔ مگر ان خاکوں میں آپ کو نرم نرم ہواؤں کی خوشبو ملے گی۔ وہ خوشبو جس کی تمنا آپ کو برسوں سے ہوگی۔ ۲۶/-

صاحب جی سلطان جی
ڈاکٹر اسلم فرخی

اس کتاب میں حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ اور سلاطین دہلی کے تعلقات کا جائزہ تاریخی بنیاد اور مستند تاریخی حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔ قیمت ۲۰/-

ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب
ایک تنقیدی جائزہ

پروفیسر آل احمد سرور

اس خطبے میں پروفیسر آل احمد سرور نے مجیب صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب THE INDIAN MUSLIMS کو موضوع بحث بنایا ہے۔ خطبے کے آخر میں پروفیسر موصوف نے موجودہ دور میں ہندستانی مسلمانوں کو لاحق مسائل کا تجزیہ کیا ہے اور ایک لائحہ عمل کا تعین کیا ہے۔ قیمت ۸/-

محمد حسن

داستاں کہو

ہوکسی فسردہ دل کی داستاں کہو
ناؤ، کیسے صبح وشام نے فلک پہ چنریاں بکھیر دیں
سردہ آنکھ ڈبڈبائی / دیکھتی رہی
ہار کی ہوا نے گیت گائے ارغنوں بجائے
رگ سبز تالیاں بجا کے جھومنے لگے
گلوں نے آنکھ کھول دی
وہ بوندیوں کے جھانجھنوں نے ساز سُر ملائے
فسردگی مگر عذاب تھی کہ سب سے بے نیاز تھی
ہ سن نہ پائی زمزمے
جو داغ کل لگے تھے ان کو گن رہا تھا دردِ دل
جو زخم تھے گلوں کی طرح کھل رہے تھے مستقل

سناؤ
کوئی داستاں
وہ چاند جیسے چہرے والے شاہزادے
راستوں میں کھو گئے
تلاش میں گئے تھے آپ گم کی پتھروں کے ہو گئے
وزیرزادے ہم رکاب جو تھی سمت کیا گئے
کہ بس وہیں کے ہو گئے
وہ نازنیں جن کے چنریوں کے رنگ آسمان تھے
خیال و خواب ہو گئیں
ردائے خاک اوڑھ کر وہ سو گئیں

ہو کسی فسردہ دل کی داستاں کہو
کہ دل کو کچھ سکوں ملے
کہ کوئی اس جہان میں ہماری طرح سے دکھی ہے
ور اداس ہے
ور اپنے آس پاس ہے ۔!!!

ی ۔ ۷، ماڈل ٹاؤن ، دہلی ۹

عنوان چشتی
بی ۔ ۱۱۷، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
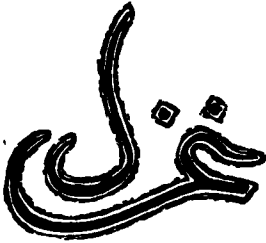
ہوائیں تیز بہت ہیں چراغ جاں کے لیے
کہاں سے لاؤں لہو، شعلۂ فغاں کے لیے

اب اُس کی شوئیِ قسمت کو کیا کہا جائے
زمیں پہ زندہ ہے جو قہرِ آسماں کے لیے

عذاب جھیل رہے ہیں زمین کے ذرّے
یہ بات شرم کے قابل ہے آسماں کے لیے

سُنا ہے، اُس کی سواری نکلنے والی ہے
بچھاؤ راہ میں آنکھیں نگارِ جاں کے لیے

بس ایک بار سہی، دُور کر یہ سناٹا
اُتار کوئی مُسافر سرائے جاں کے لیے

عزیز قیسی
بی ۲۶۔ عثمان چیمبرس سکنڈ پانڈیا لین
جوہوتارا۔ بمبئی ۴۹

شبانِ ہجراں دراز

(۱)

یہ ہوا۔ (یہ فضاؤں کی رانی)
دھیرے دھیرے سسکتی چلی ہے
رقص خانے میں نیلی فضا کے
جیسے پائل چھنکتی چلی ہے
ذرّے کھلتے ہیں کلیوں کی صورت
ریت پر۔ کنکروں پر۔ گلوں پر
پڑ رہی ہیں ستاروں کی چھوٹیں
یا برستی ہے نادیدہ شبنم
چاندنی
نارسا، زرد ـــ
یہ ناشنیدہ نوا ـــ چاندنی
اس کی آبادیوں کو خبر کیا
میرا برباد دل۔
مرزدہ۔ خواب آثار۔ افسوں گرفتہ
سانس لیتا ہوا اک کھنڈر ہے
رات کی موت کا منظر ہے

(۲)

کتنا خاموش ہے یہ ویرانہ
اک پرندہ سا ـــ
(واہمہ سا کوئی)
دل کے نزدیک پھڑ پھڑاتا ہے
کس کی یاد آئی۔ کیسی ہے آواز
چاندنی زخمہ زن ہے
پردہ ساز
(شیشۂ جاں کی طرح لرزاں ہے)
اک جھنا کے سے ٹوٹ جائے گا
ڈوبنا چاند کا مقدر ہے
ٹوٹنا ہے نصیب شیشے کا

غزل

اقبال ردولوی
درگاہ رُدولی ضلع بارہ بنکی
(یوپی)

شہرہ نئی بہار کا کیا کیا سنا نہ تھا
دیکھا تو باغ میں کوئی پتہ ہرا نہ تھا
کیا جانے کیا غریب پر افتاد پڑ گئی
وہ شخص تو خدا کی قسم بے وفا نہ تھا
جس حادثے نے ہوش ہمارے اُڑا دیے
کہتے ہیں لوگ وہ تو کوئی حادثہ نہ تھا
سب لوگ تیرے شہر میں پتھر کے ہو گئے
ہم کس سے حال کہتے کوئی بولتا نہ تھا
بس حرفِ حق زباں سے نکلنے کی دیر تھی
پھر شہر میں ہمارا کوئی آشنا نہ تھا

جمال نقوی (علیگ)
اے-۱۰۱، بلاک "جے"
نارتھ ناظم آباد-کراچی (پاکستان)

خوف

شہر میں خوف ہے
رستوں میں خوف
آنکھ میں خوف
سماعتوں میں دھماکوں کا شور باقی ہے
ہے دل میں خوف
ہر آہٹ پہ شک یہ ہوتا ہے
وہ آرہے ہیں اسی سمت اسلحہ لے کر
وہ ہم کو ماریں گے
گھر لوٹیں گے، جلائیں گے
ہماری لاشوں کو ایسے ہی چھوڑ جائیں گے
یہ سوچ سوچ کے
دل غم میں ڈوبا جاتا ہے
اور ایک زہر لہو میں اترتا جاتا ہے

احمد صغیر صدیقی
"ایچ" ۲۳ ملیر کالونی۔ کراچی
(پاکستان)

کہا یہ کسی نے کہ دیوانے گھر بدلتے ہیں
سفر بہانہ ہے دیوار و در بدلتے ہیں

وہی پرندے ہیں سفّاک وسعتوں کے حریف
اڑان چھوڑتے ہیں جو نہ پَر بدلتے ہیں

اک احتیاج ہے پتھراؤ میں نکلنا بھی
کہ ہر بہار میں ہم زخم سر بدلتے ہیں

ہمارے واسطے اچھا ہے اجنبی رہنا
قدم قدم پہ یہاں ہم سفر بدلتے ہیں

ہنر دکھاتا ہے چہروں پہ خُبث باطن بھی
ہزار آپ تو آئینہ گر بدلتے ہیں

رفیعہ شبنم عابدی
صدر شعبۂ اردو، مہاراشٹر کالج بمبئی ۸

امیرِ شہر کچھ بتا

امیرِ شہر!
کچھ بتا
وہ پھول جیسے لوگ کون تھے
کہ جن کے پیرہن کے سارے تار لٹ گئے
نفس نفس تھا جن کا مشک زا
وہ گل عذار لٹ گئے

وہ بے قرارِ جسم و جاں
ستم کشاں
رواں دواں
شکارِ گردشِ زماں
وہ کس کا رزق ہو گئے؟
کہاں پہ جاکے سو گئے؟
وہ کس خلا میں کھو گئے؟
کہ نفرتوں کا کون سا محاذ تھا
جہاں "فسادزادگاں"
سروں کی فصل بو گئے؟

امیرِ شہر!
کچھ بتا
تجھے تو ہوگا یہ پتا
کہ ان چمکتے راستوں پہ دھول کیسے جم گئی؟
جو دوستوں کے نام تھی
وہ سانس کیسے تھم گئی؟
وفا کی رسم کیا ہوئی؟
گلاب رُت ہوا ہوئی

امیرِ شہر!
کچھ بتا
حنا کے پھول کس لیے ہتھیلیوں سے مٹ گئے؟
چمکتی مانگ میں سیاہ راکھ کیسے بھر گئی؟
لہو سفید، رنگِ شہر سرخ کیسے ہوگیا؟
یہ کیا جلا؟
یہ کیوں جلا؟
یہ کس کے ہاتھ تھے کہ جو
ہوائیں آگ بن گئیں
دعائیں بانجھ ہوگئیں
جو چاند جیسی صبحیں تھیں
وہ کیسے سانجھ ہوگئیں؟

امیرِ شہر!
کچھ بتا! بتا ذرا —— ذرا بتا

امیرِ شہر کیا کہے!!
کہ اس کی میز پر چنے ہوئے
تمام ذائقے لہو کے ہیں!
کہ اس کی آستین میں سجے ہوئے
تمام رنگ ہی لہو کے ہیں!
کہ اس کی آنکھ میں بسے ہوئے
تمام عکس ہی
لہو کے ہیں!!!
امیرِ شہر کیا کہے!!

الیاس شوقی
بمبئی

وہ روزِ حشر تو ہرگز نہیں تھا

وہ روزِ عید تھا شاید
ہنسی پھولوں سی لگتی تھی،
تمنائیں
کسی محجوب دلہن سی
دلوں سے جھانکتے شرما رہی تھیں
مگر اک اضطراب آسا خموشی بھی
رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی
خوشی کافور میں لپٹی ہوئی تھی!

نہیں ___ وہ حشر تھا شاید
کہ تا حدِ نظر اک لق و دق صحرا سا پھیلا تھا
کہ پھر کوئی عدالت لگنے والی تھی
میں اپنا نامۂ اعمال سینے سے لگائے
وہاں تنہا کھڑا تھا
مجھے اپنے گناہوں کا پتا تھا
مگر یہ بھی یقیں تھا
کہ ساری نیکیاں جو میں نے کی ہیں
مجھے ان کے عوض جنت میں جانا ہے
نہیں کچھ اور بھی شاید
ذرا مجھ سے پرے
سراسیمہ، ہراساں، ناامیدی میں کسی امید کا دامن سنبھالے
بڑے گم سم کھڑے تھے
سبھی کے سر نگوں تھے

ہوائیں سسکیوں سی گونجتی تھیں
خموشی اک عذابِ جان بنتی جا رہی تھی
رگ و پے میں مرے چنگاریاں سی بھر گئی تھیں
کہ میں نے سر اٹھا کے
داہنے بائیں
ذرا دزدیدہ نظروں سے نگہ ڈالی
تو دیکھا ___ سامنے کچھ اور منظر تھا
مگر وہ حشر تو ہرگز نہیں تھا!

اگر وہ حشر ہوتا
تو کرسیِ عدالت پر خدا ہوتا
ہمارے نامۂ اعمال
ہمارے ہاتھ میں ہوتے
حسابِ نیک و بد ہوتا
وہ دن روزِ جزا ہوتا
مگر
اس دن ہوا یہ
مرے پیچھے سے کچھ لوگوں نے آ کے
مرا اعمال نامہ چھین کے اس میں
وہ سارے جرم لکھ ڈالے
جو مجھ سے آج تک ہونے نہ پائے تھے!!

ظفر اقبال ظفر
۱۰/۱ - تحصیلدار - فتح پور ۲۱۲۶۰۱

کٹی جو رات تو آنکھوں میں میرے ڈر تھا وہی
تھکانے والا مرے سامنے سفر تھا وہی

چٹانیں ٹوٹ رہی تھیں غموں کی سر پہ مگر
مرے قریب تھا جو شخص بے خبر تھا وہی

وہ چہرہ ہو گیا روپوش جس سے رونق تھی
ہر ایک شے تھی وہی اور میرا گھر تھا وہی

زمانے بھر نے کیا تھا جسے نظر انداز
مری نگاہ میں اک شخص معتبر تھا وہی

تمام عمر جو مرکز رہا نگاہوں کا
ظفر بساطِ جہاں میں ادھر ادھر تھا وہی

پروفیسر ایم، اے حفیظ بنارسی
صدر شعبۂ انگریزی (پوسٹ گریجویٹ)
مہارا بر کالج، آرہ

غزل

(نذرِ غالب)

جفا پیشہ ہوئے ثابت طرف دارِ ستم نکلے
جنھیں ہم پھول سمجھے تھے وہ پتھر کے صنم نکلے

مدد کے واسطے آواز دیتا رہ گیا کوئی
نہ اپنے گھر سے تم نکلے نہ اپنے گھر سے ہم نکلے

ادب کے ساتھ ہم کو دیکھنے آتی ہے اک دنیا
نہایت محترم ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

وہی ہم ہیں وہی آرائشِ گیسوئے ہستی ہے
نہ اپنا حوصلہ نکلا نہ اس کے پیچ و خم نکلے

حفیظ اہلِ زمانہ نے جنھیں دیکھا حقارت سے
وہی ٹوٹے ہوئے ساغر جواب جامِ جم نکلے

خالد عبادی
روزنامہ مشرقی آواز۔ نقوی مارکیٹ
دودھ پور۔ علی گڑھ

راستے اداس ہیں

اُداس ہیں یہ راستے
تو کس لیے
اُداس ہیں
نہ جانتا ہوں میں
نہ تم
کہ دونوں ہی ہیں بے خبر
کہ دونوں ہی
ہیں بے سفر
کہ دونوں ہی ہیں کھو میں گم
یہ راستے
اداس ہیں تو اس لیے
اداس ہیں

بلقیس ظفیر الحسن
۴۳ رشاستری اپارٹمنٹ بلڈنگ نمبر ۲
مولی دینا روڈ، پونا

محاصروں کا شہر

محاصروں کا شہر ہے۔ کوئی نکل نہ پائے گا
سب اپنی اپنی دہشتیں لپیٹ کر پڑے رہو
پڑے رہو، کہ راستوں گشت کر رہی ہیں ہر طرف
سٹین گنیں

گلی گلی ہیں دھند دھند خوف پُر فشاں
لہو کی بو ۔۔۔ ٹپک رہی ہے قطرہ قطرہ
منجمد سرد مردہ جسم ۔۔۔ گرد اور غبار کی تہوں تلے
پگھل رہے ہیں، گھل رہے ہیں
اپنے اپنے تہ کدوں میں سب چھپے رہو
زباں پہ آئے بھی کوئی جو آہ ۔۔۔ چُپ
جو دیکھتی ہے دیکھتی رہے مگر نگاہ ۔۔۔ چُپ
گھٹے جو دم تو گھٹ بھی جائے ہو ہر ایک سانس چُپ
ہوش چُپ ۔۔۔ حواس چُپ!
نہ روزنوں سے بھی کوئی صدا کرن نکلنے پائے

جان لو!
راستوں پہ گشت کر رہی ہیں ہر طرف ۔۔۔ سٹین گنیں
انگنت مہیب خونخوار جانور۔ بپھر بپھر کے تھوتھنی رگڑ رگڑ کے
آہٹیں کریدتے گزر رہے ہیں

شش ۔۔۔ چپ رہو!
جو جسم و جاں عزیز ہے ۔۔۔ اگر اماں عزیز ہے
نہ کچھ کہو
جو ایک حرف بھی نکل گیا زباں سے۔ تو زندگی پہ حرف آئے گا
محاصروں کا شہر ہے۔ کوئی نکل نہ پائے گا

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی
پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری
اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف
اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمّے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/=

زندگی کی طرف — شمیم حنفی
شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ، اُردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

گول مال — شفیقہ فرحت
"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۱۸/=

فی الفور — یوسف ناظم
طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۳۰/=

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظامی
مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۸/=

مالک رام - ایک مطالعہ — مرتبہ علی جواد زیدی
ماہرِ غالبیات جناب مالک رام کے علمی اور تحقیقی کارناموں پر ہند و پاک کے ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا اہم مجموعہ۔ ۵۰/=

چراغ اور کنول (شعری مجموعہ) — اختر حمید خاں
"چراغ اور کنول" اختر حمید خاں کی غزلوں میں بیسویں صدی عیسوی کا ریاض ہے۔ پندرھویں صدی ہجری کا عرفان ہے۔ یہی قلب کا چراغ اور زندگی کا کنول ہے۔ ۴۵/=

د عباس نیتر
[illegible] ضلع جھنگ
(پاکستان)

مصاحبہ: ڈاکٹر وزیر آغا

باس نیتر: "پاکستان ٹائمز" لاہور کے ایک تبصرے کے مطابق آپ ایک GENUINE POET ہیں، یعنی شاعری آپ کو اظہار ذات میں سب سے زیادہ مدد دیتی ہے۔ جب کہ آپ نے بڑا، غالباً وقیع تر کام نثر میں کیا ہے۔ اس سوال کے تناظر میں آپ نثر سے اپنے تعلق پر روشنی ڈالیے۔

وزیر آغا:- بلاشبہ میں نے لکھنے کا آغاز تو شاعری سے کیا اپنے اصل نام سے نہیں ایک اور نام سے[1] لیکن جب مولانا صلاح الدین احمد سے ملاقات ہوئی تو ان دنوں نیا نیا نفسیات کا موضوع ادب میں مقبول ہوا تھا۔ مولانا چاہتے تھے کہ میں نفسیات کے موضوع پر مقالات لکھوں، لیکن میرا اپنا رجحان فلسفہ اور تصوف کی طرف تھا۔ چنانچہ میرے ابتدائی مضامین فلسفیانہ موضوعات پر ہیں۔ تاہم ایک آدھ مضمون میں نے نفسیاتی موضوع پر بھی لکھا۔ مثلاً "محبت کا تدریجی ارتقا" اس میں نفسیاتی نقطۂ نظر کو بروئے کار لایا گیا تھا۔ اگرچہ مولانا نے "بزم ادب" میں اس کی تعریف تو بہت کی مگر میں نے اسے اپنے کسی مجموعۂ مضامین میں شامل نہیں کیا۔ میری نثر کا آغاز مسرت کے موضوع پر مضامین لکھنے سے ہوا۔ مسرت کا موضوع مجھے اس لیے عزیز تھا کہ میں مسرت کا ہمہ پہلو اور ہمہ جہت علم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ فلسفے میں اس سلسلے میں جو پیش رفت ہوئی تھی، تصوف میں اسے جو اہمیت ملی تھی اور ادب اور پھر عام زندگی میں مسرت کو جس طرح مقصود نظر گردانا گیا تھا۔ اس سب کے پیش نظر میں اس کی ماہیت کو سمجھنا چاہتا تھا۔ ان مضامین کو میں نے اپنی کتاب "مسرت کی تلاش" میں یکجا کیا۔ یہ کتاب دو بار چھپی۔ اس کے بعد نہیں چھپی۔ میری اور بہت سی کتابیں آ گئیں۔ لہٰذا اس کی باری ہی نہیں آ سکی۔ میں سمجھتا ہوں یہ میری ایک بنیادی کتاب ہے۔ کبھی جب اس کتاب کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے نظام فکر کے بنیادی رجحانات اس میں نظر آ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ طبیعات اور

---

[1] نصرت آرا، نصرت کے نام سے۔ یہ نام آپ نے شاعری میں اختیار کیا۔ نثر میں لکھنے کا آغاز بھی نصیر آغا کے فرضی نام سے کیا۔

فلکیات سے میری دلچسپی بھی اس میں تلاش کی جاسکتی ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ میرا زیادہ کام
میں ہوا ہے۔ وہ تو ٹھیک ہے مگر شاعری میں بھی خاصا کام ہوا ہے۔ اب تک میرے سا
شعری مجموعے آ چکے ہیں، اب میں انھیں ایک جلد میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اندازہ ہے
کوئی آٹھ سو صفحات ہو جائیں گے۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ میرا اصل کام شاعری
ہے لیکن چونکہ میں نے جو کچھ نثر میں لکھا وہ متنازع فیہ بنتا رہا اور میں پورے اد
ماحول سے متصادم رہا، اس لیے میری نثر نسبتاً زیادہ زیر بحث آئی، اس کی حمایت
ہوئی اور مخالفت بھی۔ مگر تصادم کی اس فضا میں میری شاعری کی طرف نسبتاً کم توجہ
ہوئی۔ لیکن شعر کہنا میرے لیے دکھاوے کا مسئلہ نہیں تھا۔ میں عادتاً بھی شعر نہیں کہتا
شاعری میری روح کی طلب ہے۔ میں نے کئی جگہ لکھا ہے کہ میرے اندر کی تعمیر و تشکیل
اور شکست و ریخت کو پورے طور پر شاعری میں ہی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شاعری
جو کتھارسس اور تزکیۂ باطن ملتا ہے وہ میری نفسیاتی اور ذہنی صحت کے لیے بہت
ضروری ہے، اس لیے میں التزام کے ساتھ شعر کہتا چلا گیا ہوں۔ اگر مجھ سے میرے
ادبی کام کے بارے میں پوچھا جائے تو کہوں گا کہ میں اپنے ادبی کام میں اوّل مقام شاعری
کو، دوسرا درجہ انشائیے کو اور تیسرا درجہ تنقید کو دیتا ہوں مگر عام تاثر اس کے اُلٹ
ہے۔

ناصر عباس نیّر: ڈاکٹر صاحب! شعری اور نثری مواد میں ماہیت اور نوعیت کے اعتبار سے کوئی
ہے اور اگر ہے تو کیا؟

ڈاکٹر وزیر آغا: فرق بہت زیادہ ہے جو فرق زمان TIME اور مکان SPACE میں ہے
فرق آپ کو شاعری اور نثر میں نظر آئے گا۔ انگریزی میں جسے Syntagmatic
کہتے ہیں یعنی چیزوں کو جوڑنا اور ایک طرح کی SPACE قائم کرنا، یہ نثر کا رویّہ ہے۔ نثر
الفاظ کو گرامر کے قاعدوں کلیوں کے مطابق جوڑا جاتا ہے۔ گویا ایک سیدھی لائن
چلنا پڑتا ہے، لیکن شاعری میں وہ رویّہ نظر آتا ہے جسے انگریزی میں ADIGMATIC
رویّہ کہا گیا ہے۔ اس میں آپ عمودی انداز میں زماں کے اندر جاتے ہیں۔ سیدھ
کو چھوڑ کر قوسین بناتے ہیں اور مماثلت یا تضاد کو دریافت کرتے ہیں۔ تشبیہ
استعارہ اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ عارض کی مثال لیجیے۔ عارض کی رنگت، ملا
اور لمس کو بیان کرنے کے لیے نثر سادہ بیانیہ اختیار کرے گی۔ جب کہ شاعری ا
متوازی ایک ایسی کیفیت تلاش کرے گی، جس میں آپ کا تجربہ شامل ہو گا۔
عارض کو بیان کرنے کے بجائے اسے مثلاً پھول سے مشابہ قرار دے گا۔ اب پھول کی
ملائمت اور خوشبو اس کے تجربے میں ہے جب اس نے عارض کو پھول کہا تو اس نے ایک
بھری۔ اسے عمودی پرواز بھی کہہ سکتے ہیں جب کہ نثر میں افقی پھیلاؤ ہوتا ہے۔ شا
میں نثر کا سیدھا بیانیہ اصولی اور منطقی رویّہ برقرار نہیں رہتا۔ چنانچہ اسی لیے تو وا

نے کہا تھا کہ شاعری میں عام زبان خودکشی کی مرتکب ہوتی ہے۔ دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ شاعری کی بنیاد آہنگ (RHYTHM) ہے۔ یہ شعری آہنگ نہ صرف شاعری کے اندر ہوتا ہے بلکہ آپ اس آہنگ کی وجہ سے بھی شعر کہتے ہیں۔ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ میں ارادے اور کوشش سے شعر نہیں کہہ سکتا۔ میں شعر اس وقت کہتا ہوں جب میرا پورا وجود ایک طرح کے ملکوتی آہنگ کی گرفت میں آجاتا ہے۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ آہنگ آتا کہاں سے ہے جس طرح ہوا کا جھونکا آپ کو مس کرتا ہے اسی طرح آہنگ آپ کو مس کرتا ہے جس کے نتیجے میں آپ کے اندر تھرکنے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ تھرکنے کی یہ کیفیت صرف الفاظ میں ہی نہیں بلکہ تصورات میں بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ سیدھا چلنے کی بجائے جست بھر کر چلتے ہیں۔ جس طرح ہرن چوکڑیاں بھر کر چلتا ہے شاعری میں سیدھی سڑک پر چلنے کا انداز نہیں ہوتا۔ شاعر تو ایک پُر اسرار سی تال پر تھرک اٹھتا ہے، گویا احساس کی سطح پر رقص کرنے لگتا ہے۔ رقص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ جسم کی شاعری ہے، جسم جب تھرکتا ہے تو وہ نظم کہہ رہا ہوتا ہے۔ نثر میں سیدھے چلنے کا انداز ہے اور جہاں کہیں نثر میں تھرکنے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ اس شعری مواد کی وجہ سے ہے جسے نثر بروئے کار لاتی ہے۔ نثری نظم لکھنے والوں سے میرا اختلاف اسی بنیاد پر ہے وہ نثری نظم کو شاعری سمجھتے ہیں۔ میرا موقف یہ ہے کہ اس میں شعری مواد تو موجود ہے مگر آہنگ نہیں جو شاعری میں اساسی حیثیت رکھتا ہے، شعری مواد تو افسانے، انشائیے اور تنقید میں بھی داخل ہو سکتا ہے۔ شعری مواد کو جو چیز شاعری بناتی ہے وہ آہنگ ہے، اگر یہ آہنگ موجود نہیں تو شعری مواد نثر ہی رہے گا۔

ناصر عباس نیر: ڈاکٹر صاحب! کہا گیا ہے کہ نثر میں بھی ایک داخلی آہنگ ہوتا ہے؟

ڈاکٹر وزیر آغا: بالکل ہوتا ہے مگر یہ نثری آہنگ ہے۔ شعری آہنگ نہیں۔ ویسے تو تمام کائنات میں آہنگ موجود ہے۔ ہماری گفتگو میں بھی ایک آہنگ ہے۔ آپ جب نپے تلے قدموں سے چلتے ہیں تو یہ چلنا نثر کے آہنگ میں ہوتا ہے مگر جب آپ رقص کرتے ہوئے، تھرکتے ہوئے قوسین بناتے ہوئے چلتے ہیں تو یہ شاعری کا انداز ہے۔ میں سمجھتا ہوں سارے کا سارا فن ایک قسم کا رقص ہے۔ موسیقی میں دیکھیں کہ اس میں سر چکر سا لگا کر دوبارہ وہیں آجاتے ہیں۔ جہاں سے وہ چلے تھے وہی قوسوں کا سا انداز! اسی طرح جسمانی اور افلاطونی (PLATONIC) محبت کے فرق پر غور کریں۔ جسمانی محبت میں محبوب کا حصول اہم ہوتا ہے جب کہ Platonic محبت محبوب کے گرد پروانہ وار گھومنے کا نام ہے۔ تمام فنون ایک مرکزی نقطے کے گرد گردش کرتے ہیں۔ اس سے جذب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ایک بہت لطیف نکتہ آپ کو بتاتا ہوں، مولانا روم کے رقاص دائرے میں گھومتے ہوئے جذب کی کیفیت میں ڈوب جاتے تھے۔ مذاہب میں دائرے میں گھومنے کی یہ کیفیت طواف کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ طواف دراصل روحانی جذب کے لیے راستا ہموار کرتا ہے۔ دائروں اور قوسوں میں گھومنے کا انداز

شاعری کا ہے اور مستقیم انداز میں چلنا نثر کا ہے جو فرق قوس اور لکیر میں ہے وہی نظم اور نثر میں ہے۔

ناصر عباس نیّر: کیا شعر اور نثر اظہار کے دو مختلف پیرائے ہیں یا وہ کاوشیں ہیں جو فنکار موجود کا ناموجود سے تعلق قائم کرنے کے سلسلے میں کرتا ہے؟

ڈاکٹر وزیر آغا:۔ اظہار کے دو مختلف پیرائے تو ہیں اور دونوں میں آپ خود کو منکشف کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ تاہم انکشافِ ذات کی کئی سطحیں اور تہیں ہیں۔ شاعری میں ذات کی لطیف ترین اور گہری سطحوں کا انکشاف ہوتا ہے اور نثر میں بالائی سطحوں کا۔ اس کے آگے نثر کے پر جل اٹھتے ہیں۔ آگے تو وہی جا سکتا ہے جو دیوانہ ہو۔ شاعری میں دیوانگی کی ایک کیفیت ہوتی ہے۔ تاہم ان دونوں میں کوئی جھگڑا یا تضاد نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میں نے ایک مثال "تصورات عشق و خرد۔ اقبال کی نظر میں" کے شروع میں دی ہے مولانا روم کے چند اشعار کے حوالے سے۔ کچھ دیر تک آپ ہرن کے نقوشِ پا پر چلتے ہیں، یہ نثر کا انداز ہے، پھر نافۂ آہو کی خوشبو آپ کی رہبر بن جاتی ہے۔ یہ نظم کا انداز ہے۔[1]

ناصر عباس نیّر:۔ کیا تخلیق کار کبھی کسی ایسی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے جس کا اظہار نظم و نثر دونوں میں نہ ہو سکے؟

ڈاکٹر وزیر آغا:۔ یقیناً۔ کیونکہ ادبی تخلیق میں لفظ کو بطور میڈیم استعمال کرنا ہوتا ہے جو سُر کے مقابلے میں کمزور اور ناقابلِ اعتبار وسیلہ ہے۔ موسیقی نسبتاً آسانی سے اس لطیف کیفیت کا اظہار کر سکتی ہے جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ لفظ گیلی مٹی کی طرح ہے جسے شاعر اپنے تصورات اور احساسات کے اظہار کے لیے نئی نئی صورتوں میں ڈھالتا ہے دوسری طرف سُر وہ STRINGS, ہیں جن پر محسوسات VIBRATIONS کی طرح سفر کرتے ہیں۔

ناصر عباس نیّر:۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے آپ کو فلسفی مزاج نقاد قرار دیا ہے۔ خود آپ نے اپنی تخلیقات کا بعض جگہوں پر تجزیہ کیا ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ آپ کی تخلیقی توانائی کا مؤثر اظہار کس صنف میں ہوا ہے؟

ڈاکٹر وزیر آغا:۔ میں سمجھتا ہوں مؤثر ترین اظہار تو شاعری میں ہوا ہے اور بعض لوگ واقعتاً نثر کے مقابلے میں میری شاعری کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ تعداد میں کم ہیں۔

ناصر عباس نیّر: ڈاکٹر صاحب اسلوب اور شخصیت کے تعلق پر روشنی ڈالیے؟

ڈاکٹر وزیر آغا: شخصیت کا معاملہ یہ ہے کہ یہ خود بخود بنتی ہے۔ شخصیت SPONTANEOUS ہے۔ زندگی کے تضادات کی چھوٹ پڑنے سے شخصیت برگ و بار لاتی ہے۔ اور شخصیت

---

[1] آغا صاحب نے اس تمثیل کا حوالہ دے کر ایک نہایت اہم نکتے کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اقبال نے رومی کے ان اشعار کی توضیح میں لکھا ہے کہ نشاناتِ پا کا سفر عقل کی راہنمائی ہے اور نافۂ آہو وجدان کی رہبری ہے (دیکھو "تصورات عشق و خرد") ہربرٹ ریڈ نے نثر کو تعمیری یعنی عقلی و تحلیلی سرگرمی قرار دیا ہے اور شاعری کو تخلیقی، وجدانی اور جذباتی سرگرمی کا نام دیا ہے۔ (ن۔ع۔ن)

میں ارتقا کے کئی مدارج ہوتے ہیں۔ بالخصوص دکھ میں سے گزر کر شخصیت تپ کر کندن ہوتی ہے۔ یہی حال اسلوب کا ہے کہ اس میں بھی Organic Growth. ہوتی ہے۔ یہ آہستہ آہستہ پروان چڑھتا ہے۔ مثال کے طور پر جوانی میں جب لہو میں تندی ہوتی ہے اور جذبات کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں اسلوب میں بھی جذباتیت اور تحرک در آتا ہے لیکن جیسے جیسے انسان عمر کی منازل طے کرتا ہے اس کی شخصیت میں بھی ٹھہراؤ آ جاتا ہے۔ یہی ٹھہراؤ اس کے اسلوب پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ لفظوں میں جو جذباتی خروش تھا وہ کم ہو جاتا ہے۔ جذبات سے مملو لہجے میں انسان فالتو لفظ فراوانی سے استعمال کرتا ہے مگر جیسے جیسے شخصیت مائل بہ ارتقا ہوتی ہے (میں GROWTH کی بات کر رہا ہوں بعض لوگوں کے ہاں GROWTH ہوتی ہی نہیں میں نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جن کا آج بھی وہی اسلوب ہے جو تیس برس پہلے تھا) جب انسان عمر میں بڑا ہوتا ہے تو قدرتی طور پر جذباتی فشار کم ہو جاتا ہے لہذا لفظوں کے استعمال میں بھی کفایت پیدا ہو جاتی ہے۔ نوجوان آرائش پسند اور خودنما ہوتا ہے مگر بعدازاں وہ ایسا نہیں رہتا۔ عمر کے مراحل طے کرتے ہوئے اس کی روح میں بھی ایک چمک اور اُجالا سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اسلوب میں عمر کے ساتھ ساتھ GROWTH آ جاتی ہے ــ میرے والد کہا کرتے تھے کہ تصوف کے انتہائی مراحل میں آدمی بچے کی سی زبان میں گفتگو کرنے لگتا ہے۔ اسلوب کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ سادہ اور پُرکار ہوتا ہے اس سے مراد روکھی پھیکی SIMPLICITY نہیں جو صحافتی یا سائنسی اسلوب میں نظر آتی ہے، اسلوب سادہ مگر پُراثر اس وقت ہوگا جب اس میں ادبیت کی چاشنی شامل ہوگی۔

ناصر عباس نیّر: تنقیدی مقالات، افسانہ، ناول، ڈراما، خاکہ اور انشائیہ میں سے کون سی صنف باوقار اور شگفتہ نثر پیش کر رہی ہے؟

ڈاکٹر وزیر آغا: مغربی ادبیات میں طالب علموں کو زبان سکھانے کے لیے LIGHT ESSAY پڑھائے جاتے ہیں۔ انشائیہ کسی زبان میں اس وقت نمودار ہوتا ہے جب زبان کی اظہار اور ترسیل پر قدرت بہت بڑھ جاتی ہے۔ انشائیے میں انتہائی لطیف خیالات پیش ہوتے ہیں مگر انشائیہ لفظ "انشا" سے نکلا ہے لہذا انشا کو انشائیے کا سب سے بڑا وصف قرار دینا ہوگا ــ افسانہ میں کہانی کے ذریعے قاری کو گرفت میں لیا جاتا ہے۔ شاعری میں پر آہنگ شعریت کے ذریعے لیکن سیدھی سادی نثر کو جو کہانی یا شعریت کو مقصود بالذات قرار نہیں دیتی ادبی سطح پر لانا کتنا مشکل کام ہے، یہ انشائیہ کا کمال ہے کہ وہ سیدھی سادی نثر کو اتنی شاداب اور زرخیز بنا دیتا ہے کہ قاری اس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ نثر کو ادب کے بہت اعلا مقام پر پہنچانا انشائیے کا کام ہے۔ انشائیہ وہ واحد صنف ہے جس میں آپ کہانی یا شعر پر تمام و کمال انحصار کرنے کے بجائے نکتہ آفرینی سے کام لے کر نثر کو ادب کی سطح پر لاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ

انشائیے میں کہانی یا شعریت کی نفی ہو جاتی ہے مگر یہ چیزیں مقصود بالذات نہیں رہتیں۔ فقط نکتہ آفرینی کے عمل میں ممد ثابت ہوتی ہیں۔ لہٰذا میں تو کہوں گا کہ انشائیہ ہی سب سے زیادہ باوقار اور شگفتہ بیلنس کر رہی ہے۔

ناصر عباس نیّر: ڈاکٹر صاحب! اردو نثر کے رجحانات کے بارے میں کچھ فرمائیے۔

ڈاکٹر وزیر آغا: اردو نثر کا ایک رجحان تو آرائشی رہا ہے، جو داستانوں سے آیا' داستان گو کوراتے بھر اپنے سامعین کو اپنی مٹھی میں رکھنا ہوتا تھا، لہٰذا وہ بات مزے لے لے کر بیان کرتا تھا۔ وہی میرانیس والی بات کہ ایک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں، مگر اب ہمارا رویّہ اس کے برعکس ہے اب ہم ایک پھول کے مضمون میں سو طرح کے معانی دریافت کرتے ہیں۔" دوسرا رجحان ترقی پسندوں کے سائنسی اسلوب میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، تیسرا رجحان وہ ہے جس میں ان دونوں کا امتزاج ہے' اسے متوازن اسلوب کہنا چاہیے۔ میری نظر میں اردو نثر کے یہی تین غالب رجحانات ہیں۔

ناصر عباس نیّر: ڈاکٹر صاحب اسلوب کی تشکیل میں ادیب کی ارادی کاوش کو کتنا دخل ہوتا ہے؟

ڈاکٹر وزیر آغا: جس طرح شخصیت کی تشکیل میں انسان کا ارادہ نسبتاً کم شامل ہوتا ہے، اسلوب کی تشکیل کے عمل میں بھی ایسے ہی ہوتا ہے۔ تاہم چند تربیتی مراحل سے انکار ممکن نہیں شعر کی تخلیق کے سلسلے میں ایک مروّج خیال تو یہ ہے کہ آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں! دوسری طرف ایمرسن کا قول ہے کہ تخلیق میں ایک فیصد INSPIRATION اور ننانوے فیصد PERSPIRATION ہوتی ہے۔ PERSPERATION کا تعلق شعور کے ساتھ ہے۔ میرے خیال میں تخلیق نہ تو مکمل طور پر لاشعور کی تخلیق ہے اور نہ محض شعور کی بلکہ وہ تو جھٹپٹے کے عالم میں وجود میں آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسلوب میں آپ کی ارادی کاوش کو بھی ایک حد تک دخل ہوتا ہے مگر اس کا غالب حصّہ INSPIRATION ہی سے منتشر ہوتا ہے۔

ناصر عباس نیّر: کیا اسلوب بھی اظہارِ ذات کو مکمل صورت دینے میں کوئی مدد کرتا ہے؟

ڈاکٹر وزیر آغا: اسلوب آپ کا دستخط ہے۔ آپ کی دو شخصیتیں ہیں۔ ایک ظاہری جس کا تعلق معاشرے کے ساتھ ہے۔ دوسری داخلی شخصیت ہے، جس کا ایک اپنا منفرد لہجہ' ایک اپنی آواز ہے۔ جب کوئی ادیب لکھتا ہے تو لازم ہے کہ اس کا یہ داخلی لہجہ لفظوں میں منتقل ہو کر اس کے اسلوب میں بھی انفرادیت پیدا کرنے کا باعث بنے۔

ناصر عباس نیّر: اگر اسلوب اظہارِ ذات کی ایک صورت ہے اور آپ تخلیقی عمل کو ایک بے ارادہ کارروائی قرار دیتے ہیں تو کیا اسلوب کے اجزائے ترکیبی بھی اسی طرح "نامعلوم" سے برآمد ہوتے ہیں جہاں سے تخلیق کار کی تخلیقات کا مواد آتا ہے؟

ڈاکٹر وزیر آغا: علامہ اقبال نے یہ نکتہ سامنے لانے کی کوشش کی تھی کہ لفظ اور خیال بیک وقت وارد ہوتے ہیں۔ ایک رویہ یہ بھی ہے کہ ذہن میں خیال پہلے آتا ہے پھر اسے لفظوں کا لباس

پہنایا جاتا ہے۔ FORM اور CONTENT کی یہ بحث بہت پرانی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اقبال کا نظریہ بالکل صحیح ہے کہ خیال اور لفظ بیک وقت آتے ہیں۔ ان کا آپس میں تعلق، روح اور جسم کا سا ہے، لباس اور بدن کا سا نہیں۔ جب آپ کی ذات کی لطیف ترین کروٹیں اپنا اظہار چاہتی ہیں تو لفظوں کی صورت میں ڈھلے بغیر ایسا کرنا ممکن نہیں۔ یہ میں ادب کی بات کر رہا ہوں مگر لفظ کوئی چھاگل نہیں ہے جس میں ذات اپنا معنی انڈیل دیتی ہے بلکہ لفظ کے ذریعے وہ خود کو پہچانتی ہے۔ لفظ میں ڈھلنے سے پہلے ادیب کی اپنی ذات ایک پگھلی ہوتی شے تھی، لفظ میں ڈھلنے پر ہی اس کی معنیاتی سطح ابھر کر سامنے آئی۔ لہٰذا الفاظ خیال کی پہچان ہیں۔ خیال تو روح کی طرح لطیف ہے۔ اسے بدن ملے گا تو اس کی شناخت ہوگی ورنہ نہیں۔ خیال کو سُر، رنگ، سنگ یا لفظ۔ یہ سب ایک وجود مہیا کرتے ہیں۔ حد یہ کہ تخلیق کار کا کسی شے کو CONCEIVE کرنا بجائے خود خیال اور لفظ کے باہمی ارتباط ہی سے عبارت ہے۔

عباس نیر: ڈاکٹر صاحب! آپ کے اسلوب میں تمثیلی انداز کی کارفرمائی بھی ملتی ہے۔ تنقید میں تمثیلی انداز بالعموم مسائل پیدا کرتا ہے کہ تنقید ایک تجزیاتی اور تشریحی عمل ہے اور منطقی طور پر صاف، سادہ پیرایۂ اظہار چاہتا ہے۔ آپ ان مسائل سے کیونکر عہدہ برآ ہوئے؟

وزیر آغا: دیکھیے دو باتیں ہیں ایک تو وہ اسلوب ہے جس میں قدم قدم پر استعارے، تشبیہیں اور تمثیلیں ملتی ہیں۔ اسے میں نے آرائشی اسلوب کہا ہے اور میں اس کے حق میں نہیں ہوں۔ کیونکہ تنقید میں تجزیاتی و تحلیلی انداز بہت اہم ہے۔ البتہ کہیں کہیں جہاں آپ نے بات کو پوری طرح خود سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا ہو تو تمثیل کا آ جانا بہت آسانی پیدا کرتا ہے۔ میں نے بہت سی گتھیاں تمثیل سے سلجھائی ہیں۔ مثلاً علامت کا مسئلہ تھا۔ علامت پورے طور پر میری گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر ایک تمثیل ذہن سے برآمد ہوئی۔ اور بات آئینہ ہو گئی۔ میں نے دو تین جگہوں پر اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ تمثیل کچھ یوں ہے کہ رات کا وقت ہے۔ ایک کھمبے پر بلب روشن ہے۔ آپ اگر اس کھمبے کی طرف بڑھتے ہیں تو آپ کا سایہ آپ کے پیچھے پیچھے آئے گا اور بتدریج قد میں چھوٹا ہوتا جائے گا۔ آپ جب کھمبے کے نیچے پہنچیں گے تو سایہ آپ کے قدموں میں غائب ہو جائے گا۔ اس کے بعد جب آپ آگے چلیں گے تو یہی سایہ آپ کے قدموں سے نکل کر اب آپ کے آگے آگے چلنے لگے گا اور بتدریج قد میں بڑا ہوتا جائے گا حتیٰ کہ رات کے دھندلکوں سے جا ٹکرائے گا۔ یہی حال علامت کا ہے جب تک معنی لفظ سے بندھا ایک غلام کی طرح پیچھے پیچھے چلتا رہا اس کی حیثیت نشان کی سی رہی پھر لفظ نامعلوم کی طرف بڑھنے لگا تو اس کا معنی دلیر ہو گیا اور لفظ کو عبور کر کے قد میں بڑا ہونے لگا۔ اس کے اندر امکانات پیدا ہو گئے۔ متعین معنی

کے ساتھ ان گنت نئے معانی ابھر آئے تاآنکہ وہ اس مقام پر آگیا جس کے آگے رات کی تاریکی تھی۔ علامت کی کارکردگی اس رات کی سرحد تک ہے۔ اس کے بعد وہ ختم ہو کر نشان میں ضم ہو جاتی ہے لہٰذا علامت اور نشان میں فرق ہے۔ علامات میں امکانات اور معانی کی فراوانی ہے جب کہ نشان محض ایک متعین معنی کا حامل ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھیں کہ ایک تمثیل نے کس آسانی کے ساتھ ساری بات سمجھا دی۔

ناصر عباس نیر: ڈاکٹر صاحب! آپ اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی سالوں میں مولانا صلاح الدین احمد کے قریب رہے۔ آپ کا یہ ادعا بھی سب کے سامنے ہے کہ آپ مولانا صلاح الدین احمد کے ادبی مشن کو آگے بڑھانے میں کوشاں ہیں۔ "اوراق" کی لوح پر "مولانا صلاح الدین کی یاد میں" کی تحریر اس کی تصدیق کرتی ہے، اس سب کے باوجود آپ کے اور مولانا کے اسلوب نگارش میں بیّن فرق موجود ہے، کیوں؟

ڈاکٹر وزیر آغا: میں نے جب لکھنا شروع کیا کہ مولانا صلاح الدین احمد کے اسلوب سے بہت متاثر ہوا۔ غالباً "مسرت کی تلاش" کا کوئی مضمون تھا۔ میں نے اس کا مسودہ مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا پڑھتے پڑھتے ایک دم خوش ہو گئے۔ اور کہنے لگے "آغا صاحب! آپ نے تو میرے اسلوب سے بہت زیادہ اثرات قبول کیے ہیں" لیکن ان الفاظ سے میرے اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی اور میں نے خود کہا کہ مولانا کے لیے تو یہ خوشی کا مقام ہے مگر میرے لیے رونے کا مقام ہے کہ میری انفرادیت تو کوئی نہ ہوئی نا! پھر میں نے شعوری طور پر مولانا کے مرصع اسلوب سے گریز کی روش اپنائی۔ میں نے اسلوب کی ادبیت کو تو برقرار رکھا اور جہاں ضرورت پڑی امیج اور تمثیل سے بھی کام لیا مگر تحلیلی اور تجزیاتی انداز کو اپنا کر اور کفایت لفظی سے کام لے کر لفظوں کے طوطے مینا بنانے کا رویّہ ترک کر دیا۔ یوں میرا اسلوب بتدریج مولانا سے مختلف ہو چلا گیا۔ ویسے میرا خیال ہے کہ میں شعوری طور پر ایسا نہ کرتا تو بھی یہ مآل کار مختلف ہو جاتا کیونکہ شخصیت سے اسلوب کا گہرا تعلق ہے۔ شخصیت جب اپنے اظہار میں کامیاب ہوتی ہے تو تحریر پر شخص مذکور کے دستخط ضرور ابھر آتے ہیں۔

ناصر عباس نیر: یہ سوال اوپر والے سوال کا تتمہ ہے، آپ اردو تنقید کے اس اسلوب کے بارے میں کچھ فرمائیں گے جس کا بیج قدیم تذکرہ نگاروں تقریظ نویسوں اور دیگر اردو نثر نگاروں نے بویا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اس کی نکھری ستھری صورت کو پیش کیا، مولانا صلاح الدین احمد نے اس اسلوب نگارش کو خاص سلیقے اور توازن سے ...

ڈاکٹر وزیر آغا: مولانا صلاح الدین احمد نے اس اسلوب میں بلاشبہ تازہ کاری سے کام لیتے ہوئے نفاست ... مگر میں نے جب اس مرصع اسلوب کا تجزیہ کیا تو مجھ پر عیاں ہوا کہ اس میں ذرا سی بے احتیاطی ہو جائے تو تصنع سے پیدا ہونے کا احتمال ہے ویسے مجھے لفظوں کا زیادہ استعمال پسند بھی نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بات کے اظہار و بیان میں ضرورت کے مطابق ہی الفاظ استعمال ہونے چاہئیں

ناصر عباس نیر: ڈاکٹر صاحب ایک عہد کے اسالیب فکر و احساس مختلف ہوتے ہیں اسی طرح اس عہد کی تخلیقات نگارشات کے اسالیب اپنی ایک خاص اور الگ پہچان رکھتے ہیں کیا اسالیب کی تبدیلی تہذیبی تبدیلیوں سے وابستہ ہے یا کوئی نابغہ GENIUS اسالیب کی تبدیلی کا محرک بنتا ہے کیونکہ آپ حیاتیات کے نظریات ارتقا میں سے ڈی وریز کے MUTATION والے نظریے سے اتفاق کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا: اچھا سوال ہے آپ کا۔ میں یہاں زمین پر ہوں خلا میں تو نہیں بیٹھا ہوا۔ ایک پورا ماحول میرے ارد گرد ہے اور مجھے پانچ حسیات ملی ہیں۔ یہ وہ پانچ دروازے ہیں جن سے میں پورے ماحول سے اثرات قبول کر رہا ہوں، سن رہا ہوں، دیکھ رہا ہوں، سونگھ رہا ہوں، مس کر رہا ہوں وغیرہ۔ ماحول کے اندر جو تبدیلیاں ہوں گی، ظاہر ہے میں ان سے اثرات قبول کروں گا۔ اب آپ دیکھیں کہ آج سے سو برس پہلے زندگی میں ٹھہراؤ تھا آوازیں کم تھیں اور ایک بات کو سو رنگ سے بیان کرنے کے لیے فرصت بھی تھی۔ اب تحرک زیادہ ہے، آوازیں بلند آہنگ ہوگئی ہیں۔ آپ کو یہ فرق پرانی اور نئی اردو فلموں میں نظر آسکتا ہے۔ نئی جنریشن جب پرانی فلموں کو دیکھتی ہے تو کہتی ہے TOO SLOW ! TOO SLOW ! اب زمانہ ایکشن فلموں کا ہے ویسے بھی ہوائی جہازوں، راکٹوں، بموں اور تیز رفتار گاڑیوں کی وجہ سے ہر طرف افراتفری مچی ہوئی ہے جیسے شہد کے چھتے کو چھیڑ دیا گیا ہو۔ یہ کیفیت پورے معاشرے کے اندر ہے۔ آج کے فرد نے آواز کی اس بلند آہنگی اور رفتار کی تیزی سے اثرات قبول کیے ہیں اور اسی حوالے سے جدید دور کے ادیب کے اسلوب میں تناؤ اور تیزی پیدا ہوگئی ہے۔ کبھی آپ کو مغربی فلموں کے اسکرپٹ پڑھنے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں بہت کم الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاں ابھی آغا حشریت موجود ہے۔ اداکار اسٹیج پر کھڑا ہو کر لوگوں کی طرف منہ کر کے لمبے لمبے مکالمے بولتا ہے۔ حالانکہ جب آپ بول رہے ہوتے ہیں تو گفتگو میں آپ کا پورا جسم شریک ہوتا ہے۔ آپ کی آنکھیں بول رہی ہوتی ہیں، ہاتھ بول رہے ہوتے ہیں۔ لفظ ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں۔ ضروری نہیں ہوتا کہ فقرہ مکمل بھی کیا جائے۔ مغربی ڈراموں میں یہ بات دیکھنے میں آتی کہ بہت تھوڑے مکالمے ہوتے ہیں اداکاری زیادہ ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ابھی پرانی روایت موجود ہے۔ تاہم اسلوب پر ماحول کا اثر پڑ رہا ہے اور اس میں کفایت لفظی اور تیزی کا احساس ہونے لگا ہے۔ سو ماحول کی تبدیلی افراد ہی نہیں پورے معاشرے کی اجتماعی روح کو متاثر کرتی ہے۔ اسی لیے ہر عہد کا اسلوب، سابقہ عہد کے اسلوب سے مختلف ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم، رتھیورک رومانویت اور علامت نگاری کی تحریک کا ذکر نہ کرتے۔ اس سب کے باوجود ادیب کی انفرادیت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ اپنے لہجے اور اپنے اسلوب میں بات کرے۔ وہ اپنے عہد کے اسلوب سے ہم رشتہ تو ہو مگر اپنی ذات کی انفرادیت سے دستکش نہ ہو۔ نابغہ

کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کے اسلوب سے ہم رشتہ تو ہوتا ہے مگر اپنی بے پناہ انفرادیت کے باعث ایک ایسا نیا لہجہ اختیار کرتا ہے جو آنے والے زمانے میں "مثالی" قرار پاتا ہے۔ اکثر اس کی تقلید بھی ہوتی ہے مگر یہ مقلدین کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوتا ہے۔ نابغہ کا اسلوب بیک وقت ایک حسین ترین بافت بھی ہے اور آنے والے زمانے کے راستے کا پتھر بھی۔ کیونکہ جب تک نیا زمانہ اسے عبور نہ کرے گا وہ اپنی انفرادیت کا اظہار نہیں کر پائے گا۔ یعنی اپنا لہجہ اور اسلوب پیدا نہیں کر سکے گا۔

کمپیوٹر کیا ہے؟

مصنف : حکیم نعیم الدین زبیری
سائز : ۲۲×۳۳/۱۶
صفحات : ۵۲
ناشر : مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
قیمت : آٹھ روپے

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں کثرت سے استعمال ہونے والی ایجادات میں سب سے مفید اور حیرت انگیز ایجاد کمپیوٹر ہے۔

طیارے، بحری جہاز، بڑے بڑے بجلی گھر، بینک، پریس، لائبریری، اسکول، کالج اور ہسپتال غرض کہ گھر سے لے کر ہر ادارے کے دفتر تک اور اسکول سے لے کر ہر قسم کے کارخانے تک کمپیوٹر ہر جگہ استعمال ہو سکتا ہے۔

کمپیوٹر کیا ہے؟ یہ کب ایجاد ہوا؟ کام کے لحاظ سے اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ یہ کس کس میدان میں استعمال ہو رہا ہے؟ یہ کس زبان میں اور کن ہدایات کے مطابق کام کرتا ہے؟ یہ سب باتیں آپ کو اس مختصر کتاب میں ملیں گی۔

کتاب "کمپیوٹر کیا ہے؟" نہایت آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ بچوں سے بڑوں تک سب کی معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔ جو نوجوان کمپیوٹر کو اپنا کیریر بنانا چاہتے ہیں ان کے لیے بہت مفید ہے۔ جو لوگ اپنے دفتر کی کارکردگی میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں یا کاروبار کو منظم کرنے کے لیے کمپیوٹر لینے کا منصوبہ بنا رہے ہیں وہ بھی اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ اتنی معلومات افزا کتاب ہے کہ ہر شخص خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت، اس کو پڑھ کر یقیناً اپنے علم میں اضافے کو محسوس کرے گا۔ اس میں درجن بھر سے زیادہ سیاہ و سفید تصویریں بھی شامل ہیں۔

—— احمد خاں خلیل

لمیل الترب
ی ۱۵۴- کریلی ہاؤسنگ اسکیم الٰہ آباد

گوشۂ جذبی پر ایک نظر

کتاب نما کے اکتوبر ۹۰ء کے شمارے میں گوشۂ معین احسن جذبی کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ جذبی انسی میں میرے اسکولی زمانے کے ساتھی ہیں اور میرے علم میں اس وقت ان کے اس زمانے کے دوستوں شناساؤں میں شاید میں تنہا بقید حیات ہوں۔ گوشۂ جذبی میں ان کے ایک شاگرد رشید را احمد جائسی نے اپنے مضمون کو طلسماتی انداز سے ختم کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ربی کو سمجھنے کے لیے جو کہ اب افسانہ بر فسوں یعنی LEGEND بن چکے ہیں۔ اسم اعظم کا نا ضروری ہے۔ میں یہ دعوا تو نہیں کر سکتا کہ اسم اعظم کی کلید میرے ہاتھ میں آگئی ہے مگر ے ایک ہمدم دیرینہ کی حیثیت سے یہ شعر پیش کرنے کا حق ضرور پہنچتا ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش — من انداز قدت را می شناسم

میں نے گوشے کے مشمولات کو بڑے اشتیاق سے پڑھنا شروع کیا مگر ختم اس ساس سے کیا کہ کیفیت و کمیت دونوں اعتبار سے گوشے کو اتنا بھرپور نہیں بنایا جا سکا جتنا اسے ہونا چاہیے تھا۔ یہ صحیح ہے کہ گوشہ بہر حال جزو کی حیثیت رکھتا ہے اس میں کل کی سعت نہیں آسکتی مگر اسے زیادہ جامع اور معلوماتی بنایا جا سکتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ جذبی ے چند قریبی شاگردوں نے یہ گوشہ مرتب کر کے حق شاگردی ادا کرنے کی سعادت تو ضرور حاصل ر لی مگر نقد و نظر کا پورا حق ادا نہیں کر سکے۔ علی گڑھ سے باہر نہ جا کر خود علی گڑھ میں جذبی کے داحوں اور نکتہ چینوں میں ایسے سنجیدہ، معتبر اور بلند پایہ سخن شناس موجود ہیں جن کے شحات قلم سے نہ صرف گوشہ کو زیادہ پر معنی و پر وقار بنایا جا سکتا تھا بلکہ اس کے معیار و افادیت یں بھی اضافہ ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے مرتبین نے اس سمت میں کوشش کی ہو مگر انھیں کامیابی ہ ملی ہو۔

امتیاز احمد نے اپنے مختصر اداریے میں گوشۂ جذبی کو جذبی شناسی کی طرف محض ایک معمولی قدم قرار دیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں "گدازِ شب" کی اشاعت کے بعد ایک بار پھر جذبی کے بھرپور مطالعے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ آج جب ترقی پسندی و ردِّ ترقی پسندی دونوں کا بازار سرد پڑ چکا ہے جذبی کا صحیح مقام متعین کیا جا سکتا ہے۔" امتیاز احمد کو یہ بھی احساس

ہے کہ اس وقت جذبی کے ادبی مقام کے تعین کی بات ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑی ہے۔ ہو سکتا
کسی ابنائی نقاد کے ذہن نے یہ سوال اٹھایا ہو مگر حقیقتاً ایسا کوئی سوال ہے نہیں۔ جذبی
کے ادبی مقام کا تعین تو "فروزاں" کی اشاعت کے بعد ہی ہو چکا تھا۔ سخن مختصر نے اس پر
مہر توثیق ثبت کردی۔ گداز شب تو فروزاں اور سخن مختصر کا مجموعہ ہے۔ اس کی اشاعت نے
ایسی کوئی بحث نہیں چھیڑی جس سے جذبی کے از سر نو مطالعہ کی ضرورت محسوس ہو۔

گوشۂ جذبی ان کے مختصر سوانحی خاکے کے علاوہ تین مندرجات اور تھوڑے سے منتخب کلام
پر مشتمل ہے۔ پہلا مضمون کبیر احمد جائسی کا ہے جسے حاصل گوشہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ اس مضمون
میں جذبی کی دل نواز شخصیت، کردار اور ان کے اوقات شب و روز کی جھلکیاں ایسے پرکیف
پر لطف اور شگفتہ انداز میں پیش کی گئی ہیں کہ نظروں کے سامنے ایک جیتا جاگتا دل نشیں
مرقع کھنچ جاتا ہے۔ سخن گسترانہ باتوں کا ذکر ایسے سلیقے سے کیا ہے کہ تحریر کی دلکشی میں
جان پڑ گئی ہے۔ جائسی نے اپنے زمانے کے اساتذہ کی درویش صفتی اور شانِ قلندری کا
بیان جس خشوع سے کیا ہے اس کے بارے میں راقم سطور کا (جو کہ جائسی سے تیس سال
علیگ ہے) یہ خیال ہے کہ اس میں حقیقت پسندی کو کم اور غلوے عقیدت کو زیادہ دخل ہے
جس نے مستثنیات پر مبنی جزوی صداقت کو عمومی صداقت بنا کر پیش کیا ہے۔ اگر ایسا نہ
ہوتا تو جذبی یہ کہتے ہوئے رجز خواں نہ ہوتے "ہر جور ناتواں کے مقابل رہے ہیں ہم" بہرحال
اس نازک بحث سے صرف نظر کرنا ہی بہتر ہے کہ یہ اپنے اپنے طرز دید کی بات ہے۔

جائسی کے مضمون کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے محاکمے سے گریز کرتے ہوئے
جذبی کی شاعری کا متوازن، مختصر مگر جامع جائزہ پیش کیا ہے۔ جائسی نے ایک جگہ جگر صاحب
کے ترنم کی اثر آفرینی کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں جذبی کے تعلق سے ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے
خالی نہ ہوگا۔ دوسری صدی کے نصف آخر میں جھانسی شعر و سخن کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا تھا۔
جگر صاحب بھوپال سے واپسی میں اکثر جھانسی میں مہینوں رک جاتے۔ ان کا قیام ہمیشہ میرے
بڑے بھائی عزیز الرب عاصی مرحوم کے ساتھ ہوتا۔ دن رات شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتیں۔ جگر
نے اپنی ایک مشہور غزل "کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا۔ ہمارے ہی کمرے میں فرش پر بیٹھے بیٹھے
ایک دن سہ پہر میں کہی تھی۔ جگر صاحب کی شہرت و مقبولیت اپنے کمالِ عروج پر تھی۔ اس عروج پر
پہنچنے میں ان کے کلام کے کیف وکم سے زیادہ دخل ان کے پڑھنے کے انداز کو تھا۔ سرمستی و سرشاری
کے عالم میں کیف و جذب میں ڈوب کر وہ جب اپنا کلام سناتے تو مسحور کن ترنم کی لے سید سلیمان ندوی
اور مولانا احسن مارہروی جیسے ثقہ اور سخن فہم بزرگوں کو اپنی رو میں بہالے جاتی۔ اسی زمانے کی
بات ہے۔ میں ایک دن سہ پہر میں جذبی سے ملنے کیلئے گیا۔ یہ اپنے مکان کے وسیع چبوترے کے ایک کونے
میں پڑے ہوئے چھپتر کے نیچے بیٹھے تھے۔ میں بھی پاس کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جذبی اس
وقت جگر کی ایک مشہور غزل کا یہ مصرع گنگنا رہے تھے "آئینہ سامنے ہے چتونیں ہیں۔ د
ھر وکی" اپنے بالوں کو ایک طرف جھٹکتے ہوئے مجھ سے بولے۔ "خلیل جی چاہتا ہے کہ اسی طرح

...ں کو جھٹک کر جھومتے ہوئے مشاعرے میں پڑھوں۔ دوسرے شاعروں کی طرح جذبی بھی صاحب
...ترنم کی دلکشی سے متاثر ضرور ہوئے مگر نہ تو انھوں نے جگر کی لے کی نقل کی اور نہ ان کے
...کلام کی۔ جذبی کی اپنی منفرد لے تھی جسے ان کی پُر درد آواز نے اثر انگیز بنا دیا تھا۔ اس کا کرشمہ
...م سطور نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

غالباً ۱۹۳۵ء کی بات ہے ہمارے گروپ کی کوشش سے جذبی یونین کے سالانہ مشاعرہ
...شرکت کے لیے پہلی بار علی گڑھ آئے۔ اس زمانے میں یونین کے سالانہ مشاعرے بڑے تب
...اب سے ہوتے تھے۔ بڑے بڑے اساتذۂ سخن یونین کے مشاعرے میں شرکت پر فخر محسوس
...تے تھے۔ اچھے اچھے کج کلاہوں کی ٹوپیاں اچھال دی جاتی تھیں۔ کسی نووارد شاعر کے لیے
...پنے ہوش وحواس گم کیے بغیر پوری غزل کو مشاعرے میں سنا لے جانا جوئے شیر لانے سے
...م نہ تھا۔ جس مشاعرے کا یہ ذکر ہے اس میں منجملہ دیگر اساتذہ کے ناطق گلاٹھوی اور جانشینِ
...اغ حضرت سائل دہلوی کی شرکت یاد ہے۔ جب نوجوان شاعر جذبی کا نام پکارا گیا۔ (اس
...قت وہ بی۔ اے کے طالب علم تھے) تو وہ اسٹینڈ کے پاس آئے اور مجمع پر پُر اعتماد نظر ڈالتے
...ہوئے اپنی غزل پڑھنا شروع کی جس کا مطلع ہے ؎

انتہائے غم میں مجھ کو مسکرانا آگیا   ہائے اخفائے محبت کا بہانا آگیا

ہر ہر شعر پر داد وتحسین کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اساتذہ بھی دادِ سخن دے رہے تھے۔ مقطع
تک پہنچتے پہنچتے ہر جانب سے مکرر مکرر کی صدائے گونجنے لگیں۔ تب جذبی نے اپنی وہ مشہور
غزل سنائی جو ان کی شاعری کی شناخت بن گئی ؎

مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں جینے کی تمنا کون کرے

جذبی نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ دوسرے دن یونی ورسٹی کیمپس میں ہر طرف جذبی کا چرچا تھا۔
اور ان کے اشعار سے ہوسٹلوں کی فضائیں گونج رہی تھیں۔ اسی غزل کو جعفر علی خاں اثر جیسے
شعر وادب کے نکتہ شناس اور ترقی پسند ادب کے سخت نکتہ چیں نے ترقی پسند ادب کا شاہکار
قرار دیا۔ علی گڑھ میں جذبی کی مقبولیت گویا قبولیت عام کی سند تھی۔

دوسرا مضمون محمد شمیم الزماں کا ہے۔ اس میں جذبی کی کتاب "حالی کا سیاسی شعور" کا
جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مضمون نگار اپنے مقصد میں کامیاب ہوا ہے۔ اس مضمون پر کسی تبصرے
کی ضرورت نہیں۔ درحقیقت جذبی کی یہ کتاب کوئی گرانمایہ تصنیف نہیں ہے۔ اس سے نہ تو
حالی کے مقام ومنصب میں کوئی فرق پڑا اور نہ اس دور کے سیاسی وسماجی مسائل سے متعلق
ہماری اجتماعی بصیرت میں کوئی اضافہ ہوا۔ اسی لیے اس کتاب کا کوئی قابلِ ذکر اثر نہیں ہوا جیسا
کہ عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کی کتابوں کا ہوا۔ بات یہ ہے کہ سر سید اور ان کے رفقا سبعہ
سیارہ کی مانند ہیں۔ سر سید کے تمام رفقا ان کی تابناک شخصیت کے گرد گردش کرتے تھے۔ یہ
سب جامع صفات کی ذات تھے۔ علم وفضل کے ساتھ ساتھ اپنی فکر ونظر کے اعتبار سے انفرادی
شخصیت کے مالک تھے۔ یہ سر سید کی ہاں میں ہاں ملانے والوں میں نہ تھے مگر ان سے ٹکراتے

بھی نہ تھے۔ یہی ان کی عظمت کا راز ہے۔ حالی سے زیادہ تو شبلی کو سرسید کے سیاسی خیالات سے اختلاف تھا۔ تاہم جذبی کی اس کاوش اور دیدہ ریزی کی داد ضرور دینی پڑے گی کہ انھوں نے قومی و ملی مسائل کے تناظر میں حالی کے منتشر سیاسی نظریات کو یک جا کر کے ان کی انفرادیت کے اس گوشہ کو فوکس میں لانے کی کامیاب کوشش کی جو پروفیسر خلیق احمد نظامی کے الفاظ میں حالی کی کسر نفسی اور سرسید سے گہری عقیدت کی وجہ سے نمایاں نہ ہو سکی۔

گوشۂ جذبی کا خاص مضمون امتیاز احمد کا ہے جس میں جذبی کی شاعرانہ قدر و قیمت کے مسئلہ سے بحث کی گئی ہے۔ مضمون کا طرز فکر خام ردہی کا مظہر ہے۔ ترقی پسند ادب کے تناظر میں مضمون میں کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی جو اس سے پہلے جذبی کے سلسلے میں نہ کہی گئی ہو۔ دوسرے ناقدین کے علاوہ یہ باتیں سرور صاحب نے فروزاں کے دیباچہ اور انور صدیقی نے "گداز شب" کے پیش گفتار میں زیادہ سنجیدہ اور بہتر انداز میں کہہ دی ہیں۔ اگر امتیاز احمد کو اسی موضوع پر بحث کرنا ہی تھا تو اپنی بحث کا نقطۂ آغاز سرور صاحب کے اس معنی خیز جملے کو بنانا کہ "فروزاں، جذبی کی شاعری کی منزل کو نہیں صرف ان کی سمت کو ظاہر کرتا ہے۔ فروزاں کے بعد کی شاعری میں اسالیبِ اظہار کی نئی جہتوں اور وسعتوں کی نشاندہی کرتے۔ مضامین کے تعلق سے فکر و نظر کے نئے گوشے تلاش کرتے۔ یہ دکھاتے کہ کیا اب جذبی نے اپنی منزل پالی ہے۔ اور یہ منزل اپنی اساس اور تعمیری اجزا میں فروزاں کی منزل سے کس طرح ممتاز و مختلف ہے۔ انور صدیقی نے پیش گفتار میں جذبی کی شاعری کا اچھا محاکمہ کیا ہے مگر وہ بھی اس بحث سے صرف نظر کر گئے۔

فروزاں کے بعد کی غزلوں میں انور صدیقی نے رویّہ کی جس تبدیلی اور ایک جہت کے اضافہ کا ذکر کیا ہے وہ جذبی کی شاعری کے لیے مختص نہیں ہے۔ اس دور کے سبھی قابل ذکر ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پر مایوسیوں کے سایے دیکھے جا سکتے ہیں کہیں ہلکے کہیں گہرے۔ علی سردار جعفری نے اس مایوسی کو شاعر کا حق بتایا ہے۔ انھیں شاعروں اور ادیبوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے مایوس کن حالات سے ہار نہیں مانی اور ایک خوش آیند مستقبل کی تعمیر میں فکر و عمل کی تمام صلاحیتوں کے ساتھ سرگرم ہیں بقول سردار جعفری ؎

عقیدے بجھ رہے ہیں شمع جاں گل ہوتی جاتی ہے
مگر ذوقِ جنوں کی شعلہ سامانی نہیں جاتی

جذبی شعلہ سامانی کے کبھی قائل نہیں رہے۔ جذبۂ عمل سے ہمیشہ دور رہے۔ وہ موج بلا کو ساحل سے طوفان کا نظارہ کرنے والوں کو دو چار تھپیڑے لگانے کا اشارہ تو ضرور کرتے ہیں مگر خود کو ان تھپیڑوں کی زد پر نہیں لاتے۔ مگر مایوسیوں سے بہت وہ بھی نہیں ہارے اور صبح کی آمد کا انھیں بھی یقین ہے ؎

ابھی سموم نے مانی کہاں نسیم سے ہار
ابھی تو معرکہ ہائے چمن کچھ اور بھی ہیں

زندگی ہے تو بہر حال بسر بھی ہوگی
شام آئی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہوگی

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ ذکر تھا امتیاز احمد کے مضمون کا۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے تن

میں اب جذبی کی شاعری کو معرض بحث میں لانا فرسودہ بات ہے۔ ایسے مباحث اب محض اکیڈمک حیثیت رکھتے ہیں اور ناقدین ادب کی موشگافیوں کے لیے موضوع فراہم کرتے ہیں۔ جذبی اور ان کے بعض ہم سفر شعرا کی نسبت یہ کہنا کہ یہ ترقی پسند ہوتے ہوئے غیر ترقی پسند ہیں اور غیر ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی ترقی پسند ہیں۔ محض قول متناقض (PARADOX) ہے جو سننے میں اچھا لگتا ہے مگر اس میں کوئی معنویت نہیں ہے۔ راقم سطور کے علم میں کسی معتبر نقاد نے جذبی کو ترقی پسندوں کے زمرے سے خارج نہیں کیا۔ جذبی کی ترقی پسندی پر اس بات سے کوئی حرف نہیں آتا کہ انھوں نے پر شور اور کف در دہاں شاعری سے احتراز کیا۔ ان کے شعری رویے میں نظریاتی سطح پر ترقی پسندی کے تمام عناصر موجود ہیں۔ انھوں نے اپنی افتاد طبع اور نظریۂ حیات کے مطابق ترقی پسند ادبی تحریک کے مثبت توانا اور پائندہ عناصر کو چن لیا۔ اُن کے کلام میں فرسودہ مزاجی روایات، جبر و استحصال اور اسٹیبلشمنٹ سے وابستہ غیر منصفانہ نظام زندگی کے خلاف احتجاج موجود ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے احتجاج کی لے مدھم ہے۔ اس میں شعلہ نوائی تو نہیں ہے مگر وہ دلسوزی اور درد مندی ضرور ہے جو شاعر کی وسیع انسان دوستی اور ایک روشن مستقبل کی آرزومندی کی نشان دہی کرتی ہے۔

تیسری دہائی سے لے کر پانچویں دہائی تک ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ یا اس کے زیر اثر جو شعرا اُبھرے اور منظر عام پر آئے ان میں جذبی نے اپنا ممتاز و منفرد مقام بنا لیا ہے خاص طور پر غزل گوئی کے میدان میں۔ معیار کا کوئی پیمانہ اپنایا جائے، جذبی کا شمار صف اول کے شعرا میں ہوگا اور شعری ادب کا کوئی انتخاب جذبی کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ نصف صدی سے کچھ اوپر کے ادبی شعر میں جذبی کا کلام وقت کی کسوٹی پر کھرا اترا ہے۔ اب رہا ان کے صف اول کے معاصرین میں درجہ بندی کا معاملہ۔ یہ خطرناک ادبی رویہ ہے اور ادبی تاریخ میں ہمیشہ بنائے فساد رہا ہے۔ بات ایسی ہے کہ دشت و چمن میں تو تفریق ممکن ہے مگر ایک بار احاطۂ چمن میں داخل ہو جانے کے بعد رنگ و بو یا قامت کی بنا پر ایک ذات کے پھولوں میں امتیاز برتنا دشوار بھی ہے اور نا روا بھی۔ یہاں اپنی ذاتی پسند یا ناپسندی کی بات آجاتی ہے۔ پروفیسر مولٹن جو تنقید کو سائنس کے زمرہ میں شمار کرنے کا زبردست حامی تھا، شکسپیر اور بن جانسن کے ڈراموں پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی اس لیے کہ ایک کی نوعیت دوسرے سے ایسی ہی جدا ہے جس طرح موتیا سے گلاب کی۔

امتیاز نے اپنے جذبۂ عقیدت میں غیر شعوری طور پر جذبی کے ساتھ ایک زیادتی بھی کی ہے۔ جذبی کے کلام میں کلاسیکی رجحان کی تلاش میں انھوں نے میر، غالب، سراج اور جوش کے چند اشعار لے کر جذبی کے اشعار سے ان کا تقابلی موازنہ کر کے مضامین کی مماثلت دکھائی ہے جو بین السطور جذبی کے فنی اظہار کی برتری دکھانے کی سعی نامشکور ہے۔ لفظیات کی سطح پر کلاسیکی اثرات دکھانے کے لیے رعایت لفظی اور صنعت تضاد کی چند مثالوں کے علاوہ حالی تغزل اور مرکبات لفظی کی فہرست دی ہے جن کا استعمال جذبی کے یہاں ہوا ہے۔ کلاسیکی عناصر کی

تلاش کا یہ انداز و طریقہ ناقص اور سطحی ہے۔ کلاسیکی رنگ کی شناخت کا یہ معیاری پیمانہ نہیں ہے۔
مضامین و خیالات میں مماثلت اردو شعرا کے کلام بالخصوص غزل میں عام بات ہے۔ امتیاز صرف پیرایہ
بیان کی ندرت میں ہے اور اگر فارسی کے مرکبات لفظی کی بات آگے بڑھائی جائے تو شاید روش صدیقی
سرفہرست رہیں گے۔ کلاسیکی شعریات کی امتیازی خصوصیت مضمون آفرینی اور خیال آفرینی
ہے۔ لفظوں اور بندشوں کی تراش خراش ضمنی چیز ہے۔ ترقی پسند شعرا کی ایک بڑی دین روایتی
الفاظ، علامات اور تشبیہات کا استعاراتی استعمال ہے جس نے ان کے معانی و مفاہیم میں نئی وسعت
پیدا کیں اور کلام میں عصری حسیت اور شعوری آگہی کو جلا بخشی۔ علی سردار جعفری نے جذبی۔
اس شعر کو ؎

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے		اس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے اس وقت یہ قطرہ موتی

الفاظ کے استعاراتی استعمال کی اچھی مثال بتائی ہے۔ ایسی مثالیں جذبی کے کلام میں بکھری
پڑی ہیں جس نظم کا یہ شعر ہے وہ حسن کے معنی کو وسعت دینے کی بھی عمدہ مثال ہے۔

ہم جب ترقی پسند ادب کی بات کرتے ہیں تو عموماً انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور اور
پریم چند کے خطبۂ صدارت کے اس معنی خیز جملے کو کہ "ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا" لے کر ایسے
مباحث چھیڑتے ہیں کہ موضوع سے متعلق ایک بدیہی حقیقت نظرانداز ہو جاتی ہے اور وہ حقیقت
یہ ہے کہ تاریخ عمرانیات کے ہر دور میں رجعت پسندی اور جمود کی قوتیں ترقی پذیری اور عمل و
حرکت کی قوتوں سے برسرپیکار رہی ہیں۔ پیکار کا یہ عمل خارجی حالات کے تابع ہوتا ہے۔ یہ عمل
کبھی سست رفتار ہوتا ہے اور کبھی ان میں تیزی آجاتی ہے۔ اوّل الذکر قوتیں زمانے کی
مروجہ قدروں اور روایتوں کو مضبوطی سے پکڑتی ہیں اور حال کو ماضی کے رشتوں سے جوڑنے
کا نام کرتی ہیں، جب کہ حرکت و عمل کی ترقی پذیر قوتیں زندگی کو مستقبل کی طرف بڑھاتی ہیں۔ اسی
جدلیاتی حقیقت کا نام زندگی ہے۔ ترقی پذیر عناصر کے سہارے زندگی آگے بڑھتی ہے۔ پیکار کا
یہ عمل تاریخ ادب میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ غالب کا یہ کہنا ؎

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے		یا کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

ادب میں ترقی پسند رویّہ کا غماز ہے۔

اس تناظر میں جب ہم اپنی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جاریہ
صدی کے دوسرے ربع میں ایسے سیاسی، اقتصادی اور سماجی عوامل پیدا ہو گئے تھے کہ حرکت
و عمل کی قوتوں کو منظم کر کے انھیں ایک آزاد، منصفانہ اور خوش آیند معاشرے کی تعمیر نو میں صف
بستہ کرنا وقت کا اہم ترین تقاضا تھا۔ ترقی پسند ادبی تحریک نے ان قوتوں کو توانائی بخشی اور ان کو
صحیح سمت اور مقصد سے آشنا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اپنی کمزوریوں، کوتاہیوں اور غلطیوں
کے باوجود اسی تحریک نے تخلیق ادب کے لیے نیا مطمح نظر، نیا احساس و شعور عطا کیا، فکر و نظر
کے نئے دریچے کھولے اور اسالیب اظہار کے نئے تجربات کا حوصلہ بخشا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد نئی
نسل کے جن شعرا نے اس ادبی فریضہ کو ادا کیا ان میں جذبی شامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن نے جذبی کے فن کو "ضبط و توازن کا آرٹ" بتایا ہے۔ اس آرٹ کی تکمیل اختصار و انتخاب کے عمل سے ہوتی ہے۔ جذبات و احساسات کے اظہار اور الفاظ و تراکیب کے ردّ و قبول میں وہ اختصار و انتخاب کے عمل سے کام لیتے ہیں۔ اس باب میں اصغر گونڈوی اور جذبی میں قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ جذبی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ وہ غزل کی فنی روایات کے رمز شناس ہیں۔ انھیں اپنے اشعار کو سنوارنے اور سجانے کا فن آتا ہے۔ انھوں نے اپنے بعض ہمعصروں کی طرح طویل نظمیں نہیں لکھیں۔ وہ لکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ ویسے انھوں نے چند بہت اچھی نظمیں کہی ہیں۔ موت، آزار اور نیا سورج ان کی اعلا پایے کی نظمیں ہیں مگر ان کی نظموں کی تزئین کاری میں غزل کی ساری تکنیک نمایاں ہے۔ جذبی کے فن کا کینوس محدود ہے۔ وہ مورل (MURAL) یا فریز نہیں بنا سکتے۔ وسیع کینوس پر طبع آزمائی کے لیے تاریخی بصیرت، مطالعہ و مشاہدہ کی وسعت اور رفعت تخیل درکار ہے۔ جذبی اپنے تجربات زندگی کے رنگوں کو تخیل و احساس جمال سے مزین کر کے موزوں ترین الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔ وہ ہلکے خطوط اور سبک و ہم آہنگ رنگوں کی آمیزش سے نقش گری کے ماہر ہیں۔ ان کی مثال ایسے فنکار کی سی ہے جو محدود دائرے میں دیکھتا ہے مگر صاف دیکھتا ہے۔ ایسا فنکار اس فنکار سے بہتر ہے جو چاروں طرف دور تک دیکھنے کی کوشش کرے مگر کچھ نہ دیکھ پائے۔

جذبی کو الفاظ کے انتخاب کا خاص سلیقہ ہے۔ شعری پیکر میں ان کے الفاظ آبدار موتیوں کی طرح لڑی میں پروئے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر دو شعر پیش ہیں ؎

شکستہ ساز چھیڑیں اپنی آنکھیں گل فشاں کرلیں　　وہ آئیں یا نہ آئیں ہم تو بزم آرائیاں کرلیں

پس نقاب بتادے گا یہ جبیں کا عرق　　ہمارا سوز نظر بار یاب ہے کہ نہیں

ان اشعار میں "گل فشاں" اور "بار یاب" کے الفاظ نے کیا بلاغت پیدا کر دی ہے۔

گوشۂ جذبی کا سب سے کمزور حصّہ "جذبی سے ایک ملاقات" ہے۔ امتیاز احمد نے بالکل غیر شعوری طور پر گفتگو کا آغاز غلط عنوان سے کیا۔ انھوں نے جذبی کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن کا یہ جملہ دہراتے ہوئے کہ "نکبت کے مدرسے میں غیرت و خودداری کا سبق سیکھا" جب جذبی سے اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ کہنے کی فرمائش کی تو جذبی کی انا کو ٹھیس لگی۔ انھوں نے نکبت و افلاس کے مفروضے کو قطعی طور پر مسترد کرتے ہوئے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ ان کا تعلق ایک معزز اور متمول خاندان سے تھا۔ نیز یہ کہ غیرت و خودداری کا احساس اور شعر و سخن کا شوق ان کو خاندانی ورثے میں ملا۔ گفتگو ذرا آگے بڑھی تو جذبی نے اپنی سوتیلی ماں کا سلوک اچھا نہ ہونے کا ذکر کیا۔ پھر "کچھ اور" کہہ کر رک گئے۔ امتیاز احمد اس "کچھ اور" کو تفصیل کی جانب جذبی کو متوجہ نہ کر سکے اور گفتگو کا رخ بدل گیا۔ دراصل اس "کچھ اور" کی تفصیل جذبی کی "بے راہ روِ زندگی" دربدری اور تباہ حالی سے عبارت ہے۔ جذبی کا یہ شعر اسی دور کا ہے ؎

خدایا موت نہ آئے تباہ حالی میں　　یہ نام ہوگا غم روزگار سہ نہ سکا

جذبی کی زندگی کا یہ دور آگرہ پہنچنے کے بعد سے شروع ہوکر ۱۹۴۵ء میں ختم ہوا جب ان کی ٹوٹی ہوئی کشتی حوادث کے تھپیڑے کھاتی ہوئی بالآخر ساحلِ تمنا پر آلگی اور پوسٹ آفس میں کلرکی کرنے کے بجائے جس کا مشورہ ان کے والد نے بیزار ہوکر دیا تھا وہ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرار ہوگئے۔

جذبی کی زندگی کا یہ انتہائی اہم دور جو کم و بیش ۱۵ سال پر محیط ہے ان کی شاعری کا تشکیلی دور بھی ہے۔ اس دور میں ان کی زندگی پیچ پیچ راہوں سے گزری۔ سرد و گرم اور تلخ و شیریں (غالباً تلخ زیادہ شیریں کم) تجربات سے انھیں دوچار ہونا پڑا۔ انھیں تجربات میں ایک تھیٹر کمپنی سے وابستگی کا دلچسپ واقعہ بھی شامل ہے۔ نامساعد حالات کے جذبی کے موم جیسے دل کو غم آشنا کیا۔ انھوں نے شدت کے ساتھ یہ محسوس کیا ؎

زندگی گو لاکھ ہو جائے تبسم آفریں　　زندگی لیکن تبسم کے فسانوں میں نہیں

یاس و حسرت اور درد و غم کی کسک حزنیہ لے میں ڈھل کر جذبی کی شاعری کی شناخت بن گئی۔ جذبی کے کلام میں یاس و غم کی جو زیریں رَو ملتی ہے۔ نہ وہ میر کی نقالی ہے اور نہ فانی کا تتبع۔ یہ احساسِ غم ان کی شخصیت کا حصہ ہے جس کی بدولت جذبی کے کلام میں ایسے اشعار اور نظمیں ملتی ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے "ہمارے شیریں ترین نغمے وہ ہیں جو ہمیں غم آگیں خیالات کی یاد دلاتے ہیں"۔ غم آگیں نغمات جذبات و احساسات کا تنقیہ کر کے زندگی کی اعلا قدروں کو جلا بخشتے ہیں اور ہمارے لیے جمالیاتی انبساط فراہم کرتے ہیں۔

ہر اچھے فن کار کی طرح زندگی اور فن کے باہمی رشتوں سے متعلق جذبی کا اپنا ایک نظریہ ہے جسے وہ اپنی شاعری میں برتتے ہیں۔ یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہیں مگر قباحت اسی وقت شروع ہوتی ہے جب وہ اس نظریہ کو دوسرے شعرا کے کلام پر تبصرہ کا معیار بناتے ہیں۔ جذبی کو اعتراف ہے کہ وہ فانی اور جگر دونوں کی شاعری سے متاثر ہوئے مگر یہ ان کا نظریہ شاعری ہے جو فانی کے بالمقابل جگر کو صاحبِ نظر تصور کرتا ہے۔ اسی نظریۂ شاعری کی بدولت جذبی کو اقبال کی شاعری میں شعریت کی کمی اور قافیہ پیمائی VERSIFICATION کی زیادتی نظر آتی ہے۔ فیض کے یہاں محض چند سنجیدہ خیالات کی تکرار اور آورد بہت ملتا ہے۔ کیفی کا یہ رویہ انھیں ناپسند ہے کہ ادھر کوئی واقعہ ہوا اور ادھر نظم تیار ہوگئی۔ وہ لمحاتی شاعری کے قائل نہیں ہیں۔ یہ اور اسی طرح کے جو بھی خیالات جذبی نے ظاہر کیے ہیں وہ عمومی اور سطحی نوعیت کے ہیں۔ ان میں تنقیدی بصیرت کی کمی صاف نظر آتی ہے۔ یہ خیالات تفصیلی بحث کے متقاضی ہیں مگر مضمون کی طوالت ایسی بحث کی اجازت نہیں دیتی تاہم دو باتوں کا مختصراً اظہار ضروری ہے۔

۱۔ اقبال، جوش، فیض اور علی سردار جعفری جیسے شعرا پر جن کے فن کا کینوس وسیع اور متنوع ہے۔ اظہار خیال کرتے وقت یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیے کہ فن کار کا کینوس جتنا طویل و عریض ہوگا اسی لحاظ سے اس بات کا امکان زیادہ رہتا ہے کہ کینوس پر کہیں کہیں

ں نظر آئے مگر اس سے فن کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ بڑے کینوس پر بنی ہوئی تصویر کو خوردبین سے
یں دیکھا جاتا۔ اس کے حسن کی جلوہ گری وقت اور فاصلہ کے تناظر میں دیکھی جاسکتی ہے۔
ں کار کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے فکر و احساس کی کن
ندیوں کو چھوا ہے اور اس نے اپنی تخلیقات سے جو محفل آراستہ کی ہے اس کا معیار کتنا
فع و اعلیٰ ہے۔

۲۔ لمحاتی ادب کے بارے میں یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں ہے کہ فنی اعتبار سے وہ ہمیشہ ادنا
جے کا ہو۔ نہ یہ بات کلیتہً صحیح ہے کہ اگر کسی اہم واقعہ سے متاثر ہو کر کوئی فن کار اپنے
ثرات کا بے ساختہ اظہار کرتا ہے تو وہ تخلیق ادھکچری ہوگی۔ تخلیق کا معیار اس بات پر
عصر ہوتا ہے کہ فن کار کتنا باشعور ہے اور وہ کس درجہ کی فنی مہارت رکھتا ہے۔ اس
سلسلے میں ایک واقعہ یاد آیا۔ کیفی کانپور میں میرے ساتھ مقیم تھے۔ وہ آگرہ گئے اور پہلی بار
ہوں نے تاج محل دیکھا۔ آگرہ سے واپسی پر ان کے تاثرات نے ایک خوبصورت نظم کی شکل
ختیار کر لی۔ نظم اس طرح ختم ہوتی ہے ؎

کتنے جاں دار جنازوں کو بھی مل جائے مزار
پھیل جائے جو اس روضے کا سمٹا دامن

عر نے جس زاویہ نگاہ سے حسن کے اس شاہ کار کو دیکھا ہے اس پر بحث کی بڑی گنجائش
ہے۔ مگر تعریف کی بات یہ ہے کہ اس سے نظم کی خوبی مجروح نہیں ہوتی۔ نظم میں تاج محل
حسن و جمال اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ ضوفشاں ہے۔

لمحاتی ادب کے معیار کا تعین ہمیں عوامی ادب کے سیاق و سباق میں کرنا چاہیے۔ اسے
ب العالیہ کی میزان پر پرکھنا اصولاً غلط ہے۔ لمحاتی ادب کی اچھی تخلیقات عوام کی امنگوں
ر آرزوؤں، محرومیوں اور کامرانیوں مایوسیوں اور مسرتوں کی ترجمان بن کر عوامی ادب میں
ا مقام خود بنا لیتی ہیں۔ لمحاتی ادب پر گفتگو کرتے وقت ہمیں ایلیا اہرن برگ کے ان الفاظ
بھی یاد رکھنا چاہیے کہ لمحاتی ادب کی اپنی اہمیت و افادیت ہے اگر انھیں لمحات میں ادیب
ملک و قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے جا رہا ہے۔"

ننھے مُنّے بچّوں
کے لیے
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں
بتاشے
نرسری کے بچّوں کے لیے آسان
زبان میں دلچسپ نظمیں : قیمت ۶/۵۰
جاں نثار دوست
بچّوں کے لیے باتصویر کہانی
قیمت ۵/- روپے
جادو کی ہنڈیا
5/-
بھیڑیے کا گانا
6/50
شیر اور بکری
6/50
کوّے کا خواب
6/50
دم کٹی لومڑی
6/50
چالاک بلّی
6/-
چاند کی بیٹی
5/-
قیمت ۶/۵۰

یوسف ناظم
ہلال، ۱۳۰ باندرہ ریکلیمیشن
ں ۵۰

قصہ اس قلم کا

جو دائیں سے بائیں طرف بھی چلتا ہے اور بائیں سے دائیں طرف بھی)

مانا کہ وہ مجلس اقوامِ متحدہ کے جنرل سکریٹری کی طرح کی کوئی عملی کُل منصوبہ بندی کی خاتون نہیں ہیں وہ
امن و امان کی فاختائیں خلا میں چھوڑتی ہیں لیکن یہ کہنا کہ

وہ تو عجیب و غریب خاتون ہیں
انھیں سمجھنا مشکل ہے
وہ کتنی زود رنج ہیں اور
وہ اُلجھتی بہت ہیں وغیرہ وغیرہ

یہ سارے کے سارے نکات الشعرا اور یہ ساری نثری نظمیں اڈولف ہٹلر کے دست راست گوبلز کے
اِ ، ت وایجادات معلوم ہوتی ہیں۔ گوبلز اسی بات کی تنخواہ پاتے تھے۔

مذکورہ بالا اور اس قسم کی بیسیوں باتیں ان کے متعلق مشہور ہیں اور یہ شہرت اُن کی ادبی شہرت
ہم سفر ہے (صحیح لفظ شاید ہم رکاب ہے لیکن ہم سفر اس لیے موزوں ہے کہ اس میں کسی سواری کی ضرورت
ں نہیں ہوتی) بلکہ بعض اوقات ان کی یہ مبینہ مزاجی شہرت اُن کی مسلمہ ادبی شہرت سے اس طرح آگے نکل
ں ہے جیسے ہمارے شہر بمبئی میں کبھی کبھی مضافاتی ٹرین (جس میں مسافر آلوؤں اور بینگنوں کی طرح لدے
تے ہیں) کسی ایکسپریس ٹرین سے آگے نکل جاتی ہے اور مضافاتی ٹرین کا موٹر مین اپنی اس ظفریابی
اتنا مسرور ہوتا ہے کہ کیا اشوئی نیجپا دوسو کلومیٹر کی دوڑ میں پی ٹی اوشا سے آگے نکل کر خوش ہوئی ہوگی۔
رۃ العین حیدر کے بارے میں لوگ اس قسم کی آرازنی اور تبادلۂ خیال کو اپنی اپنی شیر افگنی سمجھتے ہیں اور ب
جب سے انھیں گیان پیٹھ ایوارڈ ملا ہے ان زبانی اور لسانی ریلوں میں بکثرت تحریری اور اخباری اور
نـ اط مکتوباتی اور مخطوطاتی اضافے ہوئے ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے گھر بیٹھے لوگوں کو ایک مصروفیت
م پہنچادی ہے۔ روزانہ ایک نہ ایک شگوفہ کھلتا ہی رہتا ہے۔ ان شگوفوں کی تعداد چین کی آبادی کے لگ بھگ
ہو ہی چکی ہوگی۔

قرۃ العین حیدر مذکورہ بالا سطور اور "امابعد" امور کی روشنی میں ادب سے زیادہ مسئلہ بن گئی ہیں (
نی بنادی گئی ہیں) اور یہ مسئلہ اب حل نہیں ہو سکتا۔ ایوں بھی ہندستان میں کون سا مسئلہ حل ہوا ہے۔ ارباب

حل و عقد زندہ باد۔ ارباب حل و عقد کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ حل سے زیادہ عقد پر توجہ دیتے ہیں۔) قرۃ العین حیدر شاید اس لیے بھی عقدۂ لاینحل ہیں کہ انھوں نے کسی کو اپنا ہم سخن اور ہم زبان نہیں بنایا بلکہ کسی کو اپنا ہم شانہ بھی نہیں ہونے دیا۔ (ہم شانہ سے مراد قد و قامت میں تقریباً مساوی)۔ وہ ہمیشہ یونک رہیں۔ (یونک لوگ ہندستان میں کم ہی ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں ان سے لوگ برگشتہ نہ سہی اُن کی وجہ سے دل گرفتہ رہتے ہیں)۔ قرۃ العین کی پیچیدہ روی ہی اُن کی پہچان بنی۔ وہ کوئی ہوا نہیں ہیں لیکن ہوا ضرور ہیں اور ہوا کو کس نے قید کیا ہے۔

پکاسو کی پنٹنگ، چارلی چپلن کے کرتوت، سارترے کا فلسفہ، میرو ڈینا کا فٹ بال اور اسٹیفی گراف کے ٹینس کے برابر کی شہرت اگر اردو میں کسی چیز کو حاصل ہوئی ہے تو وہ قرۃ العین حیدر کی تحریر ہے۔ کبھی کبھی میرا جی بھی چاہتا ہے کہ میں بھی انھیں پڑھوں۔ پھر سوچتا ہوں پہلے ان سے اجازت تو لے لوں ورنہ ممکن ہے وہ پوچھ بیٹھیں کہ آپ کو یہ کیا سوجھی تھی تو میں کیا جواب دوں گا۔ یہی ڈر مجھے اب تک روکے ہوئے۔ ورنہ بمبئی میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو اُن کے ناول دوسروں سے پڑھوا کر سن رہے ہیں (پڑھنے کی یہ سب سے آرام دہ ترکیب ہے)۔ خاص طور پر گردشِ رنگ چمن تو ان دنوں کانوں کان لی جارہی ہے۔ کچھ کانوں میں تو میں نے آلہ مکبر الصوت بھی لگا دیکھا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے گردشِ رنگ چمن لکھ کر ان آنکھوں کا بھی اعلان کر دیا جو پچھلے ۲۵ سال سے "کلر بلائنڈ" ہو کر رہ گئی تھیں (تکنیکی نقطۂ نظر سے آنکھیں کلر بلائنڈ نہیں ہوتیں آدمی ہوا کرتا ہے لیکن میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ طبّی یا سائنسی مقالہ نہیں ہے نہ ہونا تو موضوع سے الگ ہوتا)۔ گیان پیٹھ انعامات کی فہرست میں کامل ۲۵ سال گزرنے پر اردو نظر آئی اِسے کلر بلائنڈ نہیں تو اور کیا کہیں گے؟ — ویسے امراضِ چشم بھی تعداد میں کئی ہیں اور اب تو آنکھ سیاسی مرض میں بھی مبتلا ہونے لگی ہے۔

قرۃ العین حیدر کو جو قلم ملا ہے وہ دائیں سے بائیں بھی چلتا ہے اور بائیں سے دائیں بھی۔ یعنی یہ کہ وہ اردو تو لکھتی ہی ہیں انگریزی بھی انگریزی کی طرح لکھتی ہیں۔ بس فرق یہ ہے کہ جب وہ انگریزی لکھتی ہیں تو اس میں اردو الفاظ نہیں آتے۔ انگریز جب تک یہاں مقیم (بلکہ مسلط) رہے انھوں نے غالب کو نہیں سمجھا۔ سمجھ جاتے تو غالب کی پنشن دلّی میں ہی منظور ہو جاتی انھیں کلکتہ نہیں جانا پڑتا۔ قرۃ العین حیدر نے انگریزوں کو غالب بزبان انگریزی پڑھنے کا موقع دیا۔ انگریز اس سے پہلے اردو کو لاوارث سمجھتے تھے قرۃ العین حیدر کا ترجمہ پڑھنے کے بعد اُن کی (دونوں) آنکھیں کھلیں — کہتے ہیں، آگ کا دریا، لکھنے کی وجہ سے قرۃ العین حیدر کا قلم خونچکاں ہو گیا۔ ہندستان میں خون ہے بھی بہت۔ ہمیشہ کہیں نہ کہیں بہتا ہی رہتا ہے بحرِ احمر کی طرح۔

قرۃ العین حیدر ایک زمانے تک بمبئی میں رہیں۔ پہلے تو قلبِ شہر میں مقیم و متوطن تھیں لیکن جب انھیں یہ خبر ملی کہ بمبئی کے کچھ مضافات بھی موزوں مقامات ہیں جہاں کی سکونت باعثِ سکون ہو سکتی ہے تو وہ جوہو ولے پارلے کے علاقے میں منتقل ہو گئیں لیکن یہاں پہنچ کر ان کی خوش فہمی جلد رفع ہو گئی اور یہ منتقلی انھیں اتنی مہنگی پڑی کہ وہ شہرِ بمبئی ہی سے کنارہ کش ہو گئیں۔ سنا ہے مضافات میں جس گھر میں وہ چند دن مقیم تھیں اُس گھر کے در و دیوار پر سبزہ تو نہیں اُگ سکتا تھا لیکن گھر میں سیلن مختلف قسم کی خوشبوئیں اور

سں قبیل کی دوسری مقبول عام چیزیں ضرور نمودار ہوگئیں اور یہ تک مشہور ہوا کہ جب وہ کئی دنوں بعد اس دیار
ین پہنچیں اور اپنے "افتادہ و پسماندہ" گھر کا دروازہ کھولا تو دروازہ فرطِ عقیدت سے زمین بوس ہوگیا۔ حیدرآباد دکن میں اسے
ہورنش بجالانا کہا جاتا تھا۔ اس کی چولیں ڈھیلی ہوگئی تھیں۔ کتابیں دیمکوں کے زیرِ مطالعہ رہ کر غائب
ستہ ہوگئی تھیں اور ان کے اوراق چھوٹی موٹی بُن کر رہ گئے تھے۔ جھینگر اور انواع و اقسام کے حشرات الارض اس
ھر میں نان پیئنگ گیسٹ تھے جنھیں اب باہر نکالنا ممکن نہ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ ان خبروں میں کچھ افواہی مسالہ
ھی شامل ہو لیکن بس ایک حد تک۔ اس مضافاتی گھر میں ایک مرتبہ مجھے بھی جانے کا موقع ملا تھا۔ یہ مدعا تھا
ے مشفق خواجہ کے تخلیقی ادب کے لیے غلام عباس سے متعلق ایک مضمون حاصل کرنا تھا اور محترمہ نے
مجھے ایک ان لینڈ کور پر اس گھر کا پتا لکھ بھیجا تھا مکمل ڈرائینگ کے ساتھ اور ہلکے نیلے رنگ کا یہ لفافہ
مکان کا بھی بلو پرنٹ معلوم ہونے لگا تھا۔ اس نقشے میں اس گھر کا پورا جغرافیہ اور حدودِ اربعہ اس طرح درج
تھے جیسے خط نہ ہو آٹھویں جماعت کی کوئی نصابی کتاب ہو۔ بس فرق یہ تھا کہ نصابی کتاب میں جو غلطیاں
ہوتی ہیں وہ اس میں نہیں تھیں۔ خط میں محترمہ نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ وہیں ایک بلند و بالا عمارت بھی ہے
جس کی بلندی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی بلیک مارکیٹیئر کی ملکیت ہوگی۔ وہ جب بھی کسی سے 'بدگمان' ہوتی ہیں
یقین کی حد تک بدگمان ہوتی ہیں۔ (یقین کی قسموں میں ایک قسم عین الیقین بھی ہے۔)

قرۃ العین حیدر نے ایک مرتبہ (غلطی سے) اپنے شہر کے فلیٹ میں ایک ادبی نشست بھی مدون کی
ں گرم گرم پکوڑے اور بھجیے کھلائے تھے۔ اور بھی چیزیں ہوں گی لیکن یہ دونوں چیزیں اس لیے یاد رہ
ہیں کہ ان میں مرچ بہت تھی (ان دنوں مرچ اتنی مہنگی کہاں تھی)۔ اس نشست میں گرما گرم بحث بھی
وئی تھی اور جب بھی کسی گوشے سے کسی فرانسیسی یا جرمن ادیب کا نام لیا جاتا تو قرۃ العین حیدر یہ بھول کر
وہ میزبان ہیں اس بات کی تصحیح کر دیتی کہ اس ادیب کے نام کا صحیح تلفظ یہ نہیں یہ ہے۔ (یہ بات وہ
ن الیقین سے کہتیں)۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر کوئی شخص کسی فرانسیسی ادیب کا نام صحیح تلفظ سے ادا
ہیں کرسکتا تو انھیں کیوں برا معلوم ہوتا ہے۔ بحث مباحثے میں تلفظ کی حیثیت تو ضمنی بھی نہیں ہوتی۔ تلفظ کا
م اور دانشوری سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ان سے کبھی کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ بمبئی اور دلی میں انھیں کون سی جگہ زیادہ پسند ہے حالانکہ یہ ایک
وبی نوعیت کا سوال ہے لیکن وہ تو یہی کہیں گی کہ آپ ذاتی سوال کیوں پوچھتے ہیں۔ اس معاملے میں قیاس آرائی
سے کام لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بمبئی انھیں زیادہ پسند نہیں آسکتا اور وہ کوئی میر تقی میر تو ہیں نہیں کہ اپنے
پ ہی میں مگن رہیں۔ بمبئی میں ایک ہی عمارت میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے۔ بمبئی میں
واصلاتی نظام البتہ اچھا ہے۔ سمندر بمبئی کی تلاش میں جب جی چاہے نکل جاؤ۔ دلی البتہ رہنے کی جگہ ہے اور اب
قرۃ العین حیدر ملنسار بھی زیادہ ہوگئی ہیں۔ لوگ اُن سے ملنے ان کے گھر جاتے ہیں اور وہ گھر میں رہ کر یہ
ہیں کہلاتیں کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ جلسوں میں بھی آتی جاتی ہیں اور ضرورت لاحق ہو جائے تو ہنستی بھی ہیں۔
بعض شاعروں کے بچوں بچیوں کی شادی بیاہ میں بھی جاتی ہیں۔ میں نے سُنا ہے لفافے بھی دیتی ہیں۔ لوگوں سے
گھل مل کر نہ سہی کھُل کر بات کرتی ہیں۔ انٹرویو بھی دے دیتی ہیں لیکن 'مرکزِ توجہ' بننا انھیں پسند نہیں۔ بس یہیں
گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ وہ سمجھتی ہیں مرکزِ توجہ ہونا اور موردِ الزام ہونا ایک ہی بات ہے گو دل میں جانتی ہیں کہ یہ مترادفات

نہیں ہیں۔ گیان پیٹھ ایوارڈ نے غالباً انھیں سراسیمہ کر دیا ہے لیکن وہ تو پہلے بھی بہ نفس نفیس اپنی مرضی سے سراسیمہ تھیں۔ سراسیمگی سے انھیں فطری لگاؤ ہے۔ اور اس میں انھوں نے کمال حاصل کیا ہے۔ میرا خیال ہے اب یہ کرنا چاہیے کہ اس کتاب کے اعزاز میں کوئی جلسہ منعقد کیا جائے جس پر یہ انعام دیا گیا ہے ضمنی طور پر اگر مصنفہ کا ذکر آجائے تو مجبوری ہے۔ اس طرح ان کی سراسیمگی کا کچھ بندوبست ہو سکے گا۔ پھول وغیرہ بھی پیش کرنے ہوں تو وہ کتاب پر رکھے جا سکتے ہیں۔ گل دستے کی بجائے پھولوں کی چنگری ٹھیک رہے گی۔ رنگ چمن کے اظہار کے لیے ہر رنگ کے پھول اس میں سجائے جا سکتے ہیں۔ اس تجویز پر غالباً محترمہ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ کتابوں کے بارے میں میں نے کہیں پڑھا تھا کہ یہ تصنیف کسی کی بھی ہوں عوام کی ملکیت ہوتی ہیں اور شاید اسی لیے عوام کو شعر تو بہت سے یاد رہتے ہیں لیکن وہ ان اشعار کے خالق کا نام نہیں جانتے۔ اچھی عادت ہے۔

قرۃ العین حیدر کی یادداشت اچھی خاصی ہے۔ انھیں بخوبی یاد رہتا ہے کہ کس نے ان کے بارے میں کب کیا کہا تھا یا کیا قلمبند فرمایا تھا۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن وہ اس کہے اور لکھے کا مطلب بھی خود ہی نکالتی ہیں اور پھر اس مطلب کو پتھر کی لکیر بنا دیتی ہیں۔

انھیں چھوٹے تو چھوٹے بڑے بھی عینی آپا کہتے ہیں بجز چند کے۔ بمبئی میں ایک اینی پہلے بھی گزر تی ہیں جن کا پورا نام اینی بسنٹ تھا۔ یہاں میں نے اینی بسنٹ کا نام الف سے لکھا ہے لیکن قرۃ العین حیدر سے ملنے اور ان کے غلط العوام نام سے واقف ہونے کے بعد میں نے اینی بسنٹ کو بھی عین سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس میں محترمہ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ماہرین املا کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اگر میں ایڈورڈ ہشتم کو عیڈورڈ لکھوں تو اس میں املا غلط تھوڑے ہی ہوتا ہے بلکہ ایڈورڈ ہشتم کی عزت افزائی ہوتی ہے۔

قرۃ العین حیدر شعر نہیں کہتیں لیکن غالب کے مشکل اشعار معلوم نہیں انھیں کیوں پسند آتے ہیں۔ مشکل اشعار تو اور لوگوں کو بھی پسند آتے ہیں لیکن ان کی پسند کے اشعار صرف مشکل نہیں ہوتے نادر بھی ہوتے۔ غالب کے عام دیوان ان اشعار سے محروم ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر

عمر میری ہو گئی صرف بہار حسن یار — گردش رنگ چمن ہے ماہ و سال عندلیب

وہ کیا جانیں کہ اس ایک شعر کی کھوج میں لوگوں کو کتنے "دیوانوں" سے سر ٹکرانا پڑا۔ زحمت سخن دینا شاید اسے ہی کہتے ہیں۔

ادھر ان کے لکھنے کی رفتار بھی بہت تیز ہو گئی ہے۔ قاری پیچھے رہ جاتا ہے۔ چمن کے نظارے سے فارغ نہیں ہو پاتا کہ چاندنی بیگم کی رونما کا موقع آجاتا ہے۔ اتنی سلامیاں ایک قاری دے کا بھی کہاں ہے۔ (سلامی سے مراد وہ سلامی نہیں ہے جو بندوق کی نوک پر سربراہان ملک کو دی جاتی ہے۔ یہ سلامی تو منہ دکھائی ہے)۔

۱۰ ر جنوری ۱۹۹۱ء کو دلی میں "گردش رنگ چمن" کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ اس تقریب میں قرۃ العین حیدر بھی موجود تھیں ضمناً۔

ـد القوی دسنوی
ـر شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال

اُردو ہے جس کا نام

(۱)

"آج شرما صاحب شعبۂ اُردو کے لیے تحفے میں بہت سی کتابیں لے کر آئے ہیں۔ ان کے ساتھ شوکت رموزی بھی ہیں۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ میں اور شعبے کے استاد محمد نعمان بھی ـش ہیں۔ یہ کتابیں انھیں مختلف گھروں سے ملی ہیں۔ بعض ان میں بہت کم یاب ہیں۔ بعض ایاب ہیں۔ ان پر ان کے خریداروں کے نام درج ہیں۔

مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ شعبۂ اُردو میں اچھی کتابیں آگئی ہیں کہ معاً اس ـیال نے پریشان کر دیا کہ یہ کتابیں جن گھروں سے نکالی گئی ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ وہاں سے اُردو ہی نکال دی گئی ہو؟"

(۲)

"اخبار میں جلی حروف میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ایک صاحب اردو کی ایک اہم انجمن کے عہدیدار منتخب ہوئے ہیں خبر کے ساتھ ان کی تصویر بھی نمایاں طور سے شائع ہوئی ہے تاکہ لوگ ان کی عظمت کے معترف ہو جائیں۔ ان کے چاہنے والوں کے مبارکباد کے خطوط بھی چھپ رہے ہیں۔ واہ واہ بھی ہو رہی ہے۔ دعوتیں بھی ہو رہی ہیں۔ لیکن اُردو کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ وہ بچاری اپنوں سے شرمندہ ایک گوشہ میں پڑی اپنے تاریک مستقبل پر کڑھ رہی ہے۔

(۳)

آج اُردو کے ایک استاد سے کسی نے پوچھا:

"کیوں بھئی آج کل کلاس نہیں لے رہے ہو بس گپ شپ میں مصروف رہتے ہو"

پروفیسر صاحب نے نہایت حقارت سے جواب دیا:

"ایسے طلبہ کو کیا پڑھایا جائے جو چوری اور سفارش سے کامیابی حاصل کرتے ہیں"

کہیں سے آواز آئی:

"طلبہ بھی چور استاد بھی چور۔ طلبہ سالانہ امتحان میں چوری کرتے ہیں استاد ہر روز فرض کو انجام دینے میں چوری کرتا ہے"

(۴)

اُردو کے ایک طالب علم کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملنے کا اعلان ہوا ہے۔ اس کامیابی پر لوگ اُسے مبارکباد دے رہے ہیں۔ کسی نے مبارکباد کی گرماگرمی میں یہ خبر اڑا دی کہ اس اسکالر کا مقالہ فلاں صاحب نے لکھ دیا ہے۔ اُڑتی اُڑتی یہ خبر نگراں تک پہنچی۔ وہ غصے سے بپھر گئے اور بولے :

"یہ مقالہ تو میں نے کسی اور صاحب سے لکھوایا ہے، جس کے لیے طالب علم کو بڑی رقم دینی پڑی ہے۔ یہ کون صاحب ہیں جو مقالہ لکھنے کا دعوا کر رہے ہیں؟"

کسی کی آواز گونجی :

"یہ اُردو کے اساتذہ کہاں جا رہے ہیں؟"

(۵)

بھوپال کے مشہور انگریزی اخبار کرانیکل میں یہ خبر نوجوان صحافی کمال ایوب نے دی ہے کہ بھوپال یونی ورسٹی میں اُردو میں ام فل کی تعلیم نہ ہونے کے باوجود بعض طلبہ کو اُردو میں ام فل کی ڈگری دی گئی ہے انھوں نے چھتے ایسے طلبہ کا ذکر کیا جنھیں فارسی استاد کی نگرانی میں اردو میں ام فل کی ڈگری دی گئی ہے۔ اور اسی بنیاد پر انھیں گورنمنٹ کالجوں میں ملازمتیں دی گئی ہیں۔

اخبار پڑھ کر بے اختیار زبان سے نکلا :

"ہائے بچاری اُردو یونی ورسٹی، اساتذہ، طلبہ، سب اس سے کھلواڑ کر رہے ہیں۔"

(۶)

اُردو کے ایک اُستاد کلاس سے مسلسل غیر حاضر رہتے تھے۔ طلبہ کلاس جاکر واپس آجاتے تھے۔ اُن کے کلاس نہ لینے کی خبر آہستہ آہستہ طلبہ میں مشہور ہوگئی تھی۔ ان کے متعلق طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں تھیں۔ اکثر طلبہ انھیں دیکھ کر ایک خاص انداز سے مسکراتے تھے لیکن کسی نے پرنسپل سے اس بات کی شکایت اس لیے نہیں کی کہ پروفیسر صاحب کی رسوائی ہوگی۔ ایک دن اتفاق سے پرنسپل نے کسی کام سے انھیں چپراسی بھیج کر بلایا۔ لیکن وہ نہیں ملے۔ حسب معمول وہ کلاس سے غائب تھے۔

بعد میں جب پروفیسر صاحب کو چپراسی بھیج کر اُن کو بلانے کی خبر ہوئی تو بجائے شرمندہ ہونے کے دوسرے اساتذہ سے پرنسپل کے خلاف یہ پروپگنڈا کرتے ملے :

پرنسپل کی نگاہ میں اساتذہ کی کوئی عزت نہیں، چپراسی بھیج کر معلوم کیا جاتا ہے کہ اساتذہ پڑھا رہے ہیں کہ نہیں۔ لیکن وہ اس "سچ" سے شرمندہ نہیں تھے کہ وہ پڑھاتے نہیں ہیں۔ طلبہ کو دھوکا دیتے ہیں اور طلبہ ان کو دیکھ کر ایک خاص انداز سے اُن پر ہنستے ہیں۔

غلام جیلانی
۲/۱۹۵ آر۔ٹی وجے نگر کالونی
حیدرآباد۔ اے۔پی

قافلہ درد

—— دلی سے بدرپور آنے تک ساری بس بھر گئی تھی۔

مجھے پتا بھی نہ چلا۔ میں اردگرد سے بے خبر آنکھیں بند کیے چٹان کی پھننگ پر معلق لٹکا ہوا نیچے دیکھ رہا تھا، گہرائی میں۔ بارش میں بھیگ کر چٹان پر لیکا ایک سبز کائی زندہ ہو کر بے حد پھسل واں ہو گئی تھی اور اب کسی بھی لمحے توازن کھو کر مجھے اس پر سے نیچے پھسلنا ہے.... گرنا ہے۔ عجیب ہولناک کرب کی سرو لذت میں دل ڈوبا جا رہا تھا.....

کنڈکٹر میرے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں نے مٹھی کھولی۔ بھنچے بھنچے نوٹ تڑ مڑ گیا تھا۔ کنڈکٹر نے برا سا منہ بنا کر لے لیا۔

"کہاں جانا ہے؟"

"اپنے خوابوں کو قتل کرنے۔"

کنڈکٹر نے رک کر میری طرف دیکھا۔

"پلول" میں نے جلدی سے سنبھل کر کہا۔

بقیہ ریزگاری ہاتھ میں تھماتے ہوئے اس نے پھر ایک بار میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ اور پھر میرے برابر والے مسافر سے متوجہ ہو گیا۔ تین نشست والی بنچ پر میں سرے پر بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے لگی تیسری سیٹ پر ایک معمر خاتون بیٹھی تھی۔ ان کو ٹکٹ تھماتے ہوئے کنڈکٹر مجھ سے بولا....

"تمھارا اور ان کا ٹکٹ ایک ہی میں کر دیا ہے۔ وہ بھی پلول جا رہی ہیں" جا رہی ہوں گی۔ میں ان باتوں سے بے تعلق...... کوئی ہزار میل دور کی آوازیں سن رہا تھا.... بیوی اور بیٹے کی آوازیں۔ جنھوں نے اسٹیشن پر اس بار بھی تاکید سے کہا تھا...." دلی میں کام ختم ہوتے ہی لوٹ آنا.... سنا، پلول جانے کی مت سوچنا"

وہ ڈرتے تھے۔ میں وہاں جاؤں گا تو جذبات میں بہ جاؤں گا..... پہلے ہی بلڈ پریشر کا مریض۔

مگر میں نے اس بار چپ چاپ طے کر لیا تھا۔

میں پلول جا رہا تھا۔ اپنے ان خوابوں سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پانے، جو ہر بار مجھے کرب کے

الاؤ میں ڈھکیل کر چلے جاتے ہیں۔ کب سے پیچھا کر رہے ہیں میرا...... ظالم..... سفاک۔
وہ خواب میرے پچھلے جنم کے ہیں۔ جب میں سترہ اٹھارہ برس کا تھا۔ اور پلول سے کوئی ہزار میل دور رہتا تھا۔ ہر سال آیا کرتا تھا، امی اور بھیا کے ساتھ، گرمیوں کے دو تین مہینے گزارتے، اپنے آبائی وطن، پلول، ضرور جاتا، بلاناغہ۔ مگر وہ سلسلہ یک لخت ٹوٹ گیا، جب وہاں کے سب لوگ جبراً سرحد پار بھجوا دیے گئے..... ہر بات ختم ہوگئی۔ میں پھر کبھی پلول نہیں گیا، سرحد کے اسی طرف رہتے ہوئے بھی۔ ڈوری کو قینچی سے بیچ میں سے کاٹ دیا۔ مگر پلول برابر میرے ساتھ لگا رہا۔ بچپن کے دلوں کے پلول کی خوبصورت تصویر ذہن میں محفوظ رہ گئی..... وہ میرے پہلے جنم کی تصویر تھی۔ مگر پھر اس تصویر کی ایک ایک تفصیل نے خوابوں کا روپ دھار لیا..... اور پھر ساری عمر یہ خواب میرا تعاقب کرتے رہے۔ ہر بار جھیل میں پتھر پھینکتے رہے..... میں سمجھتا رہا کہ وقت کے پاس پتھروں کا ذخیرہ ہی ختم ہو جائے گا..... اور اس کے ساتھ ذہنی ہیجان بھی۔ مگر اس کی بجائے جھیل کا پانی سوکھ گیا..... اب پتھراؤ کو جذب کرنا مشکل ہو گیا.....
جھیل کی تہہ پتھروں کے ٹکراؤ سے دہکنے لگی۔ ہر خواب کے بعد چین و سکون کرب کے الاؤ میں لاوا بن کر بہہ جاتا......
نیند غائب ہو جاتی۔ بستیوں کے پرے سے، کسی پُر اسرار پہاڑی کی گپھاؤں میں سے گھنٹیوں کی مدھم آوازیں جگانے آجاتیں..... زخموں سے چور، دکھوں میں ڈوبی ہوئی کراہیں۔
اور پھر آخری پہر کے دم توڑتے اندھیرے میں، میری ہستی کا ذرہ ذرہ بکھر جاتا..... گم ہو جاتا۔ خلاؤں میں، وسعتوں میں.....
کیا کسی نے مجھے دیکھا ہے؟..... کوئی نہیں بتاتا۔ کوئی ہے ہی نہیں وہاں.....
سب میرے پاس سے جانے کب چپ چاپ کھسک گئے ہیں!
خدایا ــــ کب تک..... اس عذاب کو جھیلتا رہوں گا؟..... کب تک یہ خواب میرا تعاقب کرتے رہیں گے؟
میں سدھارتھ نہیں ہوں۔ نہ کوئی بودھی ستوا ہوں..... مجھے ایک اور جنم کیوں دیا؟
آج، برسوں کی ہمت جمع کر کے، جا رہا ہوں؛ اس جنم کے خوابوں کی ہر کڑی کو توڑ کر اپنے ہاتھوں سے دفن کر دینے......
اور اب بس فرید آباد سے گزر رہی تھی۔ مگر یہ کون سا فرید آباد ہے! آم کے باغوں کی ٹھنڈک اور مہندی کی باڑھوں کی مہک والی وہ صاف ستھری بستی کیا ہوئی؟
یہ سڑک تو بستی سے ہٹ کر جا رہی ہے۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں، گنجان کابک نما گھروندے، غلیظ موریاں، جوہڑ..... اور ان کے پیچھے دور دور تک کارخانوں کے آتش فشاں... دھواں اگلتی ہوئی چمنیاں.....!
بے وقوف!..... ان چالیس برسوں میں زمانہ، قیامت کی چال چلتا، تاریخ کے دو ڈھائی سو سال طے کر گیا ہے..... تو کون سے دور کی بات کر رہا ہے؟..... اس کے تو نشان بھی ریت

کے بگولوں نے ریگ زاروں کے سینے پر سے مٹادیے۔
وہ ٹھنڈک، جبکہ تو کبھی کی چمنیوں کا دھواں بن چکی ہے۔....دوڑ........ہجوم میں شامل ہوجا۔ سڑکوں پر لوگوں کے سیلاب کے ساتھ بہتا جا.... ورنہ اکیلا رہ جائے گا۔ تیری لاش بھی کوئی نہیں اٹھانے گا۔ پیروں تلے روندتے، سب آگے بڑھ جائیں گے۔
جھرجھری سی لے کر میں چونک گیا۔ بس اب فراٹے بھرتی ہوئی بلب گڑھ، اساؤدی سے بھی آگے نکل آئی تھی..... میرے برابر والا دیہاتی جانے کہاں اتر گیا تھا۔ کھڑکی والی خاتون کھسک کر قریب آگئیں تھیں۔
"پلول جارہے ہیں آپ؟"
ـــــ کیوں پوچھ رہی ہے یہ؟ اسے تو معلوم ہی ہے۔ میرا ٹکٹ بھی اس کے ٹکٹ میں شامل ہے۔
"کس کے یہاں جانا ہے پلول میں؟"
اس مرتبہ میں نے اسے مڑکر دیکھا.... مجھے اکیلا کیوں نہیں چھوڑ دیتی ـــــ؟
سفید بالوں کا جھنکاڑ ہوا کے جھونکوں میں اُلجھ کر ریت میں اَٹ گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ذہین آنکھیں جھرّیوں کے جال میں پھنس کر رہ گئی تھیں۔ کبھی ان میں چمک بھی رہتی ہوگی.....اب تو وہاں غم آلود پوکھر کا زرد گدلا پانی جھلک رہا تھا۔ وضع قطع سے مہذب لگتی تھی۔
"کسی کے پاس نہیں ـــــ"
شاید میرا لہجہ سرد تھا۔ خاموشی کی خلیج نے دونوں کو اپنے اپنے خولوں میں دھکیل دیا۔
بس کے اندر تھوڑے سے لوگ رہ گئے تھے۔ جاٹ اور گوجر عورتوں کی مسلسل باتوں کی بھن بھناہٹ بھی دور سے آتی لگ رہی تھی۔ گھاگھروں، دھوتیوں اور پگڑیوں سے اٹھنے والے میل اور پسینوں کے بھبکے بار بار پچھلے جنم میں لے جاتے.....
سڑک پر پیچھے کی طرف دوڑتے ہوئے کھیت خاصے ہرے بھرے تھے۔ پہلے سے کہیں زیادہ زرخیز لگ رہے تھے....
مگر پھر یہ بس کے اندر، باہر.... سڑک کے کنارے بسے ہوئے دیہاتوں میں ہر طرف اُداس مایوس چہرے....! زرد، خوف زدہ سی آنکھیں کیوں ہیں؟ بڑے، بچے، بوڑھے.....سب بیزار سے، زندگی سے بے تعلق سے کیوں بیٹھے ہیں۔
ان کھیتوں میں گیت اور قہقہے، حسن اور عشق کی داستانیں....کیا اب اگنی بند ہوگئی ہیں؟
"اس جگہ سڑک پر دونوں جانب بڑے پُرانے تناور درخت ہوا کرتے تھے.... بڑ کے.....؟"
یکایک میں ساتھ والی خاتون سے پوچھ بیٹھا۔
"گر گئے۔ کبھی کے۔ ایک بہت بڑی آندھی آئی تھی.... طوفان"
گر گئے!.... کیسے گر گئے؟ میں نے ہمیشہ یہی سمجھا تھا ان کی جڑیں زمین میں اتنی مضبوط ہیں کہ کبھی ہل بھی نہیں سکتے..... مگر وہ گر گئے!

وہ پہلے جنم کا واہمہ تھا..... اور یہ اس جنم کی حقیقت۔
وہ قد آور درخت کہاں چلے گئے؟..... میرے دوست کہتے ہیں کہ بے بسی کے عالم میں کھیتوں کے اس طرف بھٹک رہے ہیں۔
یہ منظر کھیتوں کے دونوں جانب دیکھا ہے لوگوں نے..... اور پھر بھی لگتا ہے کسی نے نہیں دیکھا۔
"آپ باہر سے آئے ہیں؟ اُدھر..... دوسری طرف سے؟"
"نہیں۔ اِدھر ہی سے آیا ہوں۔"
وہ حیرت میں ڈوب گئی؟"
"بہت دن بعد آئے ہیں؟"
"چالیس برس بعد۔"
"تو اب وہاں کس سے ملنا ہے؟"
"وہاں کے گلی کوچوں سے، فرش و دیوار سے..."
وہ دیر تک مجھے خاموش تکتی رہی۔ اس کی آنکھوں کی گدلاہٹ اور زرد ہوگئی۔
میرے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسی ہوئی تھیں۔ اور میں انھیں زور سے بھینچتا گیا۔ یہاں تک کہ درد سے تڑپ اٹھا۔
"اب کیا ملے گا دیکھنے کو؟ کون سی گلی، کون سا فرش پہچان سکو گے؟ سب کچھ بدل گیا ہے۔"
میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دل میں ہلور سی اٹھی.....پگلی۔ یہی تو دیکھنے جا رہا ہوں۔
"کون سا محلّہ تھا؟"
"خیل۔ خیل کلاں۔"
وہ چونک گئی۔ "میر صاحب کا مکان؟"..... اور پھر جیسے خود ہی جواب پا گئی ہو۔ "میں وہاں جایا کرتی تھی..... اوپر کا چوبارہ۔ پکا کوٹھا، کچا کوٹھا..... اندر اور باہر کا نوہرہ..... سب یاد ہے مجھے۔"
زرد گدلے پانی میں، اُجلے نقطے سے جھل ملانے لگے۔
"مگر تم..... آپ، کہاں رہے اتنے دن؟"
—— اب تمھیں کیا بتاؤں کہاں رہا! میں چپ رہا۔ وہ بھی خاموش ہوگئی۔ میری آنکھوں میں یوں دیکھے جا رہی تھی جیسے کتاب کا کھلا صفحہ پڑھتی جا رہی ہو۔
سنو۔ میں پہچان لوں گا۔ چالیس برس کے اُتھل پتھل کے باوجود مجھے سب یاد ہے.....
ٹیلے پر سب سے اونچا مکان، وہ اوپر چوبارے کی کھڑکی..... باہر چوک میں پیری کا مزار، جس پر نانا ابا ہر جمعہ کو ایک مٹکا ٹھنڈے پانی کی چھڑواتے تھے..... نیچے اتار پر اینٹوں کا فرش، پھر پتھروں کا چوڑا فرش..... نواب صاحب کی کوٹھی، باہر والی مسجد، کنواں....
اور پھر بستی سے نکلتے ہی شیر شاہ کے زمانے کی شاہراہ.... بسوں کا اڈہ..... حوض کٹورا،

ہرانی کا قبرستان۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارا آبائی قبرستان۔
مجھے سب یاد ہے۔ وہاں کے موسم، بادل، درخت، فاختائیں، لوٹرو، ہریل، نیل کنٹھ، ہُد ہُد۔ ۔ ۔ ۔ ان کی
یں۔ ۔ ۔ ۔ انھوں نے کبھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔
"تو آپ اپنے کو دُکھ پہنچانے کے لیے آئے ہیں؟"
"نہیں۔ دُکھ کا ہمیشہ کے لیے گلا گھونٹ دینے کے لیے۔"
وہ خاموش ہوگئی۔ کئی منٹ تک خاموشی رہی۔
"سُنیے۔ میں ان دنوں کرمن ہوا کرتی تھی۔ ۔ ۔ پھر ماں باپ نے غریبی سے تنگ آکر عیسائی
ب اپنا لیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہتین میں چرچ تھا نا، مشن کا؟۔ ۔ ۔ ان لوگوں نے مجھے پڑھایا لکھایا، نرس کی
ینگ دی اور اپنے ہسپتال میں نوکر رکھ لیا۔ ۔ ۔ ۔ میں آپ کے گھر۔ ۔ ۔ میر صاحب کے گھر انجکشن
رہ دینے بھی آیا کرتی تھی۔"
وہ پھر چپ ہوگئی۔ چہرے پر جھریوں کا جال تمتما سا گیا تھا۔
"پھر جب محلے خالی ہوگئے اور۔ ۔ ۔ خالی گھروں میں لوگوں کے ریوڑ اترنے لگے، تو میں
توری بن گئی۔ لڑکے کو دلی میں ڈاکٹری میں داخلہ مل گیا۔ ۔ ۔ ۔ اب وہ اور اس کی ڈاکٹر بیوی
ی، سوہنہ روڈ پر ایک بڑا ہسپتال چلا رہے ہیں۔"
اور پھر چپ چاپ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔
"مگر۔ ۔ ۔ ۔ اس وقت، آپ کے ساتھ بیٹھی ہوئی، میں صرف کرمن ہوں۔"
یہ کیسا امتحان ہے؟ ربر کو بھی کھینچے جانے کی حد ہوتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری انگلیاں ایک ــــ
رے میں پیوست ہوگئیں۔
"پلول اب نزدیک آ رہا ہے۔ آبادی کوئی دس گنی ہوگئی ہے، اور باہر باہر سے نئی سڑک
، کر بسوں کا اڈہ اسی پر بنا دیا ہے۔ آپ میرے ساتھ یہیں اتریں گے۔ پھر میرے ساتھ رکشا میں چلیں
، ۔ ۔ ۔ پہلے میرے گھر، وہاں کچھ دیر آرام کریں گے، ۔ ۔ ۔ بیٹے اور بہو کے ساتھ کھانا کھا کر پھر چلیں
، ۔ ۔ ۔ ۔ آپ کے محلے خیل کی طرف۔ ۔ ۔ ۔"
وہ اس اعتماد سے کہے جا رہی تھی، جیسے میں نہیں کہہ ہی نہیں سکتا۔ لیکن میں نے کہا ضرور۔ ۔ ۔
شکریہ۔ لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"
"کاہے کا وقت نہیں ہے؟ اتنا وقت تو ضائع کر چکے! ۔ ۔ ۔ ۔ چالیس برس کی تلافی کیا اس
آنا فاناً میں کر دینا چاہتے ہیں؟ ۔ ۔ ۔ ایسی کون سی جلدی آن پڑی ہے؟"
اور پھر یک لخت چُپ ہوگئی۔ شاید اپنے لہجے کی گرمی کو خود ہی بھانپ لیا تھا۔ مسکرا کر دھیمے
بولی۔
"میں جانتی ہوں! آپ بُرا نہیں مانیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں سب سمجھتی ہوں۔"
پھر ہم بس سے اتر کر رکشا میں چلے۔
"یہ ادھر کربلا کا میدان تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب وہاں لاریوں کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ اور یہ

ادھر بھنگیوں کی بو کھر ہے۔ اب تک رہ گئی ہے ذرا سی۔"

"آگے مینار دروازہ ہے۔ ... ہے نا؟" یکایک میں نے پوچھا۔

"ہاں جی۔" یہ جواب رکشا والے کا تھا۔

سڑک چھوٹی اور تنگ ہو گئی تھی۔ دُکانیں اُبل پڑی تھیں۔ ... فاصلے ذرا سے لگ رہے تھے ہر گھر میں کئی کئی خاندان آباد ہو گئے تھے۔ ... اجنبی چہرے، اجنبی آوازیں ...

رکشا پُرانے تھانے کے سامنے رُک گیا۔ دائیں ہاتھ وہ پتھر والا فرش جاتا تھا، اوپر چڑھ کی طرف ... ہماری حویلی کو۔

میں رکشا سے اتر گیا۔ اس نے کرایہ بھی نہیں دینے دیا۔ ہاتھ تھام لیا۔

"اگلی دفعہ ... آپ پہلے ہمارے یہاں آئیں گے ... سیدھے ... وہ آگے نیم کے برابر سے سڑک مڑتی ہے۔"

"جانتا ہوں۔ وہی سوہنہ روڈ ہے۔"

"اسی پر ہمارا گھر ہے ... بیٹے کا ہسپتال۔"

"اچھا ... خدا حافظ ... اور شکریہ۔"

وہ چُپ چاپ مجھے دیکھتی رہی۔ شاید مجھے شکریہ نہیں کہنا چاہیے تھا ... اور پھر رکشا بڑھ گیا۔

میں دائیں طرف فرش پر چلنے لگا۔ کچّے کچھ بھرے ہوئے گھروں میں غم آلود سا سناٹا ... فاصلے سکڑے ہوئے ... ہر شئے کی ہیئت بدلی ہوئی سی ... کوئی آشنا نہیں۔ کسی میرے استقبال نہیں کیا ... نہ راستوں نے نہ گھروں کی دیواروں نے ... نہ پرندوں کی آوازوں نے۔

اینٹوں کے فرش کا موڑ آ گیا۔ یہاں نکڑ پر کلّو نائی کا گھر تھا۔ جو ہر سال تاج محل کی شکل کا بہت خوبصورت ایک تعزیہ بناتا، اور محرم کے دن اپنے ہی ہاتھوں سے کربلا کے میدان میں لے جاکر اسے مٹی میں دبا آتا ... دو دن تک چبوترے پر بیٹھا روتا رہتا، اور تیسرے دن سے اگلے سال کا نیا تعزیہ بنانا شروع کر دیتا۔

یہاں اب کون رہتا ہے؟ — ٹھیکر والا سے آیا ہوا کوئی شرنارتھی خاندان۔ میں بیٹھک میں چلا گیا — "ہم لوگ وہاں چناب کے کنارے مٹی کے کھلونے بناتے تھے۔ اور بابو جی ... یہاں بیٹھک میں ایک ادھورا تعزیہ اب تک جوں کا توں رکھا ہے ... کاغذ اور پنّی پھٹ گئے ہیں۔ مگر ... کھپچیاں ویسی ہی ہیں۔"

— تو جوں کا توں کہاں ہوا؟

... فرش پر اوپر چڑھتا گیا۔ یہ ہمارے گھر کا راستہ تھا۔ سارے گھر بدل گئے تھے۔ ہمارا گھر ... مگر نہیں اوپر چوبارے کی کھڑکی ابھی تک ویسی ہی تھی ... یہی ہے ہمارا گھر۔

کڑی دوپہر میں نانی اماں کچے کوٹھے میں سارے بچوں کو دبوچ کر سلا دیتی تھیں۔ مگر میں

رکے پڑا رہتا۔ اور موقع ملتے ہی تکیے کے نیچے سے چونّی چُراکر باہر بھاگ جاتا...... ملائی کی برف بیچنے والا شاید میرے انتظار میں بیٹھا رہتا...... برف کھاکر میں اوپر چوبارے والی کھڑکی میں بیٹھ جاتا...... اور تاگے میں ٹھیکری باندھ کر نیچے لٹکاتا۔

میں اتنی باتیں یاد کر رہا ہوں...... اور وہ کھڑکی پہچان بھی نہ سکی ہے...... بالکل اجنبی، غیر کی طرح دیکھ رہی ہے......

شاید خفا ہے...... کہاں چلا گیا تھا؛

دل برداشتہ میں لوٹ گیا۔ چوبارے کی کھڑکی نے، یا چاروں طرف سہمے ہوئے سناٹے نے...... میرے دل کی دھڑکنوں کو تیز نہیں کیا۔ نہ سانسوں کی رفتار بدلی۔ لمحے گزرتے گئے... اسی طرح جیسے ہمیشہ گزرتے ہیں۔

ـــ اور پھر میں اسی وقت واپس ہوگیا۔ دلی جاتے ہوئے بس میں میں خوش تھا، کہ آج اپنے خوابوں کی آگ میں سے گزر کر اسے ٹھنڈا کر دیا ہے...... ہمیشہ کے لیے۔

کتنا مشکل سہمے ہوئے تھا اسے!...... کتنا خوف زدہ تھا!

کتنے برس انتظار کیا تھا، اس لمحے کا!...... لیکن کیا یہ لمحہ بھی میرے انتظار میں تھا؟

ـــ وہ مشترک ٹکٹ...... سفید بالوں کے جھنکاڑ والی کریمن......؟

یہ مختلف تعدادوں میں احتجاج کرنے والے لمحے، ایک جگہ کیسے اکٹھے ہوگئے ـــ؟

اور پھر میں دلی سے بھی واپس آگیا؛ ایک ہزار میل دور...... اپنے شہر میں۔

ٹھیک گیارہویں دن میں نے خواب میں پھر پلول دیکھا...... بچپن کا پلول!...... وہی دار و در...... وہی موسم، وہی پرندوں کی پروازیں،...... ان کی بولیاں...... میرا پہلا جنم۔

وہی آگ...... وہی لاوا۔

مگر میں تو بدھا نہیں ہوں۔ بودھی ستوا تک نہیں۔

یوسف عارفی
۲۹/سی IV مین ۱ے۔ اسٹریٹ۔ اگرہرا
دسراہلی۔ بنگلور ۵۶۰۰۷۹

پھر سفر بے سمت ہوا

ریل سے اترنے کے بعد ـــ اس کا بڑا جی چاہا کہ وہ بشیر الدولہ کے بسائے ہوئے اس شہر کو دیکھ ڈالے ـــ جس کی گلیاں، بازار، چوبارے، مسجد، مندر، ہرے بھرے گھنے باغات اور بشیر الدولہ کی عالیشان حویلی۔ حویلی کے سامنے ایستادہ بلند و بالا ٹنگ ٹنگ گھنٹے بجاتا کلاک ٹاور ـــ اس نے چونک کر دیکھا۔

سامنے ایک بھکاری المونیم کی بدہیت تھالی میں دس پیسے کا سکہ اچھالتا ٹنگ۔ ٹنگ بھیک مانگ رہا تھا اور اسے ملتجانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بھکاری کی ملتجانہ نظروں کو دیکھ کر اچانک نہ جانے وہ خواجہ میاں اسے کیوں یاد آگیا۔ جو آج سے دس برس پہلے۔ ٹھیک بس اسٹینڈ جانے والی اسی سڑک پر ملا تھا۔

"تم شاید وہی ہو ـــ جو آج سے دس برس پہلے ملے تھے۔"

"اور شاید تم بھی!"

"کلاک ٹاور کو مسمار کر دیا گیا ہے۔ اب باغات کہاں؟ وہاں بس ڈپو بنایا گیا ہے۔ بشیر الدولہ کی حویلی کے دو حصے کر دیے گئے ہیں۔ ایک حصے میں تحصیل ہے اور دوسرا حصہ زچگی خانہ بنا دیا گیا۔ سڑکیں بے حد صاف ستھری ہیں، لیکن ان پر پیدل چلنے کی حماقت بالکل نہ کرنا۔ قدم قدم پر بھیڑ سے ٹکرا جانے کا خطرہ رہتا ہے اور کہ ہم سب یہاں بفضلِ خدا خیریت سے ہیں تمھاری بھی خیریت مطلوب! ـــ"

اسی شہر سے اس کے دوست کی لکھی تحریر لفظ لفظ اسے یاد آگئی۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ریل سے اترے ہوئے اسے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ نہ جانے گاؤں جانے والی بس کے کیا اوقات ہیں؟ چل کر کسی ہوٹل میں چائے پی جائے۔

اس نے کھڑے کھڑے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ٹین میں گندے ہوٹل جن میں بچھی میزوں کے اطراف ـــ بڑی بڑی پگڑیوں والے بڈھے، لمبے اُلجھے بالوں والے کالے کلوٹے دیہاتی اور گہرے کالے چشمے لگائے کچھ نقلی اداکار ـــ یہ سب ـــ اور ان سب کے درمیان ـــ

وہ تیز تیز قدموں سے چل کر، ہائی اسکول کی طرف جاتے ہوئے ایک اسٹوڈینٹ کے قریب
رزم ہو میں کرنکوٹ جانے والی بس کے بارے میں دریافت کیا۔ لڑکے نے اس کو
اسے دیکھا، پھر بولا۔
"کیوں بھائی ــ کیا میں تمھاری حیرانی کا سبب جان سکتا ہوں؟"
"کرنکوٹ میرا وطن ہے!" چہکتا جواب۔
"یعنی کہ تم بھی کرنکوٹ کے باشندے ہو!"
اس کا چہرہ یک بیک مسرت سے کھل اُٹھا اور اس کا جی چاہا کہ بڑھ کر اس کمسن ہم وطن
سے لگائے اور پچھلے دس برسوں کی باتیں پوچھے کون کس حالت میں ہے اور وہ
ں، ان کی چوبرجیاں اور وہ بلند و بالا پُرشکوہ بُرج کس حد تک سلامت ہیں اور دیس مکھ
یلی کے اندر کا وہ خوبصورت کنواں تو اب بآسانی دکھائی دینے لگا ہوگا جس کا شفاف پانی
آیات کے لیے تبرکاً استعمال کیا جاتا تھا اور اس کنوئیں کے پانی کا چرچا کالی کے دیس تک

"اے لڑکے کیا تم نے اس کنوئیں کو دیکھا ہے ــ" اس نے بے خیالی میں سامنے کھڑے
کے کی شفاف آنکھوں میں جھانکا۔ پھر سنبھل کر سوچنے لگا۔ یہ جھیل جیسی شفاف آنکھیں شاید وہ
یکھیں گی جو کبھی غیر یقینی تھے۔
"اللہ بڑا کارساز ہے بابا ــ" لاٹھی کے سہارے جھکا جھکا ایک مدقوق انسانی
اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے اس پنجر کے رعشہ زدہ کھردرے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔
تم ــ یہ بھیک مانگتا انسانی ہاتھ! ــ لیکن بشیر الدولہ نے تو اس بستی کو بسانے کے بعد
ر یہ منادی کرادی تھی کہ ان کے بسائے ہوئے اس خوبصورت، مہذب اور متمدن شہر میں نہ
ظلم ہوگا، نہ کوئی جھگڑا فساد ہوگا اور نہ کوئی بھیک مانگتا نظر آئے گا کہ خوش حالی بلاتفریق
، نسل، مذہب، ادنا اعلا سب میں مساوی تقسیم کی جائے گی۔ اس نے جیب سے ریزگاری
اور رعشہ زدہ کھردرے ہاتھ پر رکھ کر آگے بڑھ گیا۔
"کامران رہو ــ بامراد رہو ــ" دعائیں ــ بے شمار دعائیں اس کا تعاقب کرتی رہیں۔
جب دعاؤں کے تعاقب سے اُسے چھٹکارا ملا تو ــ اُس نے اپنے آپ کو ایک بے حد
ورد وصول سے اَٹی بس کے قریب کھڑا پایا۔ بس میں شور مچاتے، دھکم پیل کرتے اور بڑی
بی کے ساتھ بس کی کھڑکی سے جھانکتے مسافروں کو اس نے انتہائی صبر اور ضبط کے ساتھ
اور ایک بھلے سے دیہاتی کے قریب پہنچ کر پوچھنا چاہا۔
"کیا یہ بس کرنکوٹ جاتی ہے؟"
لیکن پھر اس نے سوچا، اس آدمی کا کیا بھروسا کہ کیسا جواب دے گا۔ ممکن ہے وہ اس کے
نہ پر ہی ــ ہی کرنے لگے ــ اس نے بس پر لگے بورڈ کو پڑھنے کی کوشش کی۔
بورڈ بہت پرانا سا تھا اس زبان سے وہ واقف ہی نہ تھا۔ بہرحال کنڈکٹر سے معلوم کرکے وہ بس

میں داخل ہوگیا اور بڑی سی پگڑی باندھے مونچھوں والے دیہاتی کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ چلم پر تابڑ توڑ دم لگا رہا تھا۔

بس کی روانگی میں دیر تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔

اب بس کا انجن گھڑگھڑانے لگا۔ مسافر اپنی اپنی جگہوں پر سنبھلنے لگے۔ اس نے ایک طائرانہ نظر بس پر ڈالی۔ وہی دھکم پیل، چیخ پکار اور افراتفری کا عالم!

اس نے چلتی ہوئی بس سے جھانک کر دیکھا۔ بس ریلوے یارڈ کی کچی سڑک پر دوڑنے لگی تھی۔ پرے بیٹھے چلم پر تابڑ توڑ دم لگاتے دیہاتی سے ہم کلام ہونے سے قبل اس نے سوچا۔ پریم چند نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں کس پریم کے ساتھ اس دیہاتی کا ذکر کیا تھا۔ لیکن اس دیہاتی کی مظلومی، مجبوری کو کس نے دور کیا ہے؟ اس نے پرے بیٹھے دیہاتی کو بغور دیکھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ سانسوں میں تمباکو کے ساتھ کچھ سستی شراب کا تعفن بھی۔

"کیا پریم چند کا آنکھوں دیکھا وہ مظلوم لیکن خوش مزاج دیہاتی اب مر چکا ہے؟"

"اچھوں ــــ اچھوں ــــ اچھوں!" شراب اور تمباکو کی واہیات بدبو سے وہ بے تحاشا چھینکنے لگا۔

بچپن میں اماں نے کہا تھا۔ چھینک صحت مندی اور غیر صحت مندی کی علامت ہے۔ ... ہیں کہ شہر کی ہواؤں کا باشندہ، جہاں درختوں پر پھل پکنے سے قبل سڑ جاتے ہیں ... یہ کہ ــــ دیہات کا باشندہ جہاں جنگل کی تازہ مہکتی ہواؤں میں گھوڑے ہنہنا کر دوڑتے ... اور مہلک بیماریوں کا دور دور تک پتا نہیں رہتا۔ کون صحت مند ــــ کون غیر صحت مند۔

شاید وہ معصوم ننھا منا سا بچہ ــــ جو ایک بے حد صحت مند بدن والی دیہاتن کی بھری بھری چھاتیوں سے دودھ پی رہا ہے۔ یک دم غلط ــــ یہ ننھا سا ــــ سالونے رنگ کا پھٹی پرانی ... میں لپٹا بچہ، دراصل بچہ ہی نہیں لگتا۔ بچہ تو اسے کہتے ہیں جس کی بھولی بھالی، گول مٹول ... نرم ملائم گالوں والی تصویر پوڈر کے ڈبے پر چھاپی جاتی ہے ــــ اور لوگ۔

اچانک اسے لگا ــــ بس میں بیٹھے سارے لوگ اسے بڑی ناپسندیدہ نظروں ... رہے ہیں کہ ــــ اس کی اپنی نظریں صحت مند بدن والی دیہاتن کی بھری بھری چھاتیوں، ا... ہوتے کولھوں اور جذبات میں انتشار پیدا کرنے والے سڈول جسم کے انگ انگ میں گھ... تھیں۔ لیکن یہ انمول اور شاداب بدن تو ــــ ان گندے، بے ہودہ اور نامعقول دیہاتیوں ... ملکیت ہے۔

"بابو جی سگریٹ پلاؤ گے؟" دیہاتی بڑی حقارت سے اپنی بجھی چلم کو دیکھتے اس ... رہا تھا۔

اب یہ دیہاتی سگریٹ پینے کی آرزو کرنے لگا ہے۔ لیکن بھلا تیز تمباکو کے عادی چلم کو سگریٹ میں کیا لطف آئے گا؟

بس اپنی منزل کی جانب دھول اڑاتی، مختلف موڑ گھومتی، مسافروں کو دھچکے اور ہلکورے دیتی
بجاتی دوڑی جا رہی ہے۔ آنے والے راستے دھند میں کھوئے ہوئے ہیں، گزرے ہوئے
ں پر دھول ہی دھول اڑ رہی ہے۔ راستے دھول ہوتے ہیں، دن دھول ہوتے ہیں ——
۔ مدام ـــ سفر۔

کرنکوٹ "مدام سفر" کا آخری پڑاو قریب آ رہا تھا۔ حبیب اللہ" کی چار دیواری پر نظر پڑتے ہی وہ اس
سنبھل گیا جیسے اس نے اپنے کسی بزرگ کو سامنے آتے دیکھ لیا ہو۔ چار دیواری سے ملحق محلا
ں کے شکستہ آثار اب بھوری مائل مٹی میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اور چار دیواری کا وسیع و عریض
رسلسلہ جگہ جگہ ٹوٹ چکا تھا۔ پھر اس کے دیکھتے ہی دیکھتے بس "ٹروں" کی آواز کے
ٹوٹی ہوئی چار دیواری کو پار کر گئی۔ ابھی وہ اس غیر متوقع بد اخلاقی کا مقابلہ بھی نہیں کر پایا تھا
س کی نظر چار دیواری کے بیچوں بیچ ایک اونچے چبوترے پر چلی گئی جہاں حبیب اللہ"
ر تھا۔

فقرا و مشائخ، عقیدت مندوں اور حاجت مندوں کا ہر شام یہاں جمگھٹا رہتا تھا کہ ——
، اللہ" کے جلال اور جمال کے سلسلے ایک لاکھ اسی ہزار پیغمبروں کے واسطوں سے اب تک
تے تھے۔ رب ـــ رب العالمین ـــ"

"رب العالمین"۔ بس کے رکتے ہی اس نے گہرا لمبا سانس لیا اور اسے یہ دیکھ کر
صدمہ پہنچا کہ وہ وسیع و عریض عمارت اب برائے نام رہ گئی تھی ـــ وہ بڑی دیر تک گم سم بیٹھا بس
ترتے ایک ایک مسافر کو دیکھا کیا ـــ یہ مسافر ـــ یہ مسافر مسرت اور سکون کے ساتھ اپنی
منزل کی جانب رواں دواں جاتے مسافر ـــ کیا ان مسافروں میں کوئی ایسا مسافر
ہے ـــ جو ـــ یہ جانتا ہو کہ سفر بے سمت کیوں ہوتا ہے۔ مسافر بے سمت کیوں ہوتا ہے؟

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

ماہنامہ کتاب نما
(علی سردار جعفری نمبر)

اڈیٹر: شاہد علی خاں
مہمان مدیر: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
ضخامت: ۱۲۸ صفحات
قیمت فی پرچہ: ۵ روپے سالانہ ۴۵ رو
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئ
مبصر: خلیق انجم

"کتاب نما" کا نومبر ۹۰ء کا شمارہ "علی سردار جعفری نمبر" ہے۔ یوں تو ہندستان ا
اور پاکستان کے بہت سے رسالے ادیبوں اور شاعروں کے گوشے شائع کرتے ہیں لیکن ایسو
سے اور ایسے معیاری گوشے بہت کم کسی اور رسالے میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بڑی خوبی یہ
کہ "کتاب نما" ایسے لوگوں پر توجہ کرتا ہے جو واقعی اس کے مستحق ہیں۔ یہ گوشے ہمار
میں ممکن ہے کہ بعض حضرات کی نظر میں زیادہ اہمیت کے حامل نہ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ م
کے قاری کے لیے ہیں اور مستقبل کے مؤرخین کے لیے ہمارے عہد کی بہت سی ادبی شخصیتو
فن اور سوانحی حالات کے لیے اہم ترین مآخذ ہیں۔

سردار جعفری ۲۹ر نومبر ۹۰ء کو ۸۰ سال کے ہو چکے ہیں اور لگ بھگ ۵۵ سا
اردو شاعری اور ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ نظم اور نثر دونوں پر قدرت
ہیں اگرچہ ان کا اصل میدان شاعری ہے لیکن انھوں نے اردو ادب کو اپنی شگفتہ
اور اعلا درجے کی نثر سے بھی مالا مال کیا ہے۔ سردار جعفری، فیض احمد فیض سے کسی
کم نہیں ہیں بلکہ بعض معاملوں میں انھیں فیض پر فوقیت حاصل ہے۔ اس سے انک
کہ فیض ہمارے عہد کے بہت ممتاز شاعر تھے لیکن انھیں اپنی حیثیت سے کہیں زیاد
حاصل ہوئی۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ فیض صاحب کا پاکستان میں جیل جانا،
کی سرزمین میں ولادت پانا، اور سوشلسٹ ممالک کا جھنڈا بننا وغیرہ بہت سے اسب
ان کی شہرت کے۔ یہاں ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔ سردار جعفری کی شاعری ایک

کے اپنے جذبات کا اظہار ہی نہیں بلکہ ہندستان کے پچھلے پچاس برسوں کی تاریخ کا آئینہ ہے۔
انھوں نے بے شمار عصری موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں اور غیر ترقی پسند نقادوں کی بات ہی کیا خود
ترقی پسند نقادوں نے ان پر نعرے بازی کا الزام عائد کیا ہے۔ یہ الزام جعفری صاحب کی
پوری شاعری پر عائد نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں کچھ نظمیں اس الزام کی زد میں ضرور آجاتی ہیں۔
اس سلسلے میں میری گزارش ہے کہ بعض اوقات جوش و خروش سے لبریز خطابانہ نظموں
کی غیر معمولی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ اوقات وہ ہوتے ہیں جب کوئی قوم کسی عظیم مقصد
کے لیے جہاد کر رہی ہوتی ہے اور مجاہدین میں قربانی اور ایثار کے جذبے کو ابھارنا ہوتا
ہے۔

سردار جعفری آج بھی اردو دنیا کے اہل ذوق حضرات کے دل پر راج کرتے ہیں اور
یہی فن کار کی زندگی بھر کی محنت کا صلہ ہوتا ہے۔

"کتاب نما" کے اڈیٹر شاہد علی خاں اور مہمان اڈیٹر رفیعہ شبنم عابدی دونوں
ایسے مفید اور شاندار خصوصی شمارے کے لیے ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

غزل پارے

(شجاع خاور کی غزلوں کے سوا سو منتخب اشعار)

مرتبین:۔ نورجہاں ثروت و سراج درپن
ملنے کا پتا: شمع سشما بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی
قیمت: ۱۰۰ روپے

جدید غزل کا دروئی سلسلہ میر سے ہے کہ میر ایک غیر معمولی حسیت کے شاعر تھے اور آج کے شاعر
ان کی طرح ایک بحرانی عہد میں لکھ رہے تھے۔ شجاع خاور اور ان کے ہم عصر شاعروں کا رابطہ ہمارا دیا
صدی کے میر سے اس لیے بھی گہرا ہے کہ یہ شعرا بھی ایک ایسے عہد میں شعر کہہ رہے ہیں جو خود
اپنے آپ سے نبرد آزما ہے۔ شجاع خاور کی شاعری میں تنہائی کے ساتھ ساتھ سماجی مجلسیت
اور انفرادیت کے شانہ بہ شانہ روایت کا شعور جا بجا نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں ایک طرح کے غیر رسمی
پن، اور شاعرانہ تصنع سے انحراف کی کیفیت کہیں کم اور کہیں زیادہ موجود ہے۔

اس انتخاب (غزل پارے) میں، شامل کچھ اشعار اپنی بندش اور گہرائی کے سبب متاثر
کرتے ہیں۔ ایسے اشعار کی جودت اور تیکھا پن ترجمے میں قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ شجاع خاور
کے ایسے مخصوص اشعار ہمارے ذہن کو ان مخصوص عوامل کی طرف لے جاتے ہیں جن سے اردو
زبان کے ذخیرے اور اس کی معنویت عبارت ہے۔

نہ جانے کیوں شجاع خاور کی شاعری میں ان قلندروں کے نعروں اور آوازوں کی
گونج سی سنائی دیتی ہے جو کبھی پرانی دلّی کے خاموش گلی کوچوں میں شبانہ آوارہ گردی
کیا کرتے تھے مگر ان غزلوں میں وہ بھی موجود ہے جسے ہم شہری فہم و فراست اور اجتماعی
تجربات سے منسوب کر سکتے ہیں۔

اردو کے اہم اور غیر اہم شعراء نے بے شمار اشعار کہے ہیں جو انسانی صورت حال پر زمان و مکان کی حدود سے ماورا ایک ہمہ گیر تبصرے کا وقار اور اعتبار رکھتے ہیں۔ ایسے اشعار میں ایک ہمہ گیر اور آفاقی تاثیر ہوتی ہے، اردو شاعری کی اسی خصوصیت نے اسے خاص و عام کے لیے یکساں طور پر خاصے کی چیز بنا لیا ہے، جس سے عالم اور نادان دونوں اثر اور اک اور حظ لیتے رہے ہیں۔ شجاع خاور اردو شاعری کی اسی مخصوص اور عوامی روایت کے شاعر ہیں جس میں اشعار زبان زد ہو جاتے ہیں۔

کچھ اشعار

دکانیں شہر میں ساری نئی تھیں ہمیں سب کچھ پرانا چاہیے تھا

اٹھاتا ہے کوئی اور آج کل خرچہ قلندر کا نہ وہ تیور قلندر کے نہ وہ لہجہ قلندر کا

تنہائی کا اک اور مزہ لوٹ رہا ہوں مہمان مرے گھر میں بہت آئے ہوئے ہیں

گذشتہ لمحات کو بلا لو نوشتہ الفاظ کو ملا لو

جواب تیار کر کے نکلو سوال باہر کھڑا ہوا ہے

(قرۃ العین حیدر) (انگریزی سے ترجمہ)

ابر احسنی اور اصلاحِ سخن

مرتبہ: پروفیسر عنوان چشتی۔ نعیم الدین رضوی

قیمت: سو روپے

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مبصر: ڈاکٹر اجمل اجملی

دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ فنونِ لطیفہ، علم اور سائنس کے میدانوں میں بھی نت نئے گوشے بے نقاب ہو رہے ہیں اور نت نئی شاندار کامیابیاں حاصل کی جا رہی ہیں، وہیں ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ ہم علم و سائنس کی بہت سی ایسی روایات کو بھولتے جا رہے ہیں جو ایک زمانے میں خوبصورت اور سجیلی روایات سمجھی جاتی تھیں۔ علوم و فنون کے بعض ایسے شعبے دھیرے دھیرے معدوم ہوتے جا رہے ہیں جنھوں نے انسانی تہذیب کو آگے بڑھانے میں اپنے زمانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ علوم کے سلسلے میں علم جفر اور علم الانساب کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ نسل انسانی کی ایک اہم دین اور تہذیب کی ایک تاریخ ساز روایت کے طور پر ان کی بازیافت کی جائے اور اس صورت میں اپنے ماضی کو مستقبل کے لیے محفوظ کیا جائے۔

پروفیسر عنوان چشتی اور نعیم الدین رضوی کی مشترکہ پیش کش "ابر احسنی اور اصلاحِ سخن" ایک ایسی ہی بازیافت ہے۔ یوں تو یہ کتاب مولانا ابر احسنی گنوری اور ان کے طریقۂ اصلاح سے بحث کرتی ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ مرتبین نے بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ علم معانی و بیان اور فنِ عروض کے اہم نکات بھی ۲۵۶ صفحات کی اس کتاب میں سمیٹ دیے

ا جس کے لیے پروفیسر عنوان چشتی اور نعیم الدین رضوی صاحب قابلِ مبارک باد ہیں۔

اصلاحِ سخن کی روایت اردو شاعری کی ایک مضبوط روایت رہی ہے۔ عالی مرتبت ا تذۂ سخن نے ہر دور میں اصلاحِ سخن کے ذریعے ایسے ذہنوں کی آبیاری کی ہے، جن نگارشات نے ہمارے ادب کا پلڑا گراں کیا ہے۔ شاہ حاتم سے لے کر مولانا ابر احسنی ـ ایسی ایک کہکشاں سی کھنچی نظر آتی ہے۔ سودا، ذوق، اور داغ اس کہکشاں میں اپنی ا جگہ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ جناب داغ دہلوی نے ایسے شمار بالغ نظر اساتذہ کو جنم دیا جنھوں نے زبان و بیان اور فن شاعری کی مشترکہ بیقہ رموز و اسرار اپنے بعد کی پوری پوری پیڑھیوں تک پہنچائے ہیں۔ جناب احسن مارہروی اب سیماب اکبر آبادی اور جناب نوح ناروی کو شاگردانِ داغ میں اور مولانا ابر احسنی داغ اسکول کی تیسری پیڑھی میں اپنی اپنی جگہ شعر و شاعری کی دانشگاہوں کی حیثیت صل ہے۔ اس لحاظ سے پیشِ نظر کتاب ایک تاریخی اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ مرتبین حسنِ نظر سے کام لیتے ہوئے جناب ابر احسنی کی خود نوشت کے کچھ صفحات اپنے ادبی طۂ نظر کے بارے میں اُن کا ایک مقالہ اور جناب داغ دہلوی کی طرزِ اصلاح پر مولانا سن مارہروی کا مضمون بھی کتاب میں شامل کر دیا ہے جس سے کتاب کی اہمیت اور دیت خاصی بڑھ گئی ہے۔

اصلاحِ سخن کی روایت سے آج اختلاف کیا جائے یا اتفاق، لیکن ایک بات کا اعتراف بہر حال کرنا ہوگا کہ اس روایت نے اشعار کو نکھارنے اور سنوارنے میں اور ہماری شاعری ایک معیاری درجہ عطا کرنے میں نمایاں رول ادا کیا ہے۔ کوئی شعر باشعور استاد کی نظر سے گزرنے کے بعد کس طرح نکھر جاتا ہے، اس کا اندازہ اُن اصلاحوں سے ہوتا ہے جو اس اب میں شامل ہیں۔ اس سے پہلے صفدر مرزا پوری کی مشاطۂ سخن، سیماب اکبر آبادی دستور الاصلاح اور مولانا ابر احسنی کی اصلاح الاصلاح اور میری اصلاحیں (حصہ اول و م) ہی ہمیں اصلاح کی روایت اور اہمیت کا احساس دلاتی تھیں۔ "ابر احسنی اور اصلاح نخن" اس قبیل کی کتابوں میں ایک اہم اضافہ ہے۔ جس کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ اس دایت کو نئی زندگی ملی ہے بلکہ اس میں عصرِ جدید کی علمی شان بھی پیدا ہو گئی ہے۔ کیونکہ ان مسائل پر جن لوگوں نے اظہارِ خیال کیا ہے، لگ بھگ وہ سبھی جدید علم کی وشنی سے بھی آراستہ ہیں اور اس لیے اُن کا نقطۂ نظر اور طرزِ استدلال عصرِ حاضر کے اضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہ کتاب مبتدی شعرا کے لیے بھی مفید ہے۔ ر اُن بالغ نظر اہلِ دانش کے لیے بھی جنھیں اپنے ماضی کی اہم قدروں کو دیکھنے، سمجھنے ر پرکھنے کا شوق ہو۔

کمندِ حرف

مصنّف: عمران عظیم
صفحات: ۱۲۸
قیمت: ۵۰ روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۲۵، علی گڑھ ۲، بمبئی ۳
مبصّر: پروفیسر عتیق احمد صدیقی

گنگوہ کی مقدس و مردم خیز سرزمین، نیر قریشی کا ادب آفریں گھرانہ، علی گڑھ کی تربیت ممتاز شاعر اور معروف نقاد عنوان چشتی کا تلمذ، دلی کی شور انگیز سرزمین اور اس سے حاصل ہونے والے تجربات۔ ان سب سے کسب فیض کرنے والی شخصیت کا نام ہے عمران عظیم ملکہ شاعری تو فیضان ربانی ہے، لیکن بصیرت کی آنکھوں کو کھلا رکھنا، زندگی کی ہما ہمی سے تجربات حاصل کرنا، مسائل حیات کو غور و فکر کا موضوع بنانا، روزمرہ کے عام واقعات سے نتا[ئج] حاصل کرنا، اور پھر ان سب کو اپنی شخصیت کا جز بنا کر شعور کے ساتھ شعر کے پیکر میں ڈھال دینا مشق و ریاضت کا طالب ہوتا ہے اور اسی لیے وہبی قوتوں کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا[ہے] عظیم اس ملکہ شاعری اور ان وہبی قوتوں کی پرورش و پرداخت کر کے برابر پروان چڑھ رہے ہیں۔

معاش کے لیے عمران عظیم نے پیشۂ وکالت اختیار کیا اور قوت تخلیق کے اظہار کے لیے شاعری۔ ان دونوں کے درمیان پل بنانے والی ہیں، ان کی دیگر ادبی مصروفیتیں۔ جن میں ان کا تخلیقی کام میں مشغول ہونا بھی شامل ہے۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام "کمند حرف" سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ان دونوں میں۔ پیشہ اور شوق میں۔ توازن کو برقرار رکھا ہے معلو[م] نہیں ان کی شاعری ان کی وکالت میں کس قدر معاون و مفید ہے، لیکن ان کی وکالت پیشہ کے تجربات کا عکس ان کے کلام میں جا بجا دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کا ان کو خود بھی احساس ہے تبھی تو انھوں نے اپنے تعارف میں لکھا ہے۔

> "شاعری چونکہ میرا پیشہ نہیں شوق ہے، اس لیے اپنی شاعری کو صرف اپنے مشاہدے و تجربے تک محدود رکھا ہے۔"

یہ تجربے کیا ہیں؟ ذرا تصور کیجیے۔ گنگوہ کی قصباتی اور روایتی اقدار کی حامل فضا سے [آنے] والا نوجوان، علی گڑھ کی پُرسکون اور جدید و قدیم کی آویزش کی آماجگاہ میں تعلیم پا کر [دلی] کے گرداب زدہ ماحول میں پہنچ جاتا ہے۔ اس کے پاس اقدار و روایات کے کچھ معیار ہیں، مسندات ہیں، دماغ روشن ہے، نوجوانوں کا حوصلہ و جرأت مندی اس کے اندر موجود ہے، [آگے] بڑھنا اور کچھ کر دکھانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے حالات بھی ساز گار ہو گئے ہیں۔ مگر دلی کی فضا اسے پسند نہیں، لیکن وہ اس سے نہ بد دل ہوتا ہے نہ روٹھ کر منہ موڑ لیتا ہے، [فض]ا کو یکسر مسترد کرتا ہے۔ وہ اس کو بلا چوں و چرا اپنا بھی نہیں سکتا اس کی تاریکیوں کو روشنی

کہہ سکتا، وہ اس کی طرف بڑھتا بھی ہے اور اس سے لرزاں و ترساں بھی ہے اور اس سے اس کے ذہن میں ایک کیفیت رستاخیز پیدا ہوتی ہے اور یہی رستاخیز اس کے بہت سے شعروں کا موضوع بنی ہے ؎

میں اس کے شہر سے نکلوں تو کس طرح نکلوں	وہی خفا بھی کرے اور وہی منائے بھی
تعلقات کی پروا نہ، نہ غم طعام کا ہے	عظیم شہروں میں بس مسئلہ قیام کا ہے
آپ کے شہر میں کب میری طرف تھا کوئی	یہ بھی کیا ہجر گزاری کا شرف تھا کوئی
احباب کا شکوہ بھی بجا ہے مگر اب تو	خود سے بھی ملاقات کی فرصت نہیں ہوتی
جسے دیکھو وہی اس شہر میں انجان لگتا ہے	میں اپنے ہی مکاں کا راستہ کس سے بتا مانگوں

اور اسی کے ذیل میں یہ اشعار بھی غور طلب ہیں ؎

نئی تہذیب کی مسموم لہریں کارفرما ہیں	اجڑتی جا رہی ہیں بستیاں آہستہ آہستہ
اب دیکھنا ہے آخر تعبیر ان کی کیا ہو	خوابوں کی رہ گزر سے تنہا گزر رہا ہوں

شاعر طرح طرح کے تجربوں سے گزر رہا ہے۔ ان میں سے ابھی بہت سے راست (اور اس لیے کبھی کبھی سپاٹ) بیان کر دیا گیا ہے۔ اس طرح کے بیانات کو ہم سچا تو کہہ سکتے ہیں مگر ان کی شاعری ہونے میں شبہہ کیا جا سکتا ہے ؎

گرمی کی طویل چھٹیوں میں	مکتب کے کواڑ سو رہے ہیں
چھت آنگن پر کوّے بولا کرتے ہیں	جانے کس کی آمد کا دم بھرتے ہیں
جب بھی رخصت ہوتا ہے گھر سے بیٹا	ماں کی آنکھوں میں کچھ تارے بھرتے ہیں
لو کا موسم ہو یا سردی کی شدت	مفلس بچے دن بھر محنت کرتے ہیں
ڈائری نے اسے محفوظ کیا ہے یکسر	میری آنکھوں نے کسی روز جو منظر دیکھا

اب اگر یہ سوال اٹھے کہ سچائی زیادہ اہم ہے یا شاعری تو بحث کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ لیکن سچائی کے بیان میں بھی قاری شاعر سے شعریت کا تقاضا تو کرے گا اور کہیں یوں محسوس ہوتا ہے یہ تقاضا پورا نہیں ہو رہا ہے۔

مجموعی طور پر اس مجموعے سے ایک نئی ابھرتی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ ابھی مدھم سہی، نامانوس سہی، اکھڑی اکھڑی سہی، لیکن فہم و شعور کے ساتھ جاری رہی تو اپنے نئے پن کو محسوس کرائے گی اور تعلیم کرائے گی۔

بہار میں اردو طنز و ظرافت

مؤلف: سلطان آزاد
صفحات: ۱۲۸ قیمت: ۵۰ روپے
ناشر: مکتبہ آزاد پبلیکیشن، گلزار باغ پٹنہ۔
مبصر: سید فیاض الرحمٰن

اصناف ادب میں تحقیق و تذکرہ بڑا ہی مشکل کام ہے۔ فن اور فن کار جس قدر قدیم و وسیع ہوتے ہیں، احتیاط کا دائرہ اسی قدر وسیع ہو جاتا ہے۔ غور و فکر کی وادی وسیع و عریض ہوتی

ہے اور یہ کھٹکا بہر حال موجود رہتا ہے کہ حرف گیری اور نکتہ چینی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ مؤلف اپنے شہکار کو متوقع حالات کا مقابلہ کرنے کے لائق بنا کر پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ مختصراً یہ صنف برسوں کی تگ و دو اور ریاضت کی طالب ہے۔

سلطان آزاد کی یہ تالیف اس کی غماز ہے کہ مؤلف اور صنفِ تحقیق میں گہرا یارانہ ہے مؤلف کی پہلی تخلیق "دبستان عظیم آباد" بھی تحقیق و تذکرے کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے تحقیق و تذکرہ سنگلاخ زمین سے جوئے شیر رواں کرنے کا عمل ہے۔

"بہار میں اردو طنز و ظرافت" پر یہ پہلی کتاب ہے۔ تذکرہ نویسی کے ضمن میں مذکور کتب کی خصوصیت یہ ہے کہ سلطان آزاد نے اپنی کتاب میں جدت سے کام لیا ہے، یعنی بہار کے ۳۵ طنز و مزاح نگاروں کی تصاویر بھی یکجا کی ہیں۔ مؤلف نے "دو باتیں" عنوان قائم کر کے جن باتوں کا ذکر کیا ہے وہ غور طلب ہیں۔ تقریظ میں صدر شعبۂ اردو - جی ایل۔ اے کالج ڈالٹن گنج (بہار) پروفیسر نادم بلخی نے سلطان آزاد کی ادبی شخصیت کا پیارا سا نقشا پیش کیا ہے۔ جناب یعقوب تابش نے آدارہ بن کر قطعہ تاریخ میں بھی ظرافت کا چھڑکاؤ کیا ہے۔ علاوہ بریں مؤلف نے بہار میں طنز و ظرافت سے متعلق ایک جامع مضمون شامل کتاب کیا ہے۔ ان کی یہ تحریر ادب میں ان کا مقام متعین کرنے کے لیے کافی ہے۔

مذکور کتاب منظومات و منثورات عنوان کے تحت دو حصوں پر مشتمل ہے منظومات کی صف میں ۴۸ شعرا کرام حوالہ جات کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصے میں ۲۲ نثر نگار اپنی تخلیقات کی بانگی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ قاری کو مطالعہ کے دوران راہ ظرافت کے بہت سے سنگِ میل نظر آئیں گے۔ یعنی اس کتاب کے اسیران "طنز و ظرافت" نے کس عمر میں جام ظرافت نوش کیا، کب توبہ کی اور کب توڑ دی اور کون ماضی تا حال علم ظرافت بلند کیے ہوئے ہے۔ یہ سب واضح ہو جائے گا۔

مذکورہ مشمولات کے پیش نظر امید ہے یہ کتاب ادبی حلقوں میں بہ نظر تحسین پڑھی جائے گی۔ پیش کش کے لحاظ سے بھی کتاب کی طباعت خوبصورت و دیدہ زیب ہے۔

پھول جیسے لوگ

مصنّف: انور خاں

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

قیمت: ۴۰ روپے

مبصّر: پروفیسر محمد شفیع

جس طرح غزل کہنا بہت آسان ہے لیکن اچھی غزل کہنا بہت مشکل، اسی طرح ایک اچھا ناول لکھنا، ناول نگاری کے تمام تقاضوں سے انصاف کرنا بہت مشکل کام ہے۔ زیر تذکرہ ناول "پھول جیسے لوگ"، ایک اچھا ناول لکھنے کی کامیاب کوشش ہے۔

انور خاں کا یہ تازہ ناول چھوٹی تقطیع کے تقریباً دو سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک بہت ضخیم ناول نہیں ہے۔ یہ ضخیم ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ناول نگار نے

دانستہ اپنا کینوس چھوٹا رکھا ہے لیکن اس پر بنائی گئی تصویریں اپنے اندر ابعادِ ثلاثہ 3 DIMENTIONAL گہرائیاں رکھتی ہیں۔

"پھول جیسے لوگ"، متوسط طبقے کا المیہ ہے۔ متوسط طبقے کی حرماں نصیبی، ازلی کشمکش اور جہدِ مسلسل پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو سماج کی چکی کے دو پاٹوں میں مسلسل پس رہا ہے۔ اپنی بقا کے لیے اس طبقے کے افراد اپنے اصولوں اور اقدار کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اور "نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" کا مرقع بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس ناول میں اس طبقے کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ عروس البلاد بمبئی میں اس طبقے سے تعلق رکھنے والے سیکڑوں خاندان آباد ہیں۔ روپے کی ریل پیل اور دولت کی چکاچوند نے بیشتر خاندانوں کو اپنے اقدار اور اصولوں کو قربان کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ "پھول جیسے لوگ" ایسے ہی ایک خاندان کی کہانی ہے جو صالح اقدار کا حامل ہے۔ لیکن بے عملی، تن آسانی اور راتوں رات امیر بننے کے خواب نے اس خاندان کو اس کی اقدار کو جن پستیوں کی طرف ڈھکیل دیا وہ یقیناً مرقعِ عبرت ہے۔

اس ناول کا ہیرو، متوسط طبقے کا ایک اُبھرتا ہوا اور قابل نوجوان سعید ہے جو ایک انجینیر کا بیٹا ہے لیکن والد کی بے وقت موت نے اس کی زندگی میں بڑا تغیر پیدا کر دیا ہے۔ دو بہنوں کا تنہا بھائی ہے۔ بیوہ ماں کی ساری امیدیں اسی پر مرکوز ہیں۔ شفقت اور محبت کی زیادتی نے اسے قدرے مغرور اور کاہل بنا دیا ہے۔ یوں بھی اکلوتے لڑکے کی نازبرداریاں ہمارے سماج کے افراد کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ لڑکی پرایا دھن ہے۔ لڑکا تو بڑھاپے کا سہارا ہوتا ہے۔ اس تصور نے خاندانوں ہی میں اونچ نیچ اور ذات پات کی ایسی دیواریں کھڑی کر دی ہیں جن کا یک لخت توڑنا یا ٹوٹ جانا ممکن نہیں ہے۔ سعید کی امّی بھی اسی سماج کی پروردہ ہیں اور کچھ زیادہ مختلف ذہن نہیں رکھتیں۔

سعید کی امّی یہ زیادتی اپنی بیٹی شہلا کے ساتھ کر رہی ہیں۔ شہلا دبلی پتلی نازک اندام اور خوبصورت سی ایک نوجوان لڑکی ہے جس نے ابھی ابھی سپنے دیکھنے شروع کیے ہیں۔ شہلا کے پھوپھی زاد بھائی صفدر نعمانی جو انتہائی بدصورت، فربہ اندام اور شہلا سے تقریباً ۱۵ سال عمر میں بڑے ہیں، جن کی پہلی بیوی موجود ہے اس کوشش میں شہلا سے ان کی شادی ہو جائے۔ اس بات کو صرف شہلا ہی نہیں خاندان کا کوئی بھی فرد پسند نہیں کرتا۔ مگر صفدر نعمانی ایک تجربہ کار شکاری کی طرح نہایت صبر سے اپنے شکار پر نظریں گاڑے ہوئے ہے اور اپنی دولت کو اس شکار کے چارے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ سعید جو نئی روشنی کا نوجوان ہے جو یہ جانتا ہے کہ بے جوڑ شادی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔ جسے اپنی چھوٹی بہن کے لیے کسی بھی ایسے رشتے کی شدت سے مخالفت کرنی چاہیے مگر وہ اپنے ضمیر کا خون کر کے ایسے رشتے کی وکالت کرتا ہے۔

"آخر صفدر بھائی میں کیا خرابی ہے؟... صرف یہی نا کہ وہ عمر میں کچھ زیادہ ہیں تم سے... شہلا تم خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی ہو۔ تم بالکل ناتجربہ کار ہو۔ میں تم

سے بارہ سال بڑا ہوں اور میرا تجربہ یہی بتاتا ہے کہ پیسوں کے بغیر آدمی دو کوڑی کا رہ جاتا ہے۔ جذبات سے ہٹ کر دیکھو تو تمھیں اپنا مستقبل صدر بھائی کے ساتھ بالکل محفوظ نظر آئے گا۔"

لڑکوں کو فوقیت دینا اور لڑکیوں کے ساتھ سوتیلا سلوک روا رکھنا ہمارے سماج کے دامن پر ایسا بدنما داغ ہے جس کی سیاہی ہزاروں لڑکیوں کا مقدر بن چکی ہے۔ اپنے لڑکے کو ترقی کی راہ پر گامزن کر کے قدامت پرست ماں جو مذہبی ماحول کی پروردہ ہے اور خود پنج وقتہ نمازی ہے۔ اپنی بیٹی شہلا کو فلموں میں کام کرنے کی اجازت دے دیتی ہے۔ غیرت مند بھائی جو اپنی بہن کو ترقی کا زینہ بنا کر استعمال کرنا چاہتا ہے اپنے ساتھ اسٹوڈیو لیے لیے پھرتا ہے اور بدطینت اور بدکردار فلم ڈائرکٹروں سے ملاقات کروانے میں کوئی برائی نہیں سمجھتا۔

اس ناول میں بمبئی کے فلمی ماحول کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔ فلمی دنیا بھول بھلیاں ہے جو اس میں ایک بار داخل ہو گیا اس کا لوٹ آنا ممکن نہیں ہے۔ عزت نفس اور شرافت ایسے سکے ہیں جو اس دنیا میں نہیں چلتے۔

انور خاں نے اپنے اس ناول "پھول جیسے لوگ" میں ایک نئی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ سعید جو کہانی کا ہیرو ہے، دماغی ناسور میں مبتلا ہے اور اس کے ذہن پر بے ربط سی تصویریں ابھر رہی ہیں۔ تصویروں کی یہ پرچھائیاں اپنے اندر ماضی کا سارا کرب سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان الگ الگ تصویروں کی پیوند کاری سے ناول نگار نے اپنے پورے ناول کا خاکہ تیار کیا ہے۔ اس ناول کے ہیرو کے ذہن پر وہی کیفیت ہے جو غالباً ساحر کی رہی ہوگی جب اس نے کہا تھا تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں۔ کبھی یقین کی صورت کبھی گماں کی طرح۔

انور خاں نے اپنے ناول کے مختصر سے کینواس پر جو رنگ بکھرے ہیں وہ قوس قزح کے رنگ نہیں ہیں جنھیں دیکھ کر دل میں مسرت کی ایک لہر سی اٹھتی ہے بلکہ یہ وہ رنگ ہیں جو غروب آفتاب کے وقت آسمان کے چہرے پر بے ترتیب سے کھیلے نظر آتے ہیں جنھیں دیکھ کر فرحت و انبساط کا احساس نہیں ہوتا بلکہ عظیم سورج کے دم توڑتے ہوئے وجود کا کربناک منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مہمل تحاکی ری سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

● جذبی نے امتیاز صاحب کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا
انھوں نے اپنے دادا کا لغت مجھے دے دیا ہے۔ یہ جذبی
ب کا نسیان ہے۔ وہ لغت اب بھی اُنھیں کے پاس
راس لائق ہے کہ اُس کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔
ے انھوں نے فرمائش کی تھی کہ میں اُس پر کام کروں۔
نے حامی بھرلی تھی، لیکن اُسی دوران میں طویل عرصہ کے
ہندستان کے باہر چلا گیا اور یہ منصوبہ بھی بہت سے
ے ادبی منصوبوں کی طرح معرضِ التوا میں پڑگیا۔
سردار جعفری اکبر میں رفیعہ شبنم عابدی کے ذریعہ معلوم
ترقی پسند تحریک اور شیعہ فرقہ متماثل ہیں۔ اسلامی ادب
متنفر جعفری صاحب بتائیں گے کہ یہ کون سا ادبی محاذ
، میرا خیال ہے کہ قادیانیوں نے اختر اورینوی اور شکیلہ اختر
ے فکشن نگاروں کو پیدا کرکے اور اختر اورینوی جیسا نقاد
ا کرکے ترقی پسندوں سے آگے کی جست لگائی ہے کیا
تی ہیں رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ۔ پروفیسر ڈاکٹر سید جعفر
ن صاحب مرحوم (لکھنؤ کرسچن کالج) اور پروفیسر
شام حسین صاحب مرحوم میرے اُن اساتذہ میں سے تھے
صرف یہ کہ مجھے محبوب تھے بلکہ مجھے بھی اُن کی شفقتوں
محبتوں کی دولت حاصل رہی ہے۔ میں نے ان دونوں
ادب کی ایسی کوئی تشریح یا ادیبوں کی ایسی کسی صف
ی کا ذکر نہیں سنا تھا۔ میرا خیال ہے کہ جعفری صاحب
رے سلام کا جواب دے دیا کریں گے۔ (ابن فرید، رامپور)

● جنوری سالنامہ کے کتاب نما کے اشاریہ میں جعفر عباس
صاحب نے اردو کے موجودہ ادیبوں سے ایک سوال پوچھا
ہے کہ اردو کے موجودہ ادیب اپنے گرد و پیش کے احوال
سے لاتعلق کیوں ہیں؟ سوال بڑا اچھا ہوا ہے اور اس
اعتبار سے قابلِ توجہ ہے کہ آپ نے ۱۹۹۰ء کے پہلے ہی ماہ
میں یہ سوال اٹھایا ہے تاکہ پورے سال اس پر بحث بھی ہو
اور توجہ بھی کی جاسکے۔

یہ بے چارے اردو کے ادیب جو خود اردو زبان
کے لیے اب تک کچھ نہیں کر پائے ہیں اور بے تعلق سے بیٹھے
ہیں ہمارا اردو بولنے والوں کے مسائل سے اپنا تعلق کیا ظاہر
کرسکتے ہیں۔ آپ نے بھی پڑھا ہوگا کہ اردو کے کچھ ادیب
حکمراں طبقے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اردو رسم الخط
ہی بدل دینا چاہتے تھے۔ اور آپ نے کئی سال تک یہ بھی
دیکھا کہ اردو کے ادیب دوسرے ملک کا لال پھریرا اردو
کے میدان میں گاڑنا چاہ رہے تھے۔ ان کے بعد کی نسل
نے تمام مغربی طرزِ تحریر کو اردو میں رائج کرکے اپنی دانشوری
کا سکہ بٹھانا چاہا۔ یہ تو اردو کے ادیب سرسید کے بعد سے اردو
دنیا کے مسائل سے لاتعلقی کا نمونہ پیش کرتے رہے موجودہ
ادیب اگرچہ اپنے گرد و پیش کے احوال سے لاتعلق نظر آتا ہے
مگر دراصل وہ ان دونوں اپنے تعلق اور تعلقات سے جڑا
ہوا دکھائی دیتا ہے یعنی آج کا اردو ادیب اردو اکیڈمیوں
سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہے اس معاملہ میں اس قدر
منہمک ہے کہ وہ کسی دوسری جانب نگاہ اٹھا کر دیکھنا نہیں
چاہتا۔ وہ ان دونوں اپنی اس پرانی شکایت کو دور کر رہا
ہے کہ اردو کی خدمت کرتے کرتے میر و غالب تو مفلسی میں
دم توڑ گئے مگر آج کے اردو ادیب اس تاریخ کو دہرانا نہیں
چاہتے خود ہماری صوبائی اور مرکزی حکومت اس کام میں
ان کی مدد کر رہی ہے۔ اردو ادیب، دیوانہ بکار خویش ہشیار
کے مصداق اپنی تخلیق کا مدعا انعام و اکرام کو بنائے ہوئے
ہے گرد و پیش کے احوال کو نہیں۔ وہ یہ بھی سوچتا ہے کہ انعام
و اکرام نہ ملے تو کم از کم مالِ مفت کے پیشِ نظر اکیڈمیوں سے کسی

نہ کسی بہانے روپیہ وصول کرے۔ تخلیقی ادب کی اعلا قدروں کو چھوڑ کر وہ ان دنوں کسب معاش، نام و نمود و شہرت کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اپنی ذات سے جڑ گیا ہے غیر ذات کو چھوڑ گیا ہے۔ اوّل آخر شکم بعد خورد و نوش کی تفسیر بنا ہوا ہے۔ آج کے ادیب نے یہ راز پالیا ہے کہ بھوکے پیٹ ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ کردار سے زیادہ پیٹ کی ہیئت کو دیکھتا ہے۔

ایک سوال میں بھی مہمان مدیر ڈاکٹر سید عبدالباری سے کرنا چاہتا ہوں کہ اردو کا ادیب کیا اردو والوں کی بپتا پر اپنے ادب کی عمارت کھڑی کرے یا انسانی دکھ درد کے اظہار کو اپنے فن کی بنیاد بنا لے۔ یہ تو عجیب بات ہوگی کہ چونکہ اس وقت اردو والوں پر غیر اردو والے (مراد فسادات) یلغار کر رہے ہیں اس لیے اردو کے ادیب صف آرا ہو جائیں۔ اس طرح کی ذمہ داری اردو کے تخلیقی فن کاروں پر نہیں ڈالی جا سکتی۔

ہاں اردو کے صحافی، اردو اخبارات اور اردو کے دوسرے لیڈران پر ڈالی جا سکتی ہے۔ مولانا وحیدالدین خاں مسلسل اپنے "الرسالہ" کے ذریعے اس ناگہانی مصیبت سے لڑنے یا نپٹنے کے لیے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ اردو اخبارات میں دعوت اور ممبئی کے اخبارات میں اردو ٹائمز اور اخبار عالم کے ذریعے اس طرف پوری توجہ دی جا رہی ہے۔

ادبی تخلیقات کا اسٹائل بالکل الگ ہے۔ فسادات پر چند شعر کہہ دینا یہ کوئی تخلیقی کام نہیں ہے انسان کی مظلومیت کو محسوس کرنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ انسان کو اردو اور ہندی جاننے والوں میں تقسیم کر کے صرف فسادات کے مظلوموں پر لکھا جائے۔ یہاں پر ادب سے زیادہ صحافت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

آپ نے جو اشعار مثال کے طور پر دیے ہیں ان میں ایک آدھ ہی شعر تخلیقیت کے مرتبے تک پہنچتا ہے اس طرح کے اشعار تو ہماری پرانی غزلوں میں بہت ہیں فرق صرف یہ ہے کہ وہاں ظالم معشوق تھا اور مظلوم عاشق۔ آج ظالم غیر اردو والا ہے اور مظلوم اردو والے۔ لیکن دونوں جگہ مظلومیت ایک ہی ہے۔ انسان کے دل کا دکھنا اہم ہے چاہے وہ عاشق کا دل ہو یا اردو والوں کا۔

اس مشہور شعر پر توجہ کیجیے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

اس شعر کے پردے میں ایک ظالم ہے ایک مظلوم۔ اس شعر کو ہر مظلوم اپنے حسب حال پاتا ہے۔ یہاں تک کہ بمبئی کی ایک سیاسی پارٹی شیوسینا نے دیواروں پر اس شعر کو دیوناگری میں لکھ کر اپنی مظلومیت کی شکایت ایک زمانے میں کی تھی۔ اب آپ ہی بتائیے کہاں اکبر الہ آبادی کا شعر اور کہاں شیوسینا کا قاتل۔ اصل سوال ظلم کی نوعیت کا ہے۔ ادیب چاہے وہ اردو ادیب ہو، اس کے اندر تخلیقی تحریک کا باعث وہ ظلم ہے چاہے وہ جس پر ہو۔

آپ نے جو اشعار پیش کیے ہیں وہ خام جذبات کے مظہر ہیں جذبات جب پختگی کا مرحلہ طے کر لیتے ہیں تب ہی کے قلم میں جھرجھراہٹ ہوتی ہے۔ ورنہ صرف فسادات پر لکھنا چاہیں تو کئی دیوان تیار کیے جا سکتے ہیں مگر وہ کس کام کے۔

(سید محمد رضا، بمبئی)

● کتاب نما کا خصوصی شمارہ بابت ماہ نومبر ۹۰ء علی سردار جعفری نمبر کی شکل میں اشاعت پذیر ہوا۔ سردار کی پیدائش کے مہینہ میں شائقین ادب کے لیے یہ بہترین تحفہ ہے۔ اس سے پہلے کا شمارہ "گوشۂ جذبی" سے مزین تھا۔ اردو ادب کی کساد بازاری کے اس دور میں جب سنجیدہ مطالعہ کے مواقع اور شوق دونوں میں کمی آتی جا رہی ہے۔ ہم اپنے معروف و ممتاز شاعروں اور ادیبوں سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کتاب نما ان مشاہیر ادب سے متعلق مخصوص گوشوں اور خصوصی شماروں کا اہتمام کر کے اس کمی کو دور کرنے کی قابل ستائش ادبی خدمت انجام دے رہا ہے اس کے لیے کتاب نما کا ادارہ مبارک باد کا مستحق ہے۔

سردار جعفری کی دو تصویریں جو دو متضاد کیفیات کی عکاس ہیں اس خصوصی شمارے میں چار چاند لگا رہی ہیں۔ سرورق کی تصویر گل تر کی طرح شگفتہ و شاداب ہے

کے بعد بھی خزاں نا آشنا ہے ۔ سردار کی شگفتہ
انداز ۔ خدا کرے یہ تر و تازگی تاحیات قائم رہے ۔
تصویر سرد و گرم چشیدہ دانش ور سردار کی بے ذوق
شعلہ سامانی کے اثرات خد و خال سے نمایاں ۔ انسانی
ائی کا احساس کرب چہرے سے عیاں ۔ یہ تصویر مصوّر
ار کے موئے قلم کا اعجاز ہے ۔

ڈاکٹر رفیعہ شبنم نے بڑے سلیقے سے اس شمارے
وتدوین کی ہے ۔ ہر چند کہ بیشتر مضامین ذاتی
ور تقریظی نوعیت کے ہیں اور تنقید و تبصرہ کی کمی
س ہوتی ہے تاہم سردار جعفری کی ہمہ گیر و ہمہ جہت
کو سوا سو صفحات میں احاطہ کرنے کی کوشش لفظاً
دریا کو کوزے میں سمونے کی مصداق ہے ۔ اس
س اداریہ کے علاوہ رفیعہ شبنم کے دو نہایت
مامین بھی شامل ہیں ۔ یہ بات ضرور ہے کہ ان
یں میں اکثر جگہ جذبۂ عقیدت کا غلو آمیز اظہار ملتا
سب سے زیادہ کھٹکنے والی بات یہ ہے کہ انھوں
قع محل سردار جعفری کی انقلاب پسند طبیعت
ن دوستی کا سرچشمہ "شیعیت" ہی تلاش کیا ہے
سردار کی زندگی میں "شیعیت" سے صحیح یا غلط
وب باتوں کا اثر نظر نہیں آتا ۔

اس شمارے کا سب سے طویل مضمون "گفتگو بند
عنوان سے ہے ۔ عنوان یقیناً معنی خیز ہے ۔ گفتگو
ہنے سے ہی خبر و نظر کے نئے دریچے کھلتے ہیں ۔ گفتگو
موم رضا اور سردار جعفری کے مابین ہے ۔ گفتگو کے
یں کہیں ذہنوں کی تاب ناکی کی جھلک ضرور ملتی
ہی نے گفتگو کا آغاز ایسے عنوان سے کیا اور بیچ
سے ایسے موڑ دیے گئے کہ یہ گفتگو محض اکا دکا
یا چیز ہو کر رہ گئی ۔ اردو زبان و ادب کو اس
پیش مسائل کے تناظر میں اس گفتگو کی معنویت
ہے ۔ اگر رفیعہ شبنم نے پہلے سے سوالات مرتب
ردار سے انٹرویو لیا ہوتا تو شاید گفتگو زیادہ
معنی خیز و مفید ہوتی ۔

اس گفتگو میں بہت سی باتیں بحث طلب ہیں مگر
ان سے صرفِ نظر کرنا پڑا ۔ اس لیے کیوں کہ رفیعہ شبنم نے اپنے
تمہیدی کلمات میں ایسی بندش کر دی ہے کہ ان پر بحث کی
گنجائش نہیں رہی ۔ خود انھوں نے آٹھ مقامات پر تقدان
الے رکھنے ہوئے دخل در معقولات کو مناسب نہیں سمجھا
اور ایک مقام پر سلطانہ جعفری نے جو ترمیمات کی ہیں ان
سے بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے تاہم ایک بات جو کھٹکتی ہے
کہ جس کے اظہار پر طبیعت مجبور ہے ۔ ان کی باتوں سے
یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ صرف خواص کی شاعری کے قائل ہیں جو
معترف ہیں جو ادب العالیہ میں مقام پا سکے ۔ وہ عوامی
سطح کی شاعری کو شاعری ہی تسلیم نہیں کرتے ۔ اسے تُک
بندی سمجھتے ہیں ۔ ان کی نظر میں اعلا شاعری کے مقابلہ
میں عوامی سطح کی شاعری ایسی ہی ہے جیسے مرغ یا تیتر
کے مقابلہ میں بھنڈی ۔ یہ موازنہ نہ صرف بے معنی بلکہ
مضحکہ خیز ہے اور طبقۂ خواص میں سرایت کی ہوئی مخصوص
مریضانہ ذہنیت کا غماز ہے ۔ بھنڈی کا اپنا ایک الگ
ذائقہ اور تغذیہ کے اعتبار سے اس کی اپنی افادیت ہے
راہی کے نقطۂ نظر سے کوئی تعرض نہیں ہے کیوں کہ
وہ اکثر اسی طرح کی باتیں کرتے رہتے ہیں مگر خود سردار
جعفری کا اپنی عوامی سطح کی شاعری کو ادنا قرار دینا حیرت
انگیز ہے ۔

وقتی شاعری ، لمحاتی شاعری ، احتجاجی شاعری ، ضرورت
کی شاعری ان سب کا شمار عوامی ادب میں ہوتا ہے ۔ عوامی ادب
کے بھی مختلف رنگ اور سطحیں ہوتی ہیں ۔ یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں
کہ عوامی ادب ہمیشہ گھٹیا ہوگا ۔ عوامی ادب کے سرمایہ سے
شعری و نثری تخلیقات کے بہت اچھے نمونے پیش کیے جا سکتے
ہیں ، انھیں ادب العالیہ کے برابر مقام بھلے ہی نہ ملے مگر
انھیں ادنا درجے کا ادب قرار دینا عوامی ادب کی ناروا تحقیر
اور ادبی حق ناشناسی ہے ۔ عوامی ادب کی اپنی افادیت
و اہمیت ہے ۔ حصولِ آزادی کی جدوجہد میں عوامی ادب

نے جو مثبت کردار ادا کیا ہے اسے کون باشعور ادیب نظر
انداز کر سکتا ہے۔ تاریخ ادب اردو کا ناقد روایتی انداز میں
کہی گئی بسمل کی اس غزل کو کیسے فراموش کر سکتا ہے۔
جس کا مطلع ہے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوے قاتل میں ہے

ان اشعار کی رجز خوانی کرتے ہوئے کتنے سرفروشانِ وطن
تختۂ دار پر چڑھ گئے۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا

اسے تو اعلا درجہ دیا ہی جائے گا کیوں کہ غالب نے کہا ہے۔
اس کے مقابلہ میں بسمل کا شعر محض اس لیے ادنا درجے کا قرار
پائے گا کہ وہ عوامی سطح کا شعر ہے۔

کیفی اعظمی کے بارے میں اکثر یہ بات کہی گئی ہے
کہ ان کے کلام میں وقتی شاعری کا غلبہ ہے۔ اس اعتراض کا
جواب کیفی نے اپنے شعری مجموعے 'آخر شب' کے پہلے صفحہ پر
ابلیا ابرن برگ کے الفاظ میں دیا ہے۔

"محاتی شاعری کا بھی اپنا مقام ہے اگر اسی لمحہ میں
شاعر کے ملک کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے" "آخر
شب" اس وقت میری نظر کے سامنے نہیں ہے۔ الفاظ میں
کچھ فرق ہو سکتا ہے مگر مفہوم یہی ہے۔

رفعت سروش نے اپنے مضمون میں سردار کے
متعلق بالکل صحیح لکھا ہے "یہ چشمۂ تخلیق بیک وقت کئی سمتوں
میں شروع سے بہتا رہا۔" زیر نظر شمارے میں سردار کی
شخصیت کے رنگارنگ پہلوؤں اور ان کی ادبی تخلیقات
کی مختلف جہات سے روشناس کراتا ہے مگر ایک جہت
ایسی ہے جس پر کسی مضمون نگار نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔
رفعت سروش نے سرسری طور پر صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا
کہ ابتدائی دور میں سردار نے افسانے اور ڈرامے بھی لکھے
تھے۔ ان کے افسانوں کا کوئی مجموعہ غالباً چھپا بھی تھا۔
اس کا بھی کسی نے ذکر نہیں کیا۔ سردار کی ڈراما نویسی

سے متعلق ایک واقعہ کا راقم سطور شاہد ہے۔
۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ سردار جعفری انٹرمیڈ
تھے اور راقم سطور بی۔ اے آنرز میں تھا۔ ہم دونوں
میں رہتے تھے۔ شعبۂ اردو کا مجلہ "سہیل" زیر ترتیب
سردار اپنا ایک ڈراما لے کر رشید احمد صدیقی صا
پاس پہنچے۔ رشید صاحب نے ڈرامے پر نظر ڈالی
نظروں سے سردار کو دیکھتے ہوئے پوچھا "یہ ڈراما
ہے؟" "جی ہاں میں نے لکھا ہے۔ کیا آپ کو یقین
سردار نے جواب دیا۔ اتنا کہہ کر سردار جعفری فوراً
پر آئے اور ڈراموں کا ایک بڑا بستہ لے جا کر رشید
کے سامنے رکھ دیا۔ رشید صاحب نے اسے دیکھ
کی تعریف کی اور یہ ڈراما "دیوانے" کے عنوان
کے سالنامہ میں چھپا اور قارئین سے داد تحسین
اس واقعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر
اس صنف کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی ہوتی تو
میں بھی وہ ایک ممتاز مقام حاصل کرتے۔ کسی
عقدہ کشائی نہ کی کہ سردار جعفری نے اپنے افسا
ڈراموں کو درخور اعتنا کیوں نہیں سمجھا۔
(خلیل الرب سی ۸۸ کرپلی ہاؤسنگ اسکیم

● گذشتہ جنوری کے سلسلہ میں شائع شدہ تین
پیش نظر ہیں جو بالترتیب ڈاکٹر یحییٰ، رفعت سروش
نزہت فاطمہ صاحبہ کے ہیں۔ ان خطوط میں سب
اور مفصل رفعت سروش صاحب کا خط ہے جو ڈاکٹر
اور نزہت فاطمہ صاحبہ کے خطوط کے مباحث کا بھی
ہے لہٰذا اس سلسلہ میں چند معروضات پیش خدمت
پہلی بات جس کی طرف رفعت صاحب کے
ڈاکٹر یحییٰ نے بھی توجہ دلائی ہے وہ معاونین گوشہ
ہے۔ اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ میری رسائی
ممکن تھی۔ دوسری بات جس کے سلسلہ میں رفعت
کے علاوہ نزہت فاطمہ صاحبہ نے توجہ دلائی ہے وہ
کے شعر کا "میر کے اعمال نامہ" میں ڈال دیا جاتا ہے۔

اپنی اس غلطی کے لیے بغیر کسی توجیہہ یا توضیح کے معذرت خواہ ہوں۔

مذکورہ باتوں کے علاوہ جن میں ڈاکٹر عقیل احمد صاحبہ رفعت صاحب کی شریک تھیں رفعت صاحب نے جو باتیں کہی ہیں ان کے بارے میں عرض ہے کہ :

۱۔ رفعت صاحب کا یہ بیان کہ "یہ مضمون (جذبی کے شاعرانہ قدر و قیمت کا مسئلہ) صاحب مضمون نے جذبی کی قدر و قیمت بڑھانے کے لیے لکھا ہے" میری دانست میں صحیح نہیں ہے۔ ادبی مطالعے ادبی قدر و قیمت کے تعین کے لیے ہوتے ہیں کسی کی قدر و قیمت بڑھانے یا گھٹانے کے لیے نہیں اور میں نے یہی کیا ہے۔ میرے سامنے جو ادبی معیارات ہیں ان کے مطابق میں نے جذبی کے کلام کی بالکل OBJECTIVE تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سے کوئی سروکار نہیں رکھا ہے کہ بالآخر نتیجہ جذبی کے حق میں نکلتا ہے یا جذبی کے خلاف جو نتیجہ نکلا ہے وہ بعینہٖ قارئین کے سامنے ہے۔ دلائل بھی پیش کر دیے گئے ہیں۔ نتیجہ سے اختلاف کی گنجائش ضرور ہے لیکن دلیل کی محتاج۔

۲۔ رفعت صاحب کا یہ بیان کہ میں نے "جذبی صاحب کو کلاسکیت کا درجہ دینے کی کوشش میں مرزا غالب سے بھڑا دیا ہے۔" یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ میں نے جذبی کو کلاسیکی شاعر ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی اور کسی کلاسیکی شاعر کے کلام سے تقابلی مطالعہ کرنے سے کوئی شاعر کلاسیکی نہیں ہو جاتا۔ میں اپنا جملہ پھر دہراتا ہوں میں نے لکھا ہے :

"جذبی کی شاعری کا رجحان کلاسیکیت کی طرف ہے" (ص ۹۳)

کسی شاعر کے کلاسیکی ہونے اور کلاسیکیت کی طرف اس کا رجحان ہونے میں جو فرق ہے وہ کوئی ایسا باریک نکتہ نہیں جو ناقابلِ فہم ہو۔ تقابلی مطالعے کے سلسلہ میں ص ۹۴ پر پھر میں نے واضح طور پر لکھا ہے :

"جذبی کی شاعری کے کلاسیکی رجحان کا کچھ اندازہ ان کی شاعری میں اردو کے مختلف کلاسیکی شعرا کے اثرات سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔"

تیسری بات رفعت صاحب نے یہ کہی ہے کہ : "مماثلت دکھانے سے جذبی کا مرتبہ بڑھتا نہیں ورنہ خود جذبی نے وہ اشعار کہتے وقت میر و غالب کو پیش نظر رکھا ہوگا یا ان کے ان اشعار کو ذہن سے مماثلت کا رشتہ ...... متین احمد صاحب نے نکالا ہے"

اس سلسلہ میں ایک بات پہلے واضح کر دوں کہ ادبی مطالعہ چھوٹا یا بڑا ثابت کرنے کے لیے نہیں کیا جاتا۔ یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ چھوٹا یا بڑا ہونا الگ چیز ہے۔ اور کلاسیکی ہونے کے معنی بڑے یا عظیم ہونے کے نہیں ہیں۔ یہ بات پیش نظر بھی رہنی چاہیے کہ (۱) کلاسیکیت، ترقی پسندی، جدیدیت سب ادبی رجحانات ہیں اور کوئی شاعر یا ادیب اگر وہ حقیقی شاعر یا ادیب ہے تو ایک رجحان میں بند ہو کر نہیں رہ سکتا۔ (۲) ان تمام رجحانات میں سے کوئی کسی سے کمتر یا بہتر نہیں ہے (۳) اور نہ ہی کوئی کسی کا متضاد یا مترادف ہے یہ محض خصوصیات اور پہچان کے نشانات ہیں۔ اس میں تقابلی مطالعہ سے ذہنی اور فنی رشتے کی تلاش اور رجحان کا پتہ لگانے میں مدد ملتی ہے اور بس۔

چوتھی بات رفعت صاحب نے یہ کہی ہے کہ "پھر رعایت لفظی کو ایک مستحسن بات سمجھ کر جذبی کے کلام سے اس کی مثالیں پیش کر کے انھیں صفِ اساتذہ میں بٹھلانے کی کوشش کی ہے" یہاں بھی رفعت صاحب کا وہی تحسین و تنقیص کا نظریہ کارفرما ہے جو ادب کے سلسلہ میں بے معنی اور مہمل ہے۔ تنقید خصوصیات سے بحث کرتی ہے اور خصوصیات کی بحث سے پہلے فنی معیارات کی بات کرتی ہے۔ اس میں زبان پر قدرت، مشاقی و چابکدستی، فنی لوازمات سے واقفیت اور فنکارانہ پختگی وغیرہ مباحث آتے ہیں جب فنکار یا فن پارہ ان معیارات پر پورا اتر جاتا ہے تب تنقید اس کی ادبی قدر و قیمت سے بحث کرتی ہے۔ یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ فنی قدر و قیمت اور ادبی قدر و قیمت دو الگ الگ چیزیں ہیں ضروری نہیں کہ فنی معیارات پر پورا اترنے والا فن پارہ ادبی معیارات پر کوئی بہت اچھا

اور اعلا مرتبہ حاصل کر سکے پھر پختہ، اچھا، بڑا اور عظیم فن کار اور فن پارہ کے بھی مدارج ہیں۔ اچھے بڑے اور عظیم فن کار کے لیے پختہ ہونا بھی ضروری ہے اور جس قدر اس کی پختگی میں کمی آتی جائے گی اس کی اچھائی برائی اور عظمت میں بھی کمی آتی جائے گی۔ رعایت لفظی وغیرہ فن کی MINIMUM QUALIFICATION میں سے ہے جس سے فن کار کی واقفیت ضروری ہے اس سے اس کی بڑائی میں اضافہ ہو یا نہیں اس کی پختگی میں ضرور اضافہ ہوتا ہے۔ جذبی کے سلسلہ میں یہ کوشش اس لیے اہمیت رکھتی ہے کہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترقی پسند حضرات بھی جو بزعم خود اس سے منحرف تھے اور اسے اچھی چیز نہیں سمجھتے تھے اس سے اپنا دامن نہیں بچا سکے۔ اچھائی اور برائی یہاں بھی اضافی ہے جذبی نے اپنے انٹرویو میں جس رعایت لفظی کا ذکر سبک الفاظ میں کیا ہے وہ رعایت لفظی وہ ہے جو صرف رعایت لفظی رہ جاتی ہے یعنی جس میں شاعری صرف لفظی گورکھ دھندھا بن کر رہ جاتی ہے لیکن جہاں شاعری رعایت لفظی کی وجہ سے لفظی گورکھ دھندھا بننے کے بجائے اس سے آگے بڑھ کر واقعی شاعری بنتی ہے وہاں یہ خصوصیت پھر مثبت رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

۵ انتخاب کے سلسلہ میں رفعت صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے اتفاق کرتے ہوئے یہ لکھنا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ ایک سوا سو صفحے کے رسالے کے ایک گوشہ کا انتخاب ہے اگر مجھے جذبی نمبر مرتب کرنا ہوتا تو اور بہت ساری تخلیقات شامل ہو سکتی تھیں۔

چھٹی بات یہ کہی گئی ہے کہ "امتیاز صاحب نے ترقی پسند تحریک کے عناصر خمسہ فیض، جذبی، مجروح تاباں اور جاں نثار کو قرار دیا ہے۔ مجاز نے کیا قصور کیا، سردار جعفری کیا ہوئے؟" یہاں صرف اپنا جملہ نقل کرنے پر اکتفا کروں گا۔ میں نے لکھا ہے:

"وہ (جذبی)، ترقی پسند غزل کے عناصر خمسہ میں ہیں اور فیض مجروح، تاباں اور جاں نثار کے ساتھ ایک اہم اور نمایاں مقام رکھتے ہیں" (ص ۱۰۱)

ظاہر ہے "ترقی پسند غزل کے عناصر خمسہ" اور "ترقی پسند تحریک کے عناصر خمسہ" میں فرق ہے۔ یہاں مجاز و سردار کے نام کی نہ کوئی اہمیت ہے نہ ضرورت۔ جہاں تک ترقی پسند غزل کے عناصر خمسہ میں تاباں کی موجودگی کا سوال ہے اس کے جواب کے لیے رفعت صاحب کو اگلے مقالے کا انتظار کرنا چاہیئے۔ یہاں موقع نہیں ورنہ عرض کرتا کہ تاباں کہاں سے آگئے۔

امتیاز احمد
شعبۂ اردو۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

● علمی و ادبی سطح پر "کتاب نما" نے وہ مقام حاصل کر لیا ہے، کہ ہر ماہ شدید انتظار رہتا ہے، اور جب آتا ہے تو جب تک اسے پڑھ نہیں لیتا ہوں چین نہیں ملتا ——— قاری کا یہ قلبی لگاؤ کسی بھی رسالہ کی مقبولیت کی دلیل ہے۔

میرا خیال ہے کہ "کتاب نما" کی اشاعت سے کچھ مالی منفعت تو ہوتی نہیں ہوگی، مگر جو چیز آپ کو حاصل ہو رہی ہے، وہ ایسی ہے کہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ خدا نے آپ کو استقلال و استقامت کا وہ تیشہ عطا فرمایا ہے کہ ادب و صحافت کی سنگلاخ زمین بھی اپنا روایتی مزاج بدلنے پر مجبور ہو گئی ہے!

"کتاب نما" کے ہر شمارہ میں "خامہ بگوش" (مشفق خواجہ) کی قلم کاری ایسی ہوتی ہے کہ زبان سے بے ساختہ تحسین و آفرین کے کلمات نکل پڑتے ہیں ــــ لیکن حضرت ذرا مجھے یہ تو بتایئے کہ "غزل" کے ساتھ یہ "کالی" اور "نیلی" کی صفت استعمال کرنے کے کیا معنی؟ اردو ادب نے بہت سارے ستم اور فتنے سہے ہیں اس نئے ستم اور فتنے کو بھی سہہ لے گا اردو کے ادبی پھول محتاج تنک تابی شبنم

ب بلکہ وہ توانی اندرونی توانائی کے بل پر روشن
ناک ہیں!
قیوم خضر۔ پٹنہ

ب کتاب نما" ایک ایسا جریدہ ہے جس
، چھپ کر بلا مبالغہ بےحد خوشی ہوتی ہے اس کے
ضامین نہایت پر مغز اور معلوماتی ہوتے ہیں۔
منظومات کے حصے میں البتہ بعض اوقات
ن ہلکی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ خصوصاً باقر
ری صاحب کی رکاکی غزلوں کو پڑھ کر کوئی اچھا
ثر نہیں ابھرتا۔ باقر مہدی صاحب خاصے مشہور
یا۔ کہیں اب تک میں نے ان جیسی کالی غزلیں
پڑھی نہیں انھیں پڑھنے سے میں کچھ خوش نہیں
ہو سکا۔ بلکہ ان غزلوں کے بعض بعض اشعار پڑھ کر
تو تعجب بھی ہوا کہ یہ صاحب آخر اپنی کس خصوصیت
کے لیے مشہور ہوتے۔ اس شمارے میں شجاع
خاور کی غزل البتہ پسند آئی کہ اس میں کچھ نیا پن
ضرور تھا۔ اسی شمارے میں ایک "نیلی غزل"
بھی دیکھنے کو ملی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے
کہ غزلوں کے ان رنگوں کے بارے میں بھی
مضامین لکھے جائیں تاکہ ہم جیسے کم سمجھ بھی ان
کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ زاہد نوید کا مضمون نئے
شاعر کی آسیبی دنیا دلچسپ مضمون تھا۔
بہر حال مجموعی طور پر "کتاب نما" بہت سے ضخیم
پرچوں سے کہیں اچھا ہوتا ہے۔

احمد صغیر صدیقی ۔ کراچی

۲ دسمبر ۱۹۸۹ء کو جامعہ اردو علی گڑھ کے جلسہ تقسیم اسناد میں اندر کمار گجرال سابق وزیر خارجہ کو "دکتور ادب" کی اعزازی سند پیش کی گئی
(دائیں سے بائیں) شری اندر کمار گجرال ۔ ڈاکٹر رفیق زکریا، شری وی۔ پی سنگھ ۔ ایم حبیب خاں اور پروفیسر مسعود حسین وائس چانسلر جامعہ اردو ۔ علی گڑھ دیکھے جا سکتے ہیں۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

ابراحسنی اور اصلاح سخن ۔ ایک مذاکرہ

دبستاں کے زیر اہتمام "ابراحسنی اور اصلاح سخن" پر جامعہ یونی ورسٹی کے اکیڈمک اسٹاف کالج میں ۲۴ جنوری ۱۹۹۱ء کو شام ۶ بجے حسب روایت ایک علمی مذاکرہ ہوا جس میں اردو کے دانشوروں اور نقادوں نے حصہ لیا۔ صدر جلسہ پروفیسر مجیب رضوی نے فرمایا کہ جس طرح ایک سپاہی کو اپنے ہتھیاروں کے استعمال کا شعور ہونا چاہیے، اسی طرح ایک اچھے ادیب وشاعر کو زبان کے تخلیقی استعمال کا شعور ہونا چاہیے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا۔ یہ کتاب اردو شاعری کی فنی، تہذیبی اور لسانی نکات کو سادگی اور وضاحت سے پیش کرتی ہے۔ پروفیسر شعیب اعظمی نے کہا کہ "ابراحسنی اور اصلاح سخن" میں فنی روایات اور مسلمات کو نئی معلومات کی روشنی میں نیا انداز دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اجمل اجملی نے کہا کہ اس کتاب میں پروفیسر عنوان چشتی اور نعیم الدین رضوی نے اصلاح سخن کے ورثے کو بڑی جامعیت اور افادیت کے ساتھ پیش کر کے مشرقی معیار فن کی روایات کو از سر نو تازہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ابوالفیض سحر نے کہا کہ "ابراحسنی اور اصلاح سخن" اپنے موضوع پر ماضی کے ورثے کی امین تو ہے ہی، یہ کتاب ابراحسنی اور متعدد اساتذۂ فن کی ریاضتوں کو تشنگان علم وادب تک پہنچاتی ہے۔ ڈاکٹر ظفر نظامی نے کہا کہ یہ کتاب تین نسلوں کی ذہنی تربیت کا احاطہ کرتی ہے۔ اور اپنے موضوع پر ایک دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر نورالاسلام صدیقی کا خیال تھا کہ یہ کتاب ابراحسنی کو بنیاد بنا کر اصلاح سخن کی روایت سے پردہ ہٹاتی ہے۔ ڈاکٹر جلال انجم نے کہا "ابراحسنی اور اصلاح سخن" فنون لطیفہ کے ذریعہ اظہار کی اہمیت اور معنویت کو نئے تناظر میں پیش کرتی ہے۔

الحاج محمد خلیل سیٹھ (مرحوم) چلڈرنس لائبریری کا افتتاح

مورخہ ۱ر جنوری ۱۹۹۱ء بروز منگل بعد نماز عصر نہیلا بال سیوا ٹرسٹ کی جانب سے محمد خلیل چلڈرنس لائبریری کا افتتاح جناب زین العابدین صاحب (مجاہد آزادی) کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ جناب حاجی مختار احمد صاحب میونسپل کونسلر نے صدارت فرمائی۔ شیخ عبدالحمید صاحب نے ادارہ الانصار سوشل ویلفیر اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی کی روداد مختصر پڑھ کر سنائی۔ یوسف جمال صاحب نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

ایم۔ حبیب خاں کو انعام

انجمن ترقی اردو (ہند) کے اسسٹنٹ سکریٹری اور اردو کے مشہور ادیب جناب ایم حبیب خاں کو ان کی کتاب "انشاء اللہ خاں انشا" پر اردو اکاڈمی دلی نے مبلغ دو ہزار روپے، سند اور اردو اکاڈمی کے نشان سے نوازا ہے۔ یہ انعام ۱۲ر دسمبر ۱۹۹۰ء کے جلسے میں اردو اکاڈمی نے پیش کیے۔

محمد کوثر اعظم کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض

جناب محمد کوثر اعظم، صدر شعبۂ اردو فیروز گاندھی کالج

ورسٹی آف بہار مظفرپور نے ان کے تحقیقی
قبال کی شاعری میں منظر نگاری" پر پی ایچ ڈی
ی تفویض کی ہے یہ مقالہ پروفیسر فاروق احمد
ی نگرانی میں سپرد قلم کیا گیا ہے۔

الب کا ۱۹۳ ویں یوم ولادت

نئی دہلی۔ پچھلے دنوں غالب اکیڈمی احضرت
ین میں مرزا غالب کے ۱۹۳ ویں یوم ولادت
لے میں ایک یادگار تقریب منعقد ہوئی۔ محقق
اب مالک رام صاحب نے اس تقریب کی
ی کی اور اردو کے ممتاز شاعر و ماہر قانون پنڈت
ن ملا نے اس کا افتتاح کیا۔ تقریب سے
سے قبل غالب اکیڈمی کے متصل مزار غالب پر
ی و چراغاں کی رسم ادا کی گئی۔ اس موقع پر
ے نہایت بزرگ و ممتاز شاعر پنڈت آنند نرائن ملا
نے افتتاحی تقریر میں مرزا غالب کو شاندار
عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے مشہور
سے تازہ واردان بساط ہوائے دل" کا
ی ترجمہ سنایا۔ جو ابھی تک نہ انھوں نے کہیں
تھا اور نہ کہیں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے اس
ر فرمایا کہ غالب کی شاعری اور ان کی زندگی
ب العین کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں تمام
ع انسان کی فلاح کے لیے عام طور سے اور
ے ملک کے آج کے حالات میں خاص طور
اد و محبت اور ہم آہنگی کا ماحول پیدا کرنے
لیے دل و جان سے کام کرنا چاہیے۔ اس
ب میں پاکستان سے آئے ہوئے دانشور
شان الحق حقی نے غالب اکیڈمی کی خصوصی
ت پر اظہار خیال کیا اور فرمایا کہ مرزا غالب
ہند کہ کافی کام ہوا ہے مگر ان کی شاعری اور
ن میں بہت سے ایسے گوشے باقی ہیں جن
پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اس
سلسلے میں وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ غالب کی
سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر دور میں اپنی
نظم و نثر میں نئے گوشے تلاش کرنے کی دعوت
دیتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالب اردو کے واحد شاعر
ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں فکری عنصر پورے انداز میں بھر دیا ہے۔
حکیم صاحب کی خواہش پر پروفیسر عنوان چشتی نے زیر نظر مرقع کا تقدیمہ
شائع میں پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے صاحب
کا خیر مقدم کیا اور جلسہ کی نظامت کے فرائض غالب
اکیڈمی کے سکریٹری جناب ذہین نقوی نے انجام
دیے۔ آخر میں شکریہ غالب اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ
کے رکن جناب خواجہ حسن ثانی نظامی نے مہمانان اور
حاضرین کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔

"سبز موسم کی صدا" کی رسم اجرا

۳ دسمبر ۱۹۹۰ء کی شام کو ملک کے مشہور و معتبر
شاعر ظہیر غازی پوری کی غزلوں کے مجموعے سبز موسم
کی صدا کو جاری کرتے ہوئے سابق وزیر قانون
و اوقاف جناب ایچ ایچ رحمٰن نے بہت مختصر مگر
جامع تقریر میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے
فرمایا کہ ظہیر غازی پوری کی شاعری عہد رواں کی
آئینہ دار بھی ہے اور جدید ادبی قدروں کی پاسدار
بھی۔ تقریب رسم اجرا کے صدر حضرت ناوک حمزہ پوری
نے اظہار خیال کیا۔ ہندی زبان کے مشہور ناقد
ڈاکٹر چندریشور کرن نے اپنی تقریر میں کہا کہ میں
ظہیر غازی پوری کی اردو شاعری اور تنقید نگاری
کے ساتھ ساتھ ان کی ہندی نظم نگاری اور مقالہ نویسی
سے بھی واقف ہوں۔ میں ان پر ہندی میں مقالہ
بھی لکھ چکا ہوں۔ مہمان شاعر نجم عثمانی نے فرمایا
کہ ظہیر صاحب نے جس عہد میں لکھنا شروع کیا وہ
ترقی پسندی کا دور تھا لیکن انھوں نے اپنی شاعری

کو نعرہ بازیوں سے بچائے رکھا۔ پروفیسر رونق شہری اڈیٹر سارا بہار دھنباد نے ایک سیر حاصل مقالہ پڑھ کر سنایا۔ مہمان شاعر اور ادیب آمر صدیقی نے بھی ایک پُر مغز مقالہ پڑھا۔

ابتدا میں کاروان ادب کے جنرل سکریٹری خاکسار شمس صدیقی نے "سبز موسم کی صدا" کے خالق ظہیر غازی پوری کی گل پوشی کی رسم ادا کی۔

آخر میں خود جناب ظہیر غازی پوری نے اپنی شاعری سے متعلق مختصر گفتگو کی اس کے بعد مشاعرہ ہوا جس میں تسلیم خاں، آمر صدیقی، شمس اصدقی، رونق شہری نجم عثمانی اور صدر بزم جناب ناوک حمزہ پوری نے اپنے کلام سنائے۔

"خواب خواب زندگی" اور "زاد سفر" کی تقریب رونمائی

کلکتہ۔ جناب علقمہ شبلی کے دو شعری مجموعے "خواب خواب زندگی" اور "زاد سفر" کی رسم اجرا نہایت ادبی شان سے ایران سوسائٹی ہال میں انجام پائی۔

حکیم سید فیضان احمد کے استقبالیہ کلمات اور گل پوشی کے بعد صدر جلسہ جسٹس خواجہ محمد یوسف صاحب (کلکتہ ہائی کورٹ) نے علقمہ شبلی کی حیات اور فن پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ علقمہ شبلی جتنے مخلص انسان ہیں اتنے ہی باکمال شاعر بھی ہیں۔ ڈاکٹر پرتاب چندر اچندر سابق وزیر تعلیم نے شاعر کی غزلوں کے مجموعہ "خواب خواب زندگی" کی رونمائی فرمائی۔ ڈاکٹر ہیرالال چوپڑہ نے حمدیہ و نعتیہ رباعیوں کے مجموعہ "زاد سفر" کی رسم اجرا انجام دیا۔ تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر مظفر حنفی، اقبال پروفیسر کلکتہ یونی ورسٹی نے اپنے مقالے میں فرمایا کہ علقمہ شبلی کے شعری مزاج میں گھلاوٹ، رچاؤ اور شگفتگی کے دوش بہ دوش شائستہ سر فرازی، [illegible] خوصلگی اور مستقل مزاجی کی صفات داخل ہیں اس لیے مقصدی افادیت اور عصری حسیت سے مملو ایسے اشعار موصوف کے کلا[م] سے بآسانی منتخب کیے جا سکتے ہیں جو ہماری جما[لیاتی] حس کو آسودگی بخشتے ہیں۔ جناب سالک لکھنو[ی]، ڈاکٹر ظفر اوگانوی، مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی جناب سید نور الہدیٰ اور جناب ندر الاسلام نظمی [نے] بھی اظہار خیال کرتے ہوئے علقمہ شبلی کو منف[رد] لب و لہجہ کا شاعر قرار دیا۔

دہلی میں "اقبال اکادمی" کا قیام

اردو داں بالخصوص علامہ اقبال کے پرستا[روں] کے حلقہ میں یہ خبر مسرت سے سنی جائے گی کہ اب دہلی میں معروف ماہر اقبالیات جناب سید مظفر حسین [برنی] صاحب کی صدارت و سرپرستی میں اقبال اکادمی کا قیا[م] عمل میں آگیا ہے۔ اس کی مجلس عاملہ میں محتر[م] بزرگ ہستی حکیم عبدالحمید صاحب، ممتاز ادیب و نقا[د] جناب مالک رام صاحب، مشہور رہنما جناب محمد شفیع قر[یشی] صاحب، صدر کانگریس (آئی) ریاست جموں و کشمیر، ہریانہ کے سابق وزیر داخلہ جناب کنیالال بو سوال شامل ہیں۔

اقبال کے کلام کی اشاعت و ترویج، اقبال او[ر] اس کے عہد سے متعلق مواد جمع کرنا اور اسے محفوظ [کرنا]، اقبال کی تصنیفات کا دنیا کی زبانوں اور خاص ط[ور] پر ہندستان کی علاقائی زبانوں میں ترجمہ کرنا [اور] شائع کرنا، اقبال کی شاعری، زندگی اور نظریات [پر] تحقیق و تدقیق، اقبال سے متعلق کتب و مقالات او[ر] مجلہ شائع کرنا، اقبال کی شاعری اور ان کے افکار و نظ[ریات] کے موضوع پر سیمینار، کانفرنس اور خطبات کا اہتمام اور بالخصوص "اقبال انسائکلوپیڈیا" مرتب کرنا ا[کادمی] کے اغراض و مقاصد میں شامل ہیں۔

اقبال اکیڈمی۔ ۸۔ لودھی اسٹیٹ۔ نئی دہلی ۳

خدا بخش پٹنہ کا "جرنل"

اردو دوستوں میں یہ خبر خوشی سے سنی جائے گی کہ خدا بخش لائبریری پٹنہ نے اپنے تماہی "جرنل" کو اب ماہنامہ بنادیا ہے۔ اس جرنل میں وہ مواد پیش کیا جاتا ہے جو عام اردو والوں کی دسترس سے باہر ہے۔

نیویارک میں یوم اقبالؒ

"حلقۂ فن وادب" نیویارک نے حسب روایت اس سال بھی یوم اقبالؒ کے موقع پر ایک بین الاقوامی مشاعرہ مقامی ہوٹل میں ڈاکٹر رفیق جان کی صدارت میں منعقد کیا۔ پہلے سیشن میں صدر "حلقۂ فن وادب" حنیف اخگرؔ نے یوم اقبالؒ کے پس منظر اور اپنی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کے بارے میں گفتگو کی ان کے بعد حمایت علی شاعر نے اقبال پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ جسے بے حد پسند کیا گیا۔ دوسرا سیشن مشاعرے پر مشتمل تھا۔ مشاعرے کے پہلے دور کی میزبان نیویارک کی ممتاز شاعرہ زریں یٰسین نے کی اس دور میں شمالی امریکہ میں مقیم شعرا جمال قادری، رئیس وارثی، فرحت سیلیخ، سردار سوز، عبدالرحمٰن عبد، حمید ویس احمد جعفری یونس شرر، صبیحہ صبا، حمیرا رحمان، نسیم سید، رشیدہ عیاں، حنیف اخگر، مامون ایمن اور عبدالقوی ضیا نے کلام سنایا دوسرے دور کی نظامت حمایت علی شاعر نے کی اس دور میں ناظم مشاعرہ کے علاوہ انصار حسین زیدی رفعت سلطان، جون ایلیا، محسن بھوپالی اور جمیل الدین عالی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

لاس اینجلس میں بین الاقوامی مشاعرہ اور یوم رئیس

گذشتہ دنوں لاس اینجلس میں نوتشکیل شدہ ادبی انجمن "حلقۂ شعر وادب" نے پاکستانی امریکن کونسل کے اشتراک سے پاکستان کے ممتاز شاعر اور صحافی حضرت رئیس امروہوی مرحوم کی یاد میں مشاعرے کا اہتمام کیا جس کی صدارت حنیف اخگر نے کی اور پاکستان کے قونصل جنرل جناب عزیز خاں نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ محفل کے آغاز میں جون ایلیا نے اپنے برادر بزرگ رئیس امروہوی کی زندگی کے آخری لمحات کا ذکر کیا۔ حمایت علی شاعر نے رئیس کی شاعری اور شخصیت پر مضمون پیش کیا۔ مشاعرے کا آغاز ٹی۔وی پر رئیس امروہوی کے وڈیو کیسٹ کو دکھا کر کیا گیا۔

مشاعرے میں مقامی شعرا خالد نواب ظفر عباس نیر جہاں نیر، مہرالنسا، مہر اور دیگر شعرا کے علاوہ زریں یٰسین جون ایلیا، محسن بھوپالی، حمایت علی شاعر اور صدر مشاعرہ حنیف اخگر نے کلام سنایا۔ آخر میں حلقۂ شعر وادب کے صدر اور ممتاز مصور شمیم احمد اور کونسل کے بانی صدر عتیق احمد صدیقی نے حاضرین اور مہمان شعرا کا شکریہ ادا کیا۔

حسن نجمی سکندرپوری کا انتقال

دہلی ۳۰ نومبر اردو کے ممتاز شاعر اور صحافی حسن نجمی سکندرپوری کا کل یہاں انتقال ہوگیا۔ وہ لگ بھگ چھ ماہ سے علیل تھے انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۵۰ سال تھی۔ ان کے دو شعری مجموعوں کو "شب چراغ" اور "کسک" کو اردو اکادمی یوپی سے ایوارڈ ملے ہیں۔

اردو کے تین ممتاز ادیبوں کو اڑیسہ اردو اکاڈمی کا ایوارڈ

بھونیشور۔ ۱۷ دسمبر اردو کے ممتاز ادیبوں کرامت علی کرامت، حفیظ اللہ نیولپوری اور خالد رحیم کو ۱۹۸۹ء کا موقر اڑیسہ اردو اکاڈمی ایوارڈ ملے گا۔

ممتاز اردو صحافی کا انتقال

نئی دہلی: ۹ جنوری (ی ن ا) ممتاز صحافی اور اردو ہفت روزہ شیر پنجاب کے اڈیٹر جنگ بہادر سنگھ کا گذشتہ رات حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہوگیا وہ ۷۲ برس کے تھے۔ پسماندگان میں بیوی تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔

آنند نرائن ملّا کو "اقبال سمان" انعام

نئی دہلی: ۲۰ جنوری (نمائندہ) اردو کے ممتاز شاعر اور نثر نگار پنڈت آنند نرائن ملّا کو بھوپال کا ایک لاکھ روپے کا "اقبال سمان" ایوارڈ ملا ہے۔ اس اعزاز پر ادارہ کتاب نما ملّا صاحب کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو وہ ۹۰ سال کے ہو جائیں گے۔ اس موقع پر انجمن ترقی اردو (ہند) دو روزہ کل ہند سیمینار منعقد کرے گی۔

چھپتے چھپتے

ظ۔ انصاری نہیں رہے

اردو کے صاحب طرز ادیب نقاد، صحافی ظ انصاری طویل علالت کے بعد ۳۱ جنوری ۹۱ء کو بمبئی میں انتقال کر گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

پروفیسر آل احمد سرور اور ڈاکٹر سید حسن کو قومی اعزاز

دہلی ۲۶ جنوری ۱۹۹۱ء اردو کے ممتاز نقاد پروفیسر آل احمد سرور

کو پدم بھوشن اور ماہر تعلیم ڈاکٹر سید حسن (انسان اسکول کشن گنج بہار) کو پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا۔ مکتبہ جامعہ اور ادارہ کتاب نما اپنے دونوں دانشوروں کو مبارک باد پیش کرتا ہے اور ان کی صحت، سلامتی اور درازیٔ عمر کے لیے دعا گو ہے۔

ترجمہ کے لیے ساہتیہ اکادمی کا انعام برائے ۹۰ء پروفیسر عبدالستار دلوی کو دیا گیا

نئی دہلی: ۱۷ دسمبر ۱۹۹۰ء ماہر لسانیات اور محقق پروفیسر عبدالستار دلوی (صدر شعبۂ اردو، بمبئی یونی ورسٹی) کو ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی نے ۱۹۹۰ء کے لیے اپنے گراں قدر قومی انعام سے نوازا ہے۔ پروفیسر دلوی کو یہ انعام مشہور مراٹھی ناولٹ "دن آنگن" کے اردو ترجمے کے لیے دیا گیا، جو جدید مراٹھی ادب میں ایک ادبی شہکار کا درجہ رکھتا ہے۔

مولانا تقی امینی کی وفات ایک بڑا سانحہ

نئی دہلی۔ ۲۴ جنوری (نمائندے سے) مولانا محمد تقی امینی کی وفات برصغیر میں دینی علوم کے فروغ کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔ مولانا ۱۷ جنوری کو علی گڑھ میں اپنی رہایش گاہ پر دار فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ کافی عرصہ سے علالت کے سبب بہت کمزور ہو گئے تھے۔ ان کی عمر ۷۵ سال تھی۔

مولانا علوم دینیہ کے ہر شعبے پر گہری نظر رکھتے تھے مگر فقہ ان کا خاص میدان تھا جس میں انھوں نے اپنے گہرے وجدان، مطالعے اور فہم و فراست سے تلاش و تحقیق کے کئی نادر نمونے چھوڑے ہیں۔

طبّی کتب

مصنف	نام کتاب	قیمت
محمد سعید	چند مشہور طبیب	۹/:
کمال الدین	اسلامی اصول صحت	۱۵/:
,,	تشریح عرفانی	۶:
,,	تشریح الہیکل اوّل	۱۱/:
,,	طبی جغرافیہ	۸/:
,,	مطب لطیف	۶/:
بسان	تاریخ طب	۴۴:
الرحمٰن	کتاب المرکبات	۱۵:
اشرف	غذا اور صحت	۸:
اجمل خاں	حاذق	۴۰/:
الفضل	طب یونانی دگھریلو ادویہ	۱۰/:
,, ,,	یونانی طب میں مانع حمل ادویہ	۱۰۰:
علی سینا	رسالہ جودیہ	۱۸/:
م طلحہ	رسالہ نسخہ نویسی	۱۰/:
ابراہیم	طب روحانی	۱۶/:
عثمانی	طب القانون	۲۵/:
لدغزنوی	طب نبوی وجدید سائنس	۱۵/:
لدجاوید	طبیب کی ڈائری	۲۰/:
,, ,,	طب نبویؐ	۸/:
,, ,,	دیہاتی معالج I	۱۲/:
حیدر	تاریخ طب واطبا قدیم	۱۵/:
,, ,,	معالجات نظام ہضم تولید وتناسل	۲۵/:
عابد	حفظان صحت	۱۰/:
س الدین	روحانی علاج	۱۰/:
مین فاروقی	تیمارداری	۱۲/۵۰
بدالجبار	جدید رہنمائے علاج	۵۰/:
احمد	تفہیم العلاج	۲۵/:

مصنف	نام کتاب	قیمت
پیارے لال	صحت ساگر	۴۵:
خورشید احمد	امراض اطفال	۴۸:
,,	امراض نسواں	۳۰:
وسیم احمد	امراض نسواں	۵۰:
,, ,,	امراض اذن انف وحلق	۳۰:
محمد رفیق	پیٹ کے کیڑے	۰:
مغیث نجم	بچوں کی بیماریاں وعلاج	۴:
,, ,,	بلڈ پریشر لو وہائی	۱۵:
شمیم نکہت	بچے کی صحت	۰:
وسیم احمد	بیت الحکمت کی طبی خدمات	۴۵:
علی اصغر	سکون قلب خلاقی بیماریاں	۱۲:
محمد عبداللہ	کنز المفردات	۱۴:
محمد رحمٰن	سر سے پیر تک بیماریوں کا علاج	۱۰:
محمد رحمٰن	دیہاتی معالج II	۲۰:
حماد عثمانی	کتاب الجراحت اوّل	۳۰:
الور بیگ	علاج زحمت یا رحمت	۳۰/:
افضال احمد	علم الجنین	۲۰/:
وامق امین	قدیم علم الامراض	۱۲:
ابوالولید	کتاب الکلیات	۳۵
ابوالفرح	کتاب العمدہ جراحت	۴۰:
انیس اسماعیل	کسر وخلع تدابیر وعلاج	۲۵/:
فضل کریم	کتاب تشخیص امراض مکمل	۴۰/:
صفی الدین	یونانی ادویہ مفردہ	۲۲:
جیب الرحمٰن	کلیات نبض بول براز سوم	۲۵/:
,, ,,	ہندستان کے مشہور اطبا	۱۸/:
حامد علی	میزان الطب	۲۱/:
علی حیدر	معالجات حمیات	۲۰/:
,, ,,	معالجات امراض اطفال	۱۵/:
حکیم خلیل احمد	فیض	۲۰/:

ملنے کا پتا
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

چند عمدہ کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
عملی انتقادیات	ڈاکٹر سید محمد عقیل	۶۰/-
ڈاکٹر رشید جہاں، حیات اور کارنامے	ڈاکٹر شاہدہ بانو	۱۰۰/-
ظہیر دہلوی۔ حیات و فن	ڈاکٹر مختار شمیم	۱۰۰/-
جدید اردو تنقید پر مغرب کے اثرات	علی حماد عباسی	۵۰/-
غالب احوال و آثار	ڈاکٹر حنیف نقوی	۶۰/-
کرشن چندر کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر شفیق اعظمی	۱۰۰/-
فراق کی شاعری	ڈاکٹر افغان اللہ	۱۲۵/-
فرہنگ کلیات میر	ڈاکٹر فرید احمد برکاتی	۱۵۰/-
اردو ادب میں تمثیل نگاری	ڈاکٹر غلام رسول مکرانی	۸۰/-
لکھنؤ کی پانچ راتیں	علی سردار جعفری	۴۰/-
شرر بحیثیت ناول نگار	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	۸۰/-
لندن اولندن	ڈاکٹر سید محمد عقیل	۶۰/-
تلاش و تعارف	ڈاکٹر حنیف نقوی	۴۰/-
شعلے کی شناخت	عمیق حنفی	۲۰/-
ایک نایاب مثنوی	ڈاکٹر عبدالرؤف	۱۵/-
غالب ایک مطالعہ	پروفیسر ممتاز حسین	۳۰/-
متعلقات انشا	ڈاکٹر عابد پیشاوری	۶۰/-
فراق فن اور شخصیت	ڈاکٹر علی احمد فاطمی	۳۰/-
ادب کی تلاش	بلراج کومل	۳۰/-
تنقیدی مطالعے	ڈاکٹر شارب ردولوی	۲۰/-
ساحل اور سمندر	سید احتشام حسین	۳۰/-
تاریخ ادب کی تدوین	علی جواد زیدی	۱۵/-
مجاز حیات اور شاعری	منظر سلیم	۳۰/-
کروچے کی سرگذشت	محمد علی صدیقی	۱۵/-
باغ و بہار ایک تجزیہ	ڈاکٹر وحید قریشی	۱۵/-
مغربی تنقید کے اصول	ڈاکٹر انور سجاد	۳۵/-
مارکسی جمالیات	اصغر علی انجینئر	۲۵/-
افکار و اظہار	نامی انصاری	۳۰/-

افسانے، ناول

کتاب	مصنف	قیمت
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	۵۰
معصومہ	عصمت چغتائی	۲۰
اندھیری رات کا تنہا مسافر	شہزاد منظر	۲۵
قیدی سانس لیتا ہے	زاہدہ حنا	۵۰
پت جھڑ میں خود کلامی	رشید امجد	۲۰
عقب کا دروازہ	حمید سہروردی	۲۰
آخری سلام	شکیلہ اختر	۲۰
بیس نئی کہانیاں	علی احمد فاطمی	۲۰
خالی پٹاریوں کا مداری	اقبال متین	۲۰
نچا ہوا البم	اقبال متین	۲۰
دوسرا بھوروخال	نور پرکار	۱
مٹی کا چراغ	سلمیٰ صدیقی	۰
اسٹیج ڈرامے	آفاق احمد	۹
ندی	عبداللہ حسین	۰
ضبط کی دیوار	سلیم اختر	۰
چراغ تہِ داماں	اقبال متین	۰
بے جڑ کے پودے	سہیل عظیم آبادی	۵
چار چہرے	سہیل عظیم آبادی	۰/

شعر و شاعری

کتاب	مصنف	قیمت
شجر صدا	عمیق حنفی	۰/
نژاد سنگ	بلراج کومل	۰/
ہارون کی آواز	حمایت علی شاعر	۰/
سیلِ وجود	ساجدہ زیدی	۰/
کاغذ کا شہر	ساغر اعظمی	/
رشتے ٹوٹنے کا موسم	منصور سبزواری	/
سرائے میں شام	نشتر خانقاہی	/
دوپہر	خورشید افسر بسوانی	

نصرت پبلشرز۔ امین آباد، لکھنؤ ۶۰۱۸

ساہتیہ اکادمی کی نئی اُردو مطبوعات

ہندوستانی ادب کے معمار سیریز

محمد قلی قطب شاہ	مسعود حسین خان
انشاء اللہ خان انشاء	ایم. حبیب خان
خواجہ حیدر علی آتش	محمد ذاکر
مصحفی	نور الحسن نقوی
پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	مرزا خلیل بیگ
راجندر سنگھ بیدی	وارث علوی
تلوک چند محروم	رام لعل نابھوی
مرزا محمد رفیع سودا	قاضی افضال حسین
حسرت موہانی	ایم. حبیب خان
مومن خان مومن	ظہیر احمد صدیقی
ڈاکٹر زور	پروفیسر سیدہ جعفر
یوسف حسین خاں	پروفیسر مسعود حسین خاں

تراجم

بابا فرید		بلونت سنگھ آنند
فقیر موہن سناپتی		مایادھر مان سنہا
پنجے منگیش راؤ		وی. سیتا رمیّہ
ٹی. پی. کیلاسم		ایل. ایس سیشگری راؤ
ویمنا		وی. آر. نرلا
نرالا		پرمانند سری واستو
سبرامنیم بھارتی		پرمانند کمار
ودّیاپتی		رام ناتھ جھا
بہاری		بچن سنگھ
ایشور چند ودیا ساگر		ہیرا منی باہرجی
ولی		نور الحسن ہاشمی
بسویشور		اچ. پے. رُدرہ سوامی
نام دیو		ایم. جی. درشن مکھ
گلشنِ صحت	(ناول)	تاراشنکر بندو پادھیائے
اچھوت	"	ملک راج آنند
راکھ اور ہیرے	"	لیے رزری آنند رزرے لیے ونکی
لوک راج	"	ویریندر کمار بھٹاچاریہ
کیرو چناولی	"	ہری اودھ

راجندر سنگھ بیدی کے منتخب افسانے (انگریزی انتھالوجی)	گوپی چند نارنگ	۴۰
کرشن چندر کے منتخب افسانے (انگریزی انتھالوجی)		۶۰

ساہتیہ اکادمی کی دیگر مطبوعات

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
آدم خور (نانک سنگھ)	سجاد ظہیر	۱۵/۰۰
گنجی کی کہانی	ایس احتشام حسین	۴/۵۰
ماہی گیر	مظفر شاہ	۹/۰۰
نرائن راؤ	من موہن تلخ	۲/۰۰
میڈیا	کے. اے. فاروقی	۵/۰۰
تاریخ بنگلہ ادب	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۲۵/۰۰
آرسی	تیجا سنگھ	۸/-
گلیلیو	رضیہ سجاد ظہیر	۵/-
ہیملیٹ شیکسپیئر	مترجم: فراق گورکھپوری	۱۰/۰۰
لل دید	موتی لال ساقی	۲۰/-
گورا (ٹیگور)	سید سجاد ظہیر	۴۰/۰۰
مٹی کا پتلا	پرکاش پنڈت	۱۰/-
سنجوگ	رابندر ناتھ ٹیگور	۲۵/-
اکیس کہانیاں	عبدالحیات بردوانی	۳۰/-
مٹی کی مورتیں	رام برکش بینی پوری	۱۰/-
تاؤ تے چنگ	یوسف حسین خان	۹/-
والڈن	علی عباس حسین	۴/۵۰
تین ناٹک	محمد مجیب	۲۵/۰۰
ویویکانند	احتشام حسین	۲/۵۰
ایک سو ایک نظمیں	فراق گورکھپوری	۲۵/-
اوتھیلو شیکسپیئر	سجاد ظہیر	۲۰/-
کنگ لیئر "	اے. ایس مجنوں	۲۰/-
کلموہی ٹیگور	مترجم: سید عابد حسین	۳۰/-
دو بیر دھان	ہنسراج رہبر	۱۲/-
ناسخ	شبیہ الحسن	۲۰/۰۰
آزادی	شجاع الدین	۴۰/۰۰
عورت	سیارام سرن گپتا	۱۵/۰۰
کاندید	سجاد ظہیر	۱۵/۰۰

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
بنکم چندر چٹرجی		۱۰/۰۰
سری آربندو		۱۰/۰۰
مانک بندوپادھیائے		۱۰/۰۰
تورودت		۱۰/۰۰
زندہ کول		۱۰/۰۰
راجہ رام موہن رائے		۱۰/۰۰
جے شنکر پرشاد		[illegible]/۰۰
بھارتندو ہریش چندر		۱۰/۰۰
تاراشنکر بندیوپادھیائے		۱۰/۰۰
جولیس سیزر۔ شیکسپیئر	منیب الرحمٰن	[illegible]
کنڑ ادب کی تاریخ	محمود حسن	۵/-
ابوالکلام آزاد	عبدالقیوم	۰۰/۰۰
عبدالحلیم شرر	جعفر رضا	۰۰/۰۰
چکبست	سرسوتی سرن کیف	۰۰/۰۰
غبار خاطر	ابوالکلام آزاد	۰/۰۰
ترجمان القرآن (چار جلدوں پر مشتمل)	"	[illegible]
تذکرہ	"	۵/۰۰
خطابات آزاد	"	۰/۰۰
سرت چندر شخصیت اور فن		۵/۰۰

ساہتیہ اکادمی

سواتی بلڈنگ، نزد برلا مندر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ایکتا پریڈ
ہمارے مرد، عورتیں اور بچے،
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی،
بودھ، جین، پارسی......
مشرق سے، مغرب سے، شمال سے جنوب سے
ملک کے چاروں کونوں سے ہزاروں کی تعداد
میں یوم جمہوریہ کی تقریبات میں حصہ لینے کیلئے
آتے ہیں۔
اس طرح وہ ایک بار پھر ایکتا اور اتحاد کا مظاہرہ
کرتے ہیں اور ذات پات، نسل و مذہب،
خطے اور زبان کی رکاوٹوں کو توڑنے کیلئے خود کو
وقف کر دینے اور ہمارے کروڑوں عوام کی
فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے ہوئے قوم کو
لوہے کی طرح مضبوط بنانے کا عہد کرتے ہیں۔
آئیے پریڈ کے جذبے کو برقرار
رکھیں اور مل کر آگے بڑھیں۔
davp 90/750

آج سے ۶۸ سال پہلے مکتبہ جامعہ ایک معمولی دکان کی حیثیت سے قائم کیا گیا تھا۔ لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ آج یہ اُردو کا ایک بڑا اشاعتی مرکز ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس ۶۸ سال کے طویل عرصے میں مکتبے نے دُنیا کے سرد و گرم کا مقابلہ کیا اور ہر عہد اور ہر دَور میں ادب کی شمع کو نہ صرف فروزاں رکھا بلکہ اس کو مشعل راہ بھی بنایا۔ اُردو زبان کی خدمت اور ملک کو آنے والی ضرورتوں کے مطابق بنانے کے ساتھ ساتھ ایک صحت مند قومی احساس کی بیداری ہمارا نصب العین رہا ہے اور ہمیں اس منزل تک پہنچنے کے لیے دشوار گزار راہوں سے گزرنا پڑا ہے۔ ہم نے اب تک ۴ ہزار سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں جو ہر طبقے میں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

آج جب کہ علمی اور ادبی کاموں کی راہ میں دشواریاں بڑھتی جا رہی ہیں، مکتبے نے ایک نئی قوت اور تازہ عزم کے ساتھ کام شروع کیا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ جس طرح پہلے بھی ہم نے مشکلات کا صرف سامنا ہی نہیں کیا بلکہ ان کے درمیان راہیں ڈھونڈ نکالیں اسی طرح آج بھی ان چٹانوں پر تیشہ زنی کرتے ہوئے آگے بڑھیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں گے اور پہلے کی طرح ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔

فروری ۱۹۹۱ء

یادداشت

★ براہ کرم خط وکتابت کرتے وقت اپنا نام اور پتا صاف صاف تحریر فرمائیے۔

★ ڈاک خانے اور مقام کا نام انگریزی میں لکھ سکیں تو اور بھی اچھا ہے۔

★ اپنے آرڈر کے ساتھ کم از کم چوتھائی رقم پیشگی ضرور بھجوائیے۔ آرڈر کی تعمیل کرتے وقت یہ رقم بل میں سے کم کردی جائے گی۔

★ اس مختصر فہرست کتب میں اگر آپ کی مطلوبہ کتاب موجود نہ ہو تب بھی براہ کرم آپ ہمیں خط ضرور بھیجیے۔ ہم مطلوبہ کتاب فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں گے۔

★ مصارف ڈاک وریل وغیرہ حسب قاعدہ خریدار کو ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے اپنی سہولت کے پیش نظر آرڈر میں اس کی وضاحت ضرور کردیجیے کہ کتابیں ڈاک سے بھیجی جائیں یا ریل سے۔

★ کتابیں بذریعہ سواری گاڑی منگوانے کی صورت میں قریبی ریلوے اسٹیشن کا نام ضرور لکھ دیجیے۔

● کاغذ کی گرانی کی وجہ سے تقریباً ہر ادارے نے اپنی کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ کردیا ہے اس لیے آرڈر کی تعمیل کے وقت وہی قیمت چارج کی جائے گی جو اُس وقت مقرر ہوگی۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے دفاتر

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی 110025

ٹیلی فون نمبر 630191

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

ٹیلی فون 3260668

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003

ٹیلی فون نمبر 863857

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نزد ڈاک خانہ جامعہ نگر نئی دلی 110025

مطبع

لبرٹی آرٹ پریس، ۱۵۲۰۔ پٹودی ہاؤس دریا گنج، نئی دہلی، 110002

ٹیلی فون نمبر 3276018

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) دریا گنج نئی دلی میں چھپواکر شائع کیا

وعات مکتبہ جامعہ ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشاء

پان اور پرکھ	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/-
ال کا نظریہ خودی	عبدالمغنی	۱۵۰/-
در بخش جرأت	جمیل جالبی	۱۰/-
ید افسانہ اور اس کے مسائل	وارث علوی	۳۶/-
یخ اودھ	قاسم علی نیشاپوری	۲۷/-
انا آزاد کا ذہنی سفر	ظ انصاری	۳۳/-
ر اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۹۰/-
لانا آزاد کے بارے میں	مالک رام	۵۱/۰۰
نالصدق	مولانا ابوالکلام آزاد	۷۵/۰۰
یں کلاسیکی تنقید	پروفیسر عنوان چشتی	۴۸/-
و تنقید	پروفیسر حامدی کاشمیری	۴۸/-
نار	مرتبہ : مالک رام	۱۰۱/-
مضامین	مالک رام	۹۰/-
ینامہ	مجیب رضوی	۲۱/-
السرور	مرتبہ: شمس الرحمٰن فاروقی	۷۵/-
ے	مرتبہ : مظفر حنفی	۴۵/-
نوری	صدیقہ بیگم	۲۵/-
ماجیات	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/-
کا مزاج	غلام ربانی	۲۳/-
و تعبیر	محمد ہدایت اللہ	۱۵/-
فسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	زیر طبع
کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۷/۵۰
ں کا زوال	اعظار حسین	۳۶/-

تذکرۂ معاصرین دوم	مرتبہ : مالک رام	۱۴/-
سوم	"	۲۲/-
چہارم	"	۴۰/-
لغت نویسی کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	۳۵/-
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	۳۰/-
اردو کی تہذیبی معنویت	پروفیسر علی محمد خسرو	۹/-
تحلیل نفسی کے پیچ و خم	ڈاکٹر سلامت اللہ	۲۵/-
اثبات و نفی	شمس الرحمٰن فاروقی	۴۰/-
نقد حرف	پروفیسر ممتاز حسین	۴۸/-
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغری مہدی	۳۵/-
انشائیات	ڈاکٹر عابد حسین	(زیر طبع)
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	۱۲/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	۱۲/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	۱۱/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نارائن مُلّا	۱۹/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ : عبداللطیف اعظمی	۱۲/-
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	۱۰/۵۰
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	۲۲/-
قدیم دلی کالج	مرتبہ : مالک رام	۴/۵۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۶/-
کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	۲۴/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	۵/۵۰
جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	۴/-
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	۲۴/-
تنقید کیا ہے۔	"	۲۷/-
باتیں کچھ سُریلی سی	داؤد رہبر	۳۶/-
اردو اسیز	مرتبہ : سید ظہیر الدین مدنی	۲۱/-
روح تہذیب	خواجہ غلام السیدین	۴/۵۰
نئی شعری روایت	پروفیسر شمیم حنفی	(زیر طبع)
دراسات	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	۱۵/-
دبستانِ آتش	شاہ عبدالسلام	۱۶/-

تعلیم

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ ۵/-
مشقی تدریس کیوں اور کیسے ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۴۵/-
معاشیات کے اصول عزیزہ احمد قاسمی ۲۱/-
آسان اردو ورک بک شکیل اختر فاروقی ۲۴/-
تعلیم و تربیت اور والدین ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۵۱/-
تعلیم اور رہنمائی ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۳۵/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں معین الدین ۴۵/-
تعلیم اور اس کے وسائل۔ ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۳۶/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے) شکیل اختر فاروقی ۹/-
تعلیم نظریہ اور عمل۔ ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۳۶/-
تعلیم فلسفہ اور سماج۔ ڈاکٹر سلامت اللہ ۲۷/-
بنیادی استاد کے لیے۔ ڈاکٹر سلامت اللہ ۱۲/-
ہم کیسے پڑھائیں۔ ڈاکٹر سلامت اللہ ۲۵/۵۰
تعلیمی خطبات۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ۳۶/-
سرسید کی تعلیمی تحریک۔ اختر الواسع ۲۵/-
اردو کیسے لکھیں رشید حسن خاں ۱۰/۵۰

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

اپنی ہواؤں کی خوشبو کشمیری لال ذاکر ۳۰/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں اشرف صبوحی ۵۱/-
چند تصویر بتاں مولانا عبدالسلام قدوائی ۴۵/-
ہندوستانی مسلمان اور مجیب صاحب پروفیسر آل احمد سرور ۸/-
صاحب جی، سلطان جی ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۰/-

شہید جستجو۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی
مولانا آزاد کی کہانی۔ ڈاکٹر ظفر احمد نظامی
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاؒ) ڈاکٹر اسلم فرخی
حیات جامیؒ۔ مولانا اسلم جیراجپوری
نقش ذاکر۔ مرتبہ عبدالحق خاں
مالک رام ایک مطالعہ۔ مرتبہ علی جواد زیدی
مشفق خواجہ ایک مطالعہ۔ مرتبہ خلیق انجم
عبداللطیف اعظمی حیات و خدمات۔ مرتبہ انور صدیقی
یادوں کا اجالا بھگوان سنگھ۔ مترجم شمیم حنفی
مجیب صاحب احوال و افکار پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی
حیات عابد (خود نوشت ڈاکٹر عابد حسین) ڈاکٹر صغریٰ مہدی
سلسلۂ روز و شب (خود نوشت) صالحہ عابد حسین
وجد شاعر اور شخص۔ مرتبہ یوسف ناظم
غبار کارواں۔ بیگم انیس قدوائی
فراق شخص و شاعر۔ مرتبہ: شمیم حنفی
حیات حافظ۔ اسلم جیراجپوری
افکار رومی۔ مولانا عبدالسلام خاں
بزم رفتگاں صباح الدین عبدالرحمٰن
امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری۔ پروفیسر ممتاز حسین
مکالمات افلاطون۔ مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین
غلام ربانی تاباں، حیات اور شاعری۔ شفیق النساء بیگم
اب جن کے دیکھنے کو۔ بیگم انیس قدوائی
پریم چند۔ ہنس راج رہبر
شاد عارفی شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر مظفر حنفی
حیات اسماعیل، حیات و خدمات ڈاکٹر سیفی پریمی
مفتی صدر الدین آزردہ۔ عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی
میر انیس سے تعارف۔ صالحہ عابد حسین
ہمارے ذاکر صاحب۔ رشید احمد صدیقی
اشخاص و افکار۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی
میر انیس۔ سفارش حسین رضوی
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت۔ مرتبہ عبداللطیف اعظمی

...رت کی شاعری ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ۵/-
...ہائے گرانمایہ ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ۲۴/-
...خوب آدمی تھا ۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۰/-
...رسیہ زیدی ۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-
...شار ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ۴/-
...اکر صاحب اپنے لفظ و معنی میں ۔ مرتبہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۴۵/-
...وسی ادب اوّل، دوم پروفیسر محمد مجیب ۶۰/-

فی الحقیقت یوسف ناظم ۴۵/-
...الفور ۔ یوسف ناظم ۳۰/-
...ل مال ۔ شفیقہ فرحت ۱۸/-
...الحال ۔ یوسف ناظم ۱۸/-
...انگ نمبر ۔ شفیقہ فرحت ۱۶/-
الکلیات ۔ یوسف ناظم ۱۸/-
...رکت ایک چھینک کی ۔ وجاہت علی سندیلوی ۱۵/-
ذکر خیر ۔ یوسف ناظم ۲۱/-
...ے پرکی ۔ حضرت آوارہ ۱۰/-
...خنداں ۔ رشید احمد صدیقی ۲۶/-
شگوفہ زار ۔ خواجہ عبد الغفور ۴۱/-
دیوار قہقہہ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا ۱۵/-
آشفتہ بیانی میری ۔ رشید احمد صدیقی ۱۵/-

سفرنامے، رپورتاژ

...بس کے دیس میں ۔ جگن ناتھ آزاد ۴۵/-

پشکن کے دیس میں ۔ جگن ناتھ آزاد ۴۵/-
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز ۔ بیگم صالحہ عابد حسین ۱۸/-
باتیں لاہور کی ۔ سوم آنند ۱۴/-
رہ نورد شوق ۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ۱۲/۵۰
یادوں کے سلسلے عتیق صدیقی ۱۲/-

شعری مجموعے

غبار منزل غلام ربانی تاباں ۲۵/-
انیس ۳۲ غیر مطبوعہ مرثیے ۹۰/-
پرانی بات ہے ۔ زبیر رضوی ۳۰/-
سازِ سخن ۔ ادا جعفری ۴۵/-
غزل نما (غزلیات کا انتخاب) مرتبہ ادا جعفری ۷۵/-
دائروں میں پھیلی لکیر ۔ کشور ناہید ۲۰/-
آنکھ میں سمندر ۔ زاہد ڈار ۲۰/-
آنکھ اور خواب کے درمیان ۔ ندا فاضلی ۲۱/-
رات کے مسافر ۔ مرتبہ انور سجاد ۲۸/-
گداز شب ۔ معین احسن جذبی ۴۰/-
ایک خواب اور ۔ علی سردار جعفری ۴۰/-
حرف حرف روشنی ۔ حمایت علی شاعر ۲۵/-
لفظوں کا آسمان (اڑیا نظمیں) مترجم کرامت علی کرامت ۲۷/-
دو ہے ۔ جمیل الدین عالی ۱۲/-
کلیات عرش ملسیانی مرتبہ مالک رام ۷۵/-
راوار ۔ ساقی فاروقی ۲۰/-
پتھر کی زبان ۔ فہمیدہ ریاض ۱۵/-
شام کا پہلا تارا ۔ زہرا نگاہ ۲۱/-
مثنوی نہ سپہر (امیر خسرو) مترجم محمد رفیق عابد زاہدی ۲۸/-
لہو پکارتا ہے ۔ علی سردار جعفری (زیر طبع)
شام شہریاراں ۔ فیض احمد فیض جلد ۱۰/ ۶/-
جستہ جستہ خورشید الاسلام ۱۸/-
گل افشانی گفتار ۔ نشور واحدی ۵/-

کربِ آگہی ۔ آنند نرائن مُلّا ۱۰/۵۰
نوائے آوارہ ۔ غلام ربّانی تاباں ۸/۵۰
اردو گیت ۔ ڈاکٹر قیصر جہاں (زیرِ طبع)
پچھلے پہر ۔ جاں نثار اختر ۱۵/-
انتخابِ حالی (دنیا ایڈیشن) مولفہ سفارش حسین رضوی ۱۵/-
شہرِ آشوب مرتبہ: ڈاکٹر نعیم احمد ۔ ۸/۵۰
ذوقِ سفر ۔ غلام ربانی تاباں ۵/-
کو بہ کو ۔ سلمان جاں نثار اختر ۷/-
دیوارِ قہقہہ (شعری مجموعہ) محمد یوسف پاپا ۱۵/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

تاریخ اودھ قاسم علی نیشاپوری ۲۷/-
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست پروفیسر مشیر الحق ۸/-
ہمارے دینی علوم مولانا اسلم جیراجپوری ۱۸/-
قدیم ہندستان کی سیکولر روایت ۔ ڈاکٹر مجیب اشرف ۱۲/-
ترجمۂ قرآن ۔ منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش
پروفیسر مشیر الحق ۸/-
مسلمانانِ ہند سے وقت کے مطالبات ۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی ۹/-
دنیا کے بڑے مذہب ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۸۵/-
ہندستان میں اسلامی علوم و ادبیات ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۴۰/-
ہندستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک ۔ شمس الرحمٰن محسنی ۵۰/-
رسولِ اکرمؐ اور یہودِ حجاز ۔ سید برکات احمد ۳۰/-
محجوب الارث ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۴/-
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۴۰/-
اسلام دورِ حاضر میں ۔ مترجم پروفیسر مشیر الحق ۳۶/-
اسلامیات ۔ مالک رام ۲۴/-
عمرو بن عاصؓ ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۶/-
حضرت جنید بغدادیؒ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۔ زیرِ طبع

روح القرآن ۔ مولانا عبد السلام قدوائی
عشق اور بندگی ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی
عورت اور اسلامی تعلیم ۔ مالک رام
مسلمان اور روحِ وقت کے تقاضے ۔ عبد السلام قدوائی
عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقا ۔ محمود الحسن
سماجی تبدیلیاں ۔ مترجم قاضی عبید الرحمٰن
مذہب اور جدید ذہن پروفیسر مشیر الحق
ہندستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں ۔ ڈاکٹر سالم قدوائی
دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر ۔ مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی
کتاب و سنت کے جواہر پارے ۔ مولانا جمال الدین اعظمی
خواتینِ کربلا کلامِ انیس کے آئینے میں ۔ صالحہ عابد حسین
مسلمان اور سیکولر ہندستان ۔ پروفیسر مشیر الحق
اسلامی عقائد و مسائل مذہب ۔ مولانا جمال الدین اعظمی
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی) مترجم ڈاکٹر رشید الوحیدی
تاریخ الامت سیرتِ رسولؐ حصہ اول ۔ مولانا اسلم جیراجپوری
" خلافتِ راشدہ " دوم " -
" خلافتِ بنی امیہ " سوم " -
" عباسیہ " چہارم " ۱۰/-
" عباسیہ بغداد پنجم " ۱۰/-
ششم تا ہشتم (زیرِ طبع)
فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۳۰/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز) ۔ قاری محمد اسماعیل ۵۰
" " کلاں سائز " ۱/۲۵
اسلام اور بدلتی دنیا ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۱/-
بکھرے ورق سینتی کمار چیٹرجی ۲/-
تاریخ انگلینڈ (۱۹۰۱/۱۴۸۵) سید محمد عزیز الدین حسین ۱/-

ناول

سمندری خزانہ ماریہ رحمٰن ۲۷/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو ڈاکٹر صغرا مہدی ۲۴/-
مٹی سے ہیرا سید مقبول احمد ۱۰/-
تذکرہ انتظار حسین ۵۴/-

...یت کی دیواریں	رفعت سروش	۲۱/-
...ھر با دل ۔	کشمیری لال ذاکر	۱۴/-
...ار ۔	ظفر پیامی	۴۰/-
...ڈوبتے سورج کی کتھا	کشمیری لال ذاکر	۳۶ ۔
...وں میں بکھری زندگی ۔	کشمیری لال ذاکر	۱۸/-
مہکتی بہاریں ۔	کوثر چاندپوری	۱۸/-
آگ بھوپالی ۔	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۱۵/-
دھرتی سدا سہاگن ۔	کشمیری لال ذاکر	۷/۵۰
کھجوراہو کی ایک رات ۔	کشمیری لال ذاکر	(زیر طبع)
میں واپس آؤں گا (ہاورڈ فاسٹ)	مترجم محمد انس	۲۵/-
پُروائی ۔	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۹/۵۰
نوری سونے سیج پر ۔	صالحہ عابد حسین	(زیر طبع)
انگوٹھے کا نشان ۔	کشمیری لال ذاکر	۷/-
ایک ہم دو دل ۔	خالدہ رحمٰن	۱۰/-
اشک خوں ۔	حبیبہ بانو	۱۰/-
اپنی اپنی صلیب ۔	صالحہ عابد حسین	(زیر طبع)
پرائی دھرتی اپنے لوگ ۔	جتندر بلّو	۱۲/-
ایک مٹھی ہندستان ۔	سید شمیم اشرف ۔	۹/-
ایک چادر میلی سی ۔	راجندر سنگھ بیدی	۱۵/-
آنپس کے گیت ۔	مترجم قرۃ العین حیدر	۳/-
پیار کا موسم ۔	مہندر ناتھ	۴/۵۰
چنار کا پتا ۔	سلطان آصف فیضی	۳/-
پابہ جولاں ۔	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	(زیر طبع)
زندگی کی لہر (ساؤمنگ)	مترجم محمد خلیق	۴/-
کالا شہر گورے لوگ ۔	احسان الحق	(زیر طبع)
بیوہ ۔	منشی پریم چند	۱۰/-
گئودان (نیا اڈیشن)	"	۹۰/-
میدانِ عمل (نیا اڈیشن)	منشی پریم چند	(زیر طبع)
یو دو کیہ ۔	ترجمہ قرۃ العین حیدر	۲/-
شکستِ ناتمام ۔	زہرہ سیدین	۲/-

ابھی دور ۔	صالحہ عابد حسین	زیر طبع
پُر اسرار مقدمہ ۔ کافکا	مترجم رحم علی الہاشمی	۱۲/۵۰

افسانے

پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر	۵/-
آوازوں کا میوزیم	ساگر سرحدی	۲۵/-
سدا بہار چاندنی	رام لعل	۳۰/-
دل دریا ۔	شروَن کمار	۲۵/-
تین چہرے تین آوازیں ۔	صالحہ عابد حسین	۱۸/-
دردِ دل	ستارہ جعفری	۱۸/-
مکتی بودھ	راجندر سنگھ بیدی	۲۵/۵۰
نیلی ساری	خواجہ احمد عباس	۳/-
گرہن ۔	راجندر سنگھ بیدی	۱۵/-
کوکھ جلی ۔	"	۱۸/-
کھڑکی ۔	پرکاش پنڈت	۱۲/-
ریت سمندر اور جھاگ ۔	ہرچرن چاولہ	۱۲/۷۵
تیوری ۔	امر سنگھ	۱۴/۷۵
قلی نمبر ۳۹۹ ۔	وجاہت علی سندیلوی	۱۴/۷۵
دانہ و دام ۔	راجندر سنگھ بیدی	۱۸/-
اپنے پرائے ۔	اوم پرکاش بجاج	۹/-
نئی دھرتی نئے انسان ۔	خواجہ احمد عباس	۱۲/-
درد و درماں	صالحہ عابد حسین	زیر طبع
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے ۔	راجندر سنگھ بیدی	۲۶/-
واردات ۔	پریم چند	۱۸/-
پت جھڑ کی آواز ۔	قرۃ العین حیدر	زیر طبع
دس افسانے ۔	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۴/۵۰
راستے اور کھڑکیاں ۔	انور خاں	۹/-
جو میرے وہ راجا کے نہیں ۔	صغریٰ مہدی	۱۰/-
اپنے دکھ مجھے دیدو ۔	راجندر سنگھ بیدی	۲۱/-

ڈرامے

کتاب	مصنف	قیمت
المجاہد	ابراہیم یوسف	۵/-
زندگی کی طرف۔	پروفیسر شمیم حنفی	۳۶/-
زوال کا عروج۔	مترجم: انور عظیم	۳۶/-
مجھے گھر یاد آتا ہے۔	پروفیسر شمیم حنفی	۲۱/-
انٹی گونی۔	سوفوکلیز مترجم قیصر زیدی	۹/-
خانہ جنگی	پروفیسر محمد مجیب	۳/۵۰
حبہ خاتون۔	پروفیسر محمد مجیب	۴/۵۰
تاریخ کے آنچل میں۔	رفعت سروش	۱۸/-
اداس موڑ۔	ابراہیم یوسف	۱۲/-
اینٹنی اور کلیوپٹرا	ولیم شیکسپیر	۱۶/۵۰
مٹی کا بلاوا۔	پروفیسر شمیم حنفی	۱۲/-
سات کھیل۔	راجندر سنگھ بیدی	۱۷/۵۰
غالب کون۔	سید محمد مہدی	۸/۵۰
خیال کی دستک۔	ساگر سرحدی	۱۲/۷۵
دیا بجھ گیا۔	کرتار سنگھ دگل	۶/-
پہلے آپ۔ (مزاحیہ ڈراما)	افتخار عالم	۲/۵۰
آذر کا خواب۔	قدسیہ زیدی	۸/۵۰
آزمائش۔	پروفیسر محمد مجیب	۴/۵۰
انجام۔	پروفیسر محمد مجیب	۲/-
کھیتی	〃	۴/۵۰
ہیروئن کی تلاش۔	〃	۳/۵۰
پردۂ غفلت۔	ڈاکٹر سید عابد حسین	۷/۵۰
دروازے کھول دو	کرشن چندر	۶/۵۰
آئینۂ ایام۔ جے بریشلے	مترجم خلیق احمد	۴/۵۰
نقشِ آخر۔	اشتیاق حسین قریشی	۲/۲۵
ریڈیو ڈرامے کا فن	ڈاکٹر اخلاق اثر	۱۸/-
ریڈیو ڈرامے کی اصناف	〃	۲۰/-
نشریات اور آل انڈیا ریڈیو	〃	۱۰/-
فاوسٹ (گوئٹے)	مترجم: ڈاکٹر عابد حسین	۲۵/۵۰

اقبالیات

کتاب	مصنف	قیمت
اقبال کا نظریۂ خودی	عبدالمغنی	۱۵۰/-
اقبال جادوگر ہندی نژاد	عتیق صدیقی	۱۴/-
اقبالیات کی تلاش	عبدالقوی دسنوی	۲۵/-
فلسفۂ اقبال (خطبات کی روشنی میں)	سید وحید الدین	۴۰/-
اقبال اور دہلی۔	عبدالقوی دسنوی	۱۵۰
نقدِ اقبال۔	میکش اکبرآبادی	۲۵/۵۰
نقشِ اقبال۔	اسلوب احمد انصاری	۲۱/-

غالبیات

کتاب	مصنف	قیمت
ذکرِ غالب	مالک رام	(زیر طبع)
گفتارِ غالب	مالک رام	۴۸/-
غالب اور صفیر بلگرامی۔	مشفق خواجہ	۳۶/-
تلامذۂ غالب۔	مالک رام	۷۵/-
فسانۂ غالب۔	مالک رام	۱۹/۵۰
غالب اور شاہانِ تیموریہ۔	ڈاکٹر خلیق انجم	۱/۵۰

معیاری سیریز

کتاب	مصنف	قیمت
موازنۂ انیس و دبیر۔	مرتبہ رشید حسن خاں	۲۴/-
نیرنگِ خیال۔	مالک رام	۱۵/-
یادگارِ غالب اردو۔	〃	۱۹/-
〃 فارسی۔	〃	۱۰/-
انتخاب مضامین سرسید	انور صدیقی	۱۵/-
حیاتِ سعدی۔	مرتبہ رشید حسن خاں	(زیر طبع)
فسانۂ آزاد (تلخیص)	〃 ڈاکٹر قمر رئیس	۳۶/-
فردوسِ بریں۔	〃 عبدالحلیم شرر	۱۲/-
انتخاب مضامین شبلی	مرتبہ رشید حسن خاں	(زیر طبع)
انتخاب ناسخ	مرتبہ 〃 〃	(زیر طبع)
مثنوی بحر المحبت	مرتبہ عبدالماجد دریاآبادی	۵/۵۰

ادہ ۔ ، ڈاکٹر قمر رئیس ۱۵/-
ن ادا مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن ۲۲/-
بتلا ۔ ، صدیق الرحمن قدوائی ۱۰/-
تصوح ۔ ، مالک رام ۲۵/-
و بہار ۔ ، رشید حسن خاں ۲۶/-
بوقت ۔ ، ڈاکٹر خلیق انجم ۳۶/-
س النساء ۔ ، صالحہ عابد حسین (زیر طبع)
شتہ لکھنؤ ، رشید حسن خاں (زیر طبع)
یہ حاتم طائی ۔ ، اطہر پرویز (زیر طبع)
ب ولی مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی ۱۲/-
ب سراج اورنگ آبادی مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن ۱۰/-
، مراثی انیس و دبیر ۔ رشید حسن خاں ۲۲/-
، نظیر اکبر آبادی ۔ ، ، ۳۰/-
، اکبر الہ آبادی ۔ صدیق الرحمن قدوائی ۱۸/-
، کلام میر ۔ ڈاکٹر محمد حسن (زیر طبع)
یوان درد رشید حسن خاں ۱۵/-
تخاب سودا ، (زیر طبع)
، قلی قطب شاہ ۔ محمد اکبر الدین صدیقی (زیر طبع)
، ذوق ۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۲۲/-
مثنوی سحر البیان ۔ رشید حسن خاں ۲۱/-
مثنوی گلزار نسیم ۔ ، ۱۲/-
فادات سلیم ۔ ڈاکٹر خلیق انجم ۲۱/-
مقدمہ شعر و شاعری ۔ مرتبہ رشید حسن خاں ۲۰/-

جیبی کتابیں

ایک خواب اور علی سردار جعفری ۱۰/-
آتش گل ۔ جگر مرادآبادی ۸/-

پچھلے پہر ۔ جاں نثار اختر ۶/-
رومانی غزلیں ۔ فہمیدہ حجاب ۶/-
انتخاب اکبر الہ آبادی صدیق الرحمن قدوائی ۸/-
ساتواں آنگن ۔ صالحہ عابد حسین ۸/-
دھوپ ۔ رابعہ تبسم ۵/-
گھر ۔ ماریہ رحمن ۸/-
واپسی کا سفر ۔ عبداللہ حسین ۵/-
راگ بھوپالی ۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۶/-
نشیب ۔ عبداللہ حسین ۵/-
موت کا بازار ۔ آفتاب ہلالی ۸/-

سردار جعفری نمبر مرتبہ: ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ۵/-
صالحہ عابد حسین نمبر مرتبہ: عزیزہ قریشی ۲۵/-
نئی نظم کا سفر مرتبہ: خلیل الرحمن اعظمی ۳۵/-
مشرقی علوم و السنہ پر تحقیق ۔ حامد حسین ۳/-
پریم چند نمبر ۔ عبدالقوی دسنوی ۸/۵۰
ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر ۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۱۶/-
مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر ۔ ادارہ ۱/۵۰
مرزا سلامت علی دبیر نمبر ۔ مرتبہ عبدالقوی دسنوی ۷/۵۰
جوش ملسیانی نمبر ساحر ہوشیارپوری ۵/۵۰
خواتین افسانہ نگار نمبر ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۴/۵۰
عرش ملسیانی نمبر ۔ مالک رام ۱۲/۵۰
سکندر علی وجد نمبر ۔ یوسف ناظم ۲۵/-
قدسیہ زیدی نمبر ۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-
فراق نمبر ۔ شمیم حنفی زیر طبع
لغت نویسی کے مسائل نمبر پروفیسر گوپی چند نارنگ ۲۵/-

عبداللطیف اعظمی نمبر۔ ادارہ ۱۸/-
مشفق خواجہ نمبر۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۲۰/-
جائزے۔ مرتبہ مظفر حنفی ۲۵/-
اردو ادب ۷۷-۱۹۷۶ء محمود عالم ۲/-
ماہنامہ جامعہ مجیب نمبر۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۲۵/-

بچوں کے لیے

مذہب

رمضان کا مہمان رفیع الزماں زبیری ۶/-
کمسن صحابی " ۵/-
اسلام کے جاں نثار رفیع الزماں زبیری ۴/-
سیرت پاک مختصر مختصر احمد خاں خلیل ۳/-
نور کے پھول حکیم محمد سعید ۹/-
سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکیم محمد سعید ۳/۵۰
حضرت حمزہؓ۔ احتشام علی رحیم آبادی ۲/-
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ " " " ۲/-
حضرت ابو ہریرہؓ " " " ۲/-
حضرت محبوب الٰہیؒ مشیر الحق ۲/-
" قطب الدین بختیار کاکیؒ " ۲/-
" فرید الدین گنج شکرؒ۔ " ۲/-
" معین الدین چشتیؒ۔ " ۲/-
" ابو بکر صدیقؓ۔ " ۲/-
" طلحہؓ۔ " ۳/-
" سلمان فارسیؓ۔ " ۲/-
" ابوذر غفاریؓ۔ " ۲/-
" عبداللہ بن عمرؓ۔ " ۲/-

" عبداللہ بن عباسؓ۔ "
نیک بیٹیاں۔ "
اسلام کیسے پھیلا؟ حصہ اوّل عبدالواحد سندھی
" حصہ دوم " "
قرآن کیا ہے؟ "
اسلام کیسے شروع ہوا؟ "
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل "
" دوم " "
اسلام کے مشہور امیر البحر۔ "
رسول پاکؐ۔ "
درس جنتی۔ الیاس احمد مجیبی
سرکار کا دربار۔ " "
چار یار۔ الیاس مجیبی
آں حضرتؐ کی ازواج الیاس مجیبی
حضرت محمدؐ (ہندی) "
اللہ کا گھر۔ خلیل احمد جامعی
اللہ کے خلیل۔ " "
رسول پاک کے اخلاق۔ " "
اللہ کے صفی۔ " "
ہمارا دین حصہ اوّل سید شہاب الدین دسنوی
" دوم " " "
" سوم " " "
تحسین القرآن۔ تالیف، ہدیہ سیدنا طاہر سیف الدین۔
منہاج القرآن۔ " "
ائمۂ اربعہ۔ مولانا ابو العرفان ندوی (زیر
ارکان اسلام۔ مولانا اسلم جیراجپوری
عقائد اسلام۔ " "
خلفائے اربعہ۔ خواجہ عبدالحی فاروقی
نبیوں کے قصے۔ " "
ہمارے رسولؐ۔ "
پیارے رسولؐ۔ سلطانہ آصف فیضی

رت نظام الدین اولیاؒ۔ — ادارہ — ۳/-
سلمان بیبیاں۔ — اعجاز الحق قدوسی — ۴/-
ارے نبیؐ (اردو) — سید نواب علی رضوی — ۳/۵۰
" (ہندی) " " " " — ۰/۴۰
رکارِ دو عالم۔ — محمد حسین حسان — ۹/-
اعدہ یسرنا القرآن (خورد) — ۱/۵۰
" " (کلاں) — ۲/۵۰

نظمیں

بتاشے (نرسری گیت۔ باتصویر) — ۶/۵۰
ہکتی کلیاں۔ — خضر برنی — (زیر طبع)
یسے کھلونے۔ — سطوت رسول — ۵/-
ہانے ترانے۔ — شان الحق حقی — ۶/۵۰
چوں کے افسر۔ — افسر میرٹھی — ۶/-
چوں کے اقبال۔ — مرتبہ: اطہر پرویز — ۴/۵۰

معلومات و سوانح

کمپیوٹر کیا ہے — حکیم نعیم الدین زبیری — ۷/-
ہمارے عظیم سائنس داں — حکیم محمد سعید — ۸/-
خلائی مسافر — (ادارہ) — ۶/-
عجائب گھر — قاسم صدیقی — ۱۰/-
چند مشہور ادیب اور سائنس داں (سوانح) — ۹/-
پرواز کی کہانی — علی ناصر زیدی — ۳/-
غذا کی کہانی — علی ناصر زیدی — ۳/-
سنہری اصول — حکیم محمد سعید — ۴/-
مولانا آزاد کی کہانی۔ — ظفر احمد نظامی — ۱۸/-
ذرے کی کہانی۔ — مہدی جعفر — ۲۱/-
پرندوں سے جانوروں تک۔ — شاہد عظیم — ۴/۵۰

بچوں کے ذاکر صاحب۔ — مرتبہ: عبد اللہ ولی بخش قادری — ۹/-
اندرا گاندھی کی کہانی۔ — شمیم حنفی — ۹/-
بچوں کے چار بزرگ دوست۔ — صالحہ عابد حسین — ۳/۵۰
امیر خسرو۔ — ادارہ — ۳/-
رنگوں کی بستی۔ — سہیل انور — ۲/-
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں۔ — زہرہ مشیر — ۵/-
صحت کے ۹ نکتے۔ — مسعود احمد برکاتی — ۳/-
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں۔ — یوسف ناظم — ۲/-
جدید پہیلیاں۔ — راج کشور — ۹/-
جوہر قابل۔ — مسعود احمد برکاتی — ۳/-
فصیح الدین نیر۔ — اطہر پرویز — ۷/۵۰
صحت کی الف بے۔ — مسعود احمد برکاتی — ۵/-
موم کا محل۔ — پروفیسر محمد انس — (زیر طبع)
چٹانوں کی کہانی۔ — محمد امین — ۳/۵۰
گاندھی بابا کی کہانی۔ — بیگم قدسیہ زیدی — ۱۰/-
میر انیس۔ — محمد حسین حسان — ۲/-
انوکھا عجائب خانہ (۲ حصے) " " — ۱/۵۰
ہمارے محاورے۔ — ڈاکٹر سیفی پریمی — ۸/۵۰
مقناطیس کی کہانی۔ — (زیر طبع)
دہلی۔ — مجاہد حسین زیدی — ۲/-
تاریخ ہند کی کہانیاں (اول تا چہارم) — ۷/۷۵
سماجی زندگی۔ (اول تا چہارم) — ۳/۹۰
کہاوت اور کہانی۔ — ڈاکٹر سیفی پریمی — ۸/-

کہانیاں، ناول، ڈرامے

ننھے منّے بچّوں کے لیے

بتاشے (نرسری کے گیت باتصویر) — ۶/۵۰
جاں نثار دوست (باتصویر کہانیاں) — ۵/-
شیر اور بکری۔ باتصویر کہانیاں — ۶/۵۰

چاند کی بیٹی ۔ (باتصویر کہانیاں) ۵/-
بھیڑیے کا گانا ۔ ″ ۶/۵۰
جادو کی ہنڈیا ۔ ″ ۵/-
چالاک بلی ۔ ″ ۶/-
دُم کٹی لومڑی ۔ ″ ۶/۵۰
کوے کا خواب ۔ ″ ۶/۵۰
گدھے نے بجائی بانسری ۔ کشور ناہید ۷/۵۰

بڑے بچوں کے لیے دلچسپ کہانیاں

مونٹی کرسٹو کا نواب مسعود احمد برکاتی ۹/-
غریب لکڑہارے کی کہانی (ادارہ) ۶/-
نردولی کا آدم خور ″ ۶/-
ہمت کے کرشمے ″ ۶/-
خلائی مسافر ″ ۶/-
ابو خاں کی بکری ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۵/-
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی (کہانیاں) ۶/-
نرالے گویے اشرف صبوحی ۴/-
باتونی کچھوا ″ ″ ۴/-
جادو کا چھلا ″ ″ ۳/-
جادو کی سارنگی ″ ″ ۳/-
بدر شہزادی ″ ″ ۲/-
سمندری طوفان اور تین لڑکے (مختلف کہانیاں) ۶/-
ننھا سیاح محمد زکریا مائل ۷/-
زیور (مختلف کہانیاں) ۶/-
شہنشاہ نے کہا... (مختلف کہانیاں) ۶/-
سام پر کیا گزری سید اظفر مہدی ۶/-
جگنو کی بتی عبدالاحد سندھی ۲/-
چالاک خرگوش کے کارنامے معراج ۷/۵۰
چور پکڑو مسعود احمد برکاتی ۳/-

بہادر علی ۔ قمر علی عباسی .۵۰
خالی ہاتھ ۔ ابصار عبدالعلی -
کھلونا نگر ۔ ادارہ -
حاجی بابا کی ڈائری ۔ ظ ۔ انصاری .۵۰
قصہ اژدہا پکڑنے کا ۔ ادارہ -
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی ۔ ″ .
ابو علی کا جوتا ۔ ″ .
ننھا سراغ رساں ۔ ادارہ ۔ -
پُراسرار غار ۔ ″ .
ظالم ڈاکو ۔ ریاض احمد خاں -
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں ۔ انور خاں .۵۰
دلی کی شادی ۔ اشرف صبوحی .
رحمت شہزادہ ۔ ″ ″ .
اندھے کا بیٹا ۔ شعیب اعظمی .۵۰
پانچ جاسوس ۔ امۃ الرحمٰن محسنی .۵۰
جنگل کی ایک رات ۔ ریحان احمد عباسی .
اچھی کہانیاں ۔ مرتبہ: ہمدرد فاؤنڈیشن .۵۰
ہرن کا دل ۔ اشرف صبوحی -
دریا کی رانی ۔ ″ ″ -
گوہر شہزادی ۔ ″ ″ -
شریر شیرا ۔ ″ ″ .۵
پری رانی ۔ صالحہ خاتون /-
خطرناک سفر ۔ ریاض احمد خاں .۵۰
ننھا جھبرو ۔ ریحان احمد عباسی .۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں ۔ یوسف ناظم .۵۰
بابا ناصح ۔ رشید الوحیدی /-
سلامہ و صمصامہ ۔ ″ ″ /-
پہاڑ کی چوٹی پر ۔ مرزا ادیب /-
شرارت ۔ محمد حسین حسان /-
ننھا فرشتہ ۔ فہمیدہ عتیق /-
ایک کھلا راز ۔ مسعود احمد برکاتی ۳/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
؛اوراس کی بیوی۔	عبدالواحد سندھی	۳/۵۰
؛قوں کا جہاز۔	شمیم حنفی	۴/۵۰
؛تلاش۔	ریاض احمد خاں	۴/-
؛شش کی چال۔	بیگم آصفہ مجیب	۳/-
ڈراما کریں۔	محمد مجیب	۳/-
؛دش کا سپنا	کرشن چندر	زیرطبع
؛انہرو۔	منور لکھنوی	۴/-
؛لا ہیرا۔	مظفر حنفی	۴/۵۰
؛ب کچوری تیل میں۔	عبدالواحد سندھی	(زیرطبع)
؛شیرخاں۔	قرۃ العین حیدر	۳/-
؛میڑیے کے بچے۔	" "	۳/-
؛مڑی کے بچے۔	" "	۳/-
؛یال ڈھینپو کے بچے۔	" "	۲/۵۰
؛ہادر۔	" "	۲/۵۰
ہرن کے بچے۔	" "	۱/۵۰
؛س نے کیا کرنہ جانا۔	آصفہ مجیب	۳/-
؛لٹا ہوا ہاتھ۔	شمیم حنفی	۷/۵۰
؛سنگھ نگر کا راجا۔	ریاض احمد خاں	(زیرطبع)
؛جی دارا اور ننھا فرشتہ۔	"	(")
سرکس۔	ڈین گیسپر	۱/۵۰
بندر اور نائی۔	عبدالواحد سندھی	۳/۵۰
لومڑی کا گھر۔	"	۳/-
جادو کا گھر۔	"	۳/-
؛بی مینڈکی اور کوا۔	"	۳/-
؛تاک دنا دن تاکے سے۔	"	۲/۵۰
روٹی کس نے پکائی۔	عبدالواحد سندھی	۲
پھر میں چگوں کیا خاک۔	"	۲/۵۰
پانچ بونے۔	"	۲/-
چیونٹی رانی۔	"	۲/۵۰
بچوں کی کہانیاں۔	"	۳/-
پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا۔	"	۲/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
پکڑ دُم کٹے کو۔	"	۲/۵۰
مدورانا پردیس چلے۔	"	۳/۵۰
ہتو جتو۔		۳/۵۰
سُرخ جوتے۔	بیگم قدسیہ زیدی	۳/۵۰
ریڈیو فیچر۔	جگن ناتھ آزاد	(زیرطبع)
پلک ننا دو۔	یوسف ناظم	۶/-
ایک دیس ایک خون۔	صالحہ عابد حسین	۳/-
جادو کے کھیل۔	اطہر پرویز	(زیرطبع)
انعامی مقابلہ۔	حسین حسان	۳/۲۵
دعوتِ ملاقی۔	"	زیرطبع
جیت کس کی؟	"	۲/۵۰
چینی کی گڑیا۔	"	(زیرطبع)
بہادر سیاح۔	"	۳/۵۰
چچا غالب۔ مرتبہ	"	(زیرطبع)
تانبیل خاں۔	محمد حسین حسان ندوی	۲/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (دو حصے) ترجمہ قرۃ العین حیدر۔		۵/-
چوری کی عادت۔	عبدالغفار مدھولی	۳/۵۰
غیر ذمہ دار لڑکا۔	"	(زیرطبع)
جب اور اب۔	آصفہ مجیب	"
سندر چنار۔	صالحہ عابد حسین	۱/۵۰
گلابو چوہیا اور غبارے۔	قدسیہ زیدی	۱/۵۰
گلابو چوہیا اور پری زاد۔	"	۲/-
ستاروں کی سیر۔	کرشن چندر	زیرطبع
لال مرغی۔	عبدالواحد سندھی	۳/-
تین اناڑی۔	عصمت چغتائی	۹/-
خربوزہ شہزادہ کا سرمن گیا۔	کوثر بانو	زیرطبع
چپارت کا آدم خور شیر۔	محمد معین	۱/۵۰
ننھا ٹٹو۔	خورشید سلطان	۳/-
چنبیلی۔	محمد حسین حسان	۱/۳۰
شہزادہ اور ٹھگ۔	ادارہ	۲/-

بتاشے
نرسری کے بچوں کے لیے آسان
زبان میں دلچسپ نظمیں : قیمت ۶/-
ے منّے بچوں
کے لیے
لچسپ
اور
تصویر کہانیاں
بھیڑیے کا گانا
6/50
جادو کی ہنڈیا
5/-
نثار دوست
کے لیے باتصویر کہانی
قیمت ۵/- روپے
کوّے کا خواب
6/50
شیر اور بکری
6/50
لومڑی
گڈریے کی بانسری
قیمت ۶/-
چالاک بلی
6/-
چاند کی بیٹی
5/-

…لیم بالغاں کے سلسلے کی کتابیں

…پیشے

- …ب خاں حجام ۔ مرتبہ : ادارہ تعلیم ترقی جامعہ -/۵۰
- …و فن ۔ " " " " -/۵۰
- …رجن راج ۔ " " " " -/۵۰

…جھلکیاں

- …علی ۔ " " " " -/۵۰
- …ت اللہ انصاری ۔ " " " -/۵۰

…تعلیم بالغان کے سلسلے کی نئی کتابیں

- …ی کی چوٹ ۔ معین الدین ۱/۲۵
- …ک ۔ مشتاق احمد ۱/-
- …یم کے بارے میں سو سوال ۔ محمد امین ۱/۲۵
- …ستین کا سانپ ۔ محمد حسین حسان ۱/-
- …دوا ۔ " " ۱/-
- …کے اپڈیشن ۔ " " ۱/-
- …د ۔ " " ۱/-
- …ک ۔ " " ۱/-
- …ی زمین " " ۱/-
- …ں کی چھوٹی موٹی بیماریاں ۔ " " " ۱/-
- …دھ وشواس ۔ ہندی ۳/-
- …ی کو بڑھاؤ ۔ " ۳/۵
- …ب مل کر ۔ " ۳/۵۰
- …ک آپ کی سیوا میں ۔ " ۳/۵۰

متفرق

- …ع تنتر دوم ۔ -/۵
- … " سوم ۔ -/۵۰
- …نے کی کھیتی ۔ ۱/-
- …ٹی ۔ -/۶۵

- ٹھیک بات چیت کیا ہے ۔ -/۵۰
- اپنی کھیتی کو چک کرو ۔ -/۵۰
- پیڑوں کی کاٹ چھانٹ ۔ -/۵۰
- ساگ سبزی اگائیے ۔ -/۵۰
- کھاد بنائیے کھاد ڈالیے ۔ -/۵۰
- ہرا چارہ ہرا رہے ۔ -/۵۰

پیام تعلیم

ماہنامہ پیام تعلیم

• ہندی کی دوسری کتابیں

- ہمارے نبیؐ زیر طبع
- حضرت محمدؐ -/۶۰
- ایورسٹ کی کہانی -/۵۰
- گلستاں کی کہانیاں -/۵۰
- مولانا روم کی کہانیاں -/۵۰
- موسموں کا کھیل -/۶۵
- پرم پرا -/۶۵
- اپنا گھر -/۵۰
- امریکہ -/۵۰
- دہلی -/۵۰
- منورنجن اور کام -/۵۰

چاندی کا چمچہ -/۴۰ | حساب چہارم ″ ملکہ بیگم قزلباش

چمپا کا پھول -/۴۵ | ″ پنجم ″ محمد یونس ۵۰

ہماری درسی کتابیں

• اردو

اردو قاعدہ -/۳
رنگین قاعدہ حصہ اول ۱/۵۰
حصہ دوم ۱/۵۰
اردو کی پہلی کتاب -/۴
″ دوسری کتاب ۶/۳۰
″ تیسری کتاب -/۶
″ چوتھی کتاب ۶/۵۰
اردو کی پانچویں کتاب ۸/۵۰
″ چھٹی کتاب -/۹
″ ساتویں کتاب -/۱۰
اردو کی آٹھویں کتاب -/۱۰
بچوں کی پہیلی -/۴
اردو کی دوسری برائے دہلی ۶/۵۰
″ تیسری ″ ۶/۵۰
″ چوتھی ″ ۸/۵۰
اردو خوش خطی حصہ اول -/۳
″ ″ دوم -/۳
″ ″ سوم -/۳
″ ″ چہارم -/۳

• حساب

حساب درجہ دوم ترجمہ: یاور حسین -/۱۲
حساب درجہ سوم ترجمہ: شکیل احمد -/۱۲

• طالبات کے لیے

ہمارا ملک بھارت -/۱۰
بھارت اور سنسار -/۱۰
ہماری دلی سوم کلاس کے لیے -/۱۰
ماحول کے ذریعہ تعلیم سوم -/۱۰
″ ″ ″ چہارم ۴/۳۰
۴/۳۰

• کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب

شعور ادب (ادارہ) -/۱۸
نیا اردو نصاب۔ اول۔ قیصر زیدی/محمد ذاکر ۱/۵۰
آئینہ ادب۔ ڈاکٹر علی رضا/ڈاکٹر آدم شیخ -/۲
انوار ادب۔ پروفیسر فصیح الدین/ڈاکٹر عابد حسین حسینی ۷/۵۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دلی ۲۵

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

دیگر اداروں کی مطبوعات

ادب، تنقید، انشا

ابر احسنی اور اصلاح سخن — مرتبہ عنوان چشتی، نعیم الدین رضوی — ۱۰/-
رفعت سروش، شخصیت اور فن — مرتبہ ڈاکٹر ضیعہ حامد — ۱۰/-
رفعت سروش بحیثیت نثر نگار — " " " — ۵۰/-
شہباز امروہوی، فن اور شخصیت — مرتبہ ڈاکٹر ضیاء الرحمن صدیقی — ۶۰/-
سید مسعود حسن رضوی ادیب — ڈاکٹر وسیم آرا — ۶۰/-
معترضین ابوالکلام آزاد — عبداللطیف اعظمی — ۳۶/-
اسلوب و معنی — ڈاکٹر اعجاز علی ارشد — ۲۰/-
منشورات جمیل (حصہ دوم) — " " — ۵۰/-
تحلیل نفسی اور ادبی تنقید — کلیم الدین احمد — ۲۲/-
محل خانہ (ناول) — سجاد دہلوی — ۳۲/-
آثار الصنادید (تاریخ) — مرتبہ خلیق انجم مکمل سیٹ — ۳۱۰/-
یادوں کے چاند تارے (سفرنامہ پاکستان) — رفعت سروش — ۲۰/-
نقد ملفوظات — پروفیسر نثار احمد فاروقی — ۶۵/-
نجیب محفوظ — بدرالدین الحافظ — ۶۵/-
جدید ہند کے سیکولر معمار — ڈاکٹر مجیب اشرف — ۵۰/-
محب وطن پریم چند — شمس الحق عثمانی — ۶۰/-
اردو خود نوشت، فن و تجزیہ — ڈاکٹر وہاج الدین علوی — ۱۲۵/-
اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی — ڈاکٹر تنویر احمد خاں — ۶۰/-
حرف برہنہ — پروفیسر عنوان چشتی — ۱۰۰/-
قلم کے صفیر — رفعت سروش — ۶۵/-
تلاش آزاد — عبدالقوی دسنوی — ۶۰/-
بہار میں اردو افسانہ نگاری — مرتبہ پروفیسر وہاب اشرفی — ۶۰/-
مکتوبات شہباز — مرتبہ ڈاکٹر سید صابر حسن — ۲۲/-
مولانا ابوالکلام آزاد (مقالات کا مجموعہ) — ۱۸/-

ترقیق الحکیم — ڈاکٹر بدرالدین الحافظ — ۶۰/-
مضامین ستیدین — ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی — ۴۰/-
ذکر شہادت — سید علی موسیٰ رضا حسینی — ۴۵/-
نذر مسعود — مرزا خلیل احمد بیگ — ۱۵۰/-
اقبال اور اس کا عہد — جگن ناتھ آزاد — ۴۰/-
کالی داس، شخصیت اور فن — شہناز شبنم — ۴۵/-
عوامی ذرائع ترسیل — اشفاق محمد خاں — ۸۰/-
پیغمبران سخن — سردار جعفری — ۴۰/-
اظہار خیال — عظیم الشان صدیقی — ۵۰/-
نظیر اکبر آبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ — طلعت حسین — ۶۰/-
داستان، ناول، افسانہ — دردانہ قاسمی — ۴۰/-
تلاش و تحقیق — کاظم علی خاں — ۸۰/-
آرٹ — عبیداللہ — ۵/-
لندن کی ایک رات — سجاد ظہیر — ۱۵/-
عبدالرحیم خانخاناں — شیخ سلیم احمد — ۸۰/-
تلاش فن — یونس اگاسکر — ۵۰/-
ریسرچ کیسے کریں — ڈاکٹر نورالاسلام صدیقی — ۶۰/-
خندہ ہائے بیجا — وارث علوی — ۵۱/-
اردو میں بچوں کا ادب — خوشحال زیدی — ۴۰/-
حیات جستجو — مظفر حنفی — ۳۰/-
ہندستان کدھر — پروفیسر آل احمد سرور — ۳/-
سخن دلنواز — خواجہ غلام السیدین — ۳۰/-
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں — خواجہ غلام السیدین — ۳۰/-
محمد مجیب، حیات اور خدمات — ڈاکٹر صادقہ ذکی — ۵۰/-
ابر نیساں — سیدہ طیبہ بیگم — ۲۰/-
متاع فکر و نظر — محمد آفاق صدیقی — ۳۰/-
ضیا فتح آبادی، شخص اور شاعر — مرتبہ مالک رام — ۱۵/-
رشید احمد صدیقی آثار و اقدار — مرتبہ اصغر عباس — ۴/-
بیدی نامہ — شمس الحق عثمانی — ۱۵۰/-
فن اور فنکار — صالحہ عابد حسین — ۳۵/-

اردو کی تہذیبی معنویت — سید علی محمد خسرو — ۶/-
جوہر آئینہ — طالب کاشمیری — ۱۲/-
جدیدیت اور اقبال — مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور — ۱۸/-
تفکر اقبال — سید وحید الدین — ۱۰/-
ادبی تنقید کے اصول — پروفیسر کلیم الدین احمد — ۶/-
عماد الدین غازی الدین خاں نظام — ڈاکٹر محمد قمر الدین — ۵۰/-
ہماری تعلیمی صورتِ حال — آل احمد سرور — ۴/-
اردو شعریات — مرتبہ " " — ۴۰/-
محمد اقبال (میر سید میر شکر) — کبیر احمد جائسی — ۱۸/-
آثار مشرق — مولانا ابراہیم عمادی — ۳۰/-
اقبال اور اردو نظم — پروفیسر آل احمد سرور — ۳۶/-
نقد ادبیاتِ فارسی — ڈاکٹر سمیع الدین احمد — ۳۶/-
فارسی زبان و ادب — " " — ۱۵/-
کاندید — مترجم سید سجاد ظہیر — ۵/-
تلاشِ فن — سید رضا حسین زیدی — ۹/-
قدیم اردو۔ جلد دوم — اڈیٹر مسعود حسین خاں — ۱۳/-
آئینہ ابو الکلام آزاد — مرتبہ عتیق صدیقی — ۲/-
ترقی پسند ادب نمبر — مرتبہ سردار جعفری — ۱۰/-
مولانا محمد علی؛ ایک مطالعہ — مرتبہ عبد اللطیف اعظمی — ۲/-
نذر حمید — مرتبہ مالک رام — ۷۰/-
بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط — مرتبہ عتیق صدیقی — ۲/-
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالیؒ) — ترجمہ رشید الوحیدی — ۲۵/-
مزامیر (دوم) — مرتبہ اثر لکھنوی — ۱۰/-
چند مصری ناول اور افسانے (تحقیقی مطالعہ) — ڈاکٹر سید بدر الدین الحافظ — ۵/-
دنیا میرا گاؤں (سفرنامے) — خواجہ غلام السیدین — ۶/-
ملفوظات گونگ نوزی — ترجمہ ظفر حسین خاں — ۳/۵۰
کاشف الحقائق۔ ایک مطالعہ — ڈاکٹر وہاب اشرفی — ۱۶/-
مثنویاتِ میر کا تہذیبی مطالعہ — ثمامہ بلال — ۴/۵۰
نقدِ شعر — قاضی عبد الرحمٰن ہاشمی — ۴۰/-

نذر عابد حسین (انگریزی) — مرتبہ مالک رام — ۲۵/-
نذر زیدی (اردو) — " " — ۵۱/-
" " (انگریزی) — " " — ۵۱/-
پیرس و پارس (سفرنامہ) — ثریا حسین — ۲۶/-
مکاتیب انجم — محمد ایوب واقف — ۲۰/-
ادبی زاویے — فخر الاسلام اعظمی — ۱۴/-
تحریر ہمہ رنگ — محمد اسد اللہ — ۲۰/-
منتخب ادب — مرتبہ سید احتشام حسین — ۲۰/-
مضامین ڈاکٹر عبد الودود — مرتبہ صفیہ ودود — ۳۰/-
فرہنگ انیس اول — نائب حسن نقوی — ۳۶/-
" " دوم — " " — ۴۰/-
سلسلہ روز و شب — صالحہ عابد حسین — ۶۵/-
یادوں کی پرچھائیاں — رحمت امروہوی — ۲۰/-
پس پردہ — آغا حیدر دہلوی — ۱۰/-
عربی ادب میں ہندوستان کا حصہ — شمس تبریز خاں — ۵۰/-
حامد اللہ افسر؛ حیات، شخصیت اور کارنامے — ڈاکٹر مقصود حسن — ۴۵/-
مرحوم دلی کی ایک جھلک — مرتبہ شمیم احمد — ۴/۵۰
نذر حمید (انگریزی) — مالک رام — ۱۰۱/-
یادگاری خطبات — مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی — ۱۵/-
نذرِ ذاکر — مرتبہ مالک رام — ۱۰۰/-
ارمغان مالک اردو — جلد دوم — ۳۰/-
ارمغان مالک انگریزی — ۳۰/-
اردو ناول میں طنز و مزاح — ڈاکٹر شمع افروز زیدی — ۱۴/-

مطبوعات خدا بخش لائبریری پٹنہ

جنید احمد کی آٹوگراف بک — جنید احمد — ۲۰/-
ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ — ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین — ۱۰۰/-
ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت — منشی رام پرشاد ماتھر — ۲۰/-

دیوانِ مصحفی — مرتبہ اسیر لکھنوی، امیر مینائی ۵۰/-
اورنگ زیب ایک نیا زاویۂ نظر ڈاکٹر اوم پرکاش ماتھر ۱۵/-
ایک نادر روزنامچہ مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۳۰/-
ہندستان میں قومی یکجہتی کی روایت بی این پانڈے ۵/-
تواریخ نادر العصر مؤلفہ نول کشور ۲۵/-
من موہن کی باتیں شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی ہدیہ ۱۸/-
معیار تحقیق (مجلہ) ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ ۱۰/-
کانٹے (کشمیری انشائیے) ڈاکٹر محمد زماں آزردہ ۱۵/-
فرہنگ زبان گویا جلد اول تالیف بدر ابراہیم ۵۰/-
مغربی تعلیم کا تصور رشید احمد صدیقی ۲/-
انتخاب ماہنامہ "ادیب" ۱۳-۱۹۱۰ نوبت رائے نظر ۵/-
طلسم ہوشربا اول ۱۰۰/-
" دوم ۱۰۰/-
" سوم ۱۰۰/-
" چہارم ۱۰۰/-
" پنجم اول ۱۰۰/-
" پنجم دوم ۱۰۰/-
" ششم ۱۰۰/-
" ہفتم ۱۰۰/-
مقدمہ طلسم ہوشربا ۲۰/-
باقیات طلسم ہوشربا حصہ اول (زیر طبع)
" " حصہ دوم (زیر طبع)
پیغام (ہفتہ وار) مولانا ابوالکلام آزاد ۱۰۰/-
باقیات عظیم الدین احمد ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ ۱۵/-
رسالہ "زبان" مدیر خوشتر منگروی ۵/-
تذکرہ کاملان رام پور مولفہ حافظ احمد علی شوق ۵/-
دیوان رضا عظیم آبادی قاضی عبدالودود ۱۰/-
بہار اردو لغت (جلد اول) سید یوسف الدین احمد بلخی ۱۵/-
انتخاب ماہنامہ "العصر" (۱۷-۱۹۱۳) پیارے لال شاکر ۱۵/-
انتخاب ماہنامہ صبح امید (۲۱-۱۹۱۸) برج نرائن چکبست ۵/-

مذہب اور سوانح

تاریخ اسلام (عہد نبوی تا خلافت راشدہ) ۱۲/-
المراۃ فی الاسلام (ترجمہ) غور دیال سنگھ مجذوب ۹۰/-
اشارے منزل کی طرف شاہ محمود عثمانی ۴۰/-
اسوۂ رسول اکرمؐ ڈاکٹر محمد عبدالحی ۵۰/-
فکر اسلامی کی تشکیل جدید مرتبہ ضیاء الحسن فاروقی ۳۰/-
گوتم بدھ دھرمانند کوسمبی ۷/-
تعلیمات اسلام حصہ دوم مرتبہ مولانا عبدالسلام قدوائی ۴/-
اُمت مسلمہ کا انحطاط اور اس کی تعمیر نو غلام محمد ۵۰/-
نکات قرآن مولانا اسلم جیراجپوری ۲/-
سوامی رام تیرتھ ڈی، آر، سود ۸/-
شری اروبندو نواجاتا ۲/۵۰
سردار ولبھ بھائی پٹیل دشنو پربھاکر -/۵۰

انجمن ترقی اردو کی پرانی کتابیں

دیوان بہرام مرتبہ اسلم ضیائی ۱۰/-
خمسہ کیفی دتاتریہ کیفی دہلوی ۵/-
جائزہ زبان اردو ۲۰/-
پرتھوی راج راسا محمود خاں شیرانی ۳/-
تنقید عقل محض ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین ۴۰/-
تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ ۳۰/-

لغات

پیامی ہوم اردو انگریزی ڈکشنری ۱۹/-
پیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری ۴/-
فیروز اللغات کلاں مولوی فیروز الدین ۱۴۰/-
اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری بابائے اردو ۱۴/-
" اردو انگلش ڈکشنری " ۱۲۰/-
فرہنگ عامرہ ۴۵/-

رسائل

شعور نمبر ۲	مرتبہ بلراج مینرا شرودت	۲۵/-
شعور نمبر ۳	" " "	۳۰/-
شعور نمبر ۴	" " "	۲۵/-
شعور نمبر ۵	بلراج مینرا شرودت	۳۰/-
شعور نمبر ۶	" " "	۶۰/-
شیرازہ	دوماہی مارچ ۱۹۶۲ء	۲/۵۰
خدا بخش جنرل نمبر ۴۴		۱۵/-
تحریر نمبر ۲۵	اڈیٹر مالک رام	۵/-
شاعر، بمبئی	اقبال نمبر	۵۰/-
اظہار نمبر ۵	باقر مہدی	۹۰/-

ناول، افسانے، ڈرامے اور خاکے

جگنوؤں کی دنیا	قرۃ العین حیدر	۶۰/-
سنہری ریت	زوبی ٹھاکر	۴۰/-
حرف نیم کش	عظیم اختر	۳۵/-
دہشت	ظفر پیامی	۴۵/-
دوسرا کمرہ (ڈرامے)	زاہدہ زیدی	۷/-
نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی (افسانے)	ساجد رشید	۴۰/-
کلر بلائنڈ (افسانے)	انور قمر	۳۰/-
کتھا (مراٹھی افسانے)	ترجمہ خالد اگاسکر	۸۰/-
یہ لوگ	سری نواس لاہوٹی	۳۵/-
زربیل (افسانے)	مقدر حمید	۴۰/-
یادِ بسیرے (افسانے)	انور خاں	۴۰/-
مکان (ناول)	پیغام آفاقی	۱۰۰/-
پھول جیسے لوگ	انور خاں	۴۰/-
پانی (ناول)	غضنفر	۳۰/-
عکس (افسانے)	نگار عظیم	۲۵/-
بند کمروں کی کھلی کھڑکیاں۔	ماجدہ شکور	۲۰/-
آگ الاؤ صحرا	قمر احسن	۲۵/-
اڑیا افسانے	پٹھانی پٹ نایک	۱۱/۵۰
جے کانتن کی کہانیاں	ٹی، جے کانتن	۱۱/۵۰
سات رنگ	عبداللہ حسین	۴۰/-
کتھا نگر	جوگندر پال	۳۶/-
خوشبوں کا باغ	انور سجاد	۳۰/-
بگولے	شمائل احمد	۲۰/-
اڑتے لمحے	ستیش بترا	۲۵/-
ذرا سی بات	ابوالکلام عزیزی	۱۵/-
تلخیاں	رشید اختر ندوی	۳/۵۰
شہناز	حبیب اشعر	۲/۵۰
ہلاکِ فریب	اثر لکھنوی	۴/-
وہ لڑکی	سندر شیام پرویز	۴/-
کوئی درد آشنا بھی نہیں	صغرا مہدی	۲/۵۰
ولیم مائسٹر	گوئٹے	۶/-
بارہ آنے	پرویز	۱/-
ماہم کی کھاڑی	مدھو منگیش کرنک	۱۱/۷۵
ننگر واڑی	وینکٹیش ماڈگولکر	۵/۲۵
بادل چھٹ گئے	یوگیش داس	۱۰/۵۰
پنجابی کے یک بابی ڈرامے	مرتبہ عطر سنگھ	۱۲/-
گجراتی کے یک بابی ڈرامے	مرتبہ ایم۔ ایم باول	۱۲/۲۵
سفید خون	نانک سنگھ	۸/-
چار دیواروں میں	ایم ٹی واسودیون نائر	۶/۷۵
تصویر بہ بتاں	اکھیلن	۱۲/۷۵
دیمک	شتر شینڈ و مکھو پادھیائے	۶/۷۵
رودِ چراغِ محفل	بنجی بابر	۱۹/۲۵
پورن کمبھ	رانی چندر	۱۹/۷۵
آدھی گھڑی	پار بتی تو	۱۵/-
سہیلا راجا، آدھے ادھورے، جگدیش چندر ماتھر موہن راکیش		۱۸/-
آئینہ	پی کیشو دیو	۹/۵۰
نئی فصل	بچن بھٹا چاریہ	۸/۷۵

کتاب	مصنف	قیمت
سورٹھ تیرا بہتا پانی	جھویر چند میگھانی	۱۲/-
ریل گاڑی	چندر دوں چمن لال مہتہ	۸/۷۵
سفر تمام ہوا	نیل پدمنا بھن	۱۱/۷۵
چک ویر راجندر	سری نواس (داستی) نیکشن انگیر	۷/۵۰
لنگر انگنگا مائی	شنکر موکاشی پنیکر	۱۴/-
شاعر	تارا شنکر بندو پادھیائے	۸/۷۵
موت کے بعد	شیورام کارنت	۸/۷۵
لہروں کی آواز	کلکی راکرشنا مورتی	۱۹/۵۰
نیل کنٹھ پاکھی ڈھوہ	اتین بندو پادھیائے	۱۵/-
یہ ہماری زندگی	دلیپ کور ٹوانہ	۱۴/۲۵
آدھے چاند کی رات	گوردیال سنگھ	
ناٹ آؤٹ	شیخ رحمٰن اکولوی	۲۰/-
حرف نیم کش	عظیم اختر	۳۵/-

شعری مجموعے

کتاب	مصنف	قیمت
گلِ صفورہ	شفیق فاطمہ شعریٰ	۳۶/-
غزل پارے (انتخاب)	شجاع خاور	۴۰/-
خوشی بول اٹھی ہے	عبدالاحد ساز	۴۰/-
سفرزاد	اجمل اجملی	۳۵/-
باز دید	مخمور سعیدی	۴۰/-
سنگِ جاں	زاہدہ زیدی	۴۵/-
حدیث دار	منصور الدین قریشی منصور	۳۰/-
عام سا ردِ عمل	شارق کیفی	۵۰/-
مراثی شاد	مرتبہ نقی احمد ارشاد	۵۰/-
باقیاتِ شاد	" " "	۲۲/-
چراغ اور کنول	اختر حمید خاں	۴۵/-
کربِ تنہائی	رفعت سروش	۵۰/-
برے رمیدہ	جگن ناتھ آزاد	۹۰/-
نوشتے	سلمان عباسی	۵۰/-
چراغ چشمِ تر	ظفر گورکھپوری	۴۰/-
متاعِ آخر شب	محسن زیدی	۴۰/-

کتاب	مصنف	قیمت
تنہا تنہا	شکیل دسنوی	۲۰/-
ملن کی آس	شمس فرخ آبادی	۱۵/-
سرِ شاخ طوبیٰ	فضا ابن فیضی	۷۵/-
دریچۂ سیم وتن	" "	۵۰/-
شہر خون آشام	ترجمہ شمیم حنفی	۲۰/-
موسم بھیگی آنکھوں کا	رفیعہ شبنم عابدی	۲۵/-
کمند حرف	عمران عظیم	۵۰/-
دھنک احساس کی	راج نرائن راز	۴۵/-
جام فروزاں	بشیر الہ آبادی	۳۵/-
لالہ زار صبح	ناشر نقوی	۴۰/-
مصرعِ ثانی	شجاع خاور	۵۰/-
داوین	" "	۲۵/-
طلسم سفر	شام رضوی	۲۰/-
زخم خنداں	ایس۔ اے مہدی	۲۵/-
سمندر آشنا	خالد محمود	۱۵/-
یدِ بیضا	ساحر بھوپالی	۳۰/-
ذوقِ سفر	غلام ربانی تاباں	۵/-
دیوانِ حضور	مرتبہ مختار الدین احمد	۱۰/-
گرد باد	عزیز قیسی	۳۰/-
آئینہ در آئینہ	" "	۴۰/-
نگارِ حکمت	محمد فضل الرحمٰن	۹/-
لمعاتِ نور	حکیم سیوہاروی	۱۰/-
موسم زرد گلابوں کا	شاہد میر	۲۵/-
کاروانِ منزل	گوپی ناتھ امن	۲/۵۰
ہندوستان ہمارا اول، دوم	جاں نثار اختر	۴۰/-
دھوپ، سایہ اور میں	وقار واثقی	۸/-
جوئے شیر	آنند نرائن ملّا	۱۵/-
معرکۂ کربلا	ایم مظفر نگری	۱۵/-
ضبط شدہ نظمیں	مرتبہ خلیق انجم	۲۱/-
بھرتری ہری اردو میں	منظوم ترجمہ یوسف ناظم	۵/-
بزم خیال	سیدہ فرحت	۳/-

موج شفق موج غبار	نور پرکار	۱۵/-
گل رعنا	مرتبہ مالک رام	۱۰/-
حرف تمنا	معین کوثر	۱۰/-
متاع کلیم	کلیم احمد آبادی	۴/-
صبح حیات	ناز مرادآبادی	۵/۵۰
کلیات عرش ملسیانی	مرتبہ مالک رام	۶۵/-
نوائے بلبل	سروجنی نائیڈو کی انگریزی کتاب کا ترجمہ	۹/-
ماتم سالک	جگن ناتھ آزاد	۱/-
ہم اور ہمارے رسولؐ	مولانا ظفر علی خاں	۱۲/۵۰
شمیم	شمیم جے پوری	۳۰/-
آتش سیال	ساجدہ زیدی	۱۰/-
موجیں	راجیندر بہادر موج	۳۰/-
بہتا پانی	احمد وصی	۱۵/-
بوئے سمن	مسعودہ حیات	۲۰/-

متفرقات

تکمیلی احصا	سانتی ناراتن	۲۲/۵۰
ہندوستانی معاشیات	الک گھوش	۲۷/۲۵

بچوں کی کتابیں

جواہر لال نہرو	ظ انصاری	۵/-
دنیا کے جانور	قدسیہ زیدی	۲/۵۰
گلابو چوہیا اور پری زاد	"	۲/۵۰
تیار رہو	او مانند	۱/۵۰
ہزاروں برس میں	صفدر عباس نقوی	۱/۵۰
چڑیاں	سلطانہ آصف فیضی	۳/-
ہماری ندیوں کی کہانی حصہ دوم	ال ۔ وی ۔ ایا	۱/۵۰

ننھا پودا	نجمہ صالح	۱۲/-
نٹ کھٹ چنو	تسنیم حیدر	۱۲/-
چار سہیلیوں کی کیاریاں	غلام حیدر	۱۲/-
پھول کے مہمان	شمس الاسلام فاروقی	۱۵/-
تتلی کے بچے	زاہدہ خاتون	۱۵/-
کاربن، قدرت کا انمول عطیہ	طلعت عزیز	۱۵/-

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

مارچ ۱۹۹۱ء جلد ۳۱ شمارہ ۳

فی پرچہ 5/=
سالانہ 45/=
غیر ممالک سے
(بذریعہ بحری ڈاک) 110/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 230/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 65/=

ایڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
TELEPHONE. 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲

پرنٹر پبلشر سید محکم کرمانی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے
لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں

اس شمارے میں

تنویرات (مضامین) قیوم خضر ۳۰/-
ہندو دھرم گرونانک جی کی نظر میں
(تقابلی تجزیہ) عبادالله صاحب گیلانی ۱۸/-
دیوان مصحفی (دیوان) عبدالسلام خاں ۵۰/-
حرف نیم کش (طنزیہ مزاحیہ) عظیم اختر ۳۵/-
آدمی زندہ ہے (منظوم کلام) حقیر آستانی ۱۰/-
بیٹی (ناول) رضیہ بٹ ۴۵/-
پھندنے (افسانے) سعادت حسن منٹو ۳۵/-
نگری نگری پھرا مسافر (مزاحیہ سفرنامہ) ابن انشاء ۴/-
خواب رو (ناول) جوگندر پال ۴/-
ٹوٹتے بکھرے لوگ (افسانے) یوگیش کمار ۴۰/-
بے نام قاتل (ناول) " " ۴/-
میرا شہر ادھورا سا (ناول) کشمیری لال ذاکر ۱۲۵/-
وہی قتل بھی کرے ہے (") مترجم حیدر رضوی ۱۰/-
نازک لمحہ (") طارق سعید مفتی ۵۰/-
کنفیشن (شاعری) صلاح الدین پرویز ۷۵/-
ہندو پاک میں اسلامی کلچر مرتبہ جمیل جالبی ۱۵۰/-
نسخہ ہائے وفا نیا ایڈیشن (شاعری) فیض احمد فیض ۷۵/-
گردش رنگ چمن " (ناول) قرۃ العین حیدر ۷۵/-
آگ کا دریا " " " ۱۵۰/-
مہر و نیم " (شاعری) افتخار عارف ۴۵/-
روشنی (رسالہ سہ ماہی) اڈیٹر شمس بدایونی
فی شمارہ ۵/-

امروز (عصری مضامین) یعقوب یاور کوٹی ۳۰/-
میثاق (شعری مجموعہ) قاضی حسن رضا ۲۳/-
خطا معاف (طنز و مزاح) بابو آر کے ۴۰/-
فن سہارا (شعری مجموعہ) محسن رضا رضوی ۲۵/-
ایک لمحہ ایک خواب " سیفی سرونجی ۲۵/-
ہنسنا منع ہے (طنز و مزاح) منظور وقار ۱۰/-
چشم دید " حیدر بیابانی ۲۰/-

سرورق:- عابد سہیل

مہمان مدیر
عابد سہیل
ایس پی جرنلسٹ کالونی
ڈیسی اعلی گنج، لکھنؤ ۲۲۶۰۲۰

اشاریہ

افسانہ کی تنقید: چند مباحث

ہر افسانہ کو دو سوالوں کے جواب ضرور دینے ہوتے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ کیا اس کا ہر کردار، ہر واقعہ، ہر موڑ، ہر مکالمہ اور سارا پس منظر اس تخلیق کی داخلی
طق میں اپنی تفسیر اور اپنا جواز فراہم کرتا ہے یا نہیں۔ افسانہ کے ہر جزو کا دوسرے اجزا اور ان اجزا کے مجموعی
ثر سے تعلق، ہم آہنگی اور ناگزیر ربط کا دوسرا نام ہی افسانہ کی داخلی منطق ہے۔ اس بات کو دوسرے لفظوں
یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ کیا افسانہ اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔

اس داخلی منطق میں ادب پارہ اپنا آزاد وجود رکھتا ہے، یعنی اس تخلیق سے باہر کی دنیا، افسانہ کے
خلی ڈھانچہ کی حد تک، اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ہر اچھی افسانوی تخلیق وقت، حالات، نظامِ حکومت
ر اقدار کی تبدیلی، نئے سائنسی انکشافات، مروجہ نظریوں کی تردید اور نئے نظریوں کو قبولِ عام حاصل ہو جانے کے
وجود اسی داخلی منطق سے ہم آہنگی کے سبب زندہ رہتی ہے۔ وقت اور تبدیلیاں اس کے پاس سے مؤدب گزر
تی ہیں۔ حالات کی تبدیلی کے باوجود اعلا پائے کے افسانہ کی علاقہ مندی (Relevanance) کے قائم رہنے کا
ز یہی ہے۔ اسی بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ ہر اچھا افسانہ اپنی داخلی دنیا خود تخلیق کرتا ہے اور
حالات کی تبدیلی کے باوجود وہ داخلی دنیا برقرار رہتی ہے اس لیے وہ تخلیق بھی زندہ رہتی ہے۔ کفن،
س کی رات، موزیل، ٹوبہ ٹیک سنگھ، شطرنج کے کھلاڑی، شکر گزار آنکھیں، نیا قانون، کالو بھنگی، گڈریے، چوتھی
جوڑا، ہاؤسنگ سوسائٹی وغیرہ میں سوڈیڑھ سو سال سے چالیس سال قبل تک کے سروکاروں (Concerns)
و مرکز بنایا گیا ہے۔ اس دوران ہندستان کا دیہی اور شہری سماج، سیاسی صورتِ حال، معاشرہ اور اقدار
غیرہ زبردست تبدیلیوں سے دوچار ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ افسانے آج بھی تر و تازہ ہیں۔ وقت
ن پر دھول کی ایک تہ بھی نہیں جما سکا ہے۔

لیکن اس داخلی منطق کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں؛ بیانیہ یا زبان کا استعمال، وقت، مکان، واقعہ
کردار، اقدار اور ان کی آویزش و آمیزش؛ بعض نقادوں کے نزدیک غالباً بیانیہ کے علاوہ باقی ساری چیزیں
ب کے "غیر ادبی معیاروں" کے زمرے میں آتی ہیں لیکن اسے کیا کیجیے کہ ان کے بغیر افسانہ کی داخلی منطق کی
شکیل ہی ممکن نہیں۔ ابتدا میں جس دوسرے سوال کا ذکر کیا گیا تھا وہ اسی "غیر ادبی معیار" سے متعلق ہے۔

اور وہ سوال یہ ہے کہ کیا زیرِ بحث افسانوی تخلیق عالمِ امکاں سے متاثر تو نہیں ہے۔ اور اس کی نفی تو نہیں کرتی کہ عالمِ امکاں کی حمایت کے بغیر افسانہ کی داخلی منطق کا بروئے کار آنا ممکن ہی نہیں۔

افسانہ آزاد ہے لیکن اپنی آزادیوں میں پابند۔ افسانہ پابند ہے لیکن اپنی پابندیوں کے باوجود آزاد۔ آزادیوں میں پابندی اور پابندیوں میں آزادی اسے امکانات کی اس دنیا سے ملتی ہے جو اس کے ہاتھ پالتو ہوتے ہیں۔

امکانات کی دنیا لامحدود ہے لیکن ہر امکان وقت اور مکاں کا اسیر بھی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "ہم جو چاہیں کرسکتے ہیں لیکن ہم جو چاہیں وہ چاہ نہیں سکتے۔" یہ فطرت پسند فلسفیوں کا نقطۂ نظر ہے۔ امکانات کے سلسلے میں یہی بات کسی قدر مشروط طریقے سے یوں کہنا شاید زیادہ مناسب ہو کہ ہم جو چاہیں وہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ نہیں چاہ سکتے۔ یعنی ہر امکان کو بروئے کار آنے کے لیے وقت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور مکان کی بھی جو اس کا تعین بھی کرتے ہیں اور نئے امکانات کے دروازے بھی کھولتے ہیں۔ مثلاً ہم اٹھارویں صدی کے کسی افسانہ میں کسی کردار کو ہوائی جہاز سے اترتے، کمپیوٹر کی مدد حاصل کرتے، سیکولرزم کے لیے جدوجہد یا وکالت کرتے اور کوکا کولا پیتے ہوئے نہیں دکھا سکتے۔ اسی طرح خطِ استوا کے آس پاس رہنے والوں کو نہ ہم گرم کپڑے پہنا سکتے ہیں نہ قطبِ شمالی میں کسی کردار کو کرتا اور پاجامہ اور جو کچھ کیا جاسکتا ہے اس کے لیے کسی نہ کسی "کہاں" کی بھی ضرورت ہوگی کہ اس کے بغیر کسی چیز کا "ہونا" ممکن ہی نہیں۔

وقت اور مکاں کو افسانہ کی معذوری ثابت کرنے اور ان سے گریز کرنے کی پرزور وکالت کی جارہی ہے لیکن افسانہ کیا، کچھ بھی ان کے بغیر قائم ہی نہیں ہوسکتا۔ ان کی مدد سے ہی ہر واقعہ، ہر کردار کہانی کا ہر موڑ استناد اور اپنا جواز حاصل کرتا ہے۔ ان ہی کے توسط سے، داستانوں کے "واقعات" کے برخلاف، جن میں کچھ بھی کہیں بھی ہوسکتا ہے اور جو داخلی ربط، منطق اور ناگزیریت سے محروم ہوتے ہیں، افسانہ میں واقعہ کی صورت بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اسے خود کو قائم کرنا پڑتا ہے۔

زمان و مکان کو تسلیم کیے بغیر کوئی قضیہ (Proposition) ممکن نہیں اور چونکہ افسانہ کی زبان کا ہر جملہ کسی صورتِ حال کی تردید کرتا ہے یا اثبات کہ اس کے بغیر دوسرا قدم کیا پہلا قدم بھی ممکن نہیں اس لیے ان کی حمایت کے بغیر پیش کیے جانے والے واقعات، کردار اور SEGNENCES زیادہ سے زیادہ ایک ہیولے کی شکل ہی اختیار کر پاتے ہیں جو افسانہ کے بنیادی تصور سے بعید ہے۔ ہر اچھے افسانہ میں کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس میں ایک قسم کی ناگزیریت بھی ہوتی ہے۔ یہی ناگزیریت ایک واقعہ کو دوسرے واقعہ سے، ایک کردار کو دوسرے کردار سے (واقعہ اور کردار کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا لیکن فی الوقت یوں ہی سہی) ایک امکان کو دوسرے امکان سے اور ان میں ہر ایک کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے۔ ہم آہنگ اور مربوط کرتی ہے اور انھیں جواز اور داخلی منطق فراہم کرتی ہے۔

گویا افسانہ اپنا داخلی جواز خارج سے حاصل تو کرتا ہے لیکن اس کے بعد وہ اپنی داخلی بنوٹ میں ایک طرح کی خود مختار اکائی بن جاتا ہے، اگرچہ اس کی یہ خود مختاری خارج سے رابطہ استوار کیے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ زمان و مکان، جن کو تسلیم کیے بغیر کچھ بھی ہونا ممکن نہیں، افسانہ کی معذوری نہیں بلکہ اس کی طاقت کا سرچشمہ ہیں۔ [illegible]

ہونے کا جواز حاصل ہو۔

یہ کہنا درست نہیں کہ افسانہ وقت اور مکان کا اسیر ہے۔ یہ دراصل اس کے اہم ترین اوزار ہیں جن کی مدد سے اس کا تانا بانا وجود میں آتا ہے۔ انشائیہ نما افسانوں اور اصل افسانوں میں بنیادی فرق داخلی جواز کا ہے جو واقعہ سے وجود میں آتا ہے، جس کے لیے زمان و مکاں ناگزیر ہیں۔ ان اوزاروں سے محروم کرنے کی ہر کوشش سے افسانہ خود اپنے وجود سے محروم ہو جاتا ہے۔ مثالیں دینے کی ضرورت نہیں، افسانہ کے نام سے لکھی جانے والی ایسی "کوششوں" کا حشر ہمارے آپ کے سامنے ہے۔

پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر یہ داخلی جواز اور ربط ضروری ہے تو ان افسانوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو ان کے بغیر لکھے گئے ہیں اور جن میں خواب کی سی ایک کیفیت ہے۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ خواب کا بھی ایک داخلی ربط ہوتا ہے جس کے سبب ہمیں خواب دیکھتے وقت واقعات کی عدم ہم آہنگی کا احساس نہیں ہوتا لیکن چونکہ خواب کا ربط اور اس کی منطق بیداری کے ربط اور منطق سے مطابقت اور ہم آہنگی نہیں رکھتا اس لیے "خواب کی سی کیفیت" کے افسانے اس داخلی جواز سے محروم ہو جاتے ہیں جس کے سبب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں افسانے میں زید کا فلاں عمل اس کے کردار سے میل نہیں کھاتا یا یہ کہ فلاں واقعہ افسانے کے دوسرے واقعات، فضا اور زیریں لہر سے ہم آہنگ نہیں۔ افسانہ کی داخلی واقعاتی بنوٹ کا اس کے جز سے مربوط ہونا ہی اسے اعتبار بخشتا ہے۔

افسانہ سروکار کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ افسانہ کی بنیاد بیانیہ پر قائم ہے اور بیانیہ بنیادی طور پر اثبات کرتا ہے یا نفی کہیں بالواسطہ اور کہیں بلاواسطہ۔ یہ بات شمس الرحمٰن فاروقی صاحب تک مانتے ہیں۔ انھوں نے اپنے تازہ ترین مضمون میں جو ماہنامہ "آج کل" میں شائع ہوا ہے، ہالینڈ کی ایک جدید خاتون نقاد میکا بال کی کتاب Narratology کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ "بیان جس میں کسی قسم کی تبدیلی کا ذکر ہو۔ یعنی واقعہ کہا جائے گا مثلاً

اس نے دروازہ کھول دیا / دروازہ کھولتے ہی کتا اندر آ گیا / کتا اس کو کاٹنے دوڑا / وہ کمرے سے باہر نکل گیا" بیانیہ ہیں اور ان کے برخلاف مندرجہ ذیل بیانات کو واقعہ یعنی Event نہیں کہہ سکتے۔ کتے بھونکتے ہیں / انسان کتوں سے ڈرتا ہے / کتے کے جبڑے مضبوط ہوتے ہیں / کتے کے نوک دار دانتوں کو دندان نیش کہا جاتا ہے۔"

بیانیہ کے سلسلے میں فاروقی صاحب کے ان خیالات (خاص طور پر وہ جن کا ذکر انھوں نے اس قضیہ کے ابتدائی حصہ میں کیا ہے) سے بڑی حد تک متفق ہونے کے باوجود یہ ضرور کہنا ہے کہ انھوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کے مضمرات پر غور نہیں کیا ہے۔ جب بیانیہ کے لیے قضیہ ضروری ٹھہرا تو وقت، مکاں اور داخلی منطق بھی اس کے حصار میں آ گئے کیونکہ نہ صرف ہر چیز ہر وقت اور ہر جگہ ممکن نہیں بلکہ وقت اور مکان کے بغیر اس کا ادراک تک ممکن نہیں۔ حد یہ ہے کہ لامکانیت اور ہمیشگی کو بھی ہم مکان و زماں کے حوالے سے ہی سمجھ سکتے ہیں، نہ کہ اس کے برعکس۔ اور اگر خواب کی سی فضا میں کسی دوسری قسم کی منطق کو بروئے کار لایا جائے تو خود زبان، بیانیہ کی زبان، "آستین کا لہو" بن کر "زبان خنجر" کی شکل اختیار کرے گا کیونکہ زبان

پہلے ممکن نہ تھا کہ فلاں فلاں الفاظ اس وقت رائج نہ تھے اور اس عہد کے بعد کے بھی نہیں ہو سکتے کہ جانے کب کے متروک ہو چکے تھے۔

گویا بیانیہ کو تسلیم کرنے کے معنی ہی افسانہ میں وقت، مکاں، واقعہ اور کردار کو اس کے ناگزیر جزو کی حیثیت سے قبول کرنا ہے۔ اس بحث کے سلسلے میں افسانہ میں اقدار کی آمیزش اور آویزش ا حوالہ جاتی عنصر کا بھی ذکر ضروری ہے۔ اول الذکر مسئلہ کے بارے میں براہِ راست تو کچھ نہیں کہا گیا لیکن زن کی معنویت ہی معرضِ بحث بن گئی ہو تو اقدار لازمی طور پر اس کی زد میں آجاتی ہیں۔ ادب میں اقدار کی ا ے سلسلے میں کسی نوعی بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ظاہر ہے یہ مصنف کے صوابدید پر منحصر ہے لیکن ا ہیں قدر چونکہ نوعی طور پر داخل نہیں ہوتی بلکہ واقعہ اور کردار کا گوشت پوست بن کر داخل ہوتی ہے اس لیے اس مسئلہ پر اسی نوعیت سے غور کرنا چاہیے۔ واقعہ کے معنی ہیں کچھ نہ کچھ ہونا، اچھا، برا یا ایسا کچھ جو نہ ا ہے نہ برا اور یوں بھی ہوتا ہے کہ دو ناپسندیدہ چیزوں کے درمیان کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے یا سے کم انتخاب کا سوال سامنے ہوتا ہے جسے نفسیات میں oidance - Avoidence Conflict کہا جاتا ہے۔ ان چاروں قسم کی صورت حال میں عام طور سے براہ راست تاثر واقعہ کے ذریعہ مرتب ہوتا اور اگر یہ تاثر کسی توسط سے قاری تک پہنچتا ہے تو یہ توسط کردار کا ہوتا ہے۔ واقعہ بغیر کردار کے ممکن نہ اور کردار بغیر واقعہ کے۔ ہوتا بس یہ ہے کہ اگر "مجموعی حقیقت" کے اظہار میں کلیدی رول "ہونے" کا ہو تو ا واقعہ کے ضمن میں آتا ہے اور اگر یہ رول "کرنے" کا ہو تو اسے کردار کے خانے میں رکھتے ہیں (طوالت کے خوف سے فی الحال مثالوں سے گریز کیا جا رہا ہے) چنانچہ واقعہ اور کردار کو الگ الگ خانوں میں نہیں ر جا سکتا۔ لیکن ایک بات بالکل بدیہی ہے کہ اچھے افسانہ میں قدر ناصح کا وعظ خشک بن کر نہیں بلکہ واقعہ یا ک اور کبھی کبھی دونوں کے توسط سے داخل ہوتی ہے اور چونکہ ان دونوں کا قائم ہونا اس وقت تک ممکن نہ جب تک وہ اپنے وجود کا اثبات ان احساسات اور ادراکات سے نہ کریں جو انسانی زندگی سے علاقہ رکھتی ہ اس لیے قدر کسی نہ کسی شکل میں خود بخود افسانہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

حوالہ جاتی عنصر نہ افسانوی ادب کی خوبی ہے نہ خامی۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ افسانہ کی ساخت کا حصہ ہے یا نہیں۔ تخلیق کی ساخت کا حصہ بن جانے کی صورت میں، امین آباد، لکھنؤ کا صرف وہ بازار نہیں رہ جس سے ہم آپ واقف ہیں اور یہ واقفیت اس کے جواز پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ برخلاف اس اگر وہ اس داخلی نظم کا حصہ بننے میں ناکام ہے تو کوئی فرضی نام بھی اسی قدر بے وقعت رہے گا جتنا کوئی نام یا واقعہ جو "حوالہ جاتی عنصر" کے ضمن میں آتا ہے۔ چنانچہ "حوالہ جاتی عنصر" کی بحث افسانوی ادب نوعی مسئلہ ہے ہی نہیں۔

مجموعی طور سے کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ میں واقعات کی ناگزیریت ہی امکان کو صد امکاں ؛ لاتی ہے۔ زمان و مکاں کے بغیر واقعہ قائم نہیں ہو سکتا۔ افسانہ اپنی ناگزیریت کا جواز خارج سے ہ ضرور کرتا ہے لیکن اس کے بعد وہ ایک خود مختار اکائی بن جاتا ہے اور اس کی یہ خود مختاری ہی اسے حالا کی تبدیلی اور وقت گزرنے کے باوجود قائم رکھتی ہے۔

رفعت سروش
۲ بی پاکٹ سی سدھارتھ ایکسٹنشن
نئی دہلی ۱۱۰۰۱۴

اعتراض باقی ہے

بہ یاد ظ۔ انصاری

پادش بخیر — ۹۶، والکیشور روڈ بمبئی کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار جلسوں میں ایک تیکھی آواز
ی لہجہ کے ساتھ ابھرتی اور تقریباً ہر ادیب اور شاعر کی تخلیق پر شائستگی مگر صلابت کے ساتھ اظہار
کرتی اور زبان و بیان کی گرفت کرتی۔ اب وہ تخلیق کار چاہے جوش ملیح آبادی ہو یا کرشن چندر
جعفری ہو یا ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی ہو یا رفعت سروش، بات سے بات چلتی، جواب الجواب کی
ن آتی اور پھر اہل محفل کے اصرار پر بحث ختم کر دی جاتی۔ مگر وہ تیکھی آواز آخر میں اسی شائستگی سے
دیتی — "میرا اعتراض باقی ہے"

شر و ادب، فکر و فن، سماجیات، معاشیات اور سیاسیات — زندگی کے ہر شعبہ کو بہتر سے بہتر
نے کی دھن میں اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ ان شعبوں کی خرابیوں اور منفی اقدار کو نشانۂ اعتراض بنانے
اس آواز کا نام تھا۔ ظ۔ انصاری۔ اس کے اعتراض کی جو آواز ۴۶ء کے اوائل میں ۹۶، والکیشور روڈ
ٹھی تھی وہ وقت کے ساتھ پوری دنیائے ادب و ثقافت میں گیا۔ کرۂ ارض کے ہر گوشے میں پھیل گئی۔
گونجی۔ ہر شعبۂ حیات کے دل و دماغ سے ٹکرائی۔ مگر اس آواز کو سکون کبھی حاصل نہ ہوا۔ اسے
واب نہ مل سکا۔ اس کا اعتراض باقی رہا۔ آج وہ آواز اپنے گنبد میں سمٹ آئی۔ ابدی خاموشی کے
ں ڈھل گئی۔ مگر اس کا "اعتراض باقی ہے"۔ شاید آنے والی نسلیں اس اعتراض کا جواب
سکیں۔ یا شاید......

ظ۔ انصاری نے ہیر ڈالنا نہیں سیکھا تھا۔ وہ مشہور شیعہ درسگاہ "منصبیہ کالج میرٹھ" کے فارغ التحصیل
ا تھے۔ ۴۵ء میں الہ آباد سے دلی آئے اور روزنامہ "انصاری" سے وابستہ ہوئے، مارکسزم سے مشرف
ئے اور جب اوائل ۴۶ء بھی سید سبط حسن کے امریکہ چلے جانے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کے ہفتہ وار
ہ "قومی جنگ" (بعد میں "نیا زمانہ") کو کسی اور جوہر قابل کی ضرورت ہوئی تو قرعۂ فال ظ۔ انصاری
نام نکلا۔ اور سید سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، ضیا الحسن، اشرف، اور کیفی اعظمی وغیرہ ان کے ہم قلم
ے۔ اور انھوں نے اپنے ہم چشموں میں اپنی ایک الگ پہچان بنالی۔

مولوی ظل حسنین نقوی سے ظ۔ انصاری بننے تک کی روداد قابل ذکر نہیں ہے کیونکہ اس زمانے میں یہ
مار، عام تھی [illegible]

ظ۔ انصاری ہی ہیں۔ وہ ظ۔ انصاری جو عین نوجوانی میں بمبئی میں وارد ہوئے تھے۔ گندمی رنگ چھریرا بدن، رفتار وگفتار میں دھیماپن۔ مگر زبان اور قلم میں کاٹ۔ جو شخص اپنے روایتی اور آبا معاشرے کو رد کرسکتا ہے وہ ہر ناپسند اور نامرغوب چیز یا فکر یا معاشرہ کو رد کرسکتا ہے۔ اور بار بار اپنی اختراعی اور انقلابی ذہنیت کو آشکار کرسکتا ہے۔ ظ۔ انصاری کی پوری زندگی — ۳۱ر جنوری ۱۹۹۱ء تک اس کی مثال ہے۔

ظ۔ انصاری بنیادی طور پر شاعر تھے اور صحافت ان کا پیشہ تھی۔ بمبئی میں پہنچ کر وہ سب سے پہلے اپنے ساتھیوں کی تنقید کا نشانہ بنے۔ خود بھی نشانہ باز تھے اس لیے میدان سے بھاگے نہیں۔ پھر جب ہندستان کا سیاسی ماحول بدلا اور تقسیم وطن کی ہم نوائی کرنے والی کمیونسٹ پارٹی آزادیٔ وطن کے کچھ عرصہ بعد ہی قومی حکومت کی پالیسیوں کی معترض ہوگئی تو ترقی پسند ادیب و شاعر معتوب ہونے لگے۔ ظ۔ انصاری بھی اپنے اور ساتھیوں کی طرح سیاسی قیدیوں کے زمرے میں آگئے۔ بڑا پرآشوب دور تھا۔ ترقی پسند ادیب و شاعر اور دانشور یوں ہی مفلوک الحال تھے۔ جیل چلے جائیں تو ان کے بال بچوں کے اخراجات کا مسئلہ۔ شاید پارٹی کے پاس ایسا کوئی فنڈ نہ تھا۔ کم از کم میرے علم میں نہیں۔ جس سے متاثرہ لوگوں کے اہل خاندان کی کفالت کی جاسکے۔ پھر نظریاتی سطح پر بھی تبدیلیوں کا عمل جاری تھا۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو۔ ظ۔ انصاری اور بلراج ساہنی حاکمان وقت سے "سمجھوتہ" کرکے جیل کی چہار دیواری سے باہر آگئے۔ اب ان کے لیے دنیا بہت کھلی ہوئی تھی مگر "پارٹی" کے دروازے بند تھے۔ بلراج ساہنی تو فلموں میں چلے گئے اور ظ۔ انصاری آ صحافت کی دنیا میں۔ روزنامہ انقلاب (بمبئی) سے متعلق ہوئے اور ان کے طنزیہ کالم نے خاصی مقبولیت حاصل کی۔ یہ زمانہ ظ کا تشکیلی دور ہے، جدوجہد کا زمانہ ہے۔ سب سے پہلے انھوں اپنی اس خامی کا احساس کیا کہ وہ انگریزی داں نہیں ہیں۔ انھوں نے دن رات ایک کرکے اپنی انگریزی کی استعداد بڑھائی اور برنارڈ شا پر ایک کتاب لکھ ڈالی۔ شاید یہ ان کی پہلی کتاب ہے۔ پھر مختصر انشائیوں اور افسانچوں کا ایک مجموعہ "ورق ورق" شائع کیا۔ اس کتاب میں ندرت تھی اور ادبی حلقوں میں موضوع گفتگو بنی۔ 'شاہراہ' اور دوسرے ادبی رسائل میں بھی ان کے تیکھے تنقیدی مضامین چھپ رہے۔ کسی نئے سال کے موقع پر ان کا ایک عمدہ مضمون 'شاہراہ' میں چھپا تھا۔ "نیا سال نئے سوال" اس دور میں بمبئی کے چار قلم کاروں نے مل کر ایک شاندار ادبی رسالہ نکالا۔ ماہنامہ "خیال" — یہ چار ادیب تھے۔ میراجی، اختر الایمان، ظ۔ انصاری اور مدھوسودن — اس رسالہ پر "میراجیت" کا غلبہ تھا۔ ترقی پسند حلقوں میں شدید ردعمل ہوا اور زوردار بحثیں ہوئیں۔ (ان مباحث کا ذکر میری کتاب "بمبئی کی بزم آرائیاں" میں تفصیل کے ساتھ ہے) دراصل "خیال" بھی ظ۔ انصاری کے مسائل کا حل نہیں تھا۔ وہ تو مضطرب تھے کسی اور منزل کے لیے جو ان کے ذہن میں ہوگی۔ میراجی کی شخصیت بڑی مقناطیسی تھی۔ وہ اپنی درویشانہ صفات سے ہم نشینوں کو مسحور و مغلوب کردیتے تھے۔ اختر الایمان اور مدھوسودن (افسانہ نگار) تو دہلی سے ہی میراجی کے حلقہ بگوشوں میں تھے، ظ۔ انصاری اب ان کے زیر اثر آئے۔ ظ۔ انصاری نے شاید میراجی کے کہنے پر شاعری ترک کردی۔ ان کی ایک نظم "خیال" میں

چھپی تھی۔ اور ظ۔ کے بیان کے مطابق یہ ان کی آخری نظم تھی۔ (البتہ انھوں نے اب آٹھ دس سال پہلے کچھ روسی شاعروں اور پشکن کی نظموں کا منظوم ترجمہ کیا تھا) وہ نظم میراجی کے نام معنون کی گئی تھی۔ اور اس کی ابتدا اس مصرع سے ہوتی تھی۔

"میراجی! کچھ تم ہی بتاؤ تم نے تو دنیا دیکھی ہے"۔ شاید ضروریات زندگی کا تقاضہ تھا کہ وہ بوہرہ فرقے کے سربراہ سیدنا ملا طاہر سیف الدین کے چھوٹے بھائی پرنس نجم الدین کے ٹیوٹر بھی رہے اور یہ تعلق ان کی آئندہ زندگی میں بھی کام آیا۔ "انقلاب" ظ۔ انصاری کو زیادہ دیر اپنے دائرہ میں نہ رکھ سکا اور وہ موقع غنیمت جان کر بمبئی سے عازم دلی ہوئے اور ماہنامہ "شاہراہ" کی ادارت سنبھال لی۔ مگر وہ ظ۔ انصاری ہی کیا جو کسی ایک جگہ بیٹھ رہے۔ 'شاہراہ' تو ماہانہ پرچہ تھا۔ وہ بھی محض ادبی۔ اور ظ۔ انصاری ادب و سیاست اور ثقافت و صحافت کا امتزاج۔ ادارۂ شمع نے ہفتہ وار پرچہ "آئینہ" نکالا اور ظ۔ انصاری اس کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ اگرچہ "آئینہ" بہت دن نہیں چلا۔ مگر اس کے جتنے شمارے نکلے وہ اپنی مثال آپ تھے۔ کیا بہ اعتبار مضامین اور کیا بہ اعتبار ترتیب و طباعت ـــــ اور پھر ظ۔ انصاری کی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا۔ ماسکو سے دارالترجمہ میں کام کرنے کے لیے بلاوا آیا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ماسکو پرواز کر گئے۔ شاید یہ سوچتے ہوئے ـــ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

یہ وہ زمانہ تھا کہ سوویت یونین میں اردو والوں کی آمد رفت شروع ہو چکی تھی۔ سردار جعفری اور کرشن چندر پھیرا لگا آئے تھے۔ ماسکو ریڈیو پر کچھ اردو بولنے والی آوازیں پہنچ گئی تھیں۔ جیسے شاہدہ زیدی۔ سوویت یونین میں اردو خوانی کا شوق بڑھ رہا تھا۔ ایسے میں ظ۔ انصاری پہنچے۔ ذہین آدمی، کئی زبانوں کے ماہر، خصوصاً فارسی اور عربی کے۔ ہندستان کی مشہور دینی درسگاہوں کے بعض فارغ التحصیل طلبا مشہور عالم ہوئے ہیں، کیونکہ ان کے نصاب میں زبان و ادب کے علاوہ اور دینیات و فقہ کے ساتھ ساتھ منطق، فلسفہ، علم معانی اور علم الکلام بھی داخل ہوتا ہے۔ اپنے نظریات کو استدلال کے ساتھ بیان کرنے اور معترض کو لاجواب کر دینے کا فن بھی ان مدارس میں سکھایا جاتا ہے۔ اور ان علما میں سے جو حضرات علوم مروجہ سے بھی آشنا ہو جائیں اور انگریزی پڑھ لیں تو پھر اپنے ہم چشموں میں امتیاز حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسی ایک مثال تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی (فاضل دیوبند) ظ۔ انصاری نے بھی اپنی روایتی تعلیم اور جدید علوم کے مطالعے کی بنا پر بہت جلد سوویت عالموں سے اپنی ذہانت و قابلیت کا لوہا منوا لیا۔ اور خوش قسمتی سے انھیں بابا غفوروف جیسا قدر دان مل گیا۔

بابا غفوروف فارسی کے دیوانے تھے۔ وہ تاجیک تھے اور تاجیک (یعنی قدیم فارسی) زبان پر فخر کرتے تھے۔ فارسی کے اکثر شعرا کو تاجیک کہتے تھے۔ مجھے بھی ۷۳ء میں ماسکو میں ان سے ملنے کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔ بڑی بارعب عالمانہ شخصیت تھی ان کی۔ دوہرا بدن تھا، گول چہرہ، آواز بھی گہرائی اور مٹھاس ـــ ظ۔ انصاری نے سوویت یونین میں اور جو کچھ کیا سو کیا، مگر ایک بڑا کام یہ کیا کہ

کی ڈگری حاصل کی اور جب وہ ہندستان واپس آئے تو ڈاکٹر ظ۔ انصاری تھے۔ روسی زبان کے ماہر۔ اور ایسے ماہر جنھوں نے باباغفوروف جیسے جید عالم کے ساتھ روسی۔ اردو ڈکشنری تیار کی۔ اور اسی روسی زبان کا طفیل تھا کہ وہ بمبئی یونی ورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔

جن دنوں ظ۔ انصاری ماسکو میں رہتے تھے، ان کے متعلق ہندستان میں بہت سی خبریں آتی تھیں۔ ۱۹۶۰ء کی بات ہے، پاکستان کے صدر جنرل ایوب خاں روس کے سرکاری دورے پر گئے۔ ان کے ساتھ مشہور شاعر جمیل الدین عالی بھی تھے۔ عالی ماسکو سے لوٹے تو دلی ہوتے ہوئے کراچی گئے۔ مجھ سے بھی ملنے آئے۔ ان دنوں میں آل انڈیا ریڈیو کے دودھ بھارتی یونٹ میں کام کرتا تھا۔ میں نے عالی سے پوچھا کہ ماسکو میں ظ۔ انصاری سے ملاقات ہوئی اور ان کا کیا حال ہے۔ عالی نے ظ۔ کی تعریف کرتے ہوئے کہا

(میں ان کے الفاظ دہرا رہا ہوں) ان دنوں کے سوویت یونین میں کسی کا ہونا بہت بڑی بات تھی، کیونکہ ضروریات زندگی تو سب کو میسر ہو جاتی تھی مگر آسائش سے خرچ کرنے کے لیے دولت نایاب تھی۔ صرف کچھ چھوٹ تھی قلم کار حضرات کو۔ اور میں قیاس سے کہہ سکتا ہوں کہ ظ۔ انصاری نے اپنے قلم سے بہت کچھ کمایا ہوگا اور جی کھول کر خرچ کیا ہوگا۔ قلم کی آمدنی کا اندازہ مجھے اس طرح ہے کہ جب میں سوویت یونین گیا تو ماسکو میں ایک رسالے کے لیے دو مضامین لکھے اور ماسکو ریڈیو سے ایک تقریر اور اپنی کچھ نظمیں نشر کیں۔ مجھے تقریباً دوسو روبل ملے۔ میں نے اپنی گائڈ سے کہا کہ میرے پاس اتنے روبل ہیں اور میں کچھ خریدنا چاہتا ہوں۔ اس نے حیرت سے کہا۔ دوسو روبل۔ آپ بہت مالدار ہیں ـــ اس زمانہ میں ماسکو میں ایک متوسط درجہ کے آدمی۔ مثلاً کالج کے لکچرر کی تنخواہ دوسو روبل تھی ـــ تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ظ۔ انصاری نے اپنے قلم کی قوت کو پہچانا اور اس کا بھرپور استعمال کیا۔ اور زندگی کی جو آسائشیں، آرام، شہرت ان کو زندگی میں نصیب ہوئی وہ سب قلم کی بدولت۔ اور انھیں اپنے قلم کی قوت پر آخر وقت تک بھروسا رہا اور ان کے ہر سانس نے قلم کی حفاظت کی۔

جن دنوں عالی نے مجھے ظ کے بارے میں بتایا اس کے کچھ عرصہ بعد ظ ہندستان آئے کچھ دن کے لیے۔ دلی بھی آئے۔ ان سے ملاقات ہوئی اور گرمیوں کی ایک خوشگوار شام میں نے ان کے ساتھ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر گزاری۔ (میں ان دنوں بلی ماران رہتا تھا) اس ملاقات میں میں نے محسوس کیا کہ اب ظ۔ انصاری وہ بمبئی والے ظ نہیں ہیں۔ دبلے پتلے۔ گال اندر کو دھنسے ہوئے۔ اب ان کے چہرہ پر خوش حالی اور بشاشت کھلی پڑتی تھی مگر وہ خود فریبی کے مرض میں گرفتار نہیں تھے۔ ہم نے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر قلفیاں کھائیں۔ کہنے لگے ـــ چلو کچھ خریدتے ہیں۔ یہاں بازار میں مول بھاؤ کرنے میں جو مزا آتا ہے اس کا جواب نہیں۔ روس میں تو بس دام مقرر ہیں، لو یا نہ لو۔ اس شام ظ۔ انصاری نے بتایا کہ میں نے زندگی میں جو کچھ چاہا مجھے ملا۔ عمدہ مکان، موٹر کار، شاندار رہن سہن، قابل رشک دوست، عزت، دولت، سب کچھ ـــ آج مجھے ظ۔ انصاری کے وہ الفاظ یاد آرہے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں کہ ظ۔ انصاری کی کامیابی کسی کی رہین منت نہیں سوائے ان کی انتھک

محنت اور فنی ریاضت کے۔ اور یہی وہ واسطے ہیں جن کی بنا پر وہ دنیا کے کونے کونے میں گھومے، ان کی آواز دنیا کی تعلیم گاہوں میں گونجی۔

روس سے مستقل طور پر ہندستان آجانے کے بعد ظ۔ انصاری نے نہایت دلجمعی سے کام کرنا شروع کیا۔ بہت سے اداروں سے وابستہ ہوئے جن میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر "غالب انسٹی ٹیوٹ" ہے جس کے فروغ میں ان کی مساعیٔ جمیلہ کو کافی دخل رہا۔ مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے تو وہ سکریٹری رہے۔ خسرو اکیڈمی کے بھی وہ اہم رکن تھے۔ ان کی تالیفات میں خسرو شناسی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ غالب کی فارسی مثنویوں کو یکجا کر کے ان کا نثری ترجمہ بھی ظ۔ انصاری کا تجرباتی کام ہے۔ ایک کتاب لکھ کر "اقبال شناسی" کا فرض بھی ادا کر گئے۔ بمبئی یونی ورسٹی سے بحیثیت پروفیسر ریٹائرڈ ہونے کے بعد انھوں نے گوشہ نشینی گوارا نہ کی بلکہ صحافت کی شراب کہنہ کو پھر منہ سے لگا لیا تھا۔ کچھ دن کے لیے ہی سہی۔ وہ بہت چاق و چوبند تھے، آج بمبئی میں ہیں کل لندن اور پرسوں نیویارک۔ ملکی اور بین الاقوامی سیمناروں میں ان کی شرکت ان کی چونکا دینے والی تقریروں اور مقالات کے باعث ایک واقعہ ہوتی تھی۔ چاہے کیسا ہی بڑا جلسہ ہو، وہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنا جانتے تھے، اور اپنی شخصیت کا لوہا اپنے حریفوں سے منوا لیتے تھے۔ ان کا اپنا ایک اندازِ نظر تھا۔ اور وہ کلیتاً کسی چیز کو قبول نہیں کرتے تھے۔ یعنی "ان کا اعتراض باقی رہتا تھا"۔

ابھی ان کے مرنے کے دن نہیں تھے۔ ابھی تو وہ اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہو کر اپنے آپ کو سمیٹنے کے عمل میں تھے اور توقع تھی کہ وہ اپنی زندگی اور اپنے متنوع تجربات کا نچوڑ دنیا کو کسی عظیم ادب پارے کی شکل میں پیش کریں گے۔ مگر عمر نے ان کے ساتھ دغا نہ کی اور انھیں اپنے کام ادھورے چھوڑ کر اس محفل سے اٹھ جانا پڑا۔ انھیں نہ جانے کتنے اعتراضوں کا جواب نہ ملا۔ اور جب تک اس دنیا کے مسائل لاینحل ہیں، ان کا اعتراض باقی ہے۔

سعید الظفر چغتائی
شعبۂ علم طبیعیات۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نہ جامِ جم، نہ وصالِ صنم، نہ شہرت و نام
مصوّر اپنے تصوّر کا ڈھونڈتا ہے دوام
حیات جبرِ مسلسل ہے، تو ہے جبر شکن
ہر ایک گام پہ آزادگی کا تجھ کو سلام
سحر بھی ہوگی، نسیمِ سحر بھی گائے گی
مگر یہ رات، محبت، چراغ، زہر کے جام!
تصوّرات کے پھولوں میں رنگ بھرتا ہے
حقیقتوں کی کڑی دھوپ دیتی ہے انعام
میں اپنی شمع جلاتا رہا ہوں ڈوبا پر
میں اپنے شعلے سے ہوتا رہا ہوں گرمِ کلام
شراب پی بھی تو پی چشمِ مستِ ساقی سے
مگر بڑھائے پیالۂ غمِ حیات کے جام
اسی سے میرے رگ و پے میں آتشِ سیال
اسی سے میرے تصوّر کے خم میں ماہِ تمام!!

نوا سے جس کی مچی تھی فضاؤں میں ہلچل
مری ہوس کا پپیہا نہ اُڑ سکا دو پل
زمیں میں زر ہے، ہواؤں میں نم، بہار کی رُت
تپے نہ شاخ تو پھر بھی نہ پھوٹے گی کونپل
مشامِ جاں، کبھی سونگھی ہے اس کی بو تو نے
رگوں میں دوڑتے کوثر میں کھلتا ہے جو کنول؟
ہرے لہو کو حرارت بھی آفتاب کی لے!
عروسِ ماہ کی ٹھنڈی کرن، نظر میں مچل!!
اُٹھائے ہاتھ شجر الوداع کہتے ہیں
سہانا وقت ہے، آؤ چلیں سوئے مقتل

ستیہ پال آنند
ای-۱- یونی ورسٹی کیمپس
سیکٹر ۱۴- چنڈی گڑھ ۱۴

وقت اور مقام کا تواتر

اپنی آنکھوں پہ بارہا مجھ کو
شک ہوا ہے کہ جھوٹ کہتی ہیں

"تم یہاں ہو — یہی جگہ ہے جہاں
تم ہو — اور پھر اگر یہاں ہو تو،
تم وہاں پر تو ہو نہیں سکتے!"

"تم ابھی ہو — اگر ابھی ہو تو،
اب سے پہلے نہیں تھے — اور اب کے
بعد ہونا تبھی غیر ممکن ہے!"

"اب" "یہاں" — طے شدہ حقیقت سی؟
"تب" "وہاں" — فہم کا توہم سا؟

اپنی آنکھوں سے کیا سوال کروں؟
خود نگاہی انھیں نہیں آتی!

○

SPACE TIME CONTINUUM.

اطہر راز لندن

ATHAR RAZ
President: Asian Writers' Guild
21 Colwood Gardens
Colliers Wood
LONDON
SW19 2DS

آج!

وقت کے سمندر میں آج
"آج"
ایک مچھلی ہے
جس کی بیقرار آنکھیں
کل کے خواب بنتی ہیں
کل کبھی نہیں آتی

نظم ۲

جلا وطن سچائی
ایک دن نوکِ زباں پہ
سچ کو جب رکھ کر چلا
شہر کی گونگی فضائیں
لوگ بہرے ہو گئے

نظم ۳

لارڈ میکالے
بس کہ خالی دفتروں کا
پیٹ بھرنے کے لیے
سرزمینِ ہند کی
زرخیز مٹی دیکھ کے
وہ کلرکوں کی نرالی
فصل بو کر آ گیا۔

سید قدرت نقوی
۱۴/۱۵۔اے البغدادی نارتھ کراچی
(پاکستان)

پنچ کھنیا دوہے

بھوئی موئی اس کا بدن، چاندی کی اک ڈال
پھوٹ پڑے ہے جوبن کی، سونا برسے گال
بیکل دل کو سنبھال

سورج ڈوبا سانجھ بھئی، گھور اندھیرا چھایا
خود سوچے انساں اس نے، کیا کھویا کیا پایا
ست یگ یا جگ مایا

ست یگ اور مایا جال، دونوں جیون پاٹ
مایا جیون جنجال، ست ہے مکتی ڈال
جس کو چاہے سنبھال

جیون کو حق پر وارا، کام کیا اک نیارا
جھوٹ سے جیون انجولی، یہ نہ سے اجیارا
پیم ہے من بھگیارا

شہر وفا کی گلیوں میں، جور و جفا کا راج
گل کی رنگت، باس گئی، گلشن ہے تاراج
جیسے مورن تاج

ہر سو ہے گھور اندھیرا، گھر گھر دیپ بجھائے
بھان کا لاگو رکھوالا، ڈھارس کون بندھائے
داتا آس پڑائے

گھر گھر سونا پن برسے، من من آس نراس
لوٹے مارا جائے، الٹی کال دلاس
جل کے پاس تراس

حامد کاشمیری
شالیمار۔ سری نگر

غزل

ایسی رُت میں سرخ پھولوں کی فراوانی نہ تھی
تھی پریشانی مگر اتنی پریشانی نہ تھی

برف پہلے بھی مسلسل رات بھر گرتی رہی
ہونٹ پتھرائے نہ تھے، آنکھوں میں ویرانی نہ تھی

کیوں فزوں تر ہو گئیں قلب و نظر کی وحشتیں
گلستاں در گلستاں آشفتہ سامانی نہ تھی

گھر تو گھر، روشن ہوئیں شب بھر نواحی بستیاں
اس قدر پہلے مرے اشکوں میں تابانی نہ تھی

کتنی بیگانہ وشی سے صبحدم گزری ہوا
مجھ کو حیرت ہے، چمن والوں کو حیرانی نہ تھی

کشورِ آزادگاں سے ہو کے آجاتی کبھی
اے ہوائے صبح، میری طرح زندانی نہ تھی

ماجد الباقری
۱۱۔ وحدت کالونی
گوجرانوالہ پاکستان

غزل

یہ زور و شور سرِ آبشار کیسا ہے
خموش کب سے ہے یہ کوہسار کیسا ہے

کوئی ہے اور بھی آئے گا جو اسی جیسا
وہ آچکا ہے مگر انتظار کیسا ہے

جو چاہتے ہیں کسی کو یہاں نہ آنے دیں
بتاؤ شہرِ طلب میں حصار کیسا ہے

یہ کیسی شاخ کے پیوند ہیں درختوں پر
یہ کیسے پھل ہیں یہ رنگِ بہار کیسا ہے

ہمیشہ سوچ سے کم ہی رہا ہے ہر حاصل
خیال و خواب کا یہ انتشار کیسا ہے

کسی بھی گھر میں وہ پہلی محبتیں ہی نہیں
کوئی بھی کہتا نہیں یہ پیار کیسا ہے

ہر ایک لفظ کے معنی بدل گئے ماجد

شاہد نجیب آبادی
پوسٹ بکس نمبر ۲۶۵۷۲
بحرین (عربین گلف)

غزل

شدتِ غم سے یہاں جان پہ بن آئی ہے
اور اُس نے بھی نہ آنے کی قسم کھائی ہے

یہ دعا ہے کہ خدا اس کو اماں میں رکھے
پھر اُسے میرے تڑپنے کی ادا بھائی ہے

اُس کے ہیں سارے تکلف مری نظروں کے لیے
زلف پھر اُس نے مرے واسطے سلجھائی ہے

توتے کی ضد تو سُنا دی ہے کہانی، لیکن
ہم نشیں! آنکھ تری کس لیے بھر آئی ہے

کرلیا رونقِ دنیا کو بھی اپنا شاہد

مبد الاحد ساز
کریا مینور، چوتھا منزلہ
۱۴ یوسف میر علی روڈ بمبئی ۳

غزل

ن وہ پیکِ سحر رواں، اک رنگِ دگر بن جاتے ہے
ے تو سخن، جاگے تو نفس، چونکے تو نظر بن جاتے ہے

سطحِ افق پر لرزش ہے یاں نوکِ قلم میں ہے جنبش
عکس اُدھر سے اُبھرے ہے، اک حرف اِدھر بن جاتے ہے

ر پہ بچپنا کتنا صدیوں سے مرا جیتر مجھ سے
جنگل چھوڑ نگر آیا، یہ چھوڑ نگر بن جاتے ہے

لت غور و تفکر بھی آغازِ جوانی جیسے ہیں!
میں بھنور بن جاتے ہے، دیواریں در بن جاتے ہے

شک نگاہیں نظموں کی، یہ ہونٹ غزل کے سوکھے ہوئے
ابر میں ہے وہ آپ نمو جو مصرع تر بن جاتے ہے

○

ساحل احمد
صدر شعبہ اردو
کرسچین کالج الہ آباد

وہ چلا نیزے پہ لے کر سر میاں
بڑھ رہا تھا شہر کو لشکر میاں

اب کہاں ڈھونڈوں میں اپنی روشنی
کب اُگا سورج ہتھیلی پر میاں

میں کہاں ہوں کس جگہ ہوں کیا پتا
کھو گیا ہے جب سے میرا گھر میاں

کیا پرندے پھر ہوا جر بن گئے
جا بہ جا بکھرے پڑے ہیں پر میاں

اس قدر بدلا ہوا ہے کس لیے
آج کل موسم کا یہ تیور میاں

بے گھری ساحل رہے گی کب تلک
ڈھے گیا بارش میں اب کے گھر میاں

عبدالقوی دسنوی
سیفیہ اسٹاف کوارٹرس
عقب سیفیہ سائنس کالج
بھوپال ۱

مولانا ابوالکلام کا بھوپال سے رشتہ

ماضی کے بھوپال کے شب و روز میں اگر مولانا ابوالکلام آزاد کو دیکھنے کی کوشش کی جائے تو آج سے تقریباً بیاسی سال قبل ۱۹۰۸ء میں ۲۰ سال کے نوجوان ابوالکلام آزاد پہاڑیوں اور جھیل کے اسی شہر دارالاقبال میں اپنی بہن حنیفہ بیگم آبرو کے یہاں قیام پذیر نظر آئیں گے۔ اسی زمانے میں انھیں یہاں کے لوگوں نے چلتے پھرتے، بات چیت کرتے، ہنستے، بحث و مباحثہ میں حصہ لیتے، کتابوں کی تلاش میں سرگرداں دیکھا تھا۔ اس وقت ان کا قیام اس شہر میں تقریباً ایک ماہ رہا تھا۔

بھوپال آنے کی وجہ ان کی دو بہنیں یعنی فاطمہ بیگم آرزو اور حنیفہ بیگم آبرو تھیں۔ یہ دونوں بہنیں اس زمانے میں بھوپال میں مقیم تھیں۔ نواب سلطان جہاں بیگم ان دونوں بہنوں کی صلاحیتوں کی وجہ سے ان کی بہت قدر کرتی تھیں۔

یہ دونوں بہنیں بھوپال کب آئیں اور کیوں آئیں اس پر کسی نے آج تک روشنی نہیں ڈالی ہے۔ شروع میں انھوں نے ایک دو بار کسی سبب بھوپال کا سفر کیا اور یہاں قیام کیا۔ اسی دوران میں سلطان جہاں بیگم سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور آپس میں تعلقات بڑھتے۔ چنانچہ نواب سلطان جہاں بیگم کی خواہش سے آبرو بیگم پرنس آف ویلز لیڈیز کلب کی سکریٹری بنا دی گئی تھیں اور آرزو بیگم زنانہ مدارس بھوپال کی انسپکٹر مقرر ہو گئی تھیں۔ چونکہ دونوں بہنیں نہایت ذہین تھیں اور تقریر و تحریر میں نمایاں مقام رکھتی تھیں اس لیے شہر میں بھی دونوں بہنوں کی بڑی عزت تھی۔ محمد باقر حسین فاطمہ بیگم آرزو کے نواسے لکھتے ہیں :-

"نواب سلطان جہاں ایک روشن خیال خاتون تھیں۔ انھوں نے میری بڑی نانی کو لڑکیوں کے اسکول کا نگراں مقرر کر دیا اور چھوٹی کو اپنا اتالیق اور بھوپال کے لیڈیز کلب کا سکریٹری بنا دیا۔ یہ لوگ دربار کی رکن بھی تھیں۔ انھیں ریاست سے دوسری سہولتیں مثلاً رہائشی بنگلہ اور سواری بھی

فراہم تھیں۔ ان دونوں خواتین کی تقرری کے بعد عورتوں کی تعلیم و تربیت کا کام دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا اور تمام ہندستان سے خواتین کے ادبی اداروں سے ان کے دعوت نامے آتے رہتے تھے اور یہ دونوں بیگم بھوپال کے ہمراہ ان ادبی مجالس میں شریک ہوتی تھیں۔[۱]

ابتدا میں ان کا قیام تاج محل اور نواب منزل شاہجہاں آباد میں رہا اور بعد میں احمدآباد پیلس کے ایک بنگلہ میں منتقل ہو گئی تھیں۔

ان دونوں بہنوں کے علاوہ ایک پرانا رشتہ مولانا کے والد مولانا خیرالدین کا بھوپال سے اس وقت پیدا ہوا تھا جب مولانا منورالدین نے ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی سے دو سال قبل دہلی کے حالات سے تنگ آکر مکہ جانے اور وہیں بود و باش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے نواسے مولانا خیرالدین بھی تھے۔ اس وقت نواب سکندر جہاں بیگم بھوپال کی حکمراں تھیں وہ مولانا منورالدین کی درویشانہ زندگی اور پند و نصیحت سے بہت زیادہ متاثر تھیں۔ مولانا منورالدین جب اپنے نواسے کے ساتھ بھوپال پہنچے اور کچھ دن قیام کے بعد جانے لگے تو انھوں نے مزید قیام کے لیے بھوپال میں روک لیا۔ لیکن ان کا بھوپال میں قیام اس قدر طویل ہو گیا کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی چھڑ گئی جس کی وجہ سے انھیں اس کے بعد بھی چند ماہ یہاں رہنا پڑا۔ غالباً مولانا منورالدین ۱۸۵۸ء میں مولانا خیرالدین کے ساتھ بمبئی کے لیے روانہ ہو سکے۔ مولانا آزاد نے انڈیا ونس فریڈم میں بیان کیا ہے:-

"میرے دادا کا جب انتقال ہوا تو میرے والد مولانا خیرالدین بچے ہی تھے اس لیے ان کے نانا نے اُن کی پرورش کی۔ غدر سے دو سال پہلے مولانا منورالدین نے ہندستان کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر مکہ معظمہ کو ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا، مگر سکندر جہاں بیگم نے بھوپال میں انھیں روک لیا اور وہ بھوپال ہی میں تھے جب غدر شروع ہو گیا۔ دو سال تک وہ وہاں سے نکل نہ سکے، پھر بمبئی پہنچے۔ یہاں انھیں موت نے آگھیرا اور مکہ معظمہ جانا انھیں نصیب نہ ہوا۔"[۲]

مولانا منورالدین کے قیام بھوپال کی کچھ تفصیل "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" روایت ملیح آبادی میں ملتی ہے۔ لیکن اس کتاب سے یہ نہیں پتا چلتا کہ ان کے یہاں آنے کی صحیح تاریخ یا ماہ یا سنہ کیا ہے۔ یہاں ان کے کیا کیا مشاغل تھے۔ یہاں سے ان کی واپسی کس طرح ہوئی۔ یہاں ان کی کن کن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ البتہ اس کتاب میں بعض ایسی باتیں ضرور تحریر ہیں جن کا نہ صرف حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے بلکہ وہ افسوسناک بھی ہیں۔ خاص طور سے نواب سکندر جہاں کے متعلق بے بنیاد اور لغو باتیں تحریر کی گئی ہیں۔ مولانا منورالدین کے قیام کے سلسلے میں

جس محل کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی بے حقیقت ہے۔ مولانا کی بھوپال سے واپسی، بمبئی میں قیام اور وفات سے متعلق باتیں بھی تحقیق طلب ہیں۔

مولانا سید منظور حسین صاحب سرّوش نے اپنے مضمون "غلطی ہائے مضامین" مطبوعہ نشان منزل بھوپال جنوری ۷۷ ۱۹ء میں لکھا ہے:

"آزاد کی کہانی میں "بیگم بھوپال کی توبہ" کے عنوان سے جو واقعات درج کیے گئے ہیں ان پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔"

(۱) نواب جہانگیر خاں کو نواب سکندر بیگم سے "غایت درجہ والبتنہ" بیان کیا گیا ہے اور طرزِ ادا سے مستنبط ہوتا ہے کہ نواب سکندر بیگم اور نواب جہانگیر محمد خاں کے مابین کوئی غیر اخلاقی ناگفتہ بہ تعلقات تھے حالانکہ نواب جہانگیر محمد خاں نواب سکندر بیگم کے شوہر تھے۔"

(۲) "نواب جہانگیر محمد خاں کو مولانا منوّرالدین کے قیام بھوپال کے زمانہ (۵۰-۱۸۴۹ء) میں زندہ بتا کر ان سے ایک افسانوی داستان منسوب کر دی گئی ہے۔ حالانکہ نواب جہانگیر محمد خاں کا اس سے پہلے ۱۸۴۴ء میں انتقال ہو چکا تھا۔"

(۳) کتاب میں سکندر بیگم کے کسی محل کا ذکر کیا گیا ہے جو:

"ایک تالاب کے وسط میں عیش و نشاط کے لیے بنایا گیا تھا اور اب مسجد کر دیا گیا تھا"

بھوپال میں کسی تالاب کے وسط میں، سکندر بیگم نے یا ان سے پہلے یا ان کے بعد کسی فرماں روا نے یا کسی شخص نے کبھی کوئی محل نہیں بنوایا اور جب ایسا کوئی محل بنا ہی نہیں تو اس کو مسجد کر دینے کا کیا سوال۔ نواب سکندر بیگم کا محل بھوپال کے محلّہ فتح گڑھ میں بڑے تالاب کے قریب (وسط میں نہیں) ابھی تک موجود ہے۔"

مولانا منوّرالدین کے قیام بھوپال کے دوران میں مولانا خیرالدین کا کوئی ذکر نہیں ہے جس سے ان کی بھوپال میں مصروفیت کا علم ہوتا۔ اگرچہ اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال سے کم بہرحال مولانا آزاد کا بھوپال سے ذہنی تعلق ان ہی دونوں بزرگوں کی بھوپال آمد اور قیام سے شروع ہو گیا تھا اور جس طرح اس ریاست اور اس کی بیگم نے ان کی منزلت کی اور انھیں دو تین سال یہاں قیام پر مجبور کیا۔ اس سے آزاد بھی اس ریاست رہے ہوں گے۔ بعد میں ان کی دو بڑی بہنیں بھی جن کی وہ بڑی عزت کرتے تھے، دونوں بہنیں بھی ان سے بے حد محبت کرتی تھیں، یہاں آگئی تھیں۔ ان کی اور ا اولادوں کی وجہ سے مولانا آزاد کا تعلق ہمیشہ قائم رہا۔ لیکن صرف ایک بار ان کے آنے کا صحیح علم ہو سکا ہے اور وہ بھی جب ان کی عمر بیس سال کی تھی۔ منجملہ ادارہ امرت سر سے بے تعلق ہو کر وہ ۱۹۰۸ء میں بھوپال چلے آئے تھے اور تقریباً ایک

پنی بہن آبرو بیگم کے یہاں قیام کیا تھا۔

یوسف قیصر مرحوم نے مولانا آزاد کے تین بار بھوپال آنے کا ذکر اپنے مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد اور بھوپال" مطبوعہ ماہنامہ "آج کل" دہلی ستمبر ۱۹۵۸ء میں کیا ہے۔ اُن کے لکھنے کے مطابق پہلی بار مولانا آزاد کا قیام امین زبیری کے یہاں ہوا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا ب مولانا آزاد اور ان کے بڑے بھائی کی تحریریں خدنگ نظر لکھنؤ میں شائع ہو رہی تھیں بھی یہ زمانہ ۱۹۰۳ء کا آخری حصہ یا ۱۹۰۴ء کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد بھوپال سے تشریف لائے۔ مولوی محمد امین صاحب زبیری مارہروی کے مہمان ہوئے اور تقریباً ایک ہفتہ رہے مولوی محمد امین صاحب زبیری دفتر تنظیمات میں ملازم تھے" (ص ۴۷)

ور آگے لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد سے دن میں کسی نہ کسی وقت مسلمانوں کی تعلیم پر بڑی دلچسپ بحثیں ہوا کرتی تھیں" (ص ۴۷)

محمد یوسف قیصر صاحب دوسری بار مولانا آزاد کی بھوپال آمد کا زمانہ ۱۹۰۴ء بتلاتے ہیں اور اس کی تفصیل یوں لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد کی تین بہنیں تھیں ابو النصر مولوی غلام یسین آہ (جو بعد میں مذہبی مناظرے اور تبلیغ کا کام کیا کرتے تھے) کا انتقال ہو چکا تھا اُن ہی بہنوں میں سے ایک بہن جن کا نام محمودہ بیگم اور آبرو بیگم سے مخاطب تھیں اور بہت دنوں یہاں رہیں۔ سرکار عالیہ سلطان جہاں بیگم سے بھی ملیں۔ اب ایک عرصہ کے بعد وہ اپنے گھر جانا چاہتی تھیں ان کے بلانے پر مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۰۴ء میں امرت سر سے بھوپال آئے۔ چونکہ ان کے بہن کے جانے میں کسی قدر تاخیر ہوتی گئی اس لیے مولانا آزاد تقریباً ایک ماہ تک بھوپال میں رہے۔ مجھ سے تعارف تو ہو چکا تھا اب ان کے ساتھ رہنے کی بھی عزت حاصل ہو گئی۔ مولانا کی زبان پر اردو فارسی کے سیکڑوں اشعار رہتے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے یہی مشغلہ تھا۔ امرت سر سے آتے وقت ان کے پاس فارسی شعرا کا تذکرہ آتش کدہ تھا جس میں سے بعض وقت اچھے اچھے شعر سنایا کرتے۔ رات کے بارہ ایک بجے کھلے میدانوں اور ریلوے پلیٹ فارم پر چہل قدمی رہتی اور دن کو اکثر مولوی محمد امین زبیری کے یہاں مجلسِ مباحثہ گرم رہتی۔" (ص ۴۸)

آگے یہ بھی تحریر کیا ہے:

"... مولانا آزاد کالج کی تعلیم سے غیر مطمئن تھے اور مولوی محمد امین کالج کے رنگ میں سر سے پا تک رنگے ہوئے تھے۔ اس صورت سے ان دونوں

کی باتیں بہت ہی دلچسپ ہوتی تھیں۔"
عام طور سے بھوپال میں مولانا آزاد کا وقت پرانی کتابوں کی دکانوں میں شعرا کے تذکروں کی تلاش میں گزرتا تھا۔ یہاں ان کو چار تذکرے اُن کی خواہش کے مطابق مل گئے تھے۔ انھیں میں آتش کدہ بھی تھا، مولانا آزاد انھیں دلچسپی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اچھا شعر انھیں یاد ہو جاتا تھا۔

یوسف قیصر صاحب بیان کرتے ہیں:

"... جو اچھا شعر دل میں بیٹھ گیا وہ ہر وقت زبان پر رہتا تھا۔ بڑے مزے سے سنایا کرتے تھے۔ سناتے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے کیف سے خود بھی بے خود ہو گئے ہیں۔ کبھی دل چاہا تو میرے اصرار پر اپنی غزل کے دو چار شعر سنا دیتے مگر بے کیف ہوتے تھے اور اُن سے کوئی سرور پیدا نہیں ہوتا تھا۔" (ص ۴۴)

یوسف قیصر صاحب کی تحریر سے مولانا آزاد کے تیسری بار آرزو بیگم آبرو بیگم کے شوہر مولوی معین الدین عرب اور مولوی احمد ابراہیم کی وفات کے بعد بھوپال آنے کا بھی علم ہوتا ہے۔ اس بار ان کا قیام احمد آباد پیلس میں ہوا تھا۔ ان کی مصروفیات کا ذکر کرتے یوسف قیصر صاحب نے تحریر کیا ہے:

"مولانا صاحب گھر سے چل کر درختوں کے سایہ میں صاف و شفاف پتھر کی چٹانوں پر بیٹھ جاتے۔ عقیدت مند ان کے سامنے حلقہ بنا کر بیٹھتے اور مولانا کی سحر بیانی اور زور کلام سے اس درجہ مسحور ہو جاتے کہ گھنٹوں سنتے رہتے پھر بھی یہی دل چاہتا تھا کہ اسی طرح سنا کریں اور یہ آواز کانوں میں آتی رہے۔ کبھی رشد و ہدایت کی باتیں تھیں۔ کبھی اسلام کے حقائق و معارف تھے۔ کبھی حالات حاضرہ کا جائزہ تھا۔ کبھی مسلمانوں کی غفلت و جہالت کا تذکرہ تھا۔ کبھی منتخبہ اشعار زبان پر تھے۔ کبھی طنز و مزاح تھا۔ غرض جس موضوع پر زبان کھلتی تھی ایک دریا موجزن ہو جاتا تھا۔" (ص ۴۹)

لیکن مولانا آزاد کی زندگی کے مطالعہ کے بعد اب تک میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آزاد صرف دو بار ۱۹۰۸ء میں اور اس کے بعد بھوپال تشریف لائے تھے اور پہلی بار تقریباً ماہ یہاں قیام کیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محمد یوسف قیصر صاحب مولانا آزاد سے متعلق اس سفر اور قیام بھوپال کے تاثرات تقریباً نصف صدی کی مدت گزر جانے کی وجہ سے تین سفروں کے تاثرات میں منقسم ہو گئے ہیں۔ لیکن ابھی میں یہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میرے یہ نتائج درست ہیں۔ اسے میں مستقبل کے محققین پر چھوڑتا ہوں۔ ممکن ہے مستقبل کا کوئی محقق، مولانا آزاد کی زندگی کے اس پہلو پر صحیح روشنی ڈالنے میں کامیاب ہو اور صحیح نتائج پیش کر سکے۔

اس کے بعد مولانا آزاد کا تعلق اس شہر دارالاقبال بھوپال سے ان کی بہنوں کی وجہ سے اور کچھ دوسرے احباب کی وجہ سے ضرور رہا لیکن خواہش کے باوجود، وہ پھر کبھی بھوپال نہیں آ سکے۔ اس کی وجہ بتانے کے لیے محمد باقر حسین صاحب نے اپنے مضمون "حضرت مولانا ابوالکلام آزاد۔ کچھ پرانی یادیں" میں مولانا آزاد کے خط بنام آبرو بیگم کا یہ اقتباس پیش کیا ہے جس میں مولانا آزاد نے تحریر کیا ہے:

"بہن آپ کی سرکار عالیہ سلطان جہاں بیگم، حکومت برطانیہ کی ایک چھوٹی سی ریاست کی حکمراں ہیں۔ اور میں اس حکومت کا ایک بڑا باغی ہوں اس لیے ڈرتا ہوں کہ میرے وہاں آنے سے آپ لوگ کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہو جائیں"[۴]

ظاہر ہے کہ ان حالات میں مولانا آزاد کا بھوپال آنا کس طرح ممکن ہو سکتا تھا۔ اسی وجہ سے مولانا پھر کبھی بھوپال نہ آ سکے۔ جون ۱۹۴۲ء میں جب مولانا احمد نگر قلعہ میں قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے۔ حنیفہ بیگم آبرو کا بھوپال میں انتقال ہو گیا۔ جس کا ذکر مولانا نے "انڈیا ونس فریڈم" میں اپنی رفیقہ حیات عالیہ بیگم کی وفات ۹ اپریل ۱۹۴۴ء کے متعلق لکھتے ہوئے اس طرح کیا ہے:

"تین مہینے کے بعد قسمت نے ایک اور صدمہ پہنچایا۔ میری بہن آبرو بیگم جو بھوپال میں رہتی تھیں بیمار پڑ گئیں اور تقریباً دو ہفتے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گئی ہیں"[۵]

ظاہر ہے قید و بند کی وجہ سے مولانا آزاد نہ کلکتہ جا سکے تھے نہ ہی بھوپال آ سکے تھے لیکن قلعہ احمد نگر کی قید و بند سے رہائی کے بعد بھی مولانا آزاد بھوپال نہیں آ سکے۔ نہ ہی ہندستان کے آزاد ہو جانے کے بعد کسی موقع سے وہ بھوپال تشریف لا سکے۔ حالانکہ یہاں بلانے کی انھیں بارہا کوششیں کی گئیں۔ آزادی کے بعد اُن کے بھوپال نہ آنے کی وجہ اُن کی وزارت تعلیم کی مصروفیت سمجھ میں آتی ہے۔ البتہ اُن کے تعلقات بھوپال سے فاطمہ بیگم آرزو اور حنیفہ بیگم آبرو اور اُن کی اولادوں کی وجہ سے اور دوسرے چند لوگوں کی وجہ سے ہمیشہ قائم رہے۔ اُن کے بھانجے یوسف علی صاحب سے دہلی میں اُن کی ملاقاتیں بار بار ہوتی رہیں۔ خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ میں نے خود اُن کے پاس مولانا آزاد کے تقریباً ۵۴ خط دیکھے تھے۔ انھوں نے کچھ خطوط مجھے اشاعت کے لیے بھی دیے تھے۔ اور وعدہ کیا تھا کہ وقت آنے پر سارے خطوط مجھے اشاعت کے لیے دے دیں گے۔ خطوط کے سلسلے میں ایک بار مالک رام صاحب بھی ان سے ملے تھے لیکن ان کی وفات کے بعد صورت بدل گئی اور ان قیمتی خطوط کی اشاعت کا معاملہ ختم ہو گیا۔

افراد خاندان کے علاوہ بھوپال کے لوگوں میں اگر ایک طرف وہ نواب صدیق حسن خاں سے متاثر تھے تو دوسری طرف نواب حمید اللہ خاں، مولانا طرزی مشرقی، مولانا ابوسعید بزمی

اور ڈاکٹر شنکر دیال شرما (نائب صدر جمہوریہ ہند) سے ان کے تعلقات رہے۔ ان کے علا
بعض ایسے حضرات بھی تھے جن کا بظاہر کوئی تعلق مولانا آزاد سے نہ تھا لیکن وہ مولا
آزاد کے بے حد قدرداں تھے انھیں میں اختر قدوائی صاحب تھے جنھوں نے نہ صرف
مولانا آزاد کی ہر تصنیف جمع کی تھی بلکہ ان کے متعلق تقریباً تمام قیمتی کتابیں، رسائل
کے نمبر اور تحریریں بھی حاصل کی تھیں اور الہلال، البلاغ و پیغام کی مکمل جلدیں بھی اپنے
پاس محفوظ کر لی تھیں۔ مولانا آزاد سے متعلق اُن کا مطالعہ نہایت اچھا تھا۔ مجھے مولانا
آزاد پر کام کرنے کے دوران میں ان کے ذاتی کتب خانہ سے بہت زیادہ مدد ملی۔
اور آج، اس شہر میں مولانا آزاد کی وفات کے ۳۲ سال بعد بھی ان کے شیدائی
کافی تعداد میں مل جائیں گے۔ اس طرح ۱۸۵۵ء سے تاحال مولانا ابوالکلام آزاد سے اس
شہر کا رشتہ نہ صرف قائم ہے بلکہ مضبوط ہے اور مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔

حواشی

۱ جواہرِ آزاد، مرتبہ عبدالقوی دسنوی۔ محمد نعمان، ص ۱۲۷۔ ۱۲۸۔
۲ ہماری آزادی میں سہواً سلطان جہاں بیگم درج ہو گیا ہے۔
۳ ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد۔ مترجمہ محمد مجیب۔
۴ جواہرِ آزاد مرتبہ عبدالقوی دسنوی و محمد نعمان، ص ۱۲۸۔
۵ ہماری آزادی: ابوالکلام آزاد مترجمہ محمد مجیب، ص ۱۹۰۔

طفیل ہوشیارپوری
۱۸۹- ایل بلاک
توسیع ماڈل ٹاؤن لاہور

آنس معین

چھوٹی عمر کا بڑا شاعر

آنس معین کو زمین اوڑھ کر آسودۂ خواب ہوئے تقریباً چار برس بیت چکے ہیں۔ ان چار برسوں کے دوران اس پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اگر اسے یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ ان پر بہت کچھ لکھے جانے کے باوجود ان کی شخصیت اور فن کے بہت سے پہلو مخفی رہتے ہیں۔ پہلو مخفی رہنے کی یہی وجہ نہیں ہوتی کہ ایک ہی حوالے یا مخصوص زاویوں ہی سے دیکھنے کی سعی کی گئی ہوتی ہے بلکہ درحقیقت ایسی ہستیوں کی شخصیت اور فن کے ان گنت رخ لاتعداد پہلوؤں کے ان گنت پہلو ہوتے ہیں جنہیں کسی ایک مجلس یا مقالے میں اجاگر کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آنس معین کا شمار بھی ایسی ہی تہہ در تہہ اور پہلو دار شخصیات میں ہوتا ہے۔

اکابرینِ ادب نے آنس معین کو کمسن سقراط، ننھا رومی، شکیب عصر اور کیٹس کا ہم پلہ قرار دیا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ یہ ریمارکس آنس معین کی بلند قامت شخصیت کو سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں لیکن ان کا ایک نقصان بھی ہے اور وہ یہ کہ اگر وہ کمسن سقراط، ننھا رومی، شکیب جلالی اور کیٹس ہی تھا، تو خود کیا تھا: سوچنے کی بات ہے کہ کہیں ان عظیم شخصیات کے بوجھ تلے دب کر آنس کی اپنی پہچان گم تو نہیں ہو جائے گی اور شخصیات کے حوالے سے اسے پہچانا گیا تو اس کی اپنی انفرادیت کیا برقرار رہ سکے گی۔

آنس معین کو عصر حاضر کے دو شاعروں، مصطفٰے زیدی اور شکیب جلالی سے بھی ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسا شعوری طور پر ہوا ہے یا لاشعوری طور پر اس کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن کہا بہر حال یہ بھی گیا ہے کہ آنس اپنے عہد کا مصطفٰے زیدی اور اپنے زمانے کا شکیب جلالی ہے۔ اس طرح بظاہر آنس کو بڑا کر کے پیش کرنے کی کوشش ہو رہی ہے لیکن درحقیقت اس عمل سے آنس کی انفرادیت اور اس کی بلند پایہ شاعری

کو دبانے اور اسے دھچکا لگانے کی نامشکور سعی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔

آنس اپنے عہد کا صاحب طرز شاعر ہے، اس کا لہجہ، ڈکشن، اس کی سوچیں، اس کی لفظیات، اس کی تراکیب، اس کا اسلوب، اس کی بندشیں، اس کا شعری مزاج اور اس کا رنگ و آہنگ اتنا انوکھا اور اتنا اچھوتا ہے کہ اگر غزلوں کے انبار میں بھی اس کی غزل رکھ دی جائے تو بآسانی تلاش کی جا سکتی ہے۔ یہ پہچان بہت کم شاعروں کے حصّے میں آتی ہے۔ اور بلاشبہ آنس کا شمار ایسے ہی شاعروں میں ہوتا ہے جن کی غزل ہی ان کی پہچان ہے۔

آنس معین چھوٹی عمر کا اتنا بڑا شاعر نکلا کہ اس کی قدو قامت کا جائزہ لینے کے لیے گردن اٹھا کر دیکھنا پڑے تو اپنی دستار ضرور سنبھالنی پڑتی ہے۔ وہ غزل کا ایک صاحب طرز شاعر ہے۔ اس کا منفرد لہجہ ہی اس کی پہچان ہے۔

چھوٹی عمر کے شاعروں کو "بڑے لوگ" بہت کم سراہتے ہیں۔ تعریف کرتے بھی ہیں تو بہت سے تحفظات کے ساتھ لیکن آنس معین کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ ادب کے بڑے بڑے ستونوں نے بھی اس کی شاعرانہ عظمت کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ جوش ملیح آبادی۔ اسے کمسن سقراط کا نام دیا ہے تو فیض احمد فیض اسے اپنے عہد سے آگے کا "بزرگ دانشور" قرار دینے پر مصر ہیں۔ جابر علی سید نے اسے نتھا رومی کہا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا خیال ہے کہ آنس معین کیٹس کا ہم پلہ شاعر ہے۔ اسلم انصاری اسے شعلۂ تخلیق سمجھتے ہیں اور بہت سے ناقدین کا خیال ہے کہ آنس اپنے عہد کا مصطفٰے زیدی اور اپنے زمانے کا شکیب جلالی ہے حالانکہ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ تمام مماثلتیں محض اس لیے تلاش کی گئی ہیں کہ ابھی ہم پر آنس کی انفرادیت کے اسرار نہیں کھلے۔ ابھی ہم اسے سمجھ نہیں پائے۔ ہم اس کی تفہیم کے دور سے گزر رہے ہیں۔ اس لیے کبھی ہم اسے کمسن سقراط، نتھا رومی، کبھی شکیب عصر اور کبھی کیٹس کا ہم پلہ شاعر قرار دے دیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آنس وہ کچھ نہیں تھا جو کچھ اسے اب تک سمجھا گیا ہے۔ اس موقع پر مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا ہے کہ جیسے دبے لفظوں میں آنس ہم سے یہ کہہ رہا ہو کہ

حیرت سے جو یوں میری طرف دیکھ رہے ہو
لگتا ہے کبھی تم نے سمندر نہیں دیکھا

ادب کے نقار خانے میں آنس کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کا شعری لہجہ محض مختلف اور منفرد ہی نہیں چونکا دینے والا بھی ہے۔ اس نے اپنی شاعری، اپنی تراکیب، اپنی لفظیات، اپنی سوچوں، اپنے خیالات، اپنے زاویۂ نظر، اپنے ڈکشن اور اپنی بندشوں سے ادبی دنیا کے ساتھ ساتھ آج کے قاری اور سامع کو بھی چونکا دیا ہے۔ اس کی غزل کے ہر ہر شعر میں معانی کے جہان اور مفاہیم کی دنیا آباد ہے۔ اسی لیے میں کہنے اور سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ آنس اپنے عہد کا مصطفٰے زیدی یا شکیب جلالی نہیں بلکہ درحقیقت

شکیب جلالی اور مصطفےٰ زیدی اپنے اپنے عہد کے انسؔ معین تھے۔ اسی طرح میں انسؔ کو کیٹس کا ہم پلّہ نہیں بلکہ کیٹس کو انسؔ معین کا ہم پلّہ شاعر مانتا ہوں۔

انسؔ معین پر تحقیقی، تصنیفی اور تنقیدی کام جتنے بھرپور انداز میں ہو رہا ہے۔ اس سے اس تاثر کی تغلیط ہو جاتی ہے کہ جو شاعر ہمیں خیرباد کہہ چکے ہیں انھیں ان کی آنکھ بند ہوتے ہی فراموش کر دیا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انسؔ معین پر ہر روز کسی نہ کسی اخبار یا رسالے میں مضامین نہ چھپتے۔ شاید کارنامے انسان کو مرنے کے بعد بھی زندہ رکھتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ انسؔ معین کی توانا اور زندہ شاعری اسے ادب میں رہتی دنیا تک زندہ رکھے گی۔

فردیات انسؔ معین

نہ تھی زمیں میں وسعت مری نظر جیسی — بدن تھکا بھی نہیں اور سفر تمام ہوا

کیا عدالت کو یہ باور میں کرا پاؤں گا — ہاتھ تھا اور کسی کا مرے دستانے میں

ممکن ہے کہ صدیوں بھی نظر آئے نہ سورج — اس بار اندھیرا مرے اندر سے اٹھا ہے

ذرا تو کم ہوئیں تنہائیں پرندے کی — اب ایک خوف بھی اس آشیاں میں رہتا ہے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

کتاب	موضوع	مصنف	قیمت
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/-
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/-
پت جھڑ کی آواز	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	[illegible]۵/-
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	۱۵۰/-
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲[illegible]/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/-
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/-
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/-
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/-
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۴۵/-
قلندر بخش جرأت	(خطبہ)	جمیل جالبی	۱۰/-
عجائب گھر	بچوں کی سائنسی کتاب	قاسم صدیقی	[illegible]۰/-
تاریخ اودھ	(تاریخ)	ترجمہ و ترتیب شاہ عبدالسلام	۲[illegible]/-
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	(ادب)	ظ انصاری	۳۳/-
تنقید اور جدید اردو تنقید	(تنقید)	ڈاکٹر وزیر آغا	۶۰/-
مشقی تدریس، کیوں اور کیسے؟	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۴۵/-
آوازوں کا میوزیم	(افسانے)	ساگر سرحدی	۳۵/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو	(خاکے)	کشمیری لال ذاکر	۳۶/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	(خاکے)	اشرف صبوحی	۵۱/-
چند تصویر بتاں	(تاثرات)	مولانا عبدالسلام قدوائی	۴۵/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	(ادب)	پروفیسر آل احمد سرور	۸/-
صاحب جی سلطان جی	(تذکرہ)	ڈاکٹر اسلم فرخی	۲۰/-
نظام رنگ	(ادبی خاکہ حضرت نظام الدین اولیا)	" " "	۱۵/-
شہید جستجو	(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)	ضیاء الحسن فاروقی	۷۵/-
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست	(مذہب)	مشیر الحق	۸/-
ہمارے دینی علوم	(مذہب)	مولانا اسلم جیراجپوری	۱۸/-
تحقیقی مضامین	(تحقیقی)	مالک رام	۶۰/-
آسان اردو، ورک بک	(تعلیم)	شکیل اختر فاروقی	۲۴/-

یوسف سرمست
شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی
حیدرآباد

مشفق خواجہ سے ایک ملاقات

خامہ بگوش سے میں اپنے ایک دوست کے توسط سے متعارف ہوا۔ انھوں نے مجھ سے کہا معلوم نہیں کون ہے خامہ بگوش کے نام سے لکھتا ہے۔ بڑے پتے کی باتیں بڑے ہی مزے سے لکھتا ہے۔ یوں مجھے خامہ بگوش کو پڑھنے کا اشتیاق ہوا۔ "کتاب نما" میں جب "مانگے کا اجالا" کے عنوان سے اس کی تحریر پڑھی تو پھر یوں ہوا کہ "کتاب نما" ملتے ہی سب سے پہلے خامہ بگوش کو پڑھتا تھا اور بعد میں سب کچھ "کتاب نما" نے پچھلے چند سالوں میں ایک وقیع اور اہم ادبی رسالے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسی وجہ سے ادبی حلقوں میں بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ "کتاب نما" کی مقبولیت میں "خامہ بگوش" کا بھی حصہ ہے۔ اس کی تحریر کو پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ کالم نگار بڑا وسیع مطالعہ رکھتا ہے اور مزاح کے کُلک میں علم کی تمکنت کو چھپاتا ہے۔ بعد میں پتا چلا خامہ بگوش کوئی اور نہیں مشہور و معروف ادیب، محقق، نقاد صحافی اور شاعر مشفق خواجہ ہیں۔ ان کے ضخیم وقیع رسالے "تخلیقی ادب" کے بعض شمارے میری نظر سے گزرے تھے۔ جب "یگانہ اور حیدرآباد" کے عنوان سے مقالہ لکھ رہا تھا۔ "تخلیقی ادب" میں جو گوشے چھپے تھے ان سے مقالے کی تیاری میں بڑی مدد ملی۔ یہی مضمون میں نے اشاعت کے لیے مشفق خواجہ کو بھیج دیا۔ میرے خط اور مقالے کے جواب میں مجھے ایک بڑا سا رجسٹرڈ بنڈل وصول ہوا۔ اس میں "تخلیقی ادب" کے دو شمارے، "غالب نامہ" اور رفیع فصیح الدین احمد کا ضخیم ناول "صدیوں کی زنجیر" ملفوف تھے۔ اچانک اس قیمتی تحفہ کو پاکر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہوگی۔ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میرے لیے تو یہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھا۔ اور یوں مجتبیٰ حسین کی بات کی سچائی ثابت ہوئی کہ وہ "خواجہ ادب نواز" ہیں اس کے بعد میں ان کی ادب نوازی سے کئی طرح سے مستفیض ہوتا رہا۔ مجھے مشفق خواجہ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا اچانک ان سے ملاقات ہوگئی۔ ان کے شکیل ہونے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے وہ دیکھنے میں "محقق کی صورت" نہیں رکھتے۔ تندرست اور اپنی عمر سے کم، جوان آدمی نظر آتے ہیں چہرے مہرے میں ہی نہیں لباس اور وضع قطع میں بھی وہ شاعروں اور ادیبوں کی سی بد اطواری نہیں رکھتے۔ خواجہ صاحب چونکہ کشمیری النسل ہیں شاید اسی وجہ سے چہرے پر شادابی اور شگفتی رہتی ہے۔

ان سے ملاقات پر معلوم ہوا کہ وہ جس بے تکان انداز میں لکھتے ہیں اس رفتار سے بولتے

نہیں ہیں۔ گو باتیں کم کرتے ہیں لیکن وہ ہوتی ہیں بڑی نپی تلی۔ یہ نپا تلا پن تحقیق ہی، تنقید میں مزاح اور کالم نگاری میں ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ جس طرح تحریر میں بڑے دلچسپ اور چبھتے ہوئے جملے لکھتے ہیں اسی طرح گفتگو میں یہ انداز نہ صرف قائم رہتا ہے بلکہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ باتیں کم کرتے ہیں اور سگریٹ زیادہ پیتے ہیں۔ گفتگو کے دوران پتا چلا تحقیق کا شوق ورثے میں ملا ہے۔ والد مرحوم عبدالوحید صاحب نے بھی علمی اور ادبی خدمت میں زندگی بسر کی تھی۔ تحقیق کی بے رنگی میں شاعری کی رنگینی یوں شامل ہوئی کہ مزاج لڑکپن ہی سے شاعرانہ تھا۔ جوانی کی راتوں اور امنگوں کے دلوں میں شاعری شروع کی۔ تحقیق کی پختہ کاری بابائے اردو مولوی عبدالحق کی صحبت میں جلا پائی۔ انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں جو شخص سترہ سال تک بلا ناغہ روزانہ جاتا رہا اس کے مطالعے کے ذوق وشوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آنے جانے میں بھی وقت کے زیاں کا احساس ہوا تو گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ہمہ وقت لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو گئے بابائے اردو کی بے مثال علمی لگن نے مشفق خواجہ کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ تقریباً نوّے سال کی عمر میں بابائے اردو پابندی سے صبح کتب خانے تشریف لاتے تھے اور ایک بجے تک مسلسل کام کرتے تھے۔ اس عمر میں وہ ایک ایسی کتاب پر کام کر رہے تھے جس کو اپنی زندگی میں مکمل کرنا قطعی ناممکن تھا۔ ان کی شخصیت کے اسی پہلو نے خواجہ صاحب کو اتنا متاثر کیا کہ وہ بھی ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ علمی اور تحقیقی کاموں میں استغراق کا یہ عالم ہے کہ ایک طرح سے تارک الدنیا ہو گئے ہیں۔ ادیب ہیں، محقق اور نقاد لیکن جلسے جلوسوں سے کافی دور رہتے ہیں ہر جگہ بلائے جاتے ہیں کہیں نہیں جاتے۔ جب ہندستان آتے تو ان کی صدارت اور خیر مقدم میں جلسے رکھے گئے۔ لیکن کیا مجال جو انھوں نے ان کی طرف پلٹ کے بھی دیکھا ہو حالانکہ بڑا اہتمام کیا گیا تھا اور ان کے نام پر لوگ چلے آئے تھے۔ شاعر ہیں اور بہت اچھے، لیکن مشاعروں میں تو کیا مشاعرہ میں تک نہیں گئے۔ وہ علم وادب کی اسی راہ پر گامزن ہیں جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ اپنی زندگی کی روداد بڑی خوبصورتی اور اختصار کے ساتھ انھوں نے اپنی اس غزل میں پیش کر دی ہے:

کیوں خلوتِ غم میں رہتے ہو کیوں گوشہ نشیں بے کار ہوئے
آخر تمھیں صدمہ کیا پہنچا، کیا سوچ کے خود آزار ہوئے

کیوں راستہ چھوڑ کے چلتے ہو، کیوں لوگوں سے کتراتے ہو
کیوں چلتے پھرتے اپنے لیے تم آپ ہی اک دیوار ہوئے

کیا اٹھتے بیٹھتے سوچتے ہو، کیا لکھتے پڑھتے رہتے ہو
اس عمر میں یہ بے کیفی کیوں کس واسطے نیک اطوار ہوئے

کیوں ایسے سفر پر نکلے ہو، منزل نہیں جس کی کوئی بھی
کیوں ایسی راہ پہ چلتے ہو، سایے بھی جہاں دیوار ہوئے

کیوں ترکِ علائق کو تم نے سمجھا ہے علاجِ غم آخر
دیکھو تو ولی صوفی بھی یہاں کس ٹھاٹ سے دنیا دار ہوئے

اس کوچے کی راہ تو سمجھا ؤ جس کو پہچا ننا مشکل ہے
اس شخص کا نام تو بتلاؤ تم جس کے لیے بیمار ہو نے

انھوں نے اب تک جتنا کچھ لکھا ہے اس کا شمار مشکل ہے۔ جیسا کہ انھوں نے بتایا کہ ریڈیو کے لیے انھوں نے بے حساب اسکرپٹس لکھے ہیں۔ "مسلمان سیاح" کے عنوان سے ہفتہ وار پروگرام لکھا کرتے تھے جو ساڑھے پانچ سال تک نشر ہوتا رہا۔ دیکھتا چلا گیا' یہ بھی بے حد مقبول ریڈیو پروگرام تھا جو دو سال تک مسلسل نشر ہوتا رہا۔ "سنا آپ نے" یہ پروگرام بھی روزانہ ایک مدت تک نشر ہوتا رہا۔ کوئی یقین کر سکے گا ریڈیو کے لیے بے حد و شمار لکھنے کے باوجود وہ کبھی ریڈیو اسٹیشن نہیں گئے بلکہ گھر ہی میں بیٹھ کر اسکرپٹس لکھ کے بھیج دیا کرتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے سیکڑوں کالم لکھے ہیں۔ لیکن وہ بھی ان ساری تحریروں کو اہمیت نہیں دیتے اور غالب کی طرح شاید اسے "بے رنگ" قرار دیتے ہیں۔ اور اپنے تحقیقی کام کو نقش ہائے رنگ رنگ مانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے وہ اپنے تحقیقی کام میں جس دقت نظر سے کام لیتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے:

ان کا سب سے بڑا اور اہم تحقیقی کام "جائزہ مخطوطات اردو" ہے کہنے کو تو یہ پاکستان بھر کے مخطوطا قلمی نسخوں کی وضاحتی فہرست ہے۔ یہ کام دس جلدوں میں پورا ہوگا۔ اس کی پہلی ہی جلد بارہ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے اور مرکزی اردو بورڈ لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ باقی دس جلدیں مقتدرہ قومی زبان سے شائع ہوں گی۔ دوسری جلد بھی مکمل ہو چکی ہے۔ یہ بھی بارہ سو صفحات کی ہے اور زیر طبع ہے۔ بہر حال یہ اپنی طرز کا منفرد تحقیقی کام ہے۔ اس کے بارے میں خود مشفق خواجہ نے بتایا:

"اس کتاب کی افادیت کا اسی سے اندازہ لگائیں کہ فرض کیجیے آپ ناسخ پر کام کرنا چاہتے ہیں تو میری یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ دنیا بھر میں ناسخ کے دیوان کے کتنے قلمی نسخے ہیں اور ان کی کیا کیا خصوصیات ہیں۔ کس دیوان کے کتنے اڈیشن چھپے ہیں غرض یہ کہ ناسخ کے بارے میں قدیم تذکروں سے لے کر آج تک جتنے مضامین لکھے گئے ہیں۔ ان سب کی تفصیل آپ کو اس کتاب میں مل جائے گی۔ اس طرح میری یہ کتاب محققوں کے لیے تحقیق کی راہ میں بہت سی آسانیاں اور سہولتیں پیدا کرے گی۔"

مشفق خواجہ کے تمام تحقیقی کارناموں میں ان کی غیر معمولی محنت اور کدو کاوش مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا تحقیقی کارنامہ چمک اٹھتا ہے۔ خواہ وہ "جائزہ مخطوطات اردو" ہو یا "غالب اور صفیر بلگرامی" "اقبال (مولوی احمد دین)" ہو یا سعادت خاں ناصر کی "خوش معرکہ زیبا" یا "تذکرہ شعرا اردو" یا پھر وہ تحقیقی مقالات جو "تحقیق نامہ" کے عنوان سے چھپ رہے ہیں اور شاید اب تک چھپ چکے ہیں۔ یا اور کوئی ان کی تحقیقی کتاب۔ میں نے ان کے تحقیقی کاموں میں جو گیرائی و گہرائی دیکھی تو مجھے اشتیاق ہوا کہ ان کا تحقیقی طریقہ کار بھی معلوم کروں۔ اس تعلق سے انھوں نے کہا:

"میں نے تحقیق کے لیے ایک بنیادی کام یہ کیا کہ آٹھ دس برس تک ببلیو گرافی بنائی۔ مثلاً میرے پاس اردو کے تقریباً تمام تحقیقی رسائل کا اشاریہ موجود ہے۔ اس کے

مضامین کی میں نے موضوع وار فہرست بنائی ہے۔ اس کے بعد میں نے تذکروں کا
انڈکس تیار کیا ہے۔ میرا طریقہ کار یہ ہے کہ جب کسی موضوع پر کام کا ارادہ کر لیتا ہوں
تو پھر ایک عرصے تک اس پر مواد جمع کرتا جاتا ہوں۔ جب کافی مواد جمع ہو جاتا ہے تو میں
لکھنے کا کام شروع کر دیتا ہوں۔"

دوران گفتگو یہ بات بھی انھوں نے کہی کہ "کسی کاری گر کے پاس جس طرح اوزار ہونے ضروری
ہیں۔ اسی طرح ایک محقق کے پاس بنیادی ضرورت کی کتابیں تو ہونی ہی چاہئیں تاکہ اسے کتابوں کی تلاش
میں وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔" خواجہ صاحب کی بنیادی ضرورت، کتنی وسیع اور عریض ہے اس کا اندازہ
ان کے تحقیقی کام کی نوعیت سے ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے خیال ہوا کہ ان کے پاس کتابوں کا غیر معمولی ذخیرہ ہوگا
ان کے کتب خانے کو دیکھنے کے بہانے میں ان کے ساتھ ہو گیا۔ دیکھا کئی کمروں کا مکان ہے۔ کمروں کو
گننا پڑا پورے گیارہ نکلے۔ لیکن ان کا اپنا کمرا ایک ہے اور بلا مبالغہ ایک اور وہ بھی برائے نام۔ کیونکہ
دس کے دس کمرے کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس سترہ ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں۔
صرف کتابیں ہی نہیں ان کے یہاں گذشتہ پچیس سال کے اخبار کے تراشے اس سلیقے سے رکھے
ہوئے ہیں کہ ان میں اردو شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں اس دنیا میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ
محفوظ ہو گیا ہے۔ ان ہزاروں اخباروں کے تراشوں کا ایسا انڈکس انھوں نے بنا رکھا ہے کہ ایک منٹ میں
کسی بھی ادیب یا شاعر کے بارے میں مواد مل جاتا ہے۔ ان کا یہ علمی ذخیرہ ساری دنیا سے انھیں بے تعلق
کر سکنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن حیرت ناک بات یہ ہے کہ وہ سارے اردو ادیبوں اور شاعروں
سے خواہ وہ دنیا کے کسی کونے میں ہوں ایسا گہرا تعلق بلکہ تعلق خاطر رکھتے ہیں جو بے مثال ہے اور
پھر وہ اپنے بیش بہا تحفوں سے یوں اسے زیر بار کرتے ہیں کہ وہ شاخ ثمردار کی طرح ان کی طرف جھکے
بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور کوئی بھی اس "خانہ بر انداز چمن" سے یہ گلہ نہیں کر سکتا کہ "کچھ تو ادھر بھی"!

مشفق خواجہ کے گھر گیا تو ان کی بیگم صاحبہ سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ وہ بھی صاحب قلم ہیں۔ ان کی
ایک کتاب "افکار عبدالحق" کو تو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہندستان میں اسی کے کئی جعلی اڈیشن چھپ
چکے ہیں۔ آمنہ مشفق لکھنؤ سے تعلق رکھتی ہیں۔ سرسید گرلز کالج کراچی میں اردو کی لکچرار ہیں۔ مشفق خواجہ
اور آمنہ مشفق سے ملنے کے بعد کوئی بھی انسان سچے دل سے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "آپ سے مل کے
بڑی خوشی ہوئی۔" دونوں ہی پر خلوص اور شگفتہ مزاج ہیں۔ ذہانت ایک ایک بات سے ٹپکتی ہے۔
شستہ اور شائستہ لب و لہجہ ہے اور خندہ پیشانی سے ملنا ہر ایک کو متاثر کرتا ہے۔ آمنہ صاحبہ
کی گفتگو ہی سے نہیں خود مشفق خواجہ کے غیر معمولی علمی شغف اور انہماک سے منشرح ہے کہ اس کو قائم
و باقی رکھنے میں آمنہ صاحبہ کے ایثار کا بھی بڑا حصہ ہے۔

مشفق خواجہ کے مکان میں "تخلیقی ادب" کے دوسرے شماروں کی بھی زیارت ہوئی ان کے اس
رسالے کے ہر نمبر کی بڑی اہمیت ہے خواجہ صاحب اور کچھ نہ کرتے صرف "تخلیقی ادب" ہی نکالتے
تب بھی ان کا نام اور کام اردو ادب میں یاد رکھا جاتا۔

مشفق خواجہ کے علمی اور تخلیقی کارناموں کی شہرت نے جہاں ان کو کئی نقصانات پہنچائے وہیں

ب اور بڑا نقصان یہ ہوا کہ ان کی شاعری پس منظر میں چلی گئی۔ حالانکہ وہ شاعر پہلے ہیں اور بعد میں
سب کچھ۔ ان کے چند اشعار سننے سے اندازہ ہوا کہ وہ کس پایے کے غزل گو ہیں۔ آپ بھی چند شعر سنیے:

گزرتے وقت کی ہر چاپ سے میں ڈرتا ہوں
نہ جانے کون سا لمحہ اداس کر جائے

یہ کوئی دل تو نہیں ہے کہ ٹھہر جائے گا
وقت اک خواب رواں ہے سو گزر جائے گا
شدت غم سے ملا زیست کو مفہوم نیا
ہم سمجھتے تھے کہ دل جینے سے بھر جائے گا

وفا کے باب میں اس سے تو کچھ کمی نہ ہوئی
میں آپ اپنی خوشی سے یہ بازی ہار گیا

ہر راستے کی ہے ایک منزل
اور گھر بھی ایک راستہ ہے

فقیر گوشہ نشیں اپنی ذات میں گم ہے
اب ایک اور ہی عالم نظر میں رہتا ہے

ان دیدہ دل کی راہوں پر تم کس کی تلاش میں پھرتے ہو
جو کھونا تھا سو کھو بیٹھے اب کیا ڈھونڈو گے کیا پاؤ گے

دل کی شادابی کا ساماں تو بہت سوں سے ملا
دل کی بے تابی کا باعث ہے مگر ایک ہی شخص
ہر حسین شے کو بڑے غور سے دیکھا میں نے
سامنے آیا بعنوان دگر ایک ہی شخص

جو پا سکا نہ تجھے میں تو کھو دیا خود کو
یہ مرا عجز بھی ہے یہ مرا کمال بھی ہے

یہ وہم تھا کہ مجھے وہ بھلا چکا ہوگا مگر ملا تو وہ میری ہی طرح مضطر ہیں

نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پہ کیا کیا
مڑ کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا

یہ تو چند اشعار ہیں ان کا مجموعہ کلام "ابیات" خود انتخاب ہے۔ ان کی شاعری کا مطالعہ مقصود ہو تو "ابیات" دیکھیے۔

آخر میں ایک سچی اور حقیقی بات کہ دینا بے حد ضروری ہے۔ مشفق خواجہ سے تفصیلی ملاقات کو میں نے اجمالی طور پر پیش کیا ہے۔ آپ بھی میری طرح ان سے ملنا چاہتے ہیں تو آپ کو نہ سفر کرنے کی صعوبت گوارا کرنی پڑے گی اور نہ ہی "حقیقت" میں ان سے ملنا ناگزیر ہے۔ میں بھی ابھی تک ان سے نہیں ملا ہوں نہ ہی آج میں نے تصویر کے سوا ان کی صورت دیکھی ہے۔ لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ محض افسانہ طرازی ہے یا تخیل کی پرواز۔ یہ تمام باتیں جو لکھی گئی ہیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ آپ بھی میری طرح اگر تفصیلی طور پر مشفق خواجہ سے ملنا چاہتے ہوں تو کتاب نما کی پیش کش خلیق انجم کی مرتبہ کتاب "مشفق خواجہ۔ ایک مطالعہ" پڑھنی ہوگی۔ میری ملاقات اسی ذریعے سے ہوئی ہے پ کی بھی ہو جائے گی۔

ڈاکٹر خوشحال زیدی
غفار منزل ایکسٹنشن جامعہ نگر
نئی دہلی ۲۵

بچوں کا سائنسی ادب

ایک سرسری جائزہ

آج کا دور سائنس کا دور ہے، حقیقت پسندی کا دور ہے۔ جنوں، بھوتوں، پریوں اور بادشاہوں کا عہد ختم ہوچکا۔ مافوق الفطرت اور بے مقصد داستانیں آج کے غیر معمولی ذہین بچوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں۔ ان تمام باتوں کو جانتے کے باوجود بچوں کو پڑھنے کے لیے جو مواد فراہم کیا جارہا ہے اس کا بیشتر حصہ مقصدیت سے عاری نظر آتا ہے اور تخیلی مافوق الفطرت کرداروں نیز واقعات کو خواہ مخواہ بچوں کے ذہن پر مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ سائنس انسانی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے اور کسی نہ کسی شکل میں ہر انسان کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔ سائنس نے انسان کے فلسفۂ حیات اور نظریات کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ آج کے بچے کل بڑے ہوں گے۔ اگر ابتدا سے ہی بچوں کو سائنسی ادب سے روشناس کرایا جائے تو مستقبل میں وہ سائنس کے میدان میں تیزی سے ترقی کرسکیں گے۔ موجودہ نظام تعلیم میں سائنس ابتدائی مدارج میں داخل ہے جس کے باعث ذہین بچوں کو شروع ہی سے سائنس سے دلچسپی ہوجاتی ہے۔ اگر بچوں کو ابتدا سے ہی غیر درسی سائنسی ادب بھی فراہم کیا جائے تو ان کے لیے بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔ بچے درسی کتب کے علاوہ بھی سائنس سے متعلق بہت سی کتابیں پڑھنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ اکثر باتوں کے بارے میں والدین بھی نہیں جانتے۔ زمین گول ہے؟ کیوں گول ہے؟ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یا سورج زمین کے گرد چکر لگاتا ہے؟ سمندر کے اندر کی دنیا کیسی ہے؟ کیا جل پری کا وجود ہے؟ سپرمین کیسے اڑتا ہے؟ اسٹار ٹریک کیا ہے؟ روبوٹ کیسے کام کرتا ہے؟ ہوائی جہاز، ٹیلی فون، سائکل، ٹیلی ویژن، ریڈیو کیسے کام کرتے ہیں؟ ان کا موجد کون تھا؟ سب سے پہلے خلا میں کون گیا؟ انٹارکٹکا کہاں ہے؟ یہ تمام باتیں بچوں میں سائنس سے دلچسپی اور سائنسی ادب کو بڑھاوا دیتی ہیں۔ دور جدید میں ٹیلی ویژن نے سائنسی

موضوعات پر فلمیں دکھا کر بچوں کی دلچسپی کو خاصا بڑھا دیا ہے۔ فلموں کے علاوہ روزمرہ زندگی میں کام آنے والی چیزوں کو بنانا اپنی موٹر سائکل، کیمرہ، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور کھلونے خود درست کرنا۔ یہ سب بچوں کے مشاغل ہو گئے ہیں۔ بچوں کی دلچسپی سائنسی معلوماتی کتب کے ساتھ سائنس فکشن میں زیادہ ہو رہی ہے۔ ایسی کتابوں اور طویل مضامین کا وافر ذخیرہ مختلف زبانوں میں بچوں کے لیے موجود ہے۔ بھلا اردو ادب اطفال کیونکر پیچھے رہ سکتا ہے۔ بچوں کے لیے معلوماتی اور سائنسی کتب کا لکھنا آسان کام نہیں۔ یہ بہت ذمہ داری کا کام ہے۔ یہ کام تو اسی وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب ہندستانی بچوں کی عمر کے مختلف مدارج اور ان کی ذہنی استعداد کی مناسبت سے ان کے لیے لکھنے کی کوشش کی جائے، خصوصاً ہمارے ملک کی وسعت اور اس کے الگ الگ علاقوں میں پائی جانے والی آب و ہوا، ماحول، تہذیب و تمدن، اقتصادیات اور مذاہب کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔

اردو میں سائنسی ادب اس مقدار میں نہیں ہے جتنا کہ دوسرے موضوعات پر موجود ہے۔ آزادی ہند کے بعد پنڈت نہرو اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی خصوصی توجہ نونہالوں کی بہتر نگہداشت اور پرورش کے لیے صحت مند ادب پیش کرنے پر تھی۔ سائنسی ترقیات کے پیش نظر سائنسی ادب پر بھی زور دیا گیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بچوں کا میلا، بچوں کی کتابوں کا میلا، بچوں کے لیے اچھی معیاری کتابیں تیار کرنے والے ادارے مثلاً نیشنل بک ٹرسٹ، چلڈرن بک ٹرسٹ اور نہرو بال پستکالیہ وغیرہ قائم کیے گئے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں ترقی اردو بورڈ (نئی دہلی) اور این سی آر ٹی نے بھی بچوں کے لیے سائنسی موضوعات پر بہت سی کتابیں شائع کیں۔ بچوں کے لیے سائنسی ادب پیش کرنے میں بچوں کے رسائل پیام تعلیم (نئی دہلی) کھلونا (نئی دہلی) اور بچوں کا ماہنامہ امنگ نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان رسائل میں بچوں کے لیے سائنسی معلوماتی مضامین، کہانیاں اور قسط وار ناول شائع ہوئے۔ جو بچوں میں بے حد مقبول ہوئے۔ ان رسائل نے بچوں کی تفریح کے ساتھ سائنسی موضوعات پر وافر مواد فراہم کیا ہے جس کو بچوں کے ذہن نے بآسانی قبول کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کا بہترین سائنسی ادب ان رسائل کے توسل سے ان تک پہنچا ہے۔

بچوں کے لیے سائنسی ادب پیش کرنے والوں میں کرشن چندر کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے بچوں کے لیے کہانی اور سائنس فکشن تخلیق کیا۔ انھوں نے سائنسی ادب میں بھی شعریت آمیز نثر کا استعمال کیا ہے۔ جس سے ان کی تخلیقات کی مقبولیت بڑھی ہے۔ ان کی ایسی کہانیاں ماہنامہ کھلونا کے مختلف شماروں میں بکھری ہوئی ہیں۔ "الٹا درخت" اور "ستاروں کی سیر" اردو کے بہترین سائنسی ناول ہیں جو اگرچہ اب سے تیس سال قبل لکھے گئے اور ماہنامہ کھلونا میں قسط وار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں لیکن ان ناولوں کے مختلف اڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔ "ستاروں کی سیر" کا پہلا اڈیشن ۱۹۶۵ء میں کتابی شکل میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے شائع کیا۔ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے نتیجے میں دوسرا اڈیشن

۱۹۷۷ء میں کھلونا بک ڈپو نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس ناول کی افادیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے ہندستان کی دیگر زبانوں میں اس کے ترجمے شائع کیے ہیں۔

کرشن چندر نے ناول "ستاروں کی سیر" میں بچوں کو نئے نئے جہانوں کی گھر بیٹھے سیر کرائی ہے۔ ناول میں تحیر و استعجاب سے تخیلات اور حادثات کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ اور تفریح کے پردے میں بچوں کو جدید سائنسی معلومات، ایجادات اور کائنات کے اسرار سے روشناس کرایا ہے۔ اس ناول میں ایک عجیب و غریب روبوٹ سائنسدان کے احکامات کا پابند ہے اور اس سائنسداں کے سارے کام انجام دیتا ہے۔ اس میں امن پسند دنیا اور تخریب کار سائنسدانوں کی دنیا مریخ اور خلائی جنگوں کا دلچسپ نقشا پیش کیا گیا ہے۔

اردو کی عظیم ناول نگار قرۃ العین حیدر نے بچوں کے ادب کی طرف ایک مخصوص رادیے سے توجہ کی اور غیر ملکی زبانوں کی کہانیوں نیز سائنسی، معلوماتی دلچسپ مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اس ضمن میں ان کا ناول "جن حسن عبدالرحمٰن" سرفہرست ہے جو ایل لاگن کے انگریزی ناول کا پر لطف ترجمہ ہے۔ الہ دین کے چراغ کی کہانی پرانی ہو چکی ہے اور ہمارے ترقی یافتہ عہد کا بچہ اسے شک و شبہہ کی نظر سے دیکھنے لگا ہے۔ "جن حسن عبدالرحمٰن" ایک ایسے بچے کی کہانی ہے جو سکنڈری اسکول کا طالب علم ہے وہ صراحی کی قید سے جن کو آزاد کراتا ہے۔ اس ناول کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سائنسی کرشمات کو دیکھ کر جن خود حیران رہ جاتا ہے۔

بچوں کے لیے بہترین سائنس فکشن پیش کرنے والوں میں پرکاش پنڈت کا نام خصوصیت کا حامل ہے۔ موصوف کی بہت سی کہانیاں اور ناول حیرت انگیز واقعات اور سائنسی کرشموں پر مشتمل ہیں۔ سائنسی موضوعات پر "چاند کی چوری" ان کا طبع زاد ناول اور سرکس کے کھیل طویل کہانی ہے۔ "چاند کی چوری" میں بے مہار سائنسی ترقیات کے منفی اثرات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور نائٹ روجن بم سے دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کو ختم کرنے کی سازش، سائنسدانوں کے چاند کو چرا لانے کے منصوبے اور اسی نوع کے دیگر واقعات بہت دلکش، پر لطف اور پر اثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ یہ تمام کتابیں کھلونا بک ڈپو نئی دہلی نے شائع کی ہیں۔

سائنسی ناولوں میں ظفر پیامی کا ناول "ستاروں کے قیدی" نقش ثانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ کرشن چندر نے اپنے ناول "ستاروں کی سیر" میں تخیلات کی طلسمی دنیا تخلیق کی اور سیاروں میں بھی جادوگروں اور مافوق الفطرت پرندوں سے دنیاوی کرداروں کی مڈبھیڑ دکھائی ہے۔ اس کے برعکس ظفر پیامی کا ناول "ستاروں کے قیدی" حقیقت سے نسبتاً قریب تر ہے اور اس میں جدید ترین سائنسی انکشافات سے مطابقت اور موافقت برقرار رکھنے کی شعوری کوشش کارفرما نظر آتی ہے۔

دورِ جدید میں سائنس، سراغ رسانی اور مہمات پر مشتمل ناول بچوں میں بہت مقبول ہوئے ہیں۔ لیکن جن ناولوں میں ان موضوعات کے ساتھ تخیلات کی کارفرمائی اور مافوق الفطرت واقعات اور کرداروں کی آمیزش بھی ہو انھیں سے بچوں میں اور زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ سراج انور کے سلسلے وار ناول "خوفناک جزیرہ" کالی دنیا، نیلی دنیا اور دوسرا زینہ کی نوعیت بھی یہی ہے۔ ان ناولوں میں سمندر، خلا، زمین دوز دنیاؤں کی سیر کرائی ہے۔ ناولوں میں محیر العقول واقعات، سائنسی کرشمے اور مہمات کی روداد نے مل جل کر ایسی پرکشش اور دلچسپ صورت اختیار کرلی ہے کہ بچے ہی کیا بڑے بھی انھیں از اوّل تا آخر ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ جان، شاگو اور جیگا جیسے سائنسدانوں کے کارناموں کے حامل یہ ناول فنتاسیا اور سائنسی مہمات کا دلچسپ آمیزہ ہیں۔ یہ تمام ناول ماہنامہ کھلونا نئی دہلی میں قسط وار شائع کرنے کے بعد ۱۹۸۰ء۔۸۴ء کے دوران ماہنامہ کھلونا نے کتابی شکل میں شائع کیے۔

۱۹۸۴ء میں سراج انور کی طویل کہانیاں "بوتل کا جن"، نقاب کا عذاب"، "ہیرے کا ہاتھ"، "جادو کا دروازہ"، اور "سونے کا چہرہ" طارق پبلکیشنز دہلی نے کتابی شکل میں شائع کی ہیں۔ یہ تمام کہانیاں سائنسی موضوعات کی حامل ہیں نیز بچوں کی تفریح طبع کے ساتھ ساتھ سائنسی معلومات بھی فراہم کرتی ہیں ان کا قلم ابھی تھکا نہیں ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ مستقبل میں وہ بہترین سائنس فکشن پیش کرتے رہیں گے۔

اطہر پرویز کی کہانی "مشینی گھوڑا" بچوں کی کہانی کے سلسلے کی ایک ارتقائی کڑی محسوس ہوتی ہے یہ ایک ترقی یافتہ تخیلاتی کہانی ہے۔ کہانی کی ابتدا ایک کاری گر کے بنائے ہوئے مشینی گھوڑے سے شروع ہوتی ہے۔ جس کو شہزادہ غلطی سے لے اُڑتا ہے لیکن اسے اتارنے کا گر نہیں آتا۔ اگرچہ کہانی نئی نہیں لیکن اطہر پرویز نے واقعات کی پیش کش میں مہارت فن کا ثبوت دیا ہے۔ اور بچوں کو حیرت بھری دنیا کی سیر کراتے ہوئے سائنسی ترقیوں کے امکانات سے آگاہ کیا ہے۔ اس کہانی میں تخیلات کی آمیزش نے اس کے لطف کو دوبالا کردیا ہے۔ یہ کہانی ۱۹۷۷ء میں ترقی اردو بورڈ نئی دہلی نے شائع کی۔

اطہر پرویز نے بچوں کے لیے غیر افسانوی سائنسی ادب بھی تخلیق کیا ہے۔ "پودوں اور جانوروں کی دنیا"، اور "چارلس ڈارون" اس سلسلے کی قابل ذکر کتابیں ہیں۔ "پودوں اور جانوروں کی دنیا" ترقی اُردو بورڈ نئی دہلی نے ۱۹۷۹ء میں شائع کی یہ کتاب بچوں کو حیاتیات سے متعلق معلومات فراہم کرتی ہے۔ زبان آسان اور اسلوب دلکش ہے۔

سائنس فکشن میں ایم یوسف انصاری کا "زہرہ کا سفر"، اور ساغر ملک کا "قاتل سائنسداں" لائق توجہ کتابیں ہیں "زہرہ کا سفر"، میں مہم جوئی ہے نیز زہرہ کے سفر کی سیر و تفریح اور معلومات سے بھرپور کہانی پیش کی گئی ہے۔ "قاتل سائنسداں" کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں قاتل سائنسداں سائنسی انتقام جیسی کہانیاں ہیں۔ قاتل سائنسداں میں روبوٹ کی دلچسپ کہانی پیش کی گئی ہے۔

سائنسی اور سماجی کہانیاں تو بہت پہلے سے لکھی جاتی رہی ہیں لیکن اب سراغرسانی کے واقعات کو بھی اردو کہانیوں میں اہمیت دی جانے لگی ہے۔ "بھورا بال" اور "ایک کلاس پانی" اظہار اثر کی لکھی کہانیاں سائنس سراغرسانی اور رہمات کی آمیزش سے نیا پن پیدا کرنے والی کہانیاں ہیں۔ سائنس اور سراغرسانی کے ملے جلے موضوعات پر لکھنے والوں میں افتخار احمد اقبال کا نام بھی شامل ہے۔ دورِ جدید کے سائنسی تقاضوں اور مغربی رجحانات کے غلبے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے افتخار احمد اقبال نے بچوں کے لیے "موت کے شعلے" "چلتی پھرتی تصویریں" اور "پُراسرار انسان" جیسی کہانیاں قلم بند کیں۔ جو ماہنامہ کھلونا میں قسط وار شائع ہوئیں۔ ۱۹۰۵ء میں ان کا سائنسی ناول "پاگل ڈاکٹر" کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

غیر افسانوی سائنسی ادب پیش کرنے والوں میں محمد اکرام اور اسحاق صدیقی کا نام جامعہ کے مصنفین میں شامل ہے۔ جنھوں نے سائنس کے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔ محمد اکرام کے مضامین کمپیوٹر (اکتوبر ۱۹۷۲ء) کر برنکس (مئی ۱۹۷۳ء) "سائنس کی باتیں" (اپریل ۱۹۷۵ء) "سائنس کی دنیا" (جنوری تا مارچ ۱۹۷۶ء) اور اسحاق صدیقی کے مضامین "چاند کی طرف پہلا قدم" "سائکل کی کہانی" اور "آپ کی آنکھیں" پیام تعلیم نئی دہلی کے شماروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔

محمد اسحاق کی کتاب "نو سیارے اکتیس چاند" اردو ادب اطفال میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن ۱۹۷۶ء میں احباب پبلشرز لکھنؤ نے شائع کیا کتاب میں سائنسی موضوعات پر پچیس مضمون ہیں۔ جن میں زمین گول ہے، ستاروں کے راستے، زہرہ، جادو کی نلکی کشش کا قانون، نو سیارے اکتیس چاند، سیارے کیسے بنے، مریخ، ٹوٹنے والے تارے، سیارچے، مشتری، زحل، دم دار ستارے، اور سورج، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں یہ کتاب بچوں کی آسان زبان میں باتصویر پیش کی گئی ہے۔

ترقی اردو بورڈ نئی دہلی سے سائنسی موضوعات پر شائع ہونے والی کتابوں میں "چندا ماما کے گاؤں میں" (قاضی مشتاق احمد) اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۸۷ء "چلو چاند پر چلیں" (جے پرکاش بھارتی) اپنے موضوع کے اعتبار سے قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔ "چلو چاند پر چلیں" پر حکومت ہند نے مصنف کو انعام سے بھی نوازا ہے۔ اس کتاب میں "ایک تھال موتیوں سے بھرا" "چندا ماما دور کے" "خلا کے مسافر" "چاند کا سفر" "چاند پر چہل پہل" "دوسرے سیاروں کا سفر" "ستاروں کے آگے" کے عنوانات سے دلچسپ کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔

"چندا ماما کے گاؤں میں" قاضی مشتاق احمد نے بچوں کو توہم پرستی کے دائرے سے نکالا ہے۔ بھوتوں کی کہانی "بھوت بنگلہ" "بھوتوں کا گھر" کمپیوٹر کی کہانی، آئس کریم کی کہانی اور "اکیسویں صدی کی تصویر" نہایت دلکش انداز میں پیش کی گئی ہے۔ یہ کتابیں ۷ سے ۱۰ سال تک کے بچوں کے لیے ہیں۔

"ترقی اردو بیورو" نے سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر رسمی تعلیم کے سلسلے میں ایک مستحسن قدم اٹھایا اور ۱۹۸۸ء میں "سائنس کی کہانیاں" دو حصوں میں شائع کیں جن سے سائنسی موضوعات پر

بھرپور مواد مل جاتا ہے۔ یہ مضامین سکٹف اینڈ سکٹف کے قلم بند کردہ ہیں جن کو نہایت دلچسپ اسلوب اور دلکش زبان میں ڈاکٹر انیس الدین ملک نے اردو کے قالب میں خوبصورتی سے ڈھالا ہے۔ "سائنس کی کہانی" حصہ اوّل میں "پھٹکری پوپ اور بادشاہ" "بارود اور ایک آتش فشاں پہاڑ" "کتے کا غار" "اوّلین غبارے" "جمہوریت کو سائنس دانوں کی ضرورت ہے" "اتفاقی رنگ" "ایک کیمیا داں نے خواب دیکھا" "ایک یہودی سائنس داں کو ملک بدر کیا گیا" خاص طور پر دلچسپ اور قابلِ توجہ مضامین ہیں۔

سائنس کی دنیا، حصہ دوم میں دوربین اور پینڈولم، نیوٹن اور سیب، ایکسریز کی اتفاقی دریافت تاریخ کا سب سے بڑا سائنسی جوا، بادشاہ حکمراں اور سائنس داں اور سائنس دانوں کو محتاط ہونا چاہیے۔ اہم موضوعات کے حامل مضامین ہیں یہ کتابیں ۱۱ سے ۱۴ سال تک کے بچوں کے لیے لکھی گئی ہیں۔

دورِ جدید میں روبوٹ بچوں کی دلچسپی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ روبوٹ پر بہت سی کہانیاں مضامین اور ناول شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن روبوٹ مشینی آدمی اس نوع کی سب سے دلکش دلچسپ اور خوبصورت کتاب ہے، جو ۱۹۸۸ء میں ایچ ای ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ حیدرآباد نے شائع کی۔ روبوٹ کی ابتدا کیسے ہوئی؟ روبوٹ کیا ہے؟ کیا خود بخود چلنے والی مشین روبوٹ ہے؟ فیڈ بیک کیا ہے؟ کن چیزوں سے روبوٹ بنتا ہے؟ آج کل روبوٹ کہاں پائے جاتے ہیں؟ کھیل تماشے میں بنائے جانے والے روبوٹ اصل میں کیا ہیں؟ سائی برگ کس قسم کا روبوٹ ہے؟ روبوٹ کا دماغ کس طرح کام کرتا ہے۔ غرض کہ روبوٹ کے پورے سسٹم کا عملی خاکہ اس خوبصورت انداز میں باتصویر اور انگریزی الفاظ کے ساتھ پیش کیا ہے کہ ننھے قاری اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ حقیقتاً اس نوع کی کتابوں کی بے حد ضرورت ہے۔ توقع کی جاسکتی ہے کہ ایچ۔ ای۔ ایچ دی نظامس اردو ٹرسٹ حیدرآباد اس قسم کی اچھی کتابیں شائع کرتا رہے گا۔

سائنس کے کھیل (اروند ناتھ) وگیان پرکاشن الہ آباد ۱۹۷۶ء ایٹم کی کہانی (اندرجیت لال) سالوجہ پرکاشن دہلی ۱۹۷۷ء "پھول اور شہد کی مکھی" (انور کمال حسینی) نہرو بال پستکالیہ نئی دہلی ۱۹۷۸ء "ذرے کی کہانی" (مہدی جعفر) مکتبہ پیام تعلیم نئی دہلی ۱۹۸۷ء معلومات عامہ حصہ اوّل دوم، سوم (فرحت قمر) جمعیت اہل حدیث جامع مسجد دہلی ۱۹۷۲ء عام معلومات (فرحت قمر) نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۷۲ء "نظام شمسی کی تمثیلی کانفرنس" (بدیع الزماں اعظمی) نیشنل بک ٹرسٹ ۱۹۷۶ء "درختوں کی دنیا" (رسکن بانڈ) نہرو بال پستکالیہ نئی دہلی ۱۹۷۶ء "پرندوں کی دنیا" (شفیع الدین نیر) نہرو بال پستکالیہ ۱۹۷۶ء "کھیل کھیل میں" (مناظر عاشق ہرگانوی) نہرو بال پستکالیہ ۱۹۷۶ء سائنسی موضوعات پر قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے بچوں کا سائنسی ادب پیش کرنے میں بچوں کے رسائل کا اہم رول رہا ہے۔ اردو اکیڈمی دہلی کا رسالہ "امنگ" اس سلسلے میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ رسالہ

دسمبر ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آیا۔ "امنگ" کے تقریباً ہر شمارے میں بچوں کے لیے سائنسی موضوعات پر مضامین یا کہانیاں مل جاتی ہیں۔ امنگ نے بچوں کے سائنسی ادب پر خصوصی توجہ دی نیز اچھے لکھنے والوں کو اس اہم موضوع پر لکھنے کی دعوت دی ہے۔ گذشتہ ایک برس میں شائع ہونے والے مضامین میں پودوں کی دنیا (اسرار آفاقی، جنوری ۱۹۸۹ء) سکولوں میں کمپیوٹر پروگرام (پریم پال اشک، جنوری ۱۹۸۸ء) سائنس نامہ، ویڈیو فون، شہد سے زخموں کا علاج، پلاسٹک سرجری کے بغیر آپریشن (اسد رضا، ستمبر ۸۸ء) خلا کا سفر (ایل کیش ۸۸ء) ہیرے کے کرشمے (علی ناصر زیدی، اپریل ۸۸ء) ہوا کی اہمیت (سید اسلم، مارچ ۸۸ء) پودے کا انٹرویو (اسرار آفاقی، فروری ۸۸ء) ہیکیٹر یا (ڈاکٹر محمد فاروق اعظم، اگست ۸۸ء) سائنس نامہ میں جھوٹ پکڑنے والی مشین۔ ہندوستان کی خلائی کامیابی، ایک انوکھا گھول، بغیر دھوئیں کی سگریٹ، انسان مریخ پر کب پہنچے گا۔ (نومبر ۸۸ء) بریل سسٹم کے موجد۔ لوئی بریل (پریم پال اشک دسمبر ۸۸ء) اور باندھ کے مقناطیسی ڈھال۔ مصنوعی مرچ، مصنوعی غدود، دس ہزار کلومیٹر تک مار کرنے والے میزائل، آنکھ کا انوکھا آپریشن اور الٹرا ساؤنڈ (اسد رضا۔ دسمبر ۸۸ء) قابل ذکر ہیں۔ سائنسی موضوعات پر مضامین لکھنے والوں میں ایم یوسف انصاری کا نام محتاج تعارف نہیں "زہرہ کا سفر" کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ یہاں ماہنامہ "امنگ" میں شائع ہونے والے مضامین کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ "پرندوں کی دنیا" کے عنوان سے "الو" (ستمبر ۸۸ء) سنہری چڑیا" (جولائی ۸۸ء) دھنک چڑیا (اکتوبر ۸۸ء) توتا (جنوری ۸۹ء) جیسے مضامین لکھ کر حیاتیاتی موضوعات کو فروغ دیا گیا ہے۔ مدیر امنگ کی جانب سے شائع ہونے والے مضامین میں "سائنس نامہ کے عنوان سے "بیرونی خلا میں دوربینیں" اور "تب مریخ پر بستیاں بسائی جائیں" (اگست ۸۸ء) بھی لائق ذکر ہیں۔ یہ رسالہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچ رہا ہے نیز بچوں کے لیے سائنسی ادب تخلیق پیش کرنے میں اہم رول ادا کر رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے مضامین کتابی شکل میں شائع کیے جائیں نیز ننھے قارئین کو بھی چھوٹے چھوٹے مضامین اور کہانیاں لکھنے کی دعوت دے کر اُن کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔

"سائنس کی دنیا"، سہ ماہی رسالہ سی۔ ایس۔ آئی۔ آر سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے میں سائنس اور ٹکنالوجی پر مشتمل مضامین بچوں میں سائنسی استعداد بڑھانے کے مقصد سے شائع کیے جا رہے ہیں۔ "سائنس کی دنیا" میں بائیولوجی، فزکس، کیمسٹری، سرجری، عوام کی سائنس شعاعیں دھالتوں کی کہانی ہندستان میں سائنسی ترقیات اور سائنسی لغات جیسے اہم موضوعات پر مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ مگر یہ رسالہ زیادہ تر اسکولوں کی لائبریریوں تک محدود ہے۔ ایک عام قاری اس سے استفادہ نہیں کر پاتا۔ سائنسی ادب میں "سائنس کی دنیا" ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کی زبان خشک اسلوب بے کیف اور مضامین محض درسی نوعیت کے ہونے کے سبب بچہ پڑھنے سے گریز کرتا ہے اگر کونین کی گولی کو شہد میں لپیٹ کر دیا جاتا تو یہ دل اور دماغ دونوں پر اثر انداز ہوتی۔

سائنس کی درسی کتب کے ضمن میں این سی ای آر ٹی کا نام بھی خصوصیت کا حامل ہے۔

جس نے ابتدائی درجات سے لے کر ثانوی درجات تک کی سائنسی کتب شائع کیں۔ یہ کتاب اردو میڈیم میں سائنس کی کتب ہیں۔ ان کی حیثیت بھی "سائنس کی دنیا" کے مضامین کی سی ہے۔ جس کو بچے ٹیکسٹ بک کی حیثیت سے ہی پڑھتے ہیں۔

مارچ ۱۹۸۸ء میں بچوں کے ادبی ٹرسٹ نئی دہلی نے سائنسی موضوعات پر ایک اہم سمینار اور ورک شاپ کا اہتمام کیا تھا۔ جس میں سائنس فکشن کو اہمیت دی گئی تھی۔ یہ کہانیاں بڑوں کی لکھی ہوئی بھی تھیں۔ اور بچوں کی کوششیں بھی۔ کہانیاں پڑھ کر سنائی گئیں۔ تبصرے ہوئے سائنسی کتب کی ضروریات اور مسائل پر غور و فکر ہوا۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ سمینار نشستند، گفتند اور برخواستند تک محدود نہیں رہا بلکہ ٹرسٹ کے سیکریٹری غلام حیدر صاحب کی ریاضت اور جانفشانی کا ثمرہ بہت ہی قلیل عرصے میں عملی طور پر سامنے آگیا نیز بہت ہی خوبصورت چھپے کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر سامنے آئیں۔

"ننھا پودا" (نجمہ صالحہ) "نٹ کھٹ چنو" (تسنیمہ حیدر) اور چار سہیلیوں کی کیاری (غلام حیدر) ۳ سے ۷ برس تک کے بچوں کے لیے اس سلسلے کی کتابیں ہیں۔ "ننھا پودا" کہانی کی شکل میں پودے کی نشو و نما پر بہترین کتاب ہے۔ تسنیمہ حیدر نے "نٹ کھٹ چنو" میں بہت ہی دل کش اسلوب اور پیاری زبان میں پانی کے سسٹم کو بانصویر پیش کیا ہے۔ جس سے بچے واٹر سائکل کو بآسانی سمجھ سکیں۔ غلام حیدر نے "چار سہیلیوں کی کیاری" میں مطر اگانے کے سسٹم کو بچوں کے اپنے انداز میں بتایا ہے۔

۷ سے ۱۰ برس تک کے بچوں کے لیے زاہدہ خاتون نے "تتلی کے بچے"، شمس الاسلام فاروقی سے "پھول کے مہمان" اور طلعت عزیز نے "کاربن قدرت کا انمول عطیہ ہے" قلم بند کیں۔ "تتلی کے بچے" میں "تتلی کیسے بنتی ہے" اس کا عملی سسٹم پیش کیا گیا ہے۔ "پھول کے مہمان" میں "تتلی شہد کی مکھی" "انجن ہاری جیسے کیڑوں کی دلچسپ کہانی پیش کی ہے جو پھول کو اپنی داستان سناتے ہیں۔

"کاربن قدرت کا عطیہ ہے" "کاربن کیسے بنتا ہے۔ کاربن کا استعمال، فوائد، خصوصیات اور زندگی میں کاربن کی اہمیت پر یہ ایک دلچسپ اور خوبصورت بانصویر کتاب ہے۔ ان تمام کتابوں میں سائنٹفک طریقۂ کار کو آزمایا گیا ہے۔ آج کے اس سائنسی دور میں اس نوع کی کتابوں کی بے حد ضرورت ہے۔

بچوں کے لیے سائنس فکشن کے ضمن میں کامکس ——— کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ جس نے ایک مسئلہ کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اس کی بے پناہ مقبولیت کے نتیجے میں بچوں کے ذہنوں پر منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔ ان کامکس کی کہانیاں نہ روایتی ہیں نہ ہی مافوق الفطرت ان میں سائنسی فکشن کے نام پر عجیب و غریب واقعات پیش کیے جاتے ہیں اور بچہ ان کہانیوں اور واقعات کو نہیں پڑھتا بلکہ تصویروں میں کھو جاتا ہے۔

سائنسی کتب کی تیاری بہت مشکل اور ذمہ داری کا کام ہے۔ اس کے لیے مصنف

آرٹسٹ، سائنسداں یا سائنس کی پوری صلاحیت رکھنے والے ان سب کا یکجا ہونا ضروری ہے۔ اردو میں سائنسی ادب کی کمی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک میں مصنف اور معتوز یا دو تین مصنفین کے مل کر کتاب لکھنے کا رواج بہت کم ہے جب کہ بچوں کے لیے اچھی کتاب لکھنا دراصل جماعتی Team work کام ہے۔ اگر کئی اشخاص مل کر اپنی اپنی صلاحیتوں کا استعمال کریں تو یقیناً ہر لحاظ سے معیاری کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ سائنس کی کتاب لکھنے میں اس دقت کا سامنا اکثر ہوتا ہے عام طور پر جو جانتا ہے اسے بیان کرنا نہیں آتا اور جسے بیان کرنا آتا ہے اس کی معلومات محدود ہوتی ہیں۔ میری اس بات کی تائید میں "بچوں کے ادبی ٹرسٹ" کی شائع کردہ مذکورہ کتب کا حوالہ دینا کافی ہے۔

ظفر احمد صدیقی
شعبہ اردو، بنارس ہندو یونی ورسٹی
وارانسی

فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں

اردو میں تدوینِ متن کے معیاری و مثالی نمونے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ عمل غیر معمولی محنت و مشقت اور جاں کاہی و جگر کاوی کا طالب ہے۔ بقول غالب ع عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد ہے۔ دوسرے اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بعض مخصوص صلاحیتیں درکار ہیں: ذکاوت و ذہانت، وسعتِ معلومات اسالیب زبان و بیان سے گہری واقفیت وغیرہ اور ظاہر ہے کہ قسامِ ازل نے ان عطیات و موہبات کو کبھی عام نہیں فرمایا۔ تیسرے شہرت و ناموری اور صلہ و ستایش کے امکانات بھی اس قسم کے خاموش علمی مشاغل میں کم ہیں۔ گویا یہ سودا نفع بخش بھی نہیں۔ تاہم تحقیق و تدوین کا دشتِ پُرخار فرزانہ دیوانوں سے بالکلیہ خالی بھی نہیں رہا ہے۔ چنانچہ دیوانِ غالب مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، غبارِ خاطر مرتبہ مالک رام اور کربل کتھا مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد کا شمار تدوینِ متن کی قابلِ قدر اور لائق تحسین کوششوں میں کیا جا سکتا ہے۔ ادھر اس سلسلے کا تازہ ترین کارنامہ جناب رشید حسن خاں نے فسانۂ عجائب کی ترتیب و تدوین کے ذریعے سرانجام دیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ ان کا یہ کام بعض حیثیتوں سے منفرد اور عدیم النظیر ہے۔

فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں کی اشاعت انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی کی جانب سے عمل میں آئی ہے۔ یہ اعتبار ضخامت یہ ۷۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں ڈاکٹر قمر رئیس کے پیش لفظ اور جناب خلیق انجم کے حرف آغاز کے بعد صفحہ ۱۵ سے ۱۱۴ تک مرتب کتاب کا وقیع مقدمہ ہے، جسے کمیت و کیفیت ہر دو لحاظ سے ایک مستقل تصنیف کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ اس میں ترتیب و تدوینِ متن کے اصول و آداب بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ رجب علی بیگ سرور کے ضروری سوانح، فسانۂ عجائب کی وجہ تصنیف، زمانۂ تصنیف، بیانِ لکھنؤ کے اختلافات، میر امن اور باغ و بہار کا قضیہ، ضمنی داستانیں اور زبان و بیان جیسے عنوانات پر بھی مختصر لیکن جامع گفتگو کی گئی ہے۔ لیکن یہ تمام مباحث بہ قول مرتب ضمنی ہیں: مقدمۂ کتاب میں انھوں نے جس موضوع پر کھل کر بحث کی ہے، وہ ہے اس کتاب کے مطبوعہ نسخوں کا مفصل و مبسوط تعارف اور ان کی حیثیت کا تعین۔ اس کے مطالعے سے بے تکلف یہ نتیجہ برآمد کیا جا سکتا ہے کہ مرتب کتاب اپنے موضوع پر پوری طرح حاوی اور اپنے راستے کے نشیب و فراز سے کما حقہٗ آگاہ ہے۔

مقدمۂ کتاب کے بعد فسانۂ عجائب کا متن سامنے آتا ہے۔ اس کے لیے صفحات کی از سرِ نو ترتیب

قائم کی گئی ہے۔ پاکیزہ جلی خط میں ۱۹ سطری مسطر پر یہ ۲۴۶ صفحات کو محیط ہے۔ اس متن کی بنیاد مطبع افضل المطابع لکھنؤ کے ۱۲۸۰ھ کے اڈیشن پر رکھی گئی ہے۔ کیونکہ یہ سرور کا آخری بار نظر ثانی کیا ہوا متن اور اس میں سابقہ متون کے مقابلے میں اضافے بھی ہیں اور لفظی تبدیلیاں بھی۔

کسی متن کو بنیاد بنانے کا مطلب عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اس کے جملہ اغلاط کتابت وطباعت اور تصحیفات وتحریفات کو متنِ کتاب میں داخل کرلیا جائے اور دوسرے نسخوں کے اختلاف حواشی کتاب میں درج کر دیے جائیں۔ رہا یہ سوال کہ ان میں صحیح ترین متن کون سا ہے؟ تو اس کے تعین کی ذمے داری قاری پر ڈال دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کسی متن کو مرتب کرنا فعل عبث اور تطویل لاطائل ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جناب رشید حسن خاں نے ایک نسخے کو بنیاد بنانے کے باوجود تصحیح متن کی ذمے داری خود اپنے سر لی ہے۔ میں یہاں ایک مثال پیش کرنا مناسب سمجھتا ابتدائے کتاب ہی کی عبارت ہے:

"سزاوار حمد وثنا، خالقِ ارض وسما، جلّ وعلا، صانعِ بے چون وچرا ہے۔"

مصنف کے بنیادی متن میں "جلّ وعلا"، کے بجائے "جلّ وعلی" تحریر ہے۔ مزید برآں مطبع حسنی لکھنؤ طبع اوّل ۱۲۵۹ھ، مطبع حیدری لکھنؤ ۱۲۶۴ھ، مطبع حسنی لکھنؤ طبع دوم ۱۲۶۳ھ، مطبع افضل المطابع محمدی کان پور ۱۲۷۶ھ اور مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۲۸۳ھ میں بھی اسی طرح مرقوم ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس جگہ "علا" با معنی اور برمحل ہے اور "علی" لغو وبے معنی ہے۔ لہٰذا "علا" کو متن میں جگہ دی گئی اور "علی" کو اختلاف نسخ کے ذیل میں درج کیا گیا۔

تصحیح متن کے علاوہ متن کی ترتیب میں اس کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہائے ملفوظ اور ہائے مخلوط نیز یائے معروف اور یائے مجہول کی کتابت میں تفریق برتی جائے۔ اسی طرح مشدد حروف پر تشدید کسرۂ اضافت وتوصیف کے مواقع پر زیر کی کتابت کا التزام کیا جائے۔ پیراگراف قائم کیے جائیں مقامات پر اعراب لگائے جائیں نیز رموز اوقاف اور علامات کی پابندی بھی کی جائے۔

متنِ کتاب کے بعد ضمیموں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ تعداد میں سات ہیں اور بڑے کام کے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ طلبہ سے زیادہ اساتذہ کے لیے لائق استفادہ ہیں۔ پہلے ضمیمے کا عنوان ہے "نثر ہا خاتمۂ کتاب۔ مرزا رجب علی بیگ سرور کی عادت تھی کہ وہ جب بھی اشاعتِ جدیدہ کے لیے کتاب پر نظر ثانی تو اصل کتاب میں حذف واضافہ سے قطع نظر خاتمۂ کتاب کی نثر بھی لکھتے۔ جناب رشید حسن خاں نے پیش نظر میں ایسی پانچ نثروں کو جمع کر دیا ہے۔ چونکہ خاتمۂ کتاب کی یہ پانچوں نثریں سرور کے قلم کا ثمرہ ہیں اور عجائب ہی کے تعلق سے وجود میں آئی ہیں، لہٰذا انھیں یکجا کر دینا معقول ومناسب بھی تھا اور مفید

دوسرے ضمیمے کے لیے "تشریحات" کا عنوان اختیار کیا گیا ہے۔ اس ضمیمے میں مرتب نے متن کی وترتیب کے سلسلے میں اپنی ترجیحات کے وجوہ سے بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ موقع بہ موقع بعض اطلاعات بھی فراہم کی ہیں۔ درحقیقت اصل متن سے زیادہ اس ضمیمہ تشریحات سے ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرتب نے کتاب کے ایک ایک فقرے بلکہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر کس قدر توجہ کی ہے اور صحیح متن تک پہنچنے کے لیے کیسے کیسے ہفت خواں طے کیے ہیں۔ یہ ضمیمہ باریک خط اور ۲۵

کے ۱۱ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے بعض اقتباسات کا نقل کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

(الف) "اے مرغ خوش خود طائر زمرد لباس سرخ رو" اس ٹکڑے کو دو طرح پڑھا جا سکتا ہے اور دونوں قراتیں بجائے خود درست ہوں گی: (طائر زمرد لباس، سرخ رو (۲) طائر زمرد لباس سرخ رو۔
دوسری صورت کو محض اس لیے ترجیح دی گئی کہ اس مکمل جملے کے آہنگ کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے [اے مرغ خوش خود طائر زمردِ لباس سرخ رو، بذلہ سنج بے رنج]
اس کی تائید اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ک (= مطبع محمدی کان پور ۱۲۶۰ھ) میں یہ ٹکڑا اس طرح ملتا ہے:
"اے مرغ خوش خود طائر سرخ رو" اور یہاں "طائر سرخ رو" اسی قرأت کی تائید کرتا ہے، جس کو مرجح سمجھا گیا۔

(ب) "اس دید کی خراش سے دل پاش پاش" یہاں "دید کی خراش سے" اور "دید کے خراش سے" دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ لفظ "خراش" بہ لحاظ تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے (نور اللغات، رشحات صفیر) لیکن انشا نے دریائے لطافت میں اسے صرف مؤنث لکھا ہے (ترجمہ دریائے لطافت ص ۲۵۰) اور آصفیہ میں بھی مؤنث ہے۔ شوق نیموی نے رسالہ اصلاح میں لکھا ہے کہ پہلے یہ مذکر بھی آتا تھا "مگر اکثر فصحائے حال مونث کے قائل ہیں" (ص ۲) اور اس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ جلال نے مفید الشعرا میں اسے مؤنث ہی لکھا ہے۔ ان ہی وجوہ سے یہاں اسے بہ تانیث مرجح مانا گیا ہے۔

(ج) (پلکیں دیدۂ حق بیں کا اسرار چھپانے کو، دیدۂ حاسد کی گزند بچانے کو موچھوں سے ملیں) اس جملے میں "چشم حاسد کے گزند" بھی پڑھا جا سکتا ہے اور "چشم حاسد کی گزند" بھی پڑھ سکتے ہیں۔
کیونکہ لفظ "گزند" بہ لحاظ تذکیر و تانیث مختلف فیہ ہے (نور اللغات) یہاں تانیث کو مرجح قرار دیا گیا ہے۔ اس بنا پر کہ (۱) اسی کتاب میں "برادرانِ توام" کے قصے میں ایک جگہ واضح طور پر بہ تانیث آیا ہے: "الارس حیات مضبوط تھی۔ نہ گزند پہنچنے کی پہنچی، نہ چوٹ چپیٹ گرنے کی لگی۔ (۲) سرور کی ایک اور کتاب شبستان سرور میں بھی یہ لفظ اسی طرح آیا ہے: "دیر تک صدائے مبارک باد بلند رہی، لیکن غضب کے دلوں میں گزند رہی" (جلد سوم ص ۳۲) ایک اور جملہ ہے: "ملک سے بھی آمد بند ہوئی، ہر طرح کی گزند ہوئی" (ایضاً ص ۱۶)
ان اقتباسات سے ضمیمہ تشریحات کی اہمیت و افادیت نیز مرتب کی کد و کاوش کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تیسرا ضمیمہ "انتساب اشعار" سے متعلق ہے۔ سرور نے فسانۂ عجائب میں خود اپنے اور فارسی و اردو کے دوسرے شعرا کے اشعار بھی موقع بہ موقع نقل کیے ہیں۔ اس ضمیمے میں ان کے انتساب سے بحث کی گئی ہے۔ جن اہل علم حضرات کو اس طرح کے کاموں کا تجربہ ہے، صرف وہی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کیسا دشوار گزار مرحلہ تھا، جس سے جناب رشید حسن خاں کامیاب گزر گئے ہیں۔

چوتھا ضمیمہ "اشخاص، مقامات اور عمارات" سے متعلق وضاحتوں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ پوری کتاب کو محیط نہیں، بلکہ صرف دیباچۂ کتاب سے متعلق ہے۔ اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ سرور نے دیباچۂ کتاب میں متعدد لکھنؤ کے بہت سے اشخاص نیز مقامات و عمارات کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ باذوق قاری کے لیے ان سے متعلق ضروری تفصیلات فراہم کر دی جائیں۔ اس لحاظ سے یہ ضمیمہ بھی خاصا اہم اور مفید ہے۔

پانچویں ضمیمے کا عنوان ہے "تلفظ اور املا"۔ اس کے تحت مرتب نے الفاظ کے املا یا اعراب کے سلسلے میں اپنی ترجیحات کے وجوہ پر روشنی ڈالی ہے۔ ذیل میں اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

ٹکٹکی: "اس لفظ کے تلفظ میں اختلاف ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں "ٹکٹکی" بہ کسرِ اول وسوم) ہے۔ اس کے برخلاف نور اللغات میں اسے "بالفتح وفتح سوم وکسر چہارم" "ٹکٹکی" لکھا گیا ہے۔ اثر لکھنوی مرحوم نے فرہنگ اثر میں نور اللغات کے اس اندراج پر تبصرہ کرتے ہوئے اس سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ "لکھنؤ میں بہ کسر اول وسوم" ہے۔ لیکن اوحدالدین بلگرامی کے معروف لغت نفائس اللغات میں (جو انیسویں صدی کے ربع ثانی کی تالیف ہے) اسے (نور اللغات کے مطابق) "بہ فتح اوّل وسکون دوم وفتح تائے ہندی وکسر کاف تازی وسکون تحتانی معروف" لکھا گیا ہے۔

• نفائس اللغات اور پھر نور اللغات کے اندراج سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اودھ کے علاقے میں یہ لفظ بہ فتح اول وسوم مستعمل تھا۔ بعد کو بہ کسر اول وسوم کی جانب رجحان بڑھتا گیا۔ اثر مرحوم کا اختلاف اسی بدلتے ہوئے رجحان کی نشان دہی کرتا ہے۔ دہلی کے اطراف میں غالباً شروع ہی سے یہ لفظ بہ کسر اوّل وسوم مستعمل رہا ہے۔

نفائس اللغات کے اندراج کی بنیاد پر اس کتاب یعنی فسانۂ عجائب، جس کا زمانہ تصنیف اسی عہد سے تعلق رکھتا ہے، اس لفظ کو بہ فتح اول وسوم مرجح سمجھا گیا ہے۔ نور اللغات کا اندراج اس کی توثیق کرتا ہے۔"

چھٹا ضمیمہ ہے "الفاظ اور طریقِ استعمال"۔ اس ضمیمے کا مقصد خاص طور پر ایسے الفاظ اور عبارتوں کی نشان دہی کرنا ہے، جن کے استعمال کو سرور یا ان کے عہد کے ساتھ خاص سمجھنا چاہیے۔ مثلاً:

"تیرِ دعا ہدفِ اجابت سے لبِ معشوق ہوا۔"
"نشۂ شباب سے چکنا چور ہے۔"
"سیکڑوں داؤں بیچ گئے۔"
"بحرِ عجب و نخوت میں آشنا ہوئی۔"
"چرچا چی"
"گردش میں دورِ شرابِ ناب آیا۔"
"سانحہ" (بہ معنی منظر)
"جہل خانہ" (بہ معنی جیل خانہ)
"گوشت کے مچے"

یہ ضمیمہ سرور کی زبان پر کام کرنے والوں کے لیے نہایت مفید ہے۔

ساتواں ضمیمہ "اختلاف نسخ" کا ہے۔ اصلاً تاہ ۸۰ صفحات پر مشتمل تھا اور پوری کتاب کے متداول نسخ کی نشان دہی کرتا ہے۔ لیکن کتاب کی ضخامت سے گھبرا کر اسے مختصر کر دیا گیا۔ چنانچہ پیش نظر ضمیمے میں ف دیباچۂ کتاب کے اختلافات درج کیے گئے ہیں۔ ہماری نظر میں یہ حذف و اختصار مناسب نہ تھا۔ مل یہاں ضرورت مصلحت پر غالب آگئی ہے۔ حالانکہ ہونا برعکس چاہیے تھا۔

ان معرکہ آرا ضمیموں کے بعد بھی خاں صاحب کا اشہب قلم نہ تھا نہ رکا۔ لہٰذا انھوں نے قاری کے شوق ہل من مزید کی تسکین کے لیے فرہنگ الفاظ بھی شامل کتاب کر دی ہے۔ یہ ف ب ج تین حصوں میں منقسم ہے۔ (الف) میں متن کتاب کے قابل تشریح مفردات و مرکبات کے معنی بیان کیے گئے ہیں۔ (ب) میں عربی فقروں اور عبارتوں کے ترجمے تحریر کیے گئے ہیں۔ (ج) فارسی اشعار اور فقروں کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ آخر میں متن کتاب کے اشخاص و اماکن کا اشاریہ بھی تیار کر دیا ہے۔

بعض مقامات پر مرتب کی رایوں سے اختلاف بھی ممکن ہے مثلاً:

"سزاوار حمد و ثنا، خالق ارض و سما ... صانع بے چون و چرا ہے" (ص) یہاں صانع پر اضافت لگایا گیا ہے، لیکن اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ "بے چوں و چرا کا صانع" بے معنی ہے۔ اسے بدون اضافت "صانع بے چون و چرا ہے" پڑھنا چاہیے۔ نحوی ترکیب کے لحاظ سے یہ خبر واقع ہو رہا ہے۔

"اسی شہر میں ایک شخص تھا مجسٹن نام، نہایت اہل دول، مرفہ حال" (ص) اس جملے میں دول بفتح اول لکھا گیا ہے۔ اسے "دُول" بضم اول لکھنا چاہیے۔

فرہنگ میں "بنات نعش" بکسر اول لکھا گیا ہے۔ اسے بفتح اول لکھنا چاہیے۔

بعض الفاظ شامل فرہنگ ہونے سے رہ گئے ہیں۔ مثلاً:

"مرغ کی زیر بریانی تر ترا تی کبھی ایسی نہ کھائی تھی" (ص ۲۰۰) "زیر بریانی" کی وضاحت ضروری تھی لیکن یہ فرہنگ میں شامل نہیں ہے۔ ("لکھنؤ کا دستر خوان" از مرزا جعفر حسین طبع اول ۱۹۸۰ء میں ص ۱۰ پر اس سے متعلق تفصیلات موجود ہیں۔)

بہرحال یہ معمولی اور جزوی باتیں ہیں۔ درحقیقت جناب رشید حسن خاں ایسے عظیم الشان اور محنت آفریں کارنامے کے لیے مبارک باد اور شکریے کے مستحق ہیں۔

مکتبہ پیام تعلیم کی ولولہ اور حیرت انگیز کتابیں
کمپیوٹر کیا ہے؟
حکیم نعیم الدین زبیری
8/-
ہمارے
عظیم
سائنس
حکیم محمد سعید
6/-
مونٹی کرسٹو کا نواب
نردولی کا آدم خور
6/-
خلائی مسافر
6/-

خیرالنساء مہدی
ای ۱۰۔ دوی، روشن کارٹر روڈ
باندرہ (ویسٹ) بمبئی ۵۰

(ایک انشائیہ نما کہانی)

چمپا چنبیلی سی میری نندیا!

کیسا زمانہ گزر گیا کہ جس کی یاد بھی اب دھندلی ہوتی جا رہی ہے۔ ہم جسے فیملی، مشترکہ خاندان یا بڑا گھر کہتے تھے وہ اب ہماری ایسی مہانگری سے بہت دور سپنوں میں جا بسا ہے۔ کل تک سب ساتھ مل کر رہتے تھے۔ لڑتے جھگڑتے تھے اور پھر ایک ہو جاتے تھے چھوٹے قصبوں اور گاؤں میں گھروں میں دیواریں تو ہوتی تھیں مگر ایک دوسرے کے بیچ فاصلے نہیں تھے اور ہماری لڑائیوں میں نفرت نہیں تھی بس اس طرح جیسے دو برتن آپس میں ٹکراتے تھے لیکن ایک دوسرے سے لڑتے نہیں تھے۔ ابھی لڑے اور دوسرے لمحے باتیں شروع کر دیں۔ آج لوگوں کو یہ رشتے بڑے سادے اور PRIMITIVE معلوم ہوں گے۔ اردو کے ایک شاعر نے کہا تھا:

جس کو کہتے ہیں محبت جس کو کہتے ہیں خلوص — جھونپڑوں میں ہو تو ہو پختہ مکانوں میں نہیں

ایک لحاظ سے دیکھا جائے کہ جب سے بجلی آئی ہے تو روشنی کم اور اندھیرا زیادہ بڑھ گیا ہے مگر PROGRESS اور ترقی تو بہرحال ہوئی ہے۔ بجلی کی جتنی خرابیاں ہیں اس سے زیادہ اس کی اچھائیاں بھی تو ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ میری بھی کئی نندیں تھیں کسی کی شادی ہو چکی تھی اور کسی کی نہیں۔ لیکن سب سے چھوٹی نند بالکل میری بچی جیسی معلوم ہوتی تھی وہ کانا پھوسی میں بہت آگے تھی جو سنتی اسے کہہ دیتی اور اپنے بھولے پن میں آ کر وہ باتیں بھی کہہ دیتی جو نہ سننے کی ہوتی ہے اور نہ کہنے کی۔ مجھے تو وہ ننھی سی گڑیا معلوم ہوتی تھی لیکن میرے گھر والے اسے زہر کی پڑیا کہتے تھے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ چمپا بھی تھی اور چنبیلی بھی تھی۔ مگر کچھ لوگ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں پھولوں کا میل نہیں ہے مگر میری چھوٹی نند تو واقعی چمپا چنبیلی تھی۔ مجھے تو کبھی کبھی اس کی معصومیت پر غصہ بھی آتا تھا اور سوچتی تھی کہ اس دور میں کوئی اتنا معصوم ہو کر بھی کیا کرے گا۔ آخر اسے بڑا بھی تو ہونا ہے اور زندگی بھی گزارنی ہے۔ زندگی میں سو طرح کے اُتار چڑھاؤ آتے ہیں۔ آدمی ایک ڈھنگ

سے نہیں رہ سکتا۔ آج ہم کسی کے بہت دوست ہیں اور پھر خاموشی سے تھوڑے عرصے بعد اس
دوست سے تعلقات ختم ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی چھوٹی سی نند کو سمجھاتی کہ پگلی تو ایک روز پڑھ
لکھ کر بڑی ہو گی کچھ تو دنیا کے سبھاؤ سیکھ لے۔ دیکھتی نہیں کہ تیری ماں مجھ سے کتنا خفا رہتی
ہے۔ میں جب تیرے بھائی یعنی اپنے شوہر کے ساتھ گھومنے جاتی ہوں تو اسے اچھا نہیں لگتا کہ
وہ مجھ پر اتنے پیسے خرچ کرتا ہے۔ مانا کہ میں بھی ایک ٹیچر ہوں مجھے بھی تنخواہ ملتی ہے لیکن
اس بھرے گھر کا گزارہ ان دو تنخواہوں میں مشکل ہی سے ہوتا ہے۔ کوئی فرمائش کرے یا نہ
کرے مگر اس مہنگائی نے تو سب کی کمر توڑ دی ہے۔ کوئی بیمار ہے، کوئی کسی اور شہر میں جا رہا
ہے۔ غرض کہ ہزار ضرورتیں، ہزار مانگیں اور کم آمدنی۔ قلیل رقم گزارہ ہو تو کیسے ہو۔

میری نند مجھ سے بڑی دلچسپ باتیں کرتی تھی۔ ایسی باتیں جن کا اگر اصل معنی ڈھونڈا
جائے تو بہت معمولی نکلے گا یعنی وہ اپنی سہیلی کے ساتھ پکنک پر گئی تھی یا یہ کہ اس کی سہیلی
کا بھائی اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا یا یہ کہ ایک آدمی نے اس سے پوچھا کہ کتنا بجا ہے۔
تو اس نے کہا کہ میرے پاس گھڑی نہیں ہے تو کیسے بتاؤں۔ غرض کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں
وہ مجھے بتاتی اور کھلکھلا کر ہنستی رہتی۔ میرے شوہر اس کو GIGGING ANN کی ایک لڑکی کہتے
تھے۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ میری ساس نے اس کو کھانا پکاتے ہوئے مارا تو وہ روتی ہوئی
میرے پاس آئی کہ بھابی تم بتاؤ کہ میں کھانا کس طرح پکاؤں۔ میں نے کہا تمھاری گڑیا تو
کھانا کھاتی نہیں پھر میں تمھیں کس طرح سکھاؤں کہ پکاؤ۔ اچھا پہلے سبزی ہی کاٹنا سیکھ
جاؤ۔ پالک کی ایک جوڑی لو۔ ان ہرے ہرے پتوں میں کون خراب کون اچھا ہے وہ مجھے بتاؤ
وہ سوراخ والے موٹے موٹے پتوں کو ہی اچھا کہتی۔ میں کہتی کہ یہ پتے اچھے نہیں ہیں۔ اس
نے کہا کہ یہ پتے اچھے ہیں اور اس میں اگر دو چار چھید ہیں تو کیا ہوا۔ پھر میں نے اسے سکھایا کہ پالک
کے پتوں کو ایک ساتھ لگا کر ڈنٹھل کو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے اور پتوں کو کس طرح مہین
مہین کاٹ لیا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسے نہ صرف پالک کاٹنا اور پکانا آ گیا بلکہ اور طرح کے
پکوان بھی سیکھ گئی۔

پھر ایک دن ایسا آیا وہ مجھے اپنے برابر کی لڑکی معلوم ہونے لگی۔ اس کی چال ڈھال
اور باتیں مجھے بدلی ہوئی معلوم ہوتیں۔ وہ پہلے کے مقابلے میں خاموش رہنے لگی۔ اب وہ روز شام کو
آکر مجھ سے اپنا ہوم ورک بھی نہیں کرواتی تھی گو کہ وہ ننھی ننھی چنبیلی کی مانند تھی لیکن اس
نے چمپا کی ساری خوشبو اپنے میں جذب کر لی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تو تھی مگر ایسا
معلوم ہوتا تھا جیسے ریت دھوپ میں چمک رہی ہے۔ کیا اس کا کوئی سپنا ٹوٹ گیا تھا۔
یا اس کے دل کو کوئی چوٹ پہنچی تھی وہ مجھے نہیں معلوم۔ آدمی کے رنگ ڈھنگ کتنے الگ
ہوتے ہیں۔ میں نے شروع میں ہی کہا تھا اب وہ میرے پوچھنے پر بھی نہیں بتاتی تھی کہ وہ
کیوں اتنی خاموش اور اداس رہتی ہے آخر مجھے اپنی ساس ہی سے پوچھنا پڑا کیونکہ
میرے شوہر تو کولھو کے بیل کی طرح صبح دفتر جاتے اور شام کو دفتر سے واپس آتے۔ زندگی

کی رفتار تو تیز تھی مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ میری زندگی بیل گاڑی کی چرخ چوں چرخ چوں میں گزر رہی ہے۔ بقول فراق گورکھپوری "کتنی آہستہ اور کتنی تیز"۔

میری ساس نے بتایا کہ ذات پات کا معاملہ اب مسلمانوں میں بھی آ گیا ہے اور کوئی جہیز لیے بغیر شادی کرنے کو تیار نہیں ہے اور وہ جو چمپا چنبیلی کی طرح شاید چھوئی موئی سی تھی اب ایک ضدی لڑکی بھی بن گئی تھی۔ وہ اب تنہا زندگی گزارنا چاہتی ہے اور شادی کرکے اپنی زندگی کو حصوں میں بانٹنا نہیں چاہتی۔ وہ سمجھتی ہے کہ شادی ایک بندھن ہی نہیں ایک زنجیر ہے۔ اس نے کسی ناول میں پڑھا تھا کہ جب سے دنیا بنی ہے سب سے زیادہ ظلم مردوں نے خود مردوں پر اور عورتوں پر کیے ہیں۔ میں اس سے کہتی کہ یہ کتابیں یہ فلمیں کوئی سچ تھوڑی ہی ہیں زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو بڑا صبر کرنا پڑتا ہے۔ سخت سست سننا پڑتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ آخر بندھن ہی کام آتے ہیں۔ یہ بندھن زنجیریں نہیں ہیں، رشتے ہیں اور ان کا توڑا جانا آسان ہے اور ان کو جوڑے رکھنا بڑا مشکل ہے۔ بھائی، بہن، ساس بہو، باپ بیٹے۔ نند بھاوج۔ ان رشتوں کو بھولا تو جا سکتا ہے مگر توڑا نہیں جا سکتا۔ آخر برے وقت میں اپنے ہی کام آتے ہیں مگر وہ تو نئے زمانے کی لڑکی بن گئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ آدمی کے زندہ رہنے کے لیے [illegible] اور SELF CONFIDENCE کافی ہے۔ یہی نہیں کبھی کبھی مجھ سے بحث کرتے ہوئے کہتی تھی کہ آخر بھیا آپ کو اپنی ماں کے مقابلے میں کیوں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اور آپ کا ایک سوشل CONTRACT ہے۔ یہ ممتا کا پُرتر بندھن دکھاوے میں کتنا اچھا لگتا ہے۔ مگر یہ بھی تو آخر عورتوں کی مجبوری کا SYMBOL ہے۔ کیا آپ دیکھتی نہیں کہ زندگی کن دائروں میں گزرتی ہے۔ باپ مرد۔ بھائی مرد۔ شوہر مرد۔ بیٹا مرد۔ ان ہی دائروں میں رہ کر ہماری زندگی بیت جاتی ہے۔ میں اس سے پوچھتی کہ آخر تو چاہتی کیا ہے وہ جو معصوم بھولی بھالی اور الھڑ لڑکی تھی۔ مجھ سے WOMEN LIBERATION کی باتیں کرتی اور کہتی کہ یہ UPER MIDDLES اور MIDDLE CLASS میں جو دلھن جہیز کے لیے جلا دی جاتی ہے اگر ان میں WILL POWER آ جائے تو وہ اپنے شوہروں کے بغیر زندگی گزار سکتی ہے۔ میں اسے سمجھاتی کہ یہ ساری باتیں WEST میں تو ممکن ہے مگر بھارت ایسے غریب ملک میں نہیں چل سکتی۔ یہاں تو پتی پرمیشور کے برابر ہے۔ ہم لاکھ ان بندھنوں کو توڑنا چاہیں مگر ہم ان میں اس قدر جکڑے ہوئے ہیں کہ ہم ان بندھنوں کو توڑ ہی نہیں سکتے۔ وہ میری باتیں سنتی اور اپنے قدموں کو پٹختے ہوئے میرے کمرے سے چلی جاتی ہونا کیا تھا جو بھگوان کو منظور تھا وہی ہوا یعنی۔ میری اکلوتی ساس کا انتقال ہو گیا اور میں، میری نند اور میرا شوہر گھر میں تین ہی آدمی بچ گئے۔ اب بجائے اس کے کہ وہ اپنی تعلیم اپنے چھوٹے سے قصبے میں ہی ختم کرتی اور کسی بڑے شہر میں جا کر یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتی اس نے ایر ہوسٹس بننے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ وہ اپنے بھائی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی۔

میں نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ زندگی جو وہ جینے جا رہی ہے دور سے بڑی اچھی لگتی ہے مگر یہاں بھی مردوں کی حکمرانی ہے۔ نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے مگر وہ میری بات کب سننے والی تھی۔ اس نے آخری بار اپنے بھائی سے کچھ پیسے لیے اور ایر ہوسٹس کا انٹرویو دینے چلی گئی۔ نتیجہ ہم کو پہلے ہی سے معلوم تھا۔ کیونکہ وہ چال ڈھال اور باتوں پر بہت SMART اور ہمارے خاندان میں کوئی اس طرح کی لڑکی نہیں تھی اور پھر وہ SELECT ہو گئی۔ میرے شوہر کا بھی تبادلہ بمبئی ایسے شہر میں ہو گیا اور ہم وہاں کے ایک SUBRB میں رہنے لگے۔ ہمارے پتے پر اس کے پکچر پوسٹ کارڈ اور خط آتے تھے مگر ان میں چند جملوں سے زیادہ نہیں لکھا ہوتا تھا۔ اس نے آسمانوں سے اڑتے ہوئے دنیا کے مختلف حصّوں کو دیکھا مگر کیا اس نے ان ملکوں کے رہنے والوں کی زندگی کو نزدیک سے دیکھا تھا۔ افسوس میں اس سے یہ نہ پوچھ سکی۔

اچانک ایک شام کو وہ ہمارے یہاں آگئی اور پوچھنے لگی اتنے چھوٹے فلیٹ میں آپ لوگ کیسے رہتے ہیں ہم نے کہا کہ ہم نے فیملی پلاننگ کی ہے۔ ہمارا کوئی بچہ نہیں ہے اور پھر ہماری ضروریات بھی بہت کم ہیں۔ وہ ہمارے لیے نہ جانے الگ الگ دلیسوں کے کتنے قیمتی تحفے لائی تھی۔ میں اس سے کہتی کہ ہم یہ ساری چیزیں لے کر کیا کریں گے۔ ہم تو سیدھے سادے لوگ ہیں یہ ساری چیزیں تو اپر مڈل کلاس کے لیے ہیں ہم تو LOWER مڈل کلاس کے لوگ ہیں۔ وہ کہتی بھابی آپ کی شادی کے وقت میں آپ کو کچھ نہ دے سکی۔ آپ کو یہ NECKLACE یہ چوڑیاں اور یہ کان کے بُندے تو لینا ہی پڑے گا۔ میں نے کہا یہ چیزیں بہت اچھی ہیں مگر میری عمر کے لائق نہیں ہیں۔ ہاں میں اس شرط پر اس کو لوں گی کہ جب تیری شادی ہو گی تو اسے تجھے واپس کر دوں گی۔ وہ یہ سن کر ہنستی رہتی اور کہتی کہ وہ دن تو کبھی نہیں آئے گا۔

آج اس واقعے کو ایک زمانہ گزر گیا ہے وہ دوسرے ملک میں جا کر بس گئی اور کبھی کبھی اس کے پکچر پوسٹ کارڈ اور خط بھی آتے ہیں لیکن میں اب بھی جب آنکھ بند کرتی ہوں تو مجھے آج بھی چمپا چنبیلی سی ننھی سی لڑکی نظر آتی ہے۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔

ملک
Nasar Malik Journal

بردہ فروش

"مائیبرٹ! اِس سے ملو یہ فاطمہ ہے، ہماری نئی ملازمہ!"
لانڈری کے فورمین پاوَل نے اس سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس
ہاتھ ملایا۔ اس نے بھی میری مسکراہٹ کا جواب اگرچہ مسکراہٹ ہی سے دیا لیکن میں نے محسوس کیا کہ خلاف توقع مائیبرٹ
اس گرمجوشی کا کوئی اظہار نہیں کیا تھا جو روایتی طور پر ڈینش ایسے موقعوں پر کیا کرتے ہیں —— "کیا تم یہاں
م شروع کرنے والی ہو؟" اس نے بجلت پوچھا۔

"ہاں، یہ آج سے تمہارے ہی ساتھ کام کرے گی۔ اسے مشین چلانے اور اس میں کپڑے ڈالنے کے بعد دھو
نیرہ کے بارے میں میں نے بتادیا ہے —— میرے خیال میں یہ سمجھ بھی گئی ہے کہ اسے کیا کرنا ہے —— کیوں فاطمہ؟"
ن بولے جا رہا تھا اور مائیبرٹ مجھے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنا کام بھی کرتی جا رہی تھی —— "تمھیں فاطمہ کے ساتھ کام
رنے میں دشواری نہیں ہوگی یہ ڈینش اچھی طرح جانتی ہے —— لو اب دونوں کام کرو۔ میں چلتا ہوں۔" فورمین نے
کر میرا شانہ تھپتھپایا اور وہاں سے چلا گیا۔

"کیا تم پاکستان سے ہو؟" فورمین کے جانے کے بعد مائیبرٹ نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں! میں پاکستانی ہوں۔" میں نے مختصر سا جواب دیتے ہوئے اس سے پوچھا کہ مجھے کیا کرنا ہے؟

"پاوَل نے تمھیں بتا ہی تو دیا ہے۔ بس اس مشین پر کھڑی ہو جاؤ اور وقفے وقفے سے اس میں ضرورت
کے مطابق کپڑے ڈالتی جاؤ۔ صابن ڈالتے وقت خیال رکھنا کہ وہ مقررہ مقدار سے زیادہ نہ ہو اور باہر نہ گرے
اور بس —— کپڑے دھل کر خود بخود باہر آجائیں گے تم انھیں ان خالی ٹوکریوں میں ڈال کر ایک طرف رکھتی جانا
—— استری کرنے والی عورتیں آئیں گی تو اٹھا کر لے جائیں گی۔ میری طرح تمھارا کام صرف یہی ہے کہ مشین کھڑی نہ
ہونے پائے بس کپڑے ڈالتی جانا اور صابن کا خیال رکھنا —— آؤ میں تمھاری مدد کرتی ہوں" مائیبرٹ اتنی کم
مزاج نہیں تھی جتنا کہ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے وقت اس کے بارے میں سوچا تھا۔ اس نے مشین میں کپڑے۔
اور خاص مقدار میں صابن ڈال کر ایک بٹن دبا دیا "یہ لو اب مشین سنبھالو اور ہاں بارہ بجے کھانے کا وقفہ ہوتا ہے تب
تم یہ سرخ بٹن دبا کر مشین روک دینا —— کیا تم نے لانڈری کی کینٹین دیکھی ہے؟" اس نے بغور مجھے دیکھتے
ہوئے پوچھا۔

"ہاں، پاوَل نے مجھے دکھا دی تھی" میں نے جواب دیا اس کی تیز نگاہیں ابھی تک میرے سراپے کا

جائزہ دے رہی تھیں۔
"میں اپنی مشین پر چلتی ہوں ـــ کوئی مشکل پیش آتے تو مجھے بلا لینا" وہ مجھے اس طرح دیکھتی ہوئی اپنی مشین کی طرف چلی گئی۔ میری اور اس کی مشین کے درمیان بمشکل کوئی دو میٹر کا فاصلہ ہوگا۔
بارہ بجنے میں ابھی کچھ منٹ باقی تھے کہ مائیبرٹ اپنی مشین بند کر کے میرے پاس آگئی "تم کھانا کہاں جاؤگی؟" اس نے پوچھا۔
"کیوں نہیں، لیکن ابھی تو بارہ نہیں بجے آٹھ دس منٹ رہ رہے ہیں" میں نے جواب دیا۔
"ہاں، لیکن اب تم مشین بند کر کے ہاتھ وغیرہ صاف کرلو، میں کینٹین جارہی ہوں ـــ کھانے کا وقفہ آدھ گھنٹے کا ہوتا ہے" وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی کینٹین کی طرف چل دی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بھی اپنی مشین بند کردی، ہاتھ دھوئے اور اپنا "کھانے کا ڈبا" لے کر کینٹین کی طرف چلدی۔
میں کینٹین میں داخل ہوئی تو کوئی بیس بائیس کارکن عورتیں میزوں پر بیٹھی اپنا اپنا کھانا کھا رہی تھیں ـــ ہر شخص چار پانچ رہا تھے میں نے مائیبرٹ کو تلاش کرنے کے لیے ادھر اُدھر دیکھا وہ ایک کونے میز پر اکیلی بیٹھی پہلے ہی مجھے ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھی میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ اور اپنا کھانے والا ڈبا کھول کر سامنے رکھ لیا۔
"کیا یہ پاکستانی کھانا ہے"؟ اس نے میرے کھانے کے اوپر قدرے جھک کر دیکھتے ہوئے پو
"ہاں! میں نے خود بنایا تھا ـــ کیا تم کھاؤگی؟ ـــ اس میں شاید مرچیں زیادہ ہو سکتی ہیں" اسے پیش کش کی۔
"نہیں نہیں، میں اپنا کھانا کھا چکی ہوں" ـــ وہ اپنے سامنے پڑے ہوئے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔
"تم اگر کھانا چاہو تو یہ ہم دونوں کے لیے کافی ہے" میں نے ذرا تکلف سے کام لیتے ہوئے اپنی پیش کش کو دہرایا ـــ مجھے معلوم تھا کہ سخت مرچوں والے کھانوں سے ڈینش ویسے بھی دامن بچاتے ہیں
"تم زور دیتی ہو تو میں تمھارا کھانا چکھ لیتی ہوں، کھاؤں گی اور کسی دن" اس نے یہ کہتے ہوئے آدھی چپاتی اٹھائی اور اس کے ایک ٹکڑے سے میرے کھانے کے ڈبے سے پورا ایک کوفتہ اٹھا لیا۔ ابھی منہ میں رکھنے ہی والی تھی کہ میں کانپ گئی ـــ اوہ خدایا! وہ ابھی کلبلا اُٹھے گی ـــ یہ کم بخت
میں ابھی ڈر ہی رہی تھی کہ اس نے نوالہ منہ میں رکھ کر میری طرف یوں دیکھا گویا کہ رہی ہو ـــ ایک کوفتہ اور لے لوں۔
"فاطمہ! تم اچھا کھانا بناتی ہو" مائیبرٹ بولی "اگر میں اپنا کھانا نہ کھا چکی ہوتی تو تمھارا ایک کو اور ضرور لیتی۔"

اسے یہ کیسے پتا چلا کہ میں کوفتے کھا رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں خیال آیا "شا پاکستانی گھرانے کو جانتی ہوگی، میں یہ سوچ ہی رہی تھی کہ وہ بولی "میں اب چلتی ہوں تم آجانا" وہ اپنا کا ڈبا اٹھا کر چل دی اور میں بھی کھانا کھانے کے بعد اپنی مشین پر پہنچ گئی۔
چھٹی ہوئی تو لانڈری سے نکلتے ہوئے میں مائیبرٹ کے پیچھے پیچھے ہولی ـــ وہ بس اسٹاپ

طرف جا رہی تھی مجھے اپنے پیچھے آتے دیکھ کر وہ رک گئی اور جب میں اس کی قریب پہنچی تو بولی "کیا تمہیں بھی بس پکڑنی ہے؟"

"ہاں! تم کون سی بس لوگی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"سو نمبر والی۔" اس نے جواب دیا۔

"وہی تو مجھے بھی لینی ہے۔" میں نے کہا اور ہم دونوں بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگیں

بس کے اڈے پر ہمیں کچھ زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ بس آئی تو ہم دونوں اس میں سوار ہو گئیں بھیڑ بھی زیادہ نہیں تھی ہم ایک ہی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ وہ رستہ بھر مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ پاکستان کے بارے میں اس کی معلومات کافی وسیع تھیں۔ اس نے میری شلوار اور خاص کر قمیص کے گلے اور بٹوں کی کافی تعریف کی۔ مائیبرٹ کا اسٹاپ مجھ سے دو سٹاپ پہلے پڑتا تھا۔ اس کا اسٹاپ آیا تو وہ کل کام پر ملنے کا وعدہ کر کے خدا حافظ کہتی ہوئی بس سے باہر نکل گئی۔

میں جب گھر پہنچی تو عابد مجھ سے پہلے ہی آ چکا تھا۔ وہ بھی ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا اور رات کو پارٹ ٹائم ٹیکسی بھی چلاتا تھا۔ میرے دروازہ کھولنے کی آہٹ سن کر اس نے ڈرائنگ روم ہی سے پوچھا" کام پر آج پہلا دن کیسا رہا؟"

"کام تو بس کام تھا" میں نے جواب دیا اور اپنے کپڑے بدلنے کے لیے سونے والے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

"میں سبزی لے آیا ہوں، سخت بھوک لگی ہوئی ہے، آج بہت کام کرنا پڑا ـــــ ذرا جلدی سے کھانا بنالو، میں ٹیلی ویژن پر خبریں دیکھ لوں گا۔" عابد ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھا بیٹھا مجھے حکم دے رہا تھا۔

میں کپڑے بدل کر ڈرائنگ روم میں آ گئی تھی اور ابھی کرسی پر بیٹھنے ہی والی تھی کہ اس نے مجھے چائے کا پانی رکھ دینے کو کہا۔ مرتی کیا نہ کرتی۔ یہ تو روزمرہ کا معمول تھا۔ ہماری شادی کو پانچ برس ہونے والے تھے۔ اسے اپنی تھکاوٹ کا بہت احساس رہتا تھا۔ مجھ سے فیکٹریوں میں کام کرنا ہماری اقتصادی مجبوری تھی اور پھر مجھ پر حکم چلانا اس کا ایسا حق تھا جو اس نے خود ہی حاصل کر رکھا تھا۔

دوسرے دن میں کام پر جانے لگی تو میں یہ سوچ کر کہ شاید مائیبرٹ بھی کھائے، اپنے ڈبے میں دگنا کھانا رکھ لیا۔

میں بس میں سوار ہوئی تو دو سٹاپ بعد مائیبرٹ بھی اسی بس میں سوار ہوتی دکھائی دی۔ وہ بیٹھنے کے لیے جگہ تلاش کر رہی تھی کہ میں نے اسے آواز دے کر متوجہ کیا "اِدھر آجاؤ۔"

"ہیلو فاطمہ ـــ صبح بخیر" وہ میرے پہلو میں بیٹھتے ہوئے بولی ـــــ "کہو کیسی ہو؟"

"بس ٹھیک ہوں" میں نے کہا۔

مائیبرٹ اور میں دوسرے مسافروں کی طرح کچھ کچھ اونگھ رہی تھیں اور کبھی کبھی آپس میں ایک آدھ بات بھی کر لیتی تھیں۔

لانڈری میں جا کر ہم دونوں نے اپنی اپنی مشینیں چلا کر کپڑے دھونے شروع کر دیے۔ اور پھر بارہ بجے ہم دونوں اکٹھی ہی کینٹین میں گئیں اور ایک ہی میز پر کھانا کھانے بیٹھ گئیں ـــــ "کیا آج تم میرے ساتھ

کھانا نہیں کھاؤ گی؟" میں نے اپنا کھانے کا ڈبہ کھولتے ہوئے مائیبرٹ سے پوچھا۔

"لاؤ تم بھی کیا کہو گی!" اس نے اپنا ڈبا ایک طرف رکھتے ہوئے کہا "آج کیا لائی ہو؟"

مائیبرٹ بڑے مزے سے کھانا کھا رہی تھی اور میری حیرانگی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں آج چپاتیوں کے ساتھ بھنڈیاں لائی تھی اور خدا گواہ ہے مائیبرٹ کھانے میں مجھ سے تیز تھی۔ "کیا تمھیں پاکستانی کھانے پسند ہیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ہاں تھے"۔ اس نے لقمہ اٹھاتے ہوئے مختصر سا جواب دیا اور بولی "ہم باتیں زیادہ کر رہی ہیں، دیکھو وقت کم رہ گیا ہے۔"

کھانے کے بعد ہم دونوں پھر اپنی اپنی مشینوں پر چلی گئیں اور پھر کام ختم کرتے ہی گھر جانے کے لیے بس اسٹاپ کی طرف چل دیں، اب ہمارا یہ روزمرہ کا معمول بن چکا تھا۔ ہم اکٹھی کام پر آتیں اور واپس بھی اکٹھی ہی جاتی تھیں۔ مجھے وہ کافی دلچسپ اور پیاری لگنے لگی تھی۔

مجھے لانڈری میں کام کرتے ایک ماہ ہونے کو آیا تھا ایک روز میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کی آنکھوں کے گرد قدرے سیاہ حلقے سے نظر پڑے ——— میں نے پوچھا تو وہ بولی، "پچھلی کئی راتوں سے ٹھیک طرح سو نہیں پا رہی ہوں"، میں نے سوچا شاید اس کا اپنے خاوند یا یار سے جھگڑا رہتا ہوگا ——— عابد مجھے ڈینش لڑکے لڑکیوں کے اکثر قصے سناتا رہتا تھا، یہ لوگ ایک دوسرے کے لیے ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے جوتا ——— جب چاہا بدل لیا اور تکلیف دینے لگے تو اٹھا کر پھینک دیا اور نیا لے آئے۔ میں نے مائیبرٹ سے زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا ——— "اپنا دکھ وہی جانتا ہے جو جھیلتا ہے"!

یہاں نے ایک مرتبہ مائیبرٹ کو اپنے گھر مدعو کرنا چاہا تو اس نے مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت دیدی "میں اکیلی رہتی ہوں، تم ایک دن میرے ہاں کیوں نہیں آجاتی ہو؟"

"اچھا تمھاری خواہش اگر یہی ہے تو میں ایک دن ضرور تمھارے ہاں آؤں گی"۔ میں نے اس کی دعوت قبول کرتے ہوئے کہا۔

اس روز جمعہ تھا اور عابد کو فیکٹری کے کام کے بعد شام کو ٹیکسی چلانا تھی۔ میں نے سوچا کل "ویک اینڈ" ہے کیوں نہ گھر جاتے ہوئے آج مائیبرٹ کے ہاں ہوتی جاؤں! ——— دعوت تو اس نے دے ہی رکھی ہے ——— میں نے مائیبرٹ سے بات کی تو اس نے فوراً ہاں کہہ دی، "کیوں نہیں اس سے بہتر اور کیا ہوگا۔"!

کام ختم کرنے کے بعد ہم نے حسب معمول بس پکڑی اور مائیبرٹ کے گھر کی طرف روانہ ہوگئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ چپ چپ سی تھی۔

بس سے اتر کر ہمیں کچھ زیادہ دیر نہیں چلنا پڑا تھا۔ مائیبرٹ کا فلیٹ نیر بروگید میں ایک پرانی عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔ جونہی ہم سیڑھیاں چڑھ کر اس کے فلیٹ میں داخل ہوئیں مائیبرٹ نے بڑے خلوص سے میرا اوور کوٹ اتروا تے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا اور ڈرائنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی، "چلو، بیٹھو، میں پانی گرم کرتی ہوں ——— تم چائے پیو گی یا کافی؟"

"چائے"، میں نے جواب دیا اور آگے بڑھ کر ڈرائنگ روم میں پڑے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

اب جو میں نے کمرے کا جائزہ لیا تو حیران ہو گئی۔ ٹیلی ویژن کے اوپر پڑی ہوئی ایک فریم شدہ رنگین تصویر میں ایک پاکستانی جوڑا دکھائی دے رہا تھا میں اٹھ کر ابھی اسے قریب سے دیکھ ہی رہی تھی کہ مابیرٹ چولہے پر پانی رکھ کر آ گئی ——— "کیا دیکھ رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ارے مابیرٹ! اس تصویر میں شلوار قمیص پہنے ہوئے تو تم ہو؟ ——— سچ بتاؤ یہ موچھوں والا کون ہے؟ ——— ہے نا کوئی پاکستانی؟"

اب تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ سائی کا کوئی یار ہو گا۔

"یہ تھا میرا شوہر ——— اکرم" وہ میرے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیا مطلب تمہارا شوہر تھا؟" میں نے پوچھا۔ مجھے اپنے خاوند عابد کی بتائی ہوئی باتیں یاد آ گئیں۔

"میں تمہیں بتاتی ہوں فاطمہ" اس نے ٹیلی ویژن کے اوپر رکھی ہوئی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ ہماری شادی کے چند دن بعد کی تصویر ہے، جب اسی گھر میں میری ایک سہیلی نے اتاری تھی" باورچی خانے میں چائے کا پانی ابلنے لگا تھا "ابھی آ کر بتاتی ہوں" وہ چائے بنانے کے لیے اٹھتی ہوئی بولی۔

اس نے چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا "کتنی چینی لو گی؟"

"بس ایک چمچ کافی ہے" میں نے کہا۔

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی" مابیرٹ نے چائے میں چینی ملاتے ہوئے کہنا شروع کیا ——— "اکرم اور میں پانچ سال پہلے ایک کلب میں ایک دوسرے سے ملے تھے۔ مجھے وہ رات آج بھی اچھی طرح یاد ہے ——— جب اکرم کلب میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی اپنے لیے وہسکی کا ایک جام خریدا اور بار کے قریب ہی کھڑا ہو کر اس کی چسکیاں لینے لگا ——— میں بھی اپنی ایک سہیلی کے ساتھ وہیں کھڑی تھی۔ ہم بیئر پی رہی تھیں، موسیقی اپنے زوروں پر تھی ——— کلب میں لڑکے لڑکیاں ہر بات سے بے خبر "یہ رات ہماری ہے" کی دھن پر یوں محو رقص تھے کہ گویا انہیں صبح کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی غرض ہی نہیں تھی۔ ——— میری اور اکرم کی جونہی نگاہیں چار ہوئیں اس نے مسکراتے ہوئے مجھے رقص کی دعوت دے دی اور میرے سر کی ہلکی سی اقراری جنبش پر اس نے میری کمر میں اپنا بازو ڈال کر اپنی وہسکی کا گلاس ایک میز پر رکھ دیا اور میرے ساتھ رقص کرنے لگا۔ جب تک موسیقی جاری رہی ہم رقص کرتے رہے اور پھر موسیقی کے وقفے میں ہم ایک میز پر جا بیٹھے۔ ہمارے ساتھ میری سہیلی بھی تھی ——— اکرم نے اپنا تعارف کرایا اس کی باتیں پُرلطف تھیں۔ وہ ہمیں طرح طرح کے مذاق سناتا اور ہنساتا رہا ——— اس نے ہمارے بیئر پینے کو بھی اپنے مذاق کا نشانہ بناتے ہوئے ہمارے لیے بھی وہسکی کا آرڈر دے دیا۔ "اب تم اسکول گرلز تو ہو نہیں!" مجھے اچھی طرح یاد ہے اس نے چیئرز کرتے ہوئے کہا تھا ——— مجھے وہ بہت اچھا لگا اور میرے خیال میں وہ بھی مجھ کافی دلچسپی لے رہا تھا ——— وہ لوہے کے ایک کارخانے میں ملازم تھا لیکن اپنے لباس، بات چیت اور رکھ رکھاؤ کے انداز سے مجھے وہ کسی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ دکھائی دیتا تھا ——— ہم دونوں کو ایک دوسرے کے لیے یوں دلچسپی کا اظہار کرتے دیکھ کر میری سہیلی نے مجھے کہنی ماری اور "تمہارے بھاگ جاگے" کہہ کر اس نے ہم سے رخصت چاہی اسے اپنی بوڑھی ماں کے ہاں جانا تھا

ویسے بھی کلب اب بند ہونے والا تھا ـــــ اکرم اور میں ابھی بیٹھے ہی ہوئے تھے کہ میں نے اپنا جام ختم کرتے ہوتے اس سے اجازت لینا چاہی لیکن اس کے اصرار پر ایک جام اور پینے کے لیے رک گئی اور پھر جب ہم دونوں نے اپنے اپنے جام ختم کیے تو اکرم نے مجھے اپنے ساتھ آنے کی دعوت دے دی۔ میں نے تدرے تکلف کا اظہار کیا تو میرے ساتھ میرے ہاں آنے کی تجویز پیش کر دی ـــــ "اس میں تو تمھیں اعتراض نہیں ہوگا؟" اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا ـــــ میں نے قدرے توقف کے بعد اُسے محض چائے کی پیالی کے لیے اپنے ساتھ آنے کی دعوت دے دی۔

"فاطمہ اگر تم بُرا نہ مانو تو میں ایک سگریٹ سُلگا لوں!" مائیبرٹ نے ایک کونے میں پڑی سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس اُٹھاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا "کبھی کبھی یہ بہت تسکین دیتی ہے" اس نے سگریٹ سلگا کر ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی" مائیبرٹ پھر بولی "اکرم کو میں نے چائے کی پیالی کی دعوت دی تھی لیکن مجھے اگلی صبح اسے ناشتا بھی کرانا پڑا۔ ہم نے وہ سارا دن شہر میں اکٹھے گھومتے گزارا اور پھر شام کو اگلے "ویک اینڈ" کے دوران اسی کلب میں ملنے کا وعدہ کر کے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا ـــــ ہماری ویک اینڈ کی ملاقاتوں کا سلسلہ کوئی دو تین ماہ جاری رہا۔ اس دوران میں کبھی میں اور کبھی اکرم ایک دوسرے کے ہاں آتے جاتے رہے۔ کبھی وہ میرے ہاں رات بسر کرتا تو کبھی میں صبح سویرے اس کے ہاں بستر کی سلوٹیں ٹھیک کر رہی ہوتی۔ وقت بڑی خوش اسلوبی سے گزر رہا تھا ـــــ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے" مائیبرٹ نے اپنی بات سناتے ہوئے غالباً پہلی بار چائے کی چسکی لی تھی جبکہ میں اپنی چائے کی پیالی کبھی کی خالی کر چکی تھی ـــــ اس نے میری پیالی میں چائے ڈالتے ہوئے پوچھا کہ اگر مجھے بھوک لگ رہی ہو تو وہ کچھ سینڈوچ بنا لے۔

"نہیں کھانے کی اتنی جلدی بھی کیا ہے" میں نے چائے میں چینی ملاتے ہوئے اسے اپنی بات جاری رکھنے کو کہا۔

"ہاں! ایک دن اکرم نے مجھے اپنے ساتھ شادی کرنے کی دعوت دے دی۔ میں نے اس بارے میں کچھ سوچنے کے لیے اس سے مہلت مانگی تو وہ مان گیا ـــــ اس عرصے میں وہ میرے گھر پر کئی مرتبہ میری ماں سے بھی مل چکا تھا۔ میرا باپ میرے بچپن میں ہی اگرچہ میری ماں کو چھوڑ گیا ہوا تھا لیکن وہ زندگی بھر مجھ سے پیار کرتا رہا ـــــ اس کی موت بھی ایک عجیب پُردرد کہانی ہے۔ بچارا ہر وقت نشے میں دُھت رہتا تھا۔ اگرچہ اس نے ایک اور عورت کے ساتھ رہنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اسے اس بات کا ـــــ دُکھ سرطان کی طرح کھاتا رہا کہ میری ماں نے اسے گھر سے کیوں نکال دیا تھا۔ ہاں تو میں تمھیں اکرم کے بارے میں بتا رہی تھی" مائیبرٹ نے ایک سگریٹ اور سُلگائی اور ..... دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے بولی "اکرم کی طرف سے اب شادی کا اصرار بڑھنے لگا تھا اور اس نے یہ بھی تجویز پیش کر دی کہ ہم دونوں اکٹھے ہی ایک مکان میں کیوں نہ رہیں ـــــ اکرم نے ویسٹر برو کے علاقے میں ایک کمرہ کرایے کا لے رکھا تھا اور میرے پاس یہی فلیٹ تھا ـــــ جس میں میں اب رہ رہی ہوں۔ ایک ساتھ رہنے والی اکرم کی بات میں نے مان لی اور وہ میرے ہاں منتقل ہو گیا۔ دن میں وہ اپنے کام پر چلا جاتا اور میں اپنے کالج ـــــ ہمارا وقت اچھا گزر

رہا تھا ـــــ ویک اینڈ میں ہم شہر گھومنے چلے جاتے اور جمعہ و ہفتہ کی راتیں مختلف کلبوں میں رنگ رلیاں مناتے"
مائیبرٹ اب مسلسل بولے جا رہی تھی اور مجھے یوں لگا کہ وہ اپنی کہانی سنانے کے لیے بے چین ہے
ورنہ اپنی داستانِ حیات کے اظہار کا آج ہی موقع ملا ہے۔ خود میری دلچسپی بھی تجسس کی حد تک بڑھ گئی تھی۔

"اکرم مجھے پاکستان میں اپنے خاندان کے متعلق بتاتا رہتا تھا میرے خیال میں وہ ایک اچھے گھرانے
سے تھا وہ خود بھی تو یہی کہا کرتا تھا اس کا باپ ایک جاگیردار تھا اور ماں کو گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی اس
کے دو بھائی اور ایک بہن بھی تھی۔ وہ سب سے چھوٹا تھا ـــــ ایک دن میری ماں ہمارے گھر آئی تو
باتوں باتوں میں اس نے بھی ہمیں شادی کر لینے کی ترغیب دینی شروع کر دی اب تو اکرم اور مچل گیا۔ میں
بھی کالج میں اپنے امتحان سے فارغ ہو چکی تھی۔ ہم نے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر ایک اتوار
کے روز اکرم، میں، میری ماں اور میری چند جاننے والی کالج کی سہیلیاں گرجا گھر آ پہنچ گئیں جہاں پادری
نے اکرم کو اور مجھے میاں بیوی کے بندھن میں باندھتے ہوئے ایک دوسرے پر قانونی ازدواجی حقوق
دے دیے۔ ہم نے اس کے سامنے ایک دوسرے سے زندگی بھر وفا اور پیار کرنے کا عہد کیا اور
ہنسی خوشی واپس گھر آ گئے"۔ مائیبرٹ کہتے کہتے رک گئی "دیکھو فاطمہ مجھے اب بھوک لگ رہی ہے تم پہلے
ایک ایک سینڈوچ کھا لیں ـــــ باقی قصہ پھر سناتی ہوں ـــــ کہیں تم بور تو نہیں ہو رہی ہو؟"
وہ اٹھی اور فریج میں سے سینڈوچ نکال کر گرم کرنے لگی۔ "سنو مائیبرٹ! میرے لیے کھانا نہ بنانا۔
میں گھر جا کر کھاؤں گی۔ عابد بھی آج لیٹ آئے گا۔ وہ ٹیکسی چلا رہا ہے اور پھر مجھے ابھی کوئی خاص بھوک
نہیں ہے"۔ میں نے کہا۔ اتنی دیر میں وہ سینڈوچ گرم بھی کر چکی تھی ـــــ "ہاں تو سنو!" اس نے
سینڈوچ کا نوالہ لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"شادی سے پہلے جتنا بھی عرصہ میں اکرم کے ساتھ رہی میں مانع حمل گولیاں استعمال کرتی رہی لیکن
ـــــ پھر اکرم ہی کے کہنے پر ان کا استعمال ترک کر دیا ہم دونوں ہی کو "والدین" بننے کی بڑی خواہش
تھی جو ہماری شادی کے ٹھیک دس ماہ ـــــ بعد پوری ہو گئی ـــــ وہ کرسمس کی رات تھی۔ شہر میں
چراغاں کا سماں تھا۔ لوگوں نے اپنے اپنے گھروں میں رنگ برنگے قمقمے اور موم بتیاں روشن کر رکھی تھیں اور
گرجا گھروں میں خصوصی عبادت کے لیے گھڑیال بج رہے تھے۔ ایک بجے کے قریب مجھے بچے کی پیدائش کے
آثار محسوس ہونے لگے میں نے اکرم کو بتایا تو وہ ایک طرح سے اچھل پڑا ـــــ "میرے دیس پاکستان
کا بانی محمد علی جناح بھی تو آج ہی کے روز پیدا ہوا تھا"۔ اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا تھا
وہ یہ بھول ہی گیا تھا کہ آج عیسیٰ مسیح کا جنم دن تھا۔ اکرم کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ ہم نے ٹیکسی منگوائی اور
ہسپتال کے لیے روانہ ہو گئے ـــــ نورِ سحر کی نمود کے ساتھ ہی میں نے ایک بچی کو جنم دیا اور اکرم جب
اسے دیکھنے کے لیے میرے کمرے میں آیا تو میں نے اپنے پہلو میں پڑی ہوئی بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
اسے باپ بن جانے پر مبارک باد دی "ہم اس کا نام مریم رکھیں گے"۔ میں نے کہا "یہ عیسیٰ ابنِ مریم
ہی کا تو جنم دن ہے وہ کچھ لمحوں کے لیے خاموش رہا اور پھر بولا" ہاں مریم خوبصورت نام ہے"۔ میں نے محسوس
کیا کہ وہ کچھ اداس سا لگ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے اسے بیٹے کی بڑی خواہش تھی مگر اس میں میرا کیا قصور تھا۔
وہ کچھ گھنٹے میرے پاس رہا اور پھر شام کو جب مجھے ملنے آیا تو اس کے ساتھ ایک مُلّا بھی تھا۔ اس مُلّا نے بچی کے

کان میں کوئی راگ الاپنا شروع کیا وہ ننھی معصوم بلبلا اٹھی میں نے اُن سے پوچھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں تو اکرم نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ ایک اسلامی رسم ہے جو پوری کرنی ضروری ہے۔ مُلّا نے اپنا کام ختم کیا اور ایک طرح سے مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ اکرم یوں تو میرے پاس سارا دن ہسپتال میں رہا لیکن مجھے اس کے چہرے پر خوشی دکھائی نہیں دی تھی جو ایک باپ کے چہرے پر ہونی چاہیے تھی۔"
مابیرٹ اپنی بات سنا رہی تھی اور میز پر پڑا ہوا اس کا دوسرا اسینڈوچ" کبھی کا ٹھنڈا ہو چکا تھا اور میری اپنی بھوک تو کبھی کی مر چکی تھی۔

مابیرٹ نے ایک اور سگریٹ سُلگایا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی "تین دن بعد جب اکرم اور میں مریم کو ساتھ لے کر ہسپتال سے گھر پہنچے تو گھر کا ماحول ہی عجیب تھا — ڈرائنگ روم میں بیئر کی خالی بوتلیں یہاں وہاں بکھری پڑی ہوئی تھیں اور باورچی خانے میں دھونے والے برتنوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اکرم شاید بھانپ گیا تھا" معاف کرنا مابیرٹ" اس نے کہا اور صفائی کرنے میں لگ گیا۔ ننھی مریم کو بستر پر لٹا کر اپنی تھکان کے باوجود میں بھی گھر کی صفائی میں اس کی مدد کرنے لگی — شام ہو گئی تھی ہم نے مل کر کھانا بنایا اور کھانے کے بعد مریم کو دودھ پلانے لگی تو اکرم یہ کہہ کر بستر پر چلا گیا کہ "صبح اسے جلدی کام پر جانا ہے"، میں نے بھی کوئی توجہ نہ دی۔ اب اکرم — اپنے ویک اینڈ کے مشاغل بھول گیا تھا۔ اور میں اس کی اس اچانک تبدیلی پر حیران تھی۔ اکرم نے شام کو دیر سے گھر آنا اور صبح جلدی کام پر جانا ترک کر دیا تھا اور ہاں اس نے اب گھر پر شراب پینا بند کر دیا تھا۔ وہ مُلّا جو اکرم کے ساتھ ایک بار اسپتال آیا تھا کبھی کبھی ہمارے ہاں آتا جاتا رہتا تھا اور ہفتے اور اتوار کے روز تو وہ ہمارے ہاں آ کر یوں گھنٹوں بیٹھا رہتا جیسے اسے واپس ہی نہیں جانا ہوتا تھا وہ اکرم کے ساتھ نہ جانے کیا باتیں کرتا رہتا کہ اس کے جانے کے بعد اکرم نہ صرف اُداس اُداس رہتا بلکہ اکثر بستر پر لیٹا چھت کو گھورتا رہتا۔ اور اگر میں اس کو خوش کرنے کے لیے دل لگی کی کوئی بات بھی کرتی تو وہ مجھ سے اُلجھ جاتا۔ ایک دن کسی بات پر وہ مجھ سے یہاں تک اُلجھ پڑا کہ اس نے مجھے تھپڑ دے مارا۔ مریم اب دو سال کی ہو چکی تھی اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے مریم کو بیچ میں لاتے ہوئے اپنے دل کی بات کہہ دی "مریم کی پرورش اسلامی طریقے سے ہوگی ہم مسلمان ہیں"، گویا وہ فیصلہ کر چکا تھا — "میں نے بات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ میں نہ تو مسیحیت پر یقین رکھتی ہوں، نہ ہی کسی اور مذہب پر اور جس طرح کا وہ خود مسلمان ہے اُسے ایسی مسلمان کہ یہ قرار دینے کا کیا مکمل اختیار ہے۔"

مابیرٹ نے پہلو بدلا اور ٹھنڈی چائے کی چُسکی لیتے ہوئے پھر بولی "ایک شام اکرم نے مجھے ایک دم سے حکم دے دیا کہ کل سے مریم "کنڈر گارٹن" نہیں جائے گی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس شام وہی مُلّا بھی ہمارے ہاں آیا ہوا تھا میں نے اس کے سامنے اکرم کے ساتھ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن دوسری صبح جب میں مریم کو "کنڈر گارٹن" لے جانے کے لیے تیار کرنے لگی تو وہ ایک طرح سے مجھ پر جھپٹ پڑا — "کیا میں نے کل تم سے کہہ دیا تھا کہ مریم "کنڈر گارٹن" نہیں جائے گی" وہ بچی کو میرے ہاتھوں سے چھینتے ہوئے غرّایا —
"لیکن کیوں؟" میں نے بھی ذرا تیز لہجے میں پوچھا تو اس نے مجھے ایک لات جھاڑ دی — "تمہیں وہی کرنا ہے جو میں کہوں گا — تم خود گھر پر اس کی نگہداشت اور پرورش کرو گی — اب اگر تم نے کنڈر گارٹن

طرح سے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ میں نے اس سے پہلے اُسے اس طرح آپے سے باہر ہوتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔" مائیبرٹ کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا۔

"فاطمہ تم بھی سوچتی ہوگی کہ میں کیا قصہ سنانے بیٹھ گئی" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، نہیں مائیبرٹ مجھے بتاؤ پھر کیا ہوا؟" میں نے ایک طرح سے اسے کریدتے ہوئے پوچھا تو وہ بولی۔ "میں اگرچہ مریم کو اس کے بعد کنڈرگارٹن تو نہ بھجا سکی لیکن سوچتی رہی کہ اکرم کو دن بدن کیا ہوتا جا رہا ہے۔ اب اس نے اپنی ملازمت بھی چھوڑ دی تھی اور محض بے روزگاری الاؤنس پر ہمارا گزارا ہو رہا تھا۔ اب وہ گھر پر ہی رہنے لگا تھا۔ بات بات پر الجھنا اور جھگڑے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دینا اب اس کی عادت بنتی جا رہی تھی۔ میں نے پاکستانی کھانا بنانا بھی اسی سے سیکھا تھا۔ وہی کھانے جو اسے بہت پسند تھے اب وہ ان میں نقص نکالا کرتا تھا ـــ میرے لیے یہ ماحول سوائے گھٹن کے اور کچھ بھی نہیں رہا تھا ـــ میں اگر مریم کو ساتھ لے کر کبھی باہر جانے لگتی تو وہ منع کر دیتا یا پھر خود بھی ساتھ ہو لیتا۔ وہ مریم کو کسی طرح خود سے دور نہیں ہونے دیتا تھا اور بے شک اسے بہت پیار کرنے لگا تھا۔ اب وہ اردو کے بھی کچھ جملے بولنے لگی تھی اور اکرم کو اس بات کی بہت خوشی تھی۔" مائیبرٹ اب مسلسل بولتی جا رہی تھی اور میں بت سی بنی سنتی جا رہی تھی۔ ہم دونوں ہی چائے اور کھانا بھول چکی تھیں ہاں مائیبرٹ اب سگریٹ پہ سگریٹ پھونکے جا رہی تھی۔ "اکرم کے ساتھ اگرچہ میری گزر بسر مشکل ہوتی جا رہی تھی لیکن میں پھر بھی کوشش کرتی رہی کہ کسی طرح ہمارے پیار کے گزرے ہوئے دن لوٹ آئیں۔ مجھے یہ بھی ڈر رہتا تھا کہ اکرم نہ جانے کب میرے پیار کے اظہار کو بھی غلط سمجھ لے ـــ وہ مُلّا اب اگرچہ ہمارے ہاں تو کبھی کبھار ہی آتا تھا لیکن اکرم اسے دن میں کم از کم ایک بار ضرور فون کیا کرتا تھا ـــ ایک بار وہ آیا تو اکرم نے زور دیتے ہوئے اُسے رات کے لیے بھی ٹھہرا لیا ـــ مجھے اس سے کچھ نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ اکرم سے باتیں کرتا ہوا مریم کو گود میں لے لیتا اور کنکھیوں سے مجھے دیکھتا رہتا ـــ وہ اس رات تو ہمارے ہاں رہا لیکن صبح سویرے ہی ناشتا کیے بغیر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد اکرم مجھ پر برس پڑا کہ میں دیر تک سوتی رہی اور "معزز مہمان ناشتا کیے بغیر چلا گیا ـــ میرا کہنا تھا کہ میں سوئی تو کب تھی جو بیدار ہوتی۔ وہی چند منٹ اور صبر نہ کر سکا اور چلتا بنا" اسی روز اکرم، مریم کو ساتھ لے کر باہر جانے لگا تو میں پوچھ بیٹھی وہ کہاں جا رہا ہے اس نے کوئی جواب دیے بغیر مریم کو ساتھ لیا اور چلا گیا ـــ وہ دونوں شام کو واپس گھر آئے تو میں نے اکرم سے پوچھا کہ وہ کہاں تھے مجھے ننھی مریم پر ترس آ رہا تھا اور فاطمہ، سچ پوچھو تو پہلی بار میرے دل میں اکرم کے لیے بھی نفرت پھوٹ پڑی تھی ـــ "میں ذرا پاکستانی سفارت چلا گیا تھا" اس نے بتایا ـــ "مجھے اپنے پاسپورٹ کے سلسلے میں کام تھا" میں نے کچھ زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور اب بات اِدھر اُدھر ہو گئی"

مائیبرٹ نے پیکٹ سے سگریٹ نکالا اور اُسے سلگانے لگی میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ سگریٹ سلگا کر اس نے ایک لمبا کش لیا اور بولی "ایک دن میری ماں نے مجھے فون کیا ـــ وہ بڑی سخت بیمار تھی اور مجھے ملنا چاہتی تھی میں نے اکرم سے بات کی اس نے مجھے ماں کے ہاں جانے کا مشورہ دیا ـــ میری ماں ہسنگور میں رہتی تھی ـــ میں نے مریم کو بھی ساتھ لے جانا چاہا تو اکرم نے یہ کہہ کر "ماں کی تیمارداری کرو گی یا مریم کو سنبھالو گی" مریم کو میرے ساتھ جانے سے روک دیا۔ جب اسے

راضی کرنا ممکن نہ رہا تو میں اکیلی ہی ماں کے پاس چلی گئی ـــــ مجھے دیکھ کر وہ خوش تو ہوئی لیکن اُسے افسوس تھا کہ مریم کیوں ساتھ نہیں آئی تھی ـــــ میری ماں کافی کمزور تھی اور بستر سے اٹھنے میں بھی اُسے مشکل کا سامنا ہوتا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کیا میں رات اسی کے ہاں ٹھہر سکوں گی؟ ـــــ میں نے اکرم کو فون کر کے ماں کی خواہش کے بارے میں بتایا تو اس نے فوراً ہی اجازت دے دی" تمہیں ماں کی دیکھ بھال کرنی ہی چاہیے ـــــ مریم کا فکر نہ کرو ـــــ میں اس کا خوب خیال رکھوں گا ـــــ اور ہاں دیکھو کل ویک اینڈ ہے اور ویسے بھی ہمیں کچھ کرنا تو ہے نہیں ـــــ تم ہفتہ اور اتوار وہیں ماں کے پاس رہو ـــــ اتوار کی شام کو واپس آجانا" ـــــ وہ بہت ہی مہربان لگ رہا تھا اور اس کی آواز میں ایک غیر معمولی مٹھاس بھی تھی میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اسے مریم کا خیال رکھنے کو کہتے ہوئے خود اتوار کی شام واپس لوٹ آنے کا بتایا ـــــ فاطمہ، یہ میری بدقسمتی اور بردباری کا فیصلہ تھا ـــــ کاش میں ماں کے پاس نہ رکتی" یہ کہتے ہوئے مائیرٹ کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے ـــــ "اتوار کے روز میں نے اکرم کو فون کر کے بتانا چاہا کہ میں واپس گھر آرہی ہوں لیکن جب میں نے فون کیا تو وہاں کوئی جواب دینے والا نہیں تھا ـــــ میں نے سمجھا، باپ بیٹی کہیں باہر گئے ہوئے ہوں گے، میں نے اپنی ماں کو خدا حافظ کہا اور ریل گاڑی پکڑ کر واپس گھر آگئی ـــــ دروازے پر گھنٹی بجائی تو بھی کوئی جواب نہیں تھا ـــــ میں نے دروازہ کھولا اور گھر میں داخل جو ہوئی تو وہاں کا نقشا دیکھ کر میرے ہاتھ پانو کانپنے لگے ـــــ پورے گھر میں سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا ـــــ ننھی مریم کا کمرہ تو یوں لگ رہا تھا گویا وہاں چور صفائی کر گئے تھے ـــــ میں پاگلوں کی طرح اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور اکرم و مریم کی واپسی کا انتظار کرنے لگی میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں! پولیس کو فون کروں یا نہ کروں؟ ابھی کوئی دس پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ دروازے پر گھنٹی بجی میں نے سمجھا اکرم اور مریم ہوں گے ـــــ دیوانہ وار آگے بڑھ کر میں نے دروازہ جو کھولا تو میرے سامنے وہی مُلّا کھڑا تھا جو اکرم کے پاس آتا رہتا تھا ـــــ اس کی صورت دیکھتے ہی میں نے اُسے اندر نہ بلانے کا فیصلہ کر لیا تھا ـــــ "اکرم گھر پر نہیں ہے" میں نے اُسے بتایا ـــــ "ہاں مجھے معلوم ہے" وہ بولا "میں تمہیں یہی تو بتلانے آیا ہوں کہ اکرم اور مریم کل ہفتے کے روز پاکستان چلے گئے تھے"۔ میرے پانو تلے سے زمین کھسک رہی تھی اور میں ایک طرح سے چکرا کر دروازے کی دہلیز سے لگ گئی تھی۔ "اچھا میں چلتا ہوں" اس نے کہا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے یہ پوچھتی کہ مجھے بتائے بغیر اکرم مریم کو ساتھ لے کر کیسے چلا گیا اس نے یہ سب کچھ کیوں کیا" ـــــ لیکن مجھے یہ سب پوچھنے کا موقع ہی نہ ملا ـــــ وہ مُلّا تیزی سے سیڑھیاں اتر کر جا بھی چکا تھا" ـــــ فاطمہ اما یئرٹ نے رکتی ہوئی سانس اور بڑھتی ہوئی ہچکیوں کے ساتھ مجھے مخاطب کرتے ہوئے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا ـــــ "مریم کو مجھ سے جدا ہوتے دو سال ہونے کو آئے ہیں" میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ برف کی مانند ٹھنڈے تھے ایش ٹرے میں پڑا ہوا اس کا ٹکڑا ویسے ہی دھواں دے رہا تھا ـــــ "میں نے اکرم اور مریم کو تلاش کرنے میں اپنی ہر ممکن کوشش کر دیکھی ہے وہ لاہور کا رہنے والا تھا میں ایک مرتبہ لاہور بھی جا چکی ہوں وہاں نہ تو پولیس نے میری مدد کی اور نہ ہی کسی اور نے میں دفتروں، پولیس کے تھانوں اور گلیوں میں مہینے بھر خوار ہو کر واپس آگئی ـــــ اکرم جاتے ہوئے اپنے تمام نشان مٹا گیا تھا اور وہ تصویر جو ٹیلی ویژن کے ساتھ پڑی ہوئی دیکھ رہی ہو ـــــ بس یہی ایک باقی ہے ـــــ یہ سونے کے کمرے میں الماری کے اوپر دھری رہتی تھی

توصیف چغتائی
ایم-۳/ایم- وائی اسکوائر
بلاک جی، نظام آباد، کراچی۔

شامِ غم

پیسا کتنی اچھی چیز ہے جو ہماری محبتوں، خواہشوں اور رشتوں کو استوار کرتا ہے ـــــ اور پیسا کتنی بُری چیز ہے، جو ہماری محبتوں، رفاقتوں، خونی رشتوں تک کو لمحے بھر میں کچے دھاگوں کی طرح توڑ ڈالتا ہے ـــــ

زندگی سدا سے ایسی ہی ہے اور سدا ایسی ہی رہے گی ـ ایک اہم واقعہ مجھے اچانک میرے ماضی کی جانب ڈھکیلتا ہے ـــ مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میں پُل صراط پر چلتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں ـ

چالیس سال پہلے کی ایک اُداس شام ـــ جو میری زندگی کی سب سے زیادہ اذیت ناک شام تھی ـ اس اُداس شام میں میرا دم گھٹتا جا رہا تھا اور میرے داخلی احساسات نے اس شام کو اور بھی گہرا اور اُداس بنا دیا تھا ـــ

نینا میری پہلی اور آخری محبت ـــــ میرے سامنے بیٹھی ہوئی تھی ـ اس شام میں نے اخلاقی جرأت سے کام لیتے ہوئے اس سے پوچھا تھا ـ نینا! آپ کا میرے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے میرے سوال کا کچھ اس طرح جواب دیا جیسے وہ صدیوں سے میرے اس سوال کا جواب دینے کے لیے بے چین سی ہو ـــــ " ہم اچھے دوست ہیں اور زندگی بھر شاید رہیں ـــ مگر شادی کا معاملہ ذرا مختلف ہے ـ ہاں! اگر آپ کا کیریئر اچھا ہوتا تو سب ٹھیک تھا ـ!"

کیریئر! کیریئر!! میں اس کا جواب سن کر ڈوب گیا ـ وہ میری پہلی محبت تھی ـ پہلی محبت جو سورج کی پہلی کرن کے مانند لطیف ہوتی ہے اور شفق کی طرح خوبصورت ـــ میں اچانک ٹوٹ ٹوٹ کر ـــــ بکھر گیا ـــــ

وہ اُداس شام مجھے آج بھی یاد ہے اور تمام زندگی یاد رہے گی ـــ ایک لمحہ میں ٹوٹ کر بکھر جانا بھی کتنی اذیت ناک بات ہے ـ زندگی کا ہر راستہ میرے لیے پُل صراط بن گیا اور پُل صراط پر چلتے چلتے چالیس سال بیت گئے ـــــ

چالیس سال بعد آج بھی وہ اُداس شام میرے ایوان کی دہلیز پر اٹکی ہوئی ہے ـ میں اپنے آپ کو کتنا حقیر محسوس کرتا ہوں ـ کبھی کبھی یوں ہی ہوتا ہے ـ زندگی کی ایک چھوٹی سی تلخ حقیقت ـ ایک چھوٹی سی سچائی ـ انسان کو حقیر بنا کر وقت کے پاتال میں پھینک دیتی ہے ـ ہمارے رشتے، رفاقتیں

محبتیں آن کی آن میں لوٹ جاتی ہیں ۔ زندگی سدا سے شاید یوں ہی ہے اور سدا یوں ہی رہے گی اور خواہشوں کے مارے لوگ یوں ہی سدا حقیر ہوتے رہیں گے ۔ کیا یہ قانونِ قدرت ہے؟

جس طرح ہارا ہوا جواری امید کو محسوس کرتے ہوئے آخری داؤ کھیلتا ہے بالکل اسی طرح میں نے بھی اپنے سارے وجود کو یکجا کیا اور زندگی کی رونقوں میں مدغم ہو گیا ۔ شادی بھی ہوئی اور دو بچے بھی ہوئے ۔ بچوں کو پا کر میں خود کو بھول بیٹھا ۔ میری شدید خواہش رہی کہ میں جن محرومیوں سے گذرا ہوں انھیں میرے بچے محسوس بھی نہ کر سکیں ۔ میں اپنے بیوی بچوں کو خوش دیکھنا چاہتا تھا ۔ میں نے زندگی بھر پوری دیانتداری اور محنت کے ساتھ جو کچھ بھی کمایا اس سے ان کے لیے دنیا کی ہر اس آرائش کو خریدنا چاہا جو ایک خاندان کو خود اعتمادی عطا کرتی ہے ۔

میرا بڑا بیٹا انجم ایم ۔ بی ۔ اے کے آخری سال میں ہے ۔ ایم ۔ بی ۔ اے کرنے کے بعد یقیناً اسے اچھی نوکری مل جائے گی ۔ میرا فرض پورا ہو جائے گا ۔ یہ سوچ کر میں اپنے آپ میں مگن ہو جاتا ہوں ۔

انجم میرا بڑا بیٹا ہے ۔ تندرست اور نہایت ہی خوبصورت ، انسان کا خوبصورت ہونا بھی کتنی شاندار بات ہے ۔ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اگر ذہانت بھی مل جائے تو سونے پر سہاگا ۔ کچھ دنوں سے میں اور میری بیوی محسوس کر رہے ہیں کہ انجم کی زندگی میں وہ ترتیب نہیں رہی جو ایک طالب علم کو بہت اچھا طالب علم بناتی ہے ۔

میری بیوی کئی دنوں سے اشاروں کنایوں میں مجھے کچھ کہنا چاہتی ہے ۔ عورتیں بہت دوراندیش ہوتی ہیں آنے والے طوفانوں کو خوشبو کی طرح محسوس کر لیتی ہیں ۔ میرے قدم اچانک انجم کے کمرے کی جانب اٹھ جاتے ہیں ۔ دروازہ بند ہے ۔ میں آہستہ سے دروازہ کھولتا ہوں ۔ مجھے کچھ سوجھائی نہیں دیتا ۔ میں لائٹ آن کرتا ہوں ۔ انجم دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے ۔ آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے ۔ انجم ! میں اسے پکارتا ہوں ۔

”جی بابا“ اس کی آواز بڑی گمبھیر ہے اور آنکھیں سوجی سوجی سی ۔

”تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا بیٹا؟“ میں اس کے جلتے ہوئے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتا ہوں ۔

”ہاں !“ — وہ ایک گہری آہ کھینچ کر رک جاتا ہے ۔ ایک گہری آہ کھینچتا ہے ۔ پھر جذبات میں بہہ جاتا ہے ۔ بابا مجھے تنہا چھوڑ دیجیے ۔ میں بکھر رہا ہوں ۔“ مجھے اچانک محسوس ہوتا ہے جیسے یہ میری اپنی آواز ہے — لیکن — کیا بات ہے بیٹا ۔ تم پریشان کیوں ہو ۔ ؟

میری بات کو نظرانداز کرتے ہوئے وہ مجھ سے پوچھتا ہے ۔ زندگی میں پیسے کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے بابا ۔ انسان اس کے آگے اتنا بے بس کیوں ہو جاتا ہے ؟ ۔ اور اگر پیسا ہی سب کچھ ہے تو پھر آپ نے ہمارے لیے کیا کیا ۔ ؟ زندگی بھر آپ کیا کرتے رہے ؟ اچانک اس کے منہ سے سب کچھ سن کر گھبرا جاتا ہوں ۔ پھر اپنے آپ کو قابو میں کرتے ہوئے اسے سمجھاتا ہوں ۔ بیٹا ! ایسا نہیں سوچتے ۔ پیسا زندگی کی ضرورت ہے لیکن اتنا بھی اہم نہیں کہ اس کے بغیر زندگی نہ گزاری جا سکے ۔ میں نے زندگی بھر محنت اور ایمانداری کے ساتھ جو کچھ بھی کمایا وہ تم ...

ہی لیے تو ہے۔ تمہاری اچھی طرح پرورش کی، اچھی تعلیم دلائی۔ تاکہ تم مستقبل میں اچھی زندگی گزار سکو۔"

وہ میری باتیں نظر انداز کرتے ہوئے اور بھی جذباتی ہو جاتا ہے۔"یہ چھوٹا سا گھر، سیکنڈ ہینڈ گاڑی، الماریوں میں بھری ہوئی کتابیں۔ اور بس۔ آپ کے یہاں تمام چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ مگر آج معمولی سے معمولی انسان کے پاس ان سب چیزوں سے بہت زیادہ ہے۔ معاشرے میں ہم رہتے ہیں۔ وہاں کچھ لوگ ایک دن میں ہزاروں روپے کا پٹرول پھونک دیتے ہیں۔ ہزاروں روپے کا کسی اچھے ہوٹل میں ڈنر کر لیتے ہیں ___ اور ہم ___ ہم کتنے حقیر بابا ___ ہم تمام دن محنت کی اذیتیں جھیلنے کے بعد بھی یہ سب کچھ نہیں کر سکتے ___ یہ کیسا انصاف ہے۔ ہم جو محنت کی سختیوں کو کھلے دل سے جھیلتے ہیں اور مقدر سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں ___ لوگوں کو ہمارا معاشرہ وہ عزت بھی دینے کو تیار نہیں جو ہمارا حق ہے۔ انسان، انسان کی اتنا حقیر کیوں ہو جاتا ہے بابا۔ آخر کیوں؟ نہیں بیٹا ___ نہیں ___ انسان کبھی حقیر نہیں ہوتا۔ تو خدا کا نائب ہے، پھر وہ کیسے حقیر ہو سکتا ہے؟

انجم اور بھی جذباتی ہو جاتا ہے۔ وہ پھر۔ پھر امینہ کے ڈیڈی نے مجھے اپنے گھر بلا کر حیثیت کیوں یاد دلائی۔ مجھے کیوں بے عزت کیا؟ آخر میرا قصور کیا تھا۔ میں بھی اسی معاشرے کا رہوں ___ وہ میری کلاس فیلو ہے۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ باباکیا دولت پیسا اتنی بڑی چیز ہے کہ اس کے بنا انسان حقیر ہو جاتا ہے ___ بس ___ میں امینہ سے محبت کرتا ہوں۔ وہ مجھے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔ اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں ٹوٹ جاؤں گا بابا ___ میں مر جاؤں گا ___ وہ جذباتی ہو کر سسکنے لگتا ہے۔

___ زندگی سدا سے ایسی ہے بیٹا اور شاید سدا ایسی ہی رہے گی۔ تم مایوس نہ ہو معاشرے کی اخلاقی قدریں ایک نہ ایک دن ضرور بدلیں گی۔

مجھے یاد نہیں کہ انجم کو میں نے اپنے سینے سے لگا کر اسے کس طرح سمجھانے کی کوشش کی اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کیا کہا۔ بس مجھے تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں ہمیشہ سے جھوجھ رہا ہوں اور یہ کہ چالیس سال پہلے والی شام اچانک اس کمرے میں اتر آئی ہے ___ میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ پھر اچانک مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ___ جیسے میرا وجود ایک بار پھر ریزہ ریزہ ہو کر کمرے کے فرش پر بکھر گیا ہو ___!

قیصر اقبال لکھنیاوی (افسانہ)
ماڈل کالجیٹ اسکول، مونگیر (بہار)

آزاد بستی

اس نے شاخ سے اُتر کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے درخت کے گرد ایک چکّر
یا۔ پو پھٹ چکی تھی اور ہر سو اُم جالا پھیلنے کے آثار نمایاں تھے۔ دو چار بار کو کنے کے بعد
نے تقریباً تمام چڑیوں کو بیدار کر دیا اور پھر ہر شاخ سے چہکنے کی آواز آنے لگی۔ دیکھتے
دیکھتے وہ اُڑی اور چڑیوں کا پورا غول اس کی تقلید میں اڑ گیا۔ سب کے سب ایک
سمت میں پرواز کر رہے تھے۔ اس غول میں ایک ہی ذات کی چڑیاں نہیں تھیں۔
توتا، مینا، پپیہا اور کوئل سب ہی شریک سفر تھے ہاں پپیہوں کی تعداد سب سے
ادہ تھی لیکن پرواز کی قیادت اور رہنمائی کوئل کے ہاتھ تھی کیونکہ وہ ملکوں ملکوں سفر
تی رہی تھی۔ تمام پُر خطر گھاٹیوں سے گزر چکی تھی، دیس بدیس کی رنگ برنگی چڑیوں
صحبت میں اس نے بہت کچھ سیکھ رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی کوک نے وقت
تمام آوازوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔ پھلوں کی مٹھاس، پھلوں کی خوشبو، دلول
سوز و گداز، جرس کی گونج سب ہی کچھ تو تھی اس کی آواز میں۔ وہ اپنی آواز کا جادو
گاتی ہوئی اپنے غول کے سارے پرندوں کے عزم اور حوصلوں کو بڑھاتی ہوئی منزل
جانب مائل پرواز تھی۔ جب اس کے ہم سفر پرندے پرواز کرتے کرتے تھک جاتے
وہ ان سب کو لے کر کسی محفوظ مقام پر اُتر جاتی، کچھ دیر دم لیتی، آس پاس کے
انے ڈُنکے چگ کر، درختوں میں لگے موسم کے پھلوں کو چکھ کر پھر وہاں سے اڑان
بھرتی اور اس طرح دو سو میل کی مسافت طے کر کے ایک دن ایک ندی کے کنارے پہنچی
ہاں ندی کے پار اسے ایک بستی نظر آئی۔ اس بستی میں کھیت، کھلیان اور آم کے پیڑ تھے۔
کھیتوں کے بیچ ایک سائن بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا "آزاد بستی"
کوئل نے سائن بورڈ دیکھا، ہم سفر چڑیوں کو دکھلایا۔ سب کو یہ جگہ پسند آئی،
کیوں کہ یہ ایک محفوظ مقام تھا اور یہاں پچھم کی طرف سے آنے والے سفید پرندوں سے
ٹکراؤ کا اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ سارے پرندوں نے ندی کے کنارے بیٹھ کر یہ طے کیا

کہ اب ندی کے اس پار والی آزاد بستی میں مستقل طور پر ڈیرا ڈال دیا جائے۔ آم کے درختوں پر نئے گھونسلے بنائے جائیں اور اس کے لیے یہاں کے کھیت کھلیانوں سے تنکے جمع کیے جائیں اور جب سارے آشیانے تیار ہو جائیں تو ہر نسل اور ہر ذات کی چڑیوں کو اختیار حاصل ہو کر وہ یہاں اپنے اپنے سُروں میں اپنے نغمے گائیں اور اپنی اپنی چال میں پُھدک پُھدک کر درختوں کے پھل کھائیں، کھیت کھلیانوں میں جاکر دانے چگ آئیں اور جب پیاس لگے تو ندی کا پانی پی کر سیراب ہو جائیں۔ چنانچہ صبح کا اُجالا ہوتے ہی سارے پرندے ایک ساتھ پرواز کر کے ندی پار کر گئے اور آزاد بستی کے درختوں پر، کھیتوں میں اور کھلیانوں میں اتر گئے۔

اس نئے مقام کو پا کر سب ہی خوش تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ صدیوں کی محرومیوں اور نامرادیوں کے بعد آج انھیں "آزاد بستی" میں بغیر کسی روک ٹوک کے چرنے، چگنے، پھدکنے اور گانے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ چنانچہ پوری بستی کی فضا طرح طرح کے نغموں سے گونج اُٹھی اور ہر شاخ پر شادمانی اور مسرت کے گیت گائے جا رہے تھے، لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکی کیونکہ کوئل کی کوک جس نے سارے پرندوں کو "آزاد بستی" تک پہنچنے کا عزم اور حوصلہ بخشا تھا، جد وجہد کے طویل سفر میں مسافر پرندوں کے تھکے اور مایوس بازؤں کو عمل کا پیغام دیا تھا، شکستہ دلوں کو محبت اور خلوص کے نغموں سے جوڑا تھا، کبھی توتے مینا کی چہک اور کبھی نالۂ بلبل بن کر ان کے احساسات کو چھوا تھا، اب اس "کوک" کی مقبولیت اتنی بڑھی تھی کہ اس کے سامنے سارے پرندوں کے نغمے پھیکے پڑ گئے تھے۔ گرچہ پپیہے کی "پی" میں بھی اپنی ایک شیرینی تھی، اس کا بھی اپنا ایک مقام تھا، لیکن کوئل کی کوک نے وہ جادو جگایا کہ سارے پرندے اپنے نغموں کو بھول کر اسی کی کوک میں ڈوب گئے اور اسی کی دھن پر چہکنے اور پھدکنے کا لطف لینے لگے۔

پپیہے کو اپنی "پی" کی کم مائیگی کا احساس ستانے لگا۔ اسے یقین تھا کہ کوئل کی کوک کے سامنے اس کی "پی" کوئی قدر و منزلت نہیں پا سکتی اس لیے "آزاد بستی" کے سارے پپیہوں نے مل کر یہ قانون بنایا کہ اس بستی میں بسنے والے سارے پرندوں کو اپنی اپنی آوازوں کے ساتھ پپیہے کی "پی" بھی سیکھنی ہوگی اور بوقت ضرورت پپیہے کی آواز سے آواز ملا کر "پی پی" کی رٹ لگانی ہوگی۔ یہ قانون فوراً ہی نافذ بھی ہو گیا۔ کیوں کہ آزاد بستی میں پپیہوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ بستی کے دکھنی محلوں میں بسنے والے پرندوں نے اس جبریہ قانون کی مخالفت کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔

کوئلوں کی ایک ٹولی اس بستی میں بستے وقت ہی پچھمی کونے میں اپنا ڈیرہ الگ جما چکی تھی اور اس سے پوری بستی کی راہ و رسم تقریباً منقطع تھی اس لیے آزاد بستی میں اب صرف پپیہوں کو ہی ہر طرح کی آزادی حاصل تھی اور بقیہ پرندوں نے بھی

پیہوں کے زور کو محسوس کر کے اپنی بولیوں کے ساتھ "پی" کا بولنا منظور کر لیا ہوا اور ایسا کرنے سے ان کا کچھ زیادہ بگڑا ابھی نہیں تھا، لیکن بے چاری کوئل جو زری بستی میں جہاں تہاں بکھری تھی اور کوئی ایک جگہ بھی اس کی اپنی نہیں ی۔ وہ پپیہوں کے زور کا سب سے زیادہ شکار بنی۔ اس کے کو کنے پر طرح طرح کی بندیاں لگنے لگیں۔ کھیتوں اور کھلیانوں میں اس کا چرنا چگنا مشکل ہو گیا۔ رختوں میں لگے میووں کو پانے کے لیے "پی پی" کی آواز لگانی لازمی قرار ئی۔ کوئلوں کا اپنے انداز میں پھدکنا بھی مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا چنانچہ سلسل محرومیوں اور نامرادیوں سے تنگ آ کر اب کوئلوں کی نئی نسل کو کنے کے بجائے "پی پی" کی آواز لگانے لگی ہے اور اگر بھول سے کبھی کوئل کا کوئی بچہ فطری طور ر کو کنے لگتا ہے تو اس کی اس "کوک" کو پپیہے کی "پی" کا نام دے کر اس کی جان بخشی کرائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر ظ انصاری مرحوم مصوّر شکیل اعجاز

مرتبہ: نعیم الدین رضوی

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

ظ انصاری

پیدائش: سہارن پور ۶ر فروری ۱۹۲۵ء وفات ۳۱ر جنوری ۱۹۹۱ء

چند دن قبل اردو کے ممتاز ادیب ڈاکٹر ظ انصاری کا بمبئی میں انتقال ہو گیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔ ظ انصاری کا آبائی وطن سہارنپور تھا اور اُن کی ابتدائی تعلیم میرٹھ میں ہوئی تھی۔ اگرچہ ان کا بیشتر وقت روس میں گزرا، جہاں انھوں نے ایک طرف روسی زبان وادب سے واقفیت بہم پہنچائی اور علمی کام انجام دیا اور دوسری طرف اردو زبان وادب کی اچھی کتابوں اور ادیبوں سے اہل روس کو روشناس کرایا لیکن انھوں نے بمبئی کو اپنا مستقر بنایا۔ ان کا تعلق بمبئی سے بہت گہرا تھا۔ وہ بمبئی یونی ورسٹی میں روسی زبان وادیب کی تدریس کرتے تھے۔ مہاراشٹر اردو اکاڈمی کے چیرمین کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے۔ روزنامہ "انقلاب" کے مدیر کی حیثیت سے اس میدان میں اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ انھوں نے زبان، ادب اور کلچر کے موضوع پر کئی اہم یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔ ایک مقرر، ادیب اور صحافی کی حیثیت سے ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ افسوس کہ اردو کا یہ البیلا فن کار بھی ہم سے رخصت ہو گیا۔ اس سانحہ پر ذیل میں اردو کے چند ممتاز دانشوروں اور فن کاروں کے تاثرات پیش کیے جاتے ہیں۔

نعیم الدین رضوی

ظ انصاری صاحب سے میرے تعلقات دیرینہ اور بے تکلفانہ تھے۔ اس وقت سے جب وہ مکتبہ جامعہ کے رفیق کار اور جامعہ ملیہ کے میرے دوست محمد یوسف جامعی کے ترقی پسند ماہنامہ "شاہراہ" (دہلی) میں کام کرتے تھے۔ مرحوم کی صحافتی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب ان کی ادارت میں آئینہ نکلا۔ جو ہر لحاظ سے قابل قدر تھا اور بعد میں اردو صحافت کا بہترین اخبار ثابت ہوا۔

میرے اور مرحوم کے مشترک موضوعات میں ایک اہم موضوع ابوالکلامیات تھا۔ ان کی نظر میں مولانا آزاد کی جامع مسجد والی تقریر فرضی تھی اور پاکستان کے ایک ممتاز صحافی اور مولانا آزاد کے پرجوش عقیدت مند شورش کاشمیری مرحوم کے ذہن کی پیداوار تھی اور میرے نزدیک وہ حقیقی معنی میں مولانا کی تھی اس مسئلے پر ان سے یوپی اردو اکادمی کے مولانا آزاد سیمینار منعقدہ جون ۱۹۸۹ء میں تفصیل سے گفتگو ہوئی جب ہم دونوں اتفاق سے ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں مقیم تھے۔ مرحوم کی آخری کتاب "مولانا آزاد کا ذہنی سفر" دیکھی تو مجھے بے حد پسند آئی اور میں نے اپنے ایک مضمون میں اس کے بارے میں لکھا کہ ابوالکلامیات میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔

عبداللطیف اعظمی

ظ۔ انصاری کی شخصیت ایک ہمہ جہت نگینہ تھی۔ جس کا ہر زاویہ دلآویز تھا۔ انھوں نے بیک وقت ادیب، صحافی اور خطیب کی حیثیت سے اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ ادیب کی حیثیت سے انھوں نے نثر کو ایک نئے ذائقے اور نئی خوشبو سے ہمکنار کیا جس میں سادگی و بے تکلفی، شوخی و طنز اور ایک عجیب انداز کا البیلا پن ہے۔ اسی زبان کو انھوں نے تنقید اور دوسرے سنجیدہ علمی کاموں میں برتا اور انھیں عوام و خواص سب کے لیے قابل قبول بنایا۔ صحافی کی حیثیت سے انھوں نے "آئینہ" اور "انقلاب" ایڈٹ کر کے اپنی سیاسی بصیرت اور ادارتی سلیقہ مندی کا ثبوت دیا۔ انھوں نے اس میدان میں ادبی صحافت کو خاص طور پر فروغ دیا۔ خطیب کی حیثیت سے انھوں نے ادبی اور تہذیبی موضوعات کو سدا بہار بنایا اور مخاطب کے دل کو موہ لینے کا ہنر ایجاد کیا۔ ظ انصاری نے روسی زبان کے شاہکاروں کا اردو دنیا سے اور اردو شاہ کاروں کا تعارف روسی زبان بولنے والوں سے کرایا۔ اردو زبان و ادب کی مشترکہ تہذیب اور سیکولر جہت کو نمایاں کیا۔ ابوالکلام آزاد اور خسرو پر کام کر کے، انھوں نے اردو کی علمی اور تہذیبی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ ظ انصاری ایک خاص نقطۂ نظر کے حامل تھے مگر خاک دل (از جاں نثار اختر) کے مقدمے سے ان کے نظریے اور انحراف کا پتا چلتا ہے۔ غرض جو بے تکلفی اور سادگی اور البیلا پن ان کی شخصیت کا جوہر تھا، وہی ان کی نثر کا طرۂ امتیاز ہے افسوس یہ ستارہ بھی ڈوب گیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

عنوان چشتی

ظ انصاری کی جیسی اسکالرشپ اور سوجھ بوجھ رکھنے والے ادیب اردو میں بس گنتی

کے ہوئے ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اور علم و ادب کے جس میدان میں بھی قدم رکھا اپنی انوکھی ذہانت اور وسعت علم کا غیر معمولی نقش قائم کیا۔ کیا تحریر، کیا تقریر، ہر معاملے میں وہ اپنے بیشتر معروف معاصرین سے بہت آگے تھے۔ تنقید، تحقیق، صحافت اور ترجمے میں تو ان کی خدمات ایسی ہیں کہ انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان کے انتقال نے جو صدمہ مجھے پہنچایا ہے، شاید بہت دلوں تک اس کا اثر باقی رہے گا۔ یہ ایک تہذیبی سانحہ تو ہے ہی، میرے لیے ایک ذاتی نقصان کی حیثیت بھی رکھتا ہے موت ایسی اندھی کیوں ہوتی ہے۔

شمیم حنفی

ظ انصاری کو ناقد اور صحافی کی حیثیت سے سب مدتوں سے جانتے ہیں مگر جو صفت انھیں ان کے عہد کے مصنفوں سے ممتاز کرتی ہے، وہ ان کا انوکھا، بانکا، دل موہ لینے والا اسلوب نثر ہے۔ ان سے کوئی اختلاف کرے اتفاق، ان کی تحریروں سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حال میں مولانا بوالکلام آزاد پر ان کی تصنیف سے پتا چلتا ے کہ وہ سیاسی، سماجی اور مذہبی تاریخ ر گہری نظر رکھتے تھے اور اگر زندگی وفا کرتی شاید اس میدان میں بھی ان کے قلم سے رمعمولی تصانیف وجود میں آسکتی تھیں۔ نسوس ہے کہ غیر متوقع طور پر ایک جان لیوا رض نے انھیں ہم سے چھین لیا۔ مگر ان کی غ و بہار اور رنگا رنگ ادبی شخصیت کا نش ہم سے چھین لیا۔ مگر ان کی باغ و بہار اور رنگا رنگ ادبی شخصیت کا نقش ہم سب کے دلوں پر ہمیشہ رہے گا۔

صدیق الرحمن قدوائی

ظ انصاری کی موت کے ساتھ ایک بڑی رنگا رنگ شخصیت ہماری محفل سے اٹھ گئی مرحوم ادیب بھی تھے، صحافی بھی، مترجم بھی تھے اور تبصرہ نگار بھی۔ لیکن سب سے بڑی چیز اپنی بات کہنے کا وہ اسلوب تھا جس پر انھوں نے اپنی شخصیت کی مہر لگا دی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں جن چند قلم کاروں کو ہم صاحب طرز نثر نگار کہہ سکتے ہیں ان میں ظ انصاری کا نام بے حد نمایاں تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک مخصوص تہذیب کے پروردہ تھے جسے ہم مشرقی تہذیب کہہ سکتے ہیں لیکن مختلف مغربی ملکوں میں آنے جانے اور سوویت یونین میں رہنے کے بعد انھوں نے مغربی تہذیب کی اعلا قدروں کو بھی اپنی شخصیت میں سمیٹ لیا تھا اور یوں وہ ہمارے ادب کی دنیا میں ایک ایسی شخصیت بن گئے تھے۔ جس میں مشرق و مغرب کا ایک متوازن امتزاج دکھائی دیتا ہے۔

اجمل اجملی

ظ۔ انصاری ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ وہ صحافی تھے اور ادیب بھی محقق تھے اور تنقید نگار بھی۔ انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اسے معراج کو پہنچا دیا اور اسلوب کی نئی جہتیں دریافت کیں۔ انھوں نے صحافی کی حیثیت سے جو اداریے قلم بند کیے وہ آج

بھی معنویت کے حامل ہیں۔ گزشتہ ستمبر میں میری
ان سے آخری ملاقات ہوئی تو وہ زندگی سے
مایوس ہو چکے تھے۔ وہ بھی ماسکو اور لندن
میں زیر علاج رہ کر ہندستان واپس ہوئے
تھے۔ اور اشتراکیت سے منحرف ہو کر اس کے
خلاف تشہیر و تبلیغ میں مصروف تھے۔ ان
کی وفات نے ہم سے ایک صاحب طرز ادیب کو
ہمیشہ کے لیے چھین لیا۔

ظفر احمد نظامی

اردو کی بزم کی شمعیں ایک ایک کر کے
گل ہوتی جا رہی ہیں۔ اور وہ ستون جن پر
اردو ادب اور تاریخ کا قد آور قصر تعمیر کیا
گیا تھا، ایک کے بعد ایک گرتے جا رہے ہیں۔
اور جب بھی ایسی کوئی عظیم شخصیت ہمیں
الوداع کہتی ہے۔ دل کے ایوان میں گم شدہ
شمعوں کی قطار میں ایک اور خاموش شمع
کا اضافہ کر دیتی ہے۔

جناب ظ انصاری مرحوم ایک ایسے ہی
منفرد نقاد، قد آور محقق اور پُر اثر مقرر تھے۔
جن کے بیباک قلم نے سماج کے اس بدگوشت
پر اپنے قلم سے لاتعداد بار جراحی کی ہے جو
صدیوں سے اس دنیا اور اس میں رہنے
والوں کو اپنی بدبو اور تعفن کا شکار بنائے
ہوتے ہے۔ آنے والے زمانے میں جب بھی
اردو ادب کی ایک نئی تاریخ مرتب ہو جائے
گی، ظ انصاری کا نام مؤرخ کو سر فہرست
لکھنا پڑے گا اور وہ یہ رقم کرنے پر مجبور ہوگا
کہ اپنی تمام انسانی کمزوریوں کے باوجود جن
کو لوگ اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے بیان
کر سکتے ہیں۔ ظ انصاری مرحوم کی کوششوں،
کاوشوں اور سرگرم عمل زندگی اور متحرک بیباک
قلم نے اردو ادب میں جو اضافہ کیا ہے وہ گنج
ہائے گرانمایہ سے کم نہیں۔ اور ان کی تحقیق
و تنقید و تخالیق آئندہ آنے والے برسوں
تک سنگِ میل بنی رہیں گی۔

عزیز قریشی

ظ انصاری مرحوم بڑی صلاحیتوں کے انسان
تھے۔ اردو میں کم ہی لوگ ایسے ہیں جن کو
صاحب طرز کہا جا سکے۔ ظ انصاری واقعی
صاحب طرز تھے۔ نثر میں ان کا لکھنے کا
ایک خاص انداز تھا۔ بہت ہی شگفتہ اور
رواں دواں نثر لکھتے تھے۔ ان کی موت سے
جو خلا ہو گیا ہے اس کو پُر کرنا بہت مشکل
ہے۔ مدتوں ہم سب ان کی تحریروں سے
لطف اندوز ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی
ہوتے رہیں گے۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں
تھیں مرنے والے میں۔

غلام ربانی تاباں

ظ انصاری کے سانحۂ ارتحال کی خبر اردو
دنیا کے لیے ایک بہت بری خبر تھی۔ کسی
بھی عالم و ادیب کی موت ایک عہد کی ایک
زمانے کی موت ہوتی ہے مگر ظ انصاری
جیسے تیکھے اسلوب، اور منفرد انداز نگارش
رکھنے والے ادیب کی جگہ تو واقعی کوئی پُر
نہیں کر سکے گا وہ اپنے کاموں اور اپنی
شخصیت کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔
گو وہ عرصے سے بیمار تھے مگر پھر بھی ان کی
موت کی خبر بے حد غیر متوقع تھی۔ مجھے ان
انتقال کا بے حد افسوس ہے۔ صغرا مہدی

ڈاکٹر ظ انصاری کی وفات سے اردو اپنے گھر کے ایک بہت ہی روشن چراغ سے محروم ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر ظ انصاری کی وفات اخلاق حسنہ کے مالک ایک انسان کی وفات ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اردو کے ایک ممتاز نقاد، مستند ادیب، بہترین مترجم معتبر محقق، مقتدر لغت نویس، منفرد صحافی اور اعلا مبصر کی وفات ہے۔

دہلی میں چند مہینے قبل (غالباً اگست ستمبر ۹۰ء) جب ان سے ملاقات ہوئی تھی تو کچھ بجھے بجھے سے لگے، لیکن ان کی اخلاقی رواداری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ظ انصاری کی جو چند کتابیں اس ناچیز نے پڑھی ہیں ان میں پہلی کتاب "کتاب شناسی" تھی۔ تبصرہ نگاری کے فن پر یہ پہلی اہم اور غیر معمولی کتاب تھی جو راقم سطور کے مطالعے میں آئی تھی۔ اسے پڑھ کر انصاری صاحب کے وسیع و عمیق مطالعہ اور ان کے تنقیدی شعور کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ خیال، آئینہ اور انقلاب جیسے اخبار و رسائل کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کی مدیرانہ صلاحیت اور صحافتی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اردو روسی میں دو لغتیں تیار کر کے مرحوم نے ان دو زبانوں کے مخلص خادم ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی دیگر کتابیں بھی بغایت درجہ اہم ہیں۔

اردو اپنے اس قابلِ قدر سپوت اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک کی دائمی جدائی پر جتنا بھی ماتم کرے کم ہے کیونکہ ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

عطا عابدی

عروس البلاد بمبئی سے "گلاس نسٹ اور پیپرے اشٹوتکا" کی غم دیدہ راجدھانی تک غم کی ایک اور لہر پہنچی۔

بتاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۹۱ء کو پروفیسر ظ انصاری کا انتقال ہو گیا۔

ادبی دنیا میں یہ غم کیوں؟ اس لیے کہ اب کسی شہر، کسی محفل میں اس ماتی روپ کا جلوہ نظر نہیں آسکے گا۔ یہ صدمہ معمولی نہیں، لیکن دل کی بیتابیاں وقت میں گم ہو جائیں گی۔ یہ یاد رہے گا کہ ایک طالب علم نے برطانوی سامراج اور طبقاتی نظام کے خلاف مہم جوئی کا فیصلہ کیا تھا۔ اسی لیے "ظ انصاری"، قلمی نام اختیار کیا۔ چند لوگ ہی اس راز سے واقف ہیں۔

زندگی کی آخری سانس تک اس صاحبِ علم، آگاہ و باخبر فن کار نے اردو ادب کی خدمت کی۔ اس کی سرگزشت حیات اور کارنامے، لائبریری میں محفوظ ہیں۔ معاصرین اور نئی نسل اس سے ملاقات کرتی رہے گی۔

ڈاکٹر سیفی پریمی
"نگارستان" ذاکر نگر۔ نئی دہلی ۲۵

ڈاکٹر ظ انصاری اردو کے صف اوّل کے ادیب، نقاد، محقق، فرہنگ نویس اور صحافی تھے۔ مرحوم کو عربی، فارسی، انگریزی، روسی پر قدرت حاصل تھی اور ان کی مادری زبان تھی۔ ظ صاحب کا تعلق سہارن پور کے ایک متوسط طبقے سے تھا۔ خاندان میں دینی تعلیم کا رواج تھا۔ انھیں ایک مکتب میں داخل کر دیا گیا جہاں انھوں نے عربی اور فارسی،

زبانوں پر قدرت حاصل کی۔ دینی تعلیم سے ان کے علم کی پیاس نہیں بجھی۔ انھوں نے جدید تعلیم کا میٹرک کا امتحان دیا۔ اور اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔ اپنے شوق سے پہلے انگریزی اور پھر روسی زبان کا مطالعہ کیا۔ روس سے غالب پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ روسی زبان پر ایسی قدرت حاصل کی کہ روس میں رہ کر روسی اردو اور اردو روسی لغات تیار کیے۔ ان دونوں لغات کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے کہ یہ اعلا ترین کام ہے۔ ظ انصاری مرحوم نے جو کچھ حاصل کیا، اپنی محنت اور شوق سے اور سخت نامساعد حالات میں۔ مولانا آزاد، امیر خسرو، علامہ اقبال اور غالب پر ان کی تصنیفات غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ اور یہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ ظ صاحب اعلا درجے کے مفکر، مدبر اور نقاد تھے۔ وہ دوسرے نقادوں کی رائے سے آسانی سے متاثر نہیں ہوئے۔ اپنی تنقیدی فکر کے سہارے خود نتائج اخذ کرنے کے عادی تھے۔

ڈاکٹر خلیق انجم

ظ انصاری ایک انتہائی باصلاحیت انسان تھے۔ وہ بلا کے ذہین تھے اور ان میں کام کرنے کی بے پناہ قوت اور حوصلہ تھا۔ ان کی علمیت اور لیاقت میں بھی کسی شبہے کی گنجائش نہیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم دینی مدارس میں حاصل کی تھی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ انھیں اردو کے ساتھ عربی اور فارسی زبان پر بھی عبور حاصل ہو گیا۔

زبان کا مزاج اور الفاظ کے تیور وہ خوب پہچانتے تھے۔ وہ انتہائی روشن خیال اور روشن دماغ تھے۔ غرض وہ کلاسیکی اور جدید کا ایک انتہائی تیکھا امتزاج تھے۔ ظ انصاری نے زندگی بھر صرف لکھا اور پڑھا۔ انھوں نے جو کچھ پڑھا اسے رائگاں نہیں جانے دیا۔ اور جو کچھ لکھا وہ وقیع تھا۔ ان کی شخصیت ان کا انداز گفتگو، ان کی طرز تقریر اور ان کا اسلوب نگارش یہ سب اس کلیت کے اجزا ہیں جس کا نام تھا ظ انصاری۔ آج جب ظ انصاری نہیں ہیں۔ انھیں یاد کرکے میر کا یہ مصرع بیساختہ زبان پر آیا ہے

پیدا کہاں ایسے پراگندہ طبع لوگ

ڈاکٹر اسلم پرویز

ظ انصاری ان چوکس، ذہین اور مستعد لوگوں میں تھے جو ہر نوع کے کام سے نہایت حسن و خوبی سے عہدہ برآ ہو پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک صرف اپنا آپ ہونے کے باوجود بہت کچھ معلوم ہوتے تھے نہایت اعلا استاد، بہت ہی باریک بیں محقق، نمایاں نقاد اور بڑے مجبوب مقرر اور اداکار اور آپ جو بھی سوچ لیں۔ ان کی تقریر سنتے ہوئے مجھے اکثر یہ احساس ہوا کہ انھیں کچھ بھی نہ کہنا ہو تو بھی وہ بھی تا دیر سامعین کی دلچسپی اور انہماک کا سماں باندھے رکھتے ہیں اور لہجے میں اتنا ڈراما بھر لیتے ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بہت اہم معلوم ہونے لگتی ہیں۔

ان کے بارے میں سوچتے ہوئے فوری طور پر ان کے کئی تضادات کی طرف بھی

دھیان جاتا ہے۔ مذہب ہو یا ادب یا سیاست اور تو اور نجی رویئے، وہ ایک راہ مستقیم پر کبھی نہ دکھیں گے۔ دیکھیں گے تو بیک وقت کئی راہوں پر، وہ راہیں کتنی ہی متضاد کیوں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ سوچ اور عمل میں وہ نئی زندگی کی پیچیدگی پر عبور حاوی تھے اور ہر کام کو بڑی کامیابی سے انجام دیتے تھے۔

ان کے اس طرح اچانک چلے جانے سے اردو کا چہرا اپنے ایک منفرد ادر کار گزار نمائندے سے محروم ہو گیا ہے۔

جوگندر پال

مادری زبان کے خانہ میں اردو کے بجائے ہندی

عوام کی گرفت آنے پر اہل کار نے اوپر کی ہدایت کا حوالہ دیا

کان پور ۲۰ رفروری مردم شماری کے گزشتہ ۹ رفروری سے شروع ہونے والے دوسرے دور میں دھاندلی اور فرضی کارروائیوں کے شبہات کے ساتھ ساتھ یہ شبہہ بھی قوی ہوتا جا رہا ہے کہ لسانی تعصب کی بنا پر اس کی منظم کوشش کی جا رہی ہے کہ مادری زبان کی حیثیت سے اردو کا تناسب آبادی کے لحاظ سے بڑھنے نہ پائے بلکہ اسے گھٹایا جائے۔

اس مبینہ کوشش کا راز اس وقت کھلا جب گزشتہ سنیچر کو مسلمانوں کی غالب آبادی والے علاقے کنگھی محال میں مردم شماری کا کام کرنے والے ایک ایسے سرکاری اہل کار کو گرفت میں لیا گیا جس نے مکان نمبر ۲/۳/۱۰۰ سے لے کر ۳۹۹/۱۰۰ تک کی مردم شماری کے فارم بھرے تھے لیکن ان فارموں میں مادری زبان کے خانہ ۱۷ اور دوسری دو زبانوں کے خانہ ۱۸ کو خالی چھوڑ دیا تھا۔

مذکورہ سرکاری اہل کار نے جس کا کوڈ نمبر ۷/۳۰/۸/۱/۷/۳۵/۳ ہے۔ اس فرضی کام کے سلسلہ میں بتایا کہ اوپر سے ہدایت ہے کہ موقع پر فارم بھرتے وقت مادری زبان کے خانہ کو چھوڑ دیا جائے اور بعد میں مادری زبان کے خانہ میں ہندی لکھ دیا جائے۔

(بشکریہ قومی زبان ۲۱ رفروری ۹۱ء)

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

غبارِ منزل

شاعر: غلام ربانی تاباںؔ
اشاعت: پہلی بار، نومبر ۱۹۹۰ء
قیمت: ۴۵ روپے
ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
مبصر: عبداللہ ولی بخش قادری

غبارِ منزل میں "سازِ لرزاں" (۱۹۵۰ء) "حدیثِ دل" (۱۹۶۰ء) "ذوق سفر" (۱۹۷۰ء) "نوائے آوارہ" (۱۹۷۶ء) کے انتخاب کے ساتھ غیر مطبوعہ غزلیں بھی شامل ہیں۔ اول الذکر ان کی نظموں کا انتخاب ہے اور دیگر غزلیات پر مشتمل۔ "غبارِ منزل" کا پیش لفظ "دو حرف" تقریباً پانچ سو الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے کہ "میں یوں بھی زود گو نہیں تھا۔ "نوائے آوارہ" کی اشاعت کے بعد یک موضوعی صحافت میں دلچسپی لینے لگا۔ فرقہ پرست اور انتشار پسندوں کے خلاف جد و جہد کے لیے میں نے اپنا قلم وقف کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر تخلیقی عمل پر بھی پڑا۔ ۱۹۷۶ء کے بعد مشکل سے سال میں دو غزلوں کا اوسط رہا۔" اس دوران ان کے انگریزی مضامین کا مجموعہ بھی اسی موضوع پر منظرِ عام پر آچکا ہے اور وہ اپنے "پدم شری" اعزاز سے بھی دست بردار ہو گئے ہیں۔ تاہم اُن کے شعری سرمائے پر "بہ قامت کہتر، بہ قیمت بہتر" والا قول پورے طور پر صادق آتا ہے۔ اس وقت ان کی عمر ستتر سال ہے لیکن اُن کی تازہ غزلیں بھی اُن کے رنگِ سخن کی بھرپور نمائندگی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

تاباںؔ صاحب کی غزل میں ذات اور کائنات دونوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ وہ حدیثِ دل بھی ہے اور حدیثِ دیگراں بھی۔ اس میں کلاسکی دروبست اور رچاؤ کے ساتھ بلندیِ افکار بھی نمایاں ہے اور انسان دوستی کا پیغام بھی۔ اُن کے لہجے میں متانت اور سنجیدگی میں دیانت کے باوصف شگفتگیِ بیان پر ذرا حرف نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے متعدد اشعار قبولِ عام کا شرف حاصل کر کے ضرب المثل کا روپ اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جیسے:

جنابِ شیخ سمجھتے ہیں خوب رندوں کو　　　جنابِ شیخ کو ہم بھی مگر سمجھتے ہیں
تاباں نہ آپ صاحبِ منصب، نہ اہلِ زر　　　آخر کسی حسین کو حضرت سے کیا غرض
ہم بھی رفاقتوں کا خود کو فریب دے لیں　　　کچھ دیر ساتھ رہ کے کچھ دور ساتھ چل کے

ں صاحب کے کلام میں پورے اہتمام شاعرانہ کے ساتھ جا بجا ترقی پسند نظریۂ حیات کی جھلک ملتی ہی ہے لیکن جب کبھی وہ مخصوص معاملات یا واقعات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں تب شعر کا حلیہ یا لہجہ کسی طور مجروح نہیں ہونے پاتا۔ ذرا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے:

وہ ہم سفر بھی نہایت عزیز ہیں تاباں　　　چلے جو ساتھ مگر کارواں سے دور رہے

ہم سفر کون ہیں؟ معاً اُن شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کا دھیان آتا ہے جو کسی وجہ سے اپنے آپ کو "انجمن ترقی پسند مصنفین" سے وابستہ نہ کر سکے مگر اُن کی نیک خواہشات تحریک کے ساتھ رہیں۔ اب ساتھ ہی ساتھ اُن "رفیقانِ سفر" کا بھی ذکر سن لیجیے جو مصلحتِ وقت کا شکار ہو گئے یا اپنی تن آسانی کا:

راہ میں کتنے رفیقانِ سفر چھوٹ گئے　　　دور تک یادِ رفیقانِ سفر ساتھ چلی

طن عزیز کے سیاسی حالات نے شاعر کو برابر متاثر کیا ہے۔ آزادیٔ وطن کے ساتھ ساتھ جو حالات رونما ہوئے، اُن سے ہم سب واقف ہیں۔ سیاسی بحران اور اقدار کی ناقدری سے بھی باخبر ہیں۔ اس کیفیت کا شاعرانہ اظہار دیکھیے:

گلوں کے ساتھ اجل کے پیام بھی آئے　　　بہار آئی تو گلشن میں دام بھی آئے
بڑوں بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے تاباں　　　رہِ حیات میں ایسے مقام بھی آئے

اباں صاحب کی ایک پوری غزل صورتِ حال کے بارے میں اُن کے احساس، فکر اور پیرایۂ بیان کا نہایت موثر اور دلکش اظہار نظر آتی ہے۔ اُس کے تین اشعار ملاحظہ ہوں:

منصوبۂ بہارِ چمن ہو کے رہ گیا　　　سو بار ذکرِ سرو وسمن ہو کے رہ گیا
وہ کاروبار، جبرِ سیاست کہیں جسے　　　معمولِ خسروانِ وطن ہو کے رہ گیا
ایک مسئلہ زباں کا تھا وہ بھی خیر سے　　　تاباں سخن، برائے سخن ہو کے رہ گیا

تاباں صاحب کے اشعار عصری مسائل کا پرتو ہی نہیں پیش کرتے بلکہ وہ ان کے احساس و فکر کا اظہار بھی ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر تسخیرِ خلا اور قمر پیمائی کا معاملہ لے لیجیے۔ سب سے پہلے یہ شعر نظر آتا ہے:

سوادِ شمس و قمر بھی بشر کی منزل ہے　　　ابھی تو پرورشِ بال و پر کی منزل ہے

یہ شعر اس وقت کا ہے جب کہ انسان، افق کے پار کمندیں پھینکنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ لیکن شاعر کی نگاہِ دوررس دیومالا کے پھندے کو گلے سے اترتا ہوا دیکھ لیتی ہے۔ اس لیے وہ دورِ حاضر کے انسان کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوا ملتا ہے:

وہ رہبریٔ جنابِ خضر کی منزل تھی　　　یہ رہنمائیٔ فکرِ بشر کی منزل ہے

اسی مجموعے میں "نذرِ گگارن" کے عنوان سے ایک قطعہ درج ہے جس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

کھلی فضاؤں میں اڑنا ابھی تو سیکھا ہے ابھی نہ جانے کہاں تک یہ تیز پر جائے
یہ معجزہ بھی جنوں نے دکھا دیا تاباں جہاں نظر بھی نہ پہنچے وہاں بشر جائے

تاباں صاحب کی نظم 'چاند اور ہیں' ایسے احساسات کو بڑے دلکش انداز میں پیش کرتی
جہاں چاند کے شاعرانہ تصور اور سائنسی حقائق دونوں کے ساتھ انصاف کیا گیا ہے
غرضیکہ تاباں صاحب کی غزل نہ عصری تقاضوں سے منہ موڑتی ہے اور نہ
مطالبوں سے۔ بلاشبہہ وہ ہمارے ایک نہایت معتبر اور مستند غزل گو شاعر کی
سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ 'غبارِ منزل' میں ۱۰۶ غزلیں ۲ قطعے اور ۲ نظمیں شامل ہیں
ہوتا اگر ان کی نشاندہی کر دی جاتی کہ کس مجموعے سے انتخاب ہے۔

'غبارِ منزل' اپنے کاغذی پیرہن میں بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ خدا
تاباں صاحب کی 'حدیثِ دل' برابر بیان ہوتی رہے، ان کا ذوقِ سفر یوں ہی جاری
ان کی نوائے آوارہ کی گونج تیز تر ہو اور غبارِ منزل بڑھتا جائے، بڑھتا جائے۔ اس
غزل کی آبرو بڑھے گی اور مشتاقانِ غزل کا ذوق۔

سفر زاد

شاعر: اجمل اجملی
ناشر: صوفیہ پبلشرز، ۶۹ جامعہ نگر، اوکھلا، نئی
قیمت: ۳۵ روپے
مبصر: عبداللہ ولی بخش قادری

اجمل اجملی نے اپنے 'حرفِ آغاز' کی ابتدا یوں کی ہے: "سفرزاد میری ان غز
اور نظموں کا مجموعہ ہے جو اپنے تخلیقی سفر کے دوران اچھے اور برے تجربوں کی دین کی
میں میرے ہاتھ لگی ہیں"۔ ان کی تاریخ پیدائش یکم مارچ ۱۹۳۵ء ہے۔ وہ الہ آباد کے ایک
معزز اور ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے جو جادۂ تصوف و طریقت سے وابستہ تھا اور
و ادب سے آراستہ۔ اور آج بھی الہ آباد والے بالعموم اور اہلِ صدق و صفا بالخصوص ان
بستی 'دائرۂ شاہ اجمل' کا نام ارادت و عقیدت کے ساتھ لیا کرتے ہیں۔ اجمل اجملی کے
شاہ سید احمد علی صاحب مرحوم خانقاہِ اجملیہ کے سجادہ نشین اور اپنے اسلاف کی روایا
و اقدار کا ایک دلکش نمونہ تھے۔ اجمل نے اپنے ورثے اور ماحول کا ذکر اختصار اور
کے ساتھ کیا ہے، صرف اس حد تک کہ پتا چل جائے وہ کیسے گرد و پیش میں پروا
چڑھے۔ ان کے بیان میں حجابِ شرافت کی گرفت کے باوجود ان کی افتادِ طبع کا اند
لگایا جا سکتا ہے اور اس انسان دوست، فضا کا بھی پتا چلتا ہے جس کی نمود ان کی
شخصیت کا خاصہ نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں اپنے اسکول سے لے کر یونی ورسٹی تک کے
سفر میں جن اساتذہ سے وہ متاثر ہوئے ہیں، ان کا ذکر بھی بڑی عقیدت اور سعا
مندی کے ساتھ کیا گیا ہے اور ان احباب کو بھی بڑی محبت سے سراہا ہے جن کے

صحبت کو وہ اپنا سرمایۂ افتخار گردانتے ہیں۔ اُن کا یہ "حرفِ آغاز" خاکہ نگاری کی چابکدستی، خودشناسی کی بالغ نظری اور شستہ وشائستہ نثر کا ایک دلآویز نمونہ پیش کرتا ہے۔

اجمل اجملی کا تخلیقی سفر آج سے تقریباً ۳۰ سال قبل شروع ہوا اور ہنوز جاری ہے جیسا کہ اُنھوں نے خود کہا ہے: "ہم سفر پر جب سے نکلے مڑکے دیکھا ہی نہیں"۔ مگر خانقاہی روش سے ہٹ کر اُنھوں نے ترقی پسندی کی راہوں کو اپنی آماجگاہ بنایا۔ اِس مجموعہ کلام میں ۲۵ نظمیں شامل ہیں جن پر کمیونسٹ تحریک کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ تاہم اُن کے احساسات کی زیریں لے سچی مذہبی اقدار سے سرشار نظر آتی ہے۔ صدق وصفا کا دامن اُن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے۔ وہ حقائق سے نظریں نہیں چُراتے۔ محرومی کا گِلہ بھی روا رکھتے ہیں لیکن مایوسی کا شکار ہرگز نہیں ہوتے۔ ہر حال میں بہار کا اثبات مقدّم گردانتے ہیں۔ مزید برآں اُن کے اشعار میں عصری حسیّت پوری طرح جلوہ گر رہی ہے۔ اُن کے اشعار میں فکری وحدت اور معنی آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔

مجھے جو نظمیں بہت پسند آئیں ان میں زندگی بھی شامل ہے، اس میں زندگی کی اشوہ گری کو ذرا ملاحظہ فرمایئے:

ٹھہر جاؤں تو اشاروں سے بلاتی ہے مجھے — پاس پہنچوں تو بہت دور چلی جاتی ہے

لیکن اِس تھکے ماندے راہرو کی حقیقت نگاری اور حوصلہ بھی قابلِ داد ہے۔

زندگی آج میرے پیر تھکے جاتے ہیں — بجھ چلی خواہشِ تکمیلِ سفر کیا کیجیے
اب بھی جینے کی تمنا میں دھڑکتا ہے یہ دل — اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے
زندگی آج مرے پیر تھکے جاتے ہیں — پھر کسی منزلِ محکم سے اشارہ ہو جاتے

اس وقت جس طور ہم فرقہ وارانہ فسادات کے بھنور میں پھنسے ہوتے ہیں، اس کے پیشِ نظر ان کی نظم "اعتراف" کے ان ٹکڑوں پر نظر ڈالیے:

آج پھر ملک کے اک شہر میں ہنگامہ ہوا
کسی معصوم کے دل میں کوئی خنجر اُترا

کیسے کہیے کہ اک انجان علاقے کے کسی کوچے میں
اجنبی شخص کی صورت میں مرا قتل ہوا
کیسے کہیے کہ مرے لاشے کی پہچان نہیں
کیسے کہیے کہ مرے نطق میں اب جان نہیں

اسی ضمن میں ان کی ایک غزل کا مطلع بھی سنیے:

خون ٹپکا تو نہ ہندو نہ مسلمان نکلا — مرنے والا بھی ہماری طرح انسان نکلا

ان کی ایک نظم "چاند" بھی ہے جس میں چاند کے روایتی اور رومانوی تصوّر کی عکاسی کی گئی ہے لیکن تان یہاں آکر ٹوٹتی ہے:

قافلے کا نیا پڑاؤ ہے اب　　وہم باطل کا چل چلاؤ ہے اب

وہ اپنی نظم "اے مرے شہر" میں ان تمام حساس دلوں کی ترجمانی کرتے ہوئے ہیں جنھیں حالات کے تھپیڑے اپنے وطنِ مالوف سے دور پھینک دیتے ہیں۔ ذرا دیکھیے کس انداز سے اپنا نذرانہ پیش کرتے ہیں:

اے مرے شہر تری بزم میں پھر آیا ہوں　　خون میں ڈوبے ہوئے اشعار کا نذرانہ لیے
ہر گھڑی یاد کے خنجر سے لگے ہیں پیہم　　زخم اتنے کہ گناؤں تو گنا بھی نہ سکوں
زخم سے چور ہے ہر خواب، پر ایسا بھی نہیں　　کہ نئے خواب سجاؤں تو سجا بھی نہ سکوں

نظموں کے علاوہ اس مجموعے کی زینت غزلیں بھی ہیں۔ "ندرِ میر" عنوان کے ۲۰ غزلیں پیش کی گئی ہیں۔ یہ غزلیں بھی اُن کی فکری ہم آہنگی کی غمازی کرتی ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ساتھ ساتھ حسنِ تغزل بھی نکھر کر سامنے آتا ہے اور "ندرِ میر" کا استحقاق بھی:

اِن امیدوں پہ جی رہا ہوں میں　　جن امیدوں کی زندگی کم ہے
اب تری یاد بھی نہیں آتی　　کتنا دلکش حیات کا غم ہے

اُن کی غزلوں میں ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو دورِ حاضر کی سنگینی پہ چوٹ کرتے ہیں اور ان کی رفعتِ فکر کی طرف اشارہ:

انسان آپ اپنا گلا کاٹتا ہوا　　گو میرے دور کا ہے، یہ قصہ عجیب ہے

آخر میں "ندرِ غالب" کے مصداق ۱۵ غزلیں درج کی گئی ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

یارانِ سفر کوئی دوا ڈھونڈ کر لاؤ　　انسان مرے دور کا بیمار بہت ہے

گویا وہ یہ قصہ عجیب ہے، کہ کر مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ چارہ گری کی فکر لاحق ہو جاتی ہے اور اسی غزل کے آخری شعر میں اُن کے ادراک و شعور کی ایک ساتھ کارفرمائی بھی کیا خوب ہے:

حالاتِ زمانہ سے لرز جاتے ہیں اجمل　　یوں ہے کہ زمانے سے ہمیں پیار بہت ہے

"ندرِ غالب" کی غزلوں میں اندازِ غالب کی جلوہ گری بھی قابلِ ستائش ہے:

یہ تکلف یہ ہچکچاہٹ کیوں　　جو بھی کہنا ہے برملا کہیے
ہو گئے قتل، کوئی بات نہیں　　بچ گئے گر، تو معجزہ کہیے
حشر جو کچھ ہے اپنے ہاتھوں ہے　　کیوں کسی اور کو برا کہیے

اِدھر کچھ عرصے سے ان کی جسمانی صحت اچھی نہیں رہتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ساختہ طور پر اُن سے چند ایسے اشعار بر آمد ہو گئے ہیں:

دل کی حالت کیا بتائیں، ریزہ ریزہ ٹوٹ رہا ہے　　کچھ دن ٹھہرو پوچھنے والو پوچھا ہیں گے احباب
ڈوبتی بجھتی ہوئی آواز ہوں　　ساتھ والو غور سے سننا مجھے

لیکن سچ تو یہ ہے کہ اُن کی تخلیقات ایک طویل عرصے سے اخبار و رسائل

بت بن رہی ہیں اور ان کے چاہنے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ
ہ برابر چھپتے بھی رہیں اور ان کے چاہنے والے بڑھتے بھی رہیں۔ وہ ڈوبتی بجھتی آواز
ہی نہیں ہیں۔ اُن کی آواز آج بھی حسب معمول دلوں کو گرماتی اور انسانی ضمیر کو للکارتی
ہتی ہے۔ اس مجموعے کی آخری غزل کا مطلع ان کی جسمانی ناتوانی اور اس کا مقطع
ہنی توانائی کی غمازی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں:

وقت سفر قریب ہے بستر لپیٹ لوں — بکھرا ہوا حیات کا دفتر سمیٹ لوں
اجمل بھڑک رہی ہے زمانے میں جتنی آگ — جی چاہتا ہے سینے کے اندر سمیٹ لوں

یک بات اور — 'سفر زاد' کی نظموں کا آغاز 'دعا' سے ہوتا ہے۔ پورے طور پر لطف اندوز
ہونے نیز اجمل۔ انسان اور شاعر سے متعارف ہونے کے لیے پوری نظم پڑھنا ضروری
ہے کیونکہ وہ ایک کلیدی کردار رکھتی ہے۔ تاہم ملاحظہ ہو:

آغاز: وقت آخر ہے، اے ضمیر مرے — اختتام۔ مطمئن شادماں ضمیر مرے
حق پرستی کی شان باقی رکھ — دم آخر ہے، آبرو رکھنا
بعد والوں سے سرخ رو رکھنا

یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس دعا میں ہر روشن ضمیر شریک ہونا پسند کرے گا۔ یہ
تبصرہ کسی طور اجمل اجملی جیسے بالغ نظر اور خوش فکر شاعر کے شخصی محاسن اور شعری
لطافتوں کا احاطہ نہیں کرتا۔ اس غرض سے 'سفر زاد' کی رفاقت درکار ہے۔

تقویم

شاعر: صمد انصاری
قیمت: ۴۰ روپے
مبصر: نعیم الدین رضوی
ناشر: ارم پبلی کیشنز، بارہ دری، دانگ، مرادآباد، دیوبند

شاعری نے مذہب سے ہمیشہ اخذ نور کیا ہے جس کا ثبوت دنیا کی ہر زبان کی شاعری سے
پیش کیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اردو کی صوفیانہ شاعری پر اگر
ایک طرف شاعر کے ذاتی تجربوں کا رنگ ہے تو دوسری طرف تصوف کے علمی اثرات بھی نظر آتے
ہیں۔ صمد انصاری نے "تقویم" میں اس طرز اظہار کو اور آگے بڑھایا ہے۔ انھوں نے اپنے فکر و
فن کے لیے قرآن کریم سے روشنی حاصل کی ہے۔ "تقویم" غزلوں پر مشتمل ہے۔ لیکن ان غزلوں کا
مزاج اردو شاعری سے اس لیے الگ ہے کہ "تقویم" کی ہر غزل کا ہر شعر کا خیال "کلام مجید" کی
کسی نہ کسی آیت سے ماخوذ ہے۔ ہر شعر کے نیچے سورۃ اور آیت بطور اشارہ موجود ہے۔ "تقویم"
کا ہر شعر سنجیدہ اور مقدس فکر کا حامل تو ہے ہی، صمد انصاری کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غزل
کے فنی اور جمالیاتی تقاضوں کا خاص طور سے دھیان رکھا ہے۔ ●

ساہتیہ اکادمی کی نئی اُردو مطبوعات

ہندوستانی ادب کے معمار سیریز

کتاب	مصنف	قیمت
راجندر سنگھ بیدی	وارث علوی	۱۰/-
محمد قلی قطب شاہ	مسعود حسین خاں	۱۰/-
انشاء اللہ خاں انشاؔ	ایم حبیب خاں	۱۰/-
مصحفی	نورالحسن نقوی	۱۰/-
پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی	مرزا خلیل بیگ	۱۰/-
تلوک چند محروم	رام لعل نابھوی	۱۰/-
مرزا محمد رفیع سودا	قاضی افضال حسین	۱۰/-
حسرت موہانی	ایم حبیب خاں	۱۰/-
مومن خاں مومن	ظہیر احمد صدیقی	۱۰/-
ڈاکٹر زور	سیدہ جعفر	۱۰/-
یوسف حسین خاں	مسعود حسین خاں	۱۰/-
خواجہ حیدر علی آتش	محمد ذاکر	۱۰/-
ویمنا	(ترجمہ) قدیر زماں	۱۰/-
نرالا	〃 عقیل احمد	۱۰/-
سبرامنیم بھارتی	〃 حسرت سہروردی	۱۰/-
وِدیاپتی	〃 قمر جہاں	۱۰/-
بہاری	〃 لطف الرحمٰن	[illegible]
ایشور چند ودیا ساگر	〃 اختر حسن	۱۰/-
ولی	〃 نورالحسن ہاشمی	۱۰/-
بسویشور	〃 حمید الماس	۱۰/-
نام دیو	یونس اگاسکر	۱۰/-
کبیر ویناولی	〃 سرسوتی سرن کیف	۱۰/-
گلشن صحت (ناول) تاراشنکر بندیا دھیائے		[illegible]
(ترجمہ) شانتی رنجن بھٹاچاریہ		۵۰

انگریزی انتھالوجی

کتاب	مرتب	قیمت
راجندر سنگھ بیدی کے منتخب افسانے	گوپی چند نارنگ	۶۰/-
کرشن چندر کے منتخب افسانے	گوپی چند نارنگ	۶۰/-

تراجم

کتاب	مترجم	قیمت
بابا فرید	(ترجمہ) مہر افشاں فاروقی	۱۰/-
فقیر موہن سناپتی	〃 راج نرائن راز	۱۰/-
پنجے منگیش راؤ	〃 حمید الماس	۱۰/-
ٹی۔پی کیلاسم	〃 میر محمود حسین	۱۰/-
اچھوت (ناول) ملک راج آنند (ترجمہ) م م راجندر		۵۰/-
راکھ اور ہیرے (ناول) زیے لیے وسکی		
(ترجمہ) نریندر نشچل		۶۰/-
لوک راج (ناول) وریندر کمار بھٹاچاریہ		
(ترجمہ) بلراج ورما		۴۵/-

ساہتیہ اکادمی، سواتی بلڈنگ، نزد برلا مندر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

SA/76A/Advt./32677

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

کھلے خطوط میں نور السعید اختر صاحب
ستامح کی درستی فرمائی۔ اصل بات کیا
یہ دہ جائیں اور رجالبی صاحب۔ مجھے
اتنا عرض کرنا ہے کہ اختر صاحب نے
شعر نقل کیے ہیں۔ اس میں کئی جگہ موصوف
امح ہوا۔ ایک دو کو تو کتابت کی غلطی
پچھا چھوڑا یا جا سکتا ہے۔ لیکن اسے تو کتابت
لی یقیناً نہیں کہا جا سکتا۔ موصوف نے
یخ ادب اردو کے حوالے سے یہ شعر تحریر
یا ہے ؎

ی نہ بینی درین باغ کس　تماشا کند ہر کسی یک نفس

شعر میں "لفظ "مقیمی" کے متعلق اظہار خیال
تے ہوئے لکھا ہے:

مندرجہ بالا شعر میں لفظ "مقیمی" مخلص
طور پر استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے
"ثبات" کے ہیں۔ میں یہ عرض کروں گا
ارسی و اردو کی کسی بھی لغت میں "مقیمی" کا
رائج نہیں ہے۔ اور نہ اس کے معنی "ثبات"
۔ دراصل لفظ "مقیم" ہے اس کے ساتھ
ے تنکیر شامل کی گئی ہے۔ "مقیم" اسم فاعل
ے، جس کے معنی "قیام کرنے والا، رکھنے والا،
ہنے والا" ہیں۔ "ثبات" کے معنی "قائم ہونا،
ر پکڑنا، قیام، پائیداری، قرار" ہیں۔ علامہ
ال نے لفظ "ثبات" اسی معنی میں استعمال کیا ہے:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ر فارسی کا مشہور مصرع ہے:

مامقیمان کوچۂ دلداریم

اس لیے "مقیمی" کے معنی "ثبات" نہیں ہیں بلکہ
"مقیم" کے معنی "قیام کرنے والا" ہیں، جیسا کہ
فارسی کے مصرع میں استعمال ہوا ہے۔

مقیمی میں الیاس حرف "ی" کی خلطی شکل
ہوا ہے۔ پاک و ہند میں یائے معروف و مجہول
میں فرق کیا جاتا رہا ہے اور اب تک باقی ہے
لیکن جو حضرات فارسی جدید سے متاثر اور
اس کی تقلید کے دلدادہ ہیں، وہ یہ فرق ملحوظ
نہیں رکھتے۔ عہد قدیم میں شیراز، نیشاپور،
طوس اور ان سے ملحقہ علاقوں میں جس فارسی
کا چلن تھا، اسی نے پاک و ہند میں رواج پایا
جو تا حال باقی ہے۔ اس فارسی میں یائے
معروف و مجہول میں تمیز تھی۔ یہ تمیز پاک و ہند
کی فارسی میں بھی تھی اور ہے۔ اس امر کا اعتراف
سبک شناسی جلد اوّل میں ملک الشعرا بہار نے
مختلف مقامات پر کیا ہے کہ افسوس اب اہل ایران
نے یائے معروف و مجہول میں تمیز ختم کر دی
ہے مگر اہلِ ہند ان میں تحریراً و تقریراً
تمیز کرتے ہیں۔ اس لیے اس تمیز و تخصیص
کو ہمیں برقرار رکھنا چاہیے۔

مذکورہ بالا شعر دو جگہ نقل ہوا ہے اور
دونوں جگہ "درین باغ" چھپا ہے۔ اسے اختر
صاحب کی لغزشِ قلم بھی قرار دیا جا سکتا ہے
اور سہو کتابت بھی۔ سہو کتابت ایک جگہ تو
ممکن ہے۔ لیکن دو جگہ ایک ہی غلطی کا ہونا
محلِ تامل ہے۔ یہ دراصل "دریں" ہے۔

سکندر نامہ سے جو شعر پیش کیے گئے ہیں
ان میں پہلا تو مذکورہ بالا شعر ہی ہے۔ دوسرا
شعر بھی غلطی سے پاک نہیں ہے:

"در و ہر دم از تو بری می رسد + یکی می رود دیگری می رسد"

اس شعر میں ''رود'' کے بعد واو عطف غلط ہے۔ شعر ساقط الوزن ہوجاتا ہے۔ اگر سکندر نامہ میں اسی طرح چھپا ہے تو اختر صاحب کو درستی کر دینی چاہیے تھی۔ اسے کسی طرح بھی کتابت کی غلطی نہیں کہا جا سکتا۔

در اصل اس میں ساری قباحت شعر میں الفاظ کو یائے معروف کی شکل میں لکھنے سے پیدا ہوئی۔ اگر یائے مجہول سے لکھتے تو پاک و ہند کے مزاج کے مطابق ہوتا یعنی

مقیمے نبینی درین باغ کس تماشا کند ہر کیے یک نفس
درو ہر دم از نوبرے می رسد یکے می رود، دیگرے می رسد

اس حالت میں ہر شخص باآسانی پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ اس لیے استدعا ہے کہ فارسی لکھتے وقت پاک و ہند کے مزاج کے مطابق یائے معروف اور یائے مجہول کی خطی شکل میں تمیز و تخصیص برقرار رکھی جائے تاکہ کسی قسم کی کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو سکے۔

سید قدرت نقوی کراچی

● کتاب نما کا ''علی سردار جعفری نمبر'' نظر نواز ہوا۔ گزشتہ چند ماہ کے دوران آپ نے متعدد شاعروں اور ادیبوں پر خصوصی گوشے چھاپ کر نہ صرف ان زندہ ادبا کو خراج تحسین ادا کیا بلکہ اس قسم کے گوشوں میں بہت سا نایاب قیمتی مواد بھی جمع کر دیا جو آئندہ کے نقاد اور محقق کے کام آئے گا۔ علی سردار جعفری صاحب سے بھی آپ نے ایک تفصیلی ملاقات کرائی۔ بے حد شکریہ۔

انور سدید، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

● کتاب نما کا تازہ شمارہ (فروری ۱۹۹۱ء) دیکھا۔ کھلے خطوط کے حصے میں رامپور کے ابن فرید صاحب کی گل افشانی گفتار سے لطف اندوز ہوا۔ یہ ابن فرید صاحب بھی خوب چیز ہیں۔ انھیں شکایت رفیعہ شبنم عابدی سے ہے لیکن عتاب مجھ پر نازل ہو رہا ہے۔ مجھے ''اسلامی ادب سے متنفر جعفری صاحب'' کے خطاب سے نوازا گیا ہے۔ یہ اطلاع انھیں کہاں سے ملی۔ کیا میری کسی تحریر میں اسلامی ادب سے نفرت کا اظہار ہے اور میں ابن فرید صاحب سے یہ بھی دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اسلامی ادب سے آپ کی کیا مراد ہے؟

ہر چند کہ ''اڈیٹر کا نامہ نگار سے متفق ہونا ضروری نہیں'' بہت مناسب بات ہے لیکن اس پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ نامہ نگار کہیں بد کلامی اور دریدہ دہنی کی لعنت میں تو مبتلا نہیں ہو رہا ہے۔

علی سردار جعفری۔ بمبئی

● جنوری کے شمارہ میں ڈاکٹر سید عبدالباری کے اشاریہ اور اس کے ردِ عمل کے طور پر فروری کے شمارہ میں سید محی رضا کے مراسلہ کے سلسلہ میں کچھ باتیں کہنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ سید محی رضا نے جو باتیں ڈاکٹر سید عبدالباری کے اشاریہ کے متعلق کہی ہیں وہ ڈاکٹر موصوف کے نفس مضمون تک عدم رسائی کے باعث کہی گئی ہیں یعنی مراسلہ نگار ڈاکٹر سید عبدالباری کے مضمون کو ٹھیک سے سمجھ نہیں سکے ہیں اس لیے انھیں کچھ اختلاف رہ گیا ہے۔

(ڈاکٹر محمد فاروق اعظم بھاگل پور)

● جنوری ۹۱ء کے کتاب نما میں جناب ڈاکٹر سید عبدالباری کا اشاریہ قابلِ توجہ ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ ملک کے جمہوری نظام میں تشدد، تخریب کاری، کشت و خون، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ حکومت کی طرح شاعر و ادیب بھی خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں۔ ہمارے قلمکاروں نے ہر عہد میں حالات و واقعات کے پیشِ نظر اپنے خیالات کا اظہار نہایت بیباکی کے ساتھ کیا ہے آج بھی کر رہے ہیں لیکن سست روی کے ساتھ

(قاضی حسن رضا، کھنڈوہ)

● شمارہ فروری ۱۹۹۱ء تین دن ہوئے موصول ہوا تھا اور تین دن میں ہی تقریباً پورا پڑھ ڈالا۔ یہ "بدون گوشہ نمبر" بھی خاصا متنوع اور معیاری ہے۔ رفعت سروش صاحب کا اداریہ "تخلیقی معنویت" دعوتِ فکر دیتا ہے۔ بہت سی باتیں انھوں نے ایسی لکھی ہیں کہ ان کی طرف بہتوں نے توجہ دلائی ہے۔ لیکن اربابِ حل و عقد ان باتوں کو لائق توجہ ہی نہیں سمجھتے۔ اب ہم آپ ان کا کیا بگاڑ لیں گے؟

مقالات میں محمود احمد برکاتی صاحب کا "جلاب" نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ معلوماتی ہے ایسے مضامین کبھی کبھی شائع ہوتے رہیں تو اچھا ہے۔ علی گڑھ کے دونوں پروفیسر ان کے مقالات ان کے عہدے کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کے Anecdotes غیر ارادی طور پر رفعت سروش صاحب کے اداریہ سے مربوط ہو گئے ہیں۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب سے میں یہ عرض کروں گا کہ محترم مردے تازیانوں سے بھی بیدار نہیں ہوا کرتے۔ ان کے لیے تو کسی مسیح موعود ہی کی ضرورت پڑے گی۔

خلیل الرب صاحب نے گوشہ جذبی پر تبصرہ کیا ہے۔ خود پورا ایک مضمون لکھ دیا ہے۔ کاش وہ جذبی صاحب پر خود ایک شخصیاتی مضمون لکھ دیتے۔ جذبی صاحب سے ان کے جو تعلقات رہے ہیں اور اب تک ہیں وہ ابھی تک دفینہ باطن ہیں۔ انھیں بازاریِ ادب میں آنا چاہیے۔ اس تبصرہ میں بھی انھوں نے بعض کوائف ایسے پیش کیے ہیں جن کا علم ہمیں بھی نہ تھا۔

خلیل صاحب نے یہ محاکمہ دے کر کہ "جذبی کے ادبی مقام کا تعین تو فروزاں کی اشاعت کے بعد ہی ہو چکا تھا..... گدازِ شب..... کی اشاعت نے ایسی کوئی بحث نہیں چھیڑی جس سے جذبی کے از سر نو مطالعہ کی ضرورت محسوس ہو" موصوف نے جذبی کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ انھیں شاید خیال نہیں آیا کہ وہ غیر محسوس طور پر جذبی صاحب کی تنقیص کر گئے ہیں۔ جذبی صاحب کے جذبہ کی شاعری سے فن کی شاعری تک کے ارتقاء کو وہ مذکورہ بالا محاکمہ کے ذریعہ فراموش کر گئے ہیں۔ ان کی رائے محلِ نظر ہے۔

پروفیسر کبیر احمد جائسی صاحب نے جذبی صاحب کے جن "قلندرانہ" (یہ جذبی صاحب کی اپنی اصطلاح ہے جسے وہ کثرت کے ساتھ استعمال کرتے تھے) محفلوں کا ذکر کیا ہے ان میں خلیل الرب صاحب نہ تو شریک ہوتے تھے اور نہ ان دنوں وہ علی گڑھ آئے پروفیسر جائسی صاحب نے اِن قلندرانہ محفلوں کا جس انداز سے ذکر کیا ہے وہ نہ تو مبالغہ ہے اور نہ محض عقیدت مندی۔ غلو کے بجائے پروفیسر جائسی صاحب نے خاصا محتاط انداز اختیار کیا ہے۔ اس پورے گوشہ میں میرے خیال میں بھی یہی مقالہ سب سے زیادہ اچھا ہے اور بقول خلیل صاحب "حاصلِ گوشہ" ہے۔

اب کچھ باتیں خلیل الرب صاحب سے لبرٹی لے کر عرض کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ وہ انگیز کر یں گے۔ شبلی نے اب سے سو سوا سو سال پہلے جو کچھ کہا تھا وہ صحیح تھا

اور اب بھی صحیح ہے، لیکن اس عرصہ میں اور بھی بہت سے تجربے ہوتے ہیں اور بہت کچھ کہا گیا ہے۔ مثلاً موصوف نے ہی جذبی صاحب کی جس غزل کا یہ مصرعہ: ہر جورِ ناتواں کے مقابل رہے ہیں ہم' مقتبس کیا ہے وہ پوری غزل "غم آگیں خیالات" کی 'یاد' نہیں، پُر اشتعال ردِ عمل کی پیداوار ہے۔ جذبی صاحب نے جب یہ غزل اور اس کے ساتھ ہی دو اور غزلیں کہی تھیں تو اس کے دوسرے تیسرے دن وہ ان غزلوں کے اوّلین مسودات جیب میں رکھ کر میرے ساتھ اپنے گھر سے نکلے تھے اور یونی ورسٹی کینٹین پہنچ کر جاوید کمال مرحوم کو اور مجھے سنائی تھیں اور ان کے پس منظر بھی بتائے تھے۔ اس پس منظر میں "شیرینی" کا کہیں کوئی دخل نہ تھا بلکہ اُن کے اس وقت کے حالات کی شدید تلخی کی زیریں رو تھی۔ گویا شبلی کا قول ہمیشہ ہر وقت، ہر فنی تجربے پر صادق نہیں آسکتا۔ مزید برآں یہ قول ترقی پسندانہ بھی نہیں ہے۔

جذبی صاحب اقبالؒ کی ساری شاعری کو نظم نویسی ــــ (versification) قرار نہیں دیتے۔ ان کا قول تو یہ ہے کہ اقبالؒ نے جہاں واقعی شعر کہے ہیں وہ اتنے بلند ہیں کہ دوسرے شاعر اُن بلندیوں تک پہنچ ہی نہیں سکے ہیں۔ اور یہ "جہاں" وافر و وسیع ہے۔

ایلیا اہرن برگ نے "ملحاتی ادب" (؟) کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس پر دل نہیں ٹھکتا۔ ہم کیسے بھول جائیں کہ وہ اسٹالینی آمریت کا آلۂ کار رہا ہے اور اُس نے اپنے پروپیگنڈا ادب کے لیے اس طرح کے بودے اقوال عام کیے تھے۔ ویسے بھی ایلیا اہرن برگ کا دور سوویتی ادب میں گزر چکا۔ اب تو پرسترویکا اور گلاسنوسٹ کا دور آچکا ہے۔ جمہوریتیں اتحاد کے بجائے خود مختاری کی طرف راجع ہو رہی ہیں۔ اب اس عہد کے سوویتی نظریات کو لیکوا اور زانس (۱۹۷۶ء) اور اینگس روکس برگ (۱۹۸۰ء) کے مرتب کردہ اور پیش کردہ خیالات و تصوّرات سے بھی آگے بڑھ چکے ہیں۔ ہمیں بار بار رجعت و مراجعت نہ کرنی چاہیے۔ ہر فنکار اور صاحبِ علم اپنے عہد کے سیاق میں اپنے خیالات پیش کرتا ہے۔ وہ مستقبل کے بارے میں پیش گوئی سے معذور ہوتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا سے مصاحبہ بے حد پسند آیا۔ ڈاکٹر آغا صاحب نے اپنی زندگی اور نظریہ و تجربات ادب کے بارے میں بڑی بصیرت افروز باتیں کہی ہیں۔ قرۃ العین حیدر صاحبہ پر یوسف ناظم صاحب کا بہت آمیز خاکہ بڑی دلکش تحریر ہے وہ لکھتے ہیں تو اپنے فن کا حق ادا کر دیتے ہیں۔

منظومات میں رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ کی نظم "امیرِ شہر کچھ بتا" اور پروفیسر عنوان چشتی کی غزل پسند آئیں۔ غزل کا مطلع غضب کا ہے۔ افسانے دونوں اچھے ہیں۔

جامعہ اردو کا خصوصی کنووکیشن ۲ر دسمبر نہیں ۲ر ستمبر کو ہوا تھا۔ کتابت کی تصحیح کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ بعض غلطیاں ایسی رہ جاتی ہیں جو تحریر کو مضحکہ خیز بنا دیتی ہیں۔

ابن فرید، بیت الصالحہ، زینہ عنایت خاں، رام پور (یوپی)

● "د" اردو ہے جس کا نام" (کتاب نما فروری ۱۹۹۱ء) کے سلسلہ میں مجھ سے بھی ایک دلچسپ واقعہ سن لیجیے۔

۱۹۵۷ء کے اپریل میں پونہ سے بڑودہ آتے وقت میں پروفیسر "ن" سے ملنے کے لیے بمبئی یونی ورسٹی کے دفتر میں گیا۔ اتفاقاً پروفیسر صاحب مجھے سیڑھیوں پر ہی مل گئے۔ ان کے ساتھ ایک سندھی خاتون بھی تھیں۔ مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد پروفیسر صاحب نے اس خاتون کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: "میں نے اس کافر کو کلمہ پڑھا دیا ہے۔ "د" اردو میں ایم۔ اے کر رہی ہے۔" اس کے بعد ہم تینوں نیچے اتر آئے۔ اور میں پروفیسر صاحب سے کچھ اور باتیں کرکے ان سے رخصت ہو گیا۔

اگلے سال میں پھر ایس۔ ایس سی امتحان کے ایک کام کے لیے پونہ گیا۔ وہاں ایک شام میرے دوست جمیل ملک صاحب کے مکان پر سی۔ کالج۔ بمبئی کے کچھ طلبہ سے ملاقات ہوئی۔ باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ انھیں انٹرمیڈیٹ میں ایک خاتون جن کا نام "د" ہے اردو پڑھاتی ہیں اور ان کی اردودانی کا یہ حال ہے کہ وہ "اشعار مومن" مرتبہ عبدالمنان بیدل پڑھ بھی نہیں سکتی ہیں۔ ایک بار ان طلبہ نے پرنسپل صاحب سے ان کی شکایت کی تو انھیں جواب ملا کہ اس کالج میں اردو صرف اس لیے پڑھائی جاتی ہے کہ "د" لکچرر ہیں۔

پونہ سے واپسی پر میں پھر پروفیسر "ن" سے ملا۔ چونکہ ان سے بے تکلفی تھی میں نے ان سے ہنس کر عرض کیا "آپ نے جس کافر کو کلمہ پڑھایا تھا وہ اب کے سی کالج میں مومنوں کو کافر بنا رہی ہے۔ کبھی کبھار ان بے چاروں کی بھی خبر لے لیا کریں۔"

خدا جانے "د" نے کب تک اردو کی خدمت کی!

منصورالدین قریشی۔ بڑودہ۔

ساہتیہ اکادمی کی مطبوعات

کتاب	مترجم	قیمت
آدم خور	(ترجمہ) سجاد ظہیر	۱۵/-
گنجی کی کہانی	، سید احتشام حسین	۶/۵۰
ماہی گیر	، مظفر شاہ	۹/-
نرائن راؤ	، من موہن تلخ	۲۰/-
میڈیا	، کے۔اے۔ فاروقی	۵/-
تاریخ بنگلہ ادب	، شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۲۵/-
آرسی	، تیجا سنگھ	۸/-
گلیلیو	، رضیہ سجاد ظہیر	۵/-
ہیملیٹ	، فراق گورکھپوری	۱۰/-
لل دید	، موتی لال ساقی	۲۰/-
گورا	، سید سجاد ظہیر	۴۰/-
مٹی کا پتلا	، پرکاش پنڈت	۱۰/-
سنجوگ	، رابندرناتھ ٹیگور	۲۵/-
اکیس کہانیاں	، عبدالحیات بردوانی	۲۰/-
مٹی کی مورتیں	، رام برکش بینی پوری	۱۰/-
تاؤتے چنگ	، یوسف حسین خاں	۹/-
والڈن	، علی عباس حسینی	۶/۵۰
تین ناٹک	، محمد مجیب	۲۵/-
وویکانند	، احتشام حسین	۴/۵۰
ایک سو ایک نظمیں	، فراق گورکھپوری	۴۵/-
اوتھیلو	، سید سجاد ظہیر	۲۰/-
کنگ لیئر	، مجنوں گورکھپوری	۲۰/-
کلموہی	، سید عابد حسین	۳۰/
دو سیر دھان	، ہنسراج رہبر	۱۲/
ناگ	(ترجمہ) شبیہ الحسن	۲۰/
آزادی	، شجاع الدین	۶۰/-
عورت	، رضیہ سجاد ظہیر	۱۵/
کاندید	، سید سجاد ظہیر	۱۵/-
بنکم چندر چٹرجی	، مظفر حنفی	۱۰/-
سری آروبندو	، عشرت حسن انور	۱۰/-
مانک بندوپادھیائے	، رام پرکاش راہی	۱۰/
تورودت	، بلراج کومل	۱۰/
زندہ کول	، آصف نعیم صدیقی	۱۰/-
راجہ رام موہن رائے	، نورالحسن نقوی	۱۰/-
جے شنکر پرشاد	، حنیف کیفی	۱۰/-
بھارتیندو ہریش چندر	، مظفر حنفی	۱۰/-
تاراشنکر بندوپادھیائے	، سید فرحت حسین	۱۰/-
جولیس سیزر شیکسپیر	، منیب الرحمٰن	۲۰/-
کنڑ ادب کی تاریخ	، میر محمود حسین	۷۵/-
ابوالکلام آزاد	، عبدالقوی دسنوی	۲۰/-
عبدالحلیم شرر	، جعفر رضا	۲۰/-
چکبست	، سرسوتی سرن کیف	۲۰
غبار خاطر	ابوالکلام آزاد	۴۰/-
ترجمان القرآن (چار جلدوں پر مشتمل)	، ،	۳۰۰/
تذکرہ	، ،	۷۵/-
خطبات آزاد	، ،	۱۰۰
سرت چندر	(ترجمہ) سید ابوالحسنات	۵/-

ساہتیہ اکادمی، سواتی بلڈنگ، نزد برلا مندر، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

SA/76A/Advt/32677

ادبی اور تہذیبی خبریں

اڑیسہ اردو اکادمی، بھوبنیشور

گزشتہ ۲۷؍دسمبر ۱۹۹۰ کو اڑیسہ اردو اکادمی کی جانب سے ریاست کے مقتدر ادبا و شعراء کو اکادمی اعزاز سے نوازنے اور اردو تعلیمی مرکز کے طلبہ کو الوداعیہ تقریب سوچنا بھون، بھوبنیشور میں منعقد ہوئی۔ اس تقریب کی صدارت اردو اکادمی کے نائب صدر جناب سرت کمار کنور وزیر سیاحت و ثقافت، کھیل کود، رابطہ عامہ، اڑیسہ نے کی۔ جناب سدیپ کمار نندا آئی اے ایس نے مہمان خصوصی اور شعبہ تہذیب و ثقافت کے نائب وزیر جناب پدمانابھ بہرا نے مہمان اعزازی کی حیثیت سے شرکت کی۔

ماحولیات اور بچے

بچوں کے لیے ماحول اور آلودگی پر سیمینار اور ورکشاپ

ملک میں اس غیر متوقع صورت حال میں جس میں ملک کے کچھ حصوں میں مختلف فرقوں کے لوگ ایک دوسرے کی طرف خوف اور شبہ کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں، غالب اکیڈمی میں صبح سے شام تک پورے تین دن ایک ایسا خوشگوار سائنسی، علمی اور تہذیبی ماحول نظر آیا کہ جسے دیکھ کر رابندر ناتھ ٹیگور کا وہ خیال ایک بار پھر سچا محسوس ہونے لگا کہ دنیا میں جب کوئی بچہ جنم لیتا ہے تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ ابھی خدا انسان سے بالکل مایوس نہیں ہوا ہے۔

یہ خوشگوار موقع تھا وزارت ماحولیات و جنگلات اور اردو اکیڈمی، دہلی کے تعاون سے بچوں کے ادبی ٹرسٹ کے زیر اہتمام منعقدہ ماحول اور اس آلودگی پر ایک سیمینار و ورکشاپ، جو بچوں میں اس سنگین مسئلے سے واقفیت پیدا کرنے کی غرض سے ۲۳، ۲۴، ۲۵ دسمبر ۱۹۹۰ کو غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین میں منعقد کیا گیا تھا۔ گو کہ اس کی مختلف نشستوں میں آج کل ملک میں پھیلی ہوئی ذہنی اور روحانی آلودگی کا کوئی خاص تذکرہ نہیں تھا، اور بچے اور بڑے اس کرۂ ارض اور اس کے چاروں طرف پھیلی صرف طبیعاتی آلودگی پر بحث و تنقید میں مصروف تھے، مگر اس ماحول کی خوشگواری جس میں دہلی کے مختلف اسکولوں سے آئے ہوئے بچے ہندی اور اردو میں بے جھجک اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے، اس بات کا یقین دلاتی تھی کہ اگر ہم بڑے ان کے ذہنوں کو آلودہ نہ کریں تو یہ ہمارے ملک کے کچھ حصوں میں پھیلی ہوئی ذہنی اور روحانی آلودگی کو بھی بہت آسانی سے ختم کر سکتے ہیں۔

اس پروگرام کی رہنمائی، نگرانی اور صدارت کے فرائض ملک کے مایہ ناز سائنس داں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر سید ظہور قاسم نے فرمائی اور ٹرسٹ کے فعال اور متحرک سکریٹری سید غلام حیدر نے اس تین روزہ پروگرام کے لیے کئی مہینے کی تیاری اور اس کے تمام انتظامی امور کو حسن خوبی انجام دیا۔

پورے پروگرام کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ بنیادی طور پر بچوں کا پروگرام تھا کیوں کہ اس میں دہلی کے ہندی اور اردو۔ کئی اسکولوں کے بچوں نے تحریری، تقریری طور پر اور تنقیدی بحثوں

میں بڑے انہماک اور سنجیدگی سے حصہ لیا۔ بچوں کے جوش اور لگن کا احساس اس بات سے بخوبی ہوتا تھا کہ پورے آٹھ گھنٹے متواتر اپنی، دوسرے نوخیز اور سینیئر ادیبوں، سائنس دانوں اور موضوع کے ماہرین کی خشک و تر تحریروں کو سنتے اور اُن پر بھرپور تنقیدی بحثوں کے بعد، اگلے دن یہ بچے پہلے سے زیادہ جوش اور جذبے کے ساتھ پروگرام میں شامل ہوتے تھے۔ نوخیز قلم کاروں کی تعداد لگاتار بڑھتی رہی۔

آفتاب حسنین کو ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ

بمبئی کے نوجوان ڈراما نگار اور بچوں کے ادیب جناب آفتاب حسنین کو امسال ساہتیہ کلا پریشد کے زیر اہتمام منعقدہ کل ہند ڈراما نگاری کے مقابلے میں، جناب آفتاب حسنین کے طبعزاد فل لینتھ اردو ڈراما "چل اڑ جا رے پنچھی" کو بہترین اسکرپٹ کے اوّل انعام سے نوازا گیا۔ نقد انعام اور ایک ٹرافی یکم جنوری ۱۹۹۱ کو نئی دہلی کے سری رام سنٹر میں ایک باوقار تقریب میں شری پی مرار ی (سکریٹری صدر جمہوریہ ہند) کے ہاتھوں تفویض کی گئی۔

"برف کے پھول"

کی اجرا کی منور اور معطر تقریب

میسور ۱۰ جنوری۔ کل تمام شہر کی ہوٹل سدھارتا کے کانفرنس ہال میں انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ میسور کے زیر اہتمام ایک یادگار اور مسرت افزا ادبی نشست منعقد ہوئی جس میں عالی جناب الحاج عزیز سیٹھ صاحب وزیر برائے ٹرانسپورٹ نے محترمہ الحاجہ حسنیٰ سرور صاحبہ کے ۱۴ افسانوں کا حسین و جمیل مجموعہ "برف کے پھول" کی رسم اجرا کرتے ہوئے فرمایا کہ غیر کنڑی

والوں کو کنڑی زبان سیکھنے کے مناسب اور موزوں مواقع نصیب نہیں ہیں۔ اگر تملیتی طبقوں کو کنڑی سے واقفیت کرانے کے وسیع وسائل فراہم ہو جائیں تو وہ اس زبان پر قدرت حاصل کر کے خود کنڑی دانوں سے آگے نکل جانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہم کنڑ کی زبان اور تمدّن کے خیر خواہ ہیں اور اس سرچشمہ سے فیض یاب ہونے کے لیے بے تاب ہیں۔

شعبۂ اُردو، جامعہ ملّیہ اسلامیہ میں

ظ۔ انصاری کی وفات پر جلسۂ تعزیت

نئی دہلی ۱۳ فروری ۱۹۹۱ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آج دوپہر جناب ظ۔ انصاری مرحوم کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت شعبے کے صدر پروفیسر حنیف کیفی صاحب نے فرمائی۔

جلسے کی ابتدا میں شعبے کے اساتذہ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی، پروفیسر حنیف کیفی اور پروفیسر شمیم حنفی نے ظ۔ انصاری مرحوم کی ہمہ جہت ادبی و صحافتی خدمات کا اجمالاً ذکر کیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے مندرجہ ذیل تعزیتی قرارداد پیش کی اور جملہ حاضرین نے دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔

تعزیتی قرارداد

(ڈاکٹر ظ۔ انصاری کی وفات پر)

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے طلبہ و اساتذہ کا یہ جلسہ اردو کے معروف ادیب جناب ظ۔ انصاری کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ ظ۔ صاحب کا شمار اس عہد کے ممتاز ادیبوں میں کیا جاتا تھا۔ ان کی خدمات اور دلچسپیوں کا دائرہ غیر معمولی طور پر وسیع تھا۔ تنقید، تحقیق

علم زبان، سماجی علوم اور ترجمے کے میدان میں ان کے کارنامے ہمیشہ وسیع سمجھے جائیں گے۔ انھیں اردو فارسی کے ساتھ ساتھ کئی مغربی زبانوں پر بھی دسترس حاصل تھی۔ روسی زبان سے براہ راست انھوں نے اردو میں کئی ترجمے کیے اور روسی ادب کے بعض نامور توجوانوں پر مضامین اور کتابیں بھی تصنیف کیں۔ مغربی ادبیات کے ساتھ ساتھ خالص مشرقی ادبی اور علمی روایات سے بھی وہ گہرا شغف رکھتے تھے ان کی شخصیت بے حد جامع کمالات تھی۔ اپنی خطابت اور اپنی نثری اسلوب کے اعتبار سے بھی منفرد تھے۔ ادب علم اور صحافت کی دنیا میں ان کی سرگرمیاں ابھی جاری تھیں۔ افسوس کہ ان کے رخصت ہو جانے سے ہماری تہذیبی اور ادبی زندگی میں ایک ایسا خلاء پیدا ہوگیا ہے جو آسانی سے پر نہیں کیا جا سکے گا۔

ہم مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں اور ان کے پس ماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

ظ۔ انصاری پر بتیا میں سیمینار

بتیا (مغربی چمپارن۔ بہار) شہر کے معروف ادبی ادارے "اردو سوسائٹی" نے اردو کے قد آور ادیب جناب ظ۔ انصاری کے سانحہ ارتحال پر یکم فروری ۱۹۹۱ کو اپنے دفتر میں ایک تعزیتی نشست کی جس میں صفدر امام قادری، ظفر امام، ایس۔ اے۔ شکیل، نسیم احمد نسیم، ذاکر کمار، ابوالخیر نشتر اور صدر جلسہ جناب ساجد حسین نے اپنے تفصیلی و مختصر تاثرات کا اظہار کیا اور یہ قبول کیا کہ ان کی موت سے اردو کے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا۔

تعزیتی جلسہ

مورخہ یکم فروری ۱۹۹۱ بروز جمعہ بمقام دارالکتابت بزم غالب، بوقت ۹ بجے شب بزم غالب کے عہدیداران و اراکین کا ایک ہنگامی جلسہ، جناب ڈاکٹر ظ انصاری صاحب کے انتقال پرملال پر منعقد کیا گیا جس کی صدارت جناب ایس۔ کیو۔ زماں صاحب صدر بزم غالب نے فرمائی۔ اس جلسے میں مندرجہ ذیل تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔

یہ ہنگامی جلسہ ڈاکٹر ظ۔ انصاری کے سانحہ رحلت پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے موصوف اردو کے بلند پایہ اور صاحب اسلوب ادیب تھے۔ صحافت ترجمہ اور نقد و انتقاد میں اہل زبان سے اپنا لوہا منوالیا۔ عربی، فارسی، اردو، اور روسی زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے غالب اور امیر خسرو پر بلند پایہ کام ان کی تحسین کا سبب بنا۔ اردو روسی اور روسی اردو زبان کی لغت نے روسی زبان پر ان کی مہارت کی مہر ثبت کر دی۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ آئینہ دہلی اور آئینہ بمبئی نے صحافت کی دنیا میں ایسا رنگ جمایا کہ اس کی یاد آج بھی لوگوں کے دلوں میں باقی ہے۔

اس عظیم ادیب، صحافی، مترجم، نقاد اور مقرر کی وفات سے اردو زبان نے اپنا ایک شیدائی، اور جاں نثار کھو دیا۔ اس سانحۂ عظیم پر جتنا رنج کیا جائے کم ہے۔ ہم دعاگو ہیں کہ خداوند کریم ان کی روح کو سکون بخشے۔ اور پس ماندگان کو صبر کی توفیق دے۔ آمین۔

صاف ہوا میں سانس لیجیے

فضائی آلودگی کو روکنے میں مدد کیجیے

آج دلّی میں ۱۶ لاکھ سے بھی زیادہ موٹر گاڑیاں ہیں۔ سڑکوں پر موٹر گاڑیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ ان موٹر گاڑیوں سے نکلنے والے دھوئیں سے ہونے والی فضائی آلودگی کے خطرے کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔
دلّی انتظامیہ نے اس خطرے پر قابو پانے کے لیے دسمبر ۱۹۸۷ء سے کئی کارگر قدم اُٹھائے ہیں۔

— محکمہ ٹرانسپورٹ کے جانچ پڑتال کے سات مقامات راجپور روڈ تلک مارگ، جنگ پورہ، شیخ سرائے، بُراڑی، مال روڈ، لونی روڈ پر فضائی آلودگی کی مفت جانچ کی آسانی فراہم ہے۔
— اس مقصد کے لیے تقریباً ایک سو ورکشاپ اور پٹرول پمپوں کو بھی اس کی ذمہ داری دی گئی ہے جہاں فضائی آلودگی کی جانچ دس روپے میں اور ٹیوننگ کی معمولی مرمّت پانچ روپے میں کی جاتی ہے۔
— اب تک تقریباً دس لاکھ موٹر گاڑیوں کی فضائی آلودگی کی جانچ کی جا چکی ہے۔ فضائی آلودگی کی جانچ اور پوری طرح ٹیوننگ کے بعد موٹر گاڑی ایک لٹر میں زیادہ دوری طے کرتی ہے جس سے پیسے اور قیمتی تیل کی کفایت ہوتی ہے۔
— موٹر گاڑیوں کے نئے قوانین کے تحت ڈیڑھ ہزار سے زیادہ موٹر گاڑیوں پر جرمانہ کیا جا چکا ہے۔

اپنی موٹر گاڑی کی جانچ کرائیے اور صحیح ہونے کا سرٹیفکٹ حاصل کیجیے۔

جاری کردہ:۔ ڈائرکٹوریٹ اطلاعات اور رابطہ عامہ
دلی انتظامیہ دلّی کی طرف سے عوام کی اطلاع کے لیے شائع کیا گیا۔

F.B/1-90-91/DIP/1220

مطبوعاتِ مکتبہ جامعہ ایک نظر میں

ادب، تنقید، انشاء

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
تنقید اور جدید اردو تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	۶۰/-
کچھ مولانا آزاد کے بارے میں	مالک رام	۵۱/۰۰
لسان الصدق	مولانا ابوالکلام آزاد	۷۵/۰۰
اردو میں کلاسیکی تنقید	پروفیسر عنوان چشتی	۴۸/-
تفہیم و تنقید	پروفیسر حامدی کاشمیری	۴۸/-
نذرِ مختار	مرتبہ: مالک رام	۱۰۱/-
تحقیقی مضامین	مالک رام	۶۰/-
خسرو نامہ	مجیب رضوی	۲۱/-
تحفۃ السرور	مرتبہ: شمس الرحمٰن فاروقی	۷۵/-
جائزے	مرتبہ: مظفر حنفی	۴۵/-
نقدِ بجنوری	صدیقہ بیگم	۲۵/-
ادبی سماجیات	ڈاکٹر محمد حسن	۱۵/-
الفاظ کا مزاج	غلام ربانی	۲۴/-
تقریر و تعبیر	محمد ہدایت اللہ	۱۵/-
اردو افسانہ اور افسانہ نگار	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	زیر طبع
افسانہ کی حمایت میں	شمس الرحمٰن فاروقی	۱۷/۵۰
علامتوں کا زوال	انتظار حسین	۳۶/-

کتاب	مصنف / مرتب	قیمت
تذکرۂ معاصرین دوم	مرتبہ: مالک رام	۱۲/-
سوم		۲۲/-
چہارم		۴۰/-
لغت نویسی کے مسائل	مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ	۳۵
معاصر ادب کے پیش رو	ڈاکٹر محمد حسن	۳۰/-
اردو کی تہذیبی معنویت	پروفیسر علی محمد خسرو	۶/-
تحلیل نفسی کے پیچ و خم	ڈاکٹر سلامت اللہ	۲۵/-
اثبات و نفی	شمس الرحمٰن فاروقی	۴۰/-
نقد حرف	پروفیسر ممتاز حسین	۴۸/-
اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۳۵/-
انشائیات	ڈاکٹر عابد حسین	(زیر طبع)
نظرے خوش گزرے	بیگم انیس قدوائی	۴۲/-
فکر و ریاض	علی جواد زیدی	۱۲/-
بازگشت	کبیر احمد جائسی	۱۱/-
کچھ نثر میں بھی	آنند نارائن مُلّا	۱۹/-
مشاہیر کے خطوط	مرتبہ: عبداللطیف اعظمی	۱۲/-
اردو کیسے لکھیں	رشید حسن خاں	۱۰/۵۰
مسالک و منازل	ضیاء احمد بدایونی	۲۲/-
قدیم دلی کالج	مرتبہ: مالک رام	۴/۵۰
نگارشات	پروفیسر محمد مجیب	۱۶/-
کہانی کے پانچ رنگ	پروفیسر شمیم حنفی	۲۴/-
ہوا کے دوش پر	غلام ربانی تاباں	۵/۵۰
جدید ترکی ادب کے ارکان ثلاثہ	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	۴/-
نظر اور نظریے	آل احمد سرور	۲۴/-
تنقید کیا ہے	"	۲۷/-
باتیں کچھ سُریلی سی	داؤد رہبر	۳۶/-
اردو اسیز	مرتبہ: سید ظہیر الدین مدنی	۱۸/-
روحِ تہذیب	خواجہ غلام السیدین	۴/۵۰
نئی شعری روایت	پروفیسر شمیم حنفی	(زیر طبع)
دراسات	ڈاکٹر نثار احمد فاروقی	۱۵/-
دبستانِ آتش	شاہ عبدالسلام	۱۶/-

تعلیم

مشقی تدریس کیوں اور کیسے ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۴۵/-
معاشیات کے اصول عزیز احمد قاسمی ۲۱/-
آسان اردو ورک بک شکیل اختر فاروقی ۲۴/-
تعلیم و تربیت اور والدین ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۵/۱-
تعلیم اور رہنمائی ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۳۵/-
ہم اردو کیسے پڑھائیں معین الدین ۴۵/-
تعلیم اور اس کے وسائل۔ ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۳۶/-
آسان اردو (ہندی کے ذریعے) شکیل اختر فاروقی ۹/-
تعلیم نظریہ اور عمل۔ ڈاکٹر محمد اکرام خاں ۳۶/-
تعلیم فلسفہ اور سماج۔ ڈاکٹر سلامت اللہ ۲۷/-
مبادی استاد کے لیے۔ ڈاکٹر سلامت اللہ ۱۲/-
ہم کیسے پڑھائیں۔ ڈاکٹر سلامت اللہ ۲۵/۵۰
تعلیمی خطبات۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ۳۶/-
سرسید کی تعلیمی تحریک۔ اختر الواسع ۲۵/-
اردو کیسے لکھیں رشید حسن خاں ۱۰/۵۰

تذکرہ، سوانح، شخصیتیں

دلی کی چند عجیب ہستیاں اشرف صبوحی ۵/۱-
چند تصویرِ بتاں مولانا عبدالسلام قدوائی ۴۵/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب پروفیسر آل احمد سرور ۹/-
صاحب جی، سلطان جی ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۰/-

شہیدِ جستجو۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۵/۵۰
مولانا آزاد کی کہانی۔ ڈاکٹر ظفر احمد نظامی ۱۰/-
نظام رنگ (حضرت نظام الدین اولیاءؒ) ڈاکٹر اسلم فرخی ۵/-
حیاتِ جامیؒ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۲/-
نقشِ ذاکر۔ مرتبہ عبدالحق خاں ۵/-
مالک رام ایک مطالعہ مرتبہ علی جواد زیدی ۵۰/-
مشفق خواجہ ایک مطالعہ۔ مرتبہ خلیق انجم ۲۰/-
عبداللطیف اعظمی حیات و خدمات۔ مرتبہ انور صدیقی ۱۰/-
یادوں کا اجالا بھگوان سنگھ۔ مترجم شمیم حنفی ۴۰/-
مجیب صاحب احوال و افکار پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۹/-
حیاتِ عابد (خود نوشت ڈاکٹر عابد حسین) ڈاکٹر صغری مہدی۔ ۴۵
سلسلۂ روز و شب (خود نوشت) صالحہ عابد حسین۔ ۴۵
وجد شاعر اور شخص۔ مرتبہ یوسف ناظم ۲۵/-
غبارِ کارواں۔ بیگم انیس قدوائی ۲۷/-
ذاقی شخص و شاعر۔ مرتبہ شمیم حنفی (زیر طبع)
حیاتِ حافظ۔ اسلم جیراجپوری ۱۵/-
افکارِ رومی۔ مولانا عبدالسلام خاں ۴۰/-
بزمِ رفتگاں صباح الدین عبدالرحمن (زیر طبع)
امیر خسرو دہلوی حیات اور شاعری۔ پروفیسر ممتاز حسین (زیر طبع)
مکالماتِ افلاطون۔ مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین ۲۶/-
غلام ربانی تاباں، حیات اور شاعری۔ شفیق النساء بیگم ۱۰/-
اب جن کے دیکھنے کو۔ بیگم انیس قدوائی ۲/۵۰
پریم چند۔ ہنس راج رہبر (زیر طبع)
شاد عارفی شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ۲۴/-
حیاتِ اسماعیل، حیات و خدمات ڈاکٹر سیفی پریمی ۱۸/-
مفتی صدر الدین آزردہ۔ عبدالرحمن پرواز اصلاحی ۱۲/-
میر انیس سے تعارف۔ صالحہ عابد حسین ۷/-
ہمارے ذاکر صاحب۔ رشید احمد صدیقی ۲۵/-
اشخاص و افکار۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۷/۵۰
میر انیس۔ سفارش حسین رضوی ۴/-
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت۔ مرتبہ عبداللطیف اعظمی ۶/۵۰

سرت کی شاعری۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ٥/-
گنجہائے گرانمایہ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی ٣٠/-
کیا خوب آدمی تھا۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین ١٠/-
ندسیہ زیدی۔ کرنل بشیر حسین زیدی ٢٥/-
نشار۔ مرزا فرحت اللہ بیگ ٤/-
ذاکر صاحب اپنے لفظ و معنی میں۔ مرتبہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ٤٥/-
روسی ادب اوّل، دوم پروفیسر محمد مجیب ٦٠/-

طنزیات، مزاحیات

نی الفور۔ یوسف ناظم ٣٠/-
لول مال۔ شفیقہ فرحت ١٨/-
نی الحال۔ یوسف ناظم ١٨/-
رانگ نمبر۔ شفیقہ فرحت ١٦/-
بالکلیات۔ یوسف ناظم ١٨/-
برکت ایک چھینک کی۔ وجاہت علی سندیلوی ١٥/-
ذکر خیر۔ یوسف ناظم ١٨/-
بے پرکی۔ حضرت آوارہ ١٠/-
خنداں۔ رشید احمد صدیقی ٣٦/-
شگوفہ زار۔ خواجہ عبد الغفور ٣١/-
دیوار قہقہہ۔ (مزاحیہ شاعری) محمد یوسف پاپا ١٥/-
آشفتہ بیانی میری۔ رشید احمد صدیقی ١٥/-

سفرنامے، رپورتاژ

کولمبس کے دیس میں۔ جگن ناتھ آزاد ٤٥/-
پشکن کے دیس میں۔ جگن ناتھ آزاد ٢٥/-
سفر زندگی کے لیے سوز و ساز۔ بیگم صالحہ عابد حسین ١٨/-
باتیں لاہور کی۔ سوم آنند ١٤/-
رہ نورد شوق۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ١٣/٥٠
یادوں کے سائے عتیق صدیقی ١٢/-

شعری مجموعے

پرانی بات ہے۔ زبیر رضوی ٣٠/-
سازِ سخن۔ ادا جعفری ٤٥/-
غزل نما (غزلیات کا انتخاب) مرتبہ ادا جعفری ٧٥/-
دائروں میں پھیلی لکیر۔ کشور ناہید ٣٠/-
آنکھ میں سمندر۔ زاہد ڈار ٣٠/-
آنکھ اور خواب کے درمیان۔ ندا فاضلی ٢١/-
رات کے مسافر۔ مرتبہ انور سجاد ٢٨/-
گدازِ شب۔ معین احسن جذبی ٤٠/-
ایک خواب اور۔ علی سردار جعفری ٤٠/-
حرف حرف روشنی۔ حمایت علی شاعر ٢٥/-
لفظوں کا آسمان (اڑیا نظمیں) مترجم کرامت علی کرامت ٢٠/-
دو ہے۔ جمیل الدین عالی ١٢/-
کلیات عرش ملسیانی مرتبہ مالک رام ٧٥/-
رادار۔ ساقی فاروقی ٢٠/-
پتھر کی زبان۔ فہمیدہ ریاض ١٥/-
شام کا پہلا تارا۔ زہرا نگاہ ٢١/-
مثنوی نہ سپہر۔ (امیر خسرو) مترجم محمد رفیق عابد زاہدی ٢٨/-
لہو پکارتا ہے۔ علی سردار جعفری (زیر طبع)
شام شہر یاراں۔ فیض احمد فیض مجلد ١٠/- ٦/-
جستہ جستہ۔ خورشید الاسلام ٨/-
گل افشانی گفتار۔ نشور واحدی ٥/-

کربِ آگہی ۔ آنند نرائن ملاّ ۱۰/۵۰
نوائے آوارہ ۔ غلام ربانی تاباں ۸/۵۰
اردو گیت ۔ ڈاکٹر قیصر جہاں (زیر طبع)
پچھلے پہر ۔ جاں نثار اختر ۱۵/-
انتخاب حالی (نیا اڈیشن) مولفہ سفارش حسین رضوی ۱۵/-
شہر آشوب مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد ۸/۵۰
ذوقِ سفر ۔ غلام ربانی تاباں ۵/-
کو بہ کو ۔ سلاں جاں نثار اختر ۷/-
دیوار قہقہہ (شعری مجموعہ) محمد یوسف پاپا ۱۵/-

تاریخ، اسلامیات، مذہب

مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست پروفیسر مشیر الحق ۸/-
ہمارے دینی علوم مولانا اسلم جیراجپوری ۱۸/-
قدیم ہندوستان کی سیکولر روایت ۔ ڈاکٹر حبیب اشرف ۱۲/-
ترجمۂ قرآن ۔ منشائے خداوندی کو سمجھنے کی انسانی کوشش ۔ پروفیسر مشیر الحق ۸/-
مسلمانانِ ہند سے وقت کے مطالبات ۔ پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی ۸/-
دنیا کے بڑے مذہب ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۸۵/-
ہندوستان میں اسلامی علوم و ادبیات ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۴۰/-
ہندوستانی مسلمانوں کی قومی تعلیمی تحریک ۔ شمس الرحمٰن محسنی ۵۰/-
رسولِ اکرمؐ اور یہود حجاز ۔ سید برکات احمد ۴۰/-
محبوب الارشاد ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۴/-
ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۴۰/-
اسلام دورِ حاضر میں ۔ مترجم پروفیسر مشیر الحق ۲۹/-
اسلامیات ۔ مالک رام ۲۴/-
عمرو بن عاصؓ مولانا اسلم جیراجپوری ۴/-
حضرت جنید بغدادیؒ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۔ زیر طبع

روح القرآن ۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ۳۰/-
عشق اور بھکتی ۔ عماد الحسن آزاد فاروقی ۸/-
عورت اور اسلامی تعلیم ۔ مالک رام ۳/-
مسلمان اور وقت کے تقاضے ۔ عبدالسلام قدوائی ۸/-
عربوں کی تاریخ نگاری کا آغاز و ارتقاء ۔ محمود الحسن ۱۵/-
سماجی تبدیلیاں ۔ مترجم قاضی عبیدالرحمٰن ۲/-
مذہب اور جدید ذہن ۔ پروفیسر مشیر الحق (زیر طبع)
ہندوستانی مفسرین اور ان کی عربی تفسیریں ۔ ڈاکٹر سالم قدوائی ۱۶/-
دینِ الٰہی اور اس کا پس منظر ۔ مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیرکوٹلوی ۱۲/-
کتاب و سنت کے جواہر پارے ۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۴/۵۰
واقعاتِ کربلا کلامِ انیس کے آئینے میں ۔ صالحہ عابد حسین ۱۴/-
مسلمان اور سیکولر ہندوستان ۔ پروفیسر مشیر الحق ۶/-
اسلامی عقائد و مسائل مذہب ۔ مولانا جمال الدین اعظمی ۹/۵۰
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالی) مترجم ڈاکٹر رشید الوحیدی ۲۵/-
تاریخ الامت، سیرت رسولؐ حصہ اوّل ۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۱۲/-
" خلافتِ راشدہ " دوم " ۱۵/-
" خلافتِ بنی امیہ " سوم " ۷/-
" عباسیہ " چہارم " ۵/-
" عباسیہ بغداد پنجم " ۵/-
ششم تا ہشتم زیر طبع
فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۳۰/-
قاعدہ یسرنا القرآن (خورد سائز) ۔ قاری محمد اسماعیل ۱/۵۰
" " کلاں سائز ۳/-
اسلام اور بدلتی دنیا ۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۱/-
بکھرے ورق سنیتی کمار چٹرجی ۶/-
تاریخ انگلینڈ (۱۹۰۱/۱۸۵۷) ۱۴/- سید محمد عزیز الدین حسین

ناول

تذکرہ ۔ انتظار حسین ۶/-

کتاب	مصنف	قیمت
ریت کی دیواریں	رفعت سروش	۲۱/-
ہجر بادل	کشمیری لال ذاکر	۲۴/-
زار	ظفر پیامی	۴۰/-
ڈوبتے سورج کی کتھا	کشمیری لال ذاکر	۳۶/-
لمحوں میں بکھری زندگی	کشمیری لال ذاکر	۱۹/-
مہکتی بہاریں	کوثر چاند پوری	۱۸/-
آگ بھوپالی	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۱۵/-
دھرتی سدا سہاگن	کشمیری لال ذاکر	۷/۵۰
کھجوراہو کی ایک رات	کشمیری لال ذاکر	(زیر طبع)
میں واپس آؤں گا	ہاورڈ فاسٹ مترجم محمد انس	۲۵/-
پروائی	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۹/۵۰
گوری سوئے سیج پر	صالحہ عابد حسین	(زیر طبع)
انگوٹھے کا نشان	کشمیری لال ذاکر	۷/-
ایک مہم دو دل	خالدہ رحمن	۱۰/-
اشک خوں	حبیبہ بانو	۱۰/-
اپنی اپنی صلیب	صالحہ عابد حسین	(زیر طبع)
پرائی دھرتی اپنے لوگ	جتندر بلو	۱۲/-
ایک مٹھی ہندستان	سید شمیم اشرف	۶/-
ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	۱۲/-
آلپس کے گیت	مترجم قرۃ العین حیدر	۳/-
پیار کا موسم	مہندر ناتھ	۴/۵۰
چنار کا پتا	سلطان آصف فیضی	۳/-
پابہ جولاں	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	(زیر طبع)
زندگی کی لہر (ساؤ منگ)	مترجم محمد خلیق	۴/-
کالا تھر گورے لوگ	احسان الحق	(زیر طبع)
بیوہ	منشی پریم چند	۱۰/-
گئودان (نیا اڈیشن)	"	۶۰/-
میدانِ عمل (نیا اڈیشن)	منشی پریم چند	(زیر طبع)
بودوکیہ	ترجمہ قرۃ العین حیدر	۲/-
شکستِ ناتمام	زہرہ سیدین	۲/-
ابھی دور	صالحہ عابد حسین	زیر طبع
پراسرار مقدمہ کافکا	مترجم رحم علی الہاشمی	۱۲/۵۰

افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
سدا بہار چاندنی	رام لعل	۳۰/-
دل دریا	شرون کمار	۲۵/-
تین چہرے تین آوازیں	صالحہ عابد حسین	۱۸/-
دردِ دل	ستارہ جعفری	۱۸/-
مکتی بودھ	راجندر سنگھ بیدی	۲۵/۵۰
نیلی ساری	خواجہ احمد عباس	۳۲/-
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	۱۵/-
کوکھ جلی	" "	۱۸/-
کھڑکی	پرکاش پنڈت	۱۲/-
ریت سمندر اور جھاگ	ہرچرن چاولہ	۱۲/۷۵
تیوری	امر سنگھ	۱۴/۷۵
قلی نمبر ۳۹۹	وجاہت علی سندیلوی	۱۴/۷۵
دانہ و دام	راجندر سنگھ بیدی	۱۸/-
اپنے پرائے	اوم پرکاش بجاج	۹/-
نئی دھرتی نئے انسان	خواجہ احمد عباس	۱۲/-
درد و درماں	صالحہ عابد حسین	زیر طبع
ہاتھ ہمارے قلم ہوئے	راجندر سنگھ بیدی	۳۶/-
واردات	پریم چند	۸/-
پت جھڑ کی آواز	قرۃ العین حیدر	زیر طبع
دس افسانے	ڈاکٹر صغریٰ مہدی	۴/۵۰
راستے اور کھڑکیاں	انور خاں	۶/-
جو میرے وہ راجا کے نہیں	صغریٰ مہدی	۱۰/-
اپنے دکھ مجھے دیدو	راجندر سنگھ بیدی	۲۱/-

ڈرامے

زندگی کی طرف ۔	پروفیسر شمیم حنفی	۲۶/-
زوال کا عروج ۔	مترجم: انور عظیم	۳۶/-
مجھے گھر یاد آتا ہے ۔	پروفیسر شمیم حنفی	۲۱/-
انٹی گونی ۔	سوفوکلیز مترجم: قیصر زیدی	۹/-
خانہ جنگی	پروفیسر محمد مجیب	۳/۵۰
حبہ خاتون ۔	پروفیسر محمد مجیب	۴/۵۰
تاریخ کے آنچل میں ۔	رفعت سروش	۱۸/-
اداس موڑ ۔	ابراہیم یوسف	۱۲/-
اینٹنی اور کلیوپٹرا	ولیم شیکسپیر	۱۶/۵۰
مٹی کا بلاوا ۔	پروفیسر شمیم حنفی	۱۲/-
سات کھیل ۔	راجندر سنگھ بیدی	۱۷/۵۰
غالب کون ۔	سید محمد مہدی	۸/۵۰
خیال کی دستک ۔	ساگر سرحدی	۱۲/۷۵
دیا بجھ گیا	کرتار سنگھ دگل	۶/-
پہلے آپ ۔ (مزاحیہ ڈراما)	افتخار عالم	۲/۵۰
آذر کا خواب ۔	قدسیہ زیدی	۸/۵۰
آزمایش ۔	پروفیسر محمد مجیب	۴/۵۰
انجام ۔	پروفیسر محمد مجیب	۲/-
کھیتی	"	۴/۵۰
ہیروئن کی تلاش ۔	"	۳/۵۰
پردۂ غفلت ۔	ڈاکٹر سید عابد حسین	۷/۵۰
دروازے کھول دو	کرشن چندر	۴/۵۰
آئینۂ ایام ۔ جے بی پریسٹلے	مترجم: خلیق احمد	۴/۵۰
نقشِ آخر ۔	اشتیاق حسین قریشی	۲/۲۵
ریڈیو ڈرامے کا فن	ڈاکٹر اخلاق اثر	۱۸/-
ریڈیو ڈرامے کی اصناف	"	۲۰/-
نشریات اور آل انڈیا ریڈیو	"	۱۰/-
فاوسٹ (گوئٹے)	مترجم: ڈاکٹر عابد حسین	۲۵/۵۰

اقبالیات

اقبال جادوگر ہندی نژاد	عتیق صدیقی	۱۲/-
اقبالیات کی تلاش	عبدالقوی دسنوی	۳/۵۰
فلسفۂ اقبال (خطبات کی روشنی میں)	سید وحید الدین	۳/۰
اقبال اور دہلی ۔	عبدالقوی دسنوی	۹/۵۰
نقدِ اقبال ۔	میکش اکبرآبادی	۲۵/۵۰
نقشِ اقبال ۔	اسلوب احمد انصاری	۲۱/

غالبیات

ذکر غالب	مالک رام	(زیر طبع)
گفتارِ غالب ۔	مالک رام	۴۸/-
غالب اور صفیر بلگرامی ۔	مشفق خواجہ	۳۶/-
تلامذۂ غالب ۔	مالک رام	۵۰/-
فسانۂ غالب ۔	مالک رام	۶/۵۰
غالب اور شاہان تیموریہ ۔	ڈاکٹر خلیق انجم	۹/۵۰

معیاری سیریز

موازنۂ انیس و دبیر ۔	مرتبہ رشید حسن خاں	۱۲/-
نیرنگ خیال ۔	مالک رام	۱۵/-
یادگارِ غالب اردو ۔	"	۱۶/-
" فارسی ۔	"	۱۰/-
انتخاب مضامین سرسید	انور صدیقی	۱۵/-
حیات سعدی ۔	مرتبہ رشید حسن خاں	(زیر طبع)
فسانۂ آزاد (تلخیص)	" ڈاکٹر قمر رئیس	۲۶/-
فردوس بریں ۔	" عبدالحلیم شرر	۱۲/-
انتخاب مضامین شبلی	مرتبہ رشید حسن خاں	(زیر طبع)
انتخاب ناسخ	مرتبہ " "	(زیر طبع)
مثنوی بحر المحبت	مرتبہ عبدالماجد دریا آبادی	۵/۵۰

شریف زادہ ۔ ،، ڈاکٹر قمر رئیس ۱۵/-

امراؤ جان ادا مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن ۲۲/-

فسانۂ مبتلا ۔ ،، صدیق الرحمٰن قدوائی ۱۰/-

توبۃ النصوح ۔ ،، مالک رام ۲۵/-

باغ و بہار ۔ ،، رشید حسن خاں ۲۱/-

ابن الوقت ۔ ،، ڈاکٹر خلیق انجم ۳۶/-

مجالس النساء ۔ ،، صالحہ عابد حسین (زیر طبع)

گزشتہ لکھنؤ ،، رشید حسن خاں (زیر طبع)

قصہ حاتم طائی ۔ ،، اطہر پرویز (زیر طبع)

انتخاب ولی مرتبہ سید ظہیر الدین مدنی ۱۲/-

انتخاب سراج اورنگ آبادی مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن ۱۰/-

مراثی انیس و دبیر ۔ رشید حسن خاں ۲۴/-

نظیر اکبر آبادی ۔ ،، ،، ۳۰/-

اکبر الٰہ آبادی ۔ صدیق الرحمٰن قدوائی (زیر طبع)

کلام میر ۔ ڈاکٹر محمد حسن (زیر طبع)

دیوان درد رشید حسن خاں ۱۲/-

انتخاب سودا ،، (زیر طبع)

قلی قطب شاہ ۔ محمد اکبر الدین صدیقی (زیر طبع)

ذوق ۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی ۲۴/-

مثنوی سحر البیان ۔ رشید حسن خاں ۱۶/-

مثنوی گلزار نسیم ۔ ،، ۸/-

افادات سلیم ۔ ڈاکٹر خلیق انجم ۲۱/-

مقدمہ شعر و شاعری ۔ مرتبہ رشید حسن خاں ۲۰/-

ہماری کتابیں

ایک خواب اور ۔ علی سردار جعفری ۱۰/-

آتش گل ۔ جگر مرادآبادی ۸/-

پچھلے پہر ۔ جاں نثار اختر ۶/-

رومانی غزلیں ۔ ثمینہ حجاب ۴/-

انتخاب اکبر الٰہ آبادی ۔ صدیق الرحمٰن قدوائی ۹/-

ساتواں آنگن صالحہ عابد حسین ۸/-

دھوپ ۔ ناہید تبسم ۵/-

گھر مارية رحمٰن ۸/-

واپسی کا سفر ۔ عبداللہ حسین ۵/-

راگ بھوپالی ۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۷/-

تغیب ۔ عبداللہ حسین ۵/-

موت کا بازار ۔ آفتاب بلالی ۸/-

کتاب نما کے خصوصی شمارے

صالحہ عابد حسین نمبر مرتبہ: عزیز قریشی ۴۵/-

نئی نظم کا سفر مرتبہ: خلیل الرحمٰن اعظمی ۴۵/-

مشرقی علوم وابستہ پر تحقیق ۔ عابد حسین ۳/-

پریم چند نمبر ۔ عبدالقوی دسنوی ۸/۵۰

ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر ۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۱۶/-

مولانا مہر محمد خاں شہاب نمبر ۔ ادارہ ۱/۵۰

مرزا سلامت علی دبیر نمبر ۔ مرتبہ عبدالقوی دسنوی ۷/۵۰

جوش ملسیانی نمبر ساحر ہوشیارپوری ۵/۵۰

خواتین افسانہ نگار نمبر ڈاکٹر صغریٰ مہدی ۴/۵۰

عرش ملسیانی نمبر ۔ مالک رام ۱۲/۵۰

سکندر علی وجد نمبر ۔ یوسف ناظم ۲۵/-

قدسیہ زیدی نمبر ۔ کرنل بشیر حسین زیدی ۲۵/-

فراق نمبر ۔ شمیم حنفی زیر طبع

لغت نویسی کے مسائل نمبر پروفیسر گوپی چند نارنگ ۲۵/-

عبداللطیف اعظمی نمبر۔ ادارہ ۱۸/-
مشفق خواجہ نمبر۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۲۰/-
جائزے۔ مرتبہ مظفر حنفی ۴۵/-
اردو ادب ۷۷۔۱۹۷۶ء محمود عالم ۳/-
ماہنامہ جامعہ مجیب نمبر۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی ۳۵/-

بچوں کے لیے

مذہب

اسلام کے جانباز رفیع الزماں زبیری ۴/-
سیرت پاک مختصر مختصر احمد خاں خلیل ۳/-
نور کے پھول حکیم محمد سعید ۹/-
سب سے بڑے انسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکیم محمد سعید ۳/۵۰
حضرت حمزہؓ۔ احتشام علی رحیم آبادی ۳/-
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ۔ ״ ״ ״ ۳/-
حضرت ابوہریرہؓ۔ ״ ״ ״ ۴/-
حضرت محبوب الٰہیؒ۔ مشیر الحق ۳/-
״ قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ ״ ۲/-
״ فرید الدین گنج شکرؒ۔ ״ ۲/-
״ معین الدین چشتیؒ ״ ۲/-
״ ابوبکر صدیقؓ۔ ״ ۴/-
״ طلحہؓ۔ ״ ۳/-
״ سلمان فارسیؓ۔ ״ ۳/-
״ ابوذر غفاریؓ۔ ״ ۳/-
״ عبداللہ بن عمرؓ۔ ״ ۳/-
״ عبداللہ بن عباسؓ۔ ״ ۳/-
نیک بیٹیاں۔ ״ ۳/۵۰
اسلام کیسے پھیلا؟ حصہ اوّل عبدالواحد سندھی ۷/۵۰
״ حصہ دوم ״ ۹/-
قرآن کیا ہے؟ ״ ۳/-
اسلام کیسے شروع ہوا؟ ״ ۹/۵۰
اسلام کے مشہور سپہ سالار اوّل ״ ۴/-
״ دوم ״ ۴/-
اسلام کے مشہور امیر البحر۔ ״ ۹/-
رسولِ پاکؐ۔ ״ ۹/-
دس جنتی۔ الیاس احمد مجیبی ۴/۵۰
سرکار کا دربار۔ ״ ״ ۹/۵۰
چار یار۔ الیاس مجیبی ۷/-
آں حضرتؐ (اردو) الیاس مجیبی ۳/-
حضرت محمدؐ (ہندی) ״ ۱/۶۰
اللہ کا گھر۔ خلیل احمد جامعی ۴/۵۰
اللہ کے خلیل۔ ״ ״ ۳/-
رسول پاک کے اخلاق۔ ״ ״ ۳/-
اللہ کے صفی۔ ״ ״ ۲/-
ہمارا دین حصہ اوّل سید شہاب الدین دسنوی ۸/۵۰
״ دوم ״ ״ ״ ۷/۵۰
״ سوم ״ ״ ״ ۸/۵۰
تحسین القرآن۔ تالیف: خدیجہ سیدنا طاہر سیف الدین ۴/۵۰
منہاج القرآن۔ ״ ״ ۴/۵۰
ائمۂ اربعہ۔ مولانا ابو العرفان ندوی (زیر طبع)
ارکانِ اسلام۔ مولانا اسلم جیراجپوری ۳/-
عقائدِ اسلام۔ ״ ״ ״ ۲/-
خلفائے اربعہ۔ خواجہ عبدالحی فاروقی ۸/-
نبیوں کے قصے۔ ״ ״ ۵/-
ہمارے رسولؐ۔ ״ ״ ۶/-
پیارے رسولؐ۔ سلطانہ آصف فیضی ۶/-

ننھے مُنّے بچّوں
کے
لیے
جادو کی ہنڈیا
4/50
چاند کی بیٹی
4/50
دم کٹی لومڑی
6/-
شیر اور بکری
بھیڑیے کا گانا
6/-
گدھے بھائی
بانسری
کوے کا خواب
6/50
چالاک بلی
6/-
6/50
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں

حضرت نظام الدین اولیاؒ۔ ادارہ ۳/-
مسلمان بیبیاں۔ اعجاز الحق قدوسی ۴/-
ہمارے نبیؐ۔ (اردو) سید نواب علی رضوی ۳/۵۰
" (ہندی) " " " ۰/۴۰
سرکارِ دوعالم۔ محمد حسین حسان ۹/-

نظمیں

مہکتی کلیاں۔ خضر برنی (زیر طبع)
ٹوٹے کھلونے۔ سطوت رسول ۵/-
سہانے ترانے۔ شان الحق حقی ۶/۵۰
بچوں کے افسر۔ افسر میرٹھی ۶/-
بچوں کے اقبال۔ مرتبہ: اطہر پرویز ۴/۵۰

معلومات وسوانح

(مشہور ادیب اور سائنس داں (سوانح) ۹/-
واز کی کہانی علی ناصر زیدی ۳/-
اکی کہانی علی ناصر زیدی ۳/-
ری اصول حکیم محمد سعید ۴/-
نا آزاد کی کہانی۔ ظفر احمد نظامی ۱۸/-
ے کا کہانی۔ مہدی جعفر ۲۱/۰
ں سے جانوروں تک۔ شاہد عظیم ۴/۵۰

بچوں کے ذاکر صاحب مرتبہ: عبداللہ ولی بخش قادری
اندرا گاندھی کی کہانی۔ شمیم حنفی
بچوں کے چار بزرگ دوست۔ صالحہ عابد حسین
امیر خسرو۔ ادارہ
رنگوں کی بستی۔ سہیل انور
دہلی کی چند تاریخی عمارتیں۔ زہرہ مشیر
صحت کے ۹۹ نکتے۔ مسعود احمد برکاتی
گاندھی جی دکھنی افریقہ میں۔ یوسف ناظم
جدید پہیلیاں۔ راج کشور
جوہر قابل۔ مسعود احمد برکاتی
شفیع الدین نیر۔ اطہر پرویز ۵۰
صحت کی الف بے۔ مسعود احمد برکاتی
موم کا محل۔ پروفیسر محمد انس (زیر طبع)
چٹانوں کی کہانی۔ محمد امین ۵۰
گاندھی بابا کی کہانی۔ بیگم قدسیہ زیدی
میر انیس۔ محمد حسین حسان
انوکھا عجائب خانہ (۳ حصے) " " ۵۰
ہمارے محاورے۔ ڈاکٹر سیفی پریمی ۵۰
مقناطیس کی کہانی۔ (زیر طبع)
دہلی۔ مجاہد حسین زیدی ۳/-
تاریخ ہند کی کہانیاں (اول تا چہارم) ۷۵
سماجی زندگی۔ (اول تا چہارم) ۴/۹۰
کہاوت اور کہانی۔ ڈاکٹر سیفی پریمی ۹/-

کہانیاں، ناول، ڈرامے

ننھے منے بچوں کے لیے

شیر اور بکری۔ باتصویر کہانیاں ۶/-

مکتبہ پیام تعلیم کی ولولہ انگیز اور حیرت انگیز کتابیں
ننھا ٹٹو
قیمت : ۲/-
جنگل کی ایک رات
ریحان احمد عباسی
ایک شکارگاہ کے سفر اور قیام کی مزیدار کہانی جس میں جنگل کی زندگی کے بہت سے پُراسرار مناظر سامنے آتے ہیں۔ ایک ایسا ناول جسے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے بھی شوق سے پڑھیں گے۔
قیمت :
خطرناک سفر
ریاض احمد خاں
اچھی کہانیاں
قیمت : ۲/۵۰
اندھے کا بیٹا
(کوراوغلو)
قیمت : ۳/۵۰
تین اناڑی
(ناول)
عصمت چغتائی
قیمت ۶/-

کتاب	مصنف	قیمت
چاندی بیٹی ۔	(باتصویر کہانیاں)	۲/۵۰
بھیڑیے کا گانا ۔	"	۶/-
جادو کی ہنڈیا ۔	"	۲/۵۰
چالاک بلی ۔	"	۶/-
دُم کٹی لومڑی ۔	"	۶/-
کوے کا خواب ۔	"	۶/۵۰
گدھے نے بجائی بانسری ۔	کشور ناہید	۶/۵۰

بڑے بچوں کے لیے دلچسپ کہانیاں

کتاب	مصنف	قیمت
ابو خاں کی بکری	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱۵/-
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی	(کہانیاں)	۶/-
نرالے گویے	اشرف صبوحی	۴/-
باتونی کچھوا	" "	۴/-
جادو کا چھلا	" "	۳/-
جادو کی سارنگی	" "	۳/-
بدر شہزادی	" "	۲/-
سمندری طوفان اور تین لڑکے	(مختلف کہانیاں)	۶/-
ننھا سیاح	محمد زکریا سائل	۷/-
زیور	(مختلف کہانیاں)	۶/-
شہنشاہ نے کہا...	(مختلف کہانیاں)	۶/-
سام پر کیا گزری	سید اظفر مہدی	۶/-
جنگو کی بلی	عبدالاحد سندھی	۲/-
چالاک خرگوش کے کارنامے	معراج	۷/۵۰
چور پکڑو	مسعود احمد برکاتی	۳/-

کتاب	مصنف	قیمت
بہادر علی ۔	قمر علی عباسی	۷/۵۰
خالی ہاتھ ۔	ابصار عبدالعلی	۹/-
کھلونا نگر ۔	ادارہ	۷/-
حاجی بابا کی ڈائری ۔	ظ ۔ انصاری	۶/۵۰
قصہ اژدھا پکڑنے کا ۔	ادارہ	۵/-
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی ۔	"	۶/-
ابو علی کا جوتا ۔	"	۵/-
ننھا سراغ رساں ۔	ادارہ ۔	۵/-
پُراسرار غار ۔	"	۵/-
ظالم ڈاکو ۔	ریاض احمد خاں	۶/-
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں ۔	انور خاں	۶/۵۰
دلی کی شادی ۔	اشرف صبوحی	۴/-
رحمت شہزادہ ۔	" "	۴/-
اندھے کا بیٹا ۔	شعیب اعظمی	۲/۵۰
پانچ جاسوس ۔	امۃ الرحمٰن محسنی	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات ۔	ریحان احمد عباسی	۹/-
اچھی کہانیاں ۔	مرتبہ ؛ ہمدرد فاؤنڈیشن	۲/۵۰
ہرن کا دل ۔	اشرف صبوحی	۲/-
دریا کی رانی ۔	" "	۲/-
گوہر شہزادی ۔	" "	۴/-
شریر شیرا ۔	" "	۳/۵
پری رانی ۔	صالحہ خاتون	۳/-
خطرناک سفر ۔	ریاض احمد خاں	۳/۵۰
ننھا جھرو ۔	ریحان احمد عباسی	۴/۵۰
مرغی کی چار ٹانگیں ۔	یوسف ناظم	۲/۵۰
بابا ناصح ۔	رشید الوحیدی	۲/-
سلامہ و صمصامہ ۔	" "	۵/-
پہاڑ کی چوٹی پر ۔	مرزا ادیب	۶/-
شرارت ۔	محمد حسین حسّان	۲/-
ننھا فرشتہ ۔	فہمیدہ عتیق	۶/-
ایک کھلا راز ۔	مسعود احمد برکاتی	۳/۵۰

پیامی بنیادی انگریزی اُردو ڈکشنری
PAYAMI
BASIC ENGLISH-URDU
DICTIONARY
CONTAINING
a vocabulary of 5000 Basic Words most frequently used, selected by a board of eminent scholars and experienced English teachers. Including
A LIST OF PREFIXES AND SUFFIXES
Rs. 12/-
PAYAMI
HOME
DICTIONARY
URDU TO ENGLISH
Rs. 16/-
MAKTABA PAYAM-E-TALEEM
JAMIA NAGAR, NEW DELHI 110025
چالاک خرگوش کے کارنامے
ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دینے والا بچوں کا ناول
معراج
قیمت 7/50
قیمت : 9/=
حاجی بابا کی ڈائری
6/50
جگنو بلی
قیمت -/۷
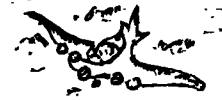
کتاب	مصنف	قیمت
مچھیرا اور اس کی بیوی۔	عبدالواحد سندھی	۲/۵۰
بھوتوں کا جہاز۔	شمیم حنفی	۴/۵۰
ہار کی تلاش۔	ریاض احمد خاں	۴/-
خرگوش کی چال۔	بیگم آصفہ مجیب	۳/-
آؤ ڈراما کریں۔	محمد مجیب	۳/-
خرگوش کا سپنا۔	کرشن چندر	زیر طبع
دادا نہرو۔	منور لکھنوی	۴/-
نیلا ہیرا۔	مظفر حنفی	۴/۵۰
ایک کھوپڑی تیل میں۔	عبدالواحد سندھی	(زیر طبع)
شیر خاں۔	قرۃ العین حیدر	۳/-
بھیڑیے کے بچے۔	" "	۳/-
لومڑی کے بچے۔	" "	۳/-
میاں ڈھینچو کے بچے۔	" "	۲/۵۰
بہادر۔	" "	۲/۵۰
ہرن کے بچے۔	" "	۱/۵۰
اس نے کیا کرنہ جانا۔	آصفہ مجیب	۲/-
کٹا ہوا ہاتھ۔	شمیم حنفی	۴/۵۰
میگھ نگر کا راجا۔	ریاض احمد خاں	(زیر طبع)
جی دار اور ننھا فرشتہ۔	"	(")
سرکس۔	ڈین گیسپر	۱/۵۰
بندر اور نائی۔	عبدالواحد سندھی	۳/۵۰
لومڑی کا گھر۔	"	۳/-
جادو کا گھر۔	"	۳/-
بی مینڈکی اور کوا۔	"	۳/-
تاک دنادن تاکے سے۔	"	۲/۵۰
روٹی کس نے پکائی۔	عبدالواحد سندھی	۴
پھر میں چگوں کیا خاک۔	"	۲/۵۰
پانچ بونے۔	"	۳/-
چیونٹی رانی۔	"	۲/۵۰
بچوں کی کہانیاں۔	"	۳/-
پان کھا کر طبلہ بجا کر رام ناچا۔	"	۲/۵۰

کتاب	مصنف	قیمت
پکڑ دُم کٹے کو۔	"	۵۰
مدورانا پردیس چلے۔	"	۵۰
ہپو جپو۔	"	۵۰
سُرخ جوتے۔	بیگم قدسیہ زیدی	۵۰
ریڈیو فیچر۔	جگن ناتھ آزاد	(زیر طبع)
پلک نہ مارو۔	یوسف ناظم	۲/-
ایک دیس ایک خون۔	صالحہ عابد حسین	۳/-
جادو کے کھیل۔	اطہر پرویز	(زیر طبع)
انعامی مقابلہ۔	حسین خاں	۳/۲۵
دعوت ملاحی۔	"	زیر طبع
جیت کس کی؟	"	۲/۵۰
چینی کی گڑیا۔	"	(زیر طبع)
بہادر سیاح۔	"	۳/۵۰
چچا غالب۔	مرتبہ "	(زیر طبع)
تانبیل خاں۔	محمد حسین حسان ندوی	۲/۵۰
جن حسن عبدالرحمٰن (دو حصے)	ترجمہ قرۃ العین حیدر۔	۵/-
چوری کی عادت۔	عبدالغفار مدھولی	۲/۵۰
غیر ذمہ دار لڑکا۔	"	(زیر طبع)
جب اور اب۔	آصفہ مجیب	"
سندر چنار۔	صالحہ عابد حسین	/۵۰
گلابو چوہیا اور غبارے۔	قدسیہ زیدی	۱/۵۰
گلابو چوہیا اور پری زاد۔	"	۲/-
ستاروں کی سیر۔	کرشن چندر	زیر طبع
لال مرغی۔	عبدالواحد سندھی	۲/-
تین اناڑی۔	عصمت چغتائی	۱/-
خربوزہ شہزادہ کا سر بن گیا۔	کوثر بانو	زیر طبع
چمپاوت کا آدم خور شیر۔	محمد معین	/۵۰
ننھا ٹٹو۔	خورشید سلطان	۲/-
چنبیلی۔	محمد حسین حسان	۲۰
شہزادہ اور ٹھگ۔	ادارہ	۱/-

تعلیم بالغان کے سلسلے کی کتابیں

پیشے

نیب خاں جمام ۔ مرتبہ : ادارہ تعلیم وترقی جامعہ -/۵۰
نمن دفن ۔ " " " " -/۵۰
بدالرحمٰن راج ۔ " " " " -/۵۰

• جھلکیاں

احمد علی ۔ " " " " -/۵۰
حیات اللہ انصاری ۔ " " " " -/۵۰

تعلیم بالغان کے سلسلے کی نئی کتابیں

نی کی چوٹ ۔	معین الدین	۱/۲۵
پلک ۔	مشتاق احمد	۱/-
سم کے بارے میں سو سوال ۔	محمد امین	۱/۲۵
ستین کا سانپ ۔	محمد حسین حسان	۱/-
یادوا ۔	" "	۱/-
دوسکے اپدیشں ۔	" "	۱/-
اند ۔	" "	۱/-
یمک ۔	" "	۱/-
نئی زمین ۔	" "	۱/-
پچوں کی چھوٹی موٹی بیماریاں ۔	" "	۱/-
ندہ وشواس ۔	ہندی	۳/-
ستری کو پڑھاؤ ۔	"	۳/۵۰
سب مل کر ۔	"	۳/۵۰
بینک آپ کی سیوا میں ۔	"	۳/۵۰

متفرق

پنچ تنتر دوم ۔	-/۵۰
" " سوم ۔	-/۵۰
بونے کی کھیتی ۔	۱/-
چیونٹی ۔	-/۶۵

ٹھیک بات چیت کا ہے ۔	-/۵۰
اپنی کھیتی کو چک کرو ۔	-/۵۰
پیڑوں کی کاٹ چھانٹ ۔	-/۵۰
ساگ سبزی اگائیے ۔	-/۵۰
کھاد بنائیے کھاد ڈالیے ۔	-/۵۰
ہرا چارہ ہرا رہے ۔	-/۵۰

• ہندی کی دوسری کتابیں

ہمارے نبیؐ	زیر طبع
حضرت محمدؐ	-/۶۰
ایورسٹ کی کہانی	-/۵۰
گلستان کی کہانیاں	-/۵۰
مولانا روم کی کہانیاں	-/۵۰
موسموں کا کھیل	-/۶۵
پرم پرا	-/۶۵
اپنا گھر	-/۵۰
امریکہ	-/۵۰
دہلی	-/۵۰
منور نجن اور کام	-/۵۰

چاندی کا چمچہ	-/۴۰	جدید حساب چہارم	ملکہ بیگم قزلباش ۱/۵۰
چمپا کا پھول	-/۲۵	" " پنجم	محمد یونس ۱/۵۰

ہماری درسی کتابیں

• اُردو

اُردو قاعدہ	-/۲
نگین قاعدہ حصہ اوّل	۱/۵۰
حصہ دوم	۱/۵۰
اردو کی پہلی کتاب	۳/۵۰
" دوسری کتاب	۵/۲۰
" تیسری کتاب	۵/۵۰
" چوتھی کتاب	-/۶
اردو کی پانچویں کتاب	۶/۷۵
" چھٹی کتاب	۷/۲۵
" ساتویں کتاب	۸/۵۰
اردو کی آٹھویں کتاب	۸/۵۰
بچوں کی پہلی	-/۲
اردو کی دوسری برائے دہلی	-/۵
" تیسری "	-/۶
" چوتھی "	-/۷
اردو خوش خطی حصہ اوّل	۲/۵۰
" " دوم	۲/۵۰
" " سوم	۲/۵۰
" چہارم	۲/۵۰

• طالبات کے لیے

ہمارا ملک بھارت	-/۱۰
بھارت اور سنسار	-/۱۰
ہماری دلی سوم کلاس کے لیے	-/۱۰
ماحول کے ذریعہ تعلیم سوم	-/۱۰
آئیے سائنس کر کے سیکھیں چہارم	۳۰
پنجم	۳۰

• کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب

شعور ادب (ادارہ)	-/۱۱
نیا اردو نصاب۔ اوّل۔ تیمر زیدی/محمد ذاکر	۱۵۰
آئینہ ادب۔ ڈاکٹر مغنی رضا/ڈاکٹر آدم شیخ	-/۱۰
انوار ادب۔ پروفیسر فصیح الدین/ڈاکٹر جاہد حسین حسینی	۸/۵۰

• حساب

جدید حساب درجہ دوم ترجمہ: یاور حسین	-/۵
حساب درجہ سوم ترجمہ: شکیل احمد	-/۹

تعلیم بالغان کے سلسلے کی کتابیں

• پیشے

نصیب خاں حجام ۔ مرتبہ : ادارہ تعلیم و ترقی جامعہ -/۵۰

کفن دفن ۔ " " " " " -/۵۰

عبدالرحمٰن راج ۔ " " " " " -/۵۰

• جھلکیاں

احمد علی ۔ " " " " " -/۵۰

حیات اللہ انصاری ۔ " " " " -/۵۰

• تعلیم بالغان کے سلسلے کی نئی کتابیں

چوٹی کی چوٹ ۔ معین الدین ۱/۲۵

پچیک ۔ مشتاق احمد ۱/-

موسم کے بارے میں سو سوال ۔ محمد امین ۱/۲۵

آستین کا سانپ ۔ محمد حسین حسان ۱/-

الٹی دوا ۔ " ۱/-

تاؤ کے ایڈیشن ۔ " ۱/-

چاند ۔ " ۱/-

دیمک ۔ " " ۱/-

کتنی زمین ۔ " " ۱/-

... کی چھوٹی موٹی بیماریاں ۔ " " ۱/-

ہ وشواس ۔ ہندی ۳/-

ری کو پڑھاؤ ۔ " ۳/۵

ب مل کر ۔ " ۳/۵۰

بلے آپ کی سیوا میں ۔ " ۳/۵۰

متفرق

بیج منتر دوم ۔ -/۵۰

" " سوم ۔ -/۵۰

دھنے کی کھیتی ۔ ۱/۰

بوٹی ۔ -/۶۵

ٹھیک بات چیت کیجیے ۔ -/۵۰

اپنی کھیتی کو چیک کرو ۔ -/۵۰

پیڑوں کی کاٹ چھانٹ ۔ -/۵۰

ساگ سبزی اگائیے ۔ -/۵۰

کھاد بنائیے کھاد ڈالیے ۔ -/۵۰

ہرا چارہ ہرا رہے ۔ -/۵۰

• ہندی کی دوسری کتابیں

ہمارے نبیؐ زیر طبع

حضرت محمدؐ -/۶۰

ایورسٹ کی کہانی -/۵۰

گلستاں کی کہانیاں -/۵۰

مولانا روم کی کہانیاں -/۵۰

موسموں کا کھیل -/۴۵

پرم پرا -/۴۵

اپنا گھر -/۵۰

امریکہ -/۵۰

دہلی -/۵۰

منورنجن اور کام -/۵۰

چاندی کا چمچہ -/۴۰
چمپا کا پھول -/۴۵

ہماری درسی کتابیں

• اردو

اردو قاعدہ ۳/-
رنگین قاعدہ حصہ اول ۱/۵۰
" حصہ دوم ۱/۵۰
اردو کی پہلی کتاب ۴/-
" دوسری کتاب ۶/۳۰
" تیسری کتاب ۷/-
" چوتھی کتاب ۷/۵۰
اردو کی پانچویں کتاب ۸/۵۰
" چھٹی کتاب ۹/-
" ساتویں کتاب ۱۰/-
اردو کی آٹھویں کتاب ۱۰/-
بچوں کی پہلی ۴/-
اردو کی دوسری برائے دہلی ۶/۵۰
" تیسری " ۷/۵۰
" چوتھی " ۸/۵۰
اردو خوش خطی حصہ اول ۳/-
" " دوم ۳/-
" " سوم ۳/-
" " چہارم ۳/-

• حساب

حساب درجہ دوم ترجمہ: یاور حسین ۱۲/-
حساب درجہ سوم ترجمہ: شکیل احمد ۱۲/-
حساب چہارم " ملکہ بیگم قزلباش /-
" پنجم " محمد یونس /۵۰

• طالبات کے لیے

ہمارا ملک بھارت ۱۰/-
بھارت اور سنسار ۱۰/-
ہماری دلی سوم کلاس کے لیے ۱۰/-
ماحول کے ذریعہ تعلیم سوم ۱۰/-
" " " چہارم ۴/۳۰
۴/۳۰

• کالج کے طلبہ کے لیے درسی کتب

شعور ادب (ادارہ) ۱۸/-
نیا اردو نصاب۔ اول۔ قیصر زیدی/محمد ذاکر ۸/۵۰
آئینہ ادب۔ ڈاکٹر محی رضا/ڈاکٹر آدم شیخ ۱۲/-
انوار ادب۔ پروفیسر فصیح الدین/ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی ۹/۵۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

یگراداروں کی مطبوعات

ادب، تنقید، انشا

براھنی اور اصلاح سخن مرتبہ عنوان چشتی و نعیم الدین رضوی ۱۰۰/-
رفعت سروش، شخصیت اور فن مرتبہ ڈاکٹر صبیحہ عادل ۱۰۰/-
رفعت سروش بحیثیت نثر نگار " " " ۵۰/-
شہباز امروہوی، فن اور شخصیت مرتبہ ڈاکٹر ضیاء الرحمن صدیقی ۷۰/-
سید مسعود حسن رضوی ادیب ڈاکٹر وسیم آرا ۷۰/-
مترضین ابوالکلام آزاد عبداللطیف اعظمی ۳۶/-
اسلوب و معنی ڈاکٹر اعجاز علی ارشد ۲۰/-
منشورات جمیل (حصہ دوم) " " ۵۰/-
تحلیل نفسی اور ادبی تنقید کلیم الدین احمد ۲۲/-
محل خانہ (ناول) سجاد دہلوی ۳۲/-
آثار الصنادید (تاریخ) مرتبہ خلیق انجم مکمل سیٹ ۳۱۰/-
یادوں کے چاند تارے (سفرنامہ پاکستان) رفعت سروش ۲۰/-
نقد ملفوظات پروفیسر نثار احمد فاروقی ۶۵/-
نجیب محفوظ بدرالدین الحافظ ۲۵/-
جدید ہند کے سیکولر معمار ڈاکٹر مجیب اشرف ۵۰/-
محب وطن پریم چند شمس الحق عثمانی ۶۰/-
اردو خود نوشت، فن و تجزیہ ڈاکٹر وہاج الدین علوی ۱۲۵/-
اقبال کی شاعری میں پیکر تراشی ڈاکٹر تو قیر احمد خاں ۶۰/-
حرف برہنہ پروفیسر عنوان چشتی ۱۰۰/-
قلم کے صفیر رفعت سروش ۷۵/-
تلاش آزاد عبدالقوی دسنوی ۴۰/-
بہار میں اردو افسانہ نگاری مرتبہ پروفیسر وہاب اشرفی ۶۰/-
مکتوبات شہباز مرتبہ ڈاکٹر سید صابر حسن ۲۲/-
مولانا ابوالکلام آزاد (مقالات کا مجموعہ) ۱۸/-

توفیق الحکیم ڈاکٹر بدرالدین الحافظ ۷/-
مضامین ستیدین ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی ۴۰/-
ذکر شہادت سید علی موسیٰ رضا حسینی ۴۵/-
نذر مسعود مرزا خلیل احمد بیگ ۱۵۰/-
اقبال اور اس کا عہد جگن ناتھ آزاد ۲۰/-
کالی داس، شخصیت اور فن شہناز شبنم ۲۵/-
عوامی ذرائع ترسیل اشفاق محمد خاں ۸۰/-
پیغمبران سخن سردار جعفری ۴۰/-
اظہار خیال عظیم الشان صدیقی ۵۰/-
نظیر اکبرآبادی کے کلام کا تنقیدی مطالعہ طلعت حسین ۷۰/-
داستان، ناول، افسانہ وردانہ قاسمی ۲۰/-
تلاش و تحقیق کاظم علی خاں ۸۰/-
آرٹ عبید اللہ ۵/-
لندن کی ایک رات سجاد ظہیر ۱۵/-
عبدالرحیم خانخاناں شیخ سلیم احمد ۸۰/-
تلاش فن یونس اگاسکر ۵۰/-
ریسرچ کیسے کریں ڈاکٹر نورالاسلام صدیقی ۶۰/-
خندہ ہائے بیجا وارث علوی ۵۱/-
اردو میں بچوں کا ادب خوشحال زیدی ۴۰/-
حیات جستجو مظفر حنفی ۳۰/-
ہندستان کدھر پروفیسر آل احمد سرور ۲/-
سخن دلنواز خواجہ غلام السیدین ۳۰/-
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں خواجہ غلام السیدین ۳۰/-
محمد مجیب، حیات اور خدمات ڈاکٹر صادقہ ذکی ۵۰/-
ابر نیساں سیدہ طیبہ بیگم ۲۰/-
متاع فکر و نظر محمد آفاق صدیقی ۳/-
ضیا فتح آبادی، شخص اور شاعر مرتبہ مالک رام ۱۵/-
رشید احمد صدیقی آثار و اقدار مرتبہ اصغر عباس ۴/-
بیدی نامہ شمس الحق عثمانی ۱۵۰/-
فن اور فنکار صالحہ عابد حسین ۳۵/-

اردو کی تہذیبی معنویت — سیّد علی محمد خسرو — ۶/-
جوہر آئینہ — طالب کاشمیری — ۱۲/-
جدیدیت اور اقبال — مرتبہ پروفیسر آل احمد سرور — ۱۸/-
تفکرِ اقبال — سید وحید الدین — ۱۰/-
ادبی تنقید کے اصول — پروفیسر کلیم الدین احمد — ۶/-
عماد الدین نازی الدین خاں نظام — ڈاکٹر محمد قمر الدین — ۵۰/-
ہماری تعلیمی صورتِ حال — آل احمد سرور — ۴/-
اردو شعریات — مرتبہ — ۶۰/-
محمد اقبال (میر سید میر شکر) — کبیر احمد جائسی — ۱۸/-
آثار مشرق — مولانا ابراہیم عمادی — ۳۰/-
اقبال اور اردو نظم — پروفیسر آل احمد سرور — ۳۶/-
نقد ادبیاتِ فارسی — ڈاکٹر سمیع الدین احمد — ۳۶/-
فارسی زبان و ادب — " " — ۱۵/-
کاندید — مترجم سید سجاد ظہیر — ۵/-
تلاشِ فن — سید رضا حسین زیدی — ۶/-
قدیم اردو۔ جلد دوم — اڈیٹر مسعود حسین خاں — ۱۳/-
آئینہ ابو الکلام آزاد — مرتبہ عتیق صدیقی — ۲۰/-
ترقی پسند ادب نمبر — مرتبہ سردار جعفری — ۱۰۰/-
مولانا محمد علی، ایک مطالعہ — مرتبہ عبد اللطیف اعظمی — ۲۰/-
نذرِ حمید — مرتبہ مالک رام — ۷۰/-
بیگم حسرت موہانی اور ان کے خطوط — مرتبہ عتیق صدیقی — ۲۰/-
اسلام کی اخلاقی تعلیمات (امام غزالیؒ) — ترجمہ رشید الوحیدی — ۲۵/-
مزامیر (دوم) — مرتبہ اثر لکھنوی — ۱۰/-
چند مصری ناول اور افسانے (تحقیقی مطالعہ) — ڈاکٹر سید بدر الدین الحافظ — ۵۰/-
دنیا میرا گاؤں (سفرنامے) — خواجہ غلام السیدین — ۶/-
ملفوظات گونگ نوزی — ترجمہ ظفر حسین خاں — ۳/۵۰
کاشف الحقائق۔ ایک مطالعہ — ڈاکٹر وہاب اشرفی — ۱۶۱/-
مثنویاتِ میر کا تہذیبی مطالعہ — قمامہ بلال — ۴۵/-
نقدِ شعر — قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی — ۴۰/-

نذرِ عابد حسین (انگریزی) — مرتبہ مالک رام — ۲۵/-
نذرِ زیدی (اردو) — " " — ۵۱/-
" " (انگریزی) — " " — ۵۱/-
پیرس و پارس (سفرنامہ) — ثریا حسین — ۲۷/-
مکاتیبِ نجم — محمد ایوب واقف — ۲۰/-
ادبی زاویے — فخر الاسلام اعظمی — ۱۴/-
تحریر ہمہ رنگ — محمد اسد اللہ — ۴۰/-
منتخب ادب — مرتبہ سید احتشام حسین — ۲۰/-
مضامین ڈاکٹر عبد الودود — مرتبہ صفیہ ودود — ۴۰/-
فرہنگ انیس اول — نائب حسن نقوی — ۳۶/-
" " دوم — " " — ۹۰/-
سلسلہ روز و شب — صالحہ عابد حسین — ۶۵/-
یادوں کی پرچھائیاں — رحمت امروہوی — ۴۰/-
پسِ پردہ — آغا حمید دہلوی — ۱۰/-
عربی ادب میں ہندستان کا حصہ — شمس تبریز خاں — ۵۰/-
حامد اللہ افسر: حیات، شخصیت اور کارنامے — ڈاکٹر مقصود حسن — ۷۵/-
مرحوم دلّی کی ایک جھلک — مرتبہ شمیم احمد — ۴/۵۰
نذرِ حمید (انگریزی) — مالک رام — ۱۰۱/-
یادگاری خطبات — مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی — ۱۵/-
نذرِ ذاکر — مرتبہ مالک رام — ۱۰۰/-
ارمغان مالک اردو جلد دوم — ۳۰/-
ارمغان مالک انگریزی — ۳۰/-
اردو ناول میں طنز و مزاح — ڈاکٹر شمع افروز زیدی — ۵/-

مطبوعات خدا بخش لائبریری پٹنہ

جنید احمد کی آٹوگراف بک — جنید احمد — ۲۰/-
ہندستان کی جنگِ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ — ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین — ۱۰۰/-
ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت — منشی رام پرشاد ماتھر — ۵/-

دیوانِ مصحفی — مرتبہ اسیر لکھنوی، امیر مینائی — ۵۰/-
اورنگ زیب ایک نیا زاویۂ نظر — ڈاکٹر اوم پرکاش ماتھر — ۱۵/-
ایک نادر روزنامچہ — مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — ۳۰/-
ہندستان میں قومی یکجہتی کی روایت — بی، این پانڈے — ۵/-
تواریخ نادرالعصر — مؤلفہ نول کشور — ۲۵/-
من موہن کی باتیں — شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی — ہدیہ ۱۸/-
معیار تحقیق (مجلہ) — ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ — ۱۰/-
کانٹے (کشمیری انشائیے) — ڈاکٹر محمد زماں آزردہ — ۱۵/-
فرہنگ زفان گویا جلد اول — تالیف بدر ابراہیم — ۵۰/-
مغربی تعلیم کا تصور — رشید احمد صدیقی — ۲/-
انتخاب ماہنامہ "ادیب" ۱۳-۱۹۱۰ — نوبت رائے نظر — ۵/-
م ہوشربا اوّل — ۱۰۰/-
" دوم — ۱۰۰/-
" سوم — ۱۰۰/-
" چہارم — ۱۰۰/-
" پنجم اوّل — ۱۰۰/-
" پنجم دوم — ۱۰۰/-
" ششم — ۱۰۰/-
" ہفتم — ۱۰۰/-
مہ طلسم ہوشربا — ۲۰/-
بات طلسم ہوشربا حصہ اول — (زیر طبع)
" " حصہ دوم — (زیر طبع)
ام (ہفتہ وار) — مولانا ابوالکلام آزاد — ۱۰۰/-
نیات عظیم الدین احمد — ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ — ۱۵/-
الہ "زبان" — مدیر خوشتر منگروی — ۵/-
رہ کاملانِ رامپور — مولفہ حافظ احمد علی شوق — ۵/-
ان رضا عظیم آبادی — قاضی عبدالودود — ۱۰/-
ار اردو لغت (جلد اول) — سید یوسف الدین احمد بلخی — ۱۵/-
ب ماہنامہ "العصر" (۱۷-۱۹۱۳) — پیارے لال شاکر — ۹۵/-
ب ماہنامہ صبح امید (۲۱-۱۹۱۸) — برج نرائن چکبست — ۵/-

مذہب اور سوانح

تاریخ اسلام (عہد نبوی تا خلافت راشدہ) — ۱۲/-
المراۃ فی الاسلام (تعریب) غور دیال سنگھ مجذوب — ۹۰/-
اشارے منزل کی طرف — شاہ محمود عثمانی — ۴۰/-
اسوۂ رسول اکرمؐ — ڈاکٹر محمد عبدالحی — ۵۰/-
فکر اسلامی کی تشکیل جدید — مرتبہ ضیاء الحسن فاروقی — ۳۰/-
گوتم بدھ — دھرمانند کوسمبی — ۷/-
تعلیمات اسلام حصہ دوم — مرتبہ مولانا عبدالسلام قدوائی — ۴/-
اُمّت مسلمہ کا انحطاط اور اس کی تعمیر نو — غلام محمد — ۵۰/-
نکات قرآن — مولانا اسلم جیراجپوری — ۲/-
سوامی رام تیرتھ — ڈی، آر، سود — ۸/-
شری اروبندو — نوا جاتا — ۲/۵۰
سردار ولبھ بھائی پٹیل — وشنو پربھاکر — ۴/۵۰

انجمن ترقی اردو کی پُرانی کتابیں

دیوان بہرام — مرتبہ اسلم ضیائی — ۱۰/-
خمسہ کیفی — دتاتریہ کیفی دہلوی — ۵/-
جائزہ زبان اردو — ۲۰/-
پرتھوی راج راسا — محمود خاں شیرانی — ۳/-
تنقید عقل محض — ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین — ۴۰/-
تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ — ۲۰/-

لغات

پیامی ہوم اردو انگریزی ڈکشنری — ۱۶/-
پیامی بیسک انگلش اردو ڈکشنری — ۴/-
فیروز اللغات کلاں — مولوی فیروزالدین — ۱۴۰/-
اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری — بابائے اردو — ۱۶/-
" اردو انگلش ڈکشنری — ۱۴۰/-
فرہنگ عامرہ — ۸۰/-

رسائل

شعور نمبر ۲	مرتبہ بلراج مینرا شرودت	۲۵/-
شعور نمبر ۳	〃 〃 〃	۳۰/-
شعور نمبر ۴	〃 〃 〃	۲۵/-
شعور نمبر ۵	بلراج مینرا شرودت	۳۰/-
شعور نمبر ۶	〃 〃 〃	۴۰/-
شیرازہ	دوماہی مارچ ۱۹۶۲ء	۲/۵۰
خدابخش جنرل نمبر ۴۴		۱۵/-
تحریر نمبر ۲۵	اڈیٹر مالک رام	۵/-
شاعر، بمبئی	اقبال نمبر	۵۰/-
اظہار نمبر ۵	باقر مہدی	۹۰/-

ناول، افسانے، ڈرامے اور خاکے

جگنوؤں کی دنیا	قرۃ العین حیدر	۶۰/-
سنہری ریت	زوبی ٹھاکر	۲۰/-
حرف نیم کش	عظیم اختر	۳۵/-
دہشت	ظفر پیامی	۴۵/-
دوسرا کمرہ (ڈرامے)	زاہدہ زیدی	۷/-
نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی (افسانے)	ساجد رشید	۴۰/-
کلر بلائنڈ (افسانے)	انور قمر	۳۰/-
کتھا (مراٹھی افسانے)	ترجمہ خالد اگاسکر	۸۰/-
یہ لوگ	سری نواس لاہوٹی	۳۵/-
زربیل (افسانے)	مقدر حمید	۴۰/-
باولبیرے (افسانے)	انور خاں	۴۰/-
مکان (ناول)	پیغام آفاقی	۱۰۰/-
پھول جیسے لوگ	انور خاں	۴۰/-
پانی (ناول)	غضنفر	۳۰/-
عکس (افسانے)	نگار عظیم	۲۵/-
بند کمروں کی کھلی کھڑکیاں۔	ہاجرہ شکور	۴۰/-
آگ الاؤ صحرا	قمر احسن	۲۵/-

اڑیا افسانے	پٹھانی پٹ نایک	۱/۵۰
جے کانتن کی کہانیاں	ٹی، جے کانتن	۱/۵۰
سات رنگ	عبداللہ حسین	۰/-
کتھا نگر	جوگندر پال	۳۶/-
خوشبوں کا باغ	انور سجاد	۰/-
بگولے	شمائل احمد	/-
اڑتے لمحے	ستیش بترا	۵/-
ذرا سی بات	ابوالکلام عزیزی	۵/-
تلخیاں	رشید اختر ندوی	/۵۰
شہناز	حبیب اشعر	/۵۰
ہلاکِ فریب	اثر لکھنوی	/-
وہ لڑکی	سندر شیام پرویز	۲/-
کوئی درد آشنا بھی نہیں	صغرا مہدی	۲/۵۰
ولیم ماتسٹر	گوسٹے	۷/-
بارہ آنے	پرویز	۱/-
ماہم کی کھاڑی	مدھو منگیش کرنک	۱/۷۵
ہنگر واڈی	ونیکٹش ماڈگولکر	۵/۲۵
بادل چھٹ گئے	یوگیش داس	۱۰/۵۰
پنجابی کے یک بابی ڈرامے	مرتبہ عطر سنگھ	۱۲/-
گجراتی کے یک بابی ڈرامے	مرتبہ ایم۔ایم راول	۱۲/۲۵
سفید خون	نانک سنگھ	۸/-
چار دیواروں میں	ایم ٹی، واسودیون نائر	۶/۷۵
تصویر بتاں	الکھیلن	۱۲/۷۵
دیمک	شنر شنیدو مکھوپادھیائے	۶/۷۵
رود چراغِ محفل	بچی بابر	۱۶/۲۵
پورن کمبھ	رانی چند	۱۶/۷۵
آدھی گھڑی	پارپتر تو	۱۵/-
سپلا راجا، آدھے ادھورے،	جگدیش چندر ماتھر، موہن راکیش	۱۱/-
آئینہ	پی کیغو دیو	۹/۵۰
نئی فصل	بجن بھٹاچاریہ	۸/۶۵

کتاب	مصنف	قیمت
سورٹھ تیرا بہتا پانی	جھویر چند میگھانی	۱۲/-
ریل گاڑی	چندر ودن چمن لال مہتہ	۷/۷۵
سفر تمام ہوا	نیل پدمنا بھن	۱۱/۷۵
چک ویرراجندر	سری نواس دماستی ونیکٹش آئنگر	۲/۵۰
گنگا انگنا ماتی	شنکر موکاشی پنیکر	۱۴/-
شاعر	تاراشنکر بندو پادھیائے	۸/۷۵
موت کے بعد	شیورام کارنت	۸/۷۵
لہروں کی آواز	کلکی راکرشنا مورتی	۱۹/۵۰
نیل کنٹھ پاکھی ٹوہ	آتین بندو پادھیائے	۱۵/-
یہ ہماری زندگی	دلیپ کور ٹوانہ	۴/۲۵
آدھے چاند کی رات	گوردیال سنگھ	
ناٹا آدٹ	شیخ رحمن اکولوی	۲۰/-
حرف نیم کش	عظیم اختر	۳۵/-

شعری مجموعے

کتاب	مصنف	قیمت
گل صنوبرہ	شفیق فاطمہ شعریٰ	۳۶/-
غزل پارے (انتخاب)	شجاع خاور	۶۰/-
خوشی بول اٹھی ہے	عبدالاحد ساز	۴۰/-
سفر زاد	اجمل اجملی	۳۵/-
بازدید	مخمور سعیدی	۹۰/-
سنگِ جاں	زاہدہ زیدی	۴۵/-
حدیث دار	منصور الدین قریشی منصور	۳۰/-
عام ساز و عمل	شارق کیفی	۵۰/-
مراثی شاد	مرتبہ نقی احمد ارشاد	۵۰/-
باقیاتِ شاد	" " "	۲۲/-
چراغ اور کنول	اختر حمید خاں	۴۵/-
کربِ تنہائی	رفعت سروش	۵/-
بوئے رمیدہ	جگن ناتھ آزاد	۹/-
نوشتے	سلمان عباسی	۵۰/-
چراغ چشمِ تر	ظفر گورکھپوری	۴۰/-
متاعِ آخر شب	محسن زیدی	۴۰/-

کتاب	مصنف	قیمت
تنہا تنہا	شکیل دسنوی	۴۰/-
ملن کی آس	شمس فرخ آبادی	۱۵/-
سرِ شاخِ طوبیٰ	نضا ابن فیضی	۷۵/-
دریچۂ سیم وتن	" "	۵۰/-
شہر خوں آشام	ترجمہ شمیم حنفی	۴۰/-
موسم بھیگی آنکھوں کا	رفیعہ شبنم عابدی	۲۵/-
کمند حرف	عمران عظیم	۵۰/-
دھنک احساس کی	راج نرائن راز	۴۵/-
جام فروزاں	بشیر الہ آبادی	۳۵/-
لالہ زارِ صبح	ناشر نقوی	۴۰/-
مصرعِ ثانی	شجاع خاور	۵۰/-
وادین	" "	۲۵/-
طلسمِ سفر	خسروی	۴۰/-
زخمِ خنداں	این۔ اے مہدی	۲۵/-
سمندر آشنا	خالد محمود	۱۵/-
یدِ بیضا	ساحر بھوپالی	۴/-
ذوقِ سفر	غلام ربانی تاباں	۹/-
دیوانِ حضور	مرتبہ مختار الدین احمد	۱۰/-
گرد باد	عزیز قیسی	۴۰/-
آئینہ در آئینہ	" "	۴/-
نگارِ حکمت	محمد فضل الرحمٰن	۹/-
لمعاتِ نور	حکیم سیوہاروی	۱۰/-
موسم زرد گلابوں کا	شاہد میر	۲۵/-
کاروانِ منزل	گوپی ناتھ امن	۲/۵۰
ہندستان ہمارا اول، دوم	جاں نثار اختر	۴۰/-
دھوپ، سایہ اور میں	وقار واثقی	۸/-
جوئے شیر	آنند نرائن ملا	۱۵/-
معرکۂ کربلا	ایم مظفر نگری	۱۵/-
ضبط شدہ نظمیں	مرتبہ خلیق انجم	۲۱/-
بھرتری ہری اردو میں	منظوم ترجمہ یوسف ناظم	۵/-
بزمِ خیال	سیدہ فرحت	۴/-

موج شفق موج غبار — نور پرکار — ۱۰/۰۰
گل رعنا — مرتبہ مالک رام — ۱۰/-
حرف تمنا — معین کوثر — ۱/-
متاع کلیم — کلیم احمد آبادی — ۴/-
صبح حیات — ناز مراد آبادی — ۵/۵۰
سحلیات عرش ملسیانی — مرتبہ مالک رام — ۷۵/-
نوائے بلبل — سروجنی نائیڈو کی انگریزی کتاب کا ترجمہ — ۸/-
ماتم سالک — جگن ناتھ آزاد — ۱/-
ہم اور ہمارے رسولؐ — مولانا ظفر علی خاں — ۱۲/۵۰
شمیم — شمیم جے پوری — ۳۰/-
آتش سیال — ساجدہ زیدی — ۱۰/-
موجیں — راجیندر بہادر موج — ۳۰/-
بہتا پانی — احمد وصی — ۱۵/-
بوئے سمن — مستورہ حیات — ۲۰/-

متفرقات

تکمیلی احصا — سانتی نارائن — ۲۲/۵۰
ہندستانی معاشیات — الکا گھوش — ۲۷/۲۵

کتابیں

جواہر لال نہرو کا بھارت — ۵/-
دنیا کے جانور — نور سیدہ زیدی — ۲/۵۰
گلابو چوہیا اور پری زاد — " — ۲/۵۰
تیار رہو — اومانند — ۱/۵۰
ہزاروں برس میں — صفدر عباس نقوی — ۱/۵۰
چڑیاں — سلطانہ آصف فیضی — ۳/-
ہماری ندیوں کی کہانی حصہ دوم — ایل وی آیا — ۱/۵۰

ننھا پودا — نجمہ صالح
نٹ کھٹ چنو — تسنیم حیدر
چار سہیلیوں کی کیاریاں — غلام حیدر
پھول کے مہمان — شمس الاسلام فاروقی
تتلی کے بچے — زاہدہ خاتون
کاربن، قدرت کا انمول عطیہ — طلعت عزیز

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

اپریل ۱۹۹۱ء جلد ۳۱ شمارہ ۴

فی پرچہ 5/=
سالانہ 45/=
غیر ممالک سے
(بذریعہ بحری ڈاک) 110/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 230/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 65/=

ایڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
TELEPHONE. 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵ ۱۱۰۰ سے شائع کیا

اس شمارے میں

نئی مطبوعات

اسلام میں راسخ الاعتقادی۔ بیچ کی راہ (خطبہ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی) ۸/-
ہندستانی مسلمان آئینہ ایام میں ڈاکٹر سید عابد حسین ۵/-
ابتدائی قواعد اردو (ادارہ) ۵/-
طلسمی گھوڑا ایم یوسف انصاری ۳/-
بنگال میں غالب شناسی (تنقید و تحقیق) پروفیسر کلیم سہسرامی ۴/-
پرواز سخن (شعری مجموعہ) ناشاد اورنگ آبادی ۳/-
دخل در معقولات (مزاحیہ مضامین) مجید جمال ۵/-
سورج میرے تعاقب میں (شعری مجموعہ) ہیرانند سوز ۴/-
نذر اعظم (نذر) مرتبہ ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی
دراصل (مزاحیہ مضامین) فاروقی نشتر ۲/-
تاریخ الامت (حصہ پنجم) (تاریخ) مولانا اسلم جیراجپوری ۲۷/-
ادبی تجزیے (تنقیدی مضامین) ڈاکٹر صابر سنبھلی ۸/-
شعور و ادراک (مضامین و خاکے) محمد ایوب واقف ۸/-
جنوبی و شمالی ہند کی تاریخی مثنویاں۔ کندن لال کندن ۸/-
پرچھائیاں (ناول) (گجراتی سے ترجمہ) وقار واثقی
ڈاکو ملے کریں گے (افسانے) م ناگ ۴/-
سید عبدالرحیم ہندستانی فٹ بال کا مسیحا الف انصاری ۲۵/-
موج سحر (شعری مجموعہ) ڈاکٹر انجنا سندھیر ۴/-
مضامین مدنی۔ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ۵۲/-
گجراتی مثنویاں مرتبہ " " ۳۵/-
تذکرۃ الوجیہہ سید حسینی پیر علوی ۴۷/-
پیشہ تو سپہ گری کا بھلا (تنقیدی مضامین) وارث علوی ۵۶/-
شہر خوباں (شعری مجموعہ) عاصی نا گفتی ۴/-

سرورق :۔ مسعود احمد برکاتی

ادبی اصناف گیان چند ۳/-
کچھ بچا لایا ہوں (تنقیدی مضامین) وارث علوی ۵۱/-
اجنبی گدھا (افسانے) شام بارک پوری ۶/-
زبان زخم (شعری مجموعہ) انجم عرفانی ۳۰/-
دہلی کے مشاعرے (مشاعرے) مرتبہ سرور تونسوی ۱۵/-
کلیات اکبر مکمل (شاعری) " " ۱۵/-
اعجاز مسیحا (ناول) نہال آڑھوی ۴/-
بچاری (افسانے) سطوت زہرا سطوت ۲۵/-
غالب احوال و آثار (غالبیات) حنیف نقوی ۶/-
اچھا خط کیسے لکھا جائے (انشاء پردازی) محمد صہیب دہلوی ۷/۵۰
غزل پارے (منتخب اشعار) شجاع خاور مرتبہ نور جہاں ثروت ۱۰/-
اقبال پر نئی تنقید و دیگر مضامین (اقبالیات) ڈاکٹر محمد حنیف ۶/-
حیدرآباد میں اردو کی ترقی (ادب) ڈاکٹر سید مصطفٰے کمال ۸/-
اردو ہندی ڈکشنری (نیا اڈیشن) ترتیب انجمن ترقی اردو ہند ۵/-
شہر آہو خانہ (افسانے) قمر احسن ۱۰/-
تاریخ جامعہ اردو علی گڑھ (تاریخ) ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۵/-
اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل (تنقید) ڈاکٹر صغیر ابراہیم ۶/-
خواب اور حقیقت (مضامین) پروفیسر عبدالسلام ۵/-
مجاہد اسلام (سوانح) شمیم فاروقی ۵/-
پیراہن جاں (شاعری) منظر شہاب ۶/-
چوتھا شوہر (افسانے) ناظمہ حسن ۵۰/-
آوارہ بگولے (" ") " " ۵/-
علم سنت الاسلام ۶/-
جدید تاجیکی شعرا کبیر احمد جائسی

مہمان مدیر
مسعود احمد برکاتی
۱۵/۲۲۶۔ دستگیر سوسائٹی
کراچی ۳۸

اشاریہ

مصنّف، مدیر، قاری — ایک مثلّث!

سماج کے لیے رسائل کا وجود اتنا ہی ضروری ہے جتنا فرد کے لیے تازہ ہوا کا۔ رسائل ذہنی زندگی کو متحرک کرتے ہیں، نئے افکار کی تخلیق میں مدد دیتے ہیں، مسائل کو زیرِ بحث لاتے اور نکھارتے ہیں۔ غور کیا جائے تو ہر سماجی، سیاسی، علمی، دینی اور ثقافتی تحریک کو جنم دینے اور آگے بڑھانے میں رسائل کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ رسائل کی حیثیت شعور کے بہتے ہوئے دریا کی مانند ہے جو فکر و دانش کے بہاؤ کو جاری و ساری رکھتا ہے۔ رسائل معاشرے میں علمی، ادبی فضا پیدا کرتے ہیں۔ نو بہ نو افکار و نظریات اور معلومات و اطلاعات کی اشاعت بھی ان کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اردو ادب رسائل ہی کے توسط اور وسیلے سے نئے خیالات، جدید رجحانات، تازہ فکری زاویوں اور نئے اسالیب بیان سے روشناس ہوا۔ ادبی، علمی، ثقافتی اور سماجی میدانوں میں یورپ کی پیش رفت اور مغرب کے ذہنی میلانات سے متعارف کرانے میں بھی اردو رسائل نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ دوسری زبانوں کے شہ پارے اردو میں منتقل کرنے کے محرک رسائل ہی بنے۔ اس طرح ایک طرف مغربی ادب کے تراجم کی داغ بیل پڑی تو دوسری طرف عربی اور فارسی کے دینی، تاریخی اور ادبی سرمایے کی منتقلی میں پیش رفت ہوئی اور اردو زبان ترقی یافتہ زبانوں کی ثروت میں حصے دار بنی۔

بعض موضوعات نہایت اہم، غور طلب اور نتیجہ خیز ہوتے ہیں، لیکن ان کے اظہار و بیان میں اتنی وسعت نہیں ہوتی کہ کتاب کی وسعت درکار ہو، ان کے لیے تنگ نائے رسالہ ہی کافی اور موزوں ہوتا ہے۔ یہ ذریعۂ ابلاغ و ارسال ان موضوعات کے لیے موجود و مہیّا ہو تو ہو سکتا ہے کہ یہ تشنۂ اظہار ہی رہ جائیں اور یہ صورت زبان و ادب کی محرومی کے مترادف کہی جا سکتی ہے۔ ایک بار لفاظۂ تحریر میں در آجانے کے بعد ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے کہ یہ موضوعات بڑھ اور پھیل کر مستقل کتابوں پر محیط ہو جاتے اور اجتماعی فکر کی مستقل رو بن جاتے ہیں۔

اردو ادب کے ذوق کو فروغ دینے میں بھی رسائل کا بڑا حصہ ہے۔ رسائل نے جہاں ادب کی جدید تحریکوں کو فروغ دیا، وہاں اردو کے کلاسیکی سرمایے کی طرف توجہ دلانے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ ہے غالب کی عظمت بحال کرنے میں کتابوں نے جو حصّہ لیا وہ اپنی جگہ، لیکن نئی نسل تک غالب کو پہنچانے اور اس کی زندگی و شاعری کے نئے گوشے نمایاں کرنے کا فریضہ رسائل ہی نے انجام دیا۔ رسائل ہی کے

ذریعے سے غالب کے علاوہ دوسرے کلاسیکی ادبا وشعرا کے مطالعے کی ضرورت واہمیت واضح اقبال کے کلام کی اوّلین اشاعت اردو رسائل ہی کی رہین منت کہی جاسکتی ہے۔ اقبال پر کتابوں بڑی تعداد حالیہ برسوں میں شائع ہوئی ہے ورنہ کلام وپیغام اقبال کو عام پڑھے لکھے آدمی تک پہنچانے کی خدمت رسائل نے ہی انجام دی۔

مغربی دنیا ہو یا اسلامی دنیا، دینی تحریکیں ہوں یا سماجی رجحانات، سائنسی پیش رفت ہو یا اختراع کی اطلاعات، امن وصلح کی تدابیر ہوں یا تصادم اور محاربات کی زور آزمائیاں، کتابوں سے رسالوں میں منعکس ہوتی ہیں۔ پھر اردو کے معاملے میں تو رسائل کی خدمات خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ غلامی کی ذلتوں کا احساس دلانے، آزادی کی تڑپ پیدا کرنے اور جدوجہد آزادی کی رہنماؤں کی شخصیتوں اور کارناموں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ طبقے میں خودی وخود آگہی اور شعور عظمت پیدا کرنے میں اردو رسائل کا حصہ تاریخ وطن کا اہم جزو ہے۔

مواد مطالعہ میں کتابوں اور رسالوں کی اہمیت بعض اعتبارات سے یکساں ہے۔ کتاب کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اپنے موضوع پر مرتکز اور جامع مواد پیش کرتی ہے اور طویل زندگی پاتی ہے جب کہ رسائل دائمی افکار کے ساتھ ساتھ موقتی مسائل کو بھی اپنے میں جگہ دیتے ہیں لیکن رسائل کو ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ کتاب اس معنی میں صرف ایک مراسلہ ہے اور رسالہ جوابی خط۔ رسائل کے ذریعے سے ابلاغ کے تقاضے مکمل طریقے سے ادا ہوتے ہیں۔ رسائل دوطرفہ (ٹو وے) ابلاغ کا ذریعہ ہیں۔ ان میں قلم کار کے ساتھ قاری بھی شریک ہوتا ہے۔ قارئین کے ردّعمل سے رسائل میں لکھنے والے بہ آسانی اور بہ عجلت واقف ہوجاتے ہیں۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہوا میں تیر نہیں چلا رہے ہیں بلکہ ان کی پھینکی ہوئی چیز ان تک واپس بھی آتی ہے اور وہ اس کو مزید نکھار سنوار سکتے ہیں۔ اس طرح ابلاغ زیادہ بھرپور، واضح اور روشن ہوجاتا ہے۔

ایک اور وصف جو رسائل کے ساتھ مخصوص ہے، یہ ہے کہ رسالے کا مدیر، لکھنے والے کی تخلیق میں تو شریک نہیں ہوتا، لیکن ابلاغ میں ضرور سہیم ہوتا ہے گویا رسائل میں لکھنے والے کے دو شریک ہوئے۔ مصنّف، مدیر اور قاری کی یہ تثلیث ادب پارے کو معاشرے میں زیادہ جاگزیں کرتی ہے اور ادیب کے پاؤں، تخیلات اور جذبات کی فضاؤں سے نکل کر معاشرے کی زمین پر جمنے لگتے ہیں۔

اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ مدیر اور قاری کی شرکت اپنی نوعیت میں تو ایک ہے، لیکن شدّت اور مدارج میں مختلف۔ کوئی مدیر کس حد تک اپنے قلمی معاون کا ذہنی معاون ہوتا ہے۔ یہ انفرادی معاملہ ہے۔ بعض مدیر اپنے فکر اور اپنے نقطۂ نظر کی طاقت سے اپنے رسالے کی تحریروں پر زیادہ مؤثر ہوتے ہیں بعض کم۔ ہوسکتا ہے کہ بعض مدیر اپنی ذہنی توانائی، اپنے تجربے اور علم کی بنا پر رسالے کی بیش تر تحریروں میں شریک غالب ہوجاتے ہوں اور بعض کی حیثیت محض ڈاکیے کی سی ہو، لیکن صحیح پیش کش کرکے ابلاغ میں کسی نہ کسی حد تک ضرور حصّے دار ہوتے ہیں اور اس طرح تخلیقی عمل میں شریک نہ سہی معاون تو ہوتے ہی ہیں۔

قارئین کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ قارئین کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔ دو قسمیں تو سامنے کی ہی
یں۔ فعال قارئین اور مجہول قارئین۔ مجہول قارئین بھی اس لحاظ سے قابلِ قدر ہیں کہ وہ رسالے کی اشاعت
ں حصّے دار تو بہرحال ہوتے ہیں، لیکن اس کی ذہنی وسعت میں معاون نہیں ہوتے۔ پڑھ لیا اور
س۔ کوئی خاص نقش ان پر نہیں جمتا، لیکن فعال قارئین جو کچھ پڑھتے ہیں اس میں اپنے کو شامل کر لیتے ہیں
ہ اپنے مطالعے اور ذہنی پس منظر کے ساتھ تحریر کو وصول اور قبول کرتے ہیں۔ کبھی وصول کر کے رد بھی کر دیتے
یں۔ یہ ردّ و قبول ان کی زندگی کا مظہر اور ادب پارے کی توانائی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ میں اسی لیے ایسے قارئین
کو زندہ قارئین کہتا ہوں۔ جس رسالے کو ایسے قارئین میسّر آجائیں وہ خوش قسمت ہوتا ہے۔ ایسے قارئین
رسالے کو مرنے نہیں دیتے۔ تقریباً ہر رسالے کو دونوں قسم کے قارئین سے واسطہ پڑتا ہے۔ کسی رسالے کے
قارئین میں فعال قارئین کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اور کسی کے مجہول قارئین کی۔ زندہ قارئین مدیر ہی کے
یے نہیں مصنّف کے لیے بھی نعمت سے کم نہیں ہوتے۔

جو رسائل مدیر، مصنّف اور قارئین کی اچھی ذہنی سطح سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ وہ اعلا درجے کا
ادب پیش کرتے ہیں اور ادبی تاریخ میں نقشِ دوام ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی اہم کتابیں

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور

اس مجموعے میں پروفیسر آل احمد سرور کے جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق زیادہ تر شاعروں اور شاعری کی خصوصیات سے ہے میر، غالب، انیس، حسرت، فانی، جوش اور فراق کی شخصیات اور شاعری پر بھرپور مضامین کا اہم مجموعہ۔ قیمت :/ ۵۱

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم
ڈاکٹر سلامت اللہ

اس کتاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے جن مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے وہ مصنف کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے کہ اس کے تاریخی اور حالیہ شواہد موجود ہیں۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کی اہم ترین تصنیف۔
قیمت :/ ۵۱

اقبال کا نظریۂ خودی — عبدالمغنی

اس کتاب میں نظریۂ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کر کے اقبال کے پورے نظام فکر کی تلاش کی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی شاعری کی حقیقی جہت واضح ہو اور دوسری طرف آج کی انسانیت کو اپنے ارتقا کی صحیح سمت دریافت کرنے میں سہولت ہو۔ قیمت :/ ۱۵۰

پت جھڑ کی آواز — قرۃ العین حیدر

برصغیر کی ممتاز ترین افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کی اہم کہانیوں کا مجموعہ۔ یہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور زندگی کی صحیح عکاسی بھی کرتی ہیں۔ نیا اڈیشن قیمت :/ ۷۵

جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔ قیمت :/ ۳۶

لکھنؤ تہذیب کا نمائندہ شاعر

قلندر بخش جرأت (خطبہ) — جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸ نومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سیمنار میں پیش کیا۔
قیمت :/ ۱۰

غبار منزل (شعری مجموعہ) — غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا تازہ مجموعہ جس میں سازِ لرزاں "ذوق سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت :/ ۴۵

تاریخ اودھ — قاسم علی نیشاپوری

"تاریخ اودھ" معروف بہ "تاریخ شاہیہ نیشاپوریہ" اودھ کی اہم تاریخ ہے۔ قاسم علی نیشاپوری نے اسے فارسی میں لکھا تھا ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے نہایت محنت سے اس کو اردو کا جامہ پہنایا۔ قیمت :/ ۲۷

فی الحقیقت — یوسف ناظم

طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں یوسف ناظم کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ان کی تحریریں نہایت ذوق شوق اور توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔ "فی الحقیقت" ان کے تازہ ترین طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔
قیمت :/ ۴۵

معین احسن جذبی
فروزاں۔ سرسید نگر
علی گڑھ ۲

غزل

نہ کوئی آہ، نہ کوئی خلش، نہ درد، نہ غم
وہ یاد آئے تو پہروں سکوت کا عالم

دکھا گئی مجھے نیرنگیاں زمانے کی
وہ اک نگاہ، کبھی ملتفت، کبھی برہم

حلاوتوں میں وہ ڈوبی سی اک کرم کی نگاہ
لطافتوں میں وہ لپٹے ہوئے ہزار ستم

وہ ایک شام کہ خود جل اُٹھے ہیں گھر کے چراغ
وہ ایک صبح کہ خود جس پہ رو پڑی شبنم

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں اُن کو آہ کیا کہیے
لبوں پہ ایک تبسّم، دلوں میں اک ماتم

محبتوں میں یہ ایماں، یہ چشم نم، یہ تڑپ
بتوں سے ہم کو بہت کچھ ملا خدا کی قسم

کہاں میں اور کہاں اپنا احتساب مگر
مخالفوں کی عنایت ہے، دشمنوں کا کرم

عجیب دھن تھی کہ ٹھہرے کہیں نہ دیوانے
وہ راحتوں کا چمن ہو کہ خارزارِ الم

وہ بینواؤں کی بستی نہ ہو کہیں اے دوست
نظر بچا کے چلے ہیں جدھر سے اہلِ کرم

مرا فسانہ بھی کیا بے اثر فسانہ ہے
نہ کوئی زلف پریشاں، نہ کوئی آنکھ ہے نم

ق

مجازؔ و اخترؔ و مخدومؔ و فیضؔ ـــــ آہ کہاں
مرے رفیق، مرے ہمنوا، مرے ہمدم

کبھی وہ محفلِ حُسن و وفا میں نغمہ سرا
کبھی سلاسل و زنداں کی سمت اُن کے قدم

یہ وہ ہیں جن سے فروزاں تھے آگہی کے چراغ
یہ وہ ہیں جن سے تھا اک دورِ شاعری کا بھرم

یہ وہ ہیں جن سے ہوا اور بھی جلیل و جمیل
بلاکشوں کی اُمیدوں کا جانفزا پرچم

نہ پوچھ کیوں مجھے آتے ہیں یاد اے جذبیؔ
جہانِ درد میں دردِ جہاں کے وہ محرم

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی اور اہم کتابیں

تنقید اور جدید اردو تنقید ڈاکٹر وزیر آغا
ڈاکٹر وزیر آغا اردو تنقید میں ایک مکتب کہلاتے ہیں۔ ان کا منفرد انداز فکر ونظر اور موقف زیر نظر مجموعہ میں بھی جھلکتا ہے۔ اردو تنقید پر کام کرنے والے اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ۶۰/-

مشقی تدریس۔ کیوں اور کیسے؟
ڈاکٹر محمد اکرام خاں

ڈاکٹر محمد اکرام خاں نے استادوں کی ٹریننگ کے عملی پہلو کی اہمیت کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور اس کے پیش نظر "مشقی تدریس" پیش کی۔ یہ کتاب آپ کے طویل تجربے، عمیق مطالعے اور تحقیق کا نچوڑ ہے۔ ۴۵/-

دلی کی چند عجیب ہستیاں اشرف صبوحی
میرامن سے شاہد احمد دہلوی تک دلی کے قلم کاروں کا جو طویل سلسلہ ہے۔ اشرف صبوحی اس کی نہایت اہم کڑی ہیں۔ ان کی دلی کا مرکز لال قلعہ نہیں، شاہجہاں آباد کے عوام ہیں۔ اس میں کبابی بھی ہیں، بھٹیارے بھی، بوڑھے تکیہ دار بھی ہیں اور رنگ ریز بھی۔ دلی کی ٹکسالی زبان میں لکھے ہوئے یہ دلچسپ خاکے اعلا اور جاندار نثر کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ۵۱/-

کچھ مولانا آزاد کے بارے میں مالک رام
مالک رام صاحب نے گذشتہ تیس برسوں میں مولانا آزاد کے بارے میں مختلف موضوعات پر گیارہ مضامین قلمبند کیے تھے۔ یہ کتاب انھیں مضامین کا مجموعہ ہے۔ ۵۱/-

آوازوں کا میوزیم ساگر سرحدی
(افسانے)

ساگر سرحدی کے افسانے دلوں کے تار کو جھنجھوڑتے ہیں اور لاشعوری طور پر اپنے پڑھنے والوں کی توجہ اس مسئلے کی اہمیت کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ ۴۵/-

اپنی ہواؤں کی خوشبو کشمیری لال ذاکر
(خاکے)

اس کتاب میں اردو کے ممتاز ادیبوں، شاعروں اور اردو دوستوں کے ہلکے ہلکے نقوش ہیں۔ مکمل تصویریں نہیں۔ مگر ان خاکوں میں آپ کو نرم نرم ہواؤں کی خوشبو ملے گی۔ وہ خوشبو جس کی تمنا آپ کو برسوں سے ہوگی۔ ۲۷/-

صاحب جی سلطان جی
ڈاکٹر اسلم فرخی

اس کتاب میں حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ اور سلاطین دہلی کے تعلقات کا جائزہ تاریخی بنیاد اور مستند تاریخی حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔ قیمت ۲۰/-

ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب
ایک تنقیدی جائزہ

پروفیسر آل احمد سرور

اس خطبے میں پروفیسر آل احمد سرور نے مجیب صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب THE INDIAN MUSLIMS کو موضوع بحث بنایا ہے۔ خطبے کے آخر میں پروفیسر موصوف نے موجودہ دور میں ہندستانی مسلمانوں کو لاحق مسائل کا تجزیہ کیا ہے اور ایک لائحہ عمل کا تعین کیا ہے۔ قیمت ۸/-

ڈاکٹر ابو محمد سحر
۳۹ مالویا نگر بھوپال ۴۶۲۰۰۳

غزل وطن آشوب

گویا چمن، چمن نہ تھا — اِس کا اُجاڑ بن نہ تھا
خون سے تر روش روش — رنگِ گل و سمن نہ تھا
شورشِ قتل سے کسے — خطرۂ جان و تن نہ تھا
وقفِ ستم جوان و پیر — رحم بہ طفل و زن نہ تھا
عقل کی جا ہیں اسلحہ — موقعِ دم زدن نہ تھا
دعوتِ امن کا جواب — جز سخنِ "بزن" نہ تھا
خارِ الم سے تار تار — کون سا پیرہن نہ تھا
آج، اگر گزر گیا — کل کا کوئی جتن نہ تھا
وائے نصیبِ آدمی — اپنا وطن، وطن نہ تھا
سکۂ دل خرابِ حال — اس کا کہیں چلن نہ تھا
حرص و ہوس کا زر تو ہے — صدق و صفا کا دھن نہ تھا
بزمِ ادب بھی دم بخود — کہنے کو کچھ سخن نہ تھا
چند خیالِ بے محل — جن کا کوئی ثمن نہ تھا
نظم بھی ہے اداس اداس — اب وہ غزل کا فن نہ تھا
نثر تمام تر فضول — شعر اثر فگن نہ تھا
تم بھی سحر رہو خموش — کوئی جوازِ فن نہ تھا

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/-
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/-
پت جھڑ کی آواز	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/-
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبد المغنی	۱۵۰/-
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶=
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/-
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/-
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/-
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۴۵/-
قلندر بخش جرأت	(خطبہ)	جمیل جالبی	۱۰/-
عجائب گھر	(بچوں کی سائنسی کتاب)	قاسم صدیقی	۱۰/-
تاریخ اودھ	(تاریخ)	ترجمہ و ترتیب شاہ عبدالسلام	۲۷/-
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	(ادب)	ظ انصاری	۳۳/-
تنقید اور جدید اردو تنقید	(تنقید)	ڈاکٹر وزیر آغا	۶۰/-
مشقی تدریس، کیوں اور کیسے؟	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۴۵/-
آوازوں کا میوزیم	(افسانے)	ساگر سرحدی	۴۵/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو	(خاکے)	کشمیری لال ذاکر	۳۶/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	(خاکے)	اشرف صبوحی	۵۱/-
چند تصویر بتاں	(تاثرات)	مولانا عبدالسلام قدوائی	۴۵/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	(ادب)	پروفیسر آل احمد سرور	۶/-
صاحب جی سلطان جی	(تذکرہ)	ڈاکٹر اسلم فرخی	۰/-
نظام رنگ	(ادبی خاکہ حضرت نظام الدین اولیا)	" " "	۹/-
شہید جستجو	(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)	ضیاء الحسن فاروقی	۵/-
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست	(مذہب)	مشیر الحق	/-
ہمارے دینی علوم	(مذہب)	مولانا اسلم جیراجپوری	/-
تحقیقی مضامین	(تحقیق)	مالک رام	۰/-
آسان اردو، ورک بک	(تعلیم)	شکیل اختر فاروقی	۲/-

وزیر آغا
۵۸۔ سول لائن سرگودھا۔ پاکستان

موت کی دستک!

اردو کی کلاسیکی شاعری میں موت کا موضوع اپنے مخصوص سیاق و سباق کے ساتھ موجود ہے یعنی سے مذہبی اور مابعد الطبیعیاتی میلانات نیز ایک مخصوص سماجی اور ثقافتی فضا نے ایک مرتب اور ِدون صورت عطا کر دی ہے۔ اس فضا میں موت محض "ماندگی کا وقفہ" ہے، زندگی کا انجام نہیں ہے۔ دجودہ زندگی قطعاً عارضی نوعیت کی ہے جب کہ آنے والی زندگی دائمی ہوگی۔ درمیان میں موت ایک رح کی نیند ہے۔ جس سے روح کی قلب ماہیئت ہوتی ہے۔ ریشم کا کیڑا اپنے گرد ریشم کا ایک جال ائن کر گہری نیند میں چلا جاتا ہے مگر جب اس نیند سے بیدار ہوتا ہے تو کیڑا نہیں رہتا تتلی بن اتا ہے۔ کیڑے سے تتلی تک کا سفر اُس بے پایاں گہری نیند کے بغیر ممکن نہیں ہے جسے ہماری کلاسیکی لرنے "موت" کا نام دیا تھا۔ لہٰذا مشرق والوں نے موت کو زندگی کے لیے اتنا ہی ضروری سمجھا ہے تنا کر جاگنے کے لیے سونا! نتیجہ یہ کہ موت کے ساتھ شخصی سطح کا خوف، خاک میں خاک ہو جانے کا خدشہ ور اس کے دائمی ہونے کا جو احساس مغربی فکر میں نمودار ہوا، اس سے مشرق بحیثیت مجموعی "آزاد" ہا۔ مگر بیسویں صدی میں صورتِ حال تبدیل ہو گئی ہے۔ مشرق کا فرد بھی اب اپنی سوسائٹی کا عضو معطل ہیں ہے بلکہ اپنی انفرادیت کا اعلان کرنے لگا ہے۔ لہٰذا موت بھی اب ایک اجتماعی عمل نہیں رہا (جسے رگِ انبوہ جشنِ دارد، کہا گیا تھا) بلکہ انفرادی، حادثاتی اور شخصی نقصان کے احساس سے عبارت دکھائی دینے لگا ہے۔ گویا موت نے ایک فطری عمل کے بجائے، غیر فطری حادثاتی صورت اختیار کر لی ہے۔ بالخصوص جدید اردو نظم میں موت کو ایک ایسے عفریت کے طور پر محسوس کیا گیا ہے جو فرد کے زندہ رہنے کے حق پر ڈاکہ ڈالتا ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں میرے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ کیا مجید امجد کی شاعری موت کے سلسلے میں جدید رویے سے عبارت ہے یا کلاسیکی اندازِ فکر کی مؤید ہے یا کیا ان دونوں کے امتزاج سے مجید امجد کے ہاں موت کے موضوع نے ایک ایسی منفرد صورت اختیار کی ہے جس پر اس کی شخصیت بلکہ پوری ذات کی چھاپ موجود ہے؟ میں آیندہ چند صفحات میں ان تمام سوالوں پر ایک نظر ڈالنے کی کوشش کروں گا۔

مجید امجد کی شاعری میں موت کی پہلی دستک اس کی نظم "شاعر" (۱۹۳۸ء) میں سنائی دیتی ہے۔ یہ نظم ایک رومانوی رویے کی غماز ہے اور جیسا کہ رومانوی انداز کا دستور ہے اس میں موت اور رومان باہم آمیز ہو گئے ہیں۔ شاعر دریچے کی چق کے ہلنے کا منتظر ہے تاکہ اس کی زندگی میں بھی کوئی عورت داخل ہو مگر ساتھ ہی وہ جانتا ہے کہ یہ رومان عارضی ثابت ہوگا — وجہ یہ کہ وقت صبا رفتار ہے اور وہ خود اس کے راستے میں موم بتی کی طرح جلنے، پگھلنے اور بالآخر بجھ جانے کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ ایسے میں اسے موت بصورت اجل نظر آتی ہے جو اس کے ننھے سے چڑیا ایسے وجود پر جھپٹنے کے لیے تیار ہو۔ اس سے اگلی نظم "صبح نو" (۱۹۳۸ء) میں ایک بار پھر مجید امجد نے زندگی کو ایک "سانس کی مہلت" قرار دیا ہے۔ دونوں نظموں میں اس برصغیر کا وہ کلاسیکی رویہ خاصا توانا ہے جو زندگی کو عارضی اور فنا آشنا قرار دیتا ہے۔ اس زمانے میں مجید امجد ہاتھ بڑھا کر زندگی سے اس کے سارے لذائذ اور اثمار (جن میں محبت کی اہمیت سب سے زیادہ ہے) حاصل کر لینا چاہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت انجام ہے اور اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا تو محرومی جاوید اس کا نوشتۂ تقدیر بن جائے گی۔ یہ ایک طرح کا ایپی کیورین رویہ بھی ہے جو مغربی فکر میں عام طور سے پروان چڑھا ہے۔

اس سلسلے کی اگلی نظم "بیاہی ہوئی سہیلی کا خط" (۱۹۴۰ء) ہے جس میں پہلی بار مجید امجد نے بیاہی ہوئی سہیلی کی وساطت سے خودکشی کے میلان کا اظہار کیا ہے۔ نوجوانی کے رومانوی دور میں جب محبوب تک رسائی پانے کا جذبہ بہت مشتعل اور وقت کے تیزی سے گزرتے چلے جانے کا احساس بہت شدید ہوتا ہے، زندگی کو اپنے ہی ہاتھوں ختم کرنے کی وہ خواہش بھی زیر سطح کلبلا رہی ہوتی ہے جسے فرائڈ نے THANATOS یا جبلت مرگ کا نام دیا تھا۔ نظم میں قطعاً "غیر شعوری طور پر مجید امجد نے سوہنی کے رومان کی طرف بھی ایک معنی خیز اشارہ کر دیا ہے جس سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ کیا سوہنی کی موت حادثاتی تھی یا اس نے جان بوجھ کر کچے گھڑے کی ناؤ میں سفر کیا تھا تاکہ راہ عشق میں قربان ہو جائے:

پانی بھرنے کے اک بہانے سے — اپنی گاگر اٹھا کے آؤں گی
اُکے ندی کنارے لہروں کو — دیر سے منتظر سا پاؤں گی
ایک لمحے کے بعد کیا ہوگا — ان کی گودی میں تھرتھراؤں گی
زندگانی کے قید خانے کی — ساری زنجیریں کاٹ جاؤں گی

مگر اگلی ہی نظم "کہاں" (۱۹۴۰ء) میں مجید امجد نے موت کی آرزو کو مسترد کر دیا ہے اور اپنے دوست کو زندگی کی سہانی رُتوں سے لطف اندوز ہونے کا مشورہ دیا ہے۔ یہ گویا LIFE INSTINCT یا EROS کا اظہار ہے۔ بین السطور یہ احساس موجزن ہے کہ چار دن کی یہ زندگی ایک بیش بہا تحفہ ہے جسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھا جائے تو آگے چل کر مجید امجد کے ہاں "اب" کی چکا چوند سے مستنیر ہونے کا جو میلان ابھرا اس کی شروعات اس نظم میں سے ہو گئی تھی۔

مجید امجد کی ان ابتدائی نظموں میں ایک دوراہے پر کھڑا نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو اس احساس کے تحت کہ زندگی ہمہ وقت موت کی جانب رواں دواں ہے، وہ زندگی سے مسرت کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کی خواہش کرتا ہے جب کہ دوسری طرف وہ زندگی کو مسترد کر کے موت کی آغوش میں چلے جا-

کا آرزو مند ہے موخر الذکر کیفیت اس کی نظم "خودکشی" (۱۹۴۰ء) میں پوری طرح ابھری ہے۔ یہ نظم ایک ایسے واقعہ کے گرد گھومتی ہے جس نے مجید امجد کو اندر سے بالکل توڑ دیا تھا۔ دو محبت کرنے والوں نے زہر پی کر اپنی زندگیوں کا خاتمہ کر دیا تو مجید امجد اس واقعہ سے اس درجہ متاثر ہوا کہ خود بھی اس تمثیل کا ایک کردار بن گیا۔

آؤ نا ہم بھی توڑ دیں اس دامِ زیست کو
سنگِ اجل پہ پھوڑ دیں اس جامِ زیست کو

اس ابتدائی دور میں محسوسات کے مدوجزر کے عقب میں ایک یہ احساس مجید امجد کے ہاں بار بار ابھرا ہے کہ زندگی ایک ایسا سفر ہے جس کی منزل "موت" کے سوا اور کوئی نہیں اور یہ سفر نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔ ایسی نوعیت کا ہے۔ مسافر قطعاً بے دست و پا ہے، اس کی آنکھیں بند کیں اور کوئی قوت اسے ایک متعین منزل کی طرف دھکیل رہی ہے۔ مسلسل سفر کا یہ احساس مجید امجد کے اس زمانے کی لاتعداد نظموں میں جھلکتا ہے۔ نظم "مسافر" (۱۹۴۰ء) اور "سفرِ حیات" (۱۹۴۰ء) اس کی واضح مثالیں ہیں۔ اپنی لافانی نظم "کنواں" (۱۹۴۱ء) میں مجید امجد نے اس سفر کو دائروی قرار دے کر اس کی بے معنویت اور لاحاصلی کو بھی اجاگر کیا ہے تاہم بحیثیت مجموعی یہ سفر سیدھی لکیر کے تابع ہے چاہے وہ ریل کے ذریعے ہو یا پانی اور ہوا کے ذریعے! دیکھا جائے تو یہ سب کی کلاسیکی فکر کا ایک محبوب موضوع بھی ہے جو اردو کی کلاسیکی شاعری میں عام طور سے مل جاتا ہے۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ مجبوری کا سفر ہے۔ انسان مجبور ہے کہ اسے یہ سفر (جو سیاحت نہیں ہے) بہر حال طے کرنا ہے اور اس طور طے کرنا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اسے ترک نہیں کر سکتا۔ یہ اس کا نوشتۂ تقدیر ہے۔ اس سے دوسرا نکتہ یہ ابھرتا ہے کہ اس کی ایک متعین منزل ہے یعنی موت!۔ گویا انسان لمحہ بہ لمحہ اپنی مرضی کے خلاف، موت کی طرف رواں ہے۔ بے بتوار بہے جانے کے اس احساس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انسان نے فلسفہ، مذہب اور فن سے مدد لی ہے تاہم وہ اس سے پوری طرح نجات حاصل نہیں کر سکا۔ بعض مفکرین نے تو اس پورے سفر ہی کو بے معنی اور لاحاصل قرار دے ڈالا ہے۔ جب کہ دوسروں نے اس بات کو قبول کرتے ہوئے کہ موت ناگزیر ہے، زندگی سے مسرت کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کی کوشش کی ہے۔ "بابر بعیش کوش" کا یہی مفہوم ہے۔ مجید امجد کے ہاں بھی ابتدا زندگی کے اثمار بالخصوص جنسی لذات سے لطف اندوز ہوتے کا رویہ ابھرا مگر جلد ہی اس کی نوعیت بالکل تبدیل ہو گئی۔ بالخصوص اس کی نظم "امروز" (۱۹۴۸ء) میں لطف اندوزی کا یہ لمحہ جسے لمحہ موجود یعنی MOMENT OF PRESENCE کا نام دینا چاہیے، اپنے جملہ لطیف ابعاد کے ساتھ موت کے سامنے ایک متوازی قوت کے طور پر ابھرا ہوا نظر آتا ہے:۔

یہ صہبائے امروز جو صبح کی شہزادی کی مست انکھڑیوں سے ٹپک کر
بدورِ حیات آ گئی ہے! یہ ننھی سی چڑیاں جو چھت میں چہکنے لگی ہیں
ہوا کا یہ جھونکا جو میرے دریچے میں تلسی کی ٹہنی کو سرزا گیا ہے
پڑوسن کے آنگن میں پانی کے نلکے پہ یہ چوڑیاں جو کھنکنے لگی ہیں

یہ دنیائے امروز میری ہے، میرے دلِ زار کی دھڑکنوں کی امیں ہے
یہ اشکوں سے شاداب دوچار صبحیں، یہ آہوں سے معمور دوچار شامیں
انھیں چلمنوں سے مجھے دیکھنا ہے وہ سب کچھ جو نظروں کی زد میں نہیں ہے

مجید امجد کی شاعری میں یہ نظم ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ میں تو یہ تک کہنے کو تیار ہوں کہ پوری اردو شاعری میں یہ نظم ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اس میں مجید امجد نے بے پتوار بہے جانے کے عالم یا ترک کر لذت کشید کرنے کے عمل کو تج کر "لمحہ موجود" سے روحانی طور پر سرشار ہونے کا تجربہ کیا ہے۔

نظم "امروز" موت کے کلاسیکی رویے کے علی الرغم ایک ایسا منفرد تجربہ ہے جو مجید امجد کی سائکی میں ہونے والی تبدیلی کا غماز ہے۔ نظم کا پہلا ہی مصرعہ ؎

ابد کے سمندر کی اک موج پہ جس پر مری زندگی کا کنول تیرتا ہے

ورڈز ورتھ کے الفاظ IMMORTAL SEA یعنی لازوال سمندر کی یاد دلاتا ہے۔ ٹائن بی[1] نے لکھا ہے کہ ان الفاظ سے یہ بات مترشح ہے کہ حقیقت عظمیٰ ایک ایسا لازوال سمندر ہے جس کی سطح پہ انسانی زندگی ایک لہر کی طرح یا ایک حباب کی طرح ابھرتی اور پھر ڈوب جاتی ہے ــــ مگر ورڈزورتھ تو بہت بعد کی پیداوار ہے۔ فارسی شاعری میں ؎

زندگی زیں عالمے خیزد کہ مانند حباب

کے مفہوم کے حامل اشعار قدیم زمانے ہی سے زبان زد خاص و عام رہے ہیں جو زندگی کے فانی ہونے کی نشان دہی کرتے ہیں۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ اشعار یاسیت پسندی پر دال ہیں اور تقدیر کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر مجید امجد کے ہاں "لمحۂ موجود" فنا کی علامت نہیں ہے۔ اس کے بجائے وہ ایک ایسا روشن لمحہ ہے جس نے ہر شے کو منور کر دیا ہے۔ اسے "لمحۂ تکلّم" بھی کہہ سکتے ہیں جس نے کائنات کی "ازلی و ابدی خاموشی" میں ایک منفرد چہکار کا منظر دکھایا ہے۔ جب افلاطونی فلسفے نے موجود یعنی BECOMING کو وجود یعنی BEING سے الگ کر کے دکھایا تھا یا جب ہندو مت نے موجود کو "مایا" یا فریب نظر قرار دیا تھا تو دراصل لمحۂ موجود کی نفی کر دی تھی۔ اصلاً موجود اور وجود میں کوئی فرق نہیں تھا۔ فقط ہمارے دماغ نے حیاتیاتی ضروریات کے تحت انسانی شعور کو زمان اور مکان کی حدود میں مقید کر کے اُسے "موجودگی" سے براہ راست متعارف ہونے کے موقع سے محروم کر دیا تھا۔ آلڈس ہکسلے[2] نے لکھا ہے کہ جب اُس نے نشہ آور دوا مسکالین (MESCALIN) کھائی تو وہ ایک ایسے عجیب و غریب روحانی تجربے سے گزرا جس میں سامنے کی اشیا زمانی اور مکانی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر خود اپنے اندر کی روشنی میں جگمگا اٹھی تھیں۔ گو اُن کی حیثیت نہ تو ظروف کی سی رہی جن میں روشنی بند پڑی ہو اور نہ وہ روشنی تک پہنچنے کا "ذرا" ہی رہیں (مراد یہ کہ ان کی علامتی حیثیت بھی معدوم ہو گئی) بلکہ خود اپنی "موجودگی" کی مظہر بن گئیں۔ عام

---

1. ARNOLD TOYNBEE: MAN'S CONCERN WITH DEATH!
2. ALDOVS HUXLAY: THE DOORS OF PERCEPTION

ںدگی میں ہم کسی بھی شے کو ایک زمانی یا مکانی بُعد میں رکھ کر دیکھتے ہیں یعنی وقت اور مقام کے اُن رشتوں
ے واسطے سے پہچانتے ہیں جو اس نے دیگر اشیا سے قائم کر رکھے ہیں لیکن ہم نہیں جانتے کہ ہر شے
ا ے خود "رشتوں کی ایک گرہ" ہے اور یہ رشتے بالائی سطح کے رابطوں کے نظام سے ایک جداگانہ صورت
رکھتے ہیں۔ جب انسان کسی بحران (CRISIS) میں سے گزرتا ہے یا موت کو اپنے روبرو پاتا ہے تو شعور
ں وہ حد بندیاں یا حفاظتی دیواریں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں جو انسانی دماغ نے حیاتیاتی ضروریات کے
ت تعمیر کر رکھی ہیں۔ چنانچہ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ "موجودگی" کا براہِ راست نظارہ کر سکے۔ ایسی بہت
ی مثالیں ہیں کہ جب موت کا وقت آیا تو مرنے والے کو ایک "انوکھی روشنی" دکھائی دی۔ فنکار یا عارف
و یہ کمال حاصل ہے کہ وہ موت کے آخری لمحات میں مبتلا ہوئے بغیر ہی وقتاً فوقتاً اپنے شعور کی حد بندیوں کو
بور کر کے موجودگی "موجودگی" کو دیکھنے لگتا ہے۔ ایک ایسی موجودگی جس میں خوشبو، رنگ، روشنی، آواز
سب ایک نئے بُعد کا منظر دکھاتے ہیں۔ عارفانہ تجربے کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ اس میں
"موجود زندگی" کی تصویر مٹ جاتی ہے اور ایک ایسا تجریدی خاکہ ابھر آتا ہے جس سے بیکرانی اور لامحدودیت
کا احساس مرتب ہوتا ہے۔ دوسری طرف فن کی تخلیق کے لمحات میں تجریدی عالم نہیں ابھرتا بلکہ اشیا اور
مظاہر بجائے خود ایک انوکھی روشنی میں بھیگ جاتے ہیں۔ اور "موجودگی" صفات کو عبور کر کے نہیں بلکہ صفات
کو شوخ تر کر کے خود کو ظاہر کرتی ہے۔ اردو شاعری میں صوفیانہ تصورات تو بہت پیش ہوئے ہیں مگر عارفانہ
تجربے سے گزرنے کے بجائے لمحات ذرا کم ہی بیان ہوئے ہیں جو "موجودگی" کو جسمانی سطح پر محسوس کرنے
کا نتیجہ ہیں۔ مجید امجد کی مندرجہ بالا نظم اس سلسلے کی ایک انوکھی نظم ہے جس میں ایک عام سا، ہر روز کا دیکھا
بھالا منظر یکایک ایک نئی معنویت سے لبریز ہو گیا ہے۔ ہوا کے جھونکے کا خرام، چوڑیوں کی چھنک
چڑیوں کی چہکار، نلکے سے پانی کے گرنے کی آواز۔ یہ سب کچھ اس معنویت سے عبارت دکھائی دینے لگا
ہے جسے آلڈس ہکسلے نے ISNESS. کا نام دیا تھا۔ آگے چل کر یہ دیکھنا ممکن ہوگا کہ مجید امجد نے جب
زندگی اور موت کی سرحد پر چہل قدمی کی تو اُسے نہ صرف ایسے لمحات فراوانی سے ملے بلکہ وہ اُن سے
آگے کے دیار میں بھی بے محابا بڑھتا چلا گیا۔ فی الحال محض اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ مجید امجد
کے ہاں موت کی جو دستکیں التزام کے ساتھ سنائی دی ہیں ان کے باعث وہ موت کو عام انداز میں
دیکھنے پر مجبور تو ہوا ہے تاہم وہ عام انسانی شعور کی دیوار میں روزن بنا کر اُس عالم کو بھی دیکھنے لگا ہے جو
ایک سچے فنکار ہی کو نظر آسکتا ہے۔

اوپر میں نے لکھا ہے کہ مجید امجد کے ابتدائی کلام میں نہ صرف موت کی ارزانی اور زندگی کی
فنا آشنائی کا احساس جا بجا ابھرا ہے بلکہ اس کے ہاں جبلتِ مرگ کے شواہد بھی مل جاتے ہیں مگر
جیسے جیسے اُس کی شاعری پروان چڑھی ہے اور شعور و ادراک میں پختگی آئی ہے تو موت کی کربناکی
بلکہ ہولناکی کا احساس مجید امجد کو جکڑتا چلا گیا ہے اور ردعمل کے طور پر اُس کے ہاں "زندگی" کو اپنے
سینے سے چمٹا لینے کی آرزو شدت اختیار کرتی چلی گئی ہے۔ شدہ شدہ مجید امجد کے لیے صرف انسان کی موت
ہی باعث کرب نہیں رہی، وہ چڑیوں، درختوں، مکانوں اور شہروں کی تباہی کے احساس سے بھی دل تھام کر

رہ گیا ہے۔ مثلاً "توسیع شہر" میں اُس نے درختوں کی موت پر ایک دردانگیز نوحہ تحریر کیا ہے:

جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم
قاتل تیشے چیر گئے اُن ساونتوں کے جسم

یا "پکار" میں بڑے دُکھ کے ساتھ لالی کے مرجانے کے امکان کا احساس دلایا ہے یا پھر "متروکہ مکان" میں اجڑتے مکانوں کا نقشا کھینچا ہے:

اب وہ روحیں گو بجتے جھکڑ ہیں گھلتی سسکیاں
ان کے مسکن یہ مکاں
منہدم ادوار کے ملبے پہ جلتی ارتھیاں

آخر آخر میں اُسے پوری زندگی موت کے جبڑوں میں جاتی دکھائی دینے لگی ہے۔ اس روح فرسا احساس میں جب اُس کے اپنے جسم کے انہدام کا احساس بھی شامل ہوا ہے تو موت ایک تجرید کے طور پر نہیں بلکہ ایک شبیہ کے طور پر اُس کے روبرو آگئی ہے۔ مجید امجد اگر محض ایک مفکر ہوتا تو موت کے بارے میں سوچ بچار کرتا ہے ازمنۂ قدیم سے اس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس پر غور کرتا مگر شاعر ہونے کے ناتے اُس نے موت کو ایک متوازی قوت کے طور پر دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ ایک ایسی قوت جس کا "کالی روپ" تشدد یعنی VIOLENCE کا مظہر ہے ایسا تشدد جس کی اولین زد خود مجید امجد کے جسم پر پڑی مجید امجد نے اس "تشدد" کو جسے موت کا لمس بھی کہا جا سکتا ہے، بڑی شدت سے محسوس کیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے جسم کے قلعے کا موت نے بصورت غنیم محاصرہ کر لیا ہے اور اب وہ قلعے کی قلعہ بندیوں اور اندرونی دیواروں کو مسلسل توڑتی اور گراتی چلی جا رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مجید امجد نے موت کو باہر کی دنیا ہی میں سرگرم عمل نہیں پایا بلکہ اپنے "اندر" کی دنیا میں بھی اس کی اذیت رساں موجودگی کو محسوس کیا ہے۔ اس تجربے کی ابتدا اُس کی نظم "پچاسویں پت جھڑ" سے ہوتی ہے:

"میں یہ اب کس کو بتاؤں کہ مرے جسم کے ریشوں کے اس الجھاؤ میں ہے۔
ایک وہ گرد سنبھلتی ہوئی نازک سی دھڑکتی ہوئی لہر
جو ہر اک دُکھ کی دوا ڈھونڈتی ہے۔
جو گزرتے ہوئے لمحے کے قدم روکتی ہے
مجھ سے کہتی ہے کہ "دیکھ ایک برس اور بجھا"
دیکھ اب کے تیری بتیسی پہ دھبّہ سا پڑا، دانت گرا
گھاؤ یہ اب نہ بھرے گا، یہی بہتر ہے کہ ہونٹوں پہ لگا لے کسی جھوٹی سی کڑی سوچ کی مہر"

مگر جیسے جیسے وقت گزرا ہے اور مجید امجد کے جسم کے مختلف اعضا ٹوٹتے یا تو مضمحل ہوتے چلے گئے اُس کے ہاں موت کو "سوچنے" کے بجائے "محسوس" کرنے کی واردات زیادہ فعال ہونے لگی ہے۔ جسم کی سطح پر ٹوٹنے اور کرچ کرچ ہونے کا جان لیوا احساس مجید امجد کی متعدد نظموں میں شامل ہو گیا۔

اور اب یہ ایک شخص
اک جانب کو اُس کے قد کا جھکاؤ

اور اسی جانب کے بوٹ کی ایڑی گھسی ہوئی
اور اسی جانب کا کوٹ کا پلو مڑا ہوا، اک جامہ بازو کے نیچے
اور وہ خود ساکت ـــ

"اور اب یہ اک سنبھلا سنبھلا" ـــ

اس کو علم ہے اب وہ ایک سیاہ گڑھے کے دہانے پر ہے
آگے ـــ اک وہ گڑھا ہے اور اس کا وہ اگلا قدم ہے
اب بھی اس کی بے جس، بے دانت، اوچھی، مسترخی باچھیں ہنستی ہیں

"اس کو علم ہے" ـــ

میرا دل، میری عینک کے منفی ہندسوں والے شیشوں کے پیچھے حیراں ہے
میں جو بشکل بہتے ہجوموں کے ساحل پر اپنے اوسانوں کو سنبھالے ہوئے ہوں
کون اس جانب دیکھے گا
جس جانب میں ہوں
جس جانب سب نے جانا ہے

"ننھے کی نوہیں آنکھیں" ـــ

مجید امجد کی نظموں میں ایک شبیہ بار بار ابھری ہے۔ یہ شبیہ روایتی ڈائن یا بلا کا دوسرا روپ ہے۔ اس سے مجھے خیال آیا کہ ڈائن کا جو تصور پرانے وقتوں سے انسانی تہذیب کو چمٹا رہا ہے اور جس نے دیو مالا میں کالی یا قیامت وغیرہ کا نام پایا ہے، کیا وہ اصلاً موت ہی کی شبیہ نہیں ہے جو انسانوں کو ان لمحات میں نظر آئی ہے جب ان کے دماغ کے اس REDUCING VALVE کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی جو شعور کو بعض حیاتیاتی ضروریات کے لیے چھوٹے چھوٹے دائروں GESTALT میں مقید رکھتا ہے؟ ـــ مجید امجد دق کے موذی مرض میں مبتلا تھا جس نے دیمک کی طرح اس کے پھیپھڑوں کو چاٹ لیا تھا۔ کچھ عجب نہیں کہ ایسے ہی وہ دماغ کے REDUCING VALVE کی کڑی گرفت سے گاہے گاہے آزاد ہوا جس کے نتیجے میں اسے موت کے کالی اور اناپورنا روپ دکھائی دیے۔ فی الحال ذکر کالی روپ کا ہے جس سے مجید امجد کے علاوہ دنیا کے بعض بڑے بڑے تخلیق کاروں کی بھی مڈبھیڑ ہوتی رہی ہے خلاؤان گاف کے مصوری کے شاہکاروں، کافکا اور ایڈگر ایلن پو کی کہانیوں اور ملٹن ور براؤننگ، دانتے اور کولرج کے بعض شعری ٹکڑوں میں اس کالی روپ کے درشن کیے جا سکتے ہیں۔ مجید امجد کی نظموں میں موت کے کالی روپ نے خود کو بطور ایک شبیہ کچھ یوں ظاہر کیا ہے:

روز، اک شکل، اس دوراہے پر　　اب مرا انتظار کرتی ہے
ایک دیوار سے لگی، ہر صبح
ٹکٹکی باندھے، نیم رخ، ایک سو　　اب مرا انتظار کرتی ہے
میں گزرتا ہوں مجھ کو دیکھتی ہے　　میں نہیں دیکھتا وہ دیکھتی ہے
اس کے چہرے کی ساخت ـــ ساعت دید

زرد ہونٹوں کی پتریاں — پیتل
سُرخ آنکھوں کی ٹکڑیاں — قرمز
روغنی دھوپ میں دھنسے ہوئے پاؤں۔ منتظر منتظر، اُداس اُداس!

ڈائن کا جو روایتی تصور عام ہے، اس کے مطابق وہ بیک وقت پرکشش بھی ہے اور خوفناک بھی۔ اسی لیے یہ کہا گیا ہے کہ جب ڈائن آواز دے تو پلٹ کر نہ دیکھنا ورنہ پتھر بن جاؤ گے۔ مراد یہ کہ اس کی کشش تمہیں مغلوب کر دے گی۔ جنسی ہیجان کی بھی یہی صورت ہے کہ انسان اس سے گریزاں بھی ہوتا ہے اور اس کی طرف راغب بھی۔ جنسی محبت اس لیے اپنے اندر کشش اور گریز کی دوگونہ کیفیت رکھتی ہے۔ جنسی عمل بجائے خود مرد کی عارضی موت کا لمحہ بھی ہے اور ایک "نئے وجود" میں ڈھلنے کا وسیلہ بھی! اس اعتبار سے دیکھیے تو یہ موت اور زندگی کا سنگم بھی ہے۔ موت کے بھی یہی دو پہلو ہیں۔ ایک طرف اسے سامنے پاکر انسان ایک انوکھے خوف TERROR کی زد میں آجاتا ہے اور دوسری طرف اُسے ایک "نئی روشنی" سے تعارف حاصل ہوتا ہے۔ خود تخلیقی عمل میں بھی فنکار اسی کیفیت سے بار بار گزرتا ہے یعنی اُسے تخلیق کاری میں خوف بھی محسوس ہوتا ہے اور کرب انگیز خوشی بھی۔ جسمانی سطح پر عورت کے ہاں دردِ زہ اور بچے کی تخلیق پر زبردست خوشی بھی اسی عمل ہی کی غماز ہے۔ مجید امجد کی شاعری میں "موجودگی" بیک وقت موت کے مثبت اور منفی روپ کا اعلامیہ ہے تاہم اس کی آخری عمر کی نظموں میں وہ ایک شبیہ سے زیادہ ایک "واردات" بن کر نمودار ہوئی (اس کا ذکر آگے آئے گا) مجید امجد کے ہاں موت کے بطور شبیہ ابھرنے کی چند مثالیں:

کس سے پوچھوں، میری وفا کا یہی صلہ تھا؟
پیتل کے جبڑوں میں کھنکنے والی، کانچ کی آنکھوں میں مسکانے والی
یہی کسیلی پیلی نفرت — میری وفا کا یہی صلہ تھا؟

— "درونِ شہر"

مندرجہ بالا دونوں مثالوں میں شبیہ ایک دھاتی METALLIC روپ میں ابھری ہے۔ بظاہر مجید امجد نے "پیتل" کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس کے زرد رنگ کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ مگر قاری کا ذہن "سونے" کی طرف بھی منعطف ہوتا ہے جو زرد رنگ کی دھات ہے۔ چنانچہ وہ سوچتا ہے کہ مجید امجد نے پیتل کا لفظ شاید طنزاً استعمال کیا ہے ورنہ در پردہ وہ سونے کا اور اس کے حوالے سے فارسی کے اُس روپ کا ذکر کر رہا ہے جو کالی اور قیامت کی روایت میں توڑ پھوڑ اور تشدد سے وابستہ ہے۔ موت بطور شبیہ اس کی نظم "دور، ادھر..." میں بھی موجود ہے:

دور، اُدھر، اُس سامنے والے رستے سے جب
آپس میں ٹکرائی، آوازوں کی لہر اُچھل کر میری جانب والے رستے تک آئی بیچ میں نیچے پانی تھا
بیچ میں نیچے، اِک میدان اور اُس میں گھاس اور پودے اور سب کچھ پانی میں تھا
ٹھنڈی رات کے سایے تھے۔

سامنے والے اُس رستے سے آوازوں کی گونج جب اچھلی نیچے پانی تھا
رات کے سایوں میں اُس پانی پر چوٹ سی پڑتی تھی
تیزی سے اک آہٹ ڈبکی بھرتی تیر کے بڑھتی تھی
گیلے گیلے پہناوُں کو جھٹکتی کیچڑ میں تھپ تھپ چلتی تھی

بے حد پر اسرار نظم ہے اور اس کے متعدد ابعاد ہیں۔ فی الوقت مجھے اس کے کالی روپ کی نشان دہی کرنا ہے جس میں غلاظت، نفرت اور تشدد سب یکجا ہو گئے ہیں۔ بظاہر مجید امجد نے اس شبیہ کے بیان میں اپنے اندر ابھرنے والے خوف کا ذکر نہیں کیا مگر پوری نظم خوف پر ہی منتج ہوتی دکھائی دے رہی ہے ایک اور نظم دیکھیے:

بیٹھے بیٹھے تو نے کتنی لاج سے دیکھا
چھت کے اُس اک تل کو جو تیری ناک میں ہے
اپنی چھت پر یوں مت رہ، چھ، خبر ہے، باہر
اک اک ڈائن آنکھ کی پتلی تیری تاک میں ہے

اس نظم میں مجید امجد نے خود کو ایک چڑیا کے روپ میں دیکھا ہے جس پر "ڈائن آنکھ" مرکوز ہے کہ جیسے ہی موقع ملے وہ اُسے جھپٹ کرلے جائے۔ گویا شاعر دو حصوں میں بٹ گیا ہے۔ ایک چڑیا روپ میں جو معصومیت اور بے خبری کی علامت ہے اور دوسرا خوف کی زد میں آئے ہوئے انسانی روپ میں جسے معلوم ہے کہ دہلیز کے باہر موت کی ڈائن آنکھیں اُس کے انتظار میں ہیں۔ ڈائن کا یہ ظالم روپ مجید امجد کی دو نظموں ــــ "ایکسی ڈنٹ" اور "مسخ" میں بطورِ خاص نمایاں ہوا ہے۔ پہلے "ایکسی ڈنٹ" لیجیے:

"مجھ سے روز یہی کہتا ہے، پکی سڑک پر وہ کالا سا داغ، جو کچھ دن پہلے
سرخ لہو کا تھا اک چھینٹا، چکنا، گیلا، چمکیلا چمکیلا
مٹی اُس پر گری اور میلی سی اک پپڑی اُس پر سے اتری اور پھر سیندوری سا اک خاکہ ابھرا
جواب پکی سڑک پر کالا سا دھبہ ہے، پسی ہوئی بجری میں جذب اور جامد ــــ ان مٹ!"

اس نظم میں متشدد موت VIOLENT DEATH کا منظر دکھائی دے رہا ہے لیکن موت کی شبیہ غائب ہے۔ قاری نظم میں موجود بہت سے نشانات سے خود ہی اس شبیہ کو مرتب کرسکتا ہے جو کسی غلیظ ٹرک کی ایک انتہائی بھیانک سی METALIC FORM کی حامل ہے۔ دیکھیے کہ ایک بار پھر مجید امجد نے موت کو دھات سے بنا ہوا دکھایا ہے۔ دوسری نظم "مسخ" ہے:

روز اُس مسخ میں کٹتا ہے ڈھیروں گوشت
دھرتی کے اس تھال میں ڈھیروں گوشت
....
ڈھیروں گوشت
کھالیں، بھیجے، انتڑیاں
یہ سب خود آگاہ، جیالے لوگ

میں نے آج جنھیں اس برسوں پہلے کی تصویر میں دیکھا

اس نظم میں مجید امجد نے ایک تو کسی خاص وجود کی موت کے بجائے اجتماعی موت کا منظر پیش کیا ہے
دوسرے اس منظر کی بے رحمی، سفاکی اور تشدد کو نمایاں کیا ہے۔ تیرے موت کو دھات (مچھری) کی مورت
زندگی کو قتل کرتے دکھایا ہے۔ گویا مجید امجد کے اس دور کی نظموں میں موت کی جو شبیہ ابھری ہے
وہ سونے یا پیتل یا لوہے (یعنی دھات) کی ہے۔ کیا یہ اشارہ دیوی (مثلاً کالی) کے مجسمے کی طرف تو نہ
جس کی پوجا آج بھی ہوتی ہے؟ یا کیا یہ بیسویں صدی میں ابھرنے والی اُس موت کا روپ ہے جو لوہے
وردی پہن کر سڑکوں پر جگہ جگہ نمودار ہو گئی ہے؟ سوچنے کی بات ہے!

مجید امجد کی شاعری میں ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۲ء دو اہم سال ہیں۔ ان دو سالوں میں پاکستان نے
صرف ایک جنگ ہاری، نہ صرف اس کے دو ٹکڑے ہوئے بلکہ ۹۰ ہزار قیدیوں کے ہتک آمیز احساس
بھی پاکستانی قوم کو ایک اجتماعی دُکھ میں مبتلا کر دیا۔ مجید امجد نے اس سانحہ کو، بالخصوص جنگ میں موت کی ارزانی
واقعہ کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ اس سے قبل وہ ۱۹۶۵ء کی جنگ سے بھی گزرا تھا۔ مگر اس جنگ
کی نوعیت اور طرح کی تھی۔ لہٰذا مجید امجد پر اس کے اتنے گہرے اثرات مرتسم نہ ہوئے جتنے ۱۹۷۱ء کی جنگ
کے؛ مثلاً ۱۹۶۵ء کی جنگ سے متاثر ہو کر مجید امجد نے بمشکل چار یا پانچ نظمیں لکھیں جب کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ
کے سایے اُس کی لاتعداد نظموں میں ابھرے ہوئے ملتے ہیں۔ بایں ہمہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھی مجید
کو سب سے زیادہ موت کی ارزانی ہی نے کرب میں مبتلا کیا تھا۔ مثلاً نظم "چہرۂ مسعود" (اکتوبر ۱۹۶۵
کی یہ چند لائنیں:

مالک! آج اِس دیس میں، اِس بستی میں، کوئی اگر دیکھے تو ہر سو
بھری بہاروں، فصلوں، کھلیانوں پر پھیلی، دھوپ کی تہ کے تلے اک
خون کے چھینٹوں والی چھینٹ کی میلی اور مٹیالی چادر بچھی ہوئی ہے
موت کی میلی اور مٹیالی موج میں رنگ لہو کے، نقش لہو کے
ایک ایک چمکتی سطح کے نیچے، راکھ لہو کی، ساکھ لہو کی ــــ

دوسری طرف ۱۹۷۱ء کی جنگ نے تو مجید امجد کو احساس سطح پر بالکل ہی کچل ڈالا۔ اس زمانے میں لکھی گئی
مجید امجد کی نظموں سے یہ چند ٹکڑے اس کے گہرے کرب کے غماز ہیں:

آج ہم اپنے جیالے بیٹوں کو روتے ہیں تو
آنسو ہم پر ہنستے ہیں
ــ "ہم تو سدا"

رات آئی ہے، اب تو تمھارے چمکتے چہروں سے بھی ڈر لگتا ہے
اے میرے آنگن میں کھلنے والے سفید گلاب کے پھولو!
شام سے تم بھی میرے کمرے کے گلدان میں آجاؤ۔ ورنہ راتوں کو
آسمانوں پر اڑنے والے بارود کی عفریت، اِس چاندنی میں، جب
چمک تمھارے چہروں کی دیکھیں گے

تو میرے ہونے پر جل جل جائیں گے اور جھپٹ جھپٹ کر
موت کے تپتے دہکتے گڑھوں سے بھر بھر دیں گے اس آنگن کو

—(۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ء)

بھائی ..... تو یہ کس سے مخاطب ہے ..... ہم کب زندہ ہیں
..... تیری مقدس زندگی کا یوں سودا کر کے
کب کے مر بھی چکے ہم!

—"ریڈیو پہ ایک قیدی"

چلتی مشین گنوں سے چھدے ہوئے وہ بول اِک انجانی بولی ہیں
بول کہ جو مرنے والوں کی آخری کراہوں میں دم بھر کو جیے تھے
جب چوبی کھمبوں سے
بندھے ہوئے اعضا .....

—"اے دل اب لو"

ایسے میں اب کون اُن کو پہچانے، کون اب ان کے ابد کی حقیقت کو جانے
اک اک کر کے کاٹ کاٹ گئے ظلموں کے لوٹے جن کی تمروں کو اک اک کر کے
اک اک کر کے

—"سدا ز مانوں کے اندر"

اور کانٹوں کی ٹوٹتی نوکیں ہمارے قدموں کے نیچے کرکرا کرنے لگتی ہیں
اور سانسوں کی لہر میں لوہے کی سیال سی پتری جڑ جاتی ہے
اور زمین کی پیٹھ پہ اپنا بوجھ بہت کم رہ جاتا ہے۔

—"اور ان خارزاروں میں"

دیکھیے کہ ان نظموں میں موت (بصورت جنگ) دھات کے لبادے میں زندگی پر حملہ زن ہوئی ہے ویسے بھی لوہے اور موت کا سمبندھ بہت پرانا ہے۔ تلوار و سناں سے لے کر جہاز اور ٹینک تک لوہے نے موت کے بہروپ میں سدا زندگی کو للکارا ہے۔ ان نظموں میں مجید امجد نے موت کو لوہے کا علامتی مظہر بنا کر پیش کیا ہے تو لوہے سے وابستہ سارا بہیمانہ انداز یعنی VIOLENCE موت کے وجود میں یکجا ہو گیا ہے۔

کہا گیا ہے کہ ایک تمام انسان دور اور نزدیک کے عین درمیان اس محدود سی RANGE کے اندر قید ہوتا ہے جہاں اشیا اور مظاہر اپنی مخصوص پہچان رکھتے ہیں۔ اور زمان کے حوالے سے کسی ایک لمحے اور مکان کے حوالے سے کسی ایک مقام کے ہالے میں موجود ہوتے ہیں (اسے شعور کا دائرہ کہ لیں) اس دائرے کو اگر عبور کریں یا اس کے مرکزہ میں سمٹ جائیں تو صورت حال تبدیل ہو جاتی ہے کیونکہ انسانی شعور کی مخصوص زد سے باہر آتے ہی چیزیں اور مظاہر اپنی صورتوں کو تج کر لکیروں اور ساختوں

STRUCTURES میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ آپ بہت فاصلے سے کسی منظر کو دیکھیں مثلاً ہوائی جہاز سے زمین کو یا رات سمے تاروں بھرے آسمان کو تو آپ کو صورتوں کے بجائے پیٹرن نظر آئیں گے۔ گویا صورتوں کی محدود دنیا کے عقب میں موجود وہ سٹرکچر یا ساخت دکھائی دینے لگے گی جو عام زندگی میں نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ یہی حال شے یا منظر کو بہت قریب سے دیکھنے کے عمل کا ہے کیونکہ ایسی صورت میں بھی شکلیں معدوم ہو جاتی ہیں اور پیٹرن اُبھر آتے ہیں۔ کوانٹم طبعیات والوں نے جب ایٹم کے بطون میں جھانکا ہے تو انھیں وہ کوئی ٹھوس وجود نہیں بلکہ رشتوں کا ایک جال دکھائی دیا ہے۔ عارفانہ تجربے کے دوران سالک یکایک زندگی کی مقررہ زد یعنی FIXED RANGE سے باہر آکر کائنات کو یا تو بے حد فاصلے سے یا پھر بے حد قریب سے دیکھنے لگتا ہے۔ مقدم الذکر صورت میں اُسے وہ تجربہ حاصل ہوتا ہے جسے ASTRAL FEELING کہا گیا ہے، جس میں انسان خود سے باہر نکل کر خود کو دیکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کائنات سے باہر کھڑا کائنات کو پیٹرن کے طور پر دیکھتا یا اس کی پیرو غلافی عبارت کو پڑھتا ہے اور پھر اپنے دیکھنے کے انداز کو دیکھتا ہے اور ہر بار پیچھے ہٹتا، اپنی ناظر کی حیثیت کو بار بار دیکھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ وہ مقام آجاتا ہے جہاں اُسے مزید پیچھے ہٹنے کو جگہ نہیں ملتی۔ تب حرکت کا عمل رُک جاتا ہے۔ زمان مکان پر منطبق ہو جاتا ہے اور انسان اور کائنات، وجود (BEING) اور موجود BECOMING کی دوئی مٹ جاتی ہے جس کے نتیجے میں ایک بے پایاں اور لازوال یکتائی کا عالم ابھر آتا ہے۔ یہ معرفت کا اعلا ترین مقام ہے۔ موخر الذکر صورت میں وہ جب شے یا منظر کو بہت قریب سے دیکھتا ہے تو خود کو "موجودگی" کے روبرو پاتا ہے۔ موجودگی، جو رشتوں سے عبارت تو ہے لیکن جس میں صورتیں معدوم نہیں ہو جاتیں بلکہ اپنے اندر کی انوکھی تابندگی، رنگت اور آواز کا مظہر بن جاتی ہیں۔

اس سے یہ بات آئینہ ہوئی کہ اصلاً عارفانہ تجربے کے دو پہلو ہیں۔ ایک وہ جو احساس بحر آسا COSMIC CONSCIOUSNESS سے عبارت ہے۔ جس میں موجود (BECOMING) باقی نہیں رہتا صرف وجود (BEING) کی عملداری ہوتی ہے۔ عارف جب عارفانہ تجربے کے اس پہلو سے آشنا ہوتا ہے تو دجلے میں قطرے کے جذب ہونے کا منظر دکھاتا ہے۔ دوسرا پہلو وہ ہے جس میں "موجود" اپنے اندر کے اصل پیٹرن کو اس طور ظاہر کرتا ہے کہ صورتیں فنا نہیں ہوتیں بلکہ ایک انوکھی تابندگی میں بھیگ جاتی ہیں۔ مقدم الذکر تجربہ ایک صوفی کا عارفانہ تجربہ ہے جب کہ موخر الذکر ایک فنکار کا! دوسرے لفظوں میں صوفی خود کو ذاتِ لامحدود میں اس طور جذب کر دیتا ہے کہ احساس بحر آسا کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتا جب کہ تخلیق کار "موجود" کے داخلی پرتو کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتا ہے۔ یوں وہ حقیقت عظمیٰ کے تخلیقی عمل کے بالکل متوازی خود بھی ایک تخلیقی عمل کا مظاہرہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ صوفی اور تخلیق کار دونوں عارفانہ تجربے کے جملہ پہلوؤں سے آشنا ہونے پر قادر ہوسکتے ہیں۔ تاہم اس فرق کے ساتھ کہ صوفی پر عارفانہ تجربے کا اولین پہلو غالب ہوگا جب کہ تخلیق کار پر اس کا ثانوی پہلو! اسی لیے صوفی اپنے تجربے کی ترسیل نہیں کر سکتا کہ وہ حقیقت عظمیٰ کے روبرو ٹھہر نہیں پاتا جب کہ تخلیق کار رنگ، آواز، لفظ یا سنگ وغیرہ کے ذریعے اس عمل میں ایک بڑی حد تک کامیاب ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب مجید امجد نے لمحہ بہ لمحہ اپنے قریب آتی موت کی چاپ کو سنا تو اس پر عارفانہ تجربے کے دونوں پہلو منکشف ہوئے تاہم ایک تخلیق کار ہونے کے

ناتے اُس کے ہاں موجود کے انہدام کا نہیں بلکہ اُس کی قلب ماہیت کا عمل نسبتاً زیادہ متحرک ہوا۔

مجید امجد کے ہاں ISNESS یا موجودگی کا یہ عرفان اُس کی بعض ابتدائی نظموں میں بھی موجود ہے (اوپر اس کا ذکر ہوا ہے) تاہم اُس نے اپنی زندگی کے آخری چار پانچ سالوں میں جو نظمیں لکھیں اُن میں یہ عرفان زیادہ توانا اور بھرپور دکھائی دیتا ہے۔ وجہ یہ ہے جسمانی نظام انسان کی عارفانہ تیز نگاہی کے راستے میں مزاحم ہے۔ انسانی حسیات کی زد (RANGE) محدود ہے اور اس زد کے بارے میں انسان محبوس پڑا ہے مگر جب بعض بحرانی تجربات، شدید علالت یا آمدِ پیری کے موقع پر انسانی جسم کا قلعہ ٹوٹنے لگتا ہے تو اس کے نتیجے میں قلعے کی دیواروں میں روزن اور جھریاں سی نمودار ہو جاتی ہیں جن میں سے اُس کے لیے مظاہر کی کنہ میں دیکھنا ممکن ہو جاتا ہے۔ مجید امجد کے کلام میں (ISNESS) کے اس تجربے نے اگر جا بجا اپنی جھلک دکھائی ہے تو اس کے پس منظر میں مجید امجد کی شدید تنہائی، علالت اور قوا کے اضمحلال کی ایک پوری کہانی بآسانی پڑھی جا سکتی ہے۔ مجید امجد کی نظموں سے یہ چند ٹکڑے دیکھیے جن میں اُس کے اس تجربے کی عکاسی ہوئی ہے:

—— اک دن ایسا بھی آتا ہے

جب پل بھر کو، ذرا سرک جاتے ہیں، میری کھڑکی کے آگے سے گھومتے گھومتے سات کروڑ کرے اور
سورج کی پیلے پھولوں والی پھلواڑی سے ایک پتّی اُڑ کر میرے میز پہ آگرتی ہے

ان ہنہاں جہتوں میں ساکن

—— "ہر سال ان صبحوں"

باہر — گیلی گیلی سڑکوں پر، سرما کے ٹھنڈے، نرم جھونکوں کے ساتھ، اس پامال سہانی دھوپ میں
تھوڑی دور چلا ہوں تو اب میرا دل کہتا ہے:
"مولا! تیری معرفتیں تو انسانوں کے جمگھٹ میں تھیں، میں کیوں پڑا رہا اپنے ہی خیالوں کی
اس اندھیاری کٹیا میں اب تک!"

—— "اندر سے اک دھوی لہر"

اے ری صبح کی اجلی زرق برق گزرگاہوں پہ پھیلتی، اڑتی، بے بس خوشبو
یہ نفرت کی سلطنت تجھ کو بھی تو خرید سکتی ہے۔

اے اس دنیا کی اچھائیوں کے تت ست میں پنپنے والی روحوں کی روح
کبھی تو تو اُن باغوں سے گزرتی

—— "اے ری صبح"

ایسے میں اک مونس سچائی ہوئی میرے سامنے آتی ہے
اور میں اک ہاتھ سے اپنے دل کے گرتے ہوئے ٹکڑے کو دل پر جوڑ کے، کس کے
گہرے کرب کی لذت میں مسکا کر
دوسرے ہاتھ سے اُس کو بڑھ کے سلام کرتا ہوں

—— "میرے دل میں"

کیسے دن ہیں! اب کے تو مجھ جیسے طاغی کو بھی، جس کی غفلت اتنی دوختہ چشم ہے
تو نے دکھائے
اپنے زمانے ... جب وہ غیب کدوں سے چھلک کر پت جھڑ کی صبحوں میں جھلک پڑتے ہیں
اپنے چشمے : جب اُن پر بادل بہتے ہیں
اپنی جنتیں : جب وہ دوام کے بور سے لد جاتی ہیں
میں کب اس قابل تھا ...

—— "کیسے دن ہیں"

یہ سب ISNESS کے "موجودگی" کو مَس کرنے کے تجربات ہیں جو مجید امجد کو کبھی تو قاشوں اور لمحوں کی صورت میں اور کبھی ایک مسلسل کیفیت کے روپ میں ملے ہیں۔ یہ وہ لمحات ہیں جب وہ ظاہر کے بطن میں موجود "غیب" کو دیکھتا ہے، صورتوں کے عقب میں اس "صورت" کو پہچانتا ہے جسے دیکھنے اور محسوس کرنے کے لیے عام انسانی حسیات ناکافی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جسے دیکھتے ہیں خود انسانی حسیات اپنی مخصوص (RANGE) کو عبور کر کے کہیں زیادہ دور رس اور حساس ہو جاتی ہیں۔ اس طور کہ رنگ کا وہ سپکٹرم (SPECTRUM) اور آواز کا وہ بُعد یا FREQUENCY گرفت میں آنے لگتی ہے جس تک عام حالات میں حسیات کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ مجید امجد کی مندرجہ بالا نظموں میں دھوپ، روشنی، خوشبو، پھول، پت جھڑ، بور اور اسی وضع کی عام چیزیں یکایک غیر معمولی اور "انوکھی" نظر آنے لگی ہیں (روسی ہیئت پسندوں نے اس کے لیے DEFAMILIAR..ATION کا لفظ استعمال کیا تھا) اور وہ ان کے اندر کی "موجودگی" کے روشن پاکر لرز اٹھا ہے۔ اُسے یوں لگا ہے جیسے وہ "سچائی" کے روبرو آگیا ہے۔ اصلاً مجید امجد کی زندگی کے آخر ایام میں لکھی گئی ان نظموں میں "موجودگی"، "سچائی" اور "موت" ایک ہی شے کے تین نام ہیں!

یونگ[1] نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں موت کے تجربے کو بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

"میں نے خود کو ایک قطعاً "منقلب حالت میں پایا۔ یوں لگا جیسے میں وجد کے عالم میں ہوں، جیسے میں خلا میں تیر رہا ہوں، جیسے میں جوف الارض میں سمٹ کر محفوظ ہو گیا ہوں۔ بظاہر یہ ایک بے پایاں "خلا" تھا لیکن گہری مسرت سے لبریز بھی تھا۔ میں نے سوچا یہ تو بے پایاں اور لازوال مسرت کا لمحہ ہے۔ اس انوکھے تجربے کو بیان کرنا ممکن نہیں ہے!"

اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے رسل نو آس جونیئر[2] نے موت کے لمس سے ابھرنے والے عارفانہ تجربے کے پانچ اوصاف کی نشان دہی کی ہے۔ پہلا یہ کہ اس انوکھے تجربے کو بیان کرنا ممکن نہ

---

1. JUNG
2. "FRONTIERS OF CONSCIOUSNESS" Ed : by JOHN WHITE

تا۔ دوسرا یہ کہ عارف خود کو زمان و مکان سے ماورا محسوس کرتا ہے۔ تیسرا یہ کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ "سچائی" کے روبرو آگیا ہے (یہ وہی بات ہے جسے ولیم جیمز نے NOETIC QUALITY کا نام دیا ا) چوتھا یہ کہ اسے بے اختیار ہونے کا احساس ہوتا ہے مراد یہ ایک طرح کی انفعالیت یا قبولیت کا میلان ہے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ آخری یہ کہ بیہوشی کی اس سرحد پر ایک گہرا خوف اُسے لرزہ براندام دیتا ہے۔ اس خوف کے ضمن میں آلڈس ہکسلے نے لکھا ہے:

The literature of religions experience a bounds in references t the pains and terrors overwhelming those who come, too sudden: face to face with some manifestation of Mysterium Tremendum

مجید امجد نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں جو نظمیں لکھیں ان میں یہ جملہ وار داتی پہلو ملاحظہ یے جا سکتے ہیں۔ بالخصوص "موجودگی" کو سامنے پا کر بے بس ہونے اور ڈرنے کی کیفیت اس کے ہاں بہت ہاں ہے:

اور یہ موجیں
یہ دشمن آنکھوں والے عفریتوں اور اُن کے ٹکراتے وجودوں کے پیچاک ابھرتے
بڑھتے، میری سمت امڈتے
سب کچھ، ایک ذرا سی جنبش، اُن سرشار ہواؤں کی جو
ازل سے ابد تک بہتی ہیں، جن کی لگامیں
ایسے ہاتھوں میں ہیں جن کی ہتھیلیوں پر یہ سارے سفینے ہیں روحوں کے
بہتے تختے ... ڈولتے بادبان ... اور ڈر اس کا، جس کا سہارا ہے!
— "آنکھیں ہیں جو"

ہم پتوں کے پانیوں سے بھری ہوئی ان صدہا آنکھوں کے سامنے ڈرتے بھی ہیں
اور اس ڈر میں جینے کا دکھ خوشی خوشی سے سہتے بھی ہیں
— "باہر اک دریا"

اُخر تمھیں بھی سوجھی یوں ہم ڈرے ہوؤں سے ڈرنے کی
نا بھئی، اب ہم پھر نہ کہیں گے، بات یہ جینے مرنے کی
— "کل ... جب ..."

بیٹھے بیٹھے آج اس کیفیت سے ڈر اٹھا ہوں، جس کو میں پہچانتا ہوں اور جس کی بابت جانتا ہوں

....

سلے WILLIAM JAMES: VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE

دل کو سہارا دینے والا اک ڈر من کو لبھانے والی ایک اُداسی
جن کا کوئی ابد اور نہ عدم ـــ

ـــ "دل تو دھڑکتے"

کالے بادل .... تیرے خوف میں ڈوب کے میرے دل دریا رک جاتے ہیں
کالے بادل .... میرے ڈر کو جانچ اور اپنے دھیانوں ہی میں بکھر کے گزر جا
ان دریاؤں سے اپنے سایوں کا بوجھ ہٹالے

ـــ "کالے بادل"

ہاں .... تو ـــ ڈر گئے نا تم ـــ تم اور کر بھی کیا سکتے تھے
اک یہ ڈر ہی تو تمھاری قوت ہے، تم جس پہ بھروسہ کر سکتے ہو

ـــ "مطلب تو ہے وہی"

اصلاً یہ خوف لامحدودیت یعنی INFINITY کے اچانک روبرو آنے سے جنم لیتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ انسان نے اپنے متخیلہ کی مدد سے اپنے چاروں طرف صورتیں PAINT کر رکھی ہیں اور اپنی حسیات کی مدد سے رنگ، آواز، بو، لمس اور ذائقہ کی چار دیواری بنا رکھی ہے جو اسے لامحدودیت کے مقابلے میں محدودیت یعنی FINITUDE کا احساس دلاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اُس کے ارضی وجود کو قائم رکھتی ہے۔ مگر جب کسی لمحے چاروں طرف آویزاں صورتیں معدوم اور حد بندیاں منہدم ہو جائیں تو انسان خود کو ایک لامحدود خلا (جسے موت کا نام بھی دیا جاسکتا ہے) کے روبرو پاتا ہے بالکل جیسے کوئی مسافر قافلے سے بچھڑ کر خود کو ریت کے ایک لامحدود اور بے کنار صحرا میں یکتا و تنہا پائے۔ اس تجربے کا پہلا اثر ایک گہرے خوف یا TERROR کی صورت میں اس پر مرتب ہوگا۔ اکثر صوفیا اور درویش اس کربناک تجربے سے گزرے ہیں تاہم عارفانہ تجربے کا یہ پہلو منزل نہیں ہے بلکہ پڑاؤ ہے اس سہانی، گہری مسرت سے لبریز ساعت کے راستے کا جہاں پہنچ کر انسان ایک ایسے عالم میں چلا جاتا ہے جسے بیان کرنا بھی ممکن نہیں ہے۔ خود مجید امجد عارفانہ تجربے کے اس لطیف ترین پہلو کو تمام و کمال بیان نہیں کر پایا تاہم ایک بہت بڑا تخلیق کار ہونے کے کارن وہ صورتوں کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے خلا VOID میں لفظاً موہوم نہیں بنا بلکہ اس نے لفظی صورتیں تخلیق کر کے یا پرانی صورتوں کو نئے روپ بخش کر اس روحانی تجربے کی عمیق ترین تہوں تک پہنچنے کی کوشش یقیناً کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مجید امجد اردو شاعری میں وہ واحد آواز ہے جس نے فکر و فلسفہ کی سطح پر نہیں بلکہ تجربے کی سطح پر موت کے نازک ترین پرتوں کو چھوا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس تجربے کو اپنے تخلیقی عمل سے صورت پذیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ عارف اور تخلیق کار میں یہی بنیادی فرق ہے کہ ہر چند دونوں اس پُر اسرار تجربے سے گزرتے ہیں تاہم ایک کے لیے یہ ناقابل بیان ہے جب کہ دوسرا اسے کسی نہ کسی حد تک صورت عطا کرنے پر قادر ہوتا ہے۔ دوسری طرف صوفی اس تجربے کے بارے میں تو شاید بہت کچھ بتا سکے مگر تجربے کو پیش نہیں کر پاتا۔ اوپر یونگ کی سوانح عمری سے ایک اقتباس پیش کیا گیا ہے جس میں اس نے عارفانہ تجربے سے پیدا ہونے والے وجد یا ECSTACY کے بارے میں جانکاری فراہم کی ہے مگر وہ اس کیفیت

وازسر تخلیق نہیں کر پایا۔ یہ کام ایک تخلیق کار ہی کر سکتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں جب مجید امجد
بک خلا VOID میں رہ رہا تھا اور لامحدودیت کے روبرو آنے کے باعث ایک انوکھے خوف کی
دمیں تھا، اُس نے گاہے گاہے موجود حقیقت کے اطاق میں اتر کر اس "موجودگی" کا شعری
رفان حاصل کیا جس کا ایک چہرہ "موت" تھا اور دوسرا ایک "تابندہ اور برتر زندگی"! ـــ اوپر موت
الے چہرے اور اس سے پیدا ہونے والے خوف یا TERROR کا ذکر ہوا! اب موت کے تجربے
ے طلوع ہونے والی تاباں و درخشاں کیفیت کا کچھ ذکر ہو جائے۔ مجید امجد اپنی نظم "جلانے اصلی صورت
مالکھا ہے:

اک یہ دراڑ جو میرے پہیتے دماغ میں ہے کون اس کو پھلانگ سکے گا
اک یہ دراڑ کہ جس کے ادھر ٹھٹھک کر رہ جاتے ہیں سارے خیال اور سارے ارادے
جس کے ادھر میں بے بس قوت ہوں
اک یہ دراڑ کہ جس کے درے وہ مقدس آگ ہے جس کی لو میں کلیوں کی برکھا ہے
اک یہ دراڑ جو میرے پہیتے دماغ میں ہے، کب اس کو پاٹ سکوں گا
اپنی حدوں کی حد سے آگے کب یہ قدم اٹھے گا
آگے، جہاں وہ سرشاری ہے جس کی کشید بھی اس میرے ہی زمین میں ہوتی ہے

ایک بے حد معنی خیز نظم ہے۔ بظاہر یوں لگتا ہے جیسے مجید امجد نے اپنی اس نظم میں مقدس آگ
وشنی کے روبرو آنے کے تجربہ کو پیش نہیں کیا بلکہ اس کی متوقع آمد کا اعلان کیا ہے لیکن دراصل یہ نظم اس بات کا ثبوت ہے
ید امجد کو جھری یا دراڑ میں سے دیکھنے کا تجربہ ہوا ہے۔ اُسے یہ بھی محسوس ہوا ہے کہ یہ جھری یا دراڑ دماغ کے اندر بھی
ہے۔ موجودیت والوں نے کم تر سطح پر اسے HOLE IN THE WALL کی ترکیب سے نشان زد کیا تھا۔
ید امجد جب کہتا ہے کہ اس دراڑ سے درے وہ مقدس آگ ہے جس کی لو میں کلیوں کی برکھا ہے
رجو اپنی حدوں کی حد سے بھی آگے ہے تو آپ دیکھیں کہ وہ ایک ایسی روحانی کیفیت کو بیان
رنے لگا ہے جس میں تپش، لو، برکھا، خوشبو اور لامحدودیت کا احساس باہم آمیز ہو گئے ہیں۔
ید امجد نے دراڑ میں سے ایک ایسے پراسرار جہاں کا نظارہ کیا ہے جس کا لمس ہی سرشاری ہے
رجہاں موت کا وہ پہلو ماند پڑ جاتا ہے جو زندگی کے انہدام سے متعلق ہے اور وہ پہلو شوخ تر
جاتا ہے جو زندگی کی برتر سطح کی نمود کا باعث ہے۔ دماغ کے سلسلے میں سپیری نے جو تجربات
یے ان سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ دماغ ایک نہیں بلکہ دو ہیں (آرتھر کوئسلر نے تین دماغوں کا ذکر کیا
ہے) ـ ایک "پرانا دماغ"، دوسرا "نیا دماغ"! دونوں کو آپس میں ملانے والی ایک سرنگ ہے جسے
رپس کلوسم کہا گیا ہے۔ عام طور پر یہ سرنگ بند رہتی ہے لیکن کبھی کبھی جب کسی بحرانی کیفیت
ید علالت یا موت کی قربت کے باعث "نئے دماغ" کی اساری ہوئی چار دیواری ٹوٹنے لگتی
ے اور انسان خود کو ایک پگھلے ہوئے عالم میں پاتا ہے تو سرنگ کھل جاتی ہے یعنی "دراڑ" نمودار
اتی ہے جس میں سے "پرانا دماغ" کی لامحدود، بے کنار، انتہائی پراسرار اور ہوش رُبا
نات کی زیارت ہوتی ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب عارف کامل خود کو "لامحدودیت" کے روبرو

پاتا ہے تو حیرت زدہ اور گم صُم ہو جاتا ہے جب کہ تخلیق کار اپنی بقا کے لیے "لامحدودیت" کی قوت کو لفظ، سنگ، رنگ یا آواز کی مدد سے پابند یا صورت پذیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ آرتھر کوئسلر[1] نے لکھا ہے کہ "پرانا دماغ" موت کے تصور کو قبول نہیں کرتا۔ اس کی بے پایاں، اور لامحدود، زمان و مکان سے ماورا سطح پر موت ایسی کوئی سلوٹ کبھی نمودار نہیں ہو سکتی۔ یہ سلوٹ نوئے دماغ کی منطق سے بھرا ہوا، حادثات سے عبارت، زمان و مکان کی حدود میں جکڑے ہوئے عالم ہی میں ظاہر ہوتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عارفانہ یا شعری تجربے کے دوران جب عارف یا تخلیق کار ملا دراڑ جھری میں سے پرانے دماغ کی لامحدودیت اور بیکرانی کے روبرو آتا ہے تو موت کو عبور کر جاتا ہے گویا موجودگی کے اس چہرے کے اندر جو مرگ آشنا، تغیر کی زد میں، عارضی اور فنا پذیر ہے جہاں ہر شے شکست و ریخت کی زد میں آکر ہمہ وقت معدوم ہو رہی ہے، وہ "موجودگی" کے اس رُخ سے آشنا ہوتا ہے جو تغیر و تبدیلی اور زمان و مکان سے ماورا ہے۔ صوفی یا عارف اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ موجود کا "سامنے کا چہرہ" سرابی کیفیت کا حامل ہے۔ دوسری طرف تخلیق کار موجودگی کے اعماق میں اترتا اور اس کی ابدیت سے روشناس ہوتا ہے مگر پھر وہ ابدیت کے روبرو رُک نہیں جاتا بلکہ اسے جسم عطا کر کے موجودگی کے ظاہر چہرے سے جوڑ دیتا ہے۔ تخلیق کار کا یہ تخلیقی عمل اصلاً تخلیقِ کائنات کے عمل سے مشابہ ہے۔ مجید امجد کے ہاں "موجودگی" کے "ظاہر چہرے" سے انقطاع کی کوئی صورت نہیں ابھری لیکن اس کے ہاں جا بجا اس کے "غائب چہرے" سے پھوٹنے والی روشنی کے شواہد بآسانی مل جاتے ہیں:

> اِن سب لاکھوں کروں، زمینوں کے اوپر، لمبی سی قوس میں، یہ بلوریں جھرنا
> جس کا ایک کنارا، دور، ان چھناروں کے پیچھے، روشنیوں کی پشمینگیوں
> میں ڈوب رہا ہے
> جس کا دھارا میرے سر پر چھت ہے
> اور میں اس پھیلاؤ کے نیچے
> کبھی نہ گرنے والی، گرتی گرتی، چھت کے نیچے
> ریزہ ریزہ کرنوں کے انبار کے نیچے
> اپنے آپ میں سوچوں!
>
> —"ان سب لاکھوں کروں"

> کسے خبر کیسی ہیں دوریوں کی یہ دنیا ہیں جو برسوں عرصوں ہمارے دلوں سے بعید رہی ہیں
> اور اچانک کبھی ہم اپنی زندگیوں کو ان کے چمکتے مدار میں پاتے ہیں، پل بھر کو،
> پل بھر اتنے قریب تک آکر پھر وہ دوریاں اپنے سوئم سفر پر، ہم سے دُور —
>
> —"برسوں عرصوں میں"

---

[1] ARTHUR KOESTLER: GHOST IN THE MACHINE

میرے نسیانوں میں جہندہ، حرفِ زندہ
تیرے معنوں میں مواج ہیں وہ سب علم جو روحوں کو کھیتے ہیں اُس اک گھاٹ کی سمت
جہاں امید اور خوف کے ڈانڈے مل جاتے ہیں
اب تو ساری دنیا میں سے جس اک شخص کو ڈوبنا ہے، وہ میں ہوں
اب تو، ساری دنیا میں وہ شخص کو جو خود تیرے بیچ نکلے گا، میں ہوں!!

— "ہر جانب میں..."

اس آخری نظم میں مجید امجد نے ایک ایسی انتہائی لطیف روحانی کیفیت کو بیان کیا ہے جس میں "موجودگی" کے دونوں چہرے یکجا ہو کر ایک چہرہ بن گئے ہیں، جہاں امید اور خوف پتوار بن کر اُس کی کشتی کو کھینے لگے ہیں اور وہ خود کو "ہونے" اور "نہ ہونے" کے اس عالم میں پانے لگا ہے جو زمان و مکان، زمین اور آسمان کی دوئی سے ماورا تو ہے مگر "ناموجود" نہیں ہے۔ یعنی ایک ایسا عالم جسے ہیئت یا فارم کا نام ملنا چاہیے۔ واضح رہے کہ آرکی ٹائپ یا علامت کی طرح فارم FORM بھی اندر سے خالی ہوتی ہے مگر "ناموجودگی" کی حامل نہیں ہوتی۔ لسانیات میں زیرو فونیم ZERO PHONEME کا جو تصور ملتا ہے وہ اس فارم ہی سے مشابہ ہے جس کی کوئی مقررہ صوتی قیمت یعنی PHONETIC VALUE تو نہیں ہوتی تاہم جسے "عدم موجود" بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ریاضی میں "صفر" فارم کے اس خاص وصف ہی کی حامل ہے کہ وہ "کچھ نہ ہونے" کے باوجود "عدم" نہیں ہے بلکہ اپنے اندر بے پناہ امکانات رکھتی ہے۔ اس کی ایک اپنی "موجودگی" ہے جو دائروی ہونے کے باعث INFINITE ہے مگر اندر سے خالی ہونے کے باعث کسی "مقررہ معنی" کے تابع نہیں بلکہ معانی کی تخلیق کا باعث ہے۔ مجید امجد اپنی زندگی کے آخری ایام میں "صفر" کے اسی عالم میں استادہ دکھائی دیتا ہے جہاں وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ ہے۔ "میں ہوں" کے الہامی الفاظ اس کیفیت ہی کو اجاگر کرتے ہیں جسے ویدانت نے "آہم برہم" کا نام دیا تھا۔ مگر مجید امجد نے کسی فلسفیانہ رویے کا اظہار نہیں کیا۔ فقط اپنے شعری تجربے کو "عجزِ اظہار" کی دھند میں ملفوف کر کے "اظہار" کا وسیلہ بنایا ہے اور یہ ایک بہت بڑا شعری کارنامہ ہے!

لے زبان یعنی LANGUAGE کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ وہ فارم ہے نہ کہ موجود بالذات SUBSTANCE اسی طرح اور کائنات کے بارے میں طبعیات والوں کا کہنا ہے کہ

الف. AT THE BIG BANG THE UNIVERSE IN THOUGHT TO HAVE HAD ZERO SIZE

ب. THE TOTAL ENERGY OF THE UNIVERSE IS ZERO

(بحوالہ اسٹیفن ہاکنگ کی کتاب: A BRIEF HISTORY OF TIME

دلیپ سنگھ
وہ ۵ راجندر نگر نئی دلی ۶۰

ظ، میرا یار

ظ انصاری صاحب اگر میرے اس مضمون کا عنوان دیکھ لیتے تو کہتے: "دلیپ میاں، یہ طرزِ تخاطب ہماری تہذیب میں ان کے لیے ہوتا ہے جن سے بے تکلفی ہو۔ آپ نے تو ہمیشہ مجھے بڑا سمجھ کر عزت سے بلایا اور میں نے ہمیشہ آپ کو اپنا عزیز جانا اس لیے آپ مجھے یار نہیں لکھ سکتے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ محبت مجھے آپ سے بہت ہے۔" میں جواباً عرض کرتا: "ظ صاحب! میں ٹھہرا پنجابی۔ ہماری تہذیب میں تو جس سے محبت ہو اُسے یار کہتے ہیں۔ خود میرے والد مجھے یار کہہ کر بلایا کرتے تھے۔"

ظ صاحب سے میرے یارانے کی عمر تو بس چھے ایک سال کی ہے۔ اس سے پہلے میرے دل میں ان کے لیے بے پناہ قدر و منزلت تو تھی لیکن "میرا حصہ دور کا جلوہ" تھا قدر و منزلت کی ایک ٹھوس وجہ تھی۔

جیسے کہ ہم سب جانتے ہیں اردو زبان کی نشوونما کھیتوں اور کھلیانوں کی بجائے دیوان خانوں میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری زبان میں رکھ رکھاؤ بہت ہے۔ زبان میں رکھ رکھاؤ تو سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ رکھ رکھاؤ ہمارے خیالات، ہماری تنقید میں کیسے در آیا۔ کسی ادیب یا اس کی تخلیق کی پرکھ کرتے ہوئے ہمارے قلم سے صرف توصیفی کلمات کیوں نکلتے ہیں کیوں کہ ہم ہر شاعر کو صاحب طرز اور ہر افسانہ نگار کو نقاش فطرت کہہ دیتے ہیں۔ جب کوئی ناقد ہمت کر کے کسی ادیب کے متعلق صحیح رائے بھی دیتا ہے تو کیوں اس طرح سے دیتا ہے کہ ادیب مذکور اسے توصیفی سرٹیفکٹ سمجھ کر اپنے ماتھے پر چسپاں کر لیتا ہے۔ تنقیدی مضامین اور تبصرے پڑھ کر مجھے ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اردو زبان میں آج تک صرف عظیم ادیب ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اس سے کم رتبے کے ادیب دوسری زبانوں میں لکھ رہے ہوں گے۔

ظ انصاری ہمارے ان ناقدوں میں سے ہیں جو زبان کی رکھ رکھاؤ کی پابندیوں میں رہ کر بھی اپنی بات کچھ اس طرح سے کہہ جاتے ہیں کہ شاعر یا ادیب مذکور کی اگلی پچھلی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔ ان کے لیے عقیدت میری اس وجہ سے تھی۔

۱۹۸۰ء میں حیدرآباد میں منعقد پہلی عالمی مزاح کانفرنس کے موقع پر میں نے تقریباً گریان کا اردو طنز و مزاح پر مقالہ سنا جس میں انھوں نے سچ اور سوائے سچ کے کچھ نہیں کہا

ان کے تیکھے انداز اور تنقید کو حاضرین بے پناہ داد دے رہے تھے۔ بہت جی چاہا میرا کہ ان کے پاس جا کر داد دوں۔ ان سے کہوں کہ صاحب آپ نے کمال کر دیا۔ پھر یہ خیال مانع رہا کہ کہیں وہ یہ نہ کہہ دیں کہ کمال تو ہمیشہ کرتا ہوں۔ آپ نئی بات کیا کہہ رہے ہیں۔

کئی سال پہلے جب میں نے لکھنا شروع کیا تو مجھے بہت جلد یہ احساس ہو گیا کہ اردو رسائل کو صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں جو ان میں لکھتے ہیں اور وہ بھی صرف اپنی تخلیق پڑھتے ہیں چنانچہ میں نے ریڈیو اور پھر ٹی وی کو اپنا ذریعہ اظہار بنا لیا۔ لیکن ۱۹۸۴ء میں جب میں یورپ سے اپنی ملازمت کی میعاد پوری کر کے لوٹا تو فکر تونسوی نے بار بار مجھے یہ احساس دلایا کہ جب تک تمہارے مضامین رسائل میں شائع نہیں ہوں گے۔ ادبی داستانوں میں تمہاری داستان تک نہیں ہو گی۔ ان کے ایما پر میں نے ایک مضمون ”معذرت نامہ“ کے عنوان سے ”شاعر“ بمبئی کے لیے لکھا۔ شائع ہونے کے تیسرے دن مجھے ظ انصاری صاحب کا ایک پوسٹ کارڈ ملا۔ لکھا تھا:

”من کہ یک تبصرہ نگار“

”میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کون ہیں اور کیوں ہیں؟ پہلی چیز آپ کے نام کے، ساتھ معذرت نامہ پڑھی اور شاعر میں تصویر بھی دیکھی۔ دونوں کو ملا کر دیکھا تو کوئی مطابقت نہیں پائی مگر ایک چیز پائی۔ آپ ضرور اس وضع کی چیزیں لکھتے رہتے ہیں اور میری بے خبری کہ ایسے جوہر قابل سے آگاہ نہیں ہو پایا۔ خیر اب سہی۔“

میں نے یہ خط فکر تونسوی کو دکھایا۔ انھوں نے پہلے تو مجھے شرمندہ کرتے ہوئے کہا۔ تو کہتے تھے۔ اردو رسائل کو کوئی پڑھتا ہی نہیں۔ دیکھو ظ نے نہ صرف تمہیں پڑھا ہے اور ... لکھا بھی ہے۔“ پھر کہنے لگے ”ظ کے خط کو معمولی مت سمجھو اردو میں یہی ایک کھرا تبصرہ نگار ہے۔ وہ اگر تمھیں ”جوہر قابل“ سمجھتا ہے تو سمجھ لو کہ تم ہو۔“

میں جوہر قابل ہوں یا نہیں ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کہ یہ ظ انصاری ... کا تبصرہ نگار ہی کر سکتا تھا کہ ادب کے میدان میں ایک ”نو وارد“ کا داخلہ دیکھ کر نہ صرف ... کا حوصلہ بڑھا کے بلکہ یہ کہہ سکے کہ ”میری بے خبری ہے کہ ایسے جوہر قابل سے آگاہ نہیں ہو پایا۔“

ان ہی دنوں بمبئی میں میرا ایک ٹی وی سیریل شوٹ ہو رہا تھا اور میرا وہاں پھیرا رہتا ... اس خط کے ملنے کے بعد جب میں بمبئی گیا تو میں نے اپنے ہوٹل سے ظ صاحب کو فون ... میں نے کہا میں دلیپ سنگھ ہوں۔ فوراً جواب دیا ”آف معذرت نامہ نیم“ پھر بڑی شفقت ... کہا کہ فلاں کلب میں پہنچ جاؤ۔ تم سے بھرپور تعارف کریں۔ میں وہاں گیا تو وہ میرے انتظار ... دروازے پر کھڑے تھے۔ دیکھتے ہی کہا ”دلیپ سنگھ“؟ میں نے کہا آپ نے اس لیے پہچان ... کہ میری تصویر دیکھ چکے ہیں۔ کہنے لگے ”نہیں تصویر پر تو تمہارے اصلی رنگ روپ سے کہیں ... رکھی ہے۔“

اس رات بہت دیر تک ان سے باتیں ہوتیں اور دوستی کا جو رشتہ قائم ہوا وہ دن

بدن استوار ہوتا گیا۔ میں جب بھی بمبئی گیا ان سے ملے بغیر نہیں لوٹا اور وہ جب بھی دلّی آئے ملاقات کیے بغیر واپس نہیں گئے۔

بمبئی میں انھوں نے مجھے اپنی کتاب "کتاب شناسی" کی ایک کاپی عنایت کی تھی جس پر لکھا تھا:

عزیز دلیپ سنگھ کے لیے
[جو ہنسانے کے لیے نہیں لکھتے]

میں نے کہا ظ صاحب آپ مجھے ترغیب دے رہے ہیں کہ طنز و مزاح میں صرف طنز کو چن لوں۔ کہنے لگے آپ ٹھیک سمجھے۔ صرف ہنسانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے کہا میں تو آپ کے مشورے پر عمل کرنے کو تیار ہوں لیکن جس طرح کی زندگی ہم جی رہے ہیں اس میں خالص طنز کو برداشت کرنے کی طاقت لوگوں میں کم ہوتی جا رہی ہے۔ کہنے لگے۔ آپ میری کتاب "کتاب شناسی" میں دیکھیں گے کہ میں اپنی بات کھرے اور اکثر کھردرے لفظوں میں کہہ جاتا ہوں۔ میں نے کہا ادب کے میدان میں ایک ظ کو تو لوگ شاید برداشت کر جائیں دو کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ بہت زور کا قہقہہ لگایا۔ میں نے انھیں ہنستے دیکھ کر کہا۔ ظ صاحب دیکھ لیجیے آپ خود ہی ہنس پڑے، میری طرف سے اس سلسلے میں کوئی کوشش نہیں تھی۔

ایک دفعہ دلّی آئے تو مجھ سے ذکر کیا کہ کل اندر کمار گجرال صاحب سے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ کل ملیے۔ میری مشکل یہ ہے کہ انھیں کب اور کہاں ملوں میں نے کہا میرے ساتھ میرے دفتر چلیے۔ وہاں سے فون پر وقت طے کر لیں گے۔

گجرال صاحب سے ملاقات تو نہ ہو سکی لیکن اس بہانے ظ صاحب کا میرے دفتر کے کام سے تعارف ہو گیا۔ میں عرض کر دوں کہ میں وزارت خارجہ کے ماہنامہ "انڈیا پرسپیکٹو" کا چیف اڈیٹر ہوں۔ یہ پرچہ انگریزی کے علاوہ فرانسیسی، ہسپانوی، عربی اور اردو میں بھی شائع ہوتا ہے اور ملک کے باہر بسے ہوئے ہندستانیوں اور غیر ملکیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ میں نے ظ صاحب کو اس کی کچھ کاپیاں تھما دیں۔ اس سلسلے میں بمبئی پہنچ کر انھوں نے ایک خط لکھا:

"انڈیا پرسپیکٹو کا تازہ پرچہ ڈاک سے آیا پہلے والے بھی رکھے ہوئے تھے۔ پڑھ ڈالے۔ اب آپ سے تعارف پورا ہوا۔ ہم تو غافل تھے۔

یہ پرچہ ایک مکمل میگزین ہے اور اپنے مقصد اشاعت کا بھرپور ترجمان ہے جرنلزم کے تقاضوں کی تعمیل کرتے ہوئے دلکشی برقرار رکھنا اور پھر نفاست + توازن معنویت۔

اگر آپ اور کچھ نہ ہوتے تب بھی اس میگزین کے چیف اڈیٹر کی حیثیت سے قابل احترام تھے۔ مگر میں نے تو "کچھ اور" سے ہی آپ کو جانا تھا۔ [اسے غالباً خفا بھی کیا ہے

چار شماروں میں اتنا کچھ ہے کہ پورے مہینے کی شامیں بِیت جائیں۔ باہر سے ہندستانیوں کے
ے آپ کی وزارت خارجہ اس سے بہتر اور کیا تحفہ سرمہ مفت نظر بھیج سکتی ہے۔

اِس خط میں ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے: "غالباً خفا بھی کیا ہو گا" پس منظر اس
ے کا یہ ہے کہ انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ میری کتاب "سارے جہاں کا درد" کا پیش لفظ لکھیں
لیکن بوجوہ یہ ممکن نہ ہو سکا۔ پھر کچھ ایسے بھی ہوا کہ میں دو ایک بار بمبئی گیا لیکن ان سے ملاقات
ہو سکی۔ ان کو گمان ہوا میں ان سے روٹھا ہوا ہوں۔ اردو اکادمی دلّی کے طنز و مزاح کے
سیمینار میں ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے پوچھا خفا ہو؟ میں نے کہا۔ "سوال ہی پیدا
نہیں ہوتا۔" کہنے لگے "میں نے آپ کی کتاب کا دیباچہ جو نہیں لکھا۔" میں نے کہا۔ "شاید اس
ے کہ کتاب اس لائق نہیں تھی۔ آپ خاطر جمع رکھیے یہ میری آخری کتاب نہیں ہے۔ میں یقیناً
یک دن ایسی کتاب لکھ سکوں گا جس کا پیش لفظ لکھنے میں آپ کو خوشی ہوگی۔

اس کے بعد جب مکتبہ جامعہ کی طرف سے میری ایک کتاب شائع کرنے کی پیش کش
ہوئی تو میں نے ظ صاحب سے ذکر کیا۔ کہنے لگے "ابھی دو مجھے مسودہ، میں اس کا دیباچہ لکھوں
ا۔ میں نے کہا آپ تو ماسکو جا رہے ہیں۔ کہنے لگے "اوّل تو لکھ کر جاؤں گا ورنہ وہاں سے
بھیج دوں گا۔

میں نے مسودہ انھیں ۲۰ مئی ۱۹۹۰ء کو دے دیا۔ ان کی طرف کافی دن تک کوئی
جواب نہیں آیا۔ ایک دن صابر دت صاحب کا خط ملا کہ ظ صاحب عنقریب آپ کی کتاب کا
دیباچہ لکھ دیں گے۔ لیکن ظ صاحب کی طرف کوئی اطلاع نہیں ملی۔ پھر ان کا ۱۳ اگست
کا خط ملا جس نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ لکھتے ہیں:-

"دلیپ میاں

وقت وقت کی بات۔

۲۰ مئی ۱۹۹۰ء کو آپ کے ۸ مضامین کی نقل مجھے مہاراشٹر عدن میں ملی۔ اسی شام
ٹھنڈی گاڑی سے میں بمبئی روانہ ہوا۔ سوچا راستے میں پڑھ لوں گا۔ وہاں پہنچ کر تبصرہ یا جو بھی لکھا جائے گا لکھ دوں
گا۔ پڑھ گیا، لکھا نہیں گیا۔ وجہ؟ اندرونی اذیت!

۵ جون کو بمبئی سے ماسکو روانہ ہوا۔ پھر انھیں مضامین کا پیکٹ بریف کیس میں
بند تھا کہ راستے میں ... مگر لا حاصل۔ ۱۳ جون کو ڈاکٹروں نے بتایا کہ آپ فوراً ولایت کی
طرف نکل جائیں کینسر کا اندیشہ ہے۔ روبل میں ٹکٹ نہیں ملتا۔ اور ڈھیروں ڈالر تو ساتھ
تھے نہیں۔ خیر ۲۳ جون کو ریل سے نکلے۔ راستے میں پھر ایک نظر ان میں دو مضامین پہ ڈالی
کہ اب لکھوں ... مگر ... نا!"

لندن میں چھان بین ہوتی رہی اور جب کنگس کالج ہسپتال میں پتا چلا کہ دمہ ہے
اور آپریشن بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر دواؤں کے ذریعے جان بچائی جا سکتی ہے۔ خیر
دیکھیں گے۔

جب میں لندن سے روانہ ہوا تو ماسکو روانہ ہوا [۱۲ اگست کو] تو سوچا بسلامتی ہوش و حواس یہ دو ورقہ تو لکھ ہی ڈالوں۔

بے نا بناوٹ کی بات! اور یہی اصلیت ہے۔ اصلیت کتنی جھوٹی لگے گی آپ کو۔

آپ کی تحریر میں جو بے تکلفی ہے، قدرتی پن ہے، زیر لب تبسم بھی گویا اوروں کی خاطر مزاح کے اندر سے ہلکی سی لکیر طنز کی پھوٹتی ہے اور سیچویشن کے سادہ بیان میں جو چٹ آپ سرسوں کی ملا دیتے ہیں۔ ان صفات کی بدولت آپ کے ہاں نہ صرف تازگی، مٹی کی سوندھی مہک اور پنجاب کے آب و نمک کا مزا ملتا ہے۔ بلکہ یہ مزا اوروں سے، میرا مطلب ہے کہ معاصرین ہم قلم عزیزوں سے جدا بھی کرتا ہے۔

آپ نے اردو میں کم لکھا لیکن بیشتر لکھنے والوں سے خصوصاً بیشِ از... قلم کاروں سے الگ پہچانے اور مانے جائیں گے۔

میں تفصیل سے لکھنے کی حالت میں نہیں ہوں۔ ۲۰ کو بمبئی اپنے گھر پہنچ جاؤں گا۔ [منزل آخر دور نہیں] والسلام۔

۲۰ مئی کے بعد میں نے ان کے گھر بمبئی میں کئی بار فون کیا لیکن کسی نے اٹھایا نہیں۔ کئی دوستوں سے بھی بات کی لیکن کسی کو ان کی حالت کا علم نہ تھا۔ ایک دو نے از راہ مذاق یہ بھی کہا کہ انھیں کینسر ہوگا ہی نہیں، ظ میں انا اتنی کہ معمولی بیماری سے مرنا بھی نہیں چاہے گا اس لیے یہ خبر پھیلادی ہوگی۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ تم اپنی کتاب چھپواؤ۔ یقین کرو کہ اس کی رسم اجرا تک نہ صرف ظ زندہ ہوں گے بلکہ غالب اکیڈمی کے ڈائس پر تمھارے ساتھ بیٹھے ہوں گے۔ پہلی جلد انھیں ہی پیش کرنا۔ میں نے بھی اپنے آپ سے وعدہ کر لیا کہ ایسا ہی کروں گا۔

ظ میرے یار آپ تو اتنی مہلک بیماری اور موت کے سایے تلے بھی اپنا وعدہ پورا کر گئے۔ مجھے تو جھوٹا ثابت کروا دیا نا۔

رفعت سروش
بی۔۲۔ پاکٹ سی سدھارتھ ایکسٹینشن
نئی دہلی۔۱۴

ایک پورٹریٹ

وہ اپنا دوست ہے،
صرف اپنا،
اس کا ذہن اس گردش میں رہتا ہے
کہ میں اپنی انا کے دائرے میں،
کس طرح محصور کر لوں ایک عالم کو
کمندیں پھینکتا ہے دوستی کی سادہ لوحوں پر
پلاتا ہے انھیں اخلاص کی صہبا
نشے میں چور کر دیتا ہے ان کی فہم و دانش کو
بنا کر پھر انھیں معمول اس منزل پہ لاتا ہے
کہ وہ اس کی فراست اور فضیلت کے ترانے گائیں،
اس کی عظمتوں کی داستاں لکھیں

انا کو جب غذا ملتی ہے
بڑھتا ہے غرور اس کا
اٹھا کر پھینک دیتا ہے وہ خالی جام و مینا کو
طلسم دوستی کو توڑ دیتا ہے
وہ اپنا دوست ہے،
اس کی انا کا دائرہ بڑھتا ہی جاتا ہے

ڈاکٹر مظفر حنفی
اقبال پروفیسر شعبۂ اردو،
کلکتہ یونی ورسٹی، کلکتہ ۳

غزل

اس نے ہم کو جھیل، ترائی اور پہاڑ دیے
ہم نے ان سب کی شہ رگ میں پنجے گاڑ دیے

زنجیروں میں جکڑی اس منہ زور ہوا نے پھر
توڑ دیے کھڑکی دروازے، پردے پھاڑ دیے

ہم سمجھے تھے، تم ہی شاید درد کا درماں ہو
تم نے بھی کچھ بھاشن بانچے، خطبے جھاڑ دیے

شبنم شبنم موتی بو کر آشا بیٹھی تھی
لشکر آیا، کھیت جلائے، پیڑ اکھاڑ دیے

ریت بھری نہروں کو دیکھو، بہنا بھول گئیں
نفرت کی آندھی نے کتنے شہر اجاڑ دیے

ہم تو گیلی ریت تھے جس کو روندا جاتا تھا
اس نے بھی کچھ نقش بناتے اور بگاڑ دیے

لاشیں گرتی ہیں مٹی میں اہل سے ملتے ہیں
یار مظفر اپنے کیوں مٹی میں گاڑ دیے

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی
ایس۔ این کالج، کٹرہ پردل خاں
اٹاوہ۔ یوپی

مشکلوں کی دھوپ میں زخمی پڑا ہے آدمی
خارزارِ زیست میں الجھا ہوا ہے آدمی

ناموافق وقت کا طوفاں بہالے جائے گا
ریت کی دیوار پر اترا رہا ہے آدمی

ایک چنگاری جو بھڑکی خاک میں مل جائے گا
ڈھیر پر بارود کے بیٹھا ہوا ہے آدمی

زندگانی روشنی کے واسطے بیتاب ہے
ظلمتِ حالات سے اکتا گیا ہے آدمی

زندگی اپنی اجالوں میں گنوا دینے کے بعد
گوشۂ تاریک میں پچھتا رہا ہے آدمی

ایک لغزش کا نتیجہ الاماں والحفیظ
باغِ جنت سے زمین پر آگیا ہے آدمی

ہائے کتنی آدمی کی قدر و قیمت گھٹ گئی
کوڑیوں کے مول اب تو بک رہا ہے آدمی

زندگی کے میکدے میں راز امرت اب کہاں
ساغرِ زہرِ ہلاہل پی رہا ہے آدمی

ظفر گورکھپوری
اے/۳۰۲، نلو ریڈ ۷، شاستری نگر
اندھیری ویسٹ بمبئی ۵۸

زرد کفن میں چپ چپ، محوِ خواب ایسا
آج سے پہلے کبھی نہ تھا مہتاب ایسا
اب خالی خالی آنکھوں کا رونا ہے
جاگتی آنکھوں نے دیکھا تھا خواب ایسا
دل پہلے بھی جلا ہے ساری ساری رات
یہ انگارہ کبھی نہ تھا شب تاب ایسا
مل جاتا تھا کبھی ہنسی میں، اشکوں میں
انساں اس سے قبل نہ تھا کم یاب ایسا
رخ سے اطمینان کا رنگ اٹھنے نہ دیا
مخلص تھا کچھ اندر کا گرداب ایسا
ٹوٹ گئے شاید آنکھوں کے سارے باندھ
چھوٹی ندیاں اور اُن میں سیلاب ایسا!
موسم تجھ کو کس نے ایسا روگ دیا
اندر پت جھڑ، باہر سے شاداب ایسا
پانی بہتا ہمسائے کے پودوں تک
ہوتا اپنا کھیت کبھی سیراب ایسا
ہم کو اپنے غم پہ امیروں جیسا فخر
کس کی جھولی میں ہے درِّ نایاب ایسا
کل تو پہلی بار ہنسے ہیں آج ظفر
ہم نے کتنی بار پیا زہراب ایسا

الیاس شوقی
بمبئی

ادراک

میں نے تو بس یہ سمجھا تھا،
یہ جانا تھا،
دوست ہوئے ہم، دوست رہیں گے،
تم مجھ میں، میں تم میں زندہ
اک دوجے کے دردشناسا، غم جویندہ
لیکن ـــــ آج اچانک دل نے
مجھ سے یہ سرگوشی کی ہے
دھیرے دھیرے، ہم دونوں ہی
انجانی سمتوں میں شاید
بڑھ آئے ہیں۔
ہم میں دوری در آئی ہے۔
کیوں کہ ہم میں
وہ پہلی سی بات نہیں اب
چاہت، غصّہ، رنج، شکایت
یہ سارے جذبات نہیں اب
یوں تو دونوں ہی زندہ ہیں
لیکن کیسے؟
اپنی اپنی زیست کے مارے
اپنے اپنے درد سہارے
اک دوجے سے بالکل غافل
اک دوجے سے شرمندہ ہیں!

سہیل آزاد
معرفت سلوجہ میڈیکل اسٹور جے پی روڈ
چیلی بھیت یوپی

آنسوؤں کے مسکراتے نقش پتھر میں پرونا
پھول کے نازک دلوں کو نوکِ نشتر میں پرونا

دن میں خود کو قید رکھنا بیکسی کے قافلے میں
شام۔ پھر تنہائیاں دیوار میں در میں پرونا

کوئی تو آنکھ اپنے اندھے جسم کے ہمراہ رکھنا
کوئی تو صورت ہمیں بھی اپنے منظر میں پرونا

نیند کالی آنکھ والے خواب کو خیرات کرنا
اور سنہری رتجگوں کا نقش بستر میں پرونا

پھر سفر پھر آگ جیسا آسماں در پیش ہے
تی آواز کے پرغم کے شہپر میں پرونا

انیس احمد خاں انیس
سپریم کورٹ ایڈووکیٹس لائبریری نئی دہلی

غزل

ایک تہذیب کا مکتب ترے لب کی خوشبو
منہہ سے آتی ہے ترے حسنِ ادب کی خوشبو

آدمیت ہے مری ذات میں افضل اشرف
میرے کردار سے آتی ہے نسب کی خوشبو

تیری یادوں کی مہک ذہن میں محدود نہیں
جسم سے بھی مرے آتی ہے غضب کی خوشبو

تو کسی چاند کے پہلو میں رہا ہے سورج
صبح میں تری بسی ہے کسی شب کی خوشبو

دردِ تخلیق مرے سینے میں اٹھتا ہے انیس
میری سانسوں میں ہے بےچین ادب کی خوشبو

افتخار اجمل شاہین
فلیٹ نمبر ۳ امینہ اپارٹمنٹس
بلاک ایم نارتھ ناظم آباد (کراچی)

دل ہے زندہ نہ جان باقی ہے
ایک خالی مکان باقی ہے

اپنی عظمت گنوا چکے کب کے
عظمتوں کا نشان باقی ہے

رہ گئی یاد ایک ہی صورت
بس اسی کا دھیان باقی ہے

اڑ گئے سب مکان کے پنچھی
اک شکستہ مکان باقی ہے

کھو چکے ہم یقین کی دولت
اب جو ہے سو گمان باقی ہے

زخم کو مندمل تو ہونا تھا
زخم کا ہر نشان باقی ہے

سہہ گیا یہ بھی حادثہ شاہیں
اب بھی زندہ ہے جان باقی ہے

محمد ولی اللہ ولی
ستلج ہاسٹل۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی
نئی دہلی

غزل

وہ تو اپنے واسطے محشر اٹھا کر لے گیا
اور میرے خواب کا منظر اٹھا کر لے گیا

کیوں سرابوں کو سمجھتا ہے وہ بحرِ بیکراں
کیا ہوا گر خواب کا پیکر اٹھا کر لے گیا

کچھ نہ کچھ لے کر ہی کچھ دیتی ہے دنیا اس لیے
خود غرض دنیا سے میں، دفتر اٹھا کر لے گیا

جسم جس کا اطلس و سنجاب میں ملبوس ہے
تن سے میرے وہ پھٹی چادر اٹھا کر لے گیا

میں تو سنگِ میل ہوں ہر راہ رو کے واسطے
کیوں مجھے وہ درد کا خوگر اٹھا کر لے گیا

ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں تو سنگ ماضی کو ولی
کون میری فکر کا محور اٹھا کر لے گیا

ایم۔ اے مشتاق
مقام و ڈاکخانہ دیسکری ضلع مدھوبنی بہار
پن ۸۴۷۲۳۹

سوچتا ہوں میں کہ آخر کیا لکھوں
زندگانی کو بھی اک سپنا لکھوں

ہمدم و ہمراز ایسا ہمنوا
کوئی تو ہو جس کو میں اپنا لکھوں

ہے لگا ہوں میں تیری صورت بسی
کعبہ لکھ دوں یا میں بت خانہ لکھوں

میں تمہیں اپنا سمجھتا ہوں مگر
تم ہی کہہ دو، تم سے کیا رشتہ لکھوں

میری غزلیں سن کے روتے ہیں سبھی
مرثیہ مشتاق کا تازہ لکھوں

اخلاق سہسوانی
سہسوان، ضلع بدایوں، یوپی
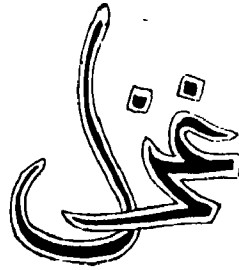
مجھ کو آلام و مصائب نے وہیں بڑھ کر چھوا
میری نظروں نے جہاں اُن کا رخِ انور چھوا

پاس کی کوٹھی سے اُٹھا قہقہوں کا ایک شور
آگ لٹتے شعلوں نے میرے گھر کا جب چھپّر چھوا

میری قسمت میں ہی کب لکھی تھیں ان کی قربتیں
ہاں مِرے دستِ تصور نے انھیں اکثر چھوا

نسبتاً چھوٹے تھے جو پودے نہ زد میں آسکے
آندھیوں نے یوں تو ہر ایک پیڑ کو یکسر چھوا

مجھ کو اے اخلاق اِس میں بھی نظر آیا تضاد
جب خیالوں نے مِرے اخلاص کا پیکر چھوا

منیر سیفی
۶- سرکار روڈ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۱
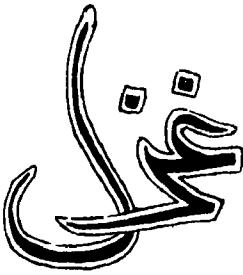
فضا میں تیرنا پتھر اتار لیتا تھا
فقیر کوزے میں ساگر اتار لیتا تھا

کبھی زمین میں قحط الرجال اور کبھی
ہرا بھرا سا وہ منظر اتار لیتا تھا

کسی کا خون بہے اس کی آنکھیں روتی تھیں
وہ اپنے دل میں ایک نشتر اتار لیتا تھا

کہ لب کشائی کی ہمت کسی میں تھی ہی کیا
ذرا سی بات پہ وہ سر اتار لیتا تھا

منیر میں بھی لڑکپن میں چڑیوں کے انڈے
لگا کے سیڑھیاں اکثر اتار لیتا تھا

صالح ندیم
۴/۱ے دوندی پور۔ الہ آباد۔

جب بھی سمندر سوکھے ہیں
خشک لبوں پر سوکھے ہیں

پیلے چہرے، پیلے جسم
دیوار و در سوکھے ہیں

آنگن آنگن بوند گری
باہر سے گھر سوکھے ہیں

صحرا تو پھر صحرا ہے
گھاٹ کے پتھر سوکھے ہیں

سرخ مناظر پر مت جا
سارے خنجر سوکھے ہیں

نیزوں میں تحریک بھرو
اب بھی کچھ سر سوکھے ہیں

تیرے لب اور میرے لب
دونوں اکثر سوکھے ہیں

حسینی جاوید
۲۲-۲-۵۹۲/۲/۲ نزد ابراہیم اسپتال
مغل پورہ۔ حیدر آباد

فرہنگ

یہ فیضان ادراک تھا
کہ میں
حدِ پرواز سے پرے جا پہنچا
آدم زاد
چیونٹیوں کا حجم اختیار کر کے
رینگتے رہے
اور ساری فلک بوس عمارتیں
ریت کے گھروندوں میں تحلیل ہوتی رہیں
میں بلندی سے انھیں دیکھتا رہا!
معاً خیال آیا
کہ نشیب کی ساری اہمیتیں
فراز پر کیوں محو ہو گئیں
وہ جوش ــــ وہ ولولے
رشک و حسد
ترغیب، سرکشی کے وہ سارے جھمیلے
مفادات اور حکایات کے سلسلے
بے معنی سے کیوں ہو گئے
رنگ و روغن کیسے اڑ گیا
اپنی ذات سے بلند ہو کر / سوچنے کا مطلب
شاید یہی ہو گا!

اوم کرشن راحت
۵ ایل/۱۵۲ - فرید آباد ٹاؤن شپ ۱۲۱۰۰۱

روشنی اور آگ

شام کو جھاڑیوں سے کچھ بچے
ایک جگنو کو پکڑ کے لاتے تھے
دیکھ کر اس کی ٹمٹماہٹ کو
زور سے تالیاں بجائی تھیں
اور معصومیت کے لہجے میں
مجھ سے کچھ اس طرح سے پوچھا تھا
"پاپا اس کے پروں کی اگنی سے
آگ جھاڑی میں کیوں نہیں لگتی"
اور جگنو یہ سن کے بولا تھا
"روشنی۔ آگ سے الگ شے ہے"

"کارِ اہم"

ماما' پاپا نے اپنی بچی کو
دے کے نازک سی کانچ کی گڑیا
پیار سے تھپتھپا کے چوما تھا
آج جانا تھا پھر کلب ان کو
ننھی بچی کو کہہ کے "ٹاٹا" وہ
باہری گیٹ پر ہی پہنچے تھے
جب کھلونے کے ٹوٹنے کی صدا
اور چیخ و پکار بچی کی
ان تک آئی تھی روکنے کے لیے
وہ مگر لوٹ کر نہ آئے تھے۔

عبدالشکور شکور
کرشنانند پور، ۷۵۴۱۳۵
کٹک (اڑیسہ)

رونقِ بزمِ چمن، نازشِ الفت ہے وہ
پیار کا ساز ہے اور حُسن کی دولت ہے وہ
میرے احساس کے موسم کا دل آویز سماں
میرے تخئیل کے گلشن کی طراوت ہے وہ
ایک شاعر کے حسیں خواب کی رنگیں تعبیر
ایک فنکار کے شہکار کی ندرت ہے وہ
میرے ارمان کے آکاش کا روشن تارا
میری امید کے گلزار کی نکہت ہے وہ
ایک عاشق کے تصور کی حسیں دوشیزہ
ایک محبوب کی پاکیزہ محبت ہے وہ
فصلِ باراں کی برستی ہوئی پہلی بارش
شامِ گل رنگ کی بکھری ہوئی رنگت ہے وہ
میری تخلیق کے شہرہ کا بھی باعث ہے شکور
میرے احساس کے ایوان کی رفعت ہے وہ

رف و ترجمہ
یس الرحمٰن
نگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ
ئی دہلی ۲۵

(امریکی شاعری)

جان بیری مین: دو نظمیں

(۱۹۱۴ء — ۱۹۷۲ء)

جان بیری مین (JOHN BERRYMAN) نے ایک بار کہا تھا کہ اُس کی دلچسپی اُن لوگوں میں ہے جو دُکھوں میں جیتے اور مرتے ہیں۔ یہ اعتراف اُس کے زمانے اور خود اُس کی زندگی کی اُداس کیفیتوں کی تاویل ہے۔ اپنے عہد کے کئی دوسرے شعرا کی طرح وہ بھی سماجی اور سیاسی بحران کے جان لیوا تجربوں سے گزرا اور اٹھاون برس کی عمر میں اس نے خود اپنی زندگی سے رشتہ توڑ لیا۔ گویا خودکشی کے اس عمل سے وہ اپنے دُکھوں کا آخری اظہار کر گیا۔

بیری مین نے کولمبیا اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ اُس کا کلام پہلی بار ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ چوتھے دہے میں یونی ورسٹیوں میں تعلیم دینے کے ساتھ وہ نظمیں بھی لکھتا رہا HOMAGE TO MISTRESS BRADSTREET ۱۹۵۶ء کی اشاعت کے ساتھ اسے شہرت ملی۔ پھر ۱۹۶۴ء میں DREAM SONGS کی اشاعت نے اسے امریکی شاعری کی تاریخ میں ایک مستقل مقام عطا کیا۔ اس مجموعے میں تین سو پچاسی نظمیں شامل ہیں۔ ان نظموں میں وہ اپنی ذات کا احاطہ کرتا ہے۔ کبھی خود کلامی کی صورت، کبھی ہنری کی ذات میں روپوش ہو کر جو دراصل اُس کی اپنی ہی ذات ہے۔ بیری مین کے دوسرے شعری مجموعے LOVE AND FAME ۱۹۷۰ء اور DELUSIONS (۱۹۷۲ء) ہیں۔ اُس نے ایک سوانحی ناول بعنوان RECOVERY (۱۹۷۳ء) بھی لکھا تھا۔ آخرالذکر دو کتابیں اُس کی موت کے بعد شائع ہوئیں۔

ذیل میں اُس کی دو نظموں کے ترجمے پیش کیے جاتے ہیں۔ یہ نظمیں اُس کے مجموعے (DREAM SONGS) خواب نغمہ سے لی گئی ہیں۔

خواب نغمہ

(۵۳)

وہ دنیا کے بیچوں بیچ پڑا ہوا تھا
نصف انسان، جیسے یونانی ہیرو پیلڈس ہو

(بادشاہ پیلیس اور سمندری پری کا بیٹا)
جیسے اُسے اور خواب آور دواؤں کی ضرورت ہو
جیسے اُسے اپنے نام آئے ہوئے ہتک آمیز خط کھولنے ہوں
دل دُکھانے والی باتیں سننی ہوں
اور اُس پر اپنی یادداشت کا ستم ہو
جو کبھی معاف کرنا نہیں جانتی۔

— میں شاید ہی کبھی فلمیں دیکھتا ہوں
فلمیں بہت مشتعل کرتی ہیں،
معزز شاعر ایلیٹ نے کہا؛
— مجھے اخبار پڑھنے میں بہت دیر لگتی ہے
برانگیختہ ناول نگار سال بیلو نے کہا
کہ میں ہر شخص میں اپنی شناخت کرتا ہوں
جن میں مُردے بھی شامل ہوتے ہیں، مرے دوست!"

کیرکیگارڈ ایک ایسے معاشرے کی تلاش میں تھا
جس میں اخبار پڑھنے کا جبر نہ ہو
اور دوستو اس کا خیال بُرا نہیں تھا،
اور ٹامس ہارڈی نے زندگی کے آخری دنوں میں خموشی اختیار کرلی تھی
جسے ہاؤسمین نے بہت پہلے اپنا لیا تھا
اور جرمن شاعر ہن نے کہا:
وال پیپر کی جگہ ہم اپنی کھال استعمال کر رہے ہیں
پھر بھی کامیاب نہیں ہوتے

(۲۶۲)
تم بوڑھا ہونا برداشت نہیں کر سکتے
لیکن سچ ہے ہم سب بوڑھے ہوتے ہیں
ہم میں تبدیلیاں آتی جاتی ہیں،
اختلافات بڑھتے جاتے ہیں
ہماری جلد تن جاتی ہے یا ڈھیلی پڑجاتی ہے
لیکن ہمت رکھو، حالات جیسے پہلے تھے اب نہیں ہیں
اور نہ کبھی ہوں گے

پرُجوش دلوں پر برف پڑ چکی ہے
ساحلوں پر ہمکنے والی موجیں سرد پڑ گئی ہیں۔

ملول ہوتی ہوئی روح اب اپنے اندر بہت سے راز چھپانے لگی ہے
جیسے دوبارہ زندہ ہو رہی ہو
یہ گنجینۂ راز ہے لیکن سب غیر یقینی
اور کچھ بھی پہلے جیسا نہیں ہے
ایسے موقعوں کے لیے ہراکلیٹس نے ایک اچھی بات کہی تھی
وہ بات ابھی میں بھول رہا ہوں
ہم جیتے جاگتے غلطیاں کرتے رہتے ہیں
اور مجموعی طور پر زیادہ دانش مند ہوتے جاتے ہیں

لیکن پھر بھی صورتِ حال پہلے سے زیادہ یقینی نہیں
یہ معاملہ نوجوانوں کے لیے چھوڑ دو
تم تو بس آگے کا رستہ ٹٹولو، جس طرف کوئی نہ گیا ہو
جہاں جانا صرف ہمارا حصّہ ہے
اس کے علاوہ، تم وقت سے پہلے ہار مان گئے
جو تمھارا حصّہ ہے
پیٹرٹن کی اندوہناک موت سے
موجودہ دلدوز منظر نامے تک
صورتِ حال ایک جیسی ہے۔

علامہ محمد محیط طباطبائی
ترجمہ: ڈاکٹر سید حسن عباس گوپال پوری
اردو سروس ریڈیو تہران - ایران

ایران میں شناخت اقبال کے ابتدائی نقوش

علامہ اقبال کی ۵۳ ویں برسی پر ایران کے ممتاز ادیب جناب علامہ محمد محیط طباطبائی کا ایک مختصر مضمون (فارسی میں) رسالہ کیہان فرہنگی شمارہ ۲ جلد ۷ میں شائع ہوا ہے۔ اقبال شناسی کے سلسلے میں مضمون کی افادیت بھرپور قائم ہے۔ قارئین کے لیے اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔

اصل مطلب پر آنے سے پہلے جو صرف اور صرف اس عظیم شاعر کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے، اقبال کو سرزمین پنجاب کا فارسی گو شاعر سمجھنا چاہیے جنھوں نے لطیف ترین ادبی مفاہیم کو خوبصورتی کے ساتھ شعری قالب میں ڈھالا اور اپنے لطیف احساسات و افکار کی چاشنی سے آمیزش دیا ہے۔

اب تک فارسی میں ان کی کوئی نثری تحریر یا تقریر کے بارے میں کوئی بات نہیں کی گئی ہے اور ان کی تخلیقات میں سوائے فارسی اشعار کے کچھ اور نہیں ملتا۔ لہٰذا فارسی نثر میں ان کی واحد تخلیق اسی خط کو سمجھنا چاہیے جو اقبال کی وفات کے برسوں بعد تہران سے ایک قلمکار نے اقبال کے نام سے شائع کیا تھا۔ لیکن ان کی تخلیقات کی چھان بین کرنے کے دوران اس خط کا کوئی مسودہ دستیاب نہیں ہوا۔ انھوں نے فارسی میں صرف شاعری کی لیکن اس زبان میں نہ تو انھوں نے کوئی چیز لکھی اور نہ ہی گفتگو کرتے تھے۔ وہ روزمرہ کی زندگی میں اردو اور انگریزی سے کام لیا کرتے تھے۔ اپنے پاک زمین کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے انھوں نے صرف فارسی دری کا انتخاب کیا تھا اور اس زبان میں اپنے بیانات میں وہ کسی حد تک قوی اور کامیاب رہے۔ گویا پیکر اقبال میں بیدل، غنی اور غالب کی روح لباس بادہ اوڑھ کر جلوہ گر ہوئی۔

شاعر اردو زبان، فارسی گو مسلمان، وکیل، فلسفی اور سیاست داں ڈاکٹر محمد اقبال میں مقیم کشمیری الاصل تھے انھوں نے ۱۳۱۷ھ شمسی میں بہار کے پہلے مہینے کے اختتام

شہر لاہور میں داعی اجل کو لبیک کہا اور ملکوت اعلا سے جا ملے۔ اس وقت ان کے انتقال کو ٹھیک ترپن سال ہو رہے ہیں۔ اس موقع پر ایرانی عوام کے رویے میں اس وقت سے بہت زیادہ تبدیلی آگئی ہے جب وہ اقبال کی زندگی میں ان کے بارے میں سوچتے تھے۔ اور اب ملک کے تعلیم یافتہ طبقے میں اس قدر معروف ہو چکے ہیں کہ ہندستان وایران کے قدیم سخنوروں کی برابری کر رہے ہیں۔

۱۳۱۷ش کے موسم بہار میں علامہ اقبال کی وفات کی ناخوش گوار خبر سارے جہاں میں پھیل گئی۔ لیکن تہران سے شائع ہونے والے اس وقت کے اخبارات ورسائل میں اس خبر پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یہ چیز کم وبیش ان لوگوں کے لیے افسوس ناک تھی جو کسی حد تک اقبال کی ادبی، فلسفی اور اجتماعی شخصیت کی اہمیت سے واقف تھے۔

ادبی رسالہ ارمغان وہ واحد رسالہ تھا جس نے نسبتاً تفصیل سے اقبال کی ادبی شخصیت اور ہندستان میں فارسی شاعری کے احیا میں ان کے کردار نیز ان کی تخلیقات کے بارے میں مقالہ شائع کیا۔ یہ مقالہ اقبال کی شخصیت سے آگاہ ایک شخص نے لکھا تھا۔ اس مقالے نے کلکتہ لاہور اور دہلی کے ادبی ماحول پر تو گہرا اثر کیا لیکن بدقسمتی سے تہران میں کچھ زیادہ موثر ثابت نہیں ہوا اور نہ ہی ایران کے ادبی حلقوں اور اخبارات وجرائد پر اثر انداز ہوا۔

واضح ہے کہ رسالہ ارمغان میں ۱۳۱۷ھ ش میں اقبال پر شائع ہونے والا مقالہ ہندستان کے اس معروف شاعر اور جدید فلسفی کے تعارف کے سلسلے میں فارسی میں لکھا جانے والا پہلا مقالہ نہیں تھا بلکہ برسوں قبل مؤلف فرہنگ نظام اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد میں فارسی زبان وادب کے استاد مرحوم سید محمد علی لاریجانی داعی الاسلام نے اسی وقت جب اسلامی تہذیب وثقافت' پر خطبات دینے کے لیے عثمانیہ یونی ورسٹی نے ڈاکٹر محمد اقبال کو حیدرآباد آنے کی دعوت دی تھی اور اقبال نے یہ دعوت قبول کر لی تھی نیز حیدرآباد گئے بھی تھے، چشم دید گواہ کی حیثیت سے اقبال کے بارے میں فارسی میں ایک بھرپور رسالہ لکھا تھا اور حیدرآباد یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی کے اپنے شاگردوں کے استفادے کے لیے چھپوایا بھی تھا اور شاید اس کے کچھ نسخے ایران اور تہران بھیجے تھے۔ کیونکہ ۱۳۰۹ میں مرحوم حسین پرویز کتاب فروش نے اس کا ایک نسخہ مجھے بھی دیا تھا۔ یہ رسالہ کم سے کم اقبال کے انتقال سے دس سال پہلے شائع ہوا تھا۔ یہ پہلی چیز تھی جو اقبال کے بارے میں ہندستان میں فارسی میں شائع ہوئی۔ اور جن لوگوں نے مجھے یا تہران میں بعد میں اقبال کے بارے میں کچھ لکھا ہے انھوں نے اس رسالے سے رجوع کیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے ۱۳۱۲ میں افغانستان کے بادشاہ ظاہر شاہ کی اس ملک کے نو بنیادی علوم کے لیے ایک نیا ثقافتی پروگرام مرتب کرنے کی دعوت پر مدرسہ اسلامیہ علی گڑھ کے بانی اور سرپرست سر سید محمود خاں کے ساتھ کابل کا سفر کیا۔ افغان قوم اور حکومت نے حد درجہ پذیرائی اور مہمان نوازی کی منجملہ فارسی کے جدید الاشاعت ادارے "کابل" نے اقبال کی شخصیت اور کارناموں پر مشتمل ایک خاص نمبر شائع کیا۔ درحقیقت ۱۳۰۷ میں شائع ہونے والے مرحوم داعی الاسلام

کے رسالہ اقبال کے بعد اور ۱۳۱ میں جریدے ارمغان کے مقالہ اقبال سے پہلے رسالہ کابل کی فارسی میں شناخت اقبال کی دوسری کوشش تھی۔ رسالہ کابل کا اقبال نمبر ۱۳۱۲ میں چھپا تھا۔ اس کے شمارے بھی تہران پہنچے اور یہاں ان سے استفادہ کیا گیا۔ لہٰذا ارمغان میں شائع ہونے والا مقالہ اقبال کی وفات کے تھوڑے ہی عرصے بعد فارسی میں شائع ہونے والا مقالہ اقبال کی وفات کے تھوڑے ہی عرصے بعد فارسی میں شائع ہونے والا تیسرا مقالہ تھا جس میں اقبال کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی تھی اور جو درحقیقت ایرانی قارئین کے لیے اس عظیم اسلامی مفکر اور ادبی شخصیت کی شناخت کے سلسلے کا پہلا مقالہ تھا۔ اگرچہ اس کے مقالہ نگار نے اس سلسلے میں افغانستان اور ہندستان میں شائع ہونے والی چیزوں سے غفلت نہیں برتی تھی۔ اور اپنے مقالے میں ان سے استفادہ کیا تھا لیکن مدیر رسالہ مرحوم وحید کی نظر میں مقالہ نگار کی اہمیت مقالے سے زیادہ تھی۔

جناب مشائخ فریدی (محمد حسین) نے جنھوں نے ۱۳۲۸ کے بعد ہمیشہ ہی ہندستان، پاکستان، سعودی عرب اور عراق کے بارے میں کافی کچھ لکھا اور وہاں رہے ہیں، حال ہی میں رسالے کیہان فرہنگی سے ایک انٹرویو میں یوں اظہار خیال کیا ہے۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے اقبال کو ایرانی عوام میں جس پہلی علمی شخصیت نے متعارف کروایا، وہ مرحوم استاد ملک الشعرا بہار کی شخصیت تھی۔ بہار نے ایران وہندستان کے روابط پر مشہور مثنوی کہی اور ۱۳۲۶ کے موسم سرما میں تہران یونی ورسٹی میں پڑھی۔"

بہار کی طرف سے اقبال کو پہچاننے یا پہچنوانے کے سلسلے میں جناب مشائخ کے اس خیال نے میرے لیے مناسب موقع فراہم کیا تاکہ میں اقبال کے سلسلے میں بہار کے پہلے اظہار نظر کا شاہد عینی ہونے کی حیثیت سے موصوف نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں اضافہ کروں۔

اواخر مہر ماہ ۱۳۱۳ ھ ش میں جب فردوسی کانگریس کے تہرانی مندوبین مشہد سے واپس آگئے تھے۔ مرحوم مجید موقر نے فردوسی پر رسالہ مہر کا ایک خاص شمارہ شائع کیا اور اسے کانگریس کے اراکین کی خدمت میں پیش کرنے کی تیاری کی تھی۔ انھوں نے ایک مقالے "فردوسی کا مذہبی عقیدہ" کے تین سو نسخے الگ چھاپے تھے اور مجھے دینا چاہتے تھے تاکہ میں جسے چاہوں دوں۔ ایک دن مذکورہ مقالے کی کاپیاں لینے کے لیے میں رسالہ مہر کے دفتر گیا۔ ملک الشعراء بہار اور افغانستان کے شاعر شیریں سخن سرور گویا جو فردوسی کانگریس میں افغانستان کے دو مندوبین میں سے ایک تھے، رسالے کے مالک ومدیر سے مختلف موضوعات پر گفتگو میں مشغول تھے۔ ناگہاں سرور گویا نے پوچھا کہ ایران میں ڈاکٹر محمد اقبال لاہوری کو ارباب ادب اس حد تک پہچانتے ہیں؟ مدرسہ دار الفنون میں تاریخ کے استاد مرحوم فلسفی نے جو اس وقت مجلہ مہر کے اداری امور کے ذمے دار تھے، مورد سوال شاعر ڈاکٹر محمد اقبال اور پنجاب یونی ورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال لاہوری کو ارباب ادب کس حد تک پہچانتے ہیں ڈاکٹر محمد اقبا

لاہوری کو جنھوں نے راوندی کی کتاب راحت الصدور کی تصحیح کی ہے اور سلسلۂ مطبوعات گیپ (اوقاف گیپ) نے شائع کیا ہے، ایک ہی تصوّر کر لیا اور راحت الصدور پر ان کے عالمانہ کام کی بے حد ستائش کی۔ مرحوم بہار نے ان کی باتوں میں صرف یہ اضافہ کیا کہ میں نے فارسی میں ان کا ایک نہایت خوشخط دیوان دیکھا ہے۔

اِن دونوں جوابات سے افغان شاعر مرحوم سرور گویا مطمئن نہیں ہوتے بلکہ ان جوابات نے انھیں بے حد غمگین اور افسردہ بنا دیا۔ پھر انھوں نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ اور خاموش رہ گئے۔ جب میں نے ان کی بے حد افسردگی اور ناراضگی کا احساس کیا تو بہانے سے مجلس سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔ جب واپس آیا تو کابلی شاعر کے پاس بیٹھا اور کہا دیوانِ اقبال کی چار جلدیں اور شناخت اقبال کے سلسلے میں داعی الاسلام کی کتاب ایک دوست کے پاس ہے۔ اگر مطالعے کی ضرورت محسوس کرتے ہوں تو آپ کو دے دی جائیں۔ اس اظہارِ محبت پر انھیں قدرے سکون حاصل ہوا۔ اسی اثنا میں مرحوم مجید نے مقالے "فردوسی کا مذہبی عقیدہ" کی اضافی کاپیاں مجھے دے دیں۔ میں نے ایک نسخہ پر سرور گویا کا نام لکھا اور ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سرور خاں نے کہا کہ ایک نسخے پر ڈاکٹر محمد اقبال لاہوری کا نام لکھ دیں اور مجھے دے دیں تاکہ میں کابل پہنچ کر انھیں تہران کی سوغات کی حیثیت سے لاہور بھیج دوں۔ کیونکہ گزشتہ سال جب وہ کابل آئے تھے تو میں نے حکومتِ افغانستان کی طرف سے ان کی پذیرائی کی تھی۔ اس سفر میں وہ اقبال کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ ان کے کہنے کے مطابق عمل کیا گیا۔ اس ملاقات کے طویل عرصہ بعد ایک دن کابل سے تہران آنے والی ڈاک میں اقبال کی چند مطبوعہ کتابوں کا ایک کھلا پیکٹ سرور کے ایک خط کے ساتھ آیا۔ پیکٹ میں ارمغان حجاز کے سوا بقیہ کتابیں میری دیکھی ہوئی تھیں اور میرے پاس بھی تھیں۔ خط کے ایک حصے میں اقبال نے سوغات تہران بھیجنے پر انگریزی میں سرور کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ پیکٹ کی طرح خط بھی کھلا ہوا تھا۔

۱۳۲۰ میں تہران میں رد کیے جانے والے غاصب سپاہیوں میں لاہور کا ایک مسلمان فارسی داں کیپٹن بھی تھا جو غالب و مغلوب کے درمیان ادبی اور ثقافتی رابطے کا کام کر رہا تھا اور شاعرِ لاہور، محمد اقبال کے سلسلے میں بہت زیادہ ارادت و عقیدت رکھتا تھا۔ ۱۳۲۲ میں جب کہ وہ ابھی تہران ہی میں مقیم تھا اس نے میوزیم ایران باستان کے ہال میں وزارت ثقافت و باستان شناسی کی مدد اور مرحوم داعی الاسلام کے تعاون سے جو جنگ کے موقع پر حیدرآباد سے ایران آ گئے تھے اور تہران میں ہی رہ رہے تھے، اقبال کی پانچویں برسی کی تقریبات منانے کا اہتمام کیا۔

اس مجلس کے اہم مقرر مرحوم داعی الاسلام تھے جنھوں نے پندرہ سال بعد ایک بار پھر البتہ تہران میں، ہندوستان کے فارسی گو شاعر اقبال کو متعارف کرایا۔ اس جلسے کی واحد اہم

شخصیت مرحوم بہار تھے جنھیں جلسے کے انعقاد میں کم وقت ہونے کی وجہ سے شاندار قصیدہ کہنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لہٰذا انھوں نے صرف مثنوی کہنے پر اکتفا کی جو بے حد مقبول ہوئی۔ اور ناچیز نے بھی خوش قسمتی سے اسی جلسے میں ملک الشعرا بہار کی زبانی یہ مثنوی سننے کی توفیق حاصل کی۔ اسی دن اقبال پر خصوصی شمارہ نامہ محیط کے ساتھ شائع ہوا۔ جو زیادہ تر برصغیر ہندستان کے دو نامور شاعر محمد اقبال اور رابندرناتھ ٹیگور کے بارے میں میری پرانی تحریروں اور ہند و ایران کے قدیم و جدید ثقافتی روابط کے خلاصے پر مشتمل تھا۔ یہ شمارہ یاد اقبال کے اس جلسے کو حاضرین میں تقسیم کیا گیا۔ اور جو بچ گیا مذکور افسر کے حوالے کر دیا گیا تا کہ وہ جسے چاہیں دیں یا بھیجیں۔

ہندستان کے تین ملکوں، ہندستان، پاکستان اور سیلان میں منقسم ہونے کے بعد ۱۳۲۸ کے بعد، ہر سال پہلی اردی بہشت (۲۵ اپریل) کو ہندستان اور پاکستان میں یوم اقبال کہا جانے لگا۔ اور اس سلسلے کی تقریبات منعقد ہوتی ہیں۔ اتفاق سے تقسیم کے پہلی ہی سال ۱۳۲۸ میں ہندستان میں اس مناسبت کی تقریبات منعقد نہیں ہوئیں۔ اسی سال مہر ماہ میں وزارت ثقافت کے حکم پر جنوبی ہندستان کے شہر میسور میں یونسکو کی جانب سے منعقدہ ثقافتی پروگرام، تعلیم بالغان، میں میں نے شرکت کی۔ فطری طور پر وہاں ہندستان کے ثقافتی اور تعلیمی امور کے ہندو اور مسلمان بعض نامور اور ماہرین فن لوگوں منجملہ حکومت بمبئی (مہاراشٹر) کے وزیر تعلیم پروفیسر غلام السیدین اور بنگال (کلکتہ) یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر باسو سے قریب سے آشنائی ہوئی۔ شہر میسور میں ہندستانی مسلمانوں کے فعال، سرگرم اور جوش و خروش سے بھرے مجمع نے اس شہر میں دنیا کے علما و فضلا کے ایک گروہ کی موجودگی کو غنیمت جانا اور غلام السیدین سے جو مسلمان ہونے کے ساتھ سمینار کی نمایاں شخصیت تھے۔ اسی موقع پر یوم اقبال منانے کی درخواست کی جو موسم بہار میں نہیں منایا گیا تھا۔ مشترکہ دعوت پر سمینار کے بعض مندوبین نے شہر میسور کے نشاط باغ میں یوم اقبال منایا جس میں سمینار کے یورپی، امریکی اور ایشیائی مندوبین نے شرکت کی۔ اکثریت میسور اور میسوری زبان والوں کی تھی جو اپنی زبان میں بول رہے تھے لیکن سامعین میں اردو، انگریزی اور فارسی والے تھے۔ میں اس سمینار کا واحد مقرر تھا جس نے فارسی میں تقریر کی تھی۔ میں نے کوشش کی کہ فارسی کے ایسے الفاظ استعمال کروں جس سے اردو والے آشنا ہوں اور بقول یوسف خوزان (نمایندہ سعودی عرب مقیم بمبئی) یہ فارسی اردو والوں کے لیے انگریزی سے زیادہ باتفہیم تھی۔

یہ کام جو مہر ماہ ۱۳۲۸ میں میسور میں بے موقع ہوا، ۱۳۲۹ میں موسم بہار کے پہلے مہینے کے اختتام پر دہلی میں واقع پاکستان کے نمایندہ دفتر میں اپنے وقت پہ انجام پایا جس میں ایرانی سفارت خانے کے کارکنوں کے ساتھ میں نے بھی شرکت کی۔

یہ خداوند عالم کا کرم تھا کہ ۱۳۱۲ میں اپنے ہم وطنوں کے اقبال کے نام سے آشنا ہونے کے پہلے جلسے اور ۱۳۲۲ میں تہران میں منعقدہ یاد اقبال کے اس پہلے جلسے میں جس میں داعی الاسلام اور بہار نے نظم و نثر میں اقبال کے ادبی اور سیاسی مقام و مرتبے پر روشنی ڈالی تھی اور اسی طرح تقسیم کے بعد ہندستان میں منعقدہ پہلے یوم اقبال میں شرکت کی توفیق حاصل کی۔ اس موقع پر جب کہ اقبال کے ہم وطن ایران میں اپنے انداز سے اقبال کی یاد منا رہے ہیں تو ان سطور کے لکھنے کی توفیق ہوئی تا کہ ایک بار پھر اس میں شریک ہو سکا۔

کیشو میشرام
ترجمہ: انور بیرکار

مراٹھی کہانی

چھلانگ

مراٹھی کے کہانی کار، شاعر اور ناقد پروفیسر کیشو میشرام کے کم و بیش بیس افسانوی مجموعے، پانچ شعری مجموعے اور تین تنقیدی مضامین کے مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان کے فن و شخصیت پر پی۔ایچ ڈی کے مقالے زیرِ تکمیل ہیں۔ ان دنوں مہارشی دیانند کالج (بمبئی) میں مراٹھی کے لیکچرر ہیں۔ اور ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ۔

دوسری مرتبہ لائی ہوئی گاڑی خالی کرنے تک دوپہر ٹل چکی تھی۔ پوری گاڑی کانٹے دار شاخوں، ٹہنیوں سے بھری پڑی تھی۔ دراصل رالو اور تالو دونوں بھائیوں نے مل کر اس کو پُر کیا تھا۔ دھان بونے کی تیاریاں مکمل ہو رہی تھیں۔ کھیت جُت چکے تھے۔ اب بونے کی باری تھی۔ بارش قدرے برس کر تھم جانے پر اس کی شروعات کا ارادہ تھا۔ اس لیے جانوروں سے بچاؤ کے لیے ان کانٹے دار جھاڑیوں، شاخوں اور ٹہنیوں کے جنگلے کی ضرورت تھی۔ چھ سات میل کی دوری پر کانٹے دار شاخیں منڈیر پر جمع کی گئی تھیں۔

"دادا، یہ ہو سکتا ہے کم پڑ جائیں۔ چھوٹے تالو نے کمر پہ ہاتھ رکھے اس ڈھیر کی طرف نظر پھینکتے ہوئے کہا۔ بائیں ہاتھ کا انگوٹھا منہ میں دابے زوروں سے چوس رہا تھا۔ اسے پھونک بھی رہا تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں نے خون سے رنگا انعام اُسے دیا تھا۔ انگوٹھے میں داخل شدہ ایک کانٹے کی ٹیس اس کے دماغ تک پہنچ چکی تھی۔ واقعی کم پڑ جائیں گی۔ دو مرتبہ اور لانی ہوں گی۔ پھر اس وقت توڑنا اور پھر انھیں گاڑی پر لاد کر لے آنے میں رات ضرور ہو جائے گی۔ رالو قدرے فکر یہ انداز میں مخاطب تھا۔

"ایک ہی جھٹکے میں اگر اپنے آنگن میں جمع کر دی جائیں۔ تو کام کی ابتدا میں تاخیر کی گنجائش نہ ہوگی۔" تالو بڑے بھائی سے کہہ رہا تھا۔

اب بیلوں کو چارا پانی دے دو پھر کچھ دیر کے لیے آزاد چھوڑ دو۔ یہ جوڑی ہے تو نئی۔ لیکن کام کے لیے بہت اچھی ہے۔ بیلوں کی تعریف میں وہ اپنے چھوٹے بھائی سے مخاطب تھا۔

رالو نے تمباکو کی ڈبیا اپنی جیب سے نکال لی تھی اور معمول کے مطابق کھانے جتنا تمباکو ہاتھ پر نکال لیا تھا۔ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے چونا لے کر تمباکو کے ساتھ ملا لیا۔ بچا ہوا چونا

گردن کے پچھلے حصّے پر مسل دیا۔ کانٹوں سے پیدا شدہ زخموں میں جیسے آگ سی محسوس ہوئی۔ تمباکو مسل کر ہونٹوں کے نیچے دبا دیا۔ اور پھر ہاتھ پر لگے تمباکو کو جھٹک دیا۔ ایک بار دائیں طرف تو دوسری مرتبہ بائیں طرف مڑ کر بدن توڑا۔ اور پھر کانٹے دار شاخوں کو بغور دیکھنے لگا۔

تالو نے بیلوں کو چھوڑ دیا تھا۔ ان کے منہ سے نکلنے والا جھاگ اب کم ہو گیا تھا۔ کھیتوں کی طرف آتے ہوئے شاخوں، ٹہنیوں سے بھری وزنی گاڑی کو ندی کی اترن کے بعد چڑھاؤ کی طرف جاتے ہوئے بیلوں کو پوری طاقت صرف کرنی پڑی تھی۔ آم کے پیڑ کے نیچے جس کی چھاؤں چاروں طرف پھیل چکی تھی، بیلوں کو باندھ دیا۔ انھوں نے گوبر خارج کیا اور اپنی آنکھیں موند کر شانت بیٹھ گئے۔

"تالو تم یہیں رکو، میں ذرا گھر کی طرف ہو آتا ہوں۔ اگر تاخیر ہو جائے تو بیلوں کی جوڑی لے کر گھر واپس آجانا"بڑے نے چھوٹے سے کہا اور گھر کا راستہ لیا۔

بھائی کے دور جاتے ہی تالو بھی بیلوں کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ ویسے اس کی عمر بمشکل پندرہ سولہ برس کی تھی۔ پارسال ہی اس کی منگنی طے پائی تھی۔ بڑے کا بیٹا چھ سال کا تھا۔ تالو تھا تو چھریرے بدن کا، مگر اکھاڑے کی وجہ سے اس کا بدن کسا ہوا لگتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں بھی اس نے پال رکھی تھیں۔ اس رہن بسیرے میں وہ بھائی کی نظروں سے بچ کر دو چار بیڑیاں ضرور پھونکا کرتا تھا۔ بھائی کی نظروں سے اوجھل ہوتا دیکھ کر ماچس کی ڈبیا باہر نکالی اور ایک بیڑی بھی۔ وہاں وہ صرف اکیلا تھا اور بیل شانت بیٹھے جگالی کر رہے تھے۔ چار یا پانچ بج رہے ہوں گے۔ پھر بھی اترتے سورج کی تپش میں کمی نہیں تھی۔ بھنورے پریشان کر رہے تھے اور پسینہ بہ کر کپڑوں میں جذب ہو رہا تھا۔ بیڑی ختم کرنے کے بعد اسے مٹی کے نیچے دبا دیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔

پاس کھڑی گاڑی میں اس کی بہت چہیتی دستہ لگی کلہاڑی پڑی ہوئی تھی۔ املی کا پیڑ کاٹ کر اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کا دستہ بنایا تھا۔ ہر دو دن بعد اُسے تیز کرنا نہ بھولتا تھا۔ بیل گاڑی کے نچلے حصّے پر ایک لوہے کی پٹی بندھی تھی اور دوسری طرف ایک قندیل لٹک رہا تھا۔ تار کے ہک اس طرح باندھے ہوئے تھے کہ اس کے ٹپکنے کا امکان بہت کم تھا۔ ندی میں پانی کم اور کائی زیادہ دکھائی دے رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے کنویں بھی اس علاقے میں سوکھتے نہیں تھے۔ تالو نے کائی کو پرے ہٹا کر ہاتھ پانو دھوئے۔ دھوتی کے کونے سے صاف کیے۔ پانی کے چھپا کے منہ پر مارنے کی وجہ سے مونچھوں میں اٹکا ہوا پانی بوند بوند نیچے گرنے کی کوشش میں غلطاں تھا۔ اور اس پر سورج کی کرنیں پڑنے کی وجہ سے بے شمار رنگ اس میں دکھائی دے رہے تھے۔ پانی خود بھی پیا۔ اور بیلوں کو بھی پلوایا۔ پھر ان پر پانی پھینکا۔ اس بات سے وہ اکثر لطف اٹھاتا کہ ان پر پانی ڈالتے ہی وہ اپنی دم کے ذریعے اور جسم کی چمڑی ہلا ہلا کر پانی دور کرنے کی کوشش کرتے۔ اس کے بعد اس نے کلہاڑی اٹھائی اور بیلوں کے ساتھ درخت کا راستہ لیا۔ ندی گھاٹ سے اوپر گنوبیہ دیوی مورتی دکھائی دی۔ حسب معمول اس نے اپنے ہاتھ جوڑے اور نمسکار کیا۔ تالو کے کھیتوں کے اس پار گاڑی کا راستہ تھا۔ دونوں طرف دھول اور کچھ اٹھی ہوتی تھی۔ دو ایک پودے اس نے کلہاڑی سے چھانٹے۔ اور پھر چھانو میں آرام کرنے لگا۔ ایک بیل سست

پڑا ہوا تھا۔ تو دوسرا اپنی پیٹھ کھجا رہا تھا۔ تالو نے پھر بیڑی سلگائی اور دھیرے دھیرے اسے ختم کیا۔
اور تنے کے نیچے دبا دیا۔ ایک ہاتھ سر کے نیچے تو دوسرا اپنی آنکھوں پر رکھے کچھ سوچ رہا تھا آم کے
درخت کے چھاؤں بہت دور تک پھیل چکی تھی۔ یکایک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یقیناً وہ کسی بات کا فیصلہ
کر چکا تھا۔ ہاتھ میں لگی ہوئی مٹی اس تنے نے صاف کی۔ کلہاڑی نیچے رکھ دی اور بڑی تیزی کے ساتھ
آم کے درخت پر چڑھ گیا۔ بہت دور تک کھیتوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دکھائی دے رہے
تھے۔ اور دور تک پھیلا ہوا دھواں۔ البتہ راستا بالکل سنسان دکھائی دے رہا تھا۔ کوئی آہٹ
نہیں تھی۔ اس کے بڑے بھائی رالو کے آنے کا امکان بھی کم ہو گیا تھا۔ تالو جھٹ پٹ درخت سے
نیچے آگیا۔ جسم پر چڑھی ہوئی چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں جھٹک دیں۔ بیلوں کی پیٹھ تھپتھپائی۔ ریس کورس
میں دوڑنے والے گھوڑوں کی طرح وہ بھی اپنی گاڑی کے ساتھ چل پڑے۔ مری مایا کا دیو اب نظروں
سے اوجھل ہو چکا تھا۔ دیوی کی طرف دیکھا، ہاتھ جوڑے۔ نمسکار کیا۔ چڑھائی اب شروع ہو چکی تھی۔
کانٹے دار جنگلوں کے کھیت اب دور ہو چلے تھے۔ گاڑی جنگل میں داخل ہو رہی تھی۔ تالو گاڑی پر
کھڑے ہو کر بیلوں اور گاڑی کو بچاتے بچاتے بولتے جنگل سے گزر رہا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے
بعد گاڑی روکی اور بیلوں کو آزاد کیا۔ اور کلہاڑی سے کانٹے دار جھاڑیاں چھانٹنے کے بعد انھیں گاڑی
پر لاد کر بیلوں کو پھر جوت دیا۔ اور گاڑی پر سوار بیڑی پھونکتا، ملہار گاتا آگے کی طرف بڑھنے لگا۔

بابو بیٹے تو ہو گیا دیوانہ
گھومتے پھرتے ہو گیا پروانہ

اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ گاڑی آگے بڑھانے میں بہت تکلیف ہو رہی تھی۔ قندیل جلانے کے
بعد بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ اب کم و بیش دو میل اندر
کی جانب جا چکا ہے۔ بیلوں کو اس بات کی عادت رہتی ہے کہ ایک بار وہ راستے پر آ نکلیں تو برابر آنکھیں موندے
آگے کی طرف بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ رات کے کیڑے بول رہے تھے اور پتوں کی سرسراہٹ صاف
سنائی دے رہی تھی۔ بیچ بیچ میں بیل ڈر کے مارے رک بھی جاتے تھے۔ تالو کی بیڑی بھی اب
قریب الختم تھی۔ اب وہ اسے پھینکنے ہی والا تھا کہ بائیں جانب کا پہیا اونچائی پر تو دائیں طرف کا
کا پہیا ایک گڑھے میں جا جھکا۔ اس نے کوشش کی کہ گاڑی کا پہیا اپنا توازن برقرار رکھے۔ اگر کوئی
تیر ہوتا تو اس کو آسانی سے دبا دیا جاتا۔ اس نے ترچھے ہو کر کلہاڑی کھینچ لی۔ اور زمین میں گڑ کر
اپنے بازو کا زور لگانا شروع کیا۔ اور پھر بھگوان کا نام لے کر بیلوں کا بڑے زور کا جھٹکا دیا۔
گاڑی ایک لخت کم از کم ایک فٹ پیچھے کی طرف سرک گئی تھی۔

گرمی سے بچاؤ کے لیے چیتا وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ گرجا جلتی صاف صاف آنکھیں، بیل
گھبرا گئے وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ تالو نے بھی کچھ عجیب سا محسوس کیا۔ اس کی آواز سے بھی وہ کسی بات کا اندازہ
نہیں لگا سکا تھا۔ گاڑی کو بچانے کی کوشش میں اس کی دونوں ایڑیاں پتھر سے چھل گئی تھیں اپنے
آپ پر قابو نہ پا سکا اور وہ گاڑی سے گر پڑا۔ کلہاڑی بھی گر پڑی تھی اس نے غصے سے اپنی
انگلیاں دبائیں۔ بیل خاموش کھڑے تھے، پاؤں زمین میں دھنسے ہوئے تھے چیتا پھر گرجا۔ سخت

ناراض لہجہ۔ تالونے دانتوں سے قندیل کا کارک توڑا۔ تھوڑا سا تیل جھاڑیوں پر گرا یا اور دیا سلائی جلائی۔ چاروں طرف لمحہ بھر کے لیے روشنی ہوئی اور پھر سبھی کچھ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ دوسری دیا سلائی کے جھنکار نے مشعل کا کام کیا۔ چاروں اور روشنی ہوئی۔ پندرہ بیس قدموں پر دور پڑی کلہاڑی پر اس کی نظر جا پڑی۔ پھرتی سے اس نے کلہاڑی اٹھالی۔ اور بیلوں کے سامنے آکھڑا ہوا چیتے نے چھلانگ لگانے کے لیے اپنے پچھلے پاؤں زمین میں گاڑ دیے تھے۔ لیکن جب اسے خطرے کا اندازہ ہوا تو وہ فوراً کود تا دوسری طرف نکل گیا۔ کیچڑ میں دھنسے ہوتے تالو کو اس کی طرف دیکھنے اور دھیان دینے کی خواہش نہیں تھی اور نہ ہی اس نے اس وقت اس بات کی ضرورت ہی محسوس کی جلتی ٹہنی اس نے زمین پر پھینک دی۔ گلا خشک ہو رہا تھا۔ اور سینہ جل رہا تھا۔ اسے خود بخود ہنسی آگئی۔ وہ اس علاقے میں کہیں ہوگا۔ گاڑی ندی سے آگے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بارش کی وجہ سے پانی جمع ہوگیا تھا۔ انجانے میں آنکھوں کے اطراف جمع شدہ پانی کو تالو نے اپنے ہاتھوں سے صاف کیا جلتی ٹہنی کا زور اب کم ہوگیا تھا اور اسی طرف ایک لالٹین اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تالو رے .... رالو کی اور اپنے پتاجی کی آواز وہ فوراً پہچان گیا۔

"آرہا ہوں۔ میں آرہا ہوں" کا فوری جواب تالو نے دیا۔ بیل جو خوف کے مارے آگے بڑھ رہے تھے۔ آواز سنتے ہی تیز رفتار ہو گئے۔ یکایک ان کی رفتار بڑھ گئی۔ ابھیمان وغیرہ سے پرے، اطمینان بخش سرور انھیں محسوس ہو رہا تھا۔ اس احساس کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ ...!!

محمد فاروق نشتر
۴۰۴، فرسٹ اسٹیج کائستری پورم
میسور ۵۷۰۰۱۱

ناک اور خطرناک

خلیجی جنگ کے ساتویں دن کی ڈاک ہمارے حوالے کرتے ہوئے بیوی نے ایک لفافے کو غور سے دیکھا اور سونگھنے لگی۔ یہ ان کی پرانی عادت ہے۔ ان کا شمار اُس مخلوق میں نہیں ہے جو لفافہ کو دیکھ کر مضمون بھانپ لیتی ہے بلکہ یہ وہ مخلوق ہے جو مضمون کو سونگھ کر پتا لگا لیتی ہے۔ ان کی اس عادت سے ہمارے مطالعہ میں کافی کمی آئی ہے۔ ہم وہ خط ہی نہیں پڑھتے جس سے بے مروتی کی بُو آتی ہے۔ یہ خط عموماً قرض خواہوں کے ہوتے ہیں۔

بیوی کی قوتِ شامہ کا ہمارے کردار سے بڑا واسطہ ہے یہ شریکِ حیات ہی نہیں شریکِ ثواب بھی ہیں۔ بڑے بڑے خطرے قبل از وقت بیوی کے آگے پانی بھرتے ہیں اسی وجہ سے ہماری جیب اور لباس میں ہماری اپنی بُو کم اور ان کی ناک کی خوشبو زیادہ ہے۔

یوں بھی مردوں کے مقابلہ میں عورت کی ناک اور بلی کی ناک کو ہمیشہ برتری حاصل ہے۔ وہ تو اچھا ہوا قطب الدین ایبک نے ایک مینارہ بنالیا ورنہ کوئی مارگریٹ اپنی ناک کا مجسمہ کھڑا کرتی تو قطب مینار کی پستی کی وجہ سے مشہور ہو جاتا اور اس کو نیچا دکھانے کے لیے مردوں کو ناکوں چنے چبانے پڑتے۔

بیوی کی ناک کی وجہ سے ہم اس طرح کے چنے اکثر چباتے رہتے ہیں۔ عورت کی ناک کو کسی دانشور نے شک کی جڑ ROOT OF SUSPICION کہا ہے اور بیوی کی ناک نے انھیں ایک ایسا کریلا بنا دیا ہے جو نیم کی ساری نیمیت کے ساتھ کڑوا ہے۔

ہم ایسے گئے گزرے نہیں کہ پرائیوٹ خط مکان کے پتے پر منگوائیں اور ایسے حال میں جب کہ ایک بیوی ساری بیویت کے ہتھیاروں سے لیس گھات لگائے ہوئے ہو ؎

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

ایک رات نیند نے ہمیں اپنے آپ پر حرام کر لیا اور ہم نے چارو ناچار کروٹوں کے تبادلہ پر رات بسر کرنے کے ارادہ سے دو کروٹیں لیں۔ خدا گواہ ہے تیسری کروٹ سے پہلے بیوی ساری حسیات

کے ساتھ جاگ گئیں اور بابری مسجد کی ساری تلخیوں کو ایک جملہ میں ٹھونس کر کہا۔" یہ رات جگ کس کی یاد میں منعقد ہوا ہے۔ یکلخت ہمارا ماضی بھارتی مسلمانوں کی طرح جاگ اُٹھا کالج کی لاپرواز زندگی نظروں میں گھوم گئی اور ماضی کی شریر لذتوں نے آب دیدہ کر دیا۔ آبدیدگی کو مگر مچھ کے آنسوؤں کا خطاب دے کر بولیں۔" اب یہ رونا کس لیے۔ یاد رہے تمھاری شادی ہو چکی ہے اور یہ پانچ سپوت نما کپوت اس کا زندہ ثبوت ہیں۔" اس موضوع پر انھوں نے نان اسٹاپ تقریر بھی کی اور دھمکیاں بھی دیں۔ جس طرح پرندہ کو پنکھ ضروری ہیں اسی طرح تقریر میں دھمکی نہ ہو تو تقریر بھی غیر ضروری سمجھی جانے لگی ہے۔ بیوی کی کئی دھمکیوں میں ایک دھمکی یہ تھی کہ اگر ہم نے اپنے ماضی کو غالب کی طرح فراموش نہ کر دیا تو وہ بچوں کو لے کر یتیم خانہ میں زندگی گزار دیں گی (یتیم خانہ اس محلہ کا نام ہے جہاں بیوی کا میکہ ہے)

ہم نے معاملہ رفع دفع کرنے کے خیال سے قومی جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔" بیگم! تم خواہ مخواہ بات کو شیطان کی آنت بنا رہی ہو۔ دراصل قوم کے شاندار ماضی نے ہمیں آبدیدہ کر دیا تھا۔" بولیں۔" میں تمھارے اُس شاندار مؤنث ماضی سے واقف ہوں جو کالج کی گروپ فوٹو میں تمھیں کن آنکھیوں سے دیکھ رہی ہے۔" بیوی کے شہد لگاتے ہی واقعی وہ چہرہ یاد آگیا جس کی طرف اِن کا اشارہ تھا۔ لیکن جب ماضی گناہ آلود نہ ہو تو دل مطمئن ماضی میں اُسی طرح کھو جاتا ہے جس طرح شیخ سعدی اپنے زندہ ادب میں کھوئے ہوئے ہیں۔

بیوی کی اِسی خطرناک خطرے کو بھانپ لینے والی عادت نے ہمیں مجبوراً باکردار بنا دیا ہے جس فسانہ کا زمانہ میں کہیں ذکر نہیں ہوتا وہ بات ہمارے زنانہ کو ہمیشہ ناگوار گزرتی ہے۔

ہم نے انسان ہونے کے ناتے لاکھ کوشش کی کہ کہیں بہک جائیں یا کسی کے بہکاوے میں بھارت کی اکثریت کی طرح آجائیں لیکن ہماری کوشش کے میزائل کو بیوی نے اپنے شک کے اسکڈ میزائل سے دے مارا۔ اِن کی نظر ہمارے حرکات و سکنات پر کسی جنگی راڈر کی طرح لگی رہتی ہے۔

ایک دن ہم مرزا کے ساتھ برآمدہ میں بیٹھے بحث و تکرار کے ذریعے ملک کو امن و آشتی کا گہوارہ بنا رہے تھے۔ پچھلے دس سالوں میں ہم دونوں نے ایسے کتنے ہی گہوارے بنائے ہیں ہماری نسل انھیں گہواروں میں پل کر جوان ہو رہی ہے۔ جس کے اثرات شاید مستقبل پر یہ پڑیں کہ بیوی ہم کو انگلی پر نچائے اور بہو، بیٹوں کو ریوالور پر۔

ریوالور کے اِسی قانون کو جلد از جلد لانے کے لیے ہم مرزا کے ساتھ بحث و تکرار کے اجلاس منعقد کر ہی رہے تھے کہ یکایک مرزا نے تپائی پر رکھا تاج محل اُٹھایا اور جانے لگے۔ ہم نے کہا۔" مرزا! یہ یکایک کیا ہو گیا، کہاں جا رہے ہو؟" مگر وہ درشتگی سے اپنے ہاتھ جھٹک کر نو دو گیارہ ہو گئے۔ ہم معاملے کی نوعیت کو سمجھ ہی رہے تھے کہ دو خونخوار آنکھوں نے ہمیں اور دہلا دیا۔ یقیناً یہ آنکھیں بیوی کی تھیں، اور طرا یہ کہ مرزا، جس تاج محل کو لے گئے تھے وہ بیوی نے اپنے ہاتھوں اور ہمارے پیسوں سے خریدا تھا۔ دیر تک انھوں نے مرزا کے جوش اور ہمارے ہوش کو موضوع بنا کر، پہلے دور، دوسرے دور، تیسرے دور اور اِسی طرح کے کئی دوروں کی بات چیت یک طرفہ کی اور مرزا کے خلاف رٹ جاری کر دی

کہ "کل سے مرزا گھر کی دہلیز پر قدم نہیں رکھیں گے۔" ہم نے جواز کہا، "بیگم! مرزا! ہمارے لنگوٹیا یار ہیں، شاید انھوں نے مذاقاً ایسا کیا ہو۔" بولیں "بھاڑ میں جائے تم اور تمھاری لنگوٹی، دراصل مرزا کی حرکت سی پُرجوش اُڑروانی بحث و تکرار کے نتیجہ کا اثر ہے جو امن و آشتی کے گہواروں پر ہوتی رہی ہے۔ لہٰذا اب اس شخص سے تم اُسی طرح بچ کر رہو جس طرح سرکاری ملازم کام کاج سے بچ کر رہتے ہیں۔"

ہم نے لاکھ سمجھایا کہ یل۔ کے مرزا یعنی لیاقت خان مرزا ایسا جوشی یعنی جوشیلا آدمی نہیں ہے۔ مگر بیوی کے آگے ہماری فریاد لالچی ڈاکٹر کے آگے غریب مریض کی فریاد ثابت ہوئی اور انھوں نے صاف کہہ دیا، "تمھارا موا مرزا! آنے والے دنوں میں جلاد بنے گا یا سی۔ آر۔ پی۔ ایف کا نگران مقرر ہوگا لہٰذا تم دین دار اور خاندار آدمی ہو، خدا اور بیوی کو سنبھالو اور مرزا کو اُسی طرح عاق کر دو جس طرح ٹیلی ویژن والوں نے اخلاقیات کو عاق کر دیا ہے۔"

بیوی کی بات کو عملی جامہ مع فولی شیروانی کے پہناتے ہوئے مرزا کو جب جوشی کے بجائے ہوشی پایا تو ہم نے انھیں صاف احکام بیویات سنا دیں اور گفتگو کے کلائمکس پر کہا کہ "مرزا! ہم سیدھے سادھے ہندستانی ہیں اور اگر تمھارا ارادہ مستقبل میں جلاد یا سی۔ آر۔ پی۔ ایف کے نگران بننے کا ہے تو ہم تمھاری دوستی کو سات سلام کرتے ہیں کیونکہ جس طرح سانچ کو آنچ نہیں ہوتی اُسی طرح کوئی جلاد سی۔ آر۔ پی۔ ایف کا نگران اور عالم بے عمل ہمارا دوست ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

خیر سے مرزا پر اس بات کا اثر ہوا جو ہمارے ہارٹ اٹیک یافتہ دل سے نکلی تھی اور انھوں نے اُسی دن، اُسی برآمدہ میں باآواز بلند دبیگم کو سنانے کے لیے) قسمیت لی کہ وہ تاج محل کی طرف آنکھ اور امن کے گہوارے والے موضوع کی طرف مُنہ اُٹھا کر نہیں دیکھیں گے۔

صاحبو! دراصل یہ بیوی کی خطرناک، ناک کا کمال ہے، جس نے ہمیں تاج محل اور مرزا سے قبل از وقت ملوا دیا۔

غرض مدعا یہ ہے کہ بیوی کی اس ناک نے ہمیں کئی حادثاتِ ارضی سے بال بال بچا لیا ہے۔ لہٰذا انھوں نے خلیجی جنگ کے ساتویں روز کا خط پھڑپھڑایا اور ایک میزائل نما جملہ داغ دیا کہ "اس خط سے اجنبیت کی بُو آرہی ہے۔" اجنبیت کو بحال رکھتے ہوئے ہم نے کمالِ ظرافت سے کہا۔ "کیوں بیگم! کیا عطرِ فردوس کی مسحور کن خوشبو ہے۔" چڑ کر بولیں۔ "اس عمر میں فردوسی خط کا انتظار نہ کرو، بلکہ اس خط کا انتظار کرو جس سے کافور کی بو آئے۔"

اس بُو کے ذکر نے ہمیں عزرائیل علیہ السلام کی یاد دِلا دی مگر ہم ذرہ برابر بھی دہشت زدہ نہیں ہوئے کیونکہ آج تقریباً ہر حساس شخص کے چہرے پر موت کی تمنا اور ہتھیلی پر جان نظر آتی ہے۔ آنے والی نسلیں اگر اتفاق سے آگئیں تو اس صدی کے لوگوں کو بہادری، نڈرتا اور طرح طرح کے القاب سے اسی طرح یاد کریں گی جس طرح ہم چودہ سو سال پہلے عرب بدّوں کو یاد کرتے ہیں۔

یہ ہمارا شیوۂ عظیم ہے کہ اس صدی میں ہم یا تو لڑتے رہے یا لڑاتے رہے بقول شخصے، لڑائی جھگڑا، محبت اور بھائی بھارگی کی معراج ہے۔ بالکل اُسی طرح، جس طرح نماز مومن کی، دو غلا پن امریکن

کی، تیل عربوں کی اور تُو تُو، میں، میں، ازدواجی و ملی زندگی کی معراج ہے اور معراج پانے والے کافور کی بُو پر کب شرمائیں گے۔

آخر کار بیوی نے سارے خط کا بھرپور جائزہ لیا اور کمالِ قوتِ شامہ سے کہا "اس خط سے بارود کی بُو آرہی ہے۔ اور ممکن ہے یہ خط ضرور جارج بش نے لکھا ہوگا"

جارج بش کے نام پر ہمارے حواس، زنانے سے پردے اور مردانے سے عقل کی طرح نکل رہے تھے کیونکہ جارج بش سے ہماری دوستی بیوی کو کب بھانے والی تھی وہ ہرگز ہمیں خنزیر خور کا دوست دیکھنا پسند نہیں کریں گی اور ان کی ناک ......؟

لیکن خلافِ توقع بیوی کا رویہ نارمل رہا وہ بولیں۔ "یہ خط تمھارے نام ہے۔ اب جنگ اس کے ہاتھوں سے امن کے سارے کبوتروں کے ساتھ نکل گئی ہے، شاید اس نے اس جنگ کا حل تم سے مانگا ہو۔"

زندگی میں پہلی بار بیگم نے عقلمندی کا تمغہ ہمارے ذہن پر ٹانکا تھا" انتہائی سعادت مندی سے لفافہ چاک کر ہی رہے تھے کہ بیگم نے جھپٹ کر لفافہ ایک طرف پھینک دیا اور بولیں "اس لفافہ کو میرے یہاں سے جانے کے بعد کھولو ہوسکتا ہے یہ لیٹر بم ہو۔"

یہ سُن کر ہم بس اسٹاپ پر کھڑے مسافر کی طرح جام ہو گئے۔ واقعی اِن دنوں ملک ہر چیز کی ساخت کے بم بن رہے ہیں۔ سُنا ہے عوام نے جنگ کی شروعات کے ساتھ ہی اشیاے خور و نوش، تیل اور بم بھی جمع کرنے شروع کر دیے ہیں اور ہر ذرہ میں ایک شعلہ بھڑکنے کے لیے بے چین ہے۔

پھر ہم نے سوچا اس دورِ بم و زیر و بم سے تو وہ موت بھلی جو انسان کا صفایا ایک پل میں اس طرح کر دیتی ہے جس طرح انسان کی جیب کا صفایا جیب کترے، پولیس اور بیویاں کرتی ہیں۔

فرش پر استراحت فرما لفافہ کو اُٹھایا اور چاک کر دیا۔ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا صرف ذہن رسا میں ہوا۔ اِس دوران بیوی دور کھڑی بچوں سمیت ہمارے پرخچے چننے کی منتظر تھیں۔

ہم نے کہا۔ "بیگم! ہمارے پرخچے کبھی اور چُننا مجھ پہ بڑا کرم ہے میرے چارہ ساز کا۔ ہم زندانِ کائنات میں ابھی محصور رہیں گے لیکن یہ دیکھیے۔ خلیجی ملک سے ہمیں بلاوا آیا ہے۔ وہ کمپنی ہمیں قبول کرنے کے لیے تیار ہے جس نے کبھی ہماری اسناد کو مجنوں کی بڑ سمجھ کے ٹھکرا دیا تھا۔"

ہمیں ایک سو دس فی صد یقین تھا کہ آج بیوی اس امتحان کی گھڑی میں میٹرک کی طرح ضرور ناکام ہو جائیں گی۔

لیکن اس مرتبہ وہ کامیاب اور ہم ناکام رہے کیونکہ بیگم نے ناگواری سے لفافہ کو چاک کر دیا اس کے پرخچے امریکہ کی اخلاقیات کے پرخچوں کی طرح اُڑا دیے اور اپنا پھٹا ہوا آنچل سر پہ ڈال کر بولیں ؎

ہوں کتنی ہی تاریک شبِ زیست کی راہیں
اک نور سا رہتا ہے جھلکتا مرے آگے

اور ہمیں اپنی بے نوری پہ رونا آگیا۔

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم
A113/I - دلشاد گارڈن
دہلی ۹۵

"چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی"

(کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین، دہلی کی سہ روزہ کانفرنس کی روداد)

o ترقی پسندی اپنی موت مرچکی ہے۔
o ترقی پسند تحریک اپنا تاریخی رول ادا کر کے ماضی میں دفن ہوچکی ہے۔
o اسے اس کے کٹر حامیوں نے خودکشی پر مجبور کیا۔
o اس تحریک کے پاس نئی پیڑھی کو دینے کے لیے کچھ نہیں۔
o یہ بنیادی طور پر ادبی نہیں سیاسی تحریک تھی۔

..... ـــــ یہ ایسے خیالات ہیں جن کا اظہار اکثر و بیشتر ادبی جلسوں اور نجی محفلوں میں کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس تحریک نے گذشتہ پچاس سال میں ایک ایسی ہمہ گیر فکر کو سماج اور ادب میں سرایت کر دیا ہے، جس نے ادب کے مفاہیم ہی بدل ڈالے۔ اس نے اردو کے ادبی سرمایے کو نہ صرف وسیع کیا ہے بلکہ عالمی ادب کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔

کسی تحریک کا کام کسی فکر کو رواج دینا ہوتا ہے اور فکر کے عام ہوتے ہی تحریک کا کام پورا ہو جاتا ہے۔ سو ترقی پسند تحریک نے بھی ترقی پسند فکر کو رواج دیا اور یہ فکر آج بھی جاری ہے۔ ترقی پسند فکر کی جو روح ہے عقلیت پسندی، بنیادی انسانی قدروں کا تحفظ، سائنٹی فک نقطۂ نگاہ اور جمہوری انسان دوستی۔ یہ ایسی فکری اساس ہے جس پر کبھی زوال آ ہی نہیں سکتا، چنانچہ ترقی پسند فکر آج بھی اتنی ہی توانا، ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے جتنی کہ پہلے تھی۔

یہ بات یوں ہی نہیں کہی جا رہی ہے، اس کا ثبوت وہ بے شمار خطوط ہیں جو ترقی پسند کانفرنس کے حوالے سے ہمیں موصول ہوتے رہے، جب ہم کانفرنسوں کی تیاریوں میں لگے تھے اور ہم نے اسی خیال کے تحت نئے ادیبوں کو بطور خاص شرکت کی دعوت دی تھی کہ ترقی پسند فکر کی عصری معنویت کا محاسبہ ہو۔ معلوم ہو کہ نوجوان ادیب ترقی پسند ادبی ورثہ کو ایک بوجھ سمجھتے ہیں یا ایسا زادِ سفر جو ان کے سفر کی کٹھن منزلوں کو آسان کر سکے۔ انھیں دھندلکوں میں روشنی نہیں تو اس کی آہٹ محسوس کرا سکے ـــــ جواب میں جو خطوط ملے، ان سے نیا حوصلہ ملا۔ مثال کے لیے صرف ایک خط۔ عالم خورشید بہار کے نئے شاعر ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ بھی شائع ہوچکا ہے اور جن کی شاعری میں امکانات بھی پوشیدہ ہیں۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ:

"اس امر سے خوشی ہوتی ہے کہ ترقی پسند تحریک ان دنوں ان بیڑیوں سے آزاد ہو رہی ہے جو اس کے پیروں میں چند نام نہاد ترقی پسندوں نے ڈال رکھی تھی۔ انھی نام نہاد ترقی پسندوں کی ضد کا نتیجہ ہے کہ میرے جیسے نئی نسل کے بہت سارے لوگ ترقی پسند تحریک کے تعلق سے اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ یہاں بہت ساری غیر ضروری پابندیاں ہیں یہاں آزاد فضا نہیں ملتی اور گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ نتیجے کے طور پر لوگوں کے سامنے ترقی پسندی کی صحیح تصویر نہیں آپاتی، مگر ان دنوں یہ احساس ہو رہا ہے کہ اب وہ دھند چھٹنے لگی ہے، یہ تحریک صحیح معنوں میں ترقی پسندی کی راہ پر گامزن ہے۔ یہ فضا اس تحریک کو ایک نئی زندگی بخشے گی اور یقیناً آنے والا دور اس تحریک کا ہوگا، ایسا مجھے یقین ہونے لگا ہے۔

آج کی تخلیقات پڑھ کر آپ بخوبی محسوس کرتے ہوں گے کہ نئی نسل ترقی پسندی سے بے حد قریب ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نسل کو بتایا جائے کہ ترقی پسندی اصل کیا ہے تاکہ اس کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں وہ دور ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے آپ لوگ اس پر غور کر رہے ہوں گے۔" (اقتباس)

کم و بیش انھیں خیالات کا اظہار دوسرے خطوط میں بھی کیا گیا تھا۔ انھیں خطوط نے ہماری کانفرنس کے لائحہ عمل اور موقف کو بھی طے کیا۔ ہم جب کبھی اس کانفرنس کے تعلق سے گفتگو کرتے تو اس بات پر خاص توجہ رہتی کہ اس بار نئی نسل کو پورا پورا موقع دیا جائے کہ وہ نہ صرف اس میں شرکت کر سکیں بلکہ ترقی پسندی سے متعلق اپنے خیالات کا بے باکی سے اظہار بھی کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں یکے بعد دیگرے کئی نشستیں قمر رئیس صاحب کے گھر پر ہی ہوئیں، جس میں لکھنؤ، بھوپال، الٰہ آباد، بہار اور دوسرے شہروں کے نوجوان ادیب بھی شریک ہوئے اور آپسی صلاح و مشورے سے پروگرام ترتیب دیئے جانے لگے۔ ایک بڑی اور اہم میٹنگ وامق جونپوری صاحب کی صدارت میں دہلی اردو اکیڈمی میں ہوئی جس میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جناب غلام ربانی تاباں، ڈاکٹر اجمل اجملی، جناب جوگندر پال اور دوسرے ادیب شریک تھے۔ افسوس اور حیرت کا ملا جلا احساس مجھے اُس وقت ہوا، جب قمر رئیس صاحب نے یہ اطلاع دی کہ ان کے بار بار لکھنے پر بھی ترقی پسند تحریک کے اکابرین نے کوئی جواب نہ دیا اور ہونے والی کانفرنس کے سلسلہ میں کسی عملی تعاون کی یقین دہانی نہیں کی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کا بجٹ ہمیشہ سے کمزور رہا ہے اس لیے ہماری توجہ اسی کی طرف سب سے پہلے گئی۔ ایک بڑی کانفرنس جس میں ہندستان کے مختلف شہروں سے کم و بیش ڈیڑھ صد ادیبوں کی شرکت متوقع ہو، علاوہ ازیں پاکستان، کینڈا، برطانیہ اور سوویت یونین سے بھی بیس پچیس مندوبین کی آمد طے ہو، اس میں کافی رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مشکل کو قمر رئیس صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے حل کیا۔ دو ماہ اسی بھاگ دوڑ میں گذر گئے۔ ایک دن قمر صاحب نے یہ اطلاع دی کہ عاشور کاظمی صاحب لندن سے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آرہے ہیں اور ساتھ ہی یہ مبارک خبر بھی دی کہ اس کی صدارت کے لیے پاکستان کے ممتاز ناول نگار جناب شوکت صدیقی نے اپنی منظوری دے دی ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر آغا سہیل، پروفیسر عتیق احمد، محترمہ کشور ناہید جناب

مسلم شمیم، جناب رفیق چودھری وغیرہ بھی آرہے ہیں۔ اب ہماری مسرتوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اپنی محنت بارآور ہوتی نظر آرہی تھی۔ لیکن ابھی تو سارا کام پڑا تھا۔

مندوبین کے خطوط آرہے تھے، جوابات بھی جارہے تھے۔ کانفرنس کے دعوت نامے کا بڑا اچھا اثر ہوا تھا۔ تقریباً سبھی ادیب اور شاعر شرکت کے متمنی تھے۔ اکثر افراد تو اپنے مصارف سے آنے کو تیار تھے، اور آئے بھی۔ جن لوگوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی ہے، ان کو اس کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔

اس سہ روزہ کانفرنس کی مجلس استقبالیہ میں جناب اندر کمار گجرال سرپرستوں میں تھے تو پروفیسر مونس رضا صدر۔ قمر صاحب کا بار بار ان حضرات کے پاس جانا ہو رہا تھا۔

۱۹۸۶ء کی کانفرنس آندھرا پردیش بھون میں ہوئی تھی، اس بار بھی یہی ارادہ تھا مگر ہم لوگوں کو مایوسی ہوئی۔ آخرکار غالب اکیڈمی کا ہال بک کرایا گیا۔ اسی علاقے میں حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی بھی رہتے ہیں، ان سے استدعا کی گئی کہ اپنا مہمان خانہ عنایت کریں، انھوں نے خندہ پیشانی سے ہماری دعوت قبول کی، وہ ہماری مجلس استقبالیہ کے نائب صدر بھی تھے۔ وہاں سے رخصت ہو کر ہم لوگ بستی نظام الدین میں ہی مقیم چودھری اقبال صاحب کے یہاں گئے اور کچھ مہمانوں کا انتظام ان کے دولت کدہ پر کیا۔ دوسرے روز ہم لوگوں نے ایوانِ غالب کے بھی کچھ کمرے محفوظ کر لیے تاکہ آنے والے ادیبوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

دن میں ہم لوگ یہ بھاگ دوڑ کرتے اور دیر رات تک کانفرنس میں ہونے والی گفتگو کی سمت پر غور کرتے، خطوں کے جواب دیے جاتے اور دوسرے روز کا پروگرام مرتب کرتے۔ اس کارواں میں ہمارے ساتھ تمام احباب تھے۔ یعنی ڈاکٹر مجیب الاسلام، ڈاکٹر ابن کنول، ڈاکٹر صلاح الدین انجم، ڈاکٹر خالد اشرف، ڈاکٹر شکیب نیازی، جناب خالد علوی وغیرہ۔ جب زیادہ کام ہوتے تو ہم لوگ بکھر جاتے اور ایک روز میں ہی مختلف کام کروا لاتے۔

اور ایک روز کانفرنس سے تقریباً پندرہ روز پہلے عاشور کاظمی صاحب بھی آگئے۔ کیوں بھیا کیا ہو رہا ہے، ہمارے لائق کوئی کام؟ آتے ہی انھوں نے اپنی مخصوص مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی آپ آئے ہیں، آرام کیجیے، پھر باتیں ہوں گی، ویسے تو سارے کام ہو چکے ہیں" قمر صاحب نے جواب دیا۔

تو عاشور بھائی ہمارا ایک مسئلہ رکا ہوا ہے، اگر آپ حل کر دیں تو کرم ہوگا میں نے معانقہ کرتے ہوتے ان سے کہہ ہی دیا۔

کیا؟ فرمائیے۔ آپ جو کہیں گے سو ہوگا۔

شکریہ! میں نے کہا، بس اس وقت آپ اس مسئلے کو یہیں چھوڑیے اور آرام کیجیے۔

O

اخبارات میں خبریں آرہی تھیں کہ دہلی میں ۲، ۳، ۴، مارچ کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس

ہونے والی ہے۔ اس کی وجہ سے عام حلقوں میں بھی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی BANNERS آ گئے، پھر کارڈ بھی چھپ گئے، اس کو پوسٹ کرنے کے مراحل میں شبنم رضوی، سہیل وحید، خالد اشرف، عاشور کاظمی اور خود قمر صاحب شریک نظر آ رہے تھے۔ شام میں ہم لوگوں نے پانچ سو کارڈ سپرد ڈاک کیے۔

پہلی تاریخ کی شام میں پاکستان کے تمام مندوبین آ رہے تھے۔ ہم لوگ ICCR اور دوسری اہم مصروفیات سے گذرتے ہوئے ٹھیک ۴ بجے ایرپورٹ پہنچ گئے۔ خدا کا شکر کہ جہاز وقت پر آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم اپنے مہمانوں کے ساتھ تھے، جناب شوکت صدیقی اور پروفیسر عتیق احمد کے ساتھ ان کی بیگم بھی تھیں۔ رفیق چودھری بزرگ ادیب تھے۔ ہم لوگوں نے جب مسلم شمیم اور دوسرے مہمانوں کو نہیں دیکھا تو مایوسی ہوئی۔ فوراً شوکت صدیقی صاحب سے دریافت کیا تو انھوں نے کہا "وہ لوگ بھی آ رہے ہیں، شاید کل آئیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل تو آ ہی چکے ہیں، وہ لکھنؤ سے کل آئیں گے۔

قمر صاحب نے ہم لوگوں کا تعارف کرایا، عتیق صاحب سے ہماری ملاقات تھی۔ تعارف کے بعد گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔ ٹیکسی میں سامان رکھ کر ہم لوگ لودی ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں ان لوگوں کو چھوڑ کر، چونکہ رات ہو گئی تھی، اس لیے ہم لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

دوسرے روز ۲ مارچ یعنی کانفرنس کے افتتاح کا دن۔ وہ وقت اور لمحہ آ گیا تھا جس کے لیے ہم لوگ پچھلے دو تین ماہ سے مسلسل بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میں یونی ورسٹی سے کلاس کے بعد سیدھا غالب اکیڈمی ہی پہنچ گیا، دیگر احباب پہلے سے موجود تھے BANNERS دور ہی سے چمک رہے تھے۔ ہال آدھا بھر چکا تھا۔ ۵ بجے تک پورا ہال بھر گیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ دروازے پر اور کچھ دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ ویڈیو فلم والے اپنی تیز روشنی بار بار لوگوں کی طرف پھینک رہے تھے۔ عکاس اردو فدا علی بھی مستعد نظر آتے تھے۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، پاکستانی مندوبین ایک ساتھ آئے۔ ان کے فوراً بعد جناب اندر کمار گجرال کی بیگم آئیں، ان کو تنہا دیکھ کر ہم لوگ پریشان ہوئے لیکن انھوں نے گاڑی سے اترتے ہی کہا، گجرال صاحب ایک ضروری میٹنگ سے فارغ ہو کر آ رہے ہیں، میں گھر سے ادھر ہی آ گئی۔ ہم لوگوں کی جان میں جان آئی۔

دہلی اردو اکیڈمی کے سکریٹری جناب شریف الحسن نقوی صاحب اپنے عملہ کے ساتھ آئے اور مہمانوں کے استقبال میں پیش کیے جانے والے گلدستے بھی لائے۔ انھوں نے دہلی اردو اکیڈمی کی جانب سے باہر سے آنے والے مہمانوں کے استقبال کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔

گل پوشی کرنے والوں کا ایک سلسلہ تھا، جس کا آغاز نقوی صاحب کے ہاتھوں ہوا۔ انھوں نے گجرال صاحب کو گلدستہ پیش کیا اور سب سے آخر میں قمر صاحب نے سوویت یونین کی اسکالر شیریا کو گلدستہ پیش کیا ـــــ ہال میں تالیاں اور قہقہے ساتھ ساتھ بکھر رہے ہیں۔ اور اب ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کی آواز ابھر رہی ہے، وہ اس کانفرنس کی غرض وغایت پر روشنی ڈال رہے ہیں اور جنرل سکریٹری کی رپورٹ پڑھ رہے ہیں۔

"حضرات! ترقی پسند ادبی تحریک ـــ اپنے آپ کو قومی اور بین الاقوامی طور پر بڑی تہلکہ خیز اور خوفناک تبدیلیوں کے روبرو محسوس کر رہی ہے۔ یہ تبدیلیاں بنی نوع انسان کی اساسی قدروں

ہ اس کے مقدس رشتوں پر اس کے محترم تہذیبی ورثہ پر بڑی سفاکی سے حملے کر رہی ہیں — سرمایہ
ری اور ظلمت پرستی اپنے تحفظ کی آخری لڑائی لڑنے کے لیے بنیاد پرستی، اور فرقہ پرستی کے، اسلحہ
یدان میں لا رہی ہے۔

دوسری طرف سوشلسٹ دنیا میں ایسے اتھل پتھل کا آغاز ہو چکا ہے جو دور رس نتائج کا حامل
وگا۔ شاید اگلی صدی کے ساتھ ایک نئی دنیا جنم لے گی۔ جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں وہ زندگی ہی نہیں
رٹ اور ادب کے بارے میں ہمارے ادعائی رویوں اور نظریوں پر نئے انداز سے غور و فکر کی دعوت
ے رہی ہیں۔ ماضی کی غلطیوں، غلط فیصلوں اور کچھ رہ نماؤں کی غلط اندیشیوں کا کھلے دل سے
تراف کیا جا رہا ہے۔ یہ مستحسن بات ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آج کی زندگی کے جو پیچیدہ مسائل،
ھوتیاں اور سوالات ہیں وہ کیوں کر حل ہوتے ہیں اور ان کو حل کرنے میں سماج کے سب سے حساس
ر ذہین لوگ یعنی ادیب اور دانشور اپنی ذمہ داریاں کیوں کر نبھاتے ہیں۔"

ہال میں مکمل خاموشی ہے۔ اسٹیج پر تشریف فرما جناب اندر کمار گجرال، جناب شوکت صدیقی، پروفیسر
نس رضا، جناب عاشور کاظمی، ڈاکٹر لڈمیلا وسیلودا، جناب کملیشور کی نظریں بار بار قمر صاحب کی طرف اٹھ
ہی ہیں۔ رپورٹ کے اختتام پر ایک منٹ کے لیے قمر صاحب رکتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ: حضرات!
اری مجلس استقبالیہ کے چیرمین پروفیسر مونس رضا صاحب ہیں، ان سے میں درخواست کرتا ہوں کہ
ہ ہمارے معزز مندوبین اور آپ تمام حضرات کا استقبال کریں اور اپنا خطبہ استقبالیہ پیش کریں۔

"حضرات!" مونس صاحب کی بھری بھری آواز ابھر رہی تھی۔

"..... میں اپنے لیے بڑی عزت کی بات سمجھتا ہوں کہ آج ایک اہم جلسہ میں آپ سب کا خیر مقدم
روں اور اس عمل کی طرف جواب شروع ہو رہا ہے اور دو دنوں تک چلتا رہے گا اور جن کے ذریعہ
ن سوالوں کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی جو آج ترقی پسند تحریک کے سامنے ہیں،
س عمل میں آپ کو خاص طور سے شریک ہونے کی دعوت دوں — ترقی پسندی میرے خیال میں
نے کردار کے اعتبار سے ایسی چیز ہے جو لامتناہی ہے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ترقی پسندی آج ختم ہو گئی ہے
ل کہ ترقی پسندی جو ختم ہو جائے، وہ ترقی پسندی نہیں۔ ہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی
حدیں ہیں ان حدوں کو کیسے پار کریں، اگر ہم ان زنجیروں کو نہیں توڑ سکتے تو ہماری ترقی پسندی
ے کار ہو کر رہ جائے گی — "

سامعین ہمہ تن گوش ہیں۔ مونس صاحب نے بہت ہی سائنٹفک طریقے سے ترقی پسندی
کے مسئلہ پر گفتگو کی ہے۔ اور اب قمر صاحب کہہ رہے ہیں کہ حضرات! آپ سب جانتے ہیں کہ اندر کمار
جرال صاحب کا تعلق پچھلے چالیس برس سے اس تحریک سے رہا ہے۔ چنانچہ وہی اس یادگار اجتماع
افتتاح کریں تو مبارک بات ہوگی۔ میری گذارش ہے کہ وہ آج کے جلسے کا افتتاح کریں — تالیاں
— تالیاں — خاموشی اس وقت چھائی جب گجرال صاحب مائک پر آئے۔ انھوں نے مونس
ضا صاحب کی بات سے اتفاق کیا اور صنعتی انقلابات کے حوالے سے اپنی گفتگو شروع کی اور نہایت
وسیع تناظر میں ادب اور ادیب کی ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تین روز

کی یہ کانفرنس، ترقی پسند تحریک اور ادیب کو دوبارہ یکجا کرنے کی کامیاب اور بروقت کوشش در اصل آج کی بدلتی ہوئی زندگی اور زمانے میں ترقی پسند ادیب کو نئی محاذ آرائی کرنی ہوگی، تو پرستی کے خلاف، سرمایہ داری کے خلاف اور سماج دشمن عناصر کے خلاف۔"

ڈاکٹر لڈمیلا وسیلووا بھی اس کانفرنس میں شرکت کے لیے بطور خاص آئی ہیں۔ انھوں روس میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا۔ وہ خوبصورت انداز میں کہہ رہی ہیں کہ :

ہماری روسی لوک کتھاؤں میں ہندوستان کا بڑا رومان پرور تصور ملتا ہے۔ لیکن یہ پسند مصنفین ہی تھے جن کی تخلیقات کے ذریعہ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ یہاں بھی دکھی اور غریب لوگ ہیں۔ ایک علامتی بات یہ ہے کہ یہ جلسہ غالب اکیڈمی میں ہو رہا ہے جو محض اتفاق نہیں ہے بلکہ اور ترقی پسندی کا وہی رشتہ ہے جو ماضی کی اور دورِ حاضر کی بہترین قدروں کا رہا ہے سہ

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

یہی روایات ترقی پسندوں کے یہاں آگئی ہے اور اسی روایت کے تحت آج کے پے چیدہ اور دشوار زمانے میں بھی ترقی پسند مصنفین ہی ہمارے معاشرے کو صحت مند بنانے میں اہم رول ادا کریں گے، فیض نے کہا ہے سہ

مثالِ زینۂ منزل بہ کارِ شوق آیا
ہر اک مقام کہ ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند"

ڈاکٹر لڈمیلا بہت پیاری اردو بولتی ہیں، چنانچہ ہال میں مکمل خاموشی تھی، جو اس وقت ٹوٹی جب قمر صاحب نے جناب اصغر علی انجینئر کو خیالات کے اظہار کی دعوت دی :

حضرات! بدلتے ہوتے سیاسی اور سماجی منظر نامے میں ترقی پسند مصنفین کے لیے کیا راستہ متعین ہونا چاہیے۔ کیا سوشلزم کے، کمیونزم کے کوئی معنی ہمارے لیے نہیں رہے ہمارے عہد میں کون سے سوالات زیادہ اہم ہیں۔ ہمارے نزدیک سوشلزم کی کیا معنویت ہے؟ ہم اس سے اب بھی INSPIRED ہوں یا آج کے نئے لکھنے والے اسے رد کریں؟

محترم اصغر علی انجینئر صاحب نہایت ہی بنیادی اور اہم سوالات پر گفتگو کر رہے ہیں سوالوں اور جوابوں کے ساتھ ان کی تقریر جاری ہے:" لڈمیلا نے جو فرد کی اہمیت پر زور دیا ہے تو کیا ہم اس سے جدیدیت کی طرف نہیں جا رہے ہیں، جس کی خدمت ہم ہی نے کی تھی۔ ادیبوں کا تعلق کسی سیاسی اور معاشی نظریہ سے کس حد تک ہونا چاہیے، کیونکہ ادیبوں کا تعلق بنیادی طور پر احساسات اور جذبات سے ہے، نظریات سے نہیں، لیکن جس طرح ہم نظریات سے وابستہ ہوئے اور جس طرح اسے اہم جُز قرار دیا گیا، اس کے بارے میں ہم آج کیا سوچیں؟

دوسرے یہ، جس کی طرف گجرال صاحب نے صنعتی انقلاب کے حوالے سے اشارہ کیا ہیں اُسے ادب کی اصطلاح میں ماورا جدیدیت کہتے ہوئے یہ عرض کروں گا کہ ہمارا جو دور ہے، اسے آپ تیسرا صنعتی انقلاب کہیے جو کمپیوٹر اور الکٹرانک کا دور ہے۔ اس عہد کے بھی کئی سوال ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انجنیئر صاحب کی تقریر نے اس کانفرنس کو ایک نہایت واضح سمت دی اور بڑی کھلی فضا میں بے باکی سے ترقی پسند تحریک پر تنقید اور تبصرہ کیا ہے ، سامعین نے پہلو بدلے ہیں رات کے ۸ بجے ہیں ، ان کے بعد قمر صاحب نے اعلان کیا کہ ہم لوگ یہاں سے نکل کر انڈیا انٹرنیشنل سینٹر چلیں گے جہاں ICCR نے ادیبوں ، شاعروں اور دانشوروں کی ضیافت کا اہتمام کیا ہے — اب میں ہندی کے ممتاز ادیب اور افسانہ نگار جناب کملیشور کو زحمت دے رہا ہوں ۔ کملیشور صاحب اپنی گفتگو افسانوں کے حوالے سے کرتے ہیں ، جو دل اور دماغ کو متاثر کرتی ہیں اور غور و فکر پر اکساتی ہیں ۔ اس افتتاحی اجلاس کی صدارت ہندوپاک کے مشہور فکشن نگار جناب شوکت صدیقی فرما رہے ہیں ۔ وہ SOFT SPOKEN انسان ہیں ، اس لیے مائک کی آواز تیز کر دی گئی ہے ۔ انھوں نے خطبۂ صدارت میں نوعِ انسانی کے چار ادوار کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ :

" حضرات ! سوشلزم اور ترقی پسندی کا رشتہ نہایت گہرا ہے ۔ اس لیے کہ سوشلسٹ نظامِ حیات ہمارے عہد کا سب سے زیادہ ترقی پسند نظامِ حیات ہے ۔ ترقی پسند فکر کے دروازے محدود نہیں بلکہ یہ ہر اس شخص کے لیے کھلے ہیں ، جو اپنی سوچ کے اعتبار سے روشن خیال ہیں نہ رجعت پرستی کے خلاف ہیں ، انسان دوست ہیں اور سوشلزم معاشرے کے ایک ارتقائی اور صحت مند نظریۂ حیات پر یقین رکھتے ہیں ۔ اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ سوشلزم کا ایک نیا تصور سامنے آ رہا ہے ۔ اس شکست و ریخت نے ترقی پسند مصنفین کے سامنے بہت سارے سوالات کھڑے کر دیے ہیں ..... ہمیں ان سوالوں پر فراخ دلی سے غور کرنا چاہیے ، جس کے لیے یہ کانفرنس کی بھی جا رہی ہے ۔

آدھ گھنٹہ کی تقریر کے بعد جلسہ ختم ہوتا ہے اب ہال میں اور ہال کے باہر چہل پہل نظر آ رہی تھی ۔ لوگوں کے الگ الگ گروپ بس کی طرف بڑھ رہے ہیں ، جس کے ذریعہ سبھی کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر پہنچنا ہے ، جہاں رات کے کھانے کا انتظام ICCR نے کیا ہے — کچھ لوگ افتتاحی اجلاس میں کیے گئے سوالات اور جوابات کے درمیان ایسے الجھے کہ پیدل پیدل ہی سنٹر تک آ گئے ، بعض نے اپنے اپنے احباب کی گاڑیوں میں لفٹ لی ۔

نرم نرم گھاس کی فرش ، کھلا آسمان ، گلابی سردی ، ادیبوں اور شاعروں کی بھیڑ بھاڑ — ایک طرف کچھ لوگ شوکت صدیقی صاحب کو گھیرے کھڑے تھے ۔ اچانک بیگم پروفیسر عتیق احمد گھبرائی ہوئی آئیں — بھائی ! وہ عتیق صاحب کہاں رہ گئے ، وہ تو کہیں نظر ہی نہیں آ رہے ہیں ۔ بڑی کھلبلی سی مچ گئی ، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ پیغام آفاقی کے ساتھ آئے تھے ، پھر کہیں غائب ہو گئے ، کھانے کے بعد ان کی تلاش میں ہم لوگ ہوٹل آئے ، وہ اپنے کمرے میں تھے اور پھر انھوں نے اپنے کھو جانے کی روداد سنائی ۔

کھانے کے دوران محترمی گجرال صاحب بھی آئے ، وہ مہمانوں کی مزاج پرسی کر رہے ہیں ۔ ایسی مہمان نوازی ہم نے اس پایہ کی شخصیت میں کم ہی دیکھی ہے — ہوٹل سے نکل کر ہم لوگ بڑے مسرور اور شاداں گھر کی طرف چل پڑے ، قمر صاحب بھی خوش تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ہر اعتبار سے کامیاب رہا تھا ۔

میرے ساتھ پٹنہ کے افسانہ نگار قاسم خورشید مقیم تھے۔ جب میں گھر آیا تو وہ باہر ٹہل رہے تھے۔ کافی رات تک ہم لوگ کانفرنس کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ صبح ۸ بجے ہم لوگ قمر صاحب کے ساتھ ہی غالب اکیڈمی آگئے۔ جہاں اس سہ روزہ کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۰ بجے شروع ہونا تھا۔ اور جس کی مجلس صدارت میں جناب کاوش بدری، ڈاکٹر حسین الحق، جناب اصغر علی انجینئر، جناب کشمیری لال ذاکر، ڈاکٹر آغا سہیل، پروفیسر قاضی عبدالستار شریک ہیں۔ قمر صاحب نے نظامت شروع کر دی ہے۔

اُدھر غالب اکیڈمی کے زینے میں ڈاکٹر خالد اشرف اور ڈاکٹر جلال انجم DELEGATES کے REGI ST-RATION- کا کام شروع کر چکے ہیں۔ اس میں ایک خوبصورت فائل کے ساتھ کانفرنس کا سووینر بھی دیا جارہا ہے۔ سووینر کی اشاعت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے کی ہے جو ایک طرح کا بڑا تعاون تھا ہم لوگوں کے لیے۔

بہر حال آیئے ہال کے اندر چلتے ہیں۔ ہال کل کی طرح بھرا ہے۔ اور قمر صاحب کی آواز گونج رہی ہے:

یہ اجلاس، ادب میں کمٹ منٹ کے نئے "تناظر" کے عنوان سے موسوم ہے۔ آیئے ہم بدلتی ہوئی زندگی اور سماج کے حوالے سے دیکھیں اور غور کریں کہ کیا ادب میں کسی قسم کے کمٹ منٹ کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ اور اگر ہے تو کیا یہ وابستگی اپنی ذات سے ہوگی، یا کائنات سے، یا کسی سیاسی، سماجی، اخلاقی نظریے سے، اور اگر ہو تو کس حد تک۔ ایک بات شروع ہی میں ہی عرض کر دوں کہ آپ تمام حضرات کو نہ صرف اس اجلاس میں بلکہ اس سہ روزہ کانفرنس میں بالکل کھلی فضا میں آزادانہ فکر کے ساتھ اپنی بات کہنے کا حق ہے۔ کسی قسم کی کوئی پابندی یا کوئی جھجک محسوس نہ کریں بلکہ بے باکی سے اپنے خیالات پیش کریں اور یہ سارے مقالے اور ان پر ہونے والی بحث ہم شائع کریں گے ۔۔۔"

اس اجلاس میں جناب کاوش بدری، ڈاکٹر طارق سعید، ڈاکٹر حسین الحق، جناب رفعت سروش، جناب نوار عالم، جناب پیغام آفاقی وغیرہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ زیادہ تر مقالہ نگاروں نے ادب میں کمٹ منٹ کو ضروری قرار دیا، لیکن اسی حد تک جہاں ادب، ادب رہے، کسی عقیدے کا ترجمان نہ بن جائے۔ چنانچہ جوگندر پال نے کہا کہ ۔۔۔ گوتم بدھ کے ایک شاگرد نے اس کی تعلیمات لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ آپ نے جو کچھ سیکھا وہ اپنے تجربات سے۔ لیکن مجھے آپ کہتے ہیں کہ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ کیا آپ مجھے یہ موقع نہیں دینا چاہتے کہ میں بھی زندگی کو اپنے طور پر دریافت کروں۔ اس وقت ہم سے زیادہ نئے لکھنے والوں کو سوچنا ہے کہ ہمارا COMMITMENT کسی جامد نظریے کے ساتھ ہوگا یا زندگی کے ساتھ۔"

تالیوں کی گونج کے ساتھ ان کی تقریر، جو خاصی فلسفیانہ بھی تھی اور جس میں ان کی مخصوص فرہنگ کے الفاظ بھی شامل تھے، ختم ہوئی تو اصغر علی انجینئر صاحب مائک پر آئے انھوں نے گلاسنو اور پروسترویکا کے حوالے سے گفتگو کا آغاز کیا اور کہا کہ کمٹ منٹ کے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہم صحیح ادب تخلیق نہیں کر سکتے ۔۔۔ نوجوان اسکالر انوار عالم نے بھی کمٹ منٹ کو ضروری کہا۔ ممتاز دانشور اور ڈراما نگار جناب ریوتی سرن شرما نے کہا کہ:

"ہمارا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ روس میں آج کیا ہو رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی یہ بد قسمتی رہی ہے کہ ہماری حویلی میں لگی مورنی کبھی ناچتی رہی ہے۔ ان ہواؤں سے جو کبھی چلتی ہے روس سے اور کبھی

ے۔ ہمیں دراصل اپنے سماجی اور سیاسی حالات کے تحت ترقی پسند تحریک اور ادب کا تجزیہ کرنا چاہیے۔
آج جو ملکی صورت حال ہے، مجھے معاف کیجیے گا اس کے لیے ایک بار پھر ترقی پسند تحریک کی شدید ضرورت
ہے۔ ادیبوں کو سوچنا ہے کہ MEDIA کے اس زمانے میں کس طرح اپنی بات لوگوں تک پہنچائیں۔"
اس ادبی اجتماع کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں پرانے لکھنے والوں کے ساتھ نئے ادیبوں کی بھی کافی
تعداد موجود ہے۔ شاید اسی لیے ریوتی سرن شرما صاحب کے بعد جب میں نے مائک کی طرف دیکھا تو جناب
سم خورشید بولتے ہوئے نظر آئے:
" وہ نظریہ جو زندگی سے پیدا ہوتا ہے، وہی دراصل سچا نظریہ ہے، سچی وابستگی ہے اور یہی دراصل صحیح
ترقی پسندی ہے کہ ہم جو محسوس کریں، اسے اپنے قاری تک پہنچا دیں۔"
کمال احمد صدیقی صاحب کا تعلق ترقی پسند تحریک سے چالیس پچاس سال پرانا ہے وہ اس کے سرگرم
رکن ہیں۔ انھوں نے بھی نظریہ اور قدر پر اچھی گفتگو کی۔ کراچی سے آئے پروفیسر عتیق احمد نے جناب کمال احمد
صدیقی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ——— آج کے اجلاس میں جو مقالے پڑھے گئے، ان میں نوجوان
ادیبوں اور بزرگ ادیبوں نے بھی، جس بات پر زور دیا ہے وہ یہ کہ ادیب کا کمٹ منٹ زندگی سے ہونا چاہیے۔
سوال یہ ہے کہ جس زندگی سے کمٹ منٹ کی بات ہم کر رہے ہیں، اس کی نوعیت کیا ہے؟ کوئی معیار تو ہوگا
اور یہ کس طرح متعین ہوگا؟ میرا خیال ہے یہ معیار مقرر ہوتے ہیں آدمی کی اس سوشل لائف سے کہ جو وہ گذار رہا
ہے ...."
ہال میں مکمل خاموشی ہے۔ چائے کے دو دور چل چکے ہیں۔ تقریباً ایک بجنے کو ہے پر کوئی اٹھنے کو تیار
نہیں ہے۔ اتنی دلچسپی اور انہماک سے لوگ اجلاس میں ہونے والی بحث میں شریک ہیں کہ کھانے کا بھی خیال
نہیں۔ ویسے اس وقت کا لنچ جناب شاہد صدیقی (مدیر نئی دنیا) نے دیا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کے آدمی
بار بار میری طرف دیکھ رہے ہیں ——— لیجیے قمر صاحب نے لنچ کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور کہا کہ:
حضرات! اس کے بعد بھی سیشن ہے اس میں بھی کافی مقالات ہیں۔ اس لیے میں اب صدر الصدور
قاضی عبدالستار صاحب کو ———
——— نہیں، نہیں ——— میں کچھ عرض کروں گا: مجمع میں سے کسی کی آواز تھی۔ کسی نے کہا، صدر الصدور
تو مفتی صدر الدین آزردہ تھے ——— آہا .... آہا .... ہاہا قمر صاحب بھی مسکرا رہے ہیں اور اب
انھوں نے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کا نام لیا ہے۔ خلیق انجم صاحب تیزی سے مائک کی طرف بڑھتے ہیں اور اپنی
بات یوں شروع کرتے ہیں ——— " آج سے پندرہ بیس روز قبل میں ایک ایسی محفل میں تھا، جس میں
زیادہ تر وہ ادیب تھے جو جدیدیے کہے جاتے ہیں۔ ان میں کچھ نقاد بھی تھے۔ وہاں بھی کمٹ منٹ پر باتیں ہو رہی
تھیں اور وہ EXACTLY وہی باتیں تھیں جو اس محفل میں کی جا رہی ہیں۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے
کہ آخر ان میں فرق کیا ہے۔
" ترقی پسند تحریک پچھلے چالیس سال میں مختلف نشیب و فراز سے گذری ہے۔ ایک وقت وہ
بھی تھا جب بڑی گھٹی ہوئی فضا تھی اس تحریک کے اندر، وہ زمانہ بھی نہیں رہا اور اب اس وقت جب
اس تحریک کے بنیادی نظریات شکست و ریخت کے شکار ہو رہے ہیں، یہ بھی ہمیشہ نہیں رہے گا۔ حضرت

ضرورت اس بات کی ہے کہ ادیب کا خود اپنا ایک سیاسی، سماجی اور معاشی نظریہ ہونا چاہئے جو ظاہر ہے صحت مند اور توانا ہو اور ہمہ گیر ہو اور زندگی سے جڑا ہو۔ تاکہ دوسرے ادیب بھی اس کی طرف متوجہ ہو سکیں اور میرے خیال میں ترقی پسند مصنفین ایک واضح اور تیکھا نظریہ رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند ادبی سرمایہ اردو میں کافی گراں قدر ہے ۔

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے اپنی گفتگو سے محفل کو قہقہہ زار بنا دیا ہے ۔ اور قمر صاحب بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے ہیں ۔ تالیاں بجتی ہیں اور قمر صاحب کہتے ہیں کہ، وقت بہت کم ہے اور میری فہرست میں پانچ نام اور ہیں۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، میرا خیال ہے کہ ابھی مجلس صدارت میں بھی کچھ لوگ ہیں جو بولیں گے، اس لئے اکثر احباب اپنے نام واپس لے لیں تو وقت ۔۔۔

جی تو نہیں چاہتا، مگر آپ کی پریشانی کے پیش نظر آیندہ اجلاس میں اپنی بات کہیں گے ۔۔۔ ! مجمع سے ایک آواز ابھری تھی ۔

" ۔۔۔ شکریہ ۔۔۔ ! اب میں راج بہادر گوڑ صاحب ۔۔۔

گوڑ صاحب کہہ رہے ہیں، حضرات میں اپنا نام واپس لینے ہی والا تھا کہ انھوں نے مجھے بلا لیا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بغیر کمٹ منٹ کے کوئی ادب لکھا ہی نہیں جاسکتا، تمام بڑے ادیبوں کو دیکھیے، کس کا کمٹ منٹ نہیں تھا۔ کمٹ منٹ سے انکار بھی دراصل ایک کمٹ منٹ ہی ہے "۔

گوڑ صاحب کے بعد اس موضوع پر جناب عابد سہیل، جناب کشمیری لال ذاکر، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر لطف الرحمٰن وغیرہ نے مختصراً اظہار خیال کیا ۔ ڈاکٹر لطف الرحمٰن نے ادبی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ کمٹ منٹ بذات خود کوئی معنی نہیں رکھتا، بغیر کمٹ منٹ کے بھی بڑا ادب پیدا ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ بھی ۔ تو دراصل بڑی چیز یہ ہے کہ ہمارا کمٹ منٹ کس سے ہو۔ ؟ اور کیوں ہو ۔ ؟ یعنی زندگی کے سچے اعلیٰ اقدار سے، فرقہ واریت کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں سے، انسانیت سے، ۔۔۔

..... بحث زوروں پر تھی، مجلس گرم تھی اور مجھے احساس تھا کہ ڈھائی بج چکے ہیں، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ چنانچہ قمر صاحب کو صورت حال سے آگاہ کیا گیا ۔ جس کے نتیجے میں یہ اجلاس ختم ہوا ۔ لوگ آہستہ آہستہ ہال کے BASEMENT کی طرف بڑھ رہے ہیں ۔ جناب تاباں صاحب کا کھانا میں نے اوپر ہی بھجوا دیا تھا بڑا خوبصورت لگ رہا ہے یہ سب ۔ لوگوں کے ہاتھوں میں پلیٹ اور باتوں میں مصروف ۔ کچھ سوال، کچھ جواب جو اجلاس میں دوران بحث اٹھائے گئے تھے، ان کے جوابات کھانے پر بھی تلاش کیے جا رہے تھے اور آج شام تک مسلسل یہ سوالات سوچنے پر مجبور کرتے رہیں گے اور مندوبین کے ہمراہ جائیں گے ۔ لوگوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ کھانے کے فوراً بعد ہی ہال میں اپنی نشستوں پر آگئے ۔ گرم گرم چائے تیار تھی، چائے کے ساتھ ہی دوسرے اجلاس کا آغاز ہو رہا تھا، جس کا موضوع تھا ۔۔۔ " ہندستان میں سیکولرزم کو درپیش خطرات اور ادیب " اس کی مجلس صدارت میں بزرگ ادیب جناب غلام ربانی تاباں، جناب سری لوکا لاہوتی، جناب جگن ناتھ آزاد، جناب الیاس احمد گدی، محترمہ زاہدہ زیدی، ڈاکٹر عبدالصمد وغیرہ شریک تھے ۔

" ادیب کی ذمہ داریاں، ادیب کے رویئے، ادیب کا PERCEPTION ادیب کی SENSIBILITY ؟

ان حالات کے تئیں جو ان خطرات کی بنا پر ہمارے ملک میں پیدا ہو رہے ہیں ظاہر ہے کہ یہ بہت پیچیدہ موضوع ہے۔ اس پر ایک کلیدی پرچہ لکھا ہے، ہماری درخواست پر تاباں صاحب نے۔ اس کے علاوہ ایک دو پرچے اور بھی ہوں گے۔ تو سب سے پہلے میں جناب معین اعجاز صاحب کو زحمت دے رہا ہوں"۔
معین اعجاز صاحب نے بڑی وضاحت سے اس مسئلے پر اظہارِ خیال کیا۔ ان کے علاوہ جن لوگوں نے اس موضوع پر کھل کر بحث میں حصہ لیا اور بے باکی سے اپنے خیالات رکھے، ان کی تعداد بڑی کثیر تھی، مثلاً جناب کرپال سنگھ آزاد، جناب احمد رشید شیروانی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر وحید اختر، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جناب خورشید اکرم، جناب ریوتی سرن شرما، جناب کملیشور، محترمہ زاہدہ زیدی، جناب رتن سنگھ، ڈاکٹر علی جاوید، جناب سری نواس لاہوتی وغیرہ نے بڑی بیش قیمت باتیں کیں۔ آیئے جناب احمد رشید شیروانی کی تقریر میں شریک ہوتے ہیں وہ ہندستان میں بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی پر تشویش کا اظہار کر رہے ہیں کہ RESPECTIBILITY ،فرقہ پرستی کو ملی ہے اور سیکولرزم کو جو DEFENSIVE پر آنا پڑا ہے، وہ بہت خطرناک صورتِ حال کا اشاریہ ہے۔ اس بدلتے ہوئے سیاسی منظرنامہ پر ادیبوں کو، دانشوروں کو اپنی نگاہ رکھنی چاہیے نیز ان خطرات کے سدباب کی راہ بھی ڈھونڈیں کیونکہ ——
پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے دوسرے مقالہ نگاروں سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ بعض حقیقتوں کو ہم جوش میں اگر نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ مثلاً ایک حقیقت تو یہ ہے کہ ہندستان کا سماج سیکولر سماج نہیں ہے۔ یہ مختلف مذاہب میں بٹا ہوا سماج ہے ایسی صورت میں صرف LEFTIST ہی ملک کو تباہی اور بلاؤں کے دہانے سے واپس لا سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ریاست کا کوئی مذہب نہ ہو اور ایسی ریاست کا تصور صرف LEFTIST دورِ حکومت میں ہی ممکن ہے۔ چنانچہ ادیبوں کو چاہیے کہ بائیں بازو کی طاقت کا ساتھ دیں اور کھل کر ساتھ دیں۔
حضرات! آیئے اب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب کے خیالات سنتے ہیں۔ قمر صاحب نے قدوائی صاحب کے اختتام پر فوراً اعلان کیا۔ انھوں نے تاریخی پس منظر میں گفتگو کی اور کہا کہ: مذہب کے نام پر فرقہ پرستی نہیں پھیلتی بلکہ بدعت کی وجہ سے پھیلتی ہے۔ آج ہمارے سماج میں بدعت پرستی زیادہ بڑھ رہی ہے اور اسی لیے فرقہ پرستی بھی سر اٹھا رہی ہے۔ چنانچہ کل راجا رام موہن رائے ستی کی مخالفت کر سکتے تھے، اس کے خلاف قانون بنوا سکتے تھے لیکن آج آپ اس نوع کی کوئی اصلاحات نہیں کر سکتے —— ہمارا جھگڑا مذہب سے کبھی نہیں رہا ہے بلکہ بدعت پرستوں سے۔ چنانچہ ادیبوں کو اس مسئلہ پر زیادہ سنجیدگی سے سوچنا ہے اور لکھنا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس وقت ادیبوں کو بالکل اسی تیور میں لکھنا ہوگا، جس تیور میں ہم نے ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا، کیوں کہ یہ لڑائی بھی جنگِ آزادی سے کم اہمیت نہیں رکھتی ——"
حقیقت یہ ہے کہ گوڑ صاحب کی تقریر نہایت اہم تھی اور انھوں نے تاریخ کے تجزیے کے ساتھ نہایت پرمغز تقریر کی، شاید یہی وجہ ہے کہ ہال میں مکمل خاموشی تھی اور قمر صاحب نے بھی ان کی گفتگو کو آگے بڑھایا۔ اب بزرگ ادیب کے بعد نوجوان ادیب ڈاکٹر علی جاوید مائک پر نظر آ رہے ہیں، خاموشی کے ساتھ چائے بھی آنی شروع ہو گئی ہے، کمال ہے کہ لوگ اپنی نشستوں سے اٹھنا بھی نہیں چاہتے۔ آخر وہ کون سی کشش ہے جس نے انھیں اتنے ذوق و شوق سے بیٹھنے پر مجبور کر دیا

ہے ۔ لوگ بحث کر رہے ہیں اور اس میں مزید حصہ بھی لینا چاہتے ہیں پر وقت کا دامن تنگ ہے ۔ اسی لیے قمر صاحب نے اب شکریہ اور معذرت کے ساتھ مجلس صدارت کے لوگوں کو دعوت دینی شروع کر دی ہے ۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جناب ریوتی سرن شرما نے اپنی گفتگو شروع کی اور بین الاقوامی سیاسی منظر نامہ کے ساتھ ساتھ بالخصوص ہندستانی سیاست پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگر اس بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور دہشت گردی پر قابو نہیں پایا گیا تو ملک تباہ ہو سکتا ہے ۔ ہمیں قومی دھارا میں بہتے ہوئے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ایک مسلمان مثلاً ڈاکٹر ابوالکلام آج کے ہندوستان کو دیتے ہیں ایک آزاد برہم استر، جو ان کی تحقیق کا نتیجہ ہے ۔ اب ایسی صورت حال میں کس سے نفرت کریں ؟ ریوتی سرن شرما صاحب اپنی تقریر ختم کر کے کرسی کی طرف بڑھ رہے ہیں ۔ تالیاں بج رہی ہیں اور قمر صاحب کہہ رہے ہیں ۔۔۔ حضرات آپ نے دیکھا کہ SITUATION کا تجزیہ ایک عقلیت پسندانہ اور سائنسی نقطۂ نگاہ سے ریوتی سرن شرما صاحب نے پیش کیا ۔۔۔ یہ صحیح معنوں میں ترقی پسندی ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ۔۔۔۔ اب میں کملیشور جی کو زحمت دوں گا کہ وہ اظہار خیال کریں ۔

کملیشور جی ہندی کے مشہور ادیب ہیں اور بہت صاف ستھری گفتگو کرتے ہیں ۔ انھوں نے بھی ملکی سیاست کو بے نقاب کیا اور کہا کہ " سیاسی پارٹیوں نے اپنے مفاد کی خاطر فرقہ پرستی کو بڑھاوا دیا ہے ____________ پھر ہی نہیں ، بلکہ اس کے پرچار کے لیے MASS MEDIA کا استعمال کیا گیا ۔ آخر تلسی داس جی نے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا کہ رام چندر اجودھیا میں جہاں پیدا ہوئے تھے وہاں ان کے نام سے ایک مندر ہے ۔۔۔ ان کی گفتگو کے درمیان میں ہی جناب پرویز جعفری نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے کملیشور جی سے کچھ کہا یا پوچھا ۔۔۔ شاید وہ ان کے خیالات کی تائید کر رہے تھے ۔

محترمہ زاہدہ زیدی نے یہ شکایت کی کہ پورے اجلاس میں موضوع سے ہٹ کر گفتگو ہوتی رہی ہے ۔ ہمیں صرف سیکولرزم پر بات نہیں کرنی تھی ، بلکہ اس کے حوالے سے ادیبوں کی ذمہ داری تلاش کرنی ہے کہ وہ بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی کے خلاف اور سیکولرزم کو درپیش خطرات کے سامنے اپنی تخلیقات کس طرح پیش کریں کہ وہ لوگوں کے اذہان کو بدل سکے ، ضرورت اس کی بھی ہوتی ہے کہ ہنگامی ادب لکھا جائے ۔

دن ڈھلنے کو تھا ، مگر گفتگو شباب پر تھی ۔ لیکن اس اجلاس کے بعد " شام افسانہ " کا بھی پروگرام تھا ۔ اس لیے یہ اجلاس ختم کر دیا گیا ، شام افسانہ میں نئے اور پرانے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے پیش کیے اس کے بعد تقریباً ۱۰ بجے رات میں ہم لوگ گھر واپس آئے ، مسرور اور شاداں !

———○———

کانفرنس کے دو دن بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی سے گذرے ۔ اچھی بامعنی بحث ، سیر حاصل گفتگو ، پُر مغز مقالے اور تقریریں ۔۔۔ کھلے ذہن کے ساتھ تبادلۂ خیالات نے کانفرنس کی فضا کو خوش گوار اور آزاد بنا دیا تھا ۔۔۔ ۲۸ مارچ کانفرنس کا آخری دن تھا اور اس کے اجلاس کا موضوع تھا ۔۔۔ " ترقی پسند فکر کی معنویت عصر حاضر میں " ۔ دراصل یہی اس کانفرنس کا کلیدی اجلاس بھی تھا ، اور مرکزی نقطہ بھی ۔

اس اجلاس میں سب سے پہلا مقالہ پیش کرنے کے لیے پاکستانی ادیب اور ترقی پسند تحریک

کے فعال رکن جناب مسلم شمیم کے نام کا اعلان قمر صاحب نے کر دیا ہے۔ مسلم شمیم صاحب نے ترقی پسند فکر کی عصری معنویت پر بڑا پُر مغز مقالہ پڑھا۔ جس نے سامعین کو [illegible] بھی کیا۔ کیوں کہ سامعین کا اصرار تھا کہ بحث بھی ہو، مگر قمر صاحب نے کہا کہ تمام پرچے پڑھ لیے جائیں، پھر اس کے بعد بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہوگا تاکہ ہم دوسرے مقالہ نگاروں کے بھی خیالات جان سکیں۔

میں مجلس صدارت پر نگاہ ڈالتا ہوں تو محترمہ ارینا میکس ینکو، جناب سید ضمیر حسن، جناب ہیشم ساہنی، جناب گوپی چند نارنگ اور پروفیسر عتیق احمد وغیرہ نظر آتے ہیں اور جناب گوپی چند نارنگ اپنا مقالہ پیش کر رہے ہیں۔ ان کے بعد ضمیر حسن اور کمال احمد صدیقی صاحبان نے مقالے پڑھے اور کہا کہ ترقی پسند فکر کی معنویت خصوصاً آج کے پیچیدہ دور میں اور زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ جناب بھیشم ساہنی جب سب و شتم کے نتیجے میں بات شروع کرتے ہیں —

— صاحب صدر! میں خود اس تحریک سے وابستہ رہا ہوں۔ کچھ دوستوں نے اس تحریک کی خامیوں کا ذکر کیا، جو مناسب ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس عظیم مقصد کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے جن کے تحت یہ تحریک شروع ہوئی تھی۔ اس سے متعلق ادیبوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ آپ ہندستان کی ادبی سیاسی تاریخ صرف نظر نہیں کر سکتی اور آج کی ملکی صورت حال میں بھی یہ تحریک اس کے بنیادی نظریے اور اس سے وابستہ مصنفین ہی صحیح معنوں میں سیکولرزم کو بحال کر سکتے ہیں —

بھیشم ساہنی کے بعد ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ پھر ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے "نیا عہد، نئی آزادی اور اردو ادیب" پڑھا، جس میں خصوصیت کے ساتھ جدید ادبی منظر نامہ کے حوالے سے نئے ادیب کی جانب سے "شکوہ جواب شکوہ" پیش کیا گیا تھا، جسے سامعین نے پسند بھی کیا۔ اسی طرح جناب ریوتی سرن شرما نے ترقی پسند فکر کی معنویت کو اجاگر کرتے ہوئے شاعرانہ انداز میں حقیقت کو بیان کیا۔

مقالوں کا سلسلہ شاید ختم ہو چکا ہے، اسی لیے قمر صاحب نے جناب سید عاشور کاظمی کو آج کی بحث کے آغاز کے لیے دعوت دی ہے۔ عاشور صاحب آج ہی حیدر آباد سے واپس آئے ہیں۔ وہ سامعین سے مخاطب ہیں —

حضرات! کل اور آج دو دنوں میں یہ بات کھل کر سامنے آئی ہے کہ جس طرح نئے ادیب اور نوجوان ادیب اپنے خیالات کا برملا اظہار کر رہے ہیں اور جس فراخ دلی سے ہمارے اکابرین ان کی باتوں کو سن رہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نوجوان نسل آزادی سے سوچنے کا شعور اور بے باکی سے بات کہنے کا حوصلہ رکھتی ہے جو بڑی خوش آئند بات ہے اور اب یہی ہیں جو اس شمع کو لے کر آگے بڑھیں گے۔ مجھے نوجوان ادیبوں پر بھروسا ہے اور میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم انھیں مشعل حوالے کر دیں کہ وہ اس تحریک اور تنظیم کو لیکر آگے بڑھیں — میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر ہر سال یہاں اس طرح کی کانفرنس ہو تو میں ہر طرح کی معاونت کے لیے تیار ہوں" —

عاشور صاحب کی تقریر کے دوران بار بار تالیاں بج رہی ہیں — ڈاکٹر لدمیلا نے قمر صاحب کی طرف کچھ اشارہ کیا ہے — انھیں مائک پر بلا لیا گیا ہے۔ وہ کمال احمد صدیقی کی بات کا جواب دے رہی ہیں کہ ہمارے یہاں جو تبدیلی آ رہی ہے وہ بہتر اور مناسب ہے۔ نئے معاشرے میں ہر فرد کی قیمت ہوگی اور عوام جو ہوں گے

وہ ہم شکل، ہم آواز، ہم خیال، ہم لباس کا کوئی مجموعہ نہیں ہونگے بلکہ ایک ذہین، بلند اخلاق اور بلند انسان پر مشتمل ایک معاشرہ ہوگا ــــ

اکرام خاور صاحب ذہین نوجوان ہیں انھوں نے کہا کہ " میں نے مانا کہ سوویت یونین میں عوام کی یہ خواہش ابھر کر سامنے آئی ہے جس نے ہمارے کمٹ منٹ کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت پیدا کی مگر ہمیں اپنے سماجی اور سیاسی، تہذیبی، اور معاشی ماحول میں کمٹ منٹ کا تصور پیدا کرنا ہوگا۔ انھوں نے بہت تیکھے سوالات بھی کیے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قمر صاحب نے کہا کہ ــــ ہمارے نوجوان مقرر نے جن سوالوں کو اٹھایا ہے ممکن ہے اس کا جواب اس کانفرنس میں نہ ملے اور کبھی نہ ملے لیکن بعض سوالوں کے لیے ہم اعلان کرتے ہیں کہ جلدی ایک سیمنار کریں گے اور ان پر غور و فکر کریں گے۔ مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ ساری دنیا میں پچھلے پچھتر سال میں جو کمیونسٹ موومنٹ کی رہنمائی کی ہے وہ کمیونسٹ انٹرنیشنل نے کی ہے، اور اس کے جو اصول رہے ہیں وہ آپ دیکھیں، تو ان میں یہ بھی ہے کہ اقتدار آنا ہے اور اقتدار مستحکم کرنا ہے تشدد کے ذریعہ سے۔ تو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ سوویت یونین میں جو تشدد ہوا، جو پالیسی اختیار کی گئی وہ کمیونسٹ انٹرنیشنل کے اصولوں پر تھی اور اسی کی ڈور ہندستان میں اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں ہلائی جاتی تھی تو کیا اس کے لیے صرف اسٹالن ہی گناہ گار ہے یا وہ طاقتیں گناہ گار ہیں جن کے ہاتھ میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی باگ ڈور تھی۔

ــــ سامعین خاموش ہیں اور قمر صاحب کی آواز ابھر رہی ہے۔ انھوں نے اب جناب شوکت صاحب سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے خیالات پیش کریں۔ جناب شوکت صدیقی نے کہا کہ: اس دنیا میں سب سے بڑی اور بنیادی قدر " انسانی محنت " ہے۔ انسانی محنت جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔ تمام لطیفۂ حسنت کا ہی نتیجہ ہے۔ میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ میری ذہنی محنت ہی تو ہے ــــ "

انھوں نے تاریخ کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑی معنی خیز تقریر کی۔ شوکت صاحب کے بعد قمر صاحب نے کہا کہ حضرات! کھانے کا وقت ہو چکا ہے مگر میرے پاس ابھی بہت سے نام ہیں جو بحث میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔ چونکہ ہماری اس کانفرنس کا اہم موضوع اور مرکز یہی ہے کہ عصر حاضر میں ترقی پسند فکر کی کیا معنویت ہے یا ہو سکتی ہے تو اس پر اور کھل کر اور دیر تک باتیں ہوں۔ لیکن ہم لوگ پہلے کھانا ــــ

نہیں نہیں صاحب! پہلے بحث و مباحثہ ہو جائے، کھانا ہوتا رہے گا۔ مجمع کی آواز تھی اور شاید جلسہ نے بھی یہی تجویز پیش کی۔ بہر حال لوگ نشستوں پر ایک بار پھر سے جم گئے ہیں اور گفتگو از سر نو ہو گئی، زاہدہ زیدی کی تقریر جاری ہے۔ انھوں نے ترقی پسندی، جدیدیت اور کمٹ منٹ کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے جدیدیت کو بھی کمٹ منٹ سے جوڑا کہ آزادی اور وابستگی کا تصور وجودی فلسفہ میں موجود ہے جو جدیدیت کا منبع ہے۔ ان کی تقریر اتنی طویل تھی کہ قمر صاحب کو پرچی بڑھانی پڑی۔

بعد ازاں جناب اظہار اثر صاحب نے ادب اور سیاست کو لازم و ملزوم قرار دیا تو انور خالد نے کہا کہ ترقی پسندی کی میرے دل میں بہت عزت ہے ہم نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے لیکن ایک بات کاظمی صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی کہ انھوں نے کہا کہ ترقی پسندی کی کوئی پالیسی ہے۔ اس کی کیا

ہو سکتی ہے کیوں کہ آپ سردار جعفری صاحب کو دیکھیے اگر کوئی پالیسی ہے تو آخر کیا وجہ ہے کہ سردار جعفری کانگریس حکومت کے بھی منظورِ نظر تھے، جنتا حکومت کے بھی اور اب جو جنتا دل کی حکومت بنی ہے اس میں بھی ہیں۔ — تو آخر ایسی بے ضرر ترقی پسندی کا کیا فائدہ؟

نوجوان ادیبوں نے تالیوں سے انور خاں کے خیالات کی تائید کی ہے اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جلسے سے مخاطب ہیں کہ سیاسی اور سماجی بحران میں ادیب کو کیا کرنا چاہیے۔ آپ کہتے ہیں کہ فرقہ پرستی اب بڑھ رہی ہے۔ یہ غلط ہے۔ اس کی شروعات تو جواہر لال نہرو کے زمانے سے ہی ہو گئی تھی۔ انھوں نے اپنی جو پہلی کابینہ بنائی تھی ان میں جن سنگھ کو نمایندگی دی تھی۔ اب وہ چیز اس قدر بڑھ گئی ہے کہ آج ہمارے قابو سے باہر ہے۔

ڈاکٹر حسین الحق نے کہا کہ ترقی پسند فکر کی معنویت پر کسی نے غور نہیں کیا حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک، تحریک سے زیادہ رجحان بن گئی ہے۔ جس کا نتیجہ ہے کہ آج کی اس محفل میں سریندر پرکاش بھی ہیں، ابو الکلام قاسمی بھی، حسین الحق بھی اور انور خاں بھی اور عبدالصمد بھی ــــ یہ اس بات کا استعارہ ہے کہ ہم نے ترقی پسند فکر کی بعض جہتوں کو اس قابل سمجھا کہ اس کو قبول کریں۔ ظاہر ہے آپ نے دروازے کھلے چھوڑے ہیں، کھڑکیاں کھول رکھی ہیں، آپ کو ہم اپنا سمجھتے ہیں۔

ــــ قمر صاحب نے گفتگو کو آگے بڑھایا ہے کہ دیکھیے حضرات اب ہم لوگ کسی C[illegible]NTR[illegible]VERSY میں نہیں پڑنا چاہتے وحید اختر صاحب نے جو کچھ کہا ہے ہم اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہر ترقی پسند فنکار جدید ہوتا ہے اور اگر وہ جدید نہیں ہے تو وہ ترقی پسند بھی نہیں ہے۔ سوویت یونین آف رائٹرس نے بھی غلطیاں کی ہیں۔ سوشلسٹ ریلزم کا نہایت گمراہ کن اور غلط تصور بھی عام کیا گیا ہے۔ ہمارے ادیبوں کو ہدایات بھی دی گئیں۔ یہ سب ہوا ہے اس کا اعتراف ہمیں آج کرنا چاہیے اور اگر آج نہ کیا تو آنے والے دور میں کیا جائے گا۔ تالیاں ــــ تالیاں ــــ جب شور کچھ کم ہوا تو قمر صاحب نے کہا آیئے اب ہم کراچی سے آئے ہوئے پروفیسر عتیق احمد صاحب کے خیالات سے استفادہ کریں۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ عہد میں ہمیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ نئی ترقی پسندی کی کیا معنویت ہوگی۔ کیا ہم نے سچی آزادی حاصل کر لی ہے؟ کیا ہمارا ذہن غلام نہیں ہے؟ کیا ابھی تک ہمارے معاشرے میں استحصال کی صورت برقرار نہیں ہے؟ کیا آج بھی بھوکے اور افلاس کے مارے ہوئے لوگ سماج میں نہیں ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آج بھی ہمیں ترقی پسند فکر کی ضرورت ہے۔

جناب عابد سہیل نے ترقی پسند مصنفین کی بعض اہم غلطیوں کی طرف اشارہ کیا کہ مثلاً ہیئت کے بجائے موضوع اور مواد کو بے جا اہمیت دینا عابد سہیل صاحب کی تقریر کے بعد یہ اجلاس ختم ہو گیا۔ اور لوگ اپنے ذہن میں سوالات کو لیے کھانے کی طرف بڑھ گئے۔

○ ○ ○

لنچ کے فوراً بعد ہی کارروائی اجلاس کا آغاز ہو گیا۔ یہ اجلاس بھی بڑا اہم تھا کہ مختلف قسم کی قرار دادیں پیش ہونی تھیں اور الکشن بھی ہونا تھا۔ انتخاب کے سلسلے میں نوجوان ادیب متفکر نظر آرہے تھے۔ ان کا عام خیال یہ تھا کہ پرانے لوگوں کو ہٹنا چاہیے۔ یہ میں بھی سوچ رہا تھا، لیکن آیئے قمر صاحب کی

بات سنتے ہیں۔ پھر انتخاب کے نتیجہ کو دیکھیں گے۔

"حضرات! ہماری یہ کانفرنس پچھلی کانفرنسوں سے کئی اعتبارات سے مختلف ہے۔ بنیادی طور پر یہ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہے جو اپنے مسائل پر اور ادب کے مسائل پر سوچنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ہم عام طور پر پچھلی کانفرنسوں میں کچھ نتائج نکالتے تھے، کوئی منشور جاری کیا جاتا تھا یا اعلان نامہ ہوتا تھا۔ ہم اس بار ایسا کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ ادیب جمع ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے اد[بی] مسئلوں پر غور کیا ہے۔ اگر آج کے سوالات ہمارے ذہنوں میں واضح ہو گئے ہیں یا کچھ نئے سوالات ہمارے ذہنوں میں پیدا کر دیے گئے ہیں۔ کچھ نئے جوابات ہمارے ذہنوں میں آئے ہیں اور ان جوا[بات] نے پھر نئے سوالوں کو جنم دیا ہے تو یہی کسی کانفرنس کی بڑی کامیابی ہے۔

بہرکیف نئی مجلس صدارت کے اراکین اسٹیج پر تشریف لائیں۔ یعنی ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر شارب ردو[لوی] ڈاکٹر محمود الحسن، ڈاکٹر علی احمد فاطمی، جناب پرویز جعفری، جناب اظہار احمد، جناب سید عاشور کاظمی، جناب فاروق[...] آیئے اس اجلاس کے آغاز میں کچھ قرار دادیں ہیں جو اتفاق رائے سے منظور کر لیں تاکہ اس پر کارروائی [ہو سکے]

سب سے اہم قرارداد عاشور کاظمی صاحب نے پیش کی جس میں ہند و پاک کے درمیان بڑھتے ہو[ئے] تناؤ اور سرد جنگ پر اپنی تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ دونوں ملکوں کو اپنی پس ماندگی دور کرنے اور مسائل [کو] سلجھانے کے لیے جنگ کی نہیں طویل امن کی ضرورت ہے۔ اس قرارداد پر پاکستانی اور ہندستانی ادیبوں کے دستخط تھے اور جس میں دونوں ملکوں کی حکومتوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اپنے مسائل جن میں کشمیر کا [مسئلہ] بھی شامل ہے، شملہ معاہدہ کی روشنی میں باہمی گفت و شنید سے طے کریں اس قرارداد کی تائید ہال میں مو[جود] تمام ادیبوں نے کھڑے ہو کر اور تالیاں بجا کر کی۔

یوپی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے حوالے سے بھی ایک قرارداد رکھی گئی جس پر کا[فی] ہنگامہ رہا مگر بعد میں اتفاق رائے سے اسے منظور کر لیا گیا۔

ایک اور قرارداد ہند و پاک کے درمیان کتابوں کی آمد و رفت کے سلسلے میں بھی پیش کی گئی اس میں یہ بھی کہا گیا کہ دونوں ملکوں کے ادیبوں کی کتابوں کے جعلی ایڈیشن پر بھی پابندی لگائی جائے۔ حکو[مت] ادیبوں کے حق کی حفاظت کے لیے مناسب اقدام کرے کہ اگر کسی مصنف کی کوئی کتاب شائع ہو تو ا[سے] اس کا معاوضہ مل سکے۔

ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے ایک ادبی رسالہ کی اشاعت کی طرف توجہ دلائی کہ اس کے بغیر تحریک، تنظیم ادب کا فروغ ناممکن ہے ــــ تامل ناڈو میں اردو اکیڈمی کے قیام کے متعلق بھی ایک قرارداد [پیش] کی گئی۔ تمام قراردادیں اتفاق رائے سے منظور کی گئیں۔

اس کے بعد انتخاب کا دور تھا جس کی تفصیل یوں ہے:

سرپرست: اندر کمار گجرال، حیات اللہ انصاری، علی سردار جعفری، غلام ربانی تاباں، وامق ج[ونپوری] ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، اختر سعید [خاں]

مجلس صدارت: جوگندر پال، انور عظیم، پروفیسر عقیل رضوی، اصغر علی انجینئر، عابد سہیل، رتن سنگھ، پروفیسر قاضی عبدالستار، پروفیسر شہریار، ریوتی سرن شرما، اقبال متین، ڈاکٹر محمود الح[سن]

رفعت سروش، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر اجمل اجملی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی۔

چیرمین مجلس صدارت : جوگندر پال

جنرل سکریٹری : پروفیسر قمر رئیس۔ آفس سکریٹری: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم۔

صوبائی سکریٹریز : راشد آذر (حیدرآباد) ڈاکٹر علی احمد فاطمی (الہ آباد) ڈاکٹر عبد القیوم ابدالی (رانچی)، پرویز جعفری (بلرام پور) شفیقہ فرحت (بھوپال)، ڈاکٹر شکیب نیازی، ڈاکٹر خالد اشرف (دہلی)۔

مجلس عاملہ : اظہار اثر، سری نواس لاہوتی، ظہور الدین، ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی، قاسم خورشید، فاروق بخشی، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر حسین الحق، ڈاکٹر ابن کنول، ڈاکٹر صغریٰ مہدی، نجمہ نکہت، سید ضمیر حسن، ہراج ورما، زاہدہ زیدی، ایم۔ کوٹھیاوی راہی، خالد علوی، انوار عالم، فخر الکریم صدیقی، نور حسین، محسن خاں، انور خاں، الیاس احمد گدی، ڈاکٹر طارق سعید، کاوش بدری، نگار عظیم، نسیمن زیدی، ڈاکٹر مجیب الاسلام، تارا چند رستوگی، سلام بن رزاق، ڈاکٹر قدوس جاوید۔

ناظم : ہردیو سندھو۔

○

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی یہ سہ روزہ کانفرنس آہستہ آہستہ اپنے اختتام پر پہنچ رہی ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کے چہرے پر اب تھکن کے آثار نظر آرہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کانفرنس کے انعقاد میں بہت محنت کی ہے وہ یوں بھی ذہنی طور پر نوجوان ادیبوں سے قریب ہیں۔ اسی لیے جب انھوں نے دوران انتخاب جنرل سکریٹری کے عہدے پر کام کرنے سے معذوری کا اظہار کیا تو کم و بیش تمام مندوبین اور حاضرین جلسہ نے انھیں اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر دیا۔ اسی کا اثر تھا کہ انھوں نے کہا۔

" آپ لوگوں نے، خصوصاً نوجوان ادیبوں نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے، میں کوشش کروں گا کہ ان کی امیدوں کو پورا کر سکوں۔ آنے والا دور جو اس تحریک کا ہوگا، وہ اپنا رنگ روپ، اپنا خاکہ خود بنائے گا اور اسے بنانے والے ہوں گے ہمارے نوجوان ادیب۔ ان کا نیا تخلیقی شعور جو سامنے آئے گا، اس میں ہمیں ذرا بھی شبہ نہیں ہے اور پچھلے دور کی جو صحت مند، توانا روایات ہیں ہمارے ادب کی، وہ یقیناً خون کی طرح آنے والی فکر میں تحلیل ہو جائیں گی اور اس طرح سے جو یہ سلسلہ ہے، جاری رہے گا۔ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ پہلی کانفرنس ہو رہی ہے ترقی پسند ادیبوں کی جس میں کوئی اعلان نامہ، کوئی ہدایت نامہ، کوئی منشور نہیں۔ جو اجلاس ہوئے ہیں ادیبوں، نوجوان ادیبوں اور بزرگ ادیبوں کے درمیان، جو ڈائیلاگ ہوا ہے وہ اتنا صحت مند ہے۔ مختلف نظریات اور تصورات رکھنے والے ادیبوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی ہے اور جو ہم آہنگی کی فضا قائم ہوئی ہے، وہ بھی ہماری تحریک کی تاریخ میں ایک نئے باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں آپ تمام حضرات کا، تمام مندوبین کرام کا، ان لوگوں کا جنہوں نے ہماری اس کانفرنس میں کسی بھی طرح کی معاونت کی ہے تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آئندہ بھی آپ کا تعاون ہمیں حاصل رہے گا۔ شکریہ!

کانفرنس کے دونوں دن "شام افسانہ" بھی ہوئی جس میں جناب شوکت صدیقی، جناب جوگندر پال، جناب رتن سنگھ، جناب رفیق چودھری، جناب الیاس احمد گدی، جناب کشمیری لال ذاکر، جناب کنور سین، جناب قاسم خورشید، جناب عابد سہیل، جناب حسین الحق، جناب عبد الصمد، جناب محسن خاں، جناب انور خاں، جناب اقبال متین، محترمہ فہمیدہ عتیق وغیرہ نے افسانے پیش کیے اور جناب مسیح انجم نے اپنی مزاحیہ تحریر سے محفل کو قہقہہ زار بنایا۔ اور اس طرح یہ سہ روزہ یادگار کانفرنس ختم ہوئی۔

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

خلیل الرب صاحب کا مضمون "گوشہ جذبی پر ایک نظر" کے سلسلے میں چند باتیں پیش خدمت ہیں اطلاعیہ کہ کسی شاعر یا ادیب کے ادبی مقام کا تعین اس کی زندگی بالخصوص تصنیفی زندگی میں نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ اس کا پورا سرمایہ سامنے نہ آچکا ہو۔ جذباتی مقبولیت یا وقتی ہیجانات کے اسباب ختم نہ ہوچکے ہوں، مخالفت و موافقت کا بازار ٹھنڈا نہ پڑ چکا ہو۔ اس کے ادبی مرتبے کا تعین قبل از وقت غیر ضروری اور بعض اوقات گمراہ کن بھی ہوتا ہے۔ یہ بہت واضح حقیقت ہے کہ ایک شاعر اپنی زندگی میں بہت مقبولیت و شہرت حاصل کرتا ہے لیکن آنکھ بند ہوتے ہی اس کی ساری مقبولیت ختم ہوجاتی ہے۔ ایک دوسرا شاعر زندگی میں نسبتاً کم مقبول ہوتا ہے لیکن موت کے بعد اسے بہت زیادہ شہرت و مقبولیت حاصل ہوجاتی ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اچھا اور بڑا فن کار نہ ہونے کے بعد بعض دوسری بنیادوں پر اس کی شخصیت اتنی اہم ہوجاتی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی کم درجہ کی تخلیق کو بھی اہمیت دی جانے لگتی ہے یا پھر یہ ہوتا ہے کہ اچھے سے اچھا فن کار اپنی شخصیت کی خامیوں یا کمیوں کی وجہ سے دب کر رہ جاتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فن کار کی زندگی میں اس کی شخصیت کا جلوہ مدرنگ یا بے رنگ اس کے فن کی مقبولیت کو بھی متاثر کرتا ہے۔ جذبی کے سلسلے میں بھی معاصر لے مجاب کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ علاوہ بریں ان کی گوشہ نشینی نے بھی ادبی حلقوں میں ان کو اس طرح موضوع بحث نہیں بننے دیا جس طرح ان کے دوسرے ہم عصر بنے۔ کلیم الدین احمد جیسا نقاد بھی جذبی کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ اسے آپ کیا کہیں گے؟ جس مجاز کو قابل اعتنا سمجھ کر کلیم الدین احمد نے گیارہ صفحے صرف کیے۔ کیا اس کے مقابلے میں جذبی کی کوئی اہمیت نہیں؟ بات یہ ہے کہ لیبلنگ کی عادت نے جس کے کلیم الدین احمد بھی شکار تھے۔ جذبی کے ساتھ ناانصافیاں کیں اس لیے ممکن ہے کہ خود خلیل الرب صاحب کے ذہن میں "گداز شب" کی اشاعت سے کوئی سوال نہ اٹھا ہو لیکن نوجوان نسل کے وہ افراد جنھیں خلیل الرب صاحب "انائی نقاد" کے خطاب سے نوازتے ہیں۔ ایسا سوچتے ہیں۔ کیوں کہ وہ ایسا سوچنے پر مجبور ہیں۔ یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ہر نسل اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ہر شاعر و ادیب کا مطالعہ کرنے پر مجبور ہے۔ اسی لیے ایک ہی شاعر ایک دور میں بڑا اور دوسرے دور میں چھوٹا ثابت ہوجاتا ہے لیکن یہ بھی ہے کہ بڑا شاعر ہر نقطۂ نظر سے اور ہر نسل کے لیے بڑا رہتا ہے۔ تعجب ہے کہ ان باتوں سے واقف ہونے کے باوجود

خلیل الرب صاحب یہ لکھتے ہیں کہ "جذبی کے ادبی مقام کا تعین توفروزاں کی اشاعت کے بعد ہی ہوچکا تھا، سخن مختصر نے اس پر مہر توثیق ثبت کردی" ادبی دنیا میں اتنی آسانی سے اور اتنی جلد صحیح مقام متعین نہیں ہوا کرتا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہر دور کا اپنا الگ الگ ادبی معیار ہوتا ہے اور ان تمام معیاروں میں جو قدر مشترک ہوتی ہے اس سے ایک بنیادی اور ہمہ جہت معیار بنتا ہوتا ہے۔

ثانیاً اگر میرا زاویہ نگاہ خلیل الرب صاحب کی نظر میں "خام روی کا مظہر ہے تو اس میں نہ میری غلطی ہے نہ خلیل الرب صاحب کی۔ اس لیے نہ مجھے پشیمان ہونے کی ضرورت ہے نہ انھیں پریشان۔ یہ زمانہ کے بدلتے ہوئے رجحانات کا معاملہ ہے جسے کسی طرح بھی ختم نہیں کیا جاسکتا جنریشن گیپ بہر حال ایک تلخ حقیقت ہے جسے انگیز کرنے پر ہم آپ سبھی مجبور ہیں۔

ثالثاً کلاسیکی عناصر کی تلاش کے "ناقص انداز کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ:

ان کا یہ فرمانا کہ مضامین کی مماثلت اور نفسیاتی سطح پر پائے جانے والے اثرات کلاسیکی رنگ کی شناخت کا معیاری پیمانہ نہیں ہیں اور مضامین وخیالات میں مماثلت اور شعرا کے کلام میں بالخصوص غزل میں عام بات ہے" اتنی سادہ لوحی پر مبنی ہے کہ ان کی بزرگی کی وجہ سے سادہ لوحی کہتے ہوئے بھی تکلف محسوس ہوتا ہے۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ اسلاف اپنے اخلاف کی شخصیت کا ناگزیر حصہ ہوتے ہیں اور ان کی فکری بنیاد سے کسب فیض کے بعد ہی اخلاف کی فکری و فنی عمارت کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ اخلاف کا اپنا الگ ایک نشان ہوتا ہے۔ کوئی آنے والی نسل اپنے فوراً پہلے کی نسل سے پوری طرح متفق ہو ہی نہیں سکتی؟ کیا کلاسیکی شاعری کا توازن، اعتدال، تحمل، مرکزیت، سماجی اقدار کا پاس اور زبان کی سطح پر نثریت سے دور ہونا تراکیب کے استعمال کے ذریعے گنجینۂ معنی کا طلسم آباد کرنا، سمندر کو کوزے میں بند کرنا وغیرہ ترقی پسند شاعری میں بھی پایا جاتا ہے۔ کیا یہ ترقی پسندی اور ترقی پسندوں کا امتیاز واختصاص ہے؟ کیا جذباتی وفور، غیر محتاط انداز اور نثریت سے ہم آہنگی اور اقدار شکنی وغیرہ ترقی پسند شاعری کے اہم رجحانات نہیں رہے؟

خلیل الرب صاحب جس "مضمون آفرینی اور خیال آفرینی کو کلاسیکی شعریات کا امتیازی خصوصیت کہتے ہیں۔ کیا وہ تراکیب کے استعمال کے ذریعے گنجینۂ معنی کا طلسم آباد کرنے سے مختلف ہے؟ کیا ترقی پسندانہ نثریت میں "خیال آفرینی اور مضمون آفرینی" ممکن ہے؟ کلاسیکی شاعری کے الفاظ وعلامات کے جس استعمال کو خلیل الرب صاحب معنی ومفہوم میں نئی وسعتیں" پیدا کرنا سمجھتے ہیں۔ وہ ان کے معنی ومفاہیم کو محدود کرنا تھا۔ وسیع کرنا نہیں

طول کلامی کی معذرت کے ساتھ۔

(امتیاز احمد مرتب، گوشہ جذبی، علی گڑھ

فروری ۹۱ء کے کتاب نما میں سید محی رضا صاحب کا خط پڑھا۔ موصوف کا خط تضاد کا شکار رہے۔ ایک جانب تو انھوں نے ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب (مہمان مدیر شمارہ جنوری ۹۱

ے اتفاق کیا ہے کہ اردو کے موجودہ ادیب اپنے گرد و پیش کے احوال سے لاتعلق ہو گئے ہیں اور
دوسری جانب موصوف نے ڈاکٹر سید عبدالباری سے یہ سوال بھی پوچھا ہے کہ کیا اردو کا ادیب
اردو والوں کی بپتا پر اپنے ادب کی عمارت کھڑی کرے یا انسانی دکھ درد کے اظہار کو اپنے فن کی بنیاد
بنائے۔ یہ تو عجیب بات ہوگی کہ چونکہ اس وقت اردو والوں پر غیر اردو والے (مثلاً فسادات)
یلغار کر رہے ہیں اس لیے اردو کے ادیب صف آرا ہو جائیں۔ اس طرح کی ذمہ داری اردو
کے تخلیقی فن کاروں پر نہیں ڈالی جا سکتی۔) ڈاکٹر سید عبدالباری کا اداریہ میری نظر سے
بھی گزرا ہے۔ انھوں نے کہیں بھی اردو ادیبوں سے محض فسادات کے خلاف صف آرا
ہونے کی بات نہیں کہی ہے۔ انھوں نے بڑی وضاحت اور بے خوفی سے ایک سچی بات
کہی ہے کہ "کسی دور کا ادب اپنے دور کے آشوب و بحران سے الگ نہیں رہ سکتا" ادب سے
ان کی مراد درباریوں کے ادب یا دانش گاہوں کے ادب سے نہیں ہے بلکہ عوام کے آغوش میں
پرورش پانے والے ادب سے ہے اور یہ حقیقت ہے کہ عصری ادب گرد و پیش کے حالات سے
بڑی حد تک چشم پوشی کر رہا ہے اور مغربی اثرات کے تحت ایک بے معنی ادب پیدا کر رہا ہے
جس کا نام تخلیقی ادب رکھ لیا گیا ہے اور یہی تخلیقی ادب کی طرف جناب محمد رضا صاحب
نے اپنے خط میں اشارہ کیا ہے۔ کیا وہ ادب جس کی اساس انسانی اقدار اور انسانی رشتوں
پر ہو، جو گرد و پیش کا منظر نامہ اور حالات کا بیانیہ ہو وہ تخلیقی ادب نہیں؟ کیا جس ادب
کا محور اشرف المخلوقات ہو وہ تخلیقی ادب نہیں؟ کیا وہ ادب جو خالق و مخلوق کے رشتوں کو اجاگر
اور استوار کرتا ہے وہ تخلیقی ادب نہیں؟ کیا وہ ادب جو دوستی بھائی چارگی یا محبت و اخوت،
امن و آشتی کا درس دیتا ہو اور نفرت، تشدد بربریت اور سفاکی کا مخالف ہو وہ تخلیقی
ادب نہیں؟ ــــ اصل میں یہی تخلیقی ادب ہے اور جس تخلیقی ادب کا ذکر محمد رضا صاحب نے
کیا ہے وہ محض ذہنی عیاشی ہے۔ وقت گزاری کے لیے دل کا بہلاوا ہے۔ یہ ادب ان کے
لیے ہے جن کی انگلیاں وقت کی نبض پر نہیں ہوتیں وہ حالات سے چشم پوشی کرتے ہیں
اور اپنی خول میں سمٹے اپنی روح کو گرماتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب نے
بالکل صحیح کہا ہے کہ "زندہ زبان کا ادب بازاروں، خانقاہوں، کھیتوں، کھلیانوں اور
محنت کشوں کے لہو کو گرم رکھنے والی کارگاہوں میں وجود میں آتا ہے۔" اس لیے جب
تک ادب سے ہم وقت کی رفتار نہیں ناپتے، لمحوں کا حساب نہیں لیتے، سانسوں کا تجزیہ
نہیں کرتے، آہوں کو قید نہیں کرتے، آنسوؤں کو صفحۂ قرطاس پر نہیں بکھیرتے، مسکراہٹوں
کو فضاؤں میں نہیں پھیلاتے۔ غرض کہ اسے انسانی اور انسانی رشتوں کا غماز نہیں بناتے
وہ بے مقصد ہی رہے گا اور یہی بات ڈاکٹر سید عبدالباری صاحب نے اپنے اداریہ میں دو ٹوک
لکھا ہے۔ میں آپ کو اتنا مضبوط سچا اور کھرا اداریہ پیش کرنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔

سید ظفر ہاشمی
احمد آباد

طالب علمانہ تجسس کے ساتھ پچاس برسوں سے ترقی پسند دانشوروں کی تصانیف اور مضا
کا مطالعہ میرے معمولات میں شامل ہے۔ ۱۹۴۵ء میں ایک کتب خانے کے لیے معیاری کتب کی فہر
تیار کر رہا تھا۔ ڈاکٹر کنور محمد اشرف سے استدعا کی کہ اہم کتب کی نشان دہی فرمائیں۔ انھوں نے
ترجمان القرآن مولانا ابوالکلام آزاد، تصنیفات و تفہیمات ابوالاعلا مودودی، تاریخ اسلام امیر علی
الفاروق، خطبات مدارس، آب کوثر، موج کوثر، رود کوثر، محمد اکرام مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ یہ کتابیں
بھی مطالعے کے لیے تجویز فرمائی تھیں۔ انھیں دنوں شیخ محمد اکرام پونے میں کلکٹر تھے۔ میں نے ان سے
بھی مطالعے کے لیے کتابوں کے نام لکھنے کی فرمائش کی۔ اکرام صاحب کا شمار تاریخ اسلام کے مستند
مورخین میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اشرف کا ذکر آیا تو فرمایا ان جیسے اسکالر ہمارے ہاں کم ہوں گے
ان کی مجوزہ فہرست کتب اہم ہو گی۔ ترقی پسند مصنفین کی تصانیف، مضامین ان کی ادبی نشست
اور ان کی محبت سے میں نے فیض حاصل کیا ہے۔ لیکن کبھی کسی کے قلم یا زبان سے مذہبی رہنما
یا علما کے خلاف کوئی بات تجربے میں نہیں آئی۔ اختلاف مذاہب اور بین المذاہب پر جتنا کچھ
گندگی اور انتشار خود مذہبی علما اور دانشوروں نے پھیلایا ہے اسے دیکھتے ہوئے جو روشن خیال
عالم اور ادیب ہیں اخلاقاً کبھی وہ مذہب کے خلاف کچھ کہنا یا لکھنا پسند نہیں کرتے۔ ترقی پسند
نے تو اقتصادی استحصال کے خلاف تحریک چلائی۔ ان کا اصرار تھا کہ جب تک معاشی نا ہمواری
قائم رہے گی نہ اخلاق بہتر ہو سکتے ہیں اور نہ جمالیاتی ذوق کو فروغ مل سکتا ہے۔ ہندستانی عوام
عموماً مذہبی ذہن رکھتے ہیں۔ اعتقادات اور مذہبی قدروں سے ان کی ناواقفیت عام ہے،
ایک ذہنی سطح ہے۔ مذہب سے تنفر کا اظہار کر کے کوئی تعمیری کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔
کتاب نما فروری اور مارچ میں ابن فرید صاحب اور سردار جعفری کے مابین جو نزاعی
باتیں شامل ہیں ان کے رد عمل کے طور پر سطور بالا حاضر ہیں۔

جنید احمد گلستان۔ بمبئی ۹۷

ایک پر خلوص درخواست ہے کہ کتاب نما میں ہر ماہ گوشہ شائع کرنے سے گریز کریں اس
لیے کہ عام قاری اور تخلیق کاروں کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ قاری یہ چاہتا ہے کہ زیادہ سے
زیادہ لوگوں کی مختلف تخلیقات پڑھ سکے۔ جنوری ۹۱ء سے پہلے کے کم سے کم چھے شمارے
گوشوں کی نذر ہو گئے جن کی وجہ سے بہت سی تخلیقات نظم و نثر شائع نہ ہو سکیں

اختر شاہجہاں پوری

ضروری نوٹ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین دہلی کے سلسلے والا
اجلاس میں جو مقالات پڑھے گئے تھے وہ آئندہ شمارہ
میں پیش کیے جائیں گے۔

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سورج میرے تعاقب میں

مصنف: ہیرانند سوز
صفحات: ۱۲۸
قیمت: چالیس روپے
ناشر: موڈرن پبلی شنگ ہاؤس نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

اردو شاعری میں ہیرانند سوز کی وفاداریاں نئے طرز فکر سے وابستہ ہیں۔ غزل، نظم اور آزاد غزل میں ان کا یہ رویہ صاف نظر آتا ہے۔ انھوں نے حادثاتی یا وقتی شاعری نہیں کی ہے بلکہ زندگی کے تقاضوں کے مطابق انھوں نے سوچا ہے اور زندہ لفظوں کی گونج سے شعور ذات کا عمل پیدا کیا ہے اور خود اعتمادی کی سچائی عطا کی ہے۔ اپنے تخلیقی عمل سے انھوں نے اپنے عہد کے کرب و نشاط، رنگ و نیرنگ، جمال و جلال، ذات و کائنات کے باہمی رشتوں، انسان اور انسانیت کی ابدی قدروں، اپنے داخلی و خارجی تلازموں، اور اپنے آس پاس کی زندگی کی ایسی مؤثر ترجمانی کی ہے جس سے آفاقی جہتوں کا سراغ ملتا ہے۔ انداز پیش کش کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں۔ ؎

انداز نو سے سوز ہوا ہے غزل سرا　　　شاید نہ ہو کسی نے سنا غور سے سنو

اس خود اعتمادی کی روشنی میں "سورج میرے تعاقب میں" کا جائزہ لینے پر اظہار و ابلاغ کے ست سے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔

آج کے دور کی نوع بہ نوع مشینی ایجادات صنعتی کارخانوں اور سائنسی ارتقار کی پے در پے یافتوں نے جہاں بہت سی سہولتیں فراہم کی ہیں وہاں انسان کو بے جہت مسافرت کے عذاب میں مبتلا کر کے اپنی شناخت سے محروم کر دیا ہے ؎

سلسلہ اونچے مکانوں کا ہے تا حد نظر　　　شہر میں پھر بھی کہیں سایۂ دیوار نہیں

وہ دور تیشہ گری ہے کہ آدمی کا وجود　　　ہر ایک سمت سے ٹوٹا دکھائی دیتا ہے

جس ماحول میں ہم جی رہے ہیں وہ زہر آلود ہے اور انسان اپنے تمام انسانی رشتوں سے کٹ کر اکیلا رہ گیا ہے۔ گھٹن کے گھیرے کی یہ صورت حال ہیرانند سوز کے شاعرانہ لہجے میں دیکھیے ؎

کان معذور، زبان بند، مقفل ہیں دماغ   کوئی در وا ہو تو آواز لگا کر دیکھیں

آج کا دور انسانیت کے دو لخت ہونے، برہمی، انتشار، بے چینی، انجانے خطرات، تہذیبی قدروں کی پامالی اور ذات کی اکائی کی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ مذہبی، بیگانگی سے عبارت ہے۔ سوز نے اپنی غزلوں اور آزاد غزلوں کے ذریعہ ان تضادات آتار چڑھاؤ اور ناہمواریوں کو بے لاگ انداز میں بیان کیا ہے۔ سچائی کے اظہار کی فنکارانہ بصیرت و بصارت دیکھیے ؎

بغض و عناد، حرص و ہوس خواہشات نفس   دل ایک اور کتنی بلاؤں کی زد میں تھا

کسی کے سر پہ کوئی سائبان نہیں ہر شخص   خود اپنی چھاؤں میں بیٹھا دکھائی دیتا ہے

وہ خود سری ہے نئی نسل میں کہ بچوں کو   کسی طرح کی نصیحت کوئی نہیں کرتا

بھٹکتی پھرتی ہے انسانیت کھلے بالوں   سنا ہے گیسوئے گیتی سنورتے جاتے ہیں

کھلا تو اس میں گناہوں کے کتنے باب ملے   وہ بند تھا مقدس کتاب لگتا تھا

اٹھتا ہے اب جو ہاتھ خدا کے حضور میں   وہ دست احتجاج ہے دستِ دعا نہیں

فرقہ وارانہ فساد بھی آج کا سلگتا ہوا مسئلہ ہے۔ فرقہ پرست طاقتیں نفرت، عداوت اور شک و شبہ کا ماحول پیدا کر کے ملک کی سالمیت کو خطرے میں ڈال رہی ہیں۔ قومیں مذہب سے نہیں بلکہ تاریخی تجربات سے بنتی ہیں۔ انسان کی شناخت کا یہ پیمانہ غلط ہے کہ اس کی ذات کیا ہے، اس کا مذہب کیا ہے۔ اس کے نقصانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوز کہتے ہیں ؎

عجیب ڈھنگ کا موسم تھا شہر میں اب کے   دلوں میں خوف تھا چہروں پہ بدحواسی تھی

خوف کے دشت میں احساس تحفظ کھو کر   آدمی ٹوٹتا جاتا ہے کہیں اندر سے

میں نے اکثر یہی دیکھا ہے تعصب کی ہوا   جب بھی چلتی ہے تو سانسوں میں گھٹن ہوتی ہے

تعصب کی ہوا سے انسان کو محفوظ رکھنے کی دعا سوز صاحب خدا سے کرتے ہیں ؎

نسلِ انساں کو تعصب کی اذیت سے بچا   اے محبت کے خدا اس پہ مسیحائی کر

ساتھ ہی ساتھ وہ انسان کو صالح راہ پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ در اصل کردار کی دولت ہی سب کچھ ہے۔ نفس پر قابو پا کر انسان خدا کو پانے کی جستجو کرے تو سارا مسئلہ حل ہو جائے ؎

خدا کی ذات میں ضم ہو گیا جہاں درویش   وہاں نہ فرق کوئی کا رنیک و بد میں رہا

وہ محترم ہے جو تسخیر ذات کی خاطر   تمام عمر لڑا اور اپنی حد میں رہا

ذات کی اکائی کی تقسیم، آندھیوں میں شمع وفا اور شمع فن جلانا، سیاسی، سماجی اور معاشرتی اتار چڑھاؤ رکھنا اور نئے سیاق میں نئے مفاہیم اور نئے معانی کا طلوع ہونا، ساتھ ہی ہجر و وصال اور غم جاناں کے مرحلے طے کرنا ہیرانند سوز کے کلام کے ایسے ضابطے ہیں جن کے بیان کے لیے وہ الفاظ محاورات اور روزمرہ کے مسلمہ قواعد و ضوابط سے کہیں بھی انحراف نہ کرتے ہوئے اپنے اظہاری رویے میں پوری طرح جدّت طرازی اور جدت آرائی کا حق ادا کرتے ہیں ●

یہ مجموعہ آفیسٹ پر بے حد خوبصورت چھپا ہے !!

خواجہ میر درد

؛ تنقیدی اور تحقیقی مطالعہ ؛

مرتبین: ثاقب صدیقی انیس احمد
سن اشاعت: ۱۹۹۹ء
قیمت: ساٹھ روپے
مبصر: ڈاکٹر جلال انجم
ناشر: مرتبین
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ. جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

گزشتہ دو دہائیوں میں اردو تحقیق و تنقید کی رفتار میں جو پیش رفت ہوئی ہے۔ اس میں ایک طرف نئے نئے موضوعات پر تحقیقی کام ہوا تو دوسری طرف بند جھکے ٹکے روایتی فیصلوں کی از سر نو چھان بین کی گئی اور حقائق کو سامنے لانے کا کام تیز ہو گیا۔ آب حیات میں محمد حسین آزاد نے بہت سی غلط بیانیوں سے کام لیا تھا۔ میر تقی میرؔ، میر دردؔ اور استاد ذوق کے بارے میں ان کی رائے سے اختلاف کیا جاتا ہے۔ انہی تضادات کے دھندلکوں سے میرؔ درد کی شخصیت کو نمایاں کرنے کا بیڑا جناب ثاقب صدیقی، اور انیس احمد نے اٹھایا ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیق کے دائرے کو اس بات پر مذکور کیا کہ محمد حسین آزادؔ نے آب حیات میں میر دردؔ کی جو تصویر پیش کی ہے اس سے خواجہ میر دردؔ کی شاعرانہ عظمت دب کر رہ گئی۔ آب حیات کے بعد جب بھی کسی نے خواجہ میر دردؔ پر گفتگو کی تو ان کو محض صوفی شاعر کہہ کر نظر انداز کیا گیا۔ مرتبین نے ایسے مضامین کو یکجا کیا ہے جو ان کی نظریہ کی توثیق کرتے ہیں۔ پہلا مضمون "درد اور آب حیات" کے عنوان سے ہے۔ جس میں قاضی عبدالودود صاحب نے آب حیات کے ذریعے پیدا کی گئی غلط بیانیوں پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ اور ان تمام غلط بیانیوں کی مدلل نفی کی ہے۔ جس سے تمام واقعات واضح ہو سکیں۔ الف، د، نسیم صاحب نے خواجہ میر دردؔ کے خاندان ے کی ہے۔ کلیم الدین احمد صاحب نے اپنے مضمون میں میر دردؔ اور سوداؔ کی شاعری میں یکسانیت تلاش کی ہے۔ سب سے اہم مضمون پروفیسر مجنوںؔ گورکھپوری کا ہے۔ اس کے بعد رشید حسن خاں، شمس الرحمن فاروقی، خلیل الرحمن اعظمی، اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضامین مجنوں گورکھپوری کے نظریہ کی تصدیق کرتے ہیں۔ آخری مضمون ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کا ہے۔ جو موضوع سے میل نہیں رکھتا۔

مرتبین نے ابتدائی مقدمہ میں اپنی رائے اس طرح دی ہے۔

"درد کی زیادہ تر شاعری عاشقانہ ہے۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ یاس و امید کا رنگ نمایاں ہے ہاں ان کی غزلیں مختصر اور منتخب ہیں۔ ان کے خیالات میں سنجیدگی، شائستگی اور متانت بھی ملتی ہے۔ ساتھ ہی درد، کسک اور سوز ان کی شاعری کا وصف ہے۔ انھوں نے جو محسوس کیا اس کو نہایت سلیقے سے اپنے اشعار میں ڈھال دیا۔ دردؔ کے کلام میں آورد کی بجائے آمد دیکھنے کو ملتی ہے۔ دردؔ کے عشقیہ اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اس اس میدان میں بھی دوسرے شعرا سے کم تر نہیں" ص ۱۹

امید ہے اس کتاب کی اشاعت کے بعد خواجہ میر درد کی عشقیہ شاعری کے مطالعہ کی جانب خاص توجہ دی جائے گی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سماجی منصب شاعرانہ مرتبہ کو ثانوی بنا دیتے ہیں۔ تو جواب ملتا ہے ہاں۔ میں موجودہ عہد کے ایسے بہت سے نام گنو سکتا ہوں جن کے شاعرانہ مرتبہ پر دوسرے مشاغل اثر انداز ہوئے۔ پروفیسر خلیل الرحمن اعظمی پروفیسر قریش، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی اور ڈاکٹر فضل وغیرہ ایسے نام ہیں جن کی سماجی حیثیت اور نقاد کا مرتبہ کی وجہ سے ان کی شاعرانہ حیثیت دب کر رہ گئی۔ میرا خیال ہے خواجہ میر درد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اسی لیے ان کو صوفی پہلے اور شاعر بعد میں سمجھا گیا۔ مذکرہ کتاب سوچنے کے لیے مواد فراہم کرتی ہے۔ اس لیے امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب اردو ادب میں مقبولیت پائے گی۔ اور اس کا مطالعہ ادب کے طالب علموں کے لیے مفید ثابت ہوگا میں اس کے مرتبین کو اپنی جانب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

دسترس

شاعر :- عرفان
قیمت :- ۲۵ روپے
ملنے کا پتا :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ
مبصر :- منظور ہاشمی

اظہار انسان کا فطری جذبہ ہے اور جو لوگ قدرے حساس ہوتے ہیں اور نگاہ رکھتے ہیں وہ اس اظہار کو رنگ و روپ دینے پر قادر ہوتے ہیں۔ کبھی نثر میں اور کبھی نظم میں۔ عرفان کی کتاب "دسترس" ان کے شعری اظہار کی خوبصورت شکل ہے۔ اس کتاب میں ان کی تقریباً دو سو مختصر اور طویل نظمیں شامل ہیں۔ جو اپنے عنوانات اور موضوعات کے لحاظ سے بہت متنوع ہیں۔ اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ عرفان کا مطالعہ، مشاہدہ اور ردِ عمل بھرپور اور گہرا ہے۔

شاعری ایک کثیرالابعاد وسیلہ اظہار ہے۔ اس کے پاس علامت، استعارے، تشبیہ، اور تمثیل وغیرہ کا رنگارنگ، روشن اور بیش بہا خزانہ ہے۔ جس کی مدد سے یہ غیر مرئی کو مرئی، ناموجود کو موجود اور معدوم کو محسوس کرنے کی قوت اور ہنر رکھتی ہے۔

عرفان ایک سنجیدہ اور حساس فنکار ہیں۔ انھوں نے اپنی سوچ اور فکر کے اظہار کے لیے نظم کا میڈیم اس لیے بھی منتخب کیا کہ اپنے آس پاس پھیلی ہوئی دنیا اور اس کے درمیان زندگی کا متواتر اور مسلسل تصادم ان سے فوری Reaction کا طالب ہوتا ہے۔ اور اپنی بات کو وہ صاف صاف اور بلاواسطہ کہنے پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کے برخلاف غزل میں بات حوالے اور کنائے سے زیادہ کی جاتی ہے۔ سماج اور سیاست کی گندگی، آدمی کی پستی و رفعت اور زندگی اور انسان کی کشاکش کی نفسیات، استحصال اور جبر کی اذیت ان کے محبوب موضوع ہیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے عرفان کو صاف سیدھے اور سچے الفاظ پسند ہیں۔ اور اپنی نظموں میں بار بار انھوں نے صاف و شفاف اور آلودگی سے پاک حرف و بیان کی آرزو کی ہے۔ ان کو ان کے ہی لفظوں میں "موزونیت سے الفت، ترتیب سے ارادت اور تہذیب سے عقیدت ہے۔ ان کا طرزِ فکر

رجحانات ترقی پسندانہ ضرور ہے۔ مگر اپنے اور اپنوں کے دکھ درد اور مسائل کو بھی وہ اہمیت دیتے ہیں۔ احساس جمال اور کاروبار شوق بھی ان کے ذہن ودل کو گدگداتے ہیں ان کی نظمیں کہ سورت عہد تشکیک . تشکیک . اظہار رجائیت ابہام اور مد ادا ان کے حق کی نمائندہ نظمیں کہی جاسکتی ہیں۔

باوجود اس کے عرفان اور روایتی اظہار کو عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی نظموں میں کبھی کبھی درکہیں کہیں استعارے اور پیکر تراشی کے روشن ٹکڑے نظر آتے ہیں۔

جیسے مندرجہ ذیل مصرعے:

" اے خامشی کے شہر "

" پھولی پڑ رہے ہے بچھڑے تنہائیوں کی لہر " :: اے خامشی کے شہر

" شام خون رنگ کے ہونٹوں کو حنا چومتی ہے " :: رجائیت

" ایک چھلکے سے تبسم کی ہنسی روتا تھا " :: تشکیک

" یونہی کھلتا رہے یہ عارض گلنار کا چاند " :: تشکیک اس کی زینت

" پلیٹ فارم جہاں روز رقص کرتی ہے :: وہ الپسرا، وہ حسین جن کو اجل کہتے ہیں۔ " "وفا"

عرفان نے اپنی نظموں میں دروں اور حساس ذہن کی آمیزش سے زندگی، زمانہ اور ماحول کی جیتی جاگتی اور موثر تصویریں پیش کی ہیں۔ مجموعی طور پر کتاب قابل مطالعہ ہے۔ اور ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے چالیس روپے میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ کتابت و طباعت صاف ستھری ہے

سارے جہاں کا درد

مصنف :: دلیپ سنگھ
قیمت :: ۲۰ روپے
ناشر :: حسامی بک ڈپو۔ مچھلی کمان حیدرآباد
مبصر :: یوسف ناظم

یہ مجلد کتاب پہلی نظر میں یوں دھوکا دیتی ہے کہ اپنی وضع قطع اور حلیے سے کوئی دینی اور مذہبی دکھائی دیتی ہے۔ پتہ نہیں اس کا مشورہ خود مصنف نے دیا تھا یا یہ حسامی بک ڈپو کا خود کردہ امہ ہے۔ بہرحال کتاب کے اس حلیے سے میرے اس نظریے کی (جو بہت پرانا ہے) تصدیق ہوتی ظرافت اور شرافت دونوں ساتھ چلنے والی چیزیں ہیں۔ دلیپ سنگھ کا ادبی سلسلہ حسب ونسب زندہ ان پنجاب سے ملتا ہے۔ (لفظ ملتا کو صرف ملتا پڑھیے ملتا جلتا نہ پڑھیے۔ معنی بدل جائیں گے) پطرس الحمید سالک، کنہیالال کپور اور فکر تونسوی ان کے بزرگ ہیں لہٰذا بھارت چند کھنہ اور نریندر لوتھر بھی ظاہر اسی فہرست میں شامل ہیں۔ لیکن یہ لوگ زندہ دلدن حیدرآباد کہلاتے ہیں) دلیپ سنگھ نے ۱۹۵۴ میں قبیلے میں داخلہ لیا۔ انھوں نے گزارش احوال واقعی میں لکھا ہے کہ انھوں نے ۱۹۵۴ میں اپنا پہلا طنزو مزاحیہ مون لکھا۔ اس حساب سے ان کی مزاح نگاری کی عمر ۱۶ سال ہوئی۔ نگاری خواہ کسی نوع کی ہو یعنی افسانہ ری ہو یا تنقید نگاری، کالم نگاری ہو یا مزاح نگاری، اسے اسی عمر کو پہنچ کر اپنی پوری چھب دکھانی چاہیے پ سنگھ یوں چھپ چھپ کر سامنے آتے رہے ہیں (چھپ چھپ کر کو اگر آپ چھپ چھپ کر بھی پڑھ لیں معنی نہیں بدلتے) لیکن اس کتاب کے میں ان کی مزاح نگاری اپنے پورے سراپا کے ساتھ نظروں

کے سامنے آتی ہے۔ یہ غسلِ آفتابی ہے۔

دلیپ سنگھ بہت رحم دل آدمی ہیں۔ اپنی تحریر میں کوئی مشکل لفظ استعمال نہیں کرتے۔ یہ بڑا
جسے ہم گرُ بھی نہ سمجھ سکتے ہیں۔ کیسے ان کے ہاتھ لگ گئی کہ ان کے قاری اور ان کے سامع انھیں اپنا دو
شریک بھائی سمجھتے ہیں۔ یہی قربت ان کے مضامین میں لذت پیدا کرتی ہے۔ وہ بہت ہی سیدھے ساد
موضوعات پر لکھتے ہیں۔ لیکن موزوں کو موزونیت بلکہ اہمیت کے درجے تک پہنچا دیتے ہیں۔ (معلوم نہ
یہ بات انھوں نے محسوس کی ہے یا نہیں۔ نہیں کی تو اب کرلیں)۔ میں نے جب بھی ان کا کوئی مضمون پڑ
یا ان سے سنا یہی محسوس کیا کہ میں ان سے گلے مل رہا ہوں۔ یہ آشنائی یا لگاؤ (INTIMACY) سرِشتہ الاخ
ظرافت کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ صحت کے لیے تازہ ہوا۔ ان کے مزاح میں "شعلگی" نہیں
گی کیونکہ وہ شعلہ نوا مزاح نگار نہیں، ادیب رنگین بیاں ہیں۔ اسی رنگینی میں وہ طنز بھی شامل کرتے ہیں
کچھ کے نہیں لگاتے لیکن اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ اسے چابک دستی کہہ لیجیے یا آرام دہ سرجری۔ ایک
دیکھیے "جب میں یونی ورسٹی میں پڑھتا تھا۔ تو میرا ایک ہم جماعت جلوسوں میں اس شدت سے حصہ
لیے چارہ بی۔ اے میں لگاتار کئی سال فیل ہوتا رہا۔ لیکن سیاست کا گہرا تجربہ ہو جانے کی وجہ سے بعد
وزارت کے عہدے تک جا پہنچا۔ اور اسے محکمۂ تعلیم کا انچارج بنا دیا گیا۔ آپ ہی بتائیے تعلیم میں سدھا
لانے کے لیے اس سے بہتر کون ہو سکتا ہے جس نے ہم سے کئی زیادہ سال یونیورسٹی کے اردگرد
چکر لگانے میں گزار دیے۔ قاری کو محسوس بھی نہیں ہوا اس بیان میں طنز بطور امزاح موجود ہے دلیپ سنگھ
اپنے ہر مضمون میں اسی طرح معصوم بنے رہتے ہیں۔ بھولے بھالے جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔ کسی ایک
کتاب پر تبصرہ لکھنے کی داستان میں اپنی مدح گوئی کی تائید میں بیان دیتے ہیں تب بھی اتنی معصومیت
سے کہ سننے والے کو ان پر رحم آتا ہے۔ وہ اپنے تبصرے کے ہر جملے کی وضاحت کرتے ہیں۔ تو اتنا
سادگی سے کہ ان کا مکتوب الیہ ان کا خط پاکر شرمندہ ہو جاتا ہے کہ ہائے اتنی کھلی اور واضح بات پہلے
اس کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔

دلیپ سنگھ کو میں نے مضمون لکھتے وقت تو نہیں دیکھا لیکن پڑھتے وقت ضرور سنا اور دیکھا ہے
سامعین ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ یہ مزاح کا ایک نہایت خوش گوار ماحول پیدا کرتے ہیں۔ سامعین کے
چہرے گلاب کی طرح کھلے رہتے ہیں۔ ان کے مزاح کا افسانوی اور تھوڑا تھوڑا ڈرامائی انداز لطف و انبسا
کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ نثری تبصروں میں اگر شاعری کی اجازت ہوتی تو میں کہتا کہ ان کی ظریفانہ تحریر گل مہ
کے اس درخت کی طرح ہے جو سرخ پھولوں سے لدا ہوا ہو اور ایسا معلوم ہو رہا ہو کہ درخت کے پتے
بھی پھول بن گئے ہیں۔

دلیپ سنگھ نے ظرافت نگاری کی دوڑ میں اپنی دلداری ہی کا نہیں دم داری کا بھی ثبوت د
ہے۔ مزاح کو سبک اور شیریں بنانا فن کاری ہے۔ اور اس لحاظ سے دلیپ سنگھ ایک کامیاب فن کار ہیں
اختصار کو ظرافت کی روح کہا گیا ہے۔ اور دلیپ سنگھ اس روح کے سیکیوریٹی گارڈ ہیں۔ ویسے لائف گار
نہیں جو سمندر کے کنارے اس انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ کوئی ڈوبے اور وہ دوڑیں ڈوبنے والے
صنف کا البتہ وہ خاص خیال رکھتے ہیں۔) لائف گارڈ ہمیشہ سوئمنگ سوٹ میں عریاں رہتے ہیں لیکن ظرا

کے سیکیوریٹی گارڈ کے لیے "عریانی" منع ہے۔ اور شکر ہے کہ دیپ سنگھ اس معاملے میں محتاط ہیں وہ ستر پوشی کے نہیں پوری طرح ملبوس ہونے کے قائل ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا دامن صاف رکھا جب کہ بلند آہنگ مزاح مقبول ہوتا جارہا ہے۔ وہ ذہانت اور ذہنیت کا فرق جانتے ہیں۔ ان کا مجموعہ ان کے ادبی سرمایے کا پورا اور مکمل گوشوارہ نہیں ہے۔ اسے درمیانی مدت کا حساب کتاب سمجھیے تو بجائے خود ایک خود تشقی اور نفع آشنا دھندے کا پیش خیمہ ہے۔ دھندے کا لفظ میں نے اپنے عزیز محترم وارث علوی کی تقلید میں لکھا ہے وہ اس قسم کے الفاظ استعمال کرنے کو معیوب نہیں، مستحسن سمجھتے ہیں۔

حیدرآباد میں اچھے کاغذ کی قلت ہے۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ اس کتاب سے اندازہ ہوا۔ قیمت بھی تو صرف ۲۰ روپے ہے۔ اور آج کل ۲۰ روپے کی قیمت کیا ہے۔ اس قیمت میں تو چار گرہ کپڑا بھی نہیں ملتا کہ عاشق کا گریباں ہی تیار ہو سکے۔ دیپ سنگھ سستے بک گئے۔ میں نے کہا نا کہ وہ رحم دل ادیب ہیں۔ دل آزاری تو دور رہی وہ دل شکنی کے بھی قائل نہیں۔ کتاب پڑھنے کے بعد آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ تبصرہ کتنا کمزور ہے۔

الف (شعری مجموعہ)

شاعر: یعقوب یاور کوٹی
قیمت: ۲۵ روپے
مبصر: محمد نعمان نمال

الف نوجوان شاعر یعقوب یاور کوٹی کا پہلا شعری مجموعہ ہے لیکن ادبی حلقوں میں ان کا نام نیا یا اجنبی نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی نظمیں، غزلیں، تنقیدی مضامین اور افسانے مختلف ادبی رسائل میں شایع ہوتے رہے ہیں اور ۷ انگریزی ناولوں کے اردو تراجم بھی کتابی صورت میں شایع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ کلام میں ۷۰ غزلیں، دو ترائیلے ایک معرّیٰ نظم اور ۱۱ نظمیں شامل ہیں جن کے مطالعے سے نوجوان شاعر کے ان تجربات، مشاہدات اور احساسات کا علم ہوتا ہے جو اسے زندگی کی آسودگیوں، تلخیوں اور محرومیوں سے حاصل ہوئے ہیں۔ حالات کی سخت گیریوں کے سبب کلام میں غم و غصہ اور جھنجھلاہٹ کا عنصر غالب نظر آتا ہے اور شاعر کا لہجہ قدرے تلخ و تند اور تیکھا ہو گیا ہے۔ مذکورہ عناصر کے سبب شاعر کے یہاں تفکر کے بجائے جذبات کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے۔ مثلاً

درد کا وارث تھا میں، تیری وراثت بھی یہی
اے مرے بیٹے، حیات جاوداں یوں ہی سہی

خوابوں میں جھومتی ہوئی جنت کو کیا کروں
زخموں کی سرکشی سے طبیعت بحال ہے

مشغلوں کی بھیڑ نے انسانوں کو تنہا کر دیا
ارتقا نے زندگی کا زخم گہرا کر دیا

دھوپ اب میرے لیے نا قابل تسخیر ہے
چھین لوں سایہ ترا جائے اماں یوں ہی سہی

زندگی کی ناہمواریوں اور تضادات نے شاعر کے لہجہ کو تلخ و تند ضرور بنا دیا ہے لیکن اس کے ہاں مایوسی اور نا امیدی کا گذر نہیں بلکہ حالات سے نبرد آزما ہونے ان کے خلاف احتجاج کرنے اور پھر انھیں گوارا بنانے کی سعیِ پیہم بھی کارفرما نظر آتی ہے ملاحظہ کیجیے چند اشعار ؎

بادبانوں پہ انحصار بھی ہے اور سمندر بھی پار کرتا ہوں
ایک طرف سے دشمن ساری دنیا ہے پھر بھی ہم کو اس دنیا میں رہنا ہے
ممکنات کا حصول مقصد حیات ہے ڈھونڈ لوں گا آنسوؤں میں چند مسکراہٹ
خوں مری بھی رگوں میں ہے یاؔور یہ الگ انکسار کرتا ہوں

یعقوب یاؔور نے روایت کی پاسداری کے باوجود نئے مضامین کو اپنی شاعری کا میابی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے مثلاً

جون جیسے سلگتے بدن چپ رہے خواہش بے زباں جنوری ہو گئی
اپنے اندر کے میں سے خائف ہوں یہ بھی چنگیز خاں ہے پیارے
فردا کی فکر ننھے دماغوں کو ڈس گئی بچے ہمارے گھر کے شرارت نہ کر سکے

حالات کی نامساعدت کے سبب یعقوب یاؔور کے کلام میں طنز و نشتریت کا نمایاں ہے اور اس ضمن میں انھوں نے اپنے پیش رو شعراء، یگانہ، شاد عارفی، مظفر حنفی کا اثر خاصا قبول کیا ہے۔ غزل جیسی نازک اور لطیف صنف سخن میں کھرد لب و لہجہ میں اظہار خیال کرنا نہایت دشوار عمل ہے۔ لیکن یعقوب یاور نے اکثر آسان کر دکھایا ہے، مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

چال کچھوے کی ہے لیکن ہر ارادہ عرش پر ہے

وہ خوش فہمی جو راہیں کاٹتی ہے مرے اندر بھی در آئی، مبارک

میں دم بخود کہ مرے اردگرد قحط خلوص انھیں یہ غم مرے دستِ طلب کھلے ہی نہیں

یا الٰہی خیر ہو یہ مرحلہ دشوار ہے نا قدروں کے ہاتھ میں یعقوب یاور آگیا

زیر نظر مجموعہ کلام میں غزلوں کے انتخاب کے علاوہ وہ نظمیں بھی شامل ہیں جن میں "تنہائی"، "اردو"، "آج کی شکنتلا" اور "میرا گھر" اچھی اور کامیاب نظمیں ہیں۔ غزلوں کے بیشتر اشعار شاعر کے احساس و فکر کی تازگی اور ندرت کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن اس ضمن میں جدت طرازی کی خاطر بعض ایسی تراکیب اور الفاظ بھی استعمال ہو گئے ہیں جن کے سبب

کلام میں شعریت یا تغزل مجروح ہوتا نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں بھی کھٹکتی ہیں۔ لیکن کیوں کہ یہ شاعر کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ اس لیے مذکورہ خامیوں کا در آنا کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے۔ یعقوب یاور کوئی نوجوان شاعر ہیں اور مستقبل میں ان سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

حرف نیم کش

مصنف: عظیم اختر
قیمت: ۴۵ روپے
مبصر: عرفان صدیقی
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دلی ۲۵

حرف نیم کش عظیم اختر کے اٹھارہ طنزیہ اور مزاحیہ انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے ادبی دنیا خصوصاً اردو کی ادبی دنیا کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں پر بقول شخصے ایک ترچھی نظر ڈالی ہے اور جہاں یہ نظر نشانے پر پڑی ہے، دل میں ترازو ہوگئی ہے۔ ان کا حرف نیم کش اپنے شکار کے دل میں پیوست ہوکر اذیت بھی دیتا ہے اور لطف بھی اور اکثر ایک ہی تاثر میں یہ دونوں کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔

عظیم اختر گزشتہ تقریباً دس برس سے باقاعدگی کے ساتھ خاکے اور انشائیے لکھ رہے ہیں۔ اور ان کی تحریریں متعدد رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ انھوں نے اپنے اس مجموعے کے انشائیوں میں جن کرداروں اور اداروں کو اپنا نشانہ بنایا ہے ان سے ہم سب بخوبی واقف ہیں۔ ان میں ازکار رفتہ محققین اور ماہرین بھی ہیں اور سرِ فن استاد اور سخن طراز نقاد بھی۔ پیشہ ور تبصرہ نگار بھی ہیں اور ناقابل اصلاح سیمینار باز بھی۔ عادی مراسلہ نگار بھی ہیں اور شاطر اعزاز شکار بھی۔ وظیفہ طلب شاعر بھی ہیں اور لطیفہ ساز ناظمین مشاعرہ بھی۔ اردو کے خود ساختہ مجاہد بھی ہیں اور اکیڈیمیوں کے برخود غلط اراکین بھی۔ غرض ایک مجمع ہے خاصے مشتبہ کرداروں کا اور عظیم اختر ان سب کی منافقتوں، کرتب بازیوں، مفاد پرستیوں، خوش فہمیوں اور غلط اندیشیوں کو اپنے انشائیوں میں آئینہ دکھا رہے ہیں۔ اب یہ چہرے ان آئینوں میں اگر مضحکہ خیز بلکہ اکثر ترحم انگیز نظر آتے ہیں تو آئینے کا قصور نہیں۔ چہرے ہی کچھ ایسے ہیں۔ عظیم اختر کا ہنر یہ ہے کہ ان چہروں کے مقابل یہ آئینے انھوں نے صحیح زاویے سے رکھے ہیں۔

عظیم اختر کے انشائیوں کا امتیازی وصف ان کے طنز کی کاٹ اور انداز بیان کی خوبی ہے۔ زبان پر قدرت ان کی بڑی طاقت ہے اور ان کا بے تکلف اور توانا لہجہ، ان کے جملوں کی برجستگی اور الفاظ اور ترکیبوں کا برمحل اور معنی خیز استعمال ان کی تحریر کی امتیازی خوبیاں ہیں۔ ان کی قوت مشاہدہ نے ان کے انشائیوں کو خوبصورت اور دلچسپ بنایا ہے۔ طنز کے مقابلہ میں اگرچہ مزاح کا عنصر ان انشائیوں میں کم ہے۔ پھر بھی ان کے بیان کی شوخی اور شگفتگی نے ان کے طنز کی جارحیت اور تلخی کو خاصا معتدل کردیا

ہے۔ عظیم اختر کا طنز پیچیدہ نہیں براہ راست ہے اور غالباً اسی وجہ سے کہیں کہیں جہاں
انداز بیان پر ان کی گرفت کچھ کمزور ہوئی ہے، وار کی گہرائی بھی کم ہو گئی ہے۔

عظیم اختر طنز نگاروں کے اس قافلے میں شامل ہیں جس کے میر کارواں، نثر میں
کنہیا لال کپور اور شاعری میں شاد عارفی تھے۔ ان کی تحریروں کی جسارت اور طنز
دھار کی تہہ میں ان کے جذبوں کا خلوص کار فرما ہے۔ وہ ریاکاریوں کو سچائی کے ساتھ
بے نقاب کرتے ہیں لیکن ان کے انشائیے بد طینتی کی آمیزش اور برتری و پاکبازی کے پندار
سے پاک ہیں۔ بقول سلیم احمد ؎

اے حرفِ اعتبار میں سچ بولتا رہوں
بچوں کی طرح نازِ صداقت کیے بغیر

اس سچ کے اظہار میں اور وہ بھی شوخی کے ساتھ سچ کے اظہار میں خوفِ فسادِ خلق بھی ر
ہے لیکن ہر طنز نگار کو اتنا رسک تو لینا ہی چاہیے۔

اس مجموعے کے جو انشائیے عظیم اختر کے اندازِ تحریر کی بھرپور اور موثر نمائندگی ک
ہیں۔ ان میں کرنا نظامت مشاعروں کی، منکا ماہر غالبیات، ہم نقاد کیسے بنے، سمینا
اور ہم، ہدایت نامہ شعرائے کرام، استاد محترم، اور عزت اسے ملی شامل ہیں۔

آخر میں ایک اعتراف، حرف نیم کش، پر یہ تبصرہ لکھنے سے پہلے ناچیز نے احتیاطاً
کا مضمون، منکا تبصرہ نگار، پڑھا تھا۔ اب خیال آتا ہے اگر میں نے بھی ان کے ممدو
تبصرہ نگار کی طرح صاحب کتاب کے مشورہ سے یہ تبصرہ لکھا ہوتا تو بہتر ہوتا

مجموعے کا گٹ اپ دیدہ زیب ہے۔ اب مکتبہ روپی دہلی سے شائع کیا ہے اور ا
روپیا قیمت بہت مناسب ہے ویسے ان خوبیوں کے بغیر بھی یہ کتاب قابل مطالعہ ہی ہ

مطبوعات ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

ادب وتنقید

تاریخ ادب اُردو جلد اول جمیل جالبی ۱۵۰/-
〃 〃 جلد دوم (دو حصوں پر مشتمل) 〃 ۲۰۰/-
ارسطو سے ایلیٹ تک (اضافہ شدہ ایڈیشن) 〃 زیر طبع
محمد تقی میر 〃 〃 ۶۰/-
ایلیٹ کے مضامین 〃 ۷۵/-
مثنوی کدم راؤ پدم راؤ 〃 ۷۵/-
ادب کلچر اور مسائل 〃 ۸۰/-
نئی تنقید 〃 ۸۰/-
تنقید اور تجربہ 〃 ۱۰۰/-
امیر خسرو کا ہندوی کلام
مع نسخہ برلن ذخیرۂ اشپرنگر گوپی چند نارنگ ۷۵/-
ادبی تنقید اور اسلوبیات 〃 ۱۲۰/-
انیس شناسی 〃 ۵۰/-
اقبال کا فن 〃 ۷۵/-
اسلوبیات میر 〃 ۳۵/-
سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ 〃 ۳۵/-
اردو افسانہ روایت اور مسائل (نیا ایڈیشن) 〃 زیر طبع
اقبال سب کے لیے فرمان فتحپوری ۱۰۰/-
شعر و حکمت دور دوم کتاب ۱ مغنی تبسم و شہریار ۱۰۰/-
شعر و حکمت دور دوم کتاب ۲ 〃 〃 ۱۵۰/-

ارمغانِ فاروقی ظہیر احمد صدیقی
ابتدائی کلام اقبال پروفیسر گیان چند جین
کھوج 〃 〃
پرکھ اور پہچان 〃 〃
ترقی پسند ادب
پچاس سال سفر قمر رئیس و عاشور کاظمی
ترقی پسند تحریک کی نصف صدی علی سردار جعفری
انتخاب دواوین
(مولوی امام بخش صہبائی) مرتبہ تنویر احمد علوی
برطانیہ کی سیاسی جماعتیں
اور پارلیمنٹ حبیب حیدرآبادی
رہ و رسم آشنائی 〃
تناظر اور تجزیے ابو الکلام قاسمی
علامہ اقبال کی
ازدواجی زندگی حافظ سید حامد جلالی

اسلامیات

ہندو پاک میں اسلامی جدیدیت عزیز احمد جمیل جالبی
ہندو پاک میں اسلامی کلچر 〃 〃
رہبر کامل صلی اللہ علیہ وسلم عبد الاحد خاں
غالب اور تصوف سید محمد مصطفی صابری
آسان لغات القرآن مولانا عبد الکریم پاریکھ

دبی اور تہذیبی خبریں

وشی بول اٹھی ہے کی رسم اجرا

اردو رائٹرز گلڈ کے زیر اہتمام ۔بمبئی، فروری ۱۹ بمقام انجمن اسلام، وی ٹی بمبئی کے نئی نسل کے اہم و معروف شاعر عبدالاحد ساز کے اولین شعری مجموعے "خموشی بول اٹھی ہے" کی اجرائی نشست، بصدارت جناب علی سردار جعفری منعقد ہوئی۔ اس نشست، بمبئی کے مشاہیر ادبا و شعرا کی شرکت کے باعث ایک یادگار نشست ثابت ہوئی جناب سردار جعفری نے اپنی صدارتی تقریر میں یہ تاریخی جملہ کہا کہ میں مسلسل ایک مہینے سے مقالہ لکھنے کی غرض سے ایران کے مشہور شاعر فردوسی کو پڑھ رہا تھا۔ اس درمیان میں عبدالاحد ساز کی کتاب پڑھ لیتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے ساز کی شاعری ناگوار نہیں گزری۔ یہ بات بجائے خود ان کی شاعری کی ایک بہت بڑی تحسین ہے۔ ممتاز شاعر عروج سلطان پوری نے اس بات پر توجہ دلوائی کہ ساز کی شاعری میں روایت سے انحراف نہیں ہے بلکہ روایت کے احترام کے ساتھ ایک اختلاف ہے جو ایک احسن طریقہ ہے۔ جناب عزیز قیسی نے فرمایا کہ ساز کو پیرایۂ بیان اور فن پر تو خاصی قدرت ہے مگر خیال کے معاملے میں کہیں کنفیوژن ہے مشہور مزاح نگار یوسف ناظم نے اپنے منفرد انداز میں لکھا ہوا مضمون، سکوت شکن شاعر" سنایا۔ پروفیسر الیاس شوقی اور آل انڈیا ریڈیو بمبئی کے اردو، پروگرام جاوید ناصر نے اپنے مضامین میں عبدالاحد ساز کے تخلیقی رویے بحث کی۔ مدیر شاعر، افتخار امام صدیقی نے ساز کے کلام کی ہند و پاک کے مقتدر رسائل میں اشاعت پر گفتگو کی۔

کتاب کا اجرا اردو کے بزرگ مقدس اور محقق جالب مظاہری صاحب کے دست مبارک سے ہوا۔ اس باوقار نشست میں جناب حسن کمال محمود ایوبی (ایڈیٹر اردو بلٹز) اور ڈاکٹر عبدالستار دلوی بطور مہمان خصوصی شریک رہے۔ نظامت کے فرائض جواں سال شاعر نظام الدین نظام نے انجام دیے۔ جب کہ نوجوان شاعر قاسم امام اور جاوید ندیم نے انتظامیہ کی ذمہ داری نبھائی۔

جوگندر پال اور کیفی اعظمی کو غالب ایوارڈ

نئی دلی۔ ۱۲ر فروری، غالب انسٹی ٹیوٹ کی غالب ایوارڈ سب کمیٹی کی میٹنگ میں جوگندر پال کو اردو نثر کے لیے مودی غالب ایوارڈ کیفی اعظمی کو اردو شاعری کا مودی ایوارڈ، شبیر احمد خان غوری کو تنقید و تحقیق کا فخرالدین علی احمد غالب ایوارڈ، سید محمد مہدی کو اردو ڈرامہ کا "ہم سب" غالب ایوارڈ رام پرکاش ساحر ہوشیار پوری کو ادبی خدمات کا اسپیشل غالب ایوارڈ "دین دنیا" کے مدیر شوکت فہمی کو اردو صحافت کا بیدی سحر غالب ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔

راج بہادر گوڑ اور سراج انور کو اردو اکادمی ایوارڈ

نئی دہلی ۱۱ مارچ سرکردہ اردو ادیب اور نقاد

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کرنے پر ۱۹۹۰ کا دہلی اردو اکادمی کا آل انڈیا بہادر شاہ ظفر ایوارڈ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر گوڑ کو دیا جانے والا اردو اکادمی کا یہ سب سے بڑا ایوارڈ ۲۵ ہزار روپے نقد ایک شال اور توصیف نامہ پر مشتمل ہوگا۔

دیگر ایوارڈ یافتگان میں مرحوم سراج انور بھی شامل ہیں۔ سراج انور کا گزشتہ ہفتہ انتقال ہوا تھا اس کے علاوہ تحقیق و تنقید کا ایوارڈ ممتاز نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو۔ شاعری کا ایوارڈ کرشن موہن کو اردو میڈیم اسکولوں میں بہترین استاد کا ایوارڈ مسز مسودہ حیات کو اور صحافت کا ایوارڈ مسز راما پرتاپ کے مسٹر پروانہ ردولوی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

مولانا حسرت موہانی پر سیمینار

مورخہ ۳ مارچ ۱۹۹۱ کو مالیگاؤں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک شاندار سیمینار اور کل ہند مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا ہے۔ سیمینار کی صدارت جناب قاضی سلیم صاحب نے کی جب کہ حسرت موہانی کی شخصیت پر ہارون فراز، حسرت موہانی اور جہاد آزادی پر جناب سرینواس لاہوٹی اور مجید سرور، جناب محمد حسن فاروقی صاحب نے حسرت کی صحافت، جناب یوسف ناظم صاحب نے حسرت کی شخصیت اور جناب عزیز قیسی صاحب نے حسرت کی شاعری پر اپنے پر مغز مقالات پیش کیے۔

شب میں ۹ بجے عظیم الشان مشاعرہ ہوا جس کی صدارت عزیز قیسی صاحب نے فرمائی۔

کشمیری لال ذاکر کو پاکستانی ایوارڈ

فرید آباد ۲۱ مارچ بین اقوامی سطح پر اردو میں تخلیقی ادب کے لیے پاکستان کی نقوش ایوارڈ کمیٹی نے سال ۱۹۸۹ کا نقوش ایوارڈ ممتاز ناول نگار شاعر اور افسانہ نگار کشمیری لال ذاکر کو دیا ہے۔ یہ ایوارڈ انھیں ان کے افسانے دوسرا مرد کے لیے دیا گیا ہے۔

جلگاؤں میں تفہیم اقبال کا

دو روزہ کامیاب پروگرام

جلگاؤں: بزم فروغ ادب راشٹریہ کاسا پبلک لائبریری جلگاؤں کے زیر اہتمام پہلی بار ۱۴ اور ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ کو تفہیم اقبال کا دو روزہ پروگرام نیشنل ملٹی پرپز ہال میں منعقد ہوا۔ بشیر اے ابا جناب اختر الزماں ناصر صاحب نے پہلے دن علامہ اقبال کی شہرۂ آفاق اور ولولہ انگیز نظمیں شکوہ اور جواب شکوہ تاریخی پس منظر کے ساتھ نہایت دل نشیں اور موثر انداز میں تفہیم و تشریح کی۔ اس سے قبل پروفیسر اکبر رحمانی نے ان نظموں کے بارے میں تعارفی تقریر کی۔ اس جلسہ کی صدارت اینگلو اردو جونیئر کالج کے پرنسپل محمد فاروق اعظمی نے فرمائی۔

دوسرے دن اقبال کا پیغام جوانان ملت کے نام، کے موضوع پر جناب اختر الزماں ناصر صاحب نے نہایت فکر انگیز تقریر کی۔ علامہ کے اردو بعض فارسی کلام کے حوالوں سے محفل کو گرما دیا اس جلسہ کی صدارت نوجوان رہنما جناب عبدالکریم سالار (چیئرمین میونسپل اسکول بورڈ) نے کی۔ بزم فروغ ادب کے سکریٹری عبدالناف نے بزم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور جلسہ کی نظامت کی۔ بزم کے صدر جناب اکبر شاہین نے مہمانوں کی گلپوشی فرمائی۔

زل احمد کے افسانوی مجموعہ "بگولے" کی رسم اجرا،

پٹنہ: نوجوان افسانہ نگار شموئل احمد کے
انوی مجموعہ" بگولے "کے اجرا کے سلسلے میں
روری ۱۹۹۱ کو مقامی گورنمنٹ اردو لائبریری میں
یت ادبی شان سے ایک تقریب منعقد ہوئی جس
تمام ادارہ "ہم عصر" بہار (پٹنہ) نے کیا۔ جلسہ
دارت ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ "دو گز زمین"
صنف افسانہ نگار، ناول نگار ڈاکٹر عبدالصمد نے
بائی۔ جبکہ کتاب کی رونمائی کی رسم اجرا، ڈاکٹر
جاوید نے انجام دی۔ پروفیسر وہاب اشرفی
ر پروفیسر علیم اللہ حالی اس جلسے کے مہمان خصوصی

اہل مکتبہ جامعہ کو صدمہ

مکتبہ کے پرانے کارکن "پیام تعلیم" اور
تاب نما" کے مینیجر جناب لطیف حسین صاحب کا
تصر علالت کے بعد ۱۲ اور ۱۳ مارچ کے
رمیانی شب میں (۲ بجے) انتقال ہو گیا۔ موصوف
ایت دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ پسماندگان
ں بیوہ اور ایک لڑکی ہے۔ ادارہ کتاب نما
روم کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

روفیسر نذیر احمد غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری مقرر

یہ خبر نہایت مسرت کے ساتھ سنی جائے گی کہ علوم
شرقی اور خصوصاً اردو، فارسی اور عربی ادبیات کے
الم اور بین الاقوامی شہرت کے مالک پروفیسر نذیر احمد
۱۰ مارچ ۹۱ء کی بورڈ آف ٹرسٹی کی میٹنگ میں غالب
سٹی ٹیوٹ نئی دلی کا سکریٹری مقرر کیا ہے میٹنگ
س یونس سلیم صاحب (سابق گورنر بہار و سکریٹری غالب
نسٹی ٹیوٹ) اور محمد شفیع قریشی صاحب بھی موجود
تھے۔ یہ جگہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری کی جگہ
محمد شفیع قریشی صاحب کے گورنر مقرر ہونے پر خالی
ہوئی تھی۔

پروفیسر نذیر احمد جنوری ۱۹۱۵ء میں ضلع
گونڈہ (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں ایم اے
(فارسی) میں کیا۔ ۱۹۴۵ء میں پی ایچ ڈی اور ۱۹۵۰ء
میں ڈی لٹ (فارسی) اور ۱۹۵۷ء میں ڈی لٹ (اردو)
کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایک سال تہران میں رہے
جہاں جدید فارسی زبان پر عبور حاصل کیا۔ وہ اب
تک مختلف ملکوں سے انعامات اور طلائی تمغے حاصل
کیے ہیں اور انھیں متعدد اعزازات سے نوازا
گیا ہے۔

نذیر احمد صاحب کی علمی خدمات کا دور لکھنؤ
سے شروع ہوا جہاں وہ بحیثیت لکچرر فارسی رہے۔
اس کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروجیکٹ
میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے پر مقرر ہوئے۔
اس کے بعد وہ شعبہ فارسی میں ریڈر اور ۱۹۶۰ء میں
صدر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں ڈین فیکلٹی آف آرٹس بنائے گئے۔

آپ کئی مرتبہ ہندوستان سے باہر بین الاقوامی
کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کے لیے تشریف
لے گئے اور وہاں سیمیناروں کی صدارت فرمائی۔ آپ بہت
سی ملکی اور غیر ملکی ادبی و علمی انجمنوں سے وابستہ ہیں۔
آپ کافی عرصے سے غالب انسٹی ٹیوٹ کی گراں قدر
خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت بھی آپ اس
کے ٹرسٹی، مجلس عاملہ، پبلیکیشن کمیٹی، انعامی کمیٹی،
لائبریری کمیٹی اور سیمینار کمیٹی کے اہم رکن ہیں۔ دو سو
سے زائد تحقیقی و تنقیدی مضامین اور کئی کتابوں کے
مصنف ہیں۔ ابھی حال میں ترقی اردو بورڈ نئی دلی
سے ان کی کتاب "علمائے بلخ" شائع کی ہے
ادارہ کتاب نما آپ کے سکریٹری مقرر ہونے پر دلی
مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ہم غم میں شریک ہیں

حسن نعیم کا انتقال

نئی دہلی . ۲۳ فروری . اردو غزل کے ممتاز و منفرد شاعر حسن نعیم کا کل رات بمبئی میں انتقال ہوگیا. وہ ۶۲ برس کے تھے اور گزشتہ چند برسوں سے بمبئی میں رہ رہے تھے۔

حسن نعیم کا جنم ۱۹۲۸ میں پٹنہ میں ہوا تھا. اور ۱۹۵۰ سے لگاتار شعر گوئی میں سرگرم تھے ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ دلّی میں گزرا. ہندستانی خارجہ سروس میں وہ مختلف عہدوں پر رہے اور اس دوران کئی ملکوں کا دورہ بھی کیا. ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ "اشعار" کے نام سے ۱۹۷۶ میں شائع ہوچکا ہے. پسماندگان میں بیوہ، دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں. ایک بیٹی شہیرہ انگریزی کی صحافی ہے۔

حسن نعیم غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر بھی رہے. وہ ایک بہترین غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت شریف، انسان دوست اور خود دار انسان تھے۔

ایک دیا اور بجھا

اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، ناول نگار اور افسانہ نگار جناب سراج انور کا دل کا دورہ پڑنے سے ۴ مارچ ۱۹۹۱ کو دہلی میں انتقال ہوگیا. مرحوم ۶۵ سال کے تھے. انھوں نے بچوں کے لیے ایک درجن سے زائد اردو ناول، سائنس فکشنس اور افسانے لکھے

جناب سراج انور کے افسانے اور ناول "بیسویں صدی" اور دیگر ممتاز رسائل و جرائد میں پابندی سے شائع ہوتے تھے. وہ نئی دہلی میں ایک فلمی / اخباری نقاد کی حیثیت سے مختلف بین فلمی میلوں میں سرگرم حصہ لیتے تھے. وہ فوٹوگرافر بھی تھے اور پرانی دہلی میں ایشیا فوٹو اسٹوڈ[illegible] وابستہ رہے۔

ادارہ "کتاب نما" مرحوم کے لیے اور پسما[ندگان کے لیے] دعائے مغفرت کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔

ڈاکٹر احمد حسین قریشی کا انتقال

احمد آباد. ۴ فروری بروز پیر شام ۵۔۴۵ [illegible] احمد حسین صاحب قریشی کا انتقال ہوگیا. انا للہ [illegible] مرحوم گجرات یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدارت سے سبکدوش ہونے کے بعد گزشتہ کئی سالوں سے گجری زبان کے مشہور مخطوطے جواہر اسرار اللہ مصنف شاہ علی جیوگام دھنی کے متن کی ترتیب میں مصروف تھے. موصوف کو فارسی زبان و ادب کی تدریس کے سلسلے میں صدر جمہوریہ ہند کا ایوارڈ بھی ملا تھا. گجرات اردو اکادمی کے زیر اہتمام مرتبہ اردو و گجراتی لغات پراجکٹ کی نگرانی اور گجرات اردو اکامی کے سالانہ تحقیقی و ادبی مجلہ شاہر نامہ کی ادارت جیسے اہم علمی و ادبی کاموں میں تادمِ آخر آپ دلچسپی لیتے رہے۔

یادگار نشست

مورخہ یکم جنوری ۱۹۹۱ کو نئے سال کی آمد پر اردو گھر مالیگاؤں کی جانب سے الحفاظ الحاج غلام رسول حسن رتم صاحب کی یاد میں اور عبدالسلام اظہر کی دوسری برسی پر ایک تعزیتی نشست اور یادگار مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا.

صدارت حاجی عبدالحمید صاحب نے کی پروگرام کی نظامت ڈاکٹر انیس بوستانی صاحب نے انجام دی. مشاعرہ کا آغاز صدر[illegible] حاجی عبدالحمید صاحب کی نعت پاک سے ہوا.

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

مئی ۱۹۹۱ء جلد ۳۱ شمارہ ۵

اس شمارے میں

فی پرچہ 5/=

سالانہ 45/=

غیر ممالک سے

(بذریعہ بحری ڈاک) 110/=

(بذریعہ ہوائی ڈاک) 230/=

سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 65/=

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

TELEPHONE. 610191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا

نئی مطبوعات

انشائیہ کے خط و خال (مضامین) وزیر آغا -/۳۵
آخری صلیب (شعری مجموعہ) شان بھارتی -/۲۴
خمیازہ (طنز و مزاح) محمد رفیع انصاری -/۲۵
لمحہ لمحہ پیاس (شعری مجموعہ) کیلاش ماہر -/۵۰
نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی (افسانے) ساجد رشید -/۴۰
صدائے بازگشت (انگریزی نظموں کے ترجمے)
دھرم سروپ -/۱۲۰
رنگوں کا امتزاج (تذکرہ) سیفی سرونجی -/۲۵
دخل در معقولات (طنز و مزاح) مجید جمال -/۵۰
خواب رو (ناول) جوگیندر پال -/۴۰
قند زقند (طنز و مزاح) فیاض احمد فیضی
پرواز سخن (شعری مجموعہ) ناشاد اورنگ آبادی -/۳۰
بنگال میں غالب شناسی (تحقیق) ڈاکٹر کلیم سہسرامی -/۴۰
فن ہمارا (شعری مجموعہ) محسن رضا رضوی -/۲۵
حدیث نبوی کے اردو تراجم محمد عاصم اعظمی -/۳۵
لہو لہو سائے (شعری مجموعہ) اختر عبدالرشید -/۳۰
حرف نم دیدہ (شعری مجموعہ) ڈاکٹر محمد علی اثر -/۴۰
دوسرا کنارا (ڈرامے) غلام جیلانی -/۴۵
موسم (شعری مجموعہ) ساحل احمد -/۵۰
بولو مت چپ رہو (ناول) حسین الحق -/۴۰
متحرک منظر کے فریم (افسانے) معین الدین عثمانی -/۲۶
قومی کتابیات (۱۹۸۶-۱۹۸۷) قدیر اقبال احمد
آنکھوں کا شہتیر (طنز و مزاح) رفیع الدین احمد -/۱۰
خانہ ہزار دشت (شاعری) حرفی -/۵۰
اردو زبان و قواعد (گرامر) شفیع احمد صدیقی -/۱۰
انتخاب برج نرائن چکبست (شاعری)
ترتیب کشور آرا -/۷

انتخاب سلام مچھلی شہری (شاعری) ترتیب عرفان عباسی -/۷
" شیخ محمد ابراہیم ذوق " " تنویر احمد علوی -/۹
" ذکی کاکوروی " " ذکی کاکوروی -/۷
" انعام اللہ خاں یقین " " ابوالکلام قاسمی -/۹
" سفر نا تمام " " وامق جونپوری -/۷
" ہم قبیلہ علی جواد زیدی -/۷
مرزا عظیم بیگ چغتائی (سوانح) ڈاکٹر ہارون ایوب -/۱۳
اسلامی تہذیب و تمدن (تہذیب اسلامی)
عماد الحسن آزاد فاروقی -/۴
موزوں ٹکنالوجی ڈائرکٹری ایم۔ ایم ہدیٰ -/۶
فرہنگ اصطلاحات تاریخ و سیاسیات
ترتیب ترقی اردو بورڈ -/۴
افاضل خجند (تذکرہ فارسی) ڈاکٹر ریحانہ خاتون -/۵۰
درد علامت و علاج (طب) ابوسعدی خالد جاوید -/۱۲
حیادیات طب پر ایک تحقیقی نظر (طب)
حکیم الطاف احمد اعظمی -/۱۱
عصمت جاوید شخص شاعر اور نقاد (تنقید)
شیخ ابراہیم خیال فتحپوری -/۸۰
رام لعل کی افسانہ نگاری (سوانح) ظہیر آفاق -/۵۰
بھیگی رتوں کی کتھا (شاعری) شہناز نبی -/۲۷
گلستان محمدؐ (نعتیہ کلام) ملا شیخ احمد خاں قادری -/۲۰
آنچل اور پرچم (شعری مجموعہ) سروش شیروانی -/۴۲
تحریکی شعور نعیم صدیقی -/۵۵
امام ابو حنیفہؒ
کے حیرت انگیز واقعات ۔ مولانا عبدالقیوم حقانی -/۳۰
مسلک کے اعتدال
حضرت علیؓ کے اقوال کی روشنی میں موسیٰ مولوی -/۳۰
وہ جنھیں کوئی خوف ہوگا نہ غم
علی اصغر چوہدری -/۱۲
دیوان مشرق (شاعری) سردار گنڈا سنگھ -/۱۲۵

مہمان مدیر
ڈاکٹر سید حامد حسین
۲۰۰، پروفیسرز کالونی
بھوپال

اشاریہ

تعصب کی زبان

بلاشبہ ہر مہذب انسان تعصب اور نفرت کے تصورات سے کتراتا ہے۔ لیکن ان تصورات کا سایہ ہم
نہیں چھوڑتا۔ افراد، گروہوں اور نظریات کے درمیان اختلاف گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں اور ان کے
ساتھ ہی تعصب اور نفرت کا رنگ ہلکا اور گہرا ہوتا رہتا ہے۔ دنیا کی زبانوں کے گودام ایسے
تعداد الفاظ بھرے پڑے ہیں جنھوں نے اسی قسم کے تعصبات سے جنم لیا تھا۔ کسی زمانے میں ان
میں موجود نفرت اور ناگواری کے زہر اور تلخی کو نوکِ زبان پر محسوس کیا جا سکتا تھا لیکن اب
یہ دسترخوانِ زبان و بیان کی رنگا رنگ لذت کا سامان ہیں۔

نسلی برتری کے احساس نے غیر اقوام کو کمتر، غیر مہذب بلکہ عقلی اعتبار سے ناقص قرار دینے کے رجحانات
کو تقویت دی۔ جس زمانے میں بحرِ روم کے شمال میں واقع یونان اور روم کے لوگوں نے یہ خود اعتمادی
حاصل کرلی کہ وہ علم و تہذیب کی دولت سے مالا مال ہیں، اسی وقت ان میں اپنے علاوہ دوسری قوموں
کو کمتر سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ چنانچہ انھوں نے بحرِ روم کے جنوب میں خاص طور پر افریقہ میں بسنے
والی قوموں کو غیر فصیح، ناقابلِ فہم زبان بولنے والا اور بڑبڑ کرنے والا سمجھتے ہوئے انھیں بربر قوموں سے
تعبیر کیا اور رفتہ رفتہ بربریت کے ساتھ بے رحمی، سفاکی، خونریزی کی وہ ساری صفات وابستہ کر دی
گئیں جن کا تعلق وحشیانہ طرزِ عمل اور غیر مہذب اندازِ زندگی سے ہے۔ اپنی زبان کو فصاحت کا
مظہر سمجھنے اور دوسروں کو کج مج زبان اور تکلم سے قاصر سمجھنے کا یہی رجحان عربوں میں نظر آتا ہے۔
انھوں نے ہر غیر عرب کو عجمی یعنی گونگے کا نام دیا۔ اسی نسلی برتری کا اثر ہندوستانی لفظ "اناڑی" میں
ملتا ہے جو دراصل "اناریہ" یعنی "غیر آریہ" تھا۔ آریہ لوگ خود کو تہذیب کا ضامن سمجھتے تھے اور دوسری
قوموں کو "اناریہ" کہہ کر یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ انھیں تہذیب چھو کر بھی نہیں گئی ہے اور دھیرے دھیرے
"اناڑی" کا یہ لفظ ناتجربہ کار، بے سلیقہ، نکمے اور بے شعور کے مترادف ہوگیا۔

جوں جوں شہروں اور بستیوں میں آباد ہونے والوں اور زمین پر ملکیت کا حق رکھنے والوں کو
سیاسی، اقتصادی اور سماجی طاقت حاصل ہوتی گئی۔ ویسے ہی ویسے گاؤں میں رہنے والوں اور کھیتوں
میں کام کرنے والوں کی تہذیبی حیثیت کو کمتر سمجھنے کا میلان بڑھتا گیا۔ تہذیب سماج کے اعلا طبقوں

کی میراث بن گئی اور عوام الناس سے تعلق رکھنے والے تہذیبی مظاہر کو گھٹیا اور معیار سے گرا ہوا
جانے لگا چنانچہ ایسے بیشتر الفاظ جو بدمذاقی، گھٹیا پن، چھچھورے پن اور خباثت کو ظاہر کرتے ہیں
انھیں طبقات سے لیے گئے۔ اردو میں سوقیانہ پن، بازاریت، دہقانیت اور گنوار پن، حقارت کا اظہا
کرنے والے الفاظ اسی طبقاتی نفرت کی جانب نشاندہی کرتے ہیں۔ انگریزی میں اسی قسم کے
بازاری پن کو لفظ "ولگر" VULGAR سے بتایا جاتا ہے جب کہ جس لاطینی لفظ VULGUS کی یہ ایک
شکل ہے اس کے معنی صرف لوگوں کی بھیڑ یا عوام الناس ہوتے ہیں۔ انگریزی لفظ "ولن" اب ہمارے
لیے غیر معروف نہیں رہا ہے۔ ناول، افسانے اور فلمی کہانیوں میں ایسا فسادی کردار جو جگہ جگہ مرکزی
کردار کی راہ میں کانٹے بوتا ہے اور کہانی میں اپنی چالوں ہتھکنڈوں، سازشوں وغیرہ سے دشواریاں
پیدا کرتا ہے، اُسے "ولن" کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ بھی زمیندارانہ تہذیب کی پیداوار ہے۔ "ولن" کے
اصلی معنی صرف گانو کے باشندے کے ہیں لیکن کیونکہ زمینداروں نے اکثر اپنے دیہاتی مزدوروں کو
آمادہ شر اور اپنا دشمن سمجھا، اس لیے رفتہ رفتہ یہ لفظ ہی شخصیت پر مائل کردار کے لیے مخصوص ہوگیا
اعلا طبقے کے اس رویے کے خلاف دوسرے طبقوں میں ردِّ عمل ہونا فطری بات ہے
چنانچہ عام لوگوں نے اعلا طبقے کے لوگوں کی جانب اپنی نفرت کے اظہار کے لیے الفاظ وضع کیے۔
انھیں میں سے ایک لفظ "بھدّا" ہے جس کا مفہوم بدشکل اور بے سلیقہ ہے۔ لیکن "بھدّا"، کا لفظ "بھدر"
سے نکلا ہے جس کا مفہوم شائستہ اور شستہ ہوتا ہے اور "بھدر لوک" کا لفظ اشراف کے لیے استعمال
ہوتا ہے۔ عام لوگوں میں اشراف کے خلاف جذبات کی بنا پر "بھدر" نے بالکل متضاد مفہوم اختیار
کر کے "بھدّا" کی شکل لی۔ اسی طرح کسانوں اور مزدوروں کے غصے اور احتجاج نے کئی دوسرے لفظوں
کو لغت میں داخل کیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں آئرلینڈ کے ایک زمیندار نے اپنی آراضی کے
انتظام کے لیے برطانوی فوج کے ایک ریٹائرڈ افسر چارلس کننگھم بائیکاٹ کو ملازم رکھا۔ بائیکاٹ
نے کسانوں پر بڑی زیادتیاں کرنا شروع کیں۔ خشک سالی کے باوجود اُن سے پورا لگان وصول
کرنا چاہا اور نادہند کسانوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا۔ اس کی سختیوں سے تنگ آ کر
۱۸۸۰ء کے قریب لوگوں نے متفق ہو کر بائیکاٹ سے مکمل قطع تعلق کر لیا۔ یہاں تک کہ اُسے کھانے
پینے اور دوسری ضرورتوں کو پورا کرنا بھی محال ہو گیا۔ بالآخر وہ تنگ آ کر برطانیہ بھاگ گیا۔ لیکن
اس کے ساتھ ساتھ عوامی غم و غصہ کے اظہار کے لیے بائیکاٹ کا لفظ لغت میں داخل ہو گیا۔ یہی
لفظ "سبوتاژ" کے ساتھ ہوا۔ اس وقت سبوتاژ سے وہ توڑ پھوڑ مراد لی جاتی ہے جو کسی مقصد
کو حاصل کرنے کے لیے کی جائے۔ فرانسیسی زبان میں "سابو" لکڑی کے جوتے کو کہتے ہیں۔ ایسے غریب
کسان جو چمڑے کے جوتے نہیں خرید سکتے وہ سردی میں پیروں کو برف سے بچانے کے لیے
لکڑی کو کھوکھلا کر کے جوتے بنا لیتے تھے۔ بعض اوقات جب ان کسانوں کا اپنے زمینداروں سے
جھگڑا ہوتا تو وہ اپنے لکڑی کے جوتوں سے فصل کو روند کر اپنا غصہ نکالتے اور اسے "سبوتاژ" کہا
صنعتی دور میں جب کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے اپنی مالکوں کو منوانے کے لیے
کی مشینوں میں گڑبڑ کر کے کام ٹھپ کر دینے کا طریقہ اختیار کیا گیا تو "سبوتاژ" کا یہی لفظ استعمال

ونے لگا۔

تعصب کی ایک اور طاقتور بنیاد مذہب رہی ہے۔ آج ہماری لغت میں کئی ایسے الفاظ اپنی جگہ
چکے ہیں جنھیں کبھی مذہبی تعصب سے جنم لیا تھا۔ قدیم ہندستان میں ایک وقت ایسا گزرا ہے
ب بدھ مذہب کے پیرو اپنے پڑوسیوں کی ناپسندیدگی کا نشانہ رہے۔ جب کہ لفظ "بدھ"
ے عقل، سمجھ اور الوہی علم کا مفہوم لیا جاتا ہے "بُدھو" جو دراصل بُدھ مذہب کے پیرو کے لیے
ب لفظ ہے، کم عقل، ناسمجھ اور بے شعور کے مترادف سمجھا جانے لگا۔ "پاشنڈ" بُدھ فرقے
کے نہایت پاکباز اور روحانی طاقتوں کے مالک سادھوؤں کا ایک طبقہ ہوا کرتا تھا۔ بتایا جاتا ہے
ہ ایک بار جب کچھ پاشنڈ شہنشاہ اشوک سے ملنے آئے تو وہ اُن کے استقبال کے لیے دروازے
ب گیا تھا۔ لیکن اب "پاکھنڈی" کا لفظ جعل ساز، فریبی اور دھوکے باز کے مفہوم میں زبان زدِ
اص وعام ہے۔ پہنچے ہوئے بدھ سادھو "اودھوت" کہلاتے تھے۔ کیونکہ وہ دوران ریاضت
فانِ حقیقت میں پوری طرح محو ہو جاتے تھے اس سے دوسرے لوگوں نے شراب پی کر مدہوش
دہانے والوں کو "دُھت" کہنے کی روش اختیار کی۔ احمق، بے ڈھنگے اور دنیا سے بے خبر شخص
بعض اوقات "بجر بٹو" کہا جاتا ہے۔ بظاہر یہ ایک جعل لفظ ہے۔ لیکن دراصل یہ "وجر بٹک" کی بگڑی
دئی شکل ہے۔ "وَجرُ بٹک" وہ سادھو کہلاتے تھے جو پکے برہم چاری کی زندگی گزارتے تھے اور
ر کو دنیاوی معاملات، تعلقات اور لذّات سے دور رکھتے تھے۔

جین مذہب کے پیرو بھی تعصبات کے نشانے سے نہیں بچ سکے۔ جو شخص بے معنی اِدھر
ر کی ہانکتا ہے، اُس کے لیے کہا جاتا ہے کہ "آئیں بائیں شائیں" کر رہا ہے۔ "آئیں بائیں شائیں"
اہر بے معنی بکواس ہے۔ لیکن یہ پالی زبان کے ایک فقرے "اتی پات شانتی" کی بدلی ہوئی
کل ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خونریزی سے بچنے میں ہی امن و نجات ہے۔ یہ فقرہ جین مذہب
ی تعلیمات میں سے ہے۔ اسی طرح جینیوں کا دگمبر طبقہ دنیا اور مادی تعلقات سے قطعاً بے نیازی کے
ہار کے لیے بے لباس رہنا پسند کرتا ہے اور جسم کو احساس سے بے نیاز کرنے کے لیے اُن
کے سادھو اپنے جسم کے بال بھی نوچ نوچ کر اکھاڑ ڈالتے ہیں۔ اسی سے دوسروں نے انھیں "لنگا لچا"
ہنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ "لُچا" کا مطلب ہی بدمعاش، بدکردار اور دغا باز ہونے لگا۔
رِ ناروا رانہ کشاکش عجیب عجیب رنگ دکھاتی ہے۔ اگر ایک فرقے کی دل آزاری کے لیے حجام کو
لیفہ کہنے کا رواج ڈالا جاتا ہے تو جواباً غنڈے اور بدمعاش کو "شہدہ" کہہ کر شہدائے کربلا
ابے حرمتی سے باک نہیں ہوتا اور ستم ظریفی یہ ہے کہ عام محاورے میں دونوں ایسے کھپ جاتے
ہ کر بعد میں یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ کبھی ان کے پس پردہ کوئی تعصب یا تلخی بھی کار فرما تھی۔

پڑوسیوں سے چشمک اور ہمسروں سے رقابت، افراد میں ہی نہیں گروہوں میں بھی دیکھنے
ا آتی ہے۔ اہل مشرق کو تو یہ احساس پیدا کر دیا گیا ہے کہ وہ ساتھ رہنا اور ایک دوسرے کی
ت وقدر کرنا نہیں جانتے۔ لیکن دنیا کو تہذیب و تمدن کا معلم ہونے کا دعوا کرنے والے اہل مغرب
ا ان کمزوریوں سے پاک نہیں ہیں۔ اس کی شہادت یوروپ کی زبانوں میں پڑوسی ملکوں

اور قوموں کے بارے میں موجود الفاظ و محاورات سے دستیاب ہوتی ہے۔ انگریز جو اپنے کندھوں پر ہندستان کی جہالت کو تہذیب کی روشنی سے دور کرنے کی ذمے داری لے کر آیا تھا وہ اسکاٹ اور آئرلینڈ میں رہنے والے اپنے پڑوسیوں کو جس حقارت کے ساتھ دیکھتا ہے اور فرانسیسیوں ڈچوں اور اسپین کے باشندوں کا جس طرح مذاق بناتا ہے اُس سے بڑی عبرت ہوتی ہے۔

اسکاٹ لینڈ حکومت برطانیہ کا ایک حصہ ہے لیکن انگریز اسکاٹ لینڈ والوں کی طرز کا مذاق اُڑانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتا۔ اگر آپ کھجا رہے ہیں تو آپ اسکاچ فڈل (گویا ستار) بجا رہے ہوں گے۔ اسکاچ آشیرواد کا مطلب ہے ڈانٹ پھٹکار۔ اسکاچ کنگھا، مویشیوں کا کنگھا کہ ہے۔ بلا چرچ یا کورٹ میں جائے جو شادی کا معاہدہ کیا جائے اُسے اسکاچ بیاہ کہتے ہیں۔ جو گلاب میں بہت کانٹے ہوں وہ اسکاچ روز ہے اور ککرمتّا۔ اسکاچ بانیٹ (عورتوں کا ہیٹ) ہے۔ اسکاچ ناشتہ وہ ہے جس میں خوب ڈٹ کر کھایا جائے اور خود اسکاٹ لینڈ کھجلی، خارش اور بالوں کی جوؤں کا دیش ہے۔

آئرلینڈ، انگلینڈ کا قریب ترین پڑوسی ہے۔ لیکن آئرلینڈ پر استعمال کرنے کے لیے انگریزوں کے ترکش میں تیروں کی کمی نہیں۔ پولس اسٹیشن، آئرش کلب ہاؤس ہے آئرش رتھ، آدمی کی دو ٹانگیں ہیں۔ پھاوڑا، آئرش چمچہ ہے۔ آئرش گواہی، جھوٹی گواہی ہے۔ آئرش دعوت کا مطلب ہے فاقہ اور آئرش ترقی کا مفہوم ہے تنزّل۔

سترھویں صدی میں ہالینڈ ایک بحری طاقت کی شکل میں اُبھرا۔ انگلستان کی اس سلسلے میں ہالینڈ سے رقابت ایک شدید نفرت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ چنانچہ انگریزوں نے ڈچ لوگوں سے منسوب کرکے بہت سارے توہین آمیز محاورے بنائے۔ آپ کو معلوم ہے ڈچ بلبل کیا ہوتی ہے۔ انگریزوں نے یہ خطاب مینڈک کو دیا ہے۔ اسی طرح ڈچ بیوہ، طوائف کا نام ہے جب کہ ڈچ بیوی سے مراد وہ سہارا ہے جس پر آپ اپنا ہاتھ ٹیک کر آرام کرسکیں۔ ڈچ ہمت وہ ہے جو شراب کے نشے میں ظاہر کی جائے۔ ڈچ کنسرٹ وہ ہنگامہ ہے جو شرابیوں کے ایک ساتھ شور مچانے سے پیدا ہو۔ ڈچ سودا نشے کی حالت میں کیا جاتا ہے اور ہوش میں آنے کے بعد اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ڈچ نیلام میں بولی بڑھتی نہیں گھٹتی ہے۔ ڈچ ضیافت میں ہر شخص اپنا بل خود ادا کرتا ہے۔ ڈچ چچا وہ ہے جو خود ڈانٹ ڈپٹ کرے اور ڈچ آرام یہ ہے کہ کوئی آرام نہ ہو۔ پیدل چلنے کو ڈچ سواری کہا گیا۔ موٹے اور بھدّے جسم والے کو ڈچ کاٹھی کا بتایا گیا اور ایک ایک چیز کے حساب کی جگہ ایک ساتھ یکمشت رقم دینے کو ڈچ حساب کرنا کہا گیا۔ اس طرح ڈچ لوگوں کو شرابی، جھگڑالو، بے اعتبار، بدمذاق، بداخلاق اور احمق ظاہر کرنے میں کوئی کسر اُٹھا کر نہ رکھی گئی۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان بھی پرانی رقابت ہے۔ انگریز فرانسیسیوں کو بے فکرے، شرابی اور جنسی بے راہ روی کے شکار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ فرنچ رخصت کا مطلب وہ

ے جو بغیر اجازت کے منافی جائے۔ اور فرنچ کریم سے مراد برانڈی ہوتی ہے۔ پھر جہاں جنسی معاملات و عیاشی کا ذکر ہو انگریز فرانسیسیوں کو گھسیٹ لاتے ہیں۔ چنانچہ کر وہ یہ کہتے ہیں کہ میری فرانسیسی معاف کیجیے گا۔ تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میری باتوں میں جنسی معاملات کے ذکر یا جنسی گالیوں کو معاف کیجیے گا۔ انگریزوں کی بول چال کی زبان میں جنسی افعال سے متعلق کئی اصطلاحات میں فرانسیسیوں کا تعاون حاصل کیا گیا ہے۔ جیسے فرانسیسی بوسہ وہ ہے جس میں لبوں کے ساتھ زبان سے بھی کام لیا جائے فرانسیسی لفافہ (لیٹر) "نرودھ" کو کہا جاتا ہے۔ فرانسیسی چیچک، فرانسیسی گٹھیا، فرانسیسی بیماری یا فرانسیسی چیز سے آتشک (سفلس) کی اذیت ناک جنسی بیماری مراد لی جاتی ہے۔ فرانسیسی پرنٹ کا اشارہ عریاں گندی تصاویر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

فرانسیسی بھی انگریزوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ وہ من مانی چھٹی منانے کو انگریزی چھٹی منانا کہتے ہیں اور "نرودھ" کو انگریز ٹوپی کا نام دیتے ہیں۔ ایک زمانے میں فرانسیسی لوگ، نادہند قرضدار کو انگریز کہا کرتے تھے۔ سر کے بالوں میں پڑنے والی جوؤں کو فرانسیسی "اسپینی" کہتے ہیں اور سوؤں کو "مادہ اسپینی" کا نام دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف جرمن لوگ جوؤں کے لیے "فرانسیسی" اور تل چٹے (کاک روچ) کے لیے "روسی" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

ہندستان میں آریوں کے غلبے کے بعد جن باہر سے آنے والی قوموں سے مزاحمت کرنا پڑی اُن میں شدید ترین مقابلہ یونانیوں سے ہوا چنانچہ بعد میں سنسکرت میں غیر ہندستانیوں کے لیے حقارتاً "ن" کا لفظ استعمال ہونے لگا یہاں تک کہ آگے چل کر اس لفظ کا اطلاق مسلمانوں پر بھی ہوا۔ مدوح میں ایک عرصے تک ترک حاکم رہے چنانچہ لوک ادب میں "ترک" کے لفظ کے ساتھ ایک ن تیکھا پن پیدا ہو گیا اور "ترکی" سے اکثر شیخی، دباؤ اور دبدبہ مراد لیا جانے لگا۔ ترکی تمام ہونا ترکی بہ ترکی جواب دینا وغیرہ محاوروں میں یہی مفہوم ابھر کر آیا۔

جب ہندستان میں دھیرے دھیرے یوروپی لوگوں نے اپنے قدم جمانا شروع کیا تو اُن خلاف بھی نفرت کا جذبہ اُبھرنے لگا اور اُن کو حقارتاً "فرنگی" کے نام سے پکارا گیا۔ بنیادی طور پر گی" لفظ کا تعلق فرانس کے باشندوں سے تھا۔ سلیبی جنگوں کے دوران فرانسیسی قیادت میں وپ کے لوگوں نے بیت المقدس پر چڑھائی کی تھی۔ اسی بنا پر مسلمان یوروپ کے لوگوں کو حاب فرنج" سے تعبیر کرنے لگے اور "اصحاب فرنج" اور "فرنگی" کے فقروں کے ساتھ ایک ناپسندیدگی زبہ وابستہ ہو گیا۔ ہندستان میں پہلے "فرنگی" کا لفظ پرتگالی ڈاکوؤں کے لیے استعمال ہوا۔ بعد میں انگریزوں نے اس ملک پر تسلط کیا تو انھیں فرنگی کہا گیا۔ کیونکہ یہ یوروپ کے لوگ عیسائی تھے اس لیے بعض اوقات فرنگی سے مسیحی لوگ بھی مراد لیے جانے لگے۔

بعض دوسرے ممالک کے لوگوں کی ہندستان میں اجنبیت نے بھی گُل کھلائے۔ بک لوگ غالباً آسانی سے ہندستانی ماحول میں گھل مل نہیں پائے اور یہاں پہنچنے والے ایسے ڈکا افراد ہندستانیوں کو سراسیمہ اور حواس باختہ جیسے محسوس ہوئے چنانچہ لفظ "اُزبک" ہونق ہکا بکا کے مترادف ہو گیا۔ اسی طرح وسط ہند کے خانہ بدوش قازق، قزاق کی شکل میں ڈاکو

اور لٹیرے کے ہم معنی بن گئے۔

آپ دیکھیں گے کہ ہندستان کے مختلف فرقوں کے ساتھ بھی بعض ایسی خصوصیات وابستہ ہو گئیں جو کسی ناگوار پہلو کی یاد دلاتی ہیں۔ جٹ قدیم ہندستان میں سندھ کے گرد و نواح میں آباد ایک قبیلہ تھا جو عام معیار کے مطابق غیر متمدن اور جنگجو تھا اور یہ صفات اس کی جہالت پر محمول کرتے ہوئے "جاہل جٹ" کا محاورہ وضع کر لیا گیا۔ "جاٹ" اور "جٹا" کے ساتھ ابھی بھی اکھڑپن کا مفہوم جوڑا جاتا ہے۔ کنجر، چمار وغیرہ ذاتوں کے نام بھی بطور گالی کے استعمال ہوتے رہے۔

شیخ صاحب کی اکڑفوں نے "شیخی" کو جنم دیا۔ پٹھانوں کے ذرا سی بات پر مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانے کو "پٹھانی" کہا گیا۔ لالا لوگوں کی چالاکی، پانڈوں کا کھانے پینے میں لالچ اور بنیوں کی کنجوسی ضرب المثل ہو گئی۔

اسی طرح علاقائی نسبت کے ذریعے حقارت کے جذبے کا اظہار کیا گیا۔ مارواڑیوں کا نام لین دین اور قرض اور سود کی برائیوں کے ساتھ جڑ گیا۔ بنگال اور بہار میں قحط کی آفتوں نے "بھوکے بنگالی" کے فقرے کو جنم دیا۔ "بابو" کا لفظ تعظیم و تکریم کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن جب یہی لفظ انگریزوں نے اپنے کارندوں کے لیے استعمال کیا تو "بنگالی بابو" انگریزوں کے پٹھوؤں اور کلرکوں سے متعلق ہو گیا۔ بنارس کے شہر میں روحانی تسکین اور نجات کے متلاشی سادہ لوح عقیدت مندوں کو ٹھگنے والوں کی وجہ سے "بنارسی ٹھگ" مشہور ہو گئے۔ شکارپور وغیرہ کے سیدھے سادے باشندوں کے ذریعے احمق اور بدھو کی مثال دی جانے لگی۔ واجد علی شاہ وغیرہ کے زمانے میں لکھنو کے عیش و عشرت کے افسانوں نے لکھنوی تہذیب کو بیجا نزاکت اور نسوانیت کا نمایندہ سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ چنانچہ "گومتی کا پانی پینے" کا محاورہ استعمال کر کے مزاج میں نسوانیت کی جانب اشارہ کیا جانے لگا۔ شاہجہاں پور کے پٹھانوں کی وجہ سے "شاہجہاں پوری بغل میں چھری" جیسی کہاوتیں بن گئیں۔

یہ عام انسان کی نفسیات ہے کہ اُسے ہر ایسے شخص سے کد ہو جاتی ہے جو اُس پر کوئی پابندی لگائے۔ چنانچہ قاضی، محتسب، کوتوال، واعظ، ناصح، استاد اور سخت گیر بزرگ سب اس بیر کا شکار ہوتے ہیں۔ شعر و ادب میں تو انھیں طنز کا نشانہ بنایا ہی گیا ہے، الفاظ اور محاوروں میں بھی اس نفسیات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مثلاً ریش قاضی وہ صافی کہلاتی ہے جس میں شراب چھانی جاتی ہے۔ عالم اور علامہ مرد ہیں تو ٹھیک ہے لیکن عورت علامہ ہوئی تو اس سے زیادہ خطرناک اور فتنہ پرداز کون ہوگا۔ استاد اور گرو اپنی جگہ قابل احترام ہیں لیکن استادوں کے استاد اور گرو گھنٹال سے لوگ ڈر تو سکتے ہیں لیکن اُن کی عزت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

لفظوں، محاوروں اور کہاوتوں کی دنیا میں اس طرح جابجا تعصب کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ لیکن وقت کی خراد پر ہمارے افراد کی نفرتیں اتنی آسانی سے چھیلی نہ جا سکیں۔ الفاظ میں ٹھونکی گئی کد و کینہ، نفرت و رقابت، تمسخر اور حقارت کی میخیں بہت جلد ہموار ہو جاتی ہیں اور ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ وہ فریق بھی جس کی توہین یا دل آزاری کے لیے شروع میں ان الفاظ و اشارات کو وضع کیا گیا تھا وہ بھی انھیں بلا تامل استعمال کرتے دکھائی دیتا ہے۔ ●●

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی
۸-۵۵، لاجپت نگر، صاحب آباد
غازی آباد، یوپی ۲۰۱۰۰۵

کچھ سرقے کے بارے میں

"شاعر" (شمارہ نمبر ۵ تا ۱۲) میں شکیب ایاز کا مضمون "نئے سرقے کی ایک مثال" : میر حسن دہلوی" بڑی توجہ سے پڑھا۔ جیسے اے گڈون، کلیم الدین احمد اور عطا کاکوی کے فرمودات تلاش کرنے اور اقتباسات کو نقل کرنے کی زحمت کرنے سے نفسِ مضمون کی نہ وضاحت ہوئی اور نہ اُس میں اضافہ ہوا۔ توارد، استفادہ اور سرقہ کی اصطلاحیں عام طور سے سمجھی جاتی ہیں۔ سودا نے ایک قصیدے میں ایک معاصر کی ہجو کی ہے ؎

مضمون جو ہو ریختہ کا تازہ کسی کے
کرتے ہیں اُسے فارسی میں باندھ کے تشہیر
پھر کہتے ہیں یوں ہے کسی استاد کا یہ شعر
سرقہ یہ کیا جن نے، بڑا ہے کوئی بے پیر
سرقہ کو نہ سمجھیں، نہ توارد کو گراں سے
پوچھے جو کوئی کیا ہیں یہ دونوں، کرو تقریر
پھر بعد تامل، بجواب اس کے یہ ذی ہوش
رد بہ کہیں سرقہ کو توارد کو کہیں شیر

مصنف موصوف نے ہمعصروں کے کلام میں ایک سا مضمون یا ایک سے مصرع دیکھ کر سرقے کا فیصلہ صادر فرمانے میں کچھ زیادہ ہی عجلت سے کام لیا ہے۔ احتیاط کا تقاضا تھا کہ کچھ توقف اور غور کرتے۔ خدائے سخن میر تقی میر اور مصحفی، دونوں ہمعصر تھے۔ اگرچہ میر پچیس برس بڑے تھے۔ میر نے برس کی طویل عمر پائی تھی۔ مصحفی نے میر کی وفات پر یہ قطعۂ تاریخ کہا تھا۔

وہ محمد تقی، میر کہ تھا — ریختہ میں ہر ایک کا سرتاج
ہند جنت نشاں میں رکھتی تھی — غزل عاشقانہ اُس سے رواج
خرمنِ عمر اُس کا برقِ اجل — کر گئی جس دم آن کر تاراج
از سرِ درد، مصحفی نے کہا
حق میں اُس کے دوا نظیری آج

مصحفی، میر کے بعد چودہ پندرہ برس اور زندہ رہے۔ وہ بہت پُرگو شاعر تھے، اور انھوں نے معاش کے لیے اپنے کلام کا بڑا حصّہ شاگردوں کے ہاتھ بیچا۔ ایسا شاعر میر کے شعر کا سرقہ کرتا؟ مصنف موصوف نے یہ مثال پیش کی ہے :

میر تقی میر : اُمیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا؟

شیخ غلام ہمدانی مصحفی : مدت ہوئی کہ بیٹھے ہیں ہم انتظار میں
کیا جانے آتے آتے قیامت کو کیا ہوا؟

میر کا شعر، دیوانِ اوّل کی ایک غزل میں ہے، اس لیے یہ بات کسی حد تک یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ کسی ایسے طرحی مشاعرے کی غزل نہیں ہے جس میں یہ دونوں شریک ہوئے ہوں۔ مصحفی نے یقیناً بعد میں، اس زمین میں غزل کہی، اس کے باوجود یہ سرقہ نہیں ہے۔ جن کا مطالعہ بہت وسیع نہ ہو، اور شبلی کی شعر العجم پڑھی ہو، وہ بھی اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ ایک زمین میں خواجہ حافظ شیراز اور خواجو کے اشعار میں قوافی اور معانی کی کیسی مماثلتیں ہیں ایک ہی مصرع سعدی اور حافظ کے یہاں مل جائے گا ایسے ہی ہم طرح اشعار موازنہ میں پیش کرنے کا دستور تھا شبلی سے مالک رام تک سب نے ایسا کیا ہے۔ ایک ہی زمین میں میر اور سودا کے شعر ہیں :

میر : عہدِ جوانی رو رو کاٹا، پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے، صبح ہوئی، آرام کیا
سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اُس کی اُور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا

سودا : تھا بجوانی فکر و تردد، بعد از پیری پایا چین
رات تو کاٹی دکھ سکھ ہی میں، صبح ہوئی آرام کیا
ادب دیا ہے ہاتھ سے اپنے کبھو بھلا مے خانے کا
کیسے ہی ہم مست چلے پر سجدہ ہر یک گام کیا

کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ میر نے سودا کا، یا سودا نے میر کا سرقہ کیا؟ اگر جواب اثبات میں ہے، تو مصنف موصوف چھان بین کریں کہ کس نے کس کا سرقہ کیا ہے۔ اور اگر جواب نفی میں ہے، تو مصحفی نے بھی میر کا سرقہ نہیں کیا ہے۔

"نکات الشعرا" میں میر نے سودا اور درد کے نام بڑے احترام کے ساتھ لیے ہیں اور اُن کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔ معاصرانہ چشمک کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ تعریف تو انھوں نے اوروں کی بھی کی ہے۔ سراج الدین خان آرزو اور میرزا مظہر جانِ جاں وغیرہ کی بھی۔ لیکن یہ دونوں بزرگ پچھلی پیڑھی کے ہیں۔ کچھ کے بارے میں ناخوشگوار باتیں بھی لکھی ہیں مثلاً انعام اللہ خاں یقین کے بارے میں یہ بات کہ وہ شعر فہم نہیں، اور شعرگوئی ان کی مشکوک ہے۔ میرزا مظہر جانِ جاں کا عطا کیا ہوا کلام پڑھتے ہیں۔ قائم کے کردار کے بارے میں انھوں نے کوئی اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے۔ قدرت کو سخن سے عاجز گردانا ہے۔ محمد یار کو

ناکس کو زبان غیر لتا کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی ہے اور اُن کے غرور اور بے ہودگی کو اُچھالا ہے۔ سرقہ بھی ایک عادت ہے، شعر، کہانی، تنقید، عروض۔ ہر میدان میں سرقے کے عادی مجرم موجود ہیں۔ اور تھے! ایک آدھ شعر یا ایک آدھ کہانی، یا ایک آدھ تنقیدی یا عروضی و فنی مقالہ کوئی سرقہ نہیں کرتا۔ مثالیں موضوع سے متعلق ہوتے ہوئے بھی، موضوعِ حاضر کی مرکزیت کو قائم نہ رہنے دیں گی۔ اس لیے ہم میر اور قائم کے ان شعروں کو لیتے ہیں، جو مصنف موصوف کے نزدیک سرقہ کی مثال ہیں۔ پہلے شعر میر کا ہے اور فوراً بعد شعر قائم کا، اس لیے مصنف موصوف کا خیال ہے کہ قائم نے میر کا سرقہ کیا ہے:

میر: کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

قائم: ہوس سے ہم کیا تھا عشق اوّل
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

میر کا جو بیان قائم کے بارے میں ہے اُس کے مطابق پہلے وہ خواجہ میر درد کے حلقے میں شامل تھے پھر مرزا محمد رفیع سودا کے حلقے میں شامل ہوئے جس زمانہ میں "نکات الشعرا" مرتب ہوا، اس وقت میر، سودا اور قائم تینوں جوان تھے۔ ایک تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ ہم طرح غزل پہلے کس نے کہی۔ یہ بات بھی امکانات میں سے ہے کہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو جو محفلِ ریختہ میر کے مکان پر ہوتی تھی، یہ طرحی غزلیں اُس میں پڑھی گئی ہوں۔ خواجہ میر درد کے ترجمہ میں میر نے نکات میں اس مجلس کے بارے میں لکھا ہے۔ مصنف موصوف نے اس امکان پر غور نہیں فرمایا، اور سرقہ کی شق میں یہ دو شعر پیش فرما دیے۔

مصنف نے میر تقی میر کے شعر کی قرأت، کلیاتِ میر سے ملانے کی زحمت بھی نہ فرمائی۔ یہ شعر دیوانِ اوّل کی ایک غزل میں ہے۔ نو شعروں کی غزل میں یہ آٹھواں شعر ہے۔ "کلیاتِ میر" (ترقی اردو بیورو ۱۹۸۳) کی قرأت اگر درست ہے۔ تو مصنف موصوف نے دونوں مصرعے جو نقل فرمائے ہیں، محرّف ہیں۔ کلیات میں متن یہ ہے (ص ۱۳۲):

کیا تھا ریختہ پردہ سخن کا
سو ٹھہرا ہے یہی اب فن ہمارا

مصرعِ اولیٰ میں جو تحریف ہے، اُسے ہم نظر انداز کر سکتے ہیں۔ نہ صرف قائم اور میر کے شعر معنی کے اعتبار سے مختلف ہیں، بلکہ دوسرے مصرعوں میں صرف قافیہ ردیف مشترک ہیں۔ اور ایک لفظ ٹھہرا بھی۔ لیکن اس کا مقام دونوں میں مختلف۔

مصنف موصوف نے خدائے سخن کا یہ شعر اُن کے کس دیوان سے نقل فرمایا ہے، کیا اس پر روشنی ڈالنے کی زحمت فرمائیں گے؟

سرقے کی ایک اور مثال میں مصنف موصوف نے پہلے حسرت موہانی کا، اور پھر اقبال کا مطلع نقل فرمایا ہے۔ گویا اقبال نے حسرت کے مصرع کا سرقہ کیا ہے:

حسرت : وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں!

اقبال : ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں!

اگر مصنف موصوف کے ہاتھ وہ گلدستہ آجاتا، جس میں "مصرعِ ثانی " مصرعِ طرح تھا، تو ہر گرہ میں اُن کو سرقے کی مثالیں ہی مثالیں ملتیں۔ منجملہ اور شعروں کے یہ مطلع بھی :

تجھی سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں!

اور اب سرقے کی پہلی مثال، جو مصنف موصوف نے دی ہے :

میر : تیز یوں ہی نہ تھی کچھ آتشِ شوق
تھی[1] خبر گرم اُن کے آنے کی

غالب : ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اِس پر مصنف نے یہ ردّا لگایا ہے :

" غالب ہے اور تھی کے فرق کے ساتھ، میر کا ثانی مصرع سرقہ کر لیتے ہیں۔ غالب کے نزدیک مصرع کا سرقہ، توارد ہے۔ لطف یہ ہے کہ غالب اس پر فخر کرتے ہیں۔"

اور تذکرۂ ہندی، مطبوعہ اتر پردیش اکادمی ۱۹۸۵ء کے حوالے سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے :

" ..... ایک مصرع میں تم کو محمد الحسن شوکت بخاری سے توارد ہوا ہے۔ یہ بھی محلِ فخر و شرف ہے، کہ جہاں شوکت پہنچا وہاں تم پہنچے ..... پہلا مصرع تمہارا اگر اُس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا، تو میرا دل زیادہ خوش ہوتا ...."

مصنف موصوف نے غالب کی تحریر سے اقتباس نقل کرنے میں پروفیسر گیان چند جین کی روش اختیار کی، اور ثانوی کو معتبر جانا۔ غالب کے خطوط کے اتنے مجموعے فراہم ہیں کسی ایک معتبر مجموعہ سے عبارت نقل کی جا سکتی تھی۔ ۱۹ر اگست ۱۸۶۱ء کے مرزا ہر گوپال تفتہ کے نام خط میں غالب نے یہ بات لکھی تھی۔ عبارت نقل کرنے میں، یا مصنف موصوف کے ماخذ میں دو غلطیاں ہوئی ہیں۔ ۱۔"محمد الحسن شوکت بخاری" نہیں" محمد اسحاق شوکت بخاری ہے۔ ۲۔" میرا دل زیادہ خوش ہوتا" نہیں "میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا" ہے۔

مصنف موصوف نے غالب پر سرقے کا جو الزام لگایا ہے، وہ نادرست ہے۔ واوین کی علامت، اور اوقاف کی دوسری علامتیں اردو تحریر میں عہدِ غالب کی بعد میں رائج ہوئیں۔ ورنہ مصرع واوین میں خود غالب لکھتے۔

---

[1] سہوِ کتابت سے تھی کے بجائے ہے چھپا ہے۔

اپنے پیش روؤں ہی کی زمینوں میں نہیں، اپنے ہم عصروں کی زمینوں میں بھی شعرا غزلیں لکھا کرتے تھے ان کے مصرعے بھی استعمال کر لیتے تھے (گرہ لگاتے تھے) اور کبھی کبھی مطلع یا مقطع میں اس طرف اشارہ بھی کر دیتے تھے۔ مرزا سودا نے عبدالقادر بیدل کی زمین میں غزل لکھی، اور ان کے اس مصرع پر گرہ لگائی :

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

غالب نے بھی ایسا ہی کیا۔ غالب کا مقطع ہے :

آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ، ہیچ !

ین کا دستور نہیں تھا اس لیے دواوین میں بیدل کا مصرع نہیں لکھا۔ غالب کی سویں برسی پر کچھ ذی وں" نے بخطِ غالب ایک مخطوطہ تیار کرایا، جس میں غالب کے اشعار کے ابتدائی خواندگیاں دکھائی ہیں۔ ان کم خواندہ "ذی علموں" نے بیدل کے مصرع کو غالب کا مصرع سمجھ کر، اس کی ابتدائی خواندگی ، دارد کی جگہ باشد لکھوا دیا !

غالب نے میر کے مصرع سے استفادہ کیا ہے، اور "ہے خبر گرم .... الخ" میر سے لیا ہے۔ یہ سرقہ ہرگز نہیں۔ اسی طرح میر کا شعر ہے :

میرے تغیرِ حال پر مت جا

اتفاقات ہیں زمانے کے

من خاں مومن نے پہلے مصرع سے استفادہ کیا —— اس شعر میں :

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ

تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

ب اگر کوئی کہے کہ مومن نے میر کے مصرع کا سرقہ کیا ، تو اس کا کیا علاج

الث کی ایک کنیز یاسمن تخلص کرتی تھیں۔ اُن کی زمین میں غالب نے ایک غزل لکھی، بہت مقبول غزلوں میں سے ہے۔ اس میں ایک شعر تھا :

کوئی ویرانے سے ویرانے ہیں

تھا ہیں صحرا ہیں کہ گھر یاد آیا

پہلا مصرع نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے تذکرے میں اسی طرح ہے۔ دوسرے مصرع کا یہی ورت نسخۂ بھوپال میں تھی، اور نسخۂ شیرانی میں ہے۔ لیکن مطبوعہ نسخوں میں شعر یوں ہے :

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

گویا غالب نے دوسرا مصرع یاسمن ہی کا رکھ دیا ، اور اس پر گرہ لگائی۔ یاسمن کا شعر ہے :

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اوین کا رواج اس عہد میں تھا نہیں ، اور تین ارکان (فاعلاتن مفاعلن فعلن / فعلان) میں اگر یاسمن ے مصرع مستعار لینے کا اعتراف کیا جاتا تو کوئی اور مضمون باندھنا ممکن نہ تھا۔ یہی بات "ہے خبر گرم ... الخ" کے سلسلے میں بھی درست ہے۔ مصنف موصوف نے غالب کے شعر کے بارے میں اپنی

جس سخن فہمی کا مظاہرہ کیا ہے، اُس سے بھی استفادہ کرنا ضروری ہے، کہ غالب کی بذلہ سنجی ایک روایت ہے اور یہ روایت اُن کے کلام کے دائرے سے نکل کر ان کے شارحین کی نکتہ آفرینیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ مصنف موصوف نے لکھا ہے:

"غالب کہتے ہیں کہ: آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا۔ اگر خبر گرم تھی تو بوریا مہیا کیوں نہ ہوا؟ اس کی وجہ نامعلوم رکھی گئی۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ وہ اچانک آگیا، اور گھر میں بوریا تک نہ تھا۔ غالب، میر کے شعر سے استفادہ نہ کر سکے، لہٰذا سرقے کے مرتکب ہوئے ...."

مصنف موصوف بوریا کے معنی بوری یا بورا سمجھتے ہیں کہ جان پہچان ہو تو تھوک یا پرچون کی دکان سے محلے میں ہی مفت فراہم ہو سکتا ہے! اُن کے آنے کی خبر گرم ہے، اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ آگئے گھر کیا، محلے میں بھی پہنچنے سے پہلے کے مرحلہ پر شعر ہے۔ خبر گرم ہونے کے معنی وقوع پزیر ہونے نہیں:

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم گئے تھے، پر تماشا نہ ہوا

غالب نے جس موقع کا شعر کہا ہے، مصنف موصوف کا تجویز کیا ہوا موقع اس سے مختلف ہے اس کے علاوہ اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے؟

یہ چند معروضات اُس طویل تمہید کے بارے میں پیش کی گئیں۔ جو مصنف موصوف نے مثنوی سحر البیان کے اور تذکرہ شعرائے اردو کے مصنف، میر حسن کے سرقے کے بارے میں باندھی ہے۔ اصل موضوع پر مصنف موصوف کی تحقیق و تنقید سے اقتباسات

"۱۔ ایک نئی صورت یا شق (سرقے کی) دیکھیے۔ میر حسن جیسا معروف مثنوی نگار، صاحب تذکرہ اور نغز گو اپنے معاصر و معروف شاعر کے شعر کا سرقہ کس طرح کرتا ہے۔

۲۔ شاہ واقف دہلوی گمنام شاعر نہ تھے ..... پوری تفصیل راقم السطور کے مدون دیوانِ واقف میں موجود ہے۔

۳۔ میر حسن (تذکرے میں) واقف سے اپنی دوستی کا دم بھرتے ہیں ..... میر حسن کے الفاظ سے مترشح ہے کہ واقف نے ایک مکمل غزل کہی تھی۔ لیکن وہ صرف مطلع درج کرتے ہیں۔ دیگر اشعار کیوں تذکرہ سے حذف کر دیے گئے، اس کی کوئی توضیح نہیں کی جاتی۔

۴۔ واقف کی پہرے میں والی غزل کو میر حسن نے طرح قرار دے کر ایک غزل داخل دیوان کی ہے۔ میر حسن نے تذکرہ شعرائے اردو میں اپنے ترجمے بھی پیش کیے ہیں ان اشعار میں یہ دو شعر بھی موجود ہیں:

ہے سزا دل کی، جو زلفوں کے گیا پہرے میں
شب کو کیوں نکلا اکیلا، جو پھنسا پہرے میں
مردمِ چشم نے پلکوں کی چڑھا سنگینیں
ایک عالم کو نظر بند کیا پہرے میں

ہے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ تذکرہ کی تکمیل تک واقف کی زمین میں میر حسن نے غزل مکمل کر دی تھی....
کے دو شعر بھی اپنے ترجمے میں نقل کر دیے ہیں۔ میر حسن کو یہ بھی چاہیے تھا کہ وہ یہ بھی اعتراف کر لیتے
یہ واقف کی طرح ہے۔ اور میں نے اُن کی غزل سے متاثر ہو کر غزل کہی ہے۔

۵۔ عبدالباری آسی کی مرتبہ قدیم بیاضوں کا ایک انتخاب میں واقف کے مزید تین شعر درج ہیں
شعار کسی تذکرے میں موجود نہیں۔ دیوانِ واقف بھی پہرے والی غزل سے خالی ہے۔

۶۔ واقف اور میر حسن کی غزلیں درج ذیل ہیں:

واقف

دور آیا ہے کہ ہیں شاہ و گدا پہرے میں
بے خطا پہرے میں، اور اہلِ خطا پہرے میں

کیا خطا دل کی جو زلفوں نے کیا پہرے میں
شب کو مت پھر تو اکیلا کہ ترا پہرے میں

مردمِ چشم نے پلکوں کی چڑھا سنگینیں
ایک عالم کو نظر بند کیا پہرے میں

دل کے لگ جانے کو کہتے ہیں میاں قیدِ فرنگ
آیا جو گھاٹی کے اندر، سو رہا پہرے میں

میر حسن

بے سزا دل کی جو زلفوں کے گیا پہرے میں
شب کو کہیں نکلا اکیلا جو پھنسا پہرے میں
دل کا لگنا ہی کسی سے ہے تری قیدِ فرنگ
پھر نہ چھوٹا کبھی جو اس کے پڑا پہرے میں
عشق ہی کا یہ پہرا کہ پھنسے حسن میں جی
ورنہ ہوتی ہے کہیں بند ہوا پہرے میں
اس فرنگی بچے کے کوچے میں جو کوئی گیا
نقشِ پا کے نمط اس جا پہ رہا پہرے میں
مردمِ چشم نے پلکوں کی چڑھا سنگینیں
ایک عالم کو نظر بند کیا پہرے میں
عشق نے جرمِ محبت پہ دیا ہے غم کے
دل جدا پہرے میں اور دیدہ جدا پہرے میں
تھا عدم میں تو ہر اک بند سے آزاد حسن
قیدِ ہستی نے مری مجھ کو دیا پہرے میں

عبدالباری آسی کے انتخاب میں شامل ترجمہ کی شہادت کی بنیاد پر مصنف موصوف نے فیصلہ صادر
ہے کہ میر حسن نے دو شعروں (مردمِ چشم نے ..... الخ) اور (دل کا لگنا ہی ..... الخ) کا سرقہ واقف
سے کیا ہے، اور یہ جبری سرقہ کی شرق ہے۔!
مصنف موصوف نے اِن نکات پر غور نہیں فرمایا:
۔ میر حسن اور واقف کے درمیان رشتہ بسیار دوستی کا تھا۔ گمان غالب ہے کہ میر حسن نے تذکرہ
اردو دورانِ تالیف میں، یا مکمل ہونے کے بعد، ایک بار یا متعدد بار واقف کو دکھایا ہوگا۔
ت کا امکان ہمیشہ رہا ہوگا کہ واقف کسی بھی وقت اسے دیکھنے کی فرمائش کر سکتے ہیں۔ میر حسن
نر کا اور بھی جس سے رشتہ یگانگت ہو، کلام اپنے کے طور پر رکھتے، یہ قرینِ قیاس نہیں۔
ر تذکروں میں پوری پوری غزلیں شاذ ہی ملیں گی مصنف موصوف کا میر حسن سے یہ توقع رکھنا کہ

وہ واقف کی پوری غزل نقل کرتے، یا مطلع کے علاوہ باقی شعر نقل نہ کرنے کی وضاحت کرتے، کچھ انہونی سی بات ہے۔

۳۔ مصنف موصوف نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا کہ میر حسن نے واقف کی زمین میں غزل بعد میں لکھ۔ معاملہ اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے۔ زیادہ جھکاؤ اسی طرف ہے کہ یا تو اس طرح میں دونوں نے ساتھ غزلیں لکھیں، یا واقف نے بعد میں۔ اگر میر حسن نے بعد میں بھی غزل لکھی تو واقف نے محسوس کیا کہ میر حسن کی غزل اُن کی غزل سے بہت بہتر ہے، اس لیے انھوں نے یہ اپنے دیوان میں بھی نہیں رکھی۔ اس بات کے امکان قوی ہیں۔ اس بات کی شہادت موجود ہے کہ واقف اپنی غزل سے مطمئن نہیں تھے، اور اس پر انھوں نے نظر ثانی کی، تو مطلع ترمیم کے بعد اپنے دیوان کے لیے نہیں رکھا؟ مختلف اصلاحی قراٗتوں کے ساتھ تذکرۂ گلشنِ سخن، گلزارِ ابراہیم اور نسخۂ دل کشا میں ہے، جس کی نشاندہی مصنف موصوف نے کی ہے۔ دوسرے تذکروں میں بھی صرف ایک مطلع ہی اس زمین میں ہے۔ مصنف موصوف نے ان کے مرتبین کی نیتوں پر کوئی شک نہیں کیا، اور نہ کسی توضیح کی توقع ان سے رکھی!

۴۔ عبدالباری آسی مرحوم کوئی بہت معتبر مرتب یا محقق نہیں۔ ڈاکٹر (؟) عظمت الٰہی کی بیاض سے انھوں نے غالب کا غیر مطبوعہ کلام جو دریافت کیا تھا۔ وہ جعلی ثابت ہو چکا ہے۔ یہ کلام خود مرحوم نے غالب کے رنگ میں تصنیف فرمایا تھا۔ مرحوم نے کوئی حوالہ بھی نہیں دیا کہ واقف سے ان اشعار کا انتساب کس شہادت کی بنا پر کیا گیا۔ وہ اشعار جو میر حسن کے دیوان ہی میں نہیں، اُن کے مرتبہ کیے ہوئے تذکرے میں، ان کے اپنے ترجمے میں موجود ہیں، جس پر واقف سمیت کسی ہم عصر نے کوئی اعتراض نہیں کیا، وہ عبدالباری آسی کی غیر مصدقہ، غیر معتبر یا نہیں مشتبہ شہادت کی بنا پر واقف کے کھاتے میں ڈال دینا، اور میر حسن کو سرقے کا مرتکب قرار دینا تحقیق کے آداب کے منافی ہے۔ ●●

سید فضل اللہ مکرم
شعبۂ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی،
حیدرآباد (اے۔ پی)

ذرائع ابلاغ ___ ماضی اور حال

حضرت انسان کو جب بھی کوئی ٹھیس پہنچتی ہے یا کوئی تکلیف محسوس ہوتی ہے تو اس کی زبان سے لفظ 'آہ' یا آنکھ سے آنسو نکل پڑتے ہیں یا پھر کسی خوشی یا مسرت کے موقع پر لبوں پر مسکراہٹ بکھرنے لگتی ہے۔ یہ جذبات و احساسات اس کی فطرت میں شامل ہیں۔ اس کا ایک ہی مقصد ہے وہ یہ کہ انسان اپنی تکلیف یا مسرت کو دوسروں تک پہنچائے یا پھر دوسروں کی تکالیف و خوشیوں سے واقف ہو۔ یہی اظہار ذرائع ابلاغ یا ترسیل کی پہلی کڑی ہے جو دنیا میں حضرتِ انسان کے ساتھ ہی وجود میں آگئی ہے۔

انسان ترقی پسند واقع ہوا ہے اس نے جیسے جیسے ترقی کے مدارج طے کیے۔ اپنی زندگی کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ اسی ضرورت نے انسان کو جستجو و کھوج اور تفتیش کی طرف مائل کیا اور لاشعوری طور پر ابلاغ کے مختلف ذرائع ایجاد ہونے لگے۔

'ابلاغ' عربی لفظ 'بلغ' سے نکلا ہے جس کے معنی 'پہنچانا' کے ہیں۔ انگریزی لفظ COMMUNICATION سے ہے جس کے معانی اطلاع دہی، آمدورفت، خط و کتابت کے ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے دو بڑے شعبے ہیں۔ کا مادہ لاطینی لفظ COMMUNE

۱۔ پرنٹ میڈیا PRINT MEDIA
۲۔ الکٹرانکس میڈیا ELECTRONICS MEDIA

یہ دونوں شعبے صحافت کے دائرے میں آتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صرف پرنٹ میڈیا ہی صحافت ہے جو سراسر غلط ہے۔ آج کے دور میں واقعات یا حقائق سے راست آگہی کا نام صحافت ہے۔ صحافت کی جان انکشاف ہے۔ واقعات و حوادث کے انکشافات پر ہی صحافت کے قصر کی تعمیر ہوتی ہے۔ عوام کو بغیر کسی آمیزش کے واقعات سے باخبر رکھنا صحافت کا پہلا فرض ہے اور جب تک صداقت اور راست بازی سے یہ فرض انجام پاتا رہے گا۔ صحافت کی قوت میں کوئی کمی نہیں پیدا ہو سکتی۔ ہر ملک کی صحافت وہاں کے باشندوں

کے جذبات و احساسات کا آئینہ دار ہوتی ہے۔ اگر قوم ترقی یافتہ اور آزاد خیال ہے تو صحافت بھی ترقی یافتہ اور آزاد ہوگی۔ جس قوم کی صحافت کا نصب العین حریت اور آزادی ہے وہ قوم آسمانوں کی بلندیوں کو چھونے لگے گی جس پر ساری دنیا کی نظریں ہوں گی اور اس قوم کے عروج کا ستارہ ہمیشہ ہمیشہ بلند ہوکر رہے گا۔ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا جلد پنجم ص پر صحافت کی تعریف یوں درج ہے۔

: PROFESSION OF GATHERING WRITING AND EDITING THE NEWS. OBSERVERS,REPORTERS AND COMMENTRATORS ON THE REST OF THE SOCIETY ...NALIST ENJOY A UNIQUE STATUS THAT AMPLY JUSTIFIES THEIR OCCSIONAL ...GNATION AS THE FOUTH ESTATE"

اس کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا آف امریکانا کی سولھویں جلد کے ص ۱۸۳ پر صحافت کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے۔

...NALISM,IS THE COLLECTION AND PERIODICAL DISSEMINATION OF CURRENT NEWS ...D EVENTS OR,MORE STRICTLY THE BUSSINESS OF MANAGING EDITING OR WRITING FOR JOURNALS OR NEWS PAPERS,"

"مقررہ وقت میں تازہ خبریں اور واقعات کو جمع کرنے کا نام صحافت ہے۔ یہ ایسا شغل ہے جس میں پورے انصاف کے ساتھ اخباروں اور جرنلس کے لیے خبریں تحریر مرتب کی جاتی ہیں۔"

صحافت جدید وسائل ابلاغ کے ذریعے، عوامی معلومات، رائے عامہ اور عوامی تفریحات کی مستند اشاعت کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ صحافت ایک ایسا فن ہے جس میں تخلیقی قوتوں کے صحیح استعمال سے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میا فیو آرنلڈ کے یہاں صحافت کے معانی اس طرح سے ہیں۔

"JOURNALISM IS A LITERATURE IN HURRY" صحافت عجلت میں لکھا گیا ادب ہے۔ ایک لحاظ سے یہ صحیح تعریف ہے۔ اس کے برعکس برنارڈ شاہ کا مشہور قول یوں ہے۔

"ALL GREAT LITERATURE IS JOURNALISM" اعلا ادب دراصل صحافت ہے۔

آج ہمارے سامنے پرنٹ میڈیا کے جو نمونے ہیں وہ سائنسی ایجادات کے رہین منت ہیں۔ اس سے قبل یعنی برسوں پہلے ابلاغ کے ذرائع اور وسائل کیا کیا تھے اس پر بھی ایک نظر ڈالیں۔

ابتدا میں انسان اپنے ارتقائی سفر میں بہت سست واقع ہوا ہے۔ چونکہ اپنے جذبات احساسات و خیالات کو دوسروں تک پہنچانا اس کی بنیادی ضرورت تھی اس لیے اس کے ذہن میں کھوجنے، تفتیش کرنے اور کچھ کر دکھانے کی دھن سوار تھی۔ وہ ابھی جنگلوں میں برہنہ اس درخت سے اس درخت پر اچھلتا کودتا رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنی مخصوص آوازوں سے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے لگا۔ مختلف آوازوں کے ذریعے

ہ آنے والے حادثے یا خطرے سے اپنے قبیلے کو آگاہ کرتا تھا یا کوئی خوشی کا پیغام ارسال
تا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے ڈھول یا نقارے جیسی چیز بھی استعمال کرنے لگا جس پر ضرب
لگا کر وہ مختلف آوازیں پیدا کرتا اور ان آوازوں کے زیر و بم میں ایک خاص مفہوم پوشیدہ
ہوتا تھا جس سے قبیلے کے لوگ واقف ہوتے تھے۔ یہ ایک طرح سے منادی کا طریقہ تھا
جسے آگے چل کر بادشاہوں نے اسی طریقے کو اپنایا۔

انسانی سوچ کی کوئی حد نہیں ہے وہ جتنا سوچتا ہے اس کی فکر کا دائرہ اتنا ہی
وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ابتدا میں اشاروں اور کنایوں کا دور تھا۔ پھر آوازوں نے اس کی
جگہ لی۔ الفاظ بننے لگے اور بولیوں کا وجود عمل میں آنے لگا۔ پھر انسان نے سوچا کہ آواز
اور خیالات کو مستقل روپ دیا جائے۔ چنانچہ تصویروں کا دور شروع ہوا۔ تقریباً چھے ہزار
سال پہلے دجلہ و فرات کی سرزمین میں تصویری رسم الخط کا آغاز ہوا۔ کئی برسوں تک یہی
حال رہا۔ آوازوں کے بنیادی عناصر کو حروف کا روپ دیا جانے لگا۔ چونکہ یونانیوں کا
ہن زیادہ زرخیز واقع ہوا ہے اس لیے انھوں نے حروف کو سادہ صورت دے کر لکھنے
ھنے کا کام آسان کر دیا۔ پھر رفتہ رفتہ دنیا کے مختلف حصوں سے رسم الخط ایجاد ہوئے
ں میں تین بڑے رسم الخط ہیں۔ سب سے پرانا اور زندہ جاوید رسم الخط چینی اور
پانی کا ہے جن میں اب بھی تصویری عناصر موجود ہیں۔ دوسرا رسم الخط رومن ہے۔
ر تیسرا یعنی جدید ترین رسم الخط عربی اور فارسی کا ہے۔

جب رسم الخط وجود میں آیا تو ایک سوال پیدا ہوا کہ کس پر لکھا جائے۔ ؟کسی
، درخت کی چھال استعمال کی اور کسی نے پتوں اور مومی تختیوں پر اپنے خیالات منتقل
یے۔ کوئی ساڑھے چار ہزار سال قبل مصریوں نے پانی کے اندر اگنے والے درخت پے پی
س کی چھال اتار کر، اس کے ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ کر ایک پلندہ سا بنا لیا اور اس
ر لکھنے لگے۔ پھر بھیڑ بکریوں کی کھال سے پارچے تیار کیے جانے لگے۔ اس طرح سے
اشعوری طور پر ذرائع ابلاغ میں اضافہ ہونے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ چین میں ایک ذہین اور طباع شخص سائی لون بادشاہ کی خدمت
میں حاضر ہوا اور کہا کہ ریشم کی کتابوں پر بہت لاگت آتی ہے جس نے یہ تدبیر سوچی
ہے کہ پھٹے پرانے کپڑوں، درخت کی چھال اور ماہی گیری کے نکمے جالوں کو کوٹ کر گودا
بنا لیا جائے۔ گودے کو ہموار سطح پر پھیلا دیا جائے اور اسے اچھی طرح دبایا جائے اور
جب خشک ہو جائے تو اس پر کتابت کر لی جائے۔ اس طرح سے کاغذ کی پہلی شکل
نمودار ہوئی جو تبلیغ کا بہت بڑا ذریعہ بن گیا۔

اس امر میں کوئی اختلاف نہیں رہا کہ سب سے پہلا چھاپہ خانہ چین میں ایجاد ہوا۔
کب ہوا۔؟ یہ بات تحقیق طلب ہے۔ لیکن یہ بات تو واضح ہے کہ سب سے پہلی کتاب
۸۶۸ء میں چین میں چھاپی گئی۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اپنی تصنیف "داستانِ صحافت"

کے صنا پر رقم طراز ہیں کہ:

"... چین کے صوبہ کانسو میں دنیا کی قدیم ترین کتاب دریافت ہوئی اس میں لکھا ہے کہ اس کتاب کو وانگ چی اے نے ۱۱ رمئی ۸۶۸ء کو مفت تقسیم کرنے کے لیے چھاپا تاکہ اس کے والدین کی یاد کو دوام حاصل ہو...."

چین میں تانگ خاندان حکمراں تھا۔ اس کے ماتحت ایک گزٹ "ٹی پاؤ" (دربار کی خبریں) کے نام سے جاری ہوا جسے دنیا کا پہلا مطبوعہ اخبار کہا جاتا ہے اور ۹۱۰ء کی بات ہے۔ اس کے بعد دنیا کے مختلف ملکوں میں چھاپے خانے قائم ہونے لگے اور اخبارات کی اجرائی عمل میں آنے لگی۔ یہ تھا دنیا میں ذرائع ابلاغ کی ابتدائی شکلوں کا سرسری جائزہ۔ آئیے دیکھیں کہ ہندستان میں ذرائع ابلاغ کا معیار کیا تھا اور کیا ہے۔

ہندستان میں انگریزوں نے پہلا چھاپہ خانہ ۱۶۷۴ء میں بمبئی میں قائم کیا اٹھارہویں صدی کے اواخر میں مدراس اور کلکتہ میں چھاپے خانے قائم کیے گئے۔ ۲۷ رمارچ ۱۸۲۲ء میں اردو کا پہلا مطبوعہ اخبار "جام جہاں نما" کے نام سے کلکتہ سے منشی سدا سکھ نے جاری کیا۔ اس سے قبل قلمی اخباروں اور پمفلٹوں کا رواج تھا اور اس سے قبل سب کچھ زبانی جمع خرچ کے دائرے میں آتا ہے۔

یورپ کی تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ وہاں ایک حویلی سے دوسری حویلی، ایک محل سے دوسرے محل اور ایک بادشاہ سے دوسرے بادشاہ تک خبریں لے جانے والے گشتی درویش تھے۔ جو مستقل طور پر یہاں سے وہاں نئی معلومات کی ترسیل کا کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ بعض مخبر ایسے بھی تھے جو ناچ گا کر نغمات کی شکل میں تازہ ترین اہم معلومات کی تشہیر کرتے تھے۔ عموماً یہ گانے اور ناچنے والے عجیب و غریب طرز کی بانسری بجاتے ہوئے گلی گلی گھوما کرتے تھے اور اطمینان سے نئی نئی باتیں معلوم کرتے تھے جس کے عوض امرا و بادشاہ انھیں انعام و اکرام سے نوازا کرتے تھے۔

ہندستان میں خبر رسانی کی سب سے قدیم شکل ہم کو منو مہاراج کے دور میں ملتی ہے۔ اس دور میں خبر رسانی کا جو طریقہ رائج تھا وہ اس طرح تھا۔

"... گانو کا چودھری اپنے گانو کے نیک و بد کا پتا دس گانوں کے چودھری کو دے اور دس گانو والا بیس گانو والے چودھری کو دے اور بیس والا سو والے کو اور سو والا ہزار والے کو اطلاع دے..." (بحوالہ ہندستانی اخبار نویسی از محمد عتیق صدیقی بار اوّل ص۱۲)

خبر رسانی کا یہ طریقہ اپنے دور کی ضرورت کو پورا کرتا تھا چوں کہ اس زمانے میں سواری وغیرہ کا انتظام نہ تھا اس لیے کسی گانو میں کوئی حادثہ پیش آتا تو کئی دنوں کے بعد دوسرے لوگوں کو سادھوؤں، درویشوں اور مسافروں کی زبانی اس کی

لاع ملتی تھی۔ پھر ہرکاروں اور قاصدوں کا دور شروع ہوا۔ قدیم دور کے کتبے اور
تون جو حال میں بازیافت ہوئے ہیں، ان پر لکھی گئی تحریر قدیم خبر رسانی طریقے کی اعلا
ال ہے۔ اشوک کے زمانے میں ستونوں اور چٹانوں پر ایسی عبارتیں کندہ کی جاتی
ہیں جو سرکاری قوانین، مذہبی احکام یا اخلاقی درس پر مبنی ہوا کرتی تھیں۔ کچھ
ون بعد تانبے کے پتروں سے تبلیغ کا کام لیا جانے لگا۔

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہوں نے اپنی سلطنت کو صحیح ڈھنگ سے چلانے
لیے اپنے ملک کے مختلف حصوں میں جاسوس چھوڑ رکھے تھے۔ ان کے ذمے یہ کام
تھا کہ وہ یہ معلوم کریں کہ آیا عوام میں کسی بغاوت یا انقلاب کے آثار تو نہیں ہیں۔
نہیں کوئی حاکم ظلم تو نہیں کر رہا ہے۔ کہیں رعایا پریشان حال تو نہیں ہے؟ الغرض
جاسوس رعایا کے درمیان رہ کر پل پل کی خبریں بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے
تے۔ صرف بادشاہ ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے بیوپاری تاجر اپنے اپنے مخبروں کو مختلف
لاقوں میں پھیلائے رکھتے تھے تاکہ بازاروں کے بھاؤ اور دوسری متعلقہ خبریں
پنے مالکوں کو بھیجتے رہیں۔

برصغیر کے ہر دور کی تاریخ میں خبر رسانی اور جاسوسی کا مقام تھا۔ شیر شاہ کے
ہد میں جاسوسی اور خبر رسانی کے ساتھ ساتھ ڈاک کا مکمل نظام تھا۔ ہر ضلع میں کوئی
کوئی اخبار نویس یا وقائع نگار ہوتے تھے۔ مخبروں کو غلط خبریں ارسال کرنے پر پھانسی
، لٹکایا جاتا تھا جس کی وجہ سے خبر بالکل صحیح صحیح اور پوری صحت کے ساتھ وقت کے اندر
ندر بادشاہ تک پہنچ جاتی تھی۔ مغل حکمرانوں کے دور میں وقائع نگار، سوانح نگار، خفیہ
نویس اور ہرکاروں کے ذریعے خبریں موصول ہوتی تھیں۔

پچھلی صدی میں بھاپ کی ایجاد نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ آسانیاں پیدا کیں
ر بیان نہیں کیا جا سکتا، جس سے قوموں اور انسانوں کے درمیان زیادہ گہرا رشتہ
استوار کیا جس کی بدولت صحافت نے بھی ترقی کی۔ اس نئی ایجاد سے سمندری جہاز،
ریلیں، پریس وغیرہ چلنے لگے اور کام میں تیزی آتی گئی۔ مہینوں کا کام ہفتوں میں اور
ہفتوں کا کام گھنٹوں میں پایہ تکمیل کو پہنچنے لگا۔ خبر رساں ادارے قائم ہوئے
تار برقی اور ٹیلی فون کی ایجاد نے صحافتی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ خبر رساں ادارو
کے بارے میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "صحافت پاکستان
و ہند" کے ص ۲۷۱ پر لکھتے ہیں۔

"خبر رساں اداروں کا آغاز تو حقیقت میں اسی وقت ہو گیا تھا جب
ایشیائی حکمرانوں نے اپنی مملکتوں کے گوشے گوشے سے وقائع نگار مقرر
کیے اور ان کی وساطت سے وہ تمام خبروں سے مطلع ہونے لگے ....
تین سو سال بعد پیرس اور لندن کے مشہور تجارتی ادارے رائٹس

پا بیلڈز نے خبروں کی بہم رسانی کے لیے پیغامبر کبوتروں کا استعمال کیا
اس ذریعے سے انھیں واٹرلو میں ولنگٹن کی شاندار فتح کی خبر سب
سے پہلے ملی۔"

اس طرح سے یورپ میں پہلی باقاعدہ خبر رساں ایجنسی "فرانس ھاناس" کے نام سے ۱۸۳۲ء میں پیرس میں قائم ہوئی۔ ۱۸۴۹ء میں لندن میں رائٹر نے اپنا دفتر کھولا اور تھوڑے ہی عرصے میں دنیا کی خبروں کا اجارہ دار بن گیا ۔ ہندستان میں پہلی خبر رساں ایجنسی کا قیام شملہ میں ہوا جس کا نام "ایسوسی ایٹیڈ پریس آف انڈیا" تھا۔ اس کے بعد سے ملک میں کئی ایک خبر رساں ادارے قائم ہوئے جن کا کام تازہ بہ تازہ خبریں بہم پہنچانا ہے۔ آج دنیا میں ابلاغ کا سب سے بڑا اور موثر ذریعہ اخبار اور میگزین ہیں۔ یونیسکو کی تحقیق کے مطابق دنیا میں ہفتہ وار اخباروں کے علاوہ روزناموں کی بائیس کروڑ کاپیاں شائع ہوتی ہیں۔ امریکہ میں ۹۰ فی صد لوگ اخبار پڑھتے ہیں۔ برطانیہ اور جرمن میں بھی یہی تناسب ہے جب کہ فرانس میں ۵۶٪، اٹلی میں ۳۹٪، جاپان میں ۷۰٪ اور مشرق وسطیٰ میں ۵ سے ۷ فی صد لوگ اخبار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہندستان میں اردو اخبار کی اہمیت کو بتانے کے لیے ایک دو حوالہ دینا چاہتا ہوں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ذرائع ابلاغ میں اخباروں کی کیا اہمیت ہے خواہ کسی بھی زبان میں ہو۔ ۱۸۵۵ء میں پادری لاجنگ نے ہندستانی اخبارو پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہندستانی اخباروں کی ظاہری شکل حقیر سی ہوتی ہے لیکن قومی گیتوں کی طرح وہ ہر اس موقع پر کامیاب ہوتے ہیں جہاں قانون ناکام رہتا ہے اور طوفان میں بہتے ہوئے تنکے کی طرح وہ ہوا کے رخ کی نشان دہی کرتے ہیں ... اور مطبوعات کے مقابلے میں دیسی اخباروں کی اشاعت کم ہوتی ہے لیکن ان کا حلقۂ اثر بہت وسیع ہے۔"

(مشمولہ ہندستانی اخبار نویسی ص۱۱)

دیسی صحافت کی حق گوئی و بیباکی سے متاثر ہو کر اس زمانے میں لارڈ کینگ نے کہا تھا:

"اس بات کو لوگ نہ تو جانتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں کہ گزشتہ چند ہفتوں میں دیسی اخباروں نے خبریں شائع کرنے کی آڑ میں ہندستانی باشندوں کے دلوں میں دلیرانہ حد تک بغاوت کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ کام بڑی مستعدی، چالاکی اور عیاری کے ساتھ انجام دیا گیا۔"

(مشمولہ ایضاً ص۳۵)

الکٹرانکس میڈیا میں سب سے موثر اور کامیاب میڈیا ریڈیو ہے۔ ریڈیو کو زندہ اخبار کہا جاتا ہے جو آواز کے ذریعے اپنے پیغام کو دوسروں تک پہنچاتا ہے اور

رات کی طرح رائے عامہ تشکیل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ ریڈیو سے ایک فائدہ ہے کہ ایک ناخواندہ بھی خبریں سن کر اپنے دور کے حالات سے باخبر رہتا ہے۔ آج ریڈیو کی اتنی مانگ ہے کہ بعض ریڈیو اسٹیشن ۲۴ گھنٹے کام کرتے رہتے ہیں۔ ریڈیو غ کا وہ موثر ذریعہ ہے جو منٹوں میں ایک جگہ کی خبر ساری دنیا میں پہنچا سکتا ہے۔ آج دنیا میں تقریباً ۴۵ کروڑ ریڈیو سیٹ خبریں سناتے ہیں۔ ہندستان میں ریڈیو ذریعے آبادی کا تقریباً ۸۹٪ حصہ اور رقبہ کا تقریباً ۸۰٪ حصہ اس سے مستفید ہوتا ہے۔

سائنس کی ترقی اور ایجادات و اختراعات نے وقت اور فاصلے کے تصور کو بالکل ہی مٹا دیا ہے۔ وہ زمانہ اور تھا جب خبریں صرف لکھی پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ آج خبریں دیکھی جاتی ہیں۔ گھر میں بیٹھے ہوئے جنگ میں ہونے والے کھیل کے مقابلے دیکھ سکتے ہیں۔ عراق اور سعودی عرب کا میدان کارزار کا بصری جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ایران میں آئے ہوئے زلزلے کے اثرات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ سٹیلائٹس کے ذریعے آج سب کچھ ممکن ہو گیا ہے۔ دید و شنید کی یکجائی نے ٹیلی ویژن صحافت کو تکنیکی طور پر ریڈیائی صحافت سے کہیں زیادہ آسان اور موثر بنا دیا ہے۔ ٹی وی پر پیش ہونے والی خبروں کے علاوہ فوکس، منی بلیٹنس، اسپورٹس راؤنڈاپ، بحث و مباحثے، انٹرویوز، شخصی، سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی و تمدنی فیچرز، نیوز ریلیز وغیرہ تمام پروگرام ابلاغ عامہ ہی تو ہیں۔

جدید دور میں فلم ابلاغ عامہ کا انتہائی موثر اور دلچسپ ذریعہ ہے۔ فلم میں کہانی کا بہانہ لے کر تہذیب، تمدن، معاشرت، فنون لطیفہ، ادب، سیاسی، سماجی، معاشی حالات انتہائی دلچسپ انداز میں دکھائے جاتے ہیں۔ ناظرین فلم کی افکار و نظریات کو قبول کرتے جاتے ہیں۔ ایک فلم سے ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ فلم اپنے زمانے کی عکاس ہوتی ہے۔ ناظرین اپنے زمانے کو دیکھ کر خود میں سدھار لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈراما، قوالیاں، فلمی نغمے، ڈانس، داستانیں سب یہ ذرائع ابلاغ ہی تو ہیں۔ کچی پوڑی اور کتھکلی ڈانس میں ہاتھوں کی مخصوص حرکات اور چہرے پہ تاثرات پوری داستان بیان کرتے ہیں۔

جدید دور میں پرنٹ میڈیا کے تحت ہینڈ بلز، پمفلٹس، پوسٹرس، سلوگنس ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور اجتماعات و تقریبات کے موقعے پر لاکھوں میں گشت کرائے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اشتہارات بھی ذرائع ابلاغ کا کردار ادا کرتے ہیں۔ موجودہ ذرائع ابلاغ، سائنسی ایجادات کی مرہون منت ہیں۔ جدید پرنٹنگ مشینری، برقی، ٹیلی فون، وائرلیس ٹیلی پرنٹر، فیکس، فوٹوگرافی، ویڈیوگرافی فوٹوگرافی، کارٹوگرافی، کمپیوٹر، سیٹلائٹس پوسٹرز، وغیرہ وغیرہ یہ تمام ایجادات ذرائع ابلاغ کے اہم کردار ہی تو

ہیں۔

اس وقت کئی خبر رساں ایجنسیاں ابلاغِ عامہ کی خدمت میں مصروف ہیں۔ جن میں اے ایف جی، رائٹر، انٹرنیشنل نیوز ایجنسی، فلش نیوز، یونائٹیڈ پریس انٹرنیشنل مڈل ایسٹ نیوز ایجنسی، عرب افریقین نیوز ایجنسی، ایسو سی ایٹیڈ پریس آف امریکہ، ایسوسی ایٹیڈ پریس آف انڈیا، پریس ٹرسٹ آف انڈیا، یونائٹیڈ نیوز آف انڈیا، پریس انفارمیشن بیورو، انڈیا نیوز اینڈ فیچر الائنس، کنگ فیچرس سنڈیکیٹ اور تصاویر ارسال کرنے والی ایجنسیوں میں گلوب فوٹو امریکہ، انٹرنیشنل نیوز فوٹو، لیونگ اسٹون، نیوز اینڈ فوٹو سروس وغیرہ وغیرہ کئی ایک ایجنسیاں ہیں جو ابلاغِ عامہ کی خدمت کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔

اس طرح سے ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح ذہن انسانی کا ارتقاء عمل میں آیا اسی طرح ذرائع ابلاغ میں پھیلاؤ آتا گیا۔ عقل حیران ہے کہ کب کون سی چیز سائنس ایجاد کر دے اور ابلاغ عامہ کو ایک اور اہم ذریعہ فراہم کر دے۔

ڈاکٹر احمد سجاد
پروفیسر شعبہ اردو
رانچی یونیورسٹی۔ رانچی

کلام اقبال کا وطنی تناظر

برصغیر ہند و پاک کے ہنگامہ خیز سیاسی ماحول میں حب الوطنی کے تعلق سے اقبال کی شاعری کا مطالعہ گزشتہ نصف صدی میں مختلف نشیب و فراز سے گزرا۔ کبھی یہ کہا گیا کہ اقبال شاعری کا ابتدائی دور وطنی شاعری کا تھا مگر بعد میں اسلامیت اور بین الاقوامیت کے زیر اثر وطنیت کے مخالف ہو گئے۔ کبھی یہ اعتراض کیا گیا کہ قومی یکجہتی کے بجائے وہ دو قومی نظریہ کے علم بردار بن گئے اور کبھی انھیں تقسیم ہند کا ذمے دار قرار دیا گیا۔ سچ پوچھیے تو اس طرح کے سوالات و اعتراضات کا بنیادی سبب یہ ہے کہ کلام اقبال کا مجموعی مطالعہ کرنے کے بجائے بعض لوگ انھیں مختلف خانوں میں تقسیم کر کے اپنے سوالات کے لیے من مانا ڈھنگ سے دلائل فراہم کرتے ہیں۔ یوں خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی مغالطے میں ڈالتے ہیں۔

اقبال کی پوری اردو، فارسی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو بانگ درا (۳ ستمبر ۱۹۲۴ء) ارمغان حجاز (نومبر ۱۹۳۸ء) سے اسرار خودی (۱۲ ستمبر ۱۹۱۵ء) اور مثنوی پس چہ باید کرد ... مع مسافر (۱۹۳۶ء) تک تقریباً ہر مجموعہ میں حب الوطنی سے متعلق خاصی تعداد میں اشعار اور نظمیں پائی جاتی ہیں۔ اوائل دور کی شاعری میں اگر "ہمالہ" نیا شوالہ اور شعاع امید" جیسی وطنی محبت سے سرشار شاہکار نظمیں ملتی ہیں تو اواخر دور میں "زمین، معزول شہنشاہ" نیز جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) اور پس چہ باید کرد و اے اقوام مشرق" (۱۹۳۶ء) میں تو ہندستان کی تاریخ، تہذیب، ثقافت اور اس کی غلامی پر تو نہایت موثر اور درد ناک اشعار پیش کیے گئے ہیں۔

اقبال "ہمالیہ" میں جہاں اپنے وطن کے کوہ وصحرا اور باغ و راغ پر فخر کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ؎

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا، وہ پاسباں ہمارا

وہیں وطن کی غلامی پر خون کے آنسو بھی بہاتے ہیں ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندستان مجھ کو	کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

غلامی اور محکومیت کی ذات سے نجات کے لیے وہ جہاں تعصب، نفرت، فرقہ پرستی اور نفاق سے اہل ملک کو بچانا ضروری سمجھتے ہیں وہیں پریم، محبت، بھائی چارہ وسیع النظری اور اتحاد و اتفاق کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بخت خفتہ کو بیدار قوموں نے

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیری امتیاز ما و تو رہنا

مگر سفر یورپ اور پہلی جنگ عظیم کے بعد اقبال کے وطنی تصورات میں بتدریج وسعت اور بالیدگی پیدا ہوتی چلی گئی۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں اپنی ایک تقریر میں کہا تھا:

"ہندستان کی سیاسی غلامی، تمام ایشیا کے لیے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ ہے اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اسے اظہار نفس کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے جس کی بدولت کبھی اس میں ایک شاندار تہذیب پیدا ہوئی تھی۔"[1]

واضح ہو کہ شری اربند وگھوش کی طرح اقبال نے بھی تین خواب دیکھے تھے۔ وطن کی آزادی، ایشیا کی بیداری اور عالم گیر اتحاد انسانی کے خواب۔ جس طرح اقبال کے یہاں خودی کا تصور فلسفہ حیات وکائنات کی بنیاد ہے اسی طرح اربند وگھوش کے یہاں یوگا کا تصور ہے۔ اقبال وطنی محبت کے ساتھ ہی ساتھ انسانوں کو ازلی اور ابدی روحانی بنیادوں پر متحد کرنا چاہتے تھے اور اربند وگھوش بھی یہی چاہتے تھے۔ اقبال نے ہمہ اوستی تصوف کی بے عملی اور زندگی سے گریز کا رخ حرکت وحیات کی جانب موڑ دیا۔ اروبندو نے بھی ویدانتی فکر کے ترک عمل اور ترک دنیا کے طلسم کو توڑ کر باعمل اور فعال زندگی کا درس دیا۔ اروبندو کا آئیڈیل گیتا کا فلسفۂ عمل اور شری کرشن جی کی ذات تھی۔ اقبال کے لیے قرآنی تعلیم اور عشق رسولؐ سرچشمۂ نور وعرفان تھے۔ دونوں نئی دنیا اور نئے آدم کی تخلیق کی آرزو اور تمنا کرتے رہے۔ دونوں کے مخاطب زیادہ تر نوجوان نسلیں اور آنے والی نسلیں تھیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہی نسلیں مستقبل کی پاسباں اور نئی دنیا .... کی تخلیق وتعمیر کی صورت گر تھیں۔ دونوں عقل کی نارسائی اور عشق کی برتری کے قائل تھے۔ دونوں فنا کے بجائے بقا اور تقلید کے بجائے تخلیق کا درس دیتے رہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ بعد کے دور میں اقبال کی اسلامیت اور بین الاقوامیت ان کی وطن دوستی کے منافی ہیں، صحیح نہیں اروبند وگھوش کی طرح اقبال کی حب الوطنی بھی شک وشبہہ سے بالاتر ہے۔ اقبال نے قرآن اور اسلام کو تنگ نظر فرقہ پرستانہ نقطۂ نظر سے اختیار نہیں

---

[1] بحوالہ اقبال اور انسان، اشفاق احمد۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی ۱۹۷۱ء، صفحہ ۳،

یا تھا کہ وہ وطنی محبت سے کنارہ کش ہو جائیں۔ وہ خود کہتے ہیں کہ:

"قرآن کا حقیقی منشا یہ ہے کہ ذہنِ انسانی میں اس تعلق کا جو اسے کائنات اور خالق کائنات سے ہے اعلا اور بہتر شعور پیدا ہو۔"

اس "اعلا اور بہتر شعور" کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی جنگ عظیم میں سامراجی قوتوں نے جب نسل پرستی اور وطن پرستی کی اس عالمی بیماری سے پوری دنیا کو جہنم زار بنا دیا تو اقبال نے اس مہلک تصور پر ضرب کلیمی کی ؎

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اروبندو یا اقبال کی دین داری اور خدا پرستی نے نسل پرستی کی مذمت ضرور کی مگر حب الوطنی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ کیونکہ حب الوطنی کے معنی ہیں وطن کے ساتھ محبت اور پیار کا رویہ اختیار کرنا، گروہ کی زندگی اور اقدار کی تحسین کرنا اور وطن کے دفاع میں بڑی سے بڑی مشقت اٹھانا، حتی کہ جان کی قربانی کے لیے بھی تیار رہو جانا۔ اس نقطہ نظر سے حب الوطنی کوئی برائی نہیں بلکہ ایک مثبت خوبی ہے جس کی اسلام تاکید کرتا ہے۔ یہ تو مذہبی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ محبت کرنا، خدمت کرنا، ظلم اور ناانصافی کے خلاف اپنی قوم اور ملک کی حفاظت کرنا مگر "قوم پرستی" حب الوطنی سے بالکل مختلف ہے۔ قوم پرستی کا جوہر یہ ہے کہ قومی اکائی کے مفادات خیر و شر کے لیے آخری معیار ہے جس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ وہ قوم اپنے افراد کی پیدائشی خصوصیت کی بنا پر دنیا کی ساری اقوام سے افضل ہے اور اس لیے اس کے مفادات کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہیے۔ اس مفروضہ کی بنیاد پر قوم پرستی اپنے معتقدین سے مکمل وفاداری کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کا دعوا دراصل قوم پرستی کو حقیقت عظمیٰ کی حیثیت سے پیش کرنا ہے۔ راسخ العقیدہ قوم پرست ــــ خواہ یہودی ہو، جرمن ہو، فرانسیسی ہو یا روسی ہو یا برطانوی و امریکی ہو ـــــ وہ یہودیوں، جرمنوں، انگریزوں، روسیوں اور امریکیوں کو فی الواقع حقیقتِ عظمیٰ کا درجہ دیتا ہے اور اس کو خیر و شر کا آخری معیار تصور کرتا ہے۔

اس نسل پرستانہ اور قوم پرستانہ نظریے نے انگریز، یہودی، جرمن روسی اور امریکی و فرانسیسی قوم کو بھلا کر حقیقت کبریٰ یعنی الوہیت تک پہنچا دیا اور دنیا پھر جلد ہی دو عظیم جنگوں میں جھونکی گئی۔ اس نسل پرستانہ تصور نے دنیا کے بہت سے ملکوں کے اندر اب فرقہ پرستی، ذات پرستی، علاقہ پرستی اور بہت سی پرستشوں کو عام کر کے نہ صرف انسانی روابط کو غارت کر ڈالا ہے بلکہ بہت سی اخلاقی خرابیوں، خاندانوں کی تباہی، ناخواندگی، کاہلی، جنگ جوئی، دہشت گردی، اسلحوں کی فراوانی، فطرت کے انعامات کا اندھا دھند استعمال اور ان سب پر مستزاد کائنات کی طبعی قوتوں کے توازن کا خطرہ۔ بقیہ غارت گری کی کمی کو پورا کر رہا ہے

ان وحشت ناک تجربات کے بعد اب دانشوران عالم ورلڈ رول، ورلڈ آرڈر اور ورلڈ ریلیجن کی باتیں کہنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

اقبال نے سفر یورپ کے دوران ان تلخ حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے وہاں سے واپسی کے بعد انھوں نے وطن پرستی کے خطرناک رجحان کے بجائے حب الوطنی اور مادر وطن سے پیار و محبت اور اس کی خدمت پر اپنی پوری صلاحیتیں صرف کر دیں۔

اقبال کی حب الوطنی کا واقعی اندازہ کرنے کے لیے ان کی عظیم شاعری کی گہرائی و گیرائی اور وسعت و کشادگی کو اس کے پورے تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ مثلاً اپنی تمام تر بین الاقوامیت اور اسلامیت کے باوجود انھوں نے اپنے اردو فارسی کلام میں مادر وطن کے مظاہر فطرت، تاریخ، تہذیب، عظیم شخصیات، فکر و فلسفہ اور جد و جہد آزادی کے مختلف نشیب و فراز کو تخلیقی انداز میں پوری وسعت قلبی کے ساتھ برتا ہے۔

وہ زمینی، آسمانی فضائی اشیاء و اجسام، موسم، چرند و پرند، بچوں، پالتو جانوروں، کوہ و صحرا، ندی نالے، پھول اور چاند تاروں کا بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر جب بھی ذکر کرتے ہیں تو ان کا پس منظر عام طور پر ملکی و وطنی ہی ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو ان کی نظم "ہمالہ، ابر کہسار" اور پیام مشرق کی نظم کشمیر وغیرہ۔ جاوید نامہ جو دنیائے شاعری کا ایک انمول رتن ہے۔ اس میں سیر افلاک کے دوران بھرتری ہری سے ملاقات کے بعد اقبال جب ٹیپو سلطان کی روح سے ملاقات کرتے ہیں تو ان کی فرمائش پر وہ اپنے مادر وطن پر انگریزوں کے ظلم و ستم کی درد بھری کہانی سناتے ہیں۔ ٹیپو سلطان کے لفظوں میں وہ دریائے کاویری کو اسلامی ملکوں کے دریائے جیحوں و فرات سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں ؎

اے مرا خوشتر ز جیحون و فرات
اے دکن را آب تو آب حیات

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" میں اقبال نے ہمالیہ اور گنگا کے مکالمہ کے دوران ملک کی غلامی پر جس طرح خون کے آنسو بہائے ہیں وہ قابل ذکر ہے۔

اسی طرح ملک کی نامور شخصیات میں گوتم، شیواجی مہاراج (جہاں دوست)، رام، نانک، بھرتری ہری، سوامی رام تیرتھ اور ٹیپو، غنی کاشمیری، غالب، بیدل، محمد علی جوہر، شبلی، حالی وغیرہ کے حوالے سے انھوں نے ملک کی تاریخ، تہذیب، فکر و فلسفہ اور ان کی اعلا تعلیمات، نیز بہترین اخلاق سے جس طرح اخذ و استفادہ کیا ہے اور انھیں اپنا جزوی آئیڈیل بنایا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ رام چندر جی کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں ؎

تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

ورگرو نانک جی کے بارے میں کہتے ہیں کہ ؎

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے

بانگ درا میں انھوں نے "آفتاب" کے عنوان سے گائتری کا جو ترجمہ کیا ہے اس میں سورج کو جلال و جمال کی علامت اور وجود و عدم کی نمود کا باعث قرار دیا ہے۔ فلک قمر پر فسیواجی مہاراج سے ملاقات ہوتی ہے تو ہندستان کے اس قدیم عارف (جہاں دوست) اور رومی سے عالم آدم اور حق پر گفتگو ہوتی ہے اور وہ مشرق و مغرب کے رجحانات اور بیداریِ مشرق کے موضوع پر بھی اظہار خیال ہوتا ہے ؎

عرشیاں را صبح عیداں ساعتے
چوں شود بیدار چشمے ملتے

(آسمان پر رہنے والوں کے لیے وہ گھڑی صبح عید کی طرح ہے۔ جب قوم نیند سے بیدار ہو جاتی ہے اور وہ آزادی حاصل کر لیتی ہے)

جدوجہد آزادی کے دوران ۱۹۲۰ء میں ہندستان کے سیاسی لیڈران گرفتار کر لیے گئے "اسیری"، کے زیر عنوان ایک پُر اثر نظم تخلیق کی۔ اسی طرح شہدائے جلیانوالہ باغ کے غم میں کہتے ہیں ؎

ہر زائرِ چمن سے کہتی ہے خاک باغ	غافل نہ رہ جہاں میں گردوں کے چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم	تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

چنانچہ سرگزشت آدم ہو یا "تصویر درد"، "ترانہ ہندی" ہو یا "ہندستانی بچوں کا قومی گیت" یا زبورِ عجم کا "بندگی نامہ"، اقبال نے ہر جگہ وطن کی حالت زار کو بہتر بنانے اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہ کرنے کی نہایت پُر اثر اور پُر درد اپیل کی ہے۔

'جاوید نامہ' میں حضرت رومی کی رہنمائی میں ایک مقام پر جب ان کی ملاقات جعفر و صادق جیسے غدارانِ وطن سے ہوتی ہے تو اس پر وہ جس طرح اظہار نفرت کرتے ہیں اس سے وطن کے لیے اقبال کے قلبی تعلق اور روحانی کرب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

جعفر از بنگال و صادق از دکن	ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن
ناقبول و نا امید و نا مراد	ملت از کار ایشاں اندر فساد

اقبال کے خیال میں سامراجی ظلم و ستم کا مقابلہ ستیہ گرہ اور اہنسا سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس تصور سے مجبور اور محکوم کو صبر کی عادت پڑ جاتی ہے اور حاکم بھی مسلسل جبر کا عادی ہو جاتا ہے۔ اس لیے اصلی تصور فقر وہ ہے جس میں حاکمیت کی سی طاقت اور جارحانہ قوت ہو۔ جب تک یہ انقلابی فقر قوم کا مسلک نہ بنے آزادی کی امید کم ہے

الحذر از جبر و ہم از خوئے صبر
جابر و مجبور را زہر است جبر

انگریزوں کی چال، لڑاؤ اور حکومت کرو کے نتیجے میں فرقہ وارانہ سیاست کا بازار گرم ہوا تو برصغیر کے قابل ذکر دانشوروں کی طرح سیاسی تصفیے کے لیے اقبال نے بھی اپنی تجاویز پیش کیں جن کا مقصد وحید ہی یہی تھا کہ برطانوی سامراج کی سازش کامیاب

نہ ہو اور ملک کے تمام ہی فرقے باہم صلح وصفائی اور امن وآشتی اور اپنی تہذیبی انفرادیت اور شناخت کے ساتھ ملک کے مستقبل کو نکھارنے اور سنوارنے میں لگ جائیں

غرض موصوف زندگی بھر اپنے علم، ادب، شاعری اور سیاست کے ذریعہ انسانی فوز فلاح اور ملک کی آزادی و ترقی اور اتحاد و یکجہتی کی تعلیم وتلقین کرتے رہے۔ ضرب کلیم مشہور نظم "شعاع امید" میں اپنی امیدوں اور آرزوں کا مرکز اپنے وطن ہی کو بنایا ہے ان کے اشعار ہیں ؎

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی
جن کے لیے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب

مختار شمیم
ایف ۲۔ گورنمنٹ گرلس پوسٹ گریجویٹ کالج کیمپس۔
موتی طویلہ روڈ، اندور ۴۵۲۰۰۴

ظہیر دہلوی بہ حیثیت مرثیہ نگار

راقم الدولہ ظہیر دہلوی نے اپنی خود نوشت سوانح داستانِ غدر میں اپنے ایک قلمی دیوان کا ذکر
ا ہے۔ اس دیوان میں "ایک جلد کے قریب مرثیے اور رباعیات[1] کے علاوہ (صاحب گلِ رعنا کے بقول)
لیات و قصائد بھی شامل ہیں[2]۔ چونکہ یہ قلمی دیوان دستیاب نہیں تھا اس لیے قیاس کر لیا گیا
ا کر اس کا مسودہ ظہیر کے نواسے میر اشتیاق حسین شوق کے ذریعے سے کسی ادب دوست تک
ہنچا ہو گا یا پھر ان کے ورثا کی تحویل میں ہو گا۔ چنانچہ ظہیر کے مذکورہ دیوان کی تلاش انھیں
طوط پر کی گئی۔

اسی دوران مرثیہ نگارانِ اردو جلد اول میں ظہیر کی مرثیہ نگاری سے متعلق ایک مختصر نوٹ
ظر سے گزرا۔ لیکن اس میں ماخذ کا کوئی ذکر موجود نہ تھا اور اس کتاب کے مرتب سے راقم الحروف
د کوئی تشفی بخش جواب بھی نہ ملا۔ تاہم ظہیر کے غیر مطبوعہ کلام کی تلاش جاری تھی کہ علی جواد زیدی صاحب
ن کتاب دہلوی مرثیہ گو جلد اول ۱۹۸۶ء میں اور جلد دوم ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔ دہلوی مرثیہ گو
بلد اول میں جناب علی جواد زیدی ظہیر کی مرثیہ گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ظہیر دہلوی کی مرثیہ گوئی کی اطلاع مجھے ان کے نواسے حکیم اشتیاق حسین صاحب
سے دلی میں برسوں پہلے ملی تھی۔ ظہیر کے ورثا پاکستان جا چکے تھے۔ اشتیاق
مرحوم نے انھیں خط لکھا لیکن وعدے کے مطابق نقل حاصل نہ ہو سکی۔ اشتیاق
صاحب کی حیات تک میرا تقاضا جاری رہا لیکن آں قدح بہ شکست و آں ساقی
نماندہ"[3]

دہلوی مرثیہ گو جلد دوم میں جناب علی جواد زیدی نے ظہیر دہلوی کے احوال و آثار کے ساتھ ساتھ ان
کے مرثیوں کے چند نمونوں کے دستیاب ہونے کا واقعہ بھی بیان کیا ہے:۔

"ظہیر کے مراثی کی تلاش مدتوں جاری رہی۔ پہلے تو لاہور میں ڈاکٹر سید صفدر حسین
کو لکھا۔ انھوں نے پاکستان میں رثائی ادب کی تحقیق و احیا کے سلسلے میں نمایاں
کام کیا تھا لیکن وہ اللہ کو پیارے ہو گئے اور میں تقریباً مایوس۔ یکایک

> لکھنؤ میں جناب ضمیر اختر نقوی سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی پاکستان میں مرثیوں پر بہت مفید کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے یہ خوش خبری سنائی کہ وہاں اب ظہیر کے مرثیوں کا کلیات دستیاب ہو گیا ہے، اس میں ۱۹ مرثیے ہیں اور از راہِ کرم انھوں نے چند نمونے بھی بھیجے۔[۴]

یقیناً ظہیر دہلوی کے مرثیوں کی دریافت کا سہرا جناب ضمیر اختر نقوی کے سر ہے اور ارباب جناب علی جواد زیدی کے ممنون ہیں کہ ان کی وساطت سے ظہیر کے مرثیوں کے "چند نمونوں" سے اردو دنیا روشناس ہوئی۔ راقم الحروف نے بھی پاکستان میں اپنے وسائل آزمائے لیکن خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر یونس حسنی (جامعہ کراچی) راقم کے دیرینہ کرم فرما ہیں۔ ایک عرصہ سے انھیں اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں مطلع کرتا رہا ہوں اور پاکستان میں ظہیر کے غیر مطبوعہ دیوان کی تلاش کے سلسلے میں بھی انھیں وقتاً فوقتاً زحمت دیتا رہا ہوں۔ کسی حد تک ناکامی کے باوجود امید کی کرن مدھم نہیں ہوئی ہے۔ شاید پردۂ غیب سے کچھ ظہور میں آجائے۔ علی جواد زیدی صاحب کے حوالے کے بعد جناب ضمیر اختر نقوی سے مراسلت کا نتیجہ بھی ابھی تک برآمد نہیں ہوا ہے۔ یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ ضمیر اختر نقوی صاحب کو "دستیاب کلیات" کی اشاعت کی کیا صورت ہوئی؟[۵]

مرثیہ نگار کی حیثیت سے میر انیس اور مرزا دبیر کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت کے سبب اردو مرثیہ کی تحقیق و تنقید لکھنؤ تک آ کر سمٹ گئی ہے۔ انیس و دبیر کے عروج کے دوران ہی دلی میں اردو مرثیہ کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی گئی۔ حالانکہ علی جواد زیدی کے بقول "دلی میں بیانِ مصائب کی روایت کافی قدیم ہے۔[۵] خانقاہوں سے لے کر محلوں تک مرثیہ گوئی اور سلام نگاری کو حصولِ ثواب اور اظہارِ عقیدت کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا تھا۔ خود بادشاہ ظفر بھی "محرم میں کم سے کم ایک سلام ضرور کہتے۔"[۶]

ظہیر دہلوی کا تعلق ایرانی خانوادے سے تھا۔ مرثیہ خوانی اور مرثیہ گوئی اگرچہ انھیں ورثہ میں ملی تھی لیکن ان کی شاعری پر اُن کے ماحول کا بھی گہرا اثر پڑا ہے۔ ظہیر دہلوی کے معاصرین میں (کسی حد تک)، شاہ نصیر، ذوق، ظفر، عارف، مجروح، سالک اور عزیز نے اردو مرثیے کی ترقی میں قابلِ ذکر خدمات انجام دی ہیں۔

ظہیر دہلوی کو اہلِ بیت سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ اس کا اظہار جا بجا دیگر اصنافِ سخن میں بھی ہوا ہے۔ لیکن مرثیہ کا میدان ان کی اس ارادت و عقیدت کے لیے بڑی وسعت رکھتا تھا۔ ظہیر کے شاعرانہ مسلک کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ اپنے مذہبی جذبات کو فکر و فن کی آنچ دے کر اردو مرثیے کی نکھری ہوئی شکل میں پیش کر سکیں۔ محض مذہبی جذبات کی آئینہ داری

---

[۴] کتاب نما کے ذریعے پاکستانی اہلِ قلم خصوصاً کرار میرزا نوری، مشفق خواجہ صاحب اور ضمیر اختر نقوی صاحب سے مکرر درخواست ہے کہ وہ ظہیر کے مرثیوں کی بازیافت کے سلسلے میں میری مدد فرمائیں۔ کرار میرزا نوری صاحب کا تعلق ظہیر دہلوی کے خاندان سے ہے۔ (م ۔ ش)

ﺎ صنف کو ایک مقررہ سطح سے اس وقت تک بلند نہیں ہونے دیتی جب تک کہ اس میں خلقیت
ﺎدبیت کی حسن کاری شامل نہ ہو۔ ظہیر کے پیشِ نظر اردو مرثیہ کی یہی صورتِ حال تھی۔ یہ تو
ﮨﯿﮟ کہ وہ انیسؔ و دبیرؔ کی طرح اردو مرثیے میں کوئی نئی بات پیدا کر رہے تھے یا اُن کے مرثیے
ﺩ شاعری میں ایک نوع کی ترقی کا باعث تھے۔ البتہ انھوں نے اردو مرثیے کے ادبی معیار
قائم رکھنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ظہیرؔ کے پیشِ نظر انیسؔ و دبیرؔ کے مراثی تھے اور کس
ﮏ ظہیرؔ نے ان کی پیروی کو مقدم سمجھا ہے۔ مثلاً ظہیرؔ کے ایک مرثیے میں صبح کا یہ بیان'
ﺮانہ منظر نگاری کا ایک ایسا نمونہ کہا جا سکتا ہے جس کی مثال انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں
ﮨﯽ مل سکتی ہے:

گلگونۂ شفق جو ہوا رونمائے صبح
نوشاہِ روزگار نے پہنی قبائے صبح
گردونِ لاجورد پہ پھیلی ضیائے صبح
تاباں ہوا تجلیِ نورِ بقائے صبح

ہر شخص محوِ صنعتِ ربِّ خلق ہوا
والشمس والضحیٰ کا جہاں میں سبق ہوا

اردو مرثیے میں رزمیہ عناصر کی وجہ سے "جنگ" کے موقع پر کسی ضمنی موضوعات کو
ﻧﮯ کی گنجایش نکل آئی ہے' انھیں میں گھوڑے اور تلوار کی تعریف بھی ہے۔ مرثیہ نگار
ﻥ جنگ سے واقف ہوا اور اس نے گھوڑسواری اور شمشیرزنی کو ایک ماہرِ فن کی طرح
ﺎ ہو تو اس قسم کے مضامین میں واقعیت اور وسعت پیدا کرنا اس کے لیے مشکل امر
ﺎ۔ پھر بیان میں صنعتوں کا التزام اس کی قادرالکلامی کی دلیل ہوگی۔ ظہیر دہلوی کے مرثیے
ﺝ ذیل حصے اس معیار پر بڑی حد تک پورے اترتے ہیں:۔

یوں اُڑ کے وہ شبدیز جہندہ گیا سن سے
جس طرح براقِ نبوی چرخِ کہن سے
آوارہ ہوئی نکہتِ گل جیسے چمن سے
یا طائرِ جاں اُڑ گئے کفار کے تن سے

پستی میں جھکا اور کبھی اوج پہ پہنچا
رف رف کی طرح اڑ کے سرِ فوج پہ پہنچا

ناگن تھی تڑپتی دہنِ مار سے نکلی
اک برقِ غضب پہلوئے رہوار سے نکلی
مانندِ مہِ نو کے شبِ تار سے نکلی
اور روح ادھر قالبِ اشرار سے نکلی

نکلی جو یہ ناگن تو جگر کاٹتی نکلی
اعدائے پیمبر کا لہو چاٹتی نکلی

ظہیر دہلوی کے مرثیوں کی اصل خوبی سادگی میں پُر کاری اور روانی و برجستگی میں ہے۔ مثلاً عون ؓ کی تعریف میں یہ بند ملاحظہ ہو۔

نورِ نظرِ جعفرِ طیار ہیں دو چاند
لختِ جگرِ حیدرِ کرار ہیں دو چاند
اور زینبِ ناشاد کے دلدار ہیں دو چاند
یہ چاند نہیں مہرِ پُر انوار ہیں دو چاند

افلاکِ شرافت پہ مہِ برجِ شرف ہیں
بحرینِ نجابت کے یہی دُرِ نجف ہیں

اسی طرح حُر کی تعریف ملاحظہ ہو۔

جب دولتِ کونین سے دل شاد ہوا حُر
اور کفر کی تقلید سے آزاد ہوا حُر
کیا موردِ افضالِ خداداد ہوا حُر
جویائے حق و طالبِ ارشاد ہوا حُر

فردوس ملا راہ میں نکلا تھا سفر کو
پہنچا ہے کہاں بھول کے جاتا تھا کدھر کو

مراثی ظہیر کا تفصیلی مطالعہ اور ان پر سیر حاصل تبصرہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب ان کے مکمل مرثیے ہمارے سامنے ہوں۔ تاہم ظہیر دہلوی کے مرثیوں کے چند نمونوں کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس فن میں بھی کامیابی سے گزرے ہیں۔

حوالے :-

ؔ۱ داستان غدر، از ظہیر دہلوی، ص ۳۱۳۔
ؔ۲ گل رعنا از حکیم عبدالحی۔ ص ۴۲۸۔
ؔ۳ دہلوی مرثیہ گو (جلد اول) از علی جواد زیدی، ص ۶۰
ؔ۴ " " (جلد دوم) " ص ۲۶
ؔ۵ " " (جلد اول) " ص ۲۶
ؔ۶ ایضاً ص ۳۹

…نسیم سحر
…بست بکس ۵۹۲۵ جدہ ۳۱۲ ۲۱۴۳

غزل

…نے عشق میں یہ بھی کمال اُس نے کیا
…بن میرے ہی جیسا اپنا حال اُس نے کیا

…ماسے پہلے تو مجھ کو پائمال اُس نے کیا
پھر میرے لیے کتنا ملال اُس نے کیا

…ں میری آنکھوں میں اِس آنکھ میں پھر اُس کا عکس
…آنکھوں کو جب آئینہ مثال اُس نے کیا

…لیا ہیں رُوبرو اُس شخص کے کیوں لاجواب؟
…ابتاؤں میں کہ مجھ سے کیا سوال اُس نے کیا

…ٹ گئے خود اُس کے اپنے چہرے کے بھی کچھ نقوش
…تھا جب مجھے خد و خال اُس نے کیا

…کر اپنا لہو لایا تھا میں تو اک چراغ
…در پھر اک دن ستاروں کا سوال اُس نے کیا

…ندہ رہنے کے لیے تازہ ہوا مانگی نسیم
…ب چلی تازہ ہوا کتنا نڈھال اس نے کیا

علقمہ شبلی
۹۶ … کلکتہ ۷۰۰۰۱۴

خودفراموشی

تلاش کرتا رہا میں اُسے زمانے میں
زمیں میں، چاند میں، سورج میں، آسمانوں میں
مہک میں پھول کی، کلیوں کے مسکرانے میں
دل و نگاہ کی پُر کیف داستانوں میں
سکوتِ بحر میں، موجوں کے گنگنانے میں

مری تلاش کو لیکن نہ مِل سکی منزل
نہ پا سکی مری تشنہ لبی کوئی ساحل

مگر جو خود کو فراموش کر دیا میں نے
قدم قدم پہ چمن ایک کھل اُٹھا جیسے

گلِ مراد سے دامن بھی بھر گیا جیسے
اسے قریبِ رگِ جاں ہی پا لیا میں نے

حیدر قریشی
ایف ۱۸۳/ محلہ کھوکھراں۔ خانپور
رحیم یار خان

وجود اُس کا اگر اس پہ منکشف ہوجائے
مجھے یقین ہے وہ خود سے منحرف ہوجائے

میں روشنی ہوں تو اترا ہوں روح تک اس کی
وہ آئینہ ہے تو پھر مجھ پہ منعطف ہوجائے

جو منہ سے بنتا ہے منکر مرا اسے کہ دو
کہ حوصلہ ہے تو دل سے بھی منحرف ہوجائے

وہ یوں نہ ترک تعلق کا خط بھی لکھ پایا
کہ لکھتے وقت کہیں خط نہ مختلف ہوجائے

بھٹکتا پھرتا ہے پھر کیوں مرے خیالوں میں
وہ خود پسند ہے تو خود میں معتکف ہوجائے

بدر نظری
بنیا پوکھر، گیا۔ ۸۲۳۰۰۱
بہار

دیکھ نہ یوں تو باہر دیکھ ، کچھ باہر کچھ اندر دیکھ
تنگ کنواں ہے جسم ترا ، دل کا گہرا ساگر دیکھ

کھول کے اپنے دل کا پٹ ، مجھ سا ایک قلندر دیکھ
کیا لکھا ہے اس کو پڑھ ، مت یوں روئے سخنور دیکھ

پھر بکھرے گا میں تیرا ، درد کا اترا لشکر دیکھ
پانو ترا کھل جائے گا ، دیکھ تو اپنی چادر دیکھ

کشتیٔ دل پھر ڈوبے گی ، شوق کا اُمڈا ساگر دیکھ
اس کے چہرہ کو پڑھ کر ، لکھا اپنے دل پر دیکھ

انساں کی عظمت پہچان ، ہیرا دیکھ نہ پتھر دیکھ
دیکھ نہ یوں دستار کے پیچ ، رہزن ہے یا رہبر دیکھ

جسموں کی مظلومی پڑھ ، اس میں اترتا خنجر دیکھ
معصوموں کی آنکھوں میں ، قہر کا ایک سمندر دیکھ
سمٹے سہمے پنچھی ہیں ، صیادوں کے تیور دیکھ

عطاء الرحمن جمیل
نمبر ۲ ہولی لین دوسرا منزلہ رینگ روڈ
شا تولی۔ ڈھاکہ، ۱۲۰۷ بنگلہ دیش

غزل

ہر شخص تیری دید کا شیدا دکھائی دے
وہ اور ہے کہ جس کا سراپا دکھائی دے

پیچھے ہٹو تو شہرِ خموشاں ہے آگ کا
آگے بڑھو تو برف کا دریا دکھائی دے

ذرہ کہو تو پیاس کا قطرہ سلگ اُٹھے
قطرہ کہو تو خون کا دریا دکھائی دے

آنکھوں میں دھوپ بھر کے جو تپتی ہوئی غزل
کہنے لگو تو پھول سا مکھڑا دکھائی دے

وہ رنگ رُخ کہ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ
جب بھی ملے نگاہ تو تازا دکھائی دے

شکوہ کروں تو کس سے کروں کس کے سامنے
دیکھو جسے وہ اپنے ہی جیسا دکھائی دے

شمس رمزی
۹۸۳ سیکٹر ۹
پنچکولہ۔ ہریانہ

غزل

یوں بظاہر دیکھیے تو یار سب
وقت پڑنے پر مگر بیکار سب

ریت مدت سے یہی ہے شہر کی
حق کہے جو اب چڑھے وہ دار سب

ہم انا کی پوٹلی تھامے رہے
وہ جو خالی ہاتھ تھے "ہیں پار سب"

اے خدا تو نے بنائی تھیں وہ کیا
جس کی آنکھوں سے ہوئے سرشار سب

کچھ سکوں شاید میسر ہو ہمیں
چھوڑ کر دیکھیں کبھی گھر بار سب

خالد طور

ساون رنگ

دیکھے ہیں نکھرتے رنگ ترے
آنکھوں نے کھلی برساتوں میں
کچھ صبحوں میں کچھ شاموں میں کچھ رِم جھم کرتی راتوں میں
گھنگھور گھٹا چھم چھم برسی !
جب گیت ہواؤں نے چھیڑے
کتنے ہی فسانے آنکھوں میں
رنگین اداؤں نے چھیڑے
کچھ حُسن کے نازک نازوں میں کچھ عشق کی چنچل گھاتوں میں
گھنگھور گھٹاؤں کا اُٹھنا
اور تیز ہواؤں کی سَن سَن
رہ رہ کر من میں ہُوک اُٹھے
تھر تھر کانپے نازک سا بدن
پل پل چھپنا یاد آتا ہے پیڑوں کے گھنیرے چھاتوں میں
بادل کا برس کر کُھل جانا، ہر سمت وہ جل تھل کا عالم
مدہوش ہوا بھیگی بھیگی، ہر دل میں ہل چل کا عالم
کیا کچھ نہ کہے خاموش زباں آنکھوں کی نشیلی باتوں میں

شوکت نظمی
راج گنج ضلع دھنباد (بہار)

سرحد سرحد لشکر ہے
ہر سو جنگی منظر ہے
شعلے سے ہیں ذہنوں میں
بارودی ہر پیکر ہے
آئے دن ہے کرفو کیوں ؟
آئے دن کیوں محشر ہے ؟
ڈگری لو ڈپلومہ لو
پھر حصے میں ٹھوکر ہے
عرضی اب ہم کس کو دیں !
سویا سارا دفتر ہے
سچ کہنے والے کے اب
سر پر نوکِ خنجر ہے
صحرا، جنگل اور دریا
سب کچھ میرے اندر ہے
کس کے تن ہیں پردے میں
چھوٹی سب کی چادر ہے
گھڑتا ہے غزلوں کے بُت
نظمی جو اک آزر ہے

ورمینائی
رالامین ٹیچرز ٹریننگ
پٹیوٹ کولار (کرناٹک)

غزل

ہر خواب شکستہ ہے تعبیر سسکتی ہے
حالات کے زنداں میں تقدیر سسکتی ہے

آئینۂ ارماں میں کیوں عکس نہیں اُس کا
البم میں مرے جس کی تصویر سسکتی ہے

دہشت زدہ ہوتے ہیں لوگ اپنے گھروں میں بھی
کاغذ سے لپٹ کر جب تحریر سسکتی ہے

اب اپنی دعاؤں کے پر ٹوٹ گئے شاید
ہر سمت خلاؤں میں تاثیر سسکتی ہے

کچھ ایسی سزا دی ہے احساسِ ندامت نے
پیکر ہوں تاسف کا تقصیر سسکتی ہے

کیا روپ میں مجرم کے تم کوئی فرشتہ ہو
تم سے ہی لپٹ کر کیوں زنجیر سسکتی ہو

ہر ذہن میں اے انور نفرت کی ہے تاریکی
ہر چہرے پہ اب دیکھو تنویر سسکتی ہے

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ ... ہاسپیٹل ۴ لکھنؤ

اُداسی میں جبینیں سوچتی ہیں
جبینیں کیا زمینیں سوچتی ہیں

کہاں کیا کیا ہوا سب بھول جاؤ
یہ باتیں نازنینیں سوچتی ہیں

ہمی نے کیسے کیسے سانپ پالے
ہماری آستینیں سوچتی ہیں

یہاں تک آ گیا ہوں چلتے چلتے
میں سوتا ہوں مشینیں سوچتی ہیں

کوئی سجدہ کہیں انگڑائی لے گا
ابھی تجھ کو جبینیں سوچتی ہیں

وہ آئینے سمجھ لیتے ہیں اکثر
جو دل میں مہ جبینیں سوچتی ہیں

لکیروں میں اضافہ ہو رہا ہے
مرے غم میں زمینیں سوچتی ہیں

اسد رضوی
اسٹوڈیو روآئی ۔ جمنا مارکیٹ
آمگولا روڈ مظفر پور ۸۴۲۰۰۲

غزل

نہ کچھ ملال نہ چہرے پہ کچھ اُداسی تھی
فقیرِ شہر کے تن پہ بھی خوش لباسی تھی

زمانہ جیسا بزرگوں کا تھا وہ اچھا تھا
سب اہلِ درد تھے سب ہی کو غم شناسی تھی

فریبِ جشنِ مسرت میں ہم مقید تھے
خوشی ہماری ہمارے لیے واقعی سزا سی تھی

سوا حسینؑ کے گھر سے کوئی نہیں نکلا
زمینِ کرب و بلا جب لہو کی پیاسی تھی

یہ عیدِ نو کا بشر جانے کتنا حاسد ہے
گذشتہ لوگوں کی جو بات تھی دعا سی تھی

خبر چھپی تھی جو اخبار میں فسانہ تھا
اور اُس کے ساتھ کی تصویر بھی قیاسی تھی

میں چبھ رہا تھا اسد سلطنت کی آنکھوں میں
اسی لیے تو مری موت بھی سیاسی تھی

رؤف رحیم
۲۰-۵-۵۲۵ شکر گنج حیدر آباد ۵۰۰۲۶۵

انگلیوں پر مرے عیبوں کو گنانے والے
آئینے میں تو کبھی دیکھ لے چہرا اپنا

یہ علامت ہے کہ سورج ہے تنزل کی طرف
اپنے قد سے جو بڑا ہو گیا سایا اپنا

ہارنے والا ہو بد ظن تو نہیں جیت اپنی
فتح وہ ہے کہ بنے جس میں پرایا اپنا

اپنی تقسیم ہے دنیا سے نرالی تقسیم
حق میں اوروں کے اجالا تو اندھیرا اپنا

دوسروں سے نہ رکھو تم کوئی امید رحیم
آدمی بوجھ اٹھاتا ہے خود اپنا اپنا

○ ○ ○

ایوب اثر
ملاولاڈاک شاہجہاں پور

غزل

جس قدر گہرا تعلق ہے غزل اور میر کا
بس وہی رشتہ ہے میرا اور تری تصویر کا
اب مجھے پہچان لیتے ہیں ترے کوچے کے لوگ
کس قدر اونچا ستارہ ہے مری تقدیر کا
اپنے آنگن میں کسی کو مسکراتے دیکھنا
خیر ہو انجام میرے خواب کی تعبیر کا
اُس نے خط میں تو لکھا ہے یاد آتے ہو بہت
کیا بھروسا ہے مگر اس کاغذی تحریر کا
ہر طرف ان ٹوٹتے رشتوں کو مت دیکھو اثر
اور اک رشتہ ابھی ہے پیار کی زنجیر کا

فرید پربتی
مینا کالونی
اودھم پور، علی گڑھ

رباعیات

کمزور ہوں تو زور عطا کر مجھ کو
بے طور ہوں تو طور عطا کر مجھ کو
جنگل ہوں عطا کر نہ مجھے تو شادابی
برسات ہوں تو مور عطا کر مجھ کو

ٹوٹی ہوئی دیوار نظر آتی ہے
سایے سے یہ بیزار نظر آتی ہے
اے زیست کے سایے میں اچھلنے والو!
کاندھوں پہ مجھے بار نظر آتی ہے

ڈاکٹر اختر عبدالرشید
انجمن ترقی اردو (شاخ)
ایشمی جدید فرخ آباد

غم سے چہرہ نکھر گیا کہ نہیں؛
قرض جو تھا اُتر گیا کہ نہیں؛
دشتِ غربت کا شاہ کار تھا جو
بولو! وہ شخص مر گیا کہ نہیں؛
حق پرستوں پہ ظلم ہوتا تھا
وہ زمانہ گزر گیا کہ نہیں؛
جو خوشی بانٹنے کو نکلا تھا
لوٹ کر اپنے گھر گیا کہ نہیں؛
جس نے ہم پر لگائی تھی تہمت
اپنے سایے سے ڈر گیا کہ نہیں؛
دل کے زخموں کی بات کرتے ہو
روح کا زخم بھر گیا کہ نہیں؛
اپنی تہذیب ڈھونڈنے والا
منزلوں سے گزر گیا کہ نہیں؛
جو تری آستیں میں تھا اختر
دیکھ وہ سانپ مر گیا کہ نہیں؛

یعقوب یاور
شعبۂ اردو
گرلس بسنت کالج
راج گھاٹ وارانسی

غزل

نقوشِ پا کا وہ جنگل کہ نقش پا ہی نہیں
وہ راستے ہیں کہ منزل کا راستہ ہی نہیں

میں اور میرے مقابل عذاب در بدری
مکاں سے اوب کے پلٹا تو گھر ملا ہی نہیں

یہ راز فاش ہوا ہے ترے وصال کے بعد
کہ تیرے لطف سے خوشیوں کا رابطہ ہی نہیں

سوارِ شب تھا نبرد آزمائے بادِ بلا
تو پھر چراغ کوئی رات بھر جلا ہی نہیں

وہ دوریاں کہ خیالوں کے بیچ بُعدِ زماں
وہ قربتیں کہ لباسوں کا فاصلہ ہی نہیں

شعورِ ذات کا عرفان حرفِ حرفِ سخن
صلہ سخن کا فقط تیری واہ وا ہی نہیں

معانیِ حق و باطل بدل گئے ــــ یاورؔ
یزیدِ وقت کے کوفے میں کربلا ہی نہیں

مجاز نوری
درویش نگر، نورالحسن لین
دربھنگہ (بہار)

غزل

نہ کوئی چھت نہ کوئی سائباں ہے
ہمارا شہر میں ایسا مکاں ہے

لبوں میں تشنگی اور آنکھ بھو کی
غریبی داستاں در داستاں ہے

جو پلکوں سے دمِ رخصت ملا تھا
وہ اک قطرہ تو بحرِ بیکراں ہے

کبھی ملتا جو دردِ آشنائی
میں اس سے پوچھ لیتا تو کہاں ہے

یہی گردش مقدر کی رہے گی
زمیں کے سر پہ جب تک آسماں ہے

کہا کس نے غزل لکھتے ہیں نوریؔ
"قلم کی نوک سے آنسو رواں ہے"

افتخار احمد فخر
بہ اردو ایم جے کالج
ل (مہاراشٹر)

جال ہیں سمندر میں مچھلیاں سمجھتی ہیں
ہیں نہنگ پوشیدہ، کشتیاں سمجھتی ہیں

گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے ہیں دنیا کا
بھانت بھانت کی ہم کو بولیاں سمجھتی ہیں

دیکھنے میں اونچے ہیں باغ کے شجر اپنے
چھاؤں کیوں نہیں دیتے پتیاں سمجھتی ہیں

نفرتوں کے شعلے ہیں جانے کب بھڑک اُٹھیں
بستیوں کو جلنا ہے، بستیاں سمجھتی ہیں

عید پر بھی بوسیدہ تن بدن پہ ہیں کپڑے
باپ ماں کی مجبوری، بچیاں سمجھتی ہیں

نیند آ ہی جاتی ہے جب بھی ماں سلاتی ہے
ننھے منّے بچّوں کو لوریاں سمجھتی ہیں

ان کو ربطِ پیہم ہے، خاص آشیانوں سے
کن کے گھر جلانے ہیں بجلیاں سمجھتی ہیں

ہو نہ ابرِ نیساں کا جب تلک کرم ان پر
بانجھ ہی رہیں گی یہ سیپیاں سمجھتی ہیں

خاص ایک طبقہ ہی فخر ہے ہدف، ان کا
اپنے مد کو ۔ صہ گولہ ۔ ہاں سمجھتی ہیں

ساحل احمد
صدر شعبہ اردو یوئنگ کرسچین کالج
الہ آباد

وقت منصف ہے ذرا صبر کرو صبر کرو
ہے یہی اس کی ادا صبر کرو صبر کرو

مشتعل موجِ صبا صبر کرو صبر کرو
آج موسم ہے خفا صبر کرو صبر کرو

ہے ابھی یاد مجھے شورِ فغاں گنجِ قفس
ہے المناک فضا صبر کرو صبر کرو

کیوں مری یاد پہ شب خون ہوا ہے اس کا
شب ہے یا کوندا صبر کرو صبر کرو

لبِ گویا پہ خموشی کی ردا ہے ساحل
ہے یہی اس کی انا صبر کرو صبر کرو

مجیب الرحمٰن بزمی

"قیصر بزمی" رحمت کالونی ڈورنڈا
رانچی

غزل

ہر سو فن کی ناقدری ہے اندھا ہیں اور گونگا تو
حُسن کی اس کے دھوم مچی ہے اندھا ہیں اور گونگا تو

کون چکائے قرض وفا کا کون بقا کی جنگ لڑے
حق تلفی کی بات چلی ہے اندھا ہیں اور گونگا تو

سرد ہوا کے جھونکے اس کی آمد تو بتلاتے ہیں
تیز ہے بارش یا ہلکی ہے اندھا ہیں اور گونگا تو

جس کی چاہت، جس کی تمنا، جس کا تصور جس کی یاد
کون بتائے وہ کیسی ہے اندھا ہیں اور گونگا تو

اس درجہ سنگین خطا پر کون سزا تجویز کرے
آئینے پر گرد جمی ہے اندھا ہیں اور گونگا تو

پھیلا ہے احساس کا جنگل، تنہائی اور سناٹا
اندر اندر آگ لگی ہے اندھا ہیں اور گونگا تو

آؤ چلو بزمی سے پوچھیں ہنگامہ یہ کیسا ہے
شاید باہم پھر سے ٹھنی ہے اندھا ہیں اور گونگا تو

شاکر کریمی

محلہ گنج نمبر ا بتیا، بہار

غزل

وہ قصّے وفا کے سناتا رہا
ہتھیلی پہ سرسوں جماتا رہا

سمندر کہ اس کو ڈراتا ر
وہ کاغذ کی کشتی بناتا ر

اسے زندگی راس آئی نہیں
جو خود سے محبت جتاتا رہا

وہ بچوں کو لوری سناتی رہی
لہو رنگ موسم رلاتا رہا

پرندے فضاؤں میں اڑتے رہے
شکاری نشانے لگاتا رہا

غریبوں کی بستی اجڑتی رہی
محافظ کھڑا مسکراتا ر

وہ شاکر جو مخلص تھا سب کے لیے
سدا طنز کے تیر کھاتا رہا

راج اجملی
اسکالر شعبۂ اردو
نی ورسٹی دلی ۷

ے سر کو چلنا جس جگہ کا قاعدہ تھا
ے سر کی بلندی سے وہاں محشر بپا تھا

سبے خودی میں جس کو سولی دی گئی ہے
ے ہی قبیلے کا وہ تنہا سر پھرا تھا

ے جس شب مدھر آواز میں گانا تھا لازم
یت ہے کہ اس شب بھی پرندہ چپ رہا تھا

تے دم بخود سے تھے سراسیمہ فضا تھی
م گریاں تھا اور خدا کا سامنا تھا

مافر جس کے رکنے کی توقع تھی زیادہ
ہانے کیوں بہت جلدی سفر پر چل دیا تھا

گوہر شیخ پوری
۳۸ ۲۰ تیلیا نالہ، بنارس
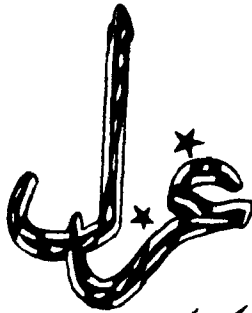
یہ کبھی ممکن نہیں میداں مجاہد چھوڑ دے
دشتِ ہستی میں وہ راہِ نامساعد چھوڑ دے

ادھ جلی بیڑی کے ٹکڑے میز پر گرد و غبار
میری تنہائی کے یہ سارے شواہد چھوڑ دے

پھر وہی کرفیو وہی وحشت نظر آنے لگے
سانپ نفرت کا اگر بستی میں حاسد چھوڑ دے

ایک مدت سے شریکِ زندگی ہے کس طرح
دفعتاً انگور کی بیٹی کو زاہد چھوڑ دے

اس کی عزت کے لیے بدنام ہونا ہے مجھے
میرے خط کو اس کے دروازے پہ قاصد چھوڑ دے

تیری غزلوں پر بھی گوہر ہوں گی تنقیدیں بہت
کیوں یہ کارِ خیر آخر آج ناقد چھوڑ دے

تعظیم احمد گوہر
معرفت محمد ایوب محلہ پکی سرائے
نزد مسلم کلب، مظفر پور (بہار)

کتاب تیری ہے، حرف کتاب تیرا ہے
میں پڑھ رہا ہوں جسے وہ نصاب تیرا ہے

بسی ہوئی ہے جو سانسوں میں تیری ہے خوشبو
کھلا ہوا ہے جو مجھ میں گلاب تیرا ہے

اُبھر رہی ہے جو مجھ سے نگاہ ہے تیری
سمٹ رہا ہے جو مجھ میں حجاب تیرا ہے

سسک رہی ہے جو مجھ میں وہ ہے تری حسرت
لرز رہا ہے جو پلکوں پہ خواب تیرا ہے

سلگ رہی ہے جو مجھ میں وہ آگ ہے تیری
برس رہا ہے جو مجھ پر سحاب تیرا ہے

جو مجھ میں کروٹیں لیتی ہے موج ہے تیری
جو مجھ میں ٹوٹ رہا ہے حباب تیرا ہے

ڈاکٹر محمد قیصر خاں قیصر
سول ہاسپٹل فرخ آباد، یوپی

رازِ غم دل سے نکل کر جو زباں تک پہنچے
بڑھ کے یہ بات خدا جانے کہاں تک پہنچے

اور ہوں گے جو فقط حدِ گماں تک پہنچے
جستجو میں تری ہم جانے کہاں تک پہنچے

تیرے دیوانوں کو خود بھی نہیں شاید یہ خبر
سرحدِ ہوش سے گزرے تو کہاں تک پہنچے

کیسے اُن تیروں کو پیغامِ قضا کیوں نہ کہوں
جو بیک جنبشِ مژگاں رگِ جاں تک پہنچے

جل بجھے قلب جگر آتشِ الفت میں مگر
دیکھنا ہے ابھی یہ آگ کہاں تک پہنچے

آہ وہ رازِ نہاں ہے غمِ الفت قیصرؔ
جو خموشی میں بھی دنیا کی زباں تک پہنچے

صابر رومانی
ام تھاوے ضلع گوپال گنج

ہیں لے جائیں گے منزل تک وہ رہبر کبھی
چلتے بھی نہیں جو دیکھتے مڑکر کبھی

زا ناگ بن کر ڈسنے لگتی ہے ہمیں
نکلتے ہیں حصارِ خواب سے باہر کبھی

سائل تک نہیں رکتا ہمارے در پہ اب
ی میں کون آتا ہے کسی کے گھر کبھی

غضب کا ہے زمانہ ٹوٹ کر ملتے ہیں ہم
سا ملتے ہیں مگر ملتے نہیں کھل کر کبھی

توں کے شعلے بھڑکائے گئے ہیں کو بکو
گسل ایسا نہ تھا اس شہر کا منظر کبھی

ہیں ہو اور پہنچے لوگ صابر چاند پر
انہ بدلے گا تمہاری زیست کا محور کبھی

اندو سروپ سریواستوا
سابق پرنسپل - ۶۰، مسوانی - فتح پور
۲۱۲۶۰۱

آئینہ مری ذات سے حیراں بھی نہیں ہے
اک عکس پریشاں ہے پریشاں بھی نہیں ہے

تنہائی میں وہ خود سے کیا کرتا ہے باتیں
وہ خود سے گریزاں ہے گریزاں بھی نہیں ہے

تصویر دکھاتا ہے فرشتوں کی ۰ سبھی کو
کہنے کو وہ انسان ہے، انساں بھی نہیں ہے

اک عمر سے جو دل کے شبستاں میں بسا ہے
وہ جلوہ کیا جو جلوۂ جاناں بھی نہیں ہے

تصویر کی حیرانی پہ حیراں ہے مصوّر
ہر نقش پشیماں ہے، پشیماں بھی نہیں ہے

کہنے کو تو یہ ہے غمِ دوراں کا تسلسل
لیکن یہ حریفِ غمِ جاناں بھی نہیں ہے

عبدالقوی دسنوی
یفر اسٹاف کوارٹرس
ب سیفیہ سائنس کالج
بھوپال ۴۶۲۰۰۱

ظ بھائی

بمبئی میں محمد علی روڈ پر الجاز پریس میں میرا اور میرے بڑے بھائی پروفیسر سید عبدالحی
حب کا آنا جانا اس لیے تھا کہ وہ اس پریس کے مالک ضیاء صاحب کے والد اور میرے
رہ پروفیسر سید سعید رضا صاحب میں بڑے گہرے تعلقات تھے۔ اکثر ہم دونوں بھائی شام
وقت پریس میں جا کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ضیا صاحب بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔
مالیے ہمیں وہاں بیٹھنے میں اور ان سے باتیں کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ وہیں ظ بھائی سے
بی ملاقات ہوئی تھی وہ بھی اکثر وہاں آکر بیٹھتے تھے۔ دیکھا تو انھیں اکثر جلسوں میں تھا درمیانہ
سڈول اور صحت مند جسم، گندمی رنگ، سنجیدہ چہرا، کلین شیوڈ، چوڑی پیشانی اور غور و فکر
ں ڈوبی آنکھیں، کھڑی ناک، سجے ہوئے بال، خوش مزاج، خوش انداز، خوش لباس یہی
بھائی کی ظاہری پہچان تھی۔ لیکن سچ تو یہ ہے یہ ان کی صوری پہچان تھی حقیقی
بھائی تو کچھ اور ہی تھے۔ اس کی پہچان اس وقت ہوتی تھی جب وہ آپ سے محو گفتگو ہوں۔
بات غیر جذباتی انداز سے گفتگو کرتے، آواز بھی بہت زیادہ بلند نہیں ہوتی تھی، البتہ جب
ہ کسی بات کو کھینچ کر کہتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اپنے اس خیال کو نہ صرف واضح کرنا
ہتے ہیں بلکہ آپ کو اپنا ہمنوا بنانا چاہتے ہیں اس طرح وہ اپنی بات کو اپنے لہجے کے
نار چڑھاؤ سے بھی سمجھانے کی کوشش کرتے۔ چہرے پر کبھی ہلکی مسکراہٹ ناچتی، کبھی
سنجیدگی جھانکتی لیکن آنکھوں سے دل کی کیفیت اور مزاج کی تبدیلی کا پتا چلانا ذرا مشکل
ہوتا تھا۔ حالانکہ عام حالات میں ان کی آنکھیں ان کے مطالعہ کرنے کی چغلی کھاتی تھیں
بلکہ چہرے کے نقوش بھی ہلکے پھلکے اشارے کر دیتے تھے کہ موصوف کافی دیر مطالعہ میں
غرق رہے ہیں۔

بات چیت کا انداز عام طور سے عام لوگوں سے بہت مختلف تھا۔ گفتگو میں اکثر ایک
خاص انداز اختیار کر لیتے تھے، جو ان ہی کا مخصوص ہوتا تھا۔ یہی انداز ان کی تقریر میں
بھی کبھی ڈرامائیت اختیار کر لیتا، کبھی تحیر و تفکر کے سامان پیدا کرتا تھا، کبھی مسکرانے
پر مجبور کرتا تھا۔ کبھی کبھی بے ساختہ داد دینے پر آمادہ کر دیتا تھا۔ کبھی زور سے بولتے

کبھی آہستہ ہو جاتے، کبھی آہستہ بولتے اور پھر چند لمحوں کے لیے خاموش ہو جاتے۔ پھر اچانک کوئی بات ایسی کر دیتے کہ عجب کیفیت پیدا ہو جاتی لیکن تقریر کا عالم کچھ اور ہوتا وہ اس فن کے بادشاہ تھے آہستہ آہستہ ایک عجیب جادو جگاتے تھے سامعین مسحور ہوتے چلے جاتے تھے۔ ہال میں سناٹا چھا جاتا تھا البتہ کبھی کبھار واہ واہ کی آواز گونجتی سنائی دیتی تھی۔ حالانکہ اُن کی تقریر اور گفتگو میں فرق یہی ہوتا تھا کہ تقریر عام طور سے ذرا بلند آواز میں ہوتی تھی لیکن وہ تقریر کے گُر سے اچھی طرح واقف تھے، سامعین کے مزاج کو سمجھتے تھے کبھی کبھی تھوڑی سی بات کو اس طرح پھیلاتے تھے کہ لوگ یہ محسوس کر نہیں پاتے تھے کہ ظ بھائی کے پاس اب اس موضوع پر کچھ کہنے کو نہیں رہا ہے محض اپنی ذہانت کے سہارے بڑی محفل کو جمائے ہوئے ہیں اور گھڑی کی ٹک ٹک کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔

بات میں ۱۹۵۱ء کی الحجاز پریس بمبئی کی کر رہا تھا جہاں ظ بھائی سے مسلسل ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔ ہم دونوں بھائیوں کو ادیبوں سے ملنے کا، بات چیت کرنے کا، اُن سے کچھ سیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے "ظ" بھائی ہمارے درمیان "نعمت" کی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن سے بات کرنے میں ہمیں بہت لطف آتا تھا، وہ بھی ہم سے بات کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔ ضیا بھائی ہماری گفتگو کے سلسلے کو طول دینے میں مدد کرتے تھے۔ یہ ملاقاتیں کافی دنوں تک رہیں، وہیں قیصر محمود صاحب سے ملاقات ہوئی، ان کی ظ بھائی سے بڑی دوستی تھی، اُن کا بھی اچھا مطالعہ تھا اکثر گفتگو میں حصہ لیتے تھے اس زمانے میں بیکار تھے اور بہت پریشان تھے اور فوٹ پاتھ پر انگریزی کی قیمتی کتابیں بیچتے تھے، بیچتے کم تھے پڑھتے زیادہ تھے، ہم لوگوں کو اُن سے بے حد ہمدردی اور دلچسپی ہو گئی تھی۔

اسی دوران میں معلوم ہوا کہ ظ بھائی کی نئی کتاب "ورق ورق" زیر طبع ہے اور ابتدائی چند صفحات الحجاز پریس میں چھپ رہے ہیں۔ ہم لوگوں کو اس کے دیکھنے اور پڑھنے کا اشتیاق روز بروز بڑھ رہا تھا اور اس کی آمد کا شدید انتظار تھا، جب کتاب چھپ کر آئی تو میرے بڑے بھائی پروفیسر عبدالمجی صاحب نے اس کی ایک جلد اسی وقت خرید لی۔ ٹائٹل بہت خوبصورت تھا۔ گلاب کی ایک شاخ جس میں دو گلاب کے پھول، ایک کلی، انیس سبز پتیاں، گلاب کے ایک شگفتہ پھول سے ایک پنکھڑی گرتی ہوئی ایک تتلی خوبصورت پر پھیلائے دوسرے گلاب کے نو شگفتہ پھول کی طرف اڑتی ہوئی، کسی ظفر آرٹسٹ نے ظ بھائی کی کتاب "ورق ورق" کو پتیوں، پنکھڑیوں اور تتلی کے پروں میں منتشر دکھانے کی کوشش کی تھی جس میں پانچ رنگ استعمال کیے گئے تھے، اس لیے ٹائٹل بڑا شوخ ہو گیا تھا اور خوبصورت تھا۔ اس کے بعد ان کی کسی کتاب کا ٹائٹل اس طرح شوخ رنگ و روپ کے ساتھ نہیں چھپا، یہ کتاب بظاہر رائٹرس اکاڈیمی ۵۹ محمد علی روڈ بمبئی ۳ نے شائع کی تھی لیکن اس اکاڈیمی کے پیچھے ضیا اور ظ بھائی ہی تھے

اس کتاب کے انتساب نے ہم لوگوں کو پہلی ہی نظر میں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا اور متوجہ کیوں نہ کرتا اس میں اس زمانے کی بے روزگاری کے مسئلہ کی طرف ایک خاص اچھوتے انداز

توجہ دلانے کی کوشش کی گئی تھی جس کا اشارہ اس زمانے کے قیصر محمود جیسے کتنے ہی
لاحیت نوجوانوں کی طرف تھا جو آزاد ہندستان میں در در کی ٹھوکریں کھا رہے تھے اور ہر در
کھلنے پر ان کی ملاقات بے روزگاری سے ہوتی رہی تھی۔ انتساب ملاحظہ کیجیے:

"ان اوراق کے نام
جو اس کتاب کی تنگ دامانی میں سمانے سے رہ گئے ان میں کوئی ستر ورق
تو ایسے تھے
جنھیں فخر تھا کہ ان کے بغیر "ورق ورق" کی محفل بے جان رہے گی اب وہ
حسرت سے ایک دوسرے کا منہ تک رہے ہیں۔
بے روزگار نوجوانوں کی طرح۔
اور پوچھتے ہیں ——— "ہمارا کیا قصور تھا؟"
میں جواب دیتا ہوں "معاشی بحران اور اشاعتی سنکٹ" یہ کتاب چھٹنی کی زد میں
آئے ہوئے ان ہی اوراق کے نام معنون کرتا ہوں"

اور یہ مسئلہ آج بھی اپنی طرف متوجہ کرتا ہے کتنے فنکار ہیں جو اس آواز کو ظ بھائی کی طرح
ں، سوچتے ہیں اور دوسروں کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کتاب میں کسی سے دیباچہ
شامل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ ظ بھائی نے اسے ان لوگوں پر چھوڑا ہے جو اسے
ادب کی سوجھ بوجھ کے ساتھ پڑھیں گے۔ البتہ اس کتاب کی شان نزول پر "پہلا ورق" میں
رح روشنی ڈالتے ہیں۔

"شان نزول ان اوراق کی یہ ہے کہ مجھے اپنی مختصر عمر کا کوئی حصہ یاد نہیں
جب میں نے دیکھنے، پڑھنے اور سننے کے ساتھ سوچا نہ ہو۔ جب لکھنا آگیا
تو میں نے سوچی یا گزری ہوئی باتوں کو لکھنا شروع کر دیا مگر مشکل یہ پیش آئی
کہ آج کچھ لکھا، تھوڑے عرصہ کے بعد اسے اٹھا کر دیکھا تو وہ ادنا درجے کی چیز معلوم ہوئی
اُسے پھاڑ پھینکا اور یہ سلسلہ برسوں جاری رہا۔ ۴۶ء سے میں نے اوروں کی دیکھا دیکھی
ایک اپنی ڈائری لکھنی شروع کر دی تھی۔"

پھر "مشاہدے" کے عنوان سے جو کچھ ظ بھائی نے لکھا وہ ہفتہ وار "شاہد" میں شائع ہوئے اس
بند ہونے کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔

انھوں نے جو ڈائری ۱۹۴۶ء میں لکھنی شروع کی تھی، ۱۹۵۰ء میں سوا تین سو اوراق پر پھیل
ان میں سے وہ اوراق جو دوسروں کی دلچسپی کا باعث بن سکتے تھے ان کا انتخاب کیا اور "ورق ورق"
ورت میں دنیائے ادب کے سامنے پیش کیا۔

یہ کتاب عام طور سے پسند کی گئی تھی اس لیے کہ اس کے موضوعات دلچسپ تھے اور اسلوب
ایک خاص ندرت اور تیکھا پن تھا۔ اس میں بقول ظ بھائی کچھ عام نثر پارے ہیں، کچھ مختصر افسانے
کچھ طنز یہ مزاحیہ کہے جا سکتے ہیں، اور کچھ مقالوں کے خانے میں ڈالے جا سکتے ہیں اور کچھ پابند نظم یا

آزاد نظم سے رشتہ جوڑ سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ان کی اس زمانے کی نثری کوششوں کے مختلف روپ ہیں اور منفرد ہیں۔

کتاب ہاتھوں ہاتھ لی گئی مختلف انداز سے تبصرے ہوئے۔ ایک دن ترقی پسند مصنفین کی نشست میں بھی لوگوں نے اس کتاب پر اظہارِ خیال کیا، یہ ۱۹۵۱ء کے آخر کی بات ہے میں اور میرے بڑے بھائی پروفیسر عبدالحی رضا بھی اس میں شریک ہوئے تھے۔ اتفاق سے سردار جعفری صاحب کے قریب ہی مجھے بیٹھنے کی جگہ ملی تھی، اب یاد نہیں آرہا ہے کہ کن کن حضرات نے اس کتاب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا لیکن آصف شاہمیری صاحب کا تبصرہ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔ اس لیے کہ اُن سے میرے بڑے اچھے تعلقات تھے وہ کتب خانہ تاج آفس بمبئی میں کام کرتے تھے، اور میں کتابیں خریدنے کے لیے وہاں برابر جاتا تھا۔

آصف شاہمیری صاحب نے اپنے تبصرے میں بعض اچھی باتیں کہی تھیں لیکن اپنے بعض خیالات کا اظہار انھوں نے خیالی خواتین کے نام سے کیا تھا مثلاً سلمیٰ نے ورق ورق کے متعلق ہنستے ہوئے کہا ․․․․ رشیدہ نے اس کی یہ بُرائی کی، فہمیدہ نے اس میں یہ خامیاں بتائیں وغیرہ وغیرہ۔ حاضرین تبصرہ سنتے رہے لیکن اس کے متعلق ان کے کچھ اچھے تاثرات نہ تھے۔ ظ بھائی کا چہرہ تمتما اٹھا تھا لیکن وہ خاموشی سے سنتے رہے، جب تبصرہ ختم ہوا اور آصف شاہمیری صاحب اتفاق سے میرے ہی قریب آکر بیٹھے اور پھر سردار جعفری صاحب کے پاس ترقی پسند ادب کی جلد جو ابھی بازار میں نہیں آئی تھی جیسے ہی انھوں نے دیکھی، ہاتھ بڑھا کر اُن سے لینے کی کوشش کی تو سردار جعفری صاحب سے نہ رہا گیا اور وہ غصّے میں کہنے لگے۔ یہ "ظ" کی کتاب نہیں ہے کہ جو چاہا آپ نے لکھ مارا اور پڑھ دیا اس کتاب کے بارے میں اُلٹے ٹیڑھے جملے کہیں گے تو میں برداشت نہیں کروں گا۔ بعد میں جعفری صاحب نے بھی ورق ورق پر اپنی رائے کا اظہار کیا اور اسے اچھی کوشش بتائی۔ ظ بھائی نے آخر میں تمام تبصروں کا نہایت سنبھل کر جواب دیا۔ آصف شاہمیری صاحب کے تبصرہ کو ناپسند کرنے کے باوجود اپنے غصّہ کا نشانہ نہیں بنایا۔

اس ادبی نشست کے بعد ظ بھائی سے اکثر ملاقاتیں رہیں کبھی کبھار جلسوں میں بھی دکھائی دیے اُسی آن بان کے ساتھ یعنی سادگی کے پیکر بنے ہوئے، زندگی کی تلخیوں پر انگشت بدنداں، حوصلہ مند۔

میں ۱۹۶۱ء میں بھوپال چلا آیا پھر ظ بھائی سے عرصہ تک ملاقات نہیں ہوئی کبھی کبھار خط کے ذریعے نصف ملاقات ضرور ہو جاتی۔ غالباً ۱۹۷۰ء میں جب ایک بار وہ بھوپال آئے تو قیصر فخرالدین صاحب کے ساتھ میرے گھر ملنے کے لیے آئے دیر تک باتیں ہوئیں میں نے دیکھا ظ بھائی اب بھی ویسے ہی ہیں جیسے بمبئی میں اُنھیں دیکھا تھا وہی اندازِ گفتگو، وہی خلوص، وہی سادگی، وہی عالمانہ مزاج ــــ اس کے بعد کئی بار مدھیہ پردیش اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام مختلف سیمیناروں میں شرکت کے لیے بھوپال آئے اور سیمینار کی جان بنتے رہے عام طور سے ان کا مقالہ پسند کیا جاتا رہا اور تقریریں سیمینار میں گرمی پیدا کرتی رہیں۔ اس درمیان میں ان کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آئیں ا

نا
ن متوجہ کر گئیں کئی ترجمے شائع ہوئے اور پسند کیے گئے ان کے نام یہ ہیں:
انقلاب روس (۱۹۴۶ء) چینی گاؤں (۱۹۴۹ء) زلفوں کے سایے میں (۱۹۵۱ء) چین کی بہترین کہانیاں
(۱۹۵۱ء) استالین (دو جلد) (۱۹۵۳ء) مارکسی تعلیم کا سلسلہ (۱۹۵۴ء) روس کی بہترین کہانیاں (۱۹۶۲ء)
بفسکی (۱۹۵۸ء) سویت یونین کی تاریخ (۱۹۶۲ء) خواب پریشاں (۱۹۷۰ء) بیچے خف (۱۹۶۱ء)
ستانی الیکسی تالستائی، لنگڑا شاہزادہ اتماتوف جمیلہ، بستی کا پہلا لڑکا، حکم کی بیگم جواری، ذلتوں کے
ے لوگ، منظوم کہانیاں، مارکس اینگلس کی منتخب تصانیف (۱۹۷۱ء) وغیرہ۔

ترجموں کے علاوہ بھی دوسری مطبوعات کی فہرست ملاحظہ فرمائیں:

جارج برنارڈ شاہ (۱۹۵۱ء) ورق ورق (۱۹۵۲ء) کیمونسٹ اور مذہب (۱۹۵۸ء) زبان و بیان
(۱۹ء) روس کا شاعر اعظم پوشکن (۱۹۶۶ء) غالب شناسی (۱) (۱۹۶۵ء) غالب شناسی (۲) کہیں بہار کو فرصت
(۱۹۶۶ء) پوشکن (۱۹۷۶ء) خسرو کا ذہنی سفر (۱۹۷۷ء) کتاب شناسی (۱۹۸۱ء) جواہر لال نہرو، کچھ بھی کچھ
ہی (۱۹۸۰ء) ابوالکلام آزاد کا ذہنی سفر (۱۹۹۰ء) اردو روسی اور روسی اردو لغت وغیرہ۔

ظ بھائی کے ترجموں اور تصانیف کی یہ فہرست مکمل نہیں ہے کاش کوئی نوجوان محقق
فہرست کو مکمل کر دے اور ان کی وہ تحریریں جو رسائل اور اخبارات میں منتشر پڑی ہیں
کی اشاریہ تیار کر دے تو صحیح طور سے ان کی علمی ادبی خدمات کا جائزہ لیا جا سکے گا۔

وہ شاہراہ کے مدیر رہے آئینہ اور انقلاب کی ادارت میں کچھ عرصہ تک شامل رہے اور
کے مزاج میں اپنے وجود سے تبدیلی پیدا کرتے رہے میں نے سنا ہے کہ انقلاب بمبئی کے اڈیٹوریل
ر کتابوں پر تبصرے کتابی صورت میں "کانٹوں کی زبان" کے نام سے شائع ہو گئے ہیں۔

ادھر چند برسوں میں ظ بھائی سے تین بار بڑی اچھی ملاقاتیں رہیں اور دیر تک بات چیت
رنے کا موقع ملا۔

۲۲، ۲۳ اور ۲۴ جون کو اتر پردیش اردو اکادمی نے مولانا ابوالکلام آزاد صد سالہ جشن کے
سلے میں لکھنؤ میں سیمینار کیا تھا، اس سیمینار میں حصہ لینے کے لیے ہندستان کے مختلف حصوں سے
ی حضرات شریک ہوئے تھے، بمبئی سے ظ بھائی بھی آئے تھے ان کا موضوع تھا "ابوالکلام آزاد اور
اہر لال نہرو، ایک تقابلی مطالعہ" جسے کافی پسند کیا گیا۔ انھوں نے اپنے مقالہ میں دونوں عظیم شخصیتوں
کے افکار و خیالات اور عملی زندگی کو مختلف مستند حوالوں کی مدد سے صحیح صورت میں پیش کرنے کی
بھی کوشش کی تھی۔ دونوں کے گہرے تعلقات اور دونوں کے درمیان کبھی کبھی فاصلے پڑ جانے کی
رف بھی اشارہ کیے تھے۔

بخی نشستوں میں انھوں نے انڈیا ونس فریڈم کے متعلق مختلف زاویوں سے تبصرے کیے تھے،
۱۵ اس کتاب کے سلسلے میں مولانا آزاد پر بعض تنگ نظروں کے اعتراض کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے
تھے۔

اسی سیمینار کے موقع پر ظ بھائی نے مجھ سے بمبئی چھوڑ کر بھوپال میں مستقل رہنے کی خواہش
ظاہر کی تھی، ان کا خیال تھا کہ بھوپال خوبصورت اور پر سکون جگہ ہے اس لیے یہاں رہ کر وہ سکون سے

ساتھ کچھ کام کرسکیں گے۔ ان کا خیال بڑا اچھا تھا بلاشبہ بھوپال خوبصورت جگہ ہے اور بمبئی کی ہنگامہ سے بھری زندگی کے مقابلہ میں پرسکون بھی ہے پہاڑوں اور تالابوں نے اسے حسن سے مالا مال کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہاں سکون نہیں ہے۔ لکھنے پڑھنے والا آدمی یہاں رہتا ہے اور سکون کو ترستا ہے۔ اس "سکون" کو جس میں لکھنے پڑھنے کے لیے حوصلے اور عزائم پیدا ہوتے ہیں۔

لیکن میں نے ظ بھائی کے خیال کی تائید کی اور اپنی خوشی کا اظہار کیا، یہ بھی وعدہ کیا کہ مکان کی تلاش میں ہر قسم کا تعاون دوں گا۔ اس میں میری خود غرضی شامل تھی مجھے یقین تھا کہ اس طرح مجھے ایک مخلص انسان اور عزیز بھائی کا ساتھ مل جائے گا۔ ڈاکٹر محمد نعمان بھی اس سیمینار میں میرے ساتھ تھے جن سے ظ بھائی جلد ہی گھل مل گئے تھے، ظ بھائی کے بھوپال آنے کے ارادہ سے وہ بھی بہت خوش تھے۔

پھر مدھیہ پردیش سرکار کے محکمہ ثقافت کے زیر اہتمام ۹ ستمبر ۱۹۸۹ء کو ٹیگور ہال میں ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوا تھا، ظ بھائی بھی اس مذاکرہ میں شریک ہوئے تھے۔ اس تقریب کا افتتاح صوبہ کی گورنر محترمہ سرلا گریوال کے ہاتھوں ہوا۔ اس وقت کے وزیر اعلا موتی لال وورا، وزیر صحت کنہیا لال شرما، وزیر مدھیہ پردیش اردو اکادمی رسول احمد صدیقی نے بھی تقریریں کی تھیں۔ اس موقع پر ظ بھائی نے پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کے تعلقات پر بڑی جرأت مندانہ تقریر کی اور انڈیا ونس فریڈم کے تیس صفحات کی سچائیوں کو روشنی میں لانے کی کامیاب کوشش کی اور دونوں محترم رہنماؤں کے درمیان خلیج پیدا کرنے کی کوشش کی سختی کے ساتھ مذمت کی۔ ظ بھائی کی اس تقریر نے ہمارے دلوں میں گہرا اثر چھوڑا اور یہ احساس پیدا کیا کہ ابھی اردو ادب میں کچھ شخصیتیں باقی ہیں جو اپنی قیمت لگاتے نہیں ہیں پہچانتے ہیں۔ اور ہر محفل میں اپنی شناخت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مجلس مذاکرہ میں حصہ لینے والے کئی اچھے نام تھے لیکن بدقسمتی سے زیادہ تر حضرات سیمینار کے سیلاب میں بہتے ہوئے بغیر ہاتھ پانو مارے بھوپال کے جزیرے پر آ لگے تھے۔ ظ بھائی کی تقریر کے علاوہ کسی نے کچھ دینے کی کوشش نہیں کی محض ایک فرض ادا کرنے میں سب مصروف رہے یہاں تک کہ خود ظ بھائی جب مذاکرے میں حصہ لینے کے لیے کھڑے ہوئے تو آزاد کی شخصیت کو کیا نکھارتے خود اپنی شخصیت کو مجروح کر گئے۔

انھوں نے مولانا آزاد کے ذہنی سفر پر اپنے خیالات کا اظہار کیا لیکن ان کی تقریر صحیح حوالوں اور تاریخوں کی روشنی میں مدھم پڑ گئی۔ مختلف زاویوں سے اُن کی تقریر پر اعتراضات کیے گئے۔ اور ظ بھائی اپنے جوابات سے مطمئن نہ کرسکے، شاید انھیں تیاری کا وقت نہیں مل سکا تھا اور ذہانت ان کا ساتھ کہاں تک دیتی۔ حقائق تو حقائق ہی ہوتے ہیں۔

افتتاحی تقریب کے بعد آدھ گھنٹے کی فرصت ملی تو وہ مجھے لے کر کینٹین چلے آئے۔ میرے ساتھ ڈاکٹر نعمان بھی تھے۔ ساری گفتگو مولانا آزاد اور انڈیا ونس فریڈم سے متعلق کرتے رہے۔ میں

انا آزاد سے متعلق اپنی بعض کتابیں دیں تو بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے میں ان کتابوں سے فائدہ
اٹھاؤں گا۔ تم نے مولانا آزاد پر کافی کام کر دیا۔ محمد نعمان نے بھوپال آنے کا ذکر کیا تو کہنے لگے کہ
ں آؤں گا اور زندگی کے بقیہ دن یہیں گزاروں گا۔ ہم دونوں ان کے اس ارادے سے بہت خوش
تھے۔

آخری بار ظ بھائی سے ملاقات مادھوراؤ سپرے سامرتی سماچار پتر سنگرالیہ بھوپال میں قمر جمالی
ر شوکت رموزی کی تالیف "مدھیہ پردیش میں اردو صحافت۔ ابتدا اور ارتقاء" کی رسم اجرا کے موقع
۲۸ مارچ ۱۹۹۰ء کو ہوئی۔ اس موقع پر صحافت سے متعلق ایک سیمینار بھی ہوا تھا۔

" مادھوراؤ سپرے پتر سنگرالیہ "مدھیہ پردیش کا ایسا منفرد ادارہ ہے جہاں مدھیہ پردیش
صدی اُردو کے اخبارات کا بڑا نادر ذخیرہ جمع ہوگیا ہے اس کے بانی اور روح رواں
دت شری دھر ہیں۔ جنھوں نے اپنی وسعت قلبی سے اردو صحافت کے لیے بھی اپنے ادارے
صرف جگہ نکالی ہے بلکہ اس سے وہ پوری دلچسپی رکھتے ہیں۔ لیکن یہ ادارہ اس لیے بھی
نصیب ہے کہ اسے ڈاکٹر سریش نرائن شرما متوالا، جیسا خوش مزاج، خوش اخلاق خدمت
مل گیا ہے جس نے اپنے وقت کا قیمتی حصہ ہندی اور اردو کے پرانے اور نایاب اخبارات
ڈھونڈ کر یکجا کرنے میں لگا دیا ہے۔ انھیں متوالا صاحب کی کوششوں اور دلچسپیوں سے
ھیہ پردیش میں اُردو صحافت"، جیسی کتاب منظر عام پر آئی ہے۔

ظ بھائی نے اس پتر سنگرالیہ کے سیمینار میں تقریر کرتے ہوئے اردو صحافت کے
تقبل پر روشنی ڈالی اور اس کے روشن مستقبل کا یقین دلایا۔ ان کی یہ تقریر بہت پسند کی گئی۔
تقریب کے اختتام پر مختصر ملاقات ہوئی، خوش تھے کہنے لگے ان کی کتاب "ابوالکلام آزاد
ہی سفر" شائع ہو گئی ہے۔ دیکھ لینا بھوپال آنے اور یہاں قیام کرنے کے ارادہ کا اظہار پھر کیا۔
لیکن اس سفر کے بعد ظ بھائی پھر بھوپال نہ آسکے۔ مجھ سے خط و کتابت بھی نہ ہو سکی البتہ
کی آمد کا برابر انتظار رہا۔ اس دوران میں اطلاع ملی کہ ظ بھائی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ علاج
لیے روس گئے تھے واپس مایوس آئے ہیں۔ معلوم نہیں یہ مایوسی روس سے تھی، دنیا والوں
سے تھی یا اپنی بے وفا زندگی سے تھی۔ سنا تھا کہ اب علاج کے لیے کہیں اور جانے کا ارادہ رکھتے
۔ لیکن اچانک ایک صبح ٹی وی نے خبر سنائی کہ ظ انصاری کا انتقال ہوگیا۔ اسی دن یکم فروری کا ہندستان
نظر آیا تو معلوم ہوا۔ ۳۱ جنوری کو ظ بھائی ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ بمبئی کے ہنگاموں سے دور
ون کی تلاش میں بھوپال کے بجائے، اس بے رحم اور خود غرض دنیا کی حدود سے پار عالم ارواح
ں جا بسے، اور بھوپال کے تالاب اور پہاڑیاں ان کا انتظار ہی کرتی رہیں بھوپال کی سڑکیں فرش راہ
نے کی آرزو مند ہی رہیں، بھوپال کے کتب خانے چشم براہ ہی رہے اور اہل بھوپال گوش بر آواز
رہے۔

انھوں نے اپنی چالیس پینتالیس سال کی ادبی زندگی میں، بہت کچھ کیا، جو عام حالات میں لوگ
زندگیوں میں نہیں کر پاتے، ان کی تحریروں کے مجموعہ "ورق ورق" سے اگر ورق گردانی شروع

کی جائے تو ہزاروں صفحات سے پہلے دم لینے کی فرصت نہیں ملے گی اور اس دوران میں نا
کبھی آپ کو ناقد نظر آئیں گے، کبھی محقق، کبھی تبصرہ نگار، کبھی مفکر، کبھی سیاست داں، کبھی
کے بہی خواہ، کبھی محب وطن، کبھی عاشق اُردو، کبھی صحافی، کبھی کہانی کار، کبھی ڈراما نویس کبھی
کبھی انسان دوست، کبھی مخلص مجسم، کبھی مشفق محترم لیکن ہر حال میں وہ اپنی ایک خاص پہچان
ساتھ نظر آئیں گے۔

انھوں نے اپنی زندگی میں اُردو، فارسی، عربی، روسی، انگریزی وغیرہ کئی زبانیں سیکھ
بمبئی یونی ورسٹی میں روسی زبان کے پروفیسر رہے، کئی شعرا اور ادبا کا گہرا مطالعہ کیا جس کی
غالب شناس بنے، اقبال آشنا ہوئے، خسرو کے ذہنی سفر کی ہمسفری کی، ابوالکلام آزاد کے
سفر سے باخبر رہے جواہر لال نہرو کی عظمتوں کی قدر دانی کی، کتابوں کی دنیا میں کتاب شناس
کہلائے۔ لیکن انھوں نے اپنے لیے کچھ نہیں کیا، کچھ نہیں چاہا۔

اور ہم اردو والے بھی ان کے لیے کچھ نہ کر سکے، نہ گوشے سجا سکے، نہ نمبر ترتیب دے
نہ کسی کمیٹی نے "نذر ظ" پیش کرنے کی کوشش کی، نہ ملک نے کسی بڑے اعزاز کا انھیں حق
ٹھہرایا۔ لیکن پھر بھی اُن کی پیشانی پر بل نہیں آیا، دل میں شکن نہیں پڑی۔ وہ لکھتے رہے، پڑ
رہے تقریر کرتے رہے اور نکتہ کی باتیں سناتے سناتے ہم سے بچھڑ گئے ۔ اور ہم بھوپال میں بیٹھے ان کا انتظار
کرتے رہے کہ وہ سکون کی تلاش میں بھوپال آنے والے ہیں اور بھوپال کے فخر میں اضافہ کرنے والے
ہیں۔ ●●

لے کتاب نما نے ستمبر ۱۹۸۸ء میں گوشہ ظ انصاری شائع کیا تھا۔ (ادارہ)

سید حسن اختر عابدی
فلیٹ نمبر ۱۳، سوریہ بنگلہ۔ اندھیری ویسٹ بمبئی ۵۸

یادِ رفتگاں ___ فراق گورکھپوری

اب یادِ رفتگاں کی بھی فرصت نہیں رہی یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

اپنے پاکستانی دوستوں کی جدائی میں تڑپنے والے فراق کو شاید اندازہ نہ تھا کہ درد و کرب سے بھرپور ان کا یہ شعر خود ایک دن انھیں کی ذات پر ایسے چسپاں ہو جائے گا۔ نہیں تو اپنی موت سے کچھ دن پہلے شاید یہ بھی خبر نہ تھی کہ اپنے ہمعصر جوشؔ کے انتقال کی خبر سن کر جب انھوں نے بڑے اداس لہجے میں اپنا یہ شعر پڑھا تھا۔

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

تو وہ خود ان کی زندگی کی کیسی سچی تصویر کشی کر رہا تھا اور کیسے جوشؔ کی موت کے ٹھیک نو دن بعد خود فراق نے زندگی کو خیرباد کہا۔ اس زندگی کو جو انھیں اپنے دور میں "بیمار کی رات" محسوس ہوتی تھی۔ ۳ مارچ ۱۹۸۲ء کو اردو غزل کی ایک نمایاں آواز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ مگر کیا آوازیں واقعی خاموش ہو جاتی ہیں؟ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے جی نہیں چاہتا۔ زندگی کی شور و غل میں آوازیں گم تو ہو سکتی ہیں خاموش نہیں ہو سکتیں۔ خصوصاً فراق کی آواز ___ جو اپنی انفرادیت کی وجہ سے غزل گو شعرا کی بھیڑ میں بھی پہچانی جا سکتی تھی جسے فراق نے مر مر کے پالا تھا۔ اس آواز کو وہ بڑے پیار سے اردو شاعری کے متوالوں کو سونپ کر چلے گئے۔

میں نے اس آواز کو مر مر کے پالا ہے فراقؔ
آج جس کی نرم لو ہے شمعِ محرابِ حیات

واقعی فراقؔ کی مدھم، نرم لب و لہجے اور کرب و اداسی سے بھرپور آواز اردو غزل میں میرؔ کے بعد دوسری دل میں اتر جانے والی آواز تھی جسے سن کر پلکیں بھیگ جاتی تھیں۔ اور سردیوں کی کسی حسین شام کی سی کیفیت کا احساس ہوتا تھا۔ دراصل فراق کی شاعری کی اس کیفیت کو سمجھنے کے لیے وہ پس منظر جاننا بے حد ضروری ہے جس نے فراق کو فراق بنایا۔ فراقؔ کے اکثر خطوط میں جو انھوں نے محمد طفیل مدیر نقوش کے نام

تحریر کیے ہیں اور جن کا مجموعہ "من آنم" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کی اس ذہنی کیفیت کا ذکر ملتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"میں زندگی بھر ایک ناقابل برداشت حد تک ایک دکھی، غم زدہ انسان رہا ہوں۔ تلخیاں، بیزاریوں، پریشانیوں، اپنی حالت سے نفرت۔ یہ وہ عناصر رہے ہیں جن سے میری زندگی عبارت تھی۔"

سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر وہ کون سا غم تھا جو ان کے شاعرانہ دل کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ اس کی وضاحت بھی خود فراق ہی کے ایک خط سے ہوتی ہے۔

"میری شادی نے میری زندگی کو ایک زندہ موت بنا کے رکھ دیا۔ زندگی کے عذاب ہو جانے کے بعد میں نے خودکشی نہیں کی۔ نہ پاگل ہوا نہ جرائم پیشہ بنا۔ نہ زندگی کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوا۔ اس لیے کہ شدید حسن پرستی کے باوجود زندگی کی شرافت کی جو قدریں مان چکا تھا۔ ان کا میں نے سہارا لیا۔ فرائض شناسی نے مجھے برباد ہونے سے بچا لیا۔"

فراق بچپن سے بے حد جذباتی تھے اور شدت پسند بھی۔ مناظر قدرت سے اس قدر متاثر ہوتے کہ انھیں میں کھو سے جاتے۔ بچپن ہی میں ایسی دوستیاں جو بے حد سنجیدہ اور شدید قسم کی کہی جا سکتی ہیں۔ وہ اپنے کھیل کھلونوں سے بھی بے حد جذباتی لگاؤ رکھتے تھے۔ اور حسن پرستی کا یہ عالم تھا کہ دو تین سال کی عمر میں ہی کسی بدصورت مرد یا عورت کی گود میں جانے سے انکار کر دیتے تھے لیکن اسی جمالیات پرست کا دامن ایک بدصورت عورت کے پلّو سے باندھ دیا گیا۔ فراق کی شخصیت کچل سی گئی۔ ان کی نفسیات پر ایک کاری ضرب لگی اور یہی ضرب ایک کرب آمیز چیخ اور اداسی بن کر ان کی غزلوں میں ابھر آئی۔

تاریکیاں چمک گئیں آواز درد سے
میری غزل سے رات کی زلفیں سنور گئیں

اپنی زندگی کے اس خلا کو پُر کرنے اور غزل کی زلفوں کو سنوارنے کے لیے فراق نے ایک اور محبوب سے دل لگایا اور وہ محبوب تھا انقلاب۔ وہ زندگی کی حقیقتوں سے ٹکرائے۔ اپنے وطن میں ہونے والی آزادی کی تحریکوں سے متاثر ہوئے۔ کانگریس میں شامل ہوئے جلسوں میں شرکت کی۔ انقلابی مہموں میں شامل ہوئے۔ جیل گئے۔ سزائیں کاٹیں یہیں ترقی پسندوں سے ملے اور انقلابی اور باغیانہ لب و لہجہ کو اپنا کر غزل کو ایک نیا رنگ دے دیا۔

اہل جنوں کو وسعتیں کچھ اور مل گئیں
دل بڑھ گیا ہے پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

اسی انقلابی تحریک نے ان کو غزل گوئی کے علاوہ نظم گوئی کی طرف بھی مائل کیا اور حسن و عشق کی نرمل کومل اور شیتل چھایا سے نکل کر فراق نظم کی تپتی ہوئی انقلابی

ماؤں میں چلے آئے اور اشتراکیت کے ترانے الاپنے لگے۔ انقلاب روس کی باتیں
ی کیں۔ سرمایہ داری کے خاتمے اور سوشلزم کے عروج کا موضوع بھی چھیڑا اور داستان
م بیان کرتے ہوئے دعوا کیا کہ۔

"ہم زندہ تھے، ہم زندہ ہیں، ہم زندہ رہیں گے

یہ حقیقت ہے کہ فراق کو غزل گو کی حیثیت سے جو شہرت ملی وہ ان نظموں سے نہ مل سکی۔
لین فراق کی جمالیاتی حسیات ان کی رباعیات میں غزل سے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے
ئیں۔ اپنی زندگی کی اس کمی کو جسے محرومیِ حسن کہا جا سکتا ہے۔ فراق نے روپ کی
باعیات کے ذریعے کی جس میں حسن فطرت اور حسن انسانی کے حسین ترین پہلو کی
صویر کشی کی گئی ہے بلکہ ہندستانی حسن کو الفاظ میں یوں قید کر لیا ہے جیسے اجنتا
ں مورتیوں میں نظر آتا ہے۔ فراق کی ہر رباعی اجنتا کی ایک مورت ہے اور ایسی ہی
ئی مورتیوں سے فراق کی شاعری کی اجنتا۔ ان کی رباعیوں کے مجموعے "روپ" کی صورت
یں پڑھنے والوں کے سامنے آئی۔ ان کی رباعیوں میں محبوب کے سراپا کی تصویریں مختلف
ا ویوں سے کھینچی گئی ہیں۔ انگڑائیاں لیتا ہوا سر کم سا قامت، منڈلاتے ہوئے بادلوں کے سے گیسو
بھرے بھرے کولھے اور پنڈلیاں۔ امرت میں ڈوبی ہوئی آواز، راج ہنس کی طرح لچکدار گردن،
جھلملاتا گھونگٹ، ندی کی سی اٹھلاتی چال۔ غرضیکہ ہندستانی حسن اور فطرت کا ایک
یک منظر دونوں ان رباعیوں میں گلے ملے نظر آتے ہیں۔ اس طرح فراق نے اپنے ناآسودہ
جنس جذبات کو پاکیزگی کا لباس عطا کیا۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے فراق کو
پنے عہد کی ایک اہم شخصیت بنا دیا مگر اتنی ہی متنازعہ فیہ بھی۔ اردو شاعری میں
نقادوں کے مابین جتنا اختلاف فراق کی شاعرانہ حیثیت کے متعلق پایا جاتا ہے شاید
کسی اور شاعر کے متعلق نہیں۔ فراق کے سلسلے میں دو گروہ خاص طور پر نظر آتے
ہیں۔ ایک ان کے موافقین کا اور دوسرا ان کے مخالفین کا۔ اول الذکر گروہ میں
پروفیسر ممتاز حسین، سید محمد عقیل، ڈاکٹر اجمل اجملی، راج بہادر گوڑ وغیرہ کے
نام لیے جا سکتے ہیں۔ آخر الذکر گروہ میں جگن ناتھ آزاد، پروفیسر گیان چند جین
ور شمس الرحمان فاروقی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ لوگ فراق کو اچھا ضرور شاعر
مانتے ہیں لیکن بڑا شاعر ماننے سے انکار کرتے ہیں یہاں تک کہ گیان چند جین تو
نھیں ایک اچھا انسان بھی نہیں مانتے۔ لیکن ایک بات ضرور ہے جس کی طرف ڈاکٹر
لی احمد فاطمی نے اشارہ کیا ہے۔ شاید اسی میں ان کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے کہ ہر
شخص ان کی شخصیت کو بالعموم اور شاعری کو بالخصوص پڑھتا ہے۔ متوجہ ہوتا ہے۔
پھر اپنی فہم اور استعداد کی روشنی میں لفظیات اور اسلوبیات کے ڈھانچے میں اسے
جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے اور نہیں کر پاتا تو جھنجھلاتا ہے۔ الزام تراشتا ہے
عیوب و نقائص تلاش کرتا ہے پھر بھی فراق کو پسند کرتا ہے۔"

شاید اسی لیے مرنے کے بعد بھی ان کی شخصیت کا جادو باقی رہا۔ ان کی شخصیت اور شاعری سے متعلق مضامین لکھے گئے۔ رسالوں نے ان کے خاص نمبر ترتیب دیے۔ سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر ملک بھر میں سمینار منعقد کیے گئے۔ مگر پھر بھی لوگ فراق کو مکمل طور پر سمجھ نہ سکے فراق خود ایک تنقیدی نگاہ کے مالک تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین ان کے تنقیدی شعور کے غماز ہیں اور ان کے یہ جملے ان کی شخصیت کو سمجھنے میں۔ ان کے نقادوں کے لیے ممد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

"شاعر کی انفرادیت کی جستجو اور پھر شاعر کو پا لینا ایک دلچسپ لیکن دق کر دینے والی کاوش کا نام ہے۔ اپنے آپ کو شاعر کے کلام میں تحلیل کر دینا ہوتا ہے۔ شاعر اور شاعری کے متعلق برسوں تک سوال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"

فراق کو سمجھنے کے لیے بھی ہمیں برسوں تک سوال کرنا ہوگا۔ تبھی ہم فراق کو سمجھ پائیں گے۔ یوں دیکھیے تو وہ ایک اچھے شاعر، ایک صاحب طرز نقاد۔ ایک ذہین انسان اور ایک قابل استاد تھے جن کی زندگی بیسویں صدی کی آٹھ دہائیوں پر محیط تھی اور آج ان کی موت کے پانچ سال بعد بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ فراق کی شخصیت اور فکر و فن کے ایسے بہت سے گوشے باقی ہیں جو تشنۂ تحریر ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور بہت کچھ لکھنے کے لیے بہت کچھ سمجھنا بے حد ضروری ہے لیکن شاید شمیم حنفی نے صحیح کہا ہے کہ

"اصل میں یہ سارا تماشا یوں پیدا ہوا کہ ایک تو فراق صاحب کی اپنی شخصیت ہی کافی پیچیدہ تھی دوسرے یہ کہ لوگوں کو مشتعل کرنے کے معاملے میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ناممکن تھا کہ آپ ان سے ملیں اور غیر معمولی طور پر متاثر یا بیزار ہو کر نہ انھیں بیچ کا راستہ نہ خود انھوں نے اپنایا نہ بس بھر دوسروں کو اپنانے دیتے تھے۔"

افسوس اردو غزل کی وہ منفرد آواز اور وہ دلچسپ باب ختم ہو گیا۔ لیکن آنے والی نسلیں فراق کو ہمیشہ یاد کرتی رہیں گی۔ انھوں نے خود کہا تھا ؎

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی ہم عصرو
جب یہ دھیان آئے گا ان کو تم نے فراق کو دیکھا تھا

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

امام نقوی
ایران قونصل
لوک ۷ ہے نے پین سی روڈ
۳۶

اجمل کا کمال "آج"

آج زندگی اس قدر الجھنوں میں گرفتار ہوچکی ہے کہ اس سے متعلق ہر شئے کو سود و زیاں کی ترازو میں
ابھی لازم ہوتا جارہا ہے۔ موجودہ دور کا پڑھا لکھا انسان بھی اپنی زندگی گزارنے کی خاطر زندگی سے
قات کا انتخاب کافی غور و فکر کے بعد ہی کرتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ دوران انتخاب وہ
ی سامنے کی حقیقت فراموش کر جاتا ہے۔ یعنی وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس انتخاب کے نتیجے میں کچھ چیزیں
عمداً چھوڑنی ہوں گی اس سے بھی زیادہ بوالعجبی یہ کہ انتخاب کے مرحلے سے گزرنے کے بعد انسان چھوٹ
نے والی چیزوں پر پچھتاتا بھی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پچھتاوے کا یہ احساس کیوں پیدا ہوتا ہے۔
اب کے لمحے میں ہم نے اپنے لیے جو مناسب خیال کیا اُسے منتخب کر لیا۔ پھر پچھتانا کیسا؟

لیکن موجودہ دور میں سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر خسارے کا سودا کرنے والے کو
پ یقیناً دیوانہ قرار دیں گے۔ اور سچ پوچھیں تو اس عہد میں الہ دین کا چراغ لے کر بھی ایسے دیوانے
پ کو نہیں ملیں گے۔ مگر فرزانوں کے اس جہان میں ایک دیوانہ یقیناً موجود ہے۔ اجمل کمال ــ شاید
آپ اس سے ملے ہوں۔ حالانکہ وہ دہلی، بمبئی، مدراس، کلکتہ گھوم چکا ہے۔ جنھوں نے اُسے دیکھا
ہے وہ حیرت میں مبتلا ہو گئے اس لیے کہ اجمل کمال اور شیوسینا کے بال ٹھاکرے میں خطرناک
تک مشابہت ہے۔ شیوسینا والے ضرورت پڑنے پر اجمل کمال کو پاکستان سے اسمگل کروا سکتے
، مگر اس خطرناک مشابہت کے باوجود دونوں کے چہروں کی رنگت جداگانہ ہے۔ ٹھاکرے کے
ہے پر مسلمانوں اور دلتوں کے خون کی سرخی صاف دکھائی دیتی ہے جبکہ اجمل کا چہرہ زرد
ہے۔

غیر منقسم ہندستان میں اجمل کا خاندان مظفر نگر میں آباد تھا ۔ ۴۸ء کے بعد اجمل کے والد پاکستان
رت کر گئے۔ اجمل کی تعلیم و تربیت حیدرآباد سندھ اور کراچی میں ہوئی۔ مگر میرے لیے اجمل کا
جوداس کی سوچ اور اس کا زندگی گزارنے کا انداز حیران کن ہے۔ کیونکہ اب تک جتنے بھی پاکستانی
زات سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا ہے ان میں اور اجمل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دیگر افراد کی
گی اس عورت سے مشابہت رکھتی ہے جو اچھے خاصے ناک نقشے کے باوجود اپنی فطری خوبصورتی کو
ضروری زیبائش کے لوازمات کی آلائشوں سے تباہ کر لیتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں کہوں تو مجھے

کراچی کی سڑکوں پر طوفانی رفتار سے دوڑتی بسوں کا سہارا لینا پڑے گا۔ پاکستانیوں کی زندگی ویگنوں کی طرح ہے جس پر ویگنوں کے مالک اپنی معصومیت کے باعث پیلے رنگ کے بتر ے مروا کرتے ہیں تاکہ بس (ویگن) خوبصورت نظر آئے۔ مگر اجمل کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ زندگی جیسی ہے۔ اسے قبول ہے۔ اپنی تمام تر مجبوریوں، محرومیوں، اور خوابوں کے ساتھ۔ کہیں کوئی تصنع نہیں، کوئی بڑبولاپن نہیں۔ کم گوئی اس کی ایک ایسی خوبی ہے جو حق گوئی کے اظہار میں کبھی مانع نہ ہوئی۔ آنکھیں زیادہ تر پڑھتی ہوئی، کتابیں یا پھر چلتی پھرتی زندگی دوستوں کا ہجوم ہے۔ افضال نظمیں سنا رہے ہیں۔ تحسین کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں مگر اجمل بیٹھے بیٹھے مراقبہ میں چلے جاتے ہیں۔ واپسی ہوتی ہے تو کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ افضال کی سوالیہ نظریں اجمل پر مرکوز ہیں۔ اجمل سناکی سے کہتے ہیں۔

"مزہ نہیں آیا۔ اس موضوع پر فلاں شاعر نے بڑی جاندار نظم کہی ہے۔ تم پڑھو۔ پتا چل جائے گا۔ کہاں کھڑے ہو۔"

آپ سوچ رہے ہوں گے اجمل کمال شاعر ہوں گے یا افسانہ نگار، ممکن ہے نقاد ہوں۔ مگر نہیں صاحب اجمل کو شاعری کا شوق ہے نہ افسانہ لکھنے کا مرض۔ تنقید وہ اس طرح پڑھتا ہے جیسے کھچڑی کھانے کے دوران اچار استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اس پر اسی انداز میں تبصرہ بھی کرتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے "اظہار" میں وزیر آغا کی تنقید نگاری پر وارث علوی کا جارحانہ مضمون پڑھنے کے بعد اس نے مجھے لکھا تھا۔

"یہ وارث علوی کو کیا ہو گیا یار۔ بھلا کوئی سمجھدار آدمی ہتھوڑے سے پاپڑ توڑا کرتا ہے۔"

ایک ہی جملے میں وارث علوی اور وزیر آغا کی تنقیدی صلاحیتوں کو بیان کر دینے والا اجمل کمال ۷۹ء سے خسارے کا سودا کر رہا ہے۔ غالباً ۷۹ء یا ۸۰ء میں اس نے کراچی سے "آج" جاری کیا۔ میری یادداشت کے مطابق طبعزاد چیزوں میں اسد محمد خاں کا "افسانہ "باسورے کی مریم" اور انور خاں کی کہانی "کووں سے ڈھکا آسمان" شامل تھیں یا پھر افضال سید اور ذیشان ساحل کی کچھ نظمیں باقی کا پورا پرچہ ترجموں پر مشتمل تھا۔ آج بھی ترجموں سے عبارت تھا۔ دنیا بھر کی اچھی نثری و شعری تخلیقات کا خوبصورت انتخاب۔ اس کے بعد اجمل نے ہندوستان کی علاقائی زبانوں کے بہترین شعری سرمایے کو "بارہ ہندوستانی شاعر" نامی کتاب میں شامل کیا چیک ادیب میلان کنڈیرا کے انٹرویوز کے تراجم اور خود کنڈیرا کی ایک خوبصورت کہانی "سوانگ" اور کچھ دیگر مغربی زبانوں کے نثری و شعری سرمایے کو مسلسل اردو والوں کے سامنے اجمل پیش کرتے رہے۔

اور اب اسی اجمل کمال نے گرما ۱۹۹۰ء کا نیا شمارہ شائع کیا ہے۔ جس میں چار کہانیاں شامل ہیں اولیت راجستھانی ادیب وجے دان دیتھا کی کہانی "کتنے ہٹلر" کو حاصل ہے باقی کہانیاں بالترتیب انور حسن منظر اور محمد سلیم الرحمٰن کی ہیں۔

"آج" کے نئے شمارہ کا حاصل "زندہ بہار" ایک سفر کی روداد ہے جسے فہمیدہ ریاض نے لکھا ہے پاکستان سے شائع ہونے والے سفرناموں میں تارڑ، اشفاق احمد، ممتاز مفتی کے سفرنامے اپنے دلکش

...بیان کی وجہ سے یاد رکھے جاتے ہیں۔ فہمیدہ کی تحریر "زندہ بہار" بھی کافی عرصہ تک اردو والوں کو غور و...ر مجبور کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کی روداد پاکستانیوں کی آنکھوں کے سامنے کئی اہم سوالات ...رتی ہے جس کے جوابات دینا ہر پاکستانی کا فرض ہے۔ اپنے بنگلہ دیش کے دوران سفر فہمیدہ ...شوار گزار منزلوں سے گزری ہیں جن کی اذیت بلا کم و کاست بیان کر دی گئی ہے۔ مگر ایک پاکستانی ...نے کے ناتے کہیں کہیں ان کے تعصبات بھی در آئے ہیں۔ اور چند ایک مقامات پر فہمیدہ ریاض نے ...ب داری سے بھی کام لیا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے یحییٰ خاں کو بھی ملعون کیا ہے (۱۴۷) اور ضیاالحق ...ں۔

بنگلہ دیش کے قیام کو کم و بیش انیس برس ہو چکے ہیں۔ اس عرصہ میں تینوں ملکوں میں تین ...ر بلوغت کی حدیں عبور کر چکی ہیں۔ خود فہمیدہ ریاض ۱۹۷۱ء میں چھبیس برس کی تھی۔ اور یہ پاکستان ... دانشور طبقہ کی بدقسمتی رہی ہے کہ اپنے میں تمام تر تجزیاتی صلاحیتوں کی موجودگی کے بعد بھی وہ ایمان داری ... حالات و واقعات کا صحیح تجزیہ نہیں کر پاتے۔ مشرقی پاکستان کے سقوط کی تمام تر ذمہ داری یحییٰ خاں ... فوج کے سر منڈھنا آج بھی اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ انیس برسوں کے بعد بھی پاکستان کا دانشور ... اپنی تجزیاتی صلاحیت کو استعمال نہیں کر رہا ہے۔

...آمریت، بلا شبہہ ایک لعنت ہے۔ لیکن ایمان داری سے اگر تجزیہ کریں تو ہم پر واضح ہوگا کہ ...ستان میں جب جب جمہوریت کی باد نسیم چلی ہے۔ پاکستان والے کچھ زیادہ ہی مخمور ہو گئے۔ جمہوریت ...ثر ان پر ایسا چڑھا کہ فہمیدہ ریاض کو بھی کہنا پڑا۔

"قومی آزادی کا مطلب یہ بھی ہے کہ قوم کا استحصالی طبقہ بھی آزادی حاصل کرے"

اس مادر پدر آزادی کا تصور، پاکستانیوں اور پاکستان کو جمہوری گوہر شاہی کی بدولت ہی ملا ... ۱۹۷۱ء کے بعد بھی پاکستان کی تاریخ میں اس کی مثالیں بہ آسانی تلاش کی جا سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ ذوالفقار علی بھٹو کی صاحبزادی بھی پاکستان کو وہی سوغاتیں دے رہی ہیں جو بھٹو دے چکے تھے۔

ہمیں خوشی ہوتی اگر فہمیدہ ریاض اسی ہمدردی اور ایمان داری سے المیہ مشرقی پاکستان کا ...ر کرتیں جس طرح انھوں نے بنگلہ دیش میں بہاریوں کی زبوں حالی کو بیان کیا ہے۔

بہر حال! ہم اجمل کمال کے ممنون ہیں کہ ان کی بدولت "آج" کے ذریعہ ہمیں کچھ ایسی تحریریں پڑھنے کو ...ئیں جن پر غور کرنا بھی آج کی اہم ضرورت ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

کتاب	موضوع	مصنف	قیمت
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/-
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/-
پت جھڑ کی آواز	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۴۰/-
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	۵۰/-
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۰/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/-
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۱۵/-
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سیّد مقبول احمد	۰/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/-
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/-
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربّانی تاباں	۴۵/-
قلندر بخش جرأت	(خطبہ)	جمیل جالبی	۱۰/-
عجائب گھر	(بچوں کی سائنسی کتاب)	قاسم صدیقی	۱۰/-
تاریخ اودھ	(تاریخ)	ترجمہ و ترتیب شاہ عبدالسلام	۲۶/-
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	(ادب)	ظ انصاری	۴۲/-
تنقید اور جدید اردو تنقید	(تنقید)	ڈاکٹر وزیر آغا	۹۰/-
مشقی تدریس، کیوں اور کیسے؟	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۲۵/-
آوازوں کا میوزیم	(افسانے)	ساگر سرحدی	۴۵/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو	(خاکے)	کشمیری لال ذاکر	۲۶/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	(خاکے)	اشرف صبوحی	۵۱/-
چند تصویر بتاں	(تاثرات)	مولانا عبدالسلام قدوائی	۲۵/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	(ادب)	پروفیسر آل احمد سرور	۸/-
صاحب جی سلطان جی	(تذکرہ)	ڈاکٹر اسلم فرخی	۲۰/-
نظام رنگ	(ادبی خاکہ حضرت نظام الدین اولیا)	〃 〃 〃	۱۵/-
شہید جستجو	(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/-
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست	(مذہب)	مشیر الحق	۸/-
ہمارے دینی علوم	(مذہب)	مولانا اسلم جیراجپوری	۱۸/-
تحقیقی مضامین	(تحقیقی)	مالک رام	۹۰/-
آسان اردو، ورک بک	(تعلیم)	شکیل اختر فاروقی	۲۴/-

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

کتاب نما کے پچھلے شمارے میں اختر شاہ جہاں
پوری کا ایک بہت ہی مختصر سا خط چھپا ہے جس میں راقم
سطور نے آپ سے فرمایش کی ہے کہ آپ "گوشے" نہ چھاپا
کریں۔ کتنی ن دہ عزت رساں اور افسوس ناک
فرمائش ہے۔ میں تو آپ سے کہنا چاہتا تھا کہ ایک ہی
شمارے میں ۳ یا کم سے کم دو گوشے ضرور چھاپیں۔ جب
کسی کا تعزیتی جلسہ ہوتا ہے تو دس مقررین میں سے نو
ضرور یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ادیبوں، شاعروں کو ان کے
انتقال کے بعد ہی یاد کرتے ہیں۔ باقی کا دسواں مقرر بھی
یہی کہنا چاہتا ہے۔ لیکن پھر سوچتا ہے (مقرر کبھی کبھی
سوچتے بھی ہیں) کہ اتنے سارے لوگ تو یہی بات کہہ
چکے ہیں کیوں کہوں! آپ اس تجویز پر زیادہ توجہ نہ دیں
ان کا خط آپ نے چھاپ دیا کافی ہے۔ میں تو کہوں گا کہ
آپ ایک گوشہ "گوشۂ قارئین" بھی چھاپیں، تصویروں
کے ساتھ (خواتین کی نمائندگی ضرور ہونی چاہیے لیکن
مشکل یہ ہے کہ خواتین گوشے کو گوشۂ پردہ سمجھتی ہیں)
ویسے 'کھلے خطوط' قارئین ہی کا گوشہ ہوتا ہے۔ لیکن اس
میں قاری کی صرف رائے ہوتی ہے، قاری کی تفصیل نہیں
ہوتی۔ قاریوں کا بھی بایو ڈیٹا ہوتا ہوگا۔ نہیں ہوتا تو اب
تیار کیا جا سکتا ہے۔ (ان کے بایو ڈیٹے کے صحیح اور درست
ہونے کے امکانات زیادہ ہیں)

زیادہ سے زیادہ گوشے چھاپنے کی میں اس لیے
سفارش کر رہا ہوں کہ کوئی کب تک اپنی باری کا انتظار
کرتا رہے گا۔ سارے مدیران جرائد متفق نہیں ہوسکتے
ورنہ میں یہ کہتا کہ تمام مدیران جرائد کو کسی سمینار میں
بیٹھ کر آپس میں ادیبوں، شاعروں کو بانٹ لینا چاہیے
کہ کس پرچے میں کس کا گوشہ شایع ہوگا۔ اس صورت میں
سب کے ساتھ انصاف ہوسکے گا۔ اگر کسی خاص ادیب
یا مخصوص شاعر کے نام پر اصرار ہو کہ ان کا گوشہ تو میرے
ہی رسالے میں چھپے گا تو اس نزاع کا تصفیہ بذریعہ
قرعہ اندازی کیا جائے۔ اس ضمن میں کسی شاعر یا ادیب
کی منظوری کی فکر نہ کی جائے۔ سارے ادیب اور شاعر
صحافت کی ملکیت ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو کوئی شکایت
ہوگی تو اس کے لیے عدالت کے دروازے کھلے ہیں۔
عدالتیں تو ہر قسم کی درخواستیں قبول کر لیتی ہیں۔ دکتنے
اہم مقدمات اسی لیے نمبر پر نہیں آتے) نمبر کے لفظ پر یاد
آیا کہ کچھ لوگوں کو نمبر ہی زیب دیتے ہیں۔ اس بات کا
خاص خیال رکھا جائے۔

مجھے حیرت ہے کہ اختر شاہ جہاں پوری نے گوشوں
کی مخالفت کی کیسے؟ گوشے بھی تو تخلیقات کا مجموعہ ہوتے
ہیں۔ اس میں نظمیں بھی ہوسکتی ہیں اور نثر تو ہوتی ہی
ہے۔

اگر کسی گوشے کے لیے آپ کو مہمان میرٹر مل رہا
ہو تو میری خدمات حاضر ہیں۔

یوسف ناظم۔ بمبئی

● اس شمارے کا اشاریہ مطالعہ کے لائق ہے۔
جناب رفعت سروش نے حقیقت کو بہت ہی خوبصورت
پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ اردو کو اردو والوں سے جو
نقصان پہنچا ہے۔ اس کے اظہار کے لیے ایک دفتر
چاہیے۔ کتنے لوگ ہیں جو ہر ماہ صرف ۵ روپے
اردو کے لیے نکال لیتے ہیں۔ حالانکہ اردو سے یہ ہر ماہ
ہزاروں روپے حاصل کرتے ہیں۔

"گوشۂ جذبی" اور "اردو ہے جس کا نام" سے بہت
متاثر ہوا۔

محمد شمس الدین، اسنسول ۔ ۷۱۳۳۰۲

بچوں کی نئی دلچسپ کتابیں

ننھے منے بچوں کے لیے

کتاب	قیمت
بتاشے	۶/۵۰
جاں نثار دوست	۵/:
چاند کی بیٹی (با تصویر)	۵/:
دم کٹی لومڑی "	۶/۵۰
جادو کی ہنڈیا "	۵/:
شیر اور بکری "	۶/۵۰
کوے کا خواب "	۶/۵۰
بھیڑیے کا گانا "	۶/۵۰
چالاک بلی "	۶/:
گدھے نے بجائی بانسری "	۶/۵۰

بڑے بچوں کے لیے

کتاب	قیمت
نردولی کا آدم خور	۹/=
غریب لکڑہارے کی کہانی	۶/=
خلائی مسافر	۶/-
ہمت کے کرشمے	۶/-
مونٹی کرسٹو کا نواب	۹/:
ہمارے عظیم سائنس داں	۸/:
سام پر کیا گزری	۳/۵۰
غذا کی کہانی	۳/-
زیور	۶/-
شہنشاہ نے کہا میں مفلس ہوا	۶/-
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی	۶/-
سنہرے اصول	۳/-
نرالے گویے	۴/-
بالونی کچھوا	۴/-
بدر شہزادی	۶/-

کتاب	قیمت
مولانا آزاد کی کہانی	۱۸/:
ننھا سیاح	۷/-
ابو خاں کی بکری	۱۵/-
پرواز کی کہانی	۳/-
سمندری طوفان اور تین لڑکے	۶/-
خالی ہاتھ	۹/:
حاجی بابا کی ڈائری	۶/۵۰
بہادر علی	۷/۵۰
کھلونا نگر	۷/:
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	۶/:
قصہ اژدھا پکڑنے کا	۵/:
ننھا سراغ رساں	۵/:
ابو علی کا جوتا	۵/:
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	۹/-
چور پکڑو	۳/-
چالاک خرگوش کے کارنامے	۷/۵۰
جادو کی سارنگی	۳/-
جادو کا چھلا	۳/-
پانچ جاسوس	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات	۶/:
ہرن کا دل	۲/:
اچھی کہانیاں	۲/۵۰
دریا کی رانی	۲/:
گوہر شہزادی	۲/:
تین اناڑی	۶/:
چوری کی عادت	۳/۵۰
شرارت	۳/:
دل کی شادی	۴/-
گاندھی جی دکنی افریقہ میں	۲/:
بندر اور نائی	۳/۵۰
رنگوں کی بستی	۴/:

کتاب	قیمت
پراسرار غار	/:
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں	/۵۰
بچوں کے ذاکر صاحب	۱/:
ننھا منو	۲/:
آؤ ڈراما کریں	۳/:
سلامہ صمصامہ	۵/:
مچھیرا اور اس کی بیوی	۱/۵۰
ایک کھلا راز	۴/۵۰
بھوتوں کا جہاز	۹/۵۰
صحت کی الف بے	۵/:
لومڑی کا گھر	۲/:
بچوں کی کہانیاں	۳/:
بابا ناصح	۳/:
بہار کی تلاش	۹/:
سرخ جوتے	۳/۵۰
اندرا گاندھی	۹/:
ننھا فرشتہ	۲/۵۰
جوہر قابل	۲/:
بھیڑیے کے بچے	۲/:
ننھا جبرو	۳/۵۰
پلک نہ مارو	۹/:
بچوں کے افسر	۹/:
شریر شیرا	۲/:
پری رانی	۳/:
خطرناک سفر	۳/۵۰
پرندوں سے جانوروں تک	۴/۵۰
ٹوٹے کھلونے	۵/:
اندھے کا بیٹا	۲/۵۰
پانچ بونے	۲/:
بچوں کے چار بزرگ دوست	۳/:
سہانے ترانے	۹/۵۰

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

جاں نثار دوست

مترجم :۔ فیروز اختر
سال اشاعت :۔ ۱۹۹۰ء
ضخامت :۔ ۳۲ صفحات
قیمت :۔ پانچ روپے۔
ناشر :۔ مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر نئی دلی ۲۵
تبصرہ نگار :۔ دلیپ بادل

بچے ملک کی امید ہوتے ہیں اور مستقبل ان ہی کے دم سے تابندہ و درخشندہ ہوتا ہے روس، انگلینڈ، جرمنی فرانس اور دوسرے ملکوں پر بچوں کے لیے دل کش، سبق آموز اور سود مند کتابیں لکھی جا رہی ہیں مگر ہمارے ہندستان میں بچوں کے ادب کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی یہی وجہ ہے کہ بچوں ملبے دلی کا احساس در آیا ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ مبارک باد کا مستحق ہے جس نے نہایت خوبصورت ادب بچوں کے لیے شائع کیا ہے۔ زیر نظر کتاب اصل میں آسکر وائلڈ کی کہانی سے ماخوذ ہے۔

دوستی کی خواہش ایک فطری عمل ہے۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے کوشش کرنا کوئی بدعت نہیں ہے۔ البتہ اس کے لیے احتیاط کی بڑی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ ہر آدمی دوست بنانے کے قابل نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر آدمی دام فریب کا شکار ہو جاتے ہیں اسی لیے کسی کو دوست بنانے سے قبل اس کی آزمائش اور پرکھ نہایت ضروری ہے۔ اسی کہانی کو ایک بلبل ندی کے کنارے پچھوے، بطخ اور گلہریوں کو سنا رہی ہے۔ یہ کہانی ایک گاؤں کے نیک اور ایماندار نوجوان نور الدین کی ہے جو اکیلا اپنی جھونپڑی میں رہتا تھا اس کا ایک باغیچہ تھا جس میں خوب پھل پھول ہوتے تھے۔ اس کا ایک چھوٹا سا کھیت بھی تھا مگر سردی میں باغیچہ خشک ہو جاتا اور اپنی گھریلو چیزیں بیچ کر گزارا کرتا اس کا ایک چوہدری رحمت تھا۔ جو بظاہر دوستی کا دم بھرتا تھا مگر نور الدین سے اپنا کام شیریں باتیں کر کے کرا لیتا۔ رحمت کا دل صاف نہیں تھا۔ وہ خود غرض تھا اس کی بیگم بھی خود غرض تھی البتہ اس کے لڑکے میں رحم دلی کے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ رحمت کے لڑکے کو جب

قد ید چوٹ لگ جاتی ہے تو وہ نورالدین کو ڈاکٹر کے پاس بلانے کو بھیج دیتا ہے۔ بلا کا طوفان تھا۔ بارش بھی زور سے ہو رہی تھی اور نورالدین کا پاؤں پھسلا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔

کتاب کی کتابت اور طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ بچوں کی دلچسپی کے لیے نہایت خوبصورت تصاویر بھی آویزاں ہیں۔ کتاب کا سرورق معنی خیز، اور دلکش ہے۔ یقیناً بچوں کے ادب میں کتاب ایک گراں اضافہ ہے۔

ہنسیے (مزاحیہ)

مصنف و ناشر: عاصی سعید
اشاعت: ۱۹۹۰ء، مبصر: راشد جمال فاروقی
قیمت: ۳۰ روپے
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

"چٹخارے" اور "آگ اور پھول" کے بعد عاصی سعید کا یہ تیسرا مجموعہ "ہنسیے" اٹھارہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اکثر مضامین بے حد لطف انگیز ہیں۔ قاری کے لیے قدم قدم پر مسکراہٹوں کا خزانہ لیے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں قہقہہ بار بھی ہیں۔ عاصی سعید کا اسلوب نگارش جدا اور منفرد ہے، کرارا اور شگفتہ انھیں الفاظ اور زبان پر قدرت ہے۔ تخیل بڑا وسیع ہے۔ کہیں کہیں محاکاتی رنگ کی آب و تاب بھی ہے۔ ان کا انوکھا تخلیقی رنگ اردو ادب میں نئی لذتوں کا اضافہ کرتا ہے۔ شائستہ طنز و مزاح میں مضمون کا مقصد معاشرہ کی اصلاح بھی ہے۔ پرانی بلند پایہ اخلاقی اقدار کی کس مپرسی کے اس زمانے میں بھی وہ ان اقدار کو کلیجے سے لگائے ہوئے ہیں، اور قاری سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں۔

بڑے بڑے نامور نقادوں، ادیبوں اور طنز و مزاح نگاروں نے عاصی سعید کے فن، منفرد و شگفتہ طرز تحریر زبان و بیان پر قدرت اور نیرنگئ تخیل وغیرہ وغیرہ کی داد دی ہے، مثلاً پروفیسر آل احمد سرور، فکر تونسوی، احمد جمال پاشا، یوسف ناظم، شفیقہ فرحت، یوگس حیدرآبادی، ڈاکٹر سعادت علی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ظفر پیامی وغیرہ وغیرہ جن سب کے اقتباسات "ہنسیے" کے صفحات ۴۴ تا صفحہ ۱۲۶ دیے گئے ہیں۔

مضمون رموز کی باتیں، بڑا شگفتہ، قہقہہ آور اور خالص مزاح ہے۔ انعام کے پھیر بھی اسی قبیل کا مضمون ہے۔ "اناں دے رگڑا" میں مزاح کے ساتھ طنز کی کارفرمائی بھی ہے، ان متقدر لوگوں پر جنھیں پبلک کی ناآسودگی کے خیال کے بجائے محض اپنی آسودگی کا خیال ہے، لولانہ کروں، عاصی کے رواں دواں طرز نگارش کی ایک عمدہ مثال ہے، جو میں نے پہلے "شگوفہ" میں بھی پڑھا تھا۔

عاصی سعید تمثیل اور فینٹاسی سے بھی ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ میرے نزدیک ان کے اس مجموعے کے بھی کئی مضامین مغربی عالمی ظرافت کے ساتھ رکھے جانے کے لائق ہیں۔ مثلاً "دل میں دل"، عالمی اور امن پسند انسانوں کا ایک مسحورکن خواب، جو آج تک بھی کسی ملک میں شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، مگر ہو سکتا ہے۔ خواہ دیر سے ہو۔ مثلاً "ملاقات"، جو ہمیں ٹالسٹائے کی مشہور روسی کہانی "تین سوال" کی یاد دلاتی ہے، جس میں ایک ہی وقت کو اہم تبلایا گیا ہے، اور وہ ہے "اب" ان کی بات بھی "اب" حال کا، ہر لمحہ موجود کا پورا پورا فائدہ اٹھا کر انسان کا ماضی بھی شاندار بن جائے اور مستقبل بھی شاندار۔ مثلاً "

نا
انسان کی بلند پایہ اخلاقی قدر عجز و انکسار کو سراہتا ہے۔ جن کو فی زمانہ اکثر لوگ انا میں بھول کر پر اتر آئے ہیں۔ مثلاً الٹی دنیا، اور تو ہم یوں جئیں، انسان کو سیدھے سیدھے چلنے اور اپنی حدود میں تلقین کرتے ہیں۔ مثلاً اللہ اور جلاد ے۔ انسان کی عمر کی اس سرحد کے آگے کی طرف اشارہ ہے جس کے بعد جینا نہ جینے کے برابر ہوا کرتا ہے۔
یقیناً "جئیے"، ہمارے اردو ادب میں ایک قابل قدر اور قابل فخر اضافہ ہے۔

نوائے دل

شاعر: رونق بدایونی
مبصر: عبداللہ ولی بخش قادری
قیمت: ۲۵ روپے

رونق بدایونی کو شاعری اپنے ماحول سے ملی ہے۔ وہ ان کے رگ و پے میں بسی ہوئی البتہ فنی رہنمائی کے لیے انھوں نے الحاج عبدالجامع صاحب جامی بدایونی (شاگرد حضرت احسن مارہروی) کا دامن پکڑا۔
غزل میں آب اس وقت آتی ہے۔ جب اس کی زبان اور انداز بیان بھی بلندی فکر میں شامل زبان پر قدرت اور فنی مہارت سے شعر ایک تراشیدہ ہیرے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ رونق استادانہ طور پر غزل کی مشاقی کی ہے۔ وہ تقریباً نصف صدی اس کاروبار شوق میں صرف چکے ہیں۔ غالباً وہ شاعری کے لیے ہی پیدا ہوئے۔ انھوں نے مدرسے کی معلمی محض اس لیے اختیار کی کہ اپنا پیٹ بھرتا تھا۔ اس وقت وہ ایک استاد فن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کے پاس ہونہار نوجوان شعرا کا ایک کارواں رہتا ہے جن کی شعری فکر کو جلا دینے میں وہ منہمک رہا کرتے ہیں۔ آج بلاشبہ میدان سخن میں رونق بدایونی، رونق بدایوں ہیں۔
سچ تو یہ ہے کہ غزل کے گیسو سنوارنے میں عمر صرف ہو جاتی ہے تب کہیں جاکر دلبری کے انداز آتے ہیں۔ اسی لیے رونق کے کلام میں کلاسکی دروبست ملتا ہے۔ اس میں الفاظ کی ترصیع سازی اور روایت کی پاسداری نظر آتی ہے۔ لیکن غزل کے لیے صرف یہ اہتمام شاعرانہ کافی نہیں ہے بلکہ بلا شرکت غیرے، اس کی زلف پر خم کے اسیر ہونے کی بھی شرط عائد ہوتی ہے اور خلوص کے علاوہ شعور بھی درکار ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو تو غزل، غزل بنتی ہے۔ رونق ان سب آداب غزل پر پورے اُترتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رونق ہم نے راہ وفا میں ‏ ‏ دانستہ بھی دھوکے کھائے
اگر آپ دیکھیں تو سب کچھ ہے دنیا ‏ ‏ اگر آپ سوچیں تو کچھ بھی نہیں ہے
اس بہار چمن کو کیا کہیے ‏ ‏ چند پھولوں کو راس آئی ہے

نوائے دل، اپنی جگہ فردوس نظر بھی ہے۔ خوش رنگ و خوش وضع سرورق اور دیدہ زیب طباعت کے علاوہ اس کا ہر ورق، نقش و نگار سے مزین ہے اور متعدد مرقعوں سے آراستہ بھی

ذکرِ شہادت

مصنف : سید علی موسیٰ رضا حسینی
مرتب : سید علی محمد خسرو حسینی
صفحات : ۱۴۳
مبصر : سری نیواس لاہوٹی
قیمت : ۴۵ روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

سانحۂ کربلا تاریخ عالم کا ایک ایسا واقعہ ہے جو بلا قید زمانہ انسانیت کو متاثر کرتا رہا ہے اور اس واقعہ نے ہر غم زدہ انسان کو تسکین بھی بخشتا رہا ہے کہ یزید اور اس کے حواریوں نے اہل بیت پر ایسے ایسے مظالم ڈھائے ہیں کہ اس کے مقابلے میں انسان اپنا نجی غم بھول جاتا ہے۔

"ذکرِ شہادت" کو سید علی موسیٰ رضا حسینی نے اپنے فرزند۔ لبند کا غم بھلانے کے لیے جن کا عالم نوجوانی میں انتقال ہو گیا تھا قلمبند کیا جو آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کتابی شکل میں دستیاب ہوئی تھی۔ سید علی موسیٰ رضا حسینی صاحب چوتھے او پانچویں نظام حیدر آباد کے دور میں فرخندہ بنیاد کے باشندے تھے ان کے آبا و اجداد میں میراں جی شمس العشاق (۸۸۷ھ تا ۹۸۱ھ) حضرت برہان الدین جانم (۹۰۱ تا ۱۰۰۷) حضرت امین الدین علی اعلا (۱۰۰۱ تا ۱۰۸۵) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

"ذکرِ شہادت" عشرہ ول کی مناسبت سے دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائی تین باب فضائل اہل بیت اور حضرت علیؓ فاطمہؓ اور امام حسین کی شہادت کے مکمل واقعات پر مشتمل ہے۔ چوتھے بات سے اصل موضوع شروع ہوتا ہے جو امام حسین کی ولادت سے لے کر ۶۱ھ تک کے واقعات پر مبنی ہے جن کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور بیانیہ انداز ایسا ہے کہ کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا ہے۔

یہ کتاب آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل لکھی گئی تھی اور اس کی قدامت ہی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ اس وقت اردو نثر کا کیا حال تھا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ یہ کتاب غالب کے خطوط سے تقریباً پندرہ سال قبل وجود میں آئی تھی مگر اس کے اسلوب اور بیان میں وہی رواتی اور سلاست ہے جو غالب کی نثر کی خصوصیت رہی ہے۔ جس طرح امین الدین علی اعلا کی "کلمۃ الاسرار" کو اردو نثر کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل ہے اسی طرح ملا وجہی کی "سب رس" میراں یعقوب کی "شمایل الاتقیا" یا شاہ ولی اللہ کی "معرفت السلوک" اردو نثر کی عہدواری اہم کڑیاں ہیں۔ اسی طرح "ذکرِ شہادت" کا شمار بھی ان اہم کڑیوں میں کیا جا سکتا ہے۔ اس دور کی نثر کے بارے میں ڈاکٹر حسینی شاہد نے اپنی تصنیف "شاہ امین الدین علی اعلا ــ حیات اور کارنامے" میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ "دکھن میں نثر نگاری کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ گیارھویں صدی ہجری کے ختم تک جن نثری کارناموں کا پتا چلا ہے انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ "کلمۃ الحقائق" کے بعد اردو نثر کی روایت کو حضرت امین ہی نے آگے بڑھایا...... حضرت امین بیجاپور میں

ردو کے دوسرے نثر نگار ہیں جنھوں نے اپنے والد کی قائم کی ہوئی روایت کو آگے بڑھانے کی
ر کوشش کی اور اردو نثر کو اس منزل پر پہنچایا جہاں اس کا انفرادی مزاج، اس کا مخصوص
نگ اور اس کا اپنا ایک لہجہ متعین ہو گیا۔" اس اقتباس کے بعد" ذکر شہادت" کو پڑھ کر اس
ت کا احساس نہیں ہوتا کہ ہم ایک قدیم نثر پارے کا مطالعہ کر رہے ہیں یہی ان بزرگان دین
کی خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے ایسی زبان کا سہارا لیتے تھے
و عوام کی سمجھ میں آسکے۔ یہاں میں اس بات کو تحریر کرنے میں جھجھک محسوس نہیں کرتا کہ
ذکر شہادت" اردو ادب کے نثری سرمایہ میں ایک بہت ہی اہم اضافہ ہے جو تاریخ ادب کے
الب علموں کے لیے رہنمائی کا کام دیتی ہے۔ اس کتاب کے مرتب سید علی محمد خسرو حسینی مبارکباد
کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کو ترتیب دے کر اور شائع کروا کر اردو ادب کی تاریخ
کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں نمایاں اور اہم حصہ ادا کیا ہے۔ اس کتاب کی طباعت اور گیٹ اپ کے
لیے مکتبہ جامعہ کا نام لینا ہی بہت کافی ہے۔

کوکن کے افسانے

ترتیب و انتخاب: انجم عباسی
قیمت: ۵۰ روپے
ناشر: کارگ یعنی کوکن اردو رائٹرس گلڈ (لینا)
مطبوعہ: فوڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دلی۔۲
مبصر: یوسف ناظم

یہ کتاب کوکن رائٹرس گلڈ کی بیسویں صدی کی بیسویں کتاب ہے۔ اس لحاظ سے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گلڈ اس صدی کے آخر تک اپنی پچیسویں کتاب ضرور شائع کرے گا۔
گلڈ اور ماڈرن پبلشنگ ہاؤس دلی میں خیر سگالی کا ایک معاہدہ یہ ہے کہ کتاب خوبصورت
چھپے گی۔ خوبصورت کا مطلب یہ نہیں کہ صرف لیلیٰ کی طرح خوبصورت جو صرف مجنوں کو خوبصورت
دکھائی دے بلکہ مونی لیزا کے تبسم کی طرح خوشنما جو ہر کسی کو خواہ وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو
پسند آئے۔ اجلا کاغذ جس پر ہاتھ پھیرو تو ایسا معلوم ہو کسی ایرانی بلی یا کشمیری قالین پر ہاتھ
پھیرا جا رہا ہے۔ پکی اور چمکدار روشنائی جو باعث بینائی ہو، عمدہ کتابت اور ایک خوش وضع سرورق
کے ساتھ مضبوط جلد۔ یہ تو ہوئیں کتاب کی ظاہری خوبیاں لیکن یہ خوبیاں تو گلڈ اور پریم گوپال
متل کی گزشتہ کتابوں میں بھی تھیں اس لیے یوں سمجھ لیجیے 'کارگ' دراصل کاریگر ادارہ ہے۔

جس کتاب کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ افسانوں کا انتخاب ہے اور انتخاب کا مطلب
یہ ہوتا ہے کہ مؤلف نے اپنے آپ کو سوئے مقتل روانہ کیا ہے۔ انتخاب میں جو چھوٹ جاتے
ہیں وہ مؤلف کو چھوڑتے نہیں۔ جو اس میں شامل ہوتے ہیں وہ بھی کچھ کم خفا نہیں
ہوتے۔ ان کی کتنی شکایتیں ہوتی ہیں۔ انجم عباسی نے جو کتابوں کی افزائش نسل کے
سلسلے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ انتخاب کے کام کے ان تمام خطروں کو بخوشی اور
برضا و رغبت مول لیا ہے۔ یہ کہہ کر کہ ع ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم۔

"کوکن کے افسانے" اور مظہر امام کی کشمیر کی غزلوں میں کوئی مماثلت نہیں کیونکہ مظہر امام کی کشمیر کی غزلیں، سرزمین کشمیر کی پیداوار ہیں۔ یہ غزلیں کشمیر کی جھیلوں کے ارد گرد بوئی اور اگائی گئیں جب کہ کوکن کے افسانوں میں وہاں کے آم کے باغوں کی ہوا اور مٹی شامل نہیں ہے۔ ان میں سے بیشتر افسانے بمبئی کی آلودہ فضا میں لکھے گئے ہیں بس کہانی کار کا تعلق، حسبی و نسبی، ذاتی و صفاتی سرزمین کوکن سے ہے۔ شیخ اسمٰعیل اور ساحر شیوی کی کہانیاں تو کینیا اور نیروبی کے صحرائی ماحول کی پیداوار ہیں۔ اس توجیہہ توضیح اور تشریح کے بعد اس تبصرہ نگار کا فرض یہ ہوتا ہے (حالانکہ ان دنوں فرض ہو نہیں بنا کرتا ہے) کہ وہ افسانوں کے بارے میں بھی کچھ کہے۔ تبصرہ نگار چونکہ خود کہانیاں نہیں لکھتا اس لیے اس کی رائے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی لیکن ایک قاری کی حیثیت سے میں یہ تو کہہ سکتا ہوں کہ انجم عباسی نے انتخاب کڑا نہ سہی، اچھا انتخاب کیا۔ نور پرکار کی کہانیوں سے کتاب شروع ہوتی ہے اور انجم عباسی کی کہانیوں پر ختم ہوتی ہے یعنی نور سے شروع ہوتی ہے اور نور ہی پر ختم ہوتی ہے۔ درمیان میں نور جہاں نور بھی ہیں۔ اس طرح یہ کتاب کافی منو ہے اس میں ۲ اگاسکر بھی شامل ہیں یعنی یونس اگاسکر اور خالد اگاسکر۔ لیکن دونوں کی کہانیاں الگ وضع کی ہیں۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر نے اپنی ڈگری اور ڈاکٹری کی وجہ سے کہانیاں لکھنا ترک کر دیا۔ مشغلہ بدلتا ہے تو کبھی بدلتا ہے۔ اب وہ تحقیق کے سالک ہیں۔ خالد اگاسکر نے افسانوں اور ترجموں ہی پر اپنی "شہرت" کی دو منزلہ عمارت تعمیر کی ہے۔ شعر بھی کہہ لیتے ہیں لیکن ان کی شناخت افسانہ ہے۔ رشیدہ قاضی کی دونوں کہانیاں ان کے دلگیر ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔ خاص طور پر "جگ جگ جیو" میں تو خود ان کی اپنی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ ساحر شیوی جو کہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اپنی کہانی "کیج برڈ" کی بنا پر کہانی کار بھی مانے جائیں گے۔ یہی صورت فقیر کلے اور شیخ اسمٰعیل کی کہانیوں کی ہے۔ فقیر کلے کی کہانی برسوں پہلے کتاب میں پڑھی تھی (کتاب وہ موقر اور معتبر ماہنامہ جو عابد سہیل چھاپا کرتے تھے) ذہن سے اتر گئی تھی۔ اس کتاب نے ان کی کہانیوں کا کایا کلپ کر دیا۔ (معلوم نہیں کایا کلپ ہومیوپیتھی میں ہوتا ہے یا نہیں)۔ شیخ اسمٰعیل کی کہانی "صلہ" پڑھ کر ذہن صدام حسین کی طرف چلا گیا کیونکہ یہ کہانی شروع ہی کویت کے ذکر سے ہوتی ہے۔ آدم نصرت بھی موجود ہیں۔ آدم نصرت پہلے ہی سے صاحب کتاب ہیں۔ دس افسانہ نگاروں کی بیس کہانیوں کا یہ مجموعہ ایک گلدستہ ہے (اور گلدستہ صرف پھولوں کا نہیں ہوا کرتا)۔ بہرحال یہ انجمن گل ہے۔ اس میں آپ کے کسی خاص نظریے کی کہانیاں نہیں ملیں گی۔ یہ روزمرہ زندگی کی چلتی پھرتی تصویریں ہیں۔ صرف چلتی پھرتی نہیں بولتی بھی ہیں۔ بشرطیکہ قاری اپنے کان کھلے رکھے۔ کارگ کی ۲۰ کتابوں میں سے ۵ کتابیں انجم عباسی کی محنت کے ذریعے وجود میں آئی ہیں یعنی ایک چوتھائی کی حد۔ ان کی لگن کی کیفیت یہی رہی تو اگلے ۱۰ برسوں میں وہ کارگ کے نصف بہتر تو ہو ہی جائیں۔

فی الحقیقت

مزاح نگار : یوسف ناظم
قیمت : ۴۵ روپے
ناشر : نئی آواز، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
مبصر : ڈاکٹر صغرا مہدی

"فی الفور" "فی الحال" اور اب "فی الحقیقت" یوسف ناظم کا ایک اور مجموعۂ مضامین۔ فی الفور تو ٹھیک ہے۔
ال؟ چلیے یہ بھی سہی۔ مگر "فی الحقیقت" ـ یہ گھپلا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ مزاح نگار نے
ت پسندی ـ بلکہ حقیقت نگاری کی طرف مراجعت کرلی۔ اور نہ یہ نیک شگن ہے نہ صحیح ہے کیونکہ فی الحقیقت
مطالعے کے بعد اس کا نہ صرف اندازہ ہوتا ہے بلکہ یقین ہو جاتا ہے کہ حقیقت سے ان مضامین کا دور کا واسطہ بھی نہیں
ں مجموعے میں شامل کیے گئے ہیں چند مضامین کے عنوانات ملاحظہ ہوں۔ "عنوان" (اس کی وضاحت ہونی چاہیے
ارکون سے عنوان) شاعروں میں ہوٹنگ کے فوائد (جو شخص ہوٹنگ میں بھی فوائد تلاش کرے اس کا
ت سے کوئی واسطہ ہو سکتا ہے؟) اسی طرح جادوگروں کی "حیثیت" فلیپ نگاری وغیرہ وغیرہ۔
حضرات اس کتاب پر اظہارِ خیال کی ضرورت ہمیں یوں پڑی کہ قارئین کتاب نما (اور کون اس کے اشتہار کو
گا) یہ نوٹ کرلیں کہ "فی الحقیقت" کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ حسبِ سابق یوسف ناظم نے اس میں بھی
ٹ بولا ہے۔ آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ اور یہ دروغ برگردنِ راوی بھی نہیں
انھوں نے غلط بیانی سے کام ان جملوں میں نہیں لیا ہے جو اپنے لیے ازراہِ انکساری کہے (وہ جملے جو اس امید پر
جاتے ہیں کہ لوگ اس کی پُر زور تردید کریں گے) افسوس کی بات تو یہ ہے کہ موصوف نے نہ صرف جھوٹ سے ہر
کام لیا ہے۔ بلکہ اس کو ...... بھی کیا ہے۔ مثلاً رشید حسن خاں کا خاکہ لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں "ان کی معلومات
ت ہیں اور ان میں مزید اضافے کے امکانات روشن ہیں لیکن ایک بات ایسی ہے جو انھیں معلوم نہیں ہے۔ لیکن مجھے
لوم ہے۔ وہ یہ کہ رشید حسن خاں سمجھتے ہیں کہ جھوٹ کی نفی صرف سچ ہو سکتی ہے۔ بس وہ یہی غلطی کرتے ہیں جبکہ
ں بھی جھوٹ کی نفی کرنا ہو تو اس سے بڑا جھوٹ بولنا چاہیے۔ اب وہ اس کی سند مانگیں گے ـ کوئی مخطوطہ۔
استغفیٰ میرا با حسرت و یاس"۔
اردو ادب کی ملکۂ معظمہ یعنی عصمت چغتائی کو ملکۂ معظمہ کہنے کا جواز بھی دیتے ہیں اور مدر ٹریسا نہ کہنے کی حسرت
اظہار بھی کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں بلکہ اسٹائل کے بارے میں کہتے ہیں "انھوں نے لکھنے کے لیے روشنائی استعمال
یں کی بلکہ اپنے قلم کو آگ میں بجھالیا اور لکھا۔ اسلحہ ساز خنجر بتاتے ہیں، تو انی بنانے میں کتنی محنت کرتے ہیں اور
صمت چغتائی نے گھر بیٹھے اپنے قلم کو اتنی آسانی سے انی کر دیا جیسے رومال کے کونے پر کشیدہ کاری فرمائی ہو"
ساتھ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یوسف ناظم جتنے ناکام نقاد ہیں اتنے ہی کامیاب مزاح نگار (اگر تنقید میں ناکام
ہوتے تو مزاح نگاری کیوں کرتے) اس میں انھوں نے اور کئی لوگوں کے خاکے کھینچے ہیں جیسے کنہیا لال کپور، ظفر تونسوی
عبد علی خاں۔ یہ سب خاکے کامیاب بھی ہیں اور موثر بھی۔ ان میں یوسف ناظم نے ادھورے فقروں، مکمل جملوں
جملہ ہائے معترضہ سے ان سب کی بڑی دلکش تصویریں بنائی ہیں۔ جو حقیقت سے کافی قریب ہیں۔ (شاید اسی

لیے ان کو اس کتاب کا نام " فی الحقیقت " رکھنے کا خیال آیا)

کہا جاتا ہے کہ اچھا مزاح نگار وہ ہے جو اپنے پر بھی ہنسے اور دوسروں پر اس طرح ہنسے کہ وہ بھی ہنس پڑ
چاہے بعد میں بُرا مان جائے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ آپ جس بات پر پہلے ہنسیں اور بعد میں بُرا مانیں تو اس سے آپ کی
بے وقوفی ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم اس پر ہنستے ہی رہتے ہیں۔ کہ یہاں تک خود کو بھی یہ یقین آجاتا ہے کہ یہ بات
ہنسنے کی ہے۔ بُرا ماننے کی نہیں ۔ لیکن اندر خانہ ہم اس حرکت سے اگر باز نہیں بھی آتے تو کرتے ہوئے جھجکتے تو
ہیں۔ اور یہی مزاح نگار کا مقصد ہوتا ہے۔ اور یہ گُر ہمارا یہ مزاح نگار جانتا ہے جسے یوسف ناظم کہتے ہیں۔ ؟
رشید احمد صدیقی کی طرح صورت سے مرثیہ گو معلوم ہوتا ہے۔ یہ موازنہ میں نے اس لیے کیا کہ یوسف ناظم کا کہنا
ہے کہ " ادب خاص طور سے اردو ادب میں غالباً میر امّن دہلوی کے زمانے سے یا شاید اس سے پہلے سے بھی یہ قاعدہ
چلا آرہا ہے کہ عوام النّاس کی سہولت کی خاطر کوئی نہ کوئی مثال ضرور دی جائے۔"

یہ بھی کہا گیا ہے کہ مزاح نگار کا کام معاشرے کی ابتری اور اس کے غلط رویّوں کی پردہ دری کرنا ہے
اس طرح کہ لوگ بظاہر تو نہیں مگر پھر اس کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ " یوسف ناظم کہتے ہیں " سچ بولنے کے نتائج
ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں آئی تو مگر اس وقت جب دنیا میں تہذیب کا چلن شروع ہوا۔
دنیا کی فلاح و بہبود کے لیے چونکہ افراد کا سچ بولنا کافی نہیں تھا۔ اب قومیں عالمی سطح پر سچ بولنے لگی
ہیں " نتیجہ یہ ہے کہ " سچ بولنے کی کئی صورتیں ہیں لیکن ان دنوں ان میں سے کوئی صورت نظر نہیں آتی
ان کے اس مضمون کا عنوان ہے " کوئی صورت نظر نہیں آتی "۔ ہند و پاک طنز و مزاح سمینار دہلی کا ذکر
کرتے ہوئے کہتے ہیں " اقلیتی کمیشن کے چیرمین مظفر حسین برنی بھی آچکے ہیں..... خوش و خرم دکھائی دیتے
ہیں (حالانکہ اقلیتی کمیشن کے چیرمین ہیں۔) برنی صاحب کو تو کسی دانش گاہ میں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ٹھیک
ہی ہوا شعر و ادب سے دلچسپی اور شغف رکھنے والے شرکاء میں سے کچھ شرکاء کو سرکار میں بھی ہونا چاہیے۔ رابطہ
قایم رہتا ہے۔ ہمہ وقتی ادیبوں سے لوگ ادب جاتے ہیں۔ سرکاری چہرے تبدیلی آب و ہوا کا موجب
ہوتے ہیں۔

اور موجودہ ادب کی صورت حال پر یہ تبصرہ " اگر کسی مصنف کو کسی بڑے ادیب سے فلیپ لکھوانا
مقصود ہو تو مصنف کو پہلے اس بڑے ادیب کا خاکہ لکھنا، کسی جلسے میں اسے پڑھ کر سنانا، اور بعد میں
اسے کسی رسالے میں چھپوانا چاہیے۔ تب کہیں وہ بڑا ادیب مصنف کے خون جگر پر اپنا پسینہ چھڑکنے کو تیار ہوتا
ہے۔"

یوسف ناظم یہ گُر جانتے تو ہیں مگر آزماتے نہیں، جبھی تو ان کی کسی کتاب پر کوئی فلیپ نہیں ہوتا اور
اسی لیے مزاح نگاری میں وہ کوئی مقام حاصل نہ کر سکے۔ اس لیے کہ اگر ہما شما کہیں بھی تو کون یقین کرتا ہے۔
قارئین! آج کل اردو کی مزاح نگاروں کی دو قسمیں دستیاب ہیں۔ ایک یوسف ناظم دوسرے مجتبیٰ حسین
آخر میں خاکسار کی درخواست ہے کہ قارئین " فی الحقیقت " کو پڑھیں ضرور۔ خرید کر، اگر یہ ممکن نہیں
تو کسی لائبریری سے اور یہ بھی ممکن نہ ہو تو چُرا کر۔ (آپ کہیں گے کہ چوری وہ بھی کتاب کی اور وہ بھی یوسف
ناظم کی فی الحقیقت کی!) ● ●

سے مندرجہ ذیل پتے پر خط وکتاب کریں
۱. پارک لین. تال کٹورہ پارک نئی دہلی ۱
ٹیلی فون نمبر ۳۴۴۴۲۲۷۳

شان الحق حقی کی پچاس سالہ ادبی خدمات کا اعتراف

کراچی (ڈاک سے) انجمن ترقی اردو پاکستان نے شان الحق حقی صاحب کی پچاس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا جس میں حقی صاحب کی ادبی خدمات پر ڈاکٹر اسلم فرخی جناب سحر انصاری، جناب مظفر علی سید، اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے مقالے پیش کیے اور جناب جمیل الدین عالی، ڈاکٹر عطیہ اویس اور جناب نورالحسن جعفری نے حقی صاحب کی ادبی خدمات پر اظہار خیال کیا۔ آخر میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے صدر. نورالحسن جعفری اور جناب جمیل الدین عالی نے سند توصیف پیش کی۔

شریف الحسن نقوی مستعفی

نئی دہلی ۱۱ اپریل۔ دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری مسٹر شریف الحسن نقوی نے اپنے عہدہ سے استعفا دے دیا اور ان کا استعفا منظور کر لیا گیا ہے نئے سکریٹری مسٹر اشتیاق عابدی نے چارج سنبھال لیا ہے۔
مسٹر شریف الحسن نقوی دہلی اردو اکیڈمی کے قیام ۱۹۸۰ سے لے کر اب تک سکریٹری کے عہدہ پر برقرار رہے اور اس دوران اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ملک کی دوسری اکیڈمیوں کے مقابلے ان کی خدمات کو سراہا گیا اکیڈمی کا بجٹ ۱۰ لاکھ روپیہ سے شروع ہوا تھا جو اب تقریباً ایک کروڑ روپیہ ہو گیا ہے۔ (قومی آواز۔ دہلی)

...بی اور تہذیبی خبریں

ادارہ "ہم سب" کی جانب سے ۵ کتابوں کی تقریب اجرا

بمبئی ۹ مارچ ۱۹۹۱ء ادارہ "ہم سب" کی
...انب سے اکبر پیر بھائی ہال میں اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ
...منعقد کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت ممتاز شاعر اور نقاد
...اقر مہدی صاحب نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت
...تر الایمان، ہارون رشید اور یوسف ناظم نے شرکت
...جوان لکھنے والوں کا تعارف مشہور افسانہ نگار
...بن رزاق نے کرایا۔ عرفان جعفری اور مقدر حمید
...' ناگ کے فن پر' انور ظہیر نے انور قمر کے فن پر'
...عباس نے عبدالاحد ساز کے شعری مجموعے پر سلیم
...کے افسانوی مجموعے پر ا' آتمارام نے' اور رفیعہ شبنم
...لا کے مضامین کے دوسرے مجموعے "حرف حرف آئینہ"
...انور خاں نے اپنے رزین خیالات کا اظہار کیا۔
...جلسہ باقر مہدی نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ
...نے اس جلسہ کے آرگنائزرس سے پہلے ہی کہہ دیا
...میں صرف ایک کتاب "نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی"
...سانہ نگار ساجد رشید) پر ہی اپنے خیالات کا اظہا
...ں گا کیونکہ میں ساجد رشید کی کہانیوں سے ذہنی
...تگی محسوس کرتا ہوں۔ سامعین نے اسے اپنی نوعیت
...م اور کامیاب جلسہ قرار دیا۔

...متاز شاعر شجاع خاور کا نیا پتا

اردو کے ممتاز شاعر شجاع خاور کے
...ست اور دشمنوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ اب شجاع خاور

اک دیا اور بجھا

احمد آباد۔ گجرات کے نامور محقق اور وسیع النظر ناقد پروفیسر احمد حسین قریشی کا ۴ فروری کو ۷۰ سال کی عمر میں احمد آباد میں انتقال ہو گیا۔ پروفیسر قریشی نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز احمد آباد کی مشہور گجرات کالج سے کیا تھا جہاں موصوف ۲۵ سال تک درس و تدریس میں مصروف رہے۔ فارسی زبان پر خاصا عبور حاصل تھا۔ ۱۹۸۹ء میں طویل تعلیمی خدمات کے پیش نظر راشٹرپتی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

کھنڈوہ میں جشن قاضی حسن رضا تحت
کل ہند مشاعرہ اور سمینار

کھنڈوہ کے مستند و معتبر شاعر قاضی حسن رضا کے شعری مجموعے "میثاق" کی اشاعت اور ان کی طویل علمی، ادبی خدمات کے اعتراف میں ۹ مارچ ۹۱ء کو کھنڈوہ میں ایک عظیم الشان اور یادگار کل ہند مشاعرہ اور ایک باوقار ادبی سمینار کا انعقاد بزم احباب کھنڈوہ کے زیر اہتمام عمل میں آیا۔ سمینار کی صدارت کھنڈوہ کے کہنہ مشق شاعر حضرت شوق ماہری نے فرمائی۔ جس میں صدر محترم کے علاوہ ڈاکٹر محبوب راہی، مخدوم جابر اور حبیب عالم نے اپنے مقالات کے ذریعہ قاضی حسن رضا کی شخصیت اور شاعری نیز ان کی علمی و ادبی خدمات پر مختلف انداز سے روشنی ڈالی۔ مہمانان خصوصی جناب غنی انصاری وزیر اوقاف اور اردو اکادمی، کستوری لال ورما وزیر تعلیمات اور مقامی ایم۔ ایل۔ اے علم چند یادو (تینوں بھارتیہ جنتا پارٹی کے) نے اپنی تقاریر میں قاضی حسن رضا کی خدمات کو سراہا اور انھیں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ سمینار کی نظامت ڈاکٹر محبوب راہی نے کی۔

پنجور میں انٹرنیشنل مشاعرہ

ہریانہ کے وزیر اعلا عزت مآب چودھری حکم سنگھ جی نے یہاں کے تاریخی مغل گارڈن میں ۱۸ مارچ کو منعقدہ انٹرنیشنل مشاعرے کا افتتاح کیا۔ وزیر اعلا نے کہا کہ ہمیں فخر ہے کہ یہ زبان ہماری ریاست میں پیدا ہوئی اور ہریانہ کے فرزندوں نے اس کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیے۔ ہندوستان میں پاکستانی سفارت خانے کے سفیر کبیر جناب عبدالستار نے صدارت فرمائی۔

اہم مہمانوں کی تقاریر کے علاوہ شام بہار ٹرسٹ انبالہ کے چیرمین جناب راجندر ملہوترا اور ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری ذاکر نے بھی اپنے اپنے اداروں کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔

کرشن چندر کی چودھویں برسی پر

لکھنؤ ۸ مارچ "کرشن چندر ایک صاحب طرز ادیب ہی نہیں تھے۔ بلکہ وہ اپنی ذات میں خود انجمن تھے۔ انھوں نے جب بھی ترقی پسند مصنفین کے منشور کے مطابق لکھنے کی کوشش کی وہ ناکام ہو گئے۔ ان کی کامیابی میں ان کے اپنے شعور، جمالیات اور فطری طنز و مزاح کا بڑا ہاتھ تھا۔" ان خیالات کا اظہار دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر قمر رئیس نے کل یہاں کرشن چندر کی چودھویں برسی کے موقع پر کیا جو اردو کے معروف افسانہ نگار مسٹر رام لعل کی قیام گاہ پر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی صدارت میں منعقد کی گئی۔

مسٹر رام لعل نے کرشن چندر کے نثر میں شاعرانہ طرز اظہار کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ کسی بڑے ادیب کے اسلوب کی تقلید کرنے کے بجائے ان کے طرز فکر نئے نئے تخلیقی گوشے دریافت کرنے چاہییں۔

جن ریسرچ اسکالروں نے کرشن چندر کے بارے میں مقالے پیش کیے۔ ان میں عذرا پروین، سیما شا

تھا زیدی اور سید محمد صادق شامل تھے۔ نظامت کے فرائض افشاں شاہین نے ادا کیے۔ شرکا میں ڈاکٹر شہاب رضوی، مونٹریال کے مسٹر آفاق حیدر، مسٹر ظہیر مئی مسٹر اچھن میاں، مسٹر ندیم لکھنوی کے علاوہ کئی دوسرے اہل قلم تھے۔

جشن منشاالرحمن منشا

ناگپور: اردو کے نامور شاعر و ادیب ڈاکٹر منشاالرحمن منشا، کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۰ فروری ۹۱ کو پاسداران ادب کے زیر اہتمام ایک جشن بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔ جس میں مشہور فنکار جناب دلیپ کمار بحیثیت مہمان خصوصی شریک تھے۔ ۹ کتابوں کا اجرا اس جشن کی توجہ کا باعث تھا۔ پروفیسر محمد اطہر حیات کی اولین تصنیف "احمد شوقی — ایک مطالعہ" کا اجرا بھی دلیپ کمار کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اجرا کے بعد دلیپ صاحب نے اپنے مخصوص و منفرد انداز میں حاضرین سے خطاب فرمایا۔

مہاراشٹر اردو اکیڈمی کے انعامات

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی نے ۹۱-۱۹۹۰ء کا مختلف اصناف ادب، صحافت، خطاطی، مجموعی خدمات اور درجہ اول میں کامیاب ہونے والے طالب علموں کے لیے جملہ ایک لاکھ اکہتر ہزار روپے کے انعامات تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

کل ہند انعام۔ رشید حسن خاں۔ دہلی۔ تیس ہزار روپے
کل ریاستی انعام۔ قاضی سلیم۔ اورنگ آباد۔ پچیس ہزار روپے
اردو کی مجموعی خدمات۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر۔ بمبئی۔ پندرہ ہزار روپے

سات ہزار روپے کے انعامات

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی (تحقیق) کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو
شبیر آصف (شاعری) مٹی کے حوالے
انور قمر (افسانہ) کلر بلائنڈ

پانچ ہزار روپے کے انعامات

ڈاکٹر منور رشید نعمانی (تحقیق) عرفان آگہی
تاج دار تاج (شاعری) زہر
ساجد رشید (افسانہ) نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی۔

چار ہزار روپے کے انعامات

عبدالباری مومن (تکنیکی) کمپیوٹر اور ہم
عبدالاحد ساز (شاعری) خوشی بول اٹھی ہے۔
رشید اعجاز (شاعری) سوچ بن
م۔ ناگ (افسانہ) ڈاکو لے کریں گے۔
محمد اجمل کلیم (صحافت) اورنگ آباد ٹائمز
شمس اعجاز (صحافت) اردو ٹائمز
امجد عثمان (صحافت) بلٹز
محمد علیم (خطاطی) اورنگ آباد ٹائمز
ظفر مہدی (خطاطی) اردو ٹائمز

تین ہزار روپے کا انعام

محمد یوسف انصاری (بچوں کا ادب) طلسمی گھوڑا

دو ہزار روپے کا انعام

رفیق احمد (بچوں کا ادب) گل دان

طالب علموں کے لیے انعامات

ایس۔ ایس۔ سی اور ایچ۔ ایس۔ سی کے اردو میں امتیازی نشانات (۸) انعامات فی کس پندرہ سو روپے، بی اے کے لیے (۹) انعامات فی کس دو ہزار روپے۔

ٹملناڈو اردو رابطہ کمیٹی

مدراس، مورخہ ۱۵ مارچ ٹملناڈو اردو رابطہ کمیٹی کا افتتاحی جلسہ منعقد ہوا جس میں تین کتابوں کا اجراء عمل میں آیا اور ایک غیر طرحی مشاعرہ منعقد کیا گیا جلسہ کی صدارت جناب ایم عبداللطیف صاحب سابق ایم۔ ایل۔ اے نے کی اور مہمان خصوصی جناب یم بشیر احمد صاحب، اڈوکیٹ، صدر کرناٹک مسلم اڈوکیٹس فورم اور جنرل سکریٹری کرناٹک اردو رابطہ کمیٹی تھے۔ اعزازی مہمان جناب مناظر عاشق ہرگانوی اور پروفیسر عبدالواسع بھی شریک تھے۔

اس کے بعد کتابوں کا اجراء ہوا۔ سب سے پہلے پروفیسر محبوب پاشا کا مرتب کردہ اور علیم صبا نویدی کا تصنیف کردہ نعتیہ مجموعہ "ن ٓ" کا اجراء عمل میں آیا شہر کے مشہور رئیس جناب مشتاق حسین پاربیا نے پہلی کاپی ریلیز کی اور سید کلیم اللہ صاحب نے اس کی پہلی کاپی حاصل کی۔ دوسرے نمبر پر راہی فدائی کی منظومات کا مجموعہ "ترقیم" جناب راز امتیاز ایگزیکٹو ایڈیٹر "سالار" بنگلور کے ہاتھوں ریلیز ہوا۔ اور پہلی کاپی جناب منڈی فاروق احمد صاحب نے حاصل کی۔ تیسرے نمبر پر "اپنائے باقیات الصالحات ویلور کی کتاب "نفیر" جناب مناظر عاشق ہرگانوی نے ریلیز کی اور اس کی پہلی کاپی قاضی صلاح الدین ایوب نے حاصل کی۔

مشاعرہ کی صدارت جناب ڈاکٹر عزیز تمنائی نے کی۔ شعراء اکرام میں، راز امتیاز، مناظر عاشق، سلیمان اطہر جاوید، اصغر ویلوری، راہی فدائی، مظفر شہیری، علیم صبا نویدی، مظہر اشفاق، برق کرنولوی اور باسط لوشاد اور کاظم نائطی شریک رہے۔ نظامت کے فرائض ملک العزیز نے انجام دیے۔

کینیڈا میں اردو زبان و ادب کا فروغ

۱۳ مارچ۔ دہلی کینیڈا سے آئے ہوئے ممتاز اردو شاعر اور ادیب جناب ولی عالم شاہین نے کینیڈا میں اردو زبان و ادب کی سمت و رفتار پر سیر حا اظہار خیال کیا۔ وہ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ جلسہ میں خطاب کر رہے تھے۔ جس میں جامعہ کے طلبہ، اسکالرس اور ادیبوں کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ شاہین صاحب نے بتایا کہ کینیڈا کے شہروں سے اردو کے کئی اخبار و رسائل نکلتے ہیں شعری مجموعوں کے علاوہ افسانوی مجموعے، تنقید تحقیق کی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں۔ انھوں نے منعقد ہونے والی کانفرنسوں اور مذاکروں کا ذکر کیا۔ جس میں فیض احمد فیض سے لیکر بشیر بدر ہندوستان اور پاکستان کی مختلف شخصیات شریک ہوتی رہی ہیں۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر محمد حنیف کیفی نے شاہین صاحب کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ کینیڈا میں جن لوگوں نے اردو کا چراغ روشن کر رکھا ہے۔ ان میں شاہین صاحب کو مرکزیت حاصل ہے۔ تحقیقی سفر کے ساتھ شاہین صاحب انگریزی میں بھی اپنے رسالے کے ذریعہ اردو کے فروغ و ا کے لیے ہمہ وقت منہمک رہتے ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے بطور مہمان خصوصی کے شرکت کی اور مغربی ممالک میں اردو کے فروغ و بقا کے مسائل پر بھی اظہار خیال کیا۔ انھوں نے شاہین صاحب کے انگریزی رسالے "اردو کینیڈا" کی اہمیت کا بطور خاص اعتراف کیا۔ جلسہ کی صدارت "آج کل اردو" کے ایڈیٹر محبوب الرحمان فاروقی نے کی۔

پنڈت آنند نرائن ملا اسپتال میں

اردو کے مشہور و ممتاز شاعر اور نثر نگار جناب آنند نرائن ملا ۱۴ مارچ ۱۹۹۱ء کی صبح کو پارلیمنٹ کی سیڑھیوں سے پیر پھسلنے کی وجہ سے گر پڑے ان کی بائیں کلائی کی ہڈی اور کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہیں۔ ملا صاحب کو رام منوہر لوہیا اسپتال کے نرسنگ ہوم میں داخل کر دیا گیا ہے۔

اپنے بچّے کو چھ قاتلوں سے بچایئے

پولیو۔ ڈپتھیریا (خناق) ٹیٹنس (کُزاز)۔ خسرہ۔ پرٹوسس۔ تپ دق
بچّوں کو متعدّی بیماری سے محفوظ رکھنے اور ٹیکے لگوانے کا موجودہ نقشہ

عمر	ٹیکہ
پیدائش سے 6 ہفتے تک	بی۔ سی۔ جی
6 ہفتے	ڈی۔ پی۔ ٹی۔ پولیو I
10 ہفتے	" " " II
14 ہفتے	" " " III
9 ماہ	خسرہ
16 ماہ تا 24 ماہ	ڈی۔ پی۔ ٹی۔ پولیو بوسٹر
5 سال	ڈی۔ ٹی
10 سال	ٹی۔ ٹی
16 سال	ٹی۔ ٹی

حاملہ کے لیے

ٹی۔ ٹی کے دو انجکشن، ایک ماہ کے وقفے سے

ٹیکہ لگانے کی فری سہولت (ہر بدھ کو ۹ بجے سے ایک بجے تک) تمام سرکاری اسپتالو
سرکاری شفاخانوں، فیملی ویلفیر سنٹر، دہلی انتظامیہ کے ہیلتھ سنٹر، میونسپل کارپوریشن
دہلی، میونسپل کارپوریشن نئی دہلی، سنٹرل گورنمنٹ ہیلتھ اسکیم، کرمچاری راجیہ بیمہ او
رضاکار تنظیموں کے دفاتر میں مہیا ہے۔

بیٹا یا بیٹی　　ایک یا دو

ہانی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

ان ۱۹۹۱ء جلد ۳۱ شمارہ ۶

پرچہ 5/=
سالانہ 45/=
ر ممالک سے
(بذریعہ بحری ڈاک) 110/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 230/=
اری تعلیمی اداروں کے لیے 65/=

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
TELEPHONE. 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی ارکیٹ۔ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید دیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰ سے شائع کیا

اس شمارے میں

آنجہانی

راجیو گاندھی

مصور: شکیل اعجاز

کیا اب بھی ہم یہ کہنے کے لائق ہیں

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ہمارا دیش بھارت، جو امن و شانتی کا گہوارہ رہا ہے جسے صوفیوں اور سادھوؤں کا دیش کہا جاتا تھا، انسانیت، رواداری، بھائی چارہ اور سیکولرزم کی قتل گاہ بنا ہوا ہے۔ عام آدمی تو گاجر مولی کی طرح کاٹے ہی جاتے رہے تھے۔ اب ہمارے ملک کے رہنماؤں تک کی زندگی محفوظ نہیں رہی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ ۲۱ رمئی کی شب میں ملک کے محبوب رہنما، سیکولرزم کے علم بردار سابق وزیر اعظم راجیو گاندھی کو بم سے اڑا دیا گیا۔ راجیو گاندھی کا قاتل کون ہے؟ اللہ جانے۔ لیکن اتنا تو ہم کو بھی معلوم ہے کہ وہ ملک، ہمارے ماضی کی شاندار روایات، اور ہمارے ملک کی ترقی کا دشمن ہے۔ ●●

ہلان مدیر
ن فرخی
ا، بلاک ۵ گلشن اقبال
۴۸ (پاکستان)

حریم لفظ

لکھتے لکھتے ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ہاتھ خود بخود رُک جاتا ہے۔ انگلیاں قلم کو تھامے رہتی
یکن قلم کاغذ پر حرف اُتارنے سے جیسے انکار کر دیتا ہے۔ ایک سوال ذہن کے کسی گوشے سے
اُبے اور رہ رہ کر کچوکے دیے جاتا ہے۔ آخر کیوں، یہ سب کس لیے؟ کیا فائدہ اس سب کا؟
ا جگر کاوی اور دماغ سوزی کا حاصل کیا؟ اس سے تو اُن لوگوں کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا جس
لیے میں یہ سب لکھ رہا ہوں۔ وہ تو اس کو پڑھیں گے بھی نہیں۔ خود احتسابی کا یہ لمحہ ہر لکھنے
پر آتا ہے، اسے اپنی پکڑ میں لے لیتا ہے، اور اپنے پیچھے ایک خلش سی چھوڑ جاتا ہے کہ فائدہ
ہنر میں خاک نہیں۔ اپنی بے وقعتی کا یہ احساس شاید کسی دور کے ادیب کو اتنی شدّت سے نہ ہوا ہوگا
ا طرح آج ہوتا ہے۔

میں اپنے چاروں طرف دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ لکھا ہوا لفظ بے توقیر ہو چکا ہے چھپا ہوا
بڑی تیزی کے ساتھ اپنی معنویت کھو دیتا ہے۔ آج کے دور میں ادب کی وقعت کیا رہ گئی ہے۔
تھوڑی یا اس سے بھی کم۔ ایک انبوہِ کثیر ہے جو اپنے حال میں مست ہے، جس کی زندگی میں
کوئی فعال کردار ادا نہیں کرتا نہ کسی اہم مقام کا حامل ہے۔ لوٹتی طبوئی ڈور کے دوسرے سرے
یب ہے کہ یقین کرنے والوں اور ماننے والوں سے بچھڑ کر، بقولِ شاعر، بے اُمّت رسول بنا ہوا
دونوں کے درمیان کا یہ فاصلہ مجھے سہماتا اور ڈراتا ہے۔ ایک طرف دیکھیے تو انبوہ کثیر ہے، خدا
اِلتی دوڑتی مخلوق، اور دوسری طرف ادب کے نام پر جراَتِ رندانہ اور شوقِ فضول میں مشغول
ر پھاڑے دیوانے کیا ان دونوں کے درمیان بے گانگی کے علاوہ کوئی معنی خیز رشتہ موجود ہے؟
ہی سڑکوں پر جو لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، جو مکانوں میں رہتے ہیں۔ دفتروں میں کام کرتے ہیں
ام آدمی کی زندگی بسر کرتے ہیں، میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ لوگ ادب کے بارے میں کیا رویّہ
ہوں گے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کے نزدیک کارِ ادب میں مبتلا لوگ محض بے ضرر مجنوں ہیں،
ا حرکات سے لطف تو لیا جا سکتا ہے، لیکن سنجیدگی سے غور کرنے کے قابل نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ
ادب کے عدم اور وجود کے بارے میں اتنے بے حس کیوں ہو گئے ہیں؟ معاشرہ جس نہج پر نمو پذیر

ہے اس میں ادب کے پاس ادا کرنے کے لیے کوئی معنی خیز ثقافتی کردار نہیں ہے۔ کیا آج ادب معاشرہ کے لیے اپنی اہمیت کھو چکا ہے؟ تمام سوالوں سے پہلے مجھے یہ سوال اہم ترین، بلکہ مرکزی نوعیت کا حامل معلوم ہوتا ہے، جس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کیے بغیر ہم ادب کی نوعیت، ماہیت اور عصر حاضر کے لیے افادیت اور معنویت کے بارے میں کوئی بات نہیں کر سکتے۔

اس عہد نے جو سوال بار بار کسی نہ کسی شکل میں اٹھایا ہے، وہ یہ ہے کہ کیا ادب ضروری ہے اور اگر یہ سوال براہ راست نہیں پوچھ لیا ہے، تو یہ شبہ کسی اور شکل میں ظاہر ہوا ہے، یا لاشعوری طور پر اثر انداز ہوا ہے۔ ادب کی افادیت کے بارے میں اس تشکیک کے پیچھے سائنس کے پیدا کردہ ذہنی انقلاب کی کارفرمائی ہے۔ اس نے لوگوں کو فوری ابلاغ کا عادی بنا دیا ہے۔ جب ٹیلی ویژن کا اسکرین روشن ہوتے ہی جنت نگاہ اور فردوس گوش کا سامان بہم ہو سکتا ہے تو غالب کے اشعار میں معنی تلاش کرنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے ایسا لگتا ہے کہ جدید ٹکنولوجی کے برق رفتار ابلاغ کے بعد لفظوں کی نفاست اور ذہانت سے تعمیر کیے ہوئے پیچاک، ماضی کے پُر تکلف تعیشات بنا کر رکھ دیا ہے۔ چارلز ڈکنز اور تھیکرے سے لے کر سرشار و شرر کے زمانے تک، ناظرین کا طبقہ ناولوں کا رسیا تھا۔ طول طویل قصّوں کی گتھیاں لوگوں کی دل چسپی کو الجھائے رکھتی تھیں، اور ان کو بڑے شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ کہانی سے دل چسپی کی اب یہ صورت ہے کہ اگر کتاب میں جان ہو گی تو اس کا ٹیلی ویژن ڈراما یا فلم بن ہی جائے گی، وہ دیکھ لیں گے۔ یہ ذریعۂ ابلاغ لوگوں کے ذوق کو اور فن سے روشناسی کے تجربے کو متعین کرتا ہے۔ بلکہ میڈیا کا اثر اتنا طاقت ور ہے کہ پیغام کے موثر ہونے کی بھی ضرورت نہیں، فقط اس میڈیم سے نشر ہو جانا کافی ہے۔ ہلینز سینڈارز نے اپنا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ٹیلی ویژن پر اس کا انٹرویو نشر ہونے کے بعد، اگلی صبح سڑک پر سے گزرنے والا ہر شخص اس کی تعریف کر رہا تھا، اسے مبارک باد دے رہا تھا۔ اس نے کئی لوگوں سے پوچھا کہ جو کچھ میں نے کہا اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اسے ہر بار یہی جواب ملا کہ صرف ٹیلی ویژن پر آنا ہی کافی ہے، ایسا کون دیکھتا ہے کہ آپ نے کیا کہا ہے، میڈیا کی عطا کردہ سستی اور فوری شہرت کی مثالوں کے لیے فرانس جانے کی ضرورت نہیں۔ ایسے بہت سے نمونے ہمیں اپنے آس پاس بکھرے ہوئے نظر آ جائیں گے۔

یہ میڈیا چونکہ بنیادی طور پر کمرشل ہوتے ہیں، اس لیے ان کے مطالبے اور ضروریات اس تکمیل پسندی کے بالکل الٹ ہیں جس کا تقاضا ادب کرتا ہے۔ اس فرق کا واضح اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی ہنر مند فنکار اپنی صلاحیتوں کو اس مندر میں بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ معلوم نہیں کبھی اس بات کا اندازہ لگایا گیا ہے کہ ریڈیو، ٹی وی اور فلم سے وابستہ ہو جانے کے بعد فنکار کی صلاحیتوں پر ان کا کس طرح منفی اثر مرتب ہوتا ہے۔ جدید ادب میں بہت سے ایسے شعلہ ہائے مستعجل فنکاروں کے نام آتے ہیں جو اپنی صلاحیتوں کو ادب میں پوری طرح بروئے کار لائے بغیر متاع ہنر کی ارزاں فروشی میں مصروف ہو گئے۔ معلوم نہیں ان میں سے کتنوں نے بعد میں اپنے آپ سے سوال کیا کیا یہ سب اس لائق تھا؟ جدید سماج نے فن اور ہنر کو بھی پرستش کی چیز بنا ڈالا ہے۔ وارث علوی نے لکھا ہے کہ بورژوازی سماج نے ہر تہذیبی سرگرمی کو بازاری اور عامیانہ بنا دیا، ادب اور

یہ سنجیدہ ذہنی مشغلے کے بجائے سستی تفریح کا ذریعہ ہے جس سے وہ ذہنی اشتعال، تفریح اور لطف اندوزی چاہتا ہے۔

دلچسپ صورتِ حال اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اشفاق احمد جیسے لوگ ماس میڈیا کی فوقیت ادب پر ثابت کرتے ہیں۔ طاہر مسعود سے انٹرویو کے دوران انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ ادب غیر موثر اور محدود ہو کر رہ گیا ہے اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے سامنے آنے والا مواد زیادہ دیرپا ہوگا۔ اگر یہ بات بار بار نہ دہرائی گئی ہوتی تو شاید سادہ بیانی کے زمرے میں آکر مزید کسی نوٹس کے قابل نہ ہوتی۔ اس قسم کے خیالات کی پشت پر مارشل میک لوہن کی اس فکر کا پرتو موجود ہے کہ شائع شدہ الفاظ کا وہ عہد جو چھاپے خانے کی ایجاد کے ساتھ شروع ہوا تھا، وہ ختم ہوگیا ہے اور اس کی جگہ برقیاتی ذرائع ابلاغ نے لے لی ہے۔ یوں تو اس اندازِ فکر کا جواب بارہا دیا جاچکا ہے لیکن اس کا مؤثر ترین اور مدلل جواب جو میری نظروں سے گزرا، وہ یہودی نژاد ناول نگار آئزک باشیوس سنگر کے پیرس ریویو والے انٹرویو میں ہے۔ سنگر نہ فلسفی ہے نہ نظریہ ساز۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو محض کہانیاں سنانے والا قرار دیتا ہے، اور صرف اسی لیے میری نظر میں مؤقر ہے۔ سنگر کا کہنا ہے کہ اچھے ادب کو ٹکنولوجی سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ٹکنولوجی کا رواج جتنا بڑھے گا، لوگوں کو اسی قدر جستجو ہوگی کہ انسانی ذہن مشینوں کی مدد کے بغیر کیا کام کر سکتا ہے۔ جب تک اچھے کہانی کار موجود ہیں، ادب کے پڑھنے والے بھی باقی رہیں گے۔ صحافیوں اور ٹیلی وژن کی فلمی رپورٹنگ کے باوجود اچھے افسانوی ادب کی گنجائش باقی رہے گی۔ کوئی مشین وہ اثر نہیں پیدا کر سکتی جو ٹالسٹائی، دستوفسکی اور گوگول کی تحریروں سے ہوتا ہے۔

سنگر نے شرط اچھے ادب کی رکھ دی ہے۔ عہدِ حاضر میں ادب کی افتاد کی دوسری علامت یہی ہے کہ اچھا ادب کیا ہوتا ہے۔ اس کی پرکھ کیوں کر ہو؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل تر ہوا جا رہا ہے۔ بظاہر تو سوال بھی سیدھا سادا ہے اور جواب بھی غیر پیچیدہ ہونا چاہیے، کہ یہ کام ادبی تنقید کا ہے۔ تنقید ان اصولوں کو وضع کرتی ہے جن کی روشنی میں ادب پاروں کی جانچ، پرکھ اور قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم جدید اردو ادب کے سیاق و سباق میں بات کریں تو مسئلہ اتنا سیدھا سادا بھی نہیں ہے۔ سائنس اور ٹکنولوجی ادب اور ادیب کو کیا بے اعتبار کریں گی جو کام خود ہماری تنقید نے کیا ہے۔ سائنس سے زیادہ بڑا خطرہ وہ غیر ادب ہے جسے ادب کے نام پر تنقید بازار میں چلانا چاہ رہی ہے۔

محمد حسن عسکری نے ایک جگہ خاصی برافروختگی کے ساتھ لکھا تھا: جب تک اردو تنقید زندہ ہے خدا نے چاہا تو ہمارے ذہن میں کوئی ادبی مسئلہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اردو تنقید روزِ اول سے لعن طعن کا شکار بنتی رہی ہے۔ کسی صنف کو اس قدر مطعون نہیں کیا گیا، اور تمام تر ملامت کے باوجود اس کی زوال آمادگی روز افزوں ترقی پر ہے۔ تنقید کے نام پر دفتر کے دفتر سیاہ ہوتے ہیں، لیکن کبھی ٹھہر کر اس بے ادب صنف نے اپنا بے لاگ تجزیہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ملے گا۔ یہ شکایت تو آلِ احمد سرور جیسے سرنجاں سرنج نقاد نے بھی کی ہے۔ اگرچہ وہ سمجھتے ہیں کہ ادبی تنقید نے

پچھلے تیس سال میں بڑی ترقی کی ہے اور آج اس کا سرمایہ خاصا اہم ہے، پھر بھی وہ دبی زبان سے اعتراف کرہی لیتے ہیں کہ اب بھی اس میں طرف داری زیادہ ہے سخن فہمی کم۔ میں فی الوقت اس سوال کو نہیں چھیڑنا چاہتا کہ تنقید کا منصب کیا ہے، وہ اس کو کس طرح پورا کرسکتی ہے اور موجود حالات میں اس کے فرائض اور ذمے داریاں کیا بنتے ہیں، یا وہ ان سے عہدہ برآ کیوں کر ہو۔ میں فی الحال اس غیر تنقیدی رویے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہماری ادبی تنقید میں رواج پاگیا ہے۔ یہ تنقید کی مسخ شدہ شکل ہے جو ادب کی تفہیم اور پڑھنے والوں میں اس کے اثر و نفوذ کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ بنتی جارہی ہے۔

ایک مغربی نقاد کو شکایت تھی کہ فی زمانہ لوگوں نے ادبی سرگرمی کا نعم البدل یہ ڈھونڈلیا ہے کہ وہ ادب کے بارے میں باتیں کرلیتے ہیں۔ اردو تنقید کی یہ شکل ایسے لوگوں کے لیے ادب کے نام پر وقت گزاری کا سہل اور سستا نسخہ بن گئی ہے۔ اس کا بڑھتا ہوا رواج ہمارے پورے ادبی و ذہنی کلچر کی فضا کو مسموم کر رہا ہے۔

اوپر عامیانہ کلچر کی ان اشکال کا ذکر ہوا جو صحیح معنوں میں تخلیقی مظاہر سے ان کے حصے کی قوت و توانائی چھین لیتی ہیں۔ ہمارے ہاں تنقید کے نام پر جو کچھ لکھا جارہا ہے، اس کا معتد بہ حصہ اسی زمرے میں آتا ہے۔ طفیلی کیڑوں کی طرح پلنے والی یہ تحریریں، تنقیدی تناظر کو پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ ان کا تعلق اس COUNTER CULTURE سے ہے جو تنقید کو صرف سفارشی چٹھی یا اشتہار کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہ COUNTER CULTURE نامی گرامی اداروں، اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی وغیرہ میں زور پکڑ چکا ہے اور ادب و فن کو عام آدمی کے برتنے کی چیز کی سطح پر لاکر فروخت کرنا چاہتا ہے۔ اس کو ادب کی اسی امیج سے دل چسپی ہے جو اس کے مقصد کو پورا کرسکتی ہو۔ اس امیج کو بنانے کے لیے تنقید سے بہتر اوزار بھلا اور کیا ہوسکتا ہے؟

تنقید کے نام پر دھاندلی، تعصب اور اشتہار بازی کی مثالیں معاصر ادب سے تلاش کرنا کچھ مشکل کام نہیں کہ تنقید کے منفی کردار کی گواہی دیں۔ لیکن میں یہ کام خود نہیں کروں گا۔ کیونکہ یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ تنقید کو مطعون کرنے والے وہ لوگ ہیں جو خود اس بات کے متمنی ہیں کہ نقاد حضرات ان کی تعریف میں مضمون لکھ دیں۔ دیکھیے اس بات کا برملا اعتراف خود ایک نقاد نے کیا ہے۔ جمیل جالبی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :

"ہمارے معاصر ادب میں جو ایک بحرانی کیفیت ہے، تخلیق جس بے سمتی اور بے جہتی کا شکار ہے، اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہماری تنقید اپنے دور کے ادب کو جہت اور بنیاد فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے۔"

تنقید جہت اور بنیاد فراہم کس طرح کرے؟ اس کو تو توصیفی اسناد بانٹنے سے ہی فرصت نہیں۔ اس نے جو انداز اپنایا ہوا ہے وہ محض سرپرستانہ اور مربیانہ ہے۔ اسے مسائل کی جڑ تک پہنچنے اور تجزیہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ کیونکہ ایسا کرنے سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا۔ اعلا درجے کے شاہکار قرار دیے جانے والی بوگس کتابوں پر سے جھوٹ کا ملمع اتر جائے گا۔

اور نہ وہ نقاد پسند کریں گے جو 'بادشاہ گر' بنے بیٹھے ہیں، نہ وہ ادیب جو درباری بھاٹ ساتھ لے کر چلنے کے قائل ہیں

جب دو طرفہ مفادات کی بات ہو تو تبدیلی کا خواہاں کوئی کیوں ہوگا؟ اسی لیے تنقید کے نام پہ چاروں طرف کوّا لوجن مچی ہوئی ہے۔ جو رسالہ چاہے اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ محض ایک گروہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر ایک صاحب پریم چند سے بہتر افسانہ نگار ہیں اور فلاں صاحب مسلّمہ طور پر دورِ حاضر کے سب سے بڑے نظم گو۔ ایک نقاد صاحب اعلان کر رہے ہیں کہ ان کے دوست کے افسانوں کے مقابلے میں منٹو محض کہانی کا بچپن ہیں۔ دوسرے نقّاد صاحب کا اپنے کمزور ناولوں کے بارے میں پختہ یقین ہے کہ جو میرے وہ راجا کے نہیں۔ ایک اور نقاد صاحب کا خیال ہے کہ ان کا فلاں بغل بچہ.... لیکن کہاں تک مثالیں دوں۔ بس اتنا ہی سمجھ لیجیے کہ سارے مسائل کی تان اس پر آکر ٹوٹتی ہے کہ ظفر اقبال کے بقول منٹو بڑا ہے یا شیخ بسّا۔ معاصر اردو تنقید یہ جواب دے چکی ہے کہ ظاہر ہے شیخ بسّا۔

تقریبات میں پڑھے جانے والے سرسری مضامین، اخباروں کے ادبی اڈیشن، گروہ بندیوں کے مفادات اور ان کی نگرانی کے لیے نکالے جانے والے پرچے، ان میں چھپنے والی گیدڑ بھبکیاں، ادھر سے اسی زبان میں جواب، اور اسی قسم کی حرکتیں یہ سب ہمارے ادب کا فاسد خون ہے، وہ سرطان ہے جس کی جرّاحی لازم ہے۔ افسوس کہ جرّاحی اور نشتر زنی کا کام تنقید کی جو صنف کر سکتی تھی، وہ ان مقدس ہاتھوں میں آلہ کار بنی ہوئی ہے

وہ قاری جس کے ذوق کی تربیت کا کام نقادوں کو کرنا چاہیے تھا، وہ نقادوں کی طرف سے روزانہ اعلا درجے کے شاہکاروں کے مژدے سن سن کر بھاگ چکا ہے۔ دورِ جدید نے اسے تفریح کے دوسرے ذرائع بہم پہنچا دیے ہیں۔ اب اسے ادب سے سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ یہاں من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو کا تنقیدی کھیل کھیلے، وہ سستی تفریح کی ذہنی افیون کہیں اور سے حاصل کر لے گا۔

مجھے شکایت ہے کہ یہ نام نہاد نقّاد حریم لفظ میں جوتوں سمیت گھس آئے ہیں میں تو اس حریم لفظ میں خیال کی جوت جلتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ محض دلوانے کا خواب یا اجتماعی آورش افسوس تو یہ کہ اتنی بہت ساری اردو تنقید پڑھ لینے کے بعد بھی مجھے نہیں معلوم۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی اہم کتابیں

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور

اس مجموعے میں پروفیسر آل احمد سرور کے جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق زیادہ تر شاعروں اور شاعری کی خصوصیات سے ہے میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، حسرتؔ، فانیؔ، جوشؔ اور فراقؔ کی شخصیات اور شاعری پر بھرپور مضامین کا اہم مجموعہ۔ قیمت: ۵۱/-

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم
ڈاکٹر سلامت اللہ

اس کتاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے جن مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے وہ مصنف کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے کہ اس کے تاریخی اور حالیہ شواہد موجود ہیں۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کی اہم ترین تصنیف۔

قیمت: ۵۱/-

اقبال کا نظریۂ خودی — عبدالمغنی

اس کتاب میں نظریۂ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کر کے اقبال کے پورے نظامِ فکر کی تلاش کی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی شاعری کی حقیقی جہت واضح ہو اور دوسری طرف آج کی انسانیت کو اپنے ارتقا کی صحیح سمت دریافت کرنے میں سہولت ہو۔ قیمت: ۱۵۰/-

پت جھڑ کی آواز — قرۃ العین حیدر

برصغیر کی ممتاز ترین افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کی اہم کہانیوں کا مجموعہ۔ یہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور زندگی کی صحیح عکاسی بھی کرتی ہیں۔ نیا اڈیشن قیمت: ۷۵/-

جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث[illegible]

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی[illegible] کا تازہ ترین مجموعہ جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک[illegible] اہم دستاویز۔ قیمت: ۴۶/-

لکھنؤ تہذیب کا نمائندہ شاعر

قلندر بخش جرأت (خطبہ) — جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا[illegible] نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸ نومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سمینار میں پیش [illegible]

قیمت: ۱۰/-

غبارِ منزل (شعری مجموعہ) — غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں [illegible] غزلوں، نظموں اور قطعات کا تازہ مجموعہ جس میں [illegible] "ذوقِ سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شا[مل] ہے۔ قیمت: ۷۵/-

تاریخ اودھ — قاسم علی نیشاپوری

"تاریخ اودھ" معروف بہ "تاریخ شاہیۂ نیشاپوریہ" کی اہم تاریخ ہے۔ قاسم علی نیشاپوری نے اسے فارسی [میں] لکھا تھا ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے نہایت محنت سے [اس] کو اردو کا جامہ پہنایا۔ قیمت: [illegible]

فی الحقیقت — یوسف ناظم

طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں یوسف ناظم کو [اہم] مقام حاصل ہے۔ ان کی تحریریں نہایت ذو[ق] شوق اور توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔ "فی الحقیقت" [ان] کے تازہ ترین طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ قیمت: [illegible]

نورالحسن نقوی
شعبۂ اردو
مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ

پروفیسر علی محمد خسرو

دھوپ ڈھل چلی تھی۔ زیدی لاج کے خوب صورت لان پر بیش بہا پنیس کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کسی میٹنگ کا اہتمام تھا۔ دس پندرہ لوگ آ بھی چکے تھے۔ جو چھوٹے چھوٹے حلقوں بنائے ہوئے محو گفتگو تھے۔ نشست کے میزبان کرنل بشیر حسین زیدی ایسے ہی ایک حلقے میں مسلم یونی ورسٹی کے مسائل پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ وہ بہت خوش تھے کہ پروفیسر علی محمد خسرو دو ایک روز میں وائس چانسلر کا منصب سنبھال لیں گے اور ان کے جو خواب ادھورے رہ گئے تھے وہ اب پورے ہو جائیں گے۔ یونی ورسٹی پریس کے لیے جو جدید مشینیں ان کے زمانے میں خریدی گئی تھیں وہ کام کرنے لگیں گی۔ انجینیرنگ کالج میں توسیع ہوگی اور یونی ورسٹی کے نزدیک ایک صنعتی شہر وجود میں آجائے گا۔

اتنے میں ایک صاحب نے لان پر قدم رکھا اور یکبارگی سب کی نظریں اُدھر اٹھ گئیں۔ کشیدہ قامت، دوہرا بدن، کھلتا ہوا گندمی رنگ، بڑی بڑی، بے حد پر کشش، مسکراتی ہوئی آنکھیں، چال میں متانت، اور خود اعتمادی۔ کیسی سحر آفریں شخصیت ہے! کون ہو سکتے ہیں یہ کہ ان کے آتے ہی محفل میں جان سی پڑ گئی۔ سب کرسیوں کا رخ ان کی طرف کو پھر گیا۔ آنکھوں کا سوال پروفیسر مسعود حسین خاں نے پڑھ لیا۔ "ارے تم انھیں نہیں جانتے! یہ پروفیسر علی محمد خسرو ہیں، تمھارے نئے وائس چانسلر"

تعارف کے بعد خسرو صاحب اپنا پروگرام بتانے لگے۔ مُنہ سے پھول جھڑنے کا محاورہ بارہا سنا تھا، یہ نہ سنا تھا کہ محاورے کبھی سچ بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ بات کرتے تو لگتا تھا سچے موتیوں کی بارش ہو رہی ہے۔

اب مہمانِ خصوصی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ ان کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ حاضرین کی نظریں بار بار سڑک کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ اتر پردیش کے گورنر اکبر علی خاں صاحب تشریف لانے والے تھے۔ زیدی لاج میں اکابرین کے جمع ہونے کا مقصد تھا لکھنؤ کے سنّی شیعہ قضیے کا تصفیہ۔ ذرا دیر میں ان کی کار کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی۔ کرنل صاحب اور بعض عمائدین پذیرائی کو بڑھے۔ کرنل صاحب کا اشارہ پاکر ہم لوگ نزدیک پہنچ گئے۔ انھوں نے تعارف کرایا "یہ ہیں ڈاکٹر عالم حسین نقوی اور یہ نورالحسن علی گڑھ سے آئے ہیں۔ آپ کے ہاتھ سے ذاکر حسین اسکول کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھوانے کے خواہشمند ہیں۔ سنّی شیعہ جھگڑا تو آسانی سے نمٹنے والا نہیں۔ پہلے آپ ان کی درخواست پر غور فرمالیجیے۔"

انھوں نے توجہ سے درخواست سنی اور منظور فرمالی لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کریں محمڈن کالج کا

طالب علم رہا ہوں۔ کیا یہ عجیب بات نہ ہوگی کہ میں علی گڑھ جاؤں اور مسلم یونیورسٹی میں حاضری نہ دوں اس لیے خسرو صاحب کو زحمت دی گئی۔ وہ نزدیک آئے تو زیدی صاحب نے تجویز پیش کی کہ خسرو صاحب گورنر صاحب کو مسلم یونیورسٹی کی طرف سے مدعو کریں۔ لمحے بھر تامل کے بعد خسرو صاحب نے فرمایا" یہ ابھی قبل از وقت ہوگا میں کچھ قربانیاں دے کر اور کچھ ارمان لے کر علی گڑھ جا رہا ہوں۔ میرے ذہن میں کچھ انقلاب آفریں منصوبے ہیں، خدا جانے وہ پسند کیے جائیں گے یا ناپسند۔ بڑی بڑی تبدیلیوں کو لوگ آسانی سے گوارا نہیں کرتے ممکن ہے وہاں میری اور میرے خوابوں کی پذیرائی نہ ہو۔ ہو سکتا ہے وہاں میرا سامان کھل بھی نہ سکے اور میں دن کے دن لوٹ آنے پر مجبور ہو جاؤں۔ اور اس عالم میں کہ میرے سر سے خون بہہ رہا ہو۔ میں اپنے خوابوں کا سودا کسی بھی قیمت پر کرنے کو تیار نہیں۔ پہلے جا کر مجھے حالات کا جائزہ لینے دیجیے۔ پھر پہلی فرصت میں آپ کو دعوت دینے لکھنؤ حاضر ہوں گا اور ان شاء اللہ یونیورسٹی میں آپ کے شایانِ شان آپ کا خیر مقدم کروں گا۔"

سامعین مسحور ہو گئے۔ الفاظ حریر و پرنیاں، عزائم صورتِ فولاد!

دو رات عجب سرخوشی کے عالم میں گزری۔ کھلی آنکھوں سے بھی اور بند آنکھوں سے بھی صرف ایک ہی سپنا دیکھا، بڑا سہانا سپنا۔ کہ دنیا کے نقشے پر بس ایک شہر جگمگا رہا ہے۔ اپنا علی گڑھ!

چند روز بعد خسرو صاحب کا علی گڑھ میں ایسا پُرجوش استقبال ہوا کہ برسوں اس کی یاد ذہنوں میں تازہ رہی۔ یونین ہال میں مہمان پر پھولوں کی لگاتار بارش کا سماں جس نے نہیں دیکھا اس نے دنیا کے حسین ترین منظروں میں سے ایک منظر کم دیکھا۔ ہال کی چھت میں ایک شگاف بنایا گیا ہے۔ چھت پر گلاب اور گیندے کی سرخ، سفید، زرد منوں پنکھڑیاں ڈھیر کر لی جاتی ہیں۔ شگاف سے یہ پتیاں تسلسل کے ساتھ مہمان پر برسائی جاتی ہیں۔ تار سا بندھ جاتا ہے۔ پھولوں کی بارش نظر آتی ہے۔ پھول برسانے والا ہاتھ دکھائی نہیں دیتا۔ محسوس ہوتا ہے آسمان سے نور برس رہا ہے۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ اس منظر کو اور بھی خوابناک بنا دیتی ہے۔ جس پر یہاں ایک بار پھول نچھاور ہو گئے وہ زندگی بھر علی گڑھ پر نچھاور ہونے کے لیے کمربستہ رہا۔

تو صاحب، خسرو صاحب کا اس شان کا استقبال ہوا۔ پروفیسر ہربنس لال شرما قائم مقام وائس چانسلر تھے۔ شرما جی سادھو سنتوں کے قدردان تھے۔ خود کو بھی صوفی بتاتے تھے۔ انھوں نے خیر مقدمی تقریر میں فرمایا" جنابِ والا! آپ کا اسمِ گرامی علی محمد خسرو یعنی اے۔ ایم۔ خسرو ہے۔ آپ درویشانہ صفات اور صوفیانہ اوصاف کا مجموعہ ہیں۔ اس لیے جی چاہتا ہے اے ایم پر آئی آر کا اضافہ کرکے آپ کو امیر خسرو کہوں۔ یوں بھی اب آپ ہمارے امیرِ کارواں ہیں۔"

خسرو صاحب جواب دینے کو اٹھے۔ پھولوں کی بارش تیز ہو گئی اور تیز! اور تیز! پھولوں کی بارش اور تالیوں کا شور تھما تو خسرو صاحب نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ اب لفظوں کے پھول برسنے لگے۔ اصلی پھولوں کی بارش مات کھا گئی۔ انھوں نے فرمایا" پروفیسر شرما! آپ نے مجھے امیر خسرو کہا۔ میں امیر خسرو نہیں، غریب خسرو ہوں۔ اور غریب کا لفظ میں خاص طور پر غریب الوطن کے معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ اس موقع پر مجھے خسرو کا ایک شعر یاد آ رہا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ خسرو گدا ہے، غریب الوطن ہے

تمہارے شہر میں آپڑا ہے۔ اب جو چاہو اس کے ساتھ سلوک کرو۔ وہ شعر ہے۔

خسروؔ غریب است و گدا افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

امیر غریب کی اس بحث نے مجھے امیر مینائی کا ایک شعر یاد دلایا کہتے ہیں

امیرؔ جمع ہیں احباب حالِ دل کہہ لو
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

اس وقت یہ شعر میرے حسب حال ہے۔ آج مجھ پر آپ کی کیسی بے پایاں عنایتیں ہیں۔ کل خدا جانے نگہ التفات ادھر ہو کہ نہ ہو۔ سنا ہے مجتبیٰ گرمجوشی سے آپ خوش آمدید کہتے ہیں اتنی ہی سرد مہری سے خدا حافظ بھی کہہ دیتے ہیں۔

اور ایک دن ایسا بھی آیا جب ایک طالب علم نے اپنی تقریر میں کہا "کوئی کہتا ہے آپ امیر خسرو ہیں، آپ کہتے ہیں میں غریب خسرو ہوں، میں کہتا ہوں آپ نہ امیر خسرو ہیں، نہ غریب خسرو، آپ تو عجیب خسرو ہیں۔"

علیم صاحب کے دور میں یونی ورسٹی کے ضبط و نظم کو دیمک لگنے لگی تھی۔ ان کے نرم رویے نے طلبہ کو خودسری کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ اور ماحول تعلیم کے لیے سازگار نہیں رہا تھا۔ خسرو صاحب کے انتخاب کا ہر طبقے میں خیر مقدم کیا گیا۔ ان کی جادو بھری شخصیت اور سحر بیانی نے پہلے ہی دن سب کے دلوں کو تسخیر کر لیا۔ ہر ایک کو یقین ہو گیا کہ ان کی سربراہی میں یونی ورسٹی کا وقار بہت جلد بحال ہو جائے گا۔ لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ان کی فراست پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلوں کو پل بھر میں سلجھا سکتی ہے۔ ان کی ذہانت کے بے شمار قصے لوگوں کو آج تک یاد ہیں۔ کوئی انھیں جمع کرے تو پوری کتاب تیار ہو جائے۔ ایک دلچسپ واقعہ اس وقت یاد آتا ہے۔

ایک بار پر کسی دوکاندار کا قرض بہت بڑھ گیا۔ اس نے پرووسٹ کو قانونی کارروائی کی دھمکی دی۔ پرووسٹ صاحب کو شاید پہلی بار ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ بہت گھبرائے۔ وائس چانسلر صاحب سے ملاقات کی۔ انھوں نے کہا آپ پریشان نہ ہوں۔ کسی بہانے لالہ جی کو حساب کتاب سمیت میرے پاس لے آئیں۔ پرووسٹ صاحب ایک دن لالہ جی کو لانے میں کامیاب ہو گئے۔ وائس چانسلر صاحب میٹنگ میں مصروف تھے۔ اطلاع کرائی گئی۔ فوراً باہر تشریف لے آئے۔ پرووسٹ صاحب سے مصافحہ کیا۔ پھر لالہ جی کو غور سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ آخر ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ لالہ شیام بہاری لال تو نہیں"

"جی سرکار، شیام بہاری لال ہی ہوں"

"لالہ بھگوان داس جی کے بیٹے؟ جنھوں نے اب سے کوئی پچاس برس پہلے علی گڑھ میں پہلی بار
کا اتنا بڑا کاروبار شروع کیا تھا"

"جی جی ٹھیک فرمایا مگر یہ سب آپ کو کیسے معلوم؟"

"بھائی، آپ کو کچھ تو آپ کی شاندار شخصیت سے پہچانا، کچھ اپنی سمجھ بوجھ سے"

لالہ جی خوش ہو گئے۔ انھوں نے جیب سے پڑیا نکالی کے وائس چانسلر صاحب کو الائچی پیش
جو کہنے کو چھوٹی الائچی تھی مگر اس کا سائز کوڑی کے برابر تھا۔ وائس چانسلر صاحب نے یہ نایاب تحفہ
حیرت اور مسرت کے ساتھ قبول کیا اور کہا۔

"کچھ ہی دنوں میں ہم زنجبار جانے والے ہیں۔ وہاں کی لونگیں اتنی بڑی بڑی ہوتی ہیں جیسے
کی تیلیاں۔ وہ ہم آپ کے لیے ضرور لائیں گے۔ اور ہاں اب سنیے ہم آپ کے بیوپار کو کس طرح جا
ہیں۔ دراصل ہمارا میدان ہے اکونومکس۔ مطلب ارتھ شاستر۔ علی گڑھ میں غلّے کے ویاپار پر
پلنگ لکھ رہے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں بہت کچھ جانکاری حاصل کرنی پڑی۔ اسی وقت یہ سب کچھ
ہوا۔ مگر آپ یہ تو بتائیے کہ آپ حساب کس طرح رکھتے ہیں۔ اور ضرورت پڑنے پر یہ کس طرح ثا
کر سکتے ہیں کہ اتنی رقم کا مال سپلائی کیا؟"

لالہ جی نے خوش ہو کر سارا حساب کتاب سامنے پھیلا دیا۔ وائس چانسلر صاحب لالہ جی کی
اور حساب رکھنے کے ڈھنگ کو سراہتے رہے۔ پھر فرمایا ہم اسے اپنی کتاب کے لیے ذرا توجہ سے دیکھ
ہیں۔ کتاب میں دو ایک فوٹو بھی دے دیں گے۔ آپ دو ایک دن کے لیے یہ سب ہمارے پاس چھو

میٹنگ کے بعد وائس چانسلر صاحب نے پرووسٹ کو فون کیا کہ اب آپ بے فکر ہو جائیے۔
لالہ جی یہ روپیہ نہیں یہ کاغذات مانگیں گے۔ اور ہوا بھی یہی۔ آخر دس پندرہ دن میں روپے کا بند
ہو گیا اور ان کا حساب چکا دیا گیا۔

یہ خسرو صاحب کے حسنِ تدبیر کا معمولی سا نمونہ تھا۔ وہ بڑے سے بڑے مسائل بھی اسی طر
کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ مگر علی گڑھ کے ماحول نے ان صلاحیتوں کو روبہ کار آنے کا موقع ہی نہ
سستی سیاست اور باہمی رقابت نے فضا کو ایسا مکدر کر دیا تھا کہ اس میں کوئی تعمیری کام آسان
خسرو صاحب نے علی گڑھ پہنچ کر حالات کا جائزہ لیا۔ لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔ تقریباً ہر شعبے، ہر دفتر
میں جا کر وہاں کے معاملات کو سمجھا۔ غور کیا اور جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ سانپ کی بانبی میں
ڈالنے سے خود کو گزند پہنچنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔ انھوں نے اپنی پالیسی بدل دی۔ اگر وہ ایسا
تو ان کے عہد کی تاریخ کسی اور ہی انداز سے لکھی جاتی۔

خسرو صاحب نے اصلاح و ترقی کا خیال چھوڑ دیا۔ اور وقت گذاری کا راستہ اختیار کر لیا۔
گروہ اپنی ذاتی منفعت کا کوئی منصوبہ لے کر آتا وہ اس کی تائید کر دیتے دوسرا گروہ اس کے خلاف
پیش کرتا تو انھیں اس پر صاد کرنے میں بھی کوئی تامل نہ ہوتا۔ اب ان کی حکمتِ عملی یہ ہو گئی تھی کہ
میں نزاع کی صورت پیدا ہو اور کرسیِ عدالت پر آپ جلوہ فرما ہوں تو داہنے ہاتھ کی اوٹ سے

مدعی کو اور بائیں ہاتھ کی اوٹ سے داہنی آنکھ مدعا علیہ کو مار دیجیے، مقدمے کی فائل پر فیصلے کی کوئی تاریخ ڈال دیجیے۔ پھر کوئی اور تاریخ، پھر کوئی اور...... یہاں تک کہ پانی پنسال میں آ کے آپ سے آپ بورس ہو رہے۔ سب سے بڑا منصف وقت ہے۔ غرض یہ کہ مسئلے سلجھائے نہیں گئے۔ فیصلے وقت پر یے نہیں گئے، کشتی کو بہاؤ کے رخ پر چھوڑ دیا گیا۔ جو ہونا ہے ہو رہے گا۔ جی کو خواہ مخواہ روگ لگانے سے حاصل؟

سنجیدہ حلقہ چپ ہو گیا، اہلِ علم گوشہ گیر ہو گئے۔ اور جلسے بازی کے دور کا آغاز ہو گیا۔ اس میدان میں خسرو صاحب کو کون مات دے سکتا تھا؟ کسی بے تکلف محفل میں گفتگو ہو، علمی مباحثہ ہو۔ بڑے سے بڑے مجمع کو خطاب کرنا ہو۔ ان کا ثانی مشکل سے ملے گا۔ جس جلسے اور جس مشاعرے میں وہ موجود ہوتے مرین کی توجہ کا مرکز بنے رہتے۔ موقع کی مناسبت سے دلچسپ قصوں اور چٹکلوں کا استعمال ہر محل معار سے گفتگو کو سجانے کا جیسا کمال انھیں آتا ہے کم لوگوں کو آتا ہوگا۔ گھنٹوں گفتگو کرتے رہیں تو بھی یا مجال کہ سننے والے اکتا جائیں۔ یا ان کی توجہ میں کمی ہو جائے۔ تقریر کے فن میں بھی انھیں لاجواب مہارت حاصل ہے۔ انگریزی اور اردو دونوں میں ایسی تقریر کرتے ہیں کہ سنے جائیے اور لطف لیے جائیے۔ پھر ن کے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ جب تقریر کے لیے اٹھنے لگیں تو بتا دیجیے کہ کس زبان میں ہارِ خیال کرنا ہے۔ اور کس موضوع پر۔ پھر دیکھیے گل افشانیِ گفتار کا کمال!

ان کے حافظے میں اشعار کا بے پناہ ذخیرہ محفوظ ہے۔ غزل کے اشعار اور چھوٹی چھوٹی نظموں ما بات تو جانے دیجیے۔ نظیر کی طویل نظمیں، انیس و دبیر کے پورے پورے مرثیے انھیں ازبر ہیں۔ شاعروں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے۔ اور اساتذہ کا بہترین کلام کبھی تحت اور کبھی ترنم سے سنا کے داد پاتے۔ تھے ایک مشاعرے میں کسی کی غزل سنا رہے تھے۔ جب اس شعر پر پہنچے لہ

جو بات کہی وہ لاثانی، جو شعر پڑھا وہ ذو معنی
ہر بات کے دو معنی یعنی انکار بھی ہے اقرار بھی ہے

تو سامعین نے یہ کہہ کر داد دی کہ یہ شعر تو یقیناً آپ ہی کا ہے۔ ایک نشست میں ایسے اشعار سنانے لگے جن میں بول چال کی برجستہ زبان استعمال ہوئی ہے۔ بیسیوں شعر سنا کے سامعین کو حیرت میں ڈال دیا۔ آج سوچتا ہوں تو ان میں سے صرف ایک مصرع یاد آتا ہے۔

ہاتھ لا استاد! کیوں کیسی کہی؟

خسرو صاحب کی گفتگو میں جو شے خاص طور پر دل آویزی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ بے ساختہ اور لطیف ظرافت۔ ایسی ظرافت جس سے کچھ ذہن لطف لے پاتے ہیں۔ کچھ محروم رہ جاتے ہیں۔ اس کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

ایک دن صبح ہی صبح ایک بزرگ نے جگا کر عجیب سا سوال کیا۔
"آپ کو معلوم ہے یہ آپ کے وائس چانسلر یہاں آنے سے پہلے کیا کرتے تھے؟"
"جی معلوم ہے، پلاننگ کمیشن کے کسی ادارے کے ڈائرکٹر تھے۔"
"نہیں اس سے پہلے"
"اس سے پہلے بھی کسی اونچے عہدے پر ہی ہوں گے۔"
"نہیں، سرکس میں کرتب دکھاتے تھے۔"
"یعنی"
"یعنی یہ کہ کرتب دکھاتے تھے اور کیا۔ سرکس میں ملازم تھے۔ ابھی خود مجھے بتایا۔"
"مذاق کیا ہوگا۔"
"مذاق اور مجھ سے! میرا بڑا احترام کرتے ہیں۔ وہ روز سویرے ہی سویرے کوٹھی کے سامنے ٹہلتے ہیں۔ کبھی کبھی میں بھی ٹہلتا ہوا ادھر جا نکلتا ہوں۔ یونی ورسٹی کے مسائل پر تبادلۂ خیال ہو جاتا ہے۔ آج تھوڑی دیر ساتھ ٹہلتے رہے۔ اسی دوران ایک سائیکل سوار ادھر سے گزرا۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ پھر اس کی سائیکل پر سوار ہو کے چکر لگانے لگے۔ رفتار بڑھائی پھر ایک دم سائیکل کو پچھلے پہیے پر اٹھالیا اور اسی طرح کئی چکر لگا ڈالے۔ مجھے حیران دیکھ کے فرمایا میں پہلے سرکس میں نوکری کرتا تھا۔ یہ سارے کرتب وہیں سیکھے۔

ایک صاحب نے پوچھا "یہ آپ ہر موقع پر اتنی اچھی تقریر کیسے کر لیتے ہیں؟" فرمایا "تقریر سے میرا کیا تعلق؟ میں اس فن میں بالکل کورا ہوں۔ آپ جیسے ایک عالم سے میں نے اردو انگریزی میں مختلف موقعوں کے لیے آٹھ تقریریں لکھوا کر رٹ لیں۔ میرا کمال بس اتنا ہے کہ کوئی نواں موقع پیش آجائے تو ان آٹھوں تقریروں کے ٹکڑے جوڑ کے ایک نئی تقریر تیار کر لیتا ہوں"

اس دن کے بعد کئی لوگوں نے تقریریں لکھوا کے رٹ ڈالیں مگر سن کی داڑھی لگا کے کوئی مولانا مدن بن سکا ہے؟

خسرو صاحب کے زمانے میں کچھ لوگوں نے ڈائریوں میں شعر لکھنے شروع کر دیے تھے۔ وی سی لاج میں ایک دن افطار پارٹی تھی۔ ایک صاحب نے جن کا منصب وائس چانسلر سے کچھ ہی کم تھا۔ اشارے سے ایک طرف بلایا اور جیب سے ڈائری نکالی۔ اس میں سے بچے کر کے شعر سنائے۔ ہر شعر میں یہ صنعت تھی کہ کم سے کم ایک مصرع ضرور ساقط الوزن تھا۔ ڈائری کے شعروں کی کل تعداد تین تھی۔

خسرو صاحب کے زمانے میں دو اصطلاحوں نے علی گڑھ میں بہت رواج پایا۔ ایک ڈائیلاگ اور دوسری کنونس کرنا۔ کہا کرتے تھے ڈائیلاگ سے ہر معاملہ طے ہو سکتا ہے۔ جسے کوئی شکایت ہوتی اسے اجازت تھی کہ بلا تکلف وائس چانسلر سے مکالمے کا آغاز کرے۔ یہ مکالمہ جاری رہتا...... جاری رہتا۔ یہاں تک کہ وہ بے چارا ہانپ جاتا اور شکایت آپ سے آپ رفع ہو جاتی۔ "دیکھیے میں آپ کو کنونس کرنے کی کوشش کرتا ہوں" خسرو صاحب کا تکیہ کلام تھا۔ اول تو ان کی شیریں بیانی انسان کے کنونس کرنے کو کافی تھی۔ کوئی اس کے قابو میں نہ آتا تو ساری رات کے ڈائیلاگ کے بعد جب صبح کو

سپیدی نمودار ہونے لگتی تو کونس ہونے کے سوا اس کے پاس کوئی چارۂ کار نہ رہتا۔ خسرو صاحب رات بھر گفتگو کر سکتے تھے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ تھکن کے آثار دور دور نظر نہ آئیں۔

اطہر پرویز صاحب شعبۂ اردو سے پہلے جنرل ایجوکیشن میں لکچرر تھے۔ یہ شعبہ توڑ دیا گیا تو ان کی سروس شعبۂ اردو میں منتقل ہو گئی۔ وائس چانسلر کی طرف سے انھیں خط ملا کہ اب آپ شعبۂ اردو سے منسلک کیے جاتے ہیں۔ مگر سینیارٹی میں آپ کی پچھلی ملازمت شمار نہ ہوگی۔ یہ فیصلہ یقیناً غیر منصفانہ تھا۔ وہ اپنا مقدمہ لے کر وائس چانسلر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس عزم کے ساتھ کہ آج کسی طرح کونس نہیں ہوں گے۔ ذرا دیر بعد لوٹے تو باہر ہی سے آواز دے کر کہا۔ "بھائی ہم پھر کونس ہو کر آ گئے۔"

خسرو صاحب نے ان کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھا اور بڑی حیرت کا اظہار کیا۔ فرمایا "بے شک یہ خط میرے دفتر سے جاری ہوا ہے اور دستخط میرے ہیں مگر مضمون انتہائی نا معقول۔ میں آپ کو کیسے قائل کروں خود کونس نہیں ہوں۔ اس سلسلے میں انکوائری کروں گا۔ اطمینان رکھیے کہ آپ کے ساتھ انصاف ہوگا" پرویز صاحب کیسے کونس نہ ہوتے۔

مگر اس سے یہ اندازہ لگانا غلط ہوگا کہ خسرو صاحب کے زمانے میں یونی ورسٹی میں کوئی تعمیری کام نہیں ہوا۔ انھوں نے بہت کچھ کیا' بہتوں کے کام آئے۔ بہت سے مسئلے سلجھائے بھی مگر جو کچھ کرنا چاہتے تھے اور جتنا کام کرنے کی ان میں صلاحیت تھی اتنا نہیں کر پائے۔ ان کے خواب ادھورے رہ گئے۔ ملت نے جو توقعات ان سے وابستہ کی تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔ اصل قصور وار شاید ہم ہیں کہ ان کے منصوبوں میں معاون ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے مسئلوں میں الجھے رہے، قومی مفاد کو ذاتی اغراض پر قربان کرتے رہے۔ اور خسرو صاحب کو ہم نے اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ ان کے عہد کا بڑا حصہ رائگاں نہ گیا ہوتا تو یہ ادارہ آج کچھ اور ہی ہوتا۔ اس موقع پر کہا تو بہت کچھ جا سکتا ہے: مگر تاب گفتار کہتی ہے بس!

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

کتاب	موضوع	مصنف	قیمت
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/-
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/-
پت جھڑ کی آواز	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۵۰/-
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	۵۰/-
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶=
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/-
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/-
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/-
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۴۵/-
قلندر بخش جرأت	(خطبہ)	جمیل جالبی	۱۰/-
عجائب گھر	(بچوں کی سائنسی کتاب)	قاسم صدیقی	۱۰/-
تاریخ اودھ	(تاریخ)	ترجمہ و ترتیب شاہ عبدالسلام	۲۷/-
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	(ادب)	ظ انصاری	۳۳/-
تنقید اور جدید اردو تنقید	(تنقید)	ڈاکٹر وزیر آغا	۶۰/-
مشقی تدریس، کیوں اور کیسے؟	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۴۵/-
آوازوں کا میوزیم	(افسانے)	ساگر سرحدی	۴۵/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو	(خاکے)	کشمیری لال ذاکر	۳۶/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	(خاکے)	اشرف صبوحی	۵۱/-
چند تصویر بتاں	(تاثرات)	مولانا عبدالسلام قدوائی	۴۵/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	(ادب)	پروفیسر آل احمد سرور	۸/-
صاحب جی سلطان جی	(تذکرہ)	ڈاکٹر اسلم فرخی	۲۰/-
نظام رنگ	(ادبی خاکہ حضرت نظام الدین اولیا)	" " "	۱۵/-
شہید جستجو	(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)	ضیاء الحسن فاروقی	۴۵/-
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست	(مذہب)	مشیر الحق	۸/-
ہمارے دینی علوم	(مذہب)	مولانا اسلم جیراجپوری	۱۸/-
تحقیقی مضامین	(تحقیق)	مالک رام	۶۰/-
آسان اردو ورک بک	(تعلیم)	شکیل اختر فاروقی	۲۴/-

لکلام قاسمی
ر، شعبۂ اردو، مسلم یونی ورسٹی
علی گڑھ

عبداللہ حسین کا ناول باگھ اور آزادی کا خواب

عبداللہ حسین اردو کے ایک ایسے منفرد اور ممتاز ناول نگار ہیں جنھوں نے اپنے پہلے ہی ناول
اس نسلیں' سے اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اپنی جگہ اور قدر و قیمت محفوظ کرالی ۔ 'باگھ' عبداللہ حسین
دسرا ناول ہے ۔ اس ناول نے عبداللہ حسین کی فن کاری کے بارے میں اُس رائے کو مزید مستحکم کر دیا ہے کہ
ن کے پہلے ناول اور بعض طویل و مختصر افسانے سے قائم ہوئی تھی ۔ عبداللہ حسین کو عام حالات و واقعات اور
م قسم کے کرداروں کے پس منظر میں روبہ عمل محرکات و عوامل اور پیچیدہ صورتِ حال کی پیش کش میں کمال حاصل
یہی سبب ہے کہ وہ اپنے ناول کو خواہ محبت کی کہانی کہیں یا محض کسی جمالیاتی تجربے کا اظہار کہیں
ان کا ہر ناول اور ہر افسانہ پیچ در پیچ سماجی اور سیاسی عوامل کی دستاویز بن جاتا ہے ۔

عبداللہ حسین نے اپنے پہلے ناول 'اُداس نسلیں' کو محبت کی کہانی کا نام دیا تھا ۔ اور زیرِ بحث
ہ ناول 'باگھ' کے سرنامے پر بھی 'محبت کی کہانی' کا لاحقہ لگایا ہے ۔ مگر کیا کوئی بھی محبت کی کہانی اول و آخر
ن محبت کی کہانی ہو سکتی ہے ؟ شاید اس کا جواب نفی میں ہو ۔ چنانچہ عبداللہ حسین اپنے ناول کے بارے
اس اعلان کے باوجود ، درحقیقت انسانی وجود اور وجودی صورت حال کے واقعات بیان کرتے ہیں محبت
نہ خلا میں اپنا وجود نہیں رکھتی ۔ اس لیے محبت پر مبنی کوئی ناول یا افسانہ بھی محبت کرنے والے وجود کی وجودی
کش اور سماجی جبر سے ماورا یا لاتعلق ہو کر اپنی تکمیل کے مراحل طے نہیں کر سکتا ۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ 'باگھ'
محبت کا موضوع ہیرو کے وجودی مسئلے اور اس کے گرد و پیش کے سماجی جبر سے ہم آہنگ ہو کر ایسا ارتفاع
حل کر لیتا ہے کہ اس کی بلندیوں سے ایک مجبور اور بے بس انسان کی لاچاری اور بے کسی کو صاف طور پر
ا اور محسوس کیا جا سکتا ہے ۔

باگھ' بظاہر ایک نوجوان جوڑے اسد کریم اور یاسمین کی محبت کی کہانی ہے لیکن جیسے جیسے ناول کے
قعات ارتقا کی طرف بڑھتے ہیں ۔ اسد کریم کے ذاتی وجود اور وجودی صورتِ حال کو بنیادی حیثیت حاصل
تی چلی جاتی ہے ۔ اس طرح اسد کریم اور یاسمین کی محبت بھی اسد کریم پر ڈھائے جانے والے مظالم اور
یدہ معاشرتی صورت حال کا پس منظر بن جاتی ہے ۔ اسد کریم بہت حساس اور جذباتی نوجوان ہے ۔ اس کی
ترتِ احساس اور وفورِ جذبات میں فن محرکات کا اہم رول رہا ہے ۔ ان میں ہر چند کہ محبت بھی ایک اہم عنصر
طور پر شامل ہے ، مگر اس سے کہیں زیادہ اُن حالات نے اسد کریم کو حساس اور جذباتی بنایا ہے جن سے
بچپن سے لے کر نوجوانی کی عمر تک دوچار رہا ہے ..... اسد شروع سے ہی ایک ذکی الحس اور چیزوں کو گہرائی
ہ دیکھنے کا عادی کردار ہے ۔ وہ لڑکپن میں اپنے باپ سے بہت جذباتی طور پر وابستہ دکھائی دیتا ہے اس کے بچپن

اور لڑکپن میں اس کے ارد گرد باپ کی شخصیت ہالے کی طرح حصار کھینچے ہوئے نظر آتی ہے۔ وہ دَ
کی عمر میں اپنے باپ کے ساتھ شکار میں جاتا ہے۔ جہاں اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا باپ نہ صرف ش
سے غیر معمولی دلچسپی اور شغف رکھتا ہے۔ بلکہ کسی شیر کا شکار کرنا اور شیر کے شکار کو اپنی زندگی "
سمجھنا" اس کی زندگی کا ایک ناگزیر عنصر بن کر رہ گیا ہے۔ اسد کریم کی شخصیت اور نفسیات پر با
مشاغل اور مقاصد کا بڑا گہرا اثر مرتب ہوتا ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ اس کا باپ شیر کے شکار کی
میں اپنے مقصد حیات کی تکمیل کرتا، اچانک اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ باپ کی موت اسد کریم
ایک سانحۂ عظیم ہے۔ جس کے باعث اسد کریم کی زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ جاتا ہے۔ اب اپنے د
دائمی مفارقت اس کی یادداشت کا محور ہے۔ اور یہ محور اس کے ذہن میں شیر یا باگھ کے شکار کی خو
آرزو بن کر ایک ایسے دھندلے پیکر کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس کی موجودگی کا احساس ہی اب
کے حافظے کی بازیافت کا واحد وسیلہ بن کر رہ گیا ہے۔ پورے ناول میں شیر کہیں دکھائی نہیں دیتا۔
باگھ سے زیادہ باگھ کی حسرت و آرزو بن کر رہ گیا ہے۔ اور یہ حسرت و آرزو بھی ایسی جو گمشدہ ہے
یہی وجہ ہے کہ جس دور دراز علاقے میں اس کی محبوبہ یاسمین رہتی ہے۔ اس کا نام بھی "گم شدہ" رک
ہے۔ اسد کریم کے باپ کی وفات کے بعد اس کے چچا اس کی پرورش و پرداخت کرتے ہیں، مگر چونکہ
خود بھی عزلت گزیں اور تنہائی پسند ہیں اس لیے اسد کو سرپرست تو مل جاتا ہے مگر اس کی ت
تنہائی کا ساتھی نہیں مل پاتا۔ مزید برآں یہ کہ سانس کی بیماری اور اس بیماری کی صعوبتیں ا
کو مزید اکیلا بنا کر چھوڑ دیتی ہے۔ ان حالات میں وہ کتابوں کا سہارا لیتا ہے۔ مگر کتابیں
کی گھٹاٹوپ اور تاریک تنہائی کا مداوا نہیں بن پاتیں۔ البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ کتابوں کے
کے دوران اُسے سخت حالات اور سماجی دباؤ سے نجات، ستمگاری اور آزادی کا سبق یقیناً
شاید رہائی اور آزادی کا یہی سبق اس کی زندگی کا حوصلہ بخش محرک بن جاتا ہے۔ جو زندگی میں
آنے والے حالات میں اُسے حوصلہ دیتا ہے۔ اور شکست کے احساس سے ماورا رکھتا ہے۔

'ناول باگھ' میں اسد کریم کا کردار ہر چند کہ یاسمین کی ملاقات کے بعد ایک مکمل کر
کر سامنے آتا ہے۔ مگر انفرادی طور پر بھی اسد کریم کے کردار کی مرکزیت سے انکار نہیں کیا
اس لیے کہ سانس کی تکلیف کے علاج کے سلسلے میں جب اسد کریم، یاسمین کے حکیم باپ
قائم کرتا ہے اس وقت یاسمین سے اس کی محبت پروان چڑھنا شروع ہوتی ہے ظاہر ہے کہ ا
مزاج کے مخصوص عناصر، جن سے اسد کریم کی پہچان ہوتی ہے۔ اس وقت تک واضح ہو کر اس
کا ناگزیر حصہ بن چکے ہیں۔ اس طرح ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ یاسمین سے اسد کی محبت اُن رجحانات
پختگی بخشتی ہے جو رجحانات اسد کریم کی شخصیت میں اس کے ذاتی حالات اور معاملات کے باعث
سے نمو پذیر نظر آنے لگے تھے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ بنیادی رجحانات کیا تھے۔ جو اکیلے پن
اور بیماری میں بھی اس کے اندر زندہ رہنے کا حوصلہ اور ظلم و جبر کے خلاف نبرد آزما رہنے کی
سرچشمہ تھے۔ اس سوال کا جواب ہمیں اس وقت ملتا ہے۔ جب اچانک یاسمین کے حکیم باپ کا قتل
ہے۔ اور قاتل کا سراغ نہ ملنے پر اسد کریم کو قتل کے شبہ میں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ گرفتاری کا

حالات میں اس پر ڈھائے گئے غیر معمولی مظالم کا زمانہ اسد کریم کے لیے سیاسی جبر و استبداد اور جور و ظلم کی ان راتوں کی طرح ہے جن راتوں میں اُسے آزادی کے خواب اور جدوجہد یا کشمکش حیات کی لذت سے آشنا ہونے کا موقع ملتا ہے۔ ناول باگھ کے وہ اوراق جن میں اسد کریم کو اقبالِ جرم پر آمادہ کرنے کے لیے طرح طرح کی اذیتوں کا شکار دکھایا گیا ہے۔ قاری کے لیے بھی محرومی اور مایوس زندگی کی مصیبتوں میں پامردی اور حوصلہ مندی کا زبردست احساس بن کر سامنے آتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مظالم سے تنگ آکر اسد کریم اقبالِ جرم کر لیتا۔ اور اس طرح صداقت کا نحیف و ناتواں مگر پختہ عزم رکھنے والا یہ مجاہد اپنے ضمیر کا علم بلند رکھنے کے باوجود مخالف قوتوں کی جنگ میں محض ایک ہارے ہوئے سپاہی کے طور پر زخم خوردہ اور لہولہان دکھائی دیتا۔ اسد کریم کی اس چھوٹی سی زندگی میں جس سے ہم ناول باگھ میں متعارف ہوتے ہیں ایسے کئی مراحل آتے ہیں جہاں معمولی اعصاب کا کوئی بھی شخص بہت آسانی سے ہمت ہار سکتا ہے۔ اسد کریم کسی بھی مرحلے پر شکست تو کجا، احساسِ شکست سے بھی دوچار ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ یاسمین کی محبت بھی جو اس کی زندگی کا حسین ترین تجربہ ہے۔ پے در پے پیش آنے والی مشکلات سے گھری ہوئی ہے۔ پھر یہ کہ جب اسد کریم کو جاسوسی کی غرض سے کشمیر کے غیر ملکی خطے میں جبراً بھیج دیا جاتا ہے، جسے وہ اپنے مزاج کے موافق نہ پاکر واپس آجاتا ہے۔ اور ایک بار پھر گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ یہ اور اس طرح کی صورتِ حال اسد کریم کے کردار میں بار بار سامنے آتی ہے۔ مگر کسی بھی موقع پر یہ کردار حوصلہ شکنی کا شکار نہیں ہوتا اور اپنی قوتِ ارادی اور کسی غیر معمولی سچائی کے جذبے سے سرشار ہو کر تمام حالات سے نبرد آزما دکھائی دیتا ہے۔

باگھ، میں یوں تو اسد کریم اور یاسمین کے علاوہ ہماری ملاقات کئی اور ضمنی کرداروں سے بھی ہوتی ہے۔ مگر کہانی کا بنیادی محور ایک ایسا شخص ہے جو ہر طرح کی ناموافق صورتِ حال کے درمیان اکیلا کھڑا ہے۔ وہ حساس ہے۔ جذباتی ہے۔ اکیلا ہے، اور عشق کے تجربے میں وصال و ہجر کی امید و بیم میں مبتلا ہے۔ مگر وہ ہر طرح کے حالات میں اپنے کردار، تلاشِ صداقت اور آزادی یا نجات کے علم کو بلند رکھتا ہے۔ اس طرح شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ عبداللہ حسین نے اپنے ناول باگھ کی شکل میں ایک تہہ در تہہ رزمیہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ اور وہ بھی ایسا رزمیہ جس میں عمل سے زیادہ جذبۂ عمل کو اور آزادی سے زیادہ آزادی کے خواب کو اہمیت حاصل ہے۔ ○

۱۔ تحریریں (مضامین) ڈاکٹر اسلم پرویز ۵۱/=

۲۔ نذیر احمد کے ناولوں میں نسوانی کردار

تحقیق ڈاکٹر زینت بشیر ۱۰۰/=

۳۔ یادو جبیبہ تذکرہ مرتبہ ڈاکٹر شعائر اللہ خاں ۵۰/=

۴۔ بزرگانِ دین سوانح " مولانا علی محمد مظہری ۱۴/=

۵۔ خواب نامہ تعبیر نامہ (تعبیر خواب) عبدالغفار حسن ۳/۵۰

۶۔ فتوح الغیب تصوف شیخ عبدالقادر جیلانی ۴۰/=

۷۔ سفر اور سایے شاعری اسلم بدر ۴۰/=

۸۔ ولی انتخاب و تہذیب ادب محمد خاں اشرف ۲۵/=

۹۔ برزخ افسانے ہاجرہ شکور ۴۰/=

۱۰۔ قند و زقند طنز و مزاح فیاض احمد فیضی ۵۰/=

۱۱۔ مقالات عابدی (فارسی)

مجموعہ مقالات مرتب سیّد اطہر شہیر ۸۰/=

۱۲۔ دیوان اماں (فارسی) مجموعہ ڈاکٹر سید علی حیدر ۶۰/=

۱۳۔ جدید اردو لسانیات لسانیات

ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین (مرحوم) ۴۰/=

۱۴۔ نماز کا تعارف مذہب عزیز الحسن جعفری ۶/=

۱۵۔ ابن سینا سوانح، سلسلہ ابوجاوید خاں ۱۰/=

۱۶۔ البیرونی " سید سعید احمد ۹/=

۱۷۔ سید احمد شہیدؒ " مظہر انصاری دہلوی ۸/=

۱۸۔ سید جمال الدین افغانی " سید ذاکر اعجاز ۹/=

۱۹۔ بابا فرید گنج شکرؒ " ادارہ ۸/=

۲۰۔ جلال الدین رومی " ابوجاوید نیازی ۱۰/=

۲۱۔ ابن رشد " ارشاد الحق قدسی ۹/=

۲۲۔ ہارون رشید " شجاعت اللہ صدیقی ۱۰/=

۲۳۔ سراج الدولہ ادارہ ۱۰/=

۲۴۔ شیر شاہ سوری " ادارہ ۱۰/=

۲۵۔ حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ " ادارہ

۲۶۔ تصوف کے دو اہم کردار ڈاکٹر ریاض احمد

احاطہ (شعری مجموعہ) جبار جمیل

پاکستانی مطبوعات

یہ کتابیں ہندستان میں دستیاب نہیں لیکن ان کے نام صرف آپ کی معلومات کے لیے دیے جا رہے ہیں۔

فصیلِ زباں (شعری مجموعہ) حفیظ الرحمن احسن

بیت المقدس (تاریخ) منشی عبدالقدیر مرحوم

اقبالیاتی جائزے (ادبی و تحقیقی) ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

تنویر اقبال (" ") ڈاکٹر عبدالمغنی

جاگو جاگو (بچوں کے لیے کہانیاں) ثاقبہ رحیم الدین

پیوستۂ شجر (افسانے) شبیہہ عباس جارچوی

محفلِ تنہائی (مضامین) ثاقبہ رحیم الدین

مولانا ابوالکلام آزاد آثار و افکار

پروفیسر محمود واحد ہاشمی

ایک کتھا انوکھی (شعری مجموعہ) وزیر آغا

چاند کے چار رنگ (سی گیو کے کلام کا ترجمہ)

مترجم محمد انیس علوی

عشق سے طبیعت نے (شعری مجموعہ) سیدہ حنا

بے جواز (شعری مجموعہ) حامد سروش

خدا حافظ (طنز و مزاح) محمد اکرام الحق صدیقی

ترنگ (شعری مجموعہ) شمشاد فاکر

جس کے بعد پہلی بارش (افسانے) طاہر نقوی

کفِ بہار (شعری مجموعہ) عرفانہ عزیز

بے شناخت (افسانے) ناصر بغدادی

الوز سدید گرم دمِ جستجو (مضامین) مرتبہ: سجاد نقوی

عذاب بے زبانی کا (افسانے) محسنہ جیلانی

فریدؒ و فردِ فریدؒ (تذکرہ) ڈاکٹر اسلم فرخی

شاعری کی زبان (مضامین) انجم اعظمی

قدرت نقوی
۱/۱۵-۱ اے البفر د ون نارتھ کراچی
(پاکستان)

خاور نامۂ رستمی

اس وقت ہمارے سامنے "خاور نامہ" مصنفہ رستمی بیجاپوری ہے۔ جسے چاند حسین شیخ نے مرتب کیا
ترقی اردو بورڈ (اردو ڈکشنری بورڈ) کراچی نے ۱۹۶۸ میں شائع کیا۔ مرتب نے خاور نامہ کے عکس
آفس لائبریری لندن سے حاصل کر کے اُسے مرتب کیا ہے۔ وہ اس مخطوطے کا تعارف کراتے ہوئے
لومات فراہم کرتے ہیں۔

"جس مخطوطے کی بنیاد پر اس دکھنی مثنوی کے متن کی ترتیب عمل میں آئی ہے۔ اس میں لاتعداد
یریں ہیں۔ اور جس طرح یہ تمام داستان فرضی ہے۔ اسی طرح یہ تصاویر بھی فرضی ہیں۔ البتہ ایک بات
کرنے کے قابل ہے کہ ان تمام تصاویر میں جہاں جہاں پیغمبروں اور حضرت علیؑ کی تصاویر آئی ہیں
رنے یہ اہتمام کیا ہے کہ اُن کے چہروں پر نقاب ڈال دیا ہے۔

فنی اعتبار سے یہ تصاویر بہت ہی دلچسپ ہیں۔ کیونکہ مصور نے تصاویر میں یہ کوشش کی ہے
ول کے تمام جزئیات کو بالتفصیل ظاہر کر دے۔ ان تصاویر سے رستمی کے زمانے میں جو لباس استعمال
تھا اس کا پتہ چلتا ہے۔ اور غالباً ان تصاویر کا پس منظر بھی عربی یا عجمی ہونے کے بجائے دکنی معلوم
ا۔ واللہ اعلم۔" (دیباچہ ص)

اس تعارف میں صرف تصاویر کے متعلق سرسری بیان ہے۔ متن اور مخطوطے کی کیفیت و حالت سے
ئی کوئی بات نہیں کہی گئی ہے۔ رسم الخط، مسطر، پیمایش، جدول، حوضہ، ترک وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں
ہ کے نزدیک ترتیب و تدوین صرف متن کو نستعلیق میں منتقل کر دینے ہی کا نام معلوم ہوتا ہے۔

مصنف کے متعلق بھی کوئی خاص بات بیان نہیں کی ہے۔ مخطوطے کے آخر میں ایک فارسی عبارت
جس سے مصنف اور سببِ تصنیف پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی سے جزوی معلومات فراہم کر دی گئی ہیں
رستمی کے متعلق معلومات کا یہ واحد ذریعہ ہے۔ اسی لیے ہم اس کا تلخیصی ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔

"خاور نامہ دکنی منظوم کرنے کا سبب یہ تھا کہ خدیجہ سلطان شہربانو جن کا لقب بڑی صاحب ہے
سلطان محمد امین قطب شاہ ابن قطب شاہ کی بیٹی اور سلطان عبداللہ قطب شاہ ابن قطب شاہ کی بہن اور
ان محمد غازی عادل شاہ ابن سلطان ابراہیم عادل شاہ کی زوجہ اور شاہ علی کی والدۂ گرامی ہیں۔ ان
ل میں یہ خیال آیا کہ فارسی خاور نامہ اگر دکنی زبان میں منظوم ہو جائے تو اچھا ہے۔ بس انھوں نے یہ

اعلان کیا کہ جو کوئی خاور نامہ کو دکنی زبان میں ترجمہ کرے گا۔ اس کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اسے ہم عصر لوگوں اور شاعروں میں ممتاز درجہ دیا جائے گا۔ اس کی قدر و منزلت بڑھائی جائے گی۔ دربار رازدانوں نے اس سلسلہ میں بڑی تگ و دو اور غور و فکر کے بعد یہ خوشخبری کمال خاں تک پہنچائی۔

کمال خاں، اسماعیل خطاط خاں دبیر کا بیٹا ہے۔ یہ خاندان چھ پشتوں سے دبیری کے عہدے پر فائز چلا آرہا ہے۔ موروثی خطاب "خطاط خاں" ہے۔ کمال خاں شاعری میں کلی مہارت رکھتا ہے۔ اس نے نظم و نثر بہت کچھ کہا اور لکھا ہے۔ نظم میں "رستمی" تخلص کرتا ہے۔

رستمی نے ملکہ کے اعلان کے مطابق اس بات کو قبول کیا۔ اور دکنی زبان میں ترجمہ کرنے لگا۔ اس فارسی کی ہر بیت کا ترجمہ دکنی بیت میں کیا۔ اس کا نام خاور نامۂ دکنی رکھا۔ چوبیس ہزار ابیات اس نے ڈیڑھ سال کی مدت میں کہیں اور یہ کتاب مرتب کی۔

دکنیات کے ممتاز ماہرین میں سے نصیر الدین ہاشمی اور محی الدین قادری کے علاوہ مرتب خاور نامہ صرف اسی عبارت سے حالات بیان کیے ہیں۔ رستمی کے حالات اور کہیں نہیں ملے۔ مصنف کا تعارف یہ ختم ہو جاتا ہے۔ اصولاً مخطوطے کا تعارف کرایا جاتا جس کے متعلق معلومات فراہم نہیں کی گئیں۔ صرف متن کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے۔ متن میں دو ایک جگہ نشان لگا کر حاشیے میں غائب اوراق کی نشاندہی کی گئی ہے۔

مرتب کے پیش نظر فارسی خاور نامے کا دو مخطوطے تھے بعد میں رہے۔ ان سے تدوین و ترتیب متن میں تو کام نہیں لیا جا سکا؛ لیکن بعد میں مقابلہ کر کے مقدمہ میں بہت کچھ کہا جا سکتا تھا۔ صرف کمال خاں متعلق یہ ضرور لکھ دیا ہے۔

برٹش میوزیم میں فارسی خاور نامے کا جو مخطوطہ محفوظ ہے۔ اس کی ایک عبارت سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غالباً یہ وہی نسخہ ہے جس سے رستمی نے اپنا دکنی خاور نامہ تیار کیا ہے۔ کیونکہ یہ نسخہ پہلے کسی کی ملکیت تھا۔ لیکن بعد میں وہ کمال الدین کی ملکیت میں آگیا۔ غالباً یہ وہی کمال الدین ہے جس کو ہم رستمی تخلص سے یاد کرتے ہیں۔ (دیباچہ ص)

اب اس کی حقیقت خواجہ حمید الدین شاہد کے مرتبہ تتمہ میں ملاحظہ فرمائیے۔ تو معلوم ہوگا کہ مندرجہ بیان درست نہیں ہے۔ تتمہ میں فارسی کے دو مخطوطوں کا ذکر ہے۔ ایک انڈیا آفس سے ملا اور دوسرا برٹش میوزیم سے دستیاب ہوا۔ اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:-

"اس اثنا میں ابن حسام کے خاور نامے کے ایک اور مخطوطے کا خورد بینی عکس برٹش میوزیم کے کتب خانے سے مل گیا...... اس مخطوطے کا ترقیمہ درج ذیل ہے:-

"....صاحب این کتاب خاور نامہ .... نواب کمال الدین خاں است...... تمت نہم ماہ رمضان المبارک ۱۰۹۷ھ کاتبہ فقیر حقیر است۔"

دکنی خاور نامہ ۱۰۵۹ھ میں مکمل ہوتا ہے۔ اور یہ فارسی خاور نامۂ ابن حسام ۱۰۹۷ھ کا مکتوبہ ہے۔ گویا دکنی خاور نامہ سے اڑتیس سال بعد کا مکتوبہ ہے۔ تو رستمی کے سامنے ترجمہ کرتے وقت یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کسی نواب کمال الدین کی ملکیت ہے بعد میں ان کے پاس نہیں آیا بلکہ اسے کاتب نے انہی کے

پس مرتب کا یہ بیان کہ رستمی کے سامنے یہ برٹش میوزیم والا نسخہ تھا اور یہ کہ یہ نسخہ پہلے کسی اور
ھا، اور بعد میں کمال الدین کی ملکیت میں آیا۔ اور اس نسخہ کا مالک کمال الدین ہی رستمی ہے۔ ترقیمہ
صحیح ثابت نہیں ہوتا۔ تغلیط کے لیے بعد زمانی ہی بہت بڑی دلیل ہے۔

پہلے خاور نامۂ ابن حسام کے فارسی مخطوطے کا تعارف بھی "تتمہ" میں کرایا گیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ
رستمی کے سامنے نہیں تھا مختصر سا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور غائب اوراق و اشعار کے
علامات فراہم کی گئی ہیں۔

فی المناجات" کی سرخی کے تحت پہلے شعر کے بعد دو اشعار ایسے ہیں جو فارسی میں نہیں ہیں۔۔۔۔
کے بعد آٹھ اشعار کا ترجمہ ہے (۵۴) اشعار کا ترجمہ مفقود ہے۔

ابن حسام کے خاوران نامہ" کے پانچویں عنوان "فی نعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے جملہ اشعار کا ترجمہ
خاور نامے" میں درج نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رستمی نے ان اشعار کا ترجمہ نہ کیا ہو۔ اسی طرح چھٹے عنوان
النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے (۹۷) اشعار کا ترجمہ نہیں ہے۔ اور اس کے بعد کے اشعار کا ترجمہ کیا گیا ہے۔
ہے کہ یہ سہو کتابت ہو یا پھر دست برد زمانہ کے ہاتھوں یہ اوراق تلف ہو گئے۔ اور انڈیا آفس کے
اور نسخے میں شامل نہ ہو سکے۔ خاور نامۂ رستمی کے مطبوعہ صفحہ (۹) کے ذیل میں مرتب نے اس طرف اشارہ
ہے: (تتمہ مرتب)

رستمی کے متعلق یہ سوچنا کہ اس نے ترجمہ کرتے وقت نعت و معراج کے اشعار کا ترجمہ نہیں کیا ہوگا
بہتان ہے۔ ایسا نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ اوراق تلف ہو جانے والی بات درست ہے۔ مرتب نے
(۹) کے حاشیہ میں لکھا ہے:

"اس جگہ انڈیا آفس والے نسخہ میں چند ورق مفقود نظر آتے ہیں۔ کیونکہ گذشتہ عبارت کا ربط باقی نظر
آتا۔ غالباً یہ حصہ در نعت پیغمبر کے عنوان کے تحت ہے۔"

مرتب کا خیال درست ہے کیونکہ مناجات کے گیارہ اشعار کے بعد مطبوعہ میں ذکر معراج شروع ہو جاتا ہے
یہاں مناجات کے باقی اشعار، نعتِ نبی کے جملہ اشعار اور کچھ ابتدائی اشعار ذکر معراج کے مطبوعہ میں نہیں
مرتب کو سوچنا چاہیے تھا کہ اتنے بہت سے اشعار غائب ہیں کہیں یہ حصہ کسی اور جگہ تو شامل نہیں ہو گیا۔
نہیں کیا گیا۔ اسی طرح کی نشاندہی صفحات (۱۹۶، ۲۴۲، ۲۸۷، ۴۰۰، ۴۲۷، ۴۴۸) کے حاشیے میں کی گئی ہے کیونکہ
مثنوی چوبیس ہزار کی ہے۔ اور موجودہ حالت میں صرف ۲۲۰۷۱ شعر ہیں۔ گویا ایک ہزار نو سو انتیس (۱۹۲۹)
اشعار ہیں۔ ہمارا قیاس ہے کہ انیس سطری مسطر پر یہ مخطوطہ لکھا گیا ہے۔ ان اشعار کو صفحات پر تقسیم کیا جائے
ایک سو دو صفحات پر لکھے گئے ہوں گے۔ اس میں دو صفحات کا اضافہ عنوانات کے لیے کیجیے تو تقریباً
سو چار صفحات کا نقصان نظر آتا ہے۔

فارسی خاور نامہ بھی چوبیس ہزار ابیات کا بتایا جاتا ہے۔ اگر کوشش کی جاتی تو معلوم ہو سکتا تھا کہ
خاور نامہ میں کہاں کہاں سے اشعار غائب ہیں اور کتنے؟ ایسی کوشش نہیں کی گئی۔ انڈیا آفس کے فارسی
نامہ میں بعض اشعار نہیں ہیں۔ رستمی کے خاور نامے نے بعض اشعار کو زائد بتایا ہے۔ لیکن وہ اشعار برٹش
میوزیم کے نسخے میں ہیں۔ اس طرح جائزہ لے کر پورے نسخے کے گم شدہ اشعار کی نشاندہی فارسی کے مخطوطات کے ذریعہ

ہو سکتی تھی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کتاب کی جلد سے کوئی ورق الگ ہو جاتا ہے تو اس کو کتاب کے کسی ...
میں رکھ کر محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ جلد بندی کے وقت اسے صحیح مقام پر رکھ لیا جاتا ہے۔ اگر نگرانی نہ ہو یا
جلد ساز کو نہ بتایا جائے تو وہ ورق جہاں حفاظت کی غرض سے رکھا ہوتا ہے۔ جلد بندی میں وہیں لگ کر
جلد بندھ جاتی ہے۔ خاور نامہ میں صفحہ ۹ کے بعد غائب اوراق کے ساتھ یہی ہوا۔ یہاں سے کم از کم چار ورق
یا آٹھ صفحے غائب ہیں۔ کیونکہ چار صفحے ص۱۳۸ پر موجود ہیں۔ تفصیل یہ ہے :-

مطبوعہ ص۹ پر فی المناجات کے زیر عنوان صرف گیارہ شعر ہیں۔ آخری شعر یہ ہے :

تج اوپر سو رحمت کا دروازہ کھول — نہ دکھلا منجے قہر دے خوب بول

اس کے بعد ص۱۰ پر پہلا شعر ہے۔

فلک رات اس رسم دسرا کیا — جو نعلیں اس، تاج کر سر لیا

گویا یہ بیت ذکر معراج سے متعلق ہے : اس سے پہلے مناجات، نعت اور کچھ اشعار ذکر معراج کے
غائب ہیں۔ آخر میں جو صفحے ہیں ان میں یہ ہوا ہے کہ مخطوطے میں یہ صفحات جس صفحے کے بعد لگ گئے اس
کی آخری عبارت عنوان کی تھی "در خاتمت کتاب و مناجات گوید" اس سے اگلے صفحے پر معراج سے متعلق اشعار
تھے۔ مرتب اس لیے غلطی کا شکار ہو گیا کہ عنوان سے پہلے جناب ختمی مرتبت کے متعلق یہ شعر ہے۔

کیا ختم اس پر سخائے رسول — میں ہوں نا امید از عطائے رسول

اس کے بعد عنوان کی عبارت پر صفحہ ختم ہو گیا اور یہ صفحہ طاق تھا۔ اس کے بعد جو صفحہ لگ گیا تھا
وہ ذکر معراج کے اشعار پر مشتمل تھا۔ جس کا پہلا اور دوسرا شعر یہ ہے :-

علم کھینچو عالم تھے اسماں اُپر — دماماں مارد ساتوں کوٹھاں اُپر
خدا کے اد فرمان سوں جان پاک — فلک پر گیا پل میں از روے خاک

کیونکہ بیان رسول اکرم سے متعلق تھا اس لیے مرتب کو احساس نہ ہوا کہ یہ الگ ہے۔ اور وہ شعر
الگ ہے۔ لیکن آخر میں جب معراج کے بعد دوسرا بیان شروع ہوتا ہے تو اس کو احساس ہوتا ہے کہ ربط کلام
باقی نہیں رہا تو حاشیہ ذیل لکھا :

"اشعار غیر مربوط ہیں۔ گمان غالب ہے کہ ایک ورق یا ایک سے زائد ورق غائب ہیں"

جس شعر پر نشان لگا کر یہ حاشیہ لکھا ہے، وہ یہ ہے۔

کیے قصد واں تے بھی معراج اُپر — رکھے پانوں بھی چاند کے تاج اُپر

یہ صفحہ کا آخری شعر تھا۔ اور یہ صفحہ طاق نمبر کا تھا۔ گویا مخطوطے میں نمبر کا ب صفحہ۔ اگلا جفت صفحہ ...

جس کا پہلا شعر یہ ہے:

ہر ایک بے نوا اس تے ہے بانوا   منجے بھی نوا ہوئے تو ہے روا

مرتب کو صحیح احساس ہوا کہ سلسلہ غیر مربوط ہو گیا۔ مگر یہ نہیں سوچا کہ سلسلہ کس طرح مربوط ہوا۔ معنی و مفہوم پر نظر نہیں رہی ورنہ عنوان سے پہلے شعر اور یہ شعر سلسلہ قائم کرنے میں آسانی پیدا کرتے ہیں۔ پہلے شعر میں سخاوت و عطائے رسول مذکور ہے۔ اور دوسرے شعر میں اسی سخاوت و عطا سے ہر ایک کا فیضیاب ہونا مذکور ہے۔ اور خود کے لیے بھی اسی کی خواہش ہے۔

کیا ختم اس بر سخائے رسول   نہیں ہوں نا امید از عطائے رسول
ہر ایک بے نوا اس تے ہے بانوا   منجے بھی نوا ہوئے تو روا
امید یو ہے منج کوں ز اکرام او   جو فائدہ پاؤں میں ز انعام او
شفاعت کرے منج کوں روز جزا   دیوے لطف سوں یو تمنا مرا
جو اس بات میں آشنائی پاؤں   اسی نور تے روشنائی پاؤں
رکاب کر رکھوں سیس اس پانوں تل   سنواروں آپس نامہ اس ناؤں تل
منجے تو کہاں ہے یو قدرت کہاں   میں بے چارگی تے بھی منگتا اماں

غرض اسی طرح بیان کرتے ہوئے خدا سے کہتا ہے:

خدایا مجھ از بہر ایں پنج تن   نبی اور ولی دو فرزندان و زمن
جو دنیا میں ہور دین میں پنج کار   اُپر لیا کرم سات اپے کردگار

اس مناجات کے بعد کتاب اور خاتمۂ کتاب کا بیان ہے۔ گویا عنوان سے مطابقت ہے۔

اب آیئے معراج سے متعلق اشعار کا جائزہ لیں۔ خواجہ حمیدالدین شاہد نے لکھا ہے کہ معراج کے ۱۰۹ شعر غائب ہیں۔ آخر میں ذکر معراج میں چھہتر (۷۶) شعر موجود ہیں۔ یہ مکمل صفحات پر آئے ہونگے۔ حساب کرتے ہیں تو انیس سطری مسطر سے چار صفحات پر یہ شعر لکھے جانے کا علم ہوتا ہے۔ ایک جز آٹھ صفحات یا چار ورق کا قرار پاتا ہے۔ اس لحاظ سے جز کے دو ورق غائب ہوئے۔ فارسی مخطوطے کی روشنی میں تعداد اشعار مناجات نعت اور معراج بتائی گئی۔ کہ مناجات کے گیارہ شعر موجود   پینتالیس غائب ہیں۔ نعت کے اشعار کی تعداد نہیں لکھی معراج کے ۹۔ اشعار کا ترجمہ نہیں ہے۔ اس طرح مناجات کے پینتالیس اور معراج کے تین شعروں کی تعداد متعین ہو جاتی کر دونوں کے اڑتالیس شعر نہیں ہیں چار صفحات پر چھہتر (۷۶) شعر آئے ہیں تو ان میں سے باقی دو ابتدائی ورق یا چار صفحات پر بھی اتنے ہی شعر ہونگے۔ حساب کرتے ہیں تو نعت کے ۲۸ شعر غائب نظر آتے ہیں۔ معراج کے غائب تین شعر صفحۂ ماقبل پر ہونگے اور چھہتر شعر آخر میں صفحات لگ جانے کی وجہ سے آخر میں ہیں۔ اب سلسلہ دیکھیے صفحہ ۱۴۳ پر یہ عنوان کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ان اشعار کا عنوان سے کوئی تعلق نہیں۔

علم کھینچو عالم تھے اسماں اُپر — دماماں مارو سا توں کو ٹھاں اُپر
خدا کے او فرماں سوں جان پاک — فلک پر گیا پل میں از روئے خاک
براق سار ہو کر گیا برق ہو — دریا میں ہوا نور کے غرق او
شتابی سوں او بیگ یے کر چلیا — چلیا بیگ بھو تیج شتابی کیا
سبک سیر جو برق ہے خوش خرام — جاوے بیگ اسمان پر تیز گام

اس کے بعد بیت المقدس میں تمام انبیا کا جمع ہونا اور نبی اکرمؐ کے پیچھے ان سب کا نماز ادا کرنا مذکور ہے۔ بیت المقدس سے حضرت جبرئیلؑ کی معیت میں معراج کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ اس بیان کا آخری شعر یہ ہے۔

کیے قصد واں تھے بھی معراج اُپر — رکھے پانو بھی چاند کے تاج اُپر

اس شعر کے بعد صفا پر مندرج اشعار سے سلسلہ ملایا جائے تو ربط و تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔ بیت المقدس سے روانہ ہوتے ہیں تو افلاک کا رُخ کرتے ہیں۔ افلاک پر کیا کیفیت ہے یہ صفا کے ان اشعار میں دیکھیے۔

فلک رات اس رسم دسرا کیا — جو نعلیں اس تاج کر سر لیا
رکاباں ہوا زین کا ماہ نو — دکھیا جو کہ آیا ہے یو شاہ نو
خریدار ہوئی جیو سوں مشتری — جو اس کے قدم تھے پاؤں برتری
قدم پر اسی سیس زہرا رکھی — جو روشن ہووے نور میرا سبھی

آگے ذکر معراج کا سلسلہ قائم ہے اور کہیں جھول نہیں اس طرح درج ذیل صفحات کے اشعار کو ملا کر پڑھا جائے تو مناجات، نعت، اور ذکر معراج میں ربط و تسلسل قائم ہو جاتا ہے۔

ا۔ ص ۹ کے آخری شعر کا سلسلہ ص ۱۳۸ کے عنوان "در خاتمت و تاریخ کتاب و مناجات گوید" کے بعد والے شعر ملائیے۔ جو ص ۱۴۳ کے شعر ۱۲ تک چلا گیا ہے۔

۲۔ ص ۱۴۳ کے شعر ۱۲ کا سلسلہ ص ۱۰ کے پہلے شعر کے ساتھ ملائیے۔ مضمون ربط و مسلسل ہو جائے گا۔

۳۔ ص ۱۳۸ کے عنوان "در خاتمت الخ" سے پہلے شعر کے ساتھ ملائیے ص ۱۴۳ کے شعر ۱۱ سے ملائیے مضمون کا رابطہ قائم ہو جائے گا۔

امور مذکورہ کی روشنی میں یہ نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے کہ مرتب نے نفس مضمون کے مطابق ربط پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے سامنے خاور نامہ رستمی اور فارسی خاور ناموں کے نسخے ہوتے تو ہم اور بھی اہم نتائج پیش کر سکتے۔

یب الرحمٰن
کینیڈا

آج

اے غم کشانِ راہ یہ کیسا سماں ہے آج
قلب و نظر کو دعوتِ آہ و فغاں ہے آج

سینوں میں دشمنی کے الاؤ ہیں شعلہ زن
دم سوز نفرتوں کا دلوں میں دھواں ہے آج

صحرا میں چل رہی ہیں ہلاکت کی آندھیاں
جور و ستم کی ریت میں گم کارواں ہے آج

برسا رہے ہیں عرش سے عفریت بجلیاں
تیرِ فنا سے جن کی بشر بے اماں ہے آج

کعبے کی سرزمیں میں ہے اغیار کا گزر
بیت الحرم کا کون بھلا پاسباں ہے آج

ہر زخم انتقام ہے اک حرفِ خونچکاں
رنگینیِ لہو سے رقم داستاں ہے آج

یہ بدنصیب شاعرِ ناچار کیا کرے
انسانیت کی موت پہ بس نوحہ خواں ہے آج

پروفیسر مظفر حنفی
اقبال پروفیسر شعبۂ اردو کلکتہ یونی ورسٹی
کلکتہ ۳۰

آپ کے پانو میں ٹھرٹھری ہے میاں
پیار کی راہ کانٹوں بھری ہے میاں

پیڑ کاٹے گا یہ، کھیت چاٹے گا یہ
یہ مسافر نہیں لشکری ہے میاں

آج دس بیس پھر جان سے جائیں گے
آج ہر موڑ پر سنتری ہے میاں

میرے اشعار کی کیفیت تو یہ تو
تیرے شیشے میں بوڑھی پری ہے میاں

کیا نیا گل کوئی پھر کھلا ہے کہیں
شاخِ دل آج کتنی ہری ہے میاں

مسکراتے رہو، تیر کھاتے رہو
دلبری ہے میاں، دلبری ہے میاں

بھائی سے پوچھتا ہوں یہ کیا راز ہے
کیوں پڑوسی ہمارا جری ہے میاں

اے مظفر بہانگ دُہل سچ کہو
سل یہ سینے پہ کیسی دھری ہے میاں

مخمور سعیدی
سی ۱۵ بی ڈی اے فلیٹ
ماتا سندری روڈ نئی دہلی ۲

بے دست و پا ہوں اور ارادہ سفر کا ہے
میرے لیے بُلاوا یہ کس رہگزر کا ہے
یہ دل، کہ مدتوں سے گرفتار گھر کا ہے
گھر کیا ہے؟ اک حصار سا دیوار و در کا ہے
منظر کا سارا حُسن حجابات ہی کی دین
منظر ہو بے حجاب، تقاضا نظر کا ہے
میں نے بھری اڑان تو جھونکے بکھر گئے
سیلِ ہوا میں زور مرے بال و پر کا ہے
بے آب کھیتیوں سے تو بچ کر چلا ہے تو
اے ابرِ خوش خرام! ارادہ کدھر کا ہے
بھولا نہ جائے سانحۂ قتلِ آرزو
رشتہ نئے غموں سے پرانی خبر کا ہے
دل کو تلاش! شہرِ نشید و نشاط کی
نقشہ نظر میں وادیِ خوف و خطر کا ہے
مہکا کرے یہیں، مرے خیمے کے آس پاس
یہ آخری پڑاؤ نسیمِ سحر کا ہے
مخمور! ناشناسِ رہِ عشق ہم نہیں
ہم کو تو پاسِ مصلحتِ ہم سفر کا ہے

نقش لائلپوری
337, STAINES ROAD,
MOUNSTOW, MIDDX
LONDON, U.K.

کسی کو قتل کسی کو حلال کرتے ہیں
وہ اپنا رنگِ سیاست بحال کرتے ہیں

کہیں پہ ڈاکہ کہیں پر غبن کہیں چکمہ
یہ سارے کام اب اہلِ کمال کرتے ہیں

مقابرانِ سیاست کے حرص خوردہ نقیب
گداگرانِ ہوس کو نہال کرتے ہیں

فقط گھٹا ہی نہیں باغبانِ حکمت بھی
ثمر نصیب شجر کا خیال کرتے ہیں

تم ان فراق زدوں کی بھی کوئی بات کرو
جو شہرِ ہجر میں جشنِ وصال کرتے ہیں

جنہیں شعور ہے تخلیقِ شعر کا دیدوست
وہ بانجھ لفظ کو بھی لازوال کرتے ہیں

زباں پہ ناز ہے جن کو کوئی جواب تو دیں
ہمارے عہد کے گونگے سوال کرتے ہیں

شفیق عباس
انجمن اسلام ہائی اسکول
۹۲، ڈاکٹر ڈی۔این روڈ، بمبئی

شب شکستہ مکاں کے اندر

یہ شب
شکستہ مکاں کے اندر ہے قید
جس کی ہزار آنکھیں
کہ جن میں اترتے ہوئے بگولے ہیں ظلمتوں کے
یہ شب
کہ زخموں سے بہتے خوں کی ہزار دھاروں نے جس کے چہرے کو
ڈھنپ لیا ہے
یہ شب
کہ جس کے پریدہ بازو کٹے پڑے ہیں
یہ شب
کہ جس میں نہیں ہے قوت
کہ اپنی جا سے قدم بڑھائے
یہ شب
شکستہ مکاں کے اندر گھٹی گھٹی سی
مجھے بلاتی ہے خوں چکیدہ سی انگلیوں کا اشارہ دے کر
مگر میں جاؤں تو کیسے جاؤں
مکان میں ہوں
کہ جس میں شب ہے
نہ میں گروں گا
نہ شب ہٹے گی
نہ اس شکستہ مکاں کا منظر بدل سکے گا

محسن زیدی
۱۷۷، راؤز ایونیو۔ نئی دہلی۔۲

کیا دیکھتے ہو راہ میں رک کر یہاں وہاں
ہے خاک و خوں کا ایک سا منظر یہاں وہاں

زیرِ نگیں اسی کے سبھی قریہ و دیار
اس کے ہی سب ہیں خیمہ و لشکر یہاں وہاں

ہے درمیان خنجر و سر فاصلے کا فرق
ورنہ سروں پہ ہے وہی خنجر یہاں وہاں

شیشے کے سب مکاں ہیں شکستہ اِدھر اُدھر
بکھرے پڑے ہیں شہر میں پتھر یہاں وہاں

محفوظ رہ گیا نہ کوئی راستہ نہ موڑ
جایا کرو نہ گھر سے نکل کر یہاں وہاں

لگتا ہے اب اُلٹنے کو ہے یہ بساط بھی
سرگوشیاں بھی ہیں برابر یہاں وہاں

محسن عجیب حبس کا عالم ہے اور میں
کوئی دریچہ ہے نہ کوئی در یہاں وہاں

ماجد الباقری
۱۱۔ وحدت کالونی، گوجرانوالہ
(پاکستان)

ایک لمحہ تھا کوئی جو لوٹ کر آیا نہیں
ڈھونڈتا وہ بھی ہے لیکن وہ اِدھر آیا نہیں

شہر کے اونچے مکاں ہیں اور گلیاں تنگ ہیں
عمر گزری آسماں پورا نظر آیا نہیں

ڈوب کر دریا میں سورج کو نکلنا تھا ضرور
اب تو سو جائیں چلو وہ رات بھر آیا نہیں

اس برس بھی کچھ درختوں پر یہاں برسات ہیں
پھول تو آئے بہت لیکن ثمر آیا نہیں

وہ محافظ دوستوں کے ساتھ خود کیوں آگیا
سوچنا یہ ہے کہ واپس نامہ بر آیا نہیں

لوگ ہیں کچھ منتظر ماجد بھی آئے گا ضرور
اب تلک خبروں میں گم ہے بے خبر آیا نہیں

رؤف خیر
بیت الخیر ۱۹/۲۰۲-۱۰-۹ دارالوشاہ نگر
رسالہ بازار، گولکنڈہ ۸، حیدرآباد

شاپنگ

بے شک تھی شاہکار گلہری میں گھاس تھی
گڑیا نہ لی کہ وہ تو فقط خوش لباس تھی
تصویر بولتی سہی تصویر ہی تو تھی

چینی کا تاج خوب تھا ناپائیدار تھا
تھا بادشاہِ وقت مگر ہاتھی دانت کا
کیا کھنکھناتا جسم تھا جو ٹوٹتا رہا

بازار کا جو مال تھا جی کو نہیں لگا
کچھ دیر اور جیب میں سکہ پڑا رہا

پھر ہوا یوں کہ خیر سے گھر لوٹتے ہوئے
آنکھیں خرید لیں کسی اندھے فقیر سے

ظفر گورکھپوری
اے/۳۰۲ "فلوریڈا" شاستری نگر
اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۸۵
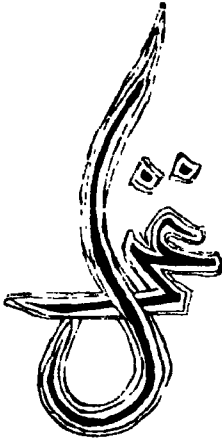
چہرہ لالہ رنگ ہوا ہے موسم رنج و ملال کے بعد
ہم نے جینے کا گُر جانا، زہر کے استعمال کے بعد

آنکھیں یوں ہی بھیگ گئیں، کیا دیکھ رہے ہو آنکھوں میں
بیٹھو صاحب، کہو سنو کچھ، ملے ہو کتنے سال کے بعد

اپنے سوا اپنے رشتے ہیں اور بھی کچھ دنیائیں تھیں
ہم نے اپنا حال لکھا، لیکن دیگر احوال کے بعد

ٹوٹے کتنے آئینے اور چھان لیے کتنے آفاق
کوئی نہ منظر آنکھ میں ٹھہرا اس کے عکسِ جمال کے بعد

بچوں کے ہاتھوں سے اتنی جلدی کاغذ مت چھینو
کوئی نقش بنا لیں گے ٹیڑھی میڑھی اشکال کے بعد

شجاع خاور
۱۔پارک لین نال کٹورا روڈ
نئی دہلی ۱

غزل

پہلے ہوا جو کرتے تھے ہم وہ نہیں رہے
دیکھو شب فراق ہے اور رو نہیں رہے

عیسیٰ بھی رو رہے ہیں انھیں جو نہیں رہے
پہلے سے معجزے تو کہیں ہو نہیں رہے

یارو دکھاؤ پھر کوئی ایسا ہنر کہ بس
غیروں کی کوئی فکر ہی ہم کو نہیں رہے

اشعار سے عیاں ہیں تو اشعار مت پڑھو
ہم دل کے داغ تم کو دکھا تو نہیں رہے

تدبیر بھی ہے جان بھی ہے مصلحت بھی ہے
رہنا نہ تھا بس ایک ہمیں سو نہیں رہے

ہم غیر اور وہ سبھی اپنی جگہ پہ ہیں
بس یوں کہو میاں کہ غزل گو نہیں رہے

نور پرکار
بمبئی

نظم

ایک نامکمل نظم کا مکمل بند.....!
ہجوم شہر مسافرت میں
میں خود ہی اپنا
نوحہ گر.....
راکھ کے ڈھیر میں ڈھونڈتا ہوں
ایک مدّت سے اپنا گھر
کسی اچھے موسم کا منتظر
کہ زنگ زدہ ذہن کے
کواڑ کھولیں گے۔
اور دل کی بے انت روشنی سے
لفظوں کے چاند.....
آنگن میں اتاریں گے
اس اجنبی سی قید میں
اس کیفیت کو رقم کیسے کروں
نہ اشک ہی میرے پاس
نہ حرف آرزو
ہیں حل طلب سوال کو بکو
نہ جستجو نہ گفتگو.....
جو شناسا ہیں کئی رتوں کے
وہی صورتوں سے ناواقف ہو چلے
جو مدتوں میرے ساتھ چلے
وہ راستے ہوئے کہ پھر کبھی نہ ملے
ہاں....
مگر تیری چاہتوں میں
مجھے یہ صلہ ملا ہے
صرف ایک لمحہ تیرے نام کا ملا ہے.....!!!

آشا پربھات
کوٹ بازار وارڈ نمبر ۷ سیتا مڑھی

بہت دن ہوئے

بہت دن ہوئے
جب یوک لپٹس کے پیڑوں کی طرح
دن اُگتا تھا
سیدھا، سپاٹ اور
ٹھہرا سا
آہستہ آہستہ
شام کی دھند میں گھلتی
گھنٹیوں کی آواز
ایک مکمل دن گذر جانے کی
خبر دیتی تھی
بہت دن ہوئے
جب ہوا کی نمی کا
خوابیدہ تاروں سے ایک رشتہ تھا
ہوا کی نمی ......
خوابیدہ تار .....
اور ہتھیلیاں .....
اب سہرن نہیں ہوتی / ہوا کی نمی
رات کی بوندوں کی طرح / ٹھہر جاتی ہے
خوابیدہ تاروں پر / بہت دن ہوئے
جب آنکھوں کو نم ہونا / راس آیا تھا
تب موسم پل میں گزرتے تھے
اور تمہاری آہٹ
سناٹے کو چونکا جاتی تھی
لیکن اب
ہر آہٹ پر سناٹے
سوالیہ نگاہ اٹھاتے ہیں
اور سو جاتے ہیں ..

رحمت امروہوی
ر موریس واڑہ نزد پرانا پاور ہاؤس
آباد ۲۴۴۰۰۱

اس کی یاد بھی آئے تو دل لرز جائے
حادثہ بھی ہمیں پر گزر گیا ہے میاں

نظامِ کہنہ میں ایسے بھی واقعات ملے
ذرا سی چوک ہوئی تھی کہ سر گیا ہے میاں

کڑی کبھی تھی کہ بل پڑ گئے جبینوں پر
ہر ایک شخص کا چہرہ اُتر گیا ہے میاں

کیا تھا طنز کسی نے بڑے خلوص کے ساتھ
زباں کا تیر تھا، دل میں اُتر گیا ہے میاں
تم انتظار میں بیٹھے ہو کس کے اے رحمت
ادھر سے وہ تو کبھی کا گزر گیا ہے میاں

پرکاش تیواری
۱۹۹، سیکٹر ۱۲ آر۔ کے پورم
نئی دہلی ۲۲

گھر سلگتا سا ہے اور جلتا ہوا سا شہر ہے
زندگانی کے لیے اب دو جہاں کا قہر ہے

جاؤ لیکن سرخ شعلوں کے سوا پاؤ گے کیا
سنسناتے دشت میں کالی ہوا کا قہر ہے

دل یہ کیا جانے کہ کیا شے ہے حرارت خون کی
جسم کیا سمجھے کہ کیسی زندگی کی لہر ہے

اے محبت! میں نزی بیتا ہوں کو کیا کروں
بڑھ کے چشمِ یار سے برہم مزاجِ دہر ہے

بھر رہا ہوں کس شراب درد سے جام غزل
روح میں مچلے ہوئے جذبات کی اک نہر ہے

زندگی سے بھاگ کر پرکاش میں جاؤں کہاں
گھر کے باہر قہر ہے اور گھر کے اندر زہر ہے

علیم صبا نویدی
۴۶۔ امیر النساء بیگم اسٹریٹ
ماؤنٹ روڈ
مدراس ۲۔۶۰۰۰۰

نیا آئینہ ہے سکندر نیا
زمانے کا ہر سو ہے منظر نیا

جسے فن کی آفاقیت چھو گئی
میں لایا تھا ایسا مقدر نیا

ستم خوردہ قسمت کا قصہ نہ پوچھ
چھتیں ہیں شکستہ تو گھر ہے نیا

یہ شیشہ بدن لوگ ڈر جائیں گے
جب آئے گا ہاتھوں میں پتھر نیا

صبا ڈھونڈ لو تم صدف در صدف
نویدی سا ہوگا نہ گوہر نیا

نیاز جیراج پوری
میڈیکل ہال، پہاڑ پور
گڑھ ۔ ۲۷۶۰۰۱ (یوپی)

تمہاری ہی عنایت سے

ی خوشیاں کہ میرے غم تمہاری ہی عنایت سے
ب خنداں و چشم نم تمہاری ہی عنایت سے
وشی کے مسکراتے رنگوں کی آغوش میں سوئے
رے یہ روز و شب برہم تمہاری ہی عنایت سے
یہ سناٹے جو میری روح کی خاموش وسعت میں
سنائی دیتے ہیں ہر دم تمہاری ہی عنایت سے
ہوائے قرب کے جھونکے، صدائے وصل کی خوشبو
جدائی کے سبھی موسم تمہاری ہی عنایت سے
سنبھلنے اور گرنے کا مسلسل سلسلہ جاری
بڑھے جاتے ہیں پھر بھی ہم تمہاری ہی عنایت سے
سلگتے ریگزاروں پر، جھلسے کوہساروں پر
برستے بھیگتے موسم تمہاری ہی عنایت سے
اداسی اور تنہائی کے اس تپتے بیاباں میں
ملہارے صدائے نم تمہاری ہی عنایت سے
ارگس کے ہونٹوں سے قصے ہجر کے سننا
یہ پھولوں کے یہ موسم تمہاری ہی عنایت سے
ہیل جسم و جاں پر دست تاریکی میں لہراتے
مالوں کے حسیں پرچم تمہاری ہی عنایت سے
ارے ذہن سے بہتے ہوئے تخلیق کے چشمے
یہ تمام سے پیہم تمہاری ہی عنایت سے
یار احساس خوشبوئے ہنر اس سے مخاطب ہے
ہ غور و فکر کا سنگم تمہاری ہی عنایت سے

طارق متین
لکھنیا بیگو سرائے (بہار)

کیا نام دوں اُسے جو مرے بھائیوں میں تھا
دشمن تھا میری جان کا بلوائیوں میں تھا

ہر شخص اپنی ذات میں گم تھا کچھ اس قدر
محفل کے درمیان بھی تنہائیوں میں تھا

چھائی ہوئی تھی چاروں طرف غم کی دھند سی
بے بس تھا میں خود اپنی ہی پسپائیوں میں تھا

مطلب نہ تھا کسی کو بھی اوروں کے حال سے
ہر شخص خود غرض تھا خود آرائیوں میں تھا

طارق میں دشمنوں سے عبث بدگماں رہا
میرا رفیق ہی مری رسوائیوں میں تھا

عقیل گیاوی
معرفت اد۔کے ٹیلرس
پرانا بازار دھنباد

کیسی ندی کی تہ میں اترنا پڑا مجھے
دامن دہکتی ریت سے بھرنا پڑا ہے مجھے

بہتر تھی اس سے خانہ بدوشی کی زندگی
جب گھر ہوا تو اور بکھرنا پڑا ہے مجھے

کوزوں میں تشنگی کی عبارت لیے ہوئے
ایک کربلا سے آج گزرنا پڑا ہے مجھے

جب بھی سنہرے خواب کا سورج ہوا طلوع
زینے سے روشنی کے اترنا پڑا ہے مجھے

اکثر تری تلاش میں اے صبح زندگی!
مخدوش راستوں سے گزرنا پڑا ہے مجھے

خورشید افسر بسوانی
بسواں۔ سیتاپور۔یوپی

مجھ کو یہ کہاں ہوش میں کس وقت کد
موسم کے پرندوں کی طرح میرا سفر

سب لوگ تہی دست تھے، دریا سے خفا
چپ میں بھی تھا لیکن مری مٹھی میں گہ

ہر چند مرے شہر کے سب لوگ دا
ہر شخص کے چہرے کا مگر رنگ دگر

پانی کہاں اس ریت کے میدان میں لی
دیکھا تو مرے پاؤں کے نیچے ہی بھنور

کرتا بھی تو کیا کرتا کوئی اپنا تحفـ
ہر شخص مرے شہر میں بے نیزہ سر

میں نے بھی نکالی ہے بہت ریت سے جا
اس دشت میں بالو کی طرح میرا ہنر

ممکن ہے زباں عمر کی سمجھتا ہو یہاں
لوگوں سے سنا ہے کہ یہ افسر کا نگر

رتب ۔
یم چشتی
مرفت پروفیسر عنوان چشتی
،،!!! جامعہ نگر، نئی دلی ۲۵

میکش اکبرآبادی

(ولادت ۱۹۰۲ء) (وفات ۱۹۹۱ء)

"میکش اکبرآبادی اردو زبان وادب کے ایک مخلص اور خاموش ادیب اور شاعر تھے۔
ہ ان میں اُنھوں نے دقیع کارنامے انجام دیے ہیں۔ اُن کے تین شعری مجموعے "میکدہ"، "حرف
ور" داستان شب" شائع ہو چکے ہیں۔ ایک نقاد اور ادیب کی حیثیت سے انھوں نے "نقد اقبال"
اقبال شناسی کا نیا دریچہ وا کیا تھا۔ ایک فعال صوفی کی حیثیت سے میکش اکبرآبادی نے سلسلہ
ہ اور چشتیہ کی تعلیمات کو عوام و خواص تک پہنچایا۔ میکش اکبرآبادی ایک سچے اور کھرے انسان بھی
۔ اس لیے اُنھوں نے انسانیت کی اعلا قدروں کے فروغ کے لیے خاص طور پر کام کیا۔
ہم عصروں میں اکثر ادیبوں اور شاعروں سے مرحوم کے پُرخلوص اور گہرے تعلقات تھے۔ تعلقات
ترام کرنا، انسانوں کی تالیفِ قلب کرنا، سچی اور کھری بات اس طرح کہنا کہ مخاطب کو بری نہ
اُن کے کردار کے نمایاں اوصاف تھے۔ یہ بات اکثر لوگوں کے علم میں نہیں کہ میکش اکبرآبادی
لی تھے اور انھوں نے ۱۹۱۹ء میں درسِ نظامی کی سندِ فراغت حاصل کی تھی۔
علامہ میکش اکبرآبادی کی وفات، ایک صوفی، عالم، شاعر، ادیب اور اعلا انسان کی وفات ہے۔
للہ و انا الیہ راجعون۔ تاریخ ادب و انسانیت اس خلا کو مدتوں پُر نہیں کر سکتی۔
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے " (ن، چ)

پروفیسر آل احمد سرور

"ہائے وہ میکش، وہ اپنے مے کدے کی آبرو"

"تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک"

محمد علی شاہ میکش اکبرآبادی بھی بالآخر ہم سے رخصت ہو گئے۔ ایک چراغ گُل ہو گیا۔ شعر و ادب
ایک ستون گر گیا۔ ہماری مشترک تہذیب کا ایک طرحدار اور شاندار نقش مٹ گیا۔ تصوف کا ایک رمز شناس

فارسی اور اردو ادب کا ایک عالم بے بدل، ایک خوش فکر اور خوش گو شاعر، ایک صاحب نظر نثر نگار،
ایک باغ و بہار شخصیت کا مالک، بزرگوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے، ادب کی بساط پر نو وارد
ہمت افزائی کرنے والا، آگرے کا عاشق، نظیر اکبر آبادی کے لغات کا محرم، انجمن ترقی اردو، آگرہ
جامعہ اردو اور ان گنت ادبی انجمنوں کا روح رواں، قدیم علوم کے بحر کا غواص، جدید دور
تقاضوں کا احساس رکھنے والا، وضع داری، شرافت اور اخلاق کا پیکر، فانی بدایونی، مانی جائسی
شاہ دلگیر، جوش، سیماب، یاس یگانہ، لطیف الدین احمد کا ہم نفس اور ہمدم، غرض اپنی ذات
سے ایک انجمن اور ایک ادارہ، قاموسی نظر رکھنے والا، خوش خو، خوش رو، خوش خلق، خوش
اوقات رند پارسا۔ وہ کیا رخصت ہوا کہ

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

میکش اکبر آبادی کئی سال سے فالج کی وجہ سے صاحب فراش تھے۔ کچھ عرصے سے غنودگی
سی رہتی تھی، آخر میں تو لوگوں کو پہچانتے بھی نہ تھے۔ انھوں نے غالباً نوے سال کی عمر پائی۔ زندگی،
تہذیب اور ادب کو کیا کچھ نہیں دے گئے۔ ہمارے شعر و ادب کی یہ آخری جید شخصیت تھے۔ ہماری
تہذیب کے چراغاں کی آخری شمع تھے۔ ادب کی بساط پر نئی گل کاریاں ہوتی رہیں گی، فکر و فن
نئے انداز سامنے آتے رہیں گے، زندگی اور ادب کی نئی بصیرت اور معرفت ہوگی مگر میکش۔
پیر مغاں اب کہاں دیکھنے میں آئیں گے۔

مجھے میکش اکبر آبادی سے کوئی ساٹھ برس سے مراسم تھے۔ میں جب سینٹ جانز
کالج میں پڑھتا تھا تو اُن کو ادبی صحبتوں میں دیکھا، میوہ کٹڑے میں اُن کے دولت کدے پر باریابی
حاضری دی اور جب اُن سے ملا تو ادب، تصوف، تہذیب اور فن کے متعلق بہت کچھ سیکھا۔
رفتہ رفتہ اُن سے مراسم بڑھے اور متعدد ملاقاتوں میں اُن کی شخصیت کی دلکشی، اُن کے طرح دار مزاج
ان کے خلوص اور محبت، اُن کی دلنوازی اور کسی کرنے کرن کی طرح دلوں میں اجالا کرنے کی صفت کا اندازہ
ہوا، اُن کے شعر سنے، انھیں اپنے شعر سنائے۔ اُن سے اردو میں تصوف پر ایک کتاب انجمن ترقی اردو
ہند کے لیے لکھوائی جس میں تصوف کی مختصر تاریخ کے ساتھ اردو کے صوفی شعرا کے کلام کا انتخاب
تصوف کی اُن اصطلاحوں کی تشریح ہے جو ہماری شاعری میں برتی گئی ہیں۔ اُن کی معرکہ آرا کتاب نقد اقبال
سے استفادہ کیا جس میں اقبال کے وحدت الوجود پر اعتراضات کا بڑا مدلل جواب ہے۔ نظیر کے
کلام میں ایسے درجنوں الفاظ پر اُن سے گفتگو کی جنھیں جاننے والے اب شاید ہی ملیں۔ انسان دوستی
کے آداب اُن سے سیکھے، اُن کے خطوں اور اشعار سے مسرت اور بصیرت کے کتنے لمحے ہاتھ آئے
افسوس وہ ساغر ٹوٹ ہی گیا۔ وہ پانی ملتان بہہ ہی گیا۔

میں کئی دفعہ میوہ کٹرہ میں اُن کے در دولت پر قیام کر چکا ہوں۔ وہ بھی جب علی گڑھ آتے
تو ملے بغیر نہ جاتے تھے۔ اُن کا دیوان خانہ بالائی منزل پر تھا۔ سڑک کے اُس پار، بالا نشینوں کے کمرے
تھے۔ میکش صاحب کو جب دیکھا سڑک کی طرف سے پشت کیے ہوئے دیکھا۔ اُن کی طبیعت میں سنجیدگی
ساتھ ایک شوخی بھی تھی۔ دوستوں اور ساتھیوں سے بے تکلف ہنستے بولتے اور شائستہ فقروں

ہو گئے۔ فانی، مانی، دلگیر، مخمور، مجنوں کے بہت سے دلچسپ واقعات انھوں نے سنائے تھے۔
تھوڑی سی ہکلاہٹ تھی مگر شعر پڑھنے میں کبھی اس کا احساس نہیں ہوا۔ ہر طرح کی نمود و نمائش
نیاز تھے۔ مزاج میں ایک درویشانہ بانکپن تھا۔ کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے۔ اُن کا یہ
ہوں نے ایک خط میں لکھا تھا بھولتا ہی نہیں۔

انتظار بھی تیرا دل کو ایک رحمت ہے
رات کٹ گئی اپنی دن گزر گیا اپنا

۱۹۵۳ء میں میں نے اُن کے متعلق یہ دو شعر کہے تھے۔ میرے مجموعہ کلام ذوق جنوں میں شامل

"آج میکش سے ملاقات میں محسوس ہوا
ہند میں صاحب عرفان ابھی باقی ہیں
لاکھ برباد سہی پھر بھی یہ ویراں تو نہیں
اس خرابے میں کچھ انسان ابھی باقی ہیں"

اس صاحب عرفان اور اس انسان کے اٹھ جانے سے اپنے خرابے میں ویرانی کا احساس
ہانے گا مگر وہ میکش جو ہمارے میکدے کی آبرو تھا۔ ہمارے دلوں میں ہمیشہ آباد رہے گا۔
ادب کی بساط پر اس کے نقش ہائے رنگ رنگ کو وقت کا ظالم ہاتھ بھی کبھی محو نہ کر سکے گا۔

بانی تاباں

موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے ایک اچھا اور سچا شاعر، نیک دل انسان، مخلص دوست اور
انی چھین لیا۔ میکش صاحب نے ہمیشہ گوشہ نشینی کی زندگی گزاری لیکن اُن کے دروازے
کے لیے کھلے رہتے تھے۔ آگرہ کے زمانہ قیام میں قریب قریب روز میں اُن کے یہاں حاضری
اتھا۔ میری حیثیت ہی کیا تھی۔ کالج کا ایک معمولی سا طالب علم لیکن ان کی محفل میں مجھے اپنی کم مائگی
اس کبھی نہیں ہوا نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتے اور بڑی دلچسپ گفتگو کرتے۔ یوں تو شاعری
ند میں کسی کا شاگرد ہوں نہ کوئی میرا شاگرد لیکن یہ واقعہ ہے کہ میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔
نے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

ڈاکٹر سیفی پریمی

تاثر بر وفات میکش اکبرآبادی

"ارض تاج" کے عوامی شاعر نظیر کو بھلایا نہیں جا سکتا۔
اب بتاریخ . . . . . میکش اکبرآبادی کی وفات نے عوام، دانشور اور اہل طریقت کے حلقوں میں غم
جدائی کا شدید احساس پیدا کر دیا ہے۔ انھیں بھلانا بھی آسان نہیں!
"میکش" تخلص ہے۔ اس کی سرخوشی معلوم! مگر معنویت کا جلوہ بھی دیکھیے۔

"بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید"

میکش اکبرآبادی کی دین، اُردو شاعری کا بلند معیار ہی نہیں۔ بلکہ انتقادی نقطۂ نظر بھی ہے۔"نقد اقبال" اُن کی لائق قدر تصنیف ہے۔ اس میں جاگیرداری عہد کے تصوف کی شاعری پر، روایتی COMMENTS سے انحراف اور شاہراہ طریقت کے بنیادی نکات اور اہم مقامات سے بحث کی گئی ہے۔

ملکش اکبرآبادی کی زندگی اور فکر و نظر میں فاصلہ کہاں تھا؟
عشق کا ارتقا اور انسانی سماج کی مودت کا پاکیزہ جذبہ، گلشن طریقت کے دو گل سرسبد۔ دراصل میکش اکبرآبادی اس صحت مند روایات اور نکھرے تمدن کے نمائندے تھے۔
ہمیں اُن کی تصانیف سے بہرہ مند ہونا چاہیے۔

اجمل اجملی

ڈاکٹر اجمل اجملی نے کہا

"عصرِ حاضر کو ماضی کی صحت مند روایات سے جوڑنے والی ایک اور وقیع اور شاندار ادبی و تہذیبی کڑی جناب میکش اکبرآبادی کی موت کے ساتھ ٹوٹ گئی۔ مولانا ہمارے اُن بزرگوں میں تھے جن کے درِ دولت پر حاضری ہم جیسے لوگ اپنے لیے باعث سعادت جانتے تھے۔ تقریباً دس سال پہلے کا ذکر ہے، میرے ایک نوجوان دوست ڈاکٹر علی احمد فاطمی آگرہ میں سینٹ جانس کالج میں اردو کے لکچرر منتخب ہوئے تو اس حوالے سے کئی بار آگرہ آنے جانے کا موقع ملا۔ مجھے آج بھی احساس ہے کہ آگرہ پہنچ کر جو تین چار جذبے ایک ساتھ سر اٹھاتے تھے اُن میں تاج محل دیکھنے، نظیر اکبرآبادی کی ابدی آرام گاہ پر حاضری نے اور مولانا میکش اکبرآبادی سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کے جذبات قابلِ ذکر ہیں۔ غور کیجیے تو تاج محل کا تہذیبی اتصال نظیر اکبرآبادی کا قلندرانہ مزاج اور مولانا میکش اکبرآبادی کی بے نیاز شخصیت کے پسِ پشت ایک معنوی ربط سا لہراتا محسوس ہوگا۔ اُن کی شخصیت میں تاج محل جیسی ہم آہنگی نظیر اکبرآبادی جیسی انسان دوستی اور تصوف کی وہ اعلا قدریں جمع ہوگئی تھیں جنھوں نے ایک عرصے تک مشرقی معاشرے کو فکری پس منظر فراہم کیا۔ مولانا کے پاس بیٹھیے تو لگتا تھا کہ علمیت و شرافت کا نور اُن کے بدن سے چھن چھن کر ارد گرد کی فضا کو جگمگا رہا ہے۔ اُن سے گفتگو کیجیے تو علم و عرفان کے پردے اُٹھتے محسوس ہوتے تھے۔ البتہ یہ اشتیاق ہی رہ گیا کہ کبھی اُن کی زبانی اُن کا کوئی شعر سننے کا موقع ملتا۔ دراصل اُن کی باتوں میں اتنا مزہ تھا کہ شعر سننے کی فرمایش ایک گناہ محسوس ہوتی تھی۔ اس کا افسوس ہے کہ دھیرے دھیرے ماضی کے یہ خوبصورت نمونے ہماری نگاہوں سے معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ابھی ہماری نئی تہذیب اس منزل پر نہیں پہنچی ہے کہ جہاں پھٹک بعد شخصیت کے ایسے جواہر ریزوں سے ہمارے معاشرے کا دامن مالا مال کر سکے۔ لیکن بقول شاعر۔

موت سے کس کو رست گاری ہے
آج تم کل ہماری باری ہے

موت بھی زندگی کی طرح ایک حقیقت ہے اور کسی نہ کسی لمحہ ہم سب کو اس حقیقت سے نگاہیں دوچار کرنی ہی پڑیں گی۔"

پروفیسر عنوان چشتی نے کہا

"میکش اکبرآبادی مشرقی تہذیب، ادب اور تصوف کا ایک ایسا روشن ستارہ تھے، جس کے غروب ہونے سے زندگی کے کئی گوشوں میں تاریکی پھیل گئی ہے۔ میکش صاحب نے ۱۹۰۲ء میں اس عالم رنگ و بو میں آنکھ کھولی۔ اور ۱۹۹۱ء میں داعئ اجل کو لبیک کہا۔ اس طرح انھوں نے ۸۹ برس تک اپنے خونِ جگر سے علم و تصوف اور ادب و تہذیب کی آبیاری کی ہے۔ میکش اکبرآبادی کا خاندان صدیوں سے ادب اور تصوف کا گہوارہ ہے۔ اُن کی شخصیت میں سلسلۂ قادریہ کی ثقافت اور سلسلۂ چشتیہ کی محبت مجسم ہوگئی تھی۔ ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے میکش اکبرآبادی نے "میکدہ" "حرفِ تمنا اور" داستانِ شب" جیسے یادگار مجموعے چھوڑے ہیں۔ اُن کی شاعری میں وحدۃ الوجودی افکار اور تہذیبی اقدار کے علاوہ ایک سچے اور کھرے انسان کے ذہنی وضمیر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ایک بالغ نظر نقاد کی حیثیت سے انھوں نے "نقدِ اقبال" اور مسائلِ تصوف تصنیف کر کے اقبال شناسی اور تصوف آگہی کا تابناک ثبوت فراہم کیا ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے علامہ میکش اکبرآبادی کو ۱۷ سال کی عمر یعنی ۱۹۹۹ء میں درسِ نظامی کی تکمیل پر دستارِ فضیلت حاصل ہوگئی تھی۔ اس ضمن میں انھوں نے "شرک و توحید"، "نغمہ اور اسلام" نیز غوث الاعظم تصنیف کر کے مذہب کے دائرے میں اپنے لچک دار وسیع اور اجتہادی نقطۂ نظر کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ علامہ میکش اکبرآبادی ایک بہترین ادیب و شاعر ہی نہ تھے، بلکہ ایک سچے صوفی اور ایک اچھے انسان بھی تھے۔ وسیع النظری، رواداری، دل جوئی، تواضع انکسار اور بُردباری اُن کے مزاج کی خصوصیات تھیں۔ آگرے میں دو چیزیں یادگار سمجھی جاتی تھیں۔ ایک تاج محل اور دوسرے میکش اکبرآبادی۔ افسوس کہ یہ یادگار زمانہ شخصیت اب ہمارے درمیان نہیں ہے۔ میں علامہ میکش اکبرآبادی کو مرحوم کے اس شعر کے ساتھ نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

جو فرشِ گل پر سو نہ سکا جو ہنس نہ سکا جو رو نہ سکا
اس خاک پہ اُس شوریدہ سر نے آخر آج آرام کیا

شعری مجموعے

جن کی صرف ایک ایک، دو دو کتابیں اسٹاک میں موجود ہیں۔

کتاب	مصنف	قیمت
ارج	ذکی ٹھاکور	۳/۵۰
ارمان نبیؐ	ارمان قادری	۱/۲۵
آئینہ اخلاق	خواجہ دل محمد	۱۰/-
آتشیں	نسیم آروی	۳/۵۰
آتش پارے	سرفراز افسر	/۵۰
ایک ہی رنگ لہو کا	شرر فتح پوری	۱۵/-
ارمغان آلام	سید محمود	۲۰/-
اشعار اکبر	مرتب سید حسن	۱۶/-
ادبی نمونے	ضمیر الدین قریشی	۱/۵۰
انوار فارسی	سید جلال الدین	۲/۷۵
اثاثہ منصور	سید نذر الحسن قادری	۶/-
انتخاب کلام ظفر	مرتب عتیق رحمانی	۷/-
بزم خیال	سیدہ فرحت	۱/-
آہنگ خیال	حیات وارثی	۵/-
امواج تغزل	سید محمد ظفر اشک	۸/-
آبشار (رباعیات)	محوی صدیقی لکھنوی	۴/-
آئینہ غزل	ساجد صدیقی لکھنوی	۶/-
آبگینہ	حفیظ مالیگانوی	۲/۵۰
آتش خاموش	مطرب نظامی	۵/-
احساس کی صلیب	رابعہ سلطانہ ناشاد	۱۰/-
انجمن در انجمن	صاحب حیدرآبادی	۸/۵۰
اردو ہے جس کا نام	ضیا بانی	۶/-
انوار سحر	دنگر راود شماکھ	۱۰/-
انتخاب کلام جمیل	ڈاکٹر محمد مثنیٰ	۳/-
ارمغان حرم	عبدالرحمٰن محسن انصاری	۴/-
انتخاب مومن	مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی	۳/-
افکار سوداگر	عبدالقادر سوداگر	۲۰/-
اردو کے مسیحی شعرا	ڈی۔ اے۔ ہیریسن قربان	۱۵/-
اردو میں ہندستانی شاعری	ڈاکٹر جعفر حسن ایم	۴/-
اجنبی پرندے	اسلم عمادی	۱۰/-
احساس کی صلیب	فریدہ لیشا آزاد فاروق	۲/-
اوتار	دیپک قمر	۴۰/-
ارد ھانگنی کے نام	کمار پاشی	۲۵/-
انامل	راہی فدائی	۳/-
ارمغان شیدا	مرزا کمال الدین شیدا	۳۵/-
انتخاب غزلیات فرہنگ	مغیث الدین فریدی	۶/-
آنگن آنگن	ظفر حبیب	۱۲/-
الہاتِ مست	دینا ناتھ مست کشمیری	۳۵/-
انگبین	قیصر زیدی	۲۰/-
ایک سو غزلیں	عتیق اللہ	۸/-
ابر معنے	قادر صدیقی	۲۰/-
آواز	معین ادیبی	۱۰/-
آواز کی پرچھائیاں	کرشن ادیب	۱۵/-
انحراف	یعقوب راہی	۵/-
آبلے	مدہوش بلگرامی	۳/-
آب ورنگ	جگدیش سہائے سکسینہ	۶/-
اک چراغ اور	دھرم پال عاقل	۳۵/-
آئینہ وطن	ضیا حانی	۱۰/-
انمول	دیپک قمر	۴۰/-
آسمان کا پیرہن	یوسف اعظمی	۲۰/-
اعراض	رئیس مالیگانوی	۱۰/-

(باقی آئندہ)

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی نمبر۳

غلام ربانی تاباں
ذاکر نگر جامعہ نگر
نئی دہلی ۲۵

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پڑھا گیا

سیکولرازم کا تحفظ اور دانش ور

ریاست سے مذہب کی علٰحدگی کی مانگ تمام متمدن اقوام میں پائی جاتی ہے کہ آج کے دور میں مذہبی حکومت زسودہ تصور لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ ہماری تحریک آزادی نے ایک مضبوط سیکولر تحریک کی شاندار ثال دنیا کے سامنے پیش کی۔ یہ تحریک کسی مذہبی یا نسلی گروہ کے بجائے پوری ہندستانی قوم کی تحریک تھی بں میں مختلف مذاہب کے ماننے والے شریک تھے۔ ہندستان کا شمار ان تھوڑے سے ملکوں میں ہوتا ہے ہاں قریب قریب دنیا کے ہر مذہب کے ماننے والے خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے ملک کی قومی تحریک کو لازمی طور سے سیکولر ہونا چاہیے تھا۔ ہماری قومی تحریک کے ایک مجاہد مولانا ابوالکلام آزاد نے بڑے واضح الفاظ میں اپنا خیال ظاہر کیا ہے "ہم میں اگر ایسے دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کے ہندو زندگی کو واپس لائیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں جو کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی گزری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو اُن سے بھی کہوں گا کہ وہ اس خواب سے جلد بیدار ہو جائیں تو بہتر ہے کیوں کہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی سر زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔" مولانا نے اس طرح سیکولرازم کی تصدیق کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک جگہ کہا ہے: "یہ کہنا حقیقت پسندی کے منافی ہے کہ جادو کے ڈنڈے یا محض نیک خواہشات سے دنیا کو تکالیف، مناقشات اور تکالیف سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ بات حقیقت پسندی کے عین مطابق ہے کہ ایسا راستہ اختیار کرنے کی سفارش کی جائے جو اُن کو ختم کر دے یا کم از کم اُن کے امکانات کو کم کر دے"۔ اور ظاہر ہے کہ وہ راستہ تھا سیکولرازم کا جس پر ہماری تحریک آزادی گامزن رہی۔

طویل جدوجہد کے بعد ہم نے بالآخر آزادی حاصل کر لی۔ لیکن اپنے سیکولر کردار کو برقرار رکھنے کی ہمیں بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ سامراجیوں نے ہمارے ملک کے ٹکڑے کر دیے۔ لیکن جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کہا "ہندستان کے لیے قدرت کا فیصلہ ہو چکا تھا کہ اُس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، تہذیبوں اور مذہبوں کے قافلوں کی منزل ہے۔" اس لیے ضروری تھا کہ اس کا سیاسی نظام سیکولر ہو۔ آزاد ہندستان کے آئین نے ہندستان کو سوشلسٹ، سیکولر جمہوریہ قرار دیا۔ ان میں اہم ترین قدر ہے سیکولرازم جس کے بغیر سوشلزم اور جمہوریت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہندستان کے لیے سیکولر جمہوریت

کا انتخاب کرکے ہمارے رہنماؤں نے سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا جو بیدار مغز اور پختہ کار تھے۔ لیکن ادھر کچھ
ہمارے چند رہنماؤں نے سیکولرازم کی تشریح و توضیح کچھ اس طرح کی ہے کہ اُس نے ہمارے ذہنوں میں اُ
کے تعلق سے شکوک و شبہات پیدا کر دیے ہیں جن کو دور کرنا ضروری ہے۔ یورپ کے قرون وسطیٰ میں سیکو
کے معنی تھے "اس دنیا سے تعلق رکھنے والے معاملات و اشیا"۔ لیکن وقت کے ساتھ سیکولرازم کے معنی بد
سائنس سیکولرازم کا تصور مقابلتاً جدید ہے اور اُس کے معنی ہیں مذہب کی سیاست اور ریاست سے مکمل
ان حضرات نے سیکولرازم کو سرو دھرم سمبھاؤ کے مترادف تعبیر کرکے اُس کے پورے تصور کو مسخ کر دیا ہے
سرو دھرم سمبھاؤ کو رواداری تو کہا جا سکتا ہے لیکن وہ سیکولرازم نہیں۔ رواداری کی تعلیم ہمارے صوفی
نے ہی دی ہے جن کی خانقاہیں اور آشرم تمام مذاہب کے ماننے والوں کے لیے کھلی رہتی تھیں اور جو مذ
منافرت کے بجائے مساوات اور بھائی چارے کا درس دیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ رواداری شر
اور انسان دوستی پر مبنی تصور ہے جس کی زیادہ سے زیادہ قدر کی جانی چاہیے اور اپنی زندگیوں کو اُس
مطابق ڈھالنے کی ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ کسی مذہب یا مذہبی گروہ سے نفرت صرف وہ کر سکتا
جو تہذیب کی اعلا قدروں سے نفرت کرے اور متمدن کہلانے کا اہل نہ ہو۔

اس میں شک نہیں کہ سرو دھرم سمبھاؤ یا رواداری سیکولرازم کا لازمی جزو ہے لیکن جیسا کہ میں پ
عرض کر چکا ہوں وہ سیکولرازم نہیں۔ سیکولرازم تمام مذاہب کا مساوی احترام کرتا ہے لیکن اُس کے سا
مطالبہ بھی کرتا ہے کہ مذہب کو ریاست سے علاحدہ رکھا جائے۔ آج کے سائنسی اور ٹکنالوجیکل ترقی کے دور
یہ ضروری ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اُن ممالک میں جہاں بہت سے مذاہب پائے جاتے ہیں اگر مذہب کو ریا
سے علاحدہ نہ رکھا جائے تو کوئی نہ کوئی مذہب دوسرے مذاہب پر غلبہ حاصل کر لے گا جس سے باہمی ٹکراؤ کی
پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سے بچنے کا واحد طریقہ ہے سائنسی سیکولرازم۔

ہمارے کچھ رہنماؤں کا خیال ہے کہ سیکولرازم غیر مذہبی اور اُس کے نتیجے میں ہندستان کے لیے ا
قبول تصور ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیکولرازم مذہب کی نفی نہیں کرتا ہے اُس کا محض اتنا تقاضا ہے کہ ر
کا کوئی مذہب نہیں ہونا چاہیے۔ سیکولر سماج میں ہر شہری کو ناقابل تنسیخ حق حاصل ہوتا ہے کسی بھی مذہب
قبول یا رد کرنے اور آزادی کے ساتھ اپنے مذہب کے ارکان و فرائض ادا کرنے کا۔ شہریوں کا یہ بنیادی
ہے جن سے انھیں محروم نہیں کیا جا سکتا۔ سیکولرازم کو مذہب کے منافی صرف وہ لوگ کہہ سکتے ہیں جن
مفادات پر اس سے چوٹ پڑتی ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سیکولرازم ایک بدیسی تصور ہے۔ لیکن قومیت، جمہوریت، سوشلزم اور ا
قسم کے بہت سے دوسرے تصور بھی تو بدیسی ہیں۔ اگر ہم انھیں قبول کر سکتے ہیں تو سیکولرازم کو قبول کر
کیا قباحت ہے۔ پھر اس قسم کا لین دین تو صدیوں سے جاری ہے۔ اگر ہم نے مغرب سے کچھ جدید تصورات و ن
لیے ہیں تو مغرب نے بھی ہم سے بہت کچھ پایا ہے۔ دنیا کے تمام عظیم مذاہب مشرق کی دین ہیں۔ اس کے علا
بھی مغرب نے ہم سے بہت سے علوم سیکھے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ کوئی تصور دیسی ہے یا بدیسی۔ ہمیں اس تنگ
سے بالاتر ہو کر دیکھنا ہے کہ وہ ہمارے لیے کس حد تک مفید ہے۔

ہم نے آزاد ہندستان کے تعلق سے کیا کیا خواب دیکھے تھے۔ اُن میں سے کچھ پورے بھی ہوئے۔

..کے بعد کے بیالیس برسوں میں ہم نے خاصی ترقی کی ہے۔ غذا کی اجناس کی پیداوار میں ہم خودکفیل ہو چکے ہیں۔ یہ ..ہمارے سائنس دانوں کی انتھک محنت کا۔ صنعتی اعتبار سے ہمارا شمار اُن ملکوں میں ہونے لگا ہے جہاں ..ساتھ ترقی ہوئی ہے۔ ناوابستگی کی تحریک نے، جس کے معماروں میں پنڈت نہرو شامل تھے، عالمی امن ..میں بڑا مثبت رول ادا کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ملک کے اندر خلفشار بڑھتا جا رہا ہے۔ فرقہ پرستی ..ی کا زہر تیزی سے پھیل رہا ہے، بنیاد پرستی اور احیا پسندی سماجی ساخت کے تار و پود بکھیر رہی ..سماجی رشتوں کی شکست و ریخت ہو رہی ہے۔ ان جارحانہ رجحانات کے بڑھنے کی ذمے داری اُن حلقوں ..جنھوں نے سیکولرازم کے تصور کو مسخ کر کے رجعت پرستی سے سمجھوتا کیا۔

اس تاریکی میں روشنی کی کرن ہیں ہمارے عوام — ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور دوسرے عام لوگ — ..روزی روٹی کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اُن کے دل اور دماغ نفرت او تعصب کے زہر سے پاک ہیں۔ لیکن ..اور عصری مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت کی کمی کی بنا پر بڑی آسانی سے انھیں مذہب کے نام پر گمراہ کیا جا سکتا ..جس کے مظاہر نہ صرف کشمیر اور پنجاب بلکہ آسام، بھاگل پور، بدایوں اور گجرات میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس ..صورت حال نے ہمارے سیکولر جمہوری نظام کے لیے بڑا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔

یوں تو ہمارے ملک میں سیکولر عناصر کی کمی نہیں لیکن بدقسمتی سے اُن میں بکھراؤ ہے۔ اپنی اپنی جگہ ..وہ سب اس صورت حال سے پریشان ہیں لیکن اُن کی سیاسی مصلحتیں مانع آتی ہیں۔ انتشار پسند طاقتوں کے ..خلاف مشترکہ موثر اقدام کرنے میں۔ اگر سیکولر طاقتیں اپنے اختلافات کو بھلا کر انتشار کی سیاسی طاقتوں کا متحدہ ..مقابلہ کریں تو انھیں آسانی سے شکست دی جا سکتی ہے اور ملک کو عدم استحکام کے خطرے سے بچایا جا سکتا ہے۔ ..لیکن اس سلسلے میں سیکولر عناصر کی بے عملی کی بنا پر حالات تیزی کے ساتھ خراب تر ہوتے جا رہے ہیں جس کی بنا پر ملک ..کے سیکولر جمہوری نظام کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر اس نظام پر آنچ آئی تو ملک کا استحکام و سالمیت بھی محفوظ نہ ..رہ سکیں گے۔ اس وقت ہمارے ملک کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُن میں اہم ترین ہے سیکولر جمہوری ..نظام کا تحفظ۔

ملک میں سیکولرازم پر کئی طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ کشمیر، پنجاب اور آسام کے دہشت پسند ہوں یا فرقہ ..پرست سب کا مقصد واحد ہے۔ دونوں ہمارے سیکولر جمہوری نظام کی بیخ کنی کے درپے ہیں۔ اس سلسلے ..میں ملک کے سبھی لوگوں اور خصوصیت سے دانش وروں پر خصوصی ذمے داری عاید ہوتی ہے۔ سیکولرازم کے دفاع ..کے لیے کشمیر، پنجاب اور آسام میں بھی جدوجہد کرنی ہوگی اور ایودھیا کی طرح کے اُن مقامات پر بھی جہاں فرقہ پرست ..اور وطن دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ لڑائی طویل بھی ہوگی اور شدید بھی۔ لیکن یہ ایک تاریخی ذمے داری ہے ..جس سے ہمارے عوام بچ سکتے ہیں نہ دانش ور۔ جبکہ ہمارا ملک نفرت اور تشدد کی آگ میں جل رہا ہے، ہماری ..خاموشی انسانیت کے خلاف ایک ناقابل معافی جرم قرار پائے گی۔ پہلے بھی اسی قسم کے بحرانی حالات کا مقابلہ ..کرنے میں دانش ور ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ اس وقت جبکہ اعلا انسانی اقدار اور تہذیبی سرمایے کے ساتھ ..ملک کا مستقبل بھی خطرے میں ہے جرأت و ہمت کے ساتھ اپنا فرض ادا کرنا چاہیے تاکہ کل کا مورخ یہ نہ ..کہہ سکے کہ جب ملک پر وقت پڑا تو دانش وروں نے اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی۔
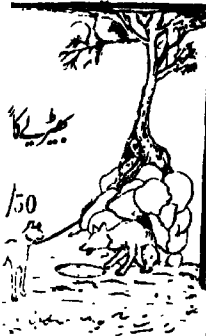
ایرینا میکسیمینکو
[illegible]، ماسکو ریڈیو، ماسکو

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پڑھا گیا

ادب کی بدلتی ہوئی قدریں

لوگوں کو ادب اور فنون کی ضرورت کیوں ہے اور ادب کا آخر کار مقصد کیا ہے؟ یہ ایک ابدی سوال ہے جدید دور کے ایک سوویت مصنف نے لکھا ہے کہ "ایسا سوچنا سیدھا پن ہوگا کہ اپنی تصانیف کے ذریعہ آپ دنیا میں خوشگوار تبدیلیاں لا سکتے ہیں لیکن اس پر بھروسا کیے بغیر لکھنا بھی ناممکن ہے۔ ادب روحانیت کا سرچشمہ، مسرتوں، دکھ درد سے بھرا ہوا پیالہ ہے۔ وہ زندگی کی سچائی کو پڑھنے والے تک پہنچاتا ہے۔ ادب کسی نہ کسی انداز میں معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ آج کل میرا ملک گہری تبدیلیوں سے گزر رہا ہے یہ تعمیر نو، جمہوریت کاری، عام صاف بیانی، کھلے پن اور عام انسانی اقدار رائج ہونے کا دور ہے جو ایک اعتبار سے انقلابی دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ سماجی و معاشی زندگی میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی لازماً تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ میں ان بعض تبدیلیوں پر آپ کی توجہ دلانے کی کوشش کروں گی جو میرے نزدیک سب سے نمایاں اور اہم ہیں۔

اوّل یہ کہ ادب کا سیاسی رجحان بڑھ رہا ہے۔ مصنفین نئے زور و شور سے اٹھتے ہوئے سماجی و معاشی مسائل پر زیادہ دھیان دینے لگے ہیں کئی نمایاں مصنفین ادبی تخلیقات کے بجائے صحافت کی جانب متوجہ ہو گئے ہیں کیونکہ آج ملک کو درپیش مسائل اس حد تک فوری اور نازک ہیں کہ سچا فن کار ان پر توجہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتا ان میں ماحولیاتی، اخلاقی اور ان سے گہری طور پر وابستہ سماجی و معاشی مسائل ہیں۔ پھر تعمیر نو کی بدولت تازہ ہوا کا جو جھونکا آیا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی تبدیلیاں اس حد تک تیز رفتار ہیں کہ فن کار کو ان پر غور کرنے کے لیے وقت مشکل ہی سے ملتا ہے جب کہ ادبی تخلیقات کی شکل میں ان کی عکاسی کرنے میں نسبتاً کہیں زیادہ وقت درکار ہے اگرچہ وہ سب فوری حل کے طلب گار مسائل ہیں۔

سوویت ادب کی موجودہ صورت حال کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ آج روسی ادب میں ایک سیلاب امڈ رہا ہے اس سیلاب میں وہ اہم اور عظیم تخلیقات شامل ہیں جن کو کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے یہاں شائع کرنے کی اجازت نہیں تھی، اب ان کی اشاعت ادبی رسالوں میں شروع ہو گئی ہے اور موجودہ نسل سوویت قارئین کی پہلی نسل ہے جو ادبی عمل کے اس انوکھے منظر سے دوچار ہو رہی ہے۔ اشاعت کے اس سلسلے کی ابتدا دو تین سال قبل ہی ہوئی ہے۔ اِن میں اولیت اُن روسی ادیبوں کی تصانیف کو حاصل ہے جو غیر ممالک میں قیام پذیر ہیں۔ اِن کے بعد وہ ادیب ہیں جن کی تصانیف ہمارے ملک کے سیاسی حالات کی وجہ سے سامنے نہیں آ سکی تھیں، اِن ادیبوں نے سوویت نظر بند کیمپ کے حالات کی تصویر کشی کی ہے تیسرے وہ شہرۂ آفاق مصنفین ہیں جن کی اگرچہ بعض تصانیف سے ہم پہلے ہی واقف تھے لیکن ان کی کچھ تخلیقات کو پسِ پردہ رکھا گیا تھا۔

مثلاً ناول ڈاکٹر ژیواگو کو حال ہی میں اپنے ملک میں شائع ہونے کا موقع ملا ہے۔ گذشتہ ستر سال (ا) میں ایسا نہیں کہ کوئی قابلِ ذکر تصنیف تخلیق نہ ہوئی ہو۔ میرے نزدیک اس طرح کی رائے انتہا پسندی اور بے انصافی ہے "خاموش دون" اور اس طرح کی کئی دوسری تصانیف مثال کے لیے پیش کی جا سکتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب زندگی سے ہمیشہ سرشار ہوتا ہے اور ادب اور زندگی کو بھی کٹر عقیدوں کے تنگ دائرے میں محدود رکھنے کی کوشش کبھی پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتی ہے، دوسری بات یہ کہ آج کہ یہ ساری تخلیقات ہمارے ادب کے دھارے میں شامل ہو کر اس کے خزانے کا شاندار نامیاتی جزو بن گئیں تو تنقیدی معیار بدل رہا ہے۔ سارے ادب کا نئے سرے سے جائزہ لینے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔

سوویت ادب کی موجودہ صورتِ حال کی تیسری خصوصیت میرے نزدیک سماجی نفسیات پر خاص توجہ دینے کا رجحان ہے۔ اس رجحان کے مصنفین نے اپنی تصانیف میں سماجی حالات کے پیشِ نظر انسان کی نفسیات کا خاص طور سے تجزیہ کیا ہے۔

آج کل ہمارے ادب میں خستہ حالی افراد اور کچلی ہوئی روح کو بھی اس طرح دکھایا جاتا ہے کہ یہ بیجا! قارئین کو شاک لگاتی ہے۔ میں اس کو سماجیاتی علاج کا ایک طریقہ سمجھتی ہوں جس کو مصنف شعوری یا غیر شعوری طور پر استعمال کرتا ہے۔ جہاں تک سوویت ادب کی موجودہ صورتِ حال کا تعلق ہے تو اس میں ایک اندیشہ بھی ہے میرا مطلب اخلاق کے قواعد کو کچھ حد تک نظر انداز کرنے میں اس غیر معمولی آزادی سے ہے جو اچانک تمام پابندیاں ہٹانے کے سبب پیدا ہو گئی ہے، اس کے نتیجہ میں بعض فن کار خود کو فروخت کر رہے ہیں اور پیسے کی خاطر ایسے موضوعات پر لکھ رہے ہیں جن پر قلم اٹھانا پہلے منع تھا مگر ایسا کرتے ہوئے گہرے خیالات و افکار اور سچے جذبات کے لیے ان کی تخلیقات میں گنجائش نہیں رہ جاتی ہے۔ اس خطرے سے دوسرے فنون (یعنی فلم، تھیٹر اور مصوری) کے مقابلے میں ادب ابھی تک سب سے کم متاثر ہوا ہے لیکن سچ پوچھیے تو ادب کے سلسلے میں بھی ایسا اندیشہ آج کے نازک اور مسائل سے بھرپور دور میں موجود ہے جو مایوسی محسوس ہو رہی وہ جھگڑوں، سخت بحثوں اور عدم رواداری کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے، دل خفگی اور غصے سے بھر جاتے ہیں۔ لیکن لگتا ہے یہ دکھ بھی ہے اور غم بھی۔ ہمارے یہاں فرسودہ کٹر عقیدوں کے شکنجے سے، چھٹکارا پانے والے ان کی چار دیواری سے آزاد ہونے والے لوگ کبھی کبھار اپنے کو غیر محفوظ اور تنہا بھی محسوس کرتے ہیں اور اس طرح شاید ہندوستان میں بھی متوسط طبقے یا جاگیر دارانہ نظام خاندان اپنے قصبے سے تعلق توڑنے والے لوگوں کو بھی تنہائی کا احساس ہوتا ہے اور کسی گاؤں سے آئے ہوئے کسان جو کناٹ پلیس پر بڑے ہوٹلوں کی تعمیر کر رہے ہیں، نہ صرف غیر محفوظ اور تنہا ہیں بلکہ صحیح معنوں میں بے گھر بھی ہیں۔ دکھ درد اور تنہائی کا احساس انسان کو اپنے جذبات کی شدت میں اندھا کر دیتا ہے لیکن اپنے پر قابو پانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے بغیر آگے بڑھنا ناممکن ہو گا۔ شاید غیر محفوظ ہونے کا احساس اور جہالت ان فسادات کا سبب بن سکتا ہے۔ جو دنیا میں جگہ جگہ مذہبی یا دوسری وجہ سے بھڑک اٹھتے ہیں حالانکہ اقبال نے کہا ہے

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

انسان پسندی فن کار کا اصلی مذہب ہے۔ گاندھی جی نے کہا تھا "جب اندیشہ بڑھ رہا ہے چراغ جلانا چاہیئے تو سب سے پہلے اپنے سینے میں اپنے دل میں شمع جلانے کی ضرورت ہے۔"

اصلی فن کار مصیبتوں بھری اس دنیا میں تنہائی محسوس کرنے والے انسان کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

مشہور ادیب بننے کا ایک آزمودہ پلان!

پچھلے سال کا ذکر ہے۔ ایک دوپہر میں دفتر میں سر جھکائے اپنے کام میں مصروف تھا کہ دروازے پر آہٹ
ہوئی۔ دیکھا ایک نوجوان بغل میں دو ایک کتابیں دبائے کھڑا ہے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے اپنا
تعارف کرایا، جس سے معلوم ہوا کہ وہ ایک نو آموز ادیب ہے۔ اور مستقبل میں ایک بڑا ادیب بننے کا خواب دیکھ
رہا ہے۔

"فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں آپ کے انٹرویوز بہت شوق سے پڑھتا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ میرا بھی ایک انٹرویو
لیں، میں ادبی مسائل پر بعض بہت چونکا دینے والی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔"

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ کوئی مضمون لکھیں، جس میں اپنے ان سنسنی خیز خیالات کا اظہار فرمائیں؟"

"مضمون کون پڑھے گا۔ دو ڈھائی تو ادبی رسائل ہیں، جن کے قارئین انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں اور
میں جو باتیں کہنا چاہتا ہوں اس کے لیے انٹرویو ہی کی صنف موزوں ہے۔ کیونکہ اس میں آپ مجھ سے بحث
مباحثہ بھی کریں گے۔ یقین مانیے میرے پاس آپ کے ہر سوال کا جواب پیشگی تیار ہے۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یہ اخبار کا دفتر ہے، کوئی بیکری نہیں جہاں آرڈر پر کیک تیار کیے جاتے
ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے کہ آپ انٹرویو لیتے ہیں، کیک نہیں بیچتے، لیکن بات یہ ہے کہ میں ادب میں کارہائے نمایاں
انجام دینا چاہتا ہوں، اور اس کے لیے مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔ آپ کا انٹرویو میرے ادبی مستقبل کے لیے نیک
شگون ثابت ہو سکتا ہے۔"

"لیکن ابھی تو آپ نے ادبی دنیا میں قدم بھی نہیں رکھا ہے۔ آپ کی نہ کوئی تصنیف ہے اور نہ کوئی کام آخر
میں کس حوالے سے آپ کا انٹرویو لوں"

"ادیب بننے کے لیے صاحبِ تصنیف ہونا ضروری تو نہیں۔ میں آپ کو کئی ایسے ادیبوں کے نام گنوا سکتا
ہوں، جن کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ اور جنھوں نے ادب میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ لیکن جن کے اخبارات

میں انٹرویوز چھپتے ہیں اور جن کے ساتھ شامیں منائی جاتی ہیں۔"

یقیناً ایسے ادیب بھی ہوں گے، لیکن آپ کو ایسے ادیبوں کو اپنے لیے مثال نہیں بنانا چاہیے کیونکہ اس طرح آپ بہت جلد اپنی موت آپ مرجائیں گے۔"

"ادب کی دنیا میں ابھی تو میں تولد بھی نہیں ہوا۔ آپ نے مرنے کی باتیں شروع کردیں۔ میں آپ سے پھر استدعا کرتا ہوں کہ میری درخواست پر غور فرمائیں۔"

"دیکھیے آپ مجھے بہت عجلت میں لگتے ہیں اور ادب میں عجلت پسندی نہایت مہلک ثابت ہوئی ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اپنی ترجیح پر غور کریں کہ آپ کس قسم کے ادیب بننا چاہتے ہیں۔ کیا ایسا ادیب جو پڑھنے والوں کے دل میں رہتا ہے۔ یا ایسا جو سستی شہرت حاصل کرکے پڑھنے والوں کے حواس پر مسلط رہنا چاہتا ہے۔"

"میری ترجیح بہت واضح ہے۔ میں آپ کے پاس آیا ہی اس لیے ہوں کہ میں ایک مشہور ادیب بننا چاہتا ہوں۔"

"آپ کو شہرت ہی کمانا ہے تو اس کے اور بھی ذرائع ہیں۔"

"مثلاً"!

"مثلاً آپ کسی مشہور شخصیت پر قاتلانہ حملہ کردیں۔"

"اس میں سزا ہو سکتی ہے۔"

"تو پھر موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانا شروع کردیں۔"

"کراچی کی سڑکوں پر روزانہ موٹر سائیکل سوار یہی کرتے ہیں، کوئی اور طریقہ بتائیں۔"

"پیدل دنیا کے گرد سات چکر لگانے کا اعلان کردیں۔"

"کیا آپ کو میں عقل سے پیدل نظر آتا ہوں، جو ایسا مشورہ دے رہے ہیں۔"

"آپ خود ہی سوچ لیجیے، شہرت حاصل کرنے کا کوئی نہ کوئی نسخہ مل ہی جائے گا۔"

"ادیب بننے سے زیادہ آسان نسخہ کوئی اور نہیں۔ میں خوب غور و فکر کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔"

"لیکن ادب میں نام پیدا کرنا آسان نہیں۔ یہاں پہلے ہی ایک سے ایک نابغہ پڑا ہے۔"

"ان نابغاؤں میں ایک کا اضافہ اور سہی۔ آپ کو کیا اعتراض ہے۔"

"تو پھر ادیب بننے کی تیاری شروع کردیجیے۔ جائیے اور جاکر دنیا کا عظیم ادب پڑھیے، لکھنے کی مشق کیجیے۔ زبان و بیان پر قدرت حاصل کیجیے۔ مختلف اسالیبِ بیان کو آزمائیے۔ اپنے لیے کسی صنف کا انتخاب کیجیے اور اس میں اپنا ایک رنگ پیدا کیجیے۔ ادیب اسی طرح بنتے ہیں۔"

"میرے پاس مغزپچی کرنے کے لیے اتنا وقت نہیں ہے اور ویسے بھی مجھے محمد حسین آزاد بننا ہے اور نہ ڈپٹی نذیر احمد۔ میں تو ایک مشہور ادیب بننا چاہتا ہوں۔"

"پھر تو آپ ادیب ہی نہیں بن سکیں گے، شہرت تو دور کی بات ہے۔"

"یہ آپ کی خام خیالی ہے، ادیب بننے کے لیے میرے پاس ایک پلان ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اس پلان پر عمل کرکے نہ صرف میں خود کو ادیب منوا سکتا ہوں، بلکہ اچھے اچھے ادیبوں کو ادب کے میدان میں پیچھے چھوڑ سکتا ہوں۔"

"یقیناً اس پلان کی تفصیلات جان کر مجھے خوشی ہوگی۔ کیا یہ کے ڈی اے کے ماسٹر پلان جیسی کوئی چیز تو نہیں۔

"جی نہیں، آپ اسے شہرت کے خواہاں ادیبوں کا ماسٹر پلان کہہ سکتے ہیں، جس پر عمل کر کے پستہ قامت ادیب دیو قامت ادیب بن سکتے ہیں۔ بلکہ بہت سے بن چکے ہیں۔ اب میں بھی قسمت آزمائی کرنے چلا ہوں۔ میری کامیابی کے لیے دعا کیجیے۔"

"میں کوئی ایسی دعا نہیں مانگتا، جس کا فائدہ مجھے نہ پہنچے۔

"میرا یہ پلان نو نکات پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا نکتہ ہے۔ تعلقات سازی۔ ان تمام شعبوں میں اپنے تعلقات مستحکم کرنا، جو بحیثیت ادیب میری شہرت میں معاون ثابت ہوں۔ مثلاً ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات وغیرہ

"لیکن آپ ان اداروں میں اپنے تعلقات کیسے استوار کریں گے؟"

" میرا ایک پولٹری فارم ہے اور بنیادی طور پر میں ایک پولٹری فارمر ہی ہوں۔ وہاں کوئی دس پندرہ ہزار مرغیاں میں نے پالی ہوئی ہیں۔ دونوں ہی قسم کی مرغیاں میرے فارم میں ہیں۔ لیئر بھی اور برائلر بھی۔ آپ دونوں میں فرق سمجھتے ہیں نا؟"

"غالباً ایک انڈے دینے والی اور دوسری حلال کر کے کھانے والی ہوتی ہے؟"

"بالکل ٹھیک۔ تو ان اداروں کے جو ذمے دار اور با اختیار حضرات ہیں۔ میں ان سے اپنے تعلقات اس طرح استوار کروں گا کہ ان کی دعوتیں کروں گا اور انھیں مرغیاں کھلایا کروں گا۔ دیکھیے نا ان میں ٹی وی اور ریڈیو کے پروڈیوسر ہیں۔ اخبارات کے ادبی صفحات کے نگراں حضرات ہیں۔ آپ کو شاید اندازہ نہیں ہے مرغیاں دیکھنے میں بظاہر بے ضرر سی ہوتی ہیں، لیکن ہوتی بڑی زود اثر ہیں۔"

"جی ہاں سیاسی رپورٹنگ کے زمانے میں اس کا تھوڑا بہت تجربہ مجھے بھی ہو چکا ہے۔"

"اس کے علاوہ اسی طریقے سے دو چار ادبی نقادوں کو بھی قابو میں کیا جا سکتا ہے۔ جو بہر حال میرے ادبی مستقبل کو تابناک بنانے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔"

"یہ بات تو چلیے واضح ہوئی۔ اب جلدی سے اپنے پلان کا اگلا نکتہ بتائیے۔"

"میرے پلان میں آپ کی بڑھتی ہوئی دلچسپی سے مجھے تشویش ہو رہی ہے، کیا میں یہ سب کچھ بتا کر کسی تکنیکی غلطی کا مرتکب تو نہیں ہو رہا ہوں؟"

"یہ تو آپ کے سوچنے کا کام ہے، میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اتنا سرمایہ لگا کر آپ بننا کیا چاہتے ہیں صرف ایک مشہور ادیب! اس سے کیا حاصل ہو جائے گا آپ کو؟"

"ہاتھ ملائیے، سبحان اللہ کیسی گہری نکالی بات ہے آپ نے۔ گویا اب آپ معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں۔"

"ازراہِ کرم مجھے اتنی گہرائی میں نہ لے جائیے گا کہ دوبارہ سطح تک آنا ہی مشکل ہو جائے۔"

"سچ پوچھیے تو میں آپ کو اپنا شریک راز بنانا نہیں چاہتا تھا لیکن مجھے یقین ہو گیا ہے کہ حقیقت حال بتائے بغیر میں آپ سے کوئی مدد حاصل نہیں کر سکوں گا۔ اس لیے سنیے میں مشہور ادیب اس لیے بننا چاہتا ہوں،

تاکہ صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی حاصل کر سکوں، یہ تمغہ میری کئی نسلوں کے لیے باعثِ افتخار رہے گا"۔

"لیکن آپ نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ مشہور ادیب بنتے ہی یہ تمغہ آپ کو مل جائے گا"۔

"اس لیے کہ یہ تمغہ عام طور پر مشہور ادیبوں ہی کو دیا جاتا ہے۔ خواہ اس نے ادب کے نام پر کچھ لکھا ہو۔ میرا خیال ہے حوالے کے لیے نام گنوانے کی ضرورت نہیں"۔

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن میں آپ کو کئی ایسے ادیبوں کے نام بتا سکتا ہوں، جنھیں اب تک یہ تمغہ نہیں ملا"۔

"اس لیے کہ اس سلسلے میں ان کی کوششیں ناتمام رہیں"۔ میرے پلان کے اگلے آٹھ گئے۔ آپ نے جستے ہی نہیں۔ انھیں سنتے ہی مجھے یقین ہے کہ ایک تمغہ تو آپ خود دینے کا اعلان کردیں گے

"آپ نہ ہی بتائیے تو اچھا ہے۔ اس لیے کہ یہ معاملہ اتنا ہی سہل ہے، تو مجھے اندیشہ ہے کہیں ا دوڑ میں میں بھی نہ شریک ہو جاؤں"۔

"معاملہ سہل قطعی نہیں ہے۔ اس کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اعلا سرکاری حلقوں رسائی، اپنی امیج سازی، مختلف علمی و ادبی اداروں میں عمل دخل، اپنے اعزاز میں جلسے جلوس۔ جنار آدمی خون تھوک دیتا ہے"۔

"جی ہاں یہی وجہ ہے کہ ایسے بے شمار ادیب جنھوں نے علم و ادب کی خدمت کرتے ہو۔ عمریں گزار دی ہیں اور جن کی گراں قدر تصنیفات کی بھی تعداد اچھی خاصی ہے۔ محض اپنی گوشہ نشینی سبب ہر قسم کے سرکاری و غیر سرکاری انعام و اکرام سے محروم رہ جاتے ہیں"۔

"اب معاملہ آپ پر آئینے کی طرح صاف ہو چکا ہے۔ مجھے امید ہے آیندہ آپ مجھے ادیب بننے کے لیے ویسے مشورے نہیں دیں گے، جو گفتگو کی ابتدا میں آپ دے رہے تھے"۔

"سمجھ میں نہیں آتا، ہمارے صدر صاحب تو بے حد اصول پسند اور دیانت دار آدمی کی شہرت رکھتے ہیں، پھر ایسی گڑبڑ کیوں ہے"؟

"تمغے اور ایوارڈ دینے کے فیصلے صدر صاحب نہیں کرتے، مصنفین کرتے ہیں، جن تک رسائی ایسی مشکل نہیں ہوتی"۔

"مگر مصنفین کے نام تو خفیہ ہوتے ہیں"۔

"خفیہ ہونے کی وجہ سے ہی کام آسان ہو جاتا ہے۔ مصنفین کے ناموں کا اعلان ہو جائے تو وابستگی ظاہر نہ ہو جائے"

"آپ تو قیامت کی نظر رکھتے ہیں"۔

"تو پھر آپ انٹرویو ابھی کرنا چاہیں گے یا کسی اور وقت حاضر ہو جاؤں"۔

"جس وقت آپ مناسب سمجھیں لیکن اس کی ایک شرط ہے"۔

"منظور ہے"۔

"شرط تو سن لیجیے۔ اپنے انٹرویو کے عوض آپ میرا بھی ایک انٹرویو کریں گے اور یوں مختلف طریقوں سے یہ سلسلہ اس وقت تک دراز رہے گا، جب تک ہم دونوں بھی کسی قومی اعزاز کے مستحق نہ قرار پا جائیں"۔

"سو فیصد منظور ہے"۔

"تو پھر لائیے ہاتھ"۔ ●●

لام بن رزاق
،آئی، جی کالونی
یسٹ بمبئی

ہدف

ساڑھے گیارہ کی ٹرین بھی جا چکی تھی اور آج کمائی کے نام پر روپیا سوا روپیا سے زیادہ نہیں
اندھی دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا رہی تھی۔ اُس کا بس چلتا تو وہ آج گپتو کو ٹرین کے نیچے دھکیل

"حرامجادہ، پالس بھر کا چھوکرا، ابھی سے کتا دماکھ ہے اُس کو۔۔۔۔۔ صبح سات بجے کے
ہوکے ساتھ ہی وہ لوگ اسٹیشن کے گیٹ پر آکر بیٹھ جاتے تھے۔ یہ اُن کا معمول تھا۔ اب
بجے گیارہ ہو گئے تھے۔

'روجانہ اِتّے بکھت میں چار پانچ روپے کی کمائی ہو جاتی تھی۔ جانے حرام جادے کو کیا ہو گیا
ے، اب کوئی آسا نئیں، کمائی کا بکھت گجر گیا۔ سویرے سات بجے سے گیارہ بجے تک لوگوں
نوکری دھندے پر جانے کا بکھت ہوتا ہے۔ ایسے میں پھکیر، بھکاری سامنے پڑ جائے تو
ولن کے لیے پیسا دو پیسا دے دیتے ہیں لوگ۔۔۔۔۔'

یہ گُر انھیں لنگڑے نے بتائی تھا۔
'کتا ہوسیار ہے لنگڑا اپنے دھندے میں۔ کیسے کیسے گُر یاد ہیں اُسے بھیک مانگنے کے۔
ہے لنگڑا بیمار پڑا ہے دھندا بہوت مندا ہو گیا ہے۔ ہلکٹ بیمار نہیں ہو گا تو کیا ہو گا۔ دارو، چرس
ی کوئی نسہ نہیں چھوڑتا۔ پیتا ہے تو پیتا ہی جاتا ہے۔ نسے میں تو بالکل جناور ہو جاتا ہے جناور۔
ے تو کپڑے کی طرح نچوڑ کر رکھ دیتا ہے ایسے بکھت۔ کتا ہی منع کرو نئیں مانتا۔ جاتے کاں سے
بل آجاتا ہے اُس میں۔ ایسا جھنجھوڑتا ہے کہ بوٹی بوٹی دُکھنے لگتی ہے۔ سویرے اُٹھا بھی
ن جاتا۔ مگر ہاں کھلاتا پلاتا بھی کھوب ہے۔ سویرے ایرانی کے ہوٹل سے کیمہ پاؤ جرور لاتا ہے۔
ھلانے پلانے میں کوئی کور کسر نئیں رکھتا لنگڑا۔ مگر وہی دن بھر کھاؤ پیئو اور رات کو اُس کی چاکری
رو۔ مگر جب سے بیمار ہوا ہے بات نئیں کرتا۔ اب کی بہوت دن بیمار ہو گیا ہے۔ بیس روج
ے جیادہ ہو گئے ہوں گے۔ ایرانی کا کیمہ کھائے ہوئے۔۔۔۔ رات کو ایسے چ مسکری سے بولی
، تو کیا بگڑ گیا تھا۔ ہلکٹ مطلبی ہے پکا۔ اپن اچھا تھا تو روج روج ستاتا تھا۔ اور میں بیس

روج بعد جرا بولی تو ایک دم بھڑک گیا۔ حرامی دوا چ نئیں کھاتا۔ اچھا کاں سے ہوگا۔ آج تو بہت ناراج ہوگا۔ ہونے دو۔ میں کیا کروں۔ یہ کتے کا پلاّ میری کاں سنتا ہے۔ جانے کون چھنال جن کر چلی گئی سور کو۔ لنگڑا بولتا ہے مرگئی۔ لوگ بولتے ہیں بھاگ گئی۔ بھاگ اچ گئی ہوگی، نئیں تو یہ لنگڑے کے پاس کون ٹکے گا۔ کیا رکھا ہے اس کے پاس۔ میرا چھوڑو۔ میں کاں جاؤں گی۔ ایک اندھی کا ہاتھ کون پکڑے گا۔ پن سکو کہتی تھی گپتو کی ماں کھبسورت تھی۔ بولتے ہیں لنگڑا ستاتا بی ہوئے تھا اُس کو کہا کرتی کب تک لنگڑے کے پاس پڑی رہتی۔ اچھا ہوا چلی گئی۔ پن یہ پاپ کی پوٹلی چھوڑ گئی میری چھاتی پر۔ چھے سات برس کا ہے مگر ابی سے اِتا بے ایمان ہے کہ کٹی انگلی پر پیساب کرنے کو تیار نئیں۔ میرے کو تو ماں بولتا چ نئیں۔ ارے باپ کی نئیں سنتا میری کیا سُنے گا حرامی۔ میں تو کہتی ہوں یہ بیج لنگڑے کا ہے چ نئیں۔ ایک دن بولی تھی تو لنگڑا ارکتا گرم ہوگیا تھا۔ ارے گر گپتو کی ماں کھبسورت تھی تو پھر کتے لوگ اس کے آگے پیچھے پھرتے ہوں گے۔ لنگڑا اس کی ٹانگوں کا دارو گا تو تھا نئیں کہ ہر گھڑی اس کی جیاجت کرتا۔ اب میں اچ اگر چاہوں تو کسی کے بی پاس چلی جاؤں۔ لنگڑے کو کیا مالوم پڑے گا۔ پن لوگ بی بہوت حرامڑے ہوتے ہیں۔ میرے پاس کائے کو آئیں گے۔ اندھی ہوں نا۔ لنگڑا کہتا تھا منہ پر ماتا کے بڑے بڑے داگ بھی ہیں۔ رنگ بی کالا ہے۔ گورا رنگ کیسا ہوتا ہوگا؟ مرد لوگ تو گوری چمڑی کے پیچھے دیوانے ہوتے ہیں۔ لنگڑا حرامی آج بی گپتو کی ماں کو یاد کرکے روتا رہتا ہے۔"

"ہٹ..... ٹر..... کُتا ہے ـــ"

"ارے گپتے! مرگیا کیا ـــ کاں چلا گیا۔ دیکھ کُتے چاٹ کے جا رہے ہیں۔ ڈُکر دیکھ کر بی نہیں بھگاتا۔"

گپتو کینٹن کے پاس کھڑا تھا۔ کانچ کے مرتبان میں کرم لگے کیک کے ٹکڑے رکھے تھے، جنھیں وہ للچائی نظروں سے گھورتا ہوا گننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ایک ـــ دو ـــ تین ـــ چار ـــ پانچ ـــ دس ـــ بارہ ـــ"

گپتو کو گنتی نہیں آتی۔

"باپ رے ـــ کتے کیک کہ میرے کو ملیں تو سب کھا جاؤں۔ بھجیا تو کھارا ہوتا ہے جلیبی میٹھی ہوتی ہے۔ یہ کریم والا کیک کیسا ہوتا ہوگا؟

"ارے گپتے! حرامی! کاں چلا گیا؟

"اندھی چلا رہلی ہے۔ مرتی بی نئیں سالی۔ کاں سے آگئی۔ باپ اُس کی چ سُنتا ہے۔ بولتا ہے اس کو ماں بولوں۔ میں نئیں بولوں گا اندھی کو ماں۔ میری ماں کتی اچھی تھی۔ ایک دم سامنے لگے پھولوں کے سریکی۔ باپ رے کتی بڑی بڑی آنکھیں ہیں پھولوں کی۔ ماں کی آنکھیں بھی ایسی اچ بڑی بڑی تھیں۔ کاں چلی گئی۔ میرے کو چھوڑ کے ماں۔ ماں تھی تو اپنی کتی جما تھی۔ روج باپ کی چوری سے دودھ والے بھیّا کے پاس سے دودھ لے کر پلاتی تھی۔ کبھی کبھی جلیبی بھی۔ رس والی جلیبی۔ میٹھا ـــ میٹھا ـــ رس ـــ س ـــ س ـــ آہ ـــ باپ کو مالوم پڑتا تھا تو کتا مارتا تھا باپ

لنگڑا باپ بہوت کھراب ہے۔ اب اوپر سے یہ اندھی ماں۔ اونہہ ۔۔۔!"

اندھی کی آواز پر اُس نے مڑ کر دیکھا۔ اندھی ٹھوڑی اوپر اٹھائے اُس کا نام لے کر پکار رہی اُس نے مرتبان میں رکھے کیکوں پر آخری نگاہ ڈالی۔ اور ڈھیلے ڈھیلے قدموں سے اندھی کے پاس گیا۔

"کاں چلا گیا تھا رے۔ حرامی! کب سے چلا رہی ہوں۔ تو گھر کو چل دیکھ آج تیری کیسی چمپی ئی ہوں۔ کھا کھا کے ڈُکر کو بہوت چربی چڑھ گئیلی ہے!"

گپّو چپ چاپ آ کے اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"دیکھ اب ٹرین آنے والی ہے۔ اِدھر آ۔ ہاں۔ اِدھر سرک کے بیٹھ میری گود میں۔ ہاں۔ ایسا۔ دیکھ اب کی دپھا اگر نئیں رویا تو بہوت مار کھائے گا۔ لنگڑے سے بول کے دونوں ٹانگیں توڑنے لگاؤں گی۔ چوتڑوں سے گھس گھس کے چلنا پڑے گا۔ ہاں دیکھ ٹرین تیار ہو جا۔ لوگ آ رہیلے ہیں۔ آ رہیلے ہیں نا؟ ارے منہ سے بول چھنال کے۔ مائی ٹما۔ تیرے مُنہ گدھی کا پیساب۔ آج تیرے کو کیا ہو گیلا ہے۔ لنگڑے سے میرے کو بھی مار کھلائے گا سور ۔۔۔ جور جور سے رو ۔۔۔ دیکھ لوگ آ رہیلے ہیں۔ رو ۔۔۔ حرامی رو!"

"بابا ۔۔۔ بچّا بھوکا ہے، بھگوان کے نام پر پیسا دو پیسا ۔۔۔ اللہ کے نام پر ۔۔۔ بابا ۔۔۔ دیکھو رو رہیلا ہے۔

"ارے رو کتّرے ۔۔۔ روتا کیوں نئیں!"

اندھی گپّو کے زور زور سے چٹکیاں کاٹتی ہے۔ مگر گپّو ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ وہ اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھا ہے۔ اندھی بلبلا کر اب کی پوری قوت سے چٹکی کاٹتی ہے۔ گپّو دہیں بل کھا کر رہ جاتا ہے۔ مگر روتا قطعی نہیں۔

"بابا! بھگوان کے نام پر ۔۔۔ بچّا بھوکا ہے!"

اندھی دانت کٹکٹاتی ہے۔

"ارے کتّے روتا کیوں نئیں ۔ رو ۔۔۔ نا رو ۔۔۔ رو!"

چٹکیاں کاٹتے کاٹتے اندھی کی انگلیاں دُکھنے لگیں۔ مگر گپّو اُسی طرح چپ چاپ بیٹھا ہے۔ دھیرے دھیرے ٹرین سے اُترے سارے مسافر اسٹیشن کے گیٹ سے گزر جاتے ہیں۔ سامنے کے ٹین کے ڈبے میں ٹن ۔۔۔ ٹن ۔۔۔ کی آواز کے ساتھ صرف دو چار سکّے گرتے ہیں۔ اندھی ٹین نکال لیتی ہے۔ انگلیوں سے چھو چھو کر گنتی ہے۔

"دو پانچ پیسا ۔۔۔ دو دس پیسا۔ اور ایک بیس پیسے کا سکّہ اور ۔۔۔ آج لنگڑا جندہ نئیں چھوڑے گا۔ سب پیسے ملا کر دو روپیا بی نئیں ہوتا ہے! ایک روپے کی تو لنگڑے کی گولی آئے گی۔ اب باکی پیسوں میں پاؤ بھاجی اور چاکاں سے آئے گی۔ یہ موٹے کو آج کیا ہو گیلا ہے۔ روتا چ نئیں مُردہ۔ کتّے جور جور سے چٹکی لی۔ حرامی کی پیٹھ کھون کھون ہو گئی ہو گی۔ پن روتا چ نئیں!"

اُس نے ایک زور کی دھپ گیتو کی پیٹھ پر رسید کی۔

"کیوں رے بھنگی کے آج کیا ہو گیلا ہے تیرے کو۔ روتا کیوں نئیں ۔؟"

"نئیں روؤں گا۔"

"ارے کتّے کیوں نئیں روئے گا؟"

"نئیں روؤں گا ۔ کبّی نئیں روؤں گا۔"

"آج تو گھر کو چل ۔ دیکھ لنگڑا تیری کیا ہالیت کرتا ہے۔ حرامی روئے گا نئیں تو کھائے گا"

اندھی نے ٹین کا ڈبّا اُٹھایا۔ اور گیتو کی بانہہ پکڑ کر اُسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی اپنے جھونپڑے کی طرف چلی۔ گیتو مذبح خانے کی طرف لے جائے جانے والے کسی جانور کی طرف گھسیٹتا ہوا اُس ساتھ چلنے لگا۔ اس کی بانہہ پر اندھی کی گرفت کافی مضبوط تھی۔ درد سے اس کی بانہہ کی ہڈ ٹوٹنے لگی۔ مگر اس کے ہونٹوں سے ایک کراہ تک نہیں نکلی۔ اس نے اپنے ہونٹ سختی سے بھینچ رکھے تھے۔ آنکھوں میں بے پناہ کرب اور چہرے پر الوٹ ضد کا تناؤ تھا۔ اندھی اُسے رہ رہ کر گھسیٹتی قدم قدم پر گالیاں دیتی چل رہی تھی۔

دیکھ آج تو تیرا مردہ چ گرائے گا لنگڑا۔ میں تو لنگڑے کے لیے گولی بی نئیں لوں گی۔ کاہ سے لوں۔ دو روپیا بیس پیسے میں پاؤ آئیں گے بھاجی آئے گی چا آئے گی کہ گولی آئے گی۔ میرے کو کیا کرنے کا۔ میں تو بول دوں گی اس حرامڑے کے ساتھ بھیک نئیں مانگتی۔ کوئی دوسرا گر بیتا۔ میری تو یہ سنتاچ نئیں۔ اور بولیں گے تو روتا نئیں۔ گھڑی گھڑی ٹھیس میں چلا ہے۔ پکار پکار کے گلا سوکھ جاتا ہے۔ بھیا لانے کو بولیں گے تو بولے گا۔ میرے کو کیک چیئے تین دن سے بولتا ہے میرے کو کرم کیک چیئے۔ ارے مُردے! کرم کا کیک کتّے کا ملتا ہے مالوم ہے دو روپے کا ایک اِتا سا کیک ۔ تیرے کو کرم کیک کھلادیں گے۔ تو ہم کیا کھائیں گے۔ تیری ماں کلیجا۔ باپ کو روج ایک روپے کی گولی چیئے۔ بیٹے کو کرم کیک — چل — گھر کو چل — اچھے سے کھلاتی ہوں کرم کیک تیرے کو۔

جب اندھی اور گیتو جھونپڑی میں داخل ہوئے تو لنگڑا جھونپڑی میں لیٹا انھیں کا انتظار کر رہا تھا اندھی دروازے کے باہر ہی سے بھنبھناتی آرہی تھی۔

"میں کیا جھوٹ بولتی ہوں۔ جانے کس کا پاپ ہے۔ حرامی کس کی سُنتاچ نئیں۔"

"کیا ہواری! کیوں کتّی کے ما پھک بھونک رئلی ہے۔ باہر سے اچ ۔؟"

"پوچھ اپنے حرامی پلّے سے پوچھ۔"

"کیا ہوا رے؟" لنگڑا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

گیتو گردن جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ اب بھی کسی کمان کی طرح تنا ہوا تھا۔ لنگڑے کی آواز سُن کر اس نے گردن اُٹھائی۔

"ارے بول! سور کے بچّے۔ دیکھ کیا رہلا ہے۔ دیدے نکال دوں گا۔"

"گیتو چپ۔"

دیکھ لے یہی حال ہے مُنّو سے ۔گھگھو کے ما پھک کھالی پیلی گھورتا ہے مُنہ سے کچھ نئیں بولتا۔ ارے جان دے نا۔ نئیں بولا تو نئیں بولا۔ اپنی ماں کے بھوک میں گیا۔ تیرا کیا جاتا ہے۔

"لاگولی دے ادھر۔"

"کائے کی گولی۔ اوچ تو بولنے جا رہی ہوں۔ آج ایک دو روپیا بیس پیسا چ ملا۔"

"کیوں ؟"

"پوچھ نا۔ اِسّی کُتّے کے جنے سے۔"

اری تو کیوں نئیں بولتی حرامڑی کہ اب اُٹھ کے دکھاؤں تیرے کو بی۔"

"میرے کو مالوم تھا۔ تیرے کو گولی نئیں ملی تو ایسا چ کاٹنے کو دوڑے گا۔"

"دیکھ اب جاستی بھنکس مت کر۔ نئیں تو ہبچ ہاتھ ڈال کے جبان کھینچ لوں گا۔"

"مار ڈال" مار ڈال میرے کو۔ تیرا نرک بھرتے بھرتے میں تو پریسان ہوگئی۔ یہ لے یہ پیسا ملا ہے۔ اب اس میں تیرے گولی لا نئیں تو میرا کپھن لا۔"

چھن۔ ن ۔ ن ۔ ن ۔ اندھی نے سب پیسے لنگڑے کے سامنے پھینک دیے لنگڑے نے زمین پر بکھری ریزگاری پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالی۔ پھر بولا۔

"ارے میں بھی تو پوچھ رہا ہوں۔ اتا کم پیسا کیوں ملا؟"

"آج یہ رویا چ نئیں۔ میں کیا کروں۔"

"رویا چ نہیں۔ کیوں نئیں رویا۔ چمٹی جرا جور سے لینے کا تھا؟"

"کتّے جور سے لوں۔ دیکھ لے پیٹھ کی چمڑی چھل گئی ہوگی۔ مگر روتا چ نئیں تھا۔ پوچھتی ہوں تو بولتا ہے۔ نئیں روؤں گا۔"

لنگڑے نے غضب ناک نگاہوں سے گپّو کی طرف دیکھا۔ گپّو زمین میں گڑی میخ کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں لنگڑے کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"کیوں رے حرام جادے! کیوں نئیں رویا آج ؟"

گپّو چپ چاپ کھڑا رہا۔

"ارے بول مادر ــــــ نئیں تو ٹکڑے کر ڈالوں گا۔" لنگڑے نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور اس کا ایک سرا گپّو کے پیٹ میں چبھو دیا۔

گپّو تھوڑا سا پیچھے کو سرک گیا۔ مگر بولا اب بھی نہیں۔ لنگڑا طیش میں آگیا۔ اس نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے اپنی طرف کھینچتا ہوا دوسرے ہاتھ سے ایک زوردار چانٹا رسید کیا۔ گپّو زمین پر لڑھک گیا۔ لنگڑے نے بیٹھے بیٹھے ہی اپنی اکلوتی ٹانگ چلائی۔ لات گپّو کی کمر پر پڑی۔ گپّو درد سے دوہرا ہوگیا۔

پھر دوسری دھپ۔

"حرام جادے بول کیوں نئیں رویا۔ جان سے مار ڈالوں گا۔ بول ــ"

گپّو زمین پر پڑے پڑے ہی چلّایا۔

"نہیں روؤں گا!"

"ارے کیوں نہیں روئے گا۔ تیری ماں کا سور ماروں۔ کیوں نہیں روئے گا؟"

چٹ ۔۔۔ ایک اور طمانچہ اور ۔

"میرے کو اب رونا اچ نہیں آتا باپ ۔ میں نہیں روؤں گا"

لنگڑا چونک پڑا۔

"کیا بولا ۔۔۔ رونا اچ نہیں آتا ۔"

ہاں ۔۔۔ رونا اچ نہیں آتا۔

گپو فرش سے اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لنگڑے نے دیکھا کہ اس کی ننگی پیٹھ پر ناخنوں کی بیشمار کھرونچیں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

بقیہ صفحہ ۴۸

ہے۔ وہ بے رحم دنیا میں انسان کی طرف حمایت کا ہاتھ بڑھاتا ہے اسے سہارا بھی دیتا ہے اور اس میں اپنی صلاحیتوں پر بھروسا پیدا کرتا ہے۔ ہماری بڑی تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں اگر کوئی چیز مستقل بھی ہے تو وہ لوگوں کے جذبات واحساسات اور تمام انسانیت کی اقدار ہیں، اپنے کلام کے ذریعہ ان کو رائج کرتے ہوئے فن کار بہت کچھ کر سکتا ہے۔ اپنے کلام کے ذریعہ عوام میں نیک جذبات پیدا کرنا ہی اصلی فن کار کا کام ہے۔

اظہار خضر
شعبۂ اردو، ٹیکسٹ بک کارپوریشن، پٹنہ

ادب کا مطالعہ کیوں؟

جدید عہد مادی ترقیوں کا عہد ہے۔ آج دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ یہ سوچنے پر مجبور ہے کیا ادبیات عالم کا مطالعہ لاکھوں بھوکے انسانوں کو غذا فراہم کر سکتا ہے؟ کیا غریبوں، بوڑھوں بیماروں کی ان گنت تمناؤں اور خواہشوں کی تکمیل ادب کے مطالعے سے ہو سکتی ہے؟ آج جنگ کے کالے بادل منڈلا رہے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ نظم، ڈراما اور ناول کے مطالعے سے یہ بادل چھٹ جائیں۔ یہ چند ایسے سوالات ہیں جو آج کے ادب کے طالب علم کو پریشان کیے ہوئے ہیں۔ وہ مطالعۂ ادب کی افادیت اور اس کی اہمیت و ضرورت پر غور کرتا ہے۔ اور اسے یہ جان کر بڑی مایوسی اور کوفت ہوتی ہے کہ زندگی کے نئے تقاضے ان چیزوں کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔ دراصل زندگی کے ان جدید تقاضوں کی روشنی میں ان سوالات کا حل ڈھونڈنا ہی مہمل ہے۔ سب سے پہلے ہمیں اپنی اقدارِ حیات کی بازیافت کرنی ہوگی۔ اور تب ادب کی جملہ تاریخی اور تہذیبی روایات کے پس منظر میں ان سوالات کا حل تلاش کریں تو ہمیں مایوسی نہ ہوگی۔ کیونکہ ادب کا بنیادی مقصد ہے صحت مند اقدار کا فروغ یہ کام ادب کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہیں ملکوں اور قوموں کے روحانی مزاج اور ان کی فطری جبلت میں نئی روح اور زندگی پھونکنے کا کام تو ادب کا ہے۔ لہٰذا آج کے عہد میں ادب کے مطالعے کی ضرورت ہے یا نہیں ہے؟ اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں ہو سکتے ہیں لیکن سب سے پہلے ہم اس سوال پر غور کریں کہ ادب کیا ہے؟

انگریزی زبان میں ادب کے لیے "لٹریچر" لفظ مستعمل ہے اس لحاظ سے اس زبان میں اس لفظ کا استعمال معنی کی دو سطحوں پر ہوتا ہے۔ عام طور پر ایسی تمام چیزیں جو تحریری شکل میں ہوں لٹریچر کے زمرے میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ سائیکل، موٹر کار یا اور کسی قسم کی چیزیں خریدنے جائیں گے تو سب سے پہلے آپ ان چیزوں سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے ان کا لٹریچر دیکھنا چاہیں گے۔ اگر آپ طب کے طالب علم ہیں تو آپ کو اس موضوع سے متعلق لٹریچر کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ یعنی ہر وہ تحریر جس سے ہمیں کسی شے یا موضوع سے متعلق معلومات اور تفصیلات حاصل ہوتی ہیں۔ "لٹریچر" ہے۔ لیکن جب گفتگو کسی زبان کے لٹریچر کے حوالے سے ہوتی ہے تو اس کے معنی و مفہوم کی سطح بدل جاتی ہے۔ اب اس کا استعمال ذرا سنجیدہ طور پر ہوتا ہے۔ بلکہ

یوں کہیے کہ ہم ناول، ڈراما اور شاعری کو سنجیدہ ادب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یعنی ادب کی ایسی تحریریں جو زندگی اور کائنات سے متعلق اپنے افکار، خیالات، احساسات اور رجحانات کی ترجمانی نیز ان کی نشاندہی قدروں کی سطح پر کریں۔ فن کار اپنے فن میں جن قدروں کی نشاندہی کرتا ہے وہ صحیح معنی میں آفاقی ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہم میکبتھ، اوتھیلو، رامائن، مہابھارت، شاہنامہ اور کلام میرؔ و غالبؔ کا مطالعہ صدیوں سے کرتے چلے آرہے ہیں اور ہمارا ذہن جتنا زیادہ ترقی یافتہ اور بالیدہ ہوگا اتنی ہی ان فنی اور تخلیقی فن پاروں کی قدر و قیمت اور اہمیت و افادیت بڑھتی جاتی گی۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سبھی ادبی اور فنی شہ پارے آفاقی اور لافانی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں ایسا ممکن نہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو میرؔ و غالبؔ کے عہد میں، ان کے ہم عصر شعرا کی ایک بھیڑ تھی۔ لیکن ان میں سے بیشتر فراموش کر دیے گئے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ ان میں وہ تخلیقی قوت نہیں تھی جو ایک عہد ساز ادب کے لیے ضروری ہے، تاکہ آنے والی نسل اس ادب کو پڑھ کر اس عہد کے تہذیبی، ثقافتی اور ادبی ماحول سے آشنا ہو سکے۔ یہ مسئلہ دراصل اچھے اور برے ادب کا ہے۔ لیکن یہ ایک بڑا ہی پیچیدہ مسئلہ ہے کہ کس ادبی شہ پارے کو اچھا کہا جائے اور کس کو برا۔ کیونکہ جب کوئی کسی ادبی فن پارے کے بارے میں خیال ظاہر کرتا ہے تو عموماً اس میں اس کی ذاتی پسند کو دخل رہتا ہے۔ چنانچہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ کسی ادبی شہ پارے پر نقد و تبصرہ کرتے ہوتے ہوئے بغیر کسی توجیہ اور دلیل کے یہ فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے کہ یہ بالکل ادبی چیز نہیں۔ میرے خیال میں ادب شناس کا یہ غلط طریقہ ہے۔ طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ کوئی کسی نظم کے بارے میں اپنا خیال ظاہر کرتا ہے اور اس کا خیال نظم کی تخلیقی اور فنی نوعیت کے خلاف ہے تو وہ مختلف توجیہات اور دلائل کے پیش نظر یہ کہہ سکتا ہے کہ "مجھے یہ نظم پسند نہیں ہے۔ یا یہ ایک بری نظم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں جتنا بھی ادب تخلیق ہوا ہے وہ سب بہترین ادب کے پیمانے پر کھرا نہیں اترتا اور ادب عالیہ کا مقام حاصل کر کارے دارد۔

یہاں ضروری یہ ہے کہ ہم وقتاً فوقتاً کلاسیکی ادب کے نمونے پیش کرتے رہیں اور لوگوں کے اذہان کی تربیت اس طور پر ہوتی چلی جائے کہ وہ اپنے عہد اور اس سے قبل کے عہد کی تہذیبی، سیاسی، سماجی اور ثقافتی روایات و اقدار سے واقف ہو سکیں ادب اور آرٹ کے نامور مفکرین اس موضوع پر اپنے افکار و خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

پلاٹو کا خیال ہے کہ ادب کے مطالعے سے انسان کی شخصیت، ایک بہتر صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ادب ہمیں صحیح معنوں میں اخلاقیات کا درس دیتا ہے۔ اس سے انسانی ذہن کی تربیت ہوتی ہے۔

(۲) سر فلپ سڈنی (۸۶ - ۱۵۵۴) اپنی کتاب APOLOGIC FOR POETRIC میں لکھتا ہے کہ انسانی زندگی اور بہادری کے بہتر اور ناقابل فراموش کارناموں کو پڑھ کر ہم میں بھی اچھائی اور بہادری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

(۳) اٹھارویں صدی کا عظیم ناقد سیمول جونسن (SAMUEL JOHNJON) کا بھی یہی خیال ہے کہ ادب کے مطالعے کا خاص مقصد ہے انسانی ذہن کی تربیت اس نے ایک مخصوص لفظ INSTRUCT استعمال کیا

مطالعۂ ادب سے متعلق ان مفکرین کے افکار کی روشنی میں اگر آپ ادبی فن پاروں کا جائزہ لیں تو محسوس کریں گے کہ ان کے مطالعے سے ذہن و شعور کو ایک نئی روشنی ملتی ہے۔ یہ انسانی شخصیت کو ایک ہمہ جہت مرتبہ بخشتا ہے۔ اور آپ کا فکر و شعور، متنوع تجربات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔

مثلاً: ۔ ایک شادی شدہ جوڑے نے اپنے کسی غیر شادی شدہ دوست سے سوال کیا "تم شادی کے مسائل کو کیا جانو؟ تمھیں اس کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اس دوست نے اس سوال کا بہت ہی معقول جواب دیا۔ "جی ہاں یہ صحیح ہے کہ مجھے اس کا ذاتی تجربہ نہیں ہے۔ لیکن بہت سارے لوگوں کے ذاتی تجربات سے مجھے آگاہی ہے۔ اور ان کی تفصیل بتاتے ہوئے اس نے کہا کہ میں نے جوسَر کی کتاب (WIFE OF BATH) رومیو اور جولیٹ، اوتھیلو، مادام بووری، دی قادر ڈیوڈ کوپر فیلڈ، WOMEN IN LOVE اور FUDE THE OBSCURE وغیرہ کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ جن میں ہمیں دنیا کے چند ذہین مرد اور عورتوں کے اس موضوع پر ان کے ذاتی تجربات اور خیالات پڑھنے کا موقع ملا۔ اور میں شادی کے مسائل کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ ہوا۔"

یعنی ہم دوسروں کے تجربے تک رسائی مختلف تحریروں اور تقریروں کے وسیلے سے حاصل کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ عملی اور حقیقی زندگی کے تجربات صرف مطالعۂ کتب سے حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ لیکن اپنے وقت کے تمام بڑے لکھنے والوں میں ملٹن کا مقام مطالعۂ کتب میں سب سے اونچا ہے۔ اس کی روزانہ زندگی کا زیادہ تر وقت، کتب بینی ہی میں گزرتا تھا۔ اور اس وجہ سے لوگ اسے کتابوں کا کیڑا کہا کرتے تھے۔ اس کے باوجود اس نے سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ لکھتا ہے۔

"ایک انسان اپنی زندگی کے ذاتی تجربے سے، حیات و کائنات کی معلومات اور اس سے آشنائی حاصل تو کرسکتا ہے لیکن وہ مقدار میں بہت کم ہوں گی لیکن ادب کے وسیلے سے وہ دوسروں کے تجربات و احساسات سے بھی واقف ہوسکتا ہے۔ اور بقول فرانسیسی، بیکن ایک "مکمل اور جامع انسان" بن سکتا ہے۔ اس میں قوت برداشت، فہم و ادراک کی صلاحیت اور دانشوری جیسی خوبیاں پیدا ہوں گی۔"

چنانچہ اسپین کے ناول نگار سروانٹے کا ناول (DON QUI HOTE) کے مطالعے سے ہمیں یہ ادراک ہوتا ہے کہ "خواب کو حقیقت سمجھنا ایک بیوقوفی ہے"۔ ہیملٹ اس بات کا اشاریہ ہے کہ کسی مسئلے میں فیصلہ نہ کرنا، خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ ناروے کے ناول نگار ابسن (ISBEN) نے اپنے ناول THE WILD DUCK میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ "ایک مثالی انسان کبھی کبھی حد سے زیادہ پریشان کن ثابت ہوسکتا ہے بہ نسبت ایک خطرناک مجرم کے" ہکسلے کے ناول (BRAVE NEW WORLD) یا جارج آرول کے ناول (NINETEEN EIGHTY FOUR) کے پڑھنے سے ہماری بصیرت میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ "تہذیب ثقافت اور ترقیات سے متعلق بعض جدید خیالات و نظریات غلط بھی ہوتے ہیں۔"

ڈی۔ ایچ۔ لارنس کا ناول (SONS AND LOVERS) محنت کشوں کی ایک حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔ جبکہ جون گال وردی کا ناول FOR-STYLE SAGA امیر اور بورژوا طبقے کی زندگی کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے اردو میں پریم چند کا ناول "گئودان" طبقاتی اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف ایک احتجاج

کی صورت میں ظاہر ہوا اس ناول کے وسیلے سے وہی ہندستان کے سماجی، طبقاتی اور سیاسی ڈھانچے کا واضح نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس عہد کی روایات و اقدار کی واضح جھلک ہمیں اس ناول میں
امراؤ جان ادا محض ایک طوائف کی کہانی نہیں ہے، بلکہ انیسویں صدی کی لکھنوی تہذیب ایک جیتی جاگتی دستاویز ہے۔ اس عہد کے تہذیبی ثقافتی اور سماجی خد وخال کے نقوش اس نا میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ طوائفوں کے کوٹھے جنسی تلذذ کے آماجگاہ نہیں تھے۔ بلکہ تہذیبی بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے شہزادے، امرا اور شرفا کی ذہنی تربیت مجروں کی محفلوں میں کرتی تھی۔

لہٰذا ناول "امراؤ جان ادا" کے وسیلے سے ہم انیسویں صدی کے لکھنؤ کی تہذیبی، ثقا اور ادبی زندگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ نیز اس عہد کی سماجی اور تہذیبی قدروں کی ترسیل ہم تک ہوتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ناول "آگ کا دریا" تقسیم ہند کی زہرناکیوں اور تلخیوں کے رد عمل وجود میں آیا۔ اس ناول کا سفر قدیم ہندستان کی سماجی، ثقافتی اور تہذیبی زندگی سے شروع ہو اور آزاد ہندستان کی پہلی کرن طلوع ہوتے ہی ختم ہوجاتا ہے۔ ناول کا کلیدی محور آزادی کی وہ پہلی کرن ہی ہے۔ یعنی برِ صغیر کا ایک ایسا عظیم سانحہ جو ناقابل فراموش ہے۔ مصنف کے نے ایسا جادو جگایا کہ لفظ لفظ ہمارے دل میں اترتا چلا گیا۔ چنانچہ اس ناول کے وسیلے سے برصغیر کی پامال شدہ قدروں کا ادراک ہوتا ہے اور ماضی کی شاندار روایات ہمارے ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ کام ادب ہی کے حصے کا تھا۔ منٹو کا افسانہ "موذیل" جذبہ ایثار اور وفا کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

ڈاکٹر محمد محسن اپنی کتاب "سعادت حسن منٹو" میں موذیل کے کردار کا نفسیاتی جائزہ ہوئے رقمطراز ہیں۔

"موذیل نے کرپال کور کو قمیص شلوار اتار کر اپنا لمبا کرتا پہنا دیا اور خود ننگ دھڑنگ ہو نے دروازہ اندر سے بند کرلیا اور جب بلوائی دروازہ پیٹنے لگے تو موذیل نے یکبارگی دروازہ دیا اور دھڑام سے ہجوم پر گر گئی۔ سب لوگ بوکھلا گئے۔ موذیل سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی پتھریلی زمین پر گرتی نیچے آگئی۔ موذیل نے بلوائیوں سے یہ کہہ کر ترلوچن میاں بھائی ہے اس کرپال کور کی جان بچالی۔ لیکن خود اس درجہ گھائل ہوگئی کہ جانبر نہ ہوسکی۔

فسادات کے پس منظر میں لکھا ہوا یہ افسانہ زندگی اور سماج کی سفاکیوں اور بے رحمیا ہے۔ اس افسانے کے وسیلے سے ہم بدلتی ہوئی سماجی تبدیلیوں اور زندگی کے نئے تقاضو آشنا ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر اعجاز حسین اپنی کتاب "اردو ادب آزادی کے بعد" میں اس نئی صورت حال ادیبوں کی ذمہ داری اور ان کے فرائض پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اشاعت سکون کے لیے افسانہ نویسوں نے مختلف انداز اختیار کیے۔ کبھی فرقہ وارا

(باقی صفحہ

ندا فاضلی
امامراپلس۔ دان پار امکار
بی ۵۲

نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی

کہانی میں کردار اور مسائل کی واپسی

ساجد رشید اردو نئی کہانی کا جانا پہچانا نام ہے۔ "ریت گھڑی" ان کے افسانوں کی پہلی کتاب
"پہلا ادبی تعارف تھا۔ ان کی نئی کتاب نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی کی اشاعت نہ صرف ان کے
لو اعتبار بخشتی ہے۔ سریندر پرکاش اور خالدہ اصغر وغیرہ کے بعد کی کہانی کو نئے سرے
ھری زمین اور آسمان سے دوبارہ جوڑنے کے عمل میں اہم کردار بھی ادا کرتی ہے۔ کہانی میں
براور عوامی مسائل کی بحالی اور ان موشگافیوں کے محدود دائرے سے نکل کر یہ کہانی ٹیڑھی میڑھی
ناتنگ و تاریک گھروں، سیاسی سماجی ناانصافیوں کی شکار زندگیوں اور غیر انسانی خود غرضیوں
ستوں میں پھیلتی نظر آتی ہے۔ نئے سیاق و سباق میں یہ کہانی ایک زاویہ سے کفن والے
چند اور "لو وو ڈ پیٹھ والے گورکی روایت کا توسیعی روپ ہے۔ "نخلستان میں کھلنے والی
ی" ساجد رشید کی چھوٹی بڑی گیارہ کہانیوں کا نیا مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ میں کہانی کار نے کسی
ی سند یا سفارش کو نہ رکھ کر جہاں پچھلے کئی برسوں کے جلاوطن کہانی کے قاری کو دوبارہ ادبی
تا سے سرفراز کیا ہے وہیں اپنی تخلیقی خود اعتمادی کا بھی اظہار کیا ہے۔ اس کتاب میں شامل
باں عنوان اور موضوع کے لحاظ سے الگ الگ اکائیاں ہوتے ہوئے بھی ایک ہی ذہنی رویہ سے ہم
ہیں یہ ایک ایسے باشعور لیکن ناراض ذہن کی قلمی تصویریں ہیں جو اردگرد پھیلے ہوئے سماج سے نامطمئن بھی اور
ا سے اپنے آپ کو منسلک بھی محسوس کرتا ہے وہ اسی سماج کا ایک فرد ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے
لیے لازم و ملزوم ہیں۔ سماج سے اس کا رشتہ مستعمل معنی میں عینیت پرستانہ ہے اور نہ ترقی
ا ز اس کی نفرت میں محبت میں نفرت کی شمولیت ان تحریروں کو نہ صرف نظریاتی افسانے کے
اٹا کھرے پن سے بچاتی ہے بلکہ رائج جدید افسانے کی فیشن زدہ لاتعلقی اور راہ فرار مولائی
ت سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ ساجد رشید زندگی کی چہل پہل سے جڑا ہوا فنکار ہے۔ اس کی
گی جو کہیں براہ راست اور کہیں علامتی اور بالواسطہ طنز کی صورت میں ابھرتی ہے کہیں بھی اس
نا دردمندی سے دور نہیں ہوتی۔ جو فنون لطیفہ کی پہلی شرط ہے۔
ان کہانیوں میں جو دنیا کی جھلکتی نظر آتی ہے اس کا جغرافیہ بھلے ہی زیادہ وسیع نہ ہو
اس کو دیکھنے دکھانے والی آنکھیں اس کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف لگتی ہیں۔ وہ اس

دنیا کا محض تماشائی ہی نہیں ہے اس میں خود بھی تماشا بننے کے کرب سے گزر رہا ہے۔ اس دنیا میں بسنے والے جو اس کی کہانیوں کے کردار ہیں جیسے برف گھر کا رشوت خور کانسٹیبل، سیاست کو پیشہ بنانے والا موٹا کھدر دھاری، راجدھانی ٹرین میں دھکے مار کر باہر پھینکا جانے والا غریب بوڑھا یا "ملزم" کا موقع پرست اجے کمار پانڈے کا پتا جو وقت کے ساتھ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے اور اسی کہانی کا سکھ رام سنگھ جو اپنے سنگھرش سے ایمانداری سے جڑا رہتا ہے اور آزادی پہلے کی طرح آزادی کے بعد بھی ملزم ٹھہرایا جاتا ہے۔ "مکرما" کا بے سہارا لڑکا جو اپنی ماں کی موت کے بعد بھوک اور پیاس کے ہاتھوں خود اپنے لیے عذاب بنا ہوا ہے سونے کے دانت کی جھلسی ہوئی معصوم آمنہ، پڑھی لکھی لیکن مجبور جمیلہ، اسمگلر ضیاؤ جو پیسے سے صحافی کی قلم جمیلہ کا شباب اور مولانا عبداللہ کا مذہب خرید لیتا ہے" ہم سب اور وہ کا چال باز امام اور مسجد میں اپنے جوتے اور ٹوپیاں کھونے والے بھولے نمازی اور ان جیسے ہی دوسرے کردار اس کے رات دن کے ملنے جلنے والے ہیں ان کے دکھ سکھ اور مسائل سے وہ اپنے شب و روز کی طرح واقف ہے۔ وہ صبح سے شام تک انھیں کے ساتھ زندگی کی بھاگ دوڑ میں شریک رہتا ہے، ٹوٹتا ہوا، لڑتا ہوا جھلاتا ہوا، وہ کہانیاں سوچتا نہیں۔ ان کی تلاش میں اسے ادھر ادھر بھٹکنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ خود چل کر اس کے پاس آتی ہیں اور اپنے آپ کو لکھواتی ہیں۔ کہانی اور کہانی کاری کی یہ قربت زندگی سے اس کی سماجی وابستگیوں کی دین ہے جن کو مونتاژ کہیں تصویری کولاژ اور کہیں مکالماتی اشاریت سے بنی گئی ہیں۔ واقعہ کی تاثراتی ترسیل ہیں۔ کسی جگہ بھی قاری کے ذوق و شوق کو آزمائش میں نہیں ڈالیں ہاں یہ ضرور ہے وہ جتنا قارئین کا احترام کرتا ہے، اتنا ہی وہ ان سے ادبی اقتدار کے احترام کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔

ساجد رشید پیشہ سے صحافی مزاج سے افسانہ کار اور عمل سے سیاسی سماجی (ACTIVIST) ہے اس کی پیشہ ورانہ صحافت اور عملی سیاست اس کے افسانہ نگار کی معاون قوتیں بھی ہیں اور یہی اس کی تخلیقیت کے رقیب بھی ہیں۔ وہ کہیں اپنے تجربہ و مشاہدہ کی سیماؤں کو پھلانگنے کی کوشش نہیں کرتا اور یہی تخلیقی شعور ان کہانیوں میں (ایک دو کو چھوڑ کر) اظہار موضوع کی ہم آہنگی اور ان کے تاثراتی ابلاغ کا سراغ ہے جانے پہچانے منظروں میں استعجابی آب و تاب بھی اسی کی دین ہے۔ یہ کہانیاں ادب و صحافت کے باریک فرق کے پل صراط سے اکثر سلامت روی کے ساتھ گزرتی ہیں لیکن جہاں یہ فرق اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے تو کرمایا" ہم سب اور وہ" جیسی کہانیاں وجود میں آتی ہیں جو اپنی تمام نیک دلی اور سماجی سوجھ بوجھ کے صحافتی دائرے سے باہر نہیں آپائیں۔ ان کے برعکس "شام کے پرندے" "ڈاکو"، "خواب" "نخلستان" کھلنے والی کھڑکی" "برف گھر" اس مجموعے کی قابل توجہ کہانیاں ہیں۔ اس کتاب کی پہلی کہانی "شام کے پرندے" اور ساتویں کہانی "نفرتوں کے آر پار" ہیں۔ انسانی رشتوں کی نفسیات اور ان کی پیچیدگی کو نہایت فنکارانہ انداز سے ابھارا گیا ہے لیکن ان میں وقف زندگی اور حالات کی کشمکش کرداروں کے متوازن حرکت و عمل کے ذریعے اس طرح دھیمے دھیمے کھلتی ہوئی اختتام تک پہنچتی ہے کہ یہ کہانیاں کاغذ پر ختم ہونے کے بعد بھی قاری کے ذہن میں تادیر جاری و ساری رہتی ہیں۔ یہ دونوں کہانیاں موضوعی لحاظ سے ہم شکل ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے میں کھوتی نہیں۔

"نخلستان میں نکلنے والی کھڑکی" کی ایک اہم خصوصیت جو خاص طور سے متوجہ کرتی ہے' وہ لفاظی سے گریز اور زبان کا محتاط استعمال ہے۔ ساجد رشید کئی جملوں کو ایک جملے میں ادا کرنے کے فن سے واقف ہیں۔ وہ خیال کو الفاظ کے حوالے کرنے کے بجائے خود زبان کو خیال کے رنگ اور مزاج کے مطابق ڈھالتے ہیں۔ اس لفظی کفایت نے کہانیوں میں کساؤ بھی پیدا کیا ہے اور انھیں تہہ دار بھی بنایا ہے۔ ساجد رشید بڑی حد تک کتابی زبان کی گھٹن سے دور ہے۔

آزادی کے بعد اردو افسانے کے ہیئتی نظام کی تبدیلی میں انتظار حسین کے نام کی اپنی اہمیت ہے انھوں نے بیدی اور منٹو کے بعد کے افسانے کو نئے محاورے اور نئی فضا سے روشناس کیا ہے لیکن ان کی اس تخلیقی توانائی نے اردو افسانے کو جتنا فائدہ پہنچایا ہے اس سے کہیں زیادہ نئے لکھنے والوں کی صلاحیتوں کا نقصان بھی کیا ہے۔ ان کی تقلید بیماری کی طرح ادب پر اس طرح نازل ہوئی کہ اچھی اچھی ذہانتیں اس کا شکار ہو کر اپنی انفرادیتوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور ایک سے چہرے نہرے کی کہانیوں کا انبار لگ گیا۔ خوشی کی بات ہے کہ ساجد رشید اور ان کے دیگر ہم عصروں نے جن میں انور خاں، سلام بن رزاق اور دوسرے انتظار حسین کے بعد کے اپنے پیش رو کہانی کاروں کی غلطی کو نہ دہرا کر تمثیل واساطیر کے تقلیدی غبار میں اپنے چہروں کی شناخت کو نہیں کھونے دیا۔ ساجد رشید کے کہانی کار کی طاقت بھی یہی انحراف ہے اور شخصی تجسس ہے جس نے ان کے افسانوں کو الگ سے اپنے مزاج کی پہچان دی ہے۔

وہ صوفی کا قول ہو، یا پنڈت کا گیان
جتنی بیتے آپ پر، اتنا ہی سچ مان

بقیہ صفحہ ۶۲

کی بھیانک تصویر دے کر پڑھنے والوں کو اس بربریت سے متاثر کیا، کبھی تفصیلات بیان کر کے یہ سمجھایا کہ اس خانہ جنگی سے کوئی فرقہ بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ بلکہ صاف صاف ہر مذہب کا نقصان ہو رہا ہے۔ لوٹ مار کرنے والے اپنے جذبۂ بہیمیت کو آسودہ کر رہے ہیں۔ وہ نہ مذہب سے واقف ہیں نہ ان کی بربریت میں کوئی جاں بازی ہے۔ اور نہ اس طرح کے انتقام میں کسی فرقہ کو فروغ ہو سکتا ہے۔ غرض کہ مختلف زاویۂ نگاہ سے فساد کو جنونِ انسانیت سوز فعل بتا کر یہ اہلِ قلم اپنا کام کر گئے۔" مختصر یہ کہ ادب کے مطالعہ سے ہم اپنی مکمل تہذیبی تاریخ سے آگاہ ہوتے ہیں۔

بچوں کی مذہبی کتابیں

رحمان کا مہمان ۶/-
کمسن صحابی ۵/-
اسلام کے جاں نثار ۴/-
سیرت پاک مختصر مختصر ۳/-
نور کے پھول ۹/-
حضرت حمزہؓ ۳/:
سب سے بڑے انسانؐ ۳/۵۰
حضرت محبوب الٰہیؒ ۳/:
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ۲/:
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ ۲/:
حضرت معین الدین چشتیؒ ۲/:
حضرت ابوبکر صدیقؓ ۶/:
حضرت طلحہؓ ۳/:
حضرت سلمان فارسیؓ ۳/:
حضرت ابوذر غفاریؓ ۳/:
حضرت عبداللہ بن عمرؓ ۳/:
حضرت عبداللہ بن عباسؓ ۲/:
نیک بیٹیاں ۳/۵۰
امیر خسروؒ ۳/:
ہمارے نبیؐ ۲/۵۰
دس سبق ۴/۵۰
منہاج القرآن ۳/۵۰
ارکانِ اسلام ۲/-
عقائدِ اسلام ۳/-
چار یار ۷/-
آں حضرتؐ ۲/:
خلفائے اربعہ ۸/-

نبیوں کے قصے ۵/:
مسلمان بیبیاں ۴/:
اسلام کیسے پھیلا اوّل۔ دوم ۵/۵۰۔ ۶/-
پیارے رسولؐ ۴/۵۰
ہمارے رسولؐ ۱/-
حضرت ابوہریرہؓ ۴/-
سرکار دو عالمؐ ۹/-
اللہ کے صفی ۲/:
حضرت نظام الدینؒ ۳/:
سرکار کا دربار ۶/۵۰
ہمارا دین (اوّل، دوم، سوم) فی حصہ ۸/-
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اوّل، دوم) مکمل ۸/-
اسلام کے مشہور امیر البحر ۴/۵۰
قرآن پاک کیا ہے؟ ۲/:
اسلام کیسے شروع ہوا؟ ۶/۵۰
رسول پاکؐ ۶/:
اللہ کا گھر ۴/۵۰
رسول پاک کے اخلاق ۳/:
اللہ کے خلیل ۲/:
تحسین القرآن ۴/۵۰
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ ۲/:

قاعدہ یسرنا القرآن

مکتبہ جامعہ نے تعلیمی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قاعدہ یسرنا القرآن کو نئی ترتیب، آسان و عام فہم ہدایتوں کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس قاعدہ کو بحمد اللہ والدین اور معلمین دونوں نے بہت پسند کیا۔ اظہار پسندیدگی کے ساتھ ہی ہمارے بعض کرم فرماؤں نے قاعدہ کو اور بہتر بنانے کے سلسلے میں اپنی گراں قدر تجویزوں سے نوازا۔ ان تجویزوں کی روشنی میں قاعدہ یسرنا القرآن کا تازہ ایڈیشن شائع ہو کر آ گیا ہے۔

سدید
ستلج۔ اقبال ٹاؤن، لاہور ۱۸

کچھ وقت پاکستانی کتابوں کے ساتھ

یئے کی آنکھ ــــ مقبول عامر

مقبول عامر نے اپنی چند نظمیں اور غزلیں فیض احمد فیض کو بیروت میں بھجوائیں تو فیض صاحب لکھا:

"بیروت کی دھواں دھار فضا میں آپ کی شاعری بادِ صبا کی طرح لگی،
جذبے اور شعور کا ایسا خوبصورت امتزاج کم ہی دیکھنے میں آیا ہے"

"دیئے کی آنکھ" مقبول عامر کی شاعری کا پہلا مجموعہ ہے جس میں جذبہ اشک رنگ نظر تا ہے اور شاعر کی آنکھ میں غصہ بھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وجہ شاید یہ ہے کہ مقبول عامر ے معاشرے کی عافیت کا جو خواب دیکھا تھا وہ خواب اس کی نظروں کے سامنے چکنا چور یا ہے، مقبول عامر نے دیکھا کہ زمانہ اپنا کھیل ایک مخصوص انداز میں کھیل رہا ہے اور ایسی قدروں نہیں ایک آدرش کی حیثیت مل چکی تھی بڑی بے رحمی سے پامال کر رہا ہے۔ یہ کھیل چونکہ ول عامر کے معیارِ اقدار کے مطابق نہیں ہے اس لیے اس کے دل میں طغیان اظہار موجزن ۔ جو کبھی نظم کی صورت اختیار کرتا ہے کبھی غزل کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے۔ اس کی شاعری ما احتجاج کی ہے لیکن بغاوت نہیں، مقبول عامر کی شاعری کے اس داخلی مزاج کو پیشِ نظر لیں تو کتاب کا عنوان "دیئے کی آنکھ" ان کی شاعری کا معنوی استعارہ بن جاتا ہے۔

مقبول عامر کی غزل میں ایک انوکھی بات یہ نظر آئی کہ وہ شعر کے دو مصرعوں کو ایک سرے کا سہارا نہیں بناتے۔ بلکہ ان کے درمیان خفیف سا خلا چھوڑ دیتے ہیں جسے قاری نے ذوقِ نظر سے پورا کرتا ہے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ کیجیے۔

بل بھر وہ چشمِ تر سے مجھے دیکھتا رہا
پھر اس کے آنسوؤں سے مری آنکھ بھر گئی

مقبول عامر کی غزل میں ایک نڈھال اور باغیرت مرد بولتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ وہ ت سے خوف نہیں کھاتا اور زندہ رہنے کے لیے دریوزہ گری نہیں کرتا۔ زندگی پر موت ہائے یورش کر دیں تو مقبول عامر خلقِ خدا کو عافیت کا راستہ دکھاتا ہے اور خطرے مقام پر سرخ نشان آویزاں کر دیتا ہے۔ ایک نئے شاعر کا یہ پہلا مجموعہ کلام اپنے دامن

شعر میں صدہا امکانات لیے ہوتے ہیں۔ اسی لیے حبیب جالب نے اسے اپنے قبیلے
شمار کیا ہے اس کتاب کی ضخامت ۹۶ صفحات اور قیمت ۱۰ روپے ہے۔ عمدہ کتابت، اعلا سفید
پر طباعت ہوئی ہے۔

بے گماں — ارشد گجراتی

"بے گماں"، اردو کے ایک ایسے شاعر کا پہلا اور آخری مجموعۂ کلام ہے جس
زندگی روشنیوں میں بسر کی دوسروں کے نام کو اپنے آب و رنگ سے چمکایا لیکن دنیا
ہوتے ہی اپنے اوپر گمنامی کی فرغل ڈال لی۔ ارشد گجراتی کا نام نصف صدی قبل بمبئی
میں گونجتا تھا، ان کا یہ تابندہ دور میرزا ادیب اور قمر تسکین نے دیکھا ہے۔ میرزا
نے لکھا ہے کہ "جناب ارشد گجراتی کی شاعری دوسروں کے لیے کم — بلکہ بہت کم اور
لیے زیادہ تھی"۔ شاعری میں ان کی تخلیقی ذات نے اپنے مشاہدات، اپنے تجربات
واردات کا بے باکانہ اظہار کیا ہے "بے گماں"، ان کی وفات کے بعد ان کے
اے۔ کریم نے شائع کی ہے، جو پاکستان کے ایک ممتاز مصور ہیں۔ میں نے اس
کا مطالعہ کیا تو محسوس ہوا کہ ارشد گجراتی کی شاعری سے ہمارے سامنے ایک ایسا
انسان آتا ہے جو عشق کو تکمیل حیات کا وسیلہ سمجھتا ہے، لیکن بوالہوسی کو قریب نہ
دیتا، چنانچہ وہ مجھے مولانا الطاف حسین حالی کے خالوادے کے فرد نظر آئے۔ ار
جذبہ وخیال کی رفعتوں کو بھی مس کیا ہے لیکن اپنی زمین کو بھی تھام رکھا ہے۔ اے کریم
نے اس کتاب کی ہر غزل کو مصور صورت دی ہے۔ ضخامت ۹۶ صفحات، قیمت در
ہے۔

غالب — مرتبین۔ مختار زمن، مشفق خواجہ

کچھ عرصہ قبل مرزا ظفر الحسن نے غالب لائبریری کے زیر اہتمام کراچی سے ایک خو
سہ ماہی ادبی رسالہ غالب فیض صاحب کی سرپرستی میں جاری کیا تھا، مرزا ظفر الحسن کی
کے بعد غالب کی اشاعت رک گئی، لیکن ادبی دنیا میں اس قسم کے علمی، تحقیقی اور تنقی
کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی۔ حال ہی میں غالب کی مجلس نظما نے جس میں بیگم آ
پروفیسر کرار حسین، شان الحق حقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، افتخار احمد عدنی، اور آ
خان جیسے نامور لوگ شامل ہیں غالب کو ایک ششماہی رسالے کی صورت میں چھاپنا
کیا ہے، ترتیب و تدوین کا کام جناب مختار زمن اور مشفق خواجہ صاحب کو تف
ہے۔ غالب کا زیر نظر شمارہ نثر کے متنوع علمی مضامین کا قابل قدر مجموعہ ہے۔ ا
طرۂ امتیاز چند نادر و نایاب چیزیں ہیں، مثال کے طور پر قاضی عبدالودود صاحب
کے خطوط جن سے ان کی شخصیت کے انوکھے زاویے ابھرتے ہیں۔ ابتدا میں دو گو

ا غالب کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں، ایک خصوصی گوشہ فیض صاحب پر شامل کیا
ہے۔ غالب کا سب سے دلچسپ سیکشن "عکس و شخص" ہے۔ جس میں جوش، راشد
ندا اختر، شیخ صلاح الدین، اے ٹی چودھری اور محمود نظامی کے خاکے شائع کیے
ہیں۔ جمیل الدین عالی کا آئس لینڈ کا سفرنامہ بھی اس پرچے کی خاصے کی چیز ہے۔
میں شاعری اور افسانے کے لیے کوئی جگہ نہیں لیکن سفرنامہ، سوانح اور خاکوں نے
جیسا لطف مطالعہ پیدا کیا ہے۔ بے حد سنجیدہ اور رسالہ کثرت سے پڑھے جانے
اہمیت رکھتا ہے۔ ضخامت ۴۲۴ صفحات۔ قیمت ۵۰ روپے۔

اگر آپ کی خریداری نمبر کے سامنے سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کی
خریداری کی مدت ختم ہو گئی۔ براہ کرم اپنا سالانہ چندہ مبلغ /۷۵ روپے
فوراً بھیجیے۔ (منیجر)

بچوں کی نئی دلچسپ کتابیں

ننھے منے بچوں کے لیے

کتاب	قیمت
بتاشے	۶/۵۰
جاں نثار دوست	۵/:
چاند کی بیٹی (با تصویر)	۵/:
دم کٹی لومڑی "	۶/۵۰
جادو کی ہنڈیا "	۵/:
شیرا اور بکری "	۶/۵۰
کوے کا خواب "	۶/۵۰
بھیڑیے کا گانا "	۶/۵۰
چالاک بلی "	۶/:
گدھے نے بجائی بانسری "	۶/۵۰

بڑے بچوں کے لیے

کتاب	قیمت
نرودلی کا آدم خور	۶/=
غریب لکڑہارے کی کہانی	۶/=
خلائی مسافر	۶/-
ہمت کے کرشمے	۶/-
مونٹی کرسٹو کا نواب	۹/:
ہمارے عظیم سائنس داں	۸/:
سام پر کیا گزری	۳/۵۰
غذا کی کہانی	۳/-
زیور	۶/-
شہنشاہ نے کہا میں مفلس ہوں	۶/-
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی	۶/-
سنہرے اصول	۳/-
نرالے گویّے	۲/-
باتونی کچھوا	۲/-
بدر شہزادی	۶/-

کتاب	قیمت
مولانا آزاد کی کہانی	۱۸/:
ننھا سیاح	۷/-
ابو خاں کی بکری	۱۵/-
پرواز کی کہانی	۳/-
سمندری طوفان اور تین لڑکے	۶/-
خالی ہاتھ	۹/:
حاجی بابا کی ڈائری	۶/۵۰
بہادر علی	۷/۵۰
کھلونا نگر	۷/:
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	۶/:
قصہ اژدھا پکڑنے کا	۵/:
ننھا سراغ رساں	۵/:
ابو علی کا جوتا	۵/:
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	۹/-
چور پکڑو	۳/-
چالاک خرگوش کے کارنامے	۷/۵۰
جادو کی سارنگی	۳/-
جادو کا چھلا	۳/-
پانچ جاسوس	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات	۶/:
ہرن کا دل	۲/:
اچھی کہانیاں	۲/۵۰
دریا کی رانی	۲/:
گوہر شہزادی	۳/:
تین اناڑی	۶/:
چوری کی عادت	۳/۵۰
شرارت	۳/:
دلی کی شادی	۴/=
گاندھی جی دکنی افریقہ میں	۲/:
بندر اور نانی	۳/۵۰
رنگوں کی بستی	۴/:

پراسرار غار
عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں
بچوں کے ذاکر صاحب
ننھا منّو
آؤ ڈراما کریں
سلامہ صمصامہ
مچھیرا اور اس کی بیوی
ایک کھلا راز
بھوتوں کا جہاز
صحت کی الف بے
لومڑی کا گھر
بچوں کی کہانیاں
بابا ناصح
ہار کی تلاش
سرخ جوتے
اندرا گاندھی
ننھا فرشتہ
جوہر قابل
بھیڑیے کے بچے
ننھا جبرو
پلک نہ مارو
بچوں کے افسر
شریر شیرا
پری رانی
خطرناک سفر
پرندوں سے جانوروں تک
ٹوٹے کھلونے
اندھے کا بیٹا
پانچ بونے
بچوں کے چار بزرگ دوست
سہانے ترانے

اڈیٹر کتاب نما کے نام

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

کتاب نما شمارہ مئی ۱۹۹۱ء سید حسن اختر عابدی صاحب کا مقالہ یادِ رفتگاں دیکھ کر مجھے ایک بات
تردید کا خیال آیا جسے مختلف موقعوں پر خود فراق نے تحریر و تقریر میں بیان کیا اور ان کی شخصیت
ر قلم اٹھانے والے ہر دانشور نے حوالہ دیا۔ فراق کی بیوی بدشکل اور بدسلیقہ ہرگز نہ تھیں۔ گھر گرہستی
وہر کی خدمت، مہمانوں کی تواضع، بچوں کی تربیت میں وہ روایتی ہندوؤں گھرانوں کی نمایاں
ائندہ رہی تھیں۔ فراق اپنے بچوں کو بہت چاہتے تھے خصوصاً چھوٹی لڑکی پشپا کی ہر خواہش و فرمائش
ری کرتے تھے۔ یونی ورسٹی کوارٹر میں منتقل ہونے سے پہلے وہ بیلی روڈ پر ایک بنگلے کے نصف
ے میں رہتے تھے۔ تنخواہ بھی سو روپے تھی لیکن باورچی کے علاوہ مالی بھی تھا اور انھوں نے
اسٹن موٹر بھی خریدی۔ ملنے کے لیے جو لوگ آتے ان کی تواضع کرکے خوش ہوتے۔ ان کا
رچ تنخواہ سے بڑھ گیا۔ موٹر چند مہینوں بعد ہی علاحدہ کردی۔ فرنیچر کرائے کا تھا جسے
اپس کیا اور یونی ورسٹی کوارٹر میں منتقل ہوگئے۔ نیند انھیں مشکل سے آتی تھی جس سے
زاج میں برہمی کا اضافہ ہوا۔ وہ وقت گزاری کے لیے بھی شعر کہتے تھے۔ اگر فراق شعر
ہنے میں ضبط سے کام لیتے اور ان کا مجموعہ جتنا ہے وہ صرف چوتھائی ہوتا تو مجموعی طور پر
عیار اور زیادہ بلند ہوتا۔ فراق نے اپنی شاعری اور شخصیت سے متعلق کئی مضمون خود لکھے،
لیکن دوسروں کے نام سے شائع کیے۔ فراق اپنے مطالعے اور مشاہدے سے زیادہ اپنی ذہانت
سے کام لیتے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے اپنے بیان کی تائید میں یوروپین مشاہیر کے حوالے وہ
محض لطف بیان کے لیے تصنیف کر دیتے تھے۔ لڑکیوں کی شادی کے بعد انھوں نے شراب
و اپنے اوپر مسلط کیا جس سے بڑی شرمندگی کا انھیں سامنا کرنا پڑا۔ بیوی مجبوراً گھر
چھوڑ کر چلی گئیں۔

ایک مضمون میں کسی صاحب نے لکھا ہے کہ فراق کے ہاں گئے اور دروازے کی گھنٹی
بجائی تو بجائے ملازم کے فراق صاحب خود باہر آئے۔ حیرت ہے فراق کے مکان میں گھنٹی کبھی
نہیں رہی۔ ملاقاتی کارڈ سے بھی وہ چڑتے تھے۔ نیاز فتحپوری اور مجنوں گورکھپوری کے علاوہ
کسی کو بھی وہ زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر پاتے تھے۔ اصغر گونڈوی کی شخصیت اور شاعری

سے متاثر تھے۔ ایک دن اصغر کے ہاں گئے اور بات یہاں سے شروع کی کہ لائف آف محمدؐ کا م
نے مطالعہ کیا تو ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اصغر نے فرمایا فراق صاحب پیغمبر صاحب
سیرت جامع ہے کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی تو مصنف یا قاری کی کم فہمی کو اس میں د
ہوگا۔ کسی مسلمان کے سامنے آپ یہ جملہ نہ دہرائیں کہ سیرتِ محمدی کی کوئی بات آپ کی سمج
میں نہیں آئی۔ مجلس میں اور بھی لوگ تھے۔ فراق مشکل سے بات ہی جانے والے آدمی ت
لیکن اس دن وہ بالکل خاموش ہو گئے اور دوسرے موضوع پر باتیں ہونے لگیں۔

۱۹۴۲ء میں الہ آباد گیا تو ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ پوچھا کتنے دن رہو گے۔
عرض کیا۔ دس بارہ دن۔ ایک استدعا ہے کہ اس دوران جب بھی حاضر ہوں آپ کے او
ملاقاتی موجود نہ ہوں اور موڈ ہو تو انگریزی شاعری کے مختلف عہد کے ممتاز نمایندہ شا
کی نظم کی خصوصیات پر روشنی ڈالیں۔ اتنے میں کچھ اور ملنے والے آ گئے تو کہنے لگے۔ آ
لوگ انھیں نہ جانتے ہوں گے، یہ اب بمبئی میں رہتے ہیں۔ دیکھیے تہذیبی ورثہ کس ک
شکل میں اپنے کو ظاہر کرتا ہے۔ انھوں نے ابھی مجھ سے فرمائش کی کہ دو چار نشستوں م
انگریزی شاعری کی خصوصیات ذہن نشین کرا دوں۔

تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو — وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

سر میں سودا بھی نہیں اور دل میں تمنا بھی نہیں — اور اس ترک محبت کا بھروسا بھی نہیں

ابھی تو بحث کفر و دیں ہے ساقی — ابھی یہ لب کہاں شائستہ جام

کہاں کا وصل تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے — ترے دم بھر کے آجانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی — اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

ہزار بار زمانہ ادھر سے گذرا ہے — نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

جاؤ نہ تم اس گم شدگی پر کہ ہمارے — ہر خواب سے اک عہد کی بنیاد پڑی ہے

داستان عشق کی دہرا گئی تاروں بھری رات — کتنی یادوں کے چراغ آج جلے اور بجھے

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست — وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

کہاں پا کے میں خود کو پاؤں گا تجھی میں کھویا ہوا ہوں میں یہ تری تلاش ہے اس لیے کہ مجھے ہے اپنی ہی جستجو
فراق نے ہمسایوں سے کبھی مراسم نہیں رکھے بلکہ اکثر سنی سنائی باتوں پر ان کے معمولات
کا استہزاء کرتے رہتے۔ کسی صاحب نے مرغی خانہ کھولنے کا مشورہ دیا۔ ڈربے تیار
ہوئے۔ مرغیاں آئیں۔ پڑوسیوں کو مذاق سوجھا' لڑکوں کو ورغلایا کہ ایک دو مرغی
اڑالیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ لڑکے مرغی لے کر بھاگ رہے ہیں اور فراق صاحب ڈنڈا لیے
ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں دو تین اصحاب کے ساتھ صبح گیارہ کے قریب ان کے
گھر گیا تو برآمدے کے دروازے پر تالا تھا' دیکھا اندر کے کمرے میں نیم برہنہ سو رہے ہیں۔
پیچھے کی جانب ہم گئے تو دو کانسٹبل بیٹھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا محلے کے لوگ پریشان
کرتے ہیں اس لیے مستقل دو حفاظتی کانسٹبل دن رات ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔
فراق جہاں باتوں میں لطائف کے ڈھیر لگا دیتے تھے کسی کو بھی زیادہ دیر برداشت
نہیں کر پاتے تھے۔ جوش سے دوستی تھی لیکن نشے میں کئی بار دونوں ایک دوسرے سے
الجھ گئے۔ ساغر کے نام سے چڑتے تھے۔ بھری محفل میں ساغر کو جاہل اور لونڈا کہہ کر
گالی گلوچ شروع ہو جاتی۔ جوش نے کبھی کچھ روپے لیے تھے اور واپس نہیں کیے
اس کا بار بار ذکر کرتے اور گالیاں دیتے۔

جنید احمد' گلستاں بمبئی' ۹۷

ماہ مئی کا کتاب نما دیکھا۔ دو مضمون ایسے ہی جو دل کو چھو لیتے ہیں اور کم از کم میری
معلومات میں بہت ہی اضافے کا باعث ہیں یہ مضامین ہیں تعصب کی زبان' اور
'کچھ سرقے کے بارے میں' یہ دو مضامین پڑھ کر دل بہت خوش ہوا کہ ایسے مضامین
کم ہی پڑھنے کو ملتے ہیں۔
دوسری اہم بات یہ رہی ہے یعنی یادِ رفتگاں' فراق گورکھپوری' میں میر کے
مشہور شعر کو فراق سے منسوب کیا گیا ہے معلوم نہیں کیوں

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

اس کا مقطع ہے ۔

گھبرا نہ میر عشق میں اس سہل زیست پر جب بس چلا نہ کچھ تو میرے یار مر گئے

یہ غزل کلیات میر جلد اول (مکمل چھے دیوان) مرتب ظل عباس عباسی میں ص
۵۰۲ پر ہے۔

نزہت فاطمہ فرنگی محل لکھنؤ

اپریل کے کتاب نما میں "غزل وطن آشوب"، کی اشاعت کے لیے ممنون ہوں۔ مطلع کے پہلے مصرع
میں "گو"، کے بجائے "گویا"، چھپ گیا ہے جس کی تصحیح ضروری ہے۔ صحیح یوں ہے :۔

گو یہ چمن' چمن نہ تھا الہا اجاڑ بن نہ تھا

(ابو محمد سحر' بھوپال)

ڈاکٹر وزیر آغا کا مضمون آدھا سمجھ میں آیا اور آدھا بالکل سمجھ سے باہر رہا۔ ہاں ان کی ہلکی پھلکی تمام باتیں میری سمجھ میں آ گئیں۔

مہمان مدیر مسعود احمد برکاتی کا اشاریہ پوری طرح سمجھ میں آیا۔ موصوف نے جتنی بھی باتیں لکھی ہیں وہ بالکل سچی ہیں۔ اچھا قاری وہی ہوتا ہے جو پڑھنے کے بعد لوٹا بھی دیتا ہے۔ موصوف کا یہ خیال کم از کم میرے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جان بیری ہین کی دونوں نظموں کے ترجمے اتنے اچھے لگے کہ ۔۔۔ کاش ان کی اور بھی نظمیں پڑھ سکتا۔!

ڈاکٹر حنفی اور ظفر صاحب کی غزلیں حسب توقع بے حد پسند آئیں۔ روداد کل ہند پڑھ کر اتنا ضرور ہوا کہ ترقی پسند مصنفین کے بارے میں کچھ اور پڑھنے کی امید بندھ گئی۔

محمد حامد، دربھنگہ، بہار

"گوشۂ جذبی" سے متعلق شائع مضمون و مکتوبات سے جذبی کی شخصیت اور شاعری پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ میں نے آج سے کوئی ۲۴، ۲۵ سال قبل اپنے اسکول کے زمانے میں ایک خط لکھ کر جذبی سے ایک شعر کے ساتھ اپنا دستخط ارسال کرنے کی فرمائش کی تھی۔ جواب میں انھوں نے اپنا درج ذیل شعر لکھ کر بھیجا تھا۔

سیہ رات کیوں کانپ اٹھتی ہے جذبی   سحر کے نو ہوتے ہیں دلکش اشارے

میرے خیال میں یہ شعر جذبی کے عمدہ شعروں میں ایک ہے۔

تاج ہاشمی، سمستی پور

تازہ شمارے میں دسنوی صاحب کا مضمون: "ظ بھائی" میں نے شوق اور دلچسپی سے پڑھا۔ اس سے مرحوم کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر اچھی اور مفید روشنی پڑتی ہے، مگر یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک اہم مسئلے پر دسنوی صاحب نے خاموشی سے کام لیا ہے۔ ظ صاحب نے اپنے انتقال سے کچھ زیادہ، دو سال پہلے اپنے ایک مضمون میں، جو ماہنامہ ایوان اردو کے آزاد نمبر (بابت دسمبر ۸۸ ۱۹ء) میں شائع ہوا تھا، مولانا آزاد کی ایک مشہور اور اہم تقریر کو فرضی لکھا ہے۔ یہ مضمون ان کی کتاب: "مولانا آزاد کا ذہنی سفر" میں بھی شامل ہے، جس کا دسنوی صاحب نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے۔ چونکہ دسنوی صاحب کو مولانا آزاد سے غیر معمولی دلچسپی ہے اور انھوں نے ان پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، اس لیے مجھے توقع تھی کہ وہ چاہے اشارتاً ہی سہی، اس اہم مسئلے پر ضرور لکھیں گے، مگر مایوسی ہوئی۔ اس کی وجہ پر صرف دسنوی صاحب ہی روشنی ڈال سکتے ہیں۔

عبداللطیف اعظمی

ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلد یں آنا ضروری ہیں)

اردو زبان و قواعد (حصہ اوّل)

مصنف: شفیع احمد صدیقی
اشاعت: ۱۹۹۱ء قیمت: ۱۵ روپے
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
مبصر: عبداللہ ولی بخش قادری

ہمارے عہد کی سیاست نے اردو کے ساتھ جو کھیل کھیلا ہے وہ ثقافتی استیصال کی ایسی داستان ہے جسے ہمیشہ تنگ دلی اور تنگ نظری کی عریاں مثال کے طور پر دُہرایا جائے گا لیکن ساتھ ہی ساتھ اردو کے پائے ثبات کی بھی داد دینی ہوگی جس نے ہر حال میں جینے کی قسم کھائی ہے۔ یوں تو آزادیِ وطن کی نمودِ صبح سے ہی اس پر عرصۂ حیات تنگ کیے ہوئے ہے تاہم اس کی ترویج و اشاعت کا سلسلہ جاری ہے گو اس کی تدریس کے مواقع ناپید ہوتے جاتے ہیں۔ وہ آج نامساعد حالات کی آلودگی میں سانس لے رہی ہے اور اس کے طالب علموں کو اپنے ماحول سے سیکھنے اور برتنے کے لیے بہت کم سہارا مل پاتا ہے۔ جو کچھ تھوڑی بہت اردو ان کے کان میں پڑتی ہے یا ادھر ادھر کچھ نظر آجاتی ہے وہ عموماً کوئی معیار اور سلیقہ نہیں رکھتی ہے اس سے کام بھلے ہی نکل جائے مگر بات نہیں بنتی۔ محض زبان چلانے سے زبان نہیں آجاتی۔ اس کے آداب سیکھنا ہوتے ہیں اس کی قواعد پر تکیہ درکار ہوتا ہے۔ اس لیے موجودہ حالات میں صحتِ زبان اور ذوقِ زبان کے لیے مدارس کے اندر زبان و قواعد پر پہلے سے کہیں زیادہ توجہ ہونی چاہیے۔ اس غرض سے اگر نظر اٹھا کر دیکھا جائے تو بہت کم کتابیں میسّر آتی ہیں اور جو چند دستیاب بھی ہیں وہ عموماً اپنے وزن سے بوجھل ملتی ہیں اور نوخیز ذہنوں کی استعداد اور افتاد کے پیشِ نظر کچھ زیادہ موزوں نہیں ٹھہرتیں۔

اس پس منظر میں شفیع احمد صدیقی کی کتاب 'اردو زبان و قواعد' (حصہ اوّل) بڑی بروقت پیش کش نظر آتی ہے۔ اس کی اوّلین خوبی تو یہی ہے کہ اسے مڈل، سیکنڈری اور جامعہ اردو علی گڑھ کے نصاب کے مطابق تیار کیا گیا ہے، گویا وہ اپنا ایک واضح حلقہ اور میدان کار رکھتی ہے اور یوں اپنی سطح کا تعین بھی کر دیتی ہے۔ موجودہ کتاب دراصل حصہ اوّل ہے جو کہ علم ہجا، علمِ صرف، اور علم نحو پر مشتمل ہے۔ اس کے حصہ دوم میں علم بیان اور علم عروض کے موضوعات شامل کیے

جائیں گے۔

شفیع صاحب نے آسان زبان میں زبان و قواعد کے رموز و علائم سمجھائے ہیں۔ وہ ایک ذی علم اور تجربہ کار استاد ہیں۔ ان کی منکسر مزاجی نے بس اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ راقم الحروف نے طلبہ کی ضرورت کے پیش نظر اپنی محدود معلومات کے باوجود اس کتاب کو صرف تدریسی تجربات کی روشنی میں اس طرح ترتیب دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ قواعد کے موجودہ نظریہ تعلیم کے مطابق عملی قواعد سے قریب تر ہو۔ ان کے اس بیان میں لفظ صرف کے بعد جو کچھ کہا گیا ہے اس میں اس کتاب کا نمایاں وصف مضمر ہے اور اسی بنا پر اس کے مفید اور کارآمد ہونے کی ضمانت ہو جاتی ہے۔

اس کتاب میں مشق کرانے کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی ہے اور مختلف انداز سے طلبہ کو زبان و قواعد سمجھنے اور برتنے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ محاوروں اور ان کے استعمال کا بھی مناسب طور پر اہتمام کیا گیا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ خطوط نویسی سے متعلق ہے۔ یہاں خطوط کے اجزائے ترکیبی اور ان کی نوعیت ہی بتا کر بات ختم نہیں کر دی گئی ہے بلکہ خطوط کے وافر نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔ اس طور سے یہ کتاب جو کچھ بتاتی اور سمجھاتی ہے اس کا اعادہ اور مشق بھی کرائی جاتی ہے۔ نیز نمونے اور مثالوں کے ذریعے آموختے کو ذہن پر نقش بھی کرتی جاتی ہے وہ ایک اچھی درسی کتاب ہونے کے علاوہ ایک رہنما (گائڈ) اور ایک تحریری کام کی کتاب (ورک بک) کی صفات بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

یہ کتاب اردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ مدارس کے طلبہ کے لیے ایسی کارآمد کتاب کے لیے اکادمی کو مبارک باد پیش کرنے کے ساتھ اس توقع کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دوسرا حصہ بھی اس تعلیمی سال کے اندر جلد از جلد شائع ہو جائے گا۔ امید ہے کہ ثانوی مدارس کے طلبہ و طالبات اس حصہ اول سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔ اس کی کتابت و طباعت بھی صاف ستھری ہے۔

لمس ہوا

شاعر: کیلاش ماہر
قیمت:
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵
مبصر: ناز مانکپوری

کیلاش ماہر غزل کے روایتی شاعر نہیں ہیں۔ وہ شاعر ہیں اس لیے کہ وہ شاعر ہیں اور کوئی جبھی شاعر ہوتا ہے جب کائنات کا دل اس کے سینے میں دھڑکتا ہے۔ انھوں نے غم جاناں کی بھی چوٹ سہی ہے اور غم دوراں کی بھی۔ ان کا کلام ہر قسم کی دھڑکنوں کی صدائے بازگشت ہے۔ انھوں نے خود کو بھی کو پہچانا ہے، اپنے محبوب کو بھی پہچانا ہے اور اس انسان کو بھی پہچانا ہے جو دور حاضرہ کے سیاسی، سماجی اور معاشی بحران کا شکار ہے اور بڑا الجھا کراہ رہا ہے۔ جب وہ عاشق ہیں تو اپنے کلام میں اردو کے روایتی عاشق نہیں بلکہ سچے عاشق نظ

آتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے۔

جانے کیا سوچ کے ہم تجھ سے وفا کرتے ہیں ۔ قرض ہے پچھلے جنم کا سو ادا کرتے ہیں
رشتۂ درد کی میراث ملی ہے ماہر ۔ ہم ترے نام پہ جینے کی خطا کرتے ہیں
انجانے لوگوں تک پہنچا ذکر تمھاری چاہت کا ۔ گلی گلی مشہور ہوا ہے ماہر کا دیوانہ پن

روایتی عشق میں معیاری عشق وہ ہے جس میں عاشق فنافی المحبوب ہو جائے۔ ماہر محبوب کی اس وحدت کے قائل نہیں۔ ان کا عشق انگریزی شاعر حیلے کے عشق جیسا ہے۔

ازل سے ہے کہیں بھی کوئی نسبت سانولے پن سے ۔ جہاں تم یا کوئی تم سا نظر آیا چلے آئے

عشق میں یہ محرومی عام ہے اور اس کی شکایت بھی عام ہے کہ آرزو پوری ہو کے بھی پوری نہیں ہوتی۔ چنانچہ ماہر نے بھی اس محرومی کا شکوہ کیا لیکن اسے کوئی فلسفیانہ رنگ نہیں دیا۔ جس سے تغزل کا رسیلا پن کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔

کچھ ہو ساقی یہ ترا جام عنایت تو نہیں ۔ دل میں حسرت ہے مگر ہات میں طاقت تو نہیں
اک اچٹتا سا کرم بھی نہ میسّر آیا ۔ اہل غم سے تیری نظروں کو عداوت تو نہیں

شاعر خوددار بھی ہوتا ہے چنانچہ ماہر کی اس محرومی کا سبب اکثر ان کی خودداری بھی ہو جاتی ہے۔

بخشش عام سہی تیری نگاہوں میں مگر ۔ اپنا دامن کبھی پھیلاؤں یہ عادت تو نہیں

یہ وارداتِ عشق کیسے رہیں؟ کتنے چڑھاؤ اتار ہیں ماہر کی محبت میں؟ محبت معیاری نہیں نہ سہی محبت محبت تو ہے اور محبت کا معیار صرف محبت ہے۔ وہ معیار نہیں جو عشق کے دقیانوسوں کی قدامت پسندی کی اختراع ہے۔

یہ ماہر کی غزلیہ شاعری کا غزلیہ رخ ہے۔ اب ذرا دوسرا رخ بھی دیکھیے جس میں غم دوراں کی بھی جھلک ہے۔ کوئی بھی شاعر بیسویں صدی کا شاعر نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر نہیں ہوا۔ بیسویں صدی کی پہلی دو دہائیوں کے گزرنے کے بعد ہر نوجوان شاعر نے ترقی پسند شعری روایات سے فیض اٹھایا اور ان روایات کو اپنی آواز میں ڈھال کر تخلیقی فکر کے لیے نئے افق تلاش کیے۔ کیلاش ماہر کا ادبی کردار آزادی کے بعد کا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں حالی اور چکبست اور سرور کے نئے پن سے آگے کی بات ہے اور اس نئے پن کی وجہ سے وہ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

ماہر کی غزلیہ شاعری میں وہ سب کچھ ہے جو غزل کو غزل بناتے ہیں۔ بقول قمر رئیس "ان کے تجربات کی شدت اور کلاسیکی طرز بیان کو سیّال بنا کر نئے معنوی امکانات سے آشنا کرتی ہے اور فرسودگی سے بچاتی ہے۔" درج ذیل اشعار کو دیکھیے اور محسوس کیجیے کہ غم جاناں اور غم دوراں کتنے قریب قریب ہیں اور اکثر دونوں ایک ہی نظر آتے ہیں۔

یہ زندگی حیات نما ہو تو بات ہے ۔ غم ہی بقدر ظرف ملا ہو تو بات ہے

شعلہ نشانیاں بھی ترے عشق تک ہیں غم ہی بقدر ظرف ملا ہو تو بات ہے
رنگ زمانہ دیکھ کے ترک وفا سہی دل سے ترا خیال گیا ہو تو بات ہے
چھیڑی تھی شام شکن در شکن کی بات منسوب ہم سے ہو گئی دار و رسن کی بات

ان اشعار میں ہر استعارہ، ہر لفظ، ہر ترکیب وہی ہے جو کلاسیکی بھی ہے لیکن ان مانوس الفاظ و تراکیب میں ایسی معنوی گہرائیاں اور تلازمات ضرور ہیں جو نشاندہی کرتے ہیں کہ شاعر واقف زمانہ بھی ہے جہاں رنگ زمانہ شاعر کی ترک وفا کے لیے مجبور کرتا ہے وہاں شاعر میں یہ استعداد و صلاحیت بھی پیدا کرتا ہے کہ وہ ہر غم کو غم جاناں بنادے اور اس طرح وہ آپ بیتی کو جگ بیتی بھی بنا دیتا ہے اور ناسازگار حالات کو سازگار بنانے کے لیے طوق و رسن کی بات بھی کرنے لگتا ہے اور شاندار مستقبل کے حسین خواب بھی دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن یہ حسین خواب ماہر کے یہاں اکثر دھندلا گئے ہیں اور ان میں مجاز کی حزنیت آ گئی ہے جو کلام کو حسن بھی بخشتی ہے اور ایک طرح کی پر اسراریت بھی اور اس طرح غزل کا غزل پن ہمارے سامنے پوری طرح جلوہ گر ہوتا ہے۔ ماہر یہاں مجاز سے تھوڑا آگے بھی بڑھ جاتے ہیں اور فراق سے متاثر نظر آنے لگتے ہیں۔ ماہر بھی پراسرار فضا کی تخلیق میں معقولیت کے پہلو نکال لیتے ہیں اور فراق کی طرح ایسی لفظی تصویریں ہمارے سامنے لا کھڑی کرتے ہیں کہ ہم کچھ کھوئے کھوئے سے اور کچھ پائے سے نظر آنے لگتے ہیں۔ چند اور اشعار دیکھیے۔

گرد سی اڑ گئی ہر منزل اندوہ و نشاط ہم سفر گردش حالات کہاں تھی پہلے
سائے ہیں گوش بر آواز ذرا آہستہ مولو آج کی شب ذکر وفا آہستہ

آنکھ نے دیکھا نہ ہو دل تو مگر جانتا ہے کون دیتا ہے دریچوں پہ صدا آہستہ

جس کا تھا انتظار صدیوں سے کاش اپنی ہی وہ صدا نکلے

بہرحال ان آوازوں میں جن کی شاعر کو تلاش ہے سبھی کچھ کھویا کھویا نہیں ہے کچھ پایا پایا ہوا بھی ہے اور یہ پایا پن ایک خوبصورت مستقبل ہے۔

آثار الصنادید

تالیف : سر سید احمد خاں
مرتب : ڈاکٹر خلیق انجم (تین جلدیں)
قیمت مکمل سیٹ : تین سو دس روپے
مبصر : ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی
ناشر : اردو اکادمی دہلی گھٹا مسجد روڈ دریا گنج نئی دہلی
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

اردو تحقیق و تنقید کے میدان میں ڈاکٹر خلیق انجم ایک مانے ہوئے محقق نقاد اور صاحب طرز ادیب ہیں۔

برصغیر ہندو پاک اور اس کے علاوہ جہاں جہاں تک اردو کی سرحدیں پھیلی ہوئی ہیں لوگ ان کے نام سے واقف ہیں۔ وہ گذشتہ پچیس تیس سال سے اردو زبان وادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ خلیق انجم صاحب بیش تیس کتابوں کے مصنّف و مولّف ہیں۔ ان میں ان کی ایک اہم کتاب "مرزا محمد رفیع سودا" ہے۔ جو ہندستان کی بعض جامعات کے نصاب میں بھی شامل ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں پر انھوں نے پی ایچ۔ ڈی کے لیے کام کیا تھا۔ علاوہ ازیں ان کی اہم کتابوں میں متنی تنقید اور خطوط غالب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ادھر گذشتہ پانچ چھے برس سے ان کی دلچسپی تاریخ و ثقافت، فن تعمیر اور آثار قدیمہ سے ہوئی ہے۔ ان کی اس نوع کی تصانیف میں "دلی کے آثارِ قدیمہ" اور دلی کی درگاہ شاہ مرداں خاص طور پر سامنے آئی ہیں۔ لیکن ہمارے تبصرے کا موضوع ان کی ترتیب دی ہوئی "آثار الصنادید" ہے۔ جو حال ہی میں دلی اردو اکادمی کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے دلّی کے آثارِ قدیمہ اور فن تعمیر سے متعلق اردو اکادمی کے ماہنامہ "مجلّے ایوان اردو" میں تقریباً تیرہ چودہ قسطوں میں مضامین شائع کرائے تھے۔ مختلف عہد کے فن تعمیر اور آثار قدیمہ پر اُن کا مطالعہ بہت عمیق اور وسیع ہے۔

آثار الصنادید کا زیرِ نظر اڈیشن جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ جلد اول میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کا مبسوط اور جامع مقدمہ اور آثار الصنادید کے متن کا ایک بڑا حصہ شامل ہے۔ انھوں نے اس مقدمے میں مختلف عہد کی تعمیرات اور آثار قدیمہ سے تفصیلی بحث کی ہے۔ جو یقیناً ایک دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ذیل میں انھوں نے فن تعمیر اور مسلمان، فن تعمیر میں عبادت گاہیں، مسلمانوں کی پہلی فن تعمیر مسجد نبوی، عرب سے باہر مسلمانوں کی پہلی عمارت، مغربی اموی اور اندلسی فن، ایرانی تعمیر فن، اسلامی فن تعمیر، سلجوقی فن تعمیر، ایوبی فن تعمیر، عثمانی تزک و فن، اسلامی فن تعمیر میں آرائش کے تحت اینٹوں سے آرائش، سنگ مرمر کا استعمال، اسٹکو، نسخی گل کاریاں اور کتبہ نگاری، عمارتوں پر مجسمہ سازی، پچی کاری، کاشی کاری اور رنگوں کا استعمال وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔ علاوہ ازیں ہندستان کے حکمرانوں کی فن تعمیر کے تحت خاندان غلامان کی تعمیرات، خاندان تغلق کی تعمیرات، خاندان خلجی کی تعمیرات، خاندان سید کی تعمیرات، سوری خاندان کی تعمیرات، اور مغل عہد کی تعمیرات کا عہد بہ عہد جائزہ لیا ہے۔ شہر دلی کے مختلف ناموں کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں سرسید کی بعض اہم تاریخی کتابوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

جلد دوم میں دلی کی عمارتوں کے نقشے "کتبے" اور چند تصاویر شامل ہیں۔ تیسری اور آخری جلد میں متن کا وہ حصہ شامل ہے جس میں شاہ جہاں آباد کے لوگوں کا ذکر ہے۔ اس اڈیشن میں دہلی کے مشائخ، مجذوبین حکما، علمائے دین، قرا، حفاظ، خوش نویس، نیز مصوّروں اور موسیقاروں کے حالات و کوائف کے علاوہ غالب! مولوی امام بخش صہبائی اور مولانا صدرالدین آزردہ کی تقاریظ بھی شامل ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے آثار الصنادید کو پہلی بار متنی تنقید کے طریقہ کار اور جدید اصولوں کے تحت ترتیب دیا ہے۔ اس سے قبل آثار الصنادید پر اس نوع کا کام سامنے نہیں آیا۔ اگرچہ یہ کام ایک پروجیکٹ کے طور پر شروع کیا جاتا اور اس میں "آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا" کے ماہرین بھی شامل ہوتے لیکن اس مرد مجاہد نے گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں تنہا آثارِ قدیمہ کو تلاش کر کے اپنے کیمرے سے خود فوٹوگراف فراہم

کیں جو اس اڈیشن کے دوسرے اور تیسرے حصے میں شامل ہیں۔ اس طرح کا کام تحقیق اور آثار قدیمہ میں گہری دلچسپی رکھنے والا شخص ہی سرانجام دے سکتا ہے۔

اس اڈیشن میں خلیق انجم صاحب نے دلی کے آثار مختلف آثار قدیمہ کی وضاحتی کتابیات بھی تیار کی ہے اور ایک ایک آثار پر تقریباً سو سو ماخذ تلاش کر کے انھیں کتاب میں شامل کیا ہے۔ اور حواشی میں ان سے متعلق اردو، فارسی اور انگریزی ماخذوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

سرزمین دہلی پر تعمیر ہونے والے تقریباً ساڑھے نو سو سال کے آثار قدیمہ کا ذکر اور مختلف عہد کی تعمیر پر لکھنا اور ان سب کا عہد بہ عہد جائزہ لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ لیکن خلیق انجم صاحب کی محنت اور جانفشانی اور ان کی غیر معمولی صلاحیتوں نے اس کام کو بحسن وخوبی پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔

آثار الصنادید کے پہلے اڈیشن کے چوتھے باب میں شاہ جہاں آباد کے لوگوں کا بیان ہے۔ سرسید نے دوسرے اڈیشن میں پورا باب حذف کر دیا تھا، لیکن زیر نظر اڈیشن میں اس باب کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ جس سے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔

زیر ترتیب اڈیشن کے مطالعہ کے بعد نہ صرف آثار الصنادید کا مطالعہ مکمل ہو جاتا ہے بلکہ آثار الصنادید کے بعد یا اس سے پہلے فن تعمیر پر لکھی گئی کتابوں کے بارے میں بھرپور معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔

جب کسی متن کی تدوین اس کی تالیف کے کچھ عرصہ بعد عمل میں آتی ہے۔ تو ایسی صورت میں متنی نقاد کی ذمے داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں جس نے اس کی تدوین کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ سرسید نے دلی کی آثار قدیمہ اور تہذیب و ثقافت میں جن ماخذوں کی مدد لی تھی آج کے زمانے میں ان کی توثیق کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ مرتب ایسے ماخذوں کی نشاندہی بھی کرے جس پر اصل مصنف کی نگاہ نہ گئی ہو۔ اور آثار الصنادید کی ترتیب میں ہی ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا وقار قائم ہوتا ہے۔

سرسید کی لکھی ہوئی آثار الصنادید وہی شخص مرتب کر سکتا تھا جو ادیب ہو اور انیسویں صدی کے ادب پر اس کی گہری نظر ہو۔ متنی نقاد ہو اور اس فن کے جدید اصولوں سے واقف ہو۔ فن تعمیر سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ اور ہندستان میں مسلمانوں کی تاریخ سے بہت اچھی طرح واقف ہو، یہ تمام صلاحیتیں ڈاکٹر خلیق انجم میں موجود ہیں۔ اس لیے انھوں نے آثار الصنادید اس انداز میں مرتب کی ہے کہ یہ تاریخی اور متنی تنقید کا قابل تقلید نمونہ ہے۔ اس کام کیلیے ہم ڈاکٹر خلیق انجم کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اور دلی اردو اکادمی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اس نے ایسی خوب صورت کتاب شائع کی۔

سہ ماہی ذہن جدید
(شمارہ ۱ اور ۲)

مرتب: زبیر رضوی
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی
مبصر: مظہر امام
قیمت فی شمارہ: بیس روپے

بہت دنوں کے بعد اردو کا ایک ایسا جریدہ منظر عام پر آیا ہے، جو چونکاتا ہی نہیں، جھنجھوڑتا بھی ہے۔ میں نے جھنجھوڑنے کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے۔ چونکانا" ایک لمحاتی طرز عمل ہے اور "جھنجھوڑنا" نسبتاً دیرپا طریق عمل کو ظاہر کرتا ہے۔ اس رسالے کا

"ذہن جدید" ہے اور اس کے مرتب زبیر رضوی ہیں جنھیں بحیثیت شاعر درجۂ اعتبار حاصل ہے۔

سہ ماہی "ذہن جدید کا پہلا شمارہ ہی مرکز گفتگو تھا کہ دوسرا شمارہ بھی ٹھیک تین ماہ بعد منصۂ شہود پر آگیا ہے۔ پہلی ہی نظر میں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ آج کا رسالہ ہے۔ اردو ادب کے تخلیقی نمونوں کو پیش کرنے کے علاوہ ہندوستانی اور عالمی ادب، مصوری، موسیقی، فلم، تھیٹر وغیرہ میں جو تازہ ترین صورتِ حال ہے اس کے بارے میں کسی نظریاتی موشگافی کے بغیر یہ جریدہ معروضی طور پر پرکشش انداز میں معلومات بہم پہنچاتا ہے اور سیاسی و عمرانی مسائل سے بھی صرف نظر نہیں کرتا۔ اس رسالے کا خاص وصف اس کی READABILITY ہے یعنی "ذہن جدید" کا مطالعہ پہلے صفحے سے آخری صفحے کے ساتھ یکساں دلچسپی کے ساتھ بغیر کسی جبر و اکراہ کے، کیا جا سکتا ہے۔

جریدے کی ابتدا کسی نہ کسی بحث سے ہوتی ہے۔ پہلے شمارے میں "اشتراکی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کے پیش نظر ترقی پسندی کی معنویت" پر بلراج کومل، شمس الرحمن فاروقی، ڈاکٹر قمر رئیس، دیویندر اسر، اور وحید اختر نے اظہار خیال کیا ہے۔ اس بحث سے پہلے میخائیل گورباچوف کے اس نہایت اہم انٹرویو کا اقتباس دیا گیا ہے، مشہور امریکی جریدے "ٹائم میگزین" نے ان سے لیا اور جس کی اشاعت اس کے ۴ رجون ۹۰ء کے شمارے میں ہوئی تھی۔ "بحث" ہی کے باب میں باقر مہدی کے مضمون "ترقی پسندی اور جدیدیت کی کشمکش" کا دوسرا حصہ شریک ہے۔ اکھڑی اکھڑی زبان اور بعض متضاد بیانات کے باوجود مضمون خاصا معلومات افزا ہے۔

دوسرے شمارے کی بحث "اردو فکشن، تنقید اور روایت" سے متعلق ہے۔ شرکاء ہیں۔ مظفر علی سید، انتظار حسین اور مسعود اشعر۔ فکشن کی تنقید کے باعث اس بحث میں بہت سی غیر رسمی باتوں کا اظہار ہوا ہے اور ان پر مزید گفتگو ہونی چاہیے۔ مظفر علی سید کی مختصر تحریر (یا گفتگو جو ضبط تحریر میں لائی گئی ہے) ہندوستان والوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اسی حصے میں جوگندر پال کا مضمون "اردو کہانی کا سفر" بھی شامل ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ ایسی کئی باتیں ہیں جو صرف جوگندر پال ہی کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ اس میں نئے الفاظ تراشنے کا عمل بھی ملتا ہے۔ یہ ساری بحثیں فکر انگیز ہیں۔

دونوں شماروں کا افسانوی حصہ جاندار ہے نام بھی اچھے اور درشن بھی اچھے۔ پہلے شمارے میں شامل بانو قدسیہ کا افسانہ "دربدر" فن کی بلندیوں کو چھوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دو نسلوں اور دو تہذیبوں کے ذہنی رویوں کے تفاوت، زر کی طمع میں ڈوبے ہوئے بیٹے کے ہاتھوں ماضی، مذہب اور عقیدے سے جڑے ہوئے باپ کا قتل کچھ اتنی اثر آفرینی کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ اس کی مثال اردو افسانے میں شاذ ہی ملے گی۔ سریندر پرکاش کے دونوں ہی افسانے "خیال صورت" اور "حاضری جاری" قابل توجہ ہیں لیکن موخر الذکر تو ان کے بہترین افسانوں کی صف،

میں بلا تکلف شامل ہو سکتا ہے۔ جیلانی بانو کی "ابن مریم" کو بھی ان کی بہت اچھی کہانیوں میں شمار کرنا چاہیے۔ انور عظیم اور عوض سعید کی کہانیاں بھی اپنی بعض باطنی خصوصیات کی بنا پر متوجہ کرتی ہیں۔ عبداللہ حسین کے نئے ناولٹ "قید" کا ایک ٹکڑا بھی افسانے کے باب میں پیش کیا گیا ہے۔

ممتاز مفتی اس وقت ہمارے بزرگ ترین افسانہ نگاروں میں ہیں لیکن ان کا قلم بھی تر و تازہ ہے ان کے "گوشے" سے پہلے شمارے کو زینت بخشی گئی ہے۔ اس گوشے میں ممتاز مفتی کے جانے پہچانے افسانے "دیکھن دکھن" کے علاوہ اشفاق احمد کا لکھا ہوا خوبصورت خاکہ اور ممتاز مفتی سے زبیر رضوی اور مسعود اشعر کا لیا ہوا ایک انٹرویو بھی شامل ہے۔ ممتاز مفتی لاگ لپیٹ کے بغیر لکھنے اور باتیں کرنے کے قائل ہیں ان کی باتیں دلچسپ بھی ہیں اور ذہن کو متحرک بھی کرتی ہیں۔

دوسرے شمارے کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں انتظار حسین، رضیہ فصیح احمد، رشید احمد مظہر الاسلام اور غلام جیلانی کے نام ہیں۔ ان کے علاوہ موہن تھپلیاں کی ہنا اور بی ہیر کاش کی کنٹر کہانی کے تراجم بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ان کہانیوں سے ان دونوں زبانوں میں لکھے جانے والے افسانوں کے رجحانات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی شمارے میں اصغر وجاہت کا طویل ڈراما (۴۴ صفحات) جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جنما ہی نہیں جو حبیب تنویر کی ہدایت میں اسٹیج ہو چکا ہے، بطور خاص توجہ چاہتا ہے۔ اصغر وجاہت ہندی افسانہ نگار کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ ان کا یہ ڈراما اپنے موضوع کے اعتبار سے طاقتور اور موثر ہے۔

"ذہن جدید" نے طنز و مزاح کا بھی مستقل باب قائم کیا ہے۔ پہلے شمارے میں دلیپ سنگھ کا مضمون "جوس کا گلاس" ہمارے معاشرے اور سیاست کی ریاکاری پر بھرپور طنز ہے۔ دلیپ سنگھ اپنے چوڑے شانوں کی بدولت مزاح نگاروں کی پہلی صف میں شامل ہو گئے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان کے روپ میں کنہیا لال کپور نے دوبارہ جنم لیا ہے۔ دوسرے شمارے میں شامل ان کا مضمون "گوشے میں قفس کے" بھی میرے اس خیال کی تردید کرتا ہے۔

یوسف ناظم کے مزاح کی دلآویز نرم خوئی ان کے مضمون "چند اشیائے خوردنی" میں بھی نمایاں ہے۔ عظیم اختر نے نسبتاً مختصر عرصے میں بحیثیت مزاح نگار اپنے وجود کا احساس دلایا ہے۔ وہ جن کرداروں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بناتے ہیں، وہ اردو دنیا سے متعلق ہمارے جانے پہچانے کردار ہیں اور انھیں ان کی اصل صورت میں دیکھ کر ہمیں ملال ہوتا ہے" ماموں نسیم لالہ" بھی ایک ایسے ہی کردار ہیں۔

"ذہن جدید" کے پہلے شمارے میں بلراج کومل، محمد علوی، وحید اختر مخمور سعیدی اور زبیر رضوی کی نظمیں شامل ہیں۔ اس شمارے میں کوئی غزل نہیں ہے لیکن دوسرے شمارے

میں اختر حسن، بلراج کومل، وزیر آغا، ندا فاضلی، عزیز قیسی، کشور ناہید، بشر نواز، انور عظم اور زبیر رضوی کی نظموں کے ساتھ ساتھ باقر مہدی، محمد علوی، شہرت بخاری، محسن یدی اور جاوید ناصر کی غزلیں بھی شامل ہیں۔

پہلے شمارے میں فیض اور قرۃ العین حیدر کے انٹرویو عام لہجے سے مختلف ہیں اور موجودہ ادبی تناظر میں ان کی معنویت قابلِ لحاظ ہے۔

اس جریدے کے دو خاص عنوانات "ہندستانی ادب" اور "عالمی ادب" ہیں۔ پہلے شمارے میں کنڑ، ہندی، پنجابی اور ہندستانی انگریزی ادب کی موجودہ صورت حال پر مضامین ہیں۔ دوسرے شمارے میں خشونت سنگھ سے انٹرویو ہے۔ انھیں کی تحریر اور شخصیت کی طرح دلچسپ! "ہندی کہانی، کل، کل اور آج" کے عنوان سے ایک بصیرت افروز مباحثہ ہے، جس میں اصغر وجاہت، راجندر یادو، رمیش اپادھیائے اور سوئم پرکاش نے حصہ لیا ہے۔

پہلے شمارے میں فلسطین کے احتجاجی ادب (جو "ادب انتفاضہ" کے نام سے موسوم ہے) سے ایک حصہ مختص ہے۔ زبیر احمد فاروقی نے "ادب انتفاضہ" کا تعارف کراتے ہوئے فلسطینی کے دو افسانوں اور دو نظموں کے عمدہ تراجم پیش کیے ہیں۔ نظموں کے منظوم ترجموں میں تخلیقی شان پیدا ہوگئی ہے۔ دوسرے شمارے میں بھی "عالمی ادب" کے تحت زبیر احمد فاروقی نے جدید عربی شاعری پر ایک تعارفی نوٹ کے ساتھ دو جدید عربی شاعروں البارردی اور الشابی کی نظموں کو منظوم اردو جامہ پہنایا ہے۔ اس حصے میں البیر کامیو، روکتا دپاز، انتولیا ہاٹ، ہنگوے، جین آسٹن اور ارونگ ویلس پر تعارفی مضامین اور اسٹفن اسپنڈر کا ایک انٹرویو بہت سی نئی معلومات فراہم کرتے ہیں۔

ان مستقل عنوانات کے علاوہ پہلے شمارے میں رابندر ناتھ ٹیگور اور وکٹوریہ اوکیمپو کے جذباتی لگاؤ کے سلسلے میں ایک نرم و نازک مضمون ہے۔ اس مضمون میں اسپینی زبان میں لکھی ہوئی وکٹوریہ کی اس خود نوشت سے استفادہ کیا گیا جو اس کی وصیت کے مطابق اس کے انتقال کے بعد ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح دوسرے شمارے میں بنگالی زبان کے لٹل میگزین ———— ویڈیو میگزین اور ملیالم کی مقبول صحافت پر مضامین ہیں اور پھر کتابوں کی باتیں! اردو کتابوں پر تبصروں کے ساتھ ساتھ انگریزی کی ان کتابوں کا بھی تعارف کرایا گیا ہے جس کا انگریزی رسائل اور اخبارات میں چرچا ہوتا ہے، مگر اردو والے ان سے عموماً بے خبر ہوتے ہیں۔

اب تک تو ذکر تھا ادب کا۔ لیکن "ذہن جدید" نے صرف ادب تک خود کو محدود نہیں رکھا ہے اور یہی اس کی بڑی خوبی ہے۔ ہمارے رسائل کی عام تصویر یہ ہے۔ کچھ مضامین (جنھیں اکثر "مقالے" کہا جاتا ہے)، کچھ افسانے، کچھ نظمیں، غزلیں، چند کتابوں پر تبصرے قارئین کے کچھ خطوط۔ "اللہ اللہ خیر صلا"۔ "ذہن جدید" ایک مختلف نوعیت کا رسالہ ہے اور صحیح معنوں میں ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔

"ذہن جدید" غالباً اردو کا پہلا رسالہ ہے جس میں اردو ادب کی تخلیقات اور

مباحث کے ساتھ ہندستان کی دیگر زبانوں کے ادب اور غیر ملکی ادب کے تازہ رجحانات سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں فلم تھیٹر، مصوری (کینوس) اور موسیقی پر نہایت دلچسپ پیرایہ میں معلوماتی مضامین پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلے شمارے میں منو پاریکھ اور دوسرے شمارے میں وان گو، ایم۔ ایف حسین، کرشن کھنہ، ستیش گجرال اور ایف۔ این سوزا جیسے ماہرین فن مصوری پر اچھا جوا ز پیش کیا گیا ہے۔ خود حسین کا تحریر کردہ ایک مضمون بھی ہے اور ان کی نظمیں بھی۔ اس شمارے میں خاصہ بڑا حصہ (تیس صفحات) فن مصوری سے متعلق ہے۔ پہلے شمارے میں "مدھوبنی پینٹنگ" پر اور دوسرے شمارے میں ایک مضمون "عصری مصوری پر بھی ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اب سے ۲۵ سال پہلے ہی متھلا کی "مدھوبنی مصوری نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی تھی۔

پہلے شمارے کے حصہ فلم میں لتا منگیشکر سے ۱۸ سال پہلے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے لیے لیا ہوا ایک غیر مطبوعہ اہم انٹرویو ہے۔ پھر گریتا گاربو سری لیکھا اور رانورادھا پوروال کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں بڑی دلچسپ اور چونکا دینے والی معلومات ہیں جن سے اردو والے عموماً ناآشنا ہیں۔ دوسرے شمارے میں موسیقار نوشاد پر گرجا راجندرن کا ایک لندن ہے۔ پھر کمرشیل سنیما، فلمی موسیقی کے بدلتے روپ، پیاسا فلموں اور سینما ہال کے متعلق مضامین ہیں۔ جن کے لکھنے والوں میں دیوبیندراسرا اور مشہور فلمی مبصر سبھاش کے جھا شامل ہیں۔

تھیٹر اور اسٹیج کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ یہ روبہ زوال ہے۔ اس سلسلے میں سری رام سنٹر کے ڈائرکٹر سبودھ لال کے مضامین "اچھا سکرپٹ نہیں ملتے" اور "دلی تھیٹر کا منظر نامہ" غور طلب ہیں۔ دوسرے شمارے میں لوک کلا کار تیجن بائی پر دیپا گہلوٹ کا مضمون بھی قابل مطالعہ ہے۔

پہلا شمارہ (ستمبر تا نومبر ۹۰ء) ۲۰۳ اور دوسرا شمارہ (دسمبر ۹۰ء تا فروری ۹۱ء) ۲۲۵ صفحات پر مشتمل ہے لیکن ۳۱ سطری خفی کتابت میں اتنے صفحات سے کہیں زیادہ کا مواد سمویا ہوا ہے۔ ایک شمارے کی قیمت بیس روپے ہے جو اتنے مواد کے پیش نظر کم ہے۔

اس رسالے میں بہت کچھ ہے۔ یہ ایک ایسا متنوع اور رنگا رنگ جریدہ ہے جس کا ایک ادبی اور صحافتی وقار بھی ہے جو لوگ ادب، آرٹ اور کلچر کے مختلف مظاہر اور تیوروں سے باخبر رہنا چاہتے ہوں، ان کے لیے "ذہن جدید" ایک ذہنی اور روحانی ضرورت

اردو صرف و نحو

مصنف: پروفیسر اقتدار حسین خان
قیمت: ۱۶ روپے
مبصر: عبداللہ ولی بخش قادری

اپنے مختصر دیباچہ میں پروفیسر اقتدار حسین خاں رقم طراز ہیں کہ "لسانیات میں زبان کا

ائنسی طور پر مطالعہ کیا جاتا ہے. صرف و نحو لسانیات کی دو اہم شاخیں ہیں. اس میں ہم زبان
ائنظ کی سطح (صرف) سے مکمل جملے (نحو) تک مطالعہ کرتے ہیں. صرف کے لیے لسانیات میں
نئی اصطلاح "تشکیلیات" بھی استعمال ہونے لگی ہے. اگرچہ صرف و نحو قدیم اصطلاحیں ہیں
لیکن جدید لسانیات میں بھی اُن کو نئے معنی دے کر جدید لسانیاتی تصورات کا جائزہ لیا جاتا
ہے"

اس کتاب کا موضوع یہی جدید لسانیاتی تصورات ہیں جنھیں دس ابواب میں تقسیم کیا گیا
ہے پہلے آٹھ باب تشکیلیات (صرف) اور نحو کے بیان پر مبنی ہیں، نویں باب میں قواعد اور اس کا
تصور واضح کیا گیا ہے۔ اور آخری باب چامسکی کے تبادلی قواعد کے تصور کو زیر بحث لاتا ہے۔
اس طور یہ کتاب لسانیات کے مبادیات کا احاطہ کرتی ہے۔ مصنف نے اس دقیق اور
اردو کے طالب علم کے لیے کسی قدر نئے موضوع کو حتی الامکان آسان بنانے کی کوشش
کی ہے۔ ان کا انداز بیان صاف اور سلجھا ہوا ہے۔ اور نئی اصطلاحات کی وضاحت بھی کردی گئی
ہے۔

اردو میں آہستہ آہستہ لسانیات کی طرف توجہ بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس سے شناسائی کا
آغاز ثانوی سطح کے بعد بلکہ پہلی سند حاصل کرنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ نیز ثانوی سطح پر جو
قواعد پڑھائی جاتی ہے۔ اور جس طرح پڑھائی جاتی ہے۔ اس سے طالب علم کی نہ بصیرت میں اضافہ
ہوتا ہے اور نہ ذوقی زبان میں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کم از کم اعلیٰ ثانوی سطح پر قواعد کے نئے
تصورات سے متعارف کرانے کا سلسلہ ضرور شروع ہو جائے۔ بہرکیف لسانیات سے ابھی واقفیت
بہت کم ہے۔ اور اس سے متعلق اردو میں خال خال ہی کتابیں ملتی ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر اقتدار حسین خاں
ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ جنھوں نے اس طرف توجہ فرمائی۔ امید ہے کہ یہ کتاب لسانیات
میں دلچسپی کا موجب ہوگی البتہ کتاب کے عنوان سے قدیم صرف و نحو کی طرف ہی دھیان جاتا ہے اور جو کسی قدر
صراحت کا متقاضی ہے۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

مولانا عبدالملک جامعی نہیں رہے

مدینہ منورہ : ۱۳ اپریل ۹۱ ، بزرگ مبلغ عالم دین مولانا عبدالملک جامعی کا کل یہاں ۹۰ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا ۔ مرحوم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ابتدائی دور کے طلبہ میں تھے ۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے ۔ آپ تبلیغی جماعت کے بانی امیر مولانا محمد الیاس صاحب سے متاثر تھے ۔ اور ۵۰ سال سے مدینہ منورہ میں مقیم تھے ۔ اور حفظ قرآن کی توسیع میں مصروف تھے ۔

انجمن ترقی پسند مصنفین مالیگاؤں کا اعزازی جلسہ

انجمن ترقی پسند مصنفین مالیگاؤں نے حیدر آباد سے آئے ہوئے مہمانان ادیب و نقاد مسر بنواس لاہوٹی اور مشہور شاعر علی احمد جلیل کے اعزاز میں ایک نشست کا انعقاد کیا گیا ۔ صدارت مشہور شاعر حمید انصاری نے کی ۔ سب سے پہلے انجمن کے رکن اور مدیر "بیباک" ویکلی ، جناب ہارون بی ۔ اے ۔ نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ان کا تعارف بھی پیش کیا ۔ اس میٹنگ میں اسحاق خضر صاحب نے ایک مزاحیہ مضمون "دم" رفیع احمد نے انشائیہ ، مجید سرور نے مقالہ ، سر بنواس لاہوٹی نے تبصرہ ، انور فراحیلیک باکس " اور علی احمد جلیل صاحب نے مقالہ "جدید شاعروں میں عورت کا مقام" پڑھا ۔ جبکہ شعرا دور میں ہارون فراز ، اشفاق انجم ، اسحاق خضر الیاس صدیقی ، اسماعیل راز ، پیام انصاری ، اور مہمان شاعر علی احمد جلیل نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ۔

بانسواڑہ میں ایک روزہ سیمینار اور مشاعرہ

ادبی سبھا بانسواڑہ کی جانب سے تاریخ ۲۴ فروری ۱۹۹۱ء کو بہ اشتراک راجستھان اردو اکادمی جے پور "ایک روزہ سیمینار اور کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا ۔ سیمینار کا موضوع تھا ۔ " بانسواڑہ کی ادبی کتابوں پر اظہار خیال " سیمینار میں افتخار امام صدیقی ، مخمور سعیدی ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی ، ش ک نظام ، سید فضل المتین خداداد خاں مونس ، ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی ، اور مقامی ادبا ، شعرا ، و معززین نے شرکت فرمائی ۔

سیمینار کے مہمان خصوصی خداداد خاں مونس تھے ۔ اور صدارت مخمور سعیدی نے فرمائی ۔ ظہیر آتش جوائنٹ سیکریٹری ادبی سبھا نے مہمانوں کا استقبال کیا ۔ اولاً ڈاکٹر شاہد میر نے بانسواڑہ کی ادبی تاریخ اور شعری کارگزاریوں پر روشنی ڈالی ۔ اس کے بعد سیمینار کا باقاعدہ آغاز ہوا ۔ نظامت کے فرائض ش ک نظام نے انجام دیے ۔ مقالات کے بعد افتخار امام صدیقی اور مخمور سعیدی نے مقالات پر تنقیدی بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ اپنی نوعیت کا بانسواڑہ میں پہلا سیمینار ہے ۔

رات دس بجے کل ہند مشاعرہ بصدارت سید فضل المتین اجمیری منعقد ہوا ۔ نظامت ش ک نظام نے فرمائی ۔ مشاعرے میں ، افتخار امام صدیقی مخمور سعیدی ، رحمت امروہوی ، خوشتر مکرانوی ، ش ک

نظام، خداداد خاں مونس۔ شاہد میر، مظفر صدیقی، راشد ٹونکی، ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی، جگجیت نشاط، پریم شنکر شری واستوا، دانش علی گڑھی، عثمان ظہیر، ظہیر آتش، ارمان رتلامی، سعید منظر، سعید روشن، راجندر آز، عطا شیخ، گھنشیام نور نے شرکت فرمائی۔ رات تین بجے مشاعرہ کا اختتام ہوا۔

"ناروے کے بہترین افسانے" کی رسم اجراء

سفارت خانہ ناروے کے خوش نما و سبزہ زار میں ہرچرن چاولہ کی مرتبہ کتاب "ناروے کے بہترین افسانے" کی رسم اجرا، ناروے کے سفیر ہند ہز ایکسیلنسی یوہان گورڈر نے انجام دی۔ اس کتاب میں ناروے کے ممتاز افسانہ نگاروں کے سترہ بہترین افسانے نارویجین زبان سے اردو میں پیش کیے گئے ہیں۔ ہندی اور پنجابی میں الگ الگ کتابوں کی صورت میں انھیں پورنیما چاولہ نے مرتب کیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک یادگار تقریب تھی کہ اس میں اردو، ہندی، پنجابی کے سرکردہ ادیبوں نے شرکت کی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ہرچرن چاولہ کی مساعی کو سراہتے ہوئے کہا کہ دوسری زبانوں کے تراجم سے ہمارا اپنا ادب زیادہ دولت مند ہوتا ہے۔ ہرچرن چاولہ گیارہ سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں جن میں تین ناول اور چھے افسانوی مجموعے ہیں۔ ہندی مجموعے پر ساپتاہک ہندستان کے اڈیٹر ہمانشو جوشی نے اظہار خیال کیا اور پنجابی مجموعے پر مشہور پنجابی افسانہ نگار مہیپ سنگھ نے جو پنجابی کتاب کے ناشر بھی ہیں۔ اس موقع پر ہرچرن چاولہ اور پورنیما چاولہ نے بھی اظہار خیال کیا۔ انھوں نے بتایا کہ دوسرے ملک کے ادب کو سمجھنا کتنا جوکھم کا کام ہے۔

آخری صلیب کا اجراء

۱۱ مارچ کو جھریا ناگرک سمیتی، جھریا کی جانب سے مشہور شاعر شان بھارتی کا دوسرا شعری مجموعہ "آخری صلیب" کا اجراء جناب اے کلام (ڈپٹی چیف مائننگ انجینئر بھارت سرکار) نے فرمایا۔ اس تقریب میں شہود عالم آفاقی (اڈیٹر ماہنامہ "شہود" کلکتہ) نسیم آزر، مفطر عظیم آبادی اور طیب خاں، (اڈیٹر روزنامہ "جن مت" دھنباد) نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ صدارت کے فرائض ملک کے معروف افسانہ نگار الیاس احمد گدی نے انجام دیے۔

اس کے بعد ایک محفل مشاعرہ بھی منعقد ہوئی جس میں مندرجہ ذیل شعراء اکرام کو سامعین نے بار بار زحمتِ سخن دی۔ شہود عالم آفاقی، مفطر عظیم آبادی، سلیم قادری، یٰسین ثاقب، شمیم آرزوی، آمر صدیقی، طیب خاں، ہری ہریانوی، زاہد عیش، صبا انادی، سہیل فیضی، نسیم اختر نسیم، جمال انور اور ریاض انور۔ نقابت کے فرائض نسیم آزر نے بحسن خوبی انجام دیے۔

"پتھروں کی رہگذر" کی اجرائی تقریب اور مشاعرہ

ملت اکیڈمی سستی پور کے وسیع اور پُررونق احاطے میں رضا اشک سستی پوری کے دوسرے مجموعۂ کلام "پتھروں کی رہگذر" کی اجرائی تقریب منعقد ہوئی۔ عطا عابدی (معاون مدیر افکار ملی دہلی) نے کتاب کی ایک جلد جناب ظہیر غازی پوری کو اجرا کے لیے پیش کی۔ ظہیر غازی پوری نے کتاب کا اجرا کیا۔ اس موقع پر پروفیسر اویس احمد دوراں

کی صدارت اور ڈاکٹر شاکر خلیق کی نظامت میں ایک
صوبائی مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ مشاعرہ میں اردو شعراء
کے علاوہ ہندی شعراء کی بھی اچھی خاصی تعداد شریک
تھی۔ چند شعراء کے نام ہیں۔ اویس احمد دوراں،
ظہیر غازی پوری، ش۔م۔ عارف ماہر آروی، مختار
احمد عاصی، شاکر خلیق، عطا عابدی، منظر سلطان،
اسد رضوی، رضا اشک، ناشاد اورنگ آبادی، انیس
صدری، محسن رضا رضوی، اصغر ساحل، شمیم انور،
سیف اللہ سیف، بسمل عارفی کے علاوہ دیگر کئی شعراء
ہندی شاعروں میں رگھوناتھ سدن، یدو نندن
رسیک، نند کشور شرما، نارائن درس، مہیندر جوہر
کے علاوہ دیگر شعراء۔ مشاعرہ بے حد کامیاب
رہا۔ اور ڈھائی بجے شب تک چلتا رہا۔

میکش اکبر آبادی کے انتقال پر جلسہ

آج مورخہ ۸ مئی ۹۱ء کو شعبۂ اردو کے اساتذہ
اور طلباء کا جلسہ ہوا جس میں حضرت میکش اکبر آبادی
کی ادبی اور شعری خدمات کو خراجِ عقیدت پیش
کیا گیا شعبے کے اساتذہ نے مرحوم کے ادبی کارناموں
پر بھی روشنی ڈالی۔ آخر میں مندرجہ ذیل تعزیتی
قرارداد متفقہ طور پر پاس کی گئی۔

جامعہ کے اساتذہ اور طلبا کا یہ جلسہ حضرت
میکش اکبر آبادی کے انتقال پُر ملال پر اپنے گہرے
رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ علامہ میکش اکبر آبادی کے
انتقال سے جو خلا ہوا ہے اس کا پُر ہونا ممکن نہیں
ہے۔ مرحوم ایک قادر الکلام اور پُر گو شاعر نیز تصوف
کے اہم شارح اور ماہر اقبالیات کی حیثیت سے جو بیش
بہا خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ان سے ادب و تہذیب
کی راہیں [illegible] دیر تک اور دور تک روشنی رہے
گی۔ داستانِ شب، اور حرفِ تمنا میکش اکبر آبادی
کے وہ شعری مجموعے ہیں جو ان کی روحانی حیثیت
اور گہرے سماجی و تہذیبی شعور کا ثبوت فراہم کرتے
ہیں۔ نقدِ اقبال اور مسائل تصوف سے موجودہ دور
میں تصوف شناسی اور اقبال شناسی کی نئی راہیں
ہموار ہوئی ہیں۔ مرحوم نے مذہبیات پر بھی کافی
وقیع تحریریں چھوڑی ہیں۔

حضرت میکش اکبر آبادی کی وفات ایک عالم
ایک صوفی ایک شاعر اور ایک ناقد کی موت ہے۔
بارگاہِ خداوندی میں مرحوم کے لیے دست بدعا ہیں
انا للہ و انا الیہ راجعون ۰ پسماندگان کو خدا صبر جمیل
عطا فرمائے۔ اس جلسہ میں پروفیسر عنوان چشتی
قائم مقام ڈین، ڈاکٹر حنیف کیفی صدر شعبہ ڈاکٹر
شہناز انجم، ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر تاج الدین
علوی، ڈاکٹر ضیاء الرحمن صدیقی قیصر اکمل قادری
(بمبئی) اور نعیم چشتی وغیرہ نے شرکت کی۔

پروفیسر گوریکر بمبئی یونی ورسٹی سے فیلو

مہاراشٹر کے گورنر ڈاکٹر سی سبرامنیم نے بمبئی
یونی ورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے پروفیسر
نظام الدین ایس گوریکر کو یونی ورسٹی سینٹ کا ممبر
نامزد کیا ہے۔ ڈاکٹر گوریکر ملازمت سے سبکدوش
ہونے کے بعد اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ انجمن اسلام
کے ناظم اعلیٰ ہیں۔

جناب رشید حسن خاں علیل ہیں

جناب رشید حسن خاں آج کل علیل ہیں اور
دہلی کے ہندو راؤ اسپتال کے نرسنگ ہوم میں داخل
تھے۔ اب اللہ کے فضل سے اچھے ہیں۔ اسپتال سے
آ گئے ہیں۔

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

جولائی ۱۹۹۱ء جلد ۳۱ شمارہ ۷

فی پرچہ 5/=
سالانہ 45/=
غیر ممالک سے
(بذریعہ بحری ڈاک) 110/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 230/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 65/=

ایڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
TELEPHONE. 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید دسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برلی آرٹ پریس پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰ سے شائع کیا

اس شمارے میں

مضامین

نظمیں / غزلیں

طنز و مزاح

کھلے خطوط

جائزے

گوشہ ڈاکٹر خلیق انجم

تحریریں (مضامین کا مجموعہ) ڈاکٹر اسلم پرویز ۵۱/-

فیض احمد فیض شخص اور شاعری (مجموعہ مضامین) مرتبہ اطہر نبی ۱۵۰/-

غالب کچھ مضامین (غالبیات) مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۴۰/-

میر کی غزل گوئی ایک جائزہ (میریات) راشد آذر ۴۵/-

رجب علی بیگ چند تحقیقی مضامین (ادب) حنیف نقوی ۳۵/-

جوش بنام ساغر (خطوط) مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم ۴۰/-

فکر و نظر نامور ان علی گڑھ مجلہ شہریار ۳۰/-

تیسرا کارواں (جلد دوم) ۳۶/-

اقبال کا ذہنی ارتقا ڈاکٹر عبدالمغنی ۳۴/-

ادبی تناظر راج بہادر گوڑ ۳۰/-

یگانہ احوال و آثار نیّر مسعود ۳۰/-

لمحہ لمحہ پیاس (شاعری) کیلاش ماہر ۵۰/-

ضرب آگہی (ملفوظات) محمد آفاق صدیقی ۴۸/-

جنھیں کوئی خوف ہوگا نہ غم (مذہب) علی اصغر چودھری ۱۶/-

دادی کی چارپائی (ڈراما) عائشہ احمد ۳۵/-

یہ گھاؤ یہ پھول (ناول) وشوا ناتھ درد ۴۰/-

نور کی ندیاں رواں (نعتیہ شاعری) نعیم صدیقی ۲۰/-

سیرت فاطمۃ الزہراء رضؓ (سیرت) طالب الہاشمی ۳۰/-

جدید شعری منظر نامہ (تنقید) حامدی کاشمیری ۱۵۰/-

یادوں کا زنداں وحید عرشی ۲۰/-

سرورق: ڈاکٹر خلیق انجم
مصور: اسلم

متحرک منظر کی فریم (افسانے) معین الدین عثمانی ۔/۔

مرشد آباد کے چار کلاسیکی شعرا (مرتبہ یوسف تقی)

آبشار ادب (مجموعہ مضامین) ڈاکٹر ایم آئی ساجد ۔/۔

نظیری کا تخلیقی شعور (تحقیق) ڈاکٹر زینت اللہ جاوید ۱۰/-

فارسی قصیدہ نگاری (تحقیق) نذیر احمد ۲۵۰/-

علوم اسلامیہ اور ہندستانی علماء (تعلیم) محمد سالم قدوائی ۶۰/-

روشن جزیروں کا سفر (شعری مجموعہ) انور مینائی ۔/۔

احمد شوقی ایک مطالعہ محمد اظہر حیات ۲۰/-

ادبی نقوش (سہ ماہی رسالہ) مدیر اعلیٰ بدر اورنگ آبادی فی پرچہ ۔/۔

جمیل الشیم (نعتیہ کلام) مولانا بدر القادری ۔/۔

رنگ و آب (شعری مجموعہ) سید محمود حسن قیصر امروہوی ۹۵/-

سیاحتِ روس ۔ پنڈت جواہر لال نہرو

یادگارِ روزگار ۔ سید بدر الحسن

قتیل شفائی
غالب کالونی سمن آباد۔ لاہور۔
(پاکستان)

آؤ کوئی تفریح کا سامان کیا جائے
پھر سے کسی واعظ کو پریشان کیا جائے

بے لغزش پا مست ہوں اُن آنکھوں سے پی کر
یوں محتسب شہر کو حیران کیا جائے

ہر شے سے مقدس ہے خیالات کا رشتہ
کیوں مصلحتوں پر اُسے قربان کیا جائے

دم گھٹنے لگا ہے مرا بارود کی بو سے
بستے ہوئے شہروں کو نہ ویران کیا جائے

مفلس کے بدن کو بھی ہے چادر کی ضرورت
اب کھل کے مزاروں پہ یہ اعلان کیا جائے

اغیار کے ہاتھوں میں ہوں جس ملک کی باگیں
معزول ہر اُس ملک کا سلطان کیا جائے

وہ شخص جو دیوانوں کی عزت نہیں کرتا
اُس شخص کا بھی چاک گریبان کیا جائے

پہلے بھی قتیلؔ آنکھوں نے کھائے کئی دھوکے
اب اور نہ بینائی کا نقصان کیا جائے

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے
جلسے میں پڑھا گیا

ڈاکٹر طارق سعید
ساکیت پی جی کالج۔ اودھ یونیورسٹی
فیض آباد

وابستگی کے چند نئے مظاہر

میں ہوں، نہیں میں نہیں ہوں کیوں کہ میرے ہونے سے میرا وجود ثابت ہوتا ہے لیکن میرے نہ ہونے سے میرے وجود کی نفی ہوتی ہے اس لیے میں ہوں۔ دراصل ہونا یا نہ ہونا میں کوئی خاص فرق نہیں ہے یہ دوسری بات ہے کہ ہونا نہ ہونے کے مقابلہ میں ایک پیچیدہ صورت ہے۔ بالفرض اگر انسان نہ ہوتا تو اس کا بھلا ہوتا۔ اس کے وجود نے صدمات، اذیت، کشمکش اور زندگی گذارنے کے لیے دو روٹی کا سوال پیدا کیا۔ انسان کے ہونے کے سبب صدمات، اذیت اور کشمکش وغیرہ جیسے الفاظ پیدا ہوئے لیکن اس کے ہونے سے اور روٹی کے سوال سے کیا مطلب؟ روٹی اور مکان سے انسان کے رشتوں کو لے کر ترقی پسندیت کی تبلیغ کیا مناسب ہے؟ سوال یہ ہے کہ "تبلیغ" کہاں سے درمیان میں آگئی؟ خیر، اس سوال سے قطع نظر کیا یہ تماشا نہیں ہے کہ وجود، ہونا، نہ ہونا اور انسان نیز فلسفہ کی بے معنی بحثیں ادب کو زیب دیتی ہیں لیکن ترقی پسند خیالات کا اظہار ادب کے لیے زہر قاتل ہے۔ ترقی پسندیت کے مقابلہ میں جدیدیت اور وابستگی کے مقابلہ میں ناوابستگی کو قطعاً بقا نہیں۔ جدیدیت ایک فیشن ہے اور فیشن کو کبھی دوام نہیں، تاریخ گواہ ہے کہ کبھی کوئی رجحان ۵۰ سال سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت ترقی پسندیت کی راہ پکڑ رہی ہے۔

ایک جدیدیت کا رجحان کیا، دنیا کا کوئی انسان اس حقیقت سے چشم پوشی کی جرأت نہیں کر سکتا ہے کہ وہ ترقی پسندیت کے عنصر سے خالی ہے۔ دنیا کی ہر شے ارتقاء پذیر ہے۔

جہاں ارتقاء نہیں، وہاں جمود اور تعطل ہے۔

میں جو کل تھا، آج وہ نہیں ہوں اور آج جو ہوں کل وہ نہیں رہوں گا؛ تو گویا میرے ارتقاء کی رفتار بہت تیز ہے۔ اور میری ہر لحظہ نت نئی ترقی، میری زندگی کی اصل شان ہے۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

لہٰذا ترقی کا کون منکر ہو سکتا ہے اور ارتقاء کے مظاہر میں ایک کہانی بھی کا بھی تھی جس کا رشتہ زمین سے جڑا تھا جو وجود و عدم کی لایعنی بحثوں سے بے خبر تھی۔ لیکن اب تو وجود اور عدم کو بھی زمین سے مکمل طور پر جوڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور "میں ہوں یا نہیں ہوں" کو بھی ادبی سماجیات کے تناظر میں پڑھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

نا
ڈاکٹر قیصر مسعود کا طویل افسانہ "عطر کافور" حیرت و استعجاب کی فضا سے ماوراء ہو کر انسان کی فطری آزادی "
ار رہا ہے۔ جو بلا شبہ وابستگی کا نیا منظر نامہ ہے۔ دوسری بات ہے کہ ابہام اور ایہام کی دبیز چادریں
ے راستے میں حائل ہیں۔ لیکن زندگی سے جڑے ان نئے رشتوں سے امید کی جا سکتی ہے کہ اب فنکار تجربہ کی
ھوپ میں کھڑا ہے۔ ایک جگہ سرہندر پرکاش لکھتے ہیں، "بغیر سوچے سمجھے کسی نظریہ اور اس نظریہ کا پرچار کرنے
اعت کی ذہنی غلامی کرنا، کسی عملی جدوجہد کے بغیر انقلاب کی آہٹ پر کان لگائے بیٹھنا اور پھر یہ مصرعہ گنگنا کے

ل ع ہ

کھولے کواڑ سُن کے صدا، دیکھا تم نہ تھے

فن کے دائرے میں بالکل شمار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ سچا فن کار دوسروں کے تجربے پر ایمان لانے
لے ذات کو تجربہ کی کڑی دھوپ میں کھڑا کرتا ہے۔" لہ

خدا کا شکر ہے کہ اب وہ ذات کو تجربہ کی کڑی دھوپ میں کھڑا کرنا پسند کرتے ہیں، "جن کی استعارہ
اور ایہام پرستی بقول شہنشاہ مرزا مرحوم کے، ایک نظریہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور اس سے ان
بستگی اتنی شدید ہے کہ وہ ہر صنفِ ادب کو انھیں پیمانوں سے جانچنا پسند کرتے ہیں۔" ؎

لیکن ترقی پسندیت اپنے نظریہ کے پیش نظر، اتنے سخت پیمانے قطعاً ناپسند کرتی ہے۔ اس کی
ا وجہ یہ ہے کہ زندگی ہر لحظہ ترقی کر رہی ہے۔ اور ارتقا پذیر زندگی کو بغیر کسی عملی کوشش کے اور بغیر کچھ
مجھے انقلاب کی دہلیز تک پہنچا دینا، ترقی پسندیت کے شان کے خلاف ہے۔ جیسا کہ بغیر کچھ سوچے سمجھے
بغیر تجربہ کی کڑی دھوپ میں کھڑے ہوئے ابہام پرستی کا پرچار کرنے والی جماعت کی ذہنی غلامی کے لوگ
رہے اور جیسا کہ "میں ہوں اور نہیں ہوں" کی بے معنی بحثوں کو فن کے حدود میں شامل کرنے کی ناکام کوشش
ی۔ سچا فن کار دوسروں کے تجربے پر ایمان لانے کے بجائے ذات کو تجربہ کی کڑی دھوپ میں کھڑا کرتا ہے

ہمارے ساتھ یہی شرط ہے کہ جو بھی چلے
وہ اپنی تیغ پر اپنا لہو سجا کے چلے

دراصل زندگی سے محبت کرنے والے ہی زندگی کی باتیں کرتے ہیں۔ انقلاب، افتخار، استحکام، اطمینان
ں کو زیب دیتا ہے۔ اور انھیں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے کو سچا فن کار کہیں۔" اور نہ وہ غلط فہمیاں اور
ایمانیاں پھیلاتے ہیں اور نہ ان میں ایسے ہیں جو استدلالی داؤں پیچوں کے ذریعے شاعری کو برتر اور
ملنے کو بدتر صنف ثابت کرنے کی دھن میں تنقید کے سنجیدہ انداز کو فراموش کر دیں۔ جیسا کہ مرحوم شہنشاہ
ا کو شمس الرحمان سے شکایت ہے۔ ؎

اس شکایت کا ازالہ کرنا خاکسار کے قلم کی طاقت سے ماوراء ہے، ہاں! یہ دوسری بات ہے کہ آج
فن کار کڑی دھوپ کی چادر کے نیچے ذات کو تجربہ کی بھٹی سے گذارنے پر مائل ہے اور دوسروں کے تجربوں یعنی

لہ جواز ۲۸، نومبر ۸۸ تا جون ۸۹
؎ افسانے کی حمایت میں جواز ۲۲
؎ جواز ۲۲، اکتوبر ۸۴ تا اگست ۸۵

میں ہوں، یا نہیں ہوں کو بالائے طاق رکھکر خود اپنے تجربوں پر ایمان لارہا ہے ۔ اس کی یہ آگہی موجودہ دور کی ترقی پسندیت کی سب سے بڑی حاصل کردہ دولت ہے ۔ پیغام آفاقی کا ناول "مکان" اسی آگہی کی ایک بہتر مثال ہے ۔ نمونہ کے طور پر صرف ایک منظر ملاحظہ کیجئے :

" آج کمار کے یہاں اشوک آیا تھا ۔ کمار نے آگے بڑھ کر ڈرائنگ روم کے باہر ہی اس کا استقبال کیا وہ اندر کافی دیر تک باتیں کرتے رہے ۔ پھر یکایک اشوک نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا ۔ " دیکھو کمار ۔ یہ لڑکی نہیں مانے گی نہیں ۔ یہ روز روز تھانے اور کچہری میں جانے کا سلسلہ ختم ہونا چاہیئے ۔ تم کو میں نے پہلے کہا تھا کہ کچہری وچہری سے وہ نہیں دبے گی ۔ لالچ بڑی چیز ہوتی ہے ۔ وہ مکان کی لالچ میں مقدمہ ضرور لڑے گی ۔ اس قسم کے لوگوں کا ایک ہی علاج ہے ، سیدھی بات یہ ہے کہ اب ایک بار کچھ کر کچھ ہو جائے ۔ اور اس کو اس کی اوقات کا احساس کرا دیا جائے ورنہ یہ چھوکری بہت اچھل کود کرے گی ، کچھ آدمی بلاؤ ۔ اور اس کا وہ کمرہ جس میں وہ رہتی ہے اس کو بھی خالی کرا کے اس کی چھٹی کرو ، پہلے تو اس سے مارپیٹ کرا دو سڑک پر ، پھر تھانے جائے گی ، وہاں اس کی رپورٹ نہیں درج ہونی چاہیئے ، چاہے اس کے لیے جو کرنا پڑے ۔ اس کے بعد دوبارہ پھر پٹائی کراؤ ، اگر نہیں بھاگتی ہے تو پھر پٹائی کراؤ ، ضرورت پڑے تو اسکو بھی بند کرواؤ ، اپنے بھی کچھ آدمی بند ہونے دو ــــ نہیں مانتی تو سالی کو اٹھوا لو ــ اور اس کے بلیو فلم بنوا لو اور ــــ اسٹامپ کاغذ پر دستخط کرا لو ۔ یہ سب اتنا زیادہ کرو کہ یہاں رہنے کے بجائے وہ اپنے گھر پر تالا لگا کر چلی جائے ۔ اس کے بعد گھر کے اندر کی طرف سے دروازہ کھول کر اس کے سامان ٹرنک میں ڈال کر ایک طرف کر دو اور اس میں ایک کرایہ دار کے نام پر کوئی آدمی رکھ دو ۔ یہ گواہی بھی کھڑی کر دو کہ کچھ دنوں پہلے یہ شملہ گئے تھے تو اس آدمی کو یہ کمرہ کرایہ پر دے گئے تھے اور اپنا سامان ٹرنک میں بند کر کے چلے گئے تھے اس کے بعد اس نئے نام نہاد کرایہ دار کی طرف سے تھانے میں رپورٹ ڈلوا دو کہ یہ لڑکی اسے اب غلط طریقہ سے دھمکی دے کر نکلوانے کی کوشش کر رہی ہے ۔ دوسرا مقدمہ عدالت میں کر دو کہ اس کا کرایہ مقرر کیا جائے اور تھانے میں انکوائری اور عدالت میں مقدمے کو لمبا کھنچواؤ ، پھر سب کچھ آہستہ آہستہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا ۔ " [۱]

پیغام آفاقی نے اپنے ناول "مکان" میں اپنے ذاتی تجربوں کو جس سطح پر لے جا کر قلم کے حوالے کیا ہے وہ تجربے عدم و وجود سے بحث کرنے والے پورے گروہ کے حصہ میں ابھی تک نہیں آئے ، مذکورہ بالا اقتباس اس امر کی بین ثبوت پیش کرتا ہے ۔ لیکن جیسا کہ اب "عطر کافور" جیسے افسانوں سے جدوجہد ، کشمکش حیات اور آزادی کا نغمہ پھوٹ رہا ہے ۔ اگرچہ ابہام کی دبیز چادر اور کڑی دھوپ میں ذاتی تجربہ کا درد اٹھائے بغیر تخلیق نے تخلیقی تخیل کے زور پر اعلان آزادی کیا ہے تاہم اس نے آزاد زندگی کو انسان کا سب سے بیش قیمت تحفہ تسلیم کر لیا ہے اس لیے ترقی پسندیت کے جدید تناظر میں زندگی کا ارتقاء مایوسیت سے دور اور رجائیت سے قریب آچکا ہے اور فن کار کو زندہ اور رجا دواں زندگی کا سیدھا راستہ دکھلائی دینے لگا ہے ــــ اور میں سمجھتا ہوں کہ فن کار کی یہی نئی سمجھ ترقی پسند تحریک کا ایک نیا منظر نامہ پیش کرتی ہے ۔

---

[۱] ناول "مکان" ، پیغام آفاقی ۔

ں کاشمیری
IBYRON AVENUE,
CRANFORD,
HOUNSLOW, MDX.
LONDON

قطعات

اعلا تعلیم

پانے آیا تھا میں اس خیال میں
مرا شمار ہو اہلِ کمال میں
کیسے کیسے گزرے ہیں لندن کے چار دن
ری میں کٹ گئے، دو ہسپتال میں

حُور کا ٹیلی فون

عبادت کی تھکاوٹ دُور کرنے کے لیے
س پی لیتا ہے زاہد دانۂ انگور کا
ن پر کرتا ہے حُورِ خلد سے خود دل لگی
و بتلاتا نہیں ہے فون نمبر حُور کا

دلّی دُور نہیں

ہوا کے دوش پر اُڑتے ہیں لوگ
قدم دو ہاتھ کوہِ طور سے ہے
شادیاں ہوتی ہیں ٹیلی فون پر
ن کہتا ہے کہ دلّی دُور ہے

لندن کی بہار

ے گل نغمۂ راحت پر سوار آئی ہے
ندسے اپنے زمانے کو نکھار آئی ہے
ہوا ہی دُھوپ مجھ کو یقیں آجائے
لکھتے ہیں کہ لندن میں بہار آئی ہے

مرزا محمد الحسنی شاداب
لیکچرار شعبۂ انگریزی اروناچل یونی ورسٹی
پوسٹ بکس ۱۱۱، اٹانگر اروناچل پردیش

غزل

انصاف گر نہ منصبِ شاہی کو آئے گا
دو دن کے بعد تختِ تباہی کو آئے گا

تاریکیاں نصیب کی اور یہ ہلالِ عید
یہ رنگ بھی نہ راس سیاہی کو آئے گا

فرعونِ وقت کے ہیں نمک خوار اہلِ شہر
ایسے میں کون میری گواہی کو آئے گا

ہر بار فرق آئے گا شدت میں جنگ کی
جب یاد اپنا ملک سپاہی کو آئے گا

ہر گام پر خیال خدا کے کلام کا
پابند کون امر و نواہی کو آئے گا

اشکوں کی نذر سے کے وہ رسوائے روزگار
عاصی ہے بارگاہِ الٰہی کو آئے گا

مجھ جیسے عاصیوں پہ بھی ہوگی حرام آگ
جب جوش اس کی خلق پناہی کو آئے گا

ف س اعجاز
انشار پبلی کیشنز نمبر ۸۶ کناٹی سیل
اسٹریٹ کلکتہ ۷۰۰۰۷۳

رہ گیا چشم قدرت سے میں بول کر
تو نے پیتل سے سونا دیا تول کر

میں ہنسا تو مرے ساتھ وہ بھی ہنسے
خوش ہوا آج میں ان سے ہنس بول کر

تشنگی اور ساقی بڑھاتا رہا
اپنی خالی دکانوں کے در کھول کر

ذہن میں جسم آواز کا بن گیا
چھپ گیا کوئی کانوں میں رس گھول کر

قدر و قیمت مقرر ہماری بھی ہو
ہم جو بے مول ہیں ہم کو انمول کر

چھوٹ پڑنے لگے ہر سبک جسم سے
سنگریزوں کو موتی بنا رول کر

ہاتھ میں بھیک کا اک پیالہ نہ دے
جو بھی سر ہے یہاں اس کو کشکول کر

محمد علوی
سمیر وہار سرکھیج روڈ، احمد آباد

انتظار اور ابھی

دونوں جانب دور دور تک
ریل کی پٹری چمک رہی ہے
اور میں اس پٹری پر بیٹھا
بڑی دیر سے سوچ رہا ہوں
جانے کب وہ ٹرین آئے گی
جو مجھ کو اس دنیا سے
اس دنیا میں لے جائے گی

تاخیر

آنگن میں چگتے چگتے
چڑیا نے سوچا اڑ جاؤں
لیکن چڑیا سے پہلے
بلی سوچ چکی تھی
بس اب جست لگاؤں!

خالد اقبال یاسر
مدیر سہ ماہی ادبیات، اکادمی ادبیاتِ پاکستان
۳۱ ایف ۱/۷ اسلام آباد
(پاکستان)

ایکیوریم
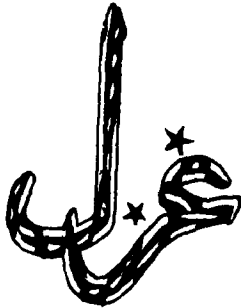
میں کبھی صاف شفاف تھا
اِس قدر بے کثافت
کہ میرے جلو میں
اِدھر سے اُدھر تیرتی کامنی مچھلیوں کی لپک سے
تماشائی آنکھیں، جہاں تاب چہرے
سبھی ماند تھے
رنگ چھپتے تھے لیکن
کوئی آڑ ملتی نہ تھی
گوشہ گوشہ عیاں تھا

مگر میرے کائی زدہ پانیوں میں
کسی خوش نظر کے لیے اب
کشش کوئی باقی نہیں
روشنی اب مرے آرپار آتی جاتی نہیں

حسن رضوی
۳-ج جی او آر تھری شادمان لاہور (پاکستان)

نہ وہ اقرار کرتا ہے نہ وہ انکار کرتا ہے
ہمیں پھر بھی گماں ہے وہ ہمیں سے پیار کرتا ہے

میں اُس کے کس ستم کی سرخیاں اخبار میں لکھوں
وہ ظالم ہے مگر ہر ظلم سے انکار کرتا ہے

منڈیروں سے کوئی مانوس سی آواز آتی ہے
کوئی تو یاد ہم کو بھی پسِ دیوار کرتا ہے

یہ اُس کے پیار کی باتیں فقط قصے پرانے ہیں
بھلا کچے گھڑے پر کون دریا پار کرتا ہے

ہمیں یہ دکھ کہ وہ اکثر کئی موسم نہیں ملتا
مگر ملنے کا وعدہ ہم سے وہ ہر بار کرتا ہے

حسنؔ راتوں کو جب سب لوگ میٹھی نیند سوتے ہیں
تو اک خوابِ آشنا چہرہ ہمیں بیدار کرتا ہے

کرامت بخاری
A ۴۰ - فیصل ٹاؤن - لاہور (پاکستان)

ہنس کے طوفاں کو ٹالتے رہیے
رنگ ہر سو اچھالتے رہیے

زیست کے بے بہا سمندر سے
سچ کے موتی نکالتے رہیے

اپنے دل کے حسین جذبوں کو
لفظ و معنی میں ڈھالتے رہیے

پھیل جائے نہ تیرگی ہر سُو
بام و در کو اجالتے رہیے

علم و دانش چھپی ہوئی شے ہے
لمحہ لمحہ کھنگالتے رہیے

درد و غم کے اُمڈتے طوفاں کو
دل کے دریا میں ڈالتے رہیے

بارِ غم تو متاعِ ہستی ہے
یہ امانت سنبھالتے رہیے

اویس خان
P.O. Box 8105, Doha
Qatar, Arabian Gulf

شاید یہی بہتر ہو

جب کوئی
ہم سے دور ہو جاتا ہے
تو ہم اُسے بھول جاتے ہیں
اُس کی جگہ
ایک خدا تعمیر کر لیتے ہیں
یادوں کے مندر میں
ایک مورتی کھڑی کر دیتے ہیں
پھر اُس کی پوجا کرنے لگتے ہیں
اور بھول جاتے ہیں
کہ کبھی یہ بھگوان
انسان بھی تھا

میں نے بھی تمہارے ساتھ
یہی کیا ہے

اگر تم کبھی
مجھے واپس مل گئے
تو میرا خواب
اور میں خود
پارہ پارہ ہو جائیں گے

شاید
یہی بہتر ہو
کہ تم مجھے
کبھی نہ مل سکو

آفتاب حسین
H-۱۶ ہربنس پورہ ، لاہور ۳۳
پاکستان

فصیلِ شہرِ تمنا میں در بناتے ہوئے
یہ کون دل میں در آیا ہے گھر بناتے ہوئے

نشیبِ چشمِ تماشا بنا گیا مجھ کو
کہیں بلندیٔ ایام پر بناتے ہوئے

میں کیا کہوں کہ ابھی کوئی پیش رفت نہیں
گزر رہا ہوں ابھی رہگزر بناتے ہوئے

کسے خبر ہے کہ کتنے نجوم ٹوٹ گرے
شبِ سیاہ سے رنگِ سحر بناتے ہوئے

پتے کی بات بھی منہ سے نکل ہی جاتی ہے
کبھی کبھی کوئی جھوٹی خبر بناتے ہوئے

مگر یہ دل مرا ، یہ طائرِ بہشت مرا
اتر ہی آیا کہیں مستقر بناتے ہوئے

دلوں کے باب میں کیا دخل آفتاب حسین
سو بات پھیل گئی مختصر بناتے ہوئے

ڈاکٹر ستیہ پال آنند
ای ۱۰، ۹۲/۱ یونیورسٹی کیمپس
چنڈی گڑھ

تین نظمیں

نابینا

اک معمّا تھا جس نے اپنا عکس
جھیل میں دیکھا ، اور حل ہونے
کے لیے ڈوبنا غلط سمجھا !
نرگسِ دیدہ ور تھا ، اپنی ذات
کیسے پہچانتا وہ نابینا !

سایہ

بھیڑ سے یہ کہا تتھاگت[1] نے
چڑھتا سورج ہو ، ڈھلتا سورج ہو
پیٹھ کر کے چلو گے تو لوگو
اپنا سایہ ہی خود سے کچھ آگے
چلتا پاؤ گے ۔ اور تم اُس کے
پیچھے پیچھے چلو گے ساری عمر !

بن باس

جانے والے نے عید کا دن ہی
کیوں چُنا ، اس سے کوئی کیا پوچھے
چاند کی پہلی رات تھی اور آج
چاند کی چودھویں ہے ، چودہ دن ،
دن نہیں ہیں ، طویل تر عرصہ
چودہ برسوں کا ہے ۔ جسے میں نے
ذہن کے جنگلوں میں پھرتے ہوئے
گھر کی دہلیز پر گزارا ہے !

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

کتاب	موضوع	مصنف	قیمت
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	۵۱/-
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	۵۱/-
پت جھڑ کی آواز	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	۷۵/-
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	۱۵۰/-
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	۲۷/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	۳۶/=
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	۴۵/-
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	۱۰/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	۲۴/-
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	۵۱/-
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	۴۵/-
قلندر بخش جرأت	(خطبہ)	جمیل جالبی	۱۰/-
عجائب گھر	(بچوں کی سائنسی کتاب)	قاسم صدیقی	۱/-
تاریخ اودھ	(تاریخ)	ترجمہ و ترتیب شاہ عبدالسلام	۲۷/-
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	(ادب)	ظ انصاری	۳۳/-
تنقید اور جدید اردو تنقید	(تنقید)	ڈاکٹر وزیر آغا	۶۰/-
مشقی تدریس، کیوں اور کیسے؟	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	۴۵/-
آوازوں کا میوزیم	(افسانے)	ساگر سرحدی	۴۵/-
اپنی ہواؤں کی خوشبو	(خاکے)	کشمیری لال ذاکر	۳۶/-
دلی کی چند عجیب ہستیاں	(خاکے)	اشرف صبوحی	۵۱/-
چند تصویر نیکاں	(تاثرات)	مولانا عبدالسلام قدوائیؒ	۴۵/-
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	(ادب)	پروفیسر آل احمد سرور	۸/-
صاحب جی سلطان جی	(تذکرہ)	ڈاکٹر اسلم فرخی	۲۰/-
نظام رنگ	(ادبی خاکہ حضرت نظام الدین اولیا)	" " "	۱۵/-
شہید جستجو	(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)	ضیاء الحسن فاروقی	۷۵/-
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست	(مذہب)	مشیر الحق	۸/-
ہمارے دینی علوم	(مذہب)	مولانا اسلم جیراجپوری	۱۸/-
تحقیقی مضامین	(تحقیق)	مالک رام	۶۰/-
آسان اردو ورک بک	(تعلیم)	شکیل اختر فاروقی	۲۴/-

ڈاکٹر سجاد سید
سی۔۲، گل مہر ایونیو، جامعہ نگر
نئی دہلی ۲۵

زندگی کے ساز کا آہنگ وہ
مسکراتے منظروں کا رنگ وہ
پھول، خوشبو، چاندنی، جھرنا، صبا
گل بدن، گل پیرہن، گل رنگ وہ
زندگی کا ہر ترنم اُس سے ہے
نغمہ و لے وہ، رباب و چنگ وہ
کیا اسے میں نام دوں حیران ہوں
ہے خیال و خواب کا نیرنگ وہ
جان دے کر جو ہوا ہے سرخ رو
آگیا تھا زندگی سے تنگ وہ
اس نے توڑا شیشۂ دل کو تو کیا
ٹوٹ کر بکھرا ہے خود بھی سنگ وہ
قتل کرنا چاہتا تو ہے مگر
بے نیازی پر مری ہے دنگ وہ
جو کبھی تھا ایک نازک آئینہ
حادثوں کی آگ سے ہے سنگ وہ
میرا دشمن ہے مرا ہمزاد ہی
کرتا رہتا ہے مجھی سے جنگ وہ
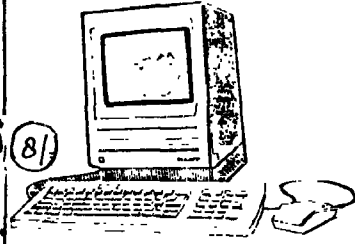
سہیل فاروقی
۱۲/۱۷۷ ذاکر نگر نئی دہلی ۲۵

در پردہ اندھیروں کی ستائش نہیں کرتے
اس واسطے جگنو کی بھی خواہش نہیں کرتے

احباب ستم پیشہ بھی پر یہ سمجھ لیں
ہم اہلِ وفا ہیں کبھی سازش نہیں کرتے

اب درد کبھی بھول کے کروٹ نہیں لیتا
اب وہ مرے احوال کی پرسش نہیں کرتے

سجدہ بھی جبینوں پہ بس اک داغ ہی رہتا
یزداں سے اگر آپ سفارش نہیں کرتے

اشعار ہمارے کبھی بچے بھی پڑھیں گے
یہ سوچ کے نذرانۂ آتش نہیں کرتے

دنیا سے سہیلؔ اتنا بھی ناشاد نہ رہیے
بھرتے ہوئے زخموں کی نمائش نہیں کرتے

مکتبہ پیام تعلیم کی ولولہ اور حیرت انگیز کتابیں
کمپیوٹر کیا ہے؟
حکیم نعیم الدین زبیری
8/-
ہمارے عظیم سائنس داں
حکیم محمد سعید
ہمت کے کرشمے
6/-
ردولی کا آدم خور
6/-
خلائی مسافر
6/-

حسینی جاوید
مکان نمبر ۲۲۳-۴-۵۹-۲/۳
نزد ابراہیم نرسنگ ہوم
مغل پورہ - حیدرآباد ۲

فن تاریخ گوئی اور تقاضے

یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ تاریخ گوئی کا فن اب رفتہ رفتہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ایک زمانے میں بادشاہوں، امراء و رؤسا کی اسے سرپرستی حاصل تھی۔ فارسی اور اردو زبان کا چلن جب تک عام رہا، اس فن کو عروج کافی حاصل تھا۔ لیکن اب صورت حال مختلف ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نئی نسل اس فن سے کما حقہ واقف نہیں ہے۔ اردو زبان کی بقا و ترقی کے مجاز اداروں کی طرف سے بھی اس فن پر خاص توجہ نہیں دی گئی۔ وہ ادارے جنھیں زبان کے تحفظ اور قلم کاروں کی مناسب اعانت کی ذمے داری سونپی گئی۔ اس کے تعلق سے خاموش ہیں۔ نہ تو اس فن کے کسی ماہر کی مدد ہی کی گئی۔ اور نہ ہی اس موضوع پر کسی کتاب کی اشاعت ہی عمل میں لائی گئی۔ حالانکہ یہ ایک ایسا فن ہے جس کے زندہ رکھنے سے زبان اردو کی نہ صرف شان بڑھ جاتی ہے بلکہ اس کی اپنی انفرادیت کا بھی کھلا اظہار ہوتا ہے۔ تاریخ گوئی دستاویزی یادگار کا فن ہے جس کی مثال عربی، فارسی اور اردو کے سوا کسی اور زبان میں نہیں ملتی۔ صدیوں کی محنت و جستجو کے بعد اسے بام عروج پر پہنچایا گیا تھا۔

مناسب و موضوع عبارت یا مصرعوں کے ذریعہ تاریخ برآمد کی جاتی ہے، اور یہ زبان و بیان کی ایک اہم خوبی قرار پاتی ہے۔ اس کے ذریعے اس دور کے رجحانات، سماجی روابط اور لفظیات کا بھی صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملک کی تمام اہم یادگاروں پر "تاریخی" کندہ ہیں، اور آج ہم ان ہی کے ذریعے آغاز و تعمیر کا صحیح سن معلوم کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ خوشی اور غمی کے اہم موقعوں پر بھی تاریخیں برآمد کرنے کا عام رواج تھا۔ بہتر اور برمحل تاریخ کہنے والے کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہر قدیم عمارت پر ہمیں تاریخیں دکھائی دیتی ہیں۔

آج اس فن کو زندہ رکھنے کی بہت ضرورت ہے۔ یہ فن زبان اردو کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور دوسری زبانیں بولنے والوں کو اردو کی اس لازوال خوبی کا احساس دلاتا ہے۔ چند اہم موقعو

ملک کے نامور ادیب و دانشور ڈاکٹر ظ انصاری کے سال وفات کے علاوہ ان کے لوح مزار پر کندہ کروانے کی غرض سے مادۂ تاریخ برآمد کیے تھے۔ انھیں مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی کو بھیج دیا گیا ہے۔

۱۔ مقبول دانشور ظ انصاری

۱۹۹۱ء

۲۔ آرام گاہ بلند نام ظ۔ انصاری مرحوم

۱۹۹۱ء

۳۔ خواب گاہ عزیزی ظ۔ انصاری

۱۹۹۱ء

۴۔ سال وفات اہل فہم ظ۔ انصاری

۱۹۹۱ء

۵۔ سال وفات نیک طبع ظ انصاری

۱۹۹۱ء

ڈاکٹر عصمت جاوید نہ صرف ماہر لسانیات ہیں، بلکہ ایک اہم نقاد، شاعر اور ادیب بھی ہیں جناب ابراہیم خیال نے "ڈاکٹر عصمت جاوید، شخص، شاعر اور نقاد" نامی کتاب لکھی۔ اس کے سن اشاعت سے متعلق "مادہ تاریخ" ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ صحیفۂ اعتراف خدمات۔

۱۹۹۰ء

شہر حیدرآباد کے قیام کے چار سو سالہ جشن کے موقع پر شائع کی جانے والی کتاب کا عنوان اور چار سو کے ابجدی اعداد پر مبنی "مادۂ تاریخ"

۱۔ حیدرآباد دکن نامہ

۴۰۰

۲۔ قطب جہاں حیدرآباد

۴۰۰

۳۔ کمالِ حیدرآباد پائندہ باد

۴۰۰

ممتاز مزاح نگار جناب مجتبیٰ حسین کے "اعتراف خدمات کے جشن" کے موقع پر قطعہ تاریخ کے لیے ایک شاعر دوست کی فرمائش پر تاریخی مصرع دیا گیا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ شہکار فکر وفن کا ہے تو مجتبیٰ حسین

۱۹۸۷ء

حیدرآباد میں حضور نظام مرحوم کی بہو پرنسس دُرِشہوار کے نام سے بچوں کا ایک دواخانہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کے افتتاح کی تاریخیں اس طرح برآمد کی گئیں۔

۱۔ دوا خانہ محسن اطفال شہزادی درِ شہوار

۱۹۸۹ء

۲۔ ہدیہ نوبیت الحکمت والشفاء

۱۴۰۹ ہجری

سید مظہر الحق قادری حیدرآبادی متعدد ادبی، سماجی اور مذہبی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ انتقال کے بعد ان کے لوحِ مزار کے لیے مادۂ تاریخ برآمد کیا گیا تھا۔

۱۔ مقامِ سبطِ نبی سید مظہر الحق قادری

۱۹۸۷ء

گلبرگہ شریف کے ممتاز نقاد خالد سعید کی تصنیف "تعبیرات" کی رسمِ اجرا کے موقع پر

۱۔ حسنِ ادب، پندِ سعید "تعبیرات"

۱۴۰۸ ہجری

۲۔ اے لو۔ رسم رونمائی "تعبیرات" مرحبا

۱۹۸۸ء

روزنامہ "اورنگ آباد ٹائمز" کے مدیر جناب عزیز خسرو کے لوحِ مزار کے لیے مادۂ تاریخ برآمد کیے تھے جو یہ ہیں۔

۱۔ ناموسِ صحافت عزیز خسرو مرحوم

۱۴۱۱ ہجری

اس کے علاوہ بہت سی اور تاریخیں کہی تھیں، جو محفوظ نہیں ہیں۔ ناظرین ان چند نمونوں سے اس فن کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں اردو تنظیموں اور ملک کی تمام اردو اکادمیوں سے خواہش کرتا ہوں کہ وہ اس فن کو ختم ہونے سے بچائیں۔ یہ اردو زبان کا اہم ورثہ ہے اور ہم سب پر اس کی حفاظت کی یکساں ذمے داری عائد ہوتی ہے۔

شکیل اعجاز
مومن پورہ، اکولہ
(مہاراشٹر)

چار کتابوں والے

ان دنوں یہ رسم چلی ہے کہ چار سو صفحات کی ایک کتاب چھاپنے کی بجائے اسے چار حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ اور چار کتابیں ایک ایک برس کے وقفے سے چھاپی جائیں۔ اس میں یہ فائدہ ہے کہ اس قسم کی چار کتابیں والا اپنے آپ کو اس قسم کی ایک کتاب والے سے بڑا ادیب سمجھنے لگ سکتا ہے۔ کسی کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے وقت اب کتابوں کی تعداد نہ گنی جائے بلکہ تمام کتابوں کے مجموعی صفحات گنے جائیں تو اچھا ہے۔ مقامِ مسرت ہے کہ ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی کا شمار ان چار کتابوں والے ادیبوں میں نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ابھی تک ان کی صرف تین کتابیں چھپی ہیں، اور ہر کتاب میں سو سے زیادہ صفحات ہیں۔ جیسے پہلی کتاب "بلا عنوان" میں ۱۰۲ صفحات، دوسری کتاب "الف سے قطب مینار" میں ۱۴۴ صفحات اور اس تیسری کتاب "ناٹ آؤٹ" میں بھی ـــــ (معاف کیجیے ہم نے ابھی ابھی دیکھا کہ اس میں سو ہی صفحات ہیں۔ خیر یہ ایسا برا نہیں) کتاب کے سرورق پر رحمٰن صاحب ناٹ آؤٹ رہنے کے بعد اسٹمپس پر بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں۔ لیکن آس پاس کے ماحول سے لگتا ہے کہ گیند باز آیا ہی نہیں۔ یہ اکیلے کسی سنسان میدان میں بلا ٹنے کر گئے اور خود کو ناٹ آؤٹ سمجھ لیا۔ صفحات کتنے ہیں؟ یہ معلومات دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "یوں تو ۱۰۰ ہیں لیکن آپ کے ہاتھوں میں آنے تک کتنے رہ گئے ہیں یہ آپ ہی جانتے ہیں۔ اس جملے سے شک ہوتا ہے کہ جلد ساز کو اجرت کم دی گئی ہے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی ہندوستان میں موجودہ تمام شاخوں کے پتے اور 'شگوفہ' حیدرآباد کا پتا دیا گیا ہے۔ ان پتوں کی وجہ اشاعت کے طور پر اور تقسیم کار کا عنوان لگا دیا گیا ہے۔ ناٹ آؤٹ کی مناسبت سے فہرستِ مضامین کا نام اسکور بورڈ رکھا گیا ہے۔ اس فہرست میں ہر مضمون کے آگے قوسین میں احتیاطاً یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ یہ کیا ہے۔ جیسے (مزاحیہ) (رپورتاژ) (انشائیہ) وغیرہ تین مضامین کے سامنے قوس غائب ہے۔ یعنی مصنف خود فیصلہ نہیں کر سکا کہ اس نے یہ کیا لکھ دیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا مضمون "اردو کی پہلی کتاب" یوسف ناظم صاحب کے طرز میں ہے۔ جس کا پہلا جملہ یہ ہے کہ " ڈاک پہنچانے والے سرکاری آدمی کو ڈاکیہ کہتے ہیں۔ کچھ اہلِ زبان ڈاکیہ کو ڈاکو کی جمع سمجھتے ہیں۔" (ہمارے خیال میں ڈاکیہ کو ڈاکو کی بیوی لکھنا چاہیے تھا۔ جیسے رضیؔ کی بیوی رضیہ)

"ہمارے خاں صاحب" دوسرا مضمون ہے۔ اس میں لطیفے خلق کرنے کی شعوری کوشش
آتی ہے۔ خاں صاحب کے تئیں محبت و عقیدت کی وہ دھواں دھار بارش ہوئی ہے کہ بارش کے
ہی خاں صاحب کا ناک نقشہ تو درکنار، یہ بھی نظر نہیں آتا کہ وہ کہاں کھڑے ہوئے ہیں اور
بھی بارش میں کہیں بہہ گئے۔ واقعات میں ربط اگر ہے تو بس اتنا کہ صفحہ نمبر انیس کے بعد
ں لکھا ہے اور بیس کے بعد اکیس۔ "ٹوپی" بلاشبہ ایک اچھا مضمون ہے جسے انشائیہ کا لیبل لگا
پیش کیا ہے۔ اس میں پگڑی کے معارف گنواتے ہوئے لکھتے ہیں — "اسے سرہانے رکھ کر تکیہ
سکتے ہیں، ہفتہ واری بازار سے سامان لایا جاسکتا ہے، جانور کی رسی کا کام لیا جاسکتا ہے، زندگی
ی اچاٹ ہو جائے تو پھندا بنا کر خودکشی بھی کی جا سکتی ہے۔"
غالباً انھیں سطور سے متاثر ہو کر آخری صفحے پر یوسف ناظم صاحب نے لکھا ہے کہ
ڈا رحمٰن ہر بات میں نکتہ پیدا کر لیتے ہیں۔ اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے تحریر فرمایا
ہ کہ شیخ رحمٰن بلاوجہ انکسار سے کام لے رہے ہیں۔ ویسے ہی ہندستان میں اچھے مزاح نگار
رہ گئے ہیں اور محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ نے اظہارِ مسرت کیا ہے کہ :-
"جو نیا ادب یاسیت کا شکار ہوا تھا وہ طلسم ٹوٹا"
کتے پر پطرس بخاری کا مضمون اتنا مشہور و مقبول ہو چکا ہے کہ اب اس موضوع پر دوسرا
مضمون صرف کانوں کے پاس مچھر کی طرح منڈلاتا رہتا ہے۔ دل میں نہیں اترتا۔ لیکن رحمٰن صاحب
نے کتے پر لکھتے ہوئے بہت سی نئی نئی باتیں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس میں
بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ یہ بات خود رحمٰن صاحب نے ہمیں بتائی۔ کتاب کے آخری
فحہ پر عبدالمغنی صاحب فرماتے ہیں کہ "ڈاکٹر رحمٰن صاحب" پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی
کے نقوشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ مزید مطالعہ اور زبان کی تراش خراش سے یہ بہت آگے جا سکتے
ہیں۔ مغنی صاحب نے یہ واضح نہیں کیا کہ آگے بڑھ کر رحمٰن صاحب کہاں تک جائیں گے۔
اگلا مضمون "ٹیلی فون بھی اِک بلا ہے" آکاش وانی ناگپور سے ستمبر اکتوبر ۹۰ء میں نشر ہوا
تھا۔ یہ اطلاع مضمون کے آخر میں دی گئی ہے۔ یہی نہیں ہر مضمون کے آخر میں یہ معلومات
درج ہیں کہ کس رسالہ یا کس اخبار میں شائع ہوا ہے۔ البتہ دو مضمون اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اس سے
فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ آخر یہ کہاں شائع ہوئے تھے۔ اور غیر مطبوعہ ہیں تو اب تک کیوں رہ گئے
"ہم نے چھپکلی ماری" ایک دلچسپ واقعاتی کہانی ہے۔ جو بیگم کے ارد گرد گھومتی ہے۔ طنز و
مزاح میں لفظ بیگم اب اتنا بور ہو چکا ہے کہ اس کی موجودگی سے سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ اور
بیگم سے کیا موقوف ہے، خود بیگم کی موجودگی سے بعض دفعہ خوشی کے خاص لمحات المیہ میں بدل
گئے ہیں۔ بیگمات سے معذرت کے ساتھ۔ ڈاکٹر رحمٰن صاحب زبان کے استعمال میں نئے تجربات
کرنے یا الفاظ سے کھیلنے کے قائل نہیں ہیں۔ نپی تلی اور معیاری زبان استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے
بھی کبھی اس پر نصابی کتاب ہونے کا گمان گزرتا ہے۔ ان کی زبان نئی نویلی دلھن کی طرح دلکش
نہ چنچل دوشیزہ کی طرح نہیں جس سے بار بار ملنے کو جی چاہے۔

اگلا مضمون ہے "کچھ محاوروں کے بارے میں" یہ مذاق مذاق میں لکھا ہوا ایک سنجیدہ مقالہ معلوم ہوتا ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد وارث علوی صاحب نے آخری صفحے پر دعا کی ہے کہ "خدا تمھاری ہنسی میں ترقی دے"

"ہم جو گئے دلی" اس کتاب کا سب سے دلچسپ اور معلوماتی مضمون ہے۔ لگتا ہے مصنف کو اپنے دوستوں یا آنے والی نسل کے ادیبوں پر بھروسا نہیں کہ وہ ان کے کارنامے یاد رکھیں گے۔ اس لیے خاص خاص کارنامے خود ہی بیان کر دیے ہیں" ہم جو گئے دلی " اسی قسم کی کاوش ہے۔ لکھا ہے 'مظفر حنفی صاحب نے اصرار کر کے کھانا کھلوایا۔ پھر چائے کی چسکیوں کے دوران (یعنی چائے بھی پلوائی ... ش۔ا) کہنے لگے تمھارے آنے کی اطلاع یہاں کے اخبارات میں شائع ہوئی تھیں۔ تمھاری چچی جان نے بتایا کہ تم آرہے ہو۔ لیکن تمھارا نام ان کے ذہن سے اتر گیا۔ اس لیے وہ تھیں شفیق الرحمٰن۔ شفیق الرحمٰن کہے جا رہی تھیں۔ میں نے کہا بیگم 'خدا تمھا' زبان مبارک کرے اور شیخ رحمٰن کو اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں شفیق الرحمٰن کا درجہ عطا کرے۔ مظفر حنفی صاحب سے اور بہت سی گھریلو باتیں ہوئیں......'

آجکل بات کرنے کے لیے موضوعات کی بہتات ہے۔ پھر مظفر صاحب نے مصنف سے گھریلو باتیں ہی کیوں کیں؟ پتہ نہیں کیوں۔ یہاں ہمارے دوست اقبال بھائی کی ایک شکایت یاد آرہی ہے۔ ایک دن کہنے لگے تم پروفیسر فہیم اللہ خاں سے اور ڈاکٹر امان اللہ خاں اور سرو جاوید سے سارے زمانے کی باتیں کرتے ہو۔ ادب، سیاست۔ تاریخ وغیرہ۔ اور مجھ سے جب بھی ملتے ہو، صرف گھریلو باتیں کرتے ہو۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اصل میں تم مجھے اس لائق نہیں سمجھتے کہ کوئی عقل کی بات کی جائے۔

اس رپورتاژ میں مصنف نے سامعین تک کا ریکارڈ محفوظ کر لیا ہے۔ چنانچہ صفحہ نمبر ۱۴۰ لکھتے ہیں" سامعین میں امیر قزلباش، انیس دہلوی، خواجہ حسن نظامی ثانی، ستیش بترہ، ... جامعی وغیرہ شامل تھے۔

آخر میں یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں: مجتبیٰ حسین صاحب کی میز پر بکھری ہوئی چیزیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ واقعی ادیب ہیں۔ بے ترتیبی اصل فنکاروں کی زندگی کا لازمی جزو ہوا کرتی ہے۔"

لگتا ہے رحمٰن صاحب کو مجتبیٰ صاحب کی کئی کتابیں پڑھ کر بھی یہ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ ادیب ہیں۔ آخر کار میز کی بے ترتیبی سے یہ اندازہ ہوا۔ یہ پڑھنے کے بعد ہمارا یہ حال ہے کہ جب بھی ڈاکٹر رحمٰن صاحب ہمارے گھر تشریف لاتے ہیں ہم قرینہ سے لگا سامان بکھیرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کتابیں اٹھا پھینک، دوات قلم اٹھا پھینک، اسی افراتفری میں ایک دفعہ خود مصنف کی کتاب بھی......

ہماری زیادہ سے زیادہ کوشش یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح ہماری میز پر بھی انھیں بے ترتیبی نظر آجائے۔

خیر خدشہ اب یہ ہے کہ رحمٰن صاحب بھی شکریے کے طور پر ہماری کتاب پر تبصرہ کرنا چاہیں گے۔

بلکہ کل ہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد محبت آمیز لہجہ بنا کر کہنے لگے۔

"یار تمہاری پہلی کتاب کو چھپے ہوئے دس برس ہونے کو آئے ہیں اب دوسری فوراً چھپنی چاہیئے۔"

اس لیے قارئین کرام آیندہ دو ایک برس میں کہیں آپ کو اس طرح کا تبصرہ پڑھنے کو ملے کہ پیش نظر کتاب بہت واہیات ہے اور اردو کے ناکارہ ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے تو آپ فوراً سمجھ جائیے کہ وہ کتاب ہماری ہے۔ اور تبصرہ نگار وہی ہیں، جن کی تیسری کتاب کا نام ناٹ آؤٹ ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/=

تفہیم و تنقید حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۴۰/=

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۴/=

زندگی کی طرف شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ، اُردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/=

گول مال شفیقہ فرحت

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار نہیں بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ ۸/=

فی الفور یوسف ناظم

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صفِ اوّل کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مزاحیہ مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ ۲۰/=

مولانا آزاد کی کہانی ڈاکٹر ظفر احمد نظامی

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع سوانح جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظامی نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک اہم تاریخی دستاویز۔ ۱۸/=

مالک رام - ایک مطالعہ مرتبہ علی جواد زیدی

ماہر غالبیات جناب مالک رام کے علمی اور تحقیقی کارناموں پر ہند و پاک کے ممتاز ادیبوں کی نگارشات کا اہم مجموعہ۔ ۵۰/=

چراغ اور کنول (شعری مجموعہ) اختر حمید خاں

"چراغ اور کنول" اختر حمید خاں کی غزلوں میں بیسویں صدی عیسوی کا ریاض ہے۔ چودھویں صدی ہجری کا عرفان ہے۔ یہی قلب کا چراغ اور زندگی کا کنول ہے۔ ۴۵/=

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

کتاب نما جستہ جستہ برابر مل رہا ہے۔ ماہ رواں کے شمارے پر چھچلتی نگاہ ڈالی تو منیب الرحمٰن کی آواز سن کے خوشی ہوئی۔ نئی آواز: حال کے البلیے پہ مگر پرانے انداز کی '، الاؤ' اچھا نہیں باندھا ہے اس کا املا 'الاو' ہونا چاہیے کیونکہ اسم میں واو کی آواز مصمتے کی طرح (آدھی) نکلتی ہے۔ اس سے مصرع کی موزونی پہ اثر پڑتا ہے۔ منظومات کے اسی حصے میں مظفر حنفی کی غزل کی ردیف کئی جگہ کھٹکتی ہے۔ خاص کر (ردیف کے ماسوا) اس خوبصورت شعر میں

کیا نیا گل کوئی پھر کھلا ہے کہیں　　شاخِ دل آج کتنی ہری ہے (میاں)

بخش لائلپوری نے "غبن"، بہ فتحۂ 'ب' غلط نظم کیا ہے، 'غبْن' بہ جزمِ 'ب' صحیح ہے جو آسانی سے ہو جاتا ہے۔

کہیں غبن ہے.....

ظفر گورکھپوری کی غزل خوب ہے۔

ساختیات کے موضوع پہ، نارنگ صاحب کے دو (جنوری، جولائی) اور وزیر آغا (مئی) اور شمس الرحمٰن فاروقی (جون) صاحبان کے مضامین مہینوں سے نکال رکھے ہیں کہ کچھ باتیں عرض کروں۔ مگر وقت نہیں مل پایا۔ مختصر یہ کہ معنوی اعتبار سے شمس الرحمٰن کی وضع کردہ اصطلاح " وضعیّت"، بلیغ ہے۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ مگر ساختیت شاید اب رواج پا گئی ہے تو میں علم STRUCTURALISM کے معنی میں 'ساختیت' یا 'وضعیّت' کہوں گا اور اس کے تمام متعلقات یعنی تشکیل ولاتشکیل وغیرہ شامل کر کے ساختیات یا وضعیات۔

اصطلاح سازی کی تمام کوششیں زبان پہ سماجی احسان کا درجہ رکھتی ہیں، انھیں سنجیدگی اور شکر گزاری سے برتنا اور قبول کرنا چاہیے۔ اس لحاظ سے شمس الرحمٰن صاحب کی فہرست پہ نظر ڈالتا ہوں تو مندرجہ ذیل باتیں فوراً ذہن میں آجاتی ہیں۔

(۱) اس فرہنگ کی حیثیت تعارف اصطلاحات کی زیادہ ہے۔ بہت سی مجوزہ اصطلاحیں اور معنی میں عرصے سے رائج ہیں اور کچھ ابھی بن نہیں پائیں۔ ان پہ علمی حلقے میں پوری بحث ہونی چاہیے۔ بعض تجویزیں بہت خوب بھی ہیں۔

لفظ جنس SEX کے معنی میں بھی استعمال ہوتا آیا ہے۔ اب ہمارے ادیب انگریزی
زیادہ لکھنے لگے ہیں جس کے بارے میں پہلے خود ہی طنز کیا کرتے تھے کہ فلاں کی مادری زبان
انگریزی ہے۔ علامت میں بھی اور پہلو ہیں اس لیے CLASS اور CODE کے لیے اور
لفظ تلاشنے چاہییں۔ CONVENTION کے لیے رسمیت مناسب لگتا ہے۔ مختصر بھی
اور کافی بھی۔ بیان کنندہ، لمبا ہوجاتا ہے۔ متمرکز کے بجائے مرکوز، زیادہ آسان اور
مانوس لفظ ہے۔ MODE کے لیے، پیرایہ، عام طور سے کافی ہے، بیانیہ پن لکھیے
ORDER کے لیے ترتیب کافی ہے۔ RECEPTION کے لیے قبول پہ غور کرنا چاہیے۔ بدیع
RHETORIC اور RHETORICS بدیعیات ہیں فرق کرنا چاہیے۔ SET کے لیے سِٹ
لکھیے۔ 'س' پہ زیر کے ساتھ۔

SUJET فرانسیسی کا SUBJECT ہے۔ اس کے لیے الگ اصلاح ضروری
نہیں صرف سمجھ لینا کافی ہے۔

SYNCHRONIC کو یک زمان اور SWCHRUNY کو یک زبانی، کہنا مجھے
زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔

کچھ ناموں کے تلفظ اور املے اس طرح ہیں۔

TODOROV. تودوروف

ERLICH ارلش (ش اور چ کے درمیان) زیادہ فصیح ہے

و داسوسیور، غلط چھپ گیا ہے۔ دوسوسیور، چاہیے۔

دُریدا اور دَریدا، ایک ہی لفظ کے فرانسیسی اور غیر فرانسیسی املے ہیں۔

(صفحہ ۱۴ سطر ۲) "ہیگلی مفکر" ہونا چاہیے۔

املا JAUSS ہے۔ LYATAR لیاتار ہوگا، یا بیٹھے امریکی تلفظ میں لائیاتار۔

گریفٹ GRAFT میں یا تو اردو چھپنے میں غلطی ہوئی ہے یا انگریزی میں۔

مجموعی طور پر اردو میں اس علمی سطح پر لکھنا اور چھاپنا دونوں کام قابل ستائش ہیں اور
لائق مبارک باد۔

مکرر یہ کہ ایک اور مضمون کے حوالے سے BEGSON کا تلفظ برگ سُوں یا برگسُوں
ہے۔ ب پہ زبر، س پہ سیدھا پیش۔ فرانسیسی ہیں "رگ" مل کے غ کے قریب ہو جاتے ہیں۔

(مرزا سعید الظفر، علی گڑھ، یوپی)

● "کتاب نما" کا تازہ شمارہ جون ۱۹۹۱ء ملا۔ میری نظم "شاپنگ" شایع فرمانے کا شکریہ
نظم کا آخری شعر یوں ہے ؎

پھر یوں ہوا کہ خیر سے گھر لوٹتے ہوئے
آنکھیں خرید لیں کسی اندھے فقیر سے

(رؤف خیر، گولکنڈہ، حیدر آباد)

• ایک دوست کے پاس جولائی ۹۰ء کا شمارہ "کتاب نما" پہلی بار دیکھا۔ بہت پسند آیا۔ ماہے نئے لکھنے والوں کے لیے اس میں کافی گنجائش رکھی گئی ہے اور موقع دیا جاتا ہے۔

(اجمل حمید، ٹونک، راجستھان)

• ماہ جون کا کتاب نما نظر نواز ہوا۔ کئی مضامین خاص طور سے پسند آئے جو نہایت سنجیدگی سے مطالعے کی دعوت دیتے ہیں۔ مہمان مدیر کے تحت آصف فرخی کا مضمون حریم ناز بھی دل کو چھوتا ہوا معلوم ہوا۔ ان کے یہ جملے

"وہ قاری جس کے ذوق کی تربیت کا کام نقادوں کو کرنا چاہیے تھا۔ وہ نقادوں کی طرف سے روزانہ اعلا درجے کے شاہکاروں کے خردے سن سن کر بھاگ چکا ہے۔ دور جدید نے اسے تفریح کے دوسرے ذرائع بہم پہنچا دیے ہیں۔ اب اسے ادب میں سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔"

ناقدین ادب کے لیے ایک مشعل راہ ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ نقاد اپنے فرائض سمجھیں اور ادب کو سربلندی عطا کرنے میں تعاون کریں۔

(عبدالناصر۔ سانہہ بیگوسرائے)

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

پیامی اردو قواعد

ناشر: مکتبہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
قیمت: کتابی سائز۔ پانچ روپے
: جیبی سائز۔ ڈھائی روپے
مبصر: عبداللہ ولی بخش قادری

جس طرح مالی پھلوں کو جانتا پہچانتا ہے اسی طرح پڑھے لکھے لوگ لفظوں کو جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔ اگر ہم باغ کے ہر پھول کو جاننا پہچاننا چاہیں تو ہمیں باغ کا علم پڑھنا اور سیکھنا ہوگا۔ اسی طرح ہم لفظ کو جاننا اور پہچاننا چاہتے ہیں تو ہمیں لفظوں کا علم حاصل کرنا ہوگا۔

لفظ حرفوں سے بنتے ہیں۔ لفظوں سے جملے بنتے ہیں۔ جملوں سے عبارت بنتی ہے اور عبارتوں سے کتابیں۔ جس کتاب میں لفظوں اور جملوں کا حال لکھا ہوتا ہے اسے قواعد کہتے ہیں۔ قواعد عربی کا لفظ ہے اور قاعدہ کی جمع ہے۔ قاعدے کے معنی دستور کے ہیں جیسے اس شہر کا کیا دستور ہے؟ لیکن زبان کے سلسلے میں قواعد کا مطلب ہوتا ہے "لفظوں اور جملوں کا علم"۔

اس چھوٹی سی کتاب میں یوں قواعد کے موضوع کو متعارف کرتے ہوئے اس کی تعریف کی طرف رجوع کیا گیا ہے اس کے موضوعات تین ہیں:

(۱) اسم:- :اسم کی قسمیں، مذکر اور مونث" واحد اور جمع۔
(۲) فعل:- زمانہ۔ صیغے۔ فاعل اور مفعول۔ فعل کی قسمیں۔
(۳) حرف: حرف کی مختلف قسمیں۔

اور آخر میں امتحانی سوالات" مزید براں ہر سبق کے ساتھ لکھے گئے سوالات مستزاد ہیں۔ دیباچہ میں کہا گیا ہے کہ اس کتاب میں کم سے کم اصطلاحات میں ابتدائی اور لازمی قواعد کو ختم کر دیا گیا ہے۔" یہ بات تو اپنی جگہ بالکل مسلّم ہے۔ لیکن اتنا اضافہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ "جہاں تک ان بچوں کا تعلق ہے جن کے لیے یہ قواعد تیار کی گئی ہے

اس کے ساتھ انصاف بھی کیا گیا ہے، اس کی زبان بچوں کی فہم و ادراک اور استعداد کے مطابق ہے اور پیرایۂ بیان بھی ان کے مذاق کو مدنظر رکھتے ہوئے اختیار کیا گیا ہے۔ نیز ان کے ادبی ذوق کی آبیاری کو بہرکیف پیش نظر رکھا گیا ہے۔

یہ پیامی اردو قواعد عام کتابی سائز پر نہایت صاف ستھرے انداز میں پیش کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک جدّت طرازی کی بھی مرتکب ہوتی ہے کہ اپنا ایک "جیبی سائز" بھی رکھتی ہے۔ مکتبہ جامعہ دسونشتر، تعلیمی تاش، بچوں کے حالی جیسی ہلکی پھلکی مگر دلچسپ اور مقبول چیزیں شائع کرنے کی روش ڈال چکا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس فہرست میں یہ جیبی اشاعت بھی ایک نمونے کی حیثیت سے جلد داخل ہو جائے گی۔ اس پر کم خرچ اور بالا نشین کی مثل بھی پورے طور پر صادق آتی ہے۔ اس مختصر قواعد کی موجودہ حالات میں افادیت اور ضرورت کو دیکھتے ہوئے یہ فرمائش بیجا نہ ہو گی کہ قواعد کا دوسرا حصہ بھی جلد شایع کیا جائے تاکہ ثانوی مدارس کے طلبہ کی کما حقہٗ مدد ہو سکے اور صرف و نحو تشبیہ و استعارہ، صنائع بدائع جیسے موضوعات کی تکمیل ہو جائے ●●●۔

سرسید اور اردو زبان و ادب

مصنف : ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی
مبصر : ڈاکٹر ثاقب حسن رضوی
قیمت : ۳۵ روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ، اردو بازار، دہلی ۶

جدید اردو نثر کے بنیاد گزاروں اور اردو زبان و ادب کے معماروں میں سرسید کا نام سرفہرست ہے۔ ملک و ملت کو درپیش تمام مسائل پر انھوں نے غور کیا اور انھیں حل کرنے کی کوشش کی لیکن ان کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ اپنے ادبی سرمایے پر انھوں نے تنقیدی نظر ڈالی اور اس کے فروغ کے لیے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ سرسید پر بہت کام ہوا ہے لیکن ان کے کارنامے اتنے وقیع ہیں کہ ان کی حیات و خدمات پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ یہ کتاب ۴۴ صفحات پر مشتمل ہے لیکن مختصر ہونے کے باوجود اس موضوع سے متعلق کوئی اہم گوشہ نظر انداز نہیں ہوا ہے۔ ان کا قلم رواں ہے۔ نہایت شستہ انداز میں ڈاکٹر فریدی نے تمام ضروری معلومات ان مختصر صفحات میں فراہم کر دی ہیں۔ ہماری رائے میں یہ کتاب طلبہ کے لیے خاص طور پر مفید ثابت ہو گی اور قارئین سے داد تحسین حاصل کرے گی۔

اقبالیاتی جائزے

مصنف : ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
قیمت : سو روپے
ناشر : گلوب پبلشرز۔ لاہور
مبصر : ڈاکٹر عبدالمغنی

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ایک معروف ماہر اقبالیات ہیں اور اقبال کی اپنی تصانیف کے

تحقیقی جائزوں سے لے کر اقبال کے متعلق لکھی ہوئی کتابوں اور مضامین پر تبصروں تک انھوں نے مطالعۂ اقبال کا اتنا وسیع ووقیع مواد مہیّا کر دیا ہے کہ اسے دیکھ کر ان کی تلاش وجستجو کاوش وکوشش اور تالیف وترتیب کی داد دینی پڑتی ہے واقعہ یہ ہے کہ ہاشمی صاحب نے جس ذوق وشوق اور استقلال وتسلسل کے ساتھ اقبالیات کے ذخیروں کی نشاندہی کی ہے اس سے جہاں اقبال کا ایک نہایت فکر انگیز خاکہ مرتب ہوتا ہے۔ اقبال کے کاموں اور اقبال پر کیے گئے کاموں کے متعلق معلومات کی فراہمی کے اعتبار سے ہاشمی صاحب کا کارنامہ منفرد ہے ہاشمی صاحب کی کتاب "تصانیف اقبال تحقیقی وتوضیحی مطالعہ" (۱۹۸۲ء) اپنے موضوع پر سب سے مستند ومعتبر کتاب ہے اور مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی "اقبال کامل کی طرح اقبال کے فکروفن کے طالب علموں، عالموں اور ماہروں سب کے لیے ضروری حوالوں کی ایک بہترین تصنیف، جس کی طرف بار بار رجوع کر کے اس سے مستقل طور پر استفادہ کیا جاتا رہے گا۔ اب ہاشمی صاحب کی دوسری معرکہ کتاب "اقبالیاتی جائزے (۱۹۹۰ء) منظر عام پر آئی ہے اور اقبال کے سلسلے میں ہر قسم کے مطالعات کی ایک ڈائرکٹری ہے۔ یہ دونوں کتابیں مل کر گویا اقبال اور اقبالیات پر ایک مختصر سی انسائیکلو پیڈیا بن گئی ہیں۔

"اقبالیاتی جائزے" کے مباحث کی وسعت وتنوع کا کچھ اندازہ موضوعات کی حسب ذیل فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے بھی ہو سکتا ہے:

اقبالیات کے گیارہ سال۔ ۱۹۸۴ کا اقبالیاتی ادب۔ علامہ اقبال کی سوانح عمریاں۔ عالم عرب میں اقبال شناسی۔ بھارت میں اقبالیات، بھارت میں مطالعۂ اقبال کے دو زاویے۔ چند پاکستانی مطبوعات۔

اس اقبالیاتی جائزے میں ہاشمی صاحب نے ان تمام مضامین اور کتابوں کا تعارف کرانے کی کوشش کی ہے جو پچھلے برسوں میں اقبال کی شخصیت، فکر اور فن پر شائع ہوئی ہیں۔ یہ بیک وقت توضیحی وتشریحی اور تحقیقی وتنقیدی کاوش ہے، جس میں ایک عالمانہ وعادلانہ انداز سے متعدد علماء وادبا کے کارناموں کی قدر وقیمت متعین کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مصنف کا انداز تحریر بالعموم معروضی وتجزیاتی ہے۔

توقع ہے کہ زیر نظر کتاب اردو زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والے اہل ذوق کے درمیان مقبول ہوگی، خاص کر اقبال کے قدر شناسوں کے لیے ایک عمدہ تحفہ ثابت ہوگی۔

مصنف: محمد آفاق صدیقی

ضربِ آگہی

سائز $\frac{20\times30}{16}$ ۔ صفحات ۲۲۰ قیمت: /۴۸ روپے

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

مبصر: ڈاکٹر محمد ذاکر

عقدہ ہای آگہی بسیار۔ کسی فلسفی کا نام لیجیے جو فطرت کے غوامض واسرار سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہو یا کائنات نقش انسانی کی نقاب کشائی کرنے کا دعویدار ہو۔ اشیا

اور مظاہر کائنات، ذروں کا بے طور، بے ثباتہ رقص، مدعا معلوم! وجود و عدم کی لاینحل گتھیاں بھول بھلیاں، رنگارنگی میں مستور یک رنگی، رنگ دینے والا نشان دے کر خود بے نشاں، اندھیرے اجالے کا ہر گھڑی کھلتا ہوا کھیل، بہے نظر سے اوجھل! اے دل ہائے دل! اسے بے قلم، یہ کیا؟ یہ کیا؟ تجھے تو آفاق صدیقی کی کتاب ضرب آگہی پر عدم آگہی اور نادانی کی مہر بنانی ہے ۔ ہاہا نادانی میں کیسی مسرت ہے اگر اس کا خمیازہ نہ بھگتنا پڑے! ویسے نادانی کے احساس سے انکساری اور انکساری سے علم آگہی کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور وہ لازمۂ بشریت، اے رب میرے میرا علم بڑھا ۔ آگہی جب اپنی آشوبیت سے گزر کر ایک مرکز پا لیتی ہے اور بطون یا ضمیر کی ضرب بنتی ہے تو دانائی کا در کھلتا ہے اور دانائی سبب بنتی ہے قلب کی توانائی کا ۔ لاشعور اور تحت الشعور کی بے صدائی میں تجربات میں تپی اور ذہنی اعتبار سے گنی ہوئی شخصیت کا اظہار اقوال کی شکل میں اور اس کی تکمیل ان پر عمل اور ان کی تلقین و تبلیغ میں ہوتی ہے ۔ اسی لیے اقوال کو شخصیت کا خلاصہ یا نچوڑ کہنا نامناسب نہیں ہیں ۔ آفاق صدیقی کی کتاب ضرب آگہی کے اکثر و بیشتر اندراجات سے استفادہ ممکن ہے اگر کوئی دافعی چاہے:

توانا بود کہ ہر دانا بود،

اس مختصر تحریر کا اختتام کتاب مذکور کے دو تین اقوال پر کرنا مناسب ہے ۔ مصنف کی اس یاد دہانی کے ساتھ کہ قارئین کو ان سے اتفاق کرنے یا نہ کرنے، مرعوب ہونے یا نہ ہونے کا حق ہے اور وہ بہرحال اس کے شکریے کے مستحق ہیں ۔

(۱) محبت قوتِ حیات کو کم اور نفرت اسے زیادہ کرتی ہے (ص ۹۹)

(۲) وہ نیکی سب سے زیادہ قابلِ قدر ہے جسے آدمی غصے کی ہر حالت میں کر ڈالتا ہے اور وہ برائی سب سے زیادہ، قابلِ مذمت ہے جو خوب سوچ سمجھ کر کی جاتے (ص ۱۰۶)

(۳) ہر قوم کی ترقی میں اس کے رہنماؤں کے پیٹ کا حجم بہت اہم کردار ادا کرتا ہے ۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

مولانا امتیاز علی عرشی سیمینار

نئی دہلی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایوان غالب نئی دہلی میں اتوار ۵ مئی ۱۹۹۱ء کو ایک روزہ "مولانا امتیاز علی عرشی سیمینار" منعقد کیا گیا جس کی صدارت اردو کے مشہور محقق اور ماہر غالبیات جناب مالک رام صاحب نے فرمائی۔ سیمینار کا افتتاح محترمہ بیگم عابدہ احمد چیرمین غالب انسٹی ٹیوٹ نے فرمائی۔ اس ایک روزہ سیمینار میں دہلی اور بیرونِ دہلی سے آئے ہوئے بہت سے عالم اور معتبر مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس جلسے میں دہلی کے ادیب و شاعر، اساتذہ اور طالب علم اور شہر کے علمائدین نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

اس سیمینار میں مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر نذیر احمد نے فرمایا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی دیگر سرگرمیوں کے علاوہ ہر سال ایک روزہ سیمینار کسی نامور محقق و دانشور شخصیت پر ہوتا ہے۔ اب تک قاضی عبدالودود اور حافظ محمود شیرانی پر ایک روزہ سیمینار ہو چکے ہیں۔ اس سال غالب انسٹی ٹیوٹ کے سیمینار سب کمیٹی نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک روزہ سیمینار مولانا امتیاز علی عرشی پر منعقد ہو۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی چیرمین محترمہ بیگم عابدہ احمد نے فرمایا۔ مولانا امتیاز علی عرشی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے متعدد تحقیقی کارنامے علمی و ادبی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ گذشتہ نصف صدی میں انھوں نے جو تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے۔ اس سے اردو زبان کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہوا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہمارے نئے لکھنے والوں کو بھی رہنمائی ملی ہے۔

جناب مالک رام صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کے ساتھ اپنے ۵۰ سالہ تعلقات کو یاد کرتے ہوئے فرمایا کہ عرشی مرحوم نے پہلی بار غالب کے اردو خطوط کا انتخاب شائع کر کے اردو والوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ خطوط کی فراہمی میں کرنل بشیر حسین زیدی نے بھی ان کی بڑی مدد کی یہ عرشی صاحب کا سب سے پہلا کارنامہ تھا۔ اس کے بعد غالب کے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب شائع کر کے اردو دنیا کو گرامی قدر سرمایہ فراہم کیا۔ غالب کا غیر مطبوعہ اردو کلام تو انھوں نے سچ مچ ردی سے نکالا تھا۔

حلقۂ ادب، بہار کا جلسہ

پٹنہ: ۲۵ اپریل ۱۹۹۱ء۔ حلقۂ ادب بہار پٹنہ کے زیر اہتمام علامہ اقبال کے یوم وفات کے موقع پر پچھلے دنوں صدر انجمن ترقی اردو بہار ڈاکٹر عبدالمغنی کی صدارت میں "شام اقبال" کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقع پر بہار کے مختلف علاقوں سے تشریف لائے ہوئے دانشوروں نے اقبال کے فکر و فن سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ایک مخصوص شعری

ت منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت مشہور
ی پسند شاعر اویس احمد دوراں نے کی۔
ات کے فرائض ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے
ام دیے۔

ن انڈیا اردو لائبریریز فیڈریشن

آج کل ہر میدان کی چھوٹی بڑی تنظیمیں موجود
لائبریریز کی بھی کل ہند فیڈریشن ہے لیکن
ر کی کم و بیش پانچ ہزار لائبریریز ہونے کے
جود اس کی کوئی کل ہند تنظیم نہیں اسی لیے ان
وں کو حکومت کی امداد حاصل نہیں ہو رہی ہے۔
راجا رام موہن رائے فاؤنڈیشن کلکتہ کی بھی
لت میں کمیں سلیکشن کمیٹی ہوتی ہے اس فاؤنڈیشن
رکار اور ریاستی سرکار لاکھوں کی امداد دیتی ہے
س کے توسط سے ریاستی زبان کی کتب خرید کر
رکز تسلیم شدہ لائبریریز کو منت دی جاتی ہے۔
کل ہند پیمانے پر اردو لائبریریز کی تنظیم نہ ہونے
ن فہرستوں میں ایک بھی کتاب اردو کی تجویز
جاتی ہر ضلع میں ایک گورنمنٹ ڈسٹرکٹ
ری ہے مگر وہاں آپ کتاب تو چھوڑ یے
سالہ یا اردو اخبار نہیں ملے گا جانچ کرنے پر
لگ ہوتا ہے کہ اردو پڑھنے والے لائبریری
نے جاتے نہیں۔ اگر اس کونسل میں نمایندگی ہو تو
ں اردو کتب ان لائبریریز میں پہنچ سکتی
ور اردو پڑھنے والے اپنی تشنگی بجھا سکتے

ان تمام کے پیش نظر ہم لوگوں نے فیصلہ کیا
ل ہند پیمانے پر اردو لائبریریز فیڈریشن کا قیام
مل میں لایا جائے۔ ہمارے پاس جن لائبریریز کے
موجود تھے ان کو ہم نے اس سلسلے میں خطوط
یں ان تمام حضرات سے گذارش ہے کہ اس
فیڈریشن کے قیام کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے
اپنی لائبریری کی مکمل معلومات اور رکنیت و تعاون کے
لیے عنایت نامہ ارسال فرمائیں تاکہ ہم اس عظیم مقصد
تک بفضل تعالیٰ پہنچ سکیں۔
ہمیں محض تنظیم کے قیام میں دلچسپی ہے۔
اسے کسی سیاسی پیش قدمی سے تصور نہ کیا جائے۔

ہمارا پتا ہے۔
حمید اشرف خان کنوینر آل انڈیا اردو لائبریریز
فیڈریشن، بحوالہ مولانا آزاد پبلک لائبریری ملکاپور،
(بلڈانہ مہاراشٹر)

جلسہ تقسیم اسناد مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کا جلسہ تقسیم
انعامات پروفیسر جاوید خاں (چیرمین اردو اکادمی)
کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جوائنٹ سیکریٹری فیاض
احمد فیضی نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں مہمانوں کا استقبال
کیا۔ اور اکادمی کی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کیا۔ ممبر
سیکریٹری یوسف ناظر نے انعام یافتگان کا تعارف
پیش کیا۔ اور فرمایا کہ اکادمی کے تعاون سے امسال
جون ۹۱ء سے مراٹھواڑہ یونی ورسٹی میں اردو شعبہ اپنا
کام شروع کر دے گا۔ ممتاز شاعر اختر الایمان نے
انعام یافتگان کو سند اور رقم پیش کرنے کے بعد
اپنی تقریر میں فرمایا کہ ہر دور میں اردو ادیبوں
شاعروں کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی ہے کرکٹ
اور کبڈی کے لیے انعامات دیے جاتے ہیں لیکن
صاحب قلم کو ہمیشہ فراموش کیا جاتا ہے۔ اس تغافل
کا سبب خود ادیب اور شاعر ہی ہیں۔ وہ کبھی سر جوڑ
کر اس سمت میں غور و فکر ہی نہیں کرتے۔ اکادمی
نے انعامات کا جو فیصلہ کیا ہے وہ ادیبوں شاعروں
کی ہمت افزائی کا سبب بنے گا۔ انعام یافتگان
کی طرف سے قاضی سلیم نے اکادمی کا شکریہ ادا کیا اور

فرمایا کہ میرے نزدیک اردو لکھنا پڑھنا اور بولنا بذات خود کسی اعزاز سے کم نہیں۔ اس لیے انعام کی رقم کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اہمیت سند اور عزت افزائی کی ہوتی ہے۔ اردو اکادمی کے وائس چیرمین، وزیر مملکت برائے توانائی واوقاف سید احمد نے اردو والوں سے اپیل کہ وہ اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دلوائیں، تاکہ اردو لکھنے پڑھنے اور بولنے والی نسل برقرار رہے۔

پروفیسر جاوید خاں نے اپنی صدارتی تقریر میں انعام یافتگان کو مبارکباد پیش کی، اور فرمایا کہ ماہم میں اردو گھر کی تعمیر کے لیے قطعہ اراضی کر لیا گیا ہے۔ اور مہاراشٹر ہاؤسنگ بورڈ اردو گھر کی تعمیر کا کام جلد از جلد مکمل کروا کوشش کی جائے گی۔ اردو گھر میں لائبریری ہال، ادیبوں شاعروں کے لیے قیام گاہ، اور بنایا جائے گا۔ آپ نے بطور خاص فرمایا کہ ضلع کی اردو پرائمری اسکولوں کی نگرانی کے لیے انسپکٹر آف ایجوکیشن کی تقرری کے لیے کوشش کی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ حکومت مہا اردو کی تمام نوکریوں کو فوری طور پر پر کر

کوشش کی جارہی ہے۔ جوائنٹ سیکریٹری مسز نورالعین علی کے شکریہ پر یہ تقریب اختتام پذیر

ڈاکٹر برج پریمی کی پہلی برسی پر مقالات کا انعقاد

مشہور ادیب، نامور محقق اور نقاد جناب ڈاکٹر برج پریمی کی پہلی برسی کے موقع پر انجمن ترقی اردو ہند (جموں) کی طرف سے محفل مقالات کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت جناب براج پوری نے کی۔

ریاست کے بعض اچھے اور نامور ادیبوں نے اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور فن پر مقالات ملتو...

قارئین کتاب نما کو عید الفطر...

کتاب نما کا خصوصی شمارہ

ڈاکٹر خلیق انجم

(شخصیت اور ادبی خدمات)

مرتبہ

ایم۔ حبیب خاں

ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

اڈیٹر : شاہد علی خاں

مہمان اڈیٹر : ایم حبیب خاں

جلد نمبر ۳۱

شمارہ نمبر : ۵

قیمت سالانہ : پینتالیس روپے

فی پرچہ : پانچ روپے

غیر ممالک کے لیے : =/۲۳۰ روپے

تقسیم کار

صدر دفتر :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں :

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

بار اول جون ۱۹۹۱ء قیمت : =/5

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ھاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی

فہرست

سوانحی خاکہ ڈاکٹر خلیق انجم

پورا نام — بچپن میں غلام احمد نام تھا لیکن دوسری یا تیسری کلاس میں نام بدل کر خلیق احمد خاں کر دیا گیا۔ خلیق صاحب کا کہنا ہے کہ کلاس میں لڑکے "غلام" کہہ کہہ کر چھیڑتے تھے اس لیے والدین نے نام بدل دیا۔

وطن — دلّی ــــ دادا رام پور سے دلّی کسی کام کے سلسلے میں آئے تھے پھر نہ جانے کن وجوہ سے یہیں سکونت اختیار کر لی۔

والد کا نام — محمد احمد مرحوم

والدہ کا نام — مرحومہ رقیہ سلطانہ

دادا کا نام — اصغر خاں ــــ پردادا کا نام ثمر خاں

بہن بھائی — بھائی کوئی نہیں ہیں، پانچ بہنیں ہیں، طلعت سعید، ثریا اسلم، صفیہ اختر رشید، ذکیہ ای۔حق، عذرا انجم (انہیں خلیق صاحب کی والدہ نے گود دیا تھا) خلیق صاحب کے بہنوئیوں کے نام ہیں۔ احمد سعید، ڈاکٹر اسلم پرویز، اختر رشید، احسان الحق اور منصور احمد۔ تاریخ ولادت ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۵ء

تعلیم — ہائی اسکول تک اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول دہلی، انٹرمیڈیٹ اور بی۔اے ۱۹۵۵ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ ایم۔اے ۱۹۵۷ء دلّی یونیورسٹی۔ ڈپلوما ان لینگوسٹک ۱۹۶۰ء۔ ڈپلوما ان لائبریری سائنس ۱۹۶۱ء۔ پی۔ایچ۔ڈی ۱۹۶۲ء (آخری تین ڈگریاں دلّی یونیورسٹی سے حاصل کیں۔)

ملازمت — ۱۹۵۷ء میں کروڑی مل کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے اور اس سے پہلے بہت سی چھوٹی چھوٹی ملازمتیں کی تھیں۔ ۱۹۷۲ء کے اواخر میں وزارتِ تعلیم میں ڈپٹی ڈائرکٹر کی حیثیت سے تقرر ہوا اور کچھ ہی دن بعد ڈائرکٹر بنا دیے گئے۔ ۱۹۷۴ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے اور ابھی تک اس عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ ۴ سال تک آل انڈیا ریڈیو میں دری (افغانستانی فارسی) کے مترجم اور براڈ کاسٹر رہے۔ ادبی تبصرے، سیکولر ڈیموکریسی، ہماری زبان اور اردو ادب کے اڈیٹر رہے۔ آخری دو رسالے کے اڈیٹر اب بھی ہیں۔ علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں علی گڑھ سے نکلنے والے ایک ماہنامہ جھلک کے سب اڈیٹر بھی رہے تھے۔

انعامات — حکومتِ اترپردیش، ہندوستان کی مختلف اکیڈمیوں، دوسرے ادبی اداروں سے بارہ انعام مل چکے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا انعام پرویز شاہدی قومی انعام ہے جو ۱۹۸۵ء میں ملا تھا۔

شادی — ۱۹۶۸ء میں شادی ہوئی تھی۔ ان کی بیگم ڈاکٹر پروفیسر موہنی انجم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈپارٹمنٹ آف سوشیالوجی میں پروفیسر ہیں۔

اولاد — دو بچے ہیں۔ سیما انجم اور ثمر انجم۔

حیثیت — بہت بڑی تعداد میں ایسی ادبی اور صحافتی تنظیمیں ہیں جن کے خلیق صاحب صدر، سکریٹری یا رکن ہیں۔

ایم۔ حبیب خاں (مہمان مدیر)
(اسسٹنٹ سکریٹری، انجمن ترقی اردو ہند)

اداریہ

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں خلیق انجم صاحب کی شخصیت اور فن پر کتاب نما کا یہ خصوصی شمارہ ترتیب دے رہا ہوں
پچھلے تقریباً ۱۶ سال سے انجم صاحب کے ساتھ انجمن میں کام کر رہا ہوں۔ میں نے ان کے ساتھ افسری اور ماتحتی
کے آداب کو ہمیشہ ملحوظ رکھا مگر یہ ان کی بڑائی ہے کہ انھوں نے ہمیشہ میرے ساتھ مساویانہ برتاؤ رکھا اور ہمیشہ دفتری معاملات
میں مجھ پر اعتماد کیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ بعض غلط فہمیوں کی وجہ سے کچھ عرصے ہمارے تعلقات میں کشیدگی رہی لیکن خدا کا
شکر ہے کہ یہ غلط فہمیاں بہت جلد دور ہو گئیں۔

انجم صاحب اردو کے مشہور و ممتاز ادیب ہیں۔ صف اول کے محقق ہیں۔ انھوں نے بڑی تعداد میں تحقیقی کتابیں
لکھی ہیں۔ وہ نقاد ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے مقتدر رسالوں میں ان کے بے شمار تحقیقی اور تنقیدی مضامین
شائع ہو چکے ہیں۔ متنی تنقید کے فن پر اردو میں پہلی کتاب لکھنے کا شرف اُن ہی کو حاصل ہے۔ چار جلدوں
میں "غالب کے خطوط" اور تین جلدوں میں "آثار الصنادید" کے تنقیدی اڈیشن تیار کر کے انھوں نے متنی تنقید کے
بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔ ان کی کچھ کتابیں ہندوستان اور پاکستان کی کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل
ہیں۔ انجم صاحب نے فارسی اور انگریزی کی کئی کتابیں اردو میں ترجمہ کی ہیں۔ انھیں فارسی پر اتنی قدرت حاصل
ہے کہ چار پانچ سال تک آل انڈیا ریڈیو کے دری یونٹ میں فارسی کے مترجم اور براڈ کاسٹر کی حیثیت سے کام
کرتے رہے ہیں۔ بہت سے پیشہ ور فوٹو گرافروں سے بہتر فوٹو کھینچتے ہیں۔ ان کے پاس کئی قیمتی کیمرے ہیں
"آثار الصنادید" میں شامل ڈیڑھ سو کے قریب تصویریں ان کے اپنے کیمرے سے کھینچی ہوئی ہیں۔ انجمن میں بھی تقریباً
ساڑھے تین سو ادیبوں کی ان کی کھینچی ہوئی تصویریں محفوظ ہیں۔ انجم صاحب کو ہومیوپیتھی کا بھی بہت شوق ہے
باقاعدہ گورنمنٹ سے آر۔ ایم۔ پی کی سند حاصل کیے ہوئے ہیں۔ تعمیرات میں بھی غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ
دلچسپی اردو گھر کی تعمیر کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ جدید طرز کی تعمیر کا ان کو بہت اچھا تجربہ ہو گیا تھا۔ غالب ہاؤسنگ
سوسائٹی، جس میں تین سو سے زاید فلیٹ ہیں، کے دس سال تک صدر رہے۔ دلی کے ذاکر حسین کالج کی نئی عمارت
کا ایک حصہ تعمیر ہوا تھا جس میں بہت سی خامیاں رہ گئی تھیں ذاکر حسین ٹرسٹ نے تعمیر کے سلسلے میں ایک کمیٹی
تشکیل دی جس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم کو منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد ذاکر حسین کالج کی باقی عمارت ڈاکٹر
صاحب کی نگرانی ہی میں تیار ہوئی۔ غالباً تعمیر کی اس دلچسپی کی بنا پر انھیں دلی کے آثار قدیمہ میں دلچسپی پیدا ہوئی اور
یہ دلچسپی اتنی بڑھی کہ اس موضوع پر ان کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) دلی کی درگاہ شاہ مرداں (۲) دلی کے آثار قدیمہ (۳) آثار الصنادید (تین جلدوں میں)۔

آج کل انجم صاحب غیر معروف آثار قدیمہ پر کام کر رہے ہیں۔ خلیق انجم صاحب نے اپنا باقاعدہ کیریئر کروڑی مل کالج
میں اردو کے استاد کی حیثیت سے شروع کیا تھا۔ ۱۵-۱۴ سال تک انھوں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طلبہ

پڑھایا اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلبہ کی رہنمائی کی۔

۱۹۷۴ء میں جب خلیق انجم صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے تو انجمن کا دفتر علی گڑھ کی ایک پرانی اور بوسیدہ سی عمارت میں تھا۔ انجمن کی آمدنی تقریباً چھ ہزار روپے ماہانہ تھی اور اردو گھر کی تعمیر شروع ہو کر تھوڑے سے کام کے بعد ہی رک گئی تھی۔ خلیق انجم صاحب اور ان کی رہنمائی میں کام کرنے والے انجمن کے کارکنوں کی مسلسل محنت کا نتیجہ ہے کہ اردو گھر کی شاندار عمارت مکمل ہو چکی ہے انجمن کا دفتر بالکل جدید انداز پر ہے۔ اور خود اپنے وسائل سے ایک لاکھ تیس ہزار روپے ماہانہ آمدنی ہے۔ انجم صاحب اردو میں اور کچھ بھی نہ کرتے تب بھی اس عظیم الشان کارنامے کی وجہ سے اردو تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں دو باتیں تو لکھنا ہی بھول گیا اور وہ یہ کہ اگر وہ ادیب اور محقق نہ ہوتے تو انجینئر ہوتے اور اگر انجینئر نہ ہو سکتے تو موٹر میکنک ضرور ہوتے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انھیں پرانی کاروں کی مرمت کا بہت شوق رہا ہے اور ان کے پاس ہمیشہ پرانی گاڑی رہی ہے۔ انھیں کار کی مرمت کرنے میں بہت مزا آتا ہے۔

انجم صاحب این سی سی میں بھی رہے ہیں ان کی تربیت ۱۹۶۳ء میں ہوئی تھی اور حکومت کا خیال تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو ان لوگوں کو فوری طور پر لڑائی پر بھیجنا پڑے گا۔ اس لیے ان کی تربیت عام فوجیوں کی طرح کی گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو سیکنڈ لفٹننٹ کے طور پر کمیشن ملا۔ لفٹننٹ ہوئے کیپٹن ہوئے۔ چوں کہ این سی سی کی مصروفیات کی وجہ سے انھیں ادبی اور تدریسی کاموں کے کرنے میں وقت بہت کم ملتا تھا، اس لیے انھوں نے این سی سی سے استعفیٰ دے دیا۔

غرض یہ ہے کہ ایسی مثال کم ملے گی کہ ایک شخص اتنے مختلف میدانوں میں کام کرے اور بیشتر میدانوں میں صف اول کا آدمی شمار ہو۔

"کتاب نما" کے خلیق انجم نمبر کے لیے محترم شاہد علی خاں صاحب گذشتہ چھ ماہ سے مجھ سے فرمائش کرتے رہے کہ جلد سے جلد مضامین مرتب کر کے رسالے کے لیے بھیج دوں مگر مجھے اپنی بعض مصروفیتوں کی وجہ سے اس کام کے لیے موقع نہ مل سکا اور یہ وقت اسی طرح گزرتا گیا۔ غرض وہ جب بھی یاددہانی کراتے مجھے ندامت ہوتی۔ ابھی دو ماہ کی بات ہے کہ انھوں نے پھر اس سلسلے میں اصرار کیا چناں چہ میں نے پچیس مضمون نگاروں کو اس سلسلے میں خطوط لکھے۔ حیرت ہے کہ اتنے کم وقت میں ۲۳ مضامین وصول ہو گئے۔ اس سے مجھے دلی مسرت ہوئی اور ان مضامین نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ میں ان تمام مضمون نگاروں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اتنے کم وقت میں اپنی تخلیقات سے نوازا اور میری رہنمائی فرمائی۔ رسالے کے محدود صفحات کے پیش نظر صرف ۱۶ مضامین شریک اشاعت کیے جا سکے۔ اس لیے باقی کے لیے معذرت خواہ ہوں، بعد میں یہ مضامین کتابی صورت میں شائع کیے جائیں گے۔ آخر میں غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم کے سلسلے میں چند اہل علم کی رائیں شامل کی گئی ہیں۔

خلیق انجم نمبر کی تیاری میں "کتاب نما" کے ایڈیٹر شاہد علی خاں صاحب کا شکر گزار ہوں کہ اگر وہ غیر معمولی دلچسپی نہ لیتے اور میری توجہ اس طرف مبذول نہ کراتے تو یہ نمبر اتنی جلد منظر عام پر نہ آتا۔

۳۰ دسمبر ۱۹۹۰ء

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

خلیق انجم — ایک عملی انسان

ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک مضمون میں اپنے متعلق کچھ اس طرح کی بات لکھی ہے کہ میں سڑک کا آدمی ہوں . . . . جامع
بد کے قریب ڈاک خانے کے نیچے بیٹھ کر خط لکھا کرتا تھا . . . . ۱۹۴۴ء میں بارہ برس کی عمر میں والد کا انتقال ہو گیا . . .
کسر نفسی یقیناً ایک خوبی ہے لیکن ڈاک خانے کے نیچے بیٹھ کر خط لکھنے سے کوئی شخص سڑک کا آدمی نہیں بن جاتا .
اکی رحمتوں کے پہلو حد و شمار سے باہر ہیں . کسی فرد کی تخلیقی صلاحیتوں کے سر چشمے کہاں کہاں واقع ہیں اس کا بعض اوقات
ان رحمتوں سے مستفید ہونے والی شخصیتوں کو علم بھی نہیں ہوتا . بزرگوں کی دعائیں یا اپنے بزرگانِ خاندان میں کسی عالم کی موجودگی
س طرح ہمیں متاثر کرتی ہے اور کس طرح بعد میں آنے والے بچوں کی علمی یا ادبی یا خالص تخلیقی صلاحیتوں پر اثر انداز ہوتی ہے یہ
ائی راز ہیں جو ہم لوگوں کی سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں ، ایک زندہ و پائندہ حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں .

ڈاکٹر خلیق انجم کے نانا پروفیسر عزیز الرحمٰن ایک مستند عالم تھے . اردو انگریزی دونوں زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا
سنہ میں انھوں نے سات جلدوں پر مشتمل "علم مجلسی" نام کی کتاب لکھی . اور انگریزی میں دہلی کی جامع مسجد پر ایک کتاب تحریر کی
جسے اس موضوع پر آج بھی استناد کا درجہ حاصل ہے . خلیق انجم کے والد ریلوے میں انجینئر تھے . گویا خاندان میں ادب اور علم
لٹریچر اور سائنس) دونوں موجود تھے . خاندان میں آنے والی نئی نسل کا ان سے متاثر ہونا یا نئی نسل کے ایک فرد یا زیادہ افراد
کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ادب اور علم کی اس موجودگی کا مثبت رول ادا کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں .

ڈاک خانے کے نیچے بیٹھ کر خط لکھنا بھی مصلحتِ ایزدی سے خالی نہیں رہا ہوگا . ممکن ہے قدرت خطوط نویسی کی جانب
خلیق انجم کے اس رجحانِ طبع کی نشان دہی کر رہی ہو جس کا ایک پہلو بعد میں آ کے "غالب کے خطوط" کی صورت میں نمودار ہوا اور جس
کی تین جلدیں اس وقت اہلِ نظر کے سامنے آ چکی ہیں اور چوتھی جلد زیرِ طبع ہے . "غالب کے خطوط" ڈاکٹر خلیق انجم کا ایک
ایسا شاہکار ہے جس نے ہند و پاکستان کے تمام بالغ نظر نقادوں کو متوجہ کیا ہے . اور انھوں نے اس کام کو ایک عظیم تدوینی
اور تحقیقی کام قرار دیا ہے . جمیل الدین عالی نے اس کے متعلق جو ایک کتاب العلوم کی حیثیت رکھتی ہے ، لکھا ہے کہ "غالب کے خطوط"
ایک مثالی نوعیت کا کام ہے اور اس معیار کا کام ہمیں جرمن ادب میں نظر آتا ہے ." جب اس کتاب کی پہلی جلد شائع ہوئی
اور راقم التحریر نے اس کا مطالعہ کیا تو اس سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس سے متعلق اس نے انگریزی میں ایک مضمون لکھا جو
"اقبال ریویو لاہور" اور "کشمیر ٹائمز ، جموں" میں شائع ہوا .

"غالب کے خطوط" پر تو کام ڈاکٹر خلیق انجم نے خیر بہت بعد میں آ کے کیا . تصنیف و تالیف کا کام انھوں نے ۱۹۵۰ء

یں شروع کر دیا تھا جب کر وہ ابھی ایم. اے کے طالب علم تھے۔ نکولائی گوگول کے ناول "تاراس بلبا" کا انھوں نے ۱۵۱
ہی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی کی جانب سے شائع ہوا تھا۔ کچھ مدت بعد انھوں
مرزا مظہر جان جاناں کے فارسی خطوط مرتب کیے۔ اور اردو میں ان کا ترجمہ کیا۔ یہ کتاب ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی "غالب
تحریریں" غالبیات کے سلسلے میں خلیق انجم کی ایک اور کتاب ہے۔ جو ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آئی۔ ۱۹۶۵ء میں "مرزا محمد رفی
انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے شایع کی۔ اس کتاب کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور صاحب نے لکھا تھا کہ اگر
کو یہ دیکھنا ہو کہ اردو میں تحقیق کس اعلا معیار پر پہنچ گئی ہے تو اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔"

یہاں اس مضمون میں ڈاکٹر خلیق انجم کی تمام تصنیفات اور تالیفات کا ذکر کرنا میرا مقصد نہیں ہے۔ اگرچہ
تصنیفات و تالیفات کی تعداد تیس اکتیس تک پہنچتی ہے لیکن یہاں کتابوں کا ذکر محض ضمنی طور پر آگیا ہے۔ کہنا تو
چاہتا تھا کہ نکولائی گوگول کے ناول "تاراس بلبا" کے ترجمے سے بھی بہت پہلے علم و ادب خلیق انجم کا اوڑھنا بچھونا ب
۱۹۵۴-۵۵ء کی بات ہے یا شاید اس سے بھی کچھ پہلے کی انجمن تعمیر اردو کے ایک جلسے میں خلیق انجم نے اصغر گو
کی شاعری پر ایک مقالہ پڑھا چند روز قبل مولانا آزاد پر ان کا ایک مضمون دیکھ چکا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم پر اس تحریر سے خاصا مایو
تھا اور اب جو چند روز بعد اصغر گونڈوی کی شاعری پر اتنا مدلل اور متوازن مقالہ سنا تو میری مسرت کی انتہا نہ رہی۔ اور
نے غالباً دس بارہ روز تک اس مضمون سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

خلیق انجم کے ساتھ اگرچہ ملاقاتیں اس سے قبل بھی انجمن تعمیر اردو کے جلسے میں ہو چکی تھیں اور غالباً انجمن
اردو (ہند) شاخ دہلی کے اجلاس میں بھی۔ لیکن اس جلسے نے یا دوسرے لفظوں میں خلیق انجم کے مقالے نے ہمیں
دوسرے سے بہت قریب کر دیا۔ اور عمر میں ۱۷۔۱۸ برس کا فرق ہونے کے باوجود دونوں میں دوستی کا ایک ایسا ر
قائم ہوا جو خدا کے فضل سے آج تک برقرار چلا آرہا ہے۔

ان دونوں انجمنوں میں مقالات، نظموں، غزلوں اور کہانیوں کے بعد کبھی کبھار بحث و مباحثہ شروع ہو جایا کرتا
بحث میں حصہ لینے والے حضرات علامہ برج موہن دتاتریا کیفی، حکیم اجمل خاں، گوپی ناتھ امن، اور مالک رام بھی تھے۔ گویا
غلام ربانی تاباں اور غلام احمد فرقت اور ان کے بعد کی نسل کے بھی جن میں شمیم کرہانی، مخمور جالندھری، فکر تونسوی، پرکاش پنڈ
نریش کمار شاد اور راقم التحریر کا نام بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے بعد کی نسل لڑکوں پر مشتمل تھی اور اس group
یں خلیق انجم بھی شامل تھے۔ خلیق انجم کی بحث تمام اہل بزم اور اہل قلم حضرات کو متاثر کرتی تھی ان کے انداز بحث کی خو
ہوتی تھی کہ وہ مختصر لفظوں میں اپنا مافی الضمیر بیان کر دینے پر قادر تھے۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی وجہ سے دو حضرا
کی نوک جھونک تلخی کی صورت اختیار کر لیتی تھی اس وقت خلیق انجم اپنے طنز و مزاح کے چھینٹوں سے کام لے کر محفل
زعفران زار بنا دیتے تھے اور صورت حال سنبھل جاتی تھی۔ خلیق انجم کی یہ شگفتہ مزاجی آج بھی باقی ہے اور میں نے اکثر علمی
ادبی محفلوں میں اور بعض دفعہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جلسوں میں بھی یہ دیکھا ہے کہ اگر کسی وجہ سے ماحول میں بدمز
پیدا ہوئی ہے تو خلیق انجم کی شگفتہ بیانی نے بگڑی ہوئی بات کو بنا لیا ہے۔ یہ رکھ رکھاؤ خلیق انجم کے مزاج کا ایک
ہے۔ اس کا جزو لاینفک ہے اور ظاہر ہے کہ

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اور یہ اسی سعادت ہی کے باعث ہے کہ یہ شگفتہ دماغی کسی مصنوعی یا بناوٹی طرز بیان کا حصہ نہیں ہے بلکہ خود ایک و

زندگی ہے جس کا خمیر صاف دلی اور بے تکلفی کے اجزا سے اٹھا ہے۔ چناں چہ یہ بات اکثر میرے دیکھنے میں آئی ہے کہ خلیق انجم کا رویہ ہر ایک کے ساتھ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا تکلفات کی آلائش سے پاک ہے۔ یہ بات بظاہر حیرت انگیز نظر آتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ خلیق اپنے دفتر کے چپراسیوں کو بھی وہی عزت دیتے ہیں جو ایک انسان کو دوسرے انسان کو دینا چاہیے۔
میں نے انھیں انجمن کے بعض ملازمین سے ناراض ہوتے بھی دیکھا ہے انھیں غصے کے عالم میں بھی دیکھا ہے لیکن جتنی تیزی سے انھیں غصہ آتا ہے اسی تیزی سے فرو بھی ہو جاتا ہے اور اسے ظاہر و باطن کی یکسانیت کی دلیل کہنا غلط نہیں ہوگا۔ پٹھان کا ظاہر و باطن تو یکساں ہونا ہی چاہیے۔ ویسے بھی ان کے انداز گل افشانیٔ گفتار کے بارے میں قرۃ العین حیدر کا کہنا ہے کہ خلیق انجم بڑی سے بڑی بات کو بھی اس طرح informal انداز میں کہتا ہے کہ بات دل میں اتر جاتی ہے دراصل خلیق انجم ٹھیٹھ دتی والا ہے۔ دلی والے کی خوبی یہ ہے کہ منہ پھٹ ہوتا ہے۔ بات دل میں نہیں رکھتا جو کچھ کہنا ہو سامنے کہہ دیتا ہے۔ اور خلیق انجم تو پٹھان بھی ہے گویا کریلا اور پھر نیم چڑھا۔ اور ہاں، خلیق انجم نوجوانوں میں جو ہر قابل کی حوصلہ افزائی اور ادب و زندگی کے میدان میں ان کی رہنمائی کو بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ انجمن کے سیمناروں میں وہ ہمیشہ دو یا تین طلبہ کو سامنے لاتے ہیں اور ان نئے طلبہ میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا شمار دیکھتے ہی دیکھتے اہل قلم میں ہونے لگا ہے۔

ہاں! تو میں خلیق انجم کے اس مقالے کی بات کر رہا تھا جو انھوں نے انجمن تعمیر اردو کے اجلاس میں پڑھا جب اجلاس ختم ہوا تو میں نے ان سے کہا کہ کبھی وقت آپ کے پاس ہو تو کبھی کبھار ملاقات ہونا چاہیے۔ چناں چہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنے اپنے پتوں سے آگاہ کیا خلیق انجم اس زمانے میں دریا گنج والے مکان میں رہتے تھے۔ میں پل بنگش والے مکان میں۔ دفتر میرا اولڈ سیکریٹریٹ میں تھا پبلی کیشن ڈویژن میں۔

ہمارے پل بنگش والے مکان کی کہانی یہ ہے کہ یہ کسی رئیس کا مکان تھا جو ۴۷ء کے فسادات میں مکان اور اس کے ساتھ اپنے وطن کو چھوڑ کے مہاجر کی حیثیت سے پاکستان چلا گیا تھا۔ ۴۸ء میں جب حضرت جوش ملیح آبادی پبلی کیشن ڈویژن میں اڈیٹر اردو بن کر آئے تو اسی مکان میں فروکش ہوئے۔ یہ مکان انھیں کسٹوڈین نے ساٹھ روپے ماہوار کرایے پر دیا تھا۔ غالباً ۵۰ یا ۵۱ء میں جوش صاحب یہ مکان چھوڑ کر اولڈ سیکریٹریٹ کے قریب گورنمنٹ کے الاٹ کردہ کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ اور میرے والد محترم مرحوم صاحب کے ساتھ اپنے وعدے کے مطابق یہ مکان ہمارے حوالے کر دیا۔ الگ بات ہے کہ سال ڈیڑھ سال کا کرایہ اور بجلی کا بل ادا کیے بغیر ہی جوش صاحب چلے گئے تھے۔ لیکن ہمارے نام بھی جوں کہ دس بارہ کمروں پر مشتمل مکان ساٹھ روپے ماہانہ ہی پر الاٹ ہونا تھا۔ اس لیے ہم نے اس پر اپنے کرایہ دارانہ حقوق کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے حکومت کے دفاتر سے کسی مطالبے کے بغیر جوش صاحب کا باقی ماندہ کرایہ اور بجلی کا بل ادا کر دیا تاکہ یہ عدم ادائیگی کہیں ہم لوگوں کی بے دخلی کا باعث نہ بن جائے۔ ہم اس وقت پانچ افراد تھے اتنا اچھا مکان چھوڑ کر کہاں جاتے۔

مکان چوں کہ بہت بڑا تھا اس لیے نہ صرف یہ کہ ہم لوگ اس میں بہت آرام سے رہتے تھے بلکہ جب مہمان آجاتے تھے تب بھی ہمارے آرام میں کوئی خلل نہیں پڑتا تھا۔ اور مہمان بھی آرام سے رہتے تھے۔ فراق صاحب جب دلی آتے تھے ان کا مستقل ٹھکانہ یہی مکان ہوتا تھا۔ جب تک ہم لوگ اس مکان میں رہے ڈاکٹر محی الدین زور بھی ہمارے یہاں قیام کرتے رہے۔ ان کا اس مکان میں قیام کرنے کا سلسلہ ۱۹۵۰ء تک رہا۔ جب ہم لوگ موتی باغ نئی دہلی کے ایک مکان میں منتقل ہو گئے تو ڈاکٹر زور کا قیام مختلف جگہوں پر ہونے لگا، کبھی آندھرا پردیش گیسٹ ہاؤس میں اور کبھی کسی اور گیسٹ ہاؤس میں۔ اس وقت موتی باغ کو پرانی دلی سے اور نئی دلی کے بعض علاقوں سے بہت دور تصور کیا جاتا تھا اور باہر سے

انے والوں کو یہ خیال رہتا تھا کہ اگر ہم موتی باغ میں رہیں گے تو شہر سے بہت دور ہو جائیں گے۔ آنے جانے کی بھی سہولیات اس وقت نہیں تھیں جو آج دہلی میں میسر ہیں۔

پل بنگش والے مکان کا ذکر یوں تو اس مضمون میں جملہ معترضہ ہی کے طور پر نظر آتا ہے لیکن حقیقتاً اس مکان کا ذکر میں نے اس لیے کیا ہے کہ ڈاکٹر زور خلیق انجم کو بہت چاہتے تھے اور ڈاکٹر زور جب تک دلی میں مقیم رہتے تھے خلیق انجم ہر روز ان سے ملنے آتے تھے۔ ان کے مکان سے ہمارے مکان کا فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ اب جب ہر روز وہ زور صاحب سے ملنے غریب خانے پر آتے تھے تو ظاہر ہے کہ ہم دونوں کے باہمی مراسم بلکہ دوستی بھی پختہ سے پختہ ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اکثر ان کے ساتھ اسلم پرویز بھی ہوتے تھے۔ اسلم پرویز بھی شگفتہ بیانی میں اپنی مثال آپ ہیں اور جب دونوں محفل میں موجود ہوتے تھے تو سے

تب دیکھیے انداز گل افشانی گفتار

کا عالم ہوتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اسلم پرویز لڑکیوں میں کہاں تک مقبول ہیں اور اس کا سبب کیا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ خلیق انجم کی صنف نازک میں مقبولیت کا سبب ان کی شگفتہ بیانی ہے۔

خلیق انجم کہتے ہیں کہ وہ شاعر نہیں ہیں لیکن ہزاروں خراب شعر کہنے والا کوئی شخص اگر شاعر کہلا سکتا ہے تو ایک شعر اچھا کہنے والا شاعر ہونے سے کیسے انکار کر سکتا ہے بالخصوص جب اس نے دو چار ہی شعر کہے ہوں اس صورت میں اس پر خراب شعر کہنے کا الزام بھی تو نہیں آسکتا۔

مدت کی بات ہے خلیق انجم اپنے چند دوستوں کے ساتھ چنڈو خانے میں بیٹھے تھے۔ وہاں ایک ایسے دوست کا ذکر آگیا جو ایک مدت سے غائب تھا۔ اور چنڈو خانے کے آس پاس کہیں نظر نہ آیا تھا۔ بات یہ تھی کہ ادھار چائے پینے کا بہت روپیہ اس کے ذمے نکلتا تھا۔ چنڈو خانے کے مالک نے اس کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ شخص ایک مدت سے نظر نہیں آرہا ہے۔ کسی نے کہا لڑکی کے عشق میں تباہ ہو گیا ہے اور مارا مارا پھر رہا ہے۔ بے ساختہ خلیق انجم کی زبان سے نکلا۔

ایسا تو کم ہوا ہے محبت میں ہار کے
عشاق نے چکائے ہوں پیسے ادھار کے

جامع مسجد پر مولانا سمیع اللہ کی دوکان پر کچھ ادیب اور شاعر بیٹھے تھے فراق کا ذکر ہو رہا تھا کسی نے کہا کہ فراق کا پورا نام رگھوپتی سہائے ہے۔ خلیق انجم نے فوراً چار مصرع کہے۔

کب وہ دل کو جلائے تھا یارو
کب وہ آنسو بہائے تھا یارو
اس کو اردو نے کر دیا ہے فراق
ورنہ وہ تو سہائے تھا یارو

خلیق ایک دن کنور مہندر سنگھ بیدی سے کہنے لگے کہ آپ نے شعرا اور شاعرات کو ڈائس پر ایسے بیٹھایا ہے کہ شاعرات آپ کے قریب ہیں اور شعرا دور۔ اور جب آپ کسی شاعر کو داد دیتے ہیں تو کسی خاتون شاعر کی پیٹھ پر تھپکی دے کر۔ اول تو یہی بات داد طلب ہے۔ اور بلکہ اس سے بھی زیادہ داد طلب فعل آپ کی تھپکی دینے کا انداز ہے۔ آپ کا ہاتھ ہوا میں کم دیر اور کمر پر زیادہ دیر رہتا ہے۔

ایک سازش کرنے والے ادیب نے دعویٰ کیا کہ میں پٹھان ہوں۔ خلیق انجم نے کہا کہ یہ بات غلط ہے۔ تم پٹھان
لگتے۔ اُس نے کہا ہمارا محلہ ہی پٹھانوں کا ہے اس میں سب پٹھان رہتے ہیں۔ خلیق انجم نے جواب میں کہا
محلے میں کوئی غیر پٹھان بھی رہتا ہوگا۔

ایک دفعہ خلیق انجم نے غلطی سے ایک شاعرہ کے مکان پر دستک دی۔ اندر سے شاعرہ کی گرجدار آواز
ہے اس وقت دستک دینے والا۔ انھوں نے فوراً اپنے حواس جمع کرتے ہوئے کہا لالاجی نے بھیجا ہے
نے اسی غصے بھری آواز میں کہا۔ کون لالاجی۔ انھوں نے بہت اطمینان سے جواب دیا ہار کی قیمت لانے کے لیے
شوہر نے ہار کی قیمت ابھی تک نہیں بھجوائی۔ دو ماہ قبل جھمکوں کی قیمت تو بھجوادی تھی لیکن ہار کے دام ابھی تک
ائے۔ اب شاعرہ حیران کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ گھر میں نہ تو جھمکے آئے ہیں اور نہ ہار۔ خلیق انجم تو لالاجی کا پیغام
ہاں سے چل دیے۔ لیکن جب شوہر صاحب گھر واپس آئے ہوں گے تو . . . . .

خلیق انجم کے ایک دوست شیر کے شکار کے بہت شوقین تھے۔ لیکن شیر ہاتھ نہیں آتا تھا۔ یہ دوسرے جانور
تے لیکن شیر کا شکار ان کے مقدر میں نہیں تھا۔ ایک دفعہ ان کے مقدر نے یاوری کی اور مدھیہ پردیش میں ایک
لار کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ انھوں نے خوشی میں گھر تار دیا LION KILLED۔ اتفاق کی بات ہے کہ
والا تار لے کر ان کے گھر پہونچا تو خلیق انجم دروازے پر موجود تھے۔ انھوں نے تار والے سے تار لے کر پڑھا اور
ب میں رکھ لیا۔ دوسرے دن ایک شخص کو ان دوست کے گھر بھیجا کہ مدھیہ پردیش میں آپ کے صاحب خانہ
زار روپے میں ہم سے پنجرے میں بند شیر خریدا تھا۔ ایک ہزار روپیہ دے دیا تھا اور ایک ہزار روپیہ باقی
ادا کیجیے۔ وہ شخص تو یہ جواب سن کر کہ ابھی صاحب خانہ واپس نہیں آئے لوٹ گیا۔ لیکن دو چار روز بعد جب
خانہ شیر کی لاش لیے ہوئے اس توقع پر گھر پہونچے کہ مبارک باد ملے گی تو گھر والوں نے ان کا خوب
ڑایا کہ پنجرے میں بند شیر کو گولی ماردی جاکر فلاں شخص کو باقی ایک ہزار ادا کرو۔ وہ سٹ پٹا کر رہ گئے۔ لگے
ں کو گالیاں دینے جس نے ان پر یہ بہتان لگایا تھا اور گالیوں کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ خلیق انجم بھی
ناکے طور پر ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے اور جس شخص نے بہتان لگایا تھا اسے برا بھلا کہتے رہے۔

ایک دوست کے گھر میں محفل جمی تھی۔ تصدق حسین خالد کا ذکر آیا کسی نے کہا کہ فلاں سنہ میں ان کا انتقال
الک رام صاحب بھی محفل میں موجود تھے۔ انھوں نے اس پر حیرت کا اظہار کیا کہ اس سنہ سے پہلے میں
ت کا سلسلہ شروع کیا تھا میری تحریر کی وفیات میں تو ان کا ذکر نہیں ہے۔ خلیق نے چھوٹتے ہی کہا وہ آپ
نکل گئے تھے۔ وہ وفیات کے شروع ہونے سے ایک سال قبل ہی دنیا سے فرار ہوگئے۔

لیق انجم ایک انٹرویو میں پیش ہوئے۔ شیخ چاند کا ذکر آگیا ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم اکسپرٹ کی حیثیت سے
انٹرویو کے رکن تھے۔ انھوں نے شیخ چاند کے ذکر پر کہا کہ شیخ چاند تو بہت معمولی مصنف تھے۔ اس پر
جواب دیا، جی ہاں، لیکن انھوں نے جو شاگرد پیدا کیے ہیں وہ بڑے مصنف تھے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کے
رنگ اڑ گیا۔

کروڑی مل کالج میں ہندی کے ایک لکچرر تھے وشوا ناتھ ترپاٹھی۔ بہت اچھی اردو جانتے تھے۔ انھوں نے
شا کلاس میں طلبہ کو اردو پڑھانے کا انتظام اس خیال سے کر رکھا تھا کہ اچھی ہندی جاننے کے لیے اردو کا
ی ہے۔ ایک دن خلیق انجم مصروف تھے۔ انھوں نے ترپاٹھی جی سے کہا کہ آج میری اردو کلاس آپ لے لیں۔

ترپاٹھی جی بولے۔ لیکن میں تو اردو نہیں جانتا، اس لیے یہ جرم ہے کہ میں اردو پڑھاؤں۔ خلیق نے فوراً کہا
آپ ہندی بھی تو پڑھاتے ہیں۔

پاکستان کے ایک سفر میں خلیق انجم اور میں اکٹھے تھے۔ دراصل ہم دونوں اردو مصنفین کے ایک ڈیلی گیشن کے
رکن تھے۔ جو پاکستان اکیڈمی آف لنگویجز کی دعوت پر پاکستان گیا تھا۔ ہلٹن ہوٹل میں ہمارا قیام تھا۔ ڈاکٹر
عشرت مجھ سے ملنے آئے۔ خلیق انجم نیچے لابی میں تھے۔ ان سے انھوں نے پوچھا کہ آزاد کس کمرے میں ہیں
نے کمرے کا نمبر بتایا تو وہ میرے یہاں تشریف لائے۔ وہ میرے لیے میرے ان مضامین کا آئریریم بھی لائے
"اقبال ریویو" اور "اقبالیات" میں شائع ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہمارے ڈیلی گیشن کو پروگرام کے مطابق
جگہ جانا تھا۔ میں، خلیق انجم اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ہم تینوں ایک ہی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ خلیق نے مجھ سے
ڈاکٹر وحید عشرت آپ کے کمرے کا نمبر پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتا دیا تھا۔ میں نے کہا یار تم نے بہت
بات کی وہ میرے لیے میرے مضامین کی رائلٹی لائے تھے۔ اب یہاں شاپنگ میرے لیے آسان ہو
رفیعہ آپا کہنے لگیں۔ میری کتاب کا بھی ایک پبلشر یہاں ہے۔ اس سے ملاقات ہو جاتی تو رائلٹی
خلیق انجم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا کہ رفیعہ آپا آپ اپنے پبلشر کی بات مت کیجیے۔ وہ یہاں
بہت غصے میں تھا اور آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ رفیعہ آپا نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ کیا مطلب؟ وہ
اور مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ خلیق نے کہا کہ جی ہاں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی کتاب چھاپی اور
کر کتاب چھپنے کے چند دن بعد طلبہ نے مجھے گھیر لیا اور بھرے بازار میں میری پٹائی کر دی۔ رفیعہ آپا نے خلیق انجم کی
یقین کرتے ہوئے کہا۔ میں نے تھوڑا ہی اسے کتاب چھاپنے کے لیے کہا تھا اس نے خود ہی چھاپی تھی۔

خلیق انجم کی بذلہ سنجی اور شگفتہ بیانی کا ذکر چل نکلا تو کچھ اور دلچسپ واقعات سن لیجیے۔ کچھ سال ؛
ادیب کو ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ ملا جس پر بعض لوگوں کو اختلاف تھا۔ خود خلیق انجم بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ا
کے مستحق نہیں ہیں یہ انعام اسے دے کر ساہتیہ اکادمی کے وقار میں کمی آئی ہے۔ اب لطیفہ سنیے۔

خلیق انجم کی ایک ایسے ادیب سے بحث ہو گئی جس نے ان کی ایک کتاب پر بے جا تنقید کی تھی۔ او
میں نوبت چیخ و پکار کو پہنچ گئی خلیق انجم نے بہت اونچی آواز میں غصے ہو کر کہا کہ آپ نے میرے خلاف جو کچھ لکھا
بدلہ ایسا چکا تا کہ آپ تو کیا آپ کا پورا خاندان کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ آنے والی نسلیں آپ کے
شرمائیں۔ ان صاحب نے انتہائی غصے میں کہا کہ آپ میرا کیا کر لیتے۔ خلیق انجم نے اسی غصے کے لہجے میں جواب
آپ کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دلوا دیتا۔ اس فقرے پر بڑے زور کا قہقہہ لگا اور محفل زعفران زار ہو گئی۔

حال ہی میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیر اہتمام قاضی عبدالغفار پر سمینار منعقد ہوا۔ خلیق صاحب
پڑھنے کے لیے جن لوگوں کو دعوت دی تھی ان میں دلی کی ایک خاتون بھی تھیں۔ ان خاتون کو قاضی صاحب کی "لیلیٰ
مجنوں کی ڈائری" کے موضوع پر مقالہ لکھنا تھا۔ ایک دن ہم لوگ "اردو گھر" میں خلیق صاحب کے ساتھ بیٹھے تھے
آگئیں۔ اور انھوں نے بیٹھتے ہی کہا کہ آپ نے مجھے "لیلیٰ کے خطوط" اور "مجنوں کی ڈائری" پر مقالہ لکھنے کے
یہ دونوں کتابیں کسی لائبریری میں نہیں ملتیں۔ آپ نے مجھے لیلیٰ مجنوں کے چکر میں کیوں ڈال دیا۔ خلیق انجم نے
دیا کہ "دل کی بات کہنے کا اور کیا طریقہ ہو سکتا تھا۔"

تین چار سال کی بات ہے کہ ایک ایمبسی میں بوفے ڈنر تھا۔ لوگ ہاتھوں میں پلیٹیں لیے چار چار یا

کھانا کھا رہے تھے۔ خلیق انجم ایک گروہ میں کھڑے حسب عادت اپنی شگفتہ بیانی سے لوگوں کو ہنسا رہے تھے۔
ب اجنبی صاحب ہاتھ میں پلیٹ لیے اس گروہ میں شریک ہو گئے۔ ایک دو منٹ تو خاموش رہے اور
نے بولنا شروع کیا ہے تو خاموش ہونے کا نام نہیں لیا۔ ایک دفعہ سانس لینے کے لیے رکے تو خلیق انجم
ب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا معاف کیجیے گا میں آپ سے واقف نہیں ہوں لیکن ایسا لگتا ہے کہ آپ
لیٹ ہیں۔ ان صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ کا خیال صحیح ہے لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ خلیق انجم نے جواب
ئی دیر سے ایسی باتیں کر رہے ہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں، پھر آپ اپنی کہے جا رہے ہیں اور کسی کی نہیں
ہے ہیں۔ اس پر بڑے زور کا قہقہہ لگا اور وہ صاحب شرمندہ ہو کر چلے گئے۔

ڑھ دو سال پہلے ڈاکٹر خلیق انجم کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور جس کی وجہ سے پاؤں کی ہڈی میں فریکچر ہو گیا جب
گیا تو ڈاکٹر نے ہدایت دی کہ آپ پاؤں زمین پر نہ رکھیں۔ پلاسٹر بندھنے کی وجہ سے خلیق کو بہت تکلیف ہو رہی
ڑی تھوڑی دیر میں کراہ رہے تھے۔ لیکن حسِ مزاح اب بھی برقرار تھی کہنے لگے ڈاکٹر صاحب دشمنوں اور
یٹھ سے یہی شکایت رہی ہے کہ میں پاؤں زمین پر نہیں رکھتا۔ اتنی تکلیف میں بھی دوسروں کو ہنسانے
ت بڑا دل گردہ چاہیے۔

کا ایک واقعہ اور سن لیجیے۔ ایک ادبی جلسے میں ایک ادیب نے کسی موضوع پر تقریر کرتے ہوئے بے وجہ
للا ہند، پر الزام کی بوچھار کر دی۔ وہ صاحب تقریر کر کے بیٹھے تو خلیق انجم جواب دینے کے لیے کھڑے
نے لگے حضرات آپ کے علم میں ہو گا کہ جامع مسجد سے حوض قاضی تک سواری کی رکشائیں چلتی ہیں۔ کسی زمانے
لے چار آنے فی سواری لیتے تھے۔ ایک دن میرے ایک دوست کو جلدی تھی وہ رکشا میں بیٹھ گئے اور دوسری
لار کیے بغیر انھوں نے رکشا والے سے چلنے کے لیے کہا۔ جب رکشا حوض قاضی پہنچی اور وہ میرے دوست
رے تو رکشا والے نے سواری کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ کالی شیروانی، سفید براق چوڑی دار پاجامہ،
ہوئے چمکتے ہوئے جوتے۔ رہوں کہ وہ رکشا میں اکیلے آئے تھے اس لیے انھیں دو سواریوں کے آٹھ آنے
رکشا والے نے ان صاحب کو دیکھ کر دو روپے مانگے۔ انھوں نے آٹھ آنے دینا چاہا۔ رکشا والا نہیں مانا
کرار ہو گئی۔ میرے دوست کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے شیروانی اتار کر رکشا پر ڈالی اور غصے میں کہا کہ "ابے اگر ہم نے
الا ہے تو تو سمجھتا ہے کہ ہم شریف آدمی ہیں۔" رکشا والا ڈر گیا اور آٹھ آنے لے کر خاموشی سے چلا گیا۔ یہ واقعہ
انجم نے کہا کہ حضرات میں اب اپنی شیروانی رکشا پر ڈالتا ہوں اور عرض کرتا ہوں۔ ہال قہقہوں سے گونج اٹھا
نو لٹتے میں تھے۔ انھوں نے پندرہ بیس منٹ تک اپنے شعلہ نوائی کے جوہر دکھائے۔

مانے اس مضمون کے شروع میں خلیق انجم کی چند کتابوں کا ذکر کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان کی چند اور کتابوں کے
جا۔ لیکن ان کی خوش بیانی اور خوش مزاجی کی باتیں شروع ہو گئیں۔ خلیق انجم کے اس طرح کے لطیف
نس بیانی پر مشتمل پوری ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے اور اقبال کے الفاظ میں ان کے بارے میں
ہا کہ

کہ ہے ظریف و خوش اندیشہ و شگفتہ دماغ

سید قدرت نقوی (کراچی)

عود ہندی اور خلیق انجم

غالب کے خطوط کا اولین مجموعہ "عود ہندی" کے نام سے پہلی مرتبہ محمد ممتاز علی خاں کی کوششوں سے ہو کر انہی کے زیرِ اہتمام مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع ہوا۔ اس زمانے میں جیسا بھی چھپا بہر حال یہ چھپ گیا کافی غلطیاں ہیں۔ کاتب کے تصرفات جداگانہ ہیں لیکن اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اگر یہ کوشش نہ آتی اور خطوط کی طباعت واشاعت کی یہ کوشش اور تحریک نہ ہوتی تو شاید غالب کے خطوط اتنے عام پر نہ آتے۔ اسی لیے "عودِ ہندی" کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ متنی تنقید کے اعتبار سے حاصل ہے کہ بحث کا آغاز اسی سے کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے "غالب کے خطوط" میں خطوطِ غالب کی از سرِ نو ترتیب کی ہے اور ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اس سلسلے میں پہلی کوشش محمد منیر مینر کی ہے جنھوں نے غالب کے خطوط کی ترتیب کے سلسلے میں ایک اہم قدم اٹھایا اور "اس اردوے معلی مطبوعہ مطبع مجیدی کان پور ۱۹۲۲ء میں اس طرح مرتب کی کہ تمام مکتوب الیہم کے جملہ منتشر خطوط مکتوب الیہم کی فہرست اور ان کے نام کے خطوط کی تعداد درج کر دی ان کے بعد مولوی مہیش پرشاد نے تاریخ سے خطوطِ غالب مرتب کیے اور "عود ہندی" اور اردوے معلّیٰ کی تفریق کو ختم کیا، کچھ نئے خطوط شامل کیے۔ اس سے مولانا غلام رسول مہر نے خطوطِ غالب کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا جسے غلام علی اینڈ سنز نے چھاپا۔ مولانا امتیاز علی عرشی نے غالب کے خطوط بنام والیانِ رام پور وغیرہ کو نہایت محنت وجاں فشانی سے مرتب کر کے طبع کرایا۔ غالب کو سید آفاق حسین آفاق دہلوی نے مولانا عرشی کے مکاتیبِ غالب کو سامنے رکھ کر مرتب کیا۔

"عودِ ہندی" میرٹھ کے بعد دہلی اور لکھنؤ وغیرہ سے متعدد بار چھپی مگر اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مرتبہ اسے مجلس ترقی ادب لاہور سے سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے مرتب کر کے چھپوایا مگر متن کی قدیم رکھی۔ البتہ حواشی وغیرہ لکھ کر اس کو مفید بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ متنی نقد کی طرف زیادہ توجہ نہیں، ماخذات کی نشان دہی کی گئی مگر ان کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔

ڈاکٹر خلیق انجم کے پیشِ نظر یہ تمام کوششیں ہیں۔ میں "عود ہندی" کے سلسلے میں یہ مختصر سی گزارش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے "عود ہندی" کی بہ یک وقت دو طباعتوں کا سراغ لگا کر اپنی انتہائی بالغ نظری، باریک بینی اور ذہنی رسائی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اس دریافت کی داستان وہ "عود ہندی" کے بارے

اہم انکشاف کے زیرِ عنوان اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"بہت عرصہ ہوا میں نے غالب کے وہ خطوط مرتب کر لیے تھے جن کے متن کی بنیاد "عودِ ہندی" اور "اردوے معلیٰ" کے پہلے ایڈیشنوں پر تھی . . . . جب میں نے دوبارہ کام شروع کیا تو انجمن ترقی اردو کی لائبریری سے "عودِ ہندی" کا پہلا ایڈیشن لے لیا مرتب کیے ہوئے خطوط کا جب "عودِ ہندی" سے موازنہ کیا تو بہت زیادہ اختلافات نسخ نکلے . . . . اتفاق سے انجمن کی لائبریری میں "عودِ ہندی" کا ایک اور پہلا ایڈیشن نکل آیا۔ میں نے دونوں ایڈیشنوں کے سرورق اور ترقیمے کی عبارتوں کا موازنہ کیا تو ایک حیرت انگیز اور دلچسپ انکشاف ہوا . . . . اگرچہ ترقیمے میں تاریخ اشاعت دونوں میں ایک ہی ہے یعنی ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ درج ہے۔ لیکن سرورق کی عبارت میں معمولی سا فرق ہے۔ ایک ایڈیشن کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

خداوند بے نسبتِ بندگی۔ نہ پری؛ درونہ پراگندگی۔ بفضل واہب العطیات خالق الخیر والحسنات انشا اردو لاجواب موسومہ عودِ ہندی من تصنیف جناب استادِ زماں علامہ عصر اسداللہ خاں المتخلص بہ غالب حسبِ فرمائش مجمع خوبی ہا جہاں میاں ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ۔
در مطبع مجتبائی میرٹھ طبع گردید۔

دوسرے ایڈیشن میں دوسری سطر میں "انشار اردو" کے بجائے "انشار اردو" اور آخری سطر اس طرح ہے۔

"در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ باہتمام محمد ممتاز علی طبع شد"

دونوں ایڈیشنوں کے سرورق کی عبارت میں اختلاف کا صاف مطلب ہے کہ دونوں الگ الگ ایڈیشن ہیں۔"

ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ انکشاف یقیناً بہت اہم ہے۔ یہ پڑھ کر میں نے اپنی "عودِ ہندی" نکالی اور اس کے سرورق کا مجلس ترقی ادب کی مطبوعہ "عودِ ہندی" میں بعنوان "عودِ ہندی کا پہلا صفحہ"، جو سرورق کا عکس ہے نکال کر مقابلہ و موازنہ کیا تو نہ صرف ڈاکٹر خلیق انجم کے بیان کو درست پایا بلکہ دونوں میں خطی اختلاف بھی پایا اور نقش و نگار میں بھی کافی فرق نظر آیا میرے پاس جو نسخہ ہے اور دوسرے نسخہ کے سرورق کی کیفیت یہ ہے۔

۱۔ میرے نسخے میں پہلی سطر میں "پراگندگی" بہ یائے معروف ہے جب کہ دوسرے میں بہ یائے مجہول۔ اور پ کے دو نقطے ہیں۔

۲۔ وسط میں "عود" کی دال میں بہت زیادہ نمایاں فرق ہے کہ دال کا تحتی سرا میرے نسخہ میں نہایت باریک ہے اور دوسرے نسخے میں موٹا ہے اور کونے دار ہے۔

۳۔ آخری سطر میں "مطبع" "واقع اور طبع" کی عین دونوں میں مختلف انداز قلم سے لکھی ہوئی ہے میرے نسخہ میں عین کا سرا خمی اور دائرہ بیضاوی مگر ڈھلکا ہوا ہے۔ دوسرے نسخہ میں عین کا سرا جلی ہے۔ دائرہ تو بیضاوی ہی ہے مگر ڈھلکا ہوا اتنا نمایاں نہیں ہو رہا ہے۔

۴۔ "میرٹھ" کو دونوں نسخوں میں ہائے ہوز کے شوشے کے ساتھ ہائے مختفی سے اس طرح "میرٹھہ" لکھا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ میرے نسخے میں "ٹ" کی علامت "ط" کو "ٹ" کے سرے پر لگایا ہے۔ اور ہائے ہوز کے شکن بشکل کو ملا کر "میر"

کے اوپر لکھا ہے۔ لیکن دوسرے نسخے میں "ط" کو ہائے مختفی کے سرے پر اور ہائے ہوز کے شکن کو "ر" کے بالائی سرے کے بالمقابل لکھا ہے۔ ان کی خطی تشکل اس طرح "میرٹھ" ہے

قدیم الایام میں مخطوطات کی الواح منقش ہوا کرتی تھیں۔ "دیوانِ غالب" نسخۂ شیرانی کی لوح منقش ہے جس میں نفیس گل کاری مختلف رنگوں سے کی گئی ہے۔ تقریباً پونے دو سو برس گزر جانے کے باوجود نقش و نگار اچھی حالت میں ہیں۔ البتہ استبدادِ زمانہ کی بدولت رنگوں میں گرد و کہنگی کی وجہ سے کچھ پھیکا پن آگیا ہے۔ چھاپے کے رواج سے الواح کی جگہ سرورق کی تزئین کی جانے لگی۔ سرورق کی تزئین میں باریک حاشیہ اور حوضہ میں بیل بوٹے بنائے جانے لگے۔ یہ کام کاتب حضرات ہی کیا کرتے تھے اور اس سلسلے میں بھی اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس تزئین میں بھی خاص اختراعات سے کام لیا جاتا تھا۔ جس میں کاتب کی صلاحیت، ہنرمندی، اور ذہنی اپج کو دخل ہوا کرتا تھا۔ مختلف قسم کے پھول، بیل بوٹے بنانے میں تخیل سے کام لیا جاتا تھا۔ "عودِ ہندی" کی دونوں طباعتوں کے سرورق میں عبارت، روشِ قلم کی اختلافات کے ساتھ ساتھ گل کاری میں کافی فرق ہے جو پہلی نظر میں واضح نہیں ہوتا مگر تعمقِ نظر سے کام لیا جائے تو فرق نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔

میرے پاس جو نسخہ ہے اس کی گل کاری دوسرے سے مختلف ہے۔ اس فرق کے اظہار میں ہم اپنے نسخہ کو پہلا اور "عودِ ہندی" میں مطبوعہ عکس کو دوسرا کہیں گے۔

دونوں طباعتوں میں سرورق کا چوکھٹا یکساں ہے۔ پہلی پٹی لہریا باریک بیل سے بنائی گئی ہے۔ دونوں کی بیل ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہے۔ اس کے بعد دہری باریک لکیریں ہیں۔ ان لکیروں کے بعد خالی پٹی ہے اس پٹی کے بعد سیاہ پٹی میں سفید پھول پتیاں بنائی گئی ہیں۔ پتیوں کو پھولوں کے گرا گرد بنایا ہے اور غنچوں کے ذریعے ملحق کیا گیا ہے۔ الحاقی زاویہ کے وسط میں بھی پھول بنائے گئے ہیں۔ یہ پتیاں شاخ نما نصف قوس کی مانند ہیں۔ آغاز دو تکا پتیوں سے کیا گیا ہے۔ دوسری شاخ کے سرے پر پھول ہے۔ ان کے بیچ میں جو دائرہ بنتا ہے اس میں ایک پھول ہے دو قسم کے پھول ساری پٹی میں ہیں۔ ایک دائرہ میں، ایک دوسرے میں دوسرا۔ بالائی، تحتانی اور بائیں ہاتھ کی پٹیاں اسی نہج پر ہیں۔ ایک پھول گلاب نما ہے۔ دوسرے پھول کی تین پتیاں تو مور پنکھی یکساں ہیں۔ مگر چوتھی پنکھڑی کو کرن یا ہی یا سیتا پھل بنایا ہے۔ دائیں طرف کا حاشیہ کم چوڑا ہے۔ بائیں حاشیہ سے تقریباً آدھا ہے۔ اس میں لہریا بیل بنائی گئی لہر کے پیچھے میں ڈنڈی اور پھول بنائے گئے ہیں۔ یہ کیفیت پہلے نسخے کے سرورق کے حاشیوں کی ہے دوسرے نسخے کا سرورق اسی نہج پر بنایا گیا ہے مگر خاصا فرق ہے۔ چوگردی لہریا باریک بیل میں فرق ہے۔ پہلے سرورق میں اس بیل کی پتیاں، ڈنڈیاں بہت نمایاں سفید پھولوں اور پتیوں میں نمایاں فرق ہے۔ جن پتیوں کو پہلے میں پھولوں کے ذریعہ ملحق کیا گیا ہے۔ دوسرے میں پھولوں کی جگہ گلدان بنے ہوتے ہیں۔ ملحاقی اتاویہ میں پھول غیر واضح ہیں۔ دائرے کے پھول پہلے سرورق کے انداز پر ہیں مگر پھولوں کی پنکھڑیوں کی رگوں اور زیرے کا انداز بدلا ہوا ہے۔ پہلے میں رگیں نمایاں اور نفیس انداز میں بنائی گئی ہیں۔ زیرہ کا گولا بھی واضح ہے۔ دوسرے سرورق میں بھی دائیں ہاتھ کا حاشیہ کم چوڑا ہے۔ اور اس کے پھولوں کی ساخت اور پنکھڑیوں کی بناوٹ میں کافی فرق ہے۔ پہلے سرورق کے پھول خوش نما، واضح اور نفیس ہیں۔ اور پنکھڑیوں کی بناوٹ ایسی ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ دو پتیاں اور ایک کلی نما پھول ہے۔ دوسرے میں بند شگوفہ کی شکل ہے۔ کالی پٹی کے بعد دونوں میں سفید چھوٹی پٹی میں کالی روشنائی سے عبارت درج ہے۔

حوضہ کے چاروں کونوں پر کیریوں اور پتیاں بنائی گئی ہیں۔ ان کیریوں اور پتیوں کی وجہ سے دونوں سرورقوں کا

فرق نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ پہلے سرورق میں کونوں سے ڈنڈیوں کا آغاز ہوتا ہے۔ان ڈنڈیوں میں دو پتے ہیں پتوں کے بعد دو ڈنڈیاں ہیں جن کے پتے کیریوں کے دونوں طرف پس منظر میں دکھائے ہیں۔ یہ دو دو پتے ہیں جن کے نوکیلے حصے کیری کے دونوں طرف نکلے ہوئے ہیں۔ اور وسطی حصہ کیریوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ اور یہ شکل پھول کی غلافی ہیئت سے مشابہ ہوگئی ہے۔ چاروں کونوں کی پہلی دو پتیاں جو ابتدائی ڈنڈی پہ بنائی گئی ہے ان کی ساخت اور پیمائش میں فرق ہے۔ بالائی بائیں کونے کی پتیاں باقی تین کونوں کی پتیوں سے بڑی ہیں۔ان کی رگیں واضح اور برگی انداز کی ہیں۔ باقی میں یہ انداز اختیار نہیں کیا گیا۔ اس کیری کی غلافی تحتانی چھوٹی پتیوں کی زمین سفید ہے۔ ان میں رگیں نہیں بنائی گئی ہیں۔ کیری کا بیرونی حلقہ غلافی پتیوں کے بعد کٹاؤ دار ہے۔ اس کے بعد دوسرا حلقہ ہے جسے کیریوں بنایا گیا ہے۔ وسطی حلقہ کے اندر ایک نقش ہے جو کٹاؤ دار ہے۔ کٹاؤ سیاہ ہیں اور ان میں سفید دائرہ ہے۔

دوسرے سرورق میں بھی حوضہ کے چاروں کونوں پر کیریں بنائی گئی ہیں۔ آغاز ڈنڈی میں نہایت باریک پتیاں بنائی گئی ہیں۔ جو صرف لکیر ہی ہیں۔ اس کے بعد دو لکیروں سے کیری کی ڈنٹھل کا اظہار کیا گیا ہے۔ پتے بالکل نہیں ہیں گویا غلافی انداز نہیں ہے۔ کیریوں کا بیرونی حلقہ ڈنٹھل میں سے کٹاؤ دار بنایا گیا ہے۔ پہلا حلقہ مرواریدی اور وسطی حصہ وہی کٹاؤ دار اور ان میں سفید موتی نما سفید دائرے ہیں مگر دونوں کی ساخت میں فرق ہے۔

وسطی بیضاوی دائرہ جس میں سفید "عود ہندی" لکھا ہوا ہے، اس کی تزئین منقش ہے اس میں پھولوں اور پتیاں سے آرائش کا کام لیا گیا ہے۔ اس دائرے کا حاشیہ پھولوں سے بنایا ہے اندرونی دائرہ جس میں سفید "عود ہندی" درج ہے، اس کی زمین پھولوں، پتیوں اور ڈنڈیوں سے مزین کی گئی ہے۔ حاشیے کے پھولوں اور پتیوں کی ساخت میں کافی فرق ہے یہ فرق زمینی تزئین کاری میں بھی پایا جاتا ہے۔

بالائی چھوٹی بڑی پٹیوں کی محاذی تحتی پتیاں بھی ہیں۔ پہلی باریک پٹی میں "من تصنیف . . . میر صاحب کالی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ دوسری بڑی پٹی میں "در مطبع" والی عبارت درج ہے۔ جس کی زمین سیاہ اور تحریر سفید ہے۔ اس میں فرق یہ ہے کہ پہلے میں "باہتمام محمد ممتاز علی خاں" درج ہے، دوسرے میں نہیں ہے۔ پہلے میں "طبع شدہ" ہے اور دوسرے میں "طبع گردید" ہے۔

یہ تحریری خطی اور تزئینی فرق دونوں کے الگ الگ طبع ہونے کی تصدیق کرتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے محتاط انداز میں لکھا ہے۔

> "یقینی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن میرا قیاس ہے کہ جس کتاب کے سرورق پر باہتمام محمد ممتاز علی خاں، لکھا ہوا ہے یہ وہ ایڈیشن ہے جو پہلے چھپا تھا۔"

خطی عبارت اور تزئینی فرق کے پیش نظر ہمارا خیال بھی یہی ہے کہ پہلے چھپنے والا سرورق وہی ہے جس کا نسخہ ہماری ملک ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جس کا عکس مجلس ترقی ادب کی مطبوعہ "عود ہندی" میں چھاپا گیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کتاب کے اجرا اور سرورق کی دوبارہ طباعت کے متعلق کچھ وجوہ بیان کی ہیں۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں:

> تیسری صورت جو قرین قیاس ہے وہ یہ ہے کہ "عود ہندی" کے ۱۸۴ صفحات چھپ چکے تھے۔ قطعہ تاریخ طباعت کے انتظار میں چار صفحے کی آخری کاپی چھپنے کی نوبت آئی تو منشی ممتاز علی خاں کو خیال آیا کہ "عود ہندی" کی مانگ بہت زیادہ ہے اور انھوں نے جتنی کتابیں چھپوائی ہیں وہ ناکافی ہیں

۱۸۴ صفحے چھپے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے اس لیے پریس میں ان کے پتھر بھی صاف کر دیے گئے تھے
تھے۔ مجبوراً ۴ ۱۸ صفحات کی کتابت کرا کے انھیں چھاپا گیا۔ آخری چار صفحے اتنی تعداد میں شائع کیے
گئے کہ وہ پوری کتاب کے لیے کافی ہوں!"

یہ بیان مبنی بر حقیقت ہے۔ آخری چار صفحے پہلے چھاپ کر چھپے ہوئے فرموں کی جز بندی پہلے ہوئی یہی وجہ ہے کہ پہلے سرورق والی کتاب کی شکل الگ ہے۔ اگر جز بندی دونوں طباعتوں کی ایک ساتھ ہوتی تو فرموں کے گڈ مڈ ہو جانے کا امکان تھا۔ اور کتاب میں یکسانیت نہ رہتی۔ جب تک پہلے فرموں کی جز بندی ہو کر کتاب قابل اشاعت ہوئی اس وقت تک دوسری طباعت کا عمل جاری رہا۔ ممتاز علی خود کتب فروش تھے انھیں کھپت اور طلب کا اندازہ بعد میں ہوا۔

یہ پہلی طباعت کی ایک بہت بڑی خصوصیت ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ بتائی ہے:

"مخطوطات میں اور انیسویں صدی کی مطبوعات میں عام قاعدہ تھا کہ جس لفظ پر جفت صفحہ ختم ہوتا تھا اسے دوسرے طاق صفحے کے شروع میں پھر لکھتے تھے۔ ایسا غالباً اس لیے کیا جاتا تھا کہ اگر صفحات آپس میں مل جائیں تو انھیں ترتیب دیا جا سکے۔ "عود ہندی" کے ایک ایڈیشن میں اس قاعدے کی پابندی کی گئی ہے جب کہ دوسرے میں بالکل نہیں کی گئی۔"

یہ بیان درست ہے لیکن یہ قاعدہ عام نہیں تھا۔ میری نظر سے بہت سے مخطوطات گزرے ہیں ان میں عام قاعدہ یہ پایا گیا کہ جفت صفحہ کی رکاب میں طاق صفحہ کا ابتدائی لفظ بطور ترک لکھا ہوا ملا ہے۔ یہ طریقہ جب مطبوعات میں اختیار کیا گیا تو اس طریقے کے علاوہ جفت صفحہ کی آخری سطر سے ملحق بائیں حاشیہ میں طاق صفحہ کا ابتدائی لفظ لکھا گیا ایسی بہت سی کتابیں نظر سے گزری ہیں جو بمبئی، لکھنؤ، کان پور اور دوسرے مقامات کی مطبوعہ ہیں مثلاً "تاریخ افغانی" مطبوعہ بمبئی میں مخطوطات کی روشنی کے مطابق ترک رکاب میں ہے۔ "کیمیائے سعادت"، "جواہر العجائب"، "ممتاز عہد تقدیر و تدبیر"، "بہار دانش"، "میزان الطب"، "ابواب الجنان"، "حیات القلوب جلد دوم و سوم" میں جفت صفحہ کی آخری سطر سے ملحق بائیں حاشیے پر طاق صفحہ کا ابتدائی لفظ بطور ترک لکھا گیا ہے۔ "غیاث اللغات" مطبوعہ لکھنؤ میں کسی ایک روش کی پابندی نہیں کی گئی اس میں ترک بائیں حاشیے پر بھی ملتا ہے اور جفت صفحہ کا حرف آخر طاق صفحہ کے آغاز میں بھی، اور بیشتر ایسے ہیں جن پر یہ روش اختیار نہیں کی گئی اور آخری فرمہ کے طاق صفحات ۱۸۵ - ۱۸۷ کے آغاز میں صفحات ۱۸۴ - ۱۸۶ کا آخری لفظ نہیں لکھا گیا۔ بہر حال ڈاکٹر خلیق انجم کی اس نشان دہی کی بدولت کتب میں ترک نویسی کے مختلف طریقے سامنے آ گئے۔ ہمارے پاس وہی ایڈیشن ہے جس میں ترک نویسی کا مذکورہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

مصنفین کاتبوں کی ستم ظریفی کا کس کس طرح شکار ہوتے ہیں، ہمیں اس کے بڑے تلخ تجربے ہوتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم بھی اس کا شکار ہوئے ہیں۔ "عود ہندی" ہی کے سلسلے میں یہ عبارت ملاحظہ فرمائیے:

"انوار الدولہ سعد الدین خان بہادر شفق کے نام غالب کے ایک خط کے اختلافات نسخ ملاحظہ ہوں اس سے اندازہ ہوگا کہ میرا پریشان ہونا کہاں تک جائز ہے۔

میرا تیار کیا ہوا متن قصیدہ (میں نے اس لفظ کے بارے میں حاشیے میں لکھا تھا کہ "صیدہ" سہو کاتب ہے۔ یہ لفظ "قصیدہ" ہے۔	عود ہندی پہلا ایڈیشن (انجمن)
قصیدہ
ہرزہ	ہرذرہ
آوارہ (میں نے لکھا تھا کہ طباعت کی غلطی ہے اصل لفظ "اوردہ" ہے)	اوردہ
ہمشیر	باہمشیر
سفر	اس نسخے میں یہ لفظ ندارد
حضور والا	حضور والد

ایک ہی خط میں اتنے اختلافاتِ نسخ دیکھ کر میں نے سوچا کہ میرا سب کام بیکار ہوگیا۔"

ڈاکٹر خلیق انجم کا پریشان ہونا بالکل بجا تھا کہ ان کی کی کرائی محنت پر پانی پھر رہا تھا لیکن محترم کاتب نے اس عبارت میں آخری سطر کے الفاظ "حضور والا" "حضور والد" کو بالکل الٹ پلٹ کر دیا ہے۔ پہلے "حضور والد" ہونا چاہیے یہ قراءت عود ہندی کے پہلے نسخے کی ہے اور انجمن کے نسخے کی قراءت "حضور والا" ہے۔ اس کے بعد کی عبارت ملاحظہ فرمایئے جس میں محترم کاتب کی غفلت سے دو جملے نہیں لکھے گئے اور عبارت بالکل مبہم ہوگئی ہے۔

اس کا متن تقریباً وہی ہے جو انجمن کے پہلے ایڈیشن کا ہے اور اس سے مختلف ہے جو میں نے تیار کیا تھا ... کہ اختلافاتِ نسخ میں انجمن کے جس ایڈیشن کے اختلافات دیے گئے ہیں وہ مجلس ادب کے مطبوعہ نسخے میں ... لکھنوی نے درج کیے ہیں: "قصیدہ" اور "حضور والا" ہی چھپا ہے" باہمشیر" کا اختلاف ظاہر کیا ہے اور ... "سفر" نہ ہونے کی نشان دہی کی ہے۔ ہمارے پاس جو نسخہ وہ وہی ہے جس سے ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنا متن تیار ... تھا۔ یہ نسخہ انھیں بعد میں انجمن میں دستیاب ہوگیا۔ ایک کتاب کے دو بیک وقت چھپنے والے نسخے سامنے ... ئے تو یہ فیصلہ کرنا واقعی دشوار ہے کہ متن کی بنیاد کس کو بنایا جائے۔ جب کہ دونوں میں کافی اختلافاتِ نسخ پایا ... تا ہو۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

"اس لیے متنی نقاد کے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ دونوں ایڈیشنوں کو بنیادی نسخوں کی حیثیت سے استعمال کرے۔ میں نے "غالب کے خطوط" کے تنقیدی ایڈیشن کی تیاری میں ایسا ہی کیا ہے۔"

ہم بھی ڈاکٹر خلیق انجم کے اس بیان سے متفق ہیں کہ دونوں نسخوں کے اختلافات ظاہر کرنے انتہائی ضروری ... ہیں۔ ہم نے "عود ہندی" سے متعلق ڈاکٹر خلیق انجم کے بیانات کی تائید، توثیق اور تصدیق کی ہے اور کچھ امور بطور وضاحت ... بیان کر دیے ہیں۔ مقصد ان کی محنت و جاں فشانی کی پذیرائی کرنا ہے۔ ہم نے نگار کراچی میں مطبوعہ خطوطِ غالب کے ... ایڈیشن اور ری پرنٹ کو سامنے رکھا ہے جسے ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب "غالب کے خطوط" کی جلداول کے عکس لے کر ... چھاپا گیا ہے۔ انشاء اللہ بھرپور تبصرہ و جائزہ کتاب دستیاب ہونے پر پیش کیا جائے گا۔ ان کے کام کی صحیح طور پر قدر ... و قیمت، مرتبہ اور حیثیت اسی وقت قائم ہو سکے گی۔ اس وقت تک جو کام ہمارے سامنے آیا ہے وہ نہایت وقیع اور فکر انگیز ہے۔ جس کے لیے موصوف مستحقِ داد و تحسین ہیں۔

رفعت سروش

ڈاکٹر خلیق انجم

ملّا کی دوڑ مسجد تک۔ اور شاعر کی دوڑ اردو بازار تک۔ یہ کہاوت کم از کم اس وقت تک سچ تھی جب میں اگست ۵۸ء میں بمبئی سے دلّی آیا اور بلی ماران کی گلی سوداگراں میں مقیم ہوا۔ کوئی ایسی شام نہ ہوتی ہوگی جب میں اردو بازار نہ جاتا ہوں۔ اور میں ہی کیا، اس زمانے میں اکثر شاعر اور ادیب شام کو جامع مسجد کی سیڑھیوں کے آس پاس اور اردو بازار کی دوکانوں کے باہر رکھی بنچوں یا قہوہ خانہ قسم کے چائے خانوں میں نظر آتے تھے۔ البتہ اتوار کی شام کو اردو ہال کے بالاخانے پر چڑھ جاتے اور گلزار دہلوی کی لچھے دار باتیں سنتے اور انجمن تعمیر اردو کی ادبی اور تنقیدی نشست میں شریک ہو کر کچھ اپنی کہتے کچھ دوسروں کی سنتے۔

اردو بازار کا یہ کردار بہت پرانا ہے اور اسے کلاسیکیت کی سند دے دی جائے تو شاید غلط نہ ہو۔ اردو بازار کی ان دوکانوں کی بنچوں اور تپائیوں پر بڑے بڑے اہل کمال بیٹھے اور جب اٹھے تو یہاں سے علم و شعر کی دولت لے کر اور اس دولت کو دنیا تک پہنچایا۔ میں خود دوسری جنگ عظیم کے دوران ۴۳ء سے ۴۵ء تک یہاں رہا، اس بازار کی ایک گلی خان خاناں میں، اور یہاں کس کس کے ساتھ نہ بیٹھا۔ شاہد احمد دہلوی، حسن عسکری، حقی حزیں، تابش دہلوی، ہلال سیوہاروی، عطا محمد شعلہ، آغا سرخوش، نخشب جارچوی، اسرار الحق مجاز، منشی عبدالقدیر، اختر الایمان، خورشید الاسلام، راز مرادآبادی، شکیل بدایونی، محشر بدایونی، جوہر سعیدی، نظر امروہوی، صابر دہلوی، طالب دہلوی، جمیل الدین عالی، شیدا گجراتی، شیدا خورجوی، طور سیوہاروی، گلزار دہلوی۔ کس کس کے نام گناؤں اور اب تیرہ سال بعد بھی اس بازار کی رونق میں کوئی خاص کمی نہیں تھی۔ اگرچہ اس عرصہ میں ملک ایک عظیم انقلاب سے گزر چکا تھا۔ اور ۴۷ء میں دلّی میں خون کی ہولی کھیلی جا چکی تھی۔ شاہد احمد دہلوی کا مکتبہ علم و ادب اور ساقی اور آغا سرخوش قزلباش کا "چمنستان" پاکستان سدھار چکا تھا۔ مگر مرا ہاتھی سوا لاکھ کا۔ اس پٹی گھسی دلّی میں بھی اردو بازار کا وہ حال تھا اور مولانا سمیع اللہ قاسمی کی "خانقاہ عزیزیہ" مولانا کی روایتی وضعداری کی آج بھی گواہی دیتی تھی۔ اور ان کی بنچوں اور تپائیوں پر آج بھی اردو کے ادیب، شاعر، دانشور رات گئے تک نظر آتے تھے۔ ہاں نام اور چہرے بدل گئے تھے۔ سوائے مولانا سمیع اللہ مرحوم، اور گلزار دہلوی کے۔ یہ دونوں پرانی اس حسین روایت کا تسلسل تھے۔ اور ان کے علاوہ اب یہاں اور جو لوگ برابر نظر آتے تھے وہ بھی زمانہ میں انتخاب تھے۔ بسمل سعیدی ٹونکی، انور صابری، میر مشتاق احمد، عبداللہ نقوی، رام کرشن مضطر، عزیز وارثی، بہار برنی، رعنا جگی، محسن زیدی، مخمور سعیدی، پریم شنکر...

ل نظامی، شمیم کرہانی، مشیر جھنجھانوی، فرقت کاکوروی، سلام احمد علمی، اظہار اثر، عشرت کرتپوری، اسلم پرویز، کمال حسین، خلیق انجم
یا احمد فاروقی، اور دوسرے بہت سے نوجوان اور وہ لوگ جو نئی دلی کی کالونیوں میں بستے تھے وہ بھی جب کبھی اس علاقے
سے گزرتے تو خانقاہ عزیزیہ میں ضرور حاضری دیتے۔ جیسے روش صدیقی، ساغر نظامی، سہیل عظیم آبادی، سلام مچھلی شہری،
جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، نریش کمار شاد وغیرہ۔

دلی جانا پہچانا شہر تھا مگر اس منظر نامے میں چند مشاہیر کو چھوڑ کر میری کسی سے شناسائی نہ تھی۔ آہستہ آہستہ
سب سے یارانہ ہوگیا۔ دراصل انجمن تعمیر اردو کے ہفتہ وار جلسے اس نئے اتحاد کے سلسلے میں ایک تاریخی رول ادا کر رہے
تھے اور دلی میں باہر سے آنے والوں کو بھی معلوم تھا کہ جس طرح ۴۷ء سے قبل اتوار کی شام کو خواجہ محمد شفیع کے مٹیا محل والے
بالاخانے پر سب ادیب و شاعر مل جاتے تھے۔ اسی طرح اب اردو ہال میں انجمن تعمیر اردو کی نشست میں سب سے
ملاقات ہوجائے گی۔ غرض کافی گہما گہمی تھی۔" محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے۔"

انجمن تعمیر اردو کے جلسے ہی میں ڈاکٹر خلیق انجم سے تعارف ہوا اور یہ نوجوان صاحبزادے مجھے خاصے تیز طرار نظر آئے۔
درمیانہ قدوقامت سوچتی ہوئی آنکھیں، فراخ دل چہرہ کے کشادہ خدوخال سے نمایاں، آواز میں دل گداز کھوج، تیکھا
لب و لہجہ مگر اس تیکھے پن پر ہلکی سی ظرافت کی آمیزش کہ سننے والے کو ناگواری نہ ہو اور کہنے والا اپنی بات مزے سے
کہہ جائے۔ اس وقت میری عمر ۳۶، ۳۷ سال تھی اور ریڈیو میں ملازمت کرتے ہوئے تیرہ چودہ سال بیت چکے تھے مگر
شاید میں اپنی عمر سے کم لگتا تھا۔ ایک قہوہ خانے میں چائے کی میز پر خلیق انجم نے اچانک مجھ سے پوچھا کہ پرانے رسالوں میں
جن رفعت سروش کی نظمیں ملتی ہیں وہ کون صاحب تھے۔ میں نے انکساری سے کہا کہ میں ہی ہوں۔ ان کے چہرے
سے کچھ ندامت کا اظہار ہوا مگر بولے کچھ نہیں۔ لیکن میں نے اس دن خلیق انجم کو ایک عام کھلنڈرے نوجوان سے کچھ مختلف
محسوس کیا کیوں کہ ان کا سوال اس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ یہ جناب صرف دلچسپ گفتگو ہی نہیں کرتے، پڑھتے
بھی ہیں میری نظمیں ۴۳ء سے "ہمایوں" "ادبی دنیا" "شاہکار" اور دوسرے معیاری رسالوں میں چھپنے لگی تھیں۔ اور
"نیا ادب" "سویرا" "ساقی" "شاعر" "شاہراہ" کوئی معیاری ادبی جریدہ ایسا نہ تھا جہاں میں نہ چھپا ہوں۔ وہ رسائل خلیق انجم
کے مطالعے میں رہتے تھے اور ان کی نظر سے میرا نام اور میری نظمیں اس طرح گزری تھیں کہ کلام اور نام ان کے ذہن میں
محفوظ تھا۔ غالباً خلیق انجم کا خیال تھا کہ میں اختر انصاری کی طرح اپنا نقلی نام رفعت سروش رکھ لیا ہے۔ شاید بعض لوگوں
کو معلوم ہو کہ ۴۵ء میں مشہور و معروف شاعر اور نقاد اختر انصاری کا کلام ایک صاحب نے چرا لیا اور راتوں رات مشہور ہوگئے
جب بات زیادہ بڑھی تو شاہد احمد دہلوی نے اس دلچسپ واقعے پر "ساقی" میں ایک مضمون لکھا اور نقلی اختر انصاری
کو متنبہ کیا کہ وہ اپنا نام بدل لیں یا اپنے نام کے پیچھے کچھ اور اضافہ کریں۔ تب ان ذاتِ شریف نے اپنے آپ کو اختر انصاری
اکبر آبادی لکھنا شروع کیا۔ تقسیم وطن کے بعد وہ صاحب پاکستان چلے گئے تھے۔ کسی ظریف الطبع نے ایک شعر بھی
کہا تھا جو خوب مشہور ہوا ؂

ملک جب تقسیم ہوا اپنے ہاتھ کیا آیا
ایک اختر انصاری وہ بھی اکبر آبادی

بہرحال کچھ رسائل کے بارے میں گفتگو کے بعد خلیق انجم کو یقین ہوگیا کہ میں نقلی رفعت سروش نہیں ہوں۔ اور
مجھے انہوں نے بھی انہیں پڑھا لکھا تصور کیا اور اب تو یہ عالم ہے کہ وہ بہت ہی زیادہ پڑھنے لگے ہیں۔ دو درجن سے زیادہ
کتابوں کے مصنف اور نہ جانے کتنی کتابوں کے مرتب اور مترجم اور ایسے ہونہار کہ ۲۵ء کے بالکل آخری مہینے دسمبر

میں پیدا ہوئے اور بیس اکیس سال کی عمر میں ایم اے کرتے ہی کروڑی مل کالج میں لیکچرر مقرر ہو گئے۔ بعد میں پی ایچ ڈی، ڈپلوما ان لائبریری سائنس اور ڈپلوما ان لنگوسٹک دلی یونیورسٹی سے کیا۔ جب ابتدا ہی شاندار اور تیز رفتار ہو تو ترقی کی منازل تیزی سے کیوں نہ طے ہوں۔ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے وہ صرف ۴۷، ۴۸ سال کی بھری جوانی میں اس کرسی پر متمکن ہو گئے جس سے ابھی ابھی بزرگ ادیب پروفیسر آل احمد سرور اترے تھے۔ اور جسے ان سے قبل قاضی عبدالغفار اور مولوی عبدالحق نے وقار بخشا تھا۔ وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے اور اس روایت کو بڑی شان سے آگے بڑھایا جو اس عہدۂ جلیلہ سے وابستہ تھی۔

میں نے ڈاکٹر خلیق انجم کو ایک شاداب پودے کی طرح بڑھتے اور پھولتے پھلتے دیکھا ہے۔ اور ان کی گزشتہ تیس سالہ زندگی میری نظر میں ہے۔ یتیمی اور گھر کے نامساعد حالات اکثر اوقات "مس خام کو کندن" بنا دیتے ہیں مگر اس اذیت ناک لطافت کا اندازہ کچھ وہی کر سکتے ہیں جو اس منزل سے گزرے ہوں۔ اس کی تفسیر نہ فلسفوں کی کتابوں میں مل سکتی ہے نہ نصیحتوں کے بے معنی دفتروں میں سمجھا جا سکتا ہے۔ جن بچوں کو ایام طفلی سے ہی اس سفاک معاشرے اور حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے ان کی ہمتیں بہت جلد جوان ہو جاتی ہیں۔ اور عزائم میں فولاد کی سی صلابت آ جاتی ہے۔ اور پھر عملی زندگی کی دشواریاں اور صعوبتیں انھیں طفلانہ کھیل معلوم ہوتی ہیں۔ بچپن سے ہی خود اعتمادی اور ذاتی جدوجہد ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ اور وہ کمزور بیساکھیوں کے سہارے کی بجائے اپنے قوت بازو اور اپنے فکر و عمل پر بھروسہ کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ خلیق انجم کو بھی آٹھ سال کی عمر سے ہی ان اذیت ناک "لطافتوں" کا ذائقہ چکھنے کا موقع میسر آیا۔ اور انھوں نے دنیا سے وہ سب کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی جو اس معاشرے میں انھیں اپنا حصہ محسوس ہوا۔ یقینی علم، باعزت زندگی، پروقار ملازمت، ہم چشموں میں احترام اور اعلیٰ رہن سہن، خوب صورت اور پرسکون گھر جہاں محبت کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔ اور یہ سب کچھ جادو کی چھڑی سے حاصل نہیں ہوتا۔ انسان کو قدم قدم پر جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ اور خلیق انجم کی زندگی اس کی ایک درخشاں اور قابل تقلید مثال ہے۔

خلیق انجم سے جب میری ملاقات ہوئی تو وہ خلیق احمد خاں سے خلیق انجم بن چکے تھے۔ ظاہر ہے یہ خوب صورت قلمی نام شاعری جیسی سادہ فن کو زیر کرنے کے لیے رکھا ہوگا۔ شاید شاعری ان کے زیر دام نہ آ سکی اور یونیورسٹی میں تحقیقی مقالہ لکھنے کے دوران ہی انھوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ "کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے"

انھوں نے صرف بائیس سال کی عمر میں ۱۹۵۷ء میں "معراج العاشقین" مرتب کر کے یہ ثابت کر دیا کہ صاحبو! مجھے لڑکا نہ سمجھنا۔ میں نے تخلص ضرور رکھ لیا تھا مگر میں وہ نہیں جو دس بیس روپے کے لیے مشاعرہ پڑھتے پھروں اور اپنی ہوٹنگ کرا کر باپ دادا کی عزت بھی گنوا دوں۔ میری منزل کہیں اور ہے۔ کہاں؟ شاید ابھی مجھے بھی نہیں معلوم بس! ؎

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

جب خلیق انجم سے میری ملاقات ہوئی اس وقت وہ "معراج العاشقین" مرتب کر چکے تھے۔ اور کروڑی مل کالج میں لیکچرر ہو چکے تھے اور پھر انھوں نے اپنے کالج کے پرنسپل اور دوسرے ارباب حل و عقد پر کچھ ایسا رعب جما یا کہ دیکھتے ہی دیکھتے چند سال میں سینئر لیکچرر ہو گئے۔ اور ان کے درخشاں مستقبل کے بارے میں قیاس آرائیاں کی جانے لگیں۔ کوئی اور ہوتا تو یونیورسٹی کے ماحول میں اپنے آپ کو گم کر کے گوشہ نشین ہو چکا ہوتا۔ مگر خلیق انجم تیز رو آدمی ہیں تیز سوچتے ہیں اور انھیں شاید اس معاشرے سے حساب کتاب چکانے کی جلدی تھی۔ بچپن سے ہی

بن نے ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا تھا۔ وہ چونکہ لڑائی لڑنے کے موڈ میں تھے۔ سیاست بامِ عروج پر پہونچنے کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ بشرطیکہ مضبوط زینہ ہاتھ آجائے۔ خلیق انجم موقع ملنے پر ایسا اقدام کرنے سے نہیں چوکے اور ایک با اثر ممبر پارلیمنٹ سبھدرا جوشی کے اشاعتی ادارے سے منسلک ہوگئے۔ سیکولر ڈیموکریسی (اردو) کے ایڈیٹر بن گئے۔ اور وہاں رہ کر ملک کی سالمیت، قومی یکجہتی اور کانگریس کی مضبوطی کے لیے دن رات کام کیا۔ اور رسالہ چمک اٹھا اور وہ وقت بھی آیا جب لیڈران کرام عوام سے اپنی خدمات کا صلہ مانگتے ہیں۔ الیکشن کا رن پڑا۔ خلیق انجم کو کانگریس نے ان کے علاقے سے میٹروپالیٹن کونسل کا ٹکٹ دے دیا۔ اور افواہ پھیل گئی کہ اگر خلیق انجم جیت گئے تو ایگزیکٹیو کونسلر تو بن ہی جائیں گے۔ مگر خدا بھلا کرے علاقے کے ووٹروں کا کہ وہ علم و ادب کے اس در بے بہا کو سیاست کی بھٹی میں نہیں جھونکنا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ضمانت ضبط ہوئی اور ان کے لیے ایوانِ علم و ادب کے نئے دروازے کھل گئے۔ اردو کو اس کا حق دلانے کے لیے گجرال کمیٹی کا کام پھیلا تو ۷۲ء میں ڈاکٹر خلیق انجم کی خدمات وزارتِ تعلیم نے بحیثیت ڈائرکٹر کے حاصل کرلیں۔ اب گویا وہ ایک روشن راہ پر گامزن تھے اور انھیں اپنے جوہر دکھانے کے مواقع میسر تھے۔ کیوں کہ گجرال کمیٹی میں اس وقت کے سب مرکزی دانشور تھے اور ملک کے گوشے گوشے میں کمیٹی کو لوگوں سے ملنا تھا۔ اور ہر طرح کے لوگوں سے ملنا تھا۔ خلیق انجم نے گجرال کمیٹی کی رپورٹ تیار کرنے میں دن رات ایک کر دیا اور اس بہانے انھوں نے اردو کے ساتھ اپنی انگریزی کو بھی صیقل کیا گجرال کمیٹی کے سربراہوں میں ملک کے منتخب لوگ تھے اور انھیں کام کی پرکھ تھی۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے نئے جنرل سکریٹری کا انتخاب اردو والوں کے لیے ایک اہم مسئلہ بنا ہوا تھا اس عہدے کے لیے بہت سے مشہور و معروف شاعر اور دانشور اور معلمان اردو امیدوار تھے مگر قرعۂ فال ڈاکٹر خلیق انجم کے نام نکلا جو ان سب میں کم عمر تھے۔ اور جب انھیں انجمن ترقی اردو (ہند) کی کرسی پیش کی گئی تو انھیں اپنے خوابوں کی تعبیر نظر آئی۔ میرے کانوں میں اس جلسے کی گونج ہے جو غالب اکیڈمی میں خلیق انجم کو اس موقع پر مبارکباد دینے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔ پروفیسر آل احمد سرور کی جوتیوں کے طفیل ترقی پانے والے کئی ادیبوں نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے سابق جنرل سکریٹری کی نسبت جن غیر ذمہ دارانہ خیالات کا اظہار کیا اس سے خود خلیق انجم بھی متفق نہیں تھے سرور صاحب سرور صاحب تھے اور ہیں۔ انجمن کی کرسی ان کے اعزاز میں کوئی اضافہ نہ کرسکتی تھی مگر دکھ ہے ان ابن الوقتوں کا جو نئے جنرل سکریٹری کی خوشنودی کے لیے یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی نئی ذمہ داری کو بہت خوش اسلوبی سے سنبھالا۔ ہندوستان گیر دورے کیے اٹے ترچھے لوگوں کو راہ راست پر لائے۔ بڑے بڑے سرپھروں کو رام کیا۔ انجمن کے دفتر کی چولیں بٹھائیں۔ اردو گھر کی تعمیر شروع ہو کر رک گئی تھی مگر خلیق صاحب کے قدموں کی برکت تھی کہ کام پھر شروع ہوگیا۔

آج کچھ، کل کچھ، قصرِ اردو آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ خلیق صاحب کی انتھک محنت، سوجھ بوجھ اور تدبیر نے ان خدشات کو باطل کردیا کہ یہ لڑکا کیا انجمن چلائے گا۔ انجمن میں آکر خلیق صاحب کے بالوں پر تو خضاب لگ گیا مگر انجمن پر جوانی آگئی۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ اب انجمن کا اشاعتی ادارہ خود کفیل ہے۔ ہفت روزہ "ہماری زبان" اور ماہی "اردو ادب" خلیق انجم کی ادارت میں پابندی سے نکلتے ہیں اور انجمن کی علاقائی شاخیں پہلے سے کہیں زیادہ فعال ہیں۔ ظاہر ہے اس لیے کہ اب جنرل سکریٹری جز وقتی نہیں، کل وقتی جنرل سکریٹری ہے۔ انجمن کا تنخواہ دار ملازم محنتی اور اکلِ حلال پر یقین رکھنے والا۔

مگر وہ خلیق انجم ہی کیا جو صرف کسی ایک ایوان میں یا ایک ادارہ میں محبوس ہو کر بیٹھ رہے۔ اگرچہ اکثر ملازم پیشہ لوگوں کا یہ مزاج ہوتا ہے۔ مگر خلیق انجم تو سیماب صفت ہیں۔ بے پناہ عملی قوت کے مالک ہیں۔ اور جب تک زندگی میں چوکھی لڑائی نہ لڑیں ان کے دماغ پر غنودگی طاری ہونے لگتی ہے۔

لکچررشپ، سیکولر ڈیموکریسی، الیکشن، نگراں کمیٹی، انجمن ترقی اردو (ہند) یہ سب اپنی جگہ مگر جو نوجوان ۲۱ برس کی عمر میں "معراج العاشقین" کا مرتب تسلیم کر لیا گیا تو تصنیف و تالیف کی ئے دو آتشے سے کیسے دور رہ سکتا ہے۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

یہ راز تو خلیق انجم نے کروڑی مل کالج کی سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے جان لیا تھا کہ ان کی زندگی لفظ سے وابستہ ہے، ادب و شعر کی علامت سے عبارت ہے۔ چناں چہ وہ دنیا کے ہزار جھمیلوں میں پھنسے رہے لیکن ان کے علمی کردار پر نظر ڈال کر دیکھیے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ شخص اپنی تصانیف اور تالیفات کے سلسلے میں بھی ان لوگوں سے بہت آگے ہے۔ جنھوں نے اپنے ذوق مطالعہ کا ڈھنڈورا پیٹ کر زندگیاں اپنے گھروں کے محبسوں میں گزار دیں جن کا بقول ان کے لوگوں سے زیادہ ملنے سے علمی کام میں خلل پڑتا ہے۔ کلاسیکی ادب سے محبت خلیق انجم کی رگ رگ میں بسی ہوئی ہے۔ اور قدما کی تفہیم ان کے ذوقِ جستجو کو سکون پہونچاتی ہے۔ انھوں نے مرزا مظہر جانِ جاناں کے فارسی خطوط کو اردو کے قالب میں ڈھالا۔ غالب کی نادر تحریروں کو جمع کیا۔ مرزا محمد رفیع سودا کا مطالعہ اپنی ایک ضخیم تصنیف کی شکل میں پیش کیا۔ کربل کتھا کا لسانی مطالعہ کیا۔ "افادات سلیم" مرتب کی اور "متنی تنقید" جیسی کتاب لکھی جو اردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ یہ سب اہم کام وہ اس دور میں کر چکے تھے جب وہ انجمن ترقی اردو ہند کی کرسی تک نہیں پہنچے تھے۔ اور بعض اوقات بے حد غیر شاعرانہ اور غیر ادبی فرائض کی ادائگی میں منہمک نظر آتے تھے۔ اور انجمن میں آجانے کے بعد انھیں کب سکون کا سانس لینا نصیب ہوا ہوگا۔ انجمن کی اکھاڑ پچھاڑ پہاڑ سی بلڈنگ کی تعمیر پھر ہندوستان کے کونے کونے میں علاقائی انجمنوں کے مسائل سے جوجھنا، دانشورانِ اردو سے معاملہ کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ اور پھر حکومتِ وقت اور عوام کے تقاضوں میں ایک توازن برقرار رکھنا بھی ایک دردِ سر ہے۔ یہ سب اپنی جگہ مگر کتابوں کی ایک کہکشاں ہے جو خلیق انجم کی ذہانت کا ثبوت ہیں۔ اس دور میں ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ چار ضخیم جلدوں میں مرزا غالب کے خطوط کی ترتیب ہے۔ غالب پر ان کی اور بھی کئی کتابیں ہیں۔ مگر خطوط غالب کی ترتیب اور طویل مقدمے نے انھیں ماہرینِ غالب کی صف میں امتیازی مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔ اگر خلیق انجم صرف یہی کام کرتے تب بھی اردو دنیا ان کو فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اس کے علاوہ بھی ان کے کام کی بہت سی جہتیں ہیں اور ان کی مرتبہ کتابوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ "آثار الصنادید" پر ان کا کام سامنے آگیا ہے۔ سرسید کی اس نادر روزگار تصنیف کو خلیق صاحب نے تین جلدوں میں ایڈٹ کر کے اپنے علمی تبحر کا ثبوت دیا ہے۔ اپنی نوعیت کا یہ اردو میں پہلا کام ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں ابھی ان کی زنبیل میں بہت کچھ باقی ہے۔

پچیس تیس سال سے ہی تقریباً ایسی ہی علمی کتابوں پر اردو کے ادبی سرمایے میں وقیع اضافہ کرنے والا ڈاکٹر خلیق انجم گوشہ تنہائی میں نہیں، بلبل ہزار داستان کی طرح ہر جگہ چہکتا نظر آتا ہے۔ چاہے اردو بازار ہو یا یونیورسٹیوں کے کیمپس، ہند اور بیرونِ ہند کے مختلف شہروں اور ملکوں میں سمینار ہوں یا اردو اور فروغ علم و فن کے لیے کانفرنس اور جلسے یا آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے اسٹوڈیو ــــــ خلیق انجم اعلیٰ پائے کے براڈ کاسٹر ہیں اور یہ

اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر عرض کر رہا ہوں۔ میں اکتوبر ۴۷ء میں دودھ بھارتی سے اردو مجلس دہلی آیا تو اردو ادیبوں اور شاعروں سے دفتری سطح پر بھی ملاقاتوں کی نوبت آئی۔ میں بخاری صاحب کے زمانے کا پرانا آدمی ہمیں سکھایا گیا تھا کہ نشر ہونے سے قبل ایک ایک لفظ کو تولو۔ بری عادت پڑی ہوئی تھی۔ اور اردو مجلس میں یہ عالم تھا کہ جو جب لکھ لایا ریکارڈ کر گیا۔ کسی موضوع پر خلیق انجم کو تقریر کے لیے بک کیا گیا۔ تشریف لائے۔ میں نے اسکرپٹ دیکھا تو محسوس ہوا کہ روا روی میں لکھا ہے۔ میں نے کہا خلیق صاحب آپ بائیں ہاتھ سے لکھ لائے ہیں۔ یہ محاورہ ہمارے ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر گوپال داس صاحب استعمال کیا کرتے تھے۔ خلیق صاحب بولے۔

"کیوں آپ کو پڑھنے میں کچھ دقت ہو رہی ہے؟"

"نہیں میرا مطلب ہے آپ نے روا روی میں اسکرپٹ لکھا ہے۔"

چپ ہو رہے، ریکارڈنگ ہو گئی۔ مگر وہ میرا مفہوم سمجھ گئے۔ اور اس کے بعد میں نے ان کے رویے میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ پھر تو وہ اردو مجلس کے ایسے براڈکاسٹر بنے کہ جس موضوع پر بلایئے۔ آئیں گے اور پوری تیاری کے ساتھ۔ خلیق انجم ان لوگوں میں سے تھے جن کی میرے کسی پروگرام میں شمولیت پروگرام کی کامیابی کی ضمانت تھی۔ اور وہ بھرپور تعاون کرتے تھے۔ تقریر تو لوگ لکھ کر لے ہی آتے ہیں۔ مگر مذاکروں اور مباحثوں میں حصہ لیتے وقت جوہر کھلتے ہیں کہ آدمی برجستہ کس طرح بول سکتا ہے اور اس کو اپنی زبان اور بیان پر کتنا عبور حاصل ہے کچھ مباحثوں میں انھوں نے میری توقع سے کہیں بہتر performance کی۔ میں نے داد دی تو بولے نہیں رفعت صاحب! میں تیار کر کے آتا ہوں اس کے علاوہ جس دن پروگرام ہوتا ہے اس دن ناشتہ کی میز پر میں اپنی بیوی کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرتا ہوں، جس سے بہت سے گوشے سامنے آجاتے ہیں۔ خلیق انجم کی بیگم ہوبی انجم سماجیات کی پروفیسر ہیں اور وہ بھی اردو کی بہت اچھی براڈکاسٹر ہیں۔ خلیق صاحب کے مزاج میں ایک کھلنڈرا پن ہے۔ مگر وہ عام طور پر جب قلم اٹھاتے ہیں تو سنجیدہ ادبی موضوعات پر ہی لکھتے ہیں۔ لیکن براڈکاسٹنگ کے تجربات کی بنا پر میرا اندازہ تھا کہ وہ ہلکی پھلکی تقریر بھی لکھ سکتے ہیں۔ جن میں مقصدیت کے ساتھ طنز کی چاشنی بھی ہو۔ اپنے اس خیال کی تصدیق مجھے ان کا لکھا ہوا "استاد رسا" کا خاکہ پڑھ کر ہو گئی۔ میں نے کوئی دلچسپ ہلکا پھلکا موضوع دیا۔ انھیں پہلے تو وہ سٹپٹائے۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنے بے تکلف دوستوں کے ساتھ جس شگفتہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں بس اس طرح کی بات چیت کی زبان لکھیے۔ اور مقالہ بازی کو چھوڑیے۔ راضی ہو گئے۔ اور ایسی تقریر لکھ کر لائے جو اوروں کو پسند آئی سو آئی۔ خود انھیں بھی پسند آئی اور ایک عرصہ تک اس کا مزا لیتے رہے۔ اس کے بعد میں نے ان سے کئی مزاحیہ تقریریں لکھوائیں۔

عام طور پر محقق اور دانشور تنظیمی معاملات میں کچے ہوتے ہیں۔ وہ تو اپنے ہی خیالوں میں غرق رہتے ہیں مگر خلیق انجم میں بلا کی تنظیمی صلاحیت ہے۔ اور اس بے پناہ صلاحیت کا اظہار وہ اپنے فرائض منصبی ادا کرتے ہوئے تو کرتے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر ثقافتی اداروں کی کمیٹیوں میں ان کی کارکردگی بے مثل ہوتی ہے اس کا تجربہ مجھے اس وقت ہوا جب اردو اکیڈمی دلی کی تشکیل ہوئی۔ مجھے بھی اس کا رکن بننے کی سعادت حاصل ہوئی اور خلیق صاحب بھی ایک اہم رکن بنے۔ انھوں نے تعلیمی کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے اس قدر تیز کام کیا کہ دلی ایڈمنسٹریشن شعبۂ تعلیم کو ناک چنے چبوا دیئے۔ اور اردو اسکولوں کی حالت زار کو ٹھیک کرنے کے لیے انتھک کام کیا۔ اور جب اشاعتی کمیٹی کے چیئرمین ہوئے تو کتابوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اسی طرح غالب انسٹی

ٹیوٹ کی سیمینار کمیٹی میں ان کے طریقے کار کو میں نے قریب سے دیکھا۔ ان دنوں میں وہاں ڈائرکٹر تھا۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ
میٹنگ میں اپنے ذہن کو تیار کر کے آتے ہیں اور اپنی بات بغیر کسی لاگ لپیٹ کے دو ٹوک کہنے پر قادر ہیں۔ ایسی
میٹنگوں میں بعض دفعہ یہ صورت حال ہوتی ہے کہ نسبتاً بزرگ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ کہہ دیا۔ کہہ دیا۔ لیکن اگر ان کی
بات حرف آخر کا درجہ رکھتی تو کمیٹی بنانا اور دوسرے لوگوں کو تبادلۂ خیال کے لیے بلانا کیا معنی! کیا صرف دکھانے
کے لیے میٹنگ ہوتی ہے۔ سب کو اپنی بات کہنے کا حق ہوتا ہے اور اختلاف رائے کا بھی۔ خلیق انجم اپنے خیالات
استدلال کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اصولی بحث میں وہ مصلحت اندیشی کے قائل نہیں۔ اپنی بات پر اصرار کرنے
کا فن جانتے ہیں کبھی سنجیدہ لب ولہجہ اختیار کیا تو کبھی ہلکے پھلکے فقرے سے کام چلا لیا اور بوجھل ماحول کو سبک
بنا دیا۔ اکثر ان کی بات کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

اور یہ تو خیر ادبی انجمنوں کی باتیں ہیں جہاں ادب بہر حال قدر مشترک ہوتا ہے۔ خلیق انجم کی تنظیمی صلاحیت
کے انداز دیکھنے ہوں تو ان گروپ ہاؤسنگ سوسائیٹیوں کی کارروائی دیکھیے جہاں کبھی کبھی شیر مارکیٹ کی
کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ان سوسائیٹیوں میں سے کسی کے صدر ہیں، کسی کے سکریٹری، کسی کے محض ممبر۔ مجلس
بھانت بھانت کے لوگ سوسائیٹیوں کے ممبر ہوتے ہیں اور چوں کہ پیسے کا لین دین بھی ہوتا ہے اس لیے
ہر آدمی پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ اور کسی کو کسی پر سو فیصدی اعتبار نہیں ہوتا۔ ان سوسائیٹیوں کو چلانا، سب
کی سننا، سب کا اعتماد حاصل کرنا، اور سب سے کم از کم ایسا معاملہ رکھنا کہ وہ ممبر شپ چھوڑ کر نہ بھاگ جائیں،
مشکل کام ہے۔ شاید انجمن ترقی اردو کے سالانہ اجلاس کی کارروائی چلانے سے بھی زیادہ مشکل۔ مگر ؎

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

دراصل خلیق انجم ہشت پہلو شخصیت کے مالک ہیں۔ اور ان کی ابتدائی زندگی کی جدوجہد نے ان میں ایک
کی خود اعتمادی اور شانِ استغنا پیدا کر دی ہے۔ اور اس معاملے میں وہ خوش قسمت شخص ہیں کہ مختلف سطح
پر ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا گیا ہے۔ وہ ملک کے بہت سے اہم اداروں کے رکن ہیں۔ اس لیے ہندوستان
میں اردو کے فروغ کے لیے جو کام کیے جاتے ہیں ان میں بالواسطہ یا براہ راست وہ شامل ہوتے ہیں۔ ان
علمی کارناموں کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ اور بہت سے اداروں اور اکیڈمیوں سے انھیں انعامات و اعزازات
نوازا گیا ہے۔ مگر خوشی کی بات یہ ہے کہ اس نے ان کے مزاج میں غرور نہیں پیدا کیا۔ وہ اپنا جائزہ لیتے رہتے
اور ان کا ذہن علم و ادب کے نئے نئے افق تلاش کرتا رہتا ہے۔ دراصل یہی ان کی کامیابی کی ضمانت ہے۔
یہی وہ رویہ ہے جو ان کے مزاج میں تلخی، بغض، حسد اور دوستوں سے بے اعتنائی نہیں آنے دیتا۔ ان کے ہشاش
بشاش اور ہر دم فعال رہنے کا یہی اسمِ اعظم ہے۔

کمال احمد صدیقی

غالب کی تحریر کے بارے میں ایک نیا گوشہ

(خطوطِ غالب، مرتبہ خلیق انجم کی روشنی میں)

غالب، بلاشبہ، اپنے عہد ہی کے نہیں، اب تک کے سب سے زیادہ اہم شاعر ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی شاعرانہ شخصیت کا محل متداول اور غیر متداول کلام غالب ہے یا ان کے خطوط۔ حالی کی یادگارِ غالب اور خطوطِ غالب مہیا نہ ہوتے تو غالب پر اتنی کتابیں بھی نہ ہوتیں۔

غالب شروع میں اس بات پر راضی نہیں تھے کہ ان کے خطوں کو جمع کر کے چھاپا جائے۔ اور یہ بات بھی ان کے خطوں ہی سے ثابت ہے۔ انھی خطوں میں انھوں نے اپنے کچھ شعروں کی تشریح بھی کی ہے۔ بعض موضوعات پر مختلف خطوں میں ان کے متضاد بیانات بھی ہیں۔ صرف عبدالصمد ہی کے بارے میں نہیں بلکہ آگرہ میں قیام کی مدت، اور شعرگوئی کے ابتدا کے بارے میں بھی۔ غالب کی سوانح اور ان کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے کے لیے ان کے خطوط بہت اہم ماخذ ہے، لیکن اس ماخذ سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا گیا ہے۔

غالب کے خطوط مختلف مجموعوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے جعلی کلام کی طرح، ان کے جعلی خطوط بھی تصنیف فرمائے گئے، اور ایک یونیورسٹی کے نصاب میں ایک جعلی خط بھی شامل کیا گیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم "سودا" اور مرزا مظہر جانِ جاناں "جانِ جاناں" اور "متنی تنقید" جیسے وقیع کام کے لیے جانے جاتے ہیں۔ لیکن اب جو "خطوطِ غالب" انھوں نے مرتب کیے ہیں، انھیں پڑھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ متن کی تدوین جیسی انھوں نے کی ہے، پہلے خطوطِ غالب کے سلسلے میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اردو میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا کام ہے۔ انھوں نے قینچی سے نہیں ذہن سے کام لیا ہے۔ پہلی جلد کا مقدمہ ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس سے زیادہ نہیں تو اتنا ہی اہم کام حواشی کا ہے۔ ایک ایک لفظ مختلف نسخوں کے تقابلی مطالعے میں چیک کیا گیا ہے۔ جو واقعی بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے دوسروں کی طرح اوروں کے کام پر ڈاکہ نہیں ڈالا ہے، بلکہ فراخدلی سے حوالہ بھی دیا ہے اس سے ان کے قد میں کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ سے وہ ایک جگہ بہت بڑی غلطی سے بچ گئے، اور اسی کی طرف میں اشارہ اس لیے بھی کر رہا ہوں کہ غالب کے سلسلے میں ہماری "تحقیق" ایک ہی طرح کے نکات اپنی زبان اور اپنے اسلوب میں بیان کرنے کے دائرے میں محصور ہو گئی ہے۔ جلد سوم میں ص ۱۳۰۵ پر نواب کلب علی خاں کے نام "بخطِ غیر" لکھوایا ہوا یہ خط ہے۔

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت

بعد تسلیم معروض ہے آج جو نہار دن ہے کہ توقیع وقیع عز ورود لایا ہے ہندوی
نمود کی روسے تنخواہ ششماہہ ۶۹ کا سو روپیہ معرض وصول میں آیا ہے جواب کے
جلد نہ لکھنے کی وجہ یہہ ہے کہ زمین گرمی کی شدت کی سبب سے اور احتباس ہوا سے
کہ جو لازمہ موسم برسات ہے بیکار محض ہو گیا ہوں مطلق کچھ لکھ نہیں سکتا
اور کوئی ایسا شخص کہ جس سے کچھ لکھواؤں اس چار روز میں میرے پاس نہیں آیا
آج اسوقت ایک صاحب آ گئے اونسے میں نے یہہ عریضہ لکھوا لیا —— بہر دوشنبہ
سابق کی عریضے کے ساتھ میں نے اپنی تصویر حضور میں بھیجی ہے اوسکی رسید از نوازشنامہ
میں مرقوم نہ تھی مجھکو اندیشہ ہے کہیں وہ لفافہ رستہ میں تلف نہ ہو گیا ہو اگر اوسکی رسید سے مشرف اطلاع پاؤں
تو دلجمعی ہو جائے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار ۱۵ جون ۱۸۶۹ء

۱۳۰۵

کتاب میں ص ۱۲۵۶ پر یہ خط نمبر ۶۸ کے تحت درج ہے۔ حواشی کے تحت ص ۱۴۰۳ پر اظہار ہے۔
"عرشی صاحب نے اس خط کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ غالب نے خود یہ خط نہیں لکھا، کسی اور سے لکھوایا ہے
لکھنے والے نے دل جمعی کو دل جمی لکھا ہے۔"
کمال عرض کرتا ہے کہ یہ خط نستعلیق میں خود غالب نے اپنے قلم سے لکھا ہے، "اور دل جمی" کا املا جان بوجھ کر غلط لکھا ہے۔

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام

اس خط کا عکس کوئی بیس برس پہلے پرتھوی چندر کے "مرقعِ غالب" میں دیکھ چکا تھا۔ اگرچہ وہ کتاب بھی آفسیٹ سے چھپی تھی، لیکن حروف اتنے شارپ نہیں تھے۔ شاید نگیٹو شیشے پر بنایا گیا ہوگا۔ مکاتیبِ غالب (مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی) میں بھی متن اور ان کا اظہار کہ یہ خط کسی اور سے لکھوایا گیا ہے، دیکھ چکا تھا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب میں اس خط کا عکس دیکھا تو یہ غالب کی تحریر لگا۔ حروف، دائروں، جوڑوں اور اسلوبِ نگارش کا تجزیہ کیا تو یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ واقعی غالب کی تحریر ہے، اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کا نستعلیق خط کتنا اچھا تھا۔ اے کاش غالب نے اپنا کلام خود اس خط میں لکھا ہوتا۔
پاکستان میں مشفق خواجہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور جمیل جالبی اور ہندوستان میں حیرت ہے کہ خلیق انجم نے متنی تنقید پر اہم کام کیا ہے لیکن اس نکتے پر اُن کی نظر بھی نہیں گئی۔

مخطوطہ شناسی کا دعوا میں بھی نہیں کرتا۔ ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور ماشاء اللہ نظر اس فن پر عبور رکھتے ہیں۔ تفصیل سے تو میں الگ اس کے بارے میں لکھوں گا۔ یہاں چند اشارے کروں گا۔

۱۔ القاب کے ساتھ سلامت بنا کر لکھا گیا ہے، لیکن آخری سطر میں یہ لفظ انھوں نے اپنے مانوس اسلوب میں لکھا ہے۔ (حالاں کہ ۸ جنوری کے خط میں (ع۳۹) سطر ۱۱ میں بھی سلامت ایسا ہی ہے)

۲۔ شروع کے دائرے بنا کر لکھے ہیں، لیکن آخر میں پھر اپنے اسلوب پر آ گئے ہیں۔

۳۔ کے میں کاف کا مرکز، اور ے کا زاویہ وہی ہے جو ان کے مانوس اور مخصوص طرزِ نگارش میں ہے۔

۴۔ نون کے نقطوں کا مقام وہی ہے، جو ان کا مخصوص اسٹائل ہے۔
۵۔ کہہ اور لکہہ جیسے الفاظ بالکل ویسے ہی ہیں، جو ان کی اور تحریروں میں ہیں۔
۶۔ یا، معروف بھی اسی طرح کئی جگہ ہے، جیسے وہ عام طور سے لکھتے تھے۔
۷۔ کیا جیسے وہ لکھتے تھے، اس پر سے کاف کا مرکز ہٹادیں، تو اس خط کا لیا ہو بہو ہو جاتا ہے۔
یہ چند اشارے ہیں۔ تفصیل سے اس کے بارے میں پھر عرض کیا جائے گا۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کیے ہوئے "خطوط غالب" کے حوالے سے جہاں درست متن سامنے آیا ہے۔ وہاں ایک یہ نہایت اہم بات بھی سامنے آئی ہے، اور یہ ایک خوشگوار اتفاق ہے کہ اس کی دریافت کی سعادت میرے حصے میں آئی۔

آثار الصنادید، مرتبہ خلیق انجم

پروفیسر نثار احمد فاروقی

[۲ دسمبر ۱۹۹۰ء کو آل انڈیا ریڈیو سے خلیق انجم صاحب کی مرتبہ آثار الصنادید پر ایک مذاکرہ منعقد ہوا تھا جس میں پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر اسلم پرویز، سید شریف الحسن نقوی صاحب اور ڈاکٹر خلیق انجم نے حصہ لیا۔ اس مذاکرے میں پروفیسر نثار احمد فاروقی نے "آثار الصنادید" کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ یہاں نقل کیے جارہے ہیں۔] (م۔ ح۔ غ)

دہلی کے آثار قدیمہ کے بارے میں جتنی کتابیں ہیں ان میں سب سے اہم کتاب "آثار الصنادید" ہے۔ اس کتاب کی تالیف و تصنیف میں سرسید نے جو محنت کی تھی اور جو کھکھیڑ اٹھائی تھی اس کا اندازہ ہمیں مولانا حالی کی "حیات جاوید" پڑھ کر ہوتا ہے۔ خلیق انجم صاحب کو دہلی کی عمارتوں اور مزارات سے ہمیشہ ہی سے دلچسپی تھی۔ ہم لوگ اکثر یہ عمارتیں دیکھنے کے لیے ساتھ جایا کرتے تھے۔ خلیق صاحب نے "آثار الصنادید" کی ترتیب میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ یہ کام انتہائی قابلِ تعریف اور لائق داد ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا مرتبہ اڈیشن تمام اڈیشنوں سے بہتر ہے۔ خلیق صاحب نے میرے مشورے سے اس میں عمارتوں کی تصویریں شامل کی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تصویریں لینے میں انھوں نے بہت روپیہ خرچ کیا ہے اور بہت محنت کی ہے۔ اب یہ اڈیشن ایسا ہوگیا ہے کہ اگلے سو سال یا دو سو سال بعد ماہر آثار قدیمہ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ۱۹۸۹ء یا ۱۹۹۰ء میں دہلی کی ان عمارتوں کا کیا حال تھا۔ طباعت کے اعتبار سے بھی اس کتاب کا شمار اردو کی بہترین کتابوں میں ہوگا۔ میں ڈاکٹر خلیق انجم اور دہلی اردو اکیڈمی کو ایسے شاندار کام پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ایم۔ حبیب خاں

انجمن صاحب

خلیق انجم صاحب پر جب میں نے مضمون لکھنا شروع کیا تو ڈاکٹر اسلم پرویز سے جو اُن کے بچپن کے دوست اور ساتھی ہیں ان کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم کیں۔ اسلم پرویز صاحب نے بتایا کہ وہ اور خلیق انجم صاحب علی گڑھ کے ممتاز ہوسٹل میں رہتے تھے تو ان کے کمروں کا بیرا انھیں ہمیشہ انجمن صاحب کہتا تھا بار ہا ٹوکنے کے باوجود انجمن صاحب کہنا نہیں چھوڑا ممکن ہے یہ کوئی قدرت کی طرف سے اشارہ تھا۔ انجمن کے سکریٹری ہونے کے بعد خلیق صاحب نے انجمن کو اپنی شخصیت اور زندگی کا حصہ بنا لیا۔ نقوش کے اڈیٹر محمد طفیل مرحوم اور ڈاکٹر ظ۔ انصاری دونوں خلیق صاحب کو "خلیق انجمن" کہتے تھے بلکہ لفافے کے پتے پر بھی ان کا نام "خلیق انجمن" لکھتے تھے۔ اسی لیے میں نے اس مضمون کا عنوان انجمن صاحب ہی رکھا ہے۔

آج میں ایک ایسے ادیب، ناقد اور محقق کے بارے میں لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں جو میرے مہربان بھی ہیں افسر بھی اور دوست بھی اور جنھیں اردو دنیا خلیق انجم کے نام سے جانتی ہے اور جن کو میں نے سب سے پہلے ۱۹۵۲ء میں دیکھا ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک قربت رہی پھر دلّی میں گاہے گاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد یکم اپریل ۱۹۷۴ء سے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

خلیق انجم صاحب کا پورا نام خلیق احمد خاں ہے لیکن اردو دنیا میں خلیق انجم کے نام سے مشہور ہیں۔ دلّی کے رہنے والے ہیں۔ بچپن میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا یہ ایسا المیہ تھا جس نے ان کے خاندان کی بنیادیں ہلا دیں۔ چار بہنوں کے ایک بھائی سب کے لاڈلے تھے لیکن سب اتنے کم سن تھے کہ ان سب کو کھانے پینے کے علاوہ تعلیم و تربیت کی ضرورت تھی۔ یہ کمی ان کی والدہ نے پوری کی۔ انھوں نے جس ثابت قدمی اور تحمل سے اولاد کی پرورش اور نگہداشت کی اور مشکلات کا مقابلہ کیا اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ والد کے انتقال کے وقت خلیق صاحب کی والدہ کی تعلیم مڈل تک تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں میں عورتوں کی تعلیم کا رواج بہت کم تھا۔ اور وہ گھر کی چہار دیواری تک محدود رہتی تھیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے خلیق صاحب کی والدہ کے حوصلے میں خدا نے ایسی استقامت پیدا کی کہ انھوں نے اپنی تعلیم کو دوبارہ جاری کیا، بی۔اے کیا، استادوں کی تربیت حاصل کی اور ملازم ہو گئیں۔ ملازمت ملنے تک والدہ اور خود خلیق انجم صاحب نے روپیہ کمانے کے لیے بہت پاپڑ بیلے۔ خلیق صاحب سات آٹھ سال کی عمر میں خاندان کی کفالت کے لیے روپیہ کمانے کے لیے مجبور ہوئے اور طرح طرح کے پیشے اختیار کیے۔ ان کی والدہ نے اسی محدود آمدنی میں اپنے بچوں کو اعلا تعلیم دلائی۔

خلیق صاحب کی والدہ نہایت نیک، صالح اور دین دار خاتون تھیں۔ پنج وقتہ نمازی اور تہجد گزار ہونے کے

علاوہ ان میں غریبوں سے ہمدردی کا بہت جذبہ تھا۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ ہر ماہ غریب اور بیوہ عورتوں کی مدد کیا کرتی تھیں۔ ان میں بے سہارا اور یتیم بچے خود غریب ہونے کے باوجود بھی شامل تھے۔ میں نے ان کو کئی بار دیکھا اور ان سے ملاقات کی۔ نورانی چہرہ، گندمی رنگ اور بے انتہا خوبصورت خدوخال، اور ہر وقت اپنے پرانے مکان واقع کلاں محل میں ایک تخت پر بیٹھی یادِ الٰہی میں مصروف رہتیں۔ انھوں نے اپنی اولاد کی تعلیم کے لیے بہت جدوجہد کی اور انھیں یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ والد کا مہربان سایہ سر سے اٹھ گیا ہے۔ والدہ ہی ان کا سب کچھ تھیں۔ انسان کو انسان بنانے میں تعلیم ہی سب کچھ نہیں ہوتی تربیت کا بھی بہت بڑا حصہ ہوتا ہے۔ خلیق انجم صاحب کی تعلیم سے زیادہ ان کی والدہ کی تربیت کا اثر ہے جو ان کے دل و دماغ پر آج تک قائم ہے۔ خلیق صاحب اکثر اپنی والدہ کے قول بیان کرتے رہتے ہیں اور اکثر کہتے ہیں کہ میں اپنی والدہ کی دعاؤں کے طفیل دشمنوں اور مخالفوں سے محفوظ ہوں اور میں نے ان ہی کی دعاؤں سے ترقی کی ہے۔ والدہ سے عقیدت اور محبت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ آج بھی دفتر میں ان کی میز پر شیشے کے نیچے والدہ کی تصویر لگی رہتی ہے اور گھر کے ڈرائنگ روم میں والدہ کی بہت بڑی تصویر آویزاں ہے۔ اسی طرح انجم صاحب کو اپنی چاروں بہنوں سے غیر معمولی محبت ہے۔ بڑی بہن کو تو وہ ماں کی طرح سمجھتے ہیں اور ان کا احترام اسی طرح کرتے ہیں۔ ان کی دو بہنیں کناڈا میں ہیں اور وہاں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کر لی ہیں اگر کبھی ان دونوں کا ذکر آجاتا ہے تو خلیق صاحب آب دیدہ ہو جاتے ہیں۔

انجم صاحب نے ابتدائی تعلیم دتی میں حاصل کی۔ مقابلے کیے، محنت کی، جامع مسجد کے ڈاک خانے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر لوگوں کے خطوط لکھے۔ حالات نے انھیں سخت کوش بنا دیا تھا لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور اسی طرح اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول اجمیری گیٹ دتی سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۰ء میں اپنے دوست اسلم پرویز صاحب کے ساتھ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس علی گڑھ میں چلے گئے جو سرسید کی درس گاہ ہونے کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ اس وقت ہندوستان کی تقسیم ہو چکی تھی۔ یہ زمانہ بڑا افراتفری کا تھا۔ چاروں طرف بڑے پیمانے پر فسادات شروع ہو چکے تھے۔ ایسے موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد نے محسوس کیا کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی حالت بہت نازک ہے اور اس کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو کے مشورے سے ڈاکٹر ذاکر حسین جو اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ۱۹۴۸ء میں وائس چانسلر مقرر کرایا۔ اور یونیورسٹی کو برباد ہونے سے بچایا۔ خلیق انجم صاحب نے ۱۹۵۰ء میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا تو اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین ہی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ علی گڑھ یونی ورسٹی سے ان کو بے حد محبت اور لگاؤ ہے۔ ان کے طالب علمی کے زمانے کا ایک ایسا واقعہ دیکھا جس میں خود اعتمادی اور جدید ذہن کی کوششوں کا دخل تھا یعنی خلیق انجم صاحب اور اسلم پرویز صاحب نے مل کر دہلی کیفے کے نام سے ایک ہوٹل علی گڑھ میں شمشاد بلڈنگ پر کھولا۔ یہ ہوٹل لالہ کی دوکان کے برابر تھا۔ اس وقت انھوں نے یہ جگہ نور محمد ٹھیکیدار سے کرائے پر لی تھی۔ ان کے ہوٹل کے عقب میں بہادر کا ہوٹل تھا۔ اس کیفے کی فضا میں بڑی کشش تھی۔ طلبہ کے علاوہ گاہے گاہے نادر روزگار ہستیاں بھی کیفے کی رونق کا باعث بنتی تھیں۔ اس کیفے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں پرانی روش کی تمام فرسودہ چیزوں کو ترک کر کے جدید طرز پر یہ کیفے علی گڑھ میں پہلی مثال تھا۔ اس زمانے میں میز پر میز پوش نہیں ڈالے جاتے تھے، طلبہ میزوں پر میز پوش دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ اسی طرح سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کی ایش ٹرے میز پر رکھنے کا رواج بھی اسی کیفے نے قائم کیا۔ ریڈیو کیفے میں بجانے کی روایت بھی اسی کیفے نے ڈالی تھی۔ اس سے کیفے میں جمگھٹ لگنے لگا۔ بل کاٹنے کا

سسٹم بھی پہلی بار یہیں دیکھا گیا۔ اپنی ان تمام خوبیوں کی وجہ سے یہ کیفے رات گئے تک کھلا رہتا اور طلبہ اس کی نفاست اور جدت طرازیوں کو دیکھ کر خوش ہوتے غرض یہ کیفے دو سال تک خوب چلا لیکن دوستوں نے اتنا قرض لیا کہ بالآخر کیفے کو بند کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

خلیق انجم صاحب علی گڑھ میں جب زیرِ تعلیم تھے تو نہایت دبلے پتلے تھے۔ رنگ گیہواں اور طبیعت میں چلبلا پن، ادب و شعر کا ذوق، حاضر جوابی اور فقرہ طرازی بہت تھی، خوش خلقی اور لطیفہ گوئی ان کی خاص خصوصیات ہیں۔

خلیق انجم صاحب کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز علی گڑھ میں ہوا، پاکستان کے ایک رسالے "اخبارِ جہاں" میں شائع ہونے والے ایک انٹرویو میں خلیق صاحب نے ادبی زندگی کے آغاز کے بارے میں بتایا کہ جب وہ اینگلو عربک اسکول میں پڑھتے تھے وہاں ایک استاد رہبر پرتاب گڈھی تھے، ان کی رہنمائی میں خلیق صاحب نے ادب کا مطالعہ شروع کیا اور نویں کلاس میں انھوں نے شرحوں کی مدد سے دیوانِ غالب کا بہت بڑا حصہ پڑھ لیا تھا۔ علی گڑھ سے ایک "جھلک" نام کا رسالہ شایع ہوتا تھا۔ اس کے مالک اور اڈیٹر طاہر قریشی تھے، یہ ضمیر الدین قریشی مرحوم مالک مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ کے چھوٹے بھائی تھے، خلیق صاحب نے اس رسالے کو ایک کہانی لکھ کر بھیجی۔ اڈیٹر کو کہانی پسند آئی اور خلیق صاحب اس وقت ممتاز ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ایک دن طاہر قریشی صاحب خلیق انجم صاحب سے ملنے ہوسٹل آئے اور باتوں باتوں میں طاہر صاحب نے پیش کش کی کہ اگر خلیق صاحب پسند کریں تو "جھلک" کے نائب مدیر ہو سکتے ہیں۔ تنخواہ ساٹھ روپے ملے گی۔ خلیق صاحب نے یہ پیش کش فوراً قبول کر لی۔ اصل میں تو انجم صاحب نائب مدیر ہوئے تھے لیکن بقول ان کے میں اور ڈاکٹر اسلم پرویز دونوں مل کر یہ کام کرتے تھے۔ ان ہی دنوں میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس کی وجہ سے خلیق صاحب کو ادیب بننے کے لیے بڑا حوصلہ ملا۔ واقعہ یہ ہے کہ خلیق صاحب اور اسلم پرویز صاحب دلّی کے تھے۔ اس لیے اردو کی کلاس میں دونوں بہت نمایاں رہتے تھے۔ کبھی کبھی لیکچرر کسی لفظ یا محاورے کے بارے میں بھی ان سے مشورہ کرتے تھے۔ معین احسن جذبی صاحب ٹیوٹوریل لیا کرتے تھے ایک دن انھوں نے کہا کہ جس طالب علم کو جو موضوع پسند ہو اس پر مضمون لکھ لائے۔ خلیق صاحب کا کہنا ہے کہ ان دنوں خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب ہمارے سینئر پارٹنر تھے اور ادبی مطالعے میں خلیق صاحب کی بہت رہنمائی کرتے تھے اس لیے ان دنوں میں خلیق صاحب اور اسلم پرویز صاحب ایسی کلاسیکی کتابیں پڑھتے تھے جو ان کی عمر سے کہیں زیادہ تھیں۔ اتفاق سے ان ہی دنوں خلیق صاحب نے سراج اورنگ آبادی کی مثنوی "خواب و خیال" پڑھی تھی اور خورشید الاسلام صاحب کا ایک مضمون "امراؤ جان ادا" پر پڑھا تھا۔ اس مضمون کا اسلوب خلیق صاحب پر چھایا ہوا تھا۔ انھوں نے خورشید الاسلام کے اسلوب میں "مثنوی خواب و خیال" پر مقالہ لکھا اور اگلے ہفتے جذبی صاحب کو وہ مقالہ دکھایا۔ مقالے کے دو تین صفحے پڑھ کر غصے ہو گئے۔ کہنے لگے "میں نے آپ سے کہا تھا کہ خود مقالہ لکھ کر لائیے۔ آپ کسی ادیب کا مقالہ نقل کر کے لے آئے۔" کلاس میں خاصی دیر بحث رہی۔ خلیق صاحب کہتے تھے کہ یہ میں نے خود لکھا ہے اور جذبی صاحب کہتے تھے کہ ایک تو نقل کی اور پھر غلط بیانی سے کام لیتے ہو۔ خلیق صاحب کہتے ہیں کہ میں اپنی اس بے عزتی پر رو پڑا۔ ہوسٹل کر اپنے کمرے میں خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ ہوسٹل کے ایک سینئر پارٹنر ابو سعید زیدی صاحب ان سے ملنے آئے تو دیکھا خلافِ معمول خلیق صاحب منھ لٹکائے بیٹھے ہیں۔ سعید صاحب نے وجہ معلوم کرنا چاہی تو انھوں نے تو کچھ نہیں بتایا، اسلم پرویز صاحب نے پوری داستان بیان کی۔ زیدی صاحب نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ رونے کا نہیں خوش ہونے کا مقام ہے۔ اگر تمہاری کسی تحریر پر یہ شبہ ہوا ہے کہ وہ کسی بڑے نقاد کی تحریر ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ تم تو باقاعدہ

نقاد ہو گئے۔ آؤ تمہارے نقاد ہونے کی خوشی میں چائے پی جائے۔ سعید زیدی صاحب ہوسٹل کے کئی لڑکوں کو اپنے ساتھ کیفے ڈی پھوس لے کر پہنچے، نمک پارے برفی اور چائے منگا کر سب نے پی اور پہلے زیدی صاحب نے اور پھر ان کی تقلید میں تمام طالب علموں نے خلیق صاحب کو مبارک باد دی۔ خلیق صاحب کا کہنا ہے کہ جذبی صاحب کے رویے اور زیدی صاحب کی خوشی کے اظہار نے مجھ میں بڑا حوصلہ پیدا کیا۔ بقول خلیق صاحب وہ ایم۔اے کر چکے تھے اور ان کی کتاب معراج العاشقین شایع ہو چکی تھی۔ ایک دن کوئی کاغذ تلاش کر رہے تھے کہ وہ مقالہ ان کے ہاتھ آ گیا۔ انھوں نے یہ مقالہ کراچی سے شایع ہونے والے رسالۂ "زندگی" کو بھیج دیا جہاں وہ فوراً شایع ہو گیا۔ تو یہ ہے داستان خلیق صاحب کی ادبی زندگی کے آغاز کی۔ خلیق صاحب اس علمی اور تہذیبی شہر میں ۱۹۵۵ء تک رہے اور اسی سال بی۔اے کر کے دلّی واپس چلے گئے۔ ۱۹۵۷ء میں دلّی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ اور اسی یونیورسٹی سے ۱۹۶۰ء میں "مرزا مظہر جان جاناں" پر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

اس وقت کروڑی مل کالج کے پرنسپل ڈاکٹر سروپ سنگھ (موجودہ گورنر گجرات) تھے۔ بڑے باغ و بہار اور زندہ دل انسان ہیں۔ ان کے کالج میں اردو کے استاد کی جگہ خالی ہوئی تو خلیق انجم صاحب کا تقرر بحیثیت استاد شعبۂ اردو میں انھوں نے ہی کیا۔ خلیق صاحب کے قول کے مطابق ان کے کریئر کو بنانے میں پرنسپل مرزا محمود بیگ اور ڈاکٹر سروپ سنگھ کو بڑا دخل ہے۔ انھوں نے ہر قدم پر ان کا خیال رکھا ہے۔ اکثر ان کی زبان سے یہ کہتے ہوئے بھی سنا ہے کہ ان کی شخصیت کے نکھار میں ان کے دوستوں کے علاوہ ان کے اساتذہ کا بھی دخل رہا ہے۔ یونیورسٹی میں تقرر کے سلسلے میں خلیق صاحب کو پروفیسر خواجہ احمد فاروقی سے بہت شکایتیں رہیں لیکن خلیق صاحب خواجہ صاحب کی غیر معمولی صلاحیتوں کے مداح بھی ہیں۔ اس کا اعتراف خلیق انجم صاحب مرزا محمد رفیع سودا کے دیباچے میں اس طرح کرتے ہیں:

> "جب میں ایم۔اے کا طالب علم تھا تو میرے محسن اور مشفق استاد ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے سب سے پہلی بار مجھے تحقیقی کام کی طرف متوجہ کیا۔ اس زمانے سے لے کر آج تک جب کبھی میں ان کے پاس سے آیا ایک نئی امنگ اور ایک نیا حوصلہ لے کر۔ اگر خواجہ صاحب مجھ میں ذاتی دلچسپی نہ لیتے، کبھی پیار، کبھی غصے سے مجھے نہ سمجھاتے رہتے تو میرے لیے اس کتاب کا مؤلف ہونا ممکن ہی نہ تھا۔" [1]

خلیق انجم صاحب نے "ادبی تبصرے" کے عنوان سے ایک رسالہ بھی دلّی سے نکالا تھا جس میں کتابوں پر تبصرے اور ان پر کڑی تنقید ہوتی تھی۔ یہ نئی فکر اور تخلیقی اظہار کا بہترین آرگن تھا۔ افسوس کہ یہ مجلس ادارت کے آپسی اختلافات کی نذر ہو گیا۔

۱۹۶۲ء میں سودا پر تحقیقی کام کے لیے خلیق انجم صاحب دوبارہ علی گڑھ پہنچے جہاں انھوں نے انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔ اس وقت انجمن کے اعزازی جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنا پی۔ ایچ ڈی کا وہ مقالہ جو مرزا مظہر جان جاناں پر تھا اس پر بھی کام کیا۔ اس زمانے میں تحقیقی کام کرنے کی قدر آج کل کے مقابلے میں زیادہ تھی اور اسکالر کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ میں نے ان کو کئی دن تک دیوانوں کی طرح انجمن کے قلمی ذخیرے سے استفادہ کرتے ہوئے دیکھا۔ سودا کے کلیات کے قلمی نسخے جو انجمن میں محفوظ ہیں

---

[1] مرزا محمد رفیع سودا۔ ص ۱۱

ان سب کو انھوں نے دیکھا۔ ان میں تحقیقی کام کرنے کی وہ تمام صلاحتیں موجود ہیں جو ایک اچھے تخلیق کار میں ہوتی ہیں۔
پی۔ ایچ ڈی کیا مگر مقالہ ہنوز شائع نہیں ہوا! البتہ مرزا محمد رفیع سودا پر جب کام مکمل ہوگیا تو اس کی اشاعت کا مسئلہ
ان کے سامنے تھا۔ اس عرصے میں ان کے مضامین اردو کے معیاری رسالوں میں شایع ہو چکے تھے۔ "تاراس بلبا"
کا اردو ترجمہ "معراج العاشقین" اور "مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط" جیسی اہم کتابیں شایع ہو چکی تھیں اور خلیق انجم صاحب
کی تحریریں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ چناں چہ خلیق انجم صاحب کی فرمائش پر سودا پر مسودہ ادبی کمیٹی میں پیش کرنے
کے لیے سرور صاحب کے پاس بھجوایا۔ قاضی صاحب کے زمانے سے آج تک انجمن میں یہ قاعدہ رہا ہے کہ مسودہ چھپنے
سے پہلے ادبی کمیٹی میں پیش کیا جاتا ہے۔ کمیٹی منظور کرنے سے پہلے اس کو مبصر کے پاس رائے کے لیے بھیجنے کے
لیے نام تجویز کرتی ہے اور جب رائے آجاتی ہے تو آیندہ ادبی کمیٹی کے جلسے میں مبصر کی رائے کو پیش کیا جاتا ہے
اگر مسودے کے حق میں مبصر کی رائے ہوتی ہے تو اس کی اشاعت عمل میں لائی جاتی ہے۔ خلیق انجم صاحب کا مسودہ سرور
صاحب کی سفارش پر مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کے پاس رائے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس زمانے میں عرشی صاحب
انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عام کے فعال ممبروں میں سے تھے۔ اسی زمانے میں سرور صاحب کی بہت سی تحریریں پڑھنے
سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ خلیق انجم صاحب کو بہت عزیز رکھتے ہیں اس لیے انھوں نے "مرزا محمد رفیع سودا" پر ان کا تحقیقی
مقالہ ۱۹۶۶ء میں انجمن سے شایع کیا۔ انجمن نے اس وقت تک جن ادیبوں کی کتابیں چھاپی تھیں ان میں انجم صاحب
سب سے کم عمر تھے۔ اس زمانے میں سے کتب خانے کی ذمے داری کے ساتھ ساتھ شعبۂ نشر و اشاعت کا تعلق مجھ ہی سے
تھا۔ اس وقت انجمن کے نائب معتمد مولانا حفیظ الدین مرحوم تھے۔ مولانا عرشی نے سودا کے مسودے پر یہ رائے دی تھی
کہ شیخ چاند مرحوم کا مقالہ "سودا" کے بعد خلیق انجم صاحب کا مقالہ بڑا اہم ہے اور اس میں وہ بہت سے مقامات پر
شیخ چاند مرحوم سے آگے نکل گئے ہیں اور اس میں اضافے کیے ہیں۔ سودا جب شایع ہوئی تو سرور صاحب نے
دو صفحے کا پیش لفظ لکھا۔ وہ خلیق انجم صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

> "جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو میں تحقیق و تنقید کا معیار گر رہا ہے انھیں خلیق انجم کی اس تصنیف
> کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ سودا کی عظمت تو شروع سے مسلم رہی ہے لیکن سودا کی یہ بدقسمتی اور
> اردو کے محققوں اور نقادوں کی یہ بدتوفیقی ہے کہ نہ تو ان کے کلیات کا کوئی صحیح ایڈیشن اب تک
> شایع ہوا ہے اور نہ شیخ چاند اور حال میں محمد حسن کے علاوہ کسی نے سودا کی حیات شخصیت
> اور کلام کے سیر حاصل جائزے کی ضرورت سمجھی۔ شیخ چاند کی کتاب قابل قدر ہے مگر اب خاصی
> پرانی ہوگئی ہے۔ اس لیے جدید تحقیق کے معیار سے سودا پر ایک نئی اور سیر حاصل کتاب کی اشد
> ضرورت تھی۔ خلیق انجم صاحب نے اس ضرورت کو بڑی خوبی سے پورا کیا ہے"۔[۱]

سرور صاحب کے اس تجزیے کے بعد کہا جاسکتا ہے کہ خلیق صاحب کے بعد جدید تحقیق کی روشنی میں سودا پر کوئی اضافہ نہیں ہے
جس طرح قاضی عبد الغفار نے پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی کتاب "میر تقی میر حیات اور شاعری" پہلی مستند اور اہم کتاب
چھاپی تھی اسی طرح سرور صاحب کے عہد میں سودا پر خلیق انجم صاحب کا کام نہ صرف قابل قدر ہے بلکہ سودا کی
حیات اور ان کے کلام پر سیر حاصل تجزیہ پیش کرتی ہے۔ خلیق انجم صاحب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی وقت

---

[۱] مرزا محمد رفیع سودا ص ۹

یں بہت سے ادبی اور غیر ادبی کام اپنے ذمے لے لیتے ہیں اور سب کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں کہ
دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔ کروڑی مل کالج کی زندگی میں "مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط" غالب کی نادر تحریریں"
مزاج العاشقین"، "کربل کتھا کا لسانی مطالعہ" اور "متنی تنقید" جیسی اہم کتابیں لکھیں۔

نومبر ۱۹۶۵ء میں انجمن کے مرکزی دفتر کے لیے دلّی میں راؤز ایونیو روڈ پر ایک قطعہ زمین خریدا گیا۔ اس کی
تعمیر کا کام سرور صاحب کے زمانے میں شروع ہو گیا تھا اور کرنل بشیر حسین زیدی کی نگرانی میں اس کا کام چلتا رہا۔ اس
عمارت کا نام "اردو گھر" رکھا گیا اور اس کا سنگِ بنیاد آنجہانی اندرا گاندھی سابق وزیر اعظم ہند نے ۲۳ مارچ ۱۹۶۸ء کو رکھا تھا
اردو گھر کا نام بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اس وقت تجویز کیا تھا جب انجمن کا دفتر اورنگ آباد دکن میں رابعہ منزل
میں تھا اور مولوی صاحب نے عمارت کی تعمیر کے لیے چندے کی اپیل کی تھی اور اس کے لیے ساٹھ ستر ہزار روپے کی
رقم جمع ہو گئی تھی۔

۱۹۷۴ء میں پروفیسر آل احمد سرور انجمن ترقی اردو ہند کے اعزازی جنرل سکریٹری اور پنڈت آنند نرائن ملا
صدر تھے۔ چوں کہ انجمن کے مرکزی دفتر کو دلّی منتقل ہونا تھا جہاں اس کے لیے اردو گھر کی عمارت زیرِ تعمیر تھی اور سرور
صاحب دلّی آنا نہیں چاہتے تھے اس لیے انھوں نے ۳۱ مارچ ۱۹۷۴ء کو انجمن سے استعفا دے دیا۔ اس وقت
سکریٹری کے عہدے کے لیے بہت سے لوگ امیدوار تھے جن میں بعض بہت سینئر ادیب اور شاعر بھی شامل تھے۔
ایک بزرگ افسانہ نگار تو اس امید پر کہ ان کا تو تقرر ہو ہی جائے گا۔ ساز و سامان لے کر دلی آ گئے تھے۔ جب پنڈت
آنند نرائن ملا صاحب کی کوٹھی پر مجلس عاملہ کا جلسہ ہوا تو باہر کھڑے اپنے حق میں فیصلے کا انتظار کرتے رہے۔ خلیق انجم صاحب
اس وقت وزارتِ تعلیم میں ڈائرکٹر تھے اور گجرال کمیٹی کی رپورٹ لکھ رہے تھے۔ کمیٹی میں کئی ممبر ایسے بھی تھے جو انجمن کے
بھی رکن تھے مثلاً سجاد ظہیر صاحب، مالک رام صاحب، ڈاکٹر گیان چند وغیرہ سب حضرات گجرال کمیٹی میں انجم صاحب کی
کارکردگی سے متاثر تھے۔ خاص طور پر مالک رام صاحب ڈاکٹر سروپ سنگھ گجرال کمیٹی کے ممبر تھے اور اس وقت دلّی
یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے ان تمام حضرات نے اپنے طور پر پنڈت آنند نرائن ملا صاحب کو اور مجلس عاملہ کے
بعض حضرات جن میں مالک رام صاحب کا نام خاص طور پر شامل تھا راضی کر لیا کہ اس عہدے پر انجم صاحب کا تقرر کیا
جائے۔ اب تک کے تمام سکریٹریوں میں انجم صاحب سب سے کم عمر تھے۔ انجم صاحب کے لیے کوشش ہو رہی تھی لیکن اس کا علم
مجلس عاملہ کے ممبروں کے سوا کسی کو نہ تھا بلکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے خود انجم صاحب کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ البتہ سرور صاحب جب
۳۰ مارچ ۱۹۷۴ء کی صبح انجمن کے دفتر پہنچے تو انھوں نے خلیق انجم صاحب کا نام بتایا ادھر ملّا صاحب نے دلّی میں خلیق انجم صاحب
کو اس تقرر کی اطلاع فون سے دے دی تھی۔

مجھے انجم صاحب کے قریب آنے کا موقع اس وقت سے ملا جب وہ یکم اپریل ۱۹۷۴ء کو انجمن کا چارج لینے علی گڑھ
پہنچے۔ انھوں نے اس روز لائبریری کے کمرے میں تمام اسٹاف کو جمع کر کے ہمدردانہ باتیں کیں اور یہ یقین دلایا کہ مجھ سے
جہاں تک ممکن ہو سکے گا آپ لوگوں کے مفاد اور سہولتوں کا خیال رکھوں گا۔ اس وقت ڈاکٹر ناصر حسین نقوی نائب معتمد اور
میں لائبریرین تھا "ہماری زبان" کا کام سید تفضل حسین صاحب کے سپرد تھا۔ علی گڑھ کے کارکنوں میں صرف رام اوتار صاحب دلّی
جانے کے لیے تیار نہ ہوئے اس لیے انھوں نے وہیں استعفا دے دیا۔ ڈاکٹر کبیر احمد جائسی نے ایک مہینے کی چھٹی مانگی۔
خلیق صاحب نے اس وقت چھٹی دینے سے انکار کر دیا جس سے انھیں بڑی تکلیف پہنچی۔ غالباً کبیر صاحب کی والدہ بیمار تھیں
خلیق صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ دلی جانے کے بعد آپ چھٹی لے سکتے ہیں مگر کبیر صاحب اس پر آمادہ نہ ہوئے اور انھوں

نے انجمن سے استعفادے دیا۔ "نذر مسعود" میں کبیر صاحب نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ کبیر صاحب انجمن میں میرے ساتھی اور علی گڑھ کے زمانے کی بہترین یادیں ان سے وابستہ ہیں اور میرے تعلقات ان سے دفتر میں ملازم ہونے سے بہت پہلے کے ہیں۔

۱۴ مئی ۴، ۱۹ء کو انجمن کا مرکزی دفتر علی گڑھ سے دلی اس نامکمل عمارت میں منتقل ہوا۔ صرف قلمی کتابوں کی الماریاں اور چند لکڑی کی الماریوں کے علاوہ باقی تمام سامان برآمدے میں کئی سال تک پڑا رہا۔ باہر کئی لکڑی کی الماریاں جو راستے میں ٹرک میں لاد کر لائی گئی تھیں، ٹوٹ گئی تھیں۔ انجم صاحب نے شکر پور میں ایک مکان تین سو روپے ماہوار پر انجمن کی مطبوعات، اردو ادب اور ہماری زبان وغیرہ کے فائلوں کے لیے کرائے پر لے لیا تھا جہاں ہماری زبان اور اردو ادب کے بہت سے فائل چوری ہو گئے بعد میں تحقیق کرنے پر پتا چلا کہ مالک مکان کے لڑکے کا یہ کام تھا۔ اس لیے اسے خالی کرنا پڑا۔ انجم صاحب نے یہ کمی اس طرح پوری کی کہ ہماری زبان اور مطبوعات کی فروخت کا انتظام اپنے مکان واقع کلاں محل کے ایک حصے میں منتقل کرا دیا اور وہاں معظم علی خاں صاحب کے سپرد یہ کام کیا گیا۔ انجمن کی مطبوعات اردو گھر میں پہنچا دی گئیں۔ کئی سال تک انجم صاحب کے مکان کا خاصا بڑا حصہ انجمن کے تصرف میں رہا اور انھوں نے انجمن سے کرایہ نہیں لیا۔ جب کہ پرانی دلّی کے اس علاقے میں مکان کا ملنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

سرور صاحب کے زمانے میں چار منزلوں کا اینٹوں کا ڈھانچہ تعمیر ہو چکا تھا مگر اوپر کا کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ خلیق انجم صاحب نے پانچویں منزل تعمیر کرائی اور تمام عمارت کا باقی کام کرایا۔ خلیق صاحب کے اس کام کی داد صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے "معارف" اکتوبر ۱۹۸۶ء کے اداریے میں ان الفاظ میں دی۔

"ڈاکٹر خلیق انجم صاحب جب سے اس کے جنرل سکریٹری ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے کو اس کا بہت ہی فعّال، متحرک، ہوش مند اور لائق عہدے دار ثابت کر دکھایا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے اس کو پاکستان منتقل کیا تو اس لٹے پٹے ادارے کو پہلے قاضی عبدالغفار اور پھر پروفیسر آل احمد سرور نے سنبھالا۔ اس زمانے میں اس ملک میں اردو کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا تو اس کے لائحہ عمل سے زیادہ توقع وابستہ نہیں کی جا رہی تھی مگر یہ سخت جان بن کر اچھی طرح چلتی رہی، اور جب ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کی باگ اپنے ہاتھوں میں لی تو اس کے بہی خواہوں کا دل دھڑک رہا تھا کہ معلوم نہیں وہ اس کی شاندار روایات کو کس حد تک برقرار رکھ سکیں گے مگر اس عہدے پر فائز ہوتے ہی ان کی ادبی صلاحیتیں اچھی طرح ابھریں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ قلب دہلی میں اردو گھر کی تعمیر ہے۔ جب سے یہ ادارہ قائم ہوا تھا بے گھر تھا جس بے سروسامانی اور ہمت شکن فضا میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کی تعمیر شروع کی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ناممکن کام کو ممکن بنانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر ان کے یقین محکم اور سعی پیہم کی بدولت دہلی کے راؤز ایونیو میں اردو گھر میں کئی منزلوں کی تعمیر کیا ہوئی کہ اس پر شیفتہ، میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، ظفرؔ، داغؔ اور ناصر نذیر فراقؔ کی اردو بلکہ اس ملک کے کروڑوں باشندوں کی مادری زبان کا پرچم لہراتا نظر آیا۔"[1]

انجم صاحب کے سامنے ایک طرف تو اردو گھر کی تعمیر کا مسئلہ تھا تو دوسری طرف انجمن کے تمام ملازمین جو علی گڑھ

---

[1] معارف اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۸۶ء ص ۲۴۳

:دالے تھے ان کی رہائش کا مسئلہ تھا۔ انھوں نے سارے اسٹاف کو تسلی و تشفی دی اور کرایے پر مکان حاصل کرنے کے
لیے میں ان کی مدد کی۔ دو تین ممبر تو ایسے ہیں جنھیں وہ خود لے کر گھومتے پھرے اور ان کے رہنے کا بندوبست کیا۔ انجمن
دتی آئی تو اس کی مالی حالت بہت خراب تھی۔ آمدنی ویسی تھی جو علی گڑھ جیسے چھوٹے شہر کی تھی اور اخراجات دلّی جیسے بڑے
کے ہوگئے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انجمن میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ ہماری زبان کے فولڈ کرنے اور اس پر چپتے
ان کرنے کا کاغذ خریدا جاسکتا۔ انجم صاحب خود کھڑے ہو کر یہ کام کرتے اور دفتر کے ساتھیوں کو بھی ساتھ لگاتے اور وہ اس
ہنسی خوشی یہ کام کرتے جیسے کوئی بہت بڑا کام ہو۔ ان کا یہ کہنا کہ کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا آدمی چھوٹا بڑا ہوتا ہے۔
ن کی مالی حالت کمزور ہونے کی وجہ سے انھوں نے دو سال تک انجمن سے تنخواہ نہیں لی۔ اگرچہ اب خدا کا شکر ہے کہ
ن کے وسائل قابل اطمینان ہیں لیکن اب بھی انجم صاحب چپراسیوں اور انجمن کے کارکنوں کے ساتھ مل کر چھوٹے سے
ٹا کام کرنے میں بے عزتی محسوس نہیں کرتے۔ عمارت کے تیار ہونے کی دھن اُن پر ایسی سوار تھی کہ ہر وقت اس
شش میں لگے رہتے۔ مالی حالت بہتر بنانے کے لیے انھوں نے نیشنل ہیرلڈ کی بلڈنگ میں ایک چھپائی کی مشین
لے پرے لی۔ جہاں چھپائی کا کام شروع ہونے لگا۔ اس وقت کرنل بشیر حسین زیدی نیشنل ہیرلڈ کے مینیجنگ ڈائرکٹر
تھے۔ اس پریس میں چھپائی کا کام آنے لگا اب انجم صاحب کی معروفیت اور بڑھ گئی۔ کام کو بڑھانے کے لیے انھوں نے
پنا ذاتی روپیہ بھی لگایا جو بعد میں انھوں نے لے لیا۔ لیکن پریس نیشنل ہیرلڈ کے کاریگروں کو آئے دن کے جھگڑوں
رران کی پریشانیوں نے ایسا مبتلا کردیا کہ اس کو آخر کار بند کرنا پڑا۔ اب انجمن کی مالی حالت بہتر ہونے کی بجائے ادر سقیم ہوگئی
کر انجم صاحب نے ہمت نہیں ہاری گو انجمن کے بعض ملازمین کی طرف سے ان کو مشکلات بھی آئیں لیکن ان کے دل میں
سی کی طرف سے میل تک نہیں آیا۔ اور انھوں نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اَن جانے میں انجم صاحب سے بھی کچھ
غلطیاں ہوئیں، کچھ ناتجربے کاری کی وجہ سے کچھ دوسروں کے کہنے میں آکر مگر بہت جلد ان پر قابو پالیا اور کسی کو بد دل نہیں
ہونے دیا۔

انجمن کو خودکفیل بنانے کی دھن ان پر شروع سے ایسی سوار ہوئی کہ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ پہلے گراؤنڈ فلور
جہاں انجمن کا دفتری سامان تھا اس کو تہ خانے میں منتقل کرایا اور گراؤنڈ فلور کرائے پر اٹھا دیا اور اس سے پانچ لاکھ روپے
ایڈوانس لے کر اوپر کی منزل مکمل کرائی۔ اسی طرح پیشگی کرایہ لے کر باقی منزلیں مکمل کرائی گئیں۔

یہ لکھنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ کرنل بشیر حسین زیدی عمارت کمیٹی کے صدر تھے انجم صاحب نے جب انجمن کا چارج لیا
ہے تو اردو گھر پر ٹھیکیدار کے تقریباً ڈھائی لاکھ کے بل واجب تھے اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نظر نہ آتا تھا۔ یہاں ایک دلچسپ
واقعہ اور بیان کردوں کہ سرور صاحب کے زمانے میں بلڈنگ فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے رسیدیں چھپوائی گئی تھیں۔
یہ رسیدیں ایک روپے، دو روپے ۵ روپے اور دس روپے کی تھیں۔ یہ رسیدیں چندے کی فراہمی کے لیے اردو کے
ہمدردوں میں تقسیم کی گئی تھیں۔ شرم آتی ہے کہ ان رسیدوں سے بیس ہزار روپے سے زیادہ وصول نہیں ہوا اور بعد میں
علم ہوا کہ کچھ حضرات نے رقم تو خاصی اکٹھا کرلی تھی لیکن انجمن میں داخل نہیں کی۔

یہ حقیقت ہے کہ اردو گھر کی تعمیر کے سلسلے میں کرنل بشیر حسین زیدی کی سرپرستی حاصل نہ ہوئی تو اردو گھر کی تعمیر
کو مکمل ہونے میں اور زیادہ وقت لگتا۔ ان کی ذات سے بہت سی الجھنوں کو سلجھنے میں مدد ملی۔ ۱۹۷۶ء کی بات ہے کہ
عمارت کے سلسلے میں مالی مشکلات اور بڑھ گئیں تو انجم صاحب نے زیدی صاحب کے مشورے سے چندے کی اسکیم
بنائی اور وہ زیدی صاحب کے ساتھ بمبئی گئے۔ وہاں کوئی دروازہ ایسا نہیں تھا جس پر دستک نہ دی ہو لیکن ہر دروازے

سے خالی لوٹنا پڑا۔ جب سب طرف سے ناامیدی ہوگئی تو زیدی صاحب انجم صاحب کو لے کر رجنی پٹیل صاحب کے گھر گئے رجنی پٹیل صاحب اس وقت پر دیش کانگریس کمیٹی کے صدر تھے اور یہ زیدی صاحب کی بیگم قدسیہ زیدی صاحبہ کو بہن کہا کرتے تھے۔ زیدی صاحب نے اردو گھر کی تعمیر کے لیے چندے کی بات کی تو پٹیل صاحب نے بتایا کہ وہ آج کل ہائی کمانڈ میں معتوب ہیں اس لیے مہاراشٹر کے وزیر اعلا کے عہدے سے ہٹا کر انھیں پردیش کانگریس کا صدر بنادیا گیا ہے۔ پٹیل صاحب نے چندہ اکٹھا کرنے کے لیے معذوری کا اظہار کیا تھوڑی دیر کے بعد وہ اندر گھر میں گئے اور واپس آکر زیدی صاحب کو ایک لفافہ دیتے ہوئے کہا کہ بہنوئی گھر آیا ہے تو خالی ہاتھ کیسے جانے دوں۔ اس میں اردو گھر کی تعمیر کے لیے ایک چھوٹا سا چک ہے۔ یہ چھوٹا سا چک دس ہزار روپے کا تھا اور بمبئی میں کئی دن تک رہنے کے باوجود بس یہی چک نصیب ہوا تھا۔ اس رقم سے انجمن کو کچھ مدد ملی۔ تیسری منزل مکمل ہونے پر اس کو بھی کرائے پر اٹھا دیا۔ پورا دفتر دوسری منزل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح اب تین منزلیں کرائے پر اٹھی ہوئی ہیں اور انجمن کو خلیق انجم صاحب نے خود کفیل بنا دیا۔ جب انجم صاحب نے چارج لیا تھا تو انجمن کو حکومت سے ۸۰ ہزار روپے کی سالانہ گرانٹ ملتی تھی جو بعد میں ۸۰ ہزار ہوگئی مگر انجم صاحب گرانٹ بڑھانے کے خلاف ہے۔ ان کی توجہ زیادہ تر انجمن کی عمارت کی طرف رہی کہ یہ ادارہ اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہو سکے اور خود کفیل بن سکے۔ آج ان کا یہ خواب پورا ہوگیا۔ ابھی گزشتہ مہینے کی بات ہے کہ انھوں نے کنارا بنک کے ایک حصے میں میزنائن بنوا کر کرایے میں اضافہ کرا دیا اس طرح اب انجمن کے کرائے سے کل آمدنی تقریباً ایک لاکھ روپے ماہانہ کے قریب ہے۔

علمی اور ادبی کام

عمارت کے جھمیلوں کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی کاموں کی طرف بھی ان کی توجہ مبذول رہی ہے اور انھوں نے انجمن کی معیاری اور قابل قدر کتابیں شائع کیں۔ اسی طرح کتابوں کی طباعت کے معیار کو بلند کیا کہ دوسرے ادارے انجمن کی تقلید کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس کام کے لیے انھوں نے پبلی کیشنز انچارج شمیم جہاں صاحبہ کی تربیت کی۔

'ہماری زبان' کے ڈاکٹر یوسف حسین نمبر، مرزا محمود بیگ نمبر، خواجہ حسن نظامی نمبر، گجرال کمیٹی نمبر، اردو کانفرنس نمبر، حالی نمبر، ہندوستان میں اردو کے مسائل نمبر، تبصرہ نمبر اور جنوبی ہند کانفرنس نمبر وغیرہ خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ ۸ جولائی ۱۹۹۰ء کا شمارہ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کی روشنی میں 'اعداد و شمار نمبر' کے نام سے شایع کیا۔ یہ نمبر اپنی افادیت کی وجہ سے بہت مقبول ہوا۔ اب اسے کتابی صورت میں شایع کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح 'اردو ادب' کے کئی خاص نمبر شایع کیے۔ ان میں فیض احمد فیض، حسرت موہانی، عبدالغفور شہباز، اشرف صبوحی، اقبال نمبر، غالب پر چند تحریریں، اردو کا اپنا عروض، اختر انصاری نمبر اور کئی خاص نمبر اردو حلقوں میں کافی مقبول ہوئے۔ خلیق صاحب نے نہ صرف اس کا علمی اور تحقیقی فضا کو قائم رکھا بلکہ اس کی پابندی کا بھی خاص خیال رکھا۔ وہ اس کے مدیر اور میں اس کا معاون مدیر ہوں اس کے علاوہ دفتر کے بیشتر ادبی کاموں میں ان کا معاون رہتا ہوں۔

انجمن کے زیر اہتمام سمینار اور استقبالیہ پروگرام منعقد کرنے کی روایت بھی ڈاکٹر خلیق انجم نے قائم کی اس سے انجمن کو بڑا فروغ ہوا۔ اس کا نام اور اس کی شہرت اخباروں ریڈیو اور ٹی. وی کے ذریعہ دور دراز مقامات تک پہنچی۔

خلیق صاحب تیس کے قریب کتابوں کے مصنف اور مولف ہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر پہلے آچکا ہے لیکن ان کی دو اہم تالیفات کا ذکر کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت سے اردو ادب کے سرمایے میں اضافہ

ہے۔ ان میں غالب کے خطوط پہلی بار سائنٹیفک طریقے سے مرتب ہوئے ہیں۔ اس میں خلیق انجم صاحب نے غالب کے اردو خطوط کو چار جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ جس کی اب تک تین جلدیں غالب انسٹی ٹیوٹ دلی سے شایع ہو چکی ہیں تھی جلد زیر طبع ہے۔ دوسرا تحقیقی کارنامہ جو ابھی حال میں دلی اردو اکاڈمی نے سرسید کی معرکتہ الآرا تالیف آثار الصنادید ہے جس کو انھوں نے پہلی بار سائنٹیفک طریقے سے مرتب کیا ہے۔ اس میں ہند و مسلم فن تعمیر کی مفصل تفصیلات اور اس کے ماخذ بیان کیے گئے ہیں۔ نیز تصویریں، نقشے اور کتبے بھی دیے گئے ہیں۔ اس کتاب سے دلی کے آثار قدیمہ کی موجودہ حالت کا بھی علم ہوتا ہے کتاب کے حواشی مرتب کی تحقیقی صلاحیتوں کا مظہر ہیں۔

اردو تحریک

انجمن ترقی اردو ہند ایک ایسا علمی، تہذیبی اور ادبی ادارہ ہے کہ اس کی طرف سے اردو کے سلسلے میں جو آواز اٹھائی جاتی ہے یا اردو کے حق میں بلند ہوتی ہے پوری اردو دنیا اس کی توجہ کا مرکز بنتی ہے۔ قاضی عبدالغفار، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مسعود حسین سے لے کر ڈاکٹر خلیق انجم تک اردو تحریک کے سلسلے میں انجمن نے جو جد و جہد کی ہے۔ وہ قابل تحسین ہے۔

خلیق انجم صاحب کا رول اردو تحریک کے سلسلے میں پچھلے پندرہ برسوں میں بہت اہم رہا ہے اور اس سلسلے میں جو کارنامے انجام دئے ہیں وہ موضوع ایک الگ مقالے کا متقاضی ہے۔ میں صرف اس کمیٹی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے اردو دنیا میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ میری مراد گجرال کمیٹی سے ہے۔ اس کا ذکر کئی بار آچکا ہے کہ خلیق صاحب اس کمیٹی میں ۱۹۷۲ء میں ڈپٹی ڈائرکٹر کی حیثیت سے لیے گئے تھے اور کچھ ہی دن بعد ان کو ڈائرکٹر کے عہدے پر ترقی دے دی گئی تھی۔ اس کمیٹی کی ضخیم رپورٹ خلیق انجم صاحب اور علی جواد زیدی صاحب نے لکھی تھی۔ خلیق صاحب اکثر کہا کرتے ہیں کہ میں نے انگریزی لکھنا علی جواد زیدی صاحب سے سیکھی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل آوری کا جائزہ لینے کے لیے مرکزی حکومت ہند نے ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی جس میں ڈاکٹر خلیق انجم کو بھی شامل کیا گیا اس کمیٹی نے ہندوستان کے مختلف صوبوں کا دورہ کرنے کے لیے چار سب کمیٹیاں تشکیل دیں ان میں سے تین کمیٹیوں کے کنوینر خلیق انجم صاحب ہی تھے۔ گجرال کمیٹی کی رپورٹ لکھنے میں جو تجربہ حاصل کیا تھا اس کا پورا استعمال اس کمیٹی میں ہوا۔ سب کمیٹیوں کی اطلاعات پر مشتمل پوری رپورٹ خلیق انجم صاحب ہی نے لکھی جو تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے اور رپورٹ میں ضمیمے کے طور پر دی گئی ہے۔

انجمن کی شاخوں کی تنظیم کا مسئلہ بھی اردو تحریک کا ایک حصہ ہے۔ کسی انجمن کی تشکیل آسان ہے مگر اس کی تکمیل میں دشواریاں پیش آتی ہیں اس کی فضا ہموار کرنے میں مرکزی انجمن کے سکریٹریوں نے ہمیشہ تعاون دیا خلیق صاحب نے بھی اپنے پیش رو کی اس روایت کو قائم رکھا۔ وہ اس سلسلے میں انجمن کی شاخوں کے عہدے داروں کو لکھتے رہتے ہیں کہ زبان کے مسائل سے شاخیں غفلت نہ برتیں اور اس سلسلے میں مرکز سے جو تعاون ہو سکتا ہے اس کے لیے وہ کوشاں رہتے ہیں۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۸۸ء کو علی گڑھ کی ضلعی شاخ کی طرف سے کل ہند پیمانے پر اردو اور روزی روٹی کا مسئلہ پر جو سمینار منعقد ہوا اس کے کنوینر ایم۔ حبیب خاں اور معاون کنوینر جناب محمد احمد شیون، کمیٹی کے خصوصی ممبر ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری اور علی گڑھ شاخ کے صدر ڈاکٹر مغیر احمد تھے۔ سمینار میں مرکزی انجمن کی طرف سے جناب حیات اللہ انصاری، بیگم سلطانہ حیات خلیق انجم، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، جناب شہاب الدین دسنوی، پروفیسر مسعود حسین اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ شامل تھے۔

انجم صاحب ضرورت مند حضرات کی مدد کے لیے ہمیشہ آمادہ رہتے ہیں۔ اردو کے مشہور صحافی سلامت علی مہدی جب بیمار پڑے تو ان کو آنجہانی اندرا گاندھی سابق وزیراعظم ہند کے فنڈ سے پانچ ہزار روپے کی رقم دلائی اور وزیر اطلاعات ونشریات کے فنڈ سے سلامت علی مہدی کو مزید پانچ ہزار روپے دلوائے اسی طرح ظ۔ انصاری کے انتقال کے بعد ان کی بیوہ کے لیے دو سال تک پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ دلّی اردو اکیڈمی سے مقرر کرایا۔ اور پانچ سو روپے ماہوار دو سال تک ایک ادارے سے دلوائے۔ ان کو بھی وزیراعظم کے فنڈ سے پانچ ہزار اور ایچ۔ کے ایل بھگت کے فنڈ سے پانچ ہزار روپے کی رقمیں دلوائیں۔ انجم صاحب نے بلامبالغہ بے شمار ادیبوں اور شاعروں کی مدد کی ہے۔

آج جب کہ انجمن کے وسائل اطمینان بخش ہو چکے ہیں انجم صاحب اب بھی چھوٹے چھوٹے کام کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے اگر ہال میں کرسیاں ٹھیک کی جا رہی ہوتی ہیں تو دفتر کے لوگوں کے ساتھ مل کر وہ بھی کرسیاں اٹھا اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھتے ہیں ان کے اس رویے سے دفتر کے تمام لوگ چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ انجم صاحب نے اسٹاف کے ہر فرد کو ہمیشہ اپنے خاندان کا فرد سمجھا ہے جب تنخواہیں بہت کم تھیں تو اسٹاف کے بہت سے ان کے مقروض رہتے تھے۔ انجم صاحب کو غصہ جتنی جلدی آتا ہے اتنی ہی جلدی اتر بھی جاتا ہے۔ انجمن کے کارکن، افسران اور چپراسیوں کو برابر کی عزت دیتے ہیں۔ ایک طرف اگر وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی چپراسی کسی افسر سے بدتمیزی کرے تو دوسری طرف جب کبھی انجمن میں کوئی تقریب ہوتی ہے تو انجمن کے تمام کارکنوں اور چپراسیوں کو ایک ساتھ کھانا کھلاتے ہیں۔ کئی دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ کسی چپراسی نے کوئی زبردست غلطی کی اور اس کے بارے میں انجم صاحب نے طے کر دیا کہ اس کو دفتر سے نکال دیا جائے گا۔ یہ واقعہ اگر صبح ہوا تو شام تک وہ اس واقعہ کو بھول جائیں گے کہ متعلقہ چپراسی کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا تھا۔ وہ بہت رحم دل اور انسان دوست ہیں۔ ان کے اس رویّے کی وجہ سے کبھی کبھی دفتر کے انتظامی امور میں ایسا خلل پڑتا ہے کہ اس کا اثر دوسرے کارکنوں پر پڑتا ہے۔ یہاں ایک واقعہ اور بیان کر دوں کہ انجمن جب دلّی منتقل ہوئی جیسا کہ میں اس سے پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ انجمن سخت ترین مالی دشواریوں کا شکار تھی اس کا ذکر اس سے پہلے بھی آچکا ہے کہ انجم صاحب نے دو سال تک تنخواہ نہیں لی اور صرف یہی نہیں کہ انھوں نے ۲۵ ہزار روپے انجمن کو قرض بھی دیا جس کی ادائیگی اس وقت ہوئی جب انجمن کے مالی وسائل ٹھیک ہو گئے۔ اس قرض دینے کی وجہ یہ تھی کہ انجم صاحب یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ انجمن کے اسٹاف کو تنخواہ ایک دن دیر سے ملے۔ کیوں کہ انھیں خیال تھا کہ اسٹاف پہلے ہی مالی دشواریوں میں گرفتار ہے اور کارکن نئے شہر میں آباد ہیں لہٰذا اب اگر تنخواہ دیر سے ملی تو یہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ انجم صاحب ان دنوں یہ کہہ کر اسٹاف کی حوصلہ افزائی کرتے تھے کہ انشاء اللہ وہ وقت بھی آئے گا کہ جب آپ کی محنت کا صلہ ملے گا اور آپ کی تنخواہوں میں مناسب اضافے ہوں گے۔ آج خدا کا شکر ہے کہ انجمن کے اسٹاف کی جو تنخواہیں ہیں وہ سینٹرل یونیورسٹی کے گریڈ کے مطابق ہیں اور ہندوستان میں کوئی اردو ادارہ اپنے اسٹاف کو اتنی تنخواہیں نہیں دیتا۔ ایسا صرف انجم صاحب کی محنت و لگن اور اسٹاف کے بھرپور تعاون کی وجہ سے ہے۔

انجم صاحب یک رخے نہیں ہیں۔ وہ ادیب ہیں، اچھے منتظم ہیں اور اعلا درجے کے مقرر ہیں۔ فوٹوگرافر بھی بہت اچھے ہیں، ہومیوپیتھی میں بھی اچھا خاصا دخل رکھتے ہیں پھر ادب میں بھی کسی خاص ایک موضوع پر کام نہیں کیا۔ مختلف میدانوں کو اپنی جولان گاہ بنایا ہے۔ تحقیقی کتابیں لکھیں، بڑی تعداد میں تنقیدی مضامین لکھے۔ متنی تنقید کے فن پر اردو میں پہلی کتاب لکھی۔ فارسی اور انگریزی سے اردو میں ترجمے کیے۔ غالب کے خطوط اور "آثار الصنادید" کے اعلا ترین درجے کے تنقیدی اڈیشن تیار کیے۔ اور اس کے علاوہ وہ ۱۴، ۱۵ سال تک کروڑی مل کالج میں اردو کے استاد رہے۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے طلبہ کو پڑھایا اور پی۔ ایچ ڈی کے طلبہ کی رہنمائی کی۔

ارا چرن رستوگی

تالیف کاری اور اس کے ملتزمات
اور
خلیق انجم بہ حیثیت مولف

شاعر بمبئی کے ایک شمارے میں میرا مضمون اداریہ نگاری و تبصرہ کاری ایک مطالعہ دو تین سال پیشتر شائع ہوا تھا۔
اداریاتی صحافت ویسے تو صحافت تنظیم journalism کے تحت آتی ہے مگر ادبیات سے تعلق اس کا بغور مطالعہ نہیں کیا گیا
ہے۔ اردو ہی میں کیا، انگریزی میں بھی اس موضوع پر کوئی کاوشش نہیں کی گئی ہے۔ کسی ادبی جریدے کے مدیر کو ادبیاتی
دل و دماغ کا حامل ہونا ضروری ہے۔ ادبیات سے کسی نوعیت کی کار آگہی کا فقدان اس کا بڑا دشمن ہوگا اور کسی طرح کا انتشار
خیالات اس کی بدبختی کا آئینہ دار ہوگا۔ بہ حیثیت مدیر ہر شمارے کے لیے اس کو اداریہ سپرد قلم کرنا پڑتا ہے۔ اداریہ کون
کون سے اوصاف سے متصف ہونا چاہیے اس پر متذکرہ مضمون میں بھرپور روشنی ڈالی گئی تھی۔ غالباً یہاں اداریہ کی بابت
کچھ معروضات اجمالاً پیش کرنا برمحل ہوگا۔ ہر شمارے کا اداریہ اس کے مشتملات پر روشنی ڈالتے ہوئے قارئین کو پیش کردہ
مضامین، منظومات، افسانوں وغیرہ سے متعارف کرا دیتا ہے تو بھی خاص خاص باتیں قارئین کو معلوم ہو جاتی ہیں۔ اگر خصوصی
شمارہ نکالا جاتا ہے تو ادارت کو مبارزہ طلبی challenge سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یعنی پیش کیے جانے
والے مواد پر تمام تر توجہ صرف کرنا پڑتی ہے۔ ادارت کو خصوصی نمبر کے موضوع سے سیر حاصل واقفیت نیز واشگاف کار آگہی
بروئے کار لانا پڑتا ہے، جو مشکل کام ہے۔ اگر خصوصی نمبر کارآگہانہ سلیقے سے نکالا گیا ہے تو اس خصوصی نمبر کو کتاب کے سائز
میں بھی نکالا جا سکتا ہے۔ اس بحث سے جو نکات مستنبط کیے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں۔

ا۔ مدیر کی موضوع سے بھرپور واقفیت

ب۔ اداریہ میں مشمولات پر طائرانہ نظر۔ اگر کسی موضوع پر ہدایت و سمت کی نشاندہی، اگر ضروری مواد سے بھرے ہوں تو صاف ظاہر ہے اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے گا۔

ج مواد کی ترتیب

مندرجہ بالا اوصاف ادبی تالیفات میں بھی ہونا چاہئیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ڈاکٹر خلیق انجم جن کا اردو ادبیات میں کلیدی
مرکزی مقام رہا ہے بہ حیثیت مولف کون اوصاف سے حامل ہیں درج ذیل تالیفات کی روشنی میں انتقادی جائزہ
بنا واقعی ادبی خدمت ہی تصور کی جائے گی

سید سلیمان ندوی	انجمن ترقی اردو ہند
محی الدین قادری زور	" " "
فیض احمد فیض	" " "

مولانا آزاد شخصیت اور کارنامے   اردو اکادمی دہلی

اختر انصاری شخص و شاعر

سید سلیمان ندوی مرحوم پر تالیف میں خلیق انجم نے اپنی بھرپور آگہی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مولانا سید سلیمان ندوی بیسویں صدی کے صف اول کے عالموں میں سے تھے۔ مرحوم عالم دین تھے، مورخ تھے، محقق اور سوانح نگار، شاعر اور مترجم تھے، سیرت نگاری میں علامہ شبلی کے بعد انھی کا نام آتا ہے ۔ ۔ ۔ مولانا ندوی کو انجمن ترقی اردو ہند سے گہرا لگاؤ تھا۔ انھوں نے انجمن کی حمایت میں لکھا، اسے مشورے دیے اور بعض اوقات تنقید بھی کی ۔ ۔ ۔" (حرف آغاز)

مدیر و مولف کو موضوع کی پوری آگہی اگر نہ ہو یا وہ کسی مخمصے کا شکار ہو جائے یا موضوع کے متعلقات پر کسی قسم کا انتشار اس کے دماغ کو محصور کر لے تو وہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ تالیف میں موضوع سے متعلق تمام تر پہلوؤں پر روشنی ڈالنے والی تحریریں شامل کی جائیں۔ خلیق انجم صاحب مرحوم کی جملہ خوبیوں سے آگاہ تھے لہذا انجمن ترقی اردو ہند، سید سلیمان ندوی سمینار میں پیش کیے گئے ایسے مقالے منتخب کر لیے جو تالیف میں شمولیت کے قابل سمجھے گئے۔ سید مظفر حسین برنی سابق گورنر منی پور اور ہریانہ کو خطبۂ افتتاحیہ کے لیے مدعو کیا جانا نگاہِ انتخاب کی خوبیوں کی آئینہ دار ہے۔ فی الواقع خلیق صاحب نے جناب برنی صاحب جو خوبی ہائے دل و دماغ کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں افتتاح کرنے کے لیے مدعو کیا یہ امر بالواسطہ اس کا ثبوت ہے کہ

قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

خلیق صاحب نے مرحوم کا سوانحی خاکہ پیش کرتے ہوئے سب کچھ کہہ دیا ہے۔ تالیف ہذا میں صرف ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے بھی مراسلت کے توسط سے مولانا سلیمان ندوی مرحوم سے بارہا استفادہ کیا تھا۔ دونوں کے مابین مراسلت کے تعلق سے ان کے خطوط پر مشتمل مجموعے بھی دستیاب ہیں۔ اگر اس موضوع پر بھی کوئی تحریر شامل کر لی جاتی تو اس گراں مایہ تالیف کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خلیق صاحب اس موضوع کو نظر انداز کر گئے۔ غالباً ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے مضمون "مولانا سید سلیمان اور فارسی ادبیات اور ڈاکٹر مسز افتخار بیگم کی تحریر "دبستان شبلی کے ایک ممتاز ادیب۔ مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ میں اقبال کے تعلق سے بھی کچھ نہ کچھ کہا گیا ہے مزید برآں ایک اور مضمون کا اضافہ تالیف کی ضخامت کو بڑھا دیتا غالباً ایسی ہی وجوہات سے اقبال اور سلیمان ندوی پر علاحدہ مضمون مشمول نہیں ہو سکا۔ بہرکیف ضرورت تھی کیوں کہ علامہ اقبال اکثر و بیشتر سید سلیمان ندوی مرحوم سے متعدد امور پر رجوع کرتے تھے۔ مرحوم ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے اور تالیف میں بھی جہات روشنی میں لائے گئے ہیں۔

محی الدین قادری زور بھی قابل ستائش تالیف ہے۔ "حرف آغاز" کے تحت خلیق صاحب نے باتمام اجمال موضوع کے متعلق سبھی نکات پیش کر دیے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ۔

"ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور تاریخ اردو ادب کا ایک روشن باب ہیں۔ انھوں نے تقریباً ۴۰ سال تک اردو زبان و ادب کی خدمت کی۔ ان کا بیشتر کام دکنی ادب پر ہے لیکن انھوں نے کبھی شمالی ہند کے ادیبوں سے کسی قسم کا تعصب نہیں برتا۔ دکن میں پیدا ہونے کے ناتے ان کے لیے دکن کا ہر ذرہ دیوتا تھا۔ زبان اور ادب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ انھوں نے قدیم دکنی ادب کے شہ پاروں کی بازیافت کی، دکنی کے کئی اہم اور قدیم مخطوطات مرتب کر کے شائع کیے ۔ ۔ ۔ دکن کی قدیم تاریخ اور تہذیب سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ انھوں نے ایوان اردو جس کی تعمیر زور صاحب

ہی کی دلچسپی کی مرہون منت تھی) . . . بڑی تعداد میں مخطوطات اور مطبوعات جمع کیے . .
میوزیم قائم کرگئے اس میں دکن کے حاکموں کی تصویریں تلواروں اور دوسرے ہتھیار، فرامین ظفرے
خطاطی کے اعلانمونے سیاسی دستاویزیں وغیرہ جمع کیں۔ یہ چیزیں دکن کی قدیم تاریخ اور
تہذیب کا مطالعہ کرنے والوں . . . کے لیے بہت اہم ہیں۔

"حیات زور" مولف ہی کی تحریر ہے جو ۱۸ صفحات کو محیط ہے۔ زور مرحوم کی ادبیاتی وثقافتی ظفر یابیوں کا ایسا خاکہ پیش کیا گیا ہے کہ اس کو زور صاحب کی پوری شخصیت کا آئینہ دار کہا جاسکتا ہے۔ زور صاحب کی کتاب اردو شاعری کا انتخاب، ساہتیہ اکیڈمی جس پر رشید حسن خاں نے سخت تنقید کی تھی اس کا بھی ذکر کردیا ہے، جو فی الواقع ضروری تھا۔ تالیف میں ۱۹ تحریریں شامل کی گئیں ہیں۔ جن کا مطالعہ قارئین کو زور مرحوم سے پوری طرح متعارف کرسکتا ہے۔ افسانہ نگاری، تنقید نگاری، مخطوطہ شناسی، اردو خدمات، حیدر آباد میں تعمیر ایوان اردو، لسانیات، شاگردوں کی حوصلہ افزائی، فارسی وار دو ادبیات میں گہری دلچسپی، سماجی شعور، تصانیف و تالیفات وغیرہ موضوعات پر تحریریں، بہ حسن ترتیب تالیف میں شامل ہیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں خلیق انجم نے زور صاحب کے جملہ متعلقات سے قارئین کو افادہ پہنچایا ہے۔ زور پر ہر مطالعہ کے لیے یہ تالیف کام میں لائی جاسکتی ہے اس کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ یہی نہیں، اردو زبان پر ایک تحریر "یہ جو اردو زبان ہماری ہے" جو قلم زور کی مرہون منت ہے۔ تالیف میں شامل کی گئی ہے۔ یہ فی الواقع "قند مکرر" کا درجہ رکھتی ہے۔

فیض احمد فیض، تنقیدی جائزہ

یہ تالیف انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کی ہے۔ حرف آغاز کے تحت خلیق صاحب نے لکھا ہے کہ
"فیض احمد فیض علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کے بعد اس صدی کے سب سے زیادہ قدآور اردو شاعر ہیں۔ بیسویں صدی کے جن اردو شاعروں کو بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ان میں غالب، علامہ اقبال کے بعد فیض کا نام آتا ہے۔ ان تینوں کی وجہ سے اردو زبان اور اس کے تخلیقی ادب سے دنیا کا بڑا حصہ واقف ہوا۔ غالب اور علامہ اقبال کو مرنے کے بعد جو شہرت نصیب ہوئی وہ ان کو اپنی زندگی میں حاصل ہوگئی۔ فیض کو ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں برابر مقبولیت حاصل رہی ہے . . . فیض نے شاعری اور عملی زندگی میں اپنی محبت اور خلوص کے ذریعہ انسانیت کو جو کچھ دیا ہے ہم اس کا بدلہ نہیں چکا سکتے . . ."

خلیق صاحب نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو فیض کی عملی زندگی اور ان کی شاعری کی بابت مضمونوں اور کتابوں میں بالتشریح لکھا گیا ہے، لکھا جارہا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ ۸ سوانحی مقالے ۱۲ تنقیدی مقالے ۵ انٹرویو انتخاب فیض کے تحت فیض کی نظموں وغیرہ کا انتخاب تالیف میں شامل کیے گئے ہیں۔ مشمولہ تحریریں چوٹی کے ادیبوں سے لکھائی ہوئی ہیں۔ لہٰذا انجمن ترقی اردو ہند کی اس مطبوعہ پیش کش سے قارئین خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ فیض کا کسی اعتبار سے مطالعہ کرنے کے لیے اس تالیف کو نظر انداز نہیں جا جاسکتا۔ مزید براں، خلیق انجم کی ژرف بینی، ذہنی وقلبی مضمرات سے غیر ملوث انتقادی توانائی "حرف آغاز" کے پہلے جملے ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ انھوں نے اس صدی کے سب سے زیادہ قدآور تین شاعر بتائے ہیں۔ اقبال، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری ملحوظ رہے۔ آج کل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فراق گورکھپوری کی شاعری کو انجہانی کردینے کی کچھ درپردہ سازش سی چل رہی ہے۔ خلیق صاحب کا نظریہ صالح بھی

ہے اور صحیح بھی۔

اختر انصاری شخص اور شاعر:

یہ وہ تالیف ہے جس کو انجمن ترقی اردو ہند نیو دہلی نے شائع کیا ہے اور خلیق صاحب نے ترتیب دیا ہے حرف آغاز" خلیق صاحب کی ناقدانہ نظر کا آئینہ دار ہے اور اس نوعیت کا ہے کہ اس کو یہاں پیش کیا جائے تاکہ قارئین خاطر خواہ استفادہ کر سکیں۔

"۲۵۔۳۰ سال قبل اردو کی جن عصری کتابوں کو اہمیت حاصل تھی ان میں ' افادی ادب' اور' ایک ادبی ڈائری' بھی شامل تھیں یہ دونوں کتابیں ایک ایسے شخص کی تصنیف تھیں جس کا شمار اردو کے ممتاز اور نامور ترقی پسند نقادوں اور شاعروں میں ہوتا تھا یعنی اختر انصاری مرحوم۔ آہستہ آہستہ اختر صاحب کی مقبولیت اور شہرت میں کمی آنے لگی۔ یہاں تک کہ خود ان کی زندگی میں نئی نسل ان کے نام اور ان کی ادبی زندگی سے واقف نہیں رہی۔ اختر انصاری (اپنی شہرت و مقبولیت) کو نقصان پہنچانے والے خود اختر انصاری تھے۔ اختر انصاری کی ۔۔ کمزوری ۔۔ ان کی انا کی غیر معمولی بڑھی ہوئی لے ۔۔۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۔۔ نقادوں نے انھیں قطعی نظر انداز کرکے بدلہ چکا لیا اور پھر ترقی پسند نقاد شروع ہی سے بہت زیادہ مصلحتوں کے شکار رہے ہیں ۔۔ مرحوم نے زندگی بھر خون جگر سے اردو شعر و ادب کی آبیاری کی لیکن خود ان کی زندگی ہی میں ان کو فراموش کر دیا گیا ۔۔ وہ گروہ بندی کے قائل نہیں تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی ۔۔۔"

"حرف آغاز" میں غرض کردہ سب کچھ آگیا ہے جو اگر سپرد قلم نہ کیا جاتا تو اختر انصاری کے متعلقہ جملہ مضامین میں کمی رہ جاتی۔ اس کمی کی نشاندہی بہت ضروری تھی کیوں کہ " انا" کی گرفت میں پھنسنے سے آج کل کے شعرا و ادبا پیچھے رہ سکتے ہیں۔ بالواسطہ مشورہ indirect suggestion نفسیاتی اعتبار سے تیر بہدف ہی ثابت ہوتا ہے کیوں کہ براہ راست مشورہ اکثر و بیشتر ناگوار گزرتا ہے۔

سوانحی خاکہ خطوط اختر انصاری، اختر کی ادبی خدمات پر مضامین اور دیگر مشمولات اختر انصاری کی شہرت کی نو آبادکاری کے لیے ضروری بھی ہیں اور افادیت سے بھرپور بھی ہیں۔ بنیادی طور پر اختر انصاری اچھے شاعر تھے۔ شاعری کا انتخاب کرنا جوئے شیر کا لانا ہے۔ کہتے ہیں نا ع

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

خلیق صاحب انتخاب پیش کرنے میں بھی عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔ اختر انصاری کا درج ذیل شعر تو روزمرہ ہی میں داخل ہو گیا ہے ؂

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

اختر انصاری کی نگارشات کو مطالعہ میں لانے کے لیے خلیق انجم کی پیش کردہ تالیف اختر انصاری شخص، شاعر سر فہرست ہی نظر آئے گی۔

مولانا ابوالکلام آزاد، شخصیت اور کارنامے

یہ تالیف اردو اکادمی، دہلی کی پیش کش ہے، جو ۱۹۸۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ ادبیاتی سرگرمیاں، بالخصوص اردو زبان و ادب سے متعلق سرگرمیاں دلی میں صدیوں سے ہوتی رہی ہیں۔ گزشتہ متعدد برسوں سے جس نوعیت کی مربوط و منظم کاوش well co-ordinated endeavours روایت میں تبدیل ہو رہی ہے اس میں خلیق انجم کا کردار واضح خد و خال profiles کا حامل ہے۔ غالب اکیڈمی، بستی نظام الدین دہلی میں ۲۵ تا ۲۷، اکتوبر، ۱۹۸۷ء ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر خلیق سمینار کے ڈائریکٹر تھے۔ سمینار میں پیش کیے گئے مقالے بغایت سلیقے اور حسن ترتیب سے تالیف دینے کا سہرا خلیق صاحب کے سر ہے۔ "حرفِ آغاز" سے رجوع کرنے پر تمام تر متعلقات واضح ہو جاتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

> "مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستانی تاریخ کی عظیم ترین ہستیوں میں ہیں۔ کچھ سیاسی حالات اور کچھ بد توفیقی کہ ہم نے قومی زندگی میں اپنے محسن کو وہ مقام نہیں دیا جس کا وہ مستحق تھا۔ ہاں، وہ وقت دور نہیں جب قوم اپنی کوتاہی کا اعتراف کرے گی۔ مولانا آزاد ہماری جنگ آزادی کے ہیرو تھے۔۔ مولانا نے ایک طرف قید و بند اور دار و رسن کی آزمائشوں میں زندگی گزاری اور دوسری طرف اپنی قوم اور خاص طور پر مسلمانوں کی فکری قیادت کی۔ سرسید نے مسلم فرقے کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا اور مذہب کو عصری زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔۔۔ مولانا آزاد اور سرسید کا اختلاف سیاسی میدان میں تھا۔ سرسید کا خیال بلکہ عقیدہ تھا کہ مسلمان برطانوی حکومت کے حمایتی بن کر رہیں۔ اس کے برعکس مولانا آزاد۔۔۔ میں برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا۔ میرا خیال ہے کہ سرسید جس راستے پر چل کر منزل پر پہنچے اس کے بعد کا راستہ وہی تھا جس پر مولانا آزاد پہنچے۔۔۔ مولانا آزاد کی شخصیت متنوع تھی۔ وہ اگر مجاہد آزادی تھے تو عالم دین بھی تھے۔۔۔ وہ فلسفی تھے، مفکر تھے، مدبر تھے، تاریخ پران کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو انقلاب برپا کر دیا۔ ایسی روایتوں کو جنم دیا، جن سے اردو صحافت نا آشنا تھی۔ مولانا کا شمار اردو کے اعلاترین انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ اگر ان کا اسلوب تحریر منفرد تھا تو تقریر میں بھی ان کا ثانی ملنا مشکل تھا۔ ان جیسے شعلہ نوا اور جادو بیان ہندوستان نے بہت کم پیدا کیے ہیں۔۔۔ غرض کہ مولانا اقتادِ طبع، علم، ذہانت و فطانت، اہلیت و صلاحیت معاملہ فہمی اور دور اندیشی کے لحاظ سے غیر معمولی انسان تھے ایسے انسان تو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔۔۔"

یہ ہے لب لباب ان تمام اوصاف کا جن کے مولانا آزاد حامل تھے۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خلیق انجم نے ان تمام تر سطور کی نشاندہی کر دی ہے جن پر نگاہ مرتکز کرتے ہوئے کسی زاویے سے مولانا کی تصانیف نیز واقعاتِ ملی و قومی جن پر مولانا نے اثرات مرتب کیے ہے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ اس تالیف میں شامل مضامین کی مجموعی تعداد ۲۶، ہے اور ان مضامین کو درج ذیل عنوانات کے تحت جگہ دی گئی ہے۔

۱۔ سیرت و شخصیت ۲۔ سیاست ۳۔ مذہب ۴۔ ادبی نثر ۵۔ صحافت ۶۔ شاعری۔

پچھلے تین چار سال کے دوران مولانا آزاد پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور متعدد اردو جریدوں نے خصوصی شمارے

بھی شایع کیے جن میں اردو اکادمی دلّی کا ماہانہ رسالہ "ایوان اردو" بھی شامل تھا اور قابل تعریف پیش کش تھا سیمناروں میں شرکا کرام نے اپنے خیالات پر مشتمل مقالے پیش کیے۔ غالب اکیڈمی، بستی نظام الدین دہلی کی سیمنار میں پیش کیے غالب اکیڈمی، بستی نظام الدین دہلی کی سیمنار میں پیش کردہ مقالوں کو بہ حسن ترتیب و تالیف پیش نظر کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ "آزاد" پر محققانہ کام کرنے والوں کو اس تالیف کی جانب بھی رجوع کرنے پڑے گا۔

منتخبات

اردو اکادمی نیو دہلی اور انجمن ترقی اردو (ہند)، نیو دہلی کے وہ تالیفات جن کی ادارت ڈاکٹر خلیق انجم کے سپرد رہی اور جن کا جائزہ اس مضمون میں لیا گیا ہے مستقل اہمیت و افادیت سے بھرپور ہیں۔ حرف آغاز کے تحت خلیق صاحب نے مستعدانہ ژرف نگاہی دکار آگہی کا ثبوت دیا ہے۔ خلیق انجم صاحب نے ایک اور تالیف "فراق گورکھپوری" کے حرف آغاز میں منجملہ دیگر امور یہ نکتہ بھی پیش کیا کہ فراق پر پوربی زبان (جو فراق کی مادری زبان تھی) نے بھی کچھ نہ کچھ اثر مرتب کیا ہے۔ ژرف نگاہی کا حامل ہی ایسی نکتہ رسی کا ثبوت دے سکتا ہے، بلکہ مثال پیش کر سکتا ہے۔ خلیق صاحب کے "حرف آغاز" کے تحت سمت ہدایت کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مولانا آزاد کے بارے میں ایک نکتہ نظر انداز ہوا معلوم ہوتا ہے۔ آزاد نے علامہ اقبال اور ان کی شاعری کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔

تالیف میں مواد کو کس طرح یعنی کس ترتیب سے پیش کیا جائے مشکل کام، بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ خلیق صاحب کی ترتیب کہیں انتشار کی زد میں نہیں آئی ہے۔

ایک اچھی تالیف اپنے موضوع کے اعتبار سے قدر و منزلت کی حامل اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اس میں کسی موضوع سے متعلقہ نظریات کا احاطہ کیا گیا ہو۔

بہ حیثیت مولف ڈاکٹر خلیق انجم اعلیٰ ترین تالیفی خد و خال distinguished profiles کے حامل ہیں اور اس کے ساتھ اردو اکادمی نیو دہلی اور انجمن ترقی اردو ہند دونوں ادارے تحسین و تعریف کے مستحق ہیں۔ تالیف کا اور تالیفات دونوں کے بارے میں غنی کے درج ذیل شعر پر یہ تحریر "ختم شد" کی منزل پر پہنچتی ہے ؎

آب بود معنی روشن غنیؔ

خوب اگر بستہ شود گوہر است

متنی تنقید اور خلیق انجم

انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اردو دنیا میں ڈاکٹر خلیق انجم کی شہرت اتنی بڑھ گئی ہے کہ
ے علمی وادبی کارناموں پر کچھ پردہ سا پڑ گیا ہے، گرچہ حال میں غالبیات کے ایک محقق کی حیثیت سے مکاتیب
ب کی ترتیب کے بعد ناقدوں کی توجہ ان کی طرف مبذول ہونے لگی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے متعدد ایسے
ی و تنقیدی کام پچھلے بیس پچیس سال میں کیے ہیں جن کا اعتراف تاریخ ادب پر ایک قرض ہے۔ "مرزا محمد رفیع
،" "مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط"، "غالب کی نادر تحریریں" اور "معراج العاشقین مع دکنی کلام" ڈاکٹر انجم کی وقیع کاوشیں
ہ جو ۱۹۶۷ء میں ان کی عالمانہ و فاضلانہ تصنیف "متنی تنقید" کی اشاعت سے قبل ہی سامنے آچکی تھیں۔ یہ سب
ہ ایک ایسے محقق و ناقد کا کردار پیش کرتی ہیں جو اپنی دیدہ ریزی اور دیدہ وری کی بدولت اپنا ایک علمی مقام بناتا
ہ اس مقام کی مزید وضاحت دلی کے آثار قدیمہ پر ڈاکٹر انجم کے ان تحقیقی مقالات سے ہوتی ہے جو چھپ کر
ناظر سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ آثار قدیمہ کے موضوع پر ان کی تین کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔

تنقید متن پر اردو میں اصولی بحثیں بہت کم کی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد محققین ادب کے علمی کارناموں
ے باوجود متن کی تنقید کے اصولوں اور طریقوں کی واقفیت عام نہیں ہے۔ حالاں کہ پچھلی چوتھائی صدی میں
اص کر یونیورسٹیوں کے اندر متون کی ترتیب کے کام بہ کثرت ہوئے ہیں۔ ریسرچ اب اردو کی اعلیٰ تعلیم کا ایک
زمی جز ہو گیا ہے اور آئے دن پی، ایچ، ڈی اور ڈی لٹ کے لیے لکھے ہوئے مقالات شایع ہوتے رہتے
ہیں۔ اس وسیع ریسرچ ورک میں متن کی اڈیٹنگ کا حصہ بہت نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ کسی قسم کا تحقیقی موضوع
دا اس کا حق اس وقت ادا ہو سکتا ہے جب صحیح متن کو مدنظر رکھا گیا ہو، اس لیے کہ جن تصانیف کا مطالعہ کیا
الست ان کے فہم اور تجزیے کے صحیح و معتبر ہونے کے لیے ان کی عبارت کی درستی ضروری ہے۔ ورنہ ناقص
ات کی بنیاد پر جو نتائج نکالے جائیں گے ناقص اور ناقابل قبول ہوں گے۔ علمی کاموں کی اصلیت، حقیقت
یت اور افادیت متن و عبارت کے صحیح ہونے پر منحصر ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی تصنیف "متنی تنقید" اردو میں لکھی ہوئی ایسی پہلی کتاب ہے جو تصحیح متن کے طریقوں پر
ربط و ضبط کے ساتھ روشنی ڈالتی ہے۔ اس سے ادب کے معیار کی تعین بھی ہوتی ہے اور اس کی تشریح و توضیح
کے پیمانے مقرر ہوتے ہیں جن سے ذوق و شعور کی پرورش اور ترقی کا سامان ہوتا ہے۔ کہنا چاہیے کہ متن

کی تصحیح دراصل تحقیق کا وہ بنیادی کام ہے جس پر تنقید کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو متنی تنقید بہ یک وقت تحقیق و تنقید دونوں میدانوں میں شامل ہے اور علم و ادب کے ان دونوں دائروں کا ارتقا اسی پر مبنی ہوتا ہے۔

ایسے کلیدی موضوع پر بحث آسان نہیں۔ اس میں چند در چند مشکلات ہیں لہٰذا اس سلسلے میں دو اہم ترین مسائل کی نشاندہی کافی ہوگی۔ اول یہ کہ موضوع کی تمام جہتوں اور ان کے مضمرات کا احاطہ بہت دشوار ہے جس کے لیے نہایت باریک بینی کے ساتھ حقائق کا مفصل تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ دوم یہ کہ اس تجزیے میں تکنیکی امور کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ کم ہی لوگ اس کے مطالعے کی طرف راغب ہوتے ہیں اور عام قارئین کے لیے اس کا قابل مطالعہ ہونا بھی مشکوک ہوتا ہے، اس لیے کہ اصطلاحی الفاظ اور اعداد و شمار کی فراوانی وضاحت بیان میں حائل ہو سکتی ہے لیکن ڈاکٹر خلیق انجم ان دونوں مسائل سے اس کمال کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں کہ مباحث بسا اوقات قصے کی طرح دلچسپ ہو گئے ہیں، خاص کر متن کی تحریف و تصحیح کی جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ قاری کی معلومات میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کے تجسس کو بہم بیدار رکھتی ہیں اور اس کے ذہن پر ایسے ایسے اسرار و رموز کا انکشاف ہوتا ہے کہ اس کی دلچسپی مسلسل بڑھتی جاتی ہے۔ یہ بات صرف اس لیے ممکن ہوئی کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے موضوع کے پورے مواد کی فراہمی کے ساتھ ہی اس پر کافی غور و فکر کر کے اس کے سارے پیچ کھول دیے، اس کے علاوہ انھوں نے بہت ہی سادہ و سلیس اندازِ بیان سے کام لے کر ہر قسم کے قاری کو اعتماد میں لیا۔ یہ انداز بے تکلفی انشائیے کا ہے جس میں جا بجا لطیف مزاح کی چاشنی کے باوجود کہیں ابتذال نہیں ہے۔ ایک مشکل اور سنجیدہ علمی موضوع کی یہ تسہیل و تفہیم مصنف کی واقفیت اور مہارت کا ثبوت ہے۔

دراصل "متنی تنقید" میں ڈاکٹر خلیق انجم کا اسلوب تحریر ایک ایسے شخص کا ہے جو ایک خاص فن کی گویا بنیاد رکھ رہا ہے اور اس نے اس کے ہر ہر پہلو کی چھان بین کر لی ہے۔ لہٰذا وہ پورے اعتماد اور بے ساختگی کے ساتھ اپنے نتائج افکار پیش کرتا ہے اور توقع رکھتا ہے کہ اس کے پڑھنے والے کچھ نئی آگہی حاصل کریں گے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے دیگر علما کے ساتھ تبادلۂ خیال نہیں کیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے متعلقہ موضوع پر کسی بھی جہت سے اظہار خیال کرنے والے اپنے پیش رووں کے متعدد حوالے دیے ہیں اور بعض اوقات ان کی رایوں پر محاکمہ بھی کیا ہے۔ استفادے اور افادے کا یہ طریقہ تخلیقی حد تک نتیجہ خیز ہے جس میں مناسب موقع سارے ضروری نکات کی تفتیش کر کے انھیں ایک نئے انداز سے بہت سوچ سمجھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ یہ ترتیب مصنف کے اپنے تجربات و تصورات کا خلاصہ ہے، جس کی اصلیت بجائے خود ایک علمی کارنامہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر انجم نے تنقید متن کے متعلق موجود حقائق و افکار کی ایک نئی تدوین کی ہے اور اپنے مطالعات کا حاصل ایک خاص تنظیم سے پیش کیا ہے۔ وہ موضوع کے مختلف پہلوؤں کی تبویب اور ان پر بحث اس منظم طریقے سے کرتے ہیں کہ مجموعی طور پر متعلقہ مواد کا ایک مربوط ہیولا تیار ہو جاتا ہے اور قاری بہت آسانی کے ساتھ ایک تکنیکی مضمون کی پیچیدگیوں اور باریکیوں سے نہ صرف واقف ہوتا ہے بلکہ لطف اٹھاتا ہے، اس لیے کہ مصنف صراحت کے ساتھ تدریجی طور پر تمام تفصیلات ایک رواں دواں انداز سے سامنے لاتا ہے، وہ اس سلسلے میں نہ تو بے جا طوالت سے کام لیتا ہے نہ پریشان کن اختصار سے۔

یہ کہ وہ بھاری بھرکم اصطلاحات کے چکر سے نکل کر سادہ و عام فہم لفظوں میں اپنا مافی الضمیر صاف دیتا ہے، گرچہ منطقی استدلال اور نکتہ سنجی اس کی ہر تشریح سے عیاں ہے۔ یہ ایک اچھا تدریسی اسلوب ہے، جس میں تجزیے کی قوت ترکیب کی صلاحیت سے ہم آہنگ ہے اور دونوں علمی طریقوں کا ارتباط تصنیف یت و ثروت کا باعث ہوتا ہے۔ اس نظم و ضبط کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

کتاب کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر باب کو اس کی جزئیات میں تقسیم کر کے زیر روشنی ڈالی گئی ہے، جیسے "متن کی تصحیح" پر مشتمل باب کے اجزا یہ دیے گئے ہیں:

بنیادی نسخہ، موازنے کا طریقہ، اختلافات نسخ کے مسایل، متنوں کی مختلف قراتیں، اردو رسم خط کی دشواریاں، متن کی تصحیح، قیاسی تصحیح۔

اس قیاسی تصحیح پر بحث کرتے ہوئے اس کے پانچ مدارج بتائے گئے ہیں، پھر سب مدارج کا الگ الگ ہے۔ گرچہ قیاسی تصحیح کی تشریح ایک مستقل باب میں اسی عنوان سے کی گئی ہے۔ اس لیے کہ یہ موضوع تصحیح کے دیگر امور سے ممتاز اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح "اعلیٰ تنقید" کے باب کو متعدد اجزا میں کے ہر جز پر الگ الگ بحث کی گئی ہے، مثلاً متن مستند ہے یا غیر مستند، سرقہ، مصنفین کے ناموں کی ت، مذہبی اختلاف، عوام کی عقیدت، مصنف کی شہرت کا ناجائز فائدہ وغیرہ۔

ڈاکٹر انجم اپنے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے بعض ایسے حقائق کی نشاندہی دہی کرتے ہیں جن کی ادبی تنقید میں بڑی اہمیت ہے، جب کہ جدید تنقید کا ایک حلقہ عصر حاضر میں ان کو نظر رہا ہے۔ ماضی اور کلاسکی ادب پر ڈاکٹر انجم کا یہ اظہار خیال ان کی علمی بصیرت اور ادبی آگہی کا ایک نمایاں ہے:

"مہذب قوم کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ اس کے پاس اپنے بزرگوں کی ذہنی اور فکری سفر کے ارتقا کی پوری تاریخ محفوظ ہوتی ہے۔ ہمارے حال کو فکر کی جن شمعوں نے روشن کیا ہے ان میں کوئی شمع ایسی نہیں جس کا رشتہ ماضی سے نہ ہو۔ کوئی سائنس اور کوئی فن ایسا نہیں جو ماضی کی پروا کیے بغیر ترقی کر سکے۔ وقت کے تیز اور تند دھارے ہر چیز کو مٹاتے ہوئے چلتے ہیں۔ انسان ازل سے ان دھاروں پہ قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جن ایجادوں کے ذریعے انسان نے اپنے مقصد میں تھوڑی بہت کامیابی حاصل کی ہے ان میں تحریر سر فہرست ہے۔ کتابوں اور مختلف اشیا پر لکھی گئی تحریروں ہی سے ہم ماضی کی بازیافت کرتے ہیں۔ الہامی کتابوں کے بعد اگر کوئی چیز مقدس ہے تو بزرگوں کے وہ فکری کارنامے ہیں جو کتابوں کی صورت میں ہمیں ورثے میں ملے ہیں۔" (ص ۱۲)

باب کے بعد جملے "مقدمہ" کے طور پر کہے گئے ہیں اور ان کے مطالعے سے اس وسیع تناظر کا پتا چلتا ہے جس کے مباحث واقع ہوئے ہیں۔ اس تناظر کی مزید توضیع اور موضوع کی تعین کے سلسلے میں مقدمے کے قابل غور ہیں:

"تنقید ادبی ہو یا متنی، دونوں سائنس ہیں۔ دونوں کے کچھ اصول و ضابطے ہیں۔ ادبی تنقید کے اصول زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، جب کہ متنی تنقید کے اصول نہیں بدلتے۔ البتہ

اسے زیادہ سے زیادہ سائنٹیفک بنانے کے لیے مزید اصولوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان دونوں کی راہیں کبھی بالکل ایک اور کبھی ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوتی ہیں۔ دونوں کا مقصد سچائی کی تلاش ہے۔ دونوں اپنے مواد کی تشریح اور تجزیہ کرتے ہیں۔" (ص ۱۴)

ادبی اور متنی تنقیدوں کی حدود کا یہ تعین جہاں ان کے باہمی امتیازات کی وضاحت کرتا ہے وہاں ان مشابہتوں کی صراحت بھی، اگرچہ اس تشریح میں بعض امور کی مزید تفصیل مطلوب ہوسکتی ہے، مثلاً ادبی تنقید اصول میں زمانی تغیر کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ تنقید ادب کے کچھ مستقل اصول نہیں ہیں، اس لیے کہ فکر و فن کے بنیادی تصورات معین ہونے کے بعد مستقل ہوجاتے ہیں اور اصول موضوعہ کے طور پر تسلیم کیے جانے ہیں بہر حال یہ بات صحیح ہے کہ متنی تنقید ادبی تنقید کی بہ نسبت زیادہ معروضی ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کا تعلق بڑی حد تک تکنیکی امور سے ہے۔

اعلیٰ تنقید کے باب میں متن کی آزمائش کے طریقے بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر انجم نے لفظیات کی تنقید کا اہم نکتہ پیش کیا ہے :

" متنی نقاد کو اپنی زبان کے ارتقا کا پورا علم ہونا چاہیے۔ مرزا مظہر کے اسکول کے شاعر کی زبان اور مفہوم دونوں دور ایہام گویاں کے شاعروں سے مختلف ہوں گے، ہر زبان میں ایسے الفاظ کی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے، جن کے بارے میں قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا استعمال کب شروع ہوا یا کس زمانے میں ان کا مفہوم یا تلفظ بدل گیا۔" (ص ۱۳۶)

ڈاکٹر خلیق انجم نے متن و عبارت کی تنقید پر اپنا وقیع کارنامہ ۶۷ء میں پیش کیا۔ یہی وقت اردو ادب جدیدیت کے اس رجحان کے آغاز کا تھا جس کے جلو میں اسلوبیاتی تنقید کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس رجحان نے لفظ کا ایک چکر چلایا، نیز ہیئت فن میں تجربوں پر زور دیا۔ اس طرح انفرادیت کی وہ ہنگامہ آرائی ہوئی جس میں ما کو نظر انداز کیا جانے لگا۔ اگر غور کیا جائے تو "متنی تنقید" کے مباحث میں ڈاکٹر انجم نے عبارت کلام کے جن سے بحث کی ہے اور اس سلسلے میں جو علمی حقائق اور تنقیدی نکات انھوں نے پیش کیے ہیں وہ وضاحتی کتا اور اسلوبیاتی تنقید دونوں کو روشنی دکھاتے اور ان کی رہنمائی کرتے ہیں جس طرح شبلی نے "موازنۂ انیس میں ایک صنف شاعری کا فنی مطالعہ اور محی الدین قادری زورؔ نے اسالیب نثر کا تجزیہ کرکے ادب کے اسلو جائزے کی نہ صرف راہ ہموار کی تھی بلکہ شاہراہ تعمیر کی تھی، اسی طرح ڈاکٹر خلیق انجم نے "متنی تنقید" لکھ کر اسی کے پر ایک سنگ میل نصب کیا، جس کا نشان جدید ترین یا جدیدی تنقید کی بے اعتدالیوں کے سبب گم ہوتا نظر آ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس کتاب کی تازہ اشاعت ہو اور اس کا مطالعہ ایک نئے تناظر میں کیا جائے، تاکہ اسا و لفظیات کے علم برداروں کو ادبی و تنقیدی مسائل کی سنجیدگی و پیچیدگی کا احساس و عرفان ہو اور نئے والوں کی استقامت کا سامان۔ اس طرح انفرادی تجربات کے شائقین اجتماعی روایات کی اہمیت کو سمجھ سکیں حال کا رشتہ ماضی سے استوار ہوگا، مسلمہ تہذیبی قدروں سے وابستگی کی افادیت واضح سے واضح تر ہوگی اور رومانیت کی ہم آہنگی سے وہ فکری و فنی توازن میسر آئے گا جس کی بنا پر ہی اخلاقیات و جمالیات کے امتز اعلیٰ ادب کی تخلیق و ترقی کے لیے فضا سازگار ہوتی ہے۔

شریف الحسن نقوی

خلیق انجم اور آثار الصنادید

پچھلے پچیس تیس برسوں میں جن حضرات نے اردو تحقیق اور تنقید میں ممتاز مقام حاصل کیا ہے ان میں ڈاکٹر خلیق انجم
کا نام شامل ہے۔ انجم صاحب کی پہلی کتاب "غالب کی نادر تحریریں" تیس سال پہلے شائع ہوئی تھی اور اب تک ان
کی بیس پچیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انجم صاحب نے "حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں" پر تحقیقی مقالہ لکھا تھا۔ جس پر
دلی یونیورسٹی نے پی۔ ایچ۔ ڈی ڈگری تفویض کی تھی، یہ مقالہ ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ انجم صاحب کی ایک
کتاب "مرزا محمد رفیع سودا" ہے۔ جو سات سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب تحقیق و تنقید کا اعلا ترین نمونہ ہے۔ پروفیسر
سرور نے اس کتاب کے مقدمے میں لکھا تھا کہ "جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو میں تحقیق و تنقید کا معیار گر رہا ہے
ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ معرکۃ الآرا کتاب دیکھنی چاہیے" یہ کتاب بیشتر یونیورسٹیوں کے ایم۔ اے کے نصاب میں شامل
"غالب اور شاہانِ تیموریہ" میں انجم صاحب نے غالب اور ذوق کے ادبی معرکوں کے نئے نئے گوشے تلاش
کیے اور قلعۂ معلیٰ سے غالب کے تعلقات کی تفصیل بیان کی ہے۔ انجم صاحب کی ایک اہم کتاب "متنی تنقید" ہے
متون کی ترتیب کے اصول و ضوابط پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔ اگرچہ بعد میں اس موضوع پر دو تین کتابیں
آئیں لیکن انجم صاحب نے ایک انتہائی خشک موضوع کو ایسا شگفتہ انداز تحریر دیا ہے کہ آج بھی ہندوستان
اور پاکستان کی بیشتر یونیورسٹیوں کے ایم۔ فل کے نصاب میں یہ کتاب شامل ہے۔

انجم صاحب کا ایک غیر معمولی ادبی کارنامہ خطوطِ غالب کا تنقیدی اڈیشن ہے۔ خطوط کی تین جلدیں شائع
ہو چکی ہیں اور چوتھی زیرِ طبع ہے۔ "غالب کے خطوط" کا یہ تنقیدی اڈیشن متنی تنقید کے جدید ترین اصولوں کے
مطابق مرتب کیا گیا ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو کے صفِ اول کے ادیب ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے انجم
صاحب کو داد دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس کتاب کا مقدمہ ہی بجائے خود ایک علمی اور تحقیقی مقالہ کا وزن رکھتا
ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی تو خلیق انجم پہلے ہی لے چکے ہیں۔ اس مقالے پر انھیں کوئی علمی ادارہ ڈی۔ لٹ دے نکلے تو
انھیں برحق ہوگا۔" اسی طرح پاکستان کے مشہور و ممتاز شاعر اور ادیب جمیل الدین عالی صاحب نے "غالب کے
خطوط" کے اس اڈیشن کے بارے میں لکھا ہے کہ "اب تک خطوطِ غالب پر اتنا بڑا کام میرے علم کی حد تک کسی اور
نے نہیں کیا۔ شاید پہلی بار یہ ہوا ہے کہ کسی اردو متن کی تدوین جدید جرمن طریقے پر کی گئی ہے۔ جرمن اس معاملے میں
یورپ کے لیے مثال اور امریکہ سے بہت آگے ہیں۔ "غالب کے خطوط" کی تدوین جرمن انداز پر بالکل

سائنٹیفک ہے۔" ان کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انجم صاحب بنیادی طور پر محقق اور متنی نقاد ہیں
نے فارسی سے اردو میں جن کتابوں کا ترجمہ کیا ہے ان کے حواشی بھی بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے لکھے
یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے، جو بنیادی طور پر محقق اور متنی نقاد ہو۔

انجم صاحب نے خاصی تعداد میں تنقیدی مقالے بھی لکھے ہیں لیکن ان مقالوں کی حیثیت ثانوی
انجم صاحب دلی والے ہیں۔ دلی کی ہر چیز سے والہانہ عشق کرتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس
ذرہ ذرہ ان کے لیے دیوتا ہے۔

انجم صاحب کو فنِ تعمیر سے بھی لگاؤ ہے۔ انھوں نے اردو گھر کی تعمیر کے سلسلے میں اس فن سے ا
واقفیت حاصل کی تھی۔ وہ ایک ایسی ہاؤسنگ سوسائٹی کے صدر رہے ہیں جس میں تین سو فلیٹ
رہے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کالج کی شاندار عمارت کی تعمیری کمیٹی کے بھی صدر تھے۔ جہ
تعمیر سے واقفیت حاصل کر کے انجم صاحب نے دلی کی قدیم عمارتوں کی طرف توجہ کی۔ جب اردو اکادمی
ایوانِ اردو نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تو خود انجم صاحب نے پیش کش کی کہ وہ دلی کے آثارِ قدیمہ پر قس
مضامین لکھیں گے۔ انھوں نے ۱۳، ۱۴ قسطوں میں دہلی کے آثارِ قدیمہ پر مضامین لکھے۔ ان مضامین کو خ
مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ مضامین پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے "آثارِ قدیمہ" کے فنِ تعمیر پر بھی قد
حاصل کر لی ہے۔ میرے دعوے کا ثبوت دلی کے آثارِ قدیمہ پر انجم صاحب کی دو کتابیں ہیں۔ ایک تو "د
درگاہِ شاہِ مرداں" اور دوسری "دلی کے آثارِ قدیمہ"۔ یہ دونوں کتابیں ۱۹۸۸ء میں دہلی اردو اکادمی
شائع ہوئی ہیں۔ "دلی کے آثارِ قدیمہ" میں ان کی دلچسپی اور ان کی واقفیت کو دیکھتے ہوئے اردو اکادمی
تحقیقی اور اشاعتی کمیٹی کی طرف سے میں نے فرمائش کی کہ وہ "آثار الصنادید" کو مرتب کر دیں۔ مجھے خوشی
انھوں نے اس کام کی ذمہ داری قبول کر لی اور "آثار الصنادید" کا متن اس انداز سے مرتب کیا کہ وہ واقعی ا
نمونہ بن گیا۔

قدیم فنِ تعمیر کو سمجھنے کے لیے انھوں نے بڑی تعداد میں مختلف زبانوں کی کتابوں کا مطالعہ کر کے
"آثار الصنادید" کے اس تنقیدی اڈیشن کا دو سو صفحات پر مشتمل مقدمہ لکھا۔ اس مقدمے میں ماہرانہ اندا
مسلم فنِ تعمیر کے آغاز اور ارتقا پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، ہندوستان کے قدیم فنِ تعمیر کا جائزہ لیا
پھر بتایا ہے کہ کس طرح ان دو مختلف اندازِ تعمیر کی آمیزش سے ایک نیا فنِ تعمیر وجود میں آیا۔ یہ تمام تف
بیان کرنے کے بعد انجم صاحب نے دلی کے اہم آثارِ قدیمہ کا ماہرانہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔

میری معلومات کے مطابق آج سے دو سال قبل تک انجم صاحب نے فنِ تعمیر پر ایک سطر
لکھی تھی، لیکن "آثار الصنادید" کے زیرِ نظر تنقیدی اڈیشن کے مقدمے کو پڑھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہو
یہ اس شخص کی تحریر ہے جس نے پہلی بار اس میدان میں قدم رکھا ہے۔ میں تاریخ کا طالبِ علم ہوں اور
پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ "آثار الصنادید" کا یہ مقدمہ مسلم اور ہندوستانی فنِ تعمیر پر ا
پہلی مستند تحریر ہے۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ انجم صاحب نہ صرف متنی تنقید کے جدید ترین اصول وضوا
ماہر ہیں بلکہ انھوں نے "غالب کے خطوط" کی شکل میں عملی متنی تنقید کا بہترین نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ انجم

الصنادید" کو متنی تنقید کے جدید ترین اصولوں کے مطابق مرتب کیا ہے۔ انھوں نے تقریباً ساڑھے تین سو
رسی اور انگریزی کتابوں کی مدد سے جو حواشی لکھے ہیں وہ خاصے کی چیز ہیں۔ پہلی جلد میں مقدمہ اور
صنادید کا عمارتوں سے متعلق متن ہے۔ دوسری جلد میں عمارتوں کے وہ خاکے اور کتبے ہیں جو سرسید نے
یشن میں شامل کیے تھے لیکن دوسرے اڈیشن کو مختصر کرنے کے خیال سے نکال دیے۔ چوں کہ سرسید
ائے ہوئے عمارتوں کے یہ خاکے اور کتبے غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اس لیے انھیں دوسری جلد میں
یا گیا ہے۔

انجم صاحب کو فوٹوگرافی کا بہت شوق ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ ایک ماہر فوٹوگرافر ہیں۔ ان
ئی قیمتی کیمرے ہیں۔ آثار قدیمہ پر کام کے دوران ان کا یہ شوق بہت کام آیا۔ انھوں نے بڑی تعداد میں
آثار قدیمہ کی تصویریں کھینچی ہیں۔ ان کی کھینچی ہوئی بہت سی تصویریں ان کی دو کتابوں دلّی کی درگاہ
دان" اور "دلّی کے آثار قدیمہ" میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے ٹائٹل کی خوب صورت
ریں بھی انھیں کی کھینچی ہوئی ہیں۔ "آثار الصنادید" کی دوسری جلد میں انھیں کی لی ہوئی ستر اسّی تصویریں
امل۔ ان تصویروں کی اہمیت یہ ہے کہ ان سے ہمیں آثار قدیمہ کی موجودہ حالت کا پتا چلتا ہے۔ ساٹھ ستر
بعد ان تصویروں کی غیر معمولی تاریخی اہمیت ہو گی اور یہ تصویریں حوالے کے طور پر استعمال کی جائیں گی۔
دلی میں بڑھتی ہوئی آبادی کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بہت سے آثار قدیمہ کو منہدم کرنا پڑا اور
ان میں سے بیشتر نئی کالونیوں میں اس طرح چھپ گئے ہیں کہ اب انھیں تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔
صب گلے میں کیمرے ڈالے مئی اور جون کی تپتی ہوئی گرمی میں ان عمارتوں کی تلاش میں گھومتے پھرے ہیں۔
ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ بعض عمارتیں تو کئی کئی دن کی تلاش کے بعد انھیں ملی ہیں۔ انجم صاحب نے اس
ری ہماری مشکل اس طرح حل کر دی کہ دوسری جلد کے حواشی میں ایسی عمارتوں کے مکمل نئے پتے درج
یے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک بڑا کام یہ کیا ہے کہ اردو، فارسی اور انگریزی کی جن کتابوں میں
آثار قدیمہ کا ذکر آیا ہے۔ ان کے حوالے صفحات کے ساتھ درج کر دیے ہیں۔ اس طرح انھوں نے
منا برآئندہ تحقیق کرنے والوں کا کام بہت آسان کر دیا ہے۔ اگر کوئی ماہر آثار قدیمہ قطب مینار یا مسجد
الاسلام یا کسی ایسے آثار قدیمہ پر کام کرنا چاہتا ہے جس کا ذکر "آثار الصنادید" میں ہے تو اسے اردو،
ور انگریزی کی ببلیوگرافی تیار صورت میں مل جائے گی۔

سرسید نے "آثار الصنادید" کے پہلے اڈیشن میں "شاہجہاں آباد کے لوگوں کا بیان" کے عنوان
عہد کے دلّی کے صوفیائے کرام، علمائے کرام، شاعر، خوش نویس اور ارباب موسیقی کا ذکر کیا تھا۔ لیکن
ے اڈیشن میں اختصار کے نقطۂ نظر سے یہ باب نکال دیا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل
کی مذہبی، سماجی اور ادبی زندگی کو سمجھنے کے لیے یہ باب بہت اہم ہے۔ زیر نظر اڈیشن کی تیسری
ں باب کو شامل کیا گیا ہے اور حواشی میں انجم صاحب نے دلّی کے ان مشاہیر کے بارے میں اہم
فراہم کی ہیں۔ ان اردو اور فارسی کتابوں کے صفحات کے ساتھ حوالے دیے ہیں جن میں ان حضرات
ہے۔

اسلم پرویز

آثار الصنادید مرتبہ خلیق انجم

محترمی ومکرمی، سلام وسپاس

آپ کا بے حد گراں قدر عطیہ آثار الصنادید، تین جلدوں میں، ستائش خیز اور حیرت افزا ہوا۔ اپنی گوناگوں اور سخت گیر اور عرق ریز مصروفیتوں کے باوجود آپ نے اس مہتم بالشان کام کے لیے وقت نکال لیا آپ کی ہمتِ مردانہ پر ہزار آفریں۔ کتابت اور طباعت اور تصویریں اور نقشے کتاب کی اہمیت کا دم بھر رہے ہیں۔ یہاں تک تو مبارکباد کا عمل دخل تھا۔

اب سپاس گزاری کا موڑ آتا ہے۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھ کو اپنی بیش بہا تصنیف سے نوازا۔ آپ کے ذہن اور قلم سرعتِ رفتار کے رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں۔

آپ جب اتنا کچھ کر سکتے ہیں تو اب کسی کے پاس کوتاہ قلمی یا تنک نگاری کے لیے مصروفیت کا عذر باقی نہیں رہا۔ ایسی مثال قائم کرنا کیا روا ہے جو بہتوں کی طمانیت برہم کر دے اور بے شمار افراد کو اپنی نظر میں گرا دے؟ اس اہم سوال پر سطورِ تبریک و تشکر کو ختم کرتا ہوں۔ والسلام

(ڈاکٹر خلیق انجم کے نام جناب سید حامد کا خط)

"آثار الصنادید" دلّی کی تاریخ، تہذیب، ثقافت اور قدیم عمارات سے متعلق سید احمد خاں کی اہم تالیف ہے۔ دراصل جمع ہے لفظ صندید کی جس کے معنی ہیں سردار، بہادر، جواں مرد۔ گویا اس کتاب میں دلّی کی ان عظیم شخصیتوں کی کوشش کی گئی ہے جو دلی کی شاندار تاریخ کا حصہ رہی ہے اور اس بازیافت کی کوشش ان عظیم شخصیتوں کے چھوڑے ان آثار یا نشانات کے وسیلے سے کی گئی ہے جن میں ان کی تہذیب، ثقافت اور ان کی بنائی ہوئی عمارات شامل ہیں۔ کے دوسرے نشانات کے مقابلے میں عمارات کی حیثیت دیرپا، واضح اور روشن نشانات کی ہے۔ شاید اسی "آثار الصنادید" کے مولف سید احمد خاں نے بھی اپنی کتاب میں دلّی کے آثار قدیمہ پر خصوصی توجہ دی ہے۔ "آثار الصنادید" دو اڈیشن سید احمد خاں کی زندگی ہی میں شایع ہو چکے تھے۔ پہلا اڈیشن ۱۸۴۷ء میں مطبع سید الاخبار سے اور دوسرا میں مطبع سلطانی سے شایع ہوا تھا۔ سید احمد خاں نے خود ہی پہلے اڈیشن کے مقابلے میں دوسرے اڈیشن میں خا اور تخفیف کر دی تھی اور اس کے ساتھ ہی کچھ اضافے بھی کیے تھے۔ پہلا اڈیشن چھ سو صفحات پر مشتمل تھا جب کہ د اڈیشن کی ضخامت صرف دو سو چوراسی صفحات رہ گئی۔ پہلے اڈیشن کا چوتھا باب جو دو سو چھیالیس صفحات پر مشتمل تھا میں دلی کی مختلف آبادیوں کا بیان تھا دوسرے اڈیشن سے خارج کر دیا گیا لیکن دوسرے اڈیشن کے پہلے باب

اور ایک باب دلی کی عمل داریوں کے مختصر حالات میں شامل کردیا گیا۔ ان دو اڈیشنوں کے بعد آثار الصنادید چار بار اور شایع ہوئی
۱۸۹۸ء میں مطبع نول کشور سے ۱۹۰۴ء میں نامی پریس کانپور سے ۱۹۶۵ء میں سینٹرل بک ڈپو دلی سے ۱۹۶۶ء میں پاکستان ہسٹاریکل
سوسائٹی کراچی سے۔ لیکن ان چاروں اڈیشنوں میں تدوین متن کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس لیے ان کی حیثیت صرف
ری پرنٹ کی سی ہے۔ اس اعتبار سے آثار الصنادید کا موجودہ اڈیشن جسے اردو اکادمی دلی نے تین جلدوں میں شائع کیا
ہے اور جس کے مرتب ڈاکٹر خلیق انجم ہیں خصوصی توجہ کے لائق ہے۔ خلیق انجم نہ صرف یہ کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل
سکریٹری اور اردو تحریک کے ایک سرگرم رکن ہیں بلکہ وہ اردو تحقیق کے میدان میں بھی ایک معتبر حیثیت کے مالک ہیں
اس کے ساتھ ہی وہ ایک متنی نقاد بھی ہیں۔ آثار الصنادید کو ترتیب دے کر انھوں نے تدوین متن کا ایک ایسا عمدہ نمونہ
پیش کیا ہے جس کی مثالیں ہمارے ہاں انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مرتب کردہ احمد علی خاں
یکتا کا فارسی تذکرہ "دستور الفصاحت"، رشید حسن خاں کا مرتب کیا ہوا "فسانۂ عجائب" اور خود خلیق انجم کے چار جلدوں میں
(جس کی چوتھی جلد طباعت کے مراحل میں ہے) مرتب کیے ہوئے خطوطِ غالب اردو میں تدوین متن کی بہترین مثالیں ہیں
آثار الصنادید کی زیرِ نظر اشاعت اسی سلسلے کا ایک اور سنگِ میل ہے۔

سید احمد خاں جیسی تاریخی شخصیت کے ساتھ خلیق انجم کا موازنہ کرنا یہاں ہمارا مقصد نہیں لیکن اتنا تو کہا ہی
جاسکتا ہے کہ بہت سی باتیں دونوں میں مشترک ہیں۔ خلیق انجم کا دائرہ کار انتہائی وسیع ہے وہ ادبی، سماجی، انتظامی اور
سیاسی بھی، غرض تمام امور میں دلچسپی رکھتے ہیں اور سب میں یکساں طور پر مصروف رہتے ہیں۔ ان کے ادبی مشاغل بھی
گوناگوں قسم کے ہیں۔ انھوں نے تراجم بھی کیے ہیں ادبی شخصیتوں پر سوانحی مضامین یا خاکے بھی لکھے ہیں۔ تنقیدی مقالات
بھی لکھے ہیں ہفت روزہ "ہماری زبان" اور دو ماہی "اردو ادب" کی ادارت بھی ان کے ذمے ہے لیکن ان کا اصل میدان تحقیق
ہے۔ "مرزا محمد رفیع سودا" اور "غالب اور شاہان تیموریہ" جیسی کتابوں کے ذریعے وہ اردو دنیا سے اپنی تحقیقی صلاحیتوں کی
داد حاصل کر چکے ہیں۔ متنی تنقید کا شعبہ بھی ایک اعتبار سے تحقیق سے ہی علاقہ رکھتا ہے۔ کچھ عرصے پہلے خلیق انجم کی ایک
کتاب "متنی تنقید" شایع ہوئی تھی۔ یہ اس موضوع پر اردو میں پہلی کتاب تھی۔ اسی کتاب کی تالیف کے ساتھ شاید خلیق انجم
نے اپنی اس صلاحیت کو بھی دریافت کیا کہ وہ تدوین متن جیسا کام کرنے کے اہل ہیں۔ چناں چہ متنی تنقید کی اشاعت کے بعد
سے ہی خطوطِ غالب" کی باقاعدہ ترتیب کی طرف ان کی توجہ مبذول ہوگئی جس کا آغاز ایک طرح سے "غالب کی نادر تحریریں" کی
اشاعت کے ساتھ پہلے ہی ہوچکا ہے اسی سلسلے کی دوسری کڑی اب ہمارے سامنے آثار الصنادید کی شکل میں ہے۔ سید
احمد خاں نے آثار الصنادید کی تالیف کے سلسلے میں دلی کے دشت و دیار کی بہت خاک چھانی تھی۔ یہی کام آثار الصنادید
کی ترتیبِ نو کے دوران اپنا کیمرہ گلے میں لٹکا کر خلیق انجم نے بھی کیا ہے۔ سید احمد خاں کے زمانے میں دلی میں سڑکوں
کا جال تو اس طرح پھیلا ہوا نہیں تھا کوئی بھی تاریخی عمارت میلوں دور ہی سے اپنے وجود کا پتا ضرور دے دیا کرتی تھی۔
آج کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی دلی میں یہ تمام آثار قدیمہ کنکریٹ کی فلک بوس عمارتوں کے جنگل میں کھو سے گئے ہیں
اور نئے جغرافیے میں اب ان آثار قدیمہ کے نشان اور پتے بھی بدل گئے ہیں۔ "آثار الصنادید" کی ترتیب کا کام ہاتھ
میں لینے کے بعد سید احمد خاں کے متن کو سامنے رکھ کر جو بنیادی نکتہ اس کتاب کے مرتب خلیق انجم کی سمجھ میں آیا اور جس
کی طرف اشارہ اس گفتگو کے آغاز میں بھی کیا جاچکا ہے وہ یہی تھا کہ صنادید کے آثار میں شاید سب سے زیادہ اہمیت
ان آثار کو حاصل ہے جو قدیم تاریخی عمارتوں یعنی آثار قدیمہ کی شکل میں ہمارے سامنے ہوتے ہیں اس لیے کہ یہی صنادید
کے سب سے ٹھوس اور مستند نشانات ہیں اور پھر ان قدیم عمارات میں ان عمارتوں کے اپنے وجود کے ساتھ کہیں کہیں

پتھروں پر کندہ ایسی عبارتیں بھی موجود ہیں جو تاریخی دستاویزوں کی حیثیت رکھتی ہیں اور جو مخطوطات کے مقابلے میں محفوظ
مستند ترین اور دیرپا ہوتی ہیں۔ اسی لیے آثار الصنادید کی ترتیب کے آغاز ہی میں خلیق انجم کی چھٹی حس نے انھیں آثا
میں غیر معمولی دل چسپی لینے پر مائل کیا یہاں تک کہ آثار الصنادید کی اشاعت سے قبل ہی آثار قدیمہ کے موضوع پر ان کی
کتابیں 'دلی کے آثار قدیمہ' اور 'دلی کی درگاہ شاہ مرداں' منظر عام پر آگئیں۔ ان دو کتابوں کے ذریعے انھوں نے گویا
ثابت کر دکھایا کہ وہ تحقیق اور تدوینِ متن جیسے دقیق کاموں کے ساتھ ساتھ آثار قدیمہ جیسے مشکل اور پیچیدہ موضوع پر
دست رس رکھتے ہیں، چناں چہ جس طرح سید احمد خاں نے پوری دلی کی خاک چھان کر ان آثار قدیمہ کو دریافت کیا تھا جو
اسی طرح ان آثار قدیمہ کی دریافت نو کے سلسلے میں خلیق انجم نے بھی کچھ کم خاک نہیں چھانی خاص طور پر یوں بھی کہ آثا
اب میلوں دور سے اپنے وجود کا پتا نہیں دیتے۔

"آثار الصنادید" کی تینوں جلدوں کو سامنے رکھیے تو اس کام کے دو روشن پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک "آثار الصنا
کا متن جس کی تدوین "آثار الصنادید" کے پہلے اور دوسرے اڈیشن کی بنیاد پر کی گئی ہے اور تقریباً چار سو اردو، فارسی اور انگریز
کتابوں کی مدد سے متن کے متعلقات سے بحث کرتے ہوئے مبسوط اور مفصل حواشی اور دو سو صفحات کا جامع مقدمہ لکھا
ہے اس اڈیشن کا دوسرا روشن پہلو یہ ہے کہ اس میں آثار قدیمہ کو وہی خصوصی اہمیت دی گئی ہے جو خود سید احمد خاں
دی تھی۔ اسی سلسلے کے حواشی اور تعلیقات کیمرے سے لی گئی اُن آثار قدیمہ کی وہ تصاویر ہیں جن میں یہ آثار قدیمہ ہو بہو اپنی
شکل میں کتاب کے صفحات میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ یہ صورتِ حال آثار الصنادید کے پہلے اڈیشن میں شامل آثار قدیمہ کی قلمی
شکلوں کے مقابلے میں زیادہ مستند اور بہتر ہونے کے ساتھ ساتھ سائنٹیفک بھی ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی مرتبہ "آثار الصنادید" کے موجودہ اڈیشن میں پہلے اڈیشن کے پہلے باب کی شمولیت
جو سید احمد خاں کے دوسرے اڈیشن میں نہیں تھا۔ اور دوسرے اڈیشن کے آخری باب کی برقراری جو سید احمد خاں کے
پہلے اڈیشن میں شامل نہیں تھا خلیق انجم کی ذاتی پسند یا ناپسند کے تحت نہیں بلکہ متنی تنقید کے تقاضوں کے
مطابق ہے۔

"آثار الصنادید" کی موجودہ تین جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد بارہ سو چھ ہے ان میں "آثار الصنادید" کے
متن لگ بھگ ساڑھے سو صفحات ہیں بقیہ ساڑھے چار سو صفحات میں کتاب کا مقدمہ، حواشی، اشاریہ اور کتابیات
وغیرہ شامل ہیں۔ یہ کام کتاب کے مرتب ڈاکٹر خلیق انجم کے لیے اور کتاب کے ناشر اردو اکادمی دلی دونوں کے
مایۂ ناز ہے خلیق انجم نے "آثار الصنادید" 'دلی کے آثار قدیمہ' اور 'دلی کی درگاہ شاہ مرداں' جیسی کتابوں کے ذریعے دلی
آثار قدیمہ سے متعلق اپنی جس دل چسپی اور مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ
ہوگی اگر وہ آگے چل کر دلی کی 'نئی آثار الصنادید' لکھنے کا بیڑہ اٹھا لیں۔

شمیم جہاں

کردار کا غازی

ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی باغ و بہار اور جانِ محفل شخصیت سے تو میں بہت پہلے سے واقف تھی، لیکن ان کو بہت قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور برتنے کا موقع مجھے انجمن میں آنے کے بعد ہی ملا۔ وہ ایک جادوئی شخصیت کے مالک ہیں۔ میں نے انھیں ہر دن، ہر پل، موقع اور وقت کے مطابق ہر روپ اور ہر رنگ میں دیکھا ہے۔ کبھی مفکر، کبھی ادیب کی حیثیت سے قلم کی نوک سے موتی بکھیرتے ہوئے، کبھی مقرر، اور مقرر بھی ایسا جو اپنی سادہ سحر بیانی سے بگڑے ہوئے مجمع کو پل بھر میں اپنی گرفت میں کر لے۔ کبھی اخبار (ہماری زبان) کی پیکنگ کرتے ہوتے۔ کبھی اسٹاف اور چپراسیوں کے ساتھ مزدوروں کی طرح کام کرتے ہوئے۔ نہ بڑی حیثیت کے لوگوں کے سامنے بچھتے ہوئے دیکھا ہے نہ کم حیثیت کے لوگوں پر رعب جماتے ہوئے بلکہ جب وہ کم حیثیت کے لوگوں سے انھیں کے لب و لہجہ میں بات کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ وہ انھیں میں سے ایک ہیں۔ ان کے اس رویہ سے اکثر انجان لوگوں کو اپنے بارے میں غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ لیکن جب وہ اعلیٰ سوسائٹی کی محفلوں میں شریک اور عالمانہ گفتگو میں مصروف ہوتے ہیں تو انھیں پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ یہ وہی خلیق انجم ہیں جنھیں کل جامع مسجد کے چوراہے پر بھائی خلّو سے انھیں کے لب و لہجے میں کرخنداری زبان میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ "ابے مان جا یار کیا کر رہا ہے۔"

بہت سے لوگ بڑی تہہ دار شخصیت اور غضب کی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایک وقت میں اپنی ایک ہی صلاحیت کو بروئے کار لانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ لیکن خلیق صاحب کمپیوٹر صفت انسان ہیں اور انھیں اپنی کئی صلاحیتوں کو بیک وقت استعمال کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ یعنی وہ کئی محاذ پر ایک ساتھ لڑ سکتے ہیں۔ دفتر میں کام کرتے ہوئے میں نے ان کا بغور جائزہ لیا ہے کہ وہ بغیر کسی تھکاوٹ اور چڑچڑاہٹ کے ایک ہی وقت میں دس کام کرتے ہیں۔ ایک طرف باہر سے آئے ہوئے مہمانوں سے ادب کے دقیق اور اہم نکتوں پر بحث کر رہے ہیں۔ دوسری طرف انجمن کے کارکنوں کو کام کے سلسلے میں ہدایات دے رہے ہیں۔ ایک ساتھ انگلش اور اردو کے خطوط ڈکٹیٹ کرا رہے ہیں۔ ڈاک بھی دیکھ رہے ہیں، فون پر بھی بات ہو رہی ہے۔ درمیان میں کوئی اہم کام یاد آگیا تو اٹھ کھڑے ہوئے اور غائب . . . . لیکن پانچ منٹ بعد پھر موجود۔

ڈاکٹر صاحب دائیں ہاتھ کی دوسری انگلی میں انگوٹھی پہنے رہتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ انگوٹھی دوسرے ہاتھ کی انگلی میں پہنچ جاتی ہے۔ دفتر آکر جب وہ اس انگوٹھی کو اسی ہاتھ کی انگلی میں ڈالتے ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہتی ہے تو اس وقت ڈاکٹر صاحب دفتر کے کسی صاحب کو بلا کر کسی اہم کام کی ہدایت دیتے ہیں۔ میں نے کئی بار

ان کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تو پوچھا۔ یہ آپ کیا کرتے ہیں تو انھوں نے بتایا کہ رات میں مجھے جب کوئی ایسا کام یاد آجاتا ہے جس کا ہونا بہت ضروری ہے تو میں ایسا کرتا ہوں تاکہ بھول نہ جاؤں۔"

ڈاکٹر صاحب کو میں نے کبھی آرام سے کھانا کھاتے ہوئے نہیں دیکھا، کام کے دوران ہی کھانا بھی کھا لیتے ہیں اگر اتفاق سے کھانے پر ان کے ساتھ کوئی موجود نہیں ہے (جو اکثر ہوتے ہیں) تو وہ کمرے میں یا کمرے سے باہر ٹہل ٹہل کر کھانا کھاتے ہیں اور اس دوران ان کا دھیان کھانے میں نہیں ہوتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اہم مسئلے پر سوچ رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں خلا میں گھورتی کسی گہری فکر میں ڈوبی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے وہ کوئی گتھی سلجھا رہے ہوں۔

کسی نے (نام اس وقت مجھے یاد نہیں) نپولین کے بارے میں کہا تھا کہ اس کی کامیابی اور ترقی کا راز یہ تھا کہ اسے اپنی نیند پر قابو تھا۔ شاید یہ سچ ہے کیوں کہ نیند کا گھوڑا اتنا سرکش ہوتا ہے کہ اس پر قابو پانا واقعی مشکل ہے لیکن جس انسان کے بس میں اس کی نیند ہے، اس کی صحت، اعصاب، دل و دماغ اور وقت اس کے قبضے میں ہے اور جس کے قبضے میں یہ تمام دولت ہے وہ واقعی کامیاب ترین انسان ہے۔ یہ کمال بھی خلیق صاحب کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحب دوپہر کو سوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ دو منٹ کے لیے بھی سو سکتے ہیں اور دو گھنٹے کے لیے بھی۔ گویا وہ کوئی مشین ہیں جس میں سوئچ فٹ ہیں ضرورت کے مطابق وہ سوئچ آن، آف کر دیتے ہیں۔

میں نے انجمن جنوری ۱۹۷۵ء میں بک ڈپو انچارج کی حیثیت سے جوائن کی۔ انجمن میں میرا پہلا دن میرے لیے اہم ہے۔ اہم اس لیے کہ آج جو کچھ بھی ہوں اس کا بیج اسی دن بویا گیا تھا۔ دفتری کام کا تجربہ صفر، تعلیم نامکمل اور ڈاکٹر صاحب میرے عزیز۔ اس ناطے میں نے امید کی تھی کہ مجھے بروقت ان کی سپورٹ حاصل رہے گی اور کام چل جائے گا۔ لیکن انھوں نے مجھے وقتی اور جھوٹے سہارے دینے سے انکار کر دیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے میرے ہاتھ میں بغیر ہتھیار دیئے مجھے جنگ میں کود پڑنے کا حکم دے دیا تھا۔ تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ انھوں نے مجھے وہ سہارا نہیں دیا تھا جو اس وقت تو اچھا لگتا لیکن مجھے سہاروں کا محتاج بنا دیتا۔ ڈاکٹر صاحب نے وہی کیا جو ایک مخلص انسان کرتا ہے۔ انھوں نے میری تعلیم جاری رکھنے میں مجھے ہر ممکن سہولت مہیا کی اور دفتر کا ہر کام سیکھنے پر مجبور کیا۔ چاہے وہ پبلیکیشن کا کام ہو، ٹائپ ہو یا اخبار کی ایڈیٹنگ اور پرنٹنگ۔ مجھے لکھنے کی ترغیب بھی ڈاکٹر صاحب سے ملی۔ انھوں نے مجھے وقتی سہارا نہ دے کر جو خود اعتمادی اور خود پر بھروسہ کرنا سکھایا ہے، میں ان کی احسان مند رہوں گی۔ یہ مضمون لکھتے ہوئے آج مجھے یہ موقع ملا ہے کہ چند لائنوں میں صدقِ دل سے ان مہربانیوں کا شکریہ ادا کروں جو اس وقت بہت ناگوار گزرتی تھیں۔

جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ مجھے سروس کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پہلا موقع تھا کہ کوئی سروس جوائن کرنے جارہی تھی، کچھ خوشی، کچھ اندیشے، کچھ خوف کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ ایک سلپ ہاتھ میں لیے ہوئے (جسے اپوائنٹمنٹ لیٹر کہنا چاہیے)، جو انجمن کے جنرل سکریٹری کی طرف سے ملا۔ تصور میں تھا کہ باقاعدہ آفس ہوگا، کمرہ، میز، کرسی وغیرہ وغیرہ۔

خیر ہم دفتر میں داخل ہو گئے اور داخل بھی کیا۔ داخل تو اس وقت ہوتے جب کوئی دروازہ ہوتا۔ یوں کہیے کہ جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں انجمن کا دفتر یعنی اردو گھر کی بلڈنگ تعمیر ہو رہی تھی لیکن تعمیر کا کام رکا ہوا تھا کیوں کہ انجمن کے پاس پیسے نہیں تھے اینٹ، پتھر اور ریت کے ڈھیر پر سے گزر کر عمارت کے اس ڈھانچے تک پہنچی، جہاں انجمن کا دفتر ٹین کے سائبان ڈال کر بنایا گیا تھا۔ سب سے پہلے میری ملاقات انجمن کے ایک کارکن اشتیاق حسین رضوی صاحب (مرحوم) سے ہوئی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ آفس میں لے گئے۔ آفس کا کمرہ اچھا خاصا کباڑخانہ تھا۔ اونچی نیچی کچی زمین، سیلن جگہ جگہ جالے لگے ہوئے۔ اٹا اپھنا کر پانچ میزیں لگائی گئی تھیں، جن پر ہرے گہرے رنگ کے تاریخی قسم کے میز پوش پڑے

ہوئے تھے جگہ جگہ نیلی اور سرخ روشنائی کے داغ، ہر رنگ میل کی وجہ سے سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دھوبی کو بھی ان کی خدمت کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ دروازے کے سامنے ایک میز کرسی پڑی تھی جس پر ایک صاحب بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔ اشتیاق صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا اور بتایا کہ آپ اسسٹنٹ سکریٹری ڈاکٹر ناظر حسین نقوی ہیں انھوں نے میرا بغور جائزہ لیا ان کے چہرے پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور تھوڑے توقف کے بعد فرمایا "جی ہاں ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے آپ کے بارے میں مجھے" سامنے والی میز پر دبلے پتلے سے ایک صاحب تشریف رکھتے تھے ان سے تعارف ہوا۔ انھوں نے اپنے چشمے کو تھوڑا اور نیچے کھسکا کر (جو پہلے ہی سے ناک پر رکھا ہوا تھا) چشمے کے اوپر سے جھانکا اور ایک لمبی ہوں سے مجھے خوش آمدید کہا۔ معلوم ہوا کہ آپ لائبریرین صاحب ہیں۔ اور اردو کے مشہور ادیب ایم حبیب خاں صاحب ہیں۔ اور ہم آگے بڑھ گئے جہاں اسی قسم کے دوسرے لوگوں سے تعارف ہوا۔

ڈاکٹر صاحب کو انجمن کا چارج سنبھالے ہوئے چند مہینے ہوئے تھے اور انھوں نے ابھی مکمل طور پر کالج نہیں چھوڑا تھا۔ کچھ وقت انھیں کالج میں دینا پڑتا تھا۔ تقریباً دو بجے ڈاکٹر صاحب تشریف لائے اور انھوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا بہت چھوٹا سا سیلن بھرا کمرہ، چھوٹی سی میز، چند پرانی کرسیاں، ایک طرف کتابوں کا ڈھیر، کمرے کی چھت میں ایک بانس میں بلب لٹکا ہوا۔ یہ کمرہ تھا، ان جنرل سکریٹری صاحب کا جنھوں نے ایجوکیشن منسٹری سے ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے کو خیرباد کہہ کر انجمن کا سکریٹری ہونا پسند کیا تھا۔ چوں کہ میں نے ان کے وہ ٹھاٹھ بھی دیکھے تھے اس لیے کچھ عجیب سا لگا۔ اب سوچتی ہوں شاید اردو سے عشق ہی انھیں یہاں کھینچ کر لایا تھا۔ کچھ دیر بعد دیر انھوں نے کہا آئیے میں آپ کو کام بتا دوں، وہ ایک اور کھنڈر نما کمرے میں مجھے لے گئے جہاں کتابوں کا ڈھیر (کتابوں کا وہ اسٹاک جو علی گڑھ سے منتقل ہوا تھا) چھت تک لگا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ یہ بک ڈپو ہے اور آپ کو یہ کتابیں سارٹ آوٹ کرنی ہیں۔ اس کے بعد ہم عمارت سے نکل کر باہر آئے (جہاں آج کل خوب صورت لان ہے اور رنگ برنگے پھول کھلتے رہیں) وہاں پرانے رسائل، اخبارات اور کتابوں کا ڈھیر تھا۔ دوسری طرف لائبریری کی الماریوں کی قطاریں تھیں میں وہیں بیٹھ کر کتابیں سارٹ آوٹ کرنے لگی۔ پانچ بجے دفتر سے لوگ جانے لگے لیکن ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں کام کر رہے تھے "ہماری زبان" کے دفتر میں اشتیاق صاحب اور عبداللہ کمال صاحب بھی بیٹھے تھے۔ میں بھی کام کرتی رہی۔ تقریباً آٹھ بجے ڈاکٹر صاحب باہر آئے، کہنے لگے بھئی میں تو یہاں نو دس بجے تک کام کرتا ہوں آپ چلی جایا کیجیے اور ایک بہتر پروہ بیٹھ کر کتابیں چھانٹنے لگے اب یہ روز کا معمول تھا کہ ڈاکٹر صاحب اپنا کام ختم کرنے کے بعد میرے ساتھ کتابیں چھانٹ کر لگواتے۔ اشتیاق صاحب بھی ہمارے ساتھ کام میں شریک رہتے۔ اس طرح رفتہ رفتہ بک ڈپو کی شکل نکلنے لگی۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا کہ اردو گھر کا اس وقت صرف ڈھانچہ تھا۔ اسے عمارت کی شکل دینا جوئے شیر لانا تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں سب سے بڑی وجہ انجمن کے تعمیر کا کام جاری رکھنے کے لیے فنڈ نہیں تھا۔ آمدنی کے وسائل محدود ترین تھے۔ گورنمنٹ کی ایڈ برائے نام تھی، جس میں اب اس میں بہت تھوڑا اضافہ ہوا ہے۔ کتابوں کی فروخت سات ہزار روپے سالانہ۔ کل ملا کر چھ ہزار روپے ماہانہ آمدنی تھی۔ تین ہزار اسٹاف کی تنخواہوں پر صرف ہوتے تھے اور تین ہزار دیگر اخراجات پر۔ نہ گورنمنٹ سے تعمیر کا کام جاری رکھنے کے لیے کسی مدد کی توقع تھی۔ اور نہ ہی اردو والوں سے مالی یا اخلاقی تعاون کی امید۔ اعتراضات کی بھرمار، سازشوں کے جال پھیلے ہوئے تھے۔ جو لوگ سکریٹری شپ کے امیدوار تھے ان کی کوشش تھی کہ اردو گھر کی عمارت مکمل نہ ہونے پائے سکریٹری کو ناکام کرنے کے لیے انھوں نے اخبارات کے ذریعے سکریٹری کے خلاف مہم چلا رکھی تھی۔ پٹنہ کے ایک اخبار میں چھپا "انجمن کے سکریٹری رنگے ہاتھوں اردو گھر اپنی بیوی کے نام کراتے ہوئے پکڑے گئے"

چوں کہ انجمن کا دفتر علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوا تھا اس لیے علی گڑھ سے آتے ہوئے اسٹاف کے لوگوں میں بھی ناراضگی اور بے چینی تھی۔ کچھ لوگوں کے عدم تعاون کی وجہ سے دفتر کے ماحول میں گھٹن سی پیدا ہو گئی تھی۔ اسٹاف کے بعض لوگ لوئر کلاس ملازمین کو سکریٹری کے خلاف بھڑکاتے اور ڈراتے رہتے تھے۔ جس سے ان میں خوف و ہراس پیدا ہو گیا تھا اور خود کو سکریٹری کے ہاتھوں میں غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس سے ان بڑے بڑے حضرات کی پول کھل گئی جو سکریٹری کے خلاف سازش کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ یہ لوگ اسٹاف کے کچھ ایسے ممبروں کو آلۂ کار بنا کر جو انجمن کی منتقلی سے دل برداشتہ تھے اور نئے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ نہیں کر پا رہے تھے، اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہوا یوں۔ ایک دن ایک چپراسی بہت پریشان سا میرے پاس آیا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہتے ہوئے ڈر رہا تھا میں نے اس سے کہا تم مجھے بتاؤ کیا بات ہے، ڈرو مت! میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گی وہ شاید فیصلہ کن موڈ میں تھا۔ اس نے کہا "بی بی ہم چپراسیوں کو نوکری سے نکال کر ڈاکٹر صاحب کو کیا ملے گا۔ ہم تو یہاں آکر خود دکھی ہیں، رات بھر یہ سوچ کر نیند نہیں آتی کہ پتا نہیں نوکری کب چلی جائے۔ آج پھر فلاں صاحب نے کہا کہ دو تین دن میں ڈاکٹر صاحب نوکری سے نکال دیں گے"۔ میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی اس لیے مجھے تعجب ہوا یہ سن کر۔ میں ڈاکٹر صاحب کے مزاج سے بھی واقف تھی کہ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ ڈاکٹر صاحب ایسا نہیں کریں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ اسے میری بات سے کچھ اطمینان ہوا تو اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس ان خطوط کی رجسٹری کی رسیدیں محفوظ ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے خلاف وزیر اعظم اور دوسرے لوگوں کو بھیجے گئے تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے ذکر کیا انھوں نے عادت کے مطابق لاپرواہی سے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ "جب کسی کو نکالنے کی بات ہی نہیں ہوئی تو کوئی کیوں کہے گا۔ اس کو غلط فہمی ہوئی چھوڑیے"۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ بات مذاق میں اڑا دی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت بڑی سازش تھی۔ جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

اندرونی اور بیرونی سازشیں، دشواریاں اور مشکلات کے باوجود جو قدم قدم پر راہیں مسدود کر رہی تھیں، ڈاکٹر صاحب ہمت نہیں ہارے کیوں کہ ان کے سامنے ایک مقصد تھا جس کے لیے انھوں نے چوبیس چوبیس گھنٹے کام کیا۔ گرمیوں کی تپتی دوپہر میں اسکوٹر پر بھوکے پیاسے مارے مارے پھرتے تھے۔ اتنی بھاگ دوڑ کرنے پر بھی ابھی تک ایسی کوئی پارٹی نہیں ملی تھی جو انجمن کو فائنینس کرنے پر تیار ہو۔ ٹھیکیدار کے تقریباً ڈھائی لاکھ روپے قرض تھے۔ ٹھیکیدار کا آدمی جب پیسے مانگنے آتا تو ڈاکٹر صاحب چھپ جاتے اور وہ گالیاں دے کر واپس چلا جاتا۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہنستے ہوئے تین چار لوگوں کے ساتھ دفتر آئے۔ معلوم ہوا کہ یہ کنارا بینک کے لوگ ہیں جو انجمن کو پانچ یا چھ لاکھ ایڈوانس (قسطوں میں) دینے پر تیار ہو گئے ہیں۔ اس دن ڈاکٹر صاحب کی خوشی کا کیا عالم تھا نہ پوچھیے۔ ڈاکٹر صاحب نے راتوں رات خود کاغذات تیار کیے۔ ایگریمنٹ ہوا کہ آٹھ مہینے کے اندر فلور تیار کر کے دینا ہوگا۔ تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے رات دن کام کر کے چھ مہینے ہی میں گراؤنڈ فلور تیار کرا کے کنارا بینک کو قبضہ دے دیا۔

یہ ڈاکٹر صاحب کی کامیابی اور انجمن کی خوش حالی کی پہلی سیڑھی تھی۔ میں اس ضمن میں اس محترم ہستی کا ذکر ضرور کروں گی جن کی حوصلہ افزائی، محبت، خلوص اور شفقت نے ڈاکٹر صاحب کے حوصلے اور عزم کو پختگی اور توانائی بخشی۔ وہ ہستی جناب کرنل بشیر حسین زیدی کی ہے۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔

اب یہ سلسلہ جاری ہو گیا ایک کے بعد ایک پارٹی ایڈوانس دیتی رہی اور فلور تیار ہوتے گئے اور ۱۹۷۷ء کا وہ دن بھی آگیا جب سابق وزیر اعظم جناب مرارجی ڈیسائی نے اردو گھر کے خوبصورت ہال میں اردو گھر کا افتتاح کیا۔ بڑی تعداد میں اردو والے جمع ہوئے۔ اس تقریب میں اردو دوستوں کے چہرے دیکھنے والے تھے، کوئی حیرت زدہ تھا، کسی کا منہ لٹکا ہوا تھا اور کوئی بے حد خوش۔

مفتی عتیق الرحمان صاحب مرحوم کا ریمارک مجھے آج بھی یاد ہے۔ مرحوم انجمن کی مجلس عام کے ممبر تھے۔ بجائے اس کے کہ وہ ایک بزرگ اور اردو دوست کی حیثیت سے خلیق انجم صاحب کی پیٹھ تھپتھپاتے انھوں نے فرمایا تھا: "اتنی بڑی عمارت بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ انجمن کے دفتر کے لیے دو تین کمرے کافی تھے یہ فضول خرچی ہے۔"

عمارت مکمل ہو گئی تھی لیکن مالی دشواریاں بدستور تھیں کیوں کہ بلڈنگ کی تعمیر کے لیے جو ایڈوانس رقم لی گئی تھی وہ مع سود کے کرائے میں کٹ رہی تھی۔ گورنمنٹ کی گرانٹ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے بہت کم تھی۔ البتہ بک ڈپو کی سیل اب سات ہزار سے بڑھ کر ستر ہزار روپے سالانہ ہو گئی تھی۔ علی گڑھ میں اسٹاف کی تنخواہیں بہت کم تھیں ڈاکٹر صاحب نے اس میں وقتاً فوقتاً خاطر خواہ اضافے کیے اور آج انجمن کے گریڈ تمام اردو اداروں سے زیادہ ہیں بلکہ وہ ہیں جو سینٹرل یونیورسٹی کے ملازمین کو دیے جاتے ہیں۔

آمدنی محدود اور اخراجات زیادہ تھے۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو کافی مشکلات پیش آتی تھیں لیکن ایسا دن کبھی نہیں آیا کہ مہینے کی پہلی تاریخ کو اسٹاف کو تنخواہ نہ ملی ہو۔ بارہا انھوں نے گھر سے رقم لا کر اسٹاف کو تنخواہیں تقسیم کیں لیکن خود انھوں نے دو سال تک انجمن سے تنخواہ نہیں لی۔ کسی ادارے کے لیے اتنی قربانی کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حالات بہتر ہونے پر انجمن نے ڈاکٹر صاحب کو وہ رقم ادا کر دی۔

کسی بھی ادارے کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کی قیادت کن ہاتھوں میں ہے۔ جہاں کسی ادارے کو کامیابی کی طرف لے جانے کے لیے عقل و فراست کی ضرورت ہوتی ہے وہاں جذبہ ایثار، خلوص، ایمانداری، محنت، لگن اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کا تعاون حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

میری رائے میں اسٹاف۔ ادارے اور ادارے کے سربراہ دونوں کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسٹاف کے ذہنی انتشار، ناراضگی اور بے چینی سے جہاں ادارے کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے وہاں نت نئی سازشیں بھی جنم لیتی ہیں۔ اسٹاف کا تعاون کامیابی اور عدم تعاون ناکامی کی طرف لے جاتا ہے۔ کامیاب حکمراں دماغوں پر نہیں دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔

یہ انجمن اور انجمن کے اسٹاف کی خوش نصیبی ہے کہ خلیق انجم صاحب انھیں کامیاب سربراہوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے درمیان کوئی دیوار نہیں رکھی اور انھیں اپنے اسٹاف کا بھرپور تعاون اور پیار حاصل ہے۔ ورنہ دفتروں میں باس نے قدم رکھا کہ سناٹا چھا گیا۔ چپراسی کمرے کے دروازے پر بلڈاگ کی طرح بیٹھا ہے۔ ہر آدمی ڈرا سہما با ادب باملاحظہ ہوشیار اندر جاتا ہے۔ باس مارتا کم ہے ڈراتا زیادہ ہے۔ باس کو دیکھتے سردوں میں گالیاں پڑ رہی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ نہ کوئی بلا وجہ ڈرتا ہے نہ دروازے پر چپراسی ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب کبھی دفتر نہیں آتے تو ہر شخص ان کی کمی محسوس کرتا ہے۔ یہ اسی لیے ہے کیوں کہ ڈاکٹر صاحب اپنے اسٹاف کے ساتھ اپنے بچوں جیسا سلوک کرتے ہیں کبھی کسی کو بلا لیا ورنہ ہر ایک کی میز پر خود ہی پہنچ جاتے ہیں۔ کسی پر کوئی مصیبت پڑی تو ہر ممکن مدد کرنے کو تیار۔ ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی ہے کہ ان کے اسٹاف کے لوگ ترقی کریں۔

یہی نہیں کہ وہ اسٹاف کے ساتھ ایسا کرتے ہیں بلکہ ان کا سلوک باہر کے لوگوں کے لیے بھی یہی ہے۔ انھوں نے نئے لکھنے والوں کی جتنی حوصلہ افزائی کی ہے کم لوگ ایسا کرتے ہیں۔ نہ جانے کتنے غریب طالب علم ایسے ہیں جن کی تعلیم کا خرچ ڈاکٹر صاحب برداشت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آج جس مقام پر ہیں وہاں تک پہنچنے میں ان کی محنت، ہمت اور حوصلے کے علاوہ نہ جانے کتنے لوگوں کی دعائیں شامل ہیں جن کی ڈاکٹر صاحب نے مدد کی ہے۔ ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا آپ کو بھی سنا دوں۔

مارچ ۱۹۸۵ء میں ایک ایکسیڈنٹ میں ڈاکٹر صاحب کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ علاج کے سلسلے میں وہ روزانہ کلیان ہوسپٹل جاتے تھے۔ وہاں ایک غریب لڑکا جس کی ٹانگ حادثے میں کٹ گئی تھی اور وہ مصنوعی ٹانگ لگوانا چاہتا تھا۔ لیکن

اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب اسے اپنے ساتھ دفتر لے آئے اور دفتر کے ایک صاحب کو پیسے دے کر اس کے ساتھ بھیج دیا کہ اس لڑکے کا کام کرادیجیے۔

ایک اور صاحب جو ادیب تھے، ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اردو گھر آتے اور ڈاکٹر صاحب ان کو خاموشی سے کچھ رقم دے دیتے۔ اگر اتفاق سے ڈاکٹر صاحب دفتر میں موجود نہیں ہوتے تو وہ شام تک ان کا انتظار کرتے تھے۔ اور نہ جانے کتنے لوگوں کو ڈاکٹر صاحب نے ملازمت دلائی۔

اس میں شک نہیں کہ انجمن کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ علامہ شبلی، مولوی عبدالحق اور آل احمد سرور جیسے لوگ اس کے سکریٹری رہ چکے ہیں۔ ان محترم حضرات نے ناسازگار حالات میں انجمن کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اس کے وقار کو بھی قائم رکھا۔ لیکن اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ خلیق انجم صاحب نے انجمن میں نئی روح پھونکی ہے۔ اس کی کارکردگی کو پہلے سے کہیں بہتر بنایا ہے۔ اور اس کو دوسری اچھی آرگنائزیشن سے آنکھ ملانے کی جرأت بخشی ہے۔ اس سلسلے میں جناب صباح الدین عبدالرحمٰن ہمیشہ خلیق صاحب کی تعریف کرتے تھے۔ انھوں نے اس موضوع پر ''معارف'' کے دو ادارئیے بھی لکھے۔

ایک بہت ہی گھسا پٹا پرانا قول ہے کہ ہر مرد کی ترقی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ قول چاہے کتنا پرانا کیوں نہ ہو لیکن اس کی سچائی اور معنویت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خلیق انجم صاحب کی کامیابی زندگی کے پیچھے بھی ایک خاتون کا ہاتھ ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں کوئی سنسنی خیز انکشاف کرنے جارہی ہوں۔ نہیں۔ وہ خاتون ان کی بیگم اور ہماری بھابی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی گھریلو زندگی بہت پُرسکون ہے۔ بیگم انجم کبھی ڈاکٹر صاحب کی راہ میں دیوار نہیں بنتیں۔ بلکہ ڈاکٹر صاحب نے ان کے اور بچوں کے حصے کا بہت سا وقت انجمن کو دیا ہے۔

انجمن آج ایک منظم اور مستحکم ادارہ ہے اور اس قابل ہے کہ اپنی ادبی اور دوسری سرگرمیاں بڑے پیمانے پر چلا سکے اگر کبھی انجمن کی تاریخ لکھی گئی تو خلیق انجم صاحب کا دور اس تاریخ کا روشن ترین باب ہوگا۔

محمد ضیاء الدین انصاری

مرزا محمد رفیع سودا

(تنقید و تحقیق کی قابلِ تقلید مثال)

ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب "مرزا محمد رفیع سودا" اعلا ترین تحقیقی کارنامہ ہے۔ اردو تحقیق اور تنقید کی قابلِ تقلید مثال ہے
دا اردو شاعری کے عظیم الشان ایوان کے ایک اہم ستون ہیں۔ طبیعت کی روانی، فنی مہارت اور کلام کی پختگی میں وہ
بنا ثانی نہیں رکھتے۔ انھوں نے جملہ اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کی اور اشہبِ فکر کی جولانی دکھائی۔ اس میں کوئی شک
ہیں کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کی اردو شاعری کو سب سے زیادہ سودا نے ہی متاثر کیا۔ انھوں نے زبان و بیان کے
ہت سے تجربے کیے اور اردو شاعری کے مزاج کو زندہ دلی اور شگفتگی عطا کی۔ اسی سبب سے انھیں مسلم الثبوت
سناد کی حیثیت حاصل ہوئی۔ انھیں اپنی زندگی میں جتنی شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی وہ فقید المثال ہے اور اس کی
ظیر اردو شاعری کی تین سو سالہ تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ دوسرے فنکاروں اور ادبی شخصیتوں کی طرح اپنی
شہرت کے قصرِ بلند تک پہنچنے کے لیے انھیں موت کے دروازے سے گزرنا نہیں پڑا۔ اپنی زندگی ہی میں وہ
عندلیبِ خوش نغمہ گلشنِ روزگار، گلِ سرسبد محافل اشعارِ یگانہ، انتخاب نسخہ صاحب کمالے، معنی یاب بے ہمتا، فخرِ
سخن گویاں، صیادِ غزالانِ سخن و سرآمد نکتہ سنجانِ این فن، شاہین زباں، استادِ استادانِ کامل و قادر، سرآمد شعرائے زماں
یکتازانِ میدان سخنوری، جیسے اعلیٰ خطابات سے نواز دیے گئے تھے۔ ان کی اس مقبولیت اور ہردلعزیزی کے باعث ان کے
دیوان کے بے شمار نسخے تیار ہوئے جن میں بہت سا الحاقی کلام بھی شامل ہو گیا۔

امتدادِ زمانہ سے سودا کی شہرت پر اثر پڑا اور رفتہ رفتہ اس میں کمی واقع ہوتی گئی۔ میر تقی میر، مرزا غالب اور علامہ
اقبال جیسے اساتذۂ فن اور نابغۂ روزگار شخصیات کی شہرت کے آگے سودا کی شہرت کسی حد تک ماند پڑ گئی۔ ہمارے
نقادوں اور سوانح نگاروں نے ان کو نظر انداز کر دیا اور ان پر اس طریقہ سے کام نہیں ہوا جس انداز سے کہ دوسرے شعرا اور
اور اہم ادبی شخصیات پر کیا گیا۔ سودا پر جامع کام سب سے پہلے شیخ چاند نے کیا۔ انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں سودا پر
تحقیقی کام کیا اور ان کے سوانح اور فن پر تحقیقی و تنقیدی مقالہ پیش کیا جسے بعد میں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد نے ۱۹۳۶ء
میں کتابی شکل میں شائع کیا۔ اردو میں غالباً یہ پہلا مقالہ ہے جو جدید تکنیک اور سائنٹیفک اصول پر ترتیب دیا گیا
تھا۔ شیخ چاند مرحوم کی اس کاوش کو اس زمانے میں بہت سراہا گیا تھا۔ اس کے ممتحن نواب صدر یار جنگ مولانا
حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا:

"پورے مقالے کے مطالعے کے بعد میری یہ پختہ رائے ہے کہ شیخ چاند صاحب نے مقالہ نگاری

فراہمی مواد، مطالعہ، بحث اور ترتیب و بیانِ مطالب میں پوری کاوش اور محنت کی ہے اور اس طرح پوری تیاری کے ساتھ مقالہ لکھا ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ فاضل مقالہ نگار نے بڑے سلیقہ سے مقالہ ترتیب دیا تھا اور تمام دستیاب ماخذ سے بھرپور فائدہ اٹھا کر تحقیق کا حق ادا کیا تھا۔ اور تنقید اور تحقیق دونوں کے جوہر دکھائے تھے۔ اس کے تقریباً تین دہوں کے بعد اسی موضوع پر ڈاکٹر خلیق انجم کی کتاب "مرزا محمد رفیع سودا" منظرِ عام پر آئی۔ یہ بھی تحقیقی کام ہے۔ شیخ چاند اور ڈاکٹر خلیق انجم دونوں کا موضوع ایک ہے اور دونوں کے کام کی نوعیت بھی یکساں ہے۔ لیکن اندازِ بیان اور ترتیب کی نوعیت میں فرق ہے۔ اس مرحلہ پر ایک ظاہر بیں یہ سوال کر سکتا ہے کہ جب اس موضوع پر جامع اور مبسوط کام کیا جا چکا ہے پھر مزید کام کی کیا ضرورت اور کیا جواز۔ لیکن اس کا جواب بڑا سہل اور شافی ہے۔ یہ بات تو اب روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ تحقیق میں کوئی بات حتمی نہیں ہوتی۔ کوئی رائے حرفِ آخر کا درجہ نہیں رکھتی۔ تحقیق کا کام ہر لمحہ جاری و ساری رہتا ہے یہ ایک عملِ مسلسل ہے جس کا کہیں خاتمہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسا جادہ ہے جس پر ہر وقت تگ و دو اور پائمردی جاری رہتی ہے۔ اس سے نئے نئے امکانات روشن ہوتے ہیں، ادب کا کارواں آگے بڑھتا ہے اور تلاش و تحقیق کو فروغ ملتا ہے۔

بیسویں صدی کے ربعِ اول تک سودا سے متعلق جتنا مواد دستیاب تھا، شیخ چاند نے اس سے حتی المقدور فائدہ اٹھایا۔ لیکن اس کے بعد جو مواد منظرِ عام پر آیا اور جو نئے ماٰخذ دریافت ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے ان سب سے استفادہ کیا اور نئی تحقیقات کی روشنی میں اپنی تحقیق کو زیادہ جامع اور زیادہ ہمہ گیر بنایا۔ اس کے علاوہ موجودہ دور میں اردو تنقید کے رویے میں بھی تبدیلیاں آئی ہیں۔ اب یہ فن زیادہ سائنٹیفک، زیادہ منضبط اور زیادہ مربوط ہو گیا ہے اور متنی تنقید سے تو انقلابِ عظیم رونما ہو گیا ہے۔ انجم صاحب کو متنی تنقید پر کامل عبور حاصل ہے۔ اس کا ثبوت اُن کی تالیف "متنی تنقید" سے بھی ملتا ہے۔ انجم صاحب محض نظریاتی ناقد ہی نہیں، عملی تنقید نگار بھی اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ زیرِ نظر تالیف میں آپ نے متنی تنقید کے بھی اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ تحقیقی مقالہ "مرزا محمد رفیع سودا" کے عنوان سے ۱۹۶۶ء میں انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے شائع ہوا۔ یہ ۴۹۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ پورے مقالے کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں سوانح اور دوسرے حصے میں سودا کی ادبی خدمات کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں اصل موضوع کے پس منظر کے طور پر اٹھارہویں صدی کے سیاسی اور سماجی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے اندراجات کے اہم عنوانات پر نظر ڈالنے سے اس مقالہ کی جامعیت اور ہمہ گیری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

۱۔ سیاسی و سماجی حالات	۲۔ سوانح	۳۔ تنقید۔
۴۔ سودا کی غزل گوئی	۵۔ قصیدہ نگاری	۶۔ ہجو گوئی
۷۔ شہر آشوب	۸۔ مثنوی نگاری	۹۔ واسوخت
۱۰۔ رباعیات	۱۱۔ پہیلیاں	۱۲۔ سودا تذکرہ نگاروں اور نقادوں کی نظر میں
۱۳۔ سودا کی تصانیف	۱۴۔ سودا کا الحاقی کلام	۱۵۔ سودا کا غیر مطبوعہ کلام
۱۶۔ سودا کے شاگرد	۱۷۔ حاصلِ سخن	۱۸۔ اشعارِ سودا کا انگریزی ترجمہ

ان عنوانات کے تحت ذیلی عنوانات قائم کیے گئے ہیں جن کی تعداد ڈیڑھ سو سے متجاوز ہے۔ پورے موضوع کو ان

ان کے تحت تقسیم کرکے جملہ مباحث کو بڑے سائنٹیفک طریقے پر پیش کیا گیا ہے۔

سودا کے سوانح کے سلسلے میں سب سے اہم مسئلہ ان کی تاریخ ولادت کا ہے۔ مختلف سوانح نگاروں اور تذکرہ
نگاروں نے ان کی ولادت کی مختلف تاریخیں بتائی ہیں۔ اس لیے حتمی طور پر ان کے سالِ ولادت کے تعین کا کام مشکل ہو گیا
شیخ چاند اور ڈاکٹر خلیق انجم دونوں نے اس مسئلہ سے تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ دونوں نے دستیاب ماخذ کی مدد سے ان
کے سالِ ولادت کا تعین کیا ہے۔ لیکن یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ دونوں الگ الگ نتیجوں پر پہنچے ہیں۔ شیخ چاند نے
قیاس آزاد، قایم چاند پوری اور میر حسن کے فراہم کردہ معلومات کا تجزیہ کر کے ۱۱۰۶ھ متعین کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے
قایم چاند پوری کی رائے کو راجح مانا ہے۔ انجم صاحب نے ان سے اختلاف کیا ہے۔ انھوں نے آبِ حیات، مخزن نکات،
کلیات سودا مرتبہ عبدالباری آسی، گلِ رعنا مؤلفہ حکیم سید عبدالحئی، خوش معرکۂ زیبا، سودا مؤلفہ شیخ چاند، دلی کا
دبستانِ شاعری، مضامین قاضی عبدالودود اور باغِ معانی مؤلفہ نقش علی، جیسے بنیادی اور اہم ماخذ کی ورق گردانی کر کے
یہ اخذ کیا ہے کہ سودا ۱۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے:

> "نقش علی نے بقول قاضی عبدالودود مرزا کا ترجمہ ۱۱۸۴ھ کے لگ بھگ لکھا ہے جس سے مرزا کا سنِ
> ولادت ۱۱۱۸ھ نکلتا ہے۔ اس کی تصدیق میر حسن کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ مرزا ۱۱۸۵ھ میں
> فرخ آباد سے فیض آباد گئے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ مرزا آج کل نواب شجاع الدولہ
> بہادر کی سرکار میں وسیلۂ فنِ شاعری سے سرفراز ہیں۔ نواب شجاع الدولہ کا انتقال آخر ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ
> میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ میر حسن نے مرزا کا ترجمہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان لکھا ہے جب مرزا فیض آباد
> آئے تھے۔ میر حسن اکثر ان سے ملاقات کرتے تھے جس کا ذکر انھوں نے خود تذکرے میں کیا ہے۔
> اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مرزا کا ترجمہ لکھتے ہوئے انھوں نے مرزا سے ان کی عمر
> دریافت نہ کی ہو۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مرزا کا سنِ شریف ستر سال کو پہنچ گیا ہے۔ چونکہ یہ
> عبارت ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان لکھی گئی ہے اس لیے مرزا کا سنِ ولادت ۱۱۱۵ھ اور
> ۱۱۱۹ھ کے درمیان قرار پاتا ہے۔ اگر ہم ۱۱۱۸ھ تسلیم کریں تو نقش علی کے بیان کی بھی تصدیق ہو جاتی
> ہے۔ اس لیے ۱۱۱۸ھ ہی قرار دینا مناسب ہے۔" (ص ۶۱۔ ۶۲)

شیخ چاند اور ڈاکٹر خلیق انجم کی تحقیقوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا اور اسے حرفِ آخر تصور کرنا دشوار کام ہے
ڈاکٹر خلیق انجم صاحب نے کوئی آخری بات نہیں کہی ہے، انھوں نے بہت ہی محتاط انداز اختیار کیا ہے اور صرف اتنا ہی کہنے
پر اکتفا کیا ہے کہ ۱۱۱۸ھ ہی قرار دینا مناسب ہے۔" اس سلسلہ میں حتمی طور پر اتنا تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس اہم مسئلہ
پر انجم صاحب نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ شیخ چاند نے اس پر صرف نصف صفحے میں بحث کی ہے جب کہ ڈاکٹر
خلیق انجم نے اس موضوع پر پانچ صفحے صَرف کیے ہیں۔

انجم صاحب نے سودا کے مختلف ناموں سے بھی بحث کی ہے۔ شیخ چاند نے اس مسئلہ کو موضوعِ بحث نہیں
بنایا۔ اردو تذکروں میں سودا کا نام مختلف طریقوں پر ملتا ہے۔ کسی نے ان کا نام مرزا رفیع لکھا ہے، کسی نے مرزا رفیع الدین
کسی نے مرزا محمد رفیع بتایا ہے۔ خود سودا اپنا نام محمد رفیع لکھا کرتے تھے۔ انجم صاحب نے ان سب پر تنقیدی نظر
ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اصلاً ان کا نام مرزا محمد رفیع تھا۔ یہ بات اس لیے اور بھی زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ ان
کے والد کا نام مرزا محمد شفیع تھا۔

شیخ چاند نے سودا کے تلمذ کے سلسلہ میں بھی کسی خاص تحقیق سے کام نہیں لیا ہے۔ ان کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سودا نے صرف شیخ ظہور حاتم سے ہی مشورہ سخن کیا۔ اس کے برخلاف انجم صاحب نے تلاش و جستجو کرکے ان کے چار استادوں کے نام بتائے ہیں۔ اردو شعرا کے تذکروں سے انھوں نے شاہ حاتم کے علاوہ خان آرزو، سلیمان قلی خاں وداد، اور نظام الدین احمد صانع کے اسمار بھی تلاش کیے ہیں جن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ کسی نہ کسی مرحلہ میں سودا نے ان سے مشورہ سخن کیا تھا۔ اس طرح خلیق انجم صاحب کی تالیف کے پہلے حصہ میں، جو سر تحقیق پر مبنی ہے۔ اس میں تفحص و تلاش اور تحقیق و جستجو کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ انجم صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی قول کو محض اس لیے نہیں تسلیم کر لیتے کہ وہ فلاں شخص کا قول ہے اور وہ چوں کہ ایک عظیم محقق ہے اس لیے اس کی رائے یقیناً درست ہوگی۔ وہ تحقیق کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور جو بات اس کسوٹی پر پوری نہیں اترتی وہ اسے تسلیم نہیں کرتے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں ہر مرحلہ پر انھوں نے مستند محققین اور صف اول کے ناقدین کی فراہم کردہ معلومات پر محاکمہ کیا ہے اور جس رائے نے ان کے متجسس ذہن اور ناقدانہ مزاج کو اپیل نہیں کیا۔ اس کو انھوں نے بلا تامل رد کردیا ہے۔ انھوں نے محمد حسین آزاد سے اختلاف کیا، بابائے اردو مولوی عبدالحق کی رائے سے اختلاف کیا، انھوں نے حکیم سید عبدالحئی، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی جیسے مستند محققین کی بہت سی آرا کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا اور ان سے اختلاف کیا۔ حتیٰ کہ بہت سے معاملات میں وہ شیخ چاند کی تحقیقات سے متفق نہ ہوسکے۔ یہ کام انھوں نے ادبی دیانت داری سے کیا اور دلائل و براہین کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر واضح کیا۔

اساتذہ کے ساتھ انجم صاحب نے سودا کے شاگردوں کا بھی تذکرہ کیا ہے اور ان کے ۲۶ تلامذہ کے احوال بیان کیے ہیں۔ یہ حصہ کافی طویل ہے۔ اور کتاب کے ۸۰ صفحات کو محیط ہے۔ شیخ چاند نے اسے یکسر نظر انداز کردیا ہے۔ انجم صاحب نے یہاں بھی بڑی تلاش و تحقیق سے کام لیا ہے۔ ان کی تحقیق کا یہ حصہ بھی اہم اور جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ اس کو علیحدہ کتابی شکل میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس میں تمہید کے طور پر اردو میں استادی اور شاگردی کی روایت کی افادیت، اہمیت اور معنویت پر بھی بھرپور تبصرہ کیا گیا ہے جس سے کتاب کی وقعت میں اضافہ ہوتا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ نقد و نظر پر مبنی ہے۔ اس میں سودا کے اردو اور فارسی کلام اور نثری تصانیف کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں اُن کی غزل گوئی، قصیدہ نگاری، ہجو گوئی، مرثیہ نگاری، قطعات، رباعیات اور شہر آشوب وغیرہ سے علیحدہ علیحدہ بحث کی گئی ہے۔ سودا قصیدہ گو اور ہجو گو کی حیثیت سے اتنے زیادہ مشہور ہوگئے ہیں کہ دوسری اصناف سخن میں ان کی مہارت ماند پڑگئی ہے حالاں کہ ان میں بھی انھوں نے اپنی مہارت اور قدرتِ کاملہ کے جوہر دکھائے ہیں۔ انجم صاحب نے ان سب سے جداگانہ بحث کی ہے اور ہر حیثیت سے ان کے مقام اور قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔

ایک کامیاب نقاد کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنی تنقید میں مکمل غیر جانبداری کا ثبوت دے۔ نہ کسی کی بے جا تعریف کرے اور نہ کسی کو غیر ضروری طور پر ہدفِ تنقید بنائے۔ نقد ایک مشکل فن ہے۔ اس کا ایک کنارا قصیدہ گوئی سے ملتا ہے اور دوسرا ہجو گوئی سے۔ تنقید اگر محض تعریف بن جائے تو نثری قصیدہ بن جاتی ہے اور اگر غیر ضروری نکتہ چینی کی جائے گی تو وہ تنقیص بن کر ہجو گوئی کی حدود میں داخل ہوجائے گی۔ اس لیے ناقد کا فرض ہے کہ وہ صراطِ مستقیم پر قایم رہے۔ وہ اپنے ممدوح کی بے جا تعریف کرنے سے گریز کرتے ہیں، نہ خواہ مخواہ کسی کی عیب جوئی کرتے ہیں۔ میانہ روی ان کا خاص وصف ہے۔ سودا کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے میانہ روی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ وہ سودا کو اردو کا عظیم ترین قصیدہ گو شاعر تو مانتے ہیں، لیکن انھیں بہترین غزل گو تسلیم نہیں کرتے۔

قصیدہ نگاری کے بارے میں انجم صاحب کی رائے ہے کہ :

"سودا کا ادبی کارنامہ قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی ہے۔ جن میں داخلیت کی بجائے خارجیت کو دخل ہوتا ہے۔ ان سے قبل ہی یہ دونوں اصناف اردو میں رائج تھیں لیکن یہ صرف سودا تھے جنھوں نے ان کو باقاعدہ فن کی صورت دی اور فنی اعتبار سے ان اصناف کو انتہا پر پہنچا دیا۔ یہ بات بغیر کسی شک و شبہ کے کہی جا سکتی ہے کہ اس میدان میں ان کا کوئی ثانی نہیں" (ص ۱۶۵)

اور جگہ وہ لکھتے ہیں :

"سودا اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قصیدہ نگاری کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے انتہائی بلندی پر پہنچایا۔ سودا کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں صرف ذوق وہ شاعر ہیں جنھیں دوسرا بڑا قصیدہ گو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن قصائد ذوق میں وہ تنوع، نیرنگی، قدرتِ اظہار اور وہ پُرشور انداز بیان نہیں ہے جو اچھے قصیدے کے لیے لازم ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جنھوں نے سودا کو انفرادیت بخشی ہے۔ قصیدے کا اندازِ بیان دوسرے اصنافِ سخن سے مختلف ہوتا ہے۔ مضمون آفرینی، جوشِ بیان، پختگی کلام، مشکل زمینیں، شکوہِ الفاظ، روانی و سلاست اور جدتِ ادا وغیرہ قصیدے کی خصوصیات ہیں۔ سودا کے قصاید میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ قصیدے کے لیے خارجیت بہت ضروری ہے۔ سودا کے عہد میں دلی کے تقریباً تمام شاعروں کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ سودا پہلے شاعر ہیں جو اپنے اندر کی دنیا سے نکل کر باہر آئے ہیں" (ص ۲۴۳)

تاہم ایک غزل گو کی حیثیت سے وہ سودا کو یہ درجہ دینے کو تیار نہیں۔ ان کی غزل گوئی کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :

"سودا ایک عظیم شاعر تھے، لیکن عظیم غزل گو نہیں۔ اگر ان کی متاعِ فن غزل اور صرف غزل ہی ہوتی تو ان کا شمار اپنے دور کے دوسرے درجے کے شاعروں میں ہوتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سودا کا مزاج اور ذہن غزل کو راس نہیں آ سکتا تھا۔ ان کی شوخ، چنچل اور طراری سے بھرتی ہوئی ہمہ رنگ طبیعت اس درد مندی سوز و گداز اور برشتگی و خستگی کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی جو غزل کی خصوصیات ہیں۔ سودا کے ہاں جذبات کی وہ صداقت و معصومیت، خلوص، خود سپردگی اور دردمندی نہیں ہے جو لب و لہجہ میں نرمی اور گھلاوٹ اور انداز بیان میں سادگی و بے تکلفی پیدا کر کے شعر کو تیر و نشتر بنا دیتی ہے۔ قدرت نے سودا کو حزن و ملال اور ان کے لطیف احساسات سے محروم رکھا تھا۔ اس لیے وہ زندگی کی ٹھوس حقیقت یعنی غم کی آتشِ سیال کو الفاظ کے نرم و نازک سانچوں میں ڈھالنے سے معذور رہے" (ص ۱۶۴ - ۱۶۵)

اس نازک مرحلہ پر بھی انجم صاحب نے بڑی خوبصورتی اور چابکدستی سے جانبداری اور بے جا تعریف سے اپنے دامن کو بچا لیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سودا نے اردو غزل کو بہت کچھ دیا۔ انھوں نے اس کے دامن کو زورِ بیان، خارجیت اور نشاط آمیز لب و لہجہ جیسی اہم صفات سے مالا مال کیا۔ انجم صاحب نے سودا کی اس صفت کا کھلے دل سے اعتراف بھی کیا ہے۔ ان ہی خصوصیات کی بنا پر وہ سودا کو ایک عظیم غزل گو شاعر بھی بتا سکتے

تھے۔ لیکن یہاں بھی انھوں نے اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور غزل گو کی حیثیت سے ان کا وہی مقام متعین کیا جس کے وہ صحیح معنیٰ میں مستحق تھے۔ یہی روش انھوں نے دوسری اصناف سخن پر بحث کرتے ہوئے اپنائی ہے۔

انجم صاحب نے کلیات سودا کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے بھی بحث کی ہے۔ یہ بات پہلے ہی عرض کی جا چکی ہے کہ سودا کی مقبولیت کے باعث ان کے دیوان کے بہت سے نسخے تیار ہو گئے تھے۔ پہلے قلمی نسخے لکھے گئے اور بعد میں ان کی بنیاد پر مطبوعہ نسخے منظر عام پر آئے۔ ان میں سے بیشتر نسخے غیر مستند طریقہ پر تیار ہوئے۔ اور ناشروں نے بھی غیر ذمہ داری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے غیر معتبر نسخے شائع کیے۔ ان بے شمار قلمی نسخوں میں صرف دو ایسے ہیں جن کو محققین اور ناقدین معتبر اور مستند مانتے ہیں۔ ان میں سے ایک مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (حبیب گنج کلکشن) میں محفوظ ہے۔ اور دوسرا انڈیا آفس لندن میں۔ یہ نسخہ رچرڈ جانسن کے نام سے مشہور ہے۔ انجم صاحب نے ان دونوں نسخوں کا تعارف کرایا ہے۔ ان کی خصوصیات واضح کی ہیں، دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور تقریباً تیس صفحات میں ان کے مندرجات کا اشاریہ ترتیب دیا ہے۔ ان قلمی نسخوں کے علاوہ چند اہم مطبوعہ نسخوں سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں مطبع مصطفائی دہلی (۱۲۷۲ھ) نول کشور کانپور (۱۹۱۶ء) نول کشور لکھنؤ (مرتبہ عبدالباری آسی۔ ۱۹۳۳ء) کے مطبوعہ نسخے شامل ہیں۔ ان تمام نسخوں کے مشمولات کا تقابلی مطالعہ کر کے سودا کے الحاقی کلام کی نشاندہی کی ہے۔ یہ حصہ بھی انجم صاحب نے کافی محنت سے ترتیب دیا ہے۔

کتاب کا ایک اہم اور دلچسپ باب "سودا تذکرہ نگاروں اور نقادوں کی نظر میں" کے عنوان سے ہے۔ اس میں ابتدا سے لے کر موجودہ عہد تک سودا کے متعلق تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سب کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان میں سب سے پہلا تذکرہ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی کا گلشن گفتار تالیف ۱۱۶۵ھ ہے۔ جس میں سودا کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بعد جتنے بھی تذکرے تالیف کیے گئے ان سب میں سودا کے احوال ملتے ہیں۔ تذکرہ نگاری کا یہ سلسلہ لالہ سری رام کے خمخانہ جاوید اور مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی کے جواہر سخن تک ہے۔ ان تمام تذکروں میں سودا کے فن اور شخصیت سے متعلق بنیادی اور مفید معلومات ملتی ہیں۔ ان کے علاوہ ناقدین میں مولانا حالی، محمد یحییٰ تنہا، عبدالحق، رام بابو سکسینہ، پروفیسر رشید احمد صدیقی، سید عبداللہ، اور کلیم الدین وغیرہ نے اپنی تالیفات میں سودا کی شاعری اور دیگر ادبی خدمات پر اظہار خیال کیا ہے۔ خلیق انجم صاحب نے ایسی تمام تحریروں کو یکجا کر دیا ہے۔ یہ بڑا مفید کام ہے۔ اس کے ذریعہ کم سے کم وقت میں معمولی محنت سے سودا پر زیادہ سے زیادہ مواد دستیاب ہو جاتا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مرزا محمد رفیع سودا کے سوانح اور انتقاد پر ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ تالیف تلاش و تحقیق اور صحیح سمت میں محنت و کاوش کا بہترین نمونہ ہے یہ مستند تحقیق اور معتبر تنقید کی عمدہ اور قابل تقلید مثال ہے۔ انھوں نے سودا کی قادر الکلامی اور فنی مہارت کا جس حسین انداز سے جائزہ لیا ہے اور ان کے کلام پر جس غیر جانبدارانہ، بلند معیاری اور سائنٹیفک انداز میں محاکمہ کیا ہے اس سے سودا کی قدر و قیمت اور عظمت کا احساس بڑھ جاتا ہے اور یہی مؤلف کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

سید منظور احمد

اردو تحریک و تنظیم کا ایک منفرد و معتبر نام ڈاکٹر خلیق انجم

بابائے اردو نے مولانا الطاف حسین حالی پر جو مضمون لکھا ہے وہ ہماری یونیورسٹی میں داخل نصاب ہونے کی وجہ سے گزشتہ
ئی برسوں سے پڑھتے پڑھاتے میرا پسندیدہ مضمون بن گیا ہے. اب اس کو پڑھتا ہوں تو غیر شعوری طور پر ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی
د تازہ ہو جاتی ہے. اس مضمون میں عبدالحق صاحب نے مولانا حالی کی دو اہم خوبیوں کا ذکر کیا ہے. ایک سادگی، دوسرا درد دل،
لیق صاحب میں بھی میں نے ان دونوں خوبیوں کو پایا اور متاثر ہوا خصوصیت کے ساتھ آخر الذکر خوبی ——— میں یہاں ان کی
بیوں کے تعلق سے کچھ قلمبند کروں گا. آپ کے تخلیقی و تحقیقی سفر کے تعلق سے کچھ نہیں لکھوں گا. اس لیے کہ اس پر ضرور دوسرے
کار لکھیں گے اور اس لیے بھی کہ آپ کی تمام تصانیف اور تالیفات رجو دو درجن سے زیادہ ہیں، پر لکھنا بہت مشکل کام ہے.
یے اتنا کہنے کی جسارت کروں گا کہ آپ کا تخلیقی سفر قابل قدر ہے اور قابل تقلید بھی. درس و تدریس کو خیر باد کہنے کے بعد نہ
ف تحریک و تنظیم سے اپنا رشتہ استوار کیا بلکہ تخلیقی و تحقیقی کام کو بھی برابر جاری رکھا. آپ کے تخلیقی کام کے مقدار، معیار
رفتار کو دیکھتے ہوئے بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے بہت سے افراد کو پیچھے چھوڑ دیا ہے ان کی کتابوں کی مقبولیت کا
عالم ہے کہ پاکستان سے ان کی کتابوں کے کئی قانونی اور غیر قانونی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں. پچھلے سال ان کی مرتبہ خطوط غالب
ی تین جلدیں انجمن ترقی اردو، پاکستان سے شائع ہوئی ہیں.

خلیق صاحب اسماً ہی نہیں جسماً بھی خلیق ہیں. ہلکا سانولا رنگ، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، موٹی ناک، کلین
یو، نوی الجثہ، خوش گفتار، روشن خیال، علم دوست، دوست پرور، بلند عزم، متحرک و فعال، مردم شناس، ہمہ وقت
ک صاف، دُھلے منجھے، کسی زمانے میں پکے نمازی تھے، اب دونوں عید کی نمازیں عیدگاہ میں پابندی سے پڑھتے ہیں،
یہ ڈاکٹر خلیق انجم جنھوں نے کبھی اپنے نام کے آگے دہلوی نہیں لکھا اور نہ ڈگری کے آگے علیگ لکھ کر علیگی ثابت کرنے کی
کوشش کی.

خلیق صاحب کی مرتب کردہ تمام کتابوں کا میں مطالعہ کر چکا ہوں، اس لیے میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں
کہ آپ نے جن مشاہیر کے فکر و فن کو لباس نقاعطا کیا ہے، اس سے آپ کی تخلیقی و تنقیدی بصیرت اور سلجھے ہوئے ذوق کا بخوبی
اندازہ ہوتا ہے. اگر آپ کی معلومات ان اہل قلم پر نہ ہوتیں تو اتنی اچھی اور ضخیم کتابوں کا منظر عام پر لانا دشوار نہیں تو مشکل ضرور
تھا. کتابوں کی طباعت و نفاست، ترتیب و تہذیب کا جہاں تک تعلق ہے. اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کام میں آپ
ماہر ہیں. انجم صاحب کا یہ کام بھی لائق ستایش ہے کہ آپ نے نہ صرف اپنی مرتب کردہ تصانیف کے حسن کا خیال رکھا بلکہ انجمن
سے شائع کردہ تمام مطبوعات کے حسن کو بھی دوبالا کیا. آج برصغیر میں انجمن کی مطبوعات ہر لحاظ سے مستند و معتبر سمجھی جاتی ہیں. آپ
کا ایک اور اہم تاریخی کارنامہ یہ بھی ہے کہ آپ نے ملک بھر کے اردو ناشروں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا اور ان کی ایک کل ہند

انجمن قائم کی۔

آپ کی ہمدردی کے تعلق سے ایک آنکھوں دیکھا واقعہ ملاحظہ کیجیے۔ دو تین سال قبل کرناٹک اردو اکادمی کے زیر اہتمام شہر بنگلور میں مولانا آزاد پر ایک کل ہند سمینار منعقد ہوا تھا۔ جس میں شرکت کے لیے خلیق صاحب، ڈاکٹر ظ۔ انصاری، پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر نجم ہبت اللہ وغیرہ کو زحمت دی گئی تھی۔ خلیق صاحب سمینار سے ایک دن پہلے ہی بنگلور پہنچ چکے تھے ان کے اعزاز میں ریاستی انجمن نے ایک جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ جلسے کے اختتام پر شام کے کھانے کے لیے شہر کے ایک ہوٹل گئے۔ ہوٹل کی خوبصورتی، پاکی صفائی نے متاثر کیا۔ کھانے کے دوران بیرے نے ایک چھوٹے سے لڑکے کو جو ہوٹل میں ملازم تھا بڑی بے دردی سے ایک تھپڑ لگایا۔ خلیق صاحب اس منظر کی تاب نہ لا سکے۔ اور تلملا اٹھے۔ خلیق صاحب نے اس واقعہ سے جو خلش محسوس کی اور آپ کی طبیعت میں جو تغیر رونما ہوا، اس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں ؎

اخفائے خلش دشوار بہت تشریح خلش ممکن ہی نہیں

چپ رہنے میں دم گھٹتا ہے کہتا ہوں تو دل تھرّاتا ہے

حسن اتفاق سے سمینار کے تمام شرکا کو اسی ہوٹل میں ٹھہرانے کا اہتمام کیا گیا تھا جب بیرے سے آپ کی آنکھیں چار ہوئیں تو خلیق صاحب پھر بے قرار ہو گئے۔ آپ کی بے تابی کو دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ واقعہ کل کا نہیں بلکہ ابھی ابھی ہوا ہے۔ آپ نے یہ واقعہ ظ۔ انصاری صاحب اور نجم صاحب سے کہا، بیرے سے پھر ایک بار مخاطب ہوئے اور کہا کہ جناب یہ لڑکے کے لکھنے پڑھنے، کھیلنے کودنے، ریڈیو اور ٹی وی دیکھنے کے دن ہیں۔ بدقسمتی سے وہ اس کم عمری میں ہوٹل کی ملازمت کر رہا ہے۔ آیندہ کبھی نہ مارنا۔ بیرا بھی بڑا شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ آپ نے اس لڑکے کو پاس بلایا، بڑے پیار و محبت سے باتیں کیں۔ کچھ رقم بھی دی، تو وہ لڑکا اتنا خوش ہو گیا، گویا اسے جنت مل گئی۔ نظام کلب کے رو برو جب ایک رئیس نے سائیس کو ہنٹر رسید کر دیے تو مولانا حالی نے بے تاب ہو کر کہا تھا "ہائے ظالم نے کیا کیا۔" کھانا بھی اچھی طرح نہیں کھایا اور قیلولہ بھی نصیب نہ ہوا، سائیس غالباً ہٹا کٹا ہو گا۔ مگر یہاں دبلا پتلا کمزور و کم سن لڑکا یہ واقعہ رات کا تھا اور خلیق صاحب نے مولانا حالی کی طرح جو درد و کرب کا اظہار کیا، اس سے ایسا محسوس ہوا کہ آپ نے رات بھر آرام نہیں کیا۔ میری حالیہ ملاقات آپ سے حیدرآباد میں ہوئی تھی، جہاں آپ کا قیام صدر انجمن محترم سید حامد صاحب کے ساتھ نظام کلب میں تھا۔ علیک سلیک کے بعد کافی دیر تک گفت و شنید ہوتی رہی۔ دورانِ گفتگو، آپ نے بتایا کہ آپ جب بھی حیدرآباد آتے ہیں تو آپ کا قیام نظام کلب میں ہوتا ہے۔ اس تاریخی مقام میں آپ سے مل کر مولانا حالی اور مولوی عبدالحق کی یاد تازہ ہو گئی۔

ع کیا بتائیں ہم تمھیں اس گھر میں کون آباد تھا

جب میں پہلی بار دلّی گیا تو خلیق صاحب سے ملاقات نہ کر سکا۔ اس وقت شہر میسور میں نہ انجمن کی شاخ تھی اور نہ میں انجمن کا معتمد اعزازی، انجمن کی رکنیت جب سے حاصل کی اسی دن سے گویا خلیق صاحب سے رشتہ جڑ گیا۔ اب جب بھی دلّی سفر ہوتا ہے تو اولین فرصت میں آپ سے "اردو گھر" پر تفصیلی ملاقات کرتا ہوں۔ پہلی بار جب ملا، تو بڑے خوش ہوئے دیر تک ریاستی شاخ کے جمود اور میسور شاخ کی سرگرمیوں کے تعلق سے پوچھا۔ چپراسی سے کہا کہ آپ بڑی دور سے آئے ہیں فوراً چائے لاؤ۔ چپراسی نے دیر کر دی تو خود گئے اور چائے پلائی۔ آپ کی شخصیت ہر اعتبار سے مجھ سے بلند و برتر انجمن کی شاخ کا سکریٹری اور آپ کل ہند انجمن کے جنرل سکریٹری۔ پہلی ملاقات میں ہی آپ کی سادگی اور شرافت سے متاثر ہوا۔ چلتے چلتے میں نے آپ کا وزیٹنگ کارڈ لیا جس پر نظر ڈالی تو آپ کی سادگی کا اظہار اس سے بھی ہوا۔ کارڈ پر آپ کا نام اور گھر کا پتا درج تھا، نام کے ساتھ نہ ڈاکٹر اور نہ عہدے کا ذکر۔

سادگی اور دردِ دل کے ساتھ خلیق صاحب کی دو اور اہم باتوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں "آپ سچ کہتے ہیں۔" یہ آپ کا
لام ہے۔ اگر آپ کے سامنے کوئی جھوٹ بھی کہے تو آپ اس وقت بھی کہیں گے "جی! آپ سچ کہتے ہیں" دوسری بات آپ
ندہ پیشانی کی۔ چاہے آپ کے سامنے لاکھ شکوے شکایتیں کریں، تلخی سے کام لیں، اس وقت بھی وہ خندہ پیشانی
ی پیش آئیں گے۔ ایک کانفرنس میں مندوبین نے مرکزی انجمن پر عموماً اور جنرل سکریٹری پر خصوصاً شکایتوں کی بوچھار
دی، جس میں بہت سی باتیں بے جا تھیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ انجمن کا اپنا پریس ہے۔ انجمن کے پاس کافی سرمایہ ہے وغیرہ۔
آپ کی پیشانی پر بل تک نہ آئے۔ اور ان سب سوالات کے جوابات بھی خندہ پیشانی سے دیتے رہے اور سب کو قائل
ردیا۔

خلیق صاحب کے سامنے بڑے سے بڑا مشکل سے مشکل مسئلہ در پیش ہو، وہ کبھی بھی گھبراہٹ اور بے چینی کا اظہار
ہیں کرتے۔ خاموشی اور یکسوئی سے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انجمن کی حالیہ کل ہند کانفرنس ۱۹۸۸ء
ہاراشٹر میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ہمارے ایک ساتھی کے ساز و سامان کی چوری ہوگئی۔ جن کی لاگت تقریباً ۴۰۰
پے ہوگی۔ میں نے اس کی اطلاع آپ کو دی، تو اس وقت بھی حسبِ معمول آپ کا چہرہ شگفتہ رہا اور خاموش رہے۔ ظاہر
ت ہے کہ کانفرنس کی تمام ذمہ داریاں جو تقریباً آپ ہی کے ذمے تھیں چھوڑ کر تھانہ کہاں جاتے اور رپورٹ کرنے پر بھی مال
بازیافت کی کیا توقع تھی؟ کانفرنس کے اختتام پر معلوم ہوا کہ آپ نے خاموشی سے اس کی تلافی یوں کردی کہ کچھ رقم ہمارے
دست کی نذر کردی۔

بدقسمتی سے آج ہمارے معاشرے کے ہر طبقے میں قول اور فعل کے تضاد کے جراثیم بری طرح سرایت کر گئے ہیں
ن کا نقصان زندگی کے ہر شعبے پر ہو رہا ہے۔ خلیق صاحب میں میں نے قول و فعل کا تضاد کم ہی پایا۔ آج کل ہمارے دانشور
ردو کے مقام و مرتبہ کے تعلق سے دھواں دھار تقریریں تو کرتے ہیں اور بڑے بڑے دعوے بھی، مگر جب عمل کا وقت آتا ہے
بے حسی اور تساہل سے کام لیتے ہیں۔ ہمارے ۹۰٪ دانشوروں کے بچے اردو زبان و ادب سے نابلد ہوتے ہیں۔ اگر سب
ے اپنے اپنے بچوں کو اردو، پڑھانے کا انتظام کیا ہوتا تو آج صورتِ حال قدرے بہتر ہوتی۔ اس معاملے میں خلیق صاحب
ھی مبارکباد کے مستحق ہیں اور ان کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے کہ انھوں نے اپنی گراں قدر مصروفیات کے باوجود اپنے بچوں
و نہ صرف اردو تعلیم سے آراستہ کیا بلکہ اپنے صاحبزادے کو اتنی اردو، سکھائی کہ اردو میں سب سے زیادہ نشانات حاصل
رکے دلی اردو اکادمی سے پہلا انعام پایا۔ انجمن کے حالیہ کانفرنس میں شرکت کے لیے میں تین چار دن قبل دلی پہنچ گیا۔
اردو گھر پہنچا، خلیق صاحب بڑے خوش ہوئے اور پہلے مندوب کو خوش آمدید کہا اور فرمایا آپ کو کانفرنس میں ایک اہم قرار
اد پیش کرنی ہوگی۔ میں نے کہا ضرور، آپ نے فوراً قرارداد لکھی "ان تمام افراد کا بائیکاٹ کیا جائے جن کے بچے اردو نہیں جانتے
ہ ردو اداروں، انجمنوں اور اکادمیوں کے سربراہ بن بیٹھے ہیں۔" میں نے آپ کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے آخری
جلاس میں قرارداد پیش کرنی چاہی تو بدقسمتی سے کئی مندوبین نے اس کی مخالفت کردی۔ خلیق صاحب نے مجھے دوسری قرارداد
ی جو گجرال کمیٹی رپورٹ کے نفاذ کے تعلق سے تھی۔ عجیب اتفاق کہ جب میں اس اہم قرارداد کو پیش کر رہا تھا محترم اندر کمار
گجرال تشریف لائے سے

خوابِ فردا کے ہیں مظہر آج کے یہ مشغلے
کل کی تیاری میں گویا آج ہیں یہ منہمک

خلیق صاحب نے اردو گھر کی تعمیر میں بڑی بڑی مشکلیں اور تکلیفیں اٹھائیں۔ مخالفوں کا سامنا کیا مگر آپ ان

سب کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے رہے اور اس عظیم منصوبے کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔ اردو گھر کی تکمیل سے انجمن کا وقار مرتبہ دوبالا ہو گیا اور انجمن خود کفیل ہو گئی۔ اردو داں طبقے میں اداروں کی تشکیل، تعمیر اور ترقی کا جذبہ تو کارفرما ہے ہی۔ ادارہ قائم کرنے کے بعد اس کو صحت مند اور جمہوری طریقے اور ڈھنگ سے چلانے کا فن بہت کم افراد میں پایا جاتا ہے خلیق صاحب کے طریقے، سلیقے اور حسنِ انتظام پر قربان جائیے کہ اردو گھر ایسا بنایا سجایا اور سنوارا کر دل سے دعا نکلتی ہے۔ ادھر آپ کے کمرے میں قدم رکھا، ادھر طبیعت باغ باغ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کسی وزیر کے کمرے میں آ گئے ہیں۔ خلیق صاحب نے اپنے اطراف فرض شناس، فعال اور بااعتماد رفقاء جناب ایم۔ حبیب خاں، محترمہ شمیم جہاں، جناب انیس احمد، جناب شاہد خاں۔ جناب مظہر نقوی اور جناب بارگی کی ایک ایسی ٹیم تیار رکھی ہے، جو ہمیشہ ہشاش بشاش، اپنے علمی ادبی و تنظیمی کاموں میں سرگرم رہتی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب خلیق صاحب کے گھر کے افراد ہیں۔ اردو گھر میں ہر جگہ ان کی ذاتی توجہ اور دلچسپی سے صفائی اور نفاست کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اردو گھر کو آپ اپنے گھر سے زیادہ پاک صاف رکھا ہے یہاں ایک واقعہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کار میں حیدرآباد سے آ رہا تھا۔ ساتھ میں شمیم جہاں صاحبہ اور جناب اطہر فاروقی تھے، شب کے دس بج رہے تھے۔ راؤز ایونیو سے ہمارا گزر ہوا تو کیا دیکھتے ہیں "اردو گھر" کی دوسری منزل بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو تعجب ہوا۔ فوراً کار رکی، تمام دروازے بند تھے، معلوم ہوا کہ بجلی چلی گئی تھی اور چپراسی جلدی میں لائٹ بند کیے بغیر چلا گیا۔ خلیق صاحب نے شمیم جہاں اور اطہر فاروقی کو بھیجا اور تمام لائٹ بند کروائے۔

خلیق صاحب کو انجمن سے والہانہ محبت ہے۔ گزشتہ ۱۶ سالوں سے آپ جنرل سکریٹری کے فرائض بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ انجمن کو نہ صرف ترقی دی بلکہ چار چاند لگائے۔ اس کا اعتراف نہ کرنا صداقت اور حقیقت سے انحراف کے مترادف ہوگا۔ میں آپ کو دعا دینے سے قبل آپ کی والدہ ماجدہ کو دعا دیتا ہوں کہ انھوں نے کسمپرسی اور غریبی کے باوجود آپ کو بے پناہ صلاحیتوں اور خوبیوں کا مالک بنایا، آپ کی تعلیم و تربیت کے لیے دنیا کی کوئی مصیبت ایسی نہیں تھی جو انھوں نے نہ اٹھائی ہو، جس کا ذکر خلیق صاحب نے بطورِ خاص فخریہ انداز میں اپنے سوانحی خاکے میں کیا ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ وہ اپنی جنرل سکریٹری شپ کی سلور جوبلی منائیں اور انجمن اپنا صد سالہ جشن۔

قدم قدم پہ حوادث نے رہنمائی کی
رواں ہے جادۂ منزل پہ کاروانِ خیال

شبیر احمد

معمار اردو

ڈاکٹر خلیق انجم یعنی خلیق احمد خاں ۱۹۷۴ء سے انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ہیں اور یہ بھی ان کے کئی کارناموں میں سے ایک کارنامہ ہے۔ اس لیے بھی کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے معتمدوں کی فہرست میں آج تک کسی کم عمر ادیب کا نام شامل نہیں ہوا۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق سے لے کر معمار اردو ڈاکٹر خلیق انجم تک جگمگاتے ستاروں کی ایک کہکشاں ہے۔

مسلم حلقہ اثر والے اداروں کی سیاست، سیادت، سربراہی یا قیادت قیامت سے کم نہیں ہے۔ مگر خلیق صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) کے ۱۶ برسوں سے سربراہ ہیں اور ابھی تک خدا کا شکر ہے کہ دامن داغدار نہیں ہوا۔ بڑی کامیابی سے سب کو ساتھ لے کر چل رہے ہیں ایسا نہیں کہ ان کے مخالفوں یا دوست نما دشمنوں کی تعداد کم ہے۔ اس لیے کہ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے اس لیے کہ حسد اور جلن کا مادہ انسان اور خاص طور پر معاصرین کی سرشت کا جز ہے۔ تبھی تو اسلام کی ہدایت ہے کہ خدا سے دعا مانگتے رہو کہ وہ تمہیں لوگوں کے حسد اور شر سے بچائے۔ اور خلیق صاحب تو ۱۶ برس سے کل ہند انجمن کے سربراہ ہیں جس کی ایک شاندار اور نمایاں تاریخ ہے اس لیے ان کے معاصرین کو بجا طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ حسد کریں۔

آزادی سے پہلے انجمن جیسے ادارے اور رؤسا و امرا کے عطیات پر زندہ رہتے تھے آزادی اور جمہوریت نے وہ سلسلہ ہی ختم کر دیا ہے اب تو ہر ادارے کو کاروباری نہج پر مستحکم ہونا ہوگا یا پھر فنا اس کا مقدر ہے۔

انجمن بھی موت کے گھاٹ اتر جاتی اگر خلیق انجم نے اس کی مالی پوزیشن مستحکم کرنے میں دن رات ایک نہ کر دیے ہوتے۔ اب اس کا اپنا منافع بخش کاروبار ہے۔ کرائے سے بھی آمدنی ہوتی ہے اور تھوڑا بہت سرکاری گرانٹ بھی ملتی ہے لیکن خدانخواستہ اگر گرانٹ بند ہو جائے تو بھی انجمن کے استحکام میں کمی نہیں آئے گی۔

یہ بھی خلیق صاحب کا ہی کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو کو ایک کشادہ وسیع اور کثیر منزلہ عمارت دی جس کو اردو گھر کہتے ہیں۔ حالاں کہ اسے اردو محل یا ایوانِ اردو کہنا چاہیے۔ مگر خاکساری اردو کے خمیر میں ہے۔

اس ایوانِ اردو کی تعمیراتی انجینیروں اور دیگر معماروں سے نپٹنا ایسا کام ہے جس کا عام لوگوں کو اندازہ بھی نہیں ہو سکتا اور پھر اردو کا معاملہ۔ جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل کام ہے۔

لیکن اس تگ و دو کا انھیں صلہ کیا ملنا تھا البتہ دامن داغدار کرنے کی کوشش ضرور ہوئی لیکن خدا کا شکر دشمن ناکام رہے خلیق انجم اتفاق سے مسلمان ہیں اور ہم مسلمانوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ غیر مذہبی کاموں کے لیے چندہ دینے میں تو ہزار آنا کانی کرتے ہیں لیکن غبن کا الزام لگانے پر فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جب مدن موہن مالویہ ہندو یونیورسٹی کی تعمیر کے لیے روپیہ اکٹھا کر رہے تھے تو گاندھی جی سے لوگوں نے شکایت کی کہ مالویہ جی چندے کی رقم میں سے بہت بڑا حصہ خرد برد کر گئے ہیں۔ گاندھی جی نے کہا تم بھی ایک ایسی ہی یونیورسٹی بنا دو اور اس سے بھی بڑی رقم خرد برد کر لو۔

خلیق صاحب پر ان کے نام کا بھی اثر ہے۔ سرورِ کائنات حضرت محمد صلعم نے فرمایا ہے اچھے نام رکھا کرو ناموں کا اثر ہوتا ہے خلیق صاحب غالباً اپنے نام کی رعایت سے بہت خلیق اور ملنسار ہیں۔ لیکن چوں کہ خان بھی ہیں اس لیے ایک زمانے میں منہ پھٹ اور اکھڑ بھی ہوا کرتے تھے لیکن یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا۔ جوان خون گرم ہوتا ہے اور خواہ مخواہ بھی چھیڑ چھاڑ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور دشمن بنانے میں مزہ آتا ہے اب تو عمر کی سہ پہر میں داخل ہو چکے ہیں اور مخالفوں کو بھی دوست بنانے کی بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب اپنے بھی خوش ہیں بیگانے بھی راضی۔ خلیق صاحب کی پیدائش ۲۲ دسمبر ۱۹۳۵ء کو دلی میں ہوئی اسی رعایت سے وہ اپنے کو اہلِ زبان کہتے ہیں اور بیرونِ دلی کے اردو والوں کے بارے میں ان کا بھی یہی خیال ہے۔

"دلی نہیں دیکھی ہے زبان دان یہ کہاں ہیں"۔

خاص طور پر بہار والوں کے بارے میں وہ بڑے بے تکلف انداز میں کہتے ہیں آپ لوگوں نے لغت سے اردو سیکھی ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ بہار والوں کو لغت دیکھنے کی نہ ضرورت ہے نہ عادت خود میں نے ایم۔ اے کرنے کے بعد لغت کی ضرورت محسوس کی سچی بات تو یہ ہے کہ جس نے بچپن میں اردو کا کلاسیکی ادب اور خاص طور داستانی ادب پڑھ لیا ہے اسے لغت کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یہ ضرور ہے کہ ہم لوگوں کی زبان پر مگدھی، اودھی بھوجپوری اور دیگر قبائلی زبانوں کا اثر ہے۔ اور ہماری اردو بھی دلی کی اردو سے مختلف ہے اور غیر جانبداری سے دیکھیے تو دہلوی اردو سے زیادہ توانا، ثروت مند اور غنی ہیں ہے کہ ہم لوگ "ڑ" اور "ڈھ" وغیرہ ثقیل الفاظ کا کم سے کم استعمال کرتے ہیں۔ اور "میں" کی غیر جمالیاتی آواز پر "ہم" کو ترجیح دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہماری اردو کا ارتقاء دلی اردو کے متوازی ہوا ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ قطعی ضروری نہیں کہ دلی کی ہم پیروی کریں۔ جہاں کی اپنی نہ تو کوئی پرانی تاریخ ہے اور نہ ہی اپنا کوئی کلچر یا جغرافیہ۔

خلیق انجم جن کو کامریڈ راج بہادر گوڑ کبھی کبھی مذاق میں خلیق انجن بھی کہتے ہیں منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے کہ ان کے والد ریلوے میں انجینئر تھے۔ مگر والد کا سایہ عاطفت آٹھ سال کی عمر میں ہی اٹھ گیا انھوں نے اپنی چار بہنوں کے ساتھ اپنی ماں کے شفیق آنچل کے سائے میں پرورش پائی۔ ان کی والدہ کو تعلیم سے بے حد دلچسپی تھی شاید اسی لیے انھوں نے ہر ممکن مصیبت برداشت کر کے تمام بھائی بہنوں کو ایم۔ اے تک تعلیم دلائی۔

خلیق صاحب نے پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کی ہے، لنگوسٹک اور لائبریری سائنس میں ڈپلومے بھی حاصل کیے ہیں۔ ۱۹۵۹ء میں لکچرر ہوئے۔ ۱۹۷۲ء میں وزارتِ تعلیمات (مرکزی سرکار) میں ڈائرکٹر ہوئے اور ۱۹۷۴ء میں انجمن کے سب سے کم عمر جنرل سکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں مرکزی یونیورسٹی کے پروفیسر گریڈ میں ان کا تقرر کیا گیا۔ ان کی ترقیوں اور عروج کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مگر حقیقت یہ ہے کہ قسمت کے ساتھ ساتھ زورِ بازو یا سخت اور جان توڑ محنت کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ وہ بچپن سے مشقتوں کے عادی ہیں۔ وہ بچپن سے ہی محنت اور کام کی عزت کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کام کرنے میں ذلت نہیں ہے کام نہیں کرنے میں ذلت ہے۔

خلیق صاحب آل انڈیا ریڈیو میں اردو یونٹ میں براڈ کاسٹر اور ٹرانسلیٹر بھی رہے ہیں کو مرڈیکو کرسی ادبا تھ

ملکی زبان اردو ادب کے ایڈیٹر بھی ابھی تک ۔ انھوں نے ۴ کتابیں مرتب کی ہیں چار کتابیں تصنیف کی ہیں اور دو کتابوں کے مترجم رہے ہیں۔ اتر پردیش سرکار کے علاوہ بہار، دہلی، مغربی بنگال اور اتر پردیش اکاڈمیوں نے انھیں ایوارڈ سے نوازا ہے ۔ اس کے علاوہ پاکستان سے انھیں نیاز فتح پوری ایوارڈ کے علاوہ کئی اداروں سے اعزاز اور ایوارڈ مل چکے ہیں ۔ لیکن میرے نزدیک سب سے بڑا اعزاز تو یہی ہے کہ وہ ۱۶ برسوں سے انجمن کو خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں ۔

میں نے خلیق انجم کے "ناکارکردی" کے خلاف زبردست مضمون لکھا جو غالباً دو قسطوں میں چھپا اور حسن نعیم اور شہباز حسین کی مداخلت پر اس کا سلسلہ روک دیا گیا۔ اس وقت تک میں ڈاکٹر خلیق انجم سے ذاتی طور پر زیادہ واقف نہ تھا۔ دراصل مجھے اس بات پر غصہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب جو اس وقت تک انجمن کے جنرل سکریٹری بن چکے تھے اردو کے لیے کوئی سرگرم دھواں دھار تحریک کیوں نہیں چلاتے ۔ شاید اس غصے کے پیچھے ایک لاشعوری وجہ یہ بھی ہو کہ خلیق صاحب کے مقابلے میں سہیل عظیم آبادی کو شکست ہوئی تھی اور سہیل صاحب کے لیے میرے دل میں بے حد عزت تھی میں سمجھتا تھا کہ دلی والوں نے سازش کر کے سہیل صاحب پر خلیق صاحب کو ترجیح دی ہے۔

لیکن جب خلیق صاحب سے تعلقات بڑھے تو معلوم ہوا کہ میرا غصہ نامناسب تھا۔ اور اس میں میرے جوش کو ہوش سے زیادہ دخل حاصل تھا۔

ملک کے جو حالات تھے اور اردو عوام کی ذہنی سطح خواندگی، جذباتیت اور عدم استقلال کا خلیق صاحب کو بہت بہتر اور درست اندازہ تھا اور ان حالات میں اردو تحریک کو جنگ جو یانہ رخ دینا بہا۔ میں تو درست تھا پورے سفر کے لیے تیار نہ تھا دراصل سفر سے مجھے ہمیشہ کوفت ہوتی ہے ۔ لیکن مسائل کے ایڈیٹر اور ہمارے بے حد عزیز دوست ریاض عظیم آبادی لے مجھے کسی نہ کسی طرح دلی والی گاڑی میں بٹھا ہی دیا ۔ اسٹیشن سے سیدھا کناٹ پلیس پہنچا۔ ڈی۔ آر۔ گوئل سے ملا مگر خلیق صاحب وہاں نہیں تھے معلوم ہوا اب وہ وزارت تعلیمات میں زیادہ وقت دینے کے سبب سیکولر ڈیموکریسی کے لیے وقت نہیں نکال سکتے ۔ لہٰذا مجھے ہی تنہا سیکولر ڈیموکریسی نکالنا ہے ۔ ملک کے لیے بہر حال نادرست تھا ۔ اپنی حماقت پر ندامت کے ساتھ خلیق صاحب کی دانش مندی کا احساس بھی ہوا اور میں نے اس کا اظہار بھی کیا۔

خلیق صاحب کا شمار ان لوگوں میں تو نہیں ہوتا جو خلقی طور پر جی نی یس (نابغہ) ہوتے ہیں جیسے ابوالکلام آزاد یا گاندھی تھے لیکن جو لوگ اپنی محنت اور ذہانت دونوں کے امتزاج سے نابغہ کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں ان میں خلیق صاحب بھی ہیں۔ موقع شناسی، تحمل اور محنت خلیق صاحب کی سرشت کے اجزائے ترکیبی میں خصوصی اہمیت کے حامل اوصاف ہیں ۔ جن کی آج کے مسلمانوں میں زبردست کمی ہے ۔

خلیق صاحب پابند رسوم و قیود تو ہیں لیکن ان معاملات میں وہ کٹر نہیں ہیں۔ اس لیے کہ وہ نہ صرف گنگا جمنی تہذیب پر یقین رکھتے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہیں بلکہ اپنے گھر میں بھی اس روشنی پر گامزن ہیں بلکہ اسے وسیع تر کر کے گنگا دجلہ تہذیب بنا دیا ہے ۔

خلیق صاحب کی حس مزاح بھی بہت تیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے بعض اوقات ایسا جملہ ادا کرتے ہیں کہ بس مزہ آجاتا ہے " بس مزہ آگیا " کا وہ اکثر استعمال کرتے ہیں۔

جہاں تک ان کی تالیفات، تراجم اور تصنیفات کا تعلق ہے ان میں بھی خلیق صاحب کی وہی جاں سوزی اور عرق ریزی نظر آتی ہے جو ان کے دوسرے کاموں میں نظر آتی ہے

محمد آصف جاہ

خلیق بھائی

ادبی دنیا میں خلیق انجم صاحب یعنی میرے خلیق بھائی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں اردو ادب میں وہ صف اول کے محقق، متنی نقاد ہیں، بہترین مقرر ہیں سماج سدھارک ہیں اور سماج میں ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ ہندوستان پاکستان اور ہر اُس جگہ جہاں اردو دوست آباد ہیں۔ ان کا نام بخوبی جانا پہچانا اور احترام سے لیا جاتا ہے۔ ایک عرصے سے وہ الیکٹرونکس میڈیا، ریڈیو اور ٹیلی ویژن، اخبارات و رسایل میں اپنا مقام بنائے ہوئے ہیں۔ خلیق بھائی دہلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنی ادبی مصروفیات کے علاوہ وہ اپنے علاقے کے ایک مقبول رہنما ہیں۔ ان کی اس مقبولیت کو ہی دیکھتے ہوئے ۱۹۷۱ء کے میٹرو پالیٹن کونسل کے الکشن کے لیے، محترمہ اندرا گاندھی نے انھیں بذات خود منتخب کیا تھا۔ آج بھی وہ بہت سی سماجی انجمنوں سے وابستہ ہیں اور سماجی بہبود کے کاموں میں بے حد دلچسپی لیتے ہیں۔ اپنے اس مضمون میں، میں قارئین کو خلیق بھائی کے بارے میں، ان کی شخصیت کو اپنے خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے آشنا کرانا چاہتا ہوں۔ میں ان کے خاندان کا ایک فرد ہوں اور اس حیثیت سے میں ان کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔

خلیق بھائی بہت سی عجیب و غریب صفات کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت کثیر الجانبہ ہے۔ ایک ہی وقت میں وہ اردو زبان کے ممتاز عالم، بہترین مقرر، سیاستداں، پرانی گاڑیوں کے مسیحا، این سی سی کے افسر، ماہر گلاب، ہومیوپیتھی کے موثر ڈاکٹر، آل انڈیا ریڈیو کی فارین سروسز میں دری زبان کے مشہور براڈ کاسٹر، ایڈ منسٹریٹر، معمار، بہترین فوٹو گرافر اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ وہ ہر نئے کام میں بآسانی ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ اور مزے دار بات یہ کہ کامیاب ہوتے ہیں۔

اُن دنوں خلیق بھائی دہلی یونیورسٹی کے کروڑی مل کالج میں لکچرار تھے ان کا ہمارے گھر آنا جانا اکثر و بیشتر ہوتا رہتا تھا۔ میری عمر اس وقت شاید پندرہ یا سولہ سال تھی۔ مجھے ان کی صحبت میں بے حد لطف آتا تھا۔ وہ خاندان کے تمام چھوٹوں اور بڑوں میں بے حد مقبول تھے۔ کوئی تفریح کا پروگرام ہے تو خلیق بھائی ہی شروع کریں گے خاندان میں، سیر و تفریح کا مشترک پروگرام انھیں کے دم سے شروع ہوا جس میں سبھی لوگ دلچسپی لیتے۔ اگر خاندان میں کسی کو ایک دوسرے سے رنجش بھی ہوتی تو بھی خلیق بھائی کو یہ کمال حاصل تھا کہ وہ سب کو یکجا کر دیتے اور اس طرح بہت سے لوگ ایک دوسرے کے قریب آجاتے، غلط فہمیاں ختم ہو جاتیں۔ میرے

[ب]ال میں، خاندان کے چند لوگوں کو اکٹھا کر دینا، باہر کے ایک بڑے مجمع کو کنٹرول کرنے سے بھی بڑا کام ہے۔ ہمارے
[خ]اندان میں پکنک کا تصور جس میں تمام لڑکے لڑکیاں، بچے، حتیٰ کہ بڑے بھی شریک ہوں، خلیق بھائی کی دین ہے۔ آج
[س]ے تقریباً تیس پینتیس سال قبل اس طرح گھومنا پھرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ جس میں گھر کی عورتیں بے پردہ مردوں
[ک]ے ساتھ، جمنا ندی کے کنارے فالیزوں پر گھوم پھر رہی ہوں۔ لیکن خلیق بھائی نہ معلوم کس طرح گھر کے بڑوں
[ک]و راضی کر لیا کرتے تھے اور اس طرح کے پروگرام خلیق بھائی مختلف موقعوں پر بنا لیا کرتے تھے۔ سب کو بے حد
[م]زہ آتا۔ خاندان کے سب ہی چھوٹوں اور بڑوں سے ان کی دوستی رہتی اور ان سے کوئی بھی بات کہنے میں جھجک
[ن]ہ ہوتی۔ ایک دن اچانک معلوم ہوا کہ خلیق بھائی این سی سی کی ٹریننگ کے لیے کامٹی جا رہے ہیں۔ بڑا
[ع]جیب سا لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹریننگ لیکر آ گئے۔ ایک فوجی افسر کی شکل میں۔ ویسے بھی وہ نظم اور ضابطوں
[س]ے ہمیشہ بندھے رہے ہیں اور ڈسپلن کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ہر چیز میں وقت کی پابندی، پوری طرح
ایک بااصول شخصیت۔ شاید ان کی اس خوبی میں ان کی والدہ مرحومہ کا کافی اثر ہے۔ خلیق بھائی کی والدہ خود ایک
[ح]وصلہ مند، سمجھدار، نظم اور ضابطوں کی پابند، دردمند اور اللہ والی خاتون تھیں۔ انھوں نے اپنی محنت اور ہمت سے
اپنی اولاد کو، اپنی شفقت کے سائے میں اچھی سے اچھی تعلیم دی۔ کیوں کہ والد صاحب کا سایہ پہلے ہی سر سے
اٹھ چکا تھا۔ اس لیے تمام تر ذمہ داری، والدہ ہی نے، تنہا بغیر کسی مدد کے، خدا کے بھروسے اٹھائی اور اپنے
مقصد میں کامیاب ہوئیں وہ بے حد سخی طبیعت خاتون تھیں۔ مجھے یاد ہے، ان کے پاس ایک بڑا سا رجسٹر ہوا کرتا تھا
اس رجسٹر میں بہت سی غریب بیوہ عورتوں، یتیم بچوں اور بے سہارا لوگوں کے نام اور پتے درج تھے، جن کی
ہر ماہ وہ مدد کیا کرتی تھیں۔ ان کے گھر میں آنے جانے والوں کا ایک تانتا سا بندھا رہتا تھا۔ ہر ایک سے وہ
اچھی طرح پیش آتیں اور پھر اپنے لگے بندھے معمول میں مصروف ہو جاتیں۔

خلیق بھائی کو گاڑی نہیں، بلکہ گاڑیاں رکھنے کا بہت شوق رہا ہے وہ بے حد کھٹارا قسم کی گاڑی خرید
لیتے، اس پر بے پناہ پیسہ لگاتے اور پھر کچھ دنوں خوب دوڑے پھرتے۔ ایسے تمام کاموں میں ہم ان کے
ساتھ ہوتے اور بہت لطف آتا۔ اس زمانے میں جامع مسجد کے چاروں طرف بھی ایک بڑا کباڑی بازار ہوا کرتا
تھا۔ جس میں ہر میک اور ماڈل کا سامان، مل جایا کرتا تھا۔ شاید ہی کوئی کباڑی ہو، جو خلیق بھائی کی شکل سے
واقف نہ ہو۔ وہ بازار میں داخل ہوتے اور ادھر ادھر سے آوازیں آنے لگتیں۔ صاحب میں نے آپ کی گاڑی
کے لیے ایک فرسٹ کلاس ڈائنامو رکھ رکھا ہے، کوئی کہتا وہ آپ کی گاڑی کا میٹر مل گیا ہے۔ لگوا لیجیے . . .
وغیرہ وغیرہ۔ خلیق بھائی ضرورت اور بغیر ضرورت سامان اکٹھا کر لیا کرتے۔ میں "چمچے" کی طرح ان کے ساتھ
ان کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ ساتھ گھومتا رہتا۔ گاڑی کے لیے گیرج تو تھا نہیں اس لیے اور بہت سی گاڑیوں کے ساتھ،
ایڈورڈ پارک کے پاس کھڑی ہوتی۔ خلیق بھائی چھٹی والے دن گاڑی پر جٹ جاتے۔ خوب صفائی اور چمکائی ہوتی
اور پھر دور تک کی سیر۔ ہم اس سیر کی امید پر جی جان سے ان کے ساتھ لگے رہتے لیکن کبھی کبھی یہ سیر بہت مہنگی
پڑتی۔ عید کا دن تھا۔ نماز سے فارغ ہوئے۔ گھر پر رشتے داروں اور دوست احباب کا آنا جانا شروع ہوا۔
خلیق بھائی بھی میری والدہ کے ہاتھ کا پان کھانے اور ملنے ملانے آئے۔ جب وہ چلے تو حسب عادت ہم بھی ساتھ
ہو لیے، پہنچ گئے گاڑی پر۔ پروگرام بنا کہ عید کا دن ہے، تھوڑا سا لطف اٹھایا جائے۔ بدرپور تک کی ڈرائیو میں
مزہ آ جائے گا۔ ہم خوش، خلیق بھائی نے گاڑی میں سیلف مارا گاڑی نے اندوہناک آوازوں میں اپنی

تکلیف بیان کی اور پھر خاموشی۔ یہ سلسلہ کافی دیر چلا۔ سہم میں گیا تھا، لیکن کرتا کیا؟ ذرا بیٹری ویک ہوگئی ہے ایک دھکے میں اسٹارٹ ہو جائے گی۔ خلیق بھائی نے کہا۔ میں پہلے ہی اس پوزیشن میں آچکا تھا۔ بہر حال ایک اور شخص سے درخواست کی اور اس کی مدد سے دھکا لگانے لگا۔ آپ یقین کریں اسی طرح ہم بیلارڈ جہاں شانتی ون سے نکل آئے۔ اور گاڑی بغیر اسٹارٹ ہوئے ہی چلتے رہنے کو بضد۔ بمشکل تمام گاڑی کو واپس ایڈورڈ پارک لائے۔ لیکن اس مشق میں پورا جسم پسینہ پسینہ، کپڑے گندے اور ایک جوتے کی ایڑی غائب ہو چکی تھی۔ آپ یہ نہ سمجھیے کہ ان کی ہر گاڑی کے ساتھ ایسا ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم کئی بار بدر پور جانے تک کامیاب ہوئے۔

خلیق بھائی کو جب وقت ملتا، وہ ہمارے گھر آتے اور رات کو کافی دیر تک محفلیں جمتیں۔ میری والدہ انہیں پان پر پان دیا کرتیں اور خلیق بھائی صرف ان کا دل رکھنے کے لیے بار بار سلام کرتے اور پان کھاتے رہتے جب کہ وہ پان کھانے کے بالکل شوقین نہیں رہے۔ ہاں وہ چین اسموکر تھے۔ لیکن ایک روز فیصلہ کر لیا کہ آج سے سگریٹ نہیں پیوں گا، اور بغیر کسی الجھن اور پریشانی کے۔ انھوں نے اپنی سگریٹ نوشی پر قابو پا لیا۔ ہم سب بہن بھائیوں کو ان کی آمد کا انتظار رہتا۔ طرح طرح کے پروگرام بنتے۔ کبھی سیر و تفریح کا تو کبھی کوئی بزنس شروع کرنے کا۔ سیاست پر بحث و مباحثہ ہوتا۔ سب کچھ ہوتا لیکن خلیق بھائی کبھی بھی خاندان کے معاملوں میں مداخلت نہ کرتے۔ نہ کسی کی برائی۔ نہ کسی سے جلنا اور نہ کبھی کسی کو نصیحت۔ شاید ان کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔

اچانک معلوم ہوا کہ خلیق بھائی شادی کر رہے ہیں۔ ایک دن حسب معمول ان کے ساتھ ایڈورڈ پارک کے باہر گاڑی کو چمکا رہا تھا کہ ایک خاتون سفید ساڑی میں ملبوس ایک اسکوٹر سے اتریں۔ خلیق بھائی نے تعارف کرایا۔ یہ آپ کی بھابھی ہیں۔ اس روز سے آج تک بیگم خلیق بھی اسی شفقت اور محبت سے پیش آتی ہیں جس طرح کہ خود خلیق بھائی مسز انجم ایک دوسرے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن نئے خاندان میں اگر وہ خلیق بھائی کی ہی طرح ہر دلعزیز ہیں۔ ان دنوں وہ دہلی یونیورسٹی کے پاس، ماڈل ٹاؤن ٹیگور گارڈن میں رہتے تھے۔ ہر سنیچر کی شام یا کسی اور دن ان کے یہاں پہنچ جاتے۔ بھابھی صاحبہ مزے مزے کے کھانے پکاتیں اور ہم سب لوگ مزے لے لے کر کھاتے خاص طور پر ان کی فش رائس ڈش بہت پسند کی جاتی۔ وہ خاندان کے ہر شخص کے ساتھ بہت محبت اور اپنائیت سے پیش آتی ہیں۔ انھوں نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ ہم ان کے شوہر کے رشتہ دار ہیں ان کے نہیں۔ گھر کی تمام تر ذمہ داری بھابھی کے کندھوں پر ہے خلیق بھائی کو آٹے دال کا بھاؤ بالکل معلوم نہیں جب کہ ہماری بھابھی بھی جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی، میں پروفیسر ہیں

ٹیگور گارڈن میں جس گھر میں خلیق بھائی رہتے تھے وہ ایک وکیل صاحب کا گھر تھا۔ وکیل صاحب لوں تو پوری طرح وکیل تھے لیکن خلیق بھائی اور ان کی فیملی سے ان کا تعلق مالک مکان اور کرایہ دار جیسا نہ تھا۔ ان کے گھر کے مسائل میں خلیق بھائی کی رائے کو اہمیت دی جاتی۔ وکیل صاحب انھیں اپنی فیملی کا ہی ایک فرد تھے، کیوں کہ جب انھوں نے یہ مکان چھوڑا تو وکیل صاحب اور ان کے بچوں کو بے حد دکھ ہوا۔ آج بھی خلیق بھائی کا اس گھر سے بہت قریبی تعلق ہے۔ ہولی، دیوالی، عید اور بقر عید پر تو ایک دوسرے سے ملتے ہی ہیں ویسے بھی اس تعلق کا سلسلہ جاری ہے۔ خلیق بھائی کے اس مکان میں ایک حصے میں، چھوٹا سا لان تھا۔ سبز گھاس اور مختلف پھولوں سے آراستہ۔ اکثر ہم لوگ جاڑوں میں کرسیاں ڈال لیتے اور گپ شپ کرتے۔ ایک روز جب میں وہاں پہنچا تو میں نے عجیب و غریب منظر دیکھا۔ لان کھدی پڑی ہے۔ سبزہ غائب

ہوری مٹی کے نشیب و فراز نظر آ رہے ہیں۔ بھابھی صاحبہ نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب (خلیق انجم) نے ایسا کیا ہے۔ وہ بہت جلد یہاں گلاب کی مختلف قسموں کا تجربہ کرنے والے ہیں۔ اسٹڈی میں خلیق بھائی لیمپ روشن کیے ایک کتاب میں غرق تھے اور آس پاس کئی موٹی موٹی کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے آصف صاحب آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ اب دیکھیے گلاب کی کتنی قسمیں یہاں اُگاتا ہوں۔ مجھے ہنسی بھی آئی۔ لیکن یہ معلوم تھا کہ وہ جو کہہ رہے ہیں ضرور کر لیں گے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ کچھ ہی دنوں میں وہاں منی روز گارڈن بن چکا تھا۔ وہ اپنے ان پودوں کا بچوں کی طرح دھیان رکھتے۔ طرح طرح کے تجربے کرتے رہتے۔ شاید انھیں دنوں گلابی لٹریچر پڑھتے پڑھتے، ہومیو پیتھی اور بایوکیمک میڈیسن پر بھی کمال حاصل کیا۔ جب وہ کسی بات کو اپناتے ہیں تو اس کی انتہا تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کوئی چیز ان کی راہ میں مانع نہیں ہوتی۔ کوئی کتاب یا کوئی اور ضروری چیز جہاں کہیں سے، اور جس قیمت پر بھی مل سکے وہ حاصل کر لیتے ہیں۔ انھوں نے ہومیو پیتھی میڈیسن کی ہندوستانی تصانیف پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ تمام لٹریچر جو جرمنی میں اس طریقۂ علاج کے سلسلے میں چھپا اسے بھی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ آج ان کے پاس ان کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ وہ ان سے استفادہ کرتے ہیں اور بہت سے لوگ ان کی اس صلاحیت سے مستفید ہو رہے ہیں۔

خلیق انجم بھائی کا ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے بہت پرانا رشتہ ہے۔ اردو سروس، اردو مجلس، بزم اور دوسری سروسوں سے ان کے مقالے اور مباحثے، انٹرویو وغیرہ نشر ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے یہاں اردو گھر میں بہت سی ادبی مجلسیں، سیمینار وغیرہ منعقد کرتے رہتے ہیں اور ملک کے مختلف حصوں میں ایسی مجلسوں اور سیمناروں میں برابر شرکت کرتے ہیں۔ ۶۰ء کی بات ہے۔ میرے بڑے بھائی، احمد سعید صاحب ان دنوں آل انڈیا ریڈیو کی دری سروس میں، براڈکاسٹر تھے۔ یہ پروگرام، افغانستان، پاکستان، ایران، خلیج کے چند ملکوں اور خود ہندوستان میں سنا جاتا ہے۔ سعید صاحب نے خلیق بھائی کو یہ زبان سیکھنے اور براڈ کاسٹنگ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ خلیق بھائی کے لیے کوئی بھی نیا محاذ نیا نہیں ہوتا۔ وہ ہر میدان میں اپنی محنت اور لگن کے بل بوتے گھس جاتے ہیں جو کہ بالکل نیا ہوتا ہے۔ یہاں بھی وہی ہوا۔ وہ رات دن اس زبان کو سیکھنے، جرنلزم اور ریڈیائی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تن دہی سے لگ گئے۔ ان دنوں دری سروس کے سپروائزر، بی بی لال ماتھر صاحب تھے جو خود ایک عالم و فاضل اور بہترین انسان تھے۔ انھوں نے خلیق بھائی کا ٹیسٹ لیا۔ وہ کامیاب ہوئے اور پھر دری پروگراموں میں casual basis پر حصہ لینے لگے۔

خلیق بھائی آج کل جہاں رہتے ہیں۔ اس کالونی کا نام سوریہ نگر ہے۔ بہت پہلے انھوں نے اس کالونی میں ایک پلاٹ لیا تھا۔ لیکن پلاٹ لینے سے مکان بنانے تک سفر بہت طویل اور پُر زحمت ہوتا ہے۔ مکان بنانے کی دشواریوں اور مصیبتوں کو جھیلنا محدود وسائل کے ہوتے ہوئے، ایک بڑا کام ہے۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی ہر شخص ایک اپنے مکان کا تصور، ایک حسین خیال اپنے ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ رکھتا ہے۔ اور روز اپنے تصور میں اس کو مختلف زاویوں سے دیکھتا ہے اور رنگ بھرتا ہے۔ خلیق بھائی بھی ایک محنت کش انسان ان کے سامنے بھی یہی دشواریاں تھیں۔ لیکن ان کے سوچنے اور کام کرنے کا انداز بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اپنی مالی مجبوریوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اینٹ اور سیمنٹ کی دیواروں کو اٹھانے سے بہت پہلے ہی سے

وہ اپنے تصور کو عملی جامہ پہنانے کی دھن میں لگ گئے۔ انھوں نے تھوڑا تھوڑا کر کے اپنی ضرورت اور جیب کے مطابق لوازمات اکٹھا کیے اور جس وقت انھوں نے اپنا مکان بنانا شروع کیا، یہی تھوڑا تھوڑا جمع کیا ہوا سامان گھر کے بنانے میں بے حد کام آیا۔ اس سے ان کی پلاننگ کی صلاحیت کا پتا لگتا ہے۔ اردو گھر کو ہی لے لیجیے جب وقت انجم صاحب، انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری بنے اس وقت یہ ایک ڈھانچہ کی شکل میں تھا۔ آج یہ ڈھا[نچہ] ایک خوب صورت عمارت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ جس کی موجودہ قیمت تین کروڑ روپے ہے۔

خلیق بھائی کو اپنے اعصاب پر مکمل کنٹرول ہے۔ جو ہر وقت اپنا توازن کھوئے بغیر بہت سے کام انجا[م] دے سکتے ہیں۔ کب سونا ہے۔ کتنی دیر کے لیے، کب کیا کرنا ہے وہ اپنے وقت کا پورا حساب رکھتے ہیں۔ م[یں] نے آج تک انھیں کسی پر غصہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ شدید مخالف حالات میں بھی ٹھنڈے دماغ سے کام لیتے ہیں اور اس طرح مخالفین کا دل بھی جیت لیتے ہیں۔ کبھی کسی پر اپنی رائے نہیں ٹھونستے۔ ہاں اگر کوئی ان سے مشورہ لیتا ہے تو پوری ایمانداری سے اپنی رائے دیتے ہیں۔ خاندان میں طرح طرح کی چھوٹی بڑ[ی] تقاریب ہوتی رہتی ہیں۔ وہ اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود ان میں شامل ہوتے ہیں اور جس طر[ح] جس کی مدد ممکن ہوتی ہے۔ اس کی مدد کرنے میں تامل نہیں کرتے۔ خاندان کے تمام افراد اور مختلف لوگوں کو وقتاً فوقتاً ملاتے رہنے کا کام بھی انجام دیتے ہیں۔ کبھی سب کو کسی نہ کسی بہانے اکٹھا کر لیں گے اور خاندان کے وہ لوگ جو مدتوں مصروفیت کی بنا پر یا جان بوجھ کر نہیں ملتے یا ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے ہیں ان کی موجودگی میں آنکھیں چار کر لیتے ہیں۔ خلیق بھائی خاندان کے لیے ایک اہم اور بے حد مقبول شخصیت ہیں۔ وہ محفلوں کی جان اور زندگی کی علامت ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ وہ میرے بھائی ہیں۔

ہاں ایک بات اور اگر ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کی تعریف کرے تو سمجھ لیجیے، وہ شخص واقعی اچھا ہے۔ وگرنہ کسی کی اصلیت جاننا ہو تو اس کے رشتہ داروں سے مل لیجیے۔

غالب کے خطوط ۔ مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم

اہلِ علم کی نظر میں

ڈاکٹر خلیق انجم نے دس بارہ سال کی لگاتار محنت سے چار جلدوں میں "غالب کے خطوط" مرتب کیے تھے۔ ان خطوط کی تین جلدیں غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع ہو چکی ہیں اور چوتھی جلد زیرِ طبع ہے۔ اس وقیع کام کی ہندوستان اور پاکستان میں جو شاندار پذیرائی ہوئی وہ اردو میں بہت کم کتابوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔ ٹیلی ویژن اور آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس اور اردو مجلس کے پروگراموں میں اس کام پر آدھے آدھے گھنٹے کے مذاکرے نشر کیے گئے۔ ان مذاکروں میں رشید حسن خاں صاحب، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر کامل قریشی اور ڈاکٹر صلاح الدین نے شرکت کی۔ بے شمار رسالوں نے اعلا درجے کے تبصرے کیے۔ کچھ رسالوں نے اپنی سابقہ روایت کو نظر انداز کر کے اداریے لکھے۔ انگریزی اور ہندی کے بیشتر اخباروں نے "غالب کے خطوط" پر شاندار تبصرے شائع کیے۔ یہاں تمام تبصرے تو نقل کرنا مشکل ہے۔ کچھ تبصروں اور خطوط کے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

(م۔ ح۔ غ)

جناب مالک رام

غالب کے اردو خطوط ادبِ اردو کا سدا بہار سرمایہ ہیں۔ ان کے دو مجموعے "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" ان کی ...گی میں مرتب ہوئے۔ وہ بہت ہی مبارک دن تھا، جب ان کے بعض احباب کو ان خطوط کے جمع کرنے کا خیال آیا۔ آج ...ب ان کے بیشتر خطوط ہماری دسترس میں ہیں، اور ہم ان کی افادیت اور تاریخِ نثرِ اردو میں ان کا مقام اور مرتبہ متعین کرنے ...ے موقف میں ہیں، ہم آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر خدا نخواستہ یہ خطوط ضائع ہو گئے ہوتے، تو یہ کتنا بڑا ناقابلِ ...لی نقصان ہوتا۔

غالب اس لحاظ سے بڑے خوش قسمت ہیں کہ اگرچہ ان کی وفات پر تقریباً سوا صدی گزر چکی ہے، لیکن آج بھی ...ئی نئی تحریریں، اور وہ بھی بیشتر ان کے اپنے قلم سے منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں۔

یہ تمام مکتوبات مختلف مجموعوں میں یا مجلّوں میں محفوظ ہیں۔ لیکن اس امر کی اشد ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ ...نا تو انھیں ایک سلسلے میں مدوّن کیا جائے۔ اور پھر حتی الوسع انھیں تاریخِ کتابت کے لحاظ سے مرتب کیا جائے۔ یہ کام ...طلب بھی تھا، اور وقتِ نظر کا متقاضی بھی۔ خوشی کا مقام ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم نے اس مہم کے سر کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ...وں نے برسوں کی محنت کے بعد تمام موجودہ خطوط کو چار جلدوں میں یکجا کر دیا ہے، ان کی تاریخ متعین کرنے کی کوشش ...ہے، خطوطِ غالب ما لہٗ و ما علیہ کے بارے میں تفصیلی حواشی قلمبند کیے ہیں؛ جہاں اصلی خط مہیا ہو گیا ہے، اس کا

عکس شائع کر دیا ہے۔

غرض، ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اب ہمیں خطوطِ غالب کا ممکنہ حد تک، ایک مکمل مجموعہ دستیاب ہو جا[ئے گا]
اس کے لیے ڈاکٹر خلیق انجم پوری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔

جمیل الدین عالی

آپ نے کتنا بڑا کام کیا ہے۔ اب تک خطوط غالب پر اتنا بڑا کام میرے علم کی حد تک کسی اور نے نہیں کیا[۔]
محنت ہے آپ کی شاید پہلی بار یہ ہوا ہے کہ کسی اردو متن کی تدوین جدید جرمن طریقے پر کی گئی ہے۔ جرمن اس [...]
میں پورے یورپ کے لیے مثال اور امریکہ سے بہت آگے ہیں۔ آپ کی تدوین جرمن انداز پر بالکل سائنٹی فک ہے
(جمیل الدین عالی سکریٹری انجمن ترقی اردو پاکستان ایک خط سے اقتباس)

پروفیسر مختار الدین احمد

بہت دنوں سے اس بات کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ غالب کے خطوط کا ایک ایسا مکمل مجموعہ مرتب [کر کے]
شایع کیا جائے جس میں اُن کے اردو کے اب تک کے دریافت ہوئے سارے خطوط مناسب ترتیب و تہذیب اور تصحیح
کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دیے جائیں۔ مقامِ مسرت ہے کہ جناب خلیق انجم نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور کئی سال کی مسلسل
محنت کے بعد اس اہم کام کو انجام تک پہنچایا۔ اردو کے مشہور مصنف اور ممتاز محقق ہیں، ان کی غالب کے خطوط سے دلچسپی بہت
قدیم ہے، اور غالب کی کم یاب تحریروں کا ایک مجموعہ غالب کی نادر تحریریں (دہلی ۱۹۶۱ء) مرتب کر کے شائع بھی کر چکے
ہیں۔ جناب خلیق انجم کا یہ معرکۃ الآرا کام چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد جو تقریباً پانچ سو صفحات پر ختم ہوتی ہے۔ ا[بھی]
چھپ کر شائقین کے سامنے ہے۔ اس میں ان کا لکھا ہوا تفصیلی مقدمہ ہے، پھر غالب کے منشی ہر گوپال تفتہ اور نواب
علاء الدین خاں علائی کے نام کے خطوط درج ہیں۔

لائق مرتب نے خطوط کا صحیح متن پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اگر خطوط کی اصل غالب کے قلم کی لکھی ہوئی
مل گئی ہے تو اس سے مطبوعہ خطوط کا مقابلہ کیا گیا ہے متن کے ماخذ کی نشان دہی کی گئی ہے، اختلافاتِ نسخ درج کیے گئے ہیں[،]
تعداد میں خطوط کا زمانۂ تحریر متعین کیا گیا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ ان خطوط پر مفید اور قیمتی حواشی سپردِ قلم کیے گئے ہیں۔ ج[و]
جلدوں میں اپنی نوعیت کے پہلے تحقیقی کارنامے کی ترتیب پر ڈاکٹر خلیق انجم اور اس کی اشاعت پر غالب انسٹی ٹیوٹ
دہلی ہر طرح مبارک باد کی مستحق ہے۔

غالب کے خطوط، غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ غالب شناس اس کتاب کی وہ قد[ر]
کریں گے جس کی یہ مستحق ہے۔

جناب رشید حسن خاں

ڈاکٹر خلیق انجم نے اب سے کئی سال پہلے اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ غالب کے سب اردو خطوں [کو]
چار جلدوں میں مرتب کیا جائے۔ ان کے مجوزہ سلسلے کی پہلی جلد اب چھپ کر سامنے آئی ہے جس کو دیکھ کر جی خوش ہو[تا ہے]
اور آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔ میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات لکھ رہا ہوں کہ خلیق انجم صاحب نے بہت دل[سوزی]
اور نظر جما کر اس کام کو انجام دیا ہے۔ انھوں نے بہت صبر و تحمل کے ساتھ کئی سال صرف کیے متن کی تصحیح پر اور بہت سا [وقت]
خرچ کیا متن سے متعلق حواشی لکھنے پر۔ انھوں نے ضروری مصادر اور ماخذ کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ قیاس نہیں، بلکہ
ذاتی معلومات کی بنا پر لکھ رہا ہوں مجھے معلوم ہے کہ انھوں کے تلاش و جستجو کا حق ادا کرنے کی ایماندارانہ کوشش کی۔

بہ بدا اصول تدوین کی روشنی میں متن کو مرتب کیا ہے۔

خلیق انجم صاحب ہم سب کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس داغِ رسوائی کو دھویا ہے کہ اردو
ں خطوطِ غالب کا کوئی مکمل مجموعہ مرتب نہیں ہو سکا تھا۔ میں توقع کرتا ہوں کہ اس سلسلے کی باقی جلدیں بھی، اس پہلی جلد
طرح، ترتیبِ متن کے تقاضوں کو پورا کریں گی اور اس طرح غالبیات کے ذخیرے میں ایک قابلِ ذکر اضافہ ہوگا۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی

مرزا غالب اردو کے عظیم شاعر ہی نہیں، بہت بڑے صاحبِ طرز نثر نگار بھی ہیں۔ ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر
ت قابلِ قدر کام ہوئے ہیں لیکن نثر کا حق ابھی تک ادا نہیں ہوا تھا اس سلسلے میں سب سے اہم اور بنیادی کام یہ ہے کہ
طوطِ غالب" کے قیمتی سرمایے کو پورے آدابِ تحقیق کے ساتھ مرتب کیا جائے۔ اس سلسلے میں مولوی مہیش پرشاد، ڈاکٹر عبدالستار
مدیقی اور غلام رسول مہر نے جو ابتدا کی تھی اس کی تکمیل ڈاکٹر خلیق انجم کے ہاتھوں سے ہوئی ہے۔ انھوں نے برسوں کی محنت اور
یدہ ریزی کے بعد خطوطِ غالب کو چار جلدوں میں فراہم کیا ہے۔ غالبیات میں انھوں نے اب تک جو کام کیے تھے وہ بھی ان کی سرخروئی
کے لیے کافی تھے لیکن اس کارنامے نے انھیں غالب شناسوں کی صفِ اول تک پہنچا دیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ

خلیق انجم کی غالبیات کے تقریباً تمام گوشوں پر ان کی نظر ہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں اور برصغیر
ے باہر برطانیہ میں بھی انھوں نے اردو کے علمی ذخیروں کو اچھی طرح دیکھا بھالا ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کی
یثیت سے ہندوستان اور پاکستان کی جملہ مطبوعات اور تحقیقی و تنقیدی مباحث ان کی نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔ وہ برسوں
ے غالب کے اردو خطوط کی نئی تدوین میں مصروف تھے۔ مولوی مہیش پرشاد، امتیاز علی خاں عرشی، غلام رسول مہر، مالک رام اور آفاق
سین آفاق نے اس سلسلے میں جو کام کیا تھا، اس کے بعد بھی نئے خطوط دریافت ہوتے رہے ہیں اور نبی بخش اشتی بھی
ں اس سارے علمی سرمائے کا ازسرِنو تحقیقی جائزہ لینے اور خطوطِ غالب کو نئی سائنٹیفک تدوین کے ساتھ پیش کرنے کی ضرورت
ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی۔ بارے اس اہم ذمے داری کا بیڑا ڈاکٹر خلیق انجم نے اٹھایا ہے۔ پہلی جلد میں تقریباً
ڈھائی سو صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے جس میں "اردوئے معلٰی" اور "عودِ ہندی" کے اولین اڈیشنوں سے لے کر اب تک شائع
ہونے والے اردو خطوط کے تمام مجموعوں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے اور خطوطِ غالب کے لسانی اور ادبی پہلوؤں سے بحث
بھی کی گئی ہے۔ منصوبے کے مطابق چار جلدوں میں خطوط کا متن پیش کیا گیا ہے اور مآخذ کی تفصیل، اور اختلافِ نسخ حواشی
میں دیے گئے ہیں۔ ان جلدوں کی اشاعت غالبیات کی تاریخ میں بنیادی نوعیت کا کارنامہ ہے۔ بلاشبہ اس علمی اقدام کے
یے ڈاکٹر خلیق انجم پوری اردو دنیا کے شکریے کے مستحق ہیں۔

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

جب غالب شناسی کا ذکر آتا ہے تو ہمارے سامنے مولانا امتیاز علی عرشی مرحوم اور قاضی عبدالودود مرحوم کا نام سامنے آتا ہے
اور ان کے ساتھ مالک رام صاحب، خدا ان کو سلامت رکھے کا نام سرِفہرست ہے۔ ان اساتذہ کے نام کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم کا نام غالب
شناسی میں سب سے نمایاں ہے اور یہ غالب کا فیضان ہے کہ اپنے ماہرین کا سلسلہ ختم نہیں ہونے دیتا۔

گزشتہ دس بارہ برس سے انجم صاحب غالب کے اردو خطوط مرتب کرنے میں مصروف تھے خدا کا شکر ہے کہ چار جلدوں میں یہ
عظیم الشان تاریخی کام شائع کیا جا رہا ہے۔ غالب کے اردو خطوط ۱۸۶۹ء سے لے کر اب تک مختلف صورتوں میں شائع ہوتے رہے ہیں
لیکن غیر معمولی سائنٹیفک انداز میں خطوطِ غالب کا تنقیدی اور تحقیقی اڈیشن پہلی بار مرتب کیا گیا ہے۔

فہرست کتب ڈاکٹر خلیق انجم

۱	معراج العاشقین	۱۹۵۷ء	مرتبہ
۲	تاراس بلبا	۱۹۵۷ء	مترجم، انگلش سے اردو ناول
۳	مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط	۱۹۶۰ء	مترجم، فارسی سے اردو
۴	غالب کی نادر تحریریں	۱۹۶۱ء	مرتبہ
۵	بڑھے چلو	۱۹۶۲ء	مرتبہ
۶	مرزا محمد رفیع سودا	۱۹۶۵ء	مصنف
۷	متنی تنقید	۱۹۶۷ء	مصنف
۸	کربل کتھا کا لسانی مطالعہ	۱۹۷۰ء	(خلیق انجم اور گوپی چند نارنگ)
۹	اصنافِ ادب	۱۹۷۰ء	مرتبہ (قمر رئیس اور خلیق انجم)
۱۰	افاداتِ سلیم	۱۹۷۲ء	مرتبہ
۱۱	اردو کی ضبط شدہ نظمیں		مرتبہ (خلیق انجم اور مجتبیٰ حسین)
۱۲	غالب اور شاہان تیموریہ	۱۹۷۵ء	مصنف
۱۳	ابن الوقت	۱۹۸۰ء	مرتبہ
۱۴	فیض احمد فیض تنقیدی جائزہ	۱۹۸۴ء	مرتبہ
۱۵	سید سلیمان ندوی	۱۹۸۵ء	مرتبہ
۱۶	مشفق خواجہ ایک مطالعہ	۱۹۸۵ء	مرتبہ
۱۷	غالب کے خطوط اول	۱۹۸۴ء	مرتبہ
۱۸	" " " دوم	۱۹۸۵ء	مرتبہ
۱۹	" " " سوم	۱۹۸۶ء	مرتبہ
۲۰	" " " چہارم	زیر طبع	مرتبہ
۲۱	رسوم دہلی	۱۹۸۵ء	مرتبہ
۲۲	مولانا ابوالکلام آزاد	۱۹۸۶ء	مرتبہ
۲۳	دلی کی درگاہ شاہ مرداں	۱۹۸۸ء	مصنف
۲۴	دلی کے آثار قدیمہ	۱۹۸۸ء	مصنف
۲۵	محی الدین قادری زور	۱۹۸۹ء	
۲۶	جوش ملیح آبادی	زیر طبع	مرتبہ
۲۷	انتخابِ خطوطِ غالب	۱۹۸۹ء	
۲۸	آثار الصنادید	۱۹۹۰ء	مرتبہ (تین جلدوں میں)

[...]ہائی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

[...]تاب نما

[...]ت ۱۹۹۶ء جلد ۲۶ شمارہ ۵

[...]چہ 5/=
[...]الانہ 45/=
[...]ممالک سے
(بذریعہ بحری ڈاک) 110/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 230/=
[...]تعلیمی اداروں کے لیے 65/=

اڈیٹر
[...]شاہد علی خاں

[...]دفتر:
[...]بہ جامعہ لمیٹڈ
[...]جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

TELEPHONE. 630191

[...]یں:

[...]جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶
[...]جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
[...]جامعہ لمیٹڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲

[...]کتاب نما میں شائع ہونے والے [...]ت و بیانات نقد و تبصرہ کے [...]خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما [...]ے متفق ہونا ضروری نہیں۔

[...]ستد رکم گر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے [...]ر یکا بجوری پاؤس دریا گنج نئی دہلی میں [...]معہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰ سے شائع کیا

اس شمارے میں

فی زمانہ　طنز و مزاح　یوسف ناظم　۴۰/-
ہندستان میں اقبالیات　ایکسپریس　جگن ناتھ آزاد　۵۰/-
آزادی کے بعد
جگن ناتھ آزاد اور اس کی شاعری۔
شخصیات　مرتبہ حمیدہ سلطان　۵۰/-
امام احمد بن حنبل　سوانح　نور اللہ خاں عزیز　۱۲/-
حضرت فاطمۃ الزہرا　مذہب　کلیم چغتائی　۴/-
ایمان اور آزمائش　مذہب　اخلاق حسین　۵/-
مزاج　شاعری　وسیم بریلوی　۵/-
رنگ و آب　شاعری　سید محمود حسن قیصر امروہوی　۱۵/-
تحریکی شعور　مذہب　نعیم صدیقی　۱۴/-
ہمارے حضورؐ　سیرت پاک　عابد نظامی　۱۰/-
سیرت تابعین　سوانحی حالات　عبدالرحمن رافت پاشا　۳۰/-
بانگ درا (نیا ایڈیشن)　شاعری　علامہ اقبال　۱۵/-
رشید احمد صدیقی کی ظرافت　تنقید　ڈاکٹر شیب الدین اشرف　۴۰/-
زیر آب　انشائیے　ڈاکٹر سید اطہر شیر　۲۶/-
حرف اقدّر　شاعری　شہاب الدین ثاقب　۱۵/-
چمن در چمن　۔　خلیل سمانی　۵/-
بہار میں اردو خاکہ نگاری۔ خاکہ نگاری　حق احمد　۰/-
اردو ادب کی خواتین ناول نگار
تذکرہ　نیلم فرزانہ　۱۰/-
ابوالکلام آزاد کا اسلوب نگارش
(ازادیات)　پروفیسر عبدالمغنی　۴۰/-

بساطِ نظر　(شعری مجموعہ)　رزاق حمید
اکیسویں صدی کا گوتم (افسانے) جلیل عشرت
ٹھلے پلارے　(ماہیا)　دیپک قمر
کلام نقش　(شعری مجموعہ) مہیش چندر نقش
ذہن جدید نمبر ۲ (سہ ماہی) مرتب زبیر رضوی
پگڈنڈی، جنگل سے کھیت تک (بچوں کے لیے معلوماتی
حصہ اول دوم　غلام حیدر
زوال شروع ہوتا ہے (افسانے) مہدی لوٹی
مخدوم کی شاعری کا تنقیدی جائزہ (تحقیقی)
ڈاکٹر منصور عمر
یاروں کا زنداں (شعری مجموعہ) وحید قریشی
خسرو و شیریں (منظوم ڈراما) محمد سمیع الحق
فیضانِ وضو　مذہب　ڈاکٹر سید محمد رحمانی

سرورق ـــ علی جواد زیدی
مصور ـــ شکیل اعجاز

مہمان مدیر
علی جواد زیدی
اے ۵۰۰/۱۵ اگریسن فلیٹ
ہاکائی کیمپس روڈ، اندھیری
ایسٹ، بمبئی ۹۳

اشاریہ

تخلیق کار اور ناقد

ادھر کتاب نما میں کچھ ادارتی ارشادات، کچھ مضامین اور کچھ خطوط ایسے نظر پڑے جن سے گمان گزرا کہ شاید تخلیق کار اور ناقد کے درمیان اگر باقاعدہ رسہ کشی نہیں تو ایک ہلکی سی کشمکش کی ہر ضرور وجود میں آگئی ہے۔ ادیب (جس سے فی الحال اس مضمون کے مقاصد کے لیے ناقد کو الگ رکھ رہا ہوں) اور شاعر کا کام تخلیق ہے اور ناقد کا کام صرف اُس کی جانچ پرکھ ہے اور یہ سلسلہ کچھ نیا نہیں بلکہ بہت پرانا ہے۔ اگر میری رائے غلطی نہیں کرتی تو تخلیق کار شروع سے ناقد کی رائے کا طلب گار رہا۔ آٹھویں صدی عیسوی کی دُرِ نہان؟ اس مصنف نے شاعر کا جو شب و روز کا وظیفہ بتایا ہے اُس میں یہ بات واضح کی ہے کہ اوّل وقت تخلیق کے بعد سہ پہر کو دوسرے ادیبوں کو سنا کر ان کی رائے معلوم کی جائے۔ یہ رائے یقیناً تخلیق کے حسن و قبح سے متعلق رہتی ہوگی اور تنقید، تعمیری تنقید کے ابتدائی نقوش اس میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ ابھی خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے زمانے تک یہ دستور تھا کہ شعرا کے گھروں پر مختصر مجلس شعر منعقد ہوتی تھی جس میں صرف شاعر شرکت کرتے۔ لوگ تعریف و تحسین کے علاوہ کبھی کبھی لغزشوں کی طرف بھی سنبھلا ہوا اشارہ کر دیا کرتے۔ آج بھی ناقد ادبی محاسن و معائب سے تو واقف ہوتے ہی ہیں اکثر صورتوں میں تخلیقی وادیوں کے سیاح بھی ہیں یہ سمجھنا کہ تخلیق کار اور ناقد میں خدا واسطے کا بیر ہے، یا ان دونوں میں کوئی بنیادی تضاد ہے مناسب نہیں کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آل احمد سرور، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، شمس الرحمٰن فاروقی، سب کے یہاں ایک تخلیقی متوازی چلتی رہی ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ تنقید نگاری بھی تخلیقی عمل ایک شکلِ خاص میں نمودار ہوتا ہے۔

آج شاعری اور افسانوں کی صورت میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ مجھے اس کے کہنے میں باک نہیں ہے کہ ان میں سبھی معیاری نہیں ہے اور انھیں یعنی سب کو تخلیق کا درجہ دینا مشکل ہوگا۔ اگر ہر تحریر کو تخلیق، عظیم فن پارہ وغیرہ کہنا شروع کر دے تو صاحب قدرت لکھنے والوں کی صریحی حق تلفی ہوگی۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہو سکتا ہے کہ اگر تحریر ناقابلِ اعتنا ہے تو اُس کی طرف توجہ ہی کیوں کی جائے؟ اُس سے بیگانہ وار گزر جانا بہتر نہ ہوگا؟ یہاں ایک اہم نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ بہت سی تحریریں ہمارے ایسے لکھنے والوں کی ہیں جو ابھی تخلیق کی منزلوں میں نو وارد کی حیثیت رکھتے ہیں، اگر

اُن کے لکھنے کا انداز، لہجہ، طرزِ فکر وغیرہ صلاحیتوں کا پتا دیتے ہیں، تو اُن کا ہمت افزائی اور رہنمائی اور اُن کی صلاحیتوں کی ایسی نشان دہی جو خود اُن کے لیے اور قاریوں کے لیے نتیجہ خیز ہو ضروری ہے۔ صاحبانِ نظر کی ایک بات عام لوگوں کی زور دار واہ واہ کے شور پر بھاری ہوتی ہے اور اُن کے سکوت سے ابھرتے ہوئے تخلیق کار کو مایوسی نہ سہی تو اس کی ہمت شکنی تو ضرور ہوتی ہے۔

صائب دو چیز می شکند قدرِ شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

ان نو واردانِ منزلِ تخلیق کو چھوڑ کر وہ لوگ بھی ہیں جو مدتوں سے مصروفِ سفر ہیں اور جنھوں نے اپنے لیے اپنے فن کے بل بوتے پر اپنے لیے جگہ بنائی ہے، اُن کی طرف ناقدین کا رویہ کیا ہو؟ یہ سوال میرے عزیز دوست رفعت سروش نے آپ کے فروری کے شمارے میں اُٹھایا ہے۔ بدقسمتی سے اُس وقت میں سخت بیمار اور داخلِ اسپتال تھا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد اب موقع ہے کہ اس مسئلے پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکوں۔

ان افکار کو پڑھ کر میرے ذہن عزیز دوست وامق جونپوری کا ایک مضمون گزرا جو انھوں نے کچھ برس پہلے کسی اخبار، غالباً قومی آواز میں شائع کرایا تھا۔ پھر موہن چراغی نے لبیک کہی اور شاید اسٹیبلش منٹ کی بات بھی چلائی تھی۔ یہ دونوں رفعت سروش کی طرح ترقی پسندی کے رفقائے سفر رہے ہیں۔ یہ شاعری کے علاوہ اس بنا پر بھی یاد رکھے جانے کے مستحق ہیں۔ ان پر نقاد اپنا آخر فیصلہ کیسے سنا سکتا ہے کیونکہ انھیں تخلیقی سطح پر کچھ منازل اور بھی طے کرنا ہے۔ ماضی ایسے ماضی پر قطب مینار کیسے تعمیر کر سکتا ہے جو جامد نہیں بلکہ ایک سیال حقیقت ہے۔ وامق، رفعت سروش یہ سب اب بھی مصروفِ کار ہیں اور اپنی طرف توجہ مبذول کراتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو شکایت نہ ہونا چاہیے کہ کون کون سا چہرہ فوکس میں زیادہ آجاتا ہے۔

بے شک ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو ایک خاص مکتبۂ فکر کے حامل رہے ہیں۔ کچھ گروہ اں نہیں پر واں کے نکالے ہوئے تو ہیں۔ لیکن مکتبۂ فکر ایک سے زیادہ وجود میں آچکے ہیں۔ ہر ایک کے کچھ نام لیوا ہیں جو اپنے ساتھیوں کو اچھالتے اور مخالفین کو گراتے رہتے ہیں۔ یہ صورتِ حال بھلا ہے کیا غالب اور ذوق کے طرفدار نہیں تھے۔ آخر غالب کو مثنوی نامہ کیوں لکھنا پڑا؟ انیس اور دبیر، استاد مصحفی کے پیرو تو ابتذال سرحدوں کو چھوا کرتے تھے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کیا تخلیق کاروں نے جھنجھلا کے نہیں کہا ہے کہ صلہ نہ سہی گر اس اشعار میں معنی نہ سہی، سچا فیصلہ کرنے والا وقت ہے۔ غالب "برہانِ قاطع" کے سلسلے میں باقاعدہ جنگ لڑنا پڑی اور انھوں نے دوسروں کی طرف سے بھی رسالے لکھوائے۔ پھر آج اگر کوئی استاد اپنے کسی شاگرد کے نام سے مضمون لکھوا یا لکھا تو یہ انوکھی بات نہیں ہوئی۔

مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل نے کہا تھا کہ ہمارے یہاں دانش وری کے کوڑے کباڑ کا ڈھیر لگ گیا ہے۔ اردو والوں میں دانش وری کی وہ بہتات تو نہیں، لیکن کوڑا کباڑ کم نہیں ہے۔ اس سے برگشتہ خاطر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ کوڑا بھی تخلیقی عمل کا ایک شاخسانہ ہے ہمیں یہ ماننا پڑے گا

دی کے بعد لکھنے والوں کی تعداد میں، مطبوعات کی تعداد میں، پڑھنے والوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا
ہے۔ معیاری چیزیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن رطب و یابس بہت کچھ ہے۔ ہم پر ایک ضرب یہ پڑی ہے کہ کاغذ
قیمتیں اور کتابت و طباعت کی شرحیں بھی کئی گنا بڑھ چکی ہیں۔ اس لیے چھوٹی سے چھوٹی ضخامت کی کتب
قیمت بھی اردو کے عام قاری کی قوتِ خرید کے باہر ہو گئی ہے۔ رفعت سروش صاحب نے صحیح
ہا ہے کہ اب کتابیں لائبریریاں خریدتی ہیں یا پھر چند سر پھرے قاری۔ میں ایک بار علی گڑھ میں اردو
تابوں کی ایک دکان پر گیا۔ اس سے کتابوں کی بکری کا حال چال پوچھا۔ اس نے کہا کہ بس
کورس کی کتابیں نکل جاتی ہیں۔ میں نے کہا یہاں اتنے ادیب، شاعر، لکچرر، ریڈر، پروفیسر ہیں، کہنے
لگا کہ یہ لوگ تو خریدتے ہی نہیں۔ ان کو کتابیں ہدیے میں مل جاتی ہیں۔" یہی تو تخلیق کاروں کے مربی
وسکتے تھے انھیں سے تو خستگی کی داد پانے کی توقع تھی لیکن ان کے یہاں یہ صورت نکلی۔ شعری مجموعوں کے
م فروخت کی شکایت ایک حقیقت بیانی ہے لیکن اس سے مفر اس لیے نہیں ہے کہ ہر بوالہوس نے
حسن پرستی شعار کی۔ اتنی کثیر تعداد میں شعری مجموعے نکلتے ہیں کہ عام لوگ خرید سکتے ہیں نہ ناقدین کی ان
ک رسائی ہو سکتی ہے۔ جیسے تیسے نکلتے ہیں یا نہیں نکلتے اور مفت تقسیم ہوتے ہیں یا پنساری کے ہاتھوں
ن کی عزت افزائی ہوتی ہے یا پھر کیڑے مکوڑے قدرداں بن جاتے ہیں۔ امریکہ کے بعض کتب
دوستوں کے یہاں بھی دیکھا تو ادبی رسائل کی بے قدری تھی اور شاعری کی کتابیں الماریوں پر کم نمایاں
ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ انسان ایک ذی عقل حیوان ہے اشاید یہ اس کی عقل کا کرشمہ ہو! مجھے اس
نزل پر بھی برٹرینڈ رسل کا یہ قول یاد آتا ہے کہ "مجھے تو اپنی طویل زندگی میں اس بیان کے ثبوت
تلاش رہی (کہ انسان ذی عقل ہے)۔ کئی ممالک اور کئی برّاعظموں میں تلاش کے باوجود اس ثبوت
کے حصول کی خوش نصیبی میرے حصے میں نہ آئی۔ اس کے برعکس میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ دنیا
زر بھی دیوانگی میں ڈوبی جا رہی ہے۔" اس اعلا سطح پر نہیں ذرا نیچے کی سطح پر اتر کر ذی عقل انسانوں
تلاش کریں تو بہت ہیں۔ آخر وہ جاسوسی ناول زیادہ پڑھتے ہیں۔ وہ سینما کے رسالوں کا مطالعہ زیادہ
کرتے ہیں۔ میں نے تو دو ایک بار دیکھا ہے کہ لوگ چمکتے دمکتے انگریزی فلم رسالے خرید لیتے ہیں۔
زال ماے کر خود اس عظیم زبان سے نا آشنا محض ہوتے ہیں۔ البتہ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے
م پڑھ لیتے ہیں اور ان کے جسم کے خطوط و دوائر کا ہر پہلو سے مطالعہ کرتے رہتے ہیں! کتابوں
نا فروخت پر سب سے بڑی چوٹ ترسیل عامہ کے وسائل کے فروغ سے بھی پڑی ہے۔ ریڈیو ٹی وی
ے سارا علم، سارا ادب، ساری کج اخلاقی یا خوش خلقی سیکھ لی جاتی ہے! ان سب کا اثر اردو رسائل
ر پڑا ہے۔ آج "شاعر" "سب رس" کی طرح کے کتنے رسائل ہیں جو خوش اسلوبی سے نکل رہے ہیں۔
ہں ان رسائل کی بات نہیں کر رہا ہوں جو سرکاری اداروں یا اکادمیوں کی جانب سے شائع ہو رہے
ں۔ جو دوسرے رسالے نکلتے ہیں جو جلد یا بدیر بند ہو جاتے ہیں، یا گنڈے دار نکلتے ہیں، یا دو ماہی
ر سہ ماہی کی شکل میں شائع ہونے لگتے ہیں۔ ایسے ماحول میں "ہما" "ھدیٰ" "شمع" "بیسویں صدی"
ت غنیمت ہیں۔ ثقافتی اور مذہبی سطح پر "معارف" "باقیات الصالحات" میں ہے اور یہ بڑی بات ہے
ایک معیار قائم کیے ہوئے ہیں۔ نقاد اس بڑے کینوس میں ایک بہت چھوٹا سا نقطہ ہے۔ مسئلے کو

سچ ورنہ ظر ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو!

ایسی فضا میں ضابطہ کاری یا گروہ بندی کی بات کی تو جا سکتی ہے، لیکن اس میں شاعرانہ مبالغہ آمیزی یا ذاتی تلخی یا انفرادی ترشی سے مفر نہ ہوگا۔ ضابطہ کاری سے اگر بھیمڑی کانفرنس کا دور مقصود ہے تو وہ دور مدت ہوئی گزر چکا ہے اور اس سے نقصان انفرادی تخلیق کاروں کو کم تحریک کو زیادہ پہنچا۔ بہر حال مدت ہوئی وہ دور بیت گیا، افسانہ ہو چکا۔ پھر گروہ بندی سے اگر یہ مراد ہے کہ ترقی پسند آپس میں ایک دوسرے کی ثنا و صفت یا انحراف کرنے والوں کی منفعت کرتے ہیں تو اس کا رونا عبث ہے۔ نظریاتی عنصر کے شاملِ حال ہو جانے کے بعد یہ سب لازمی، فطری اور لابدی ہے۔ آخری نئی نسل، کا نعرہ لگانے والوں نے یہی کیا تھا۔ غیر مشروطیت کی قید عائد کرنے والوں نے اسی طرح کی چار دیواریاں کھڑی کی تھیں۔ اس سے جو لوگ گھبرا گئے، وہ لوگ تخلیق کاری میں وہ خلوص، جوش، سرگشتگی نہیں رکھتے تھے جس کا آج مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ نظریوں اور تنقیدی رجحانات سے وابستہ ناقدین میں سے بعض کا رویہ جارحانہ رہا ہو لیکن شکایت کرنے والے تو قاضی عبدالودود صاحب اور رشید حسن صاحب جیسے مخلص ناقدین پر بھی جارحیت کا الزام لگاتے ہیں۔ آخر ہم اتنے تنگ مزاج اور زود رنگ کیوں ہوتے جاتے ہیں اگر ناقد یہی سوچنے بیٹھ جائے کہ اُس کی تنقید سے فلاں ناراض ہو جائے گا تو پھر اُسے کاروبارِ قرطاس و قلم سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ اگر ہر ناقد کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ کوئی وہی بات بہت نرمی سے یوں کہتا ہے جیسے معالج کڑوی دوا شکر میں لپیٹ کر دے رہا ہو اور کوئی بقول جوشؔ اُبل پڑتا ہے!

استعاروں میں بیان کرنے کے دن باقی نہیں
داستاں اب صاف لفظوں میں سنانی چاہیے

میرے خیال میں اچھی تنقید کو جودتِ طبع کے لیے اور تخلیق کاری کے لیے مہمیز کا کام کرنا چاہیے اور ادیب اور شاعر کو خوب سے خوب تر کی طرف جانا چاہیے، نہ کہ آئے تنقید نگار سے روٹھ کر اپنی تخلیقی قوت، صلاحیت پر بھروسا کھو دینا چاہیے۔

صرف یہ کہنا فریب میں مبتلا ہونے کے مترادف ہے کہ ضابطہ کاروں کی گرفت سے "کم سے کم ادیبوں کی تین نسلیں شکار ہوئیں"۔ اسی کے مقابل اس حقیقت کو بھی رکھیے کہ کتنی نسلیں اور آزاد اپنی بے راہ رویوں، مغرب کی بے سمجھی بوجھی نقالیوں اور کج رائی پر مبنی تجربوں کا شکار ہوئی ہیں۔ دراصل نقادوں نے پوری طاقت سے اِن لوگوں کو روکا ٹوکا نہیں یا مصلحت آمیز خاموشی پر قانع اور جدت کاروں کے آگے سپر انداختہ ہو گئے تھے۔ وہ تو اب کچھ کچھ ہوش آنے لگا ہے۔

رفعت سروشؔ نے اصل بات جو پوری ذمّے داری کے ساتھ کہی ہے وہ یہ ہے کہ اب ادیب اور شاعر کے یہاں خود شناسی کا عمل شروع ہوا ہے۔ اس خود شناسی کی بنیاد عمیق مطالعے پر رکھے بغیر نہیں چلے گا۔ جسے آزادیِ فکر کا نام دیا جاتا ہے وہ خلا میں نہیں بلکہ عالمی کاروانِ فکر کے پس منظر میں اُبھرتی ہے اور ایک خاص خلاقانہ جرأت چاہتی ہے۔ اس کے لیے ریاض اور فکر دونوں ضروری ہیں۔ ان کی کمی کو کسی ناقد کی بیساکھی پورا نہیں کر سکتی۔ دیکھنے میں یہ آ رہا ہے کہ شاعروں اور ادیبوں

اس کو بے سود سمجھتا ہے۔ جہاں ٹھوکر کھاتا ہے اُسے تجدید یا تجربہ کہ کر چھپانا چاہتا ہے۔ نتیجہ
یق اپنے ثقافتی مزاج کی توانائی روایت کے ارتقائی تسلسل اور گرد وپیش سے مطابقت رکھنے
ت کی گرمی سے عاری ہوتی جا رہی ہے۔ غریب نقاد پر اگر کوئی الزام لگایا جا سکتا ہے تو یہ ہے
ہورتِ حال کے خلاف بھرپور صدائے احتجاج بلند کیوں نہیں کرتا۔

بعض فیاض صفت نقاد ہر اُبھرتے ادیب و شاعر کے یہاں نیا اور منفرد لہجہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔
ا تو مربیانہ تعجیل کے ساتھ اُسے عظیم تسلیم کرانے کی کوشش بھی کرنے لگتے ہیں۔ ایسی فیاضی سے
اچھا ہے۔ یہ متعلقہ ادیب و شاعر کے دل میں تکمیل کی ایسی آسودگی پیدا کرتی ہے جس سے
ور یاض کا جذبہ ہی فنا ہو جاتا ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ جناب الف یا جناب جیم کی گفتگو کرتے
غالب، میر، اقبال اور فیض کی عظمتوں کا پیوند لگا دیا جاتا ہے۔ و نے گرد وپیش امروز فرد اسئے۔
ں پیوند کاری سے یکسر غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ شاعر ایک خاص تاریخی ماحول اور انفرادی اکتساب
ار ہے۔ فیض غالب نہیں بن سکتے تو جناب الف فیض کیسے ہو سکتے ہیں۔ ایسی دوست نوازی
ہیز کا آغاز تو ہو جانا ہی چاہیے۔ اس سلسلے میں ناقدین سے کوئی باز پرس کرنے نہیں آئے
زن تنقید و تعریف صحت مند مستقبل کی تعمیر کرتے ہیں اور اُبھرتے تخلیق کاروں کو ہمیشہ اس کی
ار ہے گی۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ جو ادبا اور شعرا اپنے لیے ایک جگہ محفلِ ادب میں بنا چکے ہیں، ان کی طرف
خاص توجہ کریں۔ ناقد کا کام افراد اور شخصیتوں کو آگے بڑھانا یا پیچھے ڈھکیلنا نہیں ہے۔ اس
رفتارِ ادب پر بحیثیت مجموعی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں افراد کا ذکر ناگزیر ہے۔ خاص
ف اُن افراد پر ہو سکتی ہے جو رجحان، لہجہ، یا مجموعی کیفیت کے اعتبار سے بیحد نمایاں ہوں۔ اب
یہ المیہ کس سے بیان کرے؟ اس سے مختلف گوشوں سے روز فرمائشیں ہوتی رہتی ہیں کہ سیر
مضمون لکھ دیجیے، یہ ممکن نہ ہو تو تاثرات ہی لکھ بھیجیے۔ فلیپ کے لیے ہی چند جملے رقم کر دیجیے
وقت ایسی دس دس فرمائشیں جیب میں یا میز پر پڑی رہتی ہیں۔ زیادہ تر جانی پہچانی شخصیتیں
دست ہیں یا اُن کے دوست ہیں وہ اپنے دستِ خاص سے تحریر فرماتے ہیں کہ فلاں گم نام
خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے وہ تمہارے مضمون کے بغیر نامکمل رہے گا۔ مدیر سے لکھواتے ہیں
ب سے اصرار کراتے ہیں۔ یاد دہانیاں کرائی جاتی ہیں ظاہر ہے کہ یہ محبت و خلوص کے مظاہرے ہیں
ان گروہی سازش سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ان متواتر اور پُر خلوص فرمائشوں کے آگے
اب تاب و مت نہیں رہتی۔ ناقد انسان بھی تو ہے۔ اس گھاگھمی میں تنقید کا معیار گرتا ہے۔ تعجیل کی
بعض اوقات سطحیت بھی آجاتی ہے لیکن اس کی پروا نہیں کی جاتی بلکہ ایسی تمام تحریروں کی خوب
ئی ہوتی ہے، صاحبانِ بصیرت کو چاہیے کہ عبرت حاصل کریں۔ پھر کوئی دیرینہ رفیق سفر ہمیشہ کے
ڑ جاتا ہے تو دل خود تڑپ اٹھتا ہے۔ اس پر کم سے کم ایک تاثراتی مقالہ تو سپردِ قلم کرنا ہی
اور وہ فلاں مضمون اور کتاب کا ایک حصہ منتظرِ تکمیل ہے۔ اب بیچارہ سرگشتۂ روایات ناقد، نام
رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہتا ہے اور شکایت برقرار رہتی ہے۔ وہ سب کو خوش نہیں

کرسکتا۔ صرف چند افراد یا رجحانات پر ہی توجہ کرسکتا ہے۔

اچھا صاحب ناقد نے محنت کر کے کچھ لکھا اور بھیجا اور وہ شائع کہاں ہوا جس کا سرکولیشن محدود ہے۔ اگر اس ریاض سے اہل نظر ہی واقف نہ ہوتے تو فائدہ ہوا۔ اب برہانِ سخن گر یہ سخنداں کوئی ناقد خود سے کچھ لکھنے کا قصد کرتا ہے تو سب سے پہلے اچھے اور معیاری رسائل کی فقدان کی پہنچی ہوئی کمی ولولوں کو دبا دیتی ہے۔ جو چند اچھے رسائل ہیں، ان میں سرکاری اور اکادمیوں کے رسائل کو بھی ملا لیجیے تو انھیں میں بار بار کہاں تک چھپے گا۔ اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں کوشش کرنا چاہیے کہ ہمارے موجودہ رسائل کتاب نما، شاعر، آج کل وغیرہ کے خریداروں کا حلقہ وسیع ہو۔ مزید اچھے اور معیاری رسائل اور جرائد نکلیں اور دیر پا ہوں۔ ہم ارباب حیثیت سے مل کر سفارش کریں کہ وہ رسائل ضرور خریدیں بلکہ اُن کی مالی اعانت بھی کریں اور نئے رسائل نکلوانے میں معاون ہوں، بھی مفت خواندگی کی عادت ترک کریں، کم از کم وہ ادیب اور شاعر جو چندہ دے سکتے ہیں ضرور دیں یہ رسائل حقیر ہی رقم سہی اچھے لکھنے والوں کو بطورِ معاوضہ دیں۔ ترقی یافتہ زبانوں کی صف میں کھڑے ہونے کے لیے قربانیاں تو سبھی کو کرنا ہوں گی۔ صرف حکومتوں کے سامنے کاسۂ گدائی پھیلانے اور طعنوں کام نکالنے کا منصوبہ بناتے رہنے سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ جب تک یہ مختصر پیمانے کا کام منظم طور سے نہیں ہوگا، ایک افراتفری پھیلی رہے گی اور غیر صحت رجحانات پرورش پاتے رہیں گے جس کی زد میں ناشر، ادیب، ناقد، کتب فروش سبھی رہیں گے۔ جب کئی رسالے نکلیں گے تب تنقید اچھی پھلے پھولے گی۔ ویسے یہ ایک معجزے سے کم نہیں ہے کہ تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود ہماری تنقید گزشتہ کچھ دہائیوں سے غیر معمولی توانائی اور حرکت کا ثبوت دیا ہے، لیکن ناقدین کے حلقے وسعت اور تنوع تبھی آئے گا جب ہمارے ادبی رسائل کی حالت بہتر ہونے لگے گی۔

ڈاکٹر سیفی پریمی
"نگارستان" ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

وہ عارض گلابی، وہ گیسو گھنیرے — اُسی سمت ہیں دیدہ و دل کے پھیرے

الگ سب کے رستے، الگ سب کے ڈیرے — لبوں کے ورق ہیں وُہی میرے تیرے

اُجالے کی رُوداد، وہ دل لکھے گا — کہ جس دل سے پسپا ہوئے ہیں اندھیرے

بڑا فرق ہے میرے تیرے جہاں میں — اُدھر ظلمتِ شب، اِدھر ہیں سویرے

قلم یاد رکھے گا، یہ مرحلہ بھی — کہ ہم رنگ ہی اصل دشمن تھے میرے

کسی سے کبھی "آپ بیتی" نہ کہنا — اُمڈ آئیں گے ہر طرف سے اندھیرے

خلوصِ دل و جاں، مری کم نگاہی — فریبِ مسلسل بھی "احسان" تیرے

وہ اک وعدۂ جامِ سرشار و رنگیں — وُہی شام، لیکن ہزاروں سویرے

ہر اک فتنہ گر، دیکھ لے، رنگِ سیفی
اُسی آشیانے میں سُکھ کے بسیرے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی اہم کتابیں

پہچان اور پرکھ　　پروفیسر آل احمد سرور

اس مجموعے میں پروفیسر آل احمد سرور کے جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق زیادہ تر شاعروں اور شاعری کی خصوصیات سے ہے میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، حسرتؔ، فانیؔ، جگرؔ اور فراقؔ کی شخصیات اور شاعری پر بھرپور مضامین کا اہم مجموعہ۔　　قیمت: ۵۱/-

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم
ڈاکٹر سلامت اللہ

اس کتاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے جن مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے وہ مصنف کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے کہ اس کے تاریخی اور حالیہ شواہد موجود ہیں۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کی اہم ترین تصنیف۔
قیمت: ۵۱/-

اقبال کا نظریۂ خودی　　عبدالمغنی

اس کتاب میں نظریۂ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کر کے اقبال کے پورے نظام فکر کی تلاش کی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی شاعری کی حقیقی جہت واضح ہو اور دوسری طرف آج کی انسانیت کو اپنے ارتقا کی صحیح سمت دریافت کرنے میں سہولت ہو۔　　قیمت: ۱۵۰/-

پت جھڑ کی آواز　　قرۃ العین حیدر

برصغیر کی ممتاز ترین افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کی اہم کہانیوں کا مجموعہ۔ یہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور زندگی کی صحیح عکاسی بھی کرتی ہیں۔　　نیا اڈیشن قیمت: ۷۵/-

جدید افسانہ اور اس کے مسائل　　وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔　　قیمت: ۳۶/-

لکھنؤ تہذیب کا نمائندہ شاعر

قلندر بخش جرأت　(خطبہ)　جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸ نومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سیمینار میں پیش کیا۔
قیمت: ۱۰/-

غبار منزل　(شعری مجموعہ)　غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا تازہ مجموعہ جس میں ساز لرزاں "ذوق سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے۔　　قیمت: ۴۵/-

تاریخ اودھ　　قاسم علی نیشاپوری

"تاریخ اودھ" معروف بہ "تاریخ شاہیہ نیشاپوریہ" اودھ کی اہم تاریخ ہے۔ قاسم علی نیشاپوری نے اسے فارسی میں لکھا تھا ڈاکٹر شاہ عبدالسلام نے نہایت محنت سے اس کو اردو کا جامہ پہنایا۔　　قیمت: ۲۷/-

فی الحقیقت　　یوسف ناظم

طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں یوسف ناظم کو اہم مقام حاصل ہے۔ ان کی تحریریں نہایت ذوق و شوق اور توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔ "فی الحقیقت" ان کے تازہ ترین طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔
قیمت: ۵/-

بلراج کومل
۱۲ کالکاجی، نئی دہلی ۱۹

سیلانی

ہاں جہاں سے گزر گیا
ذہن کے
مختصر سے وجود کے
لج ادا سے نقوش
لفظوں کی صحبتوں میں
کچھ ایسے تقسیم کر گیا
یں تہی دست تھا مگر
ساری ناداریوں پہ اپنی سخاوتوں کا گماں ہوا
لوگ
مجھ کو مسافتوں میں ملے تھے
میرے عزیز تھے
اجنبی تھے
یا دوست تھے
یا وہ دشمنِ جاں تھے
جو بھی تھے
غنی تھے

بہتر تھے، با اثر اور عظیم تر
مجھ پہ قربتوں کی
محبتوں کی
کدورتوں کی
عداوتوں کی
ہزار رشتوں کی تازہ کاری کی
برہمی کی
متاعِ نایاب
روز و شب میں
کچھ اس طرح سے لٹا گئے
مرا رزق بے انتہا ہوا
وہ جو میری ادنا سخاوتوں کا
گماں زدہ سا خمار تھا
مرے ذہن و دل سے اتر گیا
نئی ساعتوں کے طلوع میں
میں کہیں کہیں سے سنور گیا

پروفیسر نظیر صدیقی
مکان نمبر ۱۹۱۵۔ گلی نمبر ۱۱
آئی۔ ۱۰/۲
اسلام آباد

ایک سکنڈ ہینڈ مطالعہ

بیسویں صدی میں مغربی ناول کی تنقید کے چند بنیادی دستاویزات اور رجحانات

ہمارے یہاں ناول کس طرح سے پڑھا جاتا ہے۔ پڑھایا جاتا ہے اور لکھا جاتا ہے اس کے بارے میں ناول کی تنقید میں اب تک کچھ لکھا نہیں گیا۔ جبکہ یورپ اور امریکہ میں ان مسائل پر ناول کی روایتی رسمی تنقید سے لے کر حالیہ تنقید تک جس میں ساختیات، لاتشکیل اور مارکسزم زیر بحث رہی ہے، بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور لکھا جا رہا ہے۔ اردو ادب کے نقاد، پروفیسر صاحبان بعض مقالوں، کتابوں، مصنفوں، رجحان سازوں، اور رجحانات کے حوالوں سے اپنے مضامین کو سجا تو لیتے ہیں لیکن اردو ادب کے قارئین کو اس بات کا پتا نہیں چلنے دیتے کہ یورپ اور امریکہ میں ناول کی تنقید پر کتنی زبردست بحثیں ہوتی رہی ہیں اور کتنی معرکہ آرا کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

اس کمی کے کئی اسباب گنوائے جا سکتے ہیں۔ پاکستان میں مغربی ادب اور فلسفے کی اہم ترین کتابیں بڑی حد تک نایاب ہیں۔ مغرب کی ہر علمی، فکری، اور ادبی تحریک جب دس بیس سال پرانی ہو جاتی ہے یا جب اس تحریک کو ختم ہوئے دس بیس سال گزر جاتے ہیں تو اس سے متعلق کچھ مقالے اور کتابیں ہماری دسترس میں آتی ہیں۔ اردو کے جن دو چار ادیبوں اور نقادوں کو یورپ جانے کے مواقع ملتے رہتے ہیں وہ بھی اپنی کسی کمی کی بنا پر نہ تو یورپ اور امریکہ کی بہترین کتابوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں نہ اردو ادب کو ان کتابوں کی مدد سے فائدہ پہنچاتے ہیں۔ دراصل یہ کام ہے بھی بڑی دماغ سوزی اور جگر کاوی کا جس میں ہمارے ذاتی مسائل کی کثرت، اقتصادی عدم تحفظ اور ذہنی یکسوئی کی کمی عموماً مانع آتی رہتی ہے چنانچہ کی بھاگ دوڑ میں جتنا کچھ ہو سکتا ہے اردو ادب میں اتنا ہی ہوتا رہا ہے اور اگر مدتوں اتنا ہی ہوتا رہے گا۔ جس قوم اور جس معاشرے میں علم و حکمت اور شعر و ادب کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو وہاں اس سے زیادہ ہو بھی کیا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا عنوان کے تحت اس وقت جو کچھ میں لکھ رہا ہوں وہ بھی کچھ اسی قسم کی بھاگ دوڑ والی کاوش کا نتیجہ ہے۔ جس آدمی کی بہترین توانائی انٹرمیڈیٹ اور بی اے کے طلبہ کو پڑھانے اور جس کی ذہنی پختگی کے چودہ سال اوپن یونیورسٹی جیسی یونیورسٹی میں ضائع ہوئے

ں. وہ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتا ہے۔

اس وقت جو کچھ میں لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ میرے ذاتی مطالعے اور ذاتی
رو فکر کا نتیجہ نہیں ہے۔ دراصل اس وقت میرے سامنے ایک امریکی نقاد پروفیسر ڈینیل
شوارز (DANIEL R.SCHWARZ) کی ایک اہم تصنیف THE HUMANISTIC HERITAGE پڑی
ئی ہے۔ کاش میرے پاس اتنی صلاحیت، توانائی اور وقت ہوتا کہ میں اردو میں اس کتاب
ترجمہ کر سکتا یا کم از کم میں اس کتاب کا ایک اچھا خلاصہ تیار کر سکتا۔ مگر میں اس کام کو بھی
یز بس سے باہر ہی محسوس کر رہا ہوں۔ پھر بھی اس کتاب کی کچھ جھلکیاں دکھائے بغیر
ن نہیں آرہا ہے۔ ان جھلکیوں کی حیثیت ایک سیکنڈ ہینڈ مطالعے سے زیادہ نہیں۔ لیکن
را خیال ہے کہ اگر فرسٹ ہینڈ مطالعہ ممکن نہ ہو تو سکنڈ ہینڈ مطالعہ بھی بے سود نہیں ہو سکتا
بس طرح قومی زندگی کے بعض ادوار میں بقول اقبال تقلید اجتہاد سے بہتر ہوتا ہے اور ادبی
ریخ کے کسی دور میں ترجمہ تخلیق سے مفید تر ثابت ہو سکتا ہے اسی طرح بعض اوقات سیکنڈ ہینڈ
مطالعہ فرسٹ ہینڈ مطالعے سے زیادہ معلومات افزا اور خیال افروز ثابت ہو سکتا ہے۔ اس
مضمون کا مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ ناول کی تنقید کیا معنی رکھتی ہے۔ اس میں کون سے مباحث
بحث نظر رہے ہیں اور یورپ اور امریکہ میں ادب کی یہ شاخ کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔

پروفیسر شوارز کی یہ تصنیف ناول کی تنقید سے متعلق حالیہ کتابوں میں شمار کی جا سکتی
ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ ہمارے ادب کے قارئین بلکہ ناقدین تک کو یہ
جھن ہو سکتی ہے کہ آخر یہ شوارز نامی بزرگ ہیں کون؟ ہم نے تو کبھی ان کا نام بھی نہیں
نا۔ دراصل نام تو ہم نے بہتوں کے نہیں سنے ہیں لیکن ہمارا ان سے واقف نہ ہونا ہماری
مدانی کا ثبوت ہے نہ کہ ان کی ہیچ مدانی کا۔ یہ صحیح ہے کہ پروفیسر شوارز امریکہ کے بین الاقوامی
ہرت رکھنے والے نقادوں میں سے نہیں ہیں۔ لیکن یورپ اور امریکہ میں یونیورسٹیوں کے
ڈرار اور اسسٹنٹ پروفیسر صاحبان تک ایسی کتابیں لکھ رہے ہیں جنھیں اردو کے پروفیسر
احبان (گریڈ ۲۰ پانے والے پروفیسران) بھی ٹھیک سے سمجھنے کا دعوا نہیں کر سکتے۔
ن کی بلندی اور ہماری پستی کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔

پروفیسر شوارز کی علمی اور تنقیدی حیثیت کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ
ل تو وہ فکشن کے ماہرین میں سے ہیں دوسرے یہ کہ انھوں نے کونریڈ اور جیمس جوائس
ے دیو ہیکر ناول نگاروں پر بڑی فکر انگیز کتابیں لکھی ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں
ن جیسے اور بھی کئی ہوں گے لیکن برصغیر کی یونیورسٹیوں میں مجھے تو ان جیسا کوئی ایک بھی
ر نہیں آتا۔

پروفیسر شوارز نے ناول کی اینگلو امریکن جمالیات پر گفت گو کے لیے ناول کی تنقید سے
لق جن تنقیدی شاہکاروں کو منتخب کیا وہ حسب ذیل ہیں:۔

فکشن سے متعلق ہنری جیمس کی تنقید

۲۔ پرسی لبوک تصنیف	THE CRAFT OF FICTION (1921)
۳۔ ای ایم فورسٹر کی تصنیف	ASPECTS OF THE NOVEL (1927)
۴۔ ایف آر لیوس کی تصنیف	THE GREAT TRADITION (1948)
۵۔ ڈوروتھی وان گھنٹ کی تصنیف	E ENGLISH NOVEL : FORM AND FUNCTION ON (1953)
۶۔ ای آن واٹ کی تصنیف	THE RISE OF THE NOVEL (1957)
۷۔ ایرخ آئرباخ کی تصنیف	MEMESIS (1953)
۸۔ نورتھروپ فرائی کی تصنیف	ANATOMY OF CRITICISM (1957)
۹۔ وین بوتھ کی تصنیف	THE RHETORIC OF FICTION (1961)
۱۰۔ فرینک کرموڈ کی تصنیف	THE SENSE OF AN ENDING (1967)
۱۱۔ ناول کی مارکسی تنقید از آرنلڈ کیٹل اور ریمونڈ ولیمس	THE FORM OF VICTORIAN FICTION (1968)
۱۲۔ جے ہلس ملر کی تصانیف	FICTION AND REPETITION (1982)

برٹش کاؤنسل اور امریکن سینٹر لائبریریوں کا خدا بھلا کرے کہ ان کی بدولت مندرجہ تصانیف ایک آدھ کو چھوڑ کر برصغیر کے قارئین کو دستیاب رہی ہیں۔ لیکن اردو ادب ناقدین کو کبھی توفیق نہ ہو سکی کہ گذشتہ ۴۴ سال کے دوران جب کہ ان میں سے بیشتر کتابیں لک گیئں اور ناول کی تنقید کی کلاسکس تسلیم کر لی گیئں وہ ان میں سے کسی بھی کتاب کو ا مضامین کا موضوع بناتے اور بتاتے کہ مغرب میں ناول کی تنقید کیا رنگ و رخ اختیار کر ہے۔ ویسے یہ کام اتنا آسان تھا بھی نہیں۔ ان کتابوں کو چبانا اور ہضم کرنا کارے دارد بات ہے۔ اردو کے بعض جدید نقاد جدیدیت سے اپنی واقفیت کے ثبوت کے طور پر کبھی کبھ مندرجہ بالا نقادوں میں سے دو ایک کے حوالے دے لیتے ہیں۔ لیکن ان میں سے زیادہ نقادوں کے سرسری حوالے بھی نہیں آتے۔

پروفیسر شوارز کو اعتراف ہے کہ مندرجہ کتابوں کی فہرست جامع اور مانع نہیں۔ اگ انھوں نے ناول کے بڑے نقادوں میں ڈی ایچ لارنس، ہیری لیون، اور لوکاچ جیسے نقادوں کو شامل نہیں کیا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی جواز ان کے پاس ہوگا۔ انھوں نے اپنی کتا میں جن بڑے انگریزی ناولوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے ان کے نام یہ ہیں:۔

1. TOM JONES	BY HENRY FIELDING
2. TRISTRAM SHANDY	BY LAWRENCE STERNE
3. EMMA	BY JANE AUSTIN
4. BLEAK HOUSE	BY CHARLES DICKENS
5. WUTHERING HEIGHTS	BY EMILY BRONTE
6. VANITY FAIR	BY WILLIAM THACERAY

7. JUDE OF OBSCURE BY THOMAS HARDY
8. LORD JIM BY JOSEPH CONRAD
9. THE RAINBOW BY D.H.LAWRENCE
10. ULYSSES BY JAMES JOYCE

یہ ناول بیانیہ تکنیک، اسالیب، کردار نگاری، اور ہیئت کے تنوع کی عکاسی کرتے ہیں۔
ہنری جیمس کو انگریزی میں ناول کی تنقید کا باوا آدم تسلیم کیا گیا ہے۔ انیسویں صدی کے فرانسیسی فکشن کی بحث میں کاریگری (CRAFT) کا غلبہ دیکھ کر جیمس کے ذہن پر کاریگری کی اہمیت نقش ہو گئی۔ لیکن فکشن کے آرٹ سے انتہائی گہری دلچسپی کے باوجود تکنیک سے متعلق اس کی بحث زندگی کی ترجمانی سے ہمیشہ مربوط رہی۔ پرسی لیوک نے اپنی کتاب THE CRAFT OF FICTION میں جیمس کے اصولوں کو منضبط کر دیا۔ ای ایم فورسٹر کی کتاب ASPECTS OF THE NOVEL افسانوی کرداروں کے انسان ہونے پر زور دیتی ہے۔ اور آرٹ کو ایک ناقابلِ فنا معما قرار دیتی ہے۔ لیوس کی اہمیت ناول کے اندر اخلاقی شدت کی جستجو پر منحصر ہے۔ میتھیو آرنلڈ کی طرح وہ بھی اعلا سنجیدگی پر زور دیتا ہے۔ واٹ، کیٹل اور ولیمس تینوں پر لیوس کا گہرا اثر رہا ہے۔ ان تینوں نے ناول کی ایک ایسی جمالیات دریافت کی جو ناول نگاری میں سماجی، سیاسی اور تاریخی عوامل کی کارفرمائی کے وسیع جائزے پر مبنی ہے۔ لیوس کی طرح یہ تینوں ناول کے طریق پیشکش سے کم دلچسپی رکھتے ہیں اور اس دنیا کی صفت اور نوعیت پر زیادہ نظر رکھتے ہیں جس کی تصویر ناول میں پیش کی گئی ہے۔ واٹ نے اپنی مشہور تصنیف THE RISE OF THE NOVEL میں ناول کی ہیئت اور اس کے تاریخی تقدم یا پس منظر کے باہمی رشتے کو اجاگر کیا ہے۔ ناول کے موضوع کے ان مضمرات پر غور کرنے اور یہ دکھانے میں کہ لوگ کس طرح اپنی بستی اور برادری میں رہتے ہیں اور ان کے ذاتی رشتے کس طرح کے ہوتے ہیں آرنلڈ کیٹل اور ریمونڈ ولیمس کی مارکسی تنقید لیوس کی اتنی ہی ممنون ہے جتنی کہ مارکس اور اینگلز کی اور وہ مارکسی تنقید برطانوی تجربیت اور قطعیت (EMPIRI-CISM AND POSITIVISM) کی روایت کے دائرے سے تعلق رکھتی ہے۔
امریکہ میں وان گھنٹ اور مارک اسکورر (MARK SCHORER) فکشن پر نئی تنقید (NEW CRITICISM) بیسویں صدی کی ایک نہایت اہم اینگلو امریکن تحریک کے اصول استعمال کر رہے تھے۔ نئی تنقید نے اس بات پر زور دیا کہ ہر فن پارے کا اپنا ایک وجود ہوتا ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ اسے خود اس کی اصطلاحوں میں پرکھا جائے۔ لیکن جہاں تک وان گھنٹ اور مارک اسکورر کا تعلق ہے امریکہ میں ناول کی تنقید نئی تنقید کے زیر اثر تکنیک پر اصرار کا غلبہ کم رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا ہے کہ نئی تنقید کے زیر اثر ناول نگاری کی نفسیات اور فلسفے کے بارے میں اہم سوالات کیے گئے ہیں۔ اور زیر غور ناول کی اخلاقی قدروں سے بحث

کی گئی ہے۔

بوتھ کی کتاب RHETORIC OF FICTION اس بات کے سمجھنے کی اہمیت پر زور دیتی ہے کہ قاری جن ناول نگاروں کا شعوری انتخاب کرتا ہے وہ انتخاب کس طرح اس کے ردِعمل کی تشکیل کرتا ہے۔

آئر باخ کی تصنیف MIMESIS اور فرائی کی تصنیف ANATOMY OF CRITICISM بیسویں کی پانچویں دہائی میں تنقید کے متضاد دھاروں کی ترجمانی کرتی ہیں جن میں سے ایک دھارا MIMETIC کہلاتا ہے۔ اور دوسرا HERMENEUTICAL میمیٹک کی اصطلاح ارسطو کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ HERMENEUTIC کی اصطلاح نے ہائیڈگر کے زمانے سے زور پکڑا ہے۔ اس کے معنی ہیں تعبیر کی سائنس۔ آئرباخ کے نزدیک ادب کی قدر و قیمت کا انحصار اُن تاریخی عوامل کی صحیح ترجمانی پر ہوتا ہے جسے وہ بیان کرتا ہے۔ جب کہ فرائی کا خیال ہے کہ ناول نگار ایک ایسا نظام تخلیق کر سکتا ہے جو ادب کے مطالعے کو دنیا کے دوسرے پہلوؤں کے مطالعے سے الگ کر سکتا ہے۔ کرموڈ نے اپنی تصنیف THE SENSE OF AN ENDING میں ان دونوں تنقیدی رجحانات کی تحلیل کی کوشش کی ہے۔ وہ فکشن کی دنیا اور حقیقی دنیا کو اس طرح ملانے کی کوشش کرتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو بامعنی بنانے کے لیے فکشن کو استعمال کرتے ہیں۔ کرموڈ یہ سوال اٹھا کر ناول کی جمالیات اور اخلاقی تنقید کو ملا دیتا ہے۔ کہ فکشن ہماری اپنی زندگی سے کس طرح کے تسلسل (CONTINUITIES) کا حامل ہے۔ اس کا ہماری امیدوں منصوبوں اور ضروریات سے کس طرح کا تعلق ہے۔ بالفاظ دیگر ناول کا مطالعہ ہماری زندگی میں کس طرح کا کردار ادا کرتا ہے۔

ہِلس ملر کی دونوں نظری کتابیں گزشتہ پندرہ سال (بیسویں صدی کے ساتویں اور آٹھویں عشرے میں) کے نظری ارتقا سے تعلق رکھتی ہیں جن میں مظہریات (PHENOMENOLOGY) ساختیات، اور پس ساختیات شامل ہیں۔

تنقید کے بدلتے ہوئے سانچے بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں کی عکاسی کرتے ہیں۔ بیسویں صدی میں فن کار اپنے آپ کو کس طرح تصور کرتے ہیں۔ اس کے تین مرحلے ہیں بیسویں صدی کے آغاز میں ایلیٹ، پاؤنڈ اور جوائس جیسے فن کاروں کی بُت شکن جدیدیت سامنے آتی ہے۔ جو مختلف النوع طریقے سے فرانسیسی علامت نگاری، والٹر پیٹر کی کتاب نشاۃ ثانیہ، آسکر وائلڈ اور ایف ایچ بریڈلے کی شہرہ آفاق تصنیف APPEARANCE AND REALITY سے متاثر ہوئے۔

دوسرا مرحلہ وہ ہے جب عالمی کساد بازاری اور عالمگیر جنگوں کے باعث سیاست اور تاریخ سے زیادہ لگاؤ بڑھا۔ ناول کی مارکسی تنقید اسی دوسرے مرحلے کا جز و ہے۔ اس دوسرے مرحلے میں متن کو اسلوب پر اور حقیقت نگاری کو تخیل پر ترجیح دی گئی ہے۔

دوسری جنگ عظیم اور اس کی عالمگیر تباہیوں کے بعد تیسرے مرحلے کو

ن 'تھیٹر آف دی ایبسرڈ'، فرانس کے نئے ناول، کریہہ الصوت موسیقی جیسی
ن ہیں دیکھا جا سکتا ہے۔
ساختیات اور امریکہ کی نئی تنقید میں بہت کچھ مشترک ہے۔ دونوں ادبی تصنیف
(SYSTEM) قرار دیتے ہیں۔ گو نئی تنقید نے نظام کی اصطلاح سے بچنے کی کوشش
۔ کیونکہ نظام کی اصطلاح ان میکانکی اور سائنسی اقدار کی طرف اشارہ کرتی ہے جن پر نئی
زنی رہی ہے۔
عدم تعبیر یا لاتشکیل (DECONSTRUCTION) مستند مطالعے کے تصور کو جو مصنف کے
ی دریافت یا ادراک پر مبنی ہے رد کرتا ہے۔ وہ ادبی تصنیف میں موضوعاتی سانچے
کرتا ہے۔ اور کتاب کے اندر کی دنیا کا باہر کی دنیا سے مقابلہ کرتا ہے۔ ڈیریڈا جو اس
کا بنیادی نظریہ ساز ہے اس روایتی تشکیل کا جزو ہے جو یہ سوال نہیں اٹھاتی کہ
ے جان سکتے ہیں بلکہ یہ پوچھتی ہے کہ ہم جان بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ وہ اور اس کے مقلدین
ح یا تعبیر کے مستند ہونے پر اعتراض کرتے ہیں۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے
ک ہی متن کی متضاد تشریحیں ہو سکتی ہیں۔ لاتشکیل اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر مطالعے
ر اس کی تردید کے بیج موجود ہوتے ہیں۔ یہ نظریہ مصنف کی بجائے قاری کو خصوصی
یا اختیار دیتا ہے۔ یہ نظریہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہر مطالعہ غلط مطالعہ ہوتا ہے کیونکہ وہ
مطالعہ ہوتا ہے جو کسی تصنیف کے تمام امکانات کا احاطہ نہیں کرتا۔ ڈیریڈا اور اس
لدین اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ کسی تصنیف کے آخری معنی ہوتے ہیں نہ کوئی آخری
لی ہے۔ یہ ناقدین کسی ادبی تصنیف کو ترجمانی یا اظہار تصور نہیں کرتے بلکہ اسے ایسی
پیداوار سمجھتے ہیں جس کے اندر لامحدود ڈھانچے اور ممکنہ معانی ہوتے ہیں۔ یہ
نگاہ قاری کے کردار کو ایک فعال حیثیت عطا کرتا ہے۔ کوئی تصنیف اس پر جو اثر ڈالتی
س کے اعتبار سے وہ (قاری) اسے دوبارہ لکھتا ہے۔ اور اسے معنی پہناتا ہے۔ مصنف
ف سے شہر بدر یا جلاوطن کرنے میں لاتشکیل نئی تنقید سے مشابہ ہے۔
بیسوی صدی کے پہلے نصف حصے میں امریکہ اور انگلستان میں ناول جس طرح پڑھا
ھایا گیا اس کا سب سے اہم ماخذ ہنری جیمس ہے۔ امریکہ اور انگلستان میں ناول
کا DILEMMA یہ رہا ہے کہ موضوع کو قربان کیے بغیر تکنیک کو مرکز نگاہ کس طرح
ئے۔ اس سوال کی ابتدا کا سراغ ہنری جیمس کی تنقیدوں تک لے جاتا ہے۔ اس
این ناول کی تنقید کا بیشتر حصہ ان دو عوامل کو ایک جمالیات میں تحلیل کرنے کی کوشش
ا ہے۔ تاہم ان دو عناصر میں سے ایک کی طرف توجہ دوسرے کی طرف بے توجہی کا
بنتا رہا ہے۔
ہنری جیمس ناول کی ہیئت اور تکنیک پر توجہ دیتے وقت ادب میں اعلا
ا کے تقاضوں کو نہیں بھولتا۔ اس کے نزدیک تنقید کی تعریف وہی ہے جو میتھیو آرنلڈ

کے نزدیک تھی یعنی بہترین کو جاننا جو دنیا میں جانا اور سوچا گیا ہے۔ اس کے نزدیک
ادبی نقاد صرف رسمی اصولوں تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ تہذیبی، سماجی اور اخلاقی نقد
بھی ہوتا ہے۔

جیمس کا مقالہ 'دی آرٹ آف فکشن' (۱۸۸۴ء) ناول کی تنقید میں اس کا سب
اہم مقالہ ہے۔ جیمس کے ہاں ہر جگہ اس بات پر اصرار پایا جاتا ہے کہ ناول میں اسلوب
مواد، ہیئت اور متن، تکنیک اور موضوع ایک دوسرے میں مدغم نہ ہوں۔ اس نے تکنیک
کبھی اوّلیت نہیں دی۔ اس نے ناول میں پلاٹ پر روایتی زور ڈالنے سے احتراز کیا
کے نزدیک پلاٹ کی بجائے کردار ناول کا مرکزی جزو ہے۔

جیمس نے ناول میں ہیئت کی اہمیت پر اس وقت زور دیا جب فکشن کی
میں حقیقی زندگی سے متعلق گفتگو کا غلبہ تھا۔ رینے ویلیک نے کہا ہے کہ فارم اور STANCE
کی ہم آہنگی جیمس کی مستقل ضرورت تھی۔ آخری دور کے جیمس کے نزدیک زندگی کے
حقائق کو پیش کرنے کے لیے ایک پیچیدہ اسلوب لازمی تھا۔ تاہم وہ محسوس کرتا
کہ اسلوب کو ہمیشہ تجربے کے ادراک کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ وہ اس بات کا قائل تھ
تخلیقی عمل کی شدت ناول میں کفایت شعاری، عضوی وحدت نتیجتاً فن حسن کا سرچشمہ
کفایت شعاری سے مراد ناول کا سائز یا اس کی طوالت نہیں بلکہ ناول کے فن تعمیر اور
سے مکمل مناسبت ہے۔ جیمس ناول کے دلچسپ ہونے کا بھی قائل تھا۔ اس سلسلے
اس کا خیال تھا کہ فن کار کو چاہیے کہ وہ نمایندہ تجربے کو دریافت کرے۔ وہ قاری
دلچسپی کو بیدار کرنے اور اسے قائم رکھنے کی طرف سے کبھی غافل نہ رہا۔ وہ قاری
حاصل کرنے کے معاملے میں انتہائی باشعور تھا۔ اور اس لیے ایسے کردار پیدا کر
کا قائل تھا جن کی زندگی میں قاری شریک ہو سکے۔

ناول کی تنقید میں جیمس کے لیے نقطۂ نظر کا معاملہ مرکزی اہمیت کا مع
تھا۔ نقطۂ نظر سے اس کی دلچسپی ناول کے تین عناصر سے تعلق رکھتی ہے — شد
دلچسپی اور حقیقت۔

جیمس نے ناول کو قاری کے تجربے میں توسیع کا ذریعہ بھی قرار دیا ہے۔ اُ
کا خیال تھا کہ ناول کی تخلیقی دنیا قاری کے لیے متبادل دنیا فراہم کرتی ہے۔ جہا
پناہ لے سکتا ہے۔ ناول نگار قاری کو ایک دوسری دنیا، ایک دوسرا شعور اور ا
دوسرا تجربہ فراہم کرتا ہے۔ اس طرح ناول قاری کو اپنی روزمرّہ شخصیت سے آزاد
ناول کی تنقید میں رومانس اور ریلیزم کا فرق بھی جیمس کے نزدیک مرکز
کا حامل ہے۔ اس نے تسلیم کیا کہ ناول نگار کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے اردگرد کی زند
بحث کرے نہ کہ دینیئتی، اسطور اور فلسفے سے۔ اس کے نزدیک حقیقت کی فضا
کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ وہ پریوں اور بھوتوں کی کہانیوں کو رومانس میں شا

رومانس کو سنجیدگی سے چھٹی اور کردار کے شدید مطالعے سے تعطیل قرار دیتا تھا۔ وہ کہتا
کہ ناول کی دو ہی قسمیں میری سمجھ میں آتی ہیں ــــ ایک وہ ناول جس میں زندگی ہے
ایک وہ جس میں زندگی نہیں ہے۔

لبوک کی کتاب THE CRAFT OF FICTION جیمس کو تنقیدی خراج تحسین کے طور پر
گئی تھی۔ اس کتاب نے تین تصورات پر زور دیا۔ انفرادی کردار کا ڈرامائی شعور، اس
زبانی اور اخلاقی زندگی بطور ناول کے موضوع کے، مصنف کا تخلیقی طور پر آرٹ کو زندگی
تبدیل کرنا اور قاری کی دلچسپی کو بیدار کرنا اور قائم رکھنا۔ لبوک زندگی سے زیادہ
ٹ اور متن سے زیادہ ہیئت سے دلچسپی رکھتا تھا۔ پھر بھی اس نے وائلڈ کی اس
لیاتی روایت سے انحراف کیا ہے جو پیٹس جوائس اور وولف کی تصانیف میں اہمیت رکھتی ہے

ای ایم فورسٹر کی کتاب ASPECTS OF THE NOVEL (۱۹۲۷ء) اینگلو امریکن ناول کی تنقید میں
بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ فورسٹر کے مطالعے نے ان اقدار اور سوالات کی
ریف متعین کی جن کے ساتھ پچھلے کئی عشروں میں ناول پڑھے جاتے رہے ہیں۔ آج بھی
رسٹر کی کتاب ناول کی ہیت، نقطۂ نظر اور آرٹ اور زندگی کے باہمی رشتے سے متعلق
م سوالات پر روشنی ڈالتی ہے۔ جیمس کی جمالیات کی توسیع میں پرسی لبوک کی کتاب
THE CRAFT OF FICTION (۱۹۲۱ء)، ورجینیا وولف کی کتاب COMMON READER
۱۹۲ء اس کی چمک دار بصیرت اور رائڈ وِن میور کی کتاب THE STRUCTURE OF THE NOVEL
۱۹۲ء کا افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ ماننا ضروری ہے کہ بیسویں صدی کی تیسری
ائی میں ناول سے متعلق جو کتابیں سامنے آئیں ان میں فورسٹر کی کتاب ایک ایسی کتاب ہے
ے یہ سمجھنے کے لیے بار بار پڑھا گیا کہ ناول کے معنی اور ان کی اہمیت کیا ہے۔ اس کتاب
انہ میں ایک بڑے ناول نگار کی حیثیت سے فورسٹر کا تجربہ ہی نہیں بلکہ اس کا فیصلہ، اس
تیز نگاہی اور اس کی علمی فضیلت بھی کارفرما تھی۔ ابتدائی ابواب میں وہ ناول کے روایتی
لو کہانی، اشخاص (فورسٹر اشخاص کو کردار نہیں کہتا) اور پلاٹ سے بحث کرتا ہے۔
ر دو فینٹیسی، پیغمبرانہ اہلیت، سانچہ، اور آہنگ جیسے مباحث پر گفتگو کرتا ہے۔

فورسٹر دو قسم کی روایتوں میں لکھتا ہے۔ ایک انسان پرستانہ روایت ہے اور
سری پیغمبرانہ روایت جو آرٹ کو اس دنیا کے متبادل کے طور پر دیکھتی ہے۔ یا آرٹ کو دنیا
INTENSIFICATIO تصور کرتی ہے۔ پہلی روایت کے نمایندوں میں ارسطو، ہوریس، آرنلڈ
ر جیمس کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ دوسری روایت کے نمایندوں میں بلیک، شیلی، پیٹر،
ائلڈ، ییٹس، لارنس اور اسٹیونس کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ پہلی روایت زندگی کو باقاعدہ
ر بہ اور مکمل طور پر دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسری روایت آرٹ کو اپنی خوبی
(QUALIT کے اعتبار سے زندگی سے برتر دیکھنا چاہتی ہے۔

وولف اور فورسٹر ان دونوں روایتوں کی طرف کھنچے رہے۔ اپنی کتاب ASPECTS میں

فورسٹر دو آوازوں میں گفتگو کرتے سنائی دیتے ہیں۔ تاکہ وہ دونوں روایتوں سے انصاف کر سکیں۔ کہانی، اشخاص اور پلاٹ والے ابواب میں پہلی روایت کی آواز غالب رہتی ہے باقی ابواب میں دوسری روایت رفتہ رفتہ نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے ــــ مثال کے طور پر فینٹیسی والے باب میں ــــ کہ فورسٹر کو علم ہے کہ وہ ان دونوں روایتوں کے متخالف مطالبات میں ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتے۔

۱۹۲۸ء میں اگر برطانیہ کے عظیم ناول نگار لارنس، جوائس اور وولف کا کارنامہ اور ان کی اہمیت واضح نہیں تھی۔ جب بھی وہ اپنے نقطۂ عروج پر تھے۔ لیکن جہاں ایک طرف لارنس، جوائس، وولف اور کونریڈ نے ناول کے نئے فارم اور نیا علم نحو ڈھونڈا وہاں دوسری طرف فورسٹر نے اپنے ناولوں میں دکھایا کہ انگریزی زبان اور ناول کی ہیئت کے اندر انسانی زندگی کو جبلتوں اور جذبات سمیت جانچنے کے وسائل موجود ہیں۔

فورسٹر نے خارجی ناول کے پردے میں داخلی ناول لکھے۔ کونریڈ، لارنس، جوائس اور وولف کی طرح فورسٹر کے ناول بھی اس کی روح کی تاریخ ہیں۔ اس کے ناول نہ صرف کرداروں کی تلاش اقدار کو ڈرامائی شکل اختیار کرتے ہیں بلکہ خود اپنی تلاش اقدار کو بھی اور یہ تلاش ان (فورسٹر) کے شک اور بے یقینی کی عکاسی کرتی ہے۔

جوائس کے ناول یولیسس میں شیکسپیئر کے متعلق ڈیڈلس کہتا ہے کہ اس نے باہر کی دنیا میں ان چیزوں کو حقیقی طور پر پایا جو اس کے اندر کی دنیا میں ممکنات کی شکل میں تھیں یہ بات فورسٹر اور ان کی کتاب ASPECTS دونوں کے بارے میں صحیح ہے۔

انگریزی میں اب تک جو اطواری ناول (NOVEL OF MANNER) لکھنے کی روایت چل رہی تھی فورسٹر کی کتاب نے اس روایت کو چیلنج کیا۔

فورسٹر کی جمالیاتی اقدار کو اس کی اخلاقی اقدار سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ فورسٹر اور ان کے بلومس بری رفقا روجر فرائی، کلائیو بیل، جی۔ ای مور، اور اکثر ورجینیا وولف کے نزدیک آرٹ مذہب کا بدل ہے۔ اس عقیدے کے پیچھے اس منشا سے اور تجربے کو دخل ہے کہ کائنات کے خدائی منصوبے میں (اگر کوئی خدائی منصوبہ ہے) نظام اور ہم آہنگی کی کمی ہے۔ جمالیاتی نظام زندگی کی محرومیوں اور الجھنوں کا بدل پیش کرتا ہے۔

فورسٹر نے اس بات پر بحث کی ہے کہ جو چیز آرٹ کو زندگی سے متمائز کرتی ہے وہ اس کا فارم ہے۔ یہ خیال فورسٹر سے پہلے کلائیو بیل اور روجر فرائی ظاہر کر چکے تھے۔ یہ خیال فورسٹر کی کتاب میں بھی پوشیدہ ہے۔

فورسٹر کے نزدیک ناول کا موضوع انسانیت ہے۔ فکشن اور حقیقت کے درمیان ایک جدلیاتی رشتہ ہے۔

جیمس نے ناول میں نقطۂ نظر کو بڑی اہمیت دی تھی۔ فورسٹر کے نزدیک نقطۂ نظر

ا اہم نہیں۔ اسی لیے اس نے اپنی کتاب ASPECTS میں نقطۂ نظر پر الگ کوئی باب
یں لکھا۔

ناول کی جمالیات میں فورسٹر کا سب سے اہم اضافہ فلیٹ اور راؤنڈ کرداروں
ـرق ہے۔ فلیٹ کرداروں کا خلاصہ ایک فقرے میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اور اسی
اپر وہ اکثر کیریکیچر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جبکہ راؤنڈ کردار حقیقی اشخاص کی طرح پیچیدہ
رپہلودار ہوتے ہیں۔ فلیٹ کردار مصنفوں کے لیے آسان ہوتے ہیں۔ آسانی سے
پانے جاتے ہیں۔ انھیں آسانی سے قابو میں رکھا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی فضا آپ پیدا
رتے ہیں۔ قارئین انھیں آسانی سے یاد رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ ایک پہلو کو بہت بڑھا چڑھا
رپیش کرتے ہیں جن کی وجہ سے دوسرے پہلو دب جاتے ہیں۔ پھر بھی فکشن میں
ن کا مقام ہے۔ ایک ہی ناول میں فلیٹ اور راؤنڈ کرداروں کی باہمی موجودگی ممکن ہے۔

فورسٹر کی کتاب ASPECTS کے اثر سے جو کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں سب سے اہم غالباً
یڈون میور کی کتاب THE STRUCTURE OF THE NOVEL ہے۔ اسی طرح ناول کے اختتام سے
متعلق فورسٹر کی بصیرتوں نے فرائیڈ مین (FRIEDMAN) کی کتاب THE TURN OF THE
NOVEL (۱۹۶۶ء) کو متاثر کیا اور کرموڈ کی کتاب THE SENSE OF AN ENDING (۱۹۶۷ء)
پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ فورسٹر نے بتایا کہ ناول کے اختتام جبلی طور پر ناقص ہوتے ہیں۔ تقریباً
تمام ناولوں کا اختتام کمزور ہوتا ہے کیونکہ پلاٹ کو ختم کرنا پڑتا ہے۔ موت یا محبت وہ تنظیمی
اصول ہیں جو ناول کو خوب صورتی سے ختم کرتے ہیں۔ لیکن زندگی کے تجربے کے مطابق
ختم نہیں کرتے۔ زندگی ایک جاری رہنے والا عمل ہے۔ وہ ہمیشہ غیر حل شدہ رہتی
ہے۔ فورسٹر کے اپنے ناول نا تمام اور مبہم طریقے پر ختم ہوتے ہیں۔ ان کے ناولوں کا خاتمہ
اس معاشرتی اور اخلاقی مسئلے کو حل نہیں کرتا جسے ناول کا پلاٹ ڈرامائی شکل عطا
کرتا ہے۔

ASPECTS کے آہنگ والے باب میں فورسٹر نے ایسے ناولوں کے امکان پر گفتگو
کی ہے جو سازوں کے میل والے موسیقی (SYMPHONY MUSIC) سے مشابہ ہو سکتے ہیں۔ دراصل
اس باب میں فورسٹر نے اس گونج سے بحث کی جو ناول ختم کرنے کے بعد قاری کے ذہن
میں پیدا ہوتی۔

فورسٹر کی کتاب کے نصف آخر کے جو ابواب ہیں ان کے عنوانات سے ظاہر ہے کہ انھوں
نے کتنے نازک اور نئے موضوعات سے بحث کی ہے۔ اور کس طرح انھوں نے ناول کو
ایک طرف پیغمبری سے اور دوسری طرف مصوری اور موسیقی سے ملا دیا ہے۔ ان ابواب کا
سمجھنا آسان نہیں ہے۔ انھوں نے پیغمبرانہ اہلیت اور آہنگ (اور کسی حد تک فینٹیسی اور
سلیکے) والے ابواب میں کسی ایسی چیز کو DEFINE کرنے کی کوشش کی ہے جو ناقابل تشریح
ہے اور روحانی اور غیر مرئی ہے۔ فورسٹر پر فرائیڈ، فریزر، اور ینگ کے اثرات بھی تھے۔

فریزر کی کتاب 'شاخ زریں' نے ماضی کے دائرے کو انجیلی وقت بلکہ تاریخی وقت سے بھی آگے بڑھا دیا ہے۔ بعد میں ینگ نے آر کے ٹائپس پر جو زور دیا اس میں اس نے اس نکتے کو نمایاں کیا کہ تمام تہذیبیں مشترک بشریاتی تجربات اور نفسیاتی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ فورسٹر اس کا قائل تھا کہ رسم و رواج اور اقدار کے فرق کے باوجود ایک مشترک ورثہ نوع انسان کو متحد کرتا ہے۔

فورسٹر کی کتاب ASPECTS روزمرّہ زندگی سے آگے کی چیز کی تلاش ہے۔ لیکن فورسٹر کا المیہ یہ تھا کہ وہ اس بات کا قائل نہ ہو سکا کہ دنیا کے الفاظ دنیا کی زندگی پر بعض اوقات وہ نہایت افسوس کے ساتھ تسلیم کرتا ہے کہ آرٹ کی تخلیق اور آرٹ کا ادراک روزمرہ زندگی کی محرومیوں اور پریشانیوں کی تلافی نہیں کر سکتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے ناول لکھنا ترک کر دیا۔

'اے پیسیج ٹو انڈیا' لکھنے کے بعد فورسٹر نے ناول لکھنا کیوں ترک کر دیا یہ بیسویں صدی کا ایک ادبی معما رہا ہے۔ پروفیسر شوارز کی یہ قیاس آرائی اس معما کے حل کے قریب پہنچتی نظر آتی ہے۔ اور اس لحاظ سے میرے نزدیک یہ قیاس آرائی ان کی کتاب کے عمیق ترین نکات میں سے ہے۔

ایف آر لیوس صرف نقاد نہیں تھا بلکہ وہ انگلینڈ میں اس علمی انقلاب کا رہنما تھا جس نے برطانوی کلچر میں تنقید کو ایک مرکزی سرگرمی کی حیثیت دلوائی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ تمدّن اور تہذیب میں بشمول زبان (تحریری و گفتاری) زوال آگیا ہے۔ آرنلڈ کی طرح اس کا بھی عقیدہ تھا کہ انگریزی ادب کا مطالعہ انگریزی تمدن کو قائم رکھنے کے لیے ضروری اقدار کی دریافت کا ایک اہم جزو ہو سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ادب کا یہ مطالعہ تمدن کی صفت کو بہتر بنا سکتا ہے۔ ادب سے سنجیدہ دلچسپی حال سے شروع ہوتی ہے۔ اور اس مفروضے پر مبنی ہوتی ہے کہ ادب شعورِ عصر کی حیثیت سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس نے اصرار کیا کہ موجودہ ادیبوں کا مطالعہ معاصرانہ تمدن کے ادراک کے لیے لازمی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں رینے ویلیک سے ایک مشہور مباحثے میں اس نے اصرار کیا کہ ادبی تنقید میں نہ صرف فلسفے کی موجودگی ضروری ہے بلکہ ان مسائل کی بھی جنھیں قاری اپنی زندگی کے تجربے سے پہچان سکے اور جو اس کے اخلاقی نشو و نما سے تعلق رکھتے ہوں۔ نقاد کو چاہیے کہ وہ مجرد بیانات اور غیر متعلق تعمیم سے احتراز کرے۔ اس نے اپنی REVALUATION (۱۹۳۶ء) میں ایک اصول یہ بتایا کہ الگ الگ شاعروں سے بحث کرتے وقت نقاد کا اصول یہ ہے یا ہونا چاہیے کہ وہ مخصوص تجزیوں سے تعلق رکھے نظموں اور ان کے مختلف حصوں کا تجزیہ کرے۔ اور ایسی کوئی بات نہ کہے جس کا زیرِ بحث متن سے متعلق فیصلوں سے کوئی ربط نہ ہو۔

جہاں تک انگریزی ناولوں کے بارے میں اس کا زاویۂ نگاہ کا تعلق ہے اس

نا
ین اظہار اس کی کتاب GREAT TRADITION میں ہوا ہے۔ اس کتاب نے انگلینڈ
امریکہ میں ناول کی تدریس کو متاثر کیا۔ آرنلڈ کیٹل کی دو جلدوں INTRODUCTION
کے ساتھ ساتھ لیوس کی کتاب نے انگلینڈ میں ناول کی تنقید کو THE ENGLISH NO
س برس کے اثر (جس کا لب لباب ای ایم فورسٹر کی کتاب ASPECTS اور رووِلف
تاب THE COMMON READER ہے اور ہنری جیمس کی جمالیات (جس کا لب لباب
ں کی کتاب THE CRAFT OF- FICTION ہے سے دور کیا۔

ناول میں تکنیک پر زور دینے بلکہ فورسٹر کی طرح ناول میں موسیقی کی خالص جمالیاتی
ا پیدا کرنے کی آرزو کے بجائے اس نے ناول کے موضوع کی اہمیت پر اصرار کیا
یہ دیکھنے پر زور دیا کہ ناول میں جس دنیا کا بیان ہے اس کے بارے وہ ناول کیا
بتاتا ہے۔ THE GREAT TRADITION نے ناول کی اینگلو امریکن تنقید کی جمالیات اور اخلاقی
ار کی تعریف اور تعین میں مرکزی کردار ادا کیا۔

لیوس نے انگریزی ناول کے مطالعے کو 'زندگی کے ٹکڑے' (SLICES OF LIFE) کی
م گفتگو سے بچایا۔ اس نے یہ دکھایا کہ مطالعہ ایک تخلیقی عمل ہے۔ تجزیہ ایک تعمیری اور
ی طریق کار ہے۔ اس نے بتایا کہ شاعری کی طرح فکشن بھی گہرے تجزیے کا متحمل ہو سکتا
۔ اس نے کہا کہ ناول میں وہی شدت، عضوی وحدت، اور سنجیدگی ممکن ہے جو شاعری
ہوتی ہے۔ اس نے بہ اعتبار اہمیت انگریزی ناول کی ترتیب قائم کی۔ اس نے
ریڈ کے ناول 'نوسٹرومو'، جارج ایلیٹ کی اہمیت اور ہنری جیمس کے WASHINGTON
SQUARE جیسے ابتدائی ناولوں کی اہمیت پر اصرار کیا جبکہ وہ ڈکنس، ٹھیکرے، ٹرولوپ
ڈی، فیلڈنگ اور رچرڈسن جیسے ناول نگاروں کے قد و قامت پر حملہ آور ہوا۔

لیوس نے اپنے آپ کو آرنلڈ اور جونسن کی تنقیدی روایت کے امین کی
ت سے دیکھا۔ اس پر بیسویں صدی کے اثرات میں ٹی ایس ایلیٹ، ڈی ایچ لارنس
ر، آئی۔ اے رچرڈس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

لیوس ناول نگاروں کی جن خوبیوں کو سراہتا ہے انھی کو ایک نقاد کی حیثیت سے
ے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً پختگی، سنجیدگی، معروضیت اور زندگی
ے ممکنات آگہی۔ وہ ناول نگار کو انھی صفات کے لیے سراہتا ہے جنھیں وہ اپنی تنقید
ہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً تخیلی ہمدردی، اخلاقی تفریق، اور اضافی قدر و قیمت کا
مل۔ وہ ناول نگار کو بدلے ہوئے لباس میں نقاد تصور کرتا ہے۔

لیوس کی بہت سی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے
کسی ناول کے متن کو جس طریقے سے پڑھنا چاہیے لیوس اس طریقے کا اظہار نہیں
رتا۔ صرف مثالوں سے سمجھاتا ہے۔ اور اس کے سمجھانے کا طریقہ اس کی افتادِ طبع
آئینہ دار ہے۔ اس کے بعض معیار مثلاً انسانیت سے دلچسپی کی گہرائی اور وسعت

داخلی ہیں۔ نفس موضوع کی اچھائی کا معیار کیا ہونا چاہیے۔ جمالیاتی معیار سے اس کی
وضاحت نہیں ملتی۔ ایسے موقعوں پر لیوس تاثراتی اور خود رائے ہو کر رہ جاتا
فکشن کی زبان پر اپنی توجہ مرکوز نہیں کرتا۔ خاص طور پر لفظوں کے تخلیقی استع
زبان کے تخلیقی فریضے سے بحث کرتا ہے۔ اہم عبارتوں کو مطالعے کا مرکز بنانے او
کے کامیاب حصوں کو ناکام حصوں سے الگ کرنے کے باوجود وہ ہمیں کل کا احسا
نہیں دلاتا۔ اسے فخر ہے کہ وہ ناول کے متن سے بحث کرتا ہے۔ پھر بھی اس کے
خاصی تعمیم پائی جاتی ہے۔ مثلاً وہ کونریڈ کے ناول 'لارڈ جم' کو مسترد کرنے یا کو
فلابیر اور جارج ایلیٹ سے برتر قرار دینے کے منطقی اسباب نہیں بتاتا۔ اسی
اس کا ڈیفو اور اسٹرن لارنس کو حاشیے میں ڈال کر مسترد کر دینا کافی نہیں۔ ٹھیکرے
طرف سرپرستانہ انداز اختیار کرنا اور اسے ایک عظیم نثر نگار وولپ قرار دینا اس
کی دلیل ہے کہ اس نے ان ناول نگاروں کو توجہ سے نہیں پڑھا۔ میریڈتھ
ہارڈی پر ایک سانس میں بات کرنا آسان بخش بات نہیں۔ برونٹی بہنوں اور
وولف جیسے اہم ناول نگاروں کو نظر انداز کرنا زیادہ سے زیادہ ایک قسم کی بذلہ
کہی جا سکتی ہے۔ ان تمام کوتاہیوں کے باوجود لیوس کی کتاب GREAT TRADITION
ایک اساسی یا کتب آفریں کتاب ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے یقین آجاتا ہے کہ
پڑھے لکھے قاری کی نمایندگی کر رہا ہے۔

گزشتہ چند عشروں کے دوران انگلینڈ اور امریکہ میں فکشن کی تدریس
جن دو کتابوں کی طباعت نے بنیادی طور پر متاثر کیا ہے ان میں سے ایک بو
کتاب THE RHETORIC OF FICTION (۱۹۶۱) ہے اور دوسری ڈوروتھی وان گھنٹ
THE ENGLISH: FORM AND FUNCTION (۱۹۵۳ء) ہے۔ وان گھنٹ کے مضامین نے
کے طالبوں کو اس امر کے نمونے فراہم کیے ہیں کہ ناول کو ان کے تنظیمی جمالیاتی
کی روشنی میں کس طرح پڑھا جائے۔ وان گھنٹ کی کتاب انگریزی ناول کے فارم کی
کتاب ہے۔ اس کے مطالعے نے بہت سے مضامین اور کتابوں کو جنم دیا ہے
بوتھ اس بات کو مرکز نگاہ بناتا ہے کہ ایک ناول کرتا کیا ہے۔ وہ اپنے قاری کو کس
طرح کسی بات کی ترغیب دیتا ہے۔ وہاں وان گھنٹ ناول کو انسانی تجربے کے
کے طور پر پیش کرتی ہے۔ اس نے اپنے نظریے کے معاملے میں گیسٹالٹ نفسیات
خاصا استفادہ کیا ہے۔ وان گھنٹ کا تصور قدر آئی اے رچرڈس سے ماخوذ ہے
لیوس، بوتھ اور وان گھنٹ کے ساتھ ای آن واٹ نے بھی انگلینڈ اور ا
ناول کے مطالعے کے طریقے کو بدل دیا۔ کلچر اور معاشرے کے درمیان جو تعلق ہے
پر اپنی توجہ مرکوز کر کے واٹ نے ناول کو 'نئی تنقید' کی محض فضا سے نجات دلائی
نے شکاگو کے ارسطو پرست نقادوں کی اس رائے کو چیلنج کیا کہ رچرڈسن نے

سے کمتر درجے کا ناول نگار ہے۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ ناول نگار آرٹ اور معاشرے کے باہمی تعلق پر تحقیق کر رہے تھے۔ اس نے اس نقطہ نظر پر استدلال کیا کہ ناول نگار اپنے تاریخی پس منظر میں بہتر سمجھا جاسکتا ہے۔ لہذا فرائڈ اور ینگ کے نظریات پر انحصار زیادہ مفید نہیں۔ سماجی اور تاریخی عوامل کے جواب میں ناول کے آغاز کی توجیہ اسی طریقے سے کی جاسکتی ہے جس طرح ازمنۂ وسطیٰ میں یورپین یونیورسٹیوں یا انگلینڈ میں خانقاہوں کے زوال کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔ وہ اس بات کا قائل ہے کہ ایک ادبی نقاد کو انسانی طرزِ عمل کے معاملے میں تجربہ کار، پختہ کار، اور دانش مند مشاہد ہونا چاہیے۔ فرد اور تاریخی عوامل کے درمیان جو تعلق ہے۔ اس بارے میں سوالات اٹھانے اور کرداروں کو سماجی مسائل اور تاریخی سانچوں کے نمونے کے طور پر دیکھنے کے معاملے میں واٹ، لوکاچ، کیٹل، اور لیوس کے اثرات کا ممنون ہے۔

ایرخ آئرباخ (ERICH AUERBACH) کی مشہور کتاب MIMESIS ۱۹۵۳ میں شائع ہوئی۔ اس میں اس طریقے سے بحث کی گئی ہے جس سے تخیلی ادب حقیقت اور اس کلچر کی تقلید اور عکاسی کرتا ہے۔ جس میں وہ لکھا گیا۔ آئرباخ کا موضوع جیسا کہ خود اس نے کہا ہے کہ حقیقت کی ادبی پیش کش کی تاریخ ہے۔ اس کی دلچسپی صرف یہ نہیں ہے کہ لوگوں کا طرزِ عمل اور عقیدہ کیا ہے، وہ تاریخی عوامل کیا ہیں جو طرزِ عمل اور عقیدے کی تشکیل کرتے ہیں۔ لوکاچ کی طرح آئرباخ کے نزدیک بھی ایک مناسب جمالیاتی معیار یہ ہے کہ فن کار اور انفرادی واقعات اور ایک مخصوص سماجی اور اقتصادی پس منظر کے درمیان ایک ناگزیر ربط پیدا کرتا ہے یا نہیں۔ ہیگل سے متاثر ہونے والے لوکاچ کی طرح آئرباخ بھی کسی ادبی تصنیف کی اہمیت کا تعین کرتے وقت یہ دیکھتا ہے کہ اس میں انفرادی اور سماجی جامعیت شمولیت (INCLUSIVENESS) ہے یا نہیں اور یہ کہ کوئی تصنیف کاریخی عوامل کے احساس کا ثبوت دے رہی ہے یا نہیں۔ غرضکہ آئرباخ کے نزدیک کسی تصنیف کا صرف ادبی ہونا کافی نہیں بلکہ ایک ذہنی تاریخ ہونا بھی ضروری ہے۔

آئرباخ ایک ماہر لسانیات ہے۔ زبان کے معاملے میں اس کا تجسس ایسے سوالات اٹھاتا ہے جن کے بارے میں تاریخی حالات نے وہ الفاظ (یا تحریر) پیدا کیے جنھیں ہم پڑھتے ہیں۔

MIMESIS میں اسی اسلوب سے بحث کی گئی ہے جسے مصنف نے حقیقت کی تعبیر پیش کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اپنے ذہنی معلم اور مرشد ویکو VICO کی طرح آئرباخ کا مفروضہ یہ ہے کہ زبان تہذیبی تاریخ کا مال خانہ ہے اور یہ کہ کسی عہد کے ادب، زبان اور اسطور کا مطالعہ ہمیں اس کے کلچر کے بڑے پہلوؤں کو سمجھنے کے قابل بناتا ہے۔ آئرباخ نے ویکو کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ "اس کے نزدیک قوموں

کی دنیا میں نہ صرف سیاسی تاریخ شامل ہے بلکہ فکر، اظہار (زبان)، ادب، اور فنون لطیفہ مذہب، قانون اور اقتصادیات کی تاریخ بھی۔ چونکہ یہ تمام چیزیں ایک عہد کے انسانی معاشرے کی تہذیبی حالت سے پیدا ہوتی ہیں اس لیے اُن سب کے باہمی رشتے کو سمجھنا ضروری ہیں ورنہ وہ بالکل سمجھ میں نہیں آئیں گی۔" آئرباخ نے اس لحاظ سے ویکو کی تعریف کی ہے کہ وہ ادب کو انسانی احساس و ادراک کا ایک خودکار طریقہ سمجھتا تھا یوس کی طرح آئرباخ بھی تعیمات کو شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اور تاریخی میلانات کو جزئیات کے مسلسل حوالوں کی مدد سے بیان کرنے کا قائل تھا۔

آئرباخ ویکو کا مداح اس لیے ہے کہ ویکو تاریخ کو مجرد اصطلاحوں میں نہیں دیکھتا بلکہ اسے ایک قسم کی جدلیاتی یا ڈرامائی عمل تصور کرتا ہے۔ آئرباخ ویکو کی تعریف اس لیے بھی کرتا ہے کہ خود انسان نے اپنے افکار و اعمال سے دنیا کو جو کچھ بنایا اسے ویکو نے مرکز نگاہ بنایا۔ لیکن آئرباخ کو ویکو کے اس خیال سے اتفاق نہ تھا کہ تاریخ کسی خدائی سانچے کو عمل میں لانے کا نام ہے۔

آئرباخ نے اپنی کتاب میں اور کئی اہم بحثیں چھیڑی ہیں جن میں بیانیہ پیش کش کی دو بڑی روایتوں سے متعلق بحث نہایت اہم ہے۔ آئرباخ نے ان دو بڑی روایتوں میں سے ایک کو HOMERIC یا کلاسیکل کہا ہے اور دوسری روایت کو انجیلی یعنی BIBLICAL قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک حقیقت نگاری سے تعلق رکھنے والا ناول بیانیہ کی ان دونوں روایتوں کا امتزاج ہیں۔ وہ جدید حقیقت نگاری کو بھی ان دونوں محرکات (INPULSES) کا امتزاج تصور کرتا ہے۔ اس بحث کی تفصیلات کو اردو میں منتقل کرنا آسان نہیں۔ آئرباخ نے اپنے اس نقطہ کی توضیح و تشریح میں مغربی ادب کے عظیم اور جدید ناول نگاروں سے جس تاریخی اور فلسفیانہ سیاق و سباق میں گفتگو کی ہے وہ مرعوب کن حد تک متاثر کن ہے۔ اس کی صرف ایک کتاب اسے ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

انگریزی ادب کے مطالعے پر نورتھروپ فرائی (NORTHROP FRYE) کا اثر آئرباخ سے بھی زیادہ رہا ہے۔ فرائی کا عقیدہ ہے کہ ادب کا مطالعہ 'ادب کیا ہے' کے بارے میں قابل فہم مفروضے پیش کر سکتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ادب دنیا کی تنظیم ہے۔ ادب کے ساتھ تنقید کا وہی رشتہ ہے جو فطرت کے ساتھ سائنس کا ہے۔ جس طرح سائنس فطرت کیا ہے کے بارے میں قابل فہم مفروضے پیش کرتی ہے اسی طرح تنقید ادب کا مربوط اور باقاعدہ مطالعہ پیش کر سکتی ہے۔

فرائی نے ادب کو 'نئی تنقید' کے منفی اثرات سے آزاد کرنے کی کوشش کی ایسے دور میں جبکہ 'نئی تنقید' کا اثر نقطہ عروج پر تھا۔ فرائی نے اس بات پر اصرار کیا تنقید کو تفصیلات کے گہرے تجزیے سے آگے جانا چاہیے۔ فرائی نے ادب میں ممکنہ

ۂیت، اخلاقی فیصلوں کے التوا، خالص لفظی صنعت گری پر توجہ کے ارتکاز اور
قسم کی دوسری خوبیوں پر حملہ کیا۔ اس نے تنقید کو ادب میں اخلاقی معنی کی لازمی
ش سے بھی بچانے کی کوشش کی۔
آئرباخ نے اسلوب کو مرکزی اہمیت دی تھی۔ فرائی نے ارسطو کو مرکزی اہمیت
ہے۔ فرائی سے پہلے ٹی ایس ایلیٹ نے جوائس کے ناول 'یولیسس' پر تبصرہ کرتے
ے کہا تھا کہ بیانیہ کا اسطوری اسلوب لاحاصلی اور انتشار کے اس وسیع منظر میں
ں سے معاصرانہ تاریخ عبارت ہے۔ نظم و ترتیب پیدا کرنے کا محض ایک طریقہ ہے
کے ٹائپ کے تصور پر ینگ کی گہری چھاپ ہے۔ لیکن فرائی نے اس کے اجتماعی
زر والے تصور کو اپنے مقاصد کے لیے غیر ضروری قرار دیا۔
فرائی کا خیال ہے کہ ادب پر صرف ادبی کائنات کے اندر رہ کر بحث کی جا سکتی
۔ فرائی کا آر کے ٹائپل تجزیہ نہ صرف ادب کی عصریت کو نظر انداز کر دیتا ہے بلکہ اس
ا کو بھی کہ اظہار میں انفرادیت کہاں سے آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرائی کے ہاں
از اسلوب، اور لہجے سے متعلق بحثوں سے بے اعتنائی پائی جاتی ہے۔
آئرباخ اور فرائی کا ایک نہایت اہم فرق یہی ہے کہ فرائی خارجی دنیا کی ان قوتوں
طرف کوئی توجہ نہیں دیتا جو ادب کی تشکیل میں حصہ لیتی ہیں۔ جبکہ آئرباخ کے نزدیک
ب کی تخلیق دنیا اسی حد تک اہمیت رکھتی ہے جس حد تک وہ ان قوتوں کو بطور صفت
ی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فرائی نے ساختیاتیوں اور مابعد ساختیاتیوں کی طرح
ب کو انسانی تاریخ سے آزاد کر دیا ہے۔
بیسویں صدی کے پانچویں اور چھٹے عشرے میں فرائی کی اہمیت نقطۂ عروج
تھی، لیکن اس کے محدودات (LIMITATIONS) جس قدر واضح ہوتے جا رہے ہیں اسی
قدر اس کی اہمیت میں کمی آتی جا رہی ہے۔ بہر صورت اس کی کتاب ANATOMY OF
CRITIC بیسویں صدی کی نہایت اہم تنقیدی کتابوں میں سے ہے۔
شکاگو یونی ورسٹی کے پروفیسر وین سی بوتھ (WAYNE C.BOOTH)
تصنیف THE RHETORIC OF FICTION کو عصر حاضر کی ادبی تنقید کے نہایت اہم کارناموں
شمار کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ تیس سال کے بعد بھی وہ ایک
ی شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دوران میں بوتھ کی اور کئی اہم کتابیں منظر عام پر
نا ہیں۔

بوتھ نے اپنی اس کتاب میں یہ دکھایا ہے کہ مصنف کے مفہوم تک پہنچنا ممکن ہے۔
ہا اس نے اس مروجہ عقیدے کا بدل پیش کیا ہے کہ کسی کتاب کے متن کے معنی
پہنچنے کی نہ کوئی امید کرنی چاہیے نہ اس کوشش کو بامقصد سمجھنا چاہیے۔ جیسی
ناقدین آپ بنانا چاہیے۔

بوتھ کا ایک مرکزی عقیدہ یہ ہے کہ ہر تصنیف ایک منفرد تصنیف ہوتی ہے۔ لہٰ
اس کا مطالعہ اس کی اپنی شرطوں پر ہونا چاہیے۔ اس نے اپنی کتاب میں کہا ہے کہ ا
مطالعے اور اچھی تنقید کا بدترین دشمن مجرد قوانین کا اطلاق ہے جو مخصوص کتابوں کی زندگ
خلاف ورزی کرتے ہیں۔

بوتھ شکاگو کا ایک ایسا نقاد ہے جو ارسطو کے نقش قدم پر چلتا ہے اور جس
کا بنیادی مسئلہ قاری کے ساتھ ابلاغ کا فن ہے۔ وہ اس تنقید کو ناپسند کرتا ہے جو ا
آر لیوس کے طرز پر ایسی عظیم روایات پیدا کرتی ہے جو ان داخلی معیاروں پر مبنی ہ
جو خارجی معیاروں کے پردے میں پیش کیے جاتے ہیں۔

ادب کے اثرات پر زور دینے میں بوتھ، آئی اے رچرڈس کے کام سے متا
رہا ہے اور رچرڈس سے بھی زیادہ کینتھ برک (KENNETH BURKE) سے جس
کہا کہ ادبی تصنیف قاری کے ساتھ کچھ کر ڈالتی ہے اور وہ جو کچھ کرتی ہے اس کا دارو
مصنف کے پہلے سے کیے ہوئے فیصلوں پر منحصر ہوتا ہے۔

بوتھ نے اس بات پر اصرار کیا کہ کتاب کو دل چسپ ہونا چاہیے۔ ای ڈی ا
(E.D.HIRSCH) نے اس کے معنی یہ لیے ہیں کہ کتاب کے دل چسپ ہونے پر اصرار ہ
کا دوسرا انداز ہے کہ فکشن کو چاہیے کہ وہ قاری کو مسرور بھی کرے اور اس کے
سبق آموز بھی ہو (INSTRUCTIVE) بھی ہو

فکشن کے اساتذہ اور قاری دونوں پر بوتھ کی کتاب کا گہرا اثر رہا۔
میتھو آرنلڈ نے شاعری کو مذہب کا بدل بتایا تھا۔ ایف آر لیوس نے
کو انسانی سرگرمیوں میں مرکزی سرگرمی قرار دیا۔ لیکن بیسویں صدی کے
عشرے میں ویت نام کی جنگ، جنگ کے خلاف احتجاجی تحریک اور معاشرے ا
یونی ورسٹی کے درمیان تصادم کے باعث مطالعہ ادب کی مناسبت (VANCE
افادیت مشکوک ہو گئی تھی۔ اسی لیے ۱۹۶۷ء میں جب فرینک کرموڈ کی کتا
THE SENSE OF AN ENDING شائع ہوئی تو امریکہ کے ادبی شعبوں میں بڑا ہیجان
ہوا کیونکہ کرموڈ کی کتاب نے یہ دعوٰا کیا کہ ادب کے مطالعے کا ہماری زند
سے مرکزی تعلق ہے۔ اس سے پہلے امریکہ کی نئی تنقید نے یہ سکھایا تھا کہ
با معنی ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ اس کا صرف ہونا ضروری ہے۔ اس تحریک
اثر ادب کی تعلیم و تدریس نظری یا تاریخی پس منظر سے بے تعلق ہو کر کسی فن پا
غائر مطالعہ بن کر رہ گئی تھی۔

۱۹۶۶ء میں مطالعہ ادب کا جواز دریافت کرنے کا جذبہ شدت اختیار ک
کرموڈ کی زبان میں ادب کے طالب علموں کو اپنی زندگی میں معنی پیدا کرنے کے
فکشن کی ضرورت تھی۔ کرموڈ کی ذات میں انھیں ایک ایسا نقاد ملا جو ادب پا

رف مطالعہ پیش نہیں کر رہا تھا بلکہ ہماری زندگی میں ادب کی اہمیت پر بلیغ
شنی بھی ڈال رہا تھا۔
کرموڈ نے بتایا کہ ادبی تصانیف ایسے فکشن ہیں جو موت اور بحران کی موجودگی
ہیں اپنی زندگی کے اندر تنظیم پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اس نے یہ دکھایا کہ
تنقید کوئی مشینی قسم کی چیز نہیں بلکہ وہ فلسفیانہ اور تاریخی ادراک کا ذریعہ
سکتی ہے۔ یونی ورسٹیوں کے طلبہ اور اساتذہ یہ سن کر لطف اندوز ہوئے کہ ادبی
بد کا مطالعہ حقیقی دنیا سے کچھ تعلق رکھتا ہے۔ اور نہ صرف تخیلی تحریریں بلکہ
د بھی عمل کی دنیا میں اہمیت رکھتی ہے۔ نقاد اس بات پر بحث کر سکتا ہے کہ آدمی
گی کس طرح بسر کرتا ہے۔ اور وہ کس لیے زندہ رہتا ہے۔
کرموڈ کی کتاب دوسری جنگ عظیم، اس کی تباہ کاریوں اور اس علم کا جواب تھی
جنگ کے بعد کی دنیا آن کی آن میں اپنے آپ کو تباہ کر دینے کی قوت رکھتی ہے۔
موڈ کا مفروضہ یہ ہے کہ ہم اس بات کا یقین نہیں کر سکتے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں
ے ہیں جس کی دیکھ بھال کسی خدا کے ہاتھ میں ہے یا یہ کہ ہم ایک مہربان کائنات
رہتے ہیں۔ چونکہ ہم ایک ایسی حقیقت سے دوچار ہیں جس میں نثر کی تخلیق کا امکان ہے
اس امکان کا کوئی توڑ نہیں ہے اس لیے آدمی کی وجودی ضرورت یہ ہے کہ وہ
زندگی کو کوئی شکل اور معنی عطا کرے۔ ہمیں قابل فہم انجام کی گہری ضرورت ہے۔
کرموڈ کی کتاب کا موضوع انسانی تخیل اور حقیقی دنیا کے درمیان مکالمہ ہے۔ کرموڈ
یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ تخیل کیوں اور کس طرح تجربے کی تنظیم کرتا ہے
ایک ہیئت عطا کرنے والی قوت ہے۔ ہم جن حالات میں زندگی بسر کرتے
ادبی فکشن ان کے احساس اور ادراک پر اثر انداز ہوتے ہیں۔
آرنلڈ کی طرح کرموڈ بھی ادب کو ایک بے عقیدہ زمانے میں مذہب کا بدل ماننا
سر آتا ہے۔
ایڈمنڈ ولسن، کینتھ برک، اور ڈوروتھی وان گھنٹ جیسے نقادوں اور
THE PARTISAN REVIE جیسے رسالے کے باوجود انگلینڈ اور امریکہ میں ناول کی
انی تنقید پر مارکسی تنقید کا کوئی گہرا اثر نہ ہو سکا۔ بہرحال انگریزی ناول کے دو
بت اہم مارکسی نقاد آرنلڈ کیٹل (ARNOLD KETTLE) اور ریمونڈ ولیمس
(RAYMOND WILLIA) ہیں۔ جن کے نزدیک ادب اس معاشرے سے مربوط ہوتا ہے جو
ے پیدا کرتا ہے۔ مارکسی تنقید آرٹ کو سماجی اور اقتصادی عوامل اور انسانی
کی ہر ان عوامل کے اثرات کی ترجمانی قرار دیتی ہے۔
اگرچہ مارکسیوں کی موجودہ نسل کیٹل کو نظر انداز کرتی ہے لیکن اس کی کتاب
ریزی ناول کا تعارف، ۱۹۵۱ء کی دو جلدیں طلبہ اور اساتذہ کی ایک نسل پر اثر انداز

رہ چکی ہیں۔ اگرچہ ناول کی مارکسی تنقید میں وہ ایک پیش رو کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ریمونڈ ولیمز تک نے اپنی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اگرچہ ولیمس، کیٹل کے اثر کو تسلیم نہیں کرتا لیکن دونوں کے زاویۂ نگاہ میں بڑی مماثلت ہے۔ اور دونوں پر ایف آر لیوس کا گہرا اثر ہے۔

مارکس اور اینگلز کے نزدیک شعور زندگی کی تشکیل نہیں کرتا۔ بلکہ زندگی شعور کی تشکیل کرتی ہے۔ سماجی، سیاسی اور ذہنی زندگی کی عام روش مادی زندگی کے طریق پیداوار سے مشروط ہوتی ہے۔ یہ لوگوں کا شعور نہیں ہے جو ان کے وجود کا تعین کرتا ہے۔ بلکہ یہ ان کا سماجی وجود ہے جو اُن کے شعور کا تعین کرتا ہے۔

اس وقت تک انگریزی میں ریمونڈ ولیمس سب سے با اثر ادبی نظریہ ساز رہے ہیں۔ اس کی کتاب MARXISM AND LITERATURE دو دعووں پر مبنی ہے۔ ایک تو یہ کہ ایک اقتصادی بنیاد ایک سماجی ڈھانچے کو ترتیب دیتی ہے۔ دوسرے یہ کہ آدمی کا سماجی وجود اس کے شعور کا تعین کرتا ہے۔

مارکسی تنقید معاشرے اور ادب کے باہمی رشتے کا سائنسی مطالعہ پیش کرتی ہے۔ آرٹ میں ترجمانی ایک نصب العینی (آئیڈیولوجیکل) عمل اور ایک منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مارکسزم کا جدید جمالیاتی نظریہ ترجمانی کے متعدد تصورات کا حامل ہے۔ ان میں سے ایک تصور عکاسی کا ہے۔ عکاسی خارجی ہونے کا دعوا کرتی ہے۔ دوسرا تصور وسیلے (MEDIUM) کا ہے۔ جس کے ذریعہ آرٹ اس حقیقت کو بدلتا اور بگاڑتا ہے جسے وہ ظاہر کرتا ہے۔ کیٹل کے نزدیک وسیلہ وہ چیز فراہم کرتا ہے جسے سانچہ کہا جاتا ہے۔ ترجمانی کا ایک تصور HOMOLOGY کا ہے جس کے لغوی معنی مماثلت اور مطابقت کے ہیں۔

مارکسی نقادوں نے ہمیشہ حقیقت پسندانہ ادب کو ترجیح دی ہے۔ خصوصاً انیسویں صدی کے ناول کو کیونکہ اس کا مقصود سماجی حقیقت کا مکمل بیان ہے۔ اس فکشن کو جو چیز کلیت (ولیمس اس لفظ کو پسند کرتا ہے) عطا کرتی ہے۔ وہ تاریخ کی مصوری ہے۔

مارکسیوں نے محسوس کیا کہ ناول سیاسی شعور کی بیداری کا ایک ذریعہ ہو سکتا ہے۔ کیٹل نے لکھا ہے کہ ہر وہ ناول جسے ہم پڑھتے ہیں ہمیں بدلتا ہے اور جس حد تک اس میں تاثیر ہوگی وہ ہمارے اعمالوں کو متاثر کرے گا۔ ایک طرف ناولوں کا نفس ہی ایک صنعتی اور سرمایہ دارانہ معاشرے میں بورژوا زندگی سے قارئین کی بڑی تعداد کو اپیل کرتا ہے اور دوسری طرف معاشرے کی تنقیدی چیر پھاڑ قارئین کو تبدیلی کی ضرورت کا احساس دلاتی ہے۔

امریکہ کے ایک جدید ممتاز نقاد جن GONATHAN CULIER CULLER کلر

ہور کتاب ساختیاتی جمالیات ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔ اوز لا تشکیل پر ۱۹۸۲ء میں) سے نے NARRATOLOG کے بارے میں جو بات کہی ہے وہ مارکسی تنقید کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ ونکہ مارکسی تنقید دوسری تنقیدوں کی بہ نسبت NARRATOLOGY ہی کی ایک قسم ہے۔

کیٹل کی تنقید میں یورپین مارکسی تنقید کی مستحکم نظری بنیاد کا فقدان نمایاں ہے ن فوکس اور کرسٹوفر کوڈویل (بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے سب سے زیادہ جانے جانے برطانوی مارکسی نقاد) کے برعکس کیٹل سخت قسم کے مارکسی سانچے سے نکل آتا ہے۔ اس نے ناول کے نفس موضوع کے سماجی اور اخلاقی مضمرات پر لیوس کے زور کو برقرار ھا۔ کیٹل پر لیوس کے اثرات واضح ہیں۔ لیوس اور ٹرلنگ کی طرح اس کا خیال ہے کہ دل ہمارے عہد کا مرکزی تہذیبی بیان ہے۔ کیٹل کو لیوس کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ لارنس مرکزی اہمیت کا مالک ہے۔ اس کی زندگی اور اس کی تصانیف مادیت پرستی در افادیت پرستی کے خلاف احتجاج کی ترجمانی کرتی ہیں۔ لارنس کے ناول THE RAINBOW کا موضوع یہ ہے کہ بورژوا معاشرہ ذاتی رشتوں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ کیٹل نے زندگی در سانچے میں جو خط امتیاز کھینچا ہے وہ اس کا بنیادی جمالیاتی اصول ہے۔ فارم بجائے نود اہم نہیں۔ ناول کا مغز یہ ہے کہ وہ زندگی کے بارے میں کیا کہتا ہے۔

لیوس اور جیمس کی طرح کیٹل کہنے پر دکھانے کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کے نزدیک مصنف، متن، اور قاری کا رشتہ یہ ہے کہ ہر ناول نگار ناول کے منظر اور قاری کے درمیان کھڑا ہوتا ہے۔ وہ قاری کی توجہ پر اپنی گرفت رکھتا ہے۔ اور اس کی توجہ کی راہ نمائی کرتا ہے۔

کیٹل کے نزدیک حقیقت نگاری کے معنی ہیں۔ (۱) انسانی فطرت کی صداقت (۲) طبقاتی جدوجہد کا ادراک اور (۳) تاریخ کا ارتقائی سانچہ۔ کیٹل کے لیے حقیقت نگاری صرف ایک بیانیہ طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک بنیادی معیار ہے۔ جس سے ہم ناول کے متن کو جانچتے ہیں۔ وہ اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ ناولوں میں نظریاتی مضمرات، تاریخی عمل کا احساس اور ایسے کردار ہوتے ہیں جو سماجی اور اقتصادی سیاق و سباق میں طبقاتی مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کیٹل ان ناولوں کو زیادہ نمبر دیتا ہے جن میں نظریاتی مضمرات کو پہچانا جا سکتا ہے۔ نظریاتی سے مراد صرف سیاسی مضمرات نہیں جو اقتدار میں تبدیلی کی حمایت یا وکالت کرتے ہیں۔ وہ سیموئل بٹلر کے ناول THE WAY OF ALL FLESH کو ایسے ناولوں میں شمار کرتا ہے کیونکہ یہ ایک مقصدی ناول ہے۔ اس کا مصنف صرف حقیقتوں کی تعبیر نہیں کرتا بلکہ ان کو تبدیل بھی کرنا چاہتا ہے۔

یہ خیال کہ حقیقت نگاری میں اس مثالی انسان یا مستقبل کے انسان کی تصویر ہوتی ہے جس کی طرف تاریخ کا ارتقا ہے۔ اس سماجی حقیقت نگاری سے ماخوذ ہے جو

۱۹۵۱ء میں سوویت روس کا ایک غالب نظریہ تھا۔

کیٹل نے کونریڈ، ہنری جیمس، ای ایم فورسٹر، آرنلڈ بینٹ، جیمس جوائس، جارج ایلیٹ، ہارڈی اور ورجینیا وولف کے ناولوں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان سے فکشن کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ ناول میں ہمیشہ سماجی اور تاریخی حقیقت کی عکاسی پر زور دیتا رہا ہے۔ مارکسی نقاد ہونے کے باوجود وہ جمالیاتی اقدار کو سیاسی اقدار پر فوقیت دیتا رہا ہے۔ اس کا بنیادی معیار تاریخی حقائق کی شمولیت نہیں جو طبقاتی تقسیم اور طبقاتی جدوجہد پر زور دیتی ہے۔ بلکہ انسانی فطرت کے احساس کی صداقت ہے یعنی ناول نگار انسانی فطرت کے بارے میں جو کچھ محسوس کرے وہ صداقت پر مبنی ہو۔

کیٹل کی مارکسزم حقیقتاً ایک جذباتی انسان پرستی ہے۔ اور اس کی اقدار پور ژوائی اور جمالیاتی ہیں۔ مابعدالطبیعیات کے بغیر مارکسزم ایک قسم کا مبہم سماجی رویہ بن جاتی ہے۔ جو مساوات کے اعتدال پسندانہ اور جذباتی اصولوں پر مبنی ہوتی ہے۔ کیٹل اگرچہ اپنے اصولوں میں سخت گیر اور سائنٹفک نہیں ہے لیکن اس کی تعیمات جاذب توجہ ہیں۔

ریمونڈ ولیمس کے نزدیک بھی ناول وہ تہذیبی مظہر ہے جس کا تعین اقتصادیات کرتی ہے۔ وہ ناول کو محض سماجی تنقید کے طور پر نہیں دیکھتا بلکہ اس عمل کا حصہ تصور کرتا ہے۔ جو تاریخی شعور کی تشکیل بھی کرتا ہے اور اسے تبدیل بھی کرتا ہے۔ اس کے لیے ناول کی وہی حیثیت ہے جو قدیم تہذیبوں کے طلبہ کے لیے زبانی روایات کی تھی۔ انگریزی کی ادبی تاریخ میں ولیمس کے مقام کو سمجھنے کے معنی اسے ایک ایسے تاریخی تسلسل پر دیکھنے کے ہیں جس کا آغاز لیوس سے ہوتا ہے۔ اور جو آگے چل کر کیٹل، ولیمس، اور ٹیری ایگلٹن (TERRY EAGLETON) تک پہنچتا ہے۔ جب ہم لیوس سے کیٹل اور ولیمس تک پہنچتے ہیں تو ہمیں تاریخی شعور میں ایک نشو نما کا احساس ہوتا ہے۔

ولیمس کی کتاب THE ENGLICH NOVEL FROM DICKENS TO LAWRENCE (۱۹۷۰ء) اس کی بڑی تصانیف کلچر اینڈ سوسائٹی یا دی کنٹری اینڈ دی سیٹی کی ہم رتبہ نہیں ہے پھر بھی پروفیسر شوارز نے ناول کی تنقید کے سلسلے میں ولیمس کی اسی کتاب کو بنیاد بنایا ہے۔

پروفیسر شوارز کی کتاب کا آخری باب جے ہلس ملر پر ہے جو اس وقت امریکہ کے نقادوں کی صف اول میں سے ہے۔ ۱۹۵۸ء سے اس وقت تک اس کی چھ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ناول کی تنقید کے معاملے میں اس کے نظریات پر ہیومنزم، فینومینولوجی اور ڈی کنسٹرکشن کی گہری چھاپ موجود ہے۔

پروفیسر شوارز کی علمی فضیلت اور ناقدانہ بصیرت خود مغربی پیمانے سے بڑی اونچے معیار کی چیز ہے۔ ان کے اسلوب کو بھی ایک نقاد نے صاف شفاف اسلوب

رد یا ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ انگریزی ادب میں صاف شفاف اسلوب کا دور
شر کے لیے گزر چکا ہے۔ اب انگریزی (برطانوی اور امریکی) دونوں میں برٹرنڈ رسل
ز شو، ہسکر وائلڈ، چسٹرٹن، ٹی ایس ایلیٹ، ول ڈیورینٹ، مڈلٹن مری، ہربرٹ ریڈ
بی پریسٹلی کلفٹن فیڈیمین اور کولن ولسن جیسے لوگ شاید ہی پیدا ہوں۔ جن کے
رے سے گہرے خیالات میں بھی الجھاؤ اور ابہام نہیں ہوتا جن کی نثر پڑھ کر نثر پڑھنے
مزہ الگ ملتا ہے اور موضوع سے متعلق خیال افروز باتوں کا مزہ الگ۔ علمیت اور قابلیت
ے ادیب تو اب بھی بہت پیدا ہو رہے ہیں لیکن اب ادب میں لطف بیان اور حسن بیان
نہیں رہا۔ خیالات کو بطور صنعت بنانے کا میلان ختم ہو چکا ہے۔ بڑے بڑے اہل قلم کو
لمبے لمبے، ڈھیلے ڈھالے اور غیر واضح جملے لکھتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی معاصرانہ
ید میں بے شمار نئی اصطلاحات آگئی ہیں جن کا اردو ترجمہ کرنا بھی ایک نہایت مشکل مسئلہ
ے۔ اگرچہ بصیرت میں موشگافی کا پہلو ممکن ہے لیکن بصیرت صرف موشگافی کا نام نہیں۔ آج
بصیرت میں باریک بینی کم اور موشگافی زیادہ ہے۔ بعض اوقات عام الفاظ بھی اس
یا استعمال کیے جا رہے ہیں کہ ان کے مفہوم تک پہنچنے کی حسرت ہی رہ جاتی ہے۔
پروفیسر شوارز ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

THE DISCUSSION OF EMMA HARE AND BY BOOTH IN THE RHETORIC OF FICTION DID MUCH TO ESTABLISH THE ORTHODOXY OF THAT NOVEL IN THE POST-WAR PERIOD.

میں اس جملے میں ORTHODOXY OF THAT NOVEL کے معنی نہ سمجھ سکا۔ ممکن ہے میری
نی انگریزی میں میری مزوری کا نتیجہ ہو۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ جن کی انگریزی مضبوط
ہ مجھے سمجھا دیں بلکہ اردو میں اس جملے کا عام فہم ترجمہ کر دیں۔ یہ اور اس طرح
دوسری مشکلات ہیں جن کی بنا پر میں نے پروفیسر شوارز کی کتاب کا خلاصہ پیش کرنے
رات نہیں کی۔ انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیادہ۔

پروفیسر شوارز نے اپنی کتاب میں ہنری جیمس کے مقالے The Art of Fiction
(۱۸۸۴) سے لے کر جے ہلس ملر کی کتاب Fiction a Repetition (۱۹۸۲ء) تک
ل کی تنقید کا جائزہ لیا ہے۔ جو ایک سو سال کی تنقید پر مشتمل ہے۔ اور میرا یہ
مون اس ایک سو سال جائزے کی ایک جھلک ہے۔ اور بس۔ نہ جانے اردو تنقید
ے اور گہرے کاموں سے نبرد آزما ہونے کی اہلیت کب پیدا کر سکے گی۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید
پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ، جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ -/۴۸

تفہیم و تنقید
حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ -/۴۰

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات
ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمّے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ -/۱۲

زندگی کی طرف
شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ، اُردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ -/۳۶

گول مال
شفیقہ

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے ط[illegible] مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار[illegible] بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔

فی الفور
یوسف

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صف[illegible] کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے م[illegible] مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔

مولانا آزاد کی کہانی
ڈاکٹر ظفر احمد نظا[illegible]

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع [illegible] جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور [illegible] اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظا[illegible] بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک تاریخی دستاویز۔

مالک رام - ایک مطالعہ
مرتبہ علی جواد ز[illegible]

ماہرِ غالبیات جناب مالک رام کے [illegible] اور تحقیقی کارناموں پر ہند و پاک کے ممتاز اد[illegible] کی نگارشات کا اہم مجموعہ۔

چراغ اور کنول (شعری مجموعہ)
اختر حمید [illegible]

"چراغ اور کنول" اختر حمید خاں کی [illegible] میں بیسویں صدی عیسوی کا ریاض ہے۔ چودھو[illegible] ہجری کا عرفان ہے۔ یہی قلب کا چراغ [illegible] کا کنول ہے۔

پروفیسر عنوان چشتی
۱۱/۱۱۰۔ جامعہ نگر نئی دلّی ۲۵

کوئی مقام ہو، بے ساختہ گزر جانا
جو میکدے سے نکلنا تو اپنے گھر جانا

جو آ گئے ہو تو اتنا سا کام کر جانا
چڑھا ہو خون کا دریا تو پار اُتر جانا

یہ وہ نگر ہے جہاں بولتے ہیں سنّاٹے
کسی نے مجھ سے کہا تھا، یہاں ٹھہر جانا

کبھی چٹان کی صورت ہواؤں کی زد پر
کبھی وہ پھول کی صورت ترا بکھر جانا

سرائے جاں میں مسافر کو شام اچھی لگی
ٹھہر سکے تو مری جاں ذرا ٹھہر جانا

شکست عہد تو چھوٹی سی بات ہے" لیکن
خود اپنے آپ کی تردید ہے مُکر جانا

وہ چشم ناز ہے یا تتلیوں کے پَر، عنواں
ذرا سا ہاتھ لگانا تو رنگ اُتر جانا

نسیم سحر
پوسٹ بکس ۵۹۲۵ جدہ ۲۱۴۳۲

یوں ہی شب کو کھڑکی کھلی چھوڑ دی
ہوا نے تو آوارگی چھوڑ دی

بجھا کر دیا دل کا میں سو گیا
مگر شمع جلتی ہوئی چھوڑ دی

زباں سے تو کچھ بھی نہ میں کہہ سکا
مگر اُس کے گھر ڈائری چھوڑ دی

اندھیروں کے جنگل میں جلتے ہوئے
ستاروں بھری رات بھی چھوڑ دی

مرے دل کی تاریکیاں کب مٹیں
سو میں نے ستارہ گری چھوڑ دی

تو پھر دیکھنا اس کی ویرانیاں
اگر میں نے تیری گلی چھوڑ دی

یہ کیا روشنی سی مرے دل میں ہے؟
یہ کس نے یہاں پھلجھڑی چھوڑ دی

عجب کشمکش میں رہی وہ نسیم
پکڑ کر کلائی مری چھوڑ دی

رحمٰن جامی
"الفرا" ۲۰۱۲-۳۰/۱۴۳، مل کالونی
مہدی پٹنم - حیدرآباد

وقت

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔
بڑی مشکل سے اپنا وقت کٹتا ہے۔
جہاں جاتے ہیں
کوئی بھی نہیں ملتا
نہ اپنا اور نہ بیگانہ
فقط تنہائی ملتی ہے۔
جو لمحہ بیتتا ہے
ایسا لگتا ہے
کہ جیسے ایک صدی بیتی

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
بہت سے کام ہوتے ہیں
کہ جن کو پورا کرنے کے لیے
ملتا نہیں ہے وقت ہی کوئی
بہت سے کام رہ جاتے ہیں
آخر میں ادھورے ہی
انھیں تکمیل کرنے کو
یہ ساری عمر بھی کافی نہیں ہوتی۔

اشتیاق طالب
شعبہ اردو - جناح گورنمنٹ کالج
کراچی

خوابوں کی تعبیر — رانجھا بن کر ہیر ملی

پاؤں کو زنجیر — پھول ملے ہیں شاخوں کو

اچھی یہ تقدیر — ہاتھ نہ آیا وہ دامن

جب بھی ملی دلگ — چاندنی تجھ بن راہوں میں

آہوں کو تا — وہ ہیں پریشان میری طرح

خوشبو کی زنجیر — بادِ صبا سے رستوں کو

سب میں تیری تنو — چاند ستارے سورج پھول

لفظوں کو تو — سچے جذبے لکھنے سے

غم کی جیسے جاگ — میرے مولا ہے طالب کون

آب میمن
شعبۂ اردو ٹی. بی. این. بی کالج
اڑہ راجستھان

احمد ومی
اندھیری ویسٹ بمبئی

ادجود ہے خطرے میں ابھاگ اے دریا
ہوئی ہے کناروں پہ آگ اے دریا

البلند پرندوں کا راگ اے دریا
نا جاگ اٹھی تو بھی جاگ اے دریا

س رہی ہے درختوں پہ آگ اے دریا
لے سبز بنوں کا سہاگ اے دریا

س گئی ہیں ترے ایک لمس تر کے لیے
ہوئی ہے زمینوں میں آگ اے دریا

ے وجود کو پی لے گا اس کی سمت نہ جا
بے کنار سمندر رہے "گھاگ" اے دریا

بو سکے میرے کھیتوں کی آبیاری کر
رک پیاس نہ بن جائے "ناگ" اے دریا

ی تھوں میں اتر پائے گا کبھی شاہد
ل تو اس کا بھی چمکے گا بھاگ اے دریا

سامری

وہ لمحے
جاگتے لمحے
جو تیری میری آنکھوں کو
کبھی بھیگی ہوئی راتیں
کبھی نم دن دکھاتے تھے
صدائیں آتی رہتی تھیں
مگر وہ بڑھتے جاتے تھے
نہ جانے
ان کو کس نے
تجھ سے مجھ سے دور کر ڈالا
نہ جانے کون سا منتر کسی نے پڑھ کے پھونکا ہے
کہ بڑھتے بڑھتے سایوں کے برابر ہو گئے ہیں وہ
کم از کم تیری میری حد سے باہر ہو گئے ہیں وہ
نہ جانے کس صدا پر رک کے پتھر ہو گئے ہیں وہ

غزلیں

اختر ضیائی

13-E HOE STREET
LONDON E-17 4SD
UNITED KINGDOM

داغِ فراق زخمِ جفا ہم نے لے لیا
اُس مہرباں نے جو بھی دیا ہم نے لے لیا

آوارگی میں بوئے نفس بے مثال تھی
جس سے تری گلی کا پتا ہم نے لے لیا

کہتے ہیں اس خلوص کے ساغر میں زہر تھا
جس کو سمجھ کے دل کی دوا ہم نے لے لیا

جو کچھ بھی بن پڑا وہ کیا نذرِ زندگی
بے چارگی میں جو بھی ملا ہم نے لے لیا

اڑنے کے اور بھی تو ہزاروں لباس تھے
کس بیخودی میں رنگِ فنا ہم نے لے لیا

اس عہدِ خود فروش میں آشفتگی کا بار
جو کوئی اور لے نہ سکا ہم نے لے لیا

اب تک مہک رہا ہے وہ نقشِ سمن عذار
اک دلنواز پھول کھلا ہم نے لے لیا

کہتے ہیں ہم کو نیند کے ماتے سحر نژاد!
جب سے پیامِ دستِ صبا ہم نے لے لیا

اختر نبرد شوق میں اندوہِ بے بسی
مقدور سے بھی اپنے سوا ہم نے لے لیا

اکبر حیدرآبادی

AKBAR HYDERABADI
27 ANDERSONS CLOSE
KIDLINGTON
OXFORD OX5 1ST (UK)
TEL 08675 71592

جز نخوت و پندار رعونت سے ملا کیا
کوتاہ نظر کو قد و قامت سے ملا کیا

آنکھوں کے جھپکنے میں ہوا سرد یہ باز
شہرت کے خریدار کو شہرت سے ملا کیا

اس دل میں محبت کے لیے کتنی جگہ تھی
پالی جو کدورت تو کدورت سے ملا کیا

اچھا تھا وہی وقت کہ تھے دور کسی سے
حاصل بھی ہوا قرب تو قربت سے ملا کیا

یوں محو ہوئے خود میں کہ ہم کٹ گئے سب
کچھ اس کے سوا گوشۂ عزلت سے ملا ک

اک روشنی تھی زادِ سفر — کھو گئی وہ بھی
کس منہ سے کہیں اب ہمیں ہجرت سے ملا ک

لوگ ایک غزل کہہ کے امر ہو گئے اک
یاں تین کتابوں کی اشاعت سے ملا کیا

…احمد ساز
…ابیوز چوتھا منزلہ ۹۰-۴۳ یوسف میر علی روڈ بمبئی

…فصیلوں تک، کہکشاں کے ٹیلوں تک
…بی ہے برسوں سے، بے کسی ہے میلوں تک

…فضائے معنی ہے بے کراں خدا صورت
…ں کی الجھن ہے، لفظ کے وسیلوں تک

…کے مسافر کو تشنگی ہی راس آئے
…ائے ہم جا کر جسم کی سبیلوں تک

…ہے تدریج شرحِ کرب آگاہی
…کی قوموں سے پاس کے قبیلوں تک

…کے رسولوں کو جانے کب بشارت ہو
…ی معلق ہے دل کے جبرئیلوں تک

…ت پر ہے شیطان، گم رہا، ن فن پہنچے
…دی بہشتوں تک، غم کی سلسبیلوں تک

…ف ازل نکلا، حق میں مجرم دل کے
…کی وکالت سب رہ گئی دلیلوں تک

…شعر کی دھن میں، ہم کہاں نہیں پہنچے
…نے کیا نہیں باندھا، یعنی جبرئیلوں تک

عطا عابدی (دربھنگہ)
حال مقام: نئی دہلی

اسی غم نے تو زندہ رکھا مجھ کو
کہاں سے لاؤں گا مر کر کفن میں

سوا نیزے پہ سورج آ گیا ہے
عجب عالم میں ہوں ننگے بدن میں

نہ دو سنجیدگی کا درس مجھ کو
ابھی بھولا نہیں دیوانہ پن میں

یہ کیا دیوانگی ہے، ڈھونڈتا ہوں
سلگتے دشت میں لطفِ چمن میں

حقیقت ہے کہ مر مر کر نہ جیتا
اگر کچھ جانتا جینے کا فن میں

جہاں احساسِ غربت نے نہ چھوڑا
کہوں کیسے اُسے اپنا وطن میں

دیا احساس کو لفظوں کا پیکر
نہیں کچھ جانتا شعر و سخن میں
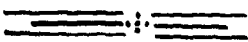
پرکاش ناتھ پرویز
مرکزِ ادب ۱۱۶۶/ایف سیکٹر ۔ بی،
چنڈی گڑھ
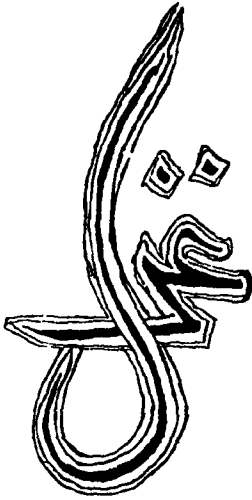
بک جاتا ہے فنکار بھی فن کے ہمراہ
دیکھی تھی کہاں ایسی تجارت پہلے

جس شہر بس جانے کی تمنا جاگی
اس شہر میں پہنچی مری شہرت پہلے

کُھل جائے گا یہ راز محبت کیا ہے
دیکھو تو سہی کرکے محبت پہلے

اب خود ہے بہاروں کو ضرورت مری
تھی مجھ کو بہاروں کی ضرورت پہلے

وہ آئے تو پرویز قیامت آئی
دیکھی تھی کہاں ہم نے قیامت پہلے

ڈاکٹر ایم۔ ایچ۔ ہُنر
۳ آگرہ روڈ بھیونڈی

ایک بوسیدہ سی پوشاک پہن کر
کون ہے جو قبا چاک پہن کر نکلا

زعم پندار میں کل کھائی تھی ٹھوکر
آج پھر جامۂ ادراک پہن کر

اس نے ہونٹوں پہ سجائے تھے تبسم کے گلا
کب وہ پوشاکِ المناک پہن کر

ہے وہ خورشید جو ظلمات سے خائف
زیورِ نور بہ افلاک پہن کر نکلا

ایک دانہ کہ جو مٹی میں دبا رہتا
جب بھی نکلا نئی پوشاک پہن کر

ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
شعبۂ اردو، مہاراشٹر کالج
بلاسس روڈ بمبئی ۸

قصۂ براہیمؑ و اسماعیلؑ
کلامِ اقبالؔ کے آئینے میں

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ علم کلام اور معانی و بیان کی سلطنت خداداد میں تلمیح کا سکہ زمانۂ قدیم
چلا آرہا ہے اور دنیا کی ہر زبان کی شاعری نے تلمیح کے سہارے خیال کو وسیع تر معنویت عطا
ہے۔ اقبالؔ کی شاعری کا دامن بھی تاریخی واقعات و حادثات، داستانیں، قصّے کہانیاں،
لیر، احادیث و روایات اور قرآنی تلمیحات سے مالا مال نظر آتا ہے۔ لیکن یہ بات قابلِ غور
کہ انھوں نے مشرق و مغرب کے بیشتر ذہنی سرمایوں سے استفادہ کیا مگر اپنے "نغمۂ ہندی"
تاثیر کی خاطر ہمیشہ "حجازی لے" کا استعمال کیا اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ ان کا فکری
اسلام اور قرآن ہے۔ تصورِ اللہ، عرفانِ الٰہی، عشقِ رسولؐ زورِ حیدری، صدقِ سلمان
بوذر، دلقِ زہراؑ اور مقامِ شبیری کے علاوہ تمام انبیاء، اولیاء، صلحاء و صحابہ کے متعدد
پیکر اقبالؔ کے ہاں ملتے ہیں۔ غرضیکہ پوری داستانِ حرم ان کی شاعری میں سما گئی ہے۔
طور پر "قصۂ براہیم و اسماعیل" کو ان کے کلام میں جو اہمیت حاصل ہے، وہ شاید ہی کسی
شاعر کے ہاں دکھائی دے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ ان کی فکر کے بنیادی عناصر،
کو ان کی شاعری کا نچوڑ بھی کہا جا سکتا ہے، وہ یہ ہیں۔ عرفان، ایقان، برہان اور ایمان
یہ چاروں عناصر، جو مردِ مومن کی پہچان کہلائے جا سکتے ہیں، حضرت ابراہیمؑ کی ذاتِ اقدس میں موجود تھے

حضرت ابراہیمؑ وہ اولوالعزم پیغمبر ہیں۔ جن کا ذکر خود قرآن کریم میں تقریباً ۲۹ جگہ آیا ہے۔
سورۂ بقرہ میں چار بار، سورۂ آل عمران میں دو بار، سورۂ نساء میں ایک بار، سورۂ انعام میں
بار، سورۂ توبہ میں ایک بار، سورۂ ہود میں ایک بار، سورۂ یوسف میں ایک بار، سورۂ
ابراہیم میں ایک بار (پورا تفصیلی ذکر) سورۂ حجر میں ایک بار، سورۂ نحل میں ایک بار، سورۂ
مریم میں ایک بار، سورۂ انبیاء میں ایک بار، سورۂ حج میں ایک بار، سورۂ شعراء میں ایک بار،
سورۂ عنکبوت دو بار، سورۂ الصّٰفّٰت ایک بار، سورۂ صٓ ایک بار سورۂ زخرف ایک بار،
الذٰریٰت میں ایک بار سورۂ نجم میں ایک بار، سورۂ حدید میں ایک بار سورۂ ممتحنہ میں ایک بار اور سورۂ
اعلیٰ میں ایک بار اسی طرح حضرت اسماعیلؑ کا ذکر سورۂ انعام، سورۂ مریم، سورۂ انبیاء، سورۂ الصّٰفّٰت
سورۂ صٓ میں کل ملا کر سات بار آیا ہے اور سب سے قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان آیتوں میں اکثر

خدائے تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کی برتری و عظمت کی مدح فرماتا ہے اور ان کے تذکرے کو وجہِ ثواب قرار دیتا ہے اور اتباعِ ابراہیمیؑ کی تلقین فرماتا ہے۔ مثلاً

۱۔ (اے رسولؐ) ان سے کہہ دو کہ ہم ابراہیم کے طریقے پر ہیں جو باطل سے کترا کے چلتے تھے اور اور مشرکین میں سے نہ تھے (سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۶، ۱۲۷)

۲۔ (اے رسولؐ) کہہ دو کہ خدا نے سچ فرمایا ہے۔ تو اب تم ملت ابراہیمؑ (اسلام) کی پیروی کرو جو باطل سے کترا کے چلتے تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے (سورۂ آل عمران آیت ۹۵)

۳۔ پھر ہم نے تمہارے پاس وحی بھی کہ ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو جو باطل سے کترا کے چلتے تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے (سورہ نحل آیت ۱۲۳)

۴۔ (اور اے رسولؐ) قرآن میں ابراہیمؑ کا بھی تذکرہ کرو۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑے سچے نبی تھے (سورۂ مریم۔ آیت۔ ۴۱)

۵۔ اس میں شک نہیں کہ ابراہیمؑ لوگوں کے پیشوا، خدا کے فرماں بردار بندے اور باطل سے کترا کے چلنے والے تھے اور مشرکین سے ہرگز نہ تھے اس کے نعمتوں کے شکر گزار ان کو خدا نے منتخب کر لیا تھا اور اپنی سیدھی راہ کی انھیں ہدایت کی تھی۔ (سورہ نحل آیت ۱۲۰)

غرضیکہ ان تمام تر آیات کی روشنی میں اقبالؔ کے قلب و نظر نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا کہ ایک مردِ مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ طریقِ ابراہیمیؑ کا پیرو ہو۔ یعنی باطل سے کترا کے چلتا ہو۔ شرک سے دور ہو۔ حق گو ہو۔ لوگوں کا پیشوا، خدا کا اطاعت گزار اور اس کی نعمتوں کا شاکر ہو۔ راہِ مستقیم کا سالک ہو اور خدا کے نزدیک منتخب اور پسندیدہ ہو۔ اسی لیے اقبالؔ اس نقطہ کو واضح کرتے ہیں

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم — دیں سرِ محمدؐ و براہیمؑ

یعنی حضرت ابراہیمؑ اس دین کے امانت دار تھے جس کی تکمیل حضور کریمؐ نے فرمائی اسی لیے اقبال نے حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے واقعات کی ایک توجیہہ اپنی شاعری میں پیش کی ہے۔ ان کی شخصیت اقبال کے لیے ایک علامتی حیثیت رکھتی ہے (حضرت ابراہیمؑ پیغام توحید الٰہی کا صریح اظہار ہیں اور حضورؐ اس دعوت کا اتمام اقبال نے اپنے مخاطبین۔ یعنی مسلمانانِ ہند کو بار بار اس بات کا احساس دلانا چاہتے تھے کہ وہ دین جو ایک نعمتِ خداوندی کی صورت میں ہمیں عطا کیا گیا تھا، اس نعمتِ خداداد کا اہل بننے کے لیے انھیں کردار کی تعمیر کرنی ہوگی۔ ایک ایسا کردار جس کی بنیادی صفات میں انقلاب پسندی اور حق گوئی شامل ہو۔ جو انھیں توحید کا صحیح عرفان عطا کرے۔ وہ خودی کی دولت سے مالا مال ہو۔ فقر کے سرمائے کا دھنی ہو اور چشمِ حق بیں رکھتا ہو تاکہ صحیح معنوں میں نیابتِ الٰہی کا حق دار قرار پا سکے۔ یعنی عرفانِ الٰہی کے لیے براہیمیؑ صفات ضروری ہیں۔ چشمِ خلیلؑ کے بغیر عرفانِ الٰہی نصیب ہو بھی نہیں سکتا۔ قرآن خود ابراہیمؑ کی معرفت کی گواہی یوں دیتا ہے۔

"جب ان پر رات کی تاریکی چھا گئی تو ایک ستارے کو دیکھا اور بول اٹھے کیا یہی میرا خدا ہے؟ پھر جب وہ غروب ہو گیا تو کہنے لگے غروب ہو جانے والی چیز کو تو میں خدا بنانا پسند نہیں کرتا۔ پھر جب چاند جگمگاتا ہوا دیکھا تو بول اٹھے کیا یہی میرا خدا ہے؟ پھر جب وہ بھی غروب

نے لگے کہ "اگر میرا حقیقی پروردگار میری ہدایت نہ کرتا تو میں ضرور گم راہ لوگوں میں ہو جاتا۔ پھر
آفتاب کو اٹھتا ہوا دیکھا تو کہنے لگے۔ یہی میرا خدا ہے۔ یہ تعجب سے بڑا بھی ہے پھر جب یہ بھی
ب ہوگیا تو کہنے لگے۔ "اے میری قوم: جن جن چیزوں کو تم لوگ خدا کا شریک بناتے ہو، ان سے
بے زار ہوں۔ یہ ہرگز خدا نہیں ہو سکتے۔ میں نے تو باطل سے کترا کر اس کی طرف رخ کر لیا ہے۔
نے بہتیرے آسمان اور زمین پیدا کیے اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں۔"

(سورۂ انعام۔ آیت ۷۵ تا ۷۷)

اپنی قوم کے نام حضرت ابراہیمؑ کی تدریس معرفت یہ انوکھا طریقہ اقبال کی شاعری میں
ڈھل گیا ہے۔

وہ سکوت شام صحرا میں غروب آفتاب
جس سے روشن تر ہوئی چشم جہاں بین خلیل
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آزری

نا الٰہی کی اسی سبیل سے ایقاں کی منزل نمودار ہوتی ہے۔ ایقاں جو محض ایک بے جان
یق یا ایک جامد عقیدہ نہیں بلکہ عشق اور وجدان، عقل اور فکر کا ایک حسین امتزاج ہے۔
رد کو حقیقت اور صداقت کی طرف لے جاتا ہے۔ جو اسے خود آگہی اور خدا آگہی کی منزل
پہنچاتا ہے جو اسے شجاعت، صداقت اور عدالت کا درس دیتا ہے۔ اور باطل سے ذرہ
ر بھی خوف زدہ نہیں ہوتا وہ اپنے قول و فعل میں آزاد ہوتا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ
تے ہیں۔

"جب آپ شہر میں آئے تو لوگ آپ کو نمرود کے پاس لے گئے۔ دیکھا کہ ایک بدصورت
تخت پر بیٹھا ہے۔ اور اس کے گرد بہت سے خوبصورت غلام اور کنیزیں صف باندھے
ہیں۔ آپ نے پوچھا۔ یہ کون ہے؟ اور یہ لوگ کون ہیں؟ کسی نے کہا "یہ خدا ہے اور
اس کی مخلوقات ہیں۔" آپ بے ساختہ بول اٹھے یہ کیوں کر خدا ہو سکتا ہے کہ خدا اور
پنے سے بہتر پیدا کر سکے؟" (سورۂ انعام۔ آیت ۸۰، ۸۱)

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے عمل سے یہ واضح کر دیا کہ مردِ مومن کی شان بے یقینی اور
نہیں بلکہ سرمایۂ یقین ہے۔ اقبال کا دل دردمند اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ
انان ہند کے غلام ذہنوں میں ایسا یقین پیدا ہو سکے۔ وہ بار بار فرماتے ہیں۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں، نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنالیتی ہیں تصویریں

اسی ہوس نے حضرت ابراہیمؑ کی قوم کے دل میں بھی اپنی تصویریں بنالی تھیں، جن کا مٹانا بڑے مشکل تھا۔ حضرت ابراہیم نے عرفان ایقان کی مدد سے برہان تک کا سفر کیا۔ اقبال نے اس کو یوں قلم بند کیا۔

یقین شل خلیلؑ آتش نشینی
یقین اللہ مستی، خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے۔ یقینی

نمرود کے سامنے وحدانیت کے جواز میں جو دلائل و براہین حضرت ابراہیمؑ نے پیش کیں، وہ سورۃ بقر (آیت ۲۵۸) اور سورۃ مریم (آیت ۴۱) میں موجود ہیں۔ مگر باطل کی آنکھ پر بے یقینی اور خود پرستی کی سیاہ پٹی بندھی تھی۔ علم کی روشنی کا گزر وہاں تک کیسے ہو سکتا۔ حضرت ابراہیمؑ کی دلیلیں سن کر اور ان سے مناظرے کر کے نمرود کا حشر یہ ہوا کہ۔

"اس پر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔ مگر ایمان نہ لایا" (سورۃ بقر۔ آیت ۲۵)

اور حضرت ابراہیم کی دعوت حق پر ان کے منہ بولے باپ (بعض روایتوں کے مطابق چچا) آزر نے کہا: "ابراہیمؑ! کیا تو میرے معبودوں کو نہیں مانتا۔ اگر تو ان باتوں سے کسی طرح نہ آئے گا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا اور تو میرے پاس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو جا" (سورۃ مریم۔ آیت ۴۶)

اقبال جانتے تھے کہ علم کی منزل شخصیت کی حیثیت کے مطابق ہوتی ہے اس۔ فرماتے ہیں۔

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیمؑ — کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
اور پھر۔ آزر کا پیشہ خارا تراشی — کار خلیلاںؑ خارا گدازی

غور سے دیکھا جائے تو اقبال کا یہ نظر "براہیمی دل و نظر" کا پیکر عصر حاضر کی یونانی اور صنم پرستی پر ایک دلچسپ اور فکر انگیز تبصرہ ہے۔ دراصل اقبال نے جس دور میں شروع کی وہ ایک زوال پذیر قوم کی بدحالی و انتشار کا دور تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد بیشتر مسلم ممالک سیاست کے گہرے منجدھار میں ڈوب چلے تھے اور مغربی اقوام کی قوتیں ان پر غلبہ پا چکی تھیں۔ اقبال اس زوال آمادہ قوم کو معاشرت کا ایک متوازن دینا چاہتے تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ یہ زوال آمادگی محض اس پست حوصلگی اور کم دینی ہے جس نے مسلمانوں کے قلوب سے عشق کی گرمی اور ایمان کی حرارت چھین لی ہے غیرت باقی ہے نہ قومی حمیت۔ نہ عرفان الٰہی ہے نہ عشق رسولؐ۔ "شرع و دیں" بت کدہ بن کر رہ گئے ہیں۔ کیونکہ عقل و دل و نگاہ، کے "مرشد اولین" یعنی عشق کی موت

وہاں اس بت کدۂ تصورات کو اسی طرح مسمار کرنا چاہتے تھے جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے بت کدۂ آزر کو تہس نہس کر ڈالا تھا۔ دور ابراہیمؑ کے یہ بتان آزری اقبال کو عصر حاضر کے بتان مغربی کی صورت میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اقبال یہ محسوس کر چکے تھے کہ قوم اس لیے بدحال و پریشان ہے کہ افراد نے دنیاوی بتوں سے آشنائی کر رکھی ہے اور انھیں کے آگے سرنگوں ہونے میں اپنی شان اور کامرانی خیال کرتے ہیں۔ "یہ لاتی و مناتی"، نظام زندگی ایشیا کی تمام قوموں پر قابض ہو چکا تھا۔ اقبال ہندی مسلمانوں کے وسیلے سے تمام ایشیائی برادری کو ایک مرکزی نقطہ پر لا کر بیداری کا پیغام دینا چاہتے تھے۔

یہ تخت و تاج میں نے لشکر سپاہ میں ہے جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

صنم کدہ ہے جہاں اور مرد حق ہے خلیلؑ یہ نکتہ وہ ہے کہ پوشیدہ لاالہٰ میں ہے

اقبال نے صنم کدہ کی ترکیب محض یوں ہی استعمال نہیں کی در اصل ان کا اشارہ تصورات و اوہام کی طرف ہے جو مومن کے قلب کو نائے سطلق کی وابستگی سے ہٹا دیتے ہیں۔ اس لیے وحدانیت کے اثبات میں اس صنم کدے کو مسمار کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ صرف ذات خداوندی ہے۔ اسے افراد کے کسی مخصوص گروہ یا جماعت کے ہاتھوں میں سونپا نہیں جا سکتا۔ چاہے وہ افراد کتنے ہی برگزیدہ کیوں نہ ہوں۔ اگر انھیں حاکم قرار دیا گیا تو اس کے لیے انسانیت کا استحصال لازمی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اسی "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کے داعی اور مبلغ تھے۔ اقبال اپنے دور کو ایک ایسے ہی ابراہیم کی تلاش میں سرگرداں دیکھنا چاہتے تھے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

اقبال اس صنم کدے کو مسمار کرنے کا انجام بھی جانتے تھے ان کی نظر میں قرآن اور ابراہیم دونوں تھے۔ انھیں پتا تھا کہ اس "بت شکنی" کی سزا "آتش نمرود" ہے لیکن انھوں نے یہ نظارہ قرآن کے پردے پر دیکھ لیا تھا کہ۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

اس کے بعد کی تصویر بھی ان کی نگاہوں سے دور نہ ہوتی
اے آگ: تو ابراہیمؑ پر بالکل ٹھنڈی اور سلامتی کا باعث ہو جا" (سورۂ انبیاء۔ آیت ۶۹)

یہ حضرت ابراہیمؑ کا جذبۂ عشق الٰہی تھا جس نے آگ کو گلزار کر دیا۔ اقبال اس نکتے سے واقف تھے کہ عشق اندیشہ ہائے دور دراز میں الجھے رہنے کی بجائے عمل کی راہوں پر گامزن رکھتا ہے بلکہ عقل مصلحت اندیش ہوتی ہے۔ حیل حجت کو بہانہ بناتی ہے۔ اگر حضرت ابراہیمؑ عقل کو رہنما بناتے تو آتش نمرود کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں یوں خاموشی اور خوشی سے کود پڑتے۔ اقبال اسی لیے تو کہتے ہیں۔

میان اندر دو حرفے سِرّ کارست | مقام عشق منبر نیست، دارست
براہیمان ز نمرودان نترسند | کہ عود خام را آتش عیارست

بیشک وہ مردِ مومن جس میں ابراہیمی حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے وہ کسی نمرود سے نہیں ڈ
کیونکہ کچے لوہے کے لیے تو آگ ایک کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال خود ایک خام لو
طرح آتشِ عصر میں تپ رہے تھے۔ انھوں نے بار ہا یہ قبول کیا کہ۔

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں | کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

مگر انھیں اس پر ناز نہیں تھا کہ۔

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش | میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند

اپنی نظم خضرِ راہ میں جب وہ سلطنت کی حقیقت، سرمایہ و محبت کا تضاد ایشیا
انتشار اور مسلمانوں کی ذلت و خواری کے متعلق حضرت خضرؑ پر سوالات کی بوچھار کرتے ہیں اور یہ پوچھتے

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے | کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

تو خضرؑ بڑے جلالی انداز میں شاعرِ مشرق کو جواب دیتے ہیں۔

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوز و ساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

اسی طرح ایک جگہ وہ کلیم اللہ سے یوں پوچھتے ہیں۔

آتشِ نمرود ہے اب تک جہاں میں شعلہ ریز | ہو گیا آنکھوں سے پنہاں کیوں ترا سوزِ کہن

تو — تھا جوابِ صاحبِ سینا کہ مسلم ہے اگر | چھوڑ کر غائب کو تو حاضر کا شیدائی نہ بن
ذوقِ حاضر ہے تو پھر لازم ہے ایمانِ خلیلؑ | ورنہ خاکستر ہے تیری زندگی کا پیرہن
شعلۂ نمرود روشن ہے زمانے میں تو کیا | شمع خود را می گداز د درمیانِ انجمن
نورِ ما چوں آتشِ سنگ از نظر پنہاں خوش است

اسی طرح جب وہ اللہ سے اپنی قوم کی بدحالی کا شکوہ کرتے ہیں کہ،

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

تو جواب میں اللہ بھی یہی فرماتا ہے کہ

آج بھی ہو جو براہیمؑ کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اقبال عمر بھر اپنے دور کے مسلمانوں میں ابراہیمؑ کا ایمان پیدا ہونے کی دعا کر
یہ دعا اس دعائے خلیلؑ ہی کی دین تھی جس کے الفاظ یہ تھے۔
"ہمارے پالنے والے: ہم نے تجھی پر بھروسہ کر لیا ہے اور تیری ہی طرف ہم رجوع کر-

تیری ہی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔ اے پروردگار: ہم لوگوں کو کافروں کی آزمائش کا ذریعہ نہ دے اور پالنے والے: تو ہمیں بخش دے۔" (سورۃ ممتحنہ۔آیت ۴ تا ۶)

آج مسلمانوں کی موجودہ حالت دیکھتے ہوئے حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا کتنی اہم معلوم ہوتی ہے۔ اس دعا کی تاثیر یہ تھی کہ فوراً جواب آیا۔

"بے شک ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور انہیں دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب مقرر کی۔" (سورۃ الحدید۔ آیت ۲۶)

غرضیکہ یہ دعا کیسے سچے دل سے نکلی تھی کہ فوراً درِ قبول تک جا پہنچی اور ایسی مقبول ہوئی کہ آج تک اہل کتاب میں سے ہر شخص آپؑ کی طرف نسبت کرنے کو اپنا فخر سمجھتا ہے۔ اقبال بھی مرد مسلماں کو نسبت براہیمیؑ کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمیؑ ہے، معمارِ جہاں تو ہے

اس نسبت براہیمیؑ کے سہارے اقبال مسلمانوں کو ان کی تخلیقی قوتوں کی طرف راغب کرتے ہیں کہ مسلمان تعمیر کے لیے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ تخریب اور تباہ کاری کے لیے مگر وہ اپنی قوم کی بے حسی پر جھنجھلا جاتے ہیں اور بے ساختہ ان کی زبان پر آجاتا ہے۔

یہ بتانِ عصرِ حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ، نہ تراشِ آزرانہ
نہ سلیقہ مجھ میں کلیمؑ کا نہ قرینہ تجھ میں خلیلؑ کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آزری

عرفان، ایقان، برہان سے گزر کر ایمان کی منزل شروع ہوتی ہے اور اس منزل پر ابراہیمی کردار کی ایک اہم صفت سامنے آتی ہے۔ اور وہ ہے ایثار و قربانی جو مردِ مومن کا امتحان ہے۔ اگر بندۂ مومن اس میں کامیاب ہو جائے تو وہ خلیلُ اللہ بن جاتا ہے۔ مگر اس کے لیے اسماعیلؑ جیسے فرزند کی قربانی دینے کی ہمت ضروری ہے جو خود راہِ خدا میں ہدیہ بن جانے کو خوشی تیار ہو جائے۔ اسی لیے تو اقبال فرماتے ہیں۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

اور جب دونوں نے حکمِ خداوندی کی تعمیل کرنا چاہی تو آواز آئی۔
"ہم نے اسماعیلؑ کا فدیہ ایک ذبحِ عظیم قرار دیا۔" (سورۃ الصٰفٰت۔آیت ۱۰۷)

اور وہ ذبح عظیم کربلا کے میدان میں امام حسینؓ نے پورا کر دکھایا جو سلب ابراہیمؑ اولاد اسماعیلؑ میں سے تھے۔ اقبال نے سچ کہا ہے کہ

صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ حیات میں بدر و حنین بھی ہے عشق

اور پھر ـــ

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ، ابتدا ہے اسماعیلؑ

مگر داستان حرم کی تکمیل کے لیے تعمیر حرم ضروری تھی جس کو روبہ عمل لانے کا ذمہ حضرت ابراہیمؑ کو دیا گیا تھا۔ اقبال یہ آواز سن رہے تھے کہ۔

(اور اے رسولؐ وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے ابراہیمؑ کے واسطے خانۂ کعبہ کی جگہ ظاہر کر دی اور (ان سے کہا) کہ میرا کسی چیز کو شریک نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف اور قیام اور رکوع و سجود کرنے والوں کے واسطے صاف رکھنا،، (سورۂ حج۔ آیت ۲۶)

اور اقبال قلندرانہ نعرہ لگا رہے تھے کہ

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں، لا الٰہ الا اللہ

قرآن سمجھا رہا تھا کہ۔

،، اور لوگوں کی عبادت کے واسطے جو گھر سب سے پہلے بنایا گیا تھا وہ یقیناً یہی (کعبہ) جو بڑی خیر و برکت والا ہے اور سارے جہاں کے لوگوں کا رہنما۔ اس میں (حرمت کی) بہت واضح اور روشن نشانیاں ہیں،، (سورۂ آل عمران۔ آیت ۹۷)

اور اقبال کا دل یہ دیکھ کر رو رہا تھا کہ۔

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر سے ترشوائے صنم اور

خدائے تعالیٰ حضورؐ کو ہدایت بھیج رہا تھا کہ۔

(اور وہ وقت بھی یاد دلاؤ) جب ابراہیمؑ و اسماعیلؑ خانۂ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے (اور یہ دعا مانگتے جاتے تھے) کہ اے ہمارے پروردگار ہماری (یہ خدمت) قبول کر۔ بے شک تو ہی (دعا کا) سننے والا اور (نیت کا) جاننے والا ہے۔ اے ہمارے پالنے والے! تو ہمیں فرمانبردار بنا۔ اور ہم کو ہمارے حج کی جگہ دکھا دے اور ہماری توبہ قبول کر۔،،
(سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۲۶-۱۲۷)

اور اقبال محسوس کر رہے تھے کہ

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغ بے نیام

ادھر خدا فرما رہا تھا۔

اور لوگوں کو حج کی خبر کر دو کہ تمھارے پاس پیادہ اور ہر طرح کی سواریوں پر جو راہ دور سے گزر کے آتی ہوں گی، چڑھ چڑھ کے پہنچیں تاکہ اپنے فائدوں پر فائز ہوں اور خدا نے جو چوپائے انھیں عطا فرماتے ہیں ان پر چند معین دنوں میں خدا کا نام لیں۔ تم لوگ (قربانی کا گوشت) خود بھی کھاؤ اور بھوکے محتاج کو بھی کھلاؤ۔" (سورۂ حج۔ آیت ۲۷، ۲۸)

اور اقبالؔ کی آنکھیں یہ منظر دیکھ کر آنسو بہار ہی تھیں کہ۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے — وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہے، تو باقی نہیں ہے

غرضیکہ آج کے مسلمانوں میں ابراہیمؑ کردار کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ کلمہ گو ضرور ہے مگر اس میں نہ حق گوئی ہے نہ باطل سے ٹکرانے کی ہمت نہ آتش نمرود میں کود پڑنے کا حوصلہ۔ نہ تعمیر حرم اور تحفظ کعبہ کا خیال۔ اقبال اس حالت زار پر خون کے آنسو روتے ہیں۔

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے دل خوگر ہیں
امتی باعث رسوائی پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا ابراہیمؑ پدر، اور پسر آزر ہیں
بادہ آشام نئے، بادہ نیا، خم بھی نئے
حرم کعبہ نیا، بت بھی نئے، تم بھی نئے

مگر اقبالؔ کا دل پھر بھی آیت "لا تقنطو" کا ورد کرتا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ اگر مسلمان کوتاہیوں کا احساس ہو جائے تو دنیا میں وہ نظام اقتدار قائم ہو سکتا ہے جس کی بنیاد انہی کے اصول پر ہے۔ اور جس کا پیغام حضرت ابراہیمؑ زندگی بھر دیتے رہے۔

مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرّ کلیمؑ و خلیلؑ

آج عراق و ایران کے پس منظر میں عالم اسلام کی بیداری کو دیکھتے ہوئے اقبال کے شعر کتنے معنی خیز نظر آتے ہیں جو انھوں نے قصۂ براہیم و اسماعیل کو علامت بنا کر آج سے تقریباً ستر اسّی سال پہلے کے سیاسی پس منظر میں کہے تھے۔

سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

ف ناظم
لال۔۱۳۔ بانندہ ریکلیمیشن
ئی ۵۰

کتابوں کے بارے میں

کتابوں کے بارے میں ہم نے کسی کتاب میں پڑھا تھا یا ہو سکتا ہے کہ پڑھا نہ ہو کسی
سن لیا ہو کہ کتابوں کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ لوگوں میں خواندگی کا رواج ہو۔
ہالی کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ خواندگی واقعی ضروری ہے۔ ضروری نہ سہی اچھی چیز ہے۔ دنیا کو قائم
ئے قرن ہا قرن گزر چکے ہیں اور روز ازل سے زمانۂ قدیم کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو یہ ماضی
بایں گزرنے والی بیسویں صدیوں کو تو نہیں بھلایا جا سکتا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنا ہو
ری صدیوں کے پاؤں تلے سے اور سر پر سے گزر جانے کے بعد بھی اگر ملک میں خواندگی صرف
ئے کے طور پر پائی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم طفل مکتب بھی نہیں۔ اس لیے سرکار صرف
ما لیے پریشان رہتی ہے کہ ملک میں دوسری ساری چیزیں تو خوب پھیل رہی ہیں مثلاً یہ کہ دانشوری
ل رہی ہے۔ عصری جنسیت پھیل رہی ہے۔ دہشت گردی مقبول ہو رہی ہے۔ مزاج بھی یوں
ے پھیل رہا ہے۔ لیکن نہیں پھیل پا رہی ہے تو بس خواندگی ..... ویسے ہمارا خیال ہے کہ سرکار کا
سر در بنیا کے اخلاق ہے ورنہ سرکار یہ جانتی ہے کہ اس کی سلامتی اور درازی عمر کی وجہ یہ ہے کہ ملک
خواندگی ٹھیک سے نہیں پھیلنے پائی۔ یہ اگر کہیں پھیل جاتی تو سرکار کیسے پھلتی پھولتی۔
عوام میں خواندگی کو عام کرنے کے لیے کئی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ جب تدابیر تعداد میں زیادہ
ہیں تو ان کے مجموعے کو منصوبہ کہا جاتا ہے۔ اور اس منصوبے کا انتساب عوام کے نام کر دیا جاتا
منصوبے پر زر کثیر خرچ کیا جاتا ہے۔ زر کثیر خرچ کرنا ہر سرکار کا اولین فرض ہے۔ اور کوئی
سرکار اس فرض کے بجا لانے میں کبھی ناکام نہیں ہوتی ہے۔ (حساب کتاب بھی ہوتا رہتا ہے)
مگی کے منصوبے پر زر کثیر خرچ کر لے کے چند دن بعد سرکار کو یہ اطلاع ملتی ہے کہ عوام میں
ندگی کا شوق رفتہ رفتہ پیدا ہو چلا ہے۔ لیکن جن کتابوں کی مدد سے اس بے لباس منصوبے کو
اسہ پہنایا جا سکتا ہے وہ کتابیں تو ہیں ہی نہیں۔ اس اطلاع کے ملنے پر مزید زر کثیر کا انتظام
جاتا ہے اور کتابیں بھی تیار ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کے فوری بعد یہ خبر آتی ہے کہ ملک میں اتنا
نہیں ہے کہ خواندگی پھیلانے والی کتابیں 'زیورِ طباعت' سے آراستہ ہو سکیں۔
یہ کاغذ کا مسئلہ ہے بھی بڑا گمبھیر۔ دوسرے ملکوں سے بندوقیں، توپیں، توپ گاڑیاں اور
قسم کی دوسری چھوٹی موٹی چیزیں تو منگوائی جا سکتی ہیں لیکن کاغذ؟ بس یہ نہیں درآمد کیا

جا سکتا۔ جتنا بھی کاغذ ملک میں پیدا ہوتا ہے وہ رائے دہندگان کی فہرستیں اور بیلٹ پیپر چھاپنے پر صرف ہو جاتا ہے۔ یہ پرچہ رائے دہی چند سال پہلے تک ڈیمائی سائز کا ایک ورق ہوتا تھا یا زیادہ سے زیادہ فل اسکیپ صفحہ۔ (یہ بھی سنبھالے نہ سنبھلتا تھا) ان دنوں اصل میں لوگوں کو صرف بیٹھے رہنے کا مرض تھا کھڑے رہنے کا شوق نہیں تھا۔ اب ہر شخص کھڑا ہونے لگا۔ ملک میں خواندگی تو نہیں پھیل پائی مستعدی بہت پھیل گئی۔ (یہ بھی اچھی چیز مانی گئی ہے) اس کی وجہ سے اب پرچہ رائے دہی ایک ہفتہ وار اخبار کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس کے لیے کاغذ عمدہ درکار ہے۔ کیونکہ یہ بیلٹ پیپر ہے امتحان کا کوئسچن پیپر نہیں کہ ردی کاغذ پر چھاپ دیا جائے۔ جمہوریت کا وقار بھی کوئی چیز ہے۔ امتحانی پرچوں کی مانگ ہے بھی کتنی جب کہ پرچہ رائے دہی ملک کے ہر بالغ کو درکار ہے۔ اب تو سن بلوغ کی عمر کے گھٹا دیے جانے کی وجہ سے ملک میں بالغوں کی تعداد فی الفور گرانی کی طرح بڑھ گئی ہے۔ ولولہ بھی زیادہ نظر آرہا ہے۔ ہر بالغ سن مقررہ پر پہنچتے ہی پہلی دعا یہ کرتا ہے کہ خدا کرے ملک میں انتخابات جلد از جلد ہوں۔ عام انتخابات میں دیر ہو تو کم سے کم میرے حلقے میں ذیلی انتخاب کا ہی موقعہ پیدا ہو جائے تا کہ میری تازہ بتازہ بلوغت ملک و قوم کے کام آسکے۔ کتابوں کی چھپائی کھٹائی میں پڑ جاتی ہے۔ اور خواندگی کا اوسط بڑھنے کی بجائے گھٹنے لگتا ہے۔ کیوں؟ اس کی وجہ خاندانی بہبودی کے محکمے والے جانتے ہیں۔ قدرت کا انتظام بھی عجیب و غریب انتظام ہے۔ پیدائشی ادیب، پیدائشی شاعر، پیدائشی رہنما اور پیدائشی کھلاڑی تو پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن پیدائشی خواندہ کوئی نہیں پیدا ہوتا۔ جانے دیجیے یہ سوال شاید مہمل ہے۔

کتابوں کے متعلق شاید یہ بھی کہا گیا ہے کہ کتابیں انسان کی بہترین دوست ہوتی ہیں۔ کتابیں دوست ہوتی ہوں گی لیکن اب آدمی کے پاس اتنا وقت ہی کہاں ہے۔ کہ وہ دوستی کی میں اپنے کچھ گھنٹے صرف کرے۔ اگر وہ اس طرح وقت ضائع کرتا رہا تو پھر نیک کام کب کرے گا۔ حالات حاضرہ پر تبادلۂ خیال کب کرے گا۔ اس لیے کتابیں بھی اب دوستی ہی کی طرح بالائے طاق رکھی ہوتی ہیں۔ نہیں نہیں رکھی نہیں دھری ہوتی ہیں۔ ہمیں یاد آیا کہ سراج اورنگ آبادی نے کسی کتاب کے بارے میں یہی کہا تھا کہ وہ طاق پر یوں ہی دھری رہی۔ پھر پورا شعر یاد آگیا۔

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی یونہی دھری رہی

وہ زمانہ اچھا تھا کہ عشق کا نسخہ ان کے ہاتھ آگیا ورنہ آج کل تو جس کسی کو دیکھیے کسی نہ کسی ڈاکٹر کا نسخہ اس کے ہاتھ میں موجود ہوتا ہے۔ (آدمی کتنا صحت مند ہو گیا ہے) لیکن اب بھی کچھ ہیں جو کتابیں پڑھنے میں طاق ہوتے ہیں۔ صحت عامہ کی خرابی کی وجہ سے کتاب ہضم نہیں کر سکتے لیکن پڑھتے ضرور ہیں۔ یہ بھی بہت ہے۔ کتاب اگر بہت ضخیم ہو تو بیچ میں سے کوئی صفحہ کھول کر اس کے حاشیے پر یا تو کچھ فرمودات لکھ دیتے ہیں یا صرف سرخ روشنائی سے لکیر کھینچ دیے

ر کسی دوسرے شخص کی نظر سے یہی کتاب گزرتی ہے تو وہ بہت مرعوب ہو جاتا ہے۔ بہت دیر
ے مرعوب رہنے کے بعد جب وہ ہوش میں آتا ہے تو خود بھی کسی صفحے پر اپنی قیمتی رائے ثبت
ر دیتا ہے۔ آج کل مطالعہ اسی کا نام ہے۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ بڑے سے بڑے شہر میں بھی کتابوں کی دکانیں نظر نہیں آتیں۔
ِ ری بھی ہیں تو شہر میں کسی دور دراز مقام پر جہاں صرف وہی شخص جا سکتا ہے جسے دنیا میں
دوسرا کوئی کام نہ ہو۔ قلب شہر میں اگر کتابوں کی دوکان کھل جاتی ہے تو شائقین اس پر ٹوٹ
پڑتے ہیں۔ یہ کتابوں کے شائقین نہیں ہوتے دوکان کے شائقین ہوتے ہیں۔ یہ سب اپنی
پگڑی پیش کرنے کے لیے بے چین ہوتے ہیں۔ دوکان دار کو مشورہ دیتے ہیں کہ تم کتابیں
بیچ کر کتنا منافع کما لو گے اور کتنی مدت میں۔ اس طرح تو تمہاری عمر نکل جائے گی۔ ہماری سنو
اور جتنا منافع تم اس صدی کے ختم ہونے تک کما سکتے ہو آج ہی ہم سے لے لو۔ اصل الگ۔
بلکہ تم چاہو تو ہم تمہاری ساری کتابیں بھی خرید لیں گے۔ ان کی قیمت لے کر بھی کتابیں ہمیں دینے
کی ضرورت نہیں۔ اپنے گھر لے جاؤ اور گھر بیٹھے بیچتے رہو۔

کہا جاتا ہے کتابوں کا بیوپار سب سے محفوظ بیوپار ہے۔ کیا آپ نے آج تک کتابوں کے
کسی تاجر کو لٹتے دیکھا۔ آج تک دہشت گردوں کے کسی گروہ نے کتابوں کی دوکان کی طرف
نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ پیٹرول پمپ لٹتے ہیں، جوہریوں کی دوکان پر دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں
نقلی پستول دکھا کر لوگ اصلی سونا چاندی اٹھا لے جاتے ہیں۔ حد یہ ہو گئی کہ پان بیڑی
اور سگریٹ بیچنے والے بھی رامپوری چاقو کی نوک پر اپنی تجوری معزز مہمانوں کی نذر کر دیتے
ہیں۔ لیکن شہر میں اگر کوئی تاجر محفوظ ہے تو بس وہ یہی کتابوں کا تاجر ہے۔ تاجر تو وہ اس لیے
کہلاتا ہے کہ اس کی ایک دوکان ہوتی ہے۔ جس کا وہ رکھوالا ہوتا ہے۔ گھر سے آتے وقت اس
کی جیب خالی رہے یا نہ رہے۔ گھر جاتے وقت بہر حال خالی رہتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ کتابیں
بکتی ہی نہیں ہیں۔ ایک چھا ناول پورے ملک میں پانسو کی تعداد میں صرف پانچ سال کی مدت
جاتا ہے۔ اسے تیزی سے بکنا کہا جاتا ہے۔ جاسوسی اور جنسی ناولیں چھپتی بھی زیادہ ہیں اور بکتی
بھی زیادہ ہیں۔ جتنی چھپتی ہیں اس سے زیادہ بکتی ہیں۔ مستعملہ کتابوں کی مانگ زیادہ ہوتی ہے۔
مستعملہ کتابوں میں ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ ہر مستعملہ کتاب آپ کے اور آپ کے احباب کے زیر استعمال
رہنے کے بعد بھی بک جاتی ہے۔ یہ کتابیں اس وقت تک بکتی رہتی ہیں جب تک کہ وہ عمر طبعی کو نہیں
پہنچ جاتیں۔

کتابیں مطالعہ کے علاوہ تحقیق کے کام بھی آتی ہیں۔ وہ کتابیں جن پر قدرت مہربان
ہوتی ہیں۔ ادب عالیہ کی دائمی رکن بن جاتی یعنی بنا دی جاتی ہیں۔ ہر زبان کی بہبودی کے لیے
اعلیٰ ادب ضروری مانا گیا ہے۔ یہ دیر سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ایک مرتبہ پیدا ہو جائے تو تا دیر قایم
رہتا ہے۔ ایسی ہی کتابیں تحقیق کے لیے منتخب کی جاتی ہیں۔ اور ان پر کچھ لوگ اپنا فن تحقیق صرف
کرتے اور مزید چند کتابوں کی افزایش کا بندوبست کرتے ہیں۔ تحقیقی کتابیں خواہ وہ مجلد ہوں

یا خستہ، الماریوں میں بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ سہولت کی خاطر ان کتابوں کو دستاویزی کہا جاتا ہے۔ (یہ ان کا لقب ہوتا ہے) اگر کسی لائبریری میں یہ کتابیں (غلطی سے) پہنچ جائیں تو حوالے کی کتابیں سمجھا جاتا ہے۔ یہ کتابوں میں سب سے اونچا درجہ ہوتا ہے۔ اگر محقق کی غلطیاں نظر انداز کر دی جائیں تو یہ کتابیں واقعی معرکتہ الآرا کتابیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان سوائے محقق کے ہر کسی کی رائے درج ہوتی ہے۔ البتہ جن کتابوں کے بارے میں یہ کہا گیا وہ آدمی کی دوست ہوتی ہیں۔ اُن میں ان کتابوں کو شامل نہیں کیا جاتا ہے۔ شامل کر لیا جا۔ پھر دوست دشمن میں فرق کیا رہا۔

تنقیدی کتابوں کا رتبہ بھی بلند ہوتا ہے۔ کچھ لوگ جن کا ادب سے صرف دور کا تعلق ہے۔ ان کتابوں کو آڈٹ رپورٹ بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ زیادتی ہے۔ آڈٹ رپورٹ تو سے تیار کی جاتی ہے۔ اس میں وقتِ نظر کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ تنقیدی رپورٹ اور کتاب میں اگر کوئی مماثلت ہوتی ہے تو بس اتنی کہ دونوں بے حد خشک ہوتی ہیں۔ تنقیدی پڑھ کر آپ کسی نیتجے پر پہنچ سکتے ہیں۔ تنقیدی کتاب آپ کو اس زحمت سے بچاتی ہے۔ رپوٹ کی روشنی میں ہی سارا کاروبار چلتا ہے۔ آڈٹ رپوٹ اور تنقیدی کتاب کو ہم شکل دے کر آڈٹ رپورٹ کو رسوا کرنا مناسب نہیں ہے۔ تنقیدی کتابوں میں مصنف کی رائے ضرور ہوتی ہے۔ اور یہی قاریوں کے لیے بلائے جان ثابت ہو سکتی ہے۔ ہم نے کہا نا قدر بعض انتظامات عجیب وغریب ہوتے ہیں۔

ان کے علاوہ بھی کتابوں کی کئی قسمیں ہیں۔ بلکہ اب تو کچھ کتابوں کے لیے نئی اصطلاحات ایجاد کرنی پڑتی ہے۔ اور ایجاد وہ ماں ہے جو بہت مصروف رہتی ہے۔ کتب فروش ان ساری کتابوں کو علاحدہ علاحدہ خانوں میں سجاتے ہیں۔ کتابوں کی ایک دکان میں ایک خانہ بھی پایا گیا۔ کتب فروش نے اکبرالہ آبادی کی تخلیقات اور ان سے متعلق تحقیقات مشتمل کتابیں تو اس خانہ میں رکھی ہی تھیں اکبر اور بیربل کے لطائف کی کتابیں بھی ان کے شانہ بشانہ سجادی گئی تھیں۔ لطائف کی کتابیں گو قد میں چھوٹی تھیں لیکن بعض کا خیال ہے کہ تحقیقی کتابوں میں سے چند کے مقابلے میں ان کا قد نکلتا ہوا تھا۔

کتابوں کی دکان میں جگہ کی قلت کی وجہ سے اگر تمام اصنافِ ادب کے لیے الگ خانے قایم نہ کیے جا سکیں تو وہ کتب فروش حضرات جو خود بھی کتابیں پڑھتے ہیں (دوسرا کوئی کام ہوتا بھی کیا ہے۔) تو وہ تنقیدی اور مزاحیہ کتابوں کو ایک ہی خانے میں رکھنا مناسب سمجھتے ہیں۔ اور ذہین قاری بھی یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہنسنا ہی مقصود ہے تو تنقیدی کتاب کیوں نہ خریدی جائے۔ بعض ہمدرد کتب فروش حضرات کا خیال ہے کہ تنقیدی کتب کی وجہ سے مزاحیہ کتابوں کی بکری پر بہت بُرا اثر پڑا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں یہ ان کی محبت انھوں نے ایسی رائے قایم کی ہے۔ ورنہ ہم نے تنقیدی کتابیں پڑھ کر لوگوں کو اشک بار بھی دیکھا ہے۔ کیا تعجب ان پر رقت بھی طاری ہوئی ہو۔

علاحدہ علاحدہ شعبے قائم کرنے کی بات پر یاد آیا کہ ایک خوش ذوق تاجر کتب نے دجی
ں ان میں سے بعض لوگ خوش ذوق بھی ہوتے ہیں۔ اور خسارے کی تجارت کرنے کے
دجود خوش وخرم بھی رہتے ہیں) ایک الماری پر یہ چٹھی لگائی "چندے آفتاب چندے ماہتاب"
س الماری میں پروفیسر گیان چند، حکم چند نیر، بھارت چند کھنہ اور گوپی چند نارنگ کی تصنیفات
کے علاوہ چندا بائی ماہ لقا کا کلام بھی رکھا پایا گیا۔ ڈاکٹر قمر رئیس کی پریم چند سے متعلق کتاب
بھی اسی الماری کی زینت تھی۔ اور تو اور امریکی خلابازوں کا چاند کا سفر نامی کتاب کو بھی اسی
الماری میں دو اپنچ جگہ ملی۔ جب ایک خریدار نے ابن انشا کی 'چاند نگر' کی فرمائش کی تو وہ کتاب
بھی اسی چندے آفتاب چندے ماہتاب والی الماری سے برآمد ہوئی۔ دھیں تو دن میں تارے
نظر آ گئے۔ اور ایسا محسوس ہوا یہ کتابوں کی الماری نہیں 'بنات النعش گردوں کی آرٹ گیلری
ہے) ایسے خوش ذوق تاجرانِ کتب خدا شاہد ہے صرف بمبئی اور حیدرآباد میں پائے جاتے ہیں

کتابوں کی دکان میں اتفاق سے الماریوں کے علاوہ کچھ شوکیس بھی ہوتے ہیں۔ دکان
میں داخل ہونے پر سب سے پہلے انھیں مخصوص چوبی طاقوں پر نظر پڑتی ہے۔ یہ شوکیس
ن خاص الخاص ادیبوں کی کتابوں کے لیے مخصوص ہوتے ہیں جو بیرونی ملکوں کا دورہ کر چکے
ہوتے ہیں۔ ان کتابوں کا سرورق بہت اچھا ہوتا ہے۔ اور بعض صورتوں میں صرف سرورق کی
نمائش سے بھی کتابوں کی تجارت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ کتابوں کے اسٹاک ایکسچنج میں یہ افواہ
عام ہے کہ خوب صورت کتابت، دیدہ زیب طباعت اور حسین جمیل سرورق کی بدولت اگر اس
کتاب کی ہم جلدیں فروخت ہو جائیں تو مصنف چار دانگ عالم میں مشہور ہو جاتا ہے۔ اسٹاک
ایکسچنج کے لوگوں میں اسی قسم کا حساب کتاب رائج ہے۔

کتابوں کی تجارت کا دارومدار بالکلیہ خریدار کی عقل وفہم پر ہوتا ہے۔ یہی ایک کاروبار
ایسا ہے جس میں سیلس مین اور سیلس گرلس کی فنکارانہ صلاحیتیں درکار نہیں ہوتیں۔ کتابوں
کو کاونٹر پر کھول کر نہیں بچھایا جاتا نہ ان کے آرام دہ ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ طباعت
وکتابت کی حسن کاریاں، چھپائی نہیں جاتیں خریدار سب کچھ جانتے، بوجھتے خود 'فراز دار'
کی آرزو کرتا ہے۔ کاش اسے سود و زیاں کے معنی معلوم ہوتے۔ کتابوں کی تجارت ہی وہ
تجارت ہے جس میں تاجر اور خریدار دونوں گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔

ہم بہرحال اس خیال کے حامی ہیں کہ یہ تو ہمارے مصنفوں کی 'کاوِ کاوِ سخت جانی
ہائے تخلیق' ہے۔ اور ناشرانِ کتب کا ولولہ کوہ کنی کہ اس کتب بیزاری اور فساد بازاری کے
ناخوش گوار ماحول میں بھی کتابیں لکھی اور چھاپی جا رہی ہیں۔ جوئے شیر نہ سہی 'بوئے شیر ہی سہی۔

شعری مجموعے

امکان	ساحرہ بیگم	۱۰/-
آنچل اور پرچم	سروش یزدانی	۲۲
ابجد	مظفر ایرج	۳۰/-
بادۂ خیام	پروفیسر غلام دستگیر شہاب	۱۶/-
برگ زرد	طالب چکوالی	۱۶/-
برگ آوارہ	حبیب جالب	۱۰/۵۰
بحر بیکراں	اختر بستوی	۹/-
باقیات اقبال	مرتبہ سید عبدالواحد معینی	۲/۵۰
برق تبسم	تبسم علی پوری	۱۰/-
برگِ سبز	طالب چکوالی	۴/-
باغ تازہ	نقوی مصطفیٰ آبادی	۱۰/-
بازگشت	ڈاکٹر زیش	۷/-
بوئے گل نالۂ دل	حسرت سہروردی	۴/۵۰
بزم خیال	سید فرحت	۱/-
بانس کے جنگلوں سے گذرتی ہوا۔	محمود سعیدی	۱۵/-
بے چین لمحوں کا تنہا سفر	ویریندر پٹواری	۴۰/-
برف شجر آواز	حمید الماس	۳۵/-
برگ سر سبز	نامی انصاری	۱۰/-
باقیات شہباز	ڈاکٹر سید صابر حسن	۲۵/-
بزم و رزم فطرت	ڈاکٹر سید عبدالمجید	۱۲/-
بھیگی رتوں کی کتھا	شہناز نبی	۲۶/-
پہلا پتھر	طاہر تلہری	۱۰/-
پیمانۂ امروز.	نعیم صدیقی	۲۰/-
پرواز غبار	غبار بھٹی	۱۰/-
پیام مشرق	اقبال	۵/-
پاک زمین کا پاک قدم	عشرت کرتپوری	۶۵/-

پنکھڑی گلاب کی	تبسم
پیکر خیال	اختر بستوی
پنکھڑیاں	سید سہروردی
پسِ دیوارِ شب	سکندر محسن
پرچھائیں اور اس کا دوسرا رخ	آصف علی
پچنول	محشر فیض آبادی
پرندوں بھرا آسمان	بلراج کومل
پیوند خستہ بادباں	خمار قریشی
پچھلے پہر کا خواب	راج کھیتی
پرچھائیوں کا جلوس	جگن ناتھ پرساد داس
پہچان کا درد	حمید الماس
تابوت	صفدر حسین
ترنگیں	رانا پرتاپ سنگھ رانگوری
تصویر وفا	حکیم احمد علی خاں وفا
تکون کا کرب	آزاد گلاٹی
ترانہائے خیام	مرتب آغا آقا سید ذر طیب حسین
تردید	محبوب راہی
شیشے کا سفر	رضا اشک
ترکش بشر	افتخار احمد بشر
تلاش	پنڈت گوکل چند حسرت شوری
تیسرا سفر	سلیمان خمار
تجلیات قمر	جمال احمد صدیقی
تعارف	طلعت عرفانی

جب جی صاحب و سکھو نبی صاحب

خواجہ دل محمد صاحب

اصل بہ توجہ آسان اردو نظم میں

جام	پروفیسر پریم رنگپوری
جنبشِ لب	ایاز بلگرامی

ملنے کا پتا:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ: بمبئی ۳

شمیم طارق
فلیٹ نمبر ۲۷
مرزبان مینشن
بائی کلا فروٹ مارکیٹ
بمبئی ۲۷

غزل کا امام وقت

کوئی مانے نہ مانے
حسن نعیم کے لیے شاعری وہ منکوحہ رہی ہے جو مہر میں بدن کا لہو مانگ لینے کے بعد جہیز میں تاثیر لاتی ہے۔

سو سوا سو غزلوں کی شکل میں وہ جو شعری سرمایہ چھوڑ گئے ہیں۔ اس کے لیے انھیں بہت کچھ چھوڑنا پڑا۔ عہدہ، سماجی رتبہ، اپنا شہر، آل اولاد، نئے پرانے احباب اور پھر زندگی بھی۔۔۔۔۔۔

آخری ہچکی تک ان کی کوشش رہی کہ ۴۰ برسوں کا انتخاب 'دبستان' اُن کے جیتے جی منظر عام پر آجائے مگر یہ آخری خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔

وہ جن شہروں میں جن عہدوں پر رہے۔ د نیو یارک اور جدّہ میں سفارت [illegible] کی حیثیت سے اور دلی میں وزارت خارجہ کے عہدیدار کے علاوہ امپورٹ اکسپورٹ [illegible] پشل کنٹرولر اور ایران غالب کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے [illegible] وہاں شہرت و دولت ان کے پاؤں [illegible] لیکن ان کو [illegible] آنکھوں کی راہ سے سمیٹی ہوئی خلش اور لہو کی گردش عزیز تھی۔ بے چینی میں [illegible] و مرتبہ کو چھوڑ چھاڑ، مستقبل کو آگ لگا بیٹھے۔

بعد میں بمبئی آئے اور اس بے رحم شہر میں لاکھ چاہا کہ خوشحالی و ناموری سے اُن کی جھولی بھرے۔ مگر یہاں جھولی بھرنے کے بجائے کشکولِ جاں میں جو تھا وہ بھی کم ہوتا گیا۔ انتقال کے وقت اکھڑی سانسوں کے سوا کچھ نہ تھا۔

ہاں فن کے لیے عمر بھر کے ریاض اور سچے تخلیقی تجربے کی جو شرط ہے ان دونوں شرطوں سے اپنی غزلوں کی تکمیل کر گئے۔ کلاسیکی غزل کی روایت سے استادانہ واقفیت کے ساتھ نئی حسیت سن و سال کی پختگی کے ساتھ جوانوں کے لہجے کی وارفتگی سے ان کی غزلوں کی اثر آفرینی میں اضافہ ہوا۔

میں ببولوں کی طرح پھولا پھلا ہوں دشت میں
ابر آئے یا نہ آئے میں سدا شاداب ہوں

بامِ خورشید سے اترے کہ نہ اترے کوئی صبح
خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے

پیمبروں نے کہا تھا کہ جھوٹ ہارے گا
مگر یہ دیکھیے اپنا مشاہدہ کیا ہے

اردو شاعری کی تاریخ میں ۶۰ء اور ۸۰ء کے درمیان کا عہد عبوری عہد کہلاتا ہے۔ اس
کے شاعروں کا امتیازی وصف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے پیشروؤں ۴۰ء ۵۰ء کی نسل کے
سے اختلاف کیا ہے۔ ان کی شاعری کسی متعین نظریے کی پابند نہیں بلکہ اس کی بنیاد ذاتی تجربے ا
جذبے پر رکھی گئی ہے۔ اس میں میرؔ کی بازیافت اور سیاسی سماجی تجربوں سے اس عہد ک
کو میرؔ کے عہد کی رات سے ملا دینے کی سعی ہے۔

چلا تھا میرؔ کے پیچھے سخن کی وادی میں
اسی کی خاک نوازی مری امامت ہے

حسن نعیمؔ اگرچہ اپنے ہم عصروں میں نسبتاً کم مشہور ہوئے مگر وہ اس عہد کے نما
شاعر ہیں۔ انھیں TREND SETTER کی حیثیت حاصل ہے۔

جہانِ فن میں جہاں منزلیں بھی فرضی ہیں
تمام عمر بھٹکنے کا حوصلہ رکھیو

ان کی غزلیں تقریباً ایک چوتھائی صدی سے معنویت اور غنائیت کا روح پرور د
ہیں۔ بعد میں ان میں دردمندی کی جہت بھی نمایاں ہوئی اور ان کے مداحوں میں دانشوروں کے
غزل کے کلاسیکل پرستار بھی شامل ہوتے گئے۔
سرحد پار انھیں ہمارا نمایندہ غزل گو شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔

حسن نعیم کی انفرادیت کا راز، ذاتی تجربے، اس کے سچے خلاقانہ اظہار، عصری حسیا
ادب کے منصب و وظیفہ سے ان کے راست تعلق اور وسیلۂ اظہار پر مکمل دسترس میں مضمر
کے شعروں میں وہ دروں بینی ہے جو لاشعور سے ہم کلام ہوتی ہے۔ لیکن ان کا فنی اظہار نا
استعاروں سے عبارت نہیں ہے۔ وہ گرد و پیش کی اشیاء سے ربط پیدا کرنے پر اصرار کرنے
ترقی پسندوں سے مختلف انداز ہیں۔ ان کے خیال میں یہ ربط ذہنی یا نظریاتی نہیں، حسی اور
ہونا چاہیے۔ ان کے متصوفانہ زاویہ نگاہ سے بھی ان کے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے۔

وہ مذہبی انسان نہیں تھے مگر امام زید اور مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری سے نسبی ن
یک گونہ سکون کا اظہار کرتے۔ وحدۃ الوجودیوں کی طرح ذات و کائنات کو وحدت کے
میں دیکھتے اور پوری زندگی کا محاسبہ کرتے ہوئے زندگی سے براہِ راست ہم کلام ہونے
شکست سے گھبرا کے کبھی ماضی کبھی اپنی ذات کی طرف دیکھتے یا پھر صورت حال کو ناگزیر

ہی کرتے تو دوسرے ہی لمحے قلبی احساس اور فنی ادراک کی یاوری سے اس مقام پر نظر آتے
ذ انسانی عظمت کی معراج ہے۔

کچھ اصولوں کا نشہ تھا کچھ مقدس خواب تھے
ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے

اپنی صفوں میں علم ہے جرأت ہے وقت ہے
ایسا نہیں کہ سچ کا مقدر شکست ہے۔

شعر و ادب پر زبان کھولیے تو مغرب و مشرق کی علمی ادبی فضاؤں پر پار پاتے ہوئے حافظ
اردو کی روح میں اتر جاتے۔ اور وہیں سے اپنے فکر و فن کی آبیاری کا سامان پاتے۔
مرزا عبدالقادر بیدل جن کی تصانیف کیت وکیفیت دونوں اعتبار سے ان کے ہم عصروں
سے موجودہ دور کے ارباب فکر و نظر تک سب کے لیے مرجع الہام رہی ہیں ان کے محبوب شاعر
رہے ہیں۔

بیدل کی باڈلی پہ لگائیں سبیل کیا۔

یہ بیدل ہی کا فیضان ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں زمین و زمان کے مسائل کو عشق
وجدان کے ذریعے سمجھنے سمجھانے کا انوکھا تجربہ کیا ہے۔

کون مجھ سے پوچھتا ہے روز اتنے پیار سے
کام کتنا ہو چکا ہے وقت کتنا رہ گیا

آ بسے کتنے نئے لوگ مکانِ جاں میں
بام و در پر ہے مگر نام اُسی کا لکھا

دی اذیت لعنتِ احساس نے گو عمر بھر
کچھ ازالہ نعمتِ افکار سے ہوتا رہا

فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں کے زمانِ خالص اور زمانِ غیر خالص کے مباحث بھی پہلو
بدل کر ان کے شعروں کا موضوع بنے ہیں۔
اس کے ساتھ ہی وہ زبان کے تسلسل اور تدریجی ارتقا کے بھی مبلغ رہے ہیں نئے تلازمے
اور ترکیبیں وضع کی ہیں۔ خطِ غبار، سست فہمی، موجۂ اشک، مکانِ جاں ..... جیسی نئی اور تازہ
ترکیبیں اور تلازمے بھی بیدل سے بھرپور استفادہ کا نتیجہ ہیں جن سے ان کی شاعری معنی آفرینی
کا نقطۂ کمال بن گئی ہے۔

چہرے پہ لکھ چکا ہوں میں خطِ غبار میں
کھوئی ہے کیسے عمر گنوایا ہے دھن کہاں

وہ مزاجاً طنز نگار نہیں تھے مگر ان کی غزلوں میں طنزیہ اشعار بھی ملتے ہیں شاید اس
وہ اس مخصوص کلچر سے وابستہ تھے جو شاعر کے مشاعرے پر تنقید کرنے کا حق تسلیم کرتا
اور پھر ان کی "انا"۔ "انا" کے ساتھ جینے مرنے کی فکر میں وہ جوانی کے بعد کے دور میں جس
آرام و یکسوئی کی نسبتاً زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ قسطوں میں مرتے رہے اور کچھ دن تو ذاتی زن
شعری تجربوں میں یہ انا بے پناہ حسن ادا بن کر بھاتی رہی۔

موجۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم
وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا

اب تو آجاؤ کہ ہم نے کاٹ لی قیدِ انا
انتظار روشنی میں اپنا دیدہ بہہ چلا

گردِ شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا
کوئی احسان زمانے کا اٹھایا ہی نہیں

لیکن جب اس انا میں ناقدریٔ زمانہ کا شدید احساس بھی شامل ہو گیا تو نفس و
تہذیب میں یکتا و تنہا، لہو اور بینائی بانٹ کر بھی چپ رہنے والا یہ شاعر شہر سخن میں دیوانہ
پیٹتے اور پتھراؤ کرتے دیکھا گیا۔

میں پشیماں ہوں کہ اپنی سست فہمی نے نعیمؔ
کیسے کیسے مسخروں کو قبلہ و کعبہ کہا

جب کھلے نقد کے اوصاف بہ فیضِ نقدی
کچھ رسالوں کے اڈیٹر بھی طرفدار ہوئے

منصف کو سب خبر ہے مگر بولتا نہیں
مجھ پر ہوا جو ظلم سزا کے بغیر بھی

اس کے بعد مایوسیوں کا دور شروع ہوا، وہ سمجھنے لگے کہ 'سانسوں سے ہم سفری
آگ رنگ روشنی، آہنگ کچھ نہیں۔

سب پریشان ہیں کہ آخر کس وبا میں وہ مرے
جن کو غربت کے علاوہ کوئی بیماری نہ تھی

جو ستارہ قبلۂ راہ تھا وہ شرار بن کے بجھا نعیم ؎ یہ زمین چادرِ خاک ہے مرا چاند جب سے گہن میں
پرانے عہدوں، رتبوں اور اچھے دنوں کے ساتھیوں کی یاد آتی تو تڑپ
زبان سے کچھ نہ کہتے۔

شعروں میں یہ کیفیت جہاں ظاہر ہوئی ہے وہ اصل میں یہ باور کرانے کی کوشش ہے کہ
شاعری معاملات، واردات اور احساسات و تجربات کا نہاں خانہ ہے جس کی نوعیت ..نجی ہے
رُخ زمین، و زمان کے باہر نہیں اس کے اندر ہے۔
کامیاب زندگی اور بامقصد پُراثر شاعری سے مایوسیوں کی چادر تان کر سو رہے تک ان
بیٍ یا جو مصیبتیں انھوں نے خود ہی مول لیں ان کا دانشورانہ اقرار اور فنکارانہ اظہار ان کی
ری کا بنیادی وصف ہے۔
اور اگرچہ وہ غم کی قوت کو زندگی کا جوہر سمجھتے اور اسی کے بل پر زندہ رہنے کے مدعی تھے

کرکے خوشیوں پر بھروسہ مرگیا ہوتا نعیم
غم کی قوت تھی کہ جس کے بل پہ زندہ رہ گیا

مگر آخر آخری غزلوں میں یہ غم قوت کے بجائے شکست اور احساس شکست کی صورت
کر گیا ہے۔ اور اس شکست خوردگی سے نجات پانے کے لیے انھوں نے ان سہاروں سے
بزرگوں کی طرف نظر کی ہے۔ جو ان کے نبی اور عام مسلمانوں کے مسلمہ روحانی بزرگ تھے
ارشاد نعیم کے نام ان کی غزل میں صاف جھلکتا ہے کہ ایک ٹوٹتا ہوا شخص، باپ کی شکل میں
مخاطب ہے مگر اس غزل میں بھی رواں دواں، بحر اور مترنم شعری سانچے سے وہی پُرکیف
در فضا تیار ہوتی ہے۔ جو ان کی ہر دور کی غزلوں کا خاصہ رہی ہے۔

یہ دکھ ہے کون بسائے گا در گہہ مخدوم
نہ میں چراغِ وراثت رہا نہ تو ہو گا
اسی میدان میں اس کربلا کی خدمت کی
کبھی تو اپنا لہو غنچۂ نمو ہو گا
ہوئی قبول دعائے سحر گہی تو نعیم
امام وقت کسی آن رُو برو ہو گا

حسن نعیم کے شعروں میں بے پناہ ترنم اور رئے غزل گائکی سے ان کے فنکارانہ شغف
ہے۔ اس فن کے اصولوں کی فنی رعایت سے انھوں نے مصرعوں بلکہ مصرعوں کے تمام ٹکڑوں
یا MUSICAL UNIT میں تبدیل کر دیا ہے۔ کوئی ٹکڑا پورا کرنے کے لیے کوئی حرف اِدھر
سر نہیں کرنا پڑتا اور ہر ٹکڑے سے معنی و موسیقی کے کئی رنگ اور راگ پھوٹتے ہیں۔
موضوع کے اعتبار سے بھی ان کے شعروں میں بڑا تنوع ہے۔ بعض موضوع تو ایسے ہیں
ماعرف انھوں نے غزل کے عام موضوعات میں شامل کیا ہے۔
(الف) غالب کے دور میں سائنس نے آج کے دور کی طرح ترقی نہیں کی تھی، اس
وجود غالب نے ابر اور ھوا کی ماہیت سے متعلق اپنے تجسس کا اظہار کیا تھا۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ھوا کیا ہے

یا اپنی قوتِ مشاہدہ کو علم فلکیات کے نکتوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے پوچھا تھا

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

لیکن حسن نعیم تو عصری دانش گاہوں میں پڑھے اور نیویارک میں برسوں رہے تھے یورپ اور امریکہ کے شعری ادبی رجحان سے بھی واقف تھے۔ جہاں نہ صرف سائنس نے نئی کی ناقابل یقین منزلیں طے کرلی تھیں۔ بلکہ جہاں سائنس کو عام موضوعات کی سطح پر لکھنے کا رجحان بھی بہت عام ہو چکا تھا۔

حسن نعیم نے اس رجحان سے استفادہ کیا اور خالص سائنسی موضوعات کو غزل کی زبان اور روح سے ہم آہنگ کیا۔

آئن اسٹائن کا نظریۂ اضافیت — یعنی یہ نظریہ کہ جو نظر آتا ہے وہی سچ نہیں ہے مثلاً روز سورج آسمان پر چڑھتا اور اترتا اور زمین کے گرد گھومتا دکھائی پڑتا ہے۔ حالانکہ زمین اپنے محور پر گھوم رہی ہے۔ حسن نعیم نے اس نظریۂ اضافیت کو یوں بیان کیا ہے۔

مری مژہ پہ جو قطرہ دکھائی دیتا ہے
تری پلک پہ ستارہ دکھائی دیتا ہے۔

(ب) اردو میں میر و غالب اور انگریزی میں آسکر وائلڈ کے "اسی عطار کے لونڈے سے دوا لینے" کی کچھ دانشوروں، فنکاروں اور شاعروں کی روایت پرانی بھی ہے اور پسندیدہ بھی۔ لیکن AIDS کی دریافت اور اس کی ہلاکت خیزیوں کے انکشافات کے بعد مغرب و مشرق میں اس روایت کو آگے بڑھانے والوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ آزادی و آوارگی کا فرق مٹانے والوں میں کہرام بپا ہے۔

حسن نعیم نے اس کیفیت — اور اس کیفیت سے دوچار غیر صحت مند روایتوں کے پرستاروں پر گہری چوٹ کی ہے۔

وصل سے جن کے ہے مغرب میں قیامت سی بپا — اُن ہی لونڈوں کے لیے میر جی بیمار ہوئے

مختصر یہ کہ موضوع، زبان اور بیان کی تازگی و توانائی حسن نعیم کی شاعری کی وہ خصوصیات ہیں جن کے سبب وہ گذشتہ ۵۰ برس میں اپنا منفرد نقش چھوڑنے والے چند شاعروں کی اگلی صف میں نظر آتے ہیں۔

اور کلاسیکی غزل میں معنی و موسیقی کے نقطۂ توازن سے پھوٹنے والی لَے کے تو دراصل وقت ہیں۔ یہ لَے انھیں لہو نچوڑ کے جینے کا ڈھنگ اختیار کرنے کے بعد حاصل ہوئی تھی۔

لہو نچوڑ کے جینے کا ڈھنگ تھا لیا تھا

آنے والوں وقتوں میں یہ لَے بہتوں کو "صاحبِ حال" بنائے گی۔ غزل گوئی میں ان سے غائبانہ بیعت کرنے والوں کا حلقہ بھی وسیع ہوگا۔

وقت ہی ناقد ہے ایسا جس کو سب معلوم ہے — حرف کے پردے میں کس نے کیا کہا کیا کہا

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگاروں کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

شفیقہ فرحت ۔ بھوپال

"کتاب نما" کا نیا شمارہ نظر نواز ہوا۔ شاعری کا پلہ بھاری ہے خصوصاً اویس خاں کی نظم بہت ہی بہتر ہو "دل کو چھو گئی اور ستیہ پال آنند سے میں کہہ چکی ہوں کہ شاعری انھیں زندہ ل۔

اب آئیں اصل حصّے کی طرف خصوصی شمارہ بے حد جامع اور بھر پور ہے ایم حبیب خان نے بڑی محنت اور محبت سے اسے ترتیب دیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی حیات شخصیت اور تمام پہلو تمام گوشے سامنے آگئے۔ پوری رعنائیوں اور وضاحتوں کے ساتھ دریا کو کوزے بند کر دیا۔ یا جن کو لوٹے میں۔

یوں بھی تصانیف کی تعداد اور ان گنت Hobbies میں دلچسپی کی داستان پڑھ کر انجم صاحب کے جن ہونے میں شبہ باقی نہیں رہا۔

چلیے "شپیرمین" کہہ لیجیے!

ناتھ آزاد کی تحریر کی اس درجہ شگفتگی اس سے پہلے کہیں نظر نہیں آئی۔ تاباں انجم کہیے زۂ آزاد۔

بہرحال مبارک باد قبول فرمایئے کہ شمارے کے اس حصّے پر ایک نظر (ترچھی ہی سہی) نے بھی ڈالی ہوگی۔

پروفیسر اشتیاق عابدی۔ سکریٹری اردو اکادمی دہلی۔

جولائی کا "کتاب نما" ملا۔ اس میں ڈاکٹر خلیق انجم صاحب سے متعلق گوشہ بے حد پسند اگر آپ کے موقر جریدے کے باریک خط کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ ماشاء اللہ سے ایک پورا۔ مکمل اور بھر پور خصوصی نمبر ہے۔ مضامین بھی بہت ہی اچھے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کی ہمہ رنگ شخصیت کے تمام ہی پہلو ابھر کر قاری کے ذہن و دل پر نقش تے ہیں واقعی بہت ہی اچھے مضامین ہیں۔

نیر مسعود حسین خان۔ علی گڑھ بنام جناب ایم حبیب خاں

آپ کا مرتب کردہ "کتاب نما" کا گوشہ خلیق انجم نظر نواز ہوا۔ اسے پڑھ کر خلیق انجم صاحب بت کے بعض ایسے پہلوؤں کا علم ہوا جو اب تک میری نظر سے اوجھل تھے۔ خاص طور پر آپ ول "انجمن صاحب" بہت پسند آیا۔ اب آپ کی تحریریں ایک خاص قسم کا رچاؤ اور روانی

آگئی ہے۔ اس مضمون میں ایک آدھ واقعہ آپ نے ایسا لکھا ہے جو دانستہ یا نادانستہ طور حقیقت سے پرے ہے لیکن اس پر گفتگو بالمشافہ ہوگی۔ انجم صاحب کو اس کارے کردی کے لیے میری جانب سے مبارک باد دیجیے اور کہیے کہ اسے پڑھ کر ان کا قد میری نظر میں اور دراز ہوگیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ۔

"کتاب نما" نے یہ بہت اچھا کام کیا کہ ڈاکٹر خلیق انجم کا گوشہ شایع کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم ایک فعال اور سرگرم علمی شخصیت ہیں اور میں انھیں ایک زمانے سے جانتا ہوں میں نے انھیں ہمیشہ علمی لگن اور دل سوزی کے اعتبار سے زعل در آتش پایا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی کسی منصب پر پہنچ جاتا ہے تو اس کا لکھنا پڑھنا موقوف ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم میں نہ صرف تنظیمی صلاحیت ہے بلکہ اپنے علمی کام کو انھوں نے کبھی پس پشت نہیں ڈالا۔ کبھی کبھی تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ دہلی کی ہنگامہ پرور زندگی میں وہ اتنے کام ایک ساتھ کیسے کر لیتے ہیں۔ بعض امور میں ان سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کی کارکردگی اور علمی لگن کا ہمیشہ سے قائل ہوں سودا اور شفتی تنقید سے لے کر خطوط غالب کی تحقیق و تدوین اور آثار الصنادید کے جامع متن اڈیشن ایک طویل علمی سفر ہے اس کی میں قدر کرتا ہوں۔ "کتاب نما" نے یہ گوشہ جناب ایم۔ حبیب خاں سے مرتب کرا کے اور بھی اچھا کیا ہے کیوں کہ حبیب صاحب کو ان کاموں کا سلیقہ ہے۔ وہ خود کثیر التصانیف ادیب ہیں اور انجمن کے دیرینہ کارکن کی حیثیت سے خلیق صاحب سے بہت قریب بھی ہیں۔"

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد۔ پٹنہ بنام جناب ایم حبیب خاں

"کتاب نما" کے تازہ شمارے میں آپ نے اردو کے بے لوث خادم اور صف اول کے ناقد و محقق ڈاکٹر خلیق انجم کی شخصیت اور ادبی خدمات سے متعلق جو گوشہ ترتیب دیا ہے ہر لحاظ سے قابل تحسین ہے۔ آپ نے خلیق صاحب کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں کو واقعی بڑے سلیقے سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں معتبر ترین لوگوں سے تحریریں حاصل کی ہیں۔ مجھے اس گوشے کی اشاعت سے از حد مسرت ہے۔

جناب ذہین نقوی۔ سکریٹری غالب اکیڈمی دلی بنام جناب ایم۔ حبیب خاں

"بھائی آپ تو کمال کے آدمی ہیں۔ کتاب نما کا خصوصی شمارہ ڈاکٹر خلیق انجم کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مرتب کر ڈالا۔ دل کی گہرائیوں سے اس اہم کام پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ کرتا ہوں۔ اس سے قبل آپ کی بہت ساری کتابیں۔ میری نظر سے گزرتی رہی ہیں۔ مریض ہے اس حالت میں "کتاب نما" نمبر دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور یہ چند سطریں اظہار مسرت پیش کر رہا ہوں۔ آپ کا مضمون انجمن صاحب "خاص طور پر پسند آیا۔

یوسف ناظم۔ بمبئی بنام ڈاکٹر خلیق انجم

"آپ کے گوشے سے متعلق بھی اسی خط میں لکھنا چاہتا تھا۔ انجمن ساری کی باتوں میں

ات رہ گئی۔ شاہد علی خاں، ایم، حبیب خاں اور خلیق احمد خاں کا تذکرہ گا لہرایا۔ ایم حبیب خاں
میم جہاں کے مضامین بہت اچھے ہیں۔ آپ کو خود نوشت لکھنی چاہیئے۔ یہ بے موقعہ
ہے۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے متعلق آپ کے خیالات سے آگاہی ہوئی۔ سوچ رہا ہوں
باد کا خط شاہد علی خاں صاحب کو لکھوں، آپ سے کیا لینا دینا۔

ڈاکٹر نیر مسعود ۔ لکھنؤ بنام ڈاکٹر خلیق انجم ۔

"کتاب نما"، میں آپ کے متعلق تحریریں بہت دل چسپی سے پڑھیں۔ ان تحریروں
افانوں کے ساتھ کتابی صورت میں بھی چھپنا چاہیئے۔

فیاض رفعت ۔ بمبئی بنام ڈاکٹر خلیق انجم۔

"کتاب نما" کا خصوصی شمارہ بابت جولائی ۱۹۹۱ء عزیزی ہارون رشید اڈیٹر بلٹز کے
ط سے ملا۔ سرورق پر اب رونق افروز ہیں۔ بہت جی خوش ہوا۔ یوں تو سب ہی مضامین
ہیں۔ اسلم پرویز صاحب آپ پر خاکہ لکھتے تو مزہ آجاتا۔ آصف جاہ صاحب نے
ن مضمون لکھا ہے۔ انھیں بے حد مبارک باد ۔

نامی انصاری۔ کان پور بنام ڈاکٹر خلیق انجم

"آپ سے تھوڑا بہت واقف تو میں پہلے سے تھا مگر آپ کی شخصیت کے گوناگوں
ؤں سے تفصیلی ملاقات "کتاب نما" کے ذریعہ ہوئی۔ میرے تجربے اور مشاہدے نے
تایا ہے کہ علمی و ادبی کاموں میں منہمک رہنے والا شخص علمی کاموں میں صفر ہوتا ہے۔
طرح عملی آدمی علم و ادب سے کم ہی دلچسپی رکھتا ہے اور رکھتا بھی ہے تو بس ایک خاص
کے اندر دونوں طرح کے کاموں کو اعلا پیمانے پر سرانجام دینے کی ایسی حیرت انگیز
بت موجود ہے جو شاذونادر ہی دیکھنے میں آئی ہے۔ اس کا واضح ثبوت اگر ایک
ت چار جلدوں میں غالب کے خطوط اور تین جلدوں میں آثارالصنادید ہے تو دوسری طرف
کے قلب میں واقع اردو گھر کی شاندار اور وسیع عمارت ہے اور یہ تینوں کام ایسے
ہ اردو ادب کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے مستحق ہیں"۔

نواب حسن خان ۔ بھوپال بنام ڈاکٹر خلیق انجم۔

" خلاق اثر صاحب سے آپ کی خیریت معلوم ہوئی۔ آج انھوں نے مجھے ایک نعمت عطا کی
وہ ہے "کتاب نما"، کا وہ شمارہ جس میں آپ کے متعلق بہت سے لاجواب مضامین ہیں۔ جب
خصوصی شمارہ میرے ہاتھ میں آیا ہے برابر بڑھ رہا ہوں۔ اور آپ کی تعریفوں کو پڑھ کر اس کو سینے
سے لگائے رہا ہوں۔ بقول غالب، "ذکر اس کا اور بیاں"، ملک کے نامور ادیبوں اور دانشوروں کے قلم سے۔

ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی ۔ استاد شعبہ اردو مسلم یونی ورسٹی۔ علی گڑھ بنام جناب ایم۔ حبیب خاں
ماہنامہ "کتاب نما"، بابت جولائی ۱۹۹۱ء موصول ہوا جس میں آپ کا ترتیب دیا ہوا گوشہ
خلیق انجم نظر سے گزرا تو مجھے انتہائی مسرت ہوئی۔ اس گوشے کی اشاعت سے ڈاکٹر خلیق
شخصیت کے ایسے گوشے جن سے لوگ ابھی تک ناواقف تھے وہ بھی منظر عام پر آ گئے۔

آپ نے ان کا سوانحی خاکہ "انجم صاحب" کے عنوان سے پیش کر کے بہت بڑا کام کیا ہے۔ مجھ جیسے بہت سے لوگ جو ان کی شخصیت اور حیات سے ناواقف تھے ان کے سامنے ڈاکٹر خلیق انجم کی قد آور شخصیت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ آپ کا طرز تحریر نہایت صاف اور سلیس ہے جس میں ایک قسم کا ٹھہراؤ اور پختگی ہے باقی مضامین بھی لائق ستائش ہیں۔ لیکن ان میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد رفعت سروش اور ڈاکٹر تاراچند رستوگی کے مضامین قابل توجہ ہیں اور نہایت خوش اسلوبی سے لکھے گئے ہیں۔

دھرم پال عاقل ۔ شملہ بنام جناب ایم حبیب خاں

"کتاب نما" کے خصوصی شمارے گوشہ خلیق انجم نظر سے گزرا اس گوشے میں سب ہی مضامین معلوماتی ہیں اور ڈاکٹر خلیق انجم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ ان کے نہایت قابل قدر کام کو بھی اجاگر کرتے ہیں جگن ناتھ آزاد۔ کمال احمد صدیقی تاراچند رستوگی اور عبدالمغنی کے مضامین بہت پسند آئے۔ مہمان مدیر جناب ایم. حبیب خان کا اداریہ بھی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

اشتیاق طالب

خلیق انجم صاحب کا گوشہ ادب بہت پسند آیا۔ خلیق صاحب پر جو مضامین شائع کیے ہیں وہ معیاری اور قابل ستائش ہیں۔

ڈاکٹر اجمل اجملی ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جولائی کا کتاب نما نظر نواز ہوا۔ برادرم قتیل شفائی کی غزل کا ایک شعر خاص طور پر بے حد پسند آیا

وہ شخص جو دیوانوں کی عزت نہیں کرتا ـــــ اس شخص کا بھی چاک گریباں کیا جائے

ڈاکٹر طارق سعید کا مضمون "وابستگی کے چند نئے مظاہر" مقالہ نگار کے الجھے ہوئے ذہن کا آئینہ دار ہے۔ کاش یہ وضاحت بھی کر دی جاتی کہ مضمون کب، کہاں اور کس تاریخ کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پڑھا گیا۔ کہ میری اطلاع میں لکھنؤ اور دلی میں تو ایسا ہوا نہیں کسی مقامی جلسے میں پڑھا گیا ہو تو اور بات۔

ڈاکٹر خلیق انجم کی شخصیت اور ادبی خدمات پر خصوصی شمارہ محترمی حبیب خاں نے بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ کمال احمد صدیقی، رفعت سروش، شریف الحسن نقوی اور ڈاکٹر اسلم پرویز صاحبان کی تحریریں بہت خوب ہیں۔ ایک مضمون جگن ناتھ آزاد صاحب کا بھی شامل ہے آزاد صاحب میرے بزرگ دوست ہیں۔ اور میں ان کا بہت احترام کرتا ہوں۔ انھوں نے اس مضمون میں میرے استاد اور بے حد محترم بزرگ ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم سے متعلق ایک انتہائی نازیبا واقعہ لکھا ہے۔ جس کی صداقت بے حد مشکوک ہے بلکہ مشکوک کی اعتبار سے۔ اول تو جہاں تک میری اور دلی کے متعدد ذمہ دار حضرات کی یادداشت کا تعلق ہے ایسا کوئی انٹرویو ہوا ہی نہیں جس میں اعجاز صاحب اکسپرٹ اور خلیق صاحب امیدوار رہے ہوں پھر اگر ایسا کوئی انٹرویو ہوا بھی ہو تو آزاد صاحب اس کے بارے میں کوئی بات یقین کے ساتھ کہنے کے موقف میں نہیں ہیں کیوں کہ اعجاز صاحب مرحوم کی زندگی میں یونی ورسٹیوں سے آزاد صاحب کا کوئی تعلق نہ تھا اس لیے وہ کسی یونی ورسٹی کے انٹرویو بورڈ کے رکن نہیں ہو سکتے تھے۔ تیسری اور آخری بات یہ کہ مرحوم اعجاز صاحب سو دائی

تھے اور چوں کہ اس وقت تک سودا کے بارے میں شیخ چاند کی کتاب ہی سب سے وقیع
ہے وہ اسے بڑی اہمیت دیتے تھے اور اپنے ہم جیسے شاگردوں کو اس کے مطالعے کی
کرتے تھے۔ اس لیے ان سے اس طرح کا جملہ منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

مجھے افسوس ہے کہ آزاد صاحب نے محض لطف زبان کے لیے ایک واقعہ ایک مرحوم کے
گھڑ لیا جو زندگی میں بھی اردو داں حلقے کی ایک محبوب شخصیت تھا اور آج بھی ہے حالانکہ
درت تھی، نہ یہ بات خود خلیق انجم صاحب کو پسند آئے گی۔ خلیق انجم صاحب اعجاز صاحب
بگاڑے بغیر بھی ایک دلچسپ اور اہم شخصیت کے مالک ہیں اور رہ سکتے ہیں۔

سید محمد رضا۔ بمبئی

کتاب نما جون ۱۹۹۱ء کے صفحہ ۴۰ پر عبداللطیف اعظمی کا خط پڑھا۔ ایسا محسوس ہوا کہ عبداللطیف اعظمی
میں دسنوی کا فوبیا ہو گیا ہے یا دسنوی کے نام سے ان کو الرجی ہو گئی ہے۔ پھر حیرت یہ
کہ ادھر اردو کے چند ادبی شمارے عبداللطیف اعظمی کے لکھے ہوئے مناسب، غیر مناسب
تاثرات چھاپے جا رہے ہیں۔ شاید اس لیے کہ لوگ ان کی بزرگی کا لحاظ رکھتے ہیں۔ تبرک
اپتے ہیں۔

اب اسی خط کو دیکھیے جو کتاب نما (جون) میں چھپا ہے۔ ظ۔ انصاری کے انتقال پر دسنوی
تاثرات قلم بند کیے۔ اب اس طرح کے تاثراتی مضمون میں ایک اہم مسئلے پر روشنی ڈالتے
بحث نکلتی ہے۔ اپنے اس خیال کو ظاہر کرنے کے لیے اعظمی صاحب کو کسی اور موقع کی تلاش
یے تھی۔ یہ بالکل غیر مناسب بات ہے کہ کسی کی موت پر کوئی اپنے تاثرات لکھے اور پھر اس قسم کے
سائل کو اٹھائے۔ عبداللطیف اعظمی کی خواہش پر افسوس کرنا پڑا۔

سلام بن رزاق کا افسانہ "ہدف" جو یقیناً ہدف ہے۔ پڑھا۔ اس افسانے کی زبان کو پڑھ کر
۔ سے سوال کرنا پڑا کہ کیا اس زبان کا تعلق ادب سے ہے؟ یہ تو جاہلوں کی بولی ہے جس کا ادب
ز سے عام نہیں۔

خود سلام بن رزاق کو اس نچلی سطح پر رہنے والوں کی بولی صحیح طور پر نہیں آتی چنانچہ افسانے
بھی مصنوعی ہو گئی ہے۔ یہ بولی اگر اصلی بولی ہوتی تو اس کا انداز اور رنگ کچھ اور ہوتا۔ چنانچہ
کی بجائے تصنع کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔

پھر موضوع کے اعتبار سے بھی یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اس افسانے کے پڑھنے اور لکھنے کا
ہے؟ کسی چیز کی نشاندہی اس میں ہوتی ہے۔ اس قسم کی تصویر کشی کا مقصد بھی واضح نہیں
افسانے کے آخری حصے سے جوڑ کر ایک لمحہ فکریہ پیدا کرنے کی کوشش بھی ناکام ہے۔ دیکھا
اور دوسرے لوگوں کی رائے کیا ہے

علی جواد زیدی۔ بمبئی

آپ کا گوشہ بہت پسند آیا بس ایک خرابی ہے اس میں میرا مضمون نہیں ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ
پت جھڑ کی آواز	(افسانے)	قرۃ العین حیدر
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبد المغنی
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں
قلندر بخش جرأت	(خطبہ)	جمیل جالبی
عجائب گھر	(بچوں کی سائنسی کتاب)	قاسم صدیقی
تاریخ اودھ	(تاریخ)	ترجمہ و ترتیب شاہ عبدالسلام
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	(ادب)	ظ انصاری
تنقید اور جدید اردو تنقید	(تنقید)	ڈاکٹر وزیر آغا
مشقی تدریس، کیوں اور کیسے؟	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں
آوازوں کا میوزیم	(افسانے)	ساگر سرحدی
اپنی ہواؤں کی خوشبو	(خاکے)	کشمیری لال ذاکر
دلی کی چند عجیب ہستیاں	(خاکے)	اشرف صبوحی
چند تصویر نیکاں	(تاثرات)	مولانا عبد السلام قدوائی
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	(ادب)	پروفیسر آل احمد سرور
صاحب جی، سلطان جی	(تذکرہ)	ڈاکٹر اسلم فرخی
نظام رنگ	(ادبی خاکہ حضرت نظام الدین اولیا)	" " "
شہید جستجو	(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)	ضیاء الحسن فاروقی
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست	(مذہب)	مشیر الحق
ہمارے دینی علوم	(مذہب)	مولانا اسلم جیراجپوری
تحقیقی مضامین	(تحقیق)	مالک رام
آسان اردو، ورک بک	(تعلیم)	شکیل اختر فاروقی

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ

مصنف: ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین
مبصر: پروفیسر عتیق احمد صدیقی
ناشر: ادارہ تحقیقات اردو۔ پٹنہ
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
قیمت سو روپے

جب خواتین کو مردوں کا نصف بہتر کہا گیا تو اگرچہ اس کا دائرۂ کار معاشرتی زندگی محدود لیکن اس کا دائرۂ اثر پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ جب کوئی بیوی اپنے شوہر کی صعوبت زندگی پر یہ آواز اٹھائے:

"چونکہ وہ (مولانا ظفر علی خاں) میرے نزدیک بے گناہ ہیں، اس لیے میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ عدالت میں اپنی صفائی ہرگز ہرگز پیش نہ کریں نظربندی ہو، قید ہو، حبس دوام ہو، پھانسی ہو، کچھ ہو، خدا اور رسول کے راستے میں ہر قسم کی کڑی مشکلات اٹھانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ امتحان کی منزل بہت سخت ہے۔ خدائے بزرگ استقلال و استقامت دے کہ تمام مشکلیں آسان ہو جائیں۔"
(بیگم مولانا ظفر علی خاں)

اور جب کوئی ماں للکار کر کہے:

"گورنمنٹ یہ جان لے کہ اگر اپنی تکالیف سے بچنے کے لیے وہ (مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی) کسی ایسی بات پر اقرار کریں گے جو ان کے مذہبی احکام یا ملکی فوائد کے ذرا بھی خلاف ہو تو مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک میرے قلب کو اتنی مضبوطی اور ان سوکھے جھریاں پڑے ہوئے ہاتھوں میں اتنی طاقت دے گا کہ میں اسی وقت ان دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی۔"

(بی اماں۔ والدہ مولانا محمد علی جوہر)

تو یہ آواز چند نفوس ہی کے دلوں میں نہیں اترتی، بلکہ ہزاروں بیٹے، ہزاروں
اور ہزاروں نوجوانوں کے دلوں کو گرمادیتی اور ان کی ہمت و استقلال اور قوت دو
عطا کرتی ہے۔ مگر مرد حاوی انسانی معاشرہ نے اپنی تاریخ کو کچھ اس طرح مرتب
ہے کہ سارے کارنامے محض مردوں سے ہی منسوب ہو کر رہ گئے۔ اس میں یہ بھی
دیا گیا کہ قابل ذکر اور قابل فخر مہمات سرانجام دینے والوں کی تربیت و پرداخت
آغوش میں ہوئی اس کا بھی ان امور کی انجام دہی میں کچھ حصہ ہے۔

ہماری جنگ آزادی جو کم و بیش ۹۰ سال پر محیط ہے۔ طبقۂ ذکور کی قربانیو
بھری ہوئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ہر قدم پر ہمیں خواتین بھی ان کے دوش بدوش نظر
آتی ہیں۔ ۱۸۵۷ کو اگر جنگ آزادی کا نقطۂ آغاز قرار دیا جائے تو اس وقت بھی اود
حضرت محل غیر ملکی تسلط کے خلاف برسرپیکار نظر آتی ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اود
منتشر قوتوں کو مجتمع کیا بلکہ تقریباً سال بھر تک میدان جنگ میں فوجوں کی کمان سنبھا
رکھی۔ اور نہایت پامردی کے ساتھ اس تمام علاقے کو انگریزوں کے تغلب سے پاک
کی کوشش کی۔ کامیابی نہیں ہوئی۔ آج اس ناکامی کے اسباب میں ان لوگوں کی
ہی تقصیرات شمار کرادی جائیں۔ لیکن ہم اس جذبے کی تحقیر نہیں کر سکتے جو اس
کے پیچھے کارفرما تھا۔ اور تقریباً ایک صدی کا یہ زمانہ ایسی مثالوں سے درخشاں ہے
و تلوار سے نہ سہی، تحریر و تقریر سے اور ولولہ انگیزی سے ان خواتین نے مشعل آ
کو روشن رکھا۔ خاص مسلمان عورتوں پر نظر ڈالیں تو مسلم معاشرہ کی بعض پابند
اور مجبوریوں کے باوجود، ان کی قربانیاں کسی دوسرے سے کم نظر نہیں آتیں۔ مگ
ان کو فراموش کر بیٹھے۔ ان کا کسی تاریخ میں ذکر نہیں۔ ان کے حالات بھی پردہ خفا میں

ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین ہمارے شکریہ کی مستحق ہیں کہ اس کتاب میں انھوں نے
کی انھیں فراموش کردہ کڑیوں کو جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ مصنفہ نے تین درجن
زیادہ ایسی خواتین کے حالات جمع کیے ہیں جن کی قربانیوں اور کاوشوں پر کوئی بھی
کر سکتی ہے۔ جگر لخت لخت کی طرح ان معلومات کو یکجا کرنا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن
نے اخبارات کے فائلوں، رسالوں، آرکائوز میں محفوظ روداروں اور نوشتوں، مخ
لائبریریوں اور کہیں کہیں ذاتی یادداشتوں سے استفادہ کر کے یہ مرقعے پیش کیے،
انھوں نے اپنے تعارفی ابتدائیہ کا آغاز اس شعر سے کیا ہے ؎

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو ورق جب اس کے اڑا لے گئی ہوا ایک ایک

اور یہ شعر ان کی کاوشوں کا آئینہ دار ہے اور اس دشواریوں کا اندازہ
لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے ریزہ ریزہ جمع کر کے کوئی عمارت بنائی ہو۔

کتاب کو تین ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے:
باب اول: ان محب وطن اور بہادر خواتین کے تذکرہ پر مشتمل ہے جنھوں نے

کی پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں عملی طور پر حصہ لیا۔

باب دوم: ان خواتین کے تذکرہ پر مشتمل ہے جو تحریک خلافت کے توسط سے عدم تعاون اور سودیشی کی تحریک میں شامل رہیں۔

باب سوم: ان خواتین کے تذکرہ پر مشتمل ہے جو ۱۹۳۰ کے بعد براہ راست گاندھی جی اور کانگریس کے دیگر رہنماؤں کے خیالات و نظریات کے زیر اثر قومی جدوجہد میں شریک ہوئیں۔

باب اول و دوم میں جن خواتین کا تذکرہ ہے وہ تقریباً سبھی پردہ نشین ہیں۔ اور عرف عام میں ان کو تعلیم یافتہ کہنا بھی مشکل ہے۔ لیکن وہ حب وطن اور جذب قومی کے سچے جذبات سے سرشار تھیں۔ اور اسی سے ان کا سیاسی شعور بیدار اور پختہ ہوا۔ جو خواتین منظر پر آسکیں، ان کی تعداد بہت کم ہے۔ لیکن ان سے کہیں زیادہ ان کی تعداد ہے جنھوں نے بس پردہ ہی رہ کر ملکی سیاسی منظر نامہ کو متاثر کیا۔ ان اثرات کو سرکاری حلقوں میں بھی محسوس کیا گیا۔ اور ان اثرات کو زائل کرنے کے لیے باقاعدہ تدابیر اختیار کی گئیں۔ ۱۹۱۷ میں ایک برطانوی افسر کی یہ رپورٹ قابل توجہ ہے کہ "علماء اور خواتین ہندستان میں انتہائی اہم اثرات کی حامل ہیں۔ جب تک ان دونوں کے بارے میں میری حکمت عملی کامیاب ہے مجھے سیاست دانوں سے کوئی خوف نہیں"۔

جدوجہد آزادی کے اس اہم حصہ کو ہم نے اب تک نظر انداز کیا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر عابدہ نے اس طرف توجہ کی۔ اس میں نہ صرف ان کے اپنے مضمون سے وابستگی، نہ صرف ان کی عالمانہ بصیرت کا دخل ہے۔ بلکہ اس بات کو بھی بڑا دخل ہے کہ ان کی تربیت ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو سیاسی تحریکات میں پیش پیش تھا۔ گویا ان تحریکات سے ان کی جذباتی وابستگی بھی ہے۔ اس لیے ان کے بیانات میں ایک والہانہ انداز موجود ہے۔ ان کو زبان پر عبور حاصل ہے۔ اپنی بات کو کہنے کا فن ان سے آتا ہے۔ انھوں نے ہر تذکرہ کو کسی برجستہ مصرعہ سے زینت دے کر اسے مزید تب و تاب بخشی ہے۔ کچھ موضوع کی دلکشی، کچھ زبان کی روانی، کچھ بیان کی لطافت، ان سب نے مل کر اس تصنیف کو ایسی عمدگی بخشی ہے جو قابل توجہ ہے۔ سپنن کی البتہ کمی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ہوتے تو کتاب کی تاریخی قیمت کا مزید اضافہ ہو جاتا۔

فن تنقید اور تنقید نگاری

مصنف : پروفیسر نورالحسن نقوی
مبصر : ضیاء الرحمن صدیقی
قیمت : پچاس روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، دہلی ۲۵

سرزمین امروہہ نے بھی کہیں کہیں نادر و نایاب شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ اس سرزمین کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے پیدا ہونے والے فنکاروں میں بے شمار ممتاز شاعر، ادیب،

فن کار، عالم دین، اطبا، سیاست داں نظر آتے ہیں اسی سرزمین کی ایک علمی و ادبی شخصیت نو
نقوی بھی ہیں۔ ان کے ادبی سفر کا آغاز تو امروہہ سے ہوا لیکن اس سفر میں تیزی اور تابناکی
علی گڑھ میں پیدا ہوتی۔

اردو ادب میں پروفیسر نورالحسن نقوی صاحب کا نام نیا نہیں ہے وہ بیک وقت
محقق نقاد اور مترجم ہیں اور تقریباً بیس کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔ ان دنوں علی گڑھ
کے شعبۂ اردو میں جمالیات کے پروفیسر ہیں۔ وہ اگرچہ اردو زبان و ادب کے استاد ہیں لیکن
انگریزی زبان و ادب میں بھی خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے انھوں
ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

انھوں نے ساہتیہ اکیڈمی اور ترقی اردو بیورو کی بعض کتابوں کے ترجمے بھی کیے
جس میں راجا رام موہن رائے اور رام چرت مانس خاص طور پر سامنے آتی ہیں۔ نقوی
نے کلیات مصحفی پانچ جلدوں کی تدوین کی ہے۔

پروفیسر نورالحسن نقوی کی اہم کتابوں میں اقبال فن اور فلسفہ، سرسید اور ہندستا
فلسفہ جمال اور اردو شاعری اور زیر تبصرہ کتاب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب تنقید کے موضوع پر پروفیسر نورالحسن نقوی کی ایک بنیادی اور اہم کتاب
اس کتاب میں مصنف نے ابتدا سے دور حاضر تک کے تمام نقادوں کے تنقیدی نظریات کو پیش
امور اردو تنقید نگاری کا احاطہ کیا ہے۔ ادبی تنقید کے اصول اور تنقید کے مختلف دبستانوں
پیش کر کے ان کا معروضی انداز میں تجزیہ کیا ہے۔

اس کتاب کے مندرجات میں تنقید کے مفہوم اور اہمیت، ادبی تنقید کے اصول، تا
تنقید، جمالیاتی تنقید، مارکسی تنقید، ترقی پسند سائنٹی فک تنقید، اسلوبیاتی تنقید، ساختیاتی
مشرقی تنقید، مغربی تنقید شامل ہیں۔ ساختیاتی اور اسلوبیاتی تنقید کو پروفیسر گوپی چند نا
کے حوالے سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ کتاب تنقید کے تمام و کمال پہلوؤں تنقید کے بنیادی امو
اور مباحث کا احاطہ کرتی ہے۔ جس سے اردو تنقید کا پورا تصور واضح طور پر ہمارے سا
آجاتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے تنقید کی تعریف کے ساتھ ساتھ ایک نقاد کی ذمے داریاں
بتائی ہیں۔

نقوی صاحب کا انداز بیان منفرد ہے وہ پیچیدہ سے پیچیدہ بات کو عام فہم انداز
بیان کر دیتے ہیں۔ بقول خورشید الاسلام۔

"پروفیسر نورالحسن نقوی کی یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود فن تنقید اور اردو تنقید
سے متعلق تمام بنیادی مباحث کا احاطہ کرتی ہے۔ اور تنقید کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتی
لگایا جا سکتا ہے کہ اس مختصر سی کتاب کی تصنیف کے لیے کتنی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا گیا
اور شعر و ادب کے مسائل پر کتنے غور و فکر سے کام لیا گیا ہے۔ انھیں پیچیدہ سے پیچیدہ
بات کو آسان اور دل نشیں انداز میں پیش کرنے کا ہنر آتا ہے۔"

...بی اور تہذیبی خبریں

...رہ عرب امارات میں جشن مجروح

جامعہ کراچی کے سابق طلبار کی انجمن یونی
...ٹیز انٹرنیشنل (UNIFAR LANG INTERNAT...)
...NA دبئی نے برصغیر پاک وہند کے نامور
...مجروح سلطان پوری کی ادبی وشعری
...مات کے اعتراف کے طور پر مقامی ہوٹل
جشن مجروح،، کی تقریب اور بین الاقوامی
...عرہ کا اہتمام کیا جس میں صاحب جشن کے
...ردخمار بارہ بنکوی، قتیل شفائی، محسن
...پالی اختر سعید خاں، شہزاد احمد، مرتضیٰ برلاس
...م نان صدیقی، ممتاز مرزا، معراج فیض
...وی، شمشیر سنگھ شیر، حنیف بنارسی، ساقی
...ٰ، ریحانہ روحی، عزم بہزاد اور مقامی شعراء
...ظہور الاسلام جاوید، ضخیم زیدی، تسنیم عابدی
...یہ فاروقی نے شرکت کی نظامت کے
...سلیم جعفری نے انجام دیئے۔ دبئی کے علاوہ
...ابوظہبی میں بھی جشن مجروح اور مشاعرے
...کیا گیا۔ منتظمین نے آیندہ سال دبئی میں
...قتیل منانے کا اعلان کیا ہے۔

...تاب تشنہ انتقال کر گئے

۱۱ اور ۱۲ مئی کی درمیانی شب ممتاز شاعر

اور روماق ایوانہائے تجارت وصنعت پاکستان کے
سکریٹری جنرل عالمتاب تشنہ ۵۶ سال کی عمر میں
حرکت قلب بند ہونے کے باعث انتقال کر گئے۔
مرحوم نے بیوہ، تین بیٹے، تین بیٹیاں اور والدہ
کو سوگوار چھوڑا ہے۔ انھیں مقامی قبرستان میں
سپرد خاک کر دیا گیا۔

عالمتاب تشنہ ۱۹۳۵ میں میرٹھ میں
پیدا ہوئے تھے ان کے اب تک دو شعری مجموعے
"موج موج تشنگی،، اور "آئینے کے اس طرف،،
شائع ہو چکے ہیں اور تیسرا مجموعہ "کف ہوا،، زیر
طبع ہے۔

شعری بھوپالی کا انتقال

بھوپال۔ ۹ جولائی (ی ن ا) اردو کے ممتاز
شاعر شعری بھوپالی طویل علالت کے بعد آج یہاں
انتقال کر گئے۔ ان کی عمر ۵۰ سال تھی۔ محمد اصغر
خاں شعری بھوپالی مقامی حمیدیہ اسپتال
میں زیر علاج تھے۔ دہلی کے ایک مشاعرہ میں
انھیں نواب حامد علی خاں طلائی تمغہ سے نوازا گیا تھا۔

"یہ لوگ" کو اردو اکیڈمی کا انعام

حیدر آباد ۷ جولائی۔ اردو کے مشہور
ادیب ونقاد اور مجاہد آزادی جناب سری نیواس
لاہوٹی کی کتاب "یہ لوگ،، کو اردو اکیڈمی آندھرا
پردیش نے بہترین تصنیف قرار دیتے ہوئے
۴ جولائی کو ایک جلسہ عام میں دو ہزار روپے
کے نقد انعام سے نوازا ہے۔ اس سے قبل بھی اس
کتاب کو اتر پردیش اردو اکیڈمی نے نقد انعام
سے سرفراز کیا تھا۔

ناروے (اوسلو) میں بین الاقوامی مشاعرہ

ایشین آرٹس کونسل اوسلو (ناروے) کے زیر اہتمام ۳۰ جون کو بمقام جشن ہال اکرزگاتا میں ایک بین الاقوامی مشاعرہ ہوا شہزاد احمد نے صدارت فرمائی۔ جن شعراء نے شرکت کی ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

پاکستان سے: شہزاد احمد، امجد اسلام امجد۔ عطاء الحق قاسمی۔ قاسم پیرزادہ ڈاکٹر انعام الحق جاوید، ڈاکٹر اجمل نیازی، مسعود ہاشمی حسن رضوی تو فیق بٹ۔ جاوید قریشی۔

بھارت سے: مخمور سعیدی جگن ناتھ آزاد ذاتی مصروفیات کی وجہ سے لندن سے اوسلو نہ آسکے۔

یورپ سے: جمشید مسرور۔ بلبل کاشمیری اطہر راز، اعجاز احمد اعجاز۔ سلطان الحسن فاروقی۔ ترغیب بلند نقوی۔ نورجہاں نوری

کوپن ہیگن ڈنمارک میں مشاعرہ

۲۹ جون ۱۹۹۱۔ بزم ادب "کوپن ہیگن" کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا۔ میٹر بورگر ہسٹ ہال" کھچا کھچ بھرا تھا۔ جن شعرا نے اس مشاعرہ میں حصہ لیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

اطہر راز، بلبل کاشمیری، اعجاز احمد اعجاز، سلطان الحسن فاروقی، بخش لائلپوری مرزا اسلم بیگ ترغیب بلند نقوی۔ شمشں خلیق ایوب خاک، حامد میر نصر ملک چاند شکلا منجیت سنگھ۔ چودھری سلیم برکات قریشی شاہد قریشی۔ خورشید انور بیگ۔

"سنگ زر" کا اجرا

۳۰ جون ۱۹ راجستھان اردو اکادمی جے پور... جلسہ کے موقع پر سوجنا کیندر جے پور میں ڈاکٹر... شیروانی کی کتاب "سنگ زر" افسانوی مجموعہ کا اجرا... کی ڈپٹی منسٹر نشریات و اطلاعات محترمہ ڈاکٹر... اس تقریب میں ڈاکٹر خلیق انجم، ... شریف الحسن نقوی، ڈاکٹر ثاقب رضوی،... ممتاز راشد نے بھی شرکت فرمائی۔ اسی... کل ہند سیمنار۔ بیاد مولانا قمر واحدی... منعقد ہوا۔ اور رات کو کل ہند مشاعرہ...

"بیساختہ" کی رسم اجرا

رانچی، انجمن معمار ادب رانچی کے ز... ۹ جون ۱۹۹۱ بروز اتوار، ڈورنڈا اردو... کے وسیع ہال میں معتبر شاعر قمر الزماں... طنزیہ و مزاحیہ مجموعہ کلام "بیساختہ" کی... رسم اجرا منائی گئی۔ تقریب کی نظامت... جمشید قمر نے فرمائی۔

رسم اجرا ڈاکٹر وہاب اشرفی (... صدر شعبہ اردو، رانچی یونی ورسٹی) کے... مبارک سے انجام پائی۔ اظہار خیال کر... والوں میں کنوینر جناب وکیل احمد رضو... جناب متین الدین خموش، ڈاکٹر صدیق... دوسرا دور مشاعرہ کا شروع... کی صدارت ڈاکٹر صدیق مجیبی نے فرمایا... نظامت کے فرائض نوجوان شاعر سرور... نے انجام دیے۔ مشاعرہ میں شرکت کر... شعرا کرام جناب ڈاکٹر صدیق مجیبی، جر... فرخ آبادی، لقمان ہاشمی، قمر حمید، وسیم... مجیب الرحمن بزمی، حیدر الہ آبادی، متین...

…س، بانکے بہاری ہمدم، اظفر جمیل، سرور ساجد
…ر اینح، نعیر افسر، راشد انور راشد، سہیل سعید
…م اللہ خاں کلام اور خود شاعر موصوف قمر الزماں
تھے۔

…ادمی ادبیات پاکستان کا ہجرہ

ادبی ایوارڈز

اسلام آباد: ۲۵ مارچ ۹۱ اردو نثر کا
…رڈ ڈاکٹر انور سدید کو ان کی کتاب "اردو
…ب کی تحریکیں" اور اردو نظم کا ایوارڈ حمایت علی
…ر کو ان کے "مجموعے ہاروں کی آواز" پر
…یس ہزار فی کس پیش کیا گیا۔

…ف بھوپالی کا انتقال

بھوپال ۔ ۲۴ جولائی ۔ مشہور و
…روف شاعر کیف بھوپالی خواجہ محمد ادریس کا آج
…ل طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا وہ ۷۱ برس
…تھے۔ پسماندگان میں بیوہ، ایک بیٹا اور ۳
…یاں ہیں۔

پتے کی تبدیلی

پروفیسر کبیر احمد جائسی ڈائرکٹر ادارہ
…وم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
…زی پور لاج سرسید نگر علی گڑھ سے منتقل ہو کر
…ل منزل بدر باغ علی گڑھ چلے گئے ہیں۔ اب ان
…مراسلت و مکاتبت کرتے وقت یہی پتا لکھا جائے۔

…اکٹر برج پریمی کی یاد میں محفل مقالات

…جموں۔ اردو کے ممتاز ناقد، افسانہ نگار اور
…یب ڈاکٹر برج پریمی کی پہلی برسی کے موقع پر

انجمن ترقی اردو ہند، جموں شاخ کے زیر اہتمام
جموں یونیورسٹی کے شعبہ قانون میں محفل مقالات
کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ممتاز ادیب دانشور
اور سوشل ورکر جناب بلراج پوری نے کی
یہ بات یاد رہے کہ ڈاکٹر برج پریمی پچھلے سال
اچانک جموں میں انتقال کر گئے۔

حسن نعیم کو خراج عقیدت

۲۵ مئی ۱۹۹۰ کی شام سات بجے قادری منزل
بتیا میں شہر کے فعال و متحرک ادبی تنظیم اردو
سوسائٹی کی جانب سے حسن نعیم کو خراج عقیدت
پیش کیا گیا جس میں شہر کے معروف و معتبر ادیبوں
و فنکاروں نے اظہار خیال کیا۔ دکھ اور قلق کے
اثرات سب کے ذہن پر یکساں چھائے ہوئے
تھے۔ اس نشست کے شرکار مندرجہ ذیل ہیں،
جناب ناظم بھارتی، جناب عزیز ربانی جناب
ساجد شمس، جناب گورکھ ناتھ مستانا، جناب
آشفتہ جمال، جناب ظفر امام، جناب نسیم احمد
نسیم، جناب ایس۔ اے شکیل، جناب ذاکر کمار،
جناب اختر حسین اور جناب آزاد اظہر۔
پروگرام کا دوسرا دور نثری ادب پر
مشتمل تھا۔ جس میں جناب ذاکر کمار نے افسانہ
شہزادہ شہزادی، اختر حسین اختر نے افسانہ
نئی نسل، اور جناب نسیم احمد نسیم نے مقالہ، ظ۔
انصاری اور پوشکن شناسی، سنایا۔ یہ سبھی
جاندار نثر اور شاندار فکری عناصر سے تیار تخلیقی
کارنامے تھے اس میں موجودہ ادب کی صحیح ترجمانی
تھی۔ اور بدلتے ہوئے دور کے ساتھ ہمدردی کا
اظہار بھی۔

اعلان

"روشنی کے پھول" کے کامیاب سفر کے بعد انور میناٹی کا آزاد غزلوں آزاد تضمینوں ثلیثوں۔ ترائیلوں اور ہائی کو پر مشتمل دوسرا شعری مجموعہ روشن جزیروں کا سفر، شائع ہوگیا ہے۔

حلقۂ شعروادب، بھاگلپور کا طرحی مشاعرہ

مصرع طرح: "سرلمحۂ حیات تغافل شعار ہے" (لطف الرحمن) "حلقۂ شعروادب"، بھاگلپور کے زیر اہتمام شہر بھاگلپور کے مشہور گہوارۂ علم وادب "مسلم میناریٹی کالج کے وسیع ہال میں پچھلے دن صدر، "مسلم ایجوکیشن کمیٹی، بھاگلپور، ڈاکٹر محمد ادریس کی صدارت میں ایک شاندار طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر منظفر اقبال نے شرکت کی۔

علی گڑھ میں ریسرچ اسکالروں کا ایک جلسہ

علی گڑھ ۲۵ مئی شعبۂ اردو کے ریسرچ اسکالر کا ایک جلسہ یہاں منعقد ہوا جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ شعبہ میں ریسرچ اسکالرس کی ایک بڑی تعداد ہونے کے باوجود ان کی کوئی ایسی انجمن نہیں ہے جو ان کے مفادات کی حفاظت کرسکے۔ اس خیال کے پیش نظر تمام ریسرچ اسکالرس نے متفقہ طور پر "انجمن اردو ریسرچ اسکالرس" (شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ) کے نام سے ایک تنظیم قایم کی جس میں درج ذیل عہد داران کا انتخاب عمل میں آیا۔

۱. جاوید اختر۔ صدر۔ خالد سیف اللہ نائب صدر

۲. محمد نعمت۔ سکریٹری۔ عبدالرشید صدیقی جوائنٹ

۳. آفتاب عالم ۔ خازن

ان عہد داران کے علاوہ نکہت آرا احمد خاں، شگفتہ جبیں۔ امتیاز احمد، اور عبدا عثمانی انجمن کی مجلس عاملہ کے ممبر منتخب ہو

جلگاؤں میں خاندیش ساہتیہ کا قیام

جلگاؤں، علاقہ خاندیش کے مختلف کے قلم کاروں کا ایک پلیٹ فارم پر لاکر ایک د کے ادب سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے ۵ مئی ۱۹۹۱ کو راشٹریہ کا تما پبلک لائبریر میں ایک میٹنگ ہوئی جس کی صدارت مراٹھی نامور ادیب اور شاعر شری ڈی۔ دی جوڑ فرمائی۔ اس میٹنگ میں خاندیش نے اردو، ہندی، گجراتی، سندھی اور دیگر زبانوں کے و شعرا کثیر تعداد میں شرکت فرماکر اکادمی کو وقت کا اہم تقاضا قرار دیا۔

اس میٹنگ میں خاندیش ساہتیہ کی ایک ایڈہاک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جس کا جناب پروفیسر اکبر رحمانی کو متفقہ طور پر منتخب اور مراٹھی کے ادیب پروفیسر آر۔ ایس۔ کو سکریٹری منتخب کیا گیا۔ اکادمی کے اراکین میں شری جوگی۔ اکبر شاہین، شری ستار، معین الدین عثمانی، نارائن شرمار مرزا افسر بھوگانوی، سراج انور مصطفیٰ پروفیسر وسنت چوہان، صغیر احمد، پرد بی پاٹل۔ اعتبار ترودی، سلیم پٹیل، منو اور مدھوکر نیوے کا انتخاب عمل

ننھے منّے بچّوں
کے لیے
دلچسپ
اور
باتصویر کہانیاں
بتاشے
نرسری کے بچوں کے لیے آسان
زبان میں دلچسپ نظمیں قیمت ۶/۵۰
جان نثار دوست
بچوں کے لیے باتصویر کہانی
قیمت ۵/- روپے
جادو کی ہنڈیا
5/-
بھیڑیے کا گانا
6/50
شیر اور بکری
6/50
کوّے کا خواب
6/50
چالاک بلی
6/-
گدھے نے بجائی بانسری
قیمت ۶/۵۰

بچوں کی مذہبی کتابیں

کتاب	قیمت
رحمان کا مہمان	۶/-
کمسن صحابی	۵/-
اسلام کے جاں نثار	۴/-
سیرت پاک مختصر مختصر	۲/-
نور کے پھول	۹/-
حضرت حمزہؓ	۳/:
سب سے بڑے انسانؐ	۳/۵۰
حضرت محبوب الٰہیؒ	۳/:
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	۲/:
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	۲/:
حضرت معین الدین چشتیؒ	۲/:
حضرت ابوبکر صدیقؓ	۶/:
حضرت طلحہؓ	۳/:
حضرت سلمان فارسیؓ	۳/:
حضرت ابوذر غفاریؓ	۲/:
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۳/:
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۳/:
نیک بیٹیاں	۲/۵۰
امیر خسروؒ	۳/:
ہمارے نبیؐ	۳/۵۰
دس جنتی	۱/۵۰
منہاج القرآن	۲/۵۰
ارکانِ اسلام	۲/-
عقائدِ اسلام	۳/-
چار یار	۷/-
آں حضرتؐ	۳/:
خلفائے اربعہ	۸/-

کتاب	قیمت
نبیوں کے قصے	۵/:
مسلمان بیبیاں	۴/:
اسلام کیسے پھیلا اوّل۔ دوم	۴/۵۰/۶
پیارے رسولؐ	۲/۵۰
ہمارے رسولؐ	[illegible]
حضرت ابوہریرہؓ	۴/-
سرکار دو عالمؐ	۹/-
اللہ کے صفی	۲/:
حضرت نظام الدینؒ	۳/:
سرکار کا دربار	۶/۵۰
ہمارا دین (اوّل، دوم، سوم) فی حصہ	۸/-
اسلام کے مشہور سپہ سالار (اوّل، دوم) مکمل	۸/-
اسلام کے مشہور امیر البحر	۴/۵۰
قرآن پاک کیا ہے؟	۲/:
اسلام کیسے شروع ہوا؟	۶/۵۰
رسول پاکؐ	۶/:
اللہ کا گھر	۴/۵۰
رسول پاک کے اخلاق	۲/:
اللہ کے خلیل	۲/:
تحسین القرآن	۴/۵۰
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ	۲/:

قاعدہ یسّرنا القرآن

مکتبہ جامعہ نے تعلیمی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قاعدہ یسّرنا القرآن کو نئی ترتیب، آسان، عام فہم ہدایتوں کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس قاعدہ کو محمد اللہ والدین اور معلمین دونوں نے بہت پسند کیا۔ اظہارِ پسندیدگی کے ساتھ ہی ہمارے بعض کرم فرماؤں نے قاعدہ کو اور بہتر بنانے کے سلسلے میں اپنی گراں قدر تجویزوں سے نوازا۔ ان تجویزوں کی روشنی میں قاعدہ یسّرنا القرآن کا تازہ ایڈیشن شائع ہو کر آگیا ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

جنگل کی ایک رات
ریحان احمد عباسی
ایک شکارگاہ کے سفر اور قیام کی مزیدار کہانی جس میں جنگل کی زندگی کے بہت سے پُراسرار مناظر سامنے آتے ہیں۔ ایک ایسا ناول جسے بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے بھی شوق سے پڑھیں گے۔
قیمت : ۹/-
ننھا ٹٹو
قیمت : ۲/-
اچھی کہانیاں
قیمت : ۲/۵۰
خطرناک سفر
ریاض احمد خاں
تین اناڑی
(ناول)
عصمت چغتائی
قیمت 6/-
اندھے کا بیٹا
قیمت : ۳.۵۰

آنتوں کی سوزش اور ہیضہ

گرمیوں میں ان کے حملے سے بچیے۔

احتیاط برتیے:

- کم گہرے ہینڈ پمپوں اور کنوؤں سے اور پانی کی نامنظور ٹرالیوں سے پانی نہ پیجیے۔
- کٹے ہوئے پھل نہ لیں اور کھلی رکھی کھانے پینے والی چیزیں نہ خریدیں جن پر مکھیاں اور گرد و غبار ہو۔
- عام طور پر بازار میں ملنے والی گھٹیا برف کا استعمال نہ کیجیے۔
- کھانا پکانے اور پینے کے لیے صرف صاف ستھرا اور نگر پالیکا کا پانی استعمال کیجیے۔
- اگر شبہہ ہو تو پانی ابال کر پیجیے یا اس میں کلورین کی گولیاں ڈالیے۔
- کھانا کھانے سے پہلے ہاتھوں کو اچھی طرح دھوئیے۔
- پینے کے پانی اور کھانے کی چیزوں کو صاف اور ڈھکن دار برتنوں میں رکھیے۔

دست اور الٹیاں ہونے پر:

- فوراً O.R.S. کا محلول دیجیے۔ ہر پانچ منٹ بعد نمک، چینی کا محلول دیجیے۔
- اگر حالت بہتر نہ ہو تو نزدیک کے اسپتال یا ڈسپنسری میں دکھائیے۔
- نمک چینی کا محلول تیار کرنے کے لیے، ابال کر ٹھنڈے کیے گئے ایک گلاس پانی میں دو چمچے چینی اور چٹکی بھر نمک ڈالیے۔

O.R.S. کے پیکٹ اور کلورین کی گولیاں تمام سرکاری اسپتالوں، ڈسپنسری زچہ بچہ کے صحتی مرکزوں میں مفت ملتی ہیں۔

جاری کردہ

ڈائرکٹر اطلاعات اور رابطہ عامہ۔ دہلی انتظامیہ۔ دہلی

F 8/1-1/91-92/DIP/3360

5-7-91

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

ستمبر ۱۹۹۱ء جلد ۳۱ شمارہ ۹

فی پرچہ 5/=
سالانہ 45/-
غیر ممالک سے
(بذریعہ بحری ڈاک) 120=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 240/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 75/=

ایڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
TELEPHONE. 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲

کتاب نما میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات نقد و تبصرہ کے ذمہ دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر صدر وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا

اس شمارے میں

ہمارا دین حصہ اول (نیا اڈیشن) (مذہب) سید شہاب الدین دسنوی ۸/۵۰
ہمارا دین حصہ دوم (نیا اڈیشن) (مذہب) سید شہاب الدین دسنوی ۸/۵۰
ہمارا دین حصہ سوم (نیا اڈیشن) (مذہب) سید شہاب الدین دسنوی ۸/۵۰
آئینۂ ادب نیا اڈیشن (درسیات) محی الدین رضا ۲۱/-
واردات " (افسانے) منشی پریم چند ۱۸/-
ہمارے رسول " (سیرت) عبدالحی ۹/-
تاریخ الامت حصہ دوم نیا اڈیشن خلافت راشدہ مولانا اسلم جیراجپوری ۱۵/-
محسن اعظمؐ اور محسنینؓ (سیرت حالات) فقیر سید وحیدالدین ۲۵/-
آتش سنگ (افسانے) ابراہیم اختر ۲۰/-
آئینے احساس کے (شاعری) اسد رضا ۵۰/-
تین بتی کے راما (ناول) علی امام نقوی ۴۰/-
دیوار پر لکھی ہوئی عبارت (افسانے) آسی رام نگری ۲۵/-
اسلام کو چھپاؤ ورنہ بغاوت پھیل جائے گی۔ (مذہب) آفتاب احمد شمسی ۴/-
ایجوکیشن ان ارلی اسلامک پیریڈ (تعلیم) ظفر عالم ۱۵/-

سرورق: پروفیسر عبدالستار دلوی
مصور شکیل اعجاز

اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار (تذکرہ) سلیم فرزانہ ۷۰/-
دریچوں میں رکھے چراغ (خاکے) رام لعل ۷۰/-
تکلم کے گونگے گھر (شاعری) شاہجہان جعفری حجاب ۷۰/-
شعر شور انگیز جلد دوم (میریات) شمس الرحمٰن فاروقی ۲۰۰/-
سب رس کے حروف (ادب) آصفہ بیگم ۵۰/-
خطوط ابوالکلام آزاد (خطوط) ابوالکلام آزاد ۲۰۰/-
دو آتشہ (شاعری) سید محمد داؤد اختر کاملی ۷۵/-
مناظر خصوصی شمارہ ۱۹۹۱ء (تنقید و تحقیق نمبر) مدیر بلراج ورما ۲۵/-
خاکۂ خاکداں (شعری مجموعہ) بدرالدین انصاری ۳۰/-
سفر سے واپسی (افسانوں کا مجموعہ) شہیر رسول ۴۰/-
ظہیر دہلوی حیات و فن (تحقیق) ڈاکٹر مختار شمیم ۹۰/-

مہمان مدیر
پروفیسر عبدالستار دلوی
صدر شعبۂ اردو ، بمبئی یونی ورسٹی
بمبئی

اشاریہ

اردو اور لسانی منصوبہ بندی

تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں زبان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے ، زبان ذریعہ ابلاغ و ترسیل بھی ہے اور اظہار قرب (COMMUNION) کا ذریعہ بھی ۔ یہ صرف مصوتوں اور مصمتوں کا مجموعہ نہیں اور نہ صرف صرف ونحو کی گردان کا نام ہے ، بلکہ یہ ایک سماجی عمل ہے جس سے انسان کو سربلندی حاصل ہونے کے ساتھ ہی اس کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے ۔ انسان کی شناخت میں زبان ایک اہم رول ادا کرتی ہے ، لہٰذا اب لسانیات میں زبانوں کے تکنیکی مطالعہ کے ساتھ ہی ساتھ اس کے سماجی و ثقافتی پہلوؤں پر کافی زور دیا جارہا ہے ۔ زبان کے یہ ثقافتی و سماجی پہلو ابتدائی مرحلوں سے لے کر ترقی کی اعلا منزلوں تک ہونے والی تبدیلیوں کو محیط کرتے ہیں ۔ ایک سے دو دہائی پہلے تک لسانیات کا بنیادی کام زبان کے تجزیائی مطالعوں تک محدود تھا اس سے ذرا آگے بڑھے تو بھی تجزیاتی مطالعے ، تجزیات کے نئے نئے طریقوں کی باز آفرینی کا کام کرنے لگے ، یا معنیاتی سطح پر لفظ و معنی کے رشتوں پر بحثیں اس کے دائرہ کار کا حصہ بنیں ، مگر تیز رفتار اور ہر لحظہ بدلنے والی سماجی زندگی کے پیش نظر زبان میں واقع ہونے والی تبدیلیاں اور ان تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے مسائل کے حل کی تلاش بھی لسانی علوم کا حصہ ہیں ۔ لسانی علوم کا کام اب زبان کے سماجی و ثقافتی رشتوں کی روشنی میں تیزی سے بدلنے والی زندگی میں زبانوں کے مختلف سطحوں پر معیار کا تعین اور ثقافتی زندگی میں اس کا مقام ، اس کی علمی نوعیتیں اور دیگر مسائل میں اسے سمت و رفتار عطا کرنا ہے ۔

اردو ہند و پاک کے کثیر لسانی پس منظر میں پھلنے پھولنے والی سب سے زیادہ اہم زبان ہے ، اسی کے ساتھ اس زبان کی ایک مخصوص خصوصیت مطابقت پذیری (ADAPTIBILITY) بھی ہے ، اس پس منظر میں اردو کے مسائل محض جذباتی سطح پر حل نہیں کیے جاسکتے بلکہ ملک کے کثیر لسانی ، ثقافتی ، تعلیمی اور سیاسی حالات کے علاوہ بین اقوامی تہذیبی و لسانی و سائنسی ہونے رویوں کے سیاق میں حل کرنے کی ضرورت ہے ۔ عام طور سے کسی بھی زبان کی معیار بندی کا تعلق اس زبان کے بولنے والوں کے شین قاف پر ہوتا ہے ، لفظوں کی تذکیر و تانیث پر ہوتا ہے ، الفاظ کے واحد اور جمع کا غلط استعمال اس کے معیار کو ساقط کر دیتے ہیں ، رسم خط

اور اس کی اصلاح اور بعض اوقات اس کی تبدیلی بھی زبان کی ترقی و اشاعت میں زیر بحث
آئے ہیں، تاہم اشاعتِ زبان کے سلسلے میں اس کے وسیع تر صوتی نظام اور اس کی مخصوص نزاکتوں
کے ساتھ اس کے صرف کے مختلف اعمال پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح الفاظ کی معنیاتی
سطحوں کے مطالعے اور ان کے تعلق سے پیدا ہونے والے فلسفیانہ اُفقوں کی بازیافت ضروری
ہے۔

اردو زبان کی ترقی کے تعلق سے ہماری ساری گفتگو اس کے ادبی پہلوؤں پر مرتکز
ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور شکایتوں اور حکایتوں کے سارے محور نقطۂ آغاز تا نقطۂ آخر ادب ہوتا ہے
اس ادب زدہ ماحول میں بھی شاعری اور افسانہ گویا ہمارے ادب کی ساری اساس ہے اور
انھیں کی ترقی و تبدیلی اور سمت و رفتار ساری زبان کی ترقی و رفتار سمجھی جاتی ہے۔ ضرورت اس
بات کی ہے کہ اب ہم شاعری اور افسانہ کی ادبی اہمیت تسلیم کر لینے کے باوجود دیگر اصناف ادب کی
طرف بھی توجہ دیں۔ جنھیں عام طور پر ہمارے ادب میں نہ صرف نظر انداز کیا جاتا رہا ہے بلکہ
جیسے دائرۂ ادب سے غیر شعوری طور سے ہی سہی خارج سمجھا جاتا ہے۔ خالص ادبی اصناف کے
علاوہ زبان کے دیگر علمی و تعلیمی پہلوؤں سے ہمارے یہاں غور و خوض نہیں کیا جاتا۔ مختلف سما
و سائنسی علوم پر اچھی تحریریں ہمارے یہاں کمیاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہیں۔ کوئی بھی زبان محض اد
زبان ہونے کی حیثیت سے بڑی زبان یا ترقی یافتہ زبان نہیں کہلائی جا سکتی۔ شاعری، افسا
ناول، ڈرامے کی ادبی حیثیت مسلّم، لیکن علمی اعتبار سے تعلیمی سطح پر سائنسی اور سماجی علوم کے تعلق
سے تصانیف کے بغیر زبان ترقی یافتہ زبان نہیں کہلائی جا سکتی۔ ادب میں عوامی ادب کی لسانی ا
ثقافتی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ مغربی ممالک میں عوامی ادب کی تہذیبی اہمیت کے پیش نظر
اس کے مطالعوں پر زور دیا جاتا ہے۔ مگر اس سے پہلے ان ملکوں نے زبان کے تعلیمی او
علمی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ تاریخ، جغرافیہ، بشریات، سماجیات اور سائنسی موضوعات
مثلاً ریاضی، کیمیا، طبیعات وغیرہ مختلف سائنسی علوم کی ضرورت اور اہمیت پر زور دے کر ایسا
وافر ادب پیدا کیا جو قوموں کی ہمہ جہت ترقی کے لیے ضروری ہے۔ اردو میں اس طرح کے
ادب کی اہمیت آج کے ماحول میں کم سے کم ہے اور اگر اس کی طرف کوئی راغب ہوتا بھی ہے تو شاعری
اور افسانہ یا زیادہ سے زیادہ ادبی تنقید کے ہوتے ہوئے اس کی اہمیت عملاً کوئی تسلیم کرنے
کو تیار نہیں۔ دلی کالج (۱۸۳۲) اور عثمانیہ یونی ورسٹی کے دارالترجمہ سے اس کام کا آغاز ہوا
تھا۔ اور ترجمہ کے ذریعہ وافر علمی ذخیرہ ہمارے پاس موجود تھا۔ مگر اب وہ اس قدر از کار رفتہ
ہو چکا تھا کہ اب اردو کے لیے لسانی منصوبہ بندی کے تحت اس پر نئے سرے سے توجہ
کی ضرورت ہے۔

کسی بھی زبان کے ادب میں تجربے ہوتے رہتے ہیں، نئے موضوعات کے سوتے
خشک نہیں ہو جاتے۔ نفسیاتی اور فلسفیانہ مسائل ادب کو پیش آتے رہتے ہیں اور ان
حل بھی تلاش کیے جاتے ہیں۔ تاہم اب ہماری بنیادی ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی زبان کو علم

تعلیمی زبان بنانے کے منصوبوں پر غور و فکر کریں اور ہمارے وہ ادارے جو زبان کی ترقی و ترویج کے مقاصد کے تحت قائم کیے گئے ہیں، صرف ادب کی ترویج و اشاعت کے مقابلے میں زبان کی اس بنیادی ضرورت پر زیادہ زور دیں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند اس سلسلے میں اہم رول ادا کرسکتی ہے، مختلف صوبوں میں قائم اردو اکیڈمیاں ہر سال اپنے بجٹ کا بڑا حصہ ادبی سیمناروں پر خرچ کرتی ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان سیمناروں میں تعلیمی اور علمی موضوعات پر گفتگو ہو اور ایک عام قاری تا سامع میں ان مذاکروں کے ذریعہ اس "دوسری" اور اہم دنیا کی بھی سیر کرائی جائے تاکہ اس تعلق سے اس کا ذہن بنے۔ کسی بھی اہم کام کے کرنے سے پہلے عوام و خواص میں موضوع کی اہمیت کے تعلق سے احساس (AWARENESS) پیدا کرنا ضروری ہے۔ یہ کام ان مذاکرات کے ذریعے کیا جاسکتا ہے۔

سطور بالا میں اردو میں تعلیمی اور علمی ادب کی ضرورت کے بارے میں جو اشارتاً گفتگو کی ہے، اس تعلق سے ایک اہم بات کی طرف اشارہ بھی ضروری ہے کہ علمی کتب کی ترتیب اور تالیف سے پہلے بنیادی علمی اصطلاحوں کی ضرورت ہوگی۔ اصطلاح سازی کا کام علمی کتابوں کے کسی بھی منصوبے سے پہلے، بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس تعلق سے مختلف علمی موضوعات کے تعلق سے حسب ضرورت علمی و سائنسی اصطلاحیں وضع کرنا ضروری ہیں اس سلسلے میں ہندستان میں ترقی اردو بیورو (وزارت تعلیم، حکومت ہند) نے پیش رفت کی اور مختلف علوم سے متعلق اصطلاحیں وضع کیں، پاکستان میں بھی اس ضمن میں پیش رفت ہوئی ہے، گویا علمی و سائنسی اصطلاحوں کے وضع کرنے کی ضرورت اب کسی حد تک پوری ہوچکی ہے اور اسے صرف عملی طور پر تعلیمی و علمی موضوعات کا جزو بنا کر زبان میں رائج کرنے کی ذمہ داری باقی رہ جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ماہر لسانیات اور اردو داں ماہرین مضمون (SUBJECT EXPERT) اصطلاحوں کے وضع کرنے کے طریقوں اور اس کی معنیات پر اتفاق رائے سے فیصلہ کرکے اسے معیار عطا کرسکتے ہیں۔ چونکہ ہماری زبان کا فطری رجحان عربی و فارسی الفاظ سے ماخوذ علمی اصطلاحیں وضع کرنے کا ہے، لہٰذا مغربی علوم کی تیز رو علمی رفتار اور معنیاتی افقوں کی روشنی میں اردو کی صرفی و نحوی ساخت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انگریزی علمی اصطلاحوں سے استفادہ کے حدود کا تعین بھی ضروری ہوگا، جس سے اغماض ممکن نہیں۔ فارسی عربی کے مقابلے میں انگریزی کی علمی اصطلاحیں غالباً زیادہ کارآمد اور مفید ثابت ہوں گی۔ [...] ہماری زبان کے لسانی مزاج پر پوری اتریں۔

زبان کی منصوبہ بندی کا ایک اہم پہلو رسم خط اور املا کے معیار اور یکسانیت کا تعین بھی ہے۔ اردو رسم خط کی اپنی جو تہذیبی اہمیت ہے وہ مسلم ہے۔ دیوناگری اور رومن دونوں ہی رسم خط [...] کی اکثر اوقات وکالت کی جاتی ہے لسانی علوم کے لحاظ سے اردو کے لیے ناقص محض ہیں۔ رسم خط کی تبدیلی کے مشورے عام طور سے سیاسی مصلحت پسندی کی بنا پر دیے جاتے ہیں۔ یا لسانی نافہمی کی وجہ سے۔ وہ لوگ جو اس مسئلہ پر علمی نظر رکھتے ہیں اور دونوں بلکہ تینوں لکھاوٹوں [...] کے درمیان میں صوتی اور تصویری (GRAPHEMIC) فرق کو سمجھتے ہیں، اس پر صاد نہیں کرسکتے۔ اس

سلسلے میں ث/س/ص، ت/ط، ذ/ز/ظ، ح/ھ، کی اہمیت مسلّم ہے، انھیں "مردہ لاشیں" کہ کر اسا
اصلاح کے شوق میں اردو زبان کے وسیع تہذیب ثقافتی اور لسانی سیاق میں دریا برد نہیں کیا
جاسکتا۔ البتہ رسم خط میں جزوی اصلاحات کی ضرورت سے بھی اغماض ممکن نہیں۔ زبان بنیادی طور
پر سماجی عمل ہے اور سماجی ضرورتیں ریاضی کے فارمولوں سے حل نہیں کی جاسکتیں، لہٰذا رسم خط کے
مسائل کو چلن کے سیاق میں دیکھنا ضروری ہے۔ جزوی اصلاحات کے لیے بھی کسی شخص واحد کی
سفارشات کے مقابلہ میں کسی مرکزی ادارے کی سفارشات پر انفرادی اختلاف رائے کے باوجود زبان
میں لسانی نظم (LINGUISTIC DISCIPLINE) کی خاطر عمل کرنے کی ضرورت ہے اور اس طرح اتفاق
رائے سے مرکزی سفارشات پر مبنی رسم خط اور طرز تحریر کا عملی استعمال نصابی کتابوں میں پیش کیا
جانا چاہیے تاکہ پانچ دس برسوں میں انھیں چلن مل سکے۔ چند الفاظ کی حد تک ایک سے دو طرح کے
ہجے بھی قابل قبول ہوسکتے ہیں۔ مثلاً اعلا/اعلیٰ، ادنا/ادنیٰ، بالکل/بلکل وغیرہ۔ تلفظ کے سلسلے میں بھی
یہی نقطۂ نظر ضروری ہے، چند الفاظ کی حد تک ایک سے زائد تلفظ بھی معیاری تلفظ ہوسکتے ہیں۔ اس
سلسلے میں الفاظ کی اصل مثلاً عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی کی بجائے اُردو کی لسانی سماجیات
(LINGUISTIC SOCIOLOGY) کو مدّنظر رکھنا ضروری ہوگا۔

ہمارے یہاں قواعد پر اچھی کتابیں ابھی لکھی ہی نہیں گئیں۔ توضیحی لسانیات نے گذشتہ
تیس چالیس برسوں میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور زبان کی قواعد کی خصوصیات کو سمجھنے کے لیے
کئی نظریات اور اصول وضع کر لیے گئے ہیں۔ ان اصولوں کے پیش نظر ہندی، مراٹھی، بنگالی، گجراتی
اور دیگر ہندستانی زبانوں میں بے شمار کتابیں دستیاب ہیں اور مختلف لسانی نظریات اور اصولوں
کی روشنی میں متعدد کتابیں مل جاتی ہیں، لیکن اردو کا دامن ابھی اس طرح کے سائنسی مطالعے
سے یکسر خالی ہے۔ چند ایک مضامین اور ایک آدھ کتاب کے علاوہ جس کا تعلق قواعدی اصولوں
ترجمہ سے زیادہ ہے ابھی ہمارے یہاں توضیحی قواعد (DESCRIPTIVE GRAMMAR) یا تشکیلی قواعد
(TRAN SFORMATION GRAMMAR) پر کتابیں لکھی ہی نہیں گئیں۔ اس طرح کی قواعد کی کتابیں آج
کے حالات میں بے انتہا ضروری ہیں۔ خاص طور سے اب جب کہ اردو زبان ہندستان اور پاکستان
علاوہ مغربی ایشیا، مشرق وسطیٰ، انگلستان، امریکہ، کینیڈا جیسے ملکوں میں رابطۂ عامہ (MASS COMMUNI-
CATION) کی زبان بنتی جارہی ہے، اس قسم کی توضیحی قواعد کی کتابوں کی ضرورت شدت سے محسوس
کی جارہی ہے۔ اس طرح کے خالص لسانی منصوبے لسانیات کے شعبے کرسکتے ہیں، اردو سے
تعلق سے یہ اہم کام دراصل علی گڑھ یونی ورسٹی کے شعبۂ لسانیات کا ہے جس کے قیام کا ایک اہم مقصد
اردو لسانیات کی تعلیم اور اردو زبان کے لسانی مطالعے پیش کرنا تھا۔ علی گڑھ یونی ورسٹی کو مرکزی یونی ورسٹی
ہونے کی حیثیت سے یہ سہولت بھی حاصل ہے کہ وہ اس طرح کے بنیادی منصوبے تیار کرکے (UNIVERSITY
GRANTS COMMISION) کی امداد سے اسے عملی جامہ پہنا دے، یہاں لسانیات میں تربیت یافتہ
ہی نہیں بلکہ اعلا سند یافتہ اساتذہ کی بھی کمی نہیں، لہٰذا اس شعبہ کی اردو لسانیات پر منصوبہ بند
طریقے سے کام نہ کرنے اور اس سے لاتعلقی پر حیرت ہوتی ہے۔

اردو کے لیے لسانی منصوبہ بندی کے موضوعات کا دائرہ وسیع تر ہے، لغت، انسائیکلوپیڈیا،
رے کی مختلف کتابوں مثلاً تاریخی، سماجی اور ادبی شخصیات پر مشتمل سوانحی لغت، مختلف عالمی
ور ملکی زبانوں کی ادبی تاریخیں، ہندستان کی علمی و ادبی شخصیات اور اسی طرح اسلامی، عربی و عجمی
نیتوں پر سوانحی کتب وغیرہ بھی لسانی منصوبہ بندی کا حصہ ہیں۔ اسی طرح ہندستانی ادبیات کی
تب کتابوں اور شعری مجموعوں کے ترجمے بھی ہماری ایک اہم ضرورت ہے تاکہ اردو اور دیگر
اقائی زبانوں میں عمل تفاعل (INTER-ACTION) کی صورت پیدا ہو۔ موجودہ سیاسی اور
مائی پس منظر میں ان تراجم کے ذریعہ عمل تفاعل اور اپنی مٹی سے اس زبان و ادب کا رشتہ
ائم رکھنا وقت کا اہم تقاضا ہے، جسے نظر انداز کرنا خود اردو کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اردو
تعلیم اور تدریس کا فروغ ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ موجودہ ہندستان میں اردو کی بقا کا تعلق
دو خواندگی (URDU READERSHIP) سے جڑا ہوا ہے، اس سلسلے میں انجمن ترقی اردو اور اردو
اکیڈمیاں اہم رول ادا کر سکتی ہیں۔

سرسید ہماری تہذیبی، تعلیمی اور لسانی زندگی میں ایک راہ نما کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی
ہمی مسلّم ہے، انھوں نے اردو کے تعلق سے جس منصوبہ بندی طریقے سے کام کیا اور اردو کی ترقی
کے لیے جو ماحول پیدا کیا وہ انھیں کا کارنامہ ہے۔ سرسید اور ان کے رفقا نے بھی زبان و ادب
کے مختلف شعبوں کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ یہ ساری خدمات سرسید کی
ہنمائی یا انفرادی ذوق و شوق اور لگن کا نتیجہ تھیں، انھوں نے اپنے تصنیفی کاموں کے ساتھ اداروں
کے قیام کے بھی منصوبے بنائے۔ اگر انھیں آج کی طرح علمی و ادبی کاموں کے لیے ادارے نصیب
تے جہاں بیٹھ کر وہ یکسوئی سے اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے تو آج اردو کی صورت حال
نہ ہوتی۔ آج بھی اردو علمی اعتبار سے جس مقام پر فائز نظر آتی ہے وہ انھیں بزرگوں کی آبیاری
نتیجہ ہے۔ یہی کام آج بہتر طریقے سے اردو کی انجمنیں، اردو اکیڈمیاں اور یونی ورسٹی کے وہ اردو
بے جہاں طلبہ کم اور اساتذہ زیادہ ہیں۔ انجام دے سکتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے بہت سے
اور غیر اہم کام کیے، مگر وہ منصوبہ بند طریقے سے وہ کام نہیں کر سکی، جو صرف وہی کر سکتی تھی۔
ہدی حسن افادی کو عام طور سے ایک بلند پایہ انشا پرداز کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے، واقعہ یہ ہے
اردو کے تعلق سے لسانی منصوبہ بندی سے متعلق نظریات پیش کرنے میں ان کی اہمیت "معلم اول"
ہے۔ انجمن ترقی اردو، اردو کا قدیم اور باوقار ادارہ ہے۔ یہ ایک عظیم ثقافتی علمی اور ادبی ورثے کا
بنا ہے، تاہم اس کی خدمات وہ نہیں ہیں جن کی اس سے توقعات وابستہ تھیں، بقول
ی حسن:

"انجمن کو سرے سے یہی نہیں معلوم یا وہ جاننا نہیں چاہتی کہ کسی زبان کے عناصر ترکیبی
ہوتے ہیں۔ یہ بات حیدر آباد یا لکھنؤ کے چند افراد کی خود رائی سے طے نہیں ہو سکتی۔ یورپ کے
مستشرق سے پوچھیے، جو دنیا کے مختلف لٹریچر کے نظامات طبعی پر غائر نظر رکھتا ہو تو وہ بتائے گا،
ملاً آپ کے کرنے کے کام یہ ہیں!"

انجمن کی کارکردگی سے متعلق مہدی کی رائے آج بھی صحیح ہے۔ انجمن کو "اردو ادب" کی بے یقینی اشاعت سے جو زیادہ سے زیادہ فیض اور فراق نمبر تک محدود ہو گئی ہے (جو دیگر ادبی رسائل کر سکتے ہیں) اصطلاحات پیشہ وراں" قسم کے غیر معمولی علمی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انجمن کے مالی وسائل ماضی کے مقابلے میں اب بہت بہتر ہیں۔" اصطلاحات پیشہ وراں" اور اسی نوع کی اہم کتابوں کی اشاعت اور مختلف سماجی علوم اور تاریخ و فلسفہ سے متعلق کتابوں کے تراجم کی اشاعت انجمن کے لیے باعثِ صد افتخار رہے، کاش انجمن اس طرف توجہ کرے اور منصوبہ بند طریقے سے تقدم یا اولیت PRIORITIES کے ساتھ موضوعات اور کتابوں کی اشاعت کا لائحہ عمل بنائے۔ مہدی افادی نے مشہور مستشرق ایڈورڈ براؤن کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ اردو زبان کی ترقی کے لیے درج ذیل کتابوں کی اشاعت کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

۱۔ جامع اللغاتِ اردو ۲۔ محاورات
۳۔ لغات الاصطلاحات
۴۔ لغاتِ فارسی (جہاں تک اردو کی تکمیل کا تعلق ہے)
۵۔ لغاتِ عربی۔ بہ ترتیب جدید
۶۔ ادب الاساتذہ۔ ۱۲ جلدوں میں
۷۔ جامع القواعد
۸۔ عقلیات۔ یعنی فلسفہ اور سائنس کی ہر شاخ پر ایک مستقل کتاب
۹۔ اردو انسائکلوپیڈیا (جو ضابطۂ علوم عصریہ ہوگی)

بقول مہدی حسن "کسی زبان کو سرمایہ دار اور بااصول کرنے کی یہ قدرتی ترتیب ہے جو "براون" کی رائے کے مطابق قطع نظر نہیں ہو سکتی۔ ہم کو محض بے غایت رسائل کی اشاعت سے خواہ وہ فی نفسہٖ مفید بھی ہوں، صرف مطبوعات کی تعداد بڑھانی نہیں ہے بلکہ ان وسائل کی تکمیل کے ساتھ جو زبان کی ترقی کے لیے لازم سے ہیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ ناآشنایانِ سخن کو کس طرح زبان کا دلدادہ بنایا جائے۔ اس کے لیے فاضل مستشرق کی رائے ہے کہ کثرت سے "صانع لغات" کی اشاعت کی جائے، اس طرح ضخیم لغات کی ترتیب کے بعد اردو فارسی اور عربی کی لاکھوں "لغات المبتدی" کی حیثیت سے مرتب کی جائیں اور اس کثرت سے شائع کی جائیں کہ بچے بچے کے ہاتھوں میں ہوں۔"

پروفیسر براؤن کی ان سفارشات میں موجودہ سیاسی اور لسانی پس منظر میں سنسکرت اور ہندی کی ایک بنیادی اور جامع لغت کے ساتھ علاقائی اور اردو اور علاقائی زبانوں کے کی ترتیب و اشاعت کی بھی تجویز پیش کروں گا کہ آج کے حالات میں فارسی اور عربی لغت کی طرح یہ بھی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ عجیب بات ہے کہ آج تک ہمارے پاس ایک مبسوط "تاریخ ادب اردو" بھی نہیں ہے اور جو بھی اردو ادب کی تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ "اتر پردیش" سے زیادہ نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ تاریخِ ادب اردو میں مختلف علاقوں میں اردو زبان وا

ہ کام ہوا ہے، اس کی شمولیت بھی ضروری ہے، تاکہ تاریخ ادب کی ایک کل ہند شکل ابھر کر سامنے
ام بھی انجمن ترقی اردو (ہند) کے کرنے کا ہے۔
دار المصنفین (اعظم گڑھ) ایک با مقصد ادارہ ہے جس نے ابتدا ہی سے جید عالموں کی خدمات حاصل
س کے وسائل کم رہے تاہم کم تنخواہ میں علمی کام سے لگن اور اسے مقصد زندگی بنانے والے
ی خدمات اسے حاصل رہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلامی تاریخ، ثقافت، علوم، شخصیات اور
وضوعات پر کتابیں یہاں سے شائع ہوئیں جو حوالہ کا کام دیتی ہیں۔ اس ادارے کی خدمات
ن و ادب کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف میں لکھی جائیں گی۔ اپنے مقصد کے تحت
نے والا غالباً یہ ملک میں اردو کا واحد ادارہ ہے جسے یہ معلوم ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔
انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اردو کی لسانی و ادبی منصوبہ بندی میں اور با مقصد
جیکٹ بنا کر اردو کی خدمت کر سکتا تھا، مگر یہ بھی شروع ہی سے اپنی بے مقصدی
با پروری کا شکار ہو گیا۔ ہماری اردو اکیڈمیاں بھی چند اکیڈمیوں کو چھوڑ کر محض نام کو اکیڈمیاں
کے پاس کوئی مقصد اور کوئی لائحۂ عمل نہیں۔ دلی اکیڈمی کی طرح کاش وہ قدیم کتابوں
ت کے ساتھ ساتھ علاقائی ادب کی اہم کتابوں کی ترتیب اور تدوین کا کام اپنے ذمے
سلاف کی خدمات کو کم از کم آیندہ سو سال تک کے لیے محفوظ کر لیتے۔ علاقائی زبان
سے لغت سازی، علاقائی شخصیات کا سوانحی لغت اور منتخب سماجی، سائنسی اور تاریخی
پر علاقائی زبانوں کے ترجمہ بھی یہ اکیڈمیاں کر سکتی تھیں۔
اردو کے سیاق میں لسانی منصوبہ بندی محض زبان کی بجائے ادب کی سرحدوں
دم رکھتی ہے، مذکورہ بحث اور سفارشات میں زبان کے ساتھ ایسے موضوعات
کی حدود میں شامل ہیں، اُن کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ لسانی منصوبہ بندی بقول
گن (EINAR HAUGAN) ایک ایسا لسانی عمل ہے، جو مسائل کے حل کی تلاش
ہوتا ہے، جو پوری طرح غیر رسمی (INFORMAL) بھی ہو سکتا ہے اور بالارادہ اور
کسی انفرادی کوششوں کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے اور سرکاری (OFFICIAL) بھی۔ لسانی منصوبہ
ضرورت اس جگہ پیدا ہوتی ہے جہاں زبانوں کے تعلق سے مسائل پیدا ہوں۔ ہندستان
کثرت اور متنوع تعلیمی اور سماجی مسائل کے پیش نظر اردو زبان (اور ادب) کے لیے
طریقے سے کام کرنے کی ازحد ضرورت ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ
پت جھڑ کی آواز	(افسانے)	قرۃ العین حیدر
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم
مٹی ہے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں
قلندر بخش جرأت	(خطبہ)	جمیل جالبی
عجائب گھر	(بچوں کی سائنسی کتاب)	قاسم • نقی
تاریخ اودھ	(تاریخ)	ترجمہ و ترتیب شاہ عبدالسلام
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	(ادب)	ظ انصاری
تنقید اور جدید اردو تنقید	(تنقید)	ڈاکٹر وزیر آغا
مشقی تدریس، کیوں اور کیسے؟	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں
آوازوں کا میوزیم	(افسانے)	ساگر سرحدی
اپنی ہواؤں کی خوشبو	(خاکے)	کشمیری لال ذاکر
دلی کی چند عجیب ہستیاں	(خاکے)	اشرف صبوحی
چند تصویر بتاں	(تاثرات)	مولانا عبدالسلام قدوائی
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	(ادب)	پروفیسر آل احمد سرور
صاحب جی سلطان جی	(تذکرہ)	ڈاکٹر اسلم فرخی
نظام رنگ	(ادبی خاکہ حضرت نظام الدین اولیا)	″ ″
شہید جستجو	(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)	ضیاء الحسن فاروقی
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست	(مذہب)	مشیر الحق
ہمارے دینی علوم	(مذہب)	مولانا اسلم جیراجپوری
تحقیقی مضامین	(تحقیق)	مالک رام
آسان اردو ورک بک	(تعلیم)	شکیل اختر فاروقی

شاعر
۴/۵۔ الفلاح سوسائٹی
کالونی۔ کراچی ۲۵

ہوا کا اعتبار کیا

ہوا کا اعتبار کیا
ہوا کا انتظار کیا
اسی ہوا کے لمس سے کھلے تھے پھول چار سُو
اسی ہوا کی زد میں بجھ گیا چراغِ آرزو
ہوا سے کس طرح کہوں کہ میری زندگی ہے تُو

ہوا کا روپ ایک ہے مگر چلن جدا بھی ہے
نظر سے دور ہے مگر نگاہ آشنا بھی ہے
کبھی ہے نزدِ جاں بہت، کبھی گریز پا بھی ہے

میں خوش گماں کہ سانس کی طرح وہ میرے ساتھ ہے
مجھے یقیں کہ اُس کے ہاتھ میں بھی میرا ہاتھ ہے
مگر مجھے خبر نہ تھی — ہوا خدا صفات ہے

خدا بھی دل نواز ہے، ہوا بھی دل نواز ہے
خدا بھی بے نیاز ہے، ہوا بھی بے نیاز ہے
خدا بھی ایک راز ہے، ہوا بھی ایک راز ہے
ہوا پہ اختیار کیا

خاور
ک لین نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

دیکھیے اب کون کم نکلتا ہے
ے تیغ اِدھر سے قلم نکلتا ہے

فراق میں تو نکلتی تھی جان ویسے بھی
پر آج وصل میں حیرت سے دم نکلتا ہے

رہے عدو کا معاملہ ایسے
کیجے تو پہلو سے ذم نکلتا ہے

میں روز جس کے تغافل کا رونا روتا ہوں
وہ شخص غور سے دیکھے تو دم نکلتا ہے

بِلتے ہیں ہیچ متاعِ فن کو شجاعؔ
نادلوں ویسے بھی کم نکلتا ہے

پروفیسر مظفر حنفی
شعبۂ اردو، کلکتہ یونی ورسٹی کلکتہ ۷۳

ہونٹوں ہونٹوں جڑی خموشی
گویائی سے بڑی خموشی

دیکھو، میں بکھرا جاتا ہوں
یارو، بس دو گھڑی خموشی

مصنوعی رونق کے دل میں
نیزے جیسی گڑی خموشی

آندھی جیسا کچھ سینے میں
اور گلے میں اڑی خموشی

لاکھوں قیدی چیخیں اندر
دروازے پر کھڑی خموشی

بچے کی قلقاری سن کر
منہ کے بل گر پڑی خموشی

دیکھ مظفر توڑ نہ دینا
موتی کی سی لڑی خموشی

آفتاب حسین
چاہ امام بخش پورہ، لاہور ۳۳۰
(پاکستان)

دیکھیے کوئی تعلق خاطر کے رنگ بھی
اس فتنہ خو سے پیار بھی ہے اور جنگ بھی

دل ہی نہیں ہے اس کے تصور میں شادکام
اک سرخوشی میں جھومتا ہے انگ انگ بھی

کچھ ربطِ خاص اصل کا ظاہر کے ساتھ ہے
خوشبو اڑے تو اڑتا ہے پھولوں کا رنگ بھی

ایسا نہیں کہ آٹھ پہر بے دلی رہے
بجتے ہیں غم کدے میں کبھی جل ترنگ بھی

دیکھا ہے آج اس نے مجھے مڑ کے آفتاب
اس واقعہ پہ خوش بھی ہوں میں اور دنگ بھی

بلبل کاشمری
1 Byron Avenue,
Cranford,
hounston, Middx
(London) ·

نمکین غزل

ہماری سستیوں کی تیز رفتاری نہیں
تو پھر اس پر تعجب کیوں کہ بیکاری نہ

ابھی تک رشوتوں کی گرم بازاری نہیں
حکیموں کی دواؤں سے یہ بیماری نہیں

ذخیرے دین و دنیا کی کتابوں کے
جنابِ شیخ کے حجرے میں الماری نہیں

ہمارے ملک سے انگریز کو مدت
مگر اب تک ہماری میم برداری نہیں

شکایت عام ہے پیٹرول کی قیمت کے
مگر سڑکوں پہ کاروں کی سیہ کاری

بری نظروں سے اب بھی گھورتا ہوں
بڑھاپے میں جوانی کی گنہگاری نہیں

جراثیم محبت مر سکیں گے کس طرح
مریضِ سخت جاں کے دل میں بیکا

جمال نقوی (علیگ)
۱۰۱۔ اے، بلاک جے
نارتھ ناظم آباد۔ کراچی (پاکستان)

آگ نفرت کی محبت سے بجھا دی جائے
اختلافات کی دیوار گرا دی جائے

حکم ان کا ہے جکڑ کر مجھے زنجیروں میں
آنکھ لگ جائے تو زنجیر ہلا دی جائے

حسن والے ترے بیمار کی اتنی ہے دوا
ایسے بیہوش کو دامن کی ہوا دی جائے

بات اگر سچ ہے تو پھر تم کو شکایت کیوں ہے
اور اگر جھوٹ کہا ہے، تو سزا دی جائے

جرم الفت کا تو اقرار کیا ہے میں نے
اب سزا اس کی سر بزم سنا دی جائے

ی
ہر بسر کھج روڈ
باد

ایک نظم

ر سے پرے کھڑا بے حال
کا پڑ چپ اُداس نڈھال
ہتا ہے کہ آج تو کوئی
لا بھٹکا پرندہ آ جائے
ڑی بیٹھے چہچہا جائے
افسر کوئی تھکا ہارا
ی مانند دھوپ کا مارا
ے چھاؤں ڈھونڈتا آئے
ے جاتے ذرا ٹھہر جائے!

شہزاد معصومی
کوارٹر نمبر ڈبلیو۔ آئی/بی-۱
بیتھاپور (کھگول روڈ)
پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۱

ہر ہر خنجر بھی اگر میرا گلا پاؤ گے
حق میں قاتل کے مجھے محوِ دعا پاؤ گے

تم سرِ دار مجھے کھینچ تو دو گے لیکن
میری آواز فضاؤں میں صدا پاؤ گے

بے وفائی کے سوا حدِ وفا پر میری
دوسرا اور نہ الزام لگا پاؤ گے

اُس کی آنکھوں میں وہ اظہارِ تبسم اُس کا
حسن اب اس کا کہاں، اس کی ادا پاؤ گے

بے وفا موسم برسات میں نقصان کے سوا
بونے والے کوئی کیا فصل اُگا پاؤ گے؟

دیکھنے میں تو ستم ہائے زمانہ ہیں بڑے
کربلا سے نہ مگر ظلم سوا پاؤ گے

آج بگڑے ہوتے اس دور میں شہزاد حزیں
کسی نیکی کا نہ تم اپنی، صلہ پاؤ گے

شبیر احمد قرار

تیری تخلیق پرور دگار آد
لمحہ لمحہ مگر تار تار آد

سانس لیتا ہوا اک فرار
پھر بھی قدرت کا ہے شاہکار

ہر بلندی پہ اب ناتھ پڑ
رات دن پستیوں کا شکار

بے بسی معجزہ بن گئی
ایک انسان میں بے شمار

کیسی فطرت ہے دن رات ڈھ
جبر کی چھاؤں میں اختیار

بال بچوں کی جاد وگری گیا
خود کہانی بنے اشتہار

فسانہ نکہت لاری اُمِّ ہانی
نول لاری منزل ۔ نزد سٹی اسٹیشن لکھنؤ ۱۸

سُن دلِ مضطرب

ن دلِ مضطرب !
ٹھہر جا ذرا ۔۔۔ اب تو رک جا ذرا
یکھ لے موسموں کا بدلتا سماں
ن دلِ مضطرب !

ٹمر سے درختوں کے ہاتھوں میں اب
ی شاخوں کا خالی نشاں رہ گیا
لے پتوں کا دامن بھی خالی ہوا
اُڑی وہ ہوا بکھرے تنکے سبھی
درنگت کو سنولا دیا شام نے
ا کی ظلمت میں ایک اک کرن کھو گئی
دلِ مضطرب ! ۔۔۔ تو ٹھہر جا ذرا
ے ناشاد دل ۔۔۔ اب تو رک جا ذرا
ے موسموں کا بدلتا سماں
دلِ مضطرب !

ن گل کی معطر فضائیں کہاں
تِ رنگیں دھنک کا نشاں مٹ چکا
ن چاند میں داغ ہی داغ ہیں
ہ زمیں کو گھیرے ہوئے ہے گہن
سوتے ہوئے پربتوں پر کہیں
ہ کوہ بھی خاک سے اَٹ گیا
دلِ مضطرب ۔۔۔ تو ٹھہر جا ذرا
ے برباد دل ۔۔۔ اب تو رک جا ذرا

دیکھ لے موسموں کا بدلتا سماں
سُن دلِ مضطرب !

پوچھ بوجھل ہواؤں سے یہ کیا ہوا ؟
بیتے لمحوں کی کوئی خبر ہے اُسے ؟
کیا ملا خوشبوؤں کا کوئی رازداں ؟
سبز موسم کی آمد کا امکاں ہے کیا ؟
چاپ سنسان راہوں پہ قدموں کی سُن
خواب بنتی ہوئی شب کو پھر سے بُلا
سُن دلِ مضطرب ۔۔۔ تو ٹھہر جا ذرا
سُن لے بے تاب دل ۔۔۔ اب تو رک جا ذرا
دیکھ لے موسموں کا بدلتا سماں
سُن دلِ مضطرب !

کون جانے امیدوں کے بادل یہاں
گھر کے آئیں گے کب اور برس جائیں کب
کب سمندر کی امواج ہوں مہرباں
ساحلوں کی طرف کب ہو کشتی رواں
کھوئے رستوں کو کب پھر اشارے ملیں
کب سفر کی مسافت چلے زیرِ پا
سُن دلِ مضطرب ۔۔۔ تو ٹھہر جا ذرا
سُن لے مایوس دل ۔۔۔ اب تو رک جا ذرا
دیکھ لے موسموں کا بدلتا سماں
سُن دلِ مضطرب !

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی نئی کتابیں

اُردو میں کلاسیکی تنقید — پروفیسر عنوان چشتی

پروفیسر عنوان چشتی کا ایک تنقیدی و تحقیقی کارنامہ جس میں لسانی، فنی اور عروضی نکات کو دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں کے مخفی اور نئے گوشوں کو پہلی بار روشنی میں لایا گیا ہے۔ اُردو کے اساتذہ، طلبہ اور فنکاروں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ۴۸/-

تفہیم و تنقید — حامدی کاشمیری

اس کتاب میں حامدی کاشمیری کے ایسے اہم مقالات شامل ہیں جو قدیم اور جدید ادوار کے بعض شعری رجحانات اور شخصیات کے متعلق ہیں۔ ۲۰/-

قدیم ہندستان کی سیکولر روایات — ڈاکٹر مجیب اشرف

اس مختصر مگر اہم کتاب میں عہدِ قدیم کی سماجی، اقتصادی، مذہبی اور سیاسی زندگی اور رجحانات کے مستند حوالوں کے ساتھ نہایت ذمّے داری سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۲/-

زندگی کی طرف — شمیم حنفی

شمیم حنفی کے ڈراموں کی نئی کتاب۔ عام انسانی تجربوں اور رویّوں کی تخلیقی تعبیر کا ایک منفرد زاویہ، اُردو ڈرامے کی روایت کا ایک اہم موڑ۔ ۳۶/-

گول مال — شفیقہ ز[illegible]

"رانگ نمبر" کے بعد شفیقہ فرحت کے طنز[illegible] مزاحیہ مضامین کا تازہ ترین مجموعہ، جو ایک بار [illegible] بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ [illegible]

فی الفور — یوسف نا[illegible]

طنز و مزاح میں یوسف ناظم کا شمار صف[illegible] کے ادیبوں میں ہوتا ہے۔ "فی الفور" آپ کے مز[illegible] مضامین کا تازہ مجموعہ ہے۔ [illegible]

مولانا آزاد کی کہانی — ڈاکٹر ظفر احمد نظا[illegible]

مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر مگر جامع [illegible] جسے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لائق استاد اور [illegible] اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر، ڈاکٹر ظفر احمد نظا[illegible] بڑی محنت سے لکھی ہے۔ طلبہ کے لیے ایک تاریخی دستاویز۔

مالک رام – ایک مطالعہ — علی جواد [illegible]

ماہرِ غالبیات جناب مالک رام [illegible] اور تحقیقی کارناموں پر ہند و پاک کے ممتاز [illegible] کی نگارشات کا اہم مجموعہ۔ [illegible]

چراغ اور کنول (شعری مجموعہ) — اختر[illegible]

"چراغ اور کنول" اختر حمید خاں کی [illegible] میں بیسویں صدی عیسوی کا ریاض ہے [illegible] ہجری کا عرفان ہے۔ یہی قلب کا چراغ [illegible] کا کنول ہے۔

الحسن نقوی
بہ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی
گڑھ

سیّد حامد

سیّد حامد کی زندگی قومی کاموں اور ملک و ملّت کی خدمت کے ولولوں سے معمور
مگر جس کارنامے نے قوم کی تاریخ میں ان کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا وہ ہے مسلم
ی ورسٹی کے علمی وقار کی بحالی اور اس ملی ادارے کی ان سیاسی جماعتوں اور ان
غرض لوگوں سے نجات جنھوں نے اسے اپنے ذاتی مفاد کا ذریعہ بنا لیا تھا۔
سیّد حامد سے ذرا پہلے کے دور کو مسلم یونی ورسٹی کی تاریخ کا تاریک ترین
کہا جا سکتا ہے۔ کچھ طالب علم یونی ورسٹی کی انتظامیہ پر حاوی ہو گئے تھے۔ ان
تعداد تو بہت کم تھی شاید ایک درجن سے بھی کم مگر ان کے بازوؤں میں اس
کس بل تھا کہ سبھی اُن کے آگے بے بس تھے۔ جو چاہتے تھے کرا لیتے تھے سنجیدہ
اور اساتذہ جن کی تعداد کسی طرح ننانوے فی صد سے کم نہ تھی، ہمت ہار کے
شہ گیر ہو گئے تھے۔ نہ داخلوں کا وقت معین تھا نہ قاعدے۔ حاکم با اختیار کو سرِ راہ
رلیا گیا تو اس نے وہیں کھڑے کھڑے سگریٹ کی ڈبیہ پر، ڈائری کے ورق پر
ے کا حکم جاری کر دیا۔ اس سال گنجائش نہ رہی تو اگلے سال کے لیے پیشگی داخلے
منظوری دے دی گئی۔ امتحان کی تاریخوں کو جس نے چاہا آگے پیچھے کرا لیا
یہ کر دوست کے گاؤں جانا ہے۔ گاؤں کے مکھیا کی بیٹی کی شادی ہے۔
پروفیسر خسرو نے رخصت ہوتے ہوئے اپنے مخصوص ظریفانہ انداز میں
تھا کہ اب تو یونی ورسٹی اسی اندازِ خسروانہ سے چلے گی اور اس وقت ان کی یہ
پتھر کی لکیر لگی تھی۔ خسرو صاحب کے زمانے میں حالات اتنے ابتر نہ تھے جتنے ان
جانے کے بعد ہو گئے۔ یونی ورسٹی کا ماحول روز بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا۔
اب تو کسی کو یاد بھی نہ ہو کہ وہ بدامنی کا ایسا دور تھا جب سورج ڈوبنے کے بعد
ہال سے دوسرے ہال میں جانا آسان نہ تھا۔ راستے میں لُٹ جانے اور پِٹ جانے
تھا۔ یہ کام اُن جرائم پیشہ افراد کا تھا جو کسی نہ کسی طرح یونی ورسٹی میں آ چھپے
کہیں تو اُن کو پناہ دی گئی تھی اور کہیں انھوں نے زورِ بازو سے خود پناہ حاصل

کر لی تھی۔ طلبہ اُن سے نجات پانا چاہتے تھے مگر کسے مجال تھی کہ ان کی طرف انگلی اٹھا سکے۔ ایک شام پستول کا رُخ یونی ورسٹی کے ایک اعلا افسر کی طرف ہو گیا۔ اگلی صبح ساری انتظامیہ دہلی میں تھی۔ کہ اب تو ہم اپنے نئے وائس چانسلر کو ساتھ لے کر ہی جائیں گے۔ چند روز کے بعد سید صاحب نے علی گڑھ پہنچ کر وائس چانسلر کی ذمہ داری سنبھال لی۔ مخلصوں کے دلوں سے آواز آئی: اے مردِ مجاہد آ نصرۃ اللہ تیرا نگہبان۔

حالات کا گہری نظر سے جائزہ لینے کے بعد سید صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ فوراً موثر اور فیصلہ کن قدم نہ اٹھایا گیا تو حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ کارروائی کا آغاز ہوتے ہی محسوس ہوا کہ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا گیا ہے۔ ہر طرف آگ سی لگ گئی۔ لوگ بھول چکے تھے کہ تعلیمی ادارے کے لیے قاعدہ قانون اور ضبط و نظم کی کیا اہمیت ہے۔ نئے وائس چانسلر کی یہ کارروائی انھیں غیر ضروری انکشس معلوم ہوئی۔ لوگوں نے جلد ہی یہ بھی محسوس کر لیا کہ کوئی کوشش سید صاحب کو اپنے راستے سے ہٹا نہیں سکتی۔ اس لیے ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ خود انہی کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ یعنی ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ وہ مستعفی ہو جائیں یا پھر خاکم بدہن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے سازشیں کی جانے لگیں۔ ادھر سید صاحب ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ یونی ورسٹی بند کرنی پڑے، پولیس کی مدد لینی پڑے، استعفی دینے کی نوبت آئے۔ سخت سے سخت قدم اٹھانے میں بھی انھیں کوئی تامل نہ تھا۔

ایک استاد کے مضمون نے بارود میں چنگاری کا کام کیا۔ یہ مضمون انگریزی اخبار میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ان بدعنوانیوں کی تفصیل بیان کی گئی تھی جو ان دنوں یونی ورسٹی میں ہوتی رہتی تھی۔ اور معیارِ تعلیم کے پست ہو جانے کا ذکر خاص طور پر کیا گیا تھا۔ بے شک زیادہ تر الزامات درست تھے اور ضروری تھا کہ اُن کی طرف توجہ دلائی جائے۔ مگر ان خامیوں کو یوں طشت از بام کرنے سے رسوائی کے سوا کیا حاصل ہو سکتا تھا۔ ان صاحب کے خلاف تادیبی کارروائی کا مطالبہ کئی طرف سے کیا گیا۔ زبردست احتجاج کا آغاز ہوا اور اس کی شدت میں روز اضافہ ہوتا گیا۔

جلسے جلوس کا اصل نشانہ وائس چانسلر کی رہائش گاہ تھی۔ روز کا معمول تھا کہ ہزاروں طلبہ کا جلوس نعرے لگاتا، شور کرتا ڈی۔ سی لاج میں داخل ہو جاتا۔ ہنگامہ آرائی کئی کئی گھنٹے جاری رہتی۔ اس میں وہ سنجیدہ طلبہ بھی شامل ہو جاتے جو متذکرہ بالا مضمون کو نامناسب خیال کرتے تھے اور وہ لوگ بھی جنھیں اس معاملے سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور محض وقت گزاری کے لیے جلوس میں شامل ہو

بعض سیاسی جماعتوں اور یونی ورسٹی کے بدخواہوں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور
ہجوم میں باہر کے ایسے لوگوں کو داخل کر دیا جو زیادہ سے زیادہ فتنہ و فساد برپا
کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یونی ورسٹی کے طلبہ میں شر پسند نہ ہونے کے
برابر تھے۔ مگر باہر کے لوگ جو پیشہ ور مجرم تھے اور جن کو پہچان کے الگ
کرنا دشوار تھا طلبہ کی بدنامی کا سبب بنے۔ انھوں نے بم پھینکے، پٹاخے داغے،
پتھر برسائے، آگ لگائی اور کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

ایک شام بہت بڑا جلوس وی۔ سی لاج کے نزدیک پہنچا۔ آگے آگے
گروہ تھا اس کا غیظ و غضب صاف بتا رہا تھا کہ ارادے اچھے نہیں۔ تین سینیر
استادوں نے آگے بڑھ کر سڑک پر ہی جلوس کو روکنے کی کوشش کی۔ یہ استاد
بلائے آئے تھے۔ اور فرض شناسی کا جذبہ ہی انھیں یہاں کھینچ لایا تھا۔ ورنہ انھیں
کتابوں کی دنیا سے باہر نکلنے کی فرصت کب تھی۔ شور و غل میں ان کی منت سماجت
کون سنتا۔ جلوس آگے بڑھتا رہا۔ جب گیٹ میں داخل ہونے لگا تو یہ تینوں دیوار
بن گئے، مگر دھکا کھا کر دور جا گرے۔ انھوں نے ہمت نہ ہاری اور اٹھ کے پھر
جلوس کو روکنا چاہا۔ تو ان میں سے دو کو جو کمزور تھے اٹھا کر لان میں پھینک
دیا گیا۔ تیسرے ذرا مضبوط جسم کے مالک تھے انھوں نے مقابلہ کیا۔ بدکلامی کا جواب
بدکلامی سے اور لاتوں گھونسوں کا جواب لاتوں گھونسوں سے دیا۔ فہمائش اور
سرزنش کا یہ بھی ایک انداز ہے۔

ہم لوگ جو باقاعدہ ڈیوٹی پر تھے آگے بڑھنے کی جرأت نہ کر سکے۔ خاموش
تماشائی بنے رہے۔ جلوس کے ایک غول نے آگے بڑھ کر اور ہمارے چہروں
کے آگے ہاتھ نچا نچا کے جو کچھ کہا وہ ناگفتنی ہے۔ خیال ہے اور خدا کرے یہ
خیال درست ہو کہ یہ ہمارے طالب علم نہیں تھے کہ ایسے کیسے لوگ تھے۔

ہم گیٹ کے نزدیک تھے۔ اب ہمارے اور اصل کوٹھی کے درمیان
درختوں کا مجموعہ حائل تھا۔ آج وائس چانسلر کی رہائش گاہ پر زبردست یورش
تھی۔ ہر طرف قیامت کا سا ہنگامہ بپا تھا۔ ہر لحظہ یہ اندیشہ کہ خدا جانے سید صاحب
کے ساتھ آج کیا حادثہ پیش آیا ہوگا۔ بھیڑ چھٹی تو معلوم ہوا کہ مجمع دروازہ توڑنے
میں ناکام رہا۔ اور وائس چانسلر کو کوئی گزند نہ پہنچ سکی لیکن کئی استادوں کے
شدید چوٹیں آئی تھیں۔

احتجاج جاری رہا اور اسی کے ساتھ وائس چانسلر سے مذاکرات کا سلسلہ
بھی۔ اس میں کئی چہروں سے نقاب اٹھی۔ ایک دن طلبہ کا مجمع نعرے لگاتا ہوا آیا۔
کئی سینیر استاد اس وقت وائس چانسلر کی خدمت میں حاضر تھے۔ انھوں نے
باہر جا کر طلبہ کو سمجھانے کی اجازت چاہی۔ ذرا دیر بعد وہ رُدرُد کر طلبہ کو خطاب

کر رہے تھے۔" میرے بچو! ابھی تمہاری آزمائش ختم نہیں ہوئی۔ جد و جہد جاری رکھو۔ تھک کر بیٹھ جانے والوں کی ہمیشہ ہار ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے آخری فتح تمہاری ہی ہوگی۔ کیونکہ تم حق پر ہو" پانچ منٹ بعد یہ بزرگوار وائس چانسلر سے مخاطب تھے۔" حضور والا" میں نے بہت کوشش کی۔ رُو رُو کر انھیں سمجھایا (اور بالکل سچ تھا) مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ہم اپنے موقف پر ڈٹے رہے ایک نہ ایک دن یہ ضرور ہوش میں آجائیں گے۔"

ایک دن سید صاحب پر سخت پتھراؤ کیا گیا۔ کئی پتھر ان کے دائیں بائیں سے گزر گئے۔ ایک پتھر ان کے سر سے اس طرح رگڑتا ہوا گزرا کہ ٹوپی گر پڑی مگر سر محفوظ رہا۔ اپنا تعلق اسی بستی سے ہے جہاں صوفیوں اور درویشوں کے مزارات پر عقل انسانی کو حیرت میں ڈال دینے والی کرامات آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ مشہور ہے کہ حضرت شاہ ولایت کی خانقاہ میں ایک بزرگ شاہ نصیر الدین تشریف لائے۔ باریابی کی اجازت چاہی۔ جواب میں پانی سے لبریز کٹورا بھیجا گیا۔ اشارہ یہ کہ خانقاہ میں آپ کے لیے گنجایش نہیں۔ ان کے ہاتھ میں پھول تھا۔ پانی پر رکھ دیا۔ مراد یہ کہ ہم اس طرح رہ لیں گے جیسے پانی کی سطح پر پھول۔ اس پر بھی در وا نہ ہوا۔ شاہ نصیر الدین نے بد دعا دی کہ تمہاری قبر پر بے شمار بچھو ہوں گے۔ جواب میں کہلایا گیا کہ بچھو ہوں گے مگر کاٹیں گے نہیں لیکن تمہاری قبر پر گدھے لوٹیں گے۔ "گدھے لوٹیں گے ضرور مگر غلاظت نہیں کریں گے۔" یہ پیغام بھیج کر وہ آگے بڑھ گیا۔ آج بھی شہر میں کسی کا گدھا کھو جائے تو اس اللہ والے کے مزار پر لوٹتا ہوا ملتا ہے۔ شاہ ولایت صاحب کے مزار کے ارد گرد اینٹوں کے نیچے بے شمار خوفناک بچھو رینگتے نظر آتے ہیں۔ آپ کی ہمت نہ ہو تو مجاور کے بچے کو اشارے سے بلائیے وہ بچھو کو اٹھا کے اپنی ہتھیلی پر رکھ لے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ مرد کامل کی دعا کس طرح موذی کے ڈنک کے لیے تریاق بن جاتی ہے۔ سینے کے اندر سے کوئی پکار کر کہے گا بولو اب کیا کہتے ہو۔ دوسری جنگ میں جیت شاید سرہی کی ہوگی اور آپ کہیں گے اونھوں ہم تو ابھی نہیں مانتے۔ اپنا بھی یہی حال ہے مگر جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اسے کیسے جھٹلائیں۔ اکثر خیال آیا کہ یہ شخص ضرور کسی غیبی طاقت کی امان میں ہے ورنہ اسے گزند نہ پہنچا سکا۔

جب سید صاحب کو اندازہ ہوا کہ ان کے خلاف سازش اپنا کام کر چکی ہے اور حالات کے بہتر ہونے کی کوئی امید باقی نہیں تو انھوں نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی اس وقت ڈبئی کے دورے پر تھیں۔ انھیں یہ خبر علی گڑھ سے دہلی ہوتی ہوئی ڈبئی پہنچی۔ انھوں نے فوراً فون پر سید صاحب

بلا قائم کرایا۔ حکومت کی بھرپور حمایت کا یقین دلایا اور انھیں اس خیال کو ترک
دینے پر آمادہ کیا۔ شاید اگلے ہی دن صبح سویرے گیانی ذیل سنگھ جو اس وقت
یر داخلہ تھے اور بعد کو صدر جمہوریہ ہند ہوئے، وائس چانسلر کے لاج کے
ن میں ٹہلتے نظر آئے۔ بظاہر وہ علی گڑھ کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے تشریف
ئے تھے۔ لیکن اندازہ ہے کہ وزیر اعظم نے انھیں اس کام پر مامور کیا ہوگا
سید صاحب کو استعفیٰ دینے سے روکیں۔ اندرا جی ان کی بہت قائل تھیں اور ان
بہت اعتماد کرتی تھیں۔ ایک بار سید صاحب کے مخالفین کے ایک وفد نے وزیر اعظم
ے شکایت کی کہ سید حامد فرقہ پرست ہیں۔ صرف مسلمانوں کا مفاد ان کے پیش نظر
تا ہے۔ انھوں نے نہایت تلخ لہجے میں جواب دیا "آپ انھیں کب سے جانتے
؟ میں چودہ برس سے انھیں دیکھ رہی ہوں۔ یہ الزام بے بنیاد ہے"۔ وفد
ے اراکین آگے کچھ کہنے کی جراُت نہ کر سکے۔ اندرا جی نے سید صاحب سے کہا تھا
پ جب دہلی آیا کریں تو ملاقات کر لیا کیجیے اور اس کے لیے پہلے سے وقت
ی ضرورت نہیں"۔ مگر سید صاحب نے غیر ضروری ملاقاتوں سے ہمیشہ گریز کیا
بات ایک بار کرنل بشیر حسین زیدی نے شکایت کے لہجے میں کہی تھی۔

بہرحال، حکومت کے اصرار اور اندرا جی کی درخواست پر سید صاحب نے استعفیٰ
نے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کئی بار یہ امید بندھی کہ استاد موصوف کو معطل کر دیا جائے
ور حالات معمول پر آجائیں گے۔ لیکن سید صاحب یہ قدم نہ اٹھانے کا فیصلہ کر چکے
۔ بزرہ دھمکیاں دی گئیں، منتیں کی گئیں، طرح طرح کے دباؤ ڈالے گئے، مگر ان پر
ی اثر نہ ہوا۔ اس وقت مناسب یہی معلوم ہوتا تھا کہ سید صاحب اپنے فیصلے پر
ثانی کریں۔ مگر کسی کی کوئی تدبیر انھیں اس پر آمادہ نہ کر سکی۔ سید صاحب ہر
ئلے پر خوب غور کرتے ہیں۔ ہر کس و ناکس کا مشورہ توجہ سے سنتے ہیں۔ اس
بعد جس نتیجے پر پہنچتے ہیں آخر تک اس پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ ایسے لوگ
ت قدمی یا ارادے کی پختگی نہیں، ضد اور ہٹ دھرمی کا نام دیتے ہیں۔ نام میں
رکھا ہے۔ کچھ بھی نام دے دو مگر سید صاحب کا یہی مزاج ہے۔ اور آج
ساس ہوتا ہے کہ علی گڑھ کو اسی کڑوی دوا کی ضرورت تھی۔

ہرحال نہ سید صاحب جھکے، نہ احتجاج کرنے والوں کو ہوش آیا اور نہ یونی ورسٹی
حالات معمول پر آئے۔ بلکہ ہر روز حالت خراب سے خراب تر ہوتی گئی۔ یہاں تک
ایک دن پولیس کی گولی سے ایک طالب علم کی جان گئی اور آخر کار یونی ورسٹی بند
دی گئی۔ ان دنوں انتظامیہ سے متعلق اساتذہ وی۔ سی لاج میں ہی رات گزارتے
نیند کا غلبہ ہوتا تو کوئی فرش پر لڑھک جاتا کوئی صوفے پر۔ ذرا سی آہٹ پر
لوگ چونک کر اٹھ بیٹھتے۔ ہر وقت کسی بڑے حملے کا اندیشہ تھا۔

ایک رات تقریباً تین بجے سوتوں کو اٹھا کر ایک کمرے میں جمع ہونے کو کہا گیا۔ بہاءالدین صاحب، پرو وائس چانسلر وہاں موجود تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وائس چانسلر صاحب اس وقت بہت مصروف ہیں۔ میں ان کی طرف سے یہ افسوسناک اطلاع دے رہا ہوں کہ یونی ورسٹی غیر معینہ مدت کے لیے بند کی جا رہی ہے۔ دن نکلنے سے پہلے تمام ہاسٹل خالی کرانا آپ کی ذمے داری ہے۔ پولیس بہت بڑی تعداد میں آپ کی مدد کے لیے موجود ہے۔ جو آپ کے مشورے کے مطابق عمل کرے گی۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ طاقت کا استعمال ناگزیر حالت میں کیا جائے۔ اور وہ بھی کم سے کم۔ گولی چلانی پڑے تو پہلے پلاسٹک کی گولیاں استعمال کی جائیں۔ جو آپ کے سامنے ان ڈبوں میں موجود ہیں۔ تاکہ کم جانیں ضائع ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے خط میں تحریر کی ہوئی ہدایت اس معذرت کے ساتھ ہر ایک کے حوالے کیں کہ انھیں مجبوراً ٹائپ نہیں کرایا جا سکا۔ کئی بار کے تجربے نے بتایا کہ جو عبارت ٹائپ کو دی جاتی ہے اس کا جتنا حصہ ٹائپ ہوتا جاتا ہے اتنا ہی بلا تاخیر باہر پہنچتا جاتا ہے۔ یہ ہے ہمارے دفتر کی راز داری کا حال! اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ ہر ہال کے لیے الگ الگ پولیس کے دستے متعین ہیں جو اس وقت منزل کے سامنے موجود ہیں۔ آپ انھیں ساتھ لے کر اپنے اپنے ہال کی طرف روانہ ہو جائیے۔

راس مسعود ہال کو خالی کرانے کی ذمہ داری راقم کے سپرد تھی۔ ہال کے سامنے پہنچ کر پولیس افسر نے مائک حوالے کر دیا کہ اس پر تین بار یونی ورسٹی بند کیے جانے کا اعلان کر دیجیے۔ اور طلبہ کو ہدایت کیجیے کہ فوراً اپنے گھروں کو روانہ ہو جائیں طلبہ کو لے جانے کے لیے بسیں اور ریل گاڑیاں تیار کھڑی ہیں۔ اعلان کیا گیا لیکن کسی طرف سے کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ طالب علم بے خبر سو رہے تھے۔ اس پولیس افسر نے کہا آپ اندر جا کر لڑکوں کو جگا کر یہ حکم سنا دیجیے۔ میں سمجھ رہا کہ پولیس میرے ساتھ اندر جائے گی۔ مگر اس نے کہا آپ لکھ کر دیں تو ہم اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ تنہا جائیے۔ آپ کی جان کو خطرہ ہوا تو ہم مداخلت کا فیصلہ کر سکیں گے۔

طلبہ کو یہ خبر سنائی گئی تو وہ چراغ پا ہو گئے۔ اس وقت وہ ہر ممکن بدسلوکی پر آمادہ تھے۔ اور کسی طرح ہال خالی کرنے کو راضی نہیں تھے۔ آخر انھیں بتایا گیا کہ آپ چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں ہیں۔ ابھی رات تھی مگر بجلی کی روشنی میں اتنا تو صاف نظر آ رہا تھا کہ چاروں طرف ہزاروں کی تعداد میں پولیس تعینات ہے۔ آخر کار سب کا سامان بندھنے لگا۔ اتنے میں یہ افواہ اڑ گئی کہ دی۔ لاج میں جو لڑکے شامیانوں کے نیچے دھرنے پر بیٹھے تھے وہ پولیس کے ہاتھوں

ے گئے۔ اس پر چاروں طرف سے لڑکوں نے آ گھیرا۔ ان کا غیظ و غضب بے حد
ب تھا۔ کسی بے قابو مجمعے کے لیے اکیلے آدمی کو مار ڈالنا کتنا سہل ہے۔
کے سارے آثار نمودار تھے۔ مگر اسی دن یہ تجربہ بھی ہوا کہ موت بالکل سامنے
کتنی حقیر اور بے وقعت نظر آتی ہے۔ طلبہ کا آخری مطالبہ یہ ہوا کہ ہمیں وی سی
لے چلو۔ ہم بچشم خود دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہاں خون خرابہ تو نہیں ہوا۔ کام مشکل
پولیس اس کی اجازت دینے کو راضی نہ تھی۔ لیکن آخر کار ان کے چند نمایندوں
تھ لے جانے کی اجازت ملی۔ جو مطمئن لوٹے۔ اس کے بعد ہال سنسان ہو گیا۔

یونی ورسٹی کے دشمنوں کو یونی ورسٹی بند ہونے کی خوشی ہوئی۔ حالانکہ یہ ان
ن کا پیش خیمہ تھی۔ کیونکہ اب ناپسندیدہ عناصر پر یونی ورسٹی کے دروازے بند
نے کو تھے۔ پوری تیاری اور تمام احتیاطی تدابیر کے بعد سید صاحب نے یونی ورسٹی
ن چاہی تو اس کی سخت مخالفت کی گئی۔ شدید خون خرابے کا خوف دلایا گیا۔ مگر
رسٹی کھلی تو سارے اندیشے بے بنیاد نکلے اور اب تعلیم کا ایسا ماحول دیکھنے کو
اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ سید صاحب نے ارادے کی جس پختگی کا
کیا اس نے شورش پسندوں کے حوصلے پست کر دیے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ
دز ٹوٹتا ہے نہ مڑتا ہے۔ طلبہ بھول گئے کہ کس طرح امتحان کی تاریخیں آگے
ائی جا سکتی ہیں۔ جہاں یہ معلوم نہ تھا کہ کل امتحان ہوگا کہ نہیں وہاں یہ پروگرام
دیکھا کہ اس سال داخلے کی آخری تاریخ یہ ہے، سالانہ امتحان کی یہ اور اگلے سال
لے کی یہ۔ آنکھوں کو یقین نہ آیا۔ سید صاحب نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا
مالی ادارے کی مسیحائی کا حق ادا کر دیا تھا۔

ایک رات بجلی غائب رہی۔ صبح کو امتحان تھا۔ طلبہ کا ایک وفد وائس چانسلر
اور نہایت شائستہ مودب انداز میں گفتگو کی۔ تمہید یہ باندھی کہ آج بیٹے اپنے
باپ سے کچھ مانگنے آئے ہیں۔ اس کے بعد حرفِ مدعا زبان پر لائے کہ آج
ان ملتوی کرنے کا حکم دے دیجیے۔ انھوں نے نہایت نرمی سے جواب دیا
چاہیں کہ باپ انھیں زہر دے دے تو باپ انھیں زہر نہیں دے سکتا۔ مطالبوں
توں پہلے ہی چھوٹ گئی تھی۔ اس واقعے کے بعد سے عاجزانہ گزارشوں کا
بھی ختم ہو گیا۔ اور یہ سبق سب کو ازبر ہو گیا کہ امتحان کی تاریخوں میں ردوبدل
نہ بات نہیں۔

شروع شروع میں کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکتا کہ سید صاحب کی شیریں کلامی
پیچھے عزم و ارادے کی ایسی پختگی پوشیدہ ہے۔ ان کی گفتگو کا انداز نہایت شائستہ
نہایت نرم ہے۔ لیکن ان کے ایک ایک جملے سے قطعیت اور مضبوطی
ہوتی۔ یہی حال ان کی تحریر کا ہے۔ ایک دن میز پر رکھا رسالہ یوں ہی کھول لیا

پہلا جملہ اچھا لگا۔ یہیں سے پڑھنا شروع کر دیا کہ دیکھوں صاحب مضمون کو پہچان سکتا ہوں کہ نہیں۔ یہ مضمون ذاکر صاحب پر تھا۔ چند سطروں کے بعد ہی ... نے مصنف کا نام بتا دیا۔ انگریزی اور فارسی ادب سے انھیں شغف رہا ہے۔ ... کی نثر میں دونوں کی پرچھائیں صاف نظر آتی ہے۔ انگریزی الفاظ و محاورات ... ترجمے اور نئی نئی ترکیبیں تراشنے میں انھیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ ہندی ... کے برمحل استعمال سے بھی ان کی نثر میں دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ ان کے اسلو... کی توانائی کا شاید ایک راز یہ بھی ہے کہ جب تک کہنے کے لیے کوئی خاص بات نہ ... وقت تک وہ قلم نہیں اٹھاتے۔ ظ۔ انصاری کا طرز تحریر بہت دلکش ہے ... کے اندرا گاندھی نمبر میں سید حامد کے مضمون کے بعد ان کا مضمون شائع ہوا ... کئی بار ان کا مضمون شروع کیا مگر جی نہ لگا اور لوٹ کے انہی کا مضمون دو... تیسری بار پڑھ لیا۔

سید صاحب کم گو اور کم آمیز ہیں۔ لوگوں سے کم ملتے ہیں۔ گفتگو میں ... ہیں۔ ان کے بارے میں پہلے یہ خیال تھا کہ تقریر اور گفتگو کے فن میں انھیں کو... مہارت حاصل نہیں۔ ایک بار گفتگو کے دوران سید برکات احمد نے کہا ایسا ... کہ سید حامد تقریر پر قادر نہ ہوں۔ بس ان کی عادت ہے کہ اپنے خیال اپنی ... کے چہرے سے نقاب کم ہی اٹھاتے ہیں۔ سید برکات احمد بڑی نبض شناس نظر رکھ... ان کے اس خیال کی صداقت اس وقت ثابت ہوئی جب سید صاحب نے تہذ... کے سلسلے میں کئی شہروں کا دورہ کیا۔ پہلی تقریر بنارس میں ہوئی۔ موضو... مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی، اس کے اسباب اور اس کا علاج۔ دیر تک بولے او... بولے۔ بات دل سے نکلی دلوں میں اتر گئی۔ راتوں رات ایک نے دوسرے او... نے تیسرے کو سنائی۔ اور ان تک بھی پہنچ گئی جو مقامی سیاست اور گروہ بند... سبب جلسے میں شریک نہ تھے۔ اگلی صبح تہذیب الاخلاق کی ممبر سازی کے ... کے گلی کوچوں میں گزر ہوا تو ہر جگہ اس تقریر کا چرچا سنا۔ ہر ایک کے ہونٹوں ... تھی کہ سید صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ اب تو ہمیں کچھ کر گزرنا ہوگا۔ بنا... بعد پٹنہ، پھلواری شریف، جمشید پور، رانچی، اور کان پور میں بھی ان کی تقریر ... جادو کا اثر کیا۔ بات سچی ہو تو جادو کا اثر کیوں نہ کرے۔

کان پور میں سید صاحب کی جرأت مندی اور معاملہ فہمی کی ایک مثال ... آئی۔ پٹنہ سے لوٹ کر میں ایک دن پہلے کان پور پہنچ گیا تھا۔ اگلے دن حلیم ... سید صاحب کی تقریر ہونے والی تھی۔ کالج کے نزدیک احتجاج کے آثار نظ... کالج کمیٹی کے اراکین سے دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہو ... جس دھڑے کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔ وہ ایک اور کالج سے متعلق ہے۔ ...

لج کے باہر پولیس کا زبردست پہرہ ہے۔ اندیشے کو تقویت ہوئی۔ جلسہ
ع ہونے کے ذرا دیر بعد نعروں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ زیادہ وقت نہ گزرا
سیکڑوں لڑکے حملے کے انداز میں دوڑتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے
ں کے پیچھے بیسیوں سپاہی ڈنڈے برساتے ہوئے اندر گھسے۔ ڈائس پر جو
ن جلوہ افروز تھے ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کو جہاں پناہ ملی وہاں جا چھپا
عبرت کا سماں تھا۔ صرف سید صاحب اسی استقامت کے ساتھ مائک پر
ے رہے۔ ادھر ادھر دیکھا اور ایک لمحے میں معاملے کی تہ کو پہنچ گئے۔ انھوں نے
نہایت درست لہجے میں پولیس سے ہاتھ روکنے کو کہا اور پھر باہر نکل جانے
ا۔ پولیس کو تعمیل کرنی پڑی۔ پھر احتجاجی طلبہ سے بیٹھ جانے کو کہا اور ان کے
ندر کو اسٹیج پر بلا کے سرِ عام اپنا مطالبہ پیش کرنے کی دعوت دی۔ مطالبہ صرف
تھا کہ کالج کی لائبریری جو ابھی تیار ہوئی ہے اس کا نام حسرت موہانی لائبریری
چاہیے۔ تجویز سبھی کو پسند آئی۔ بات ختم!

ضرورت پیش آئے تو جان پر کھیل جانے اور بڑا سے بڑا خطرہ مول لینے سے
سید صاحب نہیں گھبراتے جب یونی ورسٹی کے حالات خراب تھے اور اس پر پولیس
ی کا گمان ہوتا تھا۔ عین اس زمانے میں کینیڈی ہاؤس کے ایک جلسے میں طلبہ
ہ مطالبہ کیا کہ پولیس ہٹالی جائے۔ سید صاحب نے کہا اس میں اساتذہ کی
کو خطرہ ہے۔ اس لیے یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر کہا گیا کہ کم سے
ی کوٹھی سے پولیس ہٹا دیجیے۔ اس میں غالباً طنز تھا۔ سید صاحب نے اسے
ر کر لیا۔ بعض حاضرین نے سرگوشی کے انداز میں ایک دوسرے سے کہا کہ
۔ تو کہنے کی بات ہے۔ خدا جانے سید صاحب نے جلسہ گاہ سے کس طرح
ت دی مگر جلسے کے بعد دی۔ سی لاج میں اور اس کے اردگرد پولیس کا نشان
۔ یہ ان کی بے خوفی کی صرف ایک مثال ہے۔

ایک دل آویز تبسم، سنجیدہ ظرافت اور لہجے کی نرمی ان کی پرمغز گفتگو کو زیادہ
ہ اور زیادہ قابلِ توجہ بنا دیتے ہیں۔ خطرات میں گھرے ہوں تو ظرافت کی یہ حس
ر بیدار ہو جاتی ہے۔ احتجاجی طلبہ نے وی سی لاج کا محاصرہ کر رکھا تھا۔
رسٹی کے دشمن طلبہ کے بھیس میں اندر گھس آئے تھے۔ اور قتل و غارت
دہ تھے۔ ایسے میں ایک استاد نے فرمایا' وائس چانسلر صاحب ہم سب استاد
کے پیچھے ہیں۔ انھوں نے چونک کر "اچھا" کہا۔ دائیں بائیں گردن گھمائی جیسے
ہے ہوں کہ کرسی کے پیچھے کون ہے۔ پھر ایک تلخ سی معنی خیز مسکراہٹ کے
کہا' نہیں کوئی بھی تو نہیں۔"

سید صاحب کام کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں

انھیں بیس بیس گھنٹے کام کرتے دیکھا اور کام کے دوران ہر لحظہ انھیں تا
پایا۔ رات کے دو تین بجے تک مسلسل کام کرنے کے باوجود ان کے چہرے
تھکن کے آثار نظر نہیں آتے۔ کام با مقصد ہو، نتیجہ خیز ہو، اپنی پسند کا ہو اور
سے کیا جائے تو انسان کو تھکاتا نہیں بلکہ اس کی کارکردگی میں اضافہ کر دیتا
انھوں نے حافظ بھی غضب کا پایا ہے۔ ایک شعبے کے صدر ان کی خدمت میں
ہوئے۔ شعبے کے آٹھ نو کاموں کے سلسلے میں منظوری اور مدد کے خواہاں
سید صاحب کو وائس چانسلر کا منصب سنبھالے ابھی چند ہفتے ہی ہوئے
صدر شعبہ کی معروضات توجہ سے سنیں اور مدد کا وعدہ کیا مگر وہ صاحب ما
لوٹے سبب یہ کہ وائس چانسلر نے کچھ نوٹ نہیں کیا۔ لیکن چند ہی روز میں ایک
ایک کر کے سارے کام ہو گئے تو انھیں رائے تبدیل کرنی پڑی۔

سید صاحب کی زندگی میں کام جتنا زیادہ ہے۔ کھانا اور سونا اتنا ہی کم ہے
میں کھانے کے بعد ذرا دیر کو آرام کر لیتے ہیں۔ اکثر اس کا وقت بھی نہیں ملتا
میں تو رات کو بھی سونے کے لیے صرف چند گھنٹے ہی مل پاتے تھے۔ یہاں سے سبک
کے بعد جو بڑے بڑے کام کیے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب بھی یہی معمول
سید صاحب کے علی گڑھ سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے ایک مد
سوال کیا کہ اب ان کا کیا پروگرام ہے۔ عرض کیا گیا کہ ہندستانی مسلمانوں
تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے پر سارا وقت صرف کریں گے۔ شاید ملک کا دورہ
اور جا بجا تعلیمی اداروں کے قیام میں مدد دیں۔ انھوں نے مختصر سا جواب
"کامیاب نہیں ہوں گے،" ان کی اس غیر متوقع رائے نے چونکایا۔ وضاحت چا
جواب ملا "تمھارے سید صاحب کو لوگوں کا دل جیتنے کا ہنر نہیں آتا۔ سر سید
با اصول انسان تھے۔ لیکن کارگزاروں کی جماعت کو یکجا کرنے اور ان سے کام
میں سر سید کو بارہا اپنے اصولوں کو نظر انداز کرنا پڑا۔ سر سید تو بس ایک انسا
ان کی بات تو جانے دو۔ ہم تم جس کی امت میں ہیں اس نے اپنے مخالفوں
موہ لینے کے لیے کیا جتن نہیں کیے۔

یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی ایک با
تشریف لائے۔ دی۔ سی لاج میں قیام تھا۔ یہ عمارت زیدی صاحب نے بڑ
سے بنوائی تھی۔ سامنے کے لمبے برآمدے کے بڑے حصے کو سامنے سے بند
دفتر کی شکل دے دی گئی ہے۔ اس کے آخری کنارے پر ایک کمرہ ہے۔
بالعموم اسی میں ٹھہرائے جاتے ہیں۔ مرحوم اطہر پرویز کے ساتھ میں زیدی صا
کو سلام کرنے حاضر ہوا۔ کمرے سے نکل رہے تھے۔ وہیں دفتر میں بیٹھ کر با
کرنے لگے۔ دوران گفتگو دروازے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "میں

نے ہیں اس دروازے سے اگر دشمن بھی داخل ہوتا تو دوست بن کے باہر
نا تھا۔ آج اس دروازے سے دوست اندر داخل ہوتا ہے اور دشمن بن
اہر نکلتا ہے۔

سید صاحب کی اصول پرستی اور سخت مزاجی نے اکثر اپنوں کو غیر بنا دیا۔ انھوں
لے بار فرمایا تھا میرے ہاتھ سے دشمن کو فیض پہنچ سکتا ہے۔ لیکن دوستوں
لُدہ پہنچانے سے پہلے میں دس دفعہ غور کرتا ہوں کہ مجھ سے ناانصافی تو
رہا ہو رہی۔ میں کسی کی حق تلفی تو نہیں کر رہا۔ سید صاحب کی کئی باتیں
غلط لگتی تھیں، آج تجربے نے بتایا کہ درست تھیں۔ ان کی سخت گیری
پنوں سے بے مروتی جو آج کچھ سنگ دلی سی لگتی ہے ممکن ہے کل عین
اف نظر آئے۔

وائس چانسلر کے عہدے سے سبکدوشی کے بعد سید صاحب نے دو اہم کاموں
ف متوجہ ہوئے۔ دہلی میں ہمدرد یونی ورسٹی کا قیام جس میں انھیں خاطر خواہ
لی حاصل ہوئی۔ اور ایک انگریزی روزنامے کا اجرا۔ یہ کام نہیں ہو سکا۔ اور
ہو سکے۔ اس کے لیے سات کروڑ روپے کی ضرورت ہے۔ اور اتنی بڑی
افراہمی ہندستانی مسلمانوں کے لیے آسان نہیں۔ بالفرض یہ بھی ہو جائے تو
ر کہاں سے میسر آئیں گے۔ غیر مسلم اس کی طرف ملتفت نہ ہوں گے اور کتنے
ان ہیں جو انگریزی اخبار پڑھتے ہوں۔ یا اسے خریدنے کی استطاعت رکھتے
جو انگریزی اخبار پڑھتے ہیں ان کا پہلے سے کوئی پسندیدہ اخبار ہے۔ ایک
کی عادت سی ہو جاتی ہے۔ اپنا اخبار چھوڑ کے کوئی آپ کا اخبار پڑھنے لگے
ماہے۔ آج کی دنیا میں اخبار اور رسالے صرف خریداروں سے نہیں چلتے۔
لیے اشتہارات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے انگریزی اخبار کو اشتہارات
والے کتنے ہوں گے۔

انگریزی اخبار نکالنے کا منشا یہ تھا کہ دنیا ہمارے نقطۂ نظر سے واقف اور
ے مسائل سے باخبر ہو سکے۔ اس کے لیے آسان راستہ یہ ہے کہ ہم انگریزی
کی روزناموں اور رسالوں میں سے چند کو "اپنالیں" ان دونوں زبانوں پر
رکھنے والے مسلمان موجود ہیں۔ انھیں متحد کیا جائے اور سہولتیں فراہم
ں۔ اس مقصد کے لیے کوئی بیورو قایم کیا جائے۔ ان اہل قلم کے خطوط و مضامین
اخباروں اور رسالوں کو بھیجے جائیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اچھی تحریریں اشاعت
ے ہر جگہ قبول کی جاتی ہیں۔ سید صاحب ان دونوں زبانوں میں خود بھی لکھ سکتے
لکھنے والوں کو یکجا بھی کر سکتے تھے۔

سید حامد جن شخصیتوں سے متاثر ہوئے ہیں ان میں ایک شخصیت اندرا گاندھی

کی بھی ہے۔ ایک مضمون میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں" مسز گاندھی کے شانے فراخ نہ تھے جتنے ان کے عظیم باپ کے۔ اور نہ دل اتنا وسیع، نہ دماغ اتنا باخبر۔ انتظامی امور میں وہ ان سے زیادہ موثر تھیں۔ فیصلہ اور کام کرنے کی راہ میں مروت اور مراعات کو حائل نہ ہونے دیتی تھیں۔ فیصلے کا نفاذ بے دریغ کراتیں اور سینہ زوری، سازش کرنے والوں کو وزارت عظمیٰ کا خواب دیکھنے والوں کی انتہائی شائستہ چابکدستی کے ساتھ کرتیں۔ زبان پر کوئی سخت لفظ نہ آتا کہ ملنے کی نوبت بھی نہ آتی اور سرکش وسازشی کو پتہ چل جاتا کہ وہ آسمان سے زمین پر گرا دیا گیا ہے۔ باریابی کے دعویدار کو اچانک پتہ چلتا کہ دروازہ اس پر بند کر دیا گیا ہے۔ سر ٹکرائے گا تو بھی نہ کھلے گا۔ جو معتوب یا مشتبہ ہوا وہ خواہ کسی ریاست کا وزیر ہی کیوں نہ ہو، ہفتوں انتظار کرے تب بھی حاضری سے محروم رہے گا، اپنا سا منہ لے کر واپس چلا جائے گا۔" یہ رویہ کسی ظالم، سخت گیر سربراہ مملکت کو ہی زیب دیتا ہے۔ جس شخص کی زندگی سرکارِ دوجہاں کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش میں گزری ہو وہ کسی طاقت کی حریص خود پرست، سفاک آمر کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ کیوں بنا سکتا ہے۔

ایسی کیا تدبیر ہو کہ ہندوستان کے مسلمان عزت کی زندگی گزار سکیں۔ اس موضوع پر دوستوں کے درمیان کئی بار گفتگو ہوئی۔ کام کا ایک دھندلا سا خاکہ ذہنوں میں ابھرا جو کچھ یوں تھا" سرسید ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جائے اور ملک میں جگہ جگہ اس کی شاخیں قایم کی جائیں۔ مسلمان اس کام میں پیش پیش ہوں مگر سکھوں اور ہندوؤں کو بھی ساتھ لیا جائے مثلاً کانفرنس کا صدر کوئی سکھ اور خازن کوئی ہندو ہو۔ کانفرنس کے مقاصد صرف تین ہوں۔ (۱) قومی اتحاد (انجمن کی شاخیں اگر کچھ بھی نہ کریں اور ان کی کوشش سے مختلف فرقوں کے لوگ کبھی کبھی مل بیٹھا کریں تو بھی بڑی بات ہے۔ ملنے اور بات چیت کرنے سے غلط فہمیاں دور ہوتی ہے۔ فاصلے کم ہونے لگتے ہیں۔ یک جہتی کو فروغ ہوتا ہے) ۲۔ اسکولوں اور خاص طور سے پرائمری اسکولوں کا قیام (یہاں بھی ہندوؤں اور سکھوں کا بھرپور تعاون حاصل کیا جائے۔ اور پرائمری کی تعلیم کی بنیاد ایسی مضبوط ہو جائے کہ آگے کی تعلیم کے لیے راہ ہموار ہو جائے۔ تجربے نے بتایا کہ یہ کام بغیر روپے پیسے کے کیا جا سکتا ہے) ۳۔ چھوٹے چھوٹے صنعتی اداروں کے قیام میں رہنمائی۔ یہ کام مشکل بھی نہیں اور اس سے فوری طور پر اقتصادی حالت کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ مگر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ ان یونٹوں کے قیام میں کہاں سے کیا مدد مل سکتی ہے۔

اس منصوبے کی تکمیل کسی رہبرِ کامل کے بغیر ممکن نہ تھی۔ سب کی نظریں بیک وقت ایک طرف اٹھیں۔ اگلے ہی دن ایک رفیق دہلی پہنچے۔ ہمدرد نگر کے بلاک اے کے دروازے پر دیر تک دستک دیتے رہے مگر دروازہ اندر سے مقفل ہو گیا۔

ما
القوی دسنوی
س کالونی۔ نعمت پورہ، عیدگاہ ہلز
بھوپال - ۱

باتیں "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" کی

مولانا ابوالکلام آزاد کی بعض تحریروں اور خطوط کی بہت زیادہ اہمیت اس لیے ہے کہ ان کی
ے بہت سے اہم واقعات اور حالات ان میں کسی نہ کسی سبب محفوظ ہو گئے ہیں۔ ایسا محسوس
کہ جب بھی انھیں دنیا کے ہنگاموں سے سکون نصیب ہوتا تھا اور تنہائی کے لمحات میسر آتے
ان کا ماضی جو انھیں بہت عزیز تھا بہت یاد آتا تھا۔ ممکن ہے ان کے دل میں یہ جذبہ بھی کبھی
ا ہو کہ وہ اپنے ماضی سے دوسروں کو بھی باخبر رکھیں۔ شاید اسی وجہ سے لاشعوری طور پر اُن کی
قسم کی تحریروں میں ان کے حالات زندگی کسی نہ کسی انداز سے آ گئے ہیں اور ایسا بھی ہوا کہ وہ
بعض ایسے حالات اور واقعات لکھ گئے ہیں جن کی کسی بھی عام حالت میں بھنک بھی مل نہیں سکتی تھی۔
ن کی زندگی کا ایک رُخ یہ بھی رہا تھا کہ وہ اپنی سوانح حیات قلم بند کرنا یا کرانا پسند نہیں کرتے تھے۔
ے انھوں نے "تذکرہ"، میں اپنے حالات زندگی کو پیش کرنے سے زیادہ دلچسپی نہیں لی اور اس
بہت کم صفحات مخصوص کیے اور اس میں بھی اپنے بارے میں کوئی بات کھل کر نہ بتا سکے۔ لیکن تذکرہ
ان کے بعض خطبوں، تقریروں، تحریروں یہاں تک کے "ترجمان القرآن"، کے ابتدائی اوراق
ہ کسی طرح ان کی زندگی کے بعض حالات بے ساختہ آ گئے ہیں۔ "ترجمان القرآن" کا انتساب جس
کے نام کیا گیا ہے اس کے سفر کا واقعہ بھی ان کی زندگی کے اہم پہلو پر سے پردہ اٹھاتا ہے۔
"زادہ ان سے منسوب دو کتابیں، "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" اور "انڈیا ونس فریڈم"
یا جن کے مرتبین کے مطابق مولانا نے نہ چاہنے کے باوجود لکھائی ہیں۔
"آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" بہ روایت ملیح آبادی (مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی) مولانا ابوالکلام
وفات کے تقریباً دو ماہ بعد اپریل ۱۹۵۸ میں شائع ہو کر منظر عام پر آئی اور "انڈیا ونس فریڈم" مولانا کے وفات کے بعد تقریباً
بعد جنوری ۱۹۵۹ میں شائع ہوئی جسے ترتیب دے کر پیش کرنے کا سہرا پروفیسر ہمایوں کبیر کے سر جاتا ہے۔
۱۹ کے ابتدائی دنوں کی بات ہے جب ہمایوں کبیر نے مولانا آزاد سے درخواست کی کہ:
"وہ اپنی سوانح عمری لکھیں"
: "مولانا اپنی ذاتی زندگی کے حالات کا ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے"

ہماری آزادی ترجمہ محمد مجیب۔ ص ۱

اس لیے : "پہلے انھوں نے اُن کو بیان کرنے میں بہت تکلف کیا۔"
مگر : "آخر میں جب میں (ہمایوں کبیر) نے یقین دلایا کہ میں حتی الامکان انھیں اپنے ہاتھ سے لکھنے کی زحمت سے بچاؤں گا تو راضی ہو گئے۔"

دیباچہ میں ہمایوں کبیر نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ:

"ان دقتوں کے باوجود میں نے کوشش کی ہے کہ اپنی تحریر میں مولانا آزاد کے خیالات کا عکس اتار لوں اور یہ کہ انھوں نے میرے بیان کو پسند کیا میری محنت کا بہت ہی قیمتی معاوضہ ہے۔"

بلاشبہ پروفیسر ہمایوں کبیر اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ مولانا آزاد کے نا[م] دان ہمیشہ ان کے شکرگزار رہیں گے کہ انھوں نے اپنی ذاتی دلچسپی سے مولانا آزاد کے اف[کار و] خیالات، ان کی زندگی کے اہم واقعات و تجربات اور ہندوستان کی جنگ آزادی کی داستا[ن] سلیقہ کے ساتھ قلم بند کر دیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے بہت سی ایسی سامنے آگئی ہیں جو شاید کبھی نہیں آتیں اور جن کے نتیجے میں بہت سی بدگمانیاں پیدا ہوتی رہتیں اور حصہ بنتی جاتیں۔

اس کتاب کی اشاعت نے بڑا ہنگامہ برپا کیا، جہاں بہت سے لوگوں نے اس کی میں قلم اٹھائے کچھ تنگ نظروں نے اس کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا، لیکن ان کی اس کی مقبولیت میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی۔ اب تک اس کے کئی اڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں محمد مجیب نے اس کا نہایت اچھا ترجمہ "ہماری آزادی" کے نام سے کیا ہے جس کا پہلا اڈیشن ۱۹۶۱ میں منظر عام پر آیا۔ جس کے بعد اس کی کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ پاکستان میں انڈیا ونس کی مخالفت میں رئیس احمد جعفری نے ۱۹۵۹ء میں "آزادیِ ہند" کے نام سے تلخیص اس کا ترجمہ کیا ——— اور عبدالوحید خاں نے اکتوبر ۱۹۵۹ء میں "تقسیم ہند" کے نام جواب میں ایک کتاب شائع کی ---، دونوں جگہ اس کی موافقت اور مخالفت میں مضا[مین] بھی شروع ہوا۔

"انڈیا ونس فریڈم" اور اس کے ترجمہ "ہماری آزادی" میں سہواً بعض غلط تا[ریخیں] غلط نام یا بعض دوسری کوتاہیاں راہ پا گئی ہیں۔ جن کا میں نے اپنے مضمون "کچھ حیات مولانا ابوالکلام" مطبوعہ الیوان اُردو دسمبر ۱۹۹۰ء میں ذکر کیا ہے۔ ان غلطیوں کے بارے میں اگر کوئی یہ کتابت اور طباعت کی غلطیاں ہیں تو یہی دعا کی جا سکتی ہے کہ خدا اسے اچھی سمجھ دے۔ اس قس[م] کی نشان دہی کرنے سے نہ تو مولانا آزاد کی عظمت کو نقصان پہنچ سکتا ہے نہ ہی پرو[فیسر] کے احترام میں کمی آسکتی ہے۔ غلطیاں کسی سے بھی ہو سکتی ہیں اور ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ا[گر] ادر پروفیسر محمد مجیب زندہ ہوتے تو وہ بعض اپنے متعلق خوش فہمیوں میں مبتلا حضرات کی غلطیوں کو کاتب اور پریس کے سر تھوپ کر اطمینان کی سانس نہ لیتے بلکہ اُن کا اعتراف کر [کے] عظمت کا ثبوت پیش کرتے۔

جہاں تک "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" کا تعلق ہے اس میں بعض واقعات اور تاریخیں کی جگہ
گئی ہیں۔ جو الجھنوں کا باعث بن گئی ہیں اور حیات آزاد پر قلم اٹھانے والوں کے لیے مشکلات پیدا
رہی ہیں۔

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اس کتاب کی شان نزول، اس طرح بتائی ہے:

"آزاد کی کہانی کی شان نزول، یہ ہے کہ ۱۹۲۱ء میں ہم سب جیل کے چرند پرند بن
چکے تھے جیل کی عجیب زندگی کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو جیل میں رہ چکے ہیں۔ اکتا ڈالنے
والی زندگی۔ . . . . .

میں نے مولانا کو اکسانا شروع کیا کہ "تذکرہ" کی دوسری جلد لکھا دیں ہفتوں
"میرے بھائی" — "میرے بھائی" کہہ کر ٹالتے رہے مگر میں بھلا پیچھا چھوڑنے
والا تھا تقاضا جاری رکھا۔ آخر راضی ہو گئے اور یہ کتاب لکھانا شروع کر دی۔

"بولتے جاتے تھے اور میں پنسل سے گھسیٹا جاتا تھا۔ رات کو مسودہ صاف
کر لیتا تھا۔ مولانا نے یہ کتاب اس طرح لکھوا دی کہ سامنے نہ کوئی نوٹ ہوتا تھا اور
نہ ہی مجھ سے پوچھا "کل کیا لکھوایا تھا"، دوسرے دن بیٹھے نہیں کہ بولنے کا رشتہ
فوراً مل گیا" (ص ۱۸-۱۹)

". . . . اس کتاب میں بعینہ وہی کچھ ہے جو مولانا کی زبان سے نکلا تھا۔ میں نے
اس میں کسی قسم کا بھی تصرف یا تغیر و تبدل کرنا خلاف دیانت سمجھا ہے" (ص ۲۲)

ساتھ انھوں نے اپنے اس خیال کا بھی اظہار کیا تھا:

"مولانا اگر یہی کتاب اپنے قلم سے لکھتے یا اس پر نظر ثانی کر لیتے تو اس کی شکل
ضرور مختلف ہوتی" (ص ۲۲)

لیکن دونوں باتیں نہیں ہوئیں یعنی نہ مولانا آزاد نے خود لکھنے کی زحمت گوارہ کی، نہ ہی
نظر ثانی کی نوبت آئی اور ستم یہ ہوا کہ تقریباً ۳۴ سال بعد اس کی اشاعت اس وقت عمل میں آئی
جب مولانا اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتاب بہت سی خامیوں سے پاک نہ ہو سکی مثلاً
ہجرت و قیام بھوپال کے متعلق تحریر ہے۔

"اس زمانے میں بمبئی سے نیا سلسلہ سفر حجاز کا شروع ہوا تھا اور میمنوں کے جہاز
آنے جانے لگے تھے۔ چنانچہ یہ بھی روانہ ہوئے، جب بھوپال پہنچے تو نواب
سکندر بیگم کا زمانہ تھا۔ وہ ان کا ذکر خیر پہلے سے سن چکی تھیں۔ انھوں نے نہایت
اصرار کے ساتھ کہا کہ چند دن بھوپال میں قیام فرمائیں۔ نواب سکندر بیگم کے
حالات ویسے ہی ناخوشگوار تھے۔ جیسے عموماً امراء کے ہوا کرتے ہیں مولانا کو ان
حالات کی اطلاع تھی۔ یہ شہر سے باہر رک گئے اور کہلا بھیجا کہ میں اس شرط سے
مل سکتا ہوں کہ بیگم صدق دل سے تائب ہو۔ بیگم خود شہر سے باہر آ کر ان کی خدمت
میں حاضر ہوئی اور اس درجہ متاثر ہوئی کہ ان کے ہاتھ پر تائب ہو گئی اور شہر

یں لاکر اسی محل میں ٹھہرایا جسے پہلے ایک تالاب کے وسط میں عیش ونشاط کے لیے بنایا تھا اور اب مسجد کردیا تھا"۔ (ص ۶۰-۶۱)

• قیام بھوپال کے زمانے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ نواب جہانگیر خاں جو نواب سکندر بیگم سے غایت درجہ وابستہ تھا جب مولانا آزاد کے ہاتھ پر تائب ہونے کی وجہ سے بیگم کی نظر التفات سے محروم ہوگیا۔ ۔ ۔ ۔ (ص ۶۱)

بھوپال کے مولانا منظور حسین سروش صاحب نے "غلطی ہائے مضامین" کے تحت نواب سکندر جہاں ان کے محل اور نواب جہانگیر محمد خاں کے واقعات کو غلط بتایا ہے نواب جہانگیر محمد ۱۸۴۴ میں وفات پاچکے تھے۔ وہ نواب سکندر جہاں کے شوہر تھے اور بھوپال کے کسی تالاب کے وسط میں کوئی مسجد نہیں ہے جہاں پہلے کوئی محل تھا۔

مولانا منور الدین کا انتقال

"ایک سال بعد مولانا (منور الدین) بھوپال سے بمبئی عازم ہوئے مگر وہاں پہنچتے ہی بیمار ہو گئے اور اس سال بھی نہ جا سکے۔ اس قیام کی وجہ سے صوبہ بمبئی کاٹھیاوار اور گجرات میں ان کا اثر بہت پھیل گیا اور ہزاروں آدمی بیعت میں آگئے۔ یہاں دو سال قیام رہا۔ تیسرے سال مکہ معظمہ پہنچے اور پانچ سال میں پانچ حج کرکے وہیں انتقال کیا۔ اسی سال ہندستان میں غدر ہوا" (ص ۶۲-۶۳)

• "جب ان کے نانا نے ہجرت کا ارادہ کیا تو یہ (مولانا خیر الدین) بھی ان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ بھوپال میں بھی ساتھ مقیم رہے اور وہاں سے مکہ معظمہ گئے (ص ۷۰)

لیکن انڈیا ونس فریڈم (ہماری آزادی) میں تحریر ہے:

"غدر سے دو سال پہلے مولانا منور الدین نے ہندستان کے حالات سے دل برداشتہ ہوکر مکہ معظمہ کو ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر سلطان جہاں بیگم (نواب سکندر جہاں) نے بھوپال میں انھیں روک لیا اور وہ بھوپال ہی میں تھے جب غدر شروع ہوگیا۔ دو سال تک وہاں سے نکل نہ سکے۔ پھر بمبئی پہنچے۔ یہاں انھیں موت نے آگھیرا اور مکہ معظمہ جانا انھیں نصیب نہ ہوا (ص ۹)

• مکہ معظمہ سے واپسی اور والدہ کا انتقال

• "جس سال کلکتہ پہنچے اسی سال والدہ کا انتقال ہوگیا" (ص ۱۱۰)

• "والد مرحوم نے جب آخری سفر ہندستان کا کیا، تو اس وقت میری عمر سات آٹھ برس کی تھی اور اسی زمانے میں والدہ مرحومہ کا انتقال ہوگیا" (ص ۱۸۷)

لیکن انڈیا ونس فریڈم میں درج ہے:

۲۔ انڈیا ونس فریڈم میں سکندر جہاں درج ہے جو درست ہے لیکن پروفیسر محمد مجیب نے ترجمہ نہیں کیوں نواب سلطان جہاں بیگم کردیا۔ (عبدالقوی دسنوی)

• میں مکہ معظمہ میں ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوا۔ دو سال بعد میرے والد میرے خاندان کو لے کر کلکتہ آ گئے۔ . . . ہمارے کلکتہ آنے کے ایک سال بعد میری والدہ نے وفات پائی اور انھیں وہیں دفن کیا۔" (ص ۱۰)

مولانا شبلی نعمانی سے پہلی ملاقات

• "مولانا شبلی نعمانی سے میں ۱۹۰۴ء میں سب سے پہلے بمبئی میں ملا۔ جب میں نے اپنا نام ظاہر کیا تو اس کے بعد آدھ گھنٹے تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور چلتے وقت انھوں نے مجھ سے کہا، تو ابوالکلام آپ کے والد ہیں؟ میں نے کہا نہیں میں خود ہوں" (ص ۲۱۲)

• "اس کے چند ماہ بعد جب مولانا شبلی مرحوم سے بمبئی میں پہلی ملاقات ہوئی اور میں نے مخزن کا ذکر کیا تو ان کو بہت ہی استعجاب ہوا۔ اس وقت تک مولانا کی نظر سے وہ نہیں گزری تھی اور اس کے اجرا کی انھیں خبر نہیں تھی" (ص ۲۲۸)

• مولانا شبلی مرحوم نے اسی کے ایک مضمون کی بنا پر مجھے خط لکھا تھا۔ عکس ریز ضو غیر مرئی کی تاریخ انکشاف اور حقیقت پر لکھا تھا" (ص ۲۸۰)

• "ایک دن میرے یہاں بیٹھے تھے اور کتابوں کی الماریوں سے کتابیں نکال نکال کے دیکھ رہے تھے اس میں خدنگ نظر کا ایک مجموعہ نکل آیا اس میں میرے مضامین بھی تھے۔ پڑھ کر انھوں نے بہت زیادہ اصرار کیا اس میں ایک مضمون ایکسریز کی ایجاد حقیقت پر تھا۔ انھوں نے کہا۔ جب تم ایسے مضامین لکھ سکتے ہو تو کیوں اس طرح بلا کسی مشغلے کے ہو؟ کم سے کم ایک مضمون "الندوہ" کے ہر نمبر کے لیے لکھ دیا کرو۔"

(ص ۳۱۱-۳۱۲)

• "۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ میں عراق چلا گیا اور پھر کوئی نمبر لسان الصدق کا نہیں نکلا۔ وہاں سے جب واپس آیا تو بمبئی میں مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی یہ پہلی ملاقات تھی" (ص ۳۱۱)

• "مولانا مرحوم تقریباً دو تین ہفتہ (بمبئی میں) رہے اور اکثر اوقات میں ان کے ساتھ رہا۔ اسی زمانے میں مرحوم نے "الندوہ" جاری کیا تھا شاید ایک یا دو نمبر نکل چکے تھے۔ جب چند دنوں میں گفتگو و صحبت سے انھیں میرے علمی شوق کا خوب اندازہ ہو گیا تو بڑی محبت کرنے لگے، بار بار کہتے کہ مجھے ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔ تم اگر کسی طرح حیدرآباد آسکو تو الندوہ اپنے متعلق کر لو۔ اور وہاں مزید مطالعہ اور ترقی کا بھی موقع ملے گا" (ص ۳۱۱)

الندوہ کا پہلا شمارہ اگست ۱۹۰۴ء (جمادی الاول ۱۳۲۲ھ) میں منظر عام پر آیا۔ لسان الصدق کا آخری شمارہ ۱۹۰۴ء میں نہیں اپریل، مئی ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا اس وقت مولانا شبلی دارالعلوم ندوہ کے معتمد تھے اور لکھنؤ میں مقیم تھے پھر انھوں نے مولانا آزاد کو لکھنؤ کے بجائے حیدرآباد کیوں بلایا؟ شبلی

سے پہلی ملاقات کہیں ۱۹۰۴ بتاتے ہیں کہیں ۱۹۰۵ ایسا کیوں؟ جب مولانا آزاد نے اپنا نام مولانا شبلی کو بتایا تو تھوڑی دیر بعد انھوں نے یہ کیوں کہا؟

"تو ابوالکلام آپ کے والد ہیں"

حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ مہادیو ڈیسائی یہی واقعہ مولانا حالی سے منسوب کرتے ہوئے اس طرح رقمطراز ہیں:

When the speaker was introduced, the poet Hali, whose book the speaker had reviewed in detail, thought that the lad must be the son of the Maulana Abul Kalam Azad! There was no limit to his astonishment when he came to know that the lad was no other than the famous Maulana himself, the editor of *Lisanus Sidq*. ٣

● **مکہ و عراق کا سفر:**

● "اس کے بعد وہ شخص (محمد صدیق سندھی) مکہ معظمہ چلے گئے تھے اور برسوں کے بعد ۱۹۰۵ء میں جب میں وہاں گیا تو مجھ سے ملے اور خود ہی یہ واقعہ بیان کیا" (ص ۱۴۴)

● ۱۔ . . . "اس وقت ہم دونوں بھائی غیر حاضر تھے اور عراق چلے گئے تھے۔ ہم دونوں کا یہ سفر ان کی (والد) مرضی کے خلاف تھا۔" (ص ۱۴۵)

● "ابھی مکان تیار ہوا ہی تھا کہ بھائی بغداد سے واپس آئے مگر نہایت سخت مہلک مرض کی حالت میں، ان کو ذات الجنب کی ابتدا ہو چکی تھی۔ بمبئی میں بہت علاج کیا گیا مگر کچھ مفید نہ ہوا۔ پھر خیال ہوا کہ ہمیو پیتھک علاج کیا جائے۔ اس کا بہترین انتظام صرف کلکتہ میں ہی تھا۔ چنانچہ اس طرح وہ پھر کلکتے آ گئے۔ یہاں ایک ماہ کے بعد بھائی کا انتقال ہو گیا" (ص ۱۴۵-۱۴۶)

● " . . . . بلاد اسلامیہ کی سیاحت کا ان کو بہت شوق تھا۔ چنانچہ اسی سلسلے میں جب ایک ساتھی یعنی حافظ عبدالرحمان امرتسری مل گئے تو انھوں نے عراق کا ارادہ کیا۔ عراق ہم دونوں ساتھ گئے، لیکن میں وہاں پہنچ کر سخت بیمار ہو گیا اور واپس چلا آیا" (ص ۱۷۹)

● . . . . بہرحال برٹش قونصل کے ذریعہ سے روپیہ بھیجا گیا اور وہ بمبئی آ گئے لیکن اس درجہ ضعیف اور نحیف ہو گئے تھے کہ سنبھلنا دشوار معلوم ہوتا تھا بالآخر چند ماہ نہایت سخت تکلیف اٹھا کر ۱۹۰۷ء میں راہ گزار عدم ہوئے" (ص ۱۷۹-۱۸۰)

● " . . . . اسی زمانے میں ایک حادثہ کی وجہ سے اگرے ٹھہر گیا۔ تو منشی نادر علی خاں مفید عام پریس (آگرہ) سے گفتگو ہوئی اور اس کے بعد چند نمبر وہیں سے چھپ کر نکلے

٣ Maulana Abul Kalam Azad by Mahadev Desai: Shivalal Agarwala and Co Ltd Agra. First Indian Edition September 1945.

ایک دو نمبر بمبئی میں بھی چھپے اس کے بعد عراق کا سفر پیش آیا اور پرچہ بند ہوگیا۔" (ص ۳۰۵)

● "۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ میں عراق چلا گیا اور پھر کوئی نمبر لسان الصدق کا نہیں نکلا۔"

ان اقتباسات کے مطابق ۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ عراق کا سفر کرنا پڑا اور لسان الصدق کا کوئی شمارہ نہیں نکلا (حالانکہ لسان الصدق اپریل مئی ۱۹۰۵ء تک جاری رہا اور اس سے قبل مولانا کا عراق کا سفر نہیں ہوا) ایک جگہ تحریر ہے مولانا ابوالنصر آہ بیمار ہو کر پہلے بمبئی آتے پھر کلکتہ آئے۔ ایک جگہ تحریر ہے بیماری کی حالت میں بمبئی آتے اور ۱۹۰۷ء میں ان کا انتقال ہوگیا گویا اسلامی ممالک کا ان کا سفر تین ساڑھے تین سال تک جاری رہا (یہ بھی یاد رکھیں کہ دونوں بھائیوں نے یہ سفر اپنے والد کی مرضی کے خلاف کیا تھا تو بیرون ملک میں اس قدر طویل المدت تک اخراجات کہاں سے پورے ہوتے؟) ۔ لسان الصدق صرف ایک بار (دو شماروں پر مشتمل) اگست ستمبر ۱۹۰۴ء میں مطبع فیض رساں بمبئی سے شائع ہوا ۔ اس کے بعد مفید عام پریس آگرہ سے بھی صرف ایک بار اس کا آخری نمبر (شمارہ ۸، ۹) اپریل مئی ۱۹۰۵ء میں منظر عام پر آیا ۔ یہ بھی تحریر ہے کہ آگرہ اور بمبئی سے لسان الصدق کے نکلنے کے بعد عراق کا سفر کیا ۔ اور ایک جگہ یہ تحریر ہے کہ اس سفر میں بیمار پڑ گئے اور بیماری کی حالت میں لوٹے ۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ اس سفر میں دونوں بھائی بیمار پڑے ۔ یہ بھی تحریر ہے کہ ۱۹۰۵ء میں مکّہ کا سفر کیا ۔

● انجمن حمایت اسلام :

● "اس کے بعد انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں جس سال میں نے تقریر کی اسی سال انھوں (ابوالنصر آہ) نے ایک نظم پڑھی۔" (ص ۱۸۰)

● "۔ ۔ ۔ ۔ لکھنؤ میں ان کا خط آیا کہ حامد علی صدیقی جو اس وقت اڈیٹر تھے اپنی اصلی ملازمت پر واپس چلے گئے ہیں ۔ اب کوئی اڈیٹر نہیں ہے میری (شیخ غلام محمد مالک وکیل) خواہش ہے کہ آپ (مولانا آزاد) آجاتے ۔ اگر آپ آجائیں تو اخبار بالکل آپ کے سپرد کر دوں اور پوری آزادی سے آپ اپنے خیالات ظاہر کر سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن میں (ابوالکلام آزاد) مولانا شبلی سے الگ ہونا پسند نہیں کرتا تھا : بمبئی میں پھر ان کا خط آیا اور انجمن حمایت اسلام کا بھی سالانہ جلسہ ہونے والا تھا چنانچہ میں لاہور گیا اور جلسہ کے بعد امرتسر آیا ۔ پہلے تو محض عارضی طور پر اخبار کی ترتیب شروع کر دی کیونکہ اس وقت دفتر میں کوئی انتظام نہ تھا ۔ مگر اس کے بعد طبیعت لگنا شروع ہوگئی اور میں نے رائے قائم کر لی کہ کچھ دنوں اس عالم کی بھی سیر کرنی چاہیئے۔" (ص ۳۱۵-۳۱۶)

● "اسی اثنا میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے کا زمانہ آ گیا ۔ اخباروں میں اس کا

[illegible] الصدق

پروگرام چھپا اور طبیعت میں بے اختیار ایک جوش سا اٹھا کہ کسی نہ کسی طرح اس میں شریک ہوں۔ اس وقت یہی چیزیں تمام تر دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھیں۔ یہ ممکن نہ تھا کہ والد مرحوم جانے کی اجازت دیتے۔ تقریباً یہ بات محال تھی۔ اب میں نے ارادہ کیا کہ پوشیدہ چل دینا چاہیے۔ چند خاص دوستوں سے ذکر کیا اور ایک دن شب کو ایک جوڑا کپڑا لے کے لاہور کا ٹکٹ لے لیا اور پنجاب میل میں بیٹھ گیا۔"

(ص ۴۳۲)

• "۔۔۔۔ میں نے پہلے سے شیخ عبدالقادر کو خط لکھ دیا تھا اور منشی محبوب عالم کو بھی اطلاع دے دی تھی۔ لسان الصدق کی وجہ سے یہ لوگ واقف تھے اور شیخ عبدالقادر سے ندوۃ العلما کے موقع پر ملاقات ہو چکی تھی۔"

۔۔۔۔ تیسرے دن شب کو انجمن کا بڑا پر رونق اجلاس تھا۔ مولانا نذیر احمد ہی اس اجلاس کے صدر تھے۔ وہی وقت میری تقریر کے لیے رکھا گیا تھا۔۔" (ص ۴۳۲-۴۳۳)

• انجمن میں دوسرے سال پھر گیا اور تقریر کی مولانا حالی مرحوم سے ملاقات کا حال پہلے کہہ چکا ہوں، جو اس کے پہلے سفر لاہور میں حاصل ہوئی تھی۔ اس وقت کے اکثر مشہور آدمیوں سے اسی طرح واقفیت ہوئی۔ بڑی دقت یہ تھی کہ میری کم سنی کی وجہ سے باوقل نظر کوئی غیر معمولی توجہ کا مستحق نہ سمجھتا تھا۔ اس لیے مجھے زبان کھولنی پڑتی تھی۔ پھر استعجاب و توجہ دونوں باتیں حاصل ہو جاتیں۔ مولانا نذیر احمد مرحوم سے بھی پہلی مرتبہ اسی سفر میں ملا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری کو مخزن میں نیا نیا ملک کے سامنے پیش کیا تھا۔ (ص ۴۳۳)

"آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" کے ان اقتباسات سے یہ پتا نہیں چلتا کہ مولانا آزاد انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں کب کب شریک ہوئے۔ یہ واقعات تسلسل سے بھی بیان نہیں کیے گئے ہیں مولانا نے پہلی بار ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ منعقدہ یکم تا ۴ اپریل میں شرکت کی جس کی روداد مولانا آزاد نے لسان الصدق مئی ۱۹۰۴ء میں شائع کی ہے جس میں انھوں نے تحریر کیا:

"اس سال انجمن کے سالانہ جلسے میں ہمیں بھی شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ جبکہ عام خیال ہے کہ جلسہ پچھلے سال کے جلسوں سے اکثر باتوں میں فوقیت رکھتا تھا ۔۔۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا پر لطف لیکچر ہمارے مکرم دوست مولوی وحید الدین صاحب سلیم پانی پتی کا عالمانہ مضمون، حضرت حالی کی پر درد نظم یہ ایسی چیزیں ہیں جو کانفرنس کا اصلی عنصر اور روح رواں سمجھی جاتی ہیں ۔۔۔ ہمارا یہ مختصر سفر ۳۰ مارچ سے شروع ہو کر ۷ مئی کو ختم ہوا۔"[۵]

اس روداد میں آزاد نے اپنے بھائی ابو النصر آہ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ انجمن حمایت اسلام کے جلسہ (۱۹۰۴ء) میں شریک نہیں ہوئے تھے۔

۵۔ لسان الصدق اڈیٹر ابو الکلام آزاد مرتبہ عبدالقوی دسنوی (مکتبہ جامعہ دہلی لمیٹڈ) ص ۱۲۹

"اقبال اور انجمن حمایت اسلام"، کے صفحہ ۸۰ پر انجمن اسلام کے انیسویں سالانہ جلسہ
(اپریل ۱۹۰۴ء) میں حصہ لینے والوں کے نام درج ہیں اس میں مولانا حالی، ڈاکٹر نذیر احمد، مرزا
گورگانی میاں سر محمد شفیع، سر عبدالقادر، سر فضل حسین، مولانا ابوالکلام آزاد اور خواجہ حسن نظامی
م ہیں لیکن ابوالنصر آہ کا نام نہیں ملتا ہے۔
دی کہانی خود آزاد کی زبانی" کے صفحہ ۳۴۳ پر تحریر ہے:

"اس زمانے میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری کو مخزن نے نیا نیا ملک کے سامنے پیش کیا تھا۔

حالانکہ علامہ اقبال کا کلام مخزن لاہور میں ۱۹۰۴ سے نہیں ۱۹۰۱ سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔

ماہنامہ لسان الصدق (کلکتہ)

• "۔ ۔ ۔ ۔ اور تجویز ہوئی کی بالفعل فلس کیپ تقطیع پر ایک جزو کا رسالہ نکالا جائے اور مہینے میں دو بار نکلے۔ میں نے اس کا نام "لسان الصدق" تجویز کیا اور بلا کسی اعلان کے پہلا نمبر چھاپ کر شائع کر دیا۔ ۔" (ص ۳۰۴)

• "اسی زمانے میں ایک حادثے کی وجہ سے آگرے ٹھہر گیا تو منشی قادر علی خاں مفید عام پریس سے گفتگو ہوئی اور اس کے بعد چند نمبر وہیں سے چھپ کر نکلے ایک دو نمبر بمبئی میں بھی چھپے، اس کے بعد عراق کا سفر پیش آیا اور پرچہ بند ہو گیا۔" (ص ۳۰۵)

• ۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ میں عراق چلا گیا اور پھر کوئی نمبر لسان الصدق کا نہیں نکلا،" (ص ۳۱۱)

لسان الصدق ہمیشہ ماہنامہ رہا۔ مہینے میں دو بار یعنی پندرہ روزہ کبھی نہیں رہا۔ یہ رسالہ ناسکیپ تقطیع پر بھی کبھی نہیں چھپا۔ اس کا آخری شمارہ اپریل مئی ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا تھا۔

اس طرح کی غلطیاں اس کتاب میں تلاش کرنے سے اور بھی مل جائیں گی یہ غلطیاں کتابت ہ نہیں ہیں بلکہ مولانا آزاد کی اپنی سانح حیات دلچسپی کے ساتھ نہ لکھانے کا نتیجہ ہیں۔ اسی وجہ سے ولانے اسے دوبارہ دیکھنے کی خواہش نہیں کی اور نہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے انھیں کانے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی وفات کے بعد جب یہ کتاب چھپ کر آئی تو خامیوں اور دریوں کے ساتھ آئی اس لیے کہانیوں کی طرح دلچسپی کا باعث تو ضرور ہوئی لیکن معتبر نہ بن سکی جس وجہ سے مولانا غلام رسول مہر نے جو ماہرین آزاد میں شمار کیے جاتے ہیں، اپنے مکتوب ۲۸ جنوری ۱۹۶۰ بنام پروفیسر ریاض الرحمان شروانی میں اس کتاب کو "غلطیوں کا سرچشمہ" قرار دیا ہے۔

• اقبال اور انجمن حمایت اسلام از محمد حنیف شاہد ایم اے: کتب خانہ انجمن حمایت اسلام ریلوے روڈ، لاہور۔

شفقت رضوی
بی۔۵۵ حق باہو پلازہ
گلشن اقبال۔ بلاک ۱۳ سی۔ کراچی (پاکستان)

کلامِ حسرت موہانی

(تقابلی مطالعہ)

حسرت موہانی سخن سنج بھی تھے اور سخن فہم بھی۔ ان میں شعر گوئی کی امنگ فطری تھی۔ وہ کم عمری اساتذہ سلف کے کلام کا مطالعہ کرتے رہے اور غور و فکر سے شعر کے محاسن و معائب سمجھنے لگے تھے۔ رسالہ معلّی کے صفحات اور ان کی تالیف نکاتِ سخن زبان اور بیان کے رموز کے بارے میں ان کی وسیع معلومات اور کے تنقیدی شعور کی غماز ہیں۔ تمام شعرا کے کلام پر چاہے وہ اساتذہ ہی کیوں نہ ہوں احتسابی نظر ڈالنے کے ساتھ انھوں نے اپنے کلام کو بھی اصولِ تنقید سے جانچا اور اگر کسی شعر میں کوئی خامی یا سقم نظر آیا تو بلا پس و پیش مسترد کر دیا۔ چنانچہ ابتدائی دور (۱۸۹۶ء ـــ ۱۹۰۳ء) کے کلام کی ناپختگی کو دیکھتے ہوئے اس کی اشاعت گریزاں رہے۔ ۱۹۱۶ء میں اس کا کچھ حصہ بطور ضمیمہ دیوان شائع بھی کیا تو اس عذر کے ساتھ کہ

> "کل مجموعۂ خرافات کو یک قلم نظر انداز کر دیا البتہ چند غزلیں ضرور رہنے دیں لیکن ان کو بھی ابتدائی لباس میں بلا اصلاح چھوڑ دیا ہے تاکہ اہل نظر کو مطالعہ سے راقم حروف کے مذاقِ سخن کی تدریجی ترقی کا اندازہ ہو سکے۔ ان غزلوں کی کمزوری اور بے رنگی کے متعلق نقادانِ کلام سے عفو اور درگذر کی امید ہے۔"
>
> (عبارت خاتمہ دیوانِ اول، طبع ثانی متعلق بہ ضمیمہ)

اس طرح کلام کو رد کر دینا بڑے حوصلے کی بات ہے کیونکہ ابتدائی ادوار میں شوق سرمایہ ہوتا ہے کہ شاعر اس کے ایک حصہ سے دست برداری کا ارادہ کرے۔ یہ عمل کسی صحیح المذاق شاعر سے ہی حسرت نے ۱۹۰۳ء کے بعد کے کلام میں بھی ترمیم و تنسیخ کا عمل جاری رکھا یہاں تک کہ تمام منظومات سے ہو گئے اور انھیں کلیات میں شامل کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ان میں طبعزاد نظمیں بھی ہیں اور مترجمہ بھی۔ نظموں کے عنوانات کا حوالہ کافی ہے۔

بربطِ سلمیٰ (مخزن لاہور: مئی ۱۹۰۱ء) وردِ محبت (مخزن لاہور: دسمبر ۱۹۰۱ء) ترکیب بند (۱۱ انجمن

ریٹل کالج میگزین علی گڑھ : فروری ۱۹۰۰ء) ترکیب بند (۲) (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین : نومبر ۱۹۰۰ء
نظم : محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین : جنوری ۱۹۰۲ء) مثنوی (مشاہدہ شعرائے قدیم در عالمِ خیال) (محمڈن اینگلو
ورینٹل کالج میگزین : جون ۱۹۰۲ء) تخیل کے کرشمے (اردوئے معلیٰ کانپور : جولائی ۱۹۲۵ء) ترجمہ کی ہوئی نظمیں :
وسم بہار کا آخری پھول (مخزن لاہور : اگست ۱۹۰۱ء) ترانہ (اردوئے معلیٰ علی گڑھ : اگست ۱۹۰۳ء) ترانۂ
بت (مخزن لاہور : اکتوبر ۱۹۰۷ء)

یہ نظمیں رسائل میں شائع ہونے کے باوجود کلیات میں جگہ نہ پاسکیں۔ گویا حسرت کی نظر میں یہ ان کے
نسوخ کلام کے ضمن میں آتی ہیں۔

رسالہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ کی ابتدائی اشاعتوں میں ان کی جو غزلیں شائع ہوئی تھیں ان کا مقابلہ
طبوعہ دیوان (طبع اول) سے کرنے کے بعد پتا چلا کہ ہر غزل میں سے اشعار کو حذف کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ یہاں
اسی مطالعہ کا حاصل پیش کیا جاتا ہے۔ اہلِ نظر خود ہی اشعار کو مسترد یا منسوخ کرنے کی وجہ سمجھ سکتے ہیں اور
حسرت کی سخن فہمی کی داد دے سکتے ہیں۔

غزل مطبوعہ رسالہ اردوئے معلیٰ جلد (۱) شمارہ (۱) جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۸

مطلع ؎ روشِ حسن مراعات چلی جاتی ہے
ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے

اردوئے معلیٰ میں وضاحت کی گئی ہے "بر غزل جناب میر محمدی مرحوم بیدار دہلوی شاگرد حاتم دہلوی"
طبوعہ دیوان میں ایسی کوئی وضاحت نہیں ہے۔ اردوئے معلیٰ میں یہ غزل (۱۳) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے
ار اشعار منسوخ کر کے صرف (۹) اشعار شاملِ دیوان حصہ اول کیے گئے ہیں۔ منسوخ کردہ اشعار بقید نشان شمار درج ہیں۔

پانچواں شعر ؎ بے رخی تا بکجا اب تو کرم کر ساقی
ہائے کیا مفت میں برسات چلی جاتی ہے

(تا بکجا کی اجنبیت اور مفت میں کا بے موقع و بے مزہ استعمال اسے منسوخ کرنے کے لیے کافی ہے)

آٹھواں شعر ؎ ہائے ری سادگیِ شوق کہ اب تک ان سے
خواہشِ لطفِ ملاقات چلی جاتی ہے

(شوخ اگر انہیں ہائے ری کا بدل فراہم ہو جاتا تو شعر پُر لطف ہو سکتا تھا)

نواں شعر ؎ تہمِ جاناں میں ہے کیا بات کہ اب تک دل کی
عادتِ فخر و مباہات چلی جاتی ہے

دسواں شعر ؎ ستمِ یار بھی ہے سادگیِ یار بھی ہے
پرسشِ جرم شکایات چلی جاتی ہے

غزل مطبوعہ اُردوئے معلّٰی جلد (۱) شمارہ (۲) اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۰

مطلع ؎ تو نہ کر عہد کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے

اُردوئے معلّٰی میں اسے "مشتمل بر بیان جفائے بے پروا و مایوسیِ مجبور" کے عنوان کے تحت دو قطعات کی صورت میں شائع کیا گیا تھا۔ پہلے قطعہ میں (۹) اشعار ہیں۔ آخری شعر ہے

؎ ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پُرجفا ہو جائیے

کاتب نے لفظ وفا پر تخلص کا نشان لگا دیا ہے جس سے عابد رضا بیدار کو دھوکا ہوا کہ یہ قطعہ وفا کا ہے (ملاحظہ ہو رسالہ برہان، دہلی: اکتوبر ۱۹۶۱ء: صفحہ ۵۲)
اس قطعہ کا ساتواں شعر دیوان میں شامل نہیں ہے۔

؎ میرے منہ سے سن کہیں لیجیے جو حرفِ آرزو
دشمنِ جانِ نزارِ مدعا ہو جائیے

(سن کہیں لیجیے کی کراہیتِ سماعت سے کون انکار کر سکتا ہے)

غزل مطبوعہ اردوئے معلّٰی جلد (۱) شمارہ (۳) ستمبر ۱۹۰۳ء صفحات ۴۴، ۴۵

مطلع ؎ اثر تیرے تغافل کا رقیبِ کامراں تک ہے
وجودِ رشک یعنی اضطرابِ بدگماں تک ہے

غزل کے ساتھ یہ نوٹ بھی مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں " بہ پیروی انداز استاد الاساتذہ جناب میرزا اصغر علی خاں صاحب مرحوم نسیم دہلوی"
اردوئے معلّٰی میں اس غزل کے (۱۵) اشعار ہیں جب کہ دیوان کے لیے صرف (۱۰) منتخب کیے گئے۔ ان کو رد کر دیا گیا ہے۔

پانچواں شعر ؎ ہجوم ناتوانی مانعِ پروازِ بلبل ہے
دگرنہ فصل کیا ایسے قفس سے آشیاں تک ہے

(ہجوم ناتوانی اُردو کے لیے نامانوس ترکیب ہے)

ساتواں شعر ؎ وہ ہنس ہنس کے سنا کرتے ہیں عشقِ غیر کے قصے
اثر دردِ محبت کا سو میری داستاں تک ہے

نواں شعر ؎ بھلا دیں گی یہ بے پروائیاں نالے کسی دل کے
فراموشکاریِ جاناں فغانِ رائیگاں تک ہے

...ں ناگوار تعقید ہے۔ دوسرے مصرع میں فراشکاریِ جاناں کی ترکیب بُری طرح کھٹکتی ہے)
...کے صفحہ ۴۸ پر وفا رامپوری کی غزل اسی زمین میں ہے اور خوب ہے)

...زل مطبوعہ اردوئے معلّٰی جلد (۱) شمارہ (۴) اکتوبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۸

مطلع ؎ گرفتارِ محبت ہوں اسیرِ دامِ محنت ہوں
میں رسوائے جہانِ آرزو یعنی کہ حسرت ہوں

...اردوئے معلّٰی میں اس غزل کے (۸) شعر چھپے تھے، دیوان میں صرف (۶) کو شامل کیا گیا ہے۔ غزل کے
...جو وضاحت کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اشعار کہیں زیادہ تھے۔ لکھتے ہیں کہ:

"مشاعرہ علی گڑھ کے بعد لوگوں کی ملامت بے جا سے تنگ آکر میں نے ایک غزل لکھی تھی جس میں کچھ دردِ دل کا اظہار تھا اور کچھ جوش کا، لازمی نتیجہ تعلّی ہوا کرتا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظۂ ناظرین کے لیے حاضر ہیں۔ پوری غزل کا شائع کرنا خلافِ مصلحت معلوم ہوتا ہے۔"

...جو (۲) اشعار شامل نہیں کیے گئے اس کی وجہ بھی غالباً تعلّی ہی ہے۔ اشعار یہ ہیں:

چوتھا شعر ؎ مری محرومیوں میں لطف ہے عیشِ دو عالم کا
میں رنجوری کا شیدا بے نیازِ بزمِ عشرت ہوں

چھٹا شعر ؎ کمالِ شاعری کو ناز ہے میرے تعلّق پر
میں نازک خیال، خوش بیاں، خوش طبیعت ہوں

...زل مطبوعہ اردوئے معلّٰی جلد (۱) شمارہ (۶) ڈسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۲

مطلع ؎ گریباں چاک ہیں گلہائے رنگیں صحنِ بستاں میں
قیامت کا اثر تھا نالہ ہائے عندلیباں میں

...اشعار میں سے (۵) دیوان کے لیے منتخب نہیں کیے گئے۔

دوسرا شعر ؎ بنایا ہے سراپا لطف شرمِ جورِ بے حد نے
نکلتا ہے عجب انداز اس شوخِ پشیماں میں

تیسرا شعر ؎ بڑھا جوشِ جنونِ شوق جوشِ سبزۂ گل سے
قیامت رنگ لائی آرزو فصلِ بہاراں سے

چوتھا شعر ؎ مبارک بادوی ناکامیِ جاوید اُلفت نے
بھرے گلہائے حسرت ہم نے دامانِ ارماں میں
چھٹا شعر ؎ کہاں تک بدگمانی، صلح ہوجائے تو بہتر ہے
ترے جورِ پشیماں میں، مری یاسِ پشیماں میں
بارھواں شعر ؎ ہماری آرزوئے یاس پرور بھی عجب شے ہے
اُمیدِ مرگ پہ جیتے ہیں ہم شب ہائے ہجراں میں

غزل مطبوعہ اُردوئے معلّٰی جلد (۲) شمارہ (۱) جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۴۸
مطلع ؎ بڑھ گئی ہے ان کے آجانے سے شانِ عید
آسماں پر ہے مزاج مرتبہ دانِ عید
یہ غزل دیوان حسرت حصہ اول میں نہیں ہے بلکہ ضمیمہ دیوان میں شامل ہے گویا حسرت کی نظ
نہیں ہے۔

غزل مطبوعہ اُردوئے معلّٰی جلد (۲) شمارہ (۲) فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۴۸
مطلع ؎ تھی راحتِ حیرت کی کس درجہ فراوانی
میں نے غمِ ہستی کی صورت بھی نہ پہچانی
اس کے حسب ذیل (۲) اشعار دیوان میں شامل نہیں کیے گئے۔
چوتھا شعر ؎ کافی ہے مجھے ظالم دانستہ ستم تیرا لطفِ کرم بے مدا نیا
ساتواں شعر ؎ شوقِ کرم باقی نے خوفِ ستم قائم اربابِ محبت کی اللہ

غزل مطبوعہ اُردوئے معلّٰی جلد (۲) شمارہ (۵) مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۵۲
چہرۂ یار سے نقاب اُٹھا
دل سے اک شورِ اضطراب اُٹھا
غزل کے (۲) اشعار مسترد کیے گئے۔
پانچواں شعر ؎ بے سبب ہوتے ہیں جو آپ خفا دلِ نازک سے یہ عت
(شوق قافیہ پیمائی میں عتاب لانا تھا لیکن عتاب اُٹھا خلاف محاورہ ہے)
آٹھواں شعر ؎ اس قیامت خرام کو یوں چھیڑ حشر اے جوشِ اف
(دو مصرعوں میں معنوی ربط نہیں ہے)

طبوعہ اُردوئے معلّٰی جلد (۳) شمارہ (۱) جولائی ۱۹۰۴ء صفحات ۵۱/۵۲

کسی عنواں صبر آتا نہیں مجھ ناشکیبا کو
الٰہی کیا کروں اس خاطرِ محوِ تمنّا کو

) اشعار میں سے (۳) دیوان کے لیے منتخب نہیں ہوئے۔

دوسرا شعر ؎ کرے ناحق نہ یوں بدنام میرے شوقِ رسوا کو
ذرا سمجھاؤ اپنے حُسنِ رسوائی تقاضہ کو

احق بدنام نہ کرو میں بیان کا عجیب سا تضاد ہے اور حُسنِ رسوائی تقاضہ حسرت کے مزاج سے
آتا)

چوتھا شعر ؎ فراقِ یار کی بیتابیاں بھی لطف رکھتی ہیں
گوارا کر دیا نسبت نے ان کی ناگوارا کو

سواں شعر ؎ کہے ناصح نہ پھر رنگینیٔ جنّت کے افسانے
کبھی گر دیکھ لے اس نازنیں کے روئے زیبا کو

شمارے کے صفحہ ۵۲ پر حسرت کی ایک اور غزل ہے جس کا مطلع ہے

؎ سُن چکے شکوے ملالِ خاطرِ ناشاد کے
ہم کہ خوگر ہیں سپاسِ لذّتِ بیداد کے

شعار پر مشتمل ہے اس کے (۴) شعر مسترد کر دیے گئے ہیں۔

تیسرا شعر ؎ نالۂ مُرغِ چمن کی ہائے رے ناکامیاں
طور ہیں اب تک وہی بے رحمیٔ صیّاد کے

چوتھا شعر ؎ التفاتِ خاص کہتے ہیں وہ اپنے جور کو
کیا نئی ایجاد ہے قربان اس ایجاد کے

آٹھواں شعر ؎ خلعتِ دیوانگی بخشا ہے شاہِ عشق نے
وقف ہیں لب ہائے غم شورِ مبارک باد کے

نواں شعر ؎ دیکھ کر شوقِ شہادت خاطرِ محروم کا
حوصلے شرما گئے بیدردیٔ جلّاد کے

طبوعہ اُردوئے معلّٰی، جلد (۳) شمارہ (۲) اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۴۴ پر جو غزل شائع ہوئی ہے وہ
یوان میں نہیں ہے۔ ممکن ہے سہواً شاملِ دیوان ہونے سے رہ گئی ہو۔ یہاں مکمل غزل نقل

کی جاتی ہے:

ہوش ہے عیش ہے نہ ذوقِ فراغ	دل ہے اور ایک ان کے عشق کا داغ
ہائے وہ لطف عہدِ ساقی کے	اب نہ مے ہے نہ شوق مے کا دماغ
یادِ یار آئی ہے پئے تسکیں	خانۂ یاس میں جلا ہے چراغ
میں ہلاکِ فریبِ الفت ہوں	یا پشیمانیٔ وفا کا داغ
ان کے غم کی ہیں کاوشیں بے سود	مل چکا دل میں خرّمی کا سراغ
دل کو ہے عہدِ آرزو کی یاد	مانتی ہے بہار، باغ کا باغ

ستم ان کا ہے ابتدائے کرم
کیوں نہ حسرت کا ہو فلک پہ دماغ

غزل مطبوعہ اُردوئے معلّیٰ جلد (۳) شمارہ (۳) ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴۰

ہجومِ بے کسی کو وجہِ لطفِ بے گراں پایا
کہ ہم نے آج اس نامہرباں کو مہرباں پایا

اس کا پانچواں شعر منسوخ کر دیا گیا ہے۔

عبث طعنہ زنی کی محتسب نے بادہ خواروں پر
کہ ضد سے اور انھیں گرویدۂ پیرِ مغاں پایا

غزل مطبوعہ اُردوئے معلّیٰ جلد (۱) شمارہ (۴) اکتوبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴۸

مطلع ہے
مے نوشیوں میں بے خبرِ دو جہاں رہے
ہم خوش رہے کہ بندۂ پیرِ مغاں رہے

غزل "برطرح مشاعرہ مارہرہ" کے عنوان کے تحت اس نوٹ کے ساتھ شائع کی گئی تھی:

"مولوی سید علی احسن صاحب احسن تخلص، تلمیذ رشید حضرت داغ دہلوی نے
کو مارہرہ میں ایک محفل مشاعرہ منعقد کی تھی جس میں نواح کے تمام مشہور شعرا جمع ہوئے تھے
طرح تھا "دنیا میں ہم رہیں نہ رہیں آسماں رہے"۔ مشاعرہ نہایت کامیابی کے ساتھ
حضرات مارہرہ میں سے مولوی مخدوم عالم صاحب اثر، احسن، طپش اور میر کی غزلیں خوب تھیں
مہمانوں میں قاضی عبدالصمد صاحب فصیح شاگرد حضرت امیر مینائی کی غزل لاجواب تھی۔
فتح گڑھ میں سے مولوی عبدالجلیل صاحب طوفان، ڈپٹی کلکٹر نے سہ غزلہ لکھا تھا جس میں ایک

غزل اسی ردیف و قافیہ میں بڑی خوبی کے ساتھ ہوا تھی۔ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب ذبیح نے ارباب مارہرہ کی شان میں ایک فارسی نظم بہت اچھی سنائی تھی۔ آپ کی اردو اور فارسی غزلیں بھی قابلِ تعریف تھیں۔ نیاز برادرِ حضرت ریاض اور حضرت رسا جلیسری کی غزلیں بھی اچھی تھیں۔ بانیِ مشاعرہ نے راقم الحروف کو بھی یاد فرمایا تھا۔ مندرجہ ذیل غزل نہایت عجلت میں ریل میں لکھی گئی تھی۔ اس کی جانب، مقطع میں اشارہ ہے اور حضرات کی غزلیں گلدستۂ فصیح الملک میں شائع ہوں گی اس وقت ان کا انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا۔"

مشاعرہ مارہرہ میں پڑھی جانے والی غزل کے (۱۶) اشعار اُردوئے معلّٰی کے مذکورہ شمارہ میں درج ہیں۔ دیوان حصہ اوّل میں یہ تین شعر نہیں ہیں۔

تیسرا شعر ؎　تا عمر ہم ستم زدۂ امتحاں رہے
اتنا بھی جب کسی سے کوئی بدگماں رہے

آٹھواں شعر ؎　سن لیجیو چمن کو بھی اک دن اُجڑ گیا
بلبل پہ گر یہی ستمِ باغباں رہے

دسواں شعر ؎　بےکار عمر زہد میں ہم لے گئے بسر
یعنی یہی کہ بندۂ سود و زیاں رہے

غزل کے دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں لفظی اختلاف بھی ہے۔

اُردوئے معلّٰی :　اس بدگماں کو ترکِ وفا کا گماں رہے
دیوانِ حصہ اوّل :　اس بے وفا کو ترکِ وفا کا گماں رہے

غزل مطبوعہ اُردوئے معلّٰی جلد (۵) شمارہ (۶) جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۴۷

مطلع ؎　یاد ہیں سارے وہ عیشِ بافراغت کے مزے
دل ابھی بھولا نہیں آغازِ الفت کے مزے

اُردوئے معلّٰی میں یہ غزل " دربیان آغازِ الفت " کے زیرِ عنوان چھپی تھی۔ اشعار قطعہ کی صورت میں مسلسل ہیں۔ حسرت کی مشہور غزلوں میں سے ایک ہے۔ دیوان حصہ اوّل میں اس کے صرف (۵) شعر ہیں (۳۱) اشعار انتخاب میں نہیں آیا۔

چھٹا شعر ؎　صحتیں لاکھوں مری بیماریِ غم پر نثار
جس میں اُٹھے بارہا اس کی عیادت کے مزے

ساتواں شعر ۔　شوقِ عرضِ آرزو کے وہ نرالے زمزمے
فکرِ مضموں ہائے عنوانِ کتابت کے مزے

آٹھواں شعر ۔　وہ زمانہ بھی غرض تھا کیا زمانہ لطف کا
مجھ کو جب حاصل تھے سارے عیش و عشرت کے مزے

مقطع ۔　لیکن حسرت اس تغافل کیش کی بیداد نے
بدلے سب محرومیوں سے وہ محبت کے مزے

اسی شمارہ کے صفحات ۴۷، ۴۸ پر ایک اور غزل بعنوان "ورادعائے ترکِ محبت" ہے جس کا مطلع ہے۔

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترکِ اُلفت پہ وہ کیونکر یاد آتے ہیں

اس غزل کا چوتھا شعر دیوان میں شامل نہیں ہے ۔

شکونِ خاطرِ ناکام کی تکلیف کیا کہیے
جنون و وحشت و فصاد و نشتر یاد آتے ہیں

غزل مطبوعہ اُردوئے معلّٰی جلد (۵) شمارہ (۳،۲) اگست و ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹۳

اُردوئے معلّٰی میں مطلع ہے ۔　گزر گئی حد سے کج اُدائی، عتابِ ترکِ کلام کب تک
رہے گی مسدود اے ستم گر رہِ پیام و سلام کب تک

یہ غزل ضمیمہ دیوان میں شامل ہے اور مطلع کے مصرعِ اولیٰ میں اس طرح لفظی ترمیم کی گئی ہے ع
گزر گئی حد سے پائمالی، عتابِ ترکِ کلام کب تک

ضمیمہ دیوان کا دوسرا شعر اردوئے معلّٰی میں نہیں چھپا۔ ضمیمہ کا تیسرا شعر اُردوئے معلّٰی کی غزل کا دوسرا شعر ہے
یہی بھی لفظی اختلاف ہے ۔

اُردوئے معلّٰی ع　مرید پیرِ جنوں ہوں آخر مجھے کیا خطرِ ملامتوں کا
ضمیمہ دیوان ع　مرید پیرِ مغاں ہوں آخر مجھے کیا خطرِ ملامتوں کا
(غالباً اُردوئے معلّٰی میں کتابت کی غلطی رہ گئی ہے)

غزل مطبوعہ اُردوئے معلّٰی جلد (۵) شمارہ (۶) دسمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵۰

مطلع ۔　کچھ عرضِ حال کرنے نہ پائے کسی سے ہم
کس طرح شکوہ سنج نہ ہوں بے خودی سے ہم

دیگر غزلیات کی نسبت اس غزل کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ ہر اس غزل میں جو اُردوئے معلّٰی میں

دیوان کی نسبت زیادہ اشعار ہیں لیکن اس میں دیوان سے کم اشعار ہیں۔ یہ غزل ضمیمہ دیوان میں (۱۲) اشعار پر مشتمل ہے جبکہ اُردوئے معلّٰی میں صرف (۷) شعر چھپے تھے۔ غزل مذکورہ شمارہ کے آخری صفحہ پر ہے ممکن ہے وہاں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے باقی شعر نہ دیے گئے ہوں۔ ضمیمہ دیوان کے اشعار ۱، ۲، ۴، ۵، ۶، ۸، ۹، ۱۱ اور مقطع اُردوئے معلّٰی میں چھپنے سے رہ گئے ہیں۔

گلدستہ فتنہ وعطر فتنہ میں آزاد غازی پوری کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے غالب کے بعض اشعار کی تراکیب پر بدگمانی کا اظہار کیا تھا۔ حسرت نے اُردوئے معلّٰی جلد (۱) شمارہ (۵) میں کلام غالب کے زیرِ عنوان اس کا جواب لکھا۔ اسی مضمون میں نون بالااعلان اور بلا اعلان کے محل استعمال سے بحث کی ہے جس کے ضمن میں بطور مثال اپنی ایک غزل دی ہے اس کا عنوان ہے "صلح شوق" اور مطلع ہے ؎

تمہید صلح شوق کے سامان ہو گئے
جتنے تھے ان کے جور سب احسان ہو گئے

"صلح شوق" (۶) اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ غزل دیوان حصہ دوم میں بغیر عنوان کے دی گئی ہے جس میں تیسرا شعر شامل نہیں ہے ؎

اللہ ری حُسنِ یار کی حسرت نوازیاں
پھر ربط وضبط کے وہی سامان ہو گئے

حسرت قیدِ فرنگ میں کے دوران بھی شعر کہتے رہتے حقیقت یہ ہے کہ ان کے کلام کا بہترین حصہ وہی ہے جو انھوں نے ایّام اسیری میں کہا ہے۔ دوسری اور تیسری گرفتاری کے دوران وہ اپنا کلام بیگم حسرت کے ذریعے اشاعت کے لیے بھجوایا کرتے تھے۔ ان کے اور بیگم حسرت کے جو خطوط شائع ہوئے ہیں ان میں غزلیات درج ہیں۔ ان کا مقابلہ مطبوعہ دیوان سے کرنے پر جو فرق پایا گیا وہ یہ ہے۔

دیوانِ حسرت حصہ دوم میں ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎

قوی دل، شادماں دل، پارسا دل
ترے عشق نے بھی پایا ہے کیا دل

حسرت نے یہ غزل ۱۳ر اپریل ۱۹۱۶ء کو للت پور میں کہی تھی جو بیگم حسرت کو بھجوائی گئی تھی اور انھوں نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام اپنے ایک خط مرقومہ ۱۴ر مئی ۱۹۱۶ء کو نقل کیا تھا۔ بیگم حسرت کی تحریر کے مطابق یہ دو غزلہ تھا۔ پہلی غزل کا مطلع ہے ؎

ڈرے کیا قہرِ دشمن سے بھلا دل
قوی ہے وعدہِ حق سے مرا دل

دوسری غزل کا مطلع وہی ہے جو دیوان میں درج ہے۔ پہلی غزل کے مطلع کو حذف کر کے اسے ایک غزل

قرار دیا گیا ہے۔ مطبوعہ دیوان میں اس کے صرف (۹) اشعار ہیں۔ ان اشعار کو مسترد کردیا گیا ہے۔

سہارا کیا نہیں کافی تمھارا ، نہ ڈھونڈے اب کسی کا آسرا دل

ترے دردِ محبت کی بدولت ، ہوا ہے منزلِ صدق و صفا دل

نہ مانوں گا نصیحت میں کسی کی ، کہ ناصح سب سے بہتر ہے مرا دل

پہلی غزل کے مقطع کو دیوان میں شامل رکھا گیا ہے اور دوسری غزل کا مقطع جو اس طرح تھا:

توانائے صداقت ہے تو حسرت ، نہ ہوگا پیروِ باطل ترا دل

اس کو بدل کر یوں کر دیا گیا ہے:

توانائے صداقت ہے تو ہرگز ، نہ ہوگا پیروِ باطل ترا دل

اسی غزل کا یہ شعر دیوان میں موجود ہے لیکن بیگم حسرت نے اپنے خط میں نہیں لکھا ہے:

نہ پہنچے گا کبھی کیا گوشِ گل تک ، قفس سے اڑ کے فریادِ عنا دل

دیوانِ حصہ دوم میں ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے ؎

وقفِ حق ہے، نہیں مریدِ مراد
طاعتِ عاشقانِ پاک نژاد

بیگم حسرت نے اس مطلع کو اپنے خط بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرقومہ ۱۲ر جون ۱۹۱۹ء میں یوں لکھا ہے ؎

وقفِ حق ہے، نہیں مریدِ مراد
مقصدِ عاشقانِ پاک نژاد

اسی غزل کے ایک اور شعر نے لفظی اختلاف ہے:

ان کی تھی میرے حالِ دل پہ نظر
اور میں ان کے حال پر تھا شاد

ان کی تھی میرے حالِ دل پہ نظر
آہ اس عہدِ التفات کی یاد

دیوان میں یہ شعر زائد ہے اور بیگم حسرت کے خط میں نہیں ہے

اب تو راہِ رضائے حق میں قدم ، رکھ دیا ہم نے ہر چہ بادا باد

اس مطالعہ کی روشنی میں میں یہ کہنے پر حق بجانب ہوں کہ کلیاتِ حسرت کی از سرِ نو ترتیب ضرور ہے جس میں نہ صرف ان کی نظموں کو شامل کرلیا جائے بلکہ ان کے منسوخ کلام کی بھی نشاندہی کی جائے۔

ج علوی
بۂ اردو
ہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

قصۂ عبرت و مُزیلِ وحشت

شفاء الدولہ حکیم سید افضل علی فیض آبادی کی منظوم خود نوشت" قصۂ عبرت و مزیل وحشت"
۔ قلمی نسخہ پروفیسر مسعود حسین رضوی ادیب کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔ جو
ی تختی کے ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ترقیمے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ
ر ۱۲۸۳ھ کو نقل کیا گیا۔ دراصل یہ منظوم خود نوشت افضل علی کی زندگی کے آغاز سے
کر انتزاع سلطنت اودھ تک کے واقعات کا عکس ہے۔ اس میں ان کے خاندان
کر والدین اور بھائی بہنوں کے ناموں کا تذکرہ اور فیض آباد سے لکھنؤ آنے کا حال نیز
م وغیرہ کا حال قلم بند کیا گیا ہے۔ خود نوشت مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ عام مثنویوں کی
اس کا آغاز بھی حمد سے ہوا ہے۔ پھر نعت منقبت علی الترتیب نظم کی گئی ہیں۔ اصل قصہ
ناز افضل علی نے " آغاز داستان عبرت نشان" کے باب سے کیا ہے۔

اصل افضل علی ہے میرا نام | ابن اکبر علی خلد مقام
رضوی رشتۂ سیادت ہے | یہ شرافت ہے یہ نجابت ہے
اور مولد ہے میرا فیض آباد | جس کو گردوں نے کر دیا برباد
کیا کہوں کیا مقام رکھتا تھا | بعد دہلی کے اس کا رتبہ تھا

مندرجہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل فیض آباد فیض آباد کو دہلی کے بعد
راور اہمیت کا حامل جانتے تھے۔ لیکن اس کے پائے تخت نہ ہونے کے سبب
کی زبوں حالی کا صدمہ بھی تھا۔
حکیم افضل علی اپنے بھائیوں اور والدین کا ذکر کرنے کے بعد اپنی ابتدائی تعلیم
بیت کا حال بیان کرتے ہیں۔ اصل قصہ فیض آباد سے لکھنؤ کا سفر اختیار کرنے سے
ہوتا ہے۔ اس سفر میں جن تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا اس کا کچھ اندازہ ان اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔

عنفوان شباب کا عالم | رنج و حسرت یہ اس میں وائے ستم
فی الحقیقت سفر ہے مثل سقر | چین پاتا نہیں ہے اس میں بشر[۱]

۱۔ عبرت و مزیل وحشت قلمی صفحہ ۲۶

ان اشعار سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان دنوں سفر کتنا مشکل تھا۔ لکھنؤ سے فیض آباد کی مسافت تقریباً ۸۰ میل ہے۔ اور یہ پچاسی میل کی مسافت چار دن میں طے ہوتی تھی۔ افضل علی نے یہ تحریر نہیں کیا کہ یہ سفر انھوں نے کس طرح کیا۔ اگر کسی سواری کا ذکر ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ کس سواری سے چار دن کی مسافت تھی۔ بہرکیف انھوں نے یہاں طب کی تعلیم پوری کی اسی اثنا میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور انھیں فیض آباد جانا پڑا۔

افضل علی نے خود نوشت میں شعوری طور پر اپنے عہد کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں جن سے اس عہد کے لکھنؤ اور بادشاہ وقت کے حالات سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ لکھنؤ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

حبذا کیا مقامِ رعنا تھا	فی الحقیقت کہ جانِ دنیا تھا
عشرت و عیش و فضل علم و ہنر	سب کے ارباب جمع تھے یکسر
لوگ اکثر رحیم و نیک صفات	خوش زباں، خوش مزاج و خوش عادات
ان دنوں تھے وہ شاہ خوش بنیا	مقبرہ جن کا ہے حسین آباد[1]

ان اشعار سے لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کی سیرت اور صفات پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھنؤ کے لوگوں کی رحمدلی و خوش مزاجی کے نقوش قاری کے دل میں اجاگر ہو جاتے ہیں۔ آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ جب افضل علی فیض آباد سے لکھنو آئے تو محمد علی شاہ اودھ کے حکمراں تھے۔ محمد علی شاہ کا عہد ۱۲۵۳ھ تا ۱۲۵۸ھ ہے۔ اس حساب سے افضل علی ۱۲۵۳ھ اور ۱۲۵۸ھ کے درمیان لکھنؤ آ گئے تھے۔ دوبارہ جب وہ فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو امجد علی شاہ بادشاہ ہو چکے تھے۔ امجد علی شاہ کی فیاضی علم دوستی اور اسلام کی طرف رغبت کا ذکر مثنوی کے اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ امجد علی شاہ منصف مزاج باشرع بادشاہ تھے۔ لیکن رجب علی بیگ سرور نے 'فسانۂ عبرت' میں اس دور کو اودھ کا تاریک دور کہا ہے۔ اور بڑی مذمت کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرور نے اپنی بے روزگاری اور دربار تک نارسائی کے سبب یہ بات تحریر کر دی ہے۔

امجد علی شاہ کے عہد میں افضل علی عملی زندگی میں داخل ہوئے۔ انھیں مدرسہ میں معلمی کی جگہ مل گئی۔ انھوں نے اپنی والدہ وغیرہ کو فیض آباد سے لکھنؤ بلوا لیا۔ اور لکھنؤ میں مقیم ہو گئے۔ اس کے بعد اس مثنوی میں وہ خاص واقعہ نظم کیا گیا ہے جو

---

[1] قصہ عبرت و منزلِ وحشت قلمی صفحہ ۲۶

کے قصے پن اور خود نوشت کے بیانیہ انداز کا امتزاج ہے۔ والدہ کے اصرار پر میر محمد تقی کی صاحبزادی سے ۲۲ر رمضان کو ان کا عقد نکاح ہو گیا۔ اسی درمیان تپ دق کے مرض میں ان کی خوشدامن راہی ملک عدم ہوئیں۔ دس ماہ بعد رخصتی ہوئی۔ شادی کے بعد انھیں اپنی بیوی سے از حد محبت ہو گئی۔ افضل علی نے اس محبت کا بیان بڑے مزے لے لے کے کیا ہے۔

بعد شادی کے چند مدت میں — لطف ملنے لگے محبت میں
روز افزوں میری محبت تھی — ان عفیفہ سے مجھ کو الفت تھی
رات دن شاد شاد رہتے تھے — کیسے باہم مراد رہتے تھے[۵۴]

لیکن فلک تفرقہ پرواز کو ان کی یہ شادکامی پسند نہ آئی۔ ان کی زوجہ کو سل ہو گیا اور اس نے اتنی شدت اختیار کی کہ سارے طبیب ناامید ہو گئے۔ مرتے وقت بیوی نے جو وصیت کی اس کا لب و لہجہ "زہر عشق" کی ماہ جبیں کی وصیت سے ملتا جلتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مثنوی نظم کرتے وقت افضل علی کے ذہن میں مثنوی زہر عشق کا انداز رہا ہو۔ وصیت نامے کے چند اشعار یہ ہیں۔

گزرے اس حال پر جو کچھ ایام — پھر بلا کر مجھے کیے یہ کلام
اس جہاں سے ہماری رحلت ہے — آپ سے اب ہماری رخصت ہے
مہر میں نے تمھیں معاف کیا — بخش دو تم جو ہو ہماری خطا
کچھ ہماری وصیتیں سن لو — اس پہ دیکھو ذرا عمل کیجیو
پہلی یہ ہے کہ ہے تمھیں معلوم — رہی اولاد سے بھی میں محروم
قبر پر ہو مری ضرور مکاں — اس میں مجلس کا ہو فقط ساماں
تم سلامت رہو جہان رہے — بے نشانوں کا کچھ نشان رہے
دوسری قبر پر مری آنا — فاتحہ پڑھ کے پھر چلے جانا
تیسری بھائی ہے سفر میں مرا — اس کو حق نے جو زندہ پہنچایا
میری جانب سے اس کو کرنا پیار — کہنا یہ کہہ گئی ہے وہ بیمار
بھائی بھولے ہمیں تم یکسر — مر گئی اشتیاق میں خواہر
اس کو بھی اپنے ساتھ لے آنا — قبر سے میری لا کے لپٹانا
چوتھے بعد از نماز خمسہ مدام — لینا میرا دعائے خیر میں نام
پانچویں جب ہو جاکنی کا یقین — پڑھیو تم آپ سورۂ یٰسین[۵۵]

---

[۵۴] مثنوی۔ صفحہ ۵۳
[۵۵] ایضاً صفحہ ۶۳

ان اشعار میں وہ سارے جذبات ہیں جو ایک عورت دم آخر سنانا چاہتی ہے
یہ وصیت خود نوشت نگار کی آپ بیتی کا جزو ہے لیکن اس میں وہ اثر آفرینی اور روا
نہیں جو زہر عشق کے ان اشعار میں ہے۔

آنسو چپکے سے دو بہا لینا	قبر میری گلے لگا لینا
اگر آجائے کچھ طبیعت پر	پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جانا	پھول تربت پہ دو چڑھا جانا
رو کے کرنا نہ اپنا حال زبوں	یوں نہ ہو جائے دشمنوں کو جنوں
دیکھئے کس طرح پڑے گی کل	سخت ہوتی ہے منزل اوّل
میری مرقد پہ روز آنا تم	فاتحہ سے نہ ہاتھ اٹھانا تم
ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے	مٹی دینا تم اپنے ہاتھوں سے
عمر بھر کون کسی کو روتا ہے	کون صاحب کسی کا ہوتا ہے[۵]

یہ عجیب اتفاق ہے کہ "زہر عشق" کا ہیرو زہر کھا کر غنودگی کے عالم میں اپنی معشوقہ ک
تنبیہ اور وصیت کی یاد دہانی کے سبب زندگی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ اور حکیم افضل علی
خواب میں بیوی کے اشارے پر پھر سے گھر بار آباد کرتے ہیں۔ ان دونوں قصوں
خارجی طور پر کوئی مماثلت نظر نہیں آتی۔ لیکن وصیت کے اشعار اور پھر دنیا د
کاروبار کی طرف مائل کرنے کے لیے دونوں میں مرحومین اشارہ کرتی ہیں۔ اس مماثل
کی بنا پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ مثنوی بھی شاید شاعر کی فکر رسا کا نتیجہ ہے۔ لیا
افضل علی نے اپنی خود نوشت میں حکومت اودھ کا انتزاع بادشاہ کا کلکتہ جانا اور دہا
کے حالات نظم کیے ہیں۔ جن کی وجہ سے اس کی سوانحی حیثیت مسلم ہے۔
اس خود نوشت میں واجد علی شاہ اختر کے حالات اور اس وقت کی سیاست
کچھ مدھم نقوش بھی پائے جاتے ہیں۔ افضل علی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے
واجد علی شاہ کے ملازمین میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ جن میں آپس کی چپقلش رہا کرتی
ایک گروہ کا خیال تھا کہ بادشاہ کو لندن نہ جانا چاہیے۔ اور دوسرا گروہ بادشاہ کو لندن لے جان
تھا۔ افضل علی پہلے گروہ کے حامی نظر آتے ہیں چنانچہ "سفر شوم بہ سوئے کلکتہ" کے عنوان کے تحت تحریر کرتے

دشمن نوجواں ہوا یہ پیسر	گھر چھڑانے کی اب ہوئی تدبیر
ملک جانے کے بعد قبضے سے	مشورت والے بھی مشیر ہوئے
نہیں رہنا یہاں کا اب بہتر	یہی مناسب ہے کہ جلد کیجیے سفر
چل کے لندن میں استغاثہ کرو	ملک اب پارلیمنٹ سے لو
الغرض جب یہ سب نے ٹھہرایا	تھا جو تقدیر میں وہ پیش آیا
ساتھ والوں پہ کوہ غم ٹوٹے	مع سلطان گھروں سے ہم چھوٹے

۵ زہر عشق۔ مرتبہ مجنوں گورکھپوری صفحہ نمبر ۱۱

ان اشعار میں دوسرا شعران لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کے کہنے سے واجد علی شاہ انگلینڈ جانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ 'مشورت والوں کا مشیر ہونا' ایک طنز ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ افضل علی ان لوگوں سے نالاں تھے۔ آخری شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لکھنؤ چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن بادشاہ کے ملازم تھے اس لیے جانا پڑا۔

افضل علی کی یہ منظوم خود نوشت مکمل نہیں ہے کیونکہ اس میں زندگی کے سارے ادوار بیان نہیں کیے گئے ہیں۔ خود نوشت نظم کی ہیئت میں ہے اس لیے باوجود بیانیہ انداز کے سراحت کا فقدان ہے۔ اس منظوم خود نوشت میں رمز وکنایہ، استعارے اور تشبیہات کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ اس کے برعکس روزمرہ اور محاورہ کا استعمال زیادہ ہے۔ مثنوی کی صنف چونکہ بیانیہ کے لیے موضوع ہے اس لیے افضل علی نے یہی صنف اپنائی ہے۔ لیکن ساقی نامہ سے آغاز داستان نہیں کرتے ہیں۔ یعنی وہ حقیقت کو داستانوی یا افسانوی رنگ نہیں دینا چاہتے۔ اس کے برعکس واجد علی شاہ نے اپنی منظوم خود نوشت میں "حزن اختر" میں مثنوی کے سارے لوازم کو برقرار رکھا ہے حمد، نعت، منقبت کے بعد مثنوی کے بیشتر ابواب کا آغاز ساقی نامہ سے ہوتا ہے۔ اور مثنوی مناجات پر ختم ہوتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ افضل علی نے اپنی خود نوشت صرف مثنوی کی ہیئت میں قلمبند کیا ہے اور مثنوی کے لوازمات سے قطعی سروکار نہیں رکھا۔

شٹیفان اندرس

جرمن سے ترجمہ: منیر الدین احمد
Deulsclhes Oriental Institute,
Mittelway 1502000,
Hambury 13,
WEST GERMANY.

آسمانی جوتے

(شٹیفان اندرس STEFAN ANDRES (۱۹۰۶ء - ۱۹۷۰ء) جرمن ادبیات کی تعلیم کولون، بیینا اور بر
کی یونی ورسٹیوں میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۰ء سے اپنی وفات تک اٹلی میں مقیم رہا۔ اس کا شما
جرمن ادب کے ممتاز ناول اور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے)

میں اپنی آدھی زندگی گزار چکا تھا اور ابھی تک نہیں جانتا تھا کہ جوتے آخر کل
کو پائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک روز میرا دونوں بوڑھی بہنوں جیز پیینا اور صوفیہ
ملنا ہوا اور یہاں پر مجھے جوتوں کے اصل مقصد کا پتہ چلا۔ پپتی اور صفی۔ اس نام سے و
پکاری جاتی تھیں۔ میرے پڑوس میں رہتی تھیں۔ وہ خستہ زینے سے نیچے گلی میں شوق سے اترا کرتی تھیں
وہاں پر بعض اوقات بچے کھیلتے تھے یا کوئی دوسرا جیسے قبرستان جانا ہوتا تھا، سلام کرتا ہو
گزرتا تھا۔ اس طرح وہ سیڑھی کے آخری زینے پر بیٹھی ہوتی تھیں، سفید بالوں او
بھورے رنگ سمیت، اور موسم کی ماری پتھریلی دیوار کی طرح، جس پر ان کے سل
پڑتے تھے۔ جھریوں سے اَٹی ہوئی، دھوپ کو سینکتے ہوئے اور اُون کو ساتھ کے سا
بٹتے ہوئے۔ اپنی پتلی کمروں کے گرد وہ اُسے باندھ لیتی تھیں اور اُس میں چرخی کو لٹکا د
تھیں، اور جب کہ ان کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں ریشے کی کھینچا تانی میں لگی ہوتی تھیں ا
ان کے داہنے ہاتھ لٹکتی ہوئی چرخی کو گھماتے جاتے تھے جب میں انھیں پچھلے پہر کی سا
میں وہاں پر بیٹھے ہوئے دیکھتا تھا، وقار کے ساتھ اور انگلیوں کی بجلی حرکت کے سا
بٹتے ہوئے، تو مجھے انسانوں کی وہ عظیم لہر یاد آجاتی تھی، جو یونان سے چل کر سسلی
پھیل گئی تھی۔ سیباری سے ہوتی ہوئی پائیستم اور وہاں سے پوزیتانو جا نکلی تھی۔ اور یہ دو
بوڑھی بہنیں چمکتے ہوئے چونے اور سایہ دار زیتون کے درختوں کے بیچوں بیچ مجھ پر ا
سرزمین کا راز کھولتی تھیں۔ محض اپنے وجود کے سبب وہ اس کم زرخیز مگر روشنی سے
ہوئی دھرتی کو ایک نام دینے کا باعث تھیں، ایسا نام جو اس بنجر سرزمین کو دنیا کی عظمت
مالا مال کر دیتا تھا۔: عظیم یونان! مگر پھر ہر بار وہی بات پیش آجاتی تھی۔ ان کے کپڑے
اپنے کھلنڈرانہ خوابوں سے بیدار کر دیتے تھے۔ وہ وہاں کی دوسری بے شمار غریب
عورتوں کی طرح اُترن کے کپڑے پہنے ہوتی تھیں: جنھیں ان کے رشتہ داروں نے نیو یا

ہوا ہوتا تھا۔ یہ کاک ٹیل اور شام کی محفلوں کے کپڑے بڈھے دبلے جسموں پر غیر ارادی
لگتے تھے، جب کہ پپی اور صفی گرمیوں اور سردیوں میں ننگے پانو گھومتی تھیں
مجھے علم نہ تھا کہ انھوں نے کبھی جوتے نہیں پہنے تھے۔ اس لیے میں ایک روز ان سے
پوچھا کہ ان کے رشتہ دار انھیں جوتے کیوں نہیں بھیجتے۔ صفی نے حیرت سے میری
دیکھا، اور فوراً جواب دیا ـــــ وہ پپی سے زیادہ تیز تھی ـــــ جوتے؟ اس کے لیے ابھی
وقت ہے۔ اس نے بائیں ہاتھ کو چرخی سے اٹھایا، اور ہوا میں دور ہٹانے کا اشارہ
پپی نے تائید میں سر کو ہلایا۔ مگر مجھے جوتوں کے بارے میں اب بھی پہلے سے زیادہ
نہیں سکا۔

پھر جب جنگ آئی اور چونکہ وہ کم ظرف ہے، اس نے نیویارک سے پرانے کپڑوں
کے پیکٹوں کا پوزیتا تو پہنچنا روک دیا، تو بے شمار بڈھے بالکل یا آدھے ننگے
گھومنے لگے۔ اور بوڑھی بہنوں کے برہنہ پیر میرے تجسس کو بیدار نہ کر پاتے تھے
جنگ نے اپنا کاؤنٹر بند کیا ہی تھا۔ کہ نیویارک میں پیکٹوں کے ڈاک خانے نے
کھڑکی کھول لی۔ اور سارا پوزیتا تو جنگ سے پہلے کے نیویارک کی سڑک نمبر خلاں
کپڑوں میں ملبوس گھومنے لگا۔ بوڑھی بہنوں کے گھر بھی ایک بڑا اباد بانوں کے کپڑے
ملا ہوا بنڈل پہنچا۔ اور وہ بھی ہماری اس وقت نو سالہ بیٹی کے کندھوں پر۔ یقیناً
میں دوسری کارآمد چیزوں کے علاوہ جوتے بھی ہوں گے، ہم نے سوچا۔ مگر جب میں
بوڑھی بہنوں کو اگلی بار اُن کے معمول کی جگہ پر نیچے سیڑھی پر پایا، تو وہ ہمیشہ کی طرح
پاتھیں مناسب اخلاقی فاصلے کو پاٹنے کے مصمم ارادے کے ساتھ میں نے پوچھا کہ
انھیں جوتے نہیں تھے؟

صفی نے سر کو اٹھایا اور اپنے تیز انداز میں جواب دیا "جوتے؟ یقیناً پیکٹ میں جوتے
تھے۔ یوں بھی اب وقت کا تقاضا تھا کہ جوتے آتے!" ضرور ـــــ پھر اگر جوتوں
کے آنے کا وقت آن ہی پہنچا تھا، تو وہ کیوں برہنہ پا بیٹھی تھیں؟ میں نے یہ بات نرم ہو پپی
تھا۔ اس نے مجھے قریب قریب وہی صفی والا جواب دیا، مگر ساتھ ہی ٹھنڈی سانس
کر اب جب کہ جوتے آ گئے تھے، وہ اطمینان کے ساتھ مر سکتی تھی۔

چونکہ میں جوتوں اور اطمینان کے ساتھ مرنے کے درمیان کوئی تعلق نہ سمجھ پایا تھا، اس
مزید سوال کرنے سے باز آ گیا۔ مجھے جوتوں کے اصل مقصد کا شاید کبھی پتا نہ چلتا
ہماری اس گفتگو کے تھوڑے دنوں بعد اچانک نہ مرجاتی۔ ہم نے صرف اس قدر سنا
وہ اپنے تاریک مکان کے پتھریلے زینے سے نیچے گر گئی تھی۔ ہم اس سے اگلے روز اپنی
جانے والی ہمسائی کے ہاں گئے جیسا کہ رسم ورواج کا تقاضا ہے۔ میں نے اس
جس سے صفی مسلسل میری طرف تکتی رہی تھی، محسوس کیا کہ وہ کوئی بات
چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے اپنے عزیزوں کو گھر بھیج دیا اور خود اس کے پاس بیٹھا

رہا۔ مرنے والی پیپی اپنے حیات کے دنوں کی طرح نرم روی سے اور کسی قدر بے
کی مسکراہٹ کے ساتھ سن رہی تھی۔

صفی نے اپنی بات کا سلسلہ کسی قدر آنسو بہانے اور انھیں پونچھنے کے
شروع کیا۔ پھر اس نے سرد آہ بھری، چند بار سینے کو کوٹا، ماڈونا (حضرت مریم)
اور بار بار پیپی سے معافی کی طلب گار ہوئی۔ اسے کسی کے سامنے اقرار کرنا چاہیے،
نے سرگوشی میں کہا، اپنے دل کو ہلکا کرنا چاہیے، پادری کے سامنے بولنے سے
ابھی بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ ایک روز اپنے گناہ کا اقرار (پادری کے سامنے) کرے
وہ اپنے اندر اس کی طاقت پائے گی۔ مگر پیپی بھی ہمیشہ کچھ ایسا فرشتہ نہ تھی، جیسی اب
صفی نے ایک اچٹتی ہوئی اور خاصی ملامت بھری نظر لاش پر ڈالی، ان کے درمیا
باتیں، بہت ساری، پیکٹ کے پہنچنے کے بعد وقوع میں آئیں۔ سب کچھ وہ نہیں
سکتی۔ پھر وہ غصے سے بھر گئی تھی۔ اور بستر پر لیٹ گئی تھی۔ اور پیپی سے کہا تھا
بیمار تھی۔ "میں اسے اپنی نوکرانی بنانا چاہتی تھی۔ اسے اپنے بستر کے گرد اگرد ایک
کی طرح نچانا چاہتی تھی۔ ہاں ہاں یہ میرا ارادہ تھا۔!"

جب میں نے اس سے سیدھے سیدھے پوچھ لیا کہ آخر وہ کس وجہ سے اپنی نر
کے خلاف اس قدر سنگ دل بن گئی تھی، تو اس نے مرنے والی کی طرف دیکھا اور
میں سر کو ہلایا۔ "نہیں، اس بات کا پیپی کو خود اقرارِ گناہ کرنا ہوگا۔" اس نے دل تھا
کہا۔ "میں آپ کو صرف وہ بات بتاؤں گی، جس کا ارتکاب مجھ سے ہوا۔" اس کی بنا
کے تیسرے یا چوتھے روز پیپی نے جان لیا کہ وہ بالکل بیمار نہ تھی۔ اور اس وجہ
کے لیے پانی کا گلاس لے کر نہ آئی۔ جس کے لیے اس نے اسے کہا تھا۔ زینے
باورچی خانہ دالا رستہ، پیپی نے کہا، کسی قدر تاریک تھا، اور اسے پتا نہیں تھا کہ
اور دیا سلائیاں کہاں دھری تھیں۔

اس پر صفی نے تحکمانہ انداز میں پکار کر کہا کہ وہ عمر میں بڑی تھی۔ وہ چھیا
کی تھی، جب کہ پیپی ابھی چوراسی سال کی تھی۔ اور اس نے کچھ اور بھی کہا تھا۔ مگر
اس کے کہ صفی اپنے اصلی الفاظ کو دوہراتی، جو واقعی میں گالی کے مترادف تھے، وہ کس
جھکی، احتیاط سے مرنے والی کی طرف نگاہ ڈالی اور پھسپھسائی "تو مر کیوں نہیں جا
تکی جو ں!"

انسان سمجھ سکتا ہے کہ نرم رو پیپی نے مزید پس و پیش نہیں کی، بلکہ دیوار کو
ہوئے فوراً نیچے کو چل دی۔ عین اس لمحے صفی نے ایک چیخ سنی۔ پیپی صرف "ماڈونا" کہہ
خاموشی چھا گئی۔

صفی نے کرتے کے پلو سے آنسو پونچھے، اپنی کرسی سے اٹھی اور پلنگ کی با
طرف گئی: "یہ دیکھیں!" اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا: "سینیور، یہ جوتے۔ اس

ں پہن رکھا تھا۔۔۔۔یہی اصل سبب تھا۔۔۔"

یں اٹھا اور صفی کے پہلو میں جا کر کھڑا ہوا۔ مرنے والی کے پاؤں پر جوتے چڑھے
ئے تھے۔ فیروزہ دار، روغن والے جوتے، کسی جشن یا ڈانس کی خاطر پہنے جانے والے۔
بڑے نخرے کے ساتھ ٹیڑھی بندھی ہوئی تھیں، نہیں شوخی دارانہ، ایڑیاں شراب
گلاسوں جتنی لمبی تھیں ــــ بالکل صفی سچ کہتی تھی : یہی اصل سبب تھا۔۔۔۔"

یں فوراً جان گیا۔ یہ جوتے نہ صرف پپی کے گرنے کا سبب بنے تھے، بلکہ دونوں بہنوں
رمیان جھگڑے کا بھی۔۔۔۔۔۔

"خوب صورت جوتے" میں نے کہا "اب مجھے اپنے جوتے بھی دکھاؤ۔"

ناک کے رستے اپنے آنسوؤں کو اوپر کھینچتے ہوئے صفی الماری کی طرف سرکتی ہوئی
در ایک سفید ڈبے کو میرے پاس لائی۔ وہ اس میں دھرے تھے ــــ ویسے ہی روغن
ئے ہوئے اور پٹی دار، ویسی ہی اونچی ایڑیوں والے ــــ مگر پپی کے سبک پھولوں کی
یلوں کے بالمقابل صفی کے بڈھیوں والے تھے۔ سلیقے دار اور بس سیدھے سیدھے نفیس۔
یں نے صفی کی عمر کے تقاضے کے سبب گدلی آنکھوں میں جھانکا اور کہا، "پٹی والے
یادہ پسند ہیں۔"

"او، مجھے بھی سینور" اس نے زور سے بات کاٹی اور ہونٹوں کو آگے کی طرف ڈھکیل

"مگر یہ کہ تم اس وجہ سے بستر میں لیٹ گئی تھیں اور اپنی بہن کو نوکرانی بنا لیا تھا۔"
نے سرزنش کے انداز میں سر کو ہلایا۔

صفی تھوڑی دیر تک روتی رہی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بالآخر اس معاملے پر روشنی
اور ایک حد تک الزام سے اپنی بریت کا پکا ارادہ کر لیا تھا۔

"جی ہاں، سینیور" اس نے کہنا شروع کیا۔ "میں نے پپی پر ظلم کیا۔ مگر اس نے مجھ
ظلم کیا تھا۔ جب ہم نے جوتوں کا پیکٹ کھولا، تو وہ اس خوب صورت جوڑے کو، جو
نے پہن رکھے ہیں، لے کر کمرے کے کونے میں، ادھر بھاگ گئی اور بار بار کہتی جاتی
یہ میرے ہیں، اِلتورے نے انھیں میرے لیے بھیجا ہے۔" مگر اِلتورے کے خط میں
بالکل نہیں لکھی تھی کہ یہ جوتے کس کے لیے ہیں۔ آپ کی بیٹی نے سینیور، التورے
کو ہمیں دو بار پڑھ کر سنایا تھا۔ مگر اس بات کا اس میں بالکل ذکر نہیں تھا، بالکل
"بہت خوب بہن" اس پر میں نے کہا۔ "جوتے نہ تو تمھیں ملیں گے اور نہ مجھے
ہم میں سے پہلے مرے گا، وہ اسے ملیں گے۔" کیا یہ بات منصفانہ نہ تھی، سینیور؟
ہا نے اس پر مجھے کیا کہا۔ "ہوں، میں تمھیں جانتی ہوں، اگر میں مر گئی، تو تم مجھے
جوڑا پہنا دو گی۔" سینیور، میں غصے کے مارے بیمار پڑ گئی اور بستر میں جا لیٹی۔ سچ مچ
محسوس کرتی ہوں۔ میں واقعی میں کس قدر بیمار تھی۔ اور پپی کیا کرتی ہے؟ میری

آنکھوں کے سامنے جوتے پہن لیتی ہے، اور میرے بستر کے گرد چلتی پھرتی ہے۔ میں کیا
ہوں، چلنا؟ وہ لنگڑاتی ہے، کسی لنگڑی مرغی کی طرح۔ جوتے اس کو بہت چھوٹے
مجھے وہ بالکل پورے آتے۔ اور جب میں نے اُسے یہ بات کہی، تو وہ چلائی ــــ کوئی
ہماری بھلی مانس پپی سے اس کی توقع نہ رکھ سکتا تھا ــــ "خنزیر کے پائے" اس نے
سے کہا۔ "ماڈونا اس شخص کو لگا دے، جو مجھ سے ان جوتوں کو چھینتا ہے"! میں قسم کھا سکتا
کہ پپی نے یہ بات کہی تھی ــــ یا نہیں، کیا تم نے یہ نہیں کہا تھا"؟

صفی نے یہ سوال، جو اس نے جھجکتے ہوئے اور روندھی ہوئی آواز میں کیا
کو مخاطب کر کے کہا۔" میں جانتی ہوں کہ میں نے اُسے بچایا" صفی نے بات کو جاری
مگر سینیور، اگر اس نے ان جوتوں کو کبھی اتارا ہوتا، کم از کم شام کے وقت یا رات کو
آخر کون جوتوں سمیت بستر میں لیٹتا ہے ــــ تو کیا وہ زینے سے گر سکتی تھی؟"

میں نے اس سے اتفاق کیا، مگر اسے یاد دلایا کہ پپی دونوں میں سے چھوٹی
یہ کہ چھوٹی بہن کا خوب صورت جوتوں پر حق بنتا تھا۔

پپی کے دفنائے جانے کے بعد رشتہ داروں کی تاریک گود میں سے ایک بھتیجا
ہے۔ اور بغیر اس کے کہ وہ صفی سے پوچھے، اپنے لمبے چوڑے خاندان کے ساتھ مکان کے
میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اسے فیصلہ کن رنگ میں یہ کہتے ہوئے کہ ایک لاچار پھوپھی کو اکیلا
اس کی ناموس کے خلاف تھا۔ صفی نے میری بیٹی کو سڑک پر روکا اور اسے سرگوشی
کہ یہ بھتیجا ایک مکار بھیڑیا تھا۔ وہ صرف اس کے مرنے کے انتظار میں تھا تاکہ اس
پر، گددوں، فرنیچر اور دیگچیوں پر قبضہ کر لے۔ مگر یہ تو کچھ بھی نہیں، وہ بکی کے کان کی
جھکی اور سرگوشی میں کہا: "بیاٹریس، وہ میرے جوتے اپنی بیوی کے لیے حاصل کرنا
ہے۔ اور میں ــــ میں جنت کے دروازے پر ننگے پانو کھڑی ہوں گی!"

بیاٹریس نے اپنے ماں باپ کو بلکہ پادری کو بھی صفی کی پریشانی کا شریک راز بنا
کا کہنا تھا کہ اہم ترین امر بڑھی سے بات کرنا تھا، جو ایک روز صفی کو تابوت میں لٹائے
پر ہر بات کا انحصار تھا۔ اسے تابوت کو اتنی دیر تک نہیں بند کرنا چاہیے، جب تک
شاندار جوتے نہیں پہن لیتی۔

ایک روز صفی ہمارے باغ میں دروازے کے سامنے بیٹھی تھی۔ اور دستک د
تھی۔ جب ہم سب آ گئے اور اس کے گرد کھڑے تھے، تو اس نے شرم کے مارے
مُنہ پر رکھتے ہوئے بیان کیا کہ ڈاکو اس کے جوتے چوری کر کے لے گئے تھے:
کے علاوہ کچھ ہمارے پلے نہ پڑا تھا اور "جوتے"

ہم نے تجویز پیش کی الوارے کو لکھنے کی۔ یقیناً جلد نئے جوتے آجائیں گے،
جوتوں سے بھی بڑھیا۔ اس پر اس نے ہاتھ کو منہ کے سامنے سے ہٹا لیا اور خوفزدہ
پکاری" اور اگر میں کل مر جاؤں؟ یا پرسوں؟ جوتوں کے بغیر، تو میں کیسی کھڑی ہوں گی

ہیں ان کے بغیر تو نہیں ہے۔" اس کی آواز اس قابل شرم صورت حال کے پیش نظر جو اب
جس میں وہ اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی : بستر مرگ پر برہنہ پا اور پھر سب سے بڑھ کر
کے دروازے پر !

ہم نے فوراً پادری سے مشورہ کیا۔ غریب بڑھیا کے جوتوں کو اس کی اگلے اتوار کی
ہونی چرچ سروس میں اس قدر جلتی چمک دمک اور چور کے فعل کو اتنی جہنم کی کالک
اگلی صبح ہی جوتے صفی کے کمرے کے باہر دھرے ہوئے تھے۔ اسی سوموار کے روز صفی
مارے ہاں نعل پوش مانگنے کے لیے آئی۔ بیاٹریس ان کے ساتھ گئی اور اسے جوتے
میں مدد گار بنی۔ اب وقت آگیا تھا اس کے لیے جوتے پہننے کا۔ صفی نے کہا: "اور میں انھیں
رہوں گی۔ پھر مجھے اطمینان رہے گا۔" وہ چالاکی سے مسکرائی: "کیونکہ یہ نیچے والے
دگرنہ بعد میں کہیں گے، میرے پاؤں چھوٹے ہوئے تھے اور وہ مجھے پہنا نہ سکے تھے۔"
کھنچے ہوئے چہرے کے ساتھ اس پر اس نے ایک قدم اٹھانے کی جرأت کی اور
کراہت کے ساتھ دوسرا۔ "جنت میں" اس نے کہا اور مسکرانے کی کوشش کی،
نہیں چبھیں گے"

تھوڑے دنوں کے بعد بیاٹریس نے بڑھئی کو ایک تابوت لیے ہوئے قدمی بھورے
ن میں جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ فوراً اس کے ساتھ چل دی اور بعد میں ہمیں صفی
پاس بلا لائی۔ بڑھیا تابوت میں پڑی تھی اور اسی انداز میں مسکرا رہی تھی، جیسے اس
ان جوتے چمک رہے تھے اور بیاٹریس نے بڑھئی کے کان میں کچھ کہا اس نے سر
ثبات میں ہلایا اور تابوت کے ڈھکنے کو اٹھایا اور اس کی تصدیق کی: "تمھاری بات
ت ہے۔ پادری نے بھی مجھے کہا تھا۔ ہم تابوت کو ابھی بند کر دیتے ہیں!"

ہم سب صفی کی گہری تائید میں مسکرا دیے اور مجھے بالآخر پتا چل گیا کہ جوتے کاہے
رے جاتے ہیں۔ ●●

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(خطوط نگار کی راے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

تازہ شمارہ میں گوشہ خلیق انجم پسند آیا وہ علم و ادب کے مخلص خادم ہیں اور انھوں نے بڑی پائیدار تصانیف و تالیف سے اردو کو مالا مال کیا ہے مضامین بھی خلوص اور لیاقت سے لکھے گئے

فن تاریخ گوئی پر حسینی جاوید صاحب کا مضمون دیکھا۔ ان کا فرمانا بجا ہے کہ اب اس نو ذوق کم ہوگیا ہے۔ پھر بھی کچھ توجہ اسے ملتی رہی ہے۔ پاکستان میں شوکت الٰہ آبادی صاحب تاریخ گویوں کی رہنمائی کے لیے "معلومات تواریخ" شائع کی ہے۔ ڈاکٹر خالد حسن قادری (لندن) مولانا حامد حسن قادری کی تواریخ کا ایک ضخیم مجموعہ اپنے فاضلانہ مقدمہ (بزبان انگریزی) کے ساتھ شائع کیا ہے۔ جس میں خود بھی دادِ تاریخ گوئی دی ہے۔ کتاب کے عنوان سے لے کر تحتی عنوانات تک جو انگریزی عبارتیں بھی اردو رسم الخط میں تحریر کی گئیں، تاریخ کی حامل ہیں۔

یادش بخیر حفیظ ہوشیار پوری بھی تاریخ گوئی کے ماہر تھے۔ لیاقت علی خاں مرحوم کی شہادت پر اقبال کے مصرع سے تاریخ برآمد کی تھی۔ "صلہ شہید کیا ہے تب و تاب جاودانہ"۔ میں نے حفیظ کی تاریخِ وفات میں اس کی رعایت رکھی تھی "سالِ ادالورخ حفیظ" (۱۹۷۳)

مجھے خود بھی تاریخ گوئی سے دلچسپی رہی ہے۔ گو اس کی دُھن کبھی نہیں رہی۔ بہت ہی تھوڑا سب سے کم وقت اسے دیا ہے۔ پھر بھی سیکڑوں تاریخیں ہوگئیں۔ چند برس پہلے رسالہ اردو انجمن ترقی اردو پاکستان نے میرے ساٹھ منتخب قطعات تاریخی شائع کیے تھے جو سب کے سب دنیا کے سانحات سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد میں ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری نے انھیں ایک کتاب کی شکل دے دی تھی۔ اس کے بعد سے بچھڑنے والوں کے اور بہت سی تاریخیں کہلوادی چند بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔ تاریخ کے لیے شرط یہ ہے کہ جس کے لیے کہی گئی اسی پر چسپاں ہو اول تین تاریخیں وہ ہیں جو رسالہ اردو کے انتخاب سے رہ گئی تھیں۔

تلوک چند محروم:-

(۱) رفت در عینِ مفسدہؑ از ہند — شاعرِ باصفا و نیک نہاد
سالِ او ہم بغیرِ اب خوانید — غم محروم والدِ آزاد

۶۵ کی جنگ ۳-۱۳۸۸ — ۳-۱۳۸۸=۱۳۸۵ھ

شاہد احمد دہلوی:

از نشانِ شاہد و ساقی مپرس — او برفت ایں نیز ہم باقی نماند
آں بساطِ نغز و نغمہ افتاد — دورِ مہر و عہدِ مشتاقی نماند

کونٹان شاہد و ساقی "زبس (۱۳۸۷ء) آں قدح بشکست وآں ساقی نماندہ
مٔے ماہر موسیقی بھی تھے۔

"وجد بھی اب گم گیا آتی ہیں یادیں کئی
عہد جوانی کا دوست وجد سکندر علی" ۱۴۰۳ھ
مٔے ضرورت عددی

ید عبداللہ

گئے وہ سید عالی صفات مرزا نیش — نہ جانے مٹ بھی سکے گی کبھی یہ دل کی خلش
ادب کتنے نشانہ بنے ہیں اب کی بار — قضا نے جیسے کہ خالی ہی کر دیا ترکش
اک آہ زیر لب اے دل بیاد عبداللہ — امیر مجلس اردو منارۂ دانش

(۱۴۰۶ھ)

یال اہلیہ آغا شاعر قزلباس

اٹھ گئیں بیگم مخدومۂ آغا شاعر — سوگوار آج ہے پھر دودۂ آغا شاعر
ان کے دم سے ہی یہ شیرازہ رہا تھا مربوط — سر پہ مدت سے نہ تھا سایۂ آغا شاعر
یاد ہے حضرت شاعر کی ادب میں محفوظ — نام ان کا بھی ہے ہم رشتۂ آغا شاعر
باادب نام لو ان کا تو یہی ہے تاریخ — "بانوے نورجہاں زوجۂ آغا شاعر

۱۹۷۸+۷=۱۹۸۵ء

احسن:

اٹھ گیا وہ جفا کشوں کا رفیق — ایک آنسو اے چشم بے توفیق
مخلص بے ریا و محنت کوش — بار بے خار، بردبار، خلیق
جیتے جی وہ رہا فنا فی الجہد — ہمہ تن مقصدِ دلی میں غریق
آدم بے نظیر سبط حسن — "راحل راسخ و رفیق شفیق"

(۱۴۰۶ھ) (۱۹۸۶ء)

یر نقوش:

یا سخت سانحہ ہے محمد طفیل کا — دل پر رہے گا داغ یہ مدت تلک ہرا
نیاز وہ جریدہ نگاری میں طاق تھا — سیرت کے باب میں بڑا کام کر گیا
محکم شد از طفیل محمد مقام او
ثبت است بر جریدہ عالم دوام او"

۱۹۸۶

مار حسین:

تھا اپنا رفیق دل بند — کس قدر ہم سے سبک پا نکلا
ذات سر حقیقت کی تلاش — شوق میں سوئے عدم جا نکلا

نورِ دانش سے تھا لبریز جو دل ایک ٹوٹا ہوا تارا نکلا
سالِ غم دل سے بشکلِ نالہ وادل و دانشِ آغا" نکلا

۱؎ مابعد الطبیعیات سے خاص شفقت رکھتے تھے۔ دل کے دورے سے انتقال

قدرت اللہ شہاب :-

اک دیا اور بجھ گیا اے وائے اک ادیب اور اٹھ گیا اے وائے
کہیے "اے وائے قدرت اللہ شہاب (۱۹۸۶) حیف صد حیف یا خدا اے وائے

۱؎ "یا خدا" ان کے افسانوں کا مجموعہ۔

دیگر: آں شرارے کہ از نظر گم شد جو وتش پر نجوم غالب بود
سالِ انجامش ایں کہ "مہرِ شہاب (۱۹۸۶) گرچہ ثابت نبود تا تب بود

پروفیسر مشیر الحق :

کہیے اک بے وجہ جفا ہے، حد ہے، غضب ہے
لکھیے "قتل مشیر الحق، صد آہ، عجب ہے ۱۴۱۰ھ

صادق الخیری :

ہو رہے ہیں پے در پے سانحات درد انگیز کتنی حشر ساماں ہے وقت کی سبک سیری
سال نو نے آتے ہی داغ اک نیا بخشا جانے اہلِ دانش کا کیوں ہے ہر برس بیری
ہو گئے فسانہ خود رہ گئی زمانے میں یاد صادق الخیری" ابن راشد الخیری"

مجتبیٰ حسین :

حیرت ہی کیا بسا طارب پر ہے جو خوں
اک کربلا سی چار طرف ہے، بلا حسین رضہ
مرگِ رئیس و مسٹر خیری کے ساتھ ساتھ
ہے حدِ قہر حادثہ مجتبیٰ حسین رضہ

موٹر کے حادثے میں انتقال ہوا۔

ظ انصاری :

کیسے کیسے گل ہوئے روشن چراغ پوچھو مت کیا کیا جو ہر ہم نے کھوئے
اب یہی دل کا مقدر بن گیا اس پہ واویلا کرے اور اس پہ روئے
اب یہی آنکھوں کی خدمت رہ گئی ایک کے بعد ایک داغ دل کو دھوئے
ظ انصاری ادیب باکمال ناطق نکتہ طراز و نغز گو سے
اپنی باری بھر کے وہ بھی چل دیے بادۂ ہستی سے جھک کر وہ بھی سوئے
مدتوں اردو بھرے گی ان کا دم اس کے دامن میں ہیں گل بوٹے دلـ
گرمی دل عین عقلیت کے ساتھ فکر و فن اس طرح تھے ان میں سموئے
زندہ محفل میں رہی اک ان کی یاد (۱۹۹۱ء) واقعہ ہے ہو گئے افسانہ

مجنوں گورکھپوری

ساز صد رنگ تھا خاموش ہوا یوں صد حیف
اب فسانہ ہے وہ گفتار کا افسوں صد حیف
لطف صحبت وہ کہاں کیف ملاقات وہ کہاں
خم ہی اب پیر مغاں نے کیا واژوں صد حیف
یک بیک چل دیا اعیان قرابت کی طرف
وہ کہ تھا علم و فضیلت کا فلاطون صد حیف
گو حضوری نہ ہو امید ملاقات تو تھی
جاؤں ساحل پہ تو دریا کو نہ پاؤں صد حیف
لفظ "حضرت" بھی ہے تاریخ مگر یوں کہیے
سنہ سانحہ حضرت مجنوں صد حیف
۱۹۸۸ء

بیت اور قطعات کے علاوہ بعض قطعات زیادہ طویل ہیں انھیں طوالت کی وجہ سے
راز کر دیا۔

شان الحق حقی ڈیفنس سوسائٹی کراچی

چند برسوں سے میگزین میں گوشۂ اقبال، گوشۂ فیض، فراق، جذبی، سردار جعفری
ایک اچھی اور دل آویز روایت قائم کی جا رہی ہے۔ اقبال کے شاعری کے عہد میں
شعرا میں چار نام اُبھرے جنھیں داغ کے بعد غزل کے چار ستون کا نام دیا گیا حسرت
اصغر اور جگر۔ حسرت نے فرسودہ روایات سے انحراف کیا، فانی نے غم و الم کو زندگی
اور قابل برداشت جزو ثابت کرنا چاہا۔ جگر نے حسن و عشق کی نغمہ سرائی کچھ ایسے انداز میں کی کہ
عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئی۔ جگر جیسی عوامی مقبولیت شاید ہی کسی کو حاصل ہوئی ہو
بہار سیرو نے اصغر کی شاعری کو حسن تخیل اور حسن بیان کا بہترین مجموعہ بتلایا اور
جو بلندی اور وقار اصغر کے کلام میں ہے۔ وہی ان کی روزمرہ کی زندگی میں ہے
ابوالکلام آزاد نے سرود زندگی پر اپنی تقریظ میں تحریر فرمایا کہ میں وقت کے
مذاق سے اس اندازِ کلام کا متوقع نہ تھا۔ میں نے اصغر صاحب کے کلام کو دیکھ کر محسوس
ان کی عام مایوسیاں متشنیات سے خالی نہیں۔ اصغر کے چند شعر دیکھیے :-

انداز ہیں خوب اس میں سب شمع شبستاں کے
اک حسن کی دنیا ہے خاکستر پروانہ

رند جو ظرف اُٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ ہے

مدت ہوئی کہ چشم تحیر کو ہے سکوت
اب جنبشِ نظر میں کوئی داستاں نہیں

بارِ الم اٹھایا رنگ نشاط دیکھا
آئے نہیں ہیں یوں ہی انداز بے حسی کے

ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگ جاں بنا دیا

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

سرمستیوں میں شیشۂ مے لے کے ہاتھ میں
اتنا اچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے

شاید مرے سوا کوئی اس کو سمجھ سکے
وہ ربط خاص رنجشِ بےجا کہیں جسے

اگر خموش رہوں میں تو تو ہی سب کچھ ہے
جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود

ماؤزے تنگ سے کسی نے پوچھا رومانٹک شاعری سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے! ماؤ نے جواب دیا گلدستوں کی بھی اہمیت ہے، ہم پھولوں کے باغ بھی لگا ... ترقی پسند ادب کی تحریک کے دور عروج میں پندرہ بیس برس اصغر کی شاعری پر شاید ہی کوئی مضمون لکھا گیا ہو۔ میں نے پروفیسر آل احمد سرور سے اصغر پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ انھوں نے جواب میں فرمایا کہ ایک مضمون لکھا تھا اور جامعہ اشاعت کے لیے بھیجا تھا، خدا معلوم وہ کہاں غائب ہو گیا! اب جدیدیت کا دور۔ سردار جعفری اسے ترقی پسندی کی توسیع بتلاتے ہیں۔ ہندو پاک کے بعض اہم ... جدیدیت کو ذاتی کرب کا اظہار اور ایسی شاعری قرار دیتے ہیں جس میں کوئی پیام نہ ... ابہام جدیدیت کا خاص عنصر سمجھا جاتا ہے۔ بے شک اختر الایمان کبھی جدیدیت ... معماروں میں نہیں لیکن ان کی بعض نظمیں بعض نظموں کے ٹکڑے اتنے خوبصورت دل پذیر ہیں کہ جی چاہتا ہے شاعر کا منہ چوم لیجیے لیکن بیشتر جدیدیت کی نمائندہ

...وقت محسوس ہوتا ہے جیسے ریت پر چل رہے ہیں۔ کاش چالیس پینتالیس برس
...صاحب فکر و نظر کتاب نما میں اصغر پر سیر حاصل مضمون شامل کر کے موجودہ دور میں
...شاعری کی قدر و قیمت کا تعین فرمائیں یوں سرور صاحب کے مضمون کی تلافی بھی
...ہو جائے گی۔

کاش کتاب نما میں انگریزی شاعری کے مختلف دور ہر دور کے ممتاز شاعر ان
...سوانحیات اور انتخاب کلام کو ترجمے کے ذریعے عام ادب دوستوں کی ذہنی تربیت کا
کام کوئی صاحب نظر انجام دیں۔

اردو کو اپنی مادری زبان کہنے والوں کی تعداد کسی طور پر بھی ہندستان میں بیس
...سے ... گی۔ اعلا تعلیم کو بہتر بنانے کی بھی سعی جاری ہیں۔ لیکن انیس کروڑ سے
...دیہاتوں اور شہروں میں بسے ہوئے ہیں وہ ابتدائی خواندگی سے بھی محروم ہیں، کسی
زبان میں پوسٹ ... لکھنے پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اپنے حقوق اور فرائض
...کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انھیں جو ورغلا کر، جوش دلا کر مذہب اور سیاست، قوم اور
...کے نام پر مرنے مارنے پر آسانی سے راضی کیا جا سکتا ہے لیکن اس ایکتا تک عدم ... بھی
کوئی ایک تحریک کی بنیاد نہیں ڈالی جا سکی جس میں امریکن پیس کور کے نہج پر پڑھے
...خوشحال مرد اور خواتین سال دو برس ایمرجنسی کی سطح پر ابتدائی تعلیم پھیلا سکیں اور
...کار حاصل کرنے کی ٹریننگ دی جا سکے ... بیس کروڑ جاہل اور مفلس قوموں کو
...دے کر ان کی صلاحیتوں کو ابھارا جا سکے تو اس میں سائنس داں، فورڈ، ٹاٹا
...فیض و فراق جیسے ذہن ابھر سکتے ہیں۔ بانس تراش کر ہم بانسری تیار کرتے
...کر نادر مجسمے، سادے کینوس پہ جنبش برش سے حسین کی تصاویر پندرہ لاکھ روپیہ
...کرتی ہیں۔ بیس کروڑ اردو کو مادری زبان بولنے والوں کو ۱۹۹۱ میں دستخط کرنا
...یہ کیسی ستم ظریفی ہے؟ دوسری جنگ عظیم نے روس، جرمنی، فرانس، جاپان اور یہودیوں
...کر دیا تھا، انھوں نے سب سے زیادہ اہمیت تعلیم کو دی یہ سب آج سپر پاور
... فراق کا شعر ہے ؎

تقدیر تو قوموں کی ہوا کرتی ہے
فرد کی تقدیر کوئی تقدیر نہیں

کاش میری آرزو شاہد علی خاں صاحب کے دل کو چھو سکے۔ جو کام ہم آٹھ سو برس
نہیں کر سکے دو برس میں اس داغ کو دھو کر دکھلا سکیں۔

خود اپنے ہی سوز باطنی سے نکال اک شمع غیر فانی
چراغ دیر و حرم تو اے دل جلا کریں گے بجھا کریں گے (جگر)

جنید احمد (بمبئی)

دلچسپ اور معیاری تحریروں کے ساتھ اگست کا "کتاب نما" موصول ہوا۔ یہاں پاکستان:
"کتاب نما" کی حیثیت ہم لوگوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں، جس سے ہر ماہ مستفیض ہو۔
موقع ملتا ہے۔ اس کرم فرمائی کے لیے، دل سے آپ کے لیے دعا نکلتی ہے۔

ڈاکٹر رفیعہ شبنم نے اپنے مضمون "رقصہ ابراہیم و اسماعیل کلام اقبال کے آئینے میں" اقبالیات
ایک نسبتاً نئے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے موضوع کے جملہ پہلوؤں کو سامنے لانے کی
خاصی کاوش کی ہے، جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس مضمون میں ص ۴۴ پر اقبال کا ایک
مصرع خوفناک حد تک غلط چھپا ہے۔

اس طرح : ع غلامی سے بہتر ہے بے یقینی

اس سے مفہوم بالکل الٹ ہو گیا ہے۔ "بہتر" کے بجائے "بدتر" ہونا چاہیے۔

علی جواد زیدی صاحب نے اشاریے میں تخلیق کار، اور ناقد کے باہمی رشتے اور تعلق پر خوب
سے اظہار خیال کیا ہے۔ آخری پیراگراف خصوصیت سے، ہم سب کے لیے قابل توجہ اور لمحہ فکریہ

شمارہ ماقبل کا ایک حصہ "گوشۂ خلیق انجم" پر مشتمل تھا۔ حبیب خاں صاحب نے اسے اس ڈھ
اور مہارت سے مرتب کیا ہے کہ اس سے خلیق انجم صاحب کی شخصیت کے بہت سے یا بیشتر پہلو سا
آ گئے ہیں (سارے تو نہیں، شاید وہ ممکن بھی نہیں) ۔ یہ ان کی بہت دل آویز تصویر ہے۔
ان سے کئی بار دلی اور لاہور میں بھی، ملنے کی مسرت حاصل ہوئی، مگر "کتاب نما" کے ذریعے،
کی شخصیت اور صلاحیتوں کے ایسے پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہوئی، جس سے دل میں ان کی قدر،
گئی۔ اردو زبان و ادب کی ترقی اور انجمن ترقی اردو ہند کی تجدید و احیائے نو کے لیے ان
خدمات لائق ستائش اور ناقابل فراموش ہیں۔

رفیع الدین ہاشمی، پنجاب یونی ورسٹی، اورنٹیل کالج۔ لاہور

تازہ شمارہ ملا۔ میزبانی کا شکریہ!

کتابت کی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی تصحیح ضروری معلوم ہوتی ہے۔

ص ۳ س ۶۔ کا دیہ میالنسا کے، پہلے درست کریں

" " س ۱۱۔ محاسن و معائب، ہے، محاسن و محاسب، نہیں۔

" " س ۱۴۔ تخلیق متوازی، کی جگہ "تخلیق رو متوازی" ہونا چاہیے۔

ص ۴ س ۸۔ فن کے بھی، کی جگہ "فن کے ہی" ہونا چاہیے۔

ص ۴ س ۹۔ میرے ذہن میں۔

" ۔ س ۲۷۔ لکھواتا یا خود لکھتا ہے،

ص ۸ س ۱۷۔ تنقید نے ۔ ۔ ۔

سہو کتابت کے اور تو نے لوگ سمجھ لیتے ہیں۔ فہرست تیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ براہ کرم ا
اشاعت میں مناسب طور سے وضاحت کر دیں۔

علی جواد زیدی۔ بمبئی

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

گول مال

مصنف: شفیقہ فرحت
قیمت: ۱۸/- روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دلی ۲۵
مبصر: ڈاکٹر سید حامد حسین

آج سے ۴۰ سال قبل جب شفیقہ فرحت نے لکھنا شروع کیا تب خواتین یا تو معاشرتی اصلاحی افسانے لکھتی تھیں یا بعض خواتین باغیانہ انداز فکر کا اظہار کر کے ترقی پسند کہلانا پسند کرتی تھیں۔ اس شفیقہ فرحت نے طنز و مزاح کا ایک ایسا اسلوب اختیار کیا جس میں انھوں نے بہت جلد انفرادیت حاصل کرلی۔ چند سال قبل مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دلی سے "رانگ نمبر" کے عنوان سے ان کا ایک اور مجموعہ ...ن شائع ہوا اور اب ان کا تیسرا مجموعہ "گول مال" مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے۔

شفیقہ فرحت کے مزاحیہ اسلوب کا امتیاز دراصل اس کی سنجیدگی اور بیساختگی ہے۔ شفیقہ فرحت ...ب کے مطالعے اور ادب کی تدریس سے جو قریبی معاملہ رہا ہے وہ ان کے اسلوب پر بھی اثرانداز ...ہے۔ ایک طرف جہاں ان کے جملوں میں میر، غالب، اقبال و فیض کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ...بعض اوقات فقروں کا توازن اور آہنگ، جملوں کی متوازن ساخت اور پُراہتمام اسلوب اُن ...ناکو ایک خاص وقعت بخشتا ہے۔

شفیقہ فرحت کا مزاحیہ فن لطیفہ گوئی، چٹکلے بازی، واقعاتی بے تکے پن کا مرہون منت نہیں۔ ...ان کا مزاحیہ اسلوب دراصل اپنے لطف بیان لطف واقعہ اور جدت اظہار بنا پر قارئین کے لیے کشش ...کا سامان بنتا ہے۔

"کیا حضرت غالب، کیا میر کیا وزیر، کیا خرزیں کیا پیادہ۔ سب جانتے ہیں کہ وعدہ کرنا کرنا اور کرکے بھولنا اور بھول کے توڑنا پیدائشی حق ہے۔ اور پیدائش کیوں۔ یہ ریت تو روز ازل سے چلی آرہی ہے۔ اگر مادام اینڈ موسیو حوّا و آدم، دانۂ گندم نوش نہ فرمانے کا پکا وعدہ کرکے بھلا نہ دیتے تو یہ عالم رنگا رنگ ہی وجود میں نہ آتا۔"

"یہ سب پانی کا کھیل ہے جس سے ہم سب پانی پانی ہوئے جا رہے ہیں اور سرکار

ہمیں نیست ونابود ہونے سے بچانے کی خاطر پانی کی طرح روپیا بہا رہی ہے
اور درباری اپنی بقا کی خاطر کروڑوں پہ پانی پھیر رہے ہیں"
"مثل مشہور ہے کہ قاضی جی کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ گو آج قاضی
جی کا دائرۂ عمل و اختیار صرف نکاح تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور نکاح چاہے
وہ فلم "نکاح" ہو یا مصری چھوہارے اس میں عقل کا دخل ہے کہاں۔ لیکن چوہوں
کے سہارے ان کے سیانے پن کا بھرم آج بھی قائم ہے"
بات سے بات پیدا کرنے کا یہ انداز شفیقہ فرحت کے مضامین کے لطف کو دو بالا کر دیتا ہے
ان فقروں میں چھپی ہوئی طنز کی کنیاں اسے سہ آتشہ بنا دیتی ہیں۔ شفیقہ کے یہاں خالص مزاح
خالص طنز کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے مزاح میں بیشتر سماجی اور سیاسی مضامین بالطف
شامل ہوتا ہے اور ان کا طنز۔ مزاح سے دلفریب شگفتگی حاصل کرتا ہے۔ بہر حال ... مضامین شفیقہ فرحت کے رنگا رنگ مزاحیہ اسلوب کا ایک نمائندہ انتخاب ہیں۔

عزیزان علی گڑھ

مصنف: رشید احمد صدیقی
مرتبین: ڈاکٹر رفیع احمد صدیقی / ...
ناشر: بیکن بکس ملتان
قیمت: ۹۰/- صفحات: ۱۹۲
مبصر: یوسف ناظم

اوپر بڑی ہوئی روداد کے بعد عرض ہے کہ یہ کتاب چھپی لاہور میں ہے لیکن ... کی ملکیت علی گڑھ کی مٹی اور وہاں کی ہواؤں کی مہک کے علاوہ مرتبین کی عقیدت اور ... دمک اس میں موجود ہے اس لحاظ سے اس کی قدر و قیمت۔ اس کی ضخامت اور ... سب جانتے ہیں کہ رشید احمد صدیقی لکھتے کاغذ پر تھے لیکن جو کچھ لکھتے تھے پتھر کی لکیر ہوتا تھا ... میں ریشم و دیبا کی نرمی کے ساتھ ساتھ فولاد و آہن کی مضبوطی یوں گھلی ملی رہتی تھی ... ایک ہی چیز ہوں۔ رشید صاحب نے حافظہ بھی وہی پایا تھا جو ابوالکلام آزاد کو عطا ہوا تھا ... نے ایسا حافظہ چند مخصوص اور پسندیدہ لوگوں کے لیے محفوظ رکھا ہے۔ اس حافظے کی مدد ... آدمی خودکار اور خود مکتفی لائبریری بن جانے میں سہولت محسوس کرتا ہے ... کا طالب علم نہیں رہا لیکن یہ کسی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ طالب علم بننے کے لیے ... لازم ... اور رو برو ہو کر زانوے تلمذ تہ کرنا ضروری ہے۔ یہ کام دور بیٹھ کر بھی کیا جا سکتا ... اور یہی صحیح النسب یہ ایسی ہے۔
عزیزان علی گڑھ، جیسا کہ مرتبین نے بتایا ہے رشید صاحب کا وہ خطبہ ہے جسے ...
۱۹۷۰ء میں لکھنا شروع کیا تھا علی گڑھ یونیورسٹی کی صد سالہ جوبلی جو اس سال نہیں منائی ...
اس لحاظ سے کامیاب تقریب تھی کہ زیر نظر خطبہ وجود میں آ گیا۔ یہ تحریر ۱۰ سال میں مکمل ...

[illegible] ہے۔ یہ مصنف کی آخری سانس تک قلمبند ہوتی رہی۔ ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی کی زبانی (۱۴ جنوری [illegible] وفات سے چند گھنٹوں پہلے مغرب کے بعد اپنے کمرے میں (جس میں وہ کم و بیش ۲۵ برسوں سے رہ رہے [illegible] آرام کرسی پر بیٹھے، عزیزان علی گڑھ کی تراش خراش میں لگے ہوتے تھے) یہ جملہ میں نے صرف [illegible] نقل کیا کہ بتا دوں کہ اس تحریر کو مصنف کو حرز جاں بنا لیا تھا۔ اس خطبے میں دنیا جہان کی باتیں ہیں۔ [illegible] یونیورسٹی بجائے خود سمندر کی طرح وسیع اور فراخ موضوع ہے اور رشید صاحب کہہ سکتے حد [illegible] ناخود سر آدمی تھے۔ عشرتِ قطرہ کا مفہوم سمجھتے تھے۔ اس خطبے میں مصنف نے [illegible] علم و دانش ہی کے موتی نہیں بکھیرے ہیں۔ علی گڑھ سے اپنی بے پایاں محبت اور شغف کا اظہار [illegible] طرح کیا ہے کہ غیر علی گڑھی بھی کہہ اٹھے تری آواز مکے اور مدینے۔

یہاں ان تمام موضوعات کا احاطہ کرنا جن پر رشید صاحب نے قلم اٹھایا ہے، ممکن نہیں ہے [illegible] سید احمد خاں، نظام تعلیم، یونیورسٹی کے ساتھ ارباب مقتدر کا سلوک، وزیر تعلیم کا رویہ، [illegible] نوجوانوں میں گمراہی، تعلیم سے عدم دلچسپی، نظم و نسق کا معاملہ، لباس، فحاشی جنس اور ایسے کتنے ہی [illegible] ہیں جو اس خطبے میں شامل ہیں۔ ان پر مستزاد رشید صاحب کا تنقیدی مزاج۔ اردو کے [illegible] سے متعلق ان کی اپنی رائے، جو مستند بھی ہے اور صائب بھی۔ چند مثالیں بطور تبرک [illegible]

[illegible] نے شاعری کے تمام لوازم کو ملحوظ رکھتے ہوئے غزل کو اس طرح سنوارا اور اس کی [illegible] رجحت، لب و لہجہ، اور ترک و قبول کی صلاحیت بخشی اور سب پر فوق اور سب سے [illegible] ہونے پیش کیے کہ ایک بے راہ اور بدنام صنف کلام، اردو شاعری کی آبرو بن گئی۔ [illegible] خلفا کے بغیر اپنے مشن کو مفید، قبول اور مستحکم نہیں کر سکتا۔ سرسید کے ایسے خلفا میں [illegible] بلند ہے۔ اگر دہلی اور لکھنؤ کے زوال پر غالب کا ظہور نہ ہوتا اور حالی، اکبر اور اقبال [illegible] کے سفینے کی ناخدائی اپنے ہاتھ میں نہ لی ہوتی تو اردو اور اردو تہذیب کا ناقابل تلافی [illegible] ۸۹ مجھے یہاں ایک جدید تنقید نگار کی تقریر یاد آ گئی جو بمبئی میں کوئی ۵ سال پہلے فرمائی [illegible] تنقید نگار نے حالی کے بارے میں "چالاک" کا لفظ استعمال فرمایا تھا۔ اے سبحان اللہ!

[illegible] شاعری میں حالی اور اقبال دو ایسے بڑے شاعر گزرے ہیں جنھوں نے عورت کی [illegible] در ملت کی اساس عظمت کی تلقین کی تائید اور تصدیق میں اپنی پوری صلاحیت شعری [illegible] سوزی سے کام لیا ہے ۹۰۔ رشید صاحب نے اقبال کو بڑا شاعر کہا جب کہ انہی [illegible] سے ایک استاذ مکرم اقبال کو صرف اہم شاعر مانتے ہیں بڑا نہیں مانتے — [illegible] ضرورت ہے۔ رشید صاحب اس کو بھی وہی درجہ دیتے ہیں جو اقبال کو دیتے ہیں۔ [illegible] حاصل ہے، وہ انیس کے مانند اردو کے پلّہ کو گراں، اور زمین سخن کو آسمان [illegible] کی نظر بے اختیار اقبال پر بھی پڑتی ہے اور کسی اعتماد و افتخار سے پڑتی ہے ۹۱۔ [illegible] خطبے میں [illegible] ات الرشید کی گنتی مشکل ہے۔ [illegible] شاعری اور موسیقی کا امتزاج حافظ کے یہاں بھی ملتا [illegible] اس فرق کے ساتھ کہ حافظ تمام تر غزل کے شاعر ہیں جس میں موسیقی کا عمل دخل آسانی سے ہو جاتا

ہے۔ موسیقی کی جو ہمدمی غزل کو حاصل ہے شاید کسی اور صنف کو نہیں ہے۔۔۔۔ تصوف کے تمام ستم
نے حافظ کو ساز سے قریب اور ستیز سے دور رکھا ہے ص۱۱۔ اکبر الٰہ آبادی کے تو کتنے ہی شعر رشید
صاحب نے اپنے اس خطبے میں نقل کر دیے ہیں ــــ میں اگر یہ تبرکات ہی پیش کرتا رہا تو آپ کہیں
اقتباسات اور تبصرے کا کچھ تو فرق ملحوظ رکھا ہوتا لیکن ایک اقتباس جو میرے لیے عبرت ا
ثابت ہوا پیش کیے بغیر میں مانوں گا نہیں۔ لکھتے ہیں۔ "سب سے زیادہ ایسے کڑے شرائط
ادب بالخصوص طنز و ظرافت میں ملحوظ رکھے جاتے ہیں اس لیے کہ جو شخص ان کا نشانہ بنتا
اس کی عفت و آبرو زد میں ہوتی ہے جس کا لحاظ رکھنا شرافت اور فن دونوں کا اولین تقاضا ہے۔
اور ہنسانے کے فن میں دھوکا یہ ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ ہنس ہی نہیں سکتا بلکہ ہنسا
سکتا ہے حالانکہ یہ دونوں اعلا صلاحیتوں کے طلب گار ہوتے ہیں جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہو
ہے۔۔۔ طنز و ظرافت کا فن بڑا نازک اور سخت گیر ہے اس کی ترغیب جتنی پُر کشش اور تو
ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ اس کے وہ مطالبے اور پابندیاں ہوتی ہیں جن کا ہم لحاظ نہیں ر
اور یہ فن اور فن کار دونوں کی محرومی کا باعث ہوتا ہے۔ طنز و ظرافت کی تیغ بے زنہار پا
سے آسان اور محفوظ گزر جانا اردو کے بہت کم فن کاروں کے حصے میں آیا ہے" ص۱۲۵۔ پتا نہیں
پڑھ کر میں سرنگوں ہوا سر بزانو ہوا یا سر بسجود ــــ ایسے سخت مقامات اس زخو(بصورت) کتاب
میں جگہ جگہ آتے ہیں۔

جس مقصد کے تحت، یہ خطبہ لکھا گیا ہے اس کی ایک جھلک "آج کی جہابھارت میں بوڑ
اپنی نوجوان اولاد کو سر دالو پر لگاتے رہتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ خود جیتے رہتے ہ
اور اولاد ہارتی رہتی ہے۔ دروپدی کے ناموس کو کرشن جی نے بچایا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ
نوجوانوں کی عفت بچانے کے لیے کون سے کرشن کہاں اور کب نمودار ہوتے ہیں ص۱۴۹ ــــ
رشید صاحب نے ایک جگہ اپنے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ میں مراثی نہیں ہوں ــــ آج وہ زندہ
ہوتے تو میراثی ہی ہوتے۔ انتظار کی حد ہوتی ہے ظلم کی خواہ نہ ہو۔

دونوں مرتبین، مبارک باد کے نہیں شکریے کے مستحق ہیں۔ اس کتاب کا جلد اڈیشن
شائع ہو جانا چاہیے۔ یہ جعل نہیں کار خیر ہوگا۔

فن تنقید اور اردو تنقید نگاری

مصنف: نور الحسن نقوی
قیمت: پچاس روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۶
مبصر: قمر الہدیٰ فریدی

اردو زبان و ادب کے انتھک خدمت گزار اور علمی دنیا میں اعتبار و احترام کے حامل نام
ہیں پروفیسر نور الحسن نقوی اس لحاظ سے قابل ذکر ہیں کہ تحقیق ہو یا تنقید، نامانوس فلسفیانہ مباحث
ہوں یا دقیق اجنبی افکار، اُن کا قلم ایک مخصوص علمی وقار کے ساتھ قاری کو از اوّل تا آخر اسیر رکھتا ہے
اب تک ان کی متعدد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں، اُن میں سے کوئی سی اٹھا لیجیے۔ اقبال: فن اور

سفر، سرسید اور ہندستانی مسلمان، نذیر احمد مصحفی، فلسفۂ جمال اور اردو شاعری؛ ہر جگہ یہی صورت
نظر آتی ہے بلکہ زبان و بیان کی یہ شگفتگی ان کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں: رام چرت مانس، راجا رام موہن رائے
ز کے ان دیکھے روپ، اشارات تعلیم اور میرا بائی میں بھی موجود ہے۔

"فن تنقید اور اردو تنقید نگاری" نقوی صاحب کی تازہ تصنیف ہے جو چند سال قبل یونی ورسٹی
ٹس کمیشن کی جانب سے لکھوائی گئی تھی اور اب مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے تعاون سے شائع ہوئی
، آسان زبان میں فن تنقید اور اردو تنقید نگاری سے متعلق بنیادی مباحث کو اس میں جگہ دی گئی
یہ کام تنقید کی بعض دوسری کتابوں میں بھی ہوا ہے، کہیں شرح و بسط کے ساتھ، کہیں اجمال و
ارے، کہیں کسی ایک پہلو پر زور ہے، کہیں کوئی مخصوص نقطۂ نظر کارفرما ہے کوئی خواص کے
رے ناقص تو کوئی اس قدر فلسفیانہ مباحث سے پُر کہ ادب کے عام قاری کے لیے بے کار!
ایسی کتاب کی ضرورت تھی جو موضوع کے اہم پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہو اور پیچیدگیٔ بیان سے
بالکل بھی نہ ہو۔ "فن تنقید اور اردو تنقید نگاری" نے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اس کتاب میں
د کی تعریف، اہمیت، ادبی تنقید کے اصول، ادبی تنقید کے مختلف دبستان، مشرق و مغرب
تنقید کے ارتقا، اردو تنقید کے اوّلین نمونوں اور اردو کے پرانے اور نئے اٹھارہ اہم
ن کی کاوشوں کا عالمانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ گویا اس ایک کتاب میں دوسری سیکڑوں کتابوں
اور مصنف کی برسوں کی غور و فکر سمٹ آئی ہے اور اس لحاظ سے یہ ادبی ذوق رکھنے
نگارین، اساتذہ اور طلبہ ہر ایک کے لیے مفید قرار دی جا سکتی ہے۔ کتابت، طباعت اعلا درجے
گرد پوش دلکش ہے۔

بولو مت چپ رہو

ناول نگار: حسین الحق

قیمت: -/۱۸ روپے
ملنے کا پتا: نصرت پبلشرز۔ امین آباد لکھنؤ۔
صفحات: ۱۸۴

مبصر: اعجاز علی ارشد

حسین الحق کا یہ ناول آزادیٔ ہند کے بعد ابھرنے والی اس نسل کی کہانی ہے جو ایک زہر آلود
ہ کے حصار میں اسیر ہو کر بے کراں کے سفر میں ہے اور بابِ نجات تلاش کر رہی ہے۔ دراصل
اور مہلک سسٹم آزادی سے قبل بھی موجود تھا مگر ناول نگار کے خیال میں اس کی شدت اور وسعت
غاز ہوا ہے۔ اور پچھلے چالیس برسوں کے دوران جو دیوستھا ابھری ہے اس نے غلطیوں کی
رنے کے بجائے ان کو اور زیادہ بھیانک بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ اکثر لوگوں
غلط نظام زندگی کو مول کی چیز سمجھ کر نہ صرف قبول کر لیا ہے بلکہ اس کے مخالفین سے ہمدردی
ر کھتے۔ اس صورت حال میں بنیادی سوال یہ ابھرتا ہے کہ آخر اچھے لوگ کیا کریں؟ اسی سسٹم
نظر بن جائیں؟ خاموش تماشائی بنے رہیں؟ یا انفرادی سطح پر احتجاج اور اصلاح کا راستا
کریں؟ حسین الحق نے ان سوالوں کو خاصی تفصیل کے ساتھ اٹھایا ہے اور ناول کے ہیرو

کو آخر میں پُرامن احتجاج کی طرف بڑھتے ہوئے دکھا کر اپنے رجائی نقطہ نظر اور حوصلہ مندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

ایک معمولی گاؤں معمول پور کا پرائمری اسکول ٹیچر ماسٹر افتخار الزماں ناول کا ہیرو ہے۔ اس کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے درخت تو لگائے ہیں مگر پھلوں کی ہوس کبھی نہیں کی۔ اس کی پوری جوانی ایک سچے انقلابی کی طرح جنگ آزادی میں حصہ لیتے گذری۔ پھر جب آزادی کے پھل کھانے کا وقت آیا ہے تو اس نے عملی سیاست سے کنارہ کش ہو کر خدمت خلق کے لیے ایک اسکول کھول لیا ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ جو لوگ اس کے سامنے عضو ... کی حیثیت رکھتے تھے وہ بڑے آدمی بن چکے ہیں اور وہ خود ماسٹر صاحب، سے گھٹتے گھٹتے ... صاحب" بن گیا ہے۔ رام ناتھ اور بھٹاچاریہ، عجائب سنگھ اور انصار محمد جیسے اس کے ساتھی پار... اور اسمبلی کے ممبر بن کر محافظ دستوں کی حفاظت میں موٹر کاروں پہ گھوم رہے ہیں اور اس کی نوکری بلکہ عزت اور زندگی بھی خطرے میں ہے۔ اس کی محبوبہ کو کلکتہ میں رہنے والا دولت مند اڑا لے گیا ہے۔ اور اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ راجیشور سنگھ جیسا پارٹی سے لوٹا ہوا آدمی، انسپکٹر جیسا بے ایمان افسر اور چندو مل جیسا دھوکا باز تاجر بھی اسے خاطر میں نہیں لاتا۔ ایک بیمار ... ایک سیدھی سادی بیٹی اور اپنے ہی رنگ میں رنگے ہوئے دو شریف بیٹوں کو سرمایہ حیات ... ہوئے زندگی جیسے شکستہ کنگوروں پہ ٹکی رہتی ہے اور سارے حالات اس سے بس یہی تقاضا کر... ہیں کہ وہ بھی اس غلط سسٹم سے سمجھوتہ کر کے اپنا پریشانیوں سے نجات پالے۔ موجودہ سماج کی گرتی ہوئی دیوار کے دوسرے سرے پر اس کا ایک فرماں بردار مگر حساس شاگرد کیلاش متوا...

نارد بھی ہے جو نکسلائٹ بن چکا ہے۔ نام نہاد جمہوریت کے خلاف عام لوگوں کے دل میں جو غصہ ... کا اظہار نارد کے اس بیان میں ہوا ہے:

"نارد چور ڈاکو نیکھے ہمارا جھگڑا سرمایہ داروں اور امیروں سب سے ہے۔ ہم ہمارا ... آدمی بھول سے بھی کو لوگ غریب یا عام جنتا کے نہ چھوتے۔"

ماسٹر کے لیے یہ راستا بھی کھلا ہوا ہے اور ایک موقع ایسا آتا ہے جب وہ اس راستے پر چلنے کا ... ہے مگر آخر کار ایک غلط سسٹم کو دوسرے غلط سسٹم کے ذریعے ہٹانا اسے بے معنی لگتا ہے۔ ... سوچتا ہے کہ اس کے اسکول میں آتے ہوتے نئے ماسٹر ہوں یا اسکول انسپکٹر اور ڈی۔ ایس۔ ... اڑھتیا ہو یا نیتا جی راجیشور سنگھ، یہ سب تو محض پرزے ہیں۔ انھیں ہٹانے سے مکمل انقلاب ... جب کہ اصل مقصد یہی ہے۔

بہر حال قدم قدم پر یادوں کے دریچے میں جھانکتا، اپنی شہ زوریوں اور ... ذلت کے احساس سے دوچار ہوتا۔ ٹھوکریں کھاتا اور سنبھلتا ہوا بہ ظاہر بے وقعت ... اپنے پرانے دوست انصار محمد ایم۔ ایل۔ اے کے طرز عمل سے بھی مایوس ہو جاتا ہے تو ... بھرے ہوئے تالاب میں کنول کے پھول کی طرح زندہ رہنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ بہت دنوں پہلے ...

اضطراب، آشفتگی اور تنہائی ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ تجربات کی وسعت اور شعور کی بتدریج پختگی کے سبب نقش کے کلام میں ایک ارتقا صورت بھی موجود رہی ہے اور زندگی نے جس طرح رفتہ رفتہ ان کی نگاہوں کے سامنے خود کو بے نقاب کیا ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ اثر ان کے کلام پر ہوتا رہا ہے مگر بنیادی طور پر ان کے کلام کا جو رنگ و آہنگ پہلے تھا وہ بعد میں بھی رہا۔ عشق کی راہوں میں چلتے ہوئے انھوں نے اپنی وفاؤں کا صلہ طلب کرنے کی جگہ تمام عمر ناکامیوں سے کام لیا اور وصال سے زیادہ ہجر کی کیفیات انھیں پسند رہیں۔ ان کا حوصلہ

ہم یہ نہیں کہتے کہ وفاؤں کا صلہ دے اے دوست غم عشق کی کچھ عمر بڑھا دے

انسان دوستی کے ساتھ ہی تہذیب، شائستگی، شگفتگی اور حسن ہزار شیوہ کی ناز برداری نے ایک طرف ان کے یہاں احتجاج کی لے کو معتدل اور متوازن رکھا ہے اور دوسری طرف ان کے کلام کو نادر تشبیہوں اور خوبصورت پیکروں سے مالا مال کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ـــ

رقص کرتی ہوں جیسے راگنیاں ان نگاہوں کی بات کیا کہیے
عرق آلودہ چہرۂ رنگیں جیسے شبنم سے گل نکھرتے ہیں
بول اٹھی خاموشیٔ شب یاد جو آئی ان کی بات
ہے جوانی پہ سوگ کا عالم سرد راتوں کی چاندنی کیا ہے
رسمساتا ہے یوں ترا پیکر جیسے قوس قزح کی انگڑائی
رخ پر نور پر موجِ تبسم شرابِ ناب سے پھوٹی کرن ہے
ایک موہوم آرزو کی کرن غم کے ماروں کے پاس ہوتی ہے
جیسے تاریکیوں کے سینے میں صبح صادق کی آس ہوتی ہے
کسی کی نکھرتی جوانی کا منظر نگاہیں مری کس طرح بھول جائیں
وہ ساری سے رنگیں بدن کا جھلکنا تہ آب جیسے دیے جھلملائیں

مجموعی طور پر نقش کے کلام میں بے حد روانی، سلاست، نغمگی اور لطافت ہے۔ یہاں تک کہ ان کی بعض غزلوں سے اکثر اشعار سہل ممتنع کی مثال بن جاتے ہیں۔ انھوں نے اساتذہ اور دونوں کی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں اور مختلف بحروں کا استعمال کیا ہے مگر چھوٹی بحروں کا رنگ سخن زیادہ نکھرتا ہے۔

کلام نقش کی کتابت و طباعت صاف ستھری اور عمدہ ہے۔ میں ایسے تمام اہل ذوق جو غزل کو اس کی تمام تر صنفی خصوصیات کے ساتھ دیکھنے کے خواہاں ہیں اس مجموعے کے مطالعے کی دعوت دیتا ہوں۔

سیدہ جعفر کو مخدوم ایوارڈ

اردو کی ممتاز نقاد اور ادیب پروفیسر سیدہ جعفر کو اردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے اپنا دس ہزار روپے کا سب سے بڑا انعام "مخدوم ایوارڈ" سے نوازا ہے۔

پروفیسر سیدہ جعفر عثمانیہ یونیورسٹی سے یونی ورسٹی آف حیدرآباد میں منتقل ہو گئی ہیں۔ آج کل صدر شعبۂ اردو ہیں۔

...اور تہذیبی خبریں

...ر سکریٹری حکومت ہند کا خط
...انجمن سید حامد کے نام

کچھ عرصے پہلے ہمیں اطلاع ملی تھی کہ "مانو کا
س" پروگرام سترہ زبانوں میں نشر کیا جائے گا۔
...ر اس پروگرام میں شامل نہیں ہے۔ ہم
...انڈیا ریڈیو کے اس رویے پر سخت
...کیا۔ وزیر اعظم اور وزیر اطلاعات و نشریات
...لکھے اور ہم نے خط لکھ کر انجمن ترقی اردو
...شاخوں کے عہدے داروں، ادیبوں،
...صحافیوں اور اسکول اور کالجوں کے
...دل سے درخواست کی کہ وہ وزیر اطلاعات
...یات کو خطوط لکھ کر احتجاج کریں۔ خوشی
...ہے کہ ہماری اس درخواست پر مختلف
...اور افراد نے وزیر اطلاعات و نشریات
...ط لکھے ان کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے،
...اور ان تین سو خطوط کا اثر یہ ہوا
...اطلاعات و نشریات کو ہمارا مطالبہ
...پڑا۔ ہم ان تمام حضرات کے تہ دل سے
...ہیں جنھوں نے اس معاملے میں ہمارے
...ون کیا اور جن کی وجہ سے ہمارا جائز مطالبہ
...لیا گیا۔ اگر آئندہ بھی اردو والے اسی
...دوسرے سے تعاون کریں گے تو کوئی
...اردو کے بہت سے مسائل حل نہ
...ہم نے کچھ اراکین پارلیمنٹ سے بھی

درخواست کی تھی کہ وہ احتجاج کریں۔ وزیر اطلاعات و نشریات جناب اجیت کمار پانجا نے جناب شہاب الدین (ایم پی) کے احتجاجی خط کا جو جواب دیا ہے اس کی خبر "کتاب نما" کے صفحات پر دی جا رہی ہے۔ حکومت ہند کے انڈر سکریٹری نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر جناب سید حامد کے نام جو خط لکھا ہے اس کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔

عنوان آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے "مانو کا وکاس" سیریل اردو میں بھی نشر ہونے کے بارے میں۔

مکرمی!

(۱) آپ کے خط ۲۹ جون ۱۹۹۱ء کے جواب میں جو آپ نے وزیر اعظم اور وزیر اطلاعات و نشریات کے نام بھیجا تھا۔ (جس کا نام اوپر دیا گیا ہے) اطلاعاً یہ خط لکھ رہا ہوں کہ اس معاملے کی آگے کی کارروائی کی جا چکی ہے۔

(۲) یہ سیریل "مانو کا وکاس" (انسانی ارتقا) آل انڈیا ریڈیو اور نیشنل کونسل آف سائنس و ٹکنالوجی کمیونیکیشن کی کوشش سے تیار کیا گیا ہے۔ یہ سیریل کچھ خاص سامعین کے لیے ہے جیسے دس سے چودہ سال کے درمیان کے بچے۔ اور وہ سامعین جنھوں نے بہت سارے پروگرام مختلف زبانوں میں سننے کے لیے خود کو ملک کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے وابستہ کر رکھا ہے۔

(۳) اب یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ یہ سیریل اردو میں بھی تیار کیا جائے گا اور آل انڈیا ریڈیو اسے اردو میں نشر کرے گا۔ اس سیریل سے متعلق جو بھی معلومات ہوں گی وہ وقت آنے پر آل انڈیا ریڈیو سے نشر کر دی جائے گی۔

آپ کا مخلص

(ڈی ایس آر اسو)

انڈر سکریٹری حکومت ہند

رفعت سروش کی نئی کتاب "قلم کے سفیر" کا اجرا

دہلی، ۲؍اگست ۱۹۹۱ء کو اردو کے معروف ادیب و شاعر رفعت سروش کی نئی کتاب "قلم کے سفیر" کا اجرا اردو گھر نئی دلی میں عمل میں آیا۔ جلسے کی نظامت پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے کی۔ "قلم کے سفیر" رفعت سروش کے تازہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کا اجرا فرماتے ہوئے ڈاکٹر گرجا ویاس (نائب وزیر برائے اطلاعات و نشریات) نے رفعت سروش کو مبارکباد دی اور کہا کہ میں ریڈیو پر ان کی آواز سے برسوں سے آشنا ہوں۔ انھوں نے گذشتہ پچاس سال اردو ادب کی خدمت میں گزارے ہیں۔ نظم، غزل، اوپیرا، بیلے، ڈرامے، ناول سب کچھ لکھا ہے۔

صدر جلسہ پروفیسر اشتیاق عابدی نے فرمایا کہ مختلف اصناف ادب میں نت نئے تجربات کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ رفعت سروش کا تخلیقی سفر جاری و ساری ہے اور انھیں خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے رفعت صاحب سے اپنی طویل رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جیسے نیاز فتح پوری کا ایک "نگار" تھا اور نگار کا ایک نام نیاز فتح پوری، اسی طرح میرے اور ہم میں سے بہت سے اردو والوں کے نزدیک رفعت سروش کا ایک نام اردو مجلس تھا اور اردو مجلس کا ایک نام رفعت سروش۔ بحیثیت شاعر تو وہ اپنا مقام پہلے ہی بنا چکے تھے۔ انھوں نے کہا کہ رفعت صاحب کسی گروہ بندی کے شکار نہیں۔ ان کا کمٹ منٹ ادب سے ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ رفعت صاحب کے یہاں یادوں کا قیمتی سرمایہ ہے جسے وہ بہ حسن

ستھرا
وخوبی اپنی تحریروں میں استعمال کرتے ہیں۔ ایسا مواد تاریخ ادب کی ترتیب کے لیے ضروری ہے۔ ان کی نثر رواں دواں اور شگفتہ ہے ایک مدت تک ریڈیو میں رہنے کی وجہ سے انھوں نے اپنے سامعین و قارئین کے دل میں اترنے کا فن سیکھا ہے۔ مشہور شاعر بیکل اتساہی نے کہا کہ رفعت الساں کی زنبیل میں سب کچھ ہے، نظم، غزل، ... انشائیہ، سفرنامہ، تنقید سب کچھ۔ ان کا تخلیقی سفر جاری و ساری ہے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے اس موقع پر ایک مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے رفعت صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اور ذاتی تجربات کی بنا پر کہا کہ وہ قلم برداشتہ نظم و نثر لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب (لندن) نے کہا کہ میڈیا سے متعلق ہونے کے باعث ان کی نثر میں شگفتگی اور خوب صورتی ہے۔ م۔م۔ راجندر نے رفعت سروش کو ہمہ صفت ... قرار دیا۔ وہ بلاشبہ ... ہیں۔ ابوالفیض سحر نے کہا "رفعت سروش نثر دونوں اصناف میں عبوری حاصل ہے

وزیر
انشائیہ کے خدوخال

"ناولستان" کے نئے ناول

تو پچے ہیں سنگ سیمٹ لو

صغرا مہدی (ناولٹ)

ڈاکٹر صغرا مہدی کا نام اب کسی کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ آپ کے کئی ناول شائع ہو کر قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" آپ کا تازہ ترین ناولٹ ہے۔ قیمت :/۲۴

مٹی سے ہیرا (ناولٹ)

سید مقبول احمد

مسلم ماحول میں لکھا ہوا ایک نہایت اہم ناولٹ جس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ گھریلو زندگی کے نشیب و فراز کی سچی کہانی۔ :/۱۶

سیکولر بھارت کی قابلِ فخر راجدھانی ہے۔

یہاں پر مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ مل جل کر

امن سے رہتے آئے ہیں۔

آیئے

اس روایت کو قائم رکھیں۔

جاری کردہ

FS/1-2/91-92/DIP/4629 19-8-91 KITAB NUMA MONTHLY

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

اکتوبر ۱۹۹۱ء جلد ۳۱ شمارہ ۱۰

پرچہ	6/=
سالانہ	53/=
کاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/=
مالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	120/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک)	240/=

اڈیٹر

شاہد علی خاں

دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 630191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

ماہنامہ میں شائع ہونے والے مضامین و بیانات، نقد و تبصرہ
اور دار خود مصنفین ہیں۔ ادارہ کتاب نما کا ان سے متفق
ہونا ضروری نہیں۔

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے
لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں
چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

پگڈنڈی (حصہ اول ودوم) (بچّوں کا ناول) غلام حیدر ۸/-

اردو ساخت کے بنیادی عناصر (قواعد اردو)
نصیر احمد خاں ۱۰۰/-

آدمی نامہ (معلومات) پروفیسر مونس رضا ۴/-

آبِ گم (ہندستانی اڈیشن) (طنز ومزاح)
مشتاق احمد یوسفی ۸۰/-

زرگزشت (ہندستانی اڈیشن) (طنز ومزاح)
مشتاق احمد یوسفی ۶۰/-

بدرالدجیٰ (پاکستانی) نعتیہ کلام راغب مرادآبادی ۷/-

گیانی ذیل سنگھ (سوانح) سرہندر سنگھ جوہر ۱۲/-

چناروں کے سایے (افسانے) پریم ناتھ درد ۵/-

ہنسراج رہبر کے منتخب افسانے (افسانوی مجموعہ)
مرتبہ نند کشور وکرم ۷/-

بیچاری (افسانے) سطوت زہرا ۲۵/-

باز دید (نیا اڈیشن) (شاعری) پروفیسر منیب الرحمٰن ۷/-

مجموعۂ نظم حالی (کلام حالی) ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ۱۲/-

اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار (تذکرہ)
نیلم فرزانہ ۱۰/-

قرآن مجید اور ہماری رفتار گفتار (مذہب)
علی اصغر چودھری ۱۲/-

حیات رسول ۱۲۵ سوالات، جوابات (سیرت)
علی اصغر چودھری ۲۰/-

رباعیات زیڈ ایچ خاں زاہد ۲۰/-

دوسرا کھجور رو خاں (افسانے) نور پرکار ۱۸/-

سرِورق: ڈی ایس۔ اعجاز

قرآنی دعائیں (مذہب) مولانا محمد حنیف

حیات طیبہ (سیرت رسولؐ) مفتی محمد شفیع

اسلامی قانون اجرت (مذہب) مجیب اللہ ندوی

اسلامی فقہ اول، دوم " "

روحانی علاج " خواجہ شمس الدین

روشنی، اول، دوم (نیا اڈیشن) تقاریر
شاہ بلیغ الدین

طوبیٰ " " " "

تاریخ اسلام تین جلدیں (نیا اڈیشن) (اسلامی تا[ریخ])
نجیب آبادی

آب کوثر مکمل (تذکرہ، تاریخ) شیخ اکرام
رودِ کوثر " "
موجِ کوثر " "

اچھا خط کیسے لکھیں (خطوط نویسی) محمد صدیق

تعلیمی اشارے (نیا اڈیشن) (گائیڈ معلم اردو)
ڈاکٹر خوشحال زیدی

پراسرار بندے اول، دوم عشرت جا[وید]

لیسن ان ماڈرن پرشین (فارسی انگلش) احمد

اردو لنگویج اینڈ لٹریچر (انگلش میں) گوپی چند

بیساختہ (طنز ومزاح) قمر الزماں قمر

اسلام اور تربیت اولاد (مذہب) مولانا عبداللہ

ابرِ تر (شعری مجموعہ) فرید پربتی

کنور اپنی دو مثنویوں کی روشنی میں (تحقیق) ڈاکٹر ابو[الکلام]

اثر خامہ (شعری مجموعہ) علیم صبا نویدی

زوال شروع ہوتا ہے (افسانے) مہدی لو...

آکاش (شعری مجموعہ) راجیندر بہادر موج

اشاریہ

ن مُدیر

س۔ اعجاز

ماہنامہ انشاء: ۱-۶اے، کنائی سیل اسٹریٹ، کلکتہ ۳،

ہنگامی اور نئے موضوعات

ادب میں موضوعات کی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔ انسان کی ضروریات اس کے حالات کے ساتھ بدلتی
ہیں۔ اور معاشرتی تبدیلیاں انسانی سوچ اور فکر کو نئے سانچوں میں ڈھالتی چلی جاتی ہیں۔ ذہنی ارتقا کے
بے کوئی صورتِ حال بھی آخری فنی صورتِ حال نہیں کہی جاسکتی۔ حالات کے مطابق اپنے افعال اور ذہنی
یوں کو رُخ دینا اور میسّر سہولیات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بہتر سے بہتر نتائج سماج کے سامنے پیش کرنا
ترقی پسندانہ فعل قرار دیا جاسکتا ہے۔ کمہار اپنے چاک پر مٹی کے برتن تیار کرنے میں اپنے عمل کو ایک
ص ترکیب کا تابع رکھتا ہے اور ہر روز ایک جیسے برتن بنائے چلا جاتا ہے۔ لیکن جب سائنسی سوچ اور
تی نے پلاسٹک کے برتن بنانے کی ترکیب ایجاد کردی تو ظروف کی صنعت کو ایک لامحدودیت کا تصوّر دے دیا۔
ال ہر پل ایک نئے پن کا سواگت کیا جاتا ہے۔

سائنس کی طرح ادب بھی تغیّر کے عمل سے بچ نہیں سکتا۔ یہاں بھی نئی تبدیلی کے تصور اور نئی کھوج کا سلسلہ
ہتا رہتا ہے۔ جب ہم یہ ٹھان لیتے ہیں کہ ہمیں حُسن کا معیار بدلنا ہوگا اس وقت ہمیں یہ عہد کرلینا چاہیے کہ ہم فنی
نقطۂ نگاہ میں وقتاً فوقتاً مناسب ترمیم کرتے رہیں گے۔ بہرحال سائنسی دریافت اور فتوحات کا نسخہ ادب کی
بارٹری میں نہیں چلتا۔ ادیب کی تجربہ گاہ اس کے ضمیر میں ہوتی ہے۔ کسی بھی انوکھے فنی نتیجے کے لیے ادیب کو
پنے اندر زبردست تحریکات کا منتظر رہنا پڑتا ہے اور خارجی تبدیلیوں کو اپنے باطن میں طوفان اٹھانے کی اجازت
ینا پڑتی ہے۔ اس کے بعد ہی وہ خارجی دنیا کے ادبی منظرنامہ میں نئے رنگ بھر سکتا ہے۔ شاعر کو کسی میکانکی
رے نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنے عناصر میں ایک قسم کی اتھل پتھل سے گزرنا پڑتا ہے۔ بقول فراق ؎

وہ عالم ہوتا ہے مجھ پر جب فکرِ غزل میں کرتا ہوں
خود اپنے خیالوں کو ہمدم میں ہاتھ لگاتے ڈرتا ہوں

تخلیق کے لمحوں میں تخلیق کار کی کیفیتیں واقعی عجیب ہوتی ہیں۔ لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ تخلیق کے بیڑے ثمر
نا لگے ہیں۔ کتنے اُردو شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نویس ایسے ہیں جو تخلیق کی ان شدّتوں سے
رنا بھی پسند کرتے ہیں۔ گذشتہ بیس برسوں میں کتنے نئے موضوعات قارئین کو دیے جاسکے؟ ہم نے اپنے

قریبی پیش روؤں کی تخلیقی محنتوں اور ان کے ڈوب کر لکھنے کو قابلِ تقلید نہیں سمجھا۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ
کا معیار بدلنے کا نعرہ ایجاد کرنے والوں میں سے جو قلم کار خیر سے ابھی زندہ ہیں ان میں سے بیشتر اب خود
معاملے میں سنجیدہ نہیں رہ گئے ہیں۔ وہ یا تو سرکاری خزانوں کے ذریعے یا کسی دوسری طرح اپنی زندگی کا معیا
اونچا کر کے مطمئن ہو چکے ہیں یا پھر ان کے افکار پر بڑھاپا طاری ہو چکا ہے۔

حُسن کا معیار بدلنے کے لیے اب نئے ادیبوں کو آگے بڑھنا ہوگا اور ادب کو نئے نئے موضوعات د
ہوں گے۔ کہنہ اور فرسودہ موضوعات سے آہستہ آہستہ پیچھا چھڑا لینا چاہیے۔ ابھی ادیب کو بھدّے پن
بہت سا حُسن تلاش کرنا ہے۔ ہم تیسری اور چوتھی دنیا کے لوگوں کے پاس موضوعات کی کوئی کمی نہیں ہے۔
موضوعات تو بالکل ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ اور نئے موضوعات کے دریچے ہمیں اپنے اندر جھانکنے کی دعوت دے
ہیں۔ گیسوئے جاناں کو شاعری کا موضوع نہ بنا کر ایک بال کلپ (HAIR CLIP) کو موضوع بنانے کی
کوشش کی جا سکتی ہے جو کسی ایسی منگیتر یا بیوی کی آخری نشانی ثابت ہو سکتی ہے جسے کشمیر یا پنجاب کے د
گردوں نے ناحق قتل کر دیا ہو۔ ترقی پسند ادیب ہنگامی موضوعات پر لکھتے ہی رہے ہیں کل اگر دوسری
عظیم کی تباہ کاریوں یا تقسیم ملک کے نتیجے میں رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی مذمت میں لکھنا
پسندی کا ثبوت تھا تو آج دہشت گردی کے خلاف ایک تحریری اور ادبی محاذ قائم کرنا ترقی پسندی کا اولیں
ہونا چاہیے۔ اس وقت ساری دنیا میں ہی کسی نہ کسی قسم کی دہشت گردی پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن برصغیر
جو حالات ہیں وہ انوکھے ہیں۔ ان شوریدہ سر اور فتنہ و فساد برپا کرنے والوں کے خلاف ادیبوں اور شاعرو
ایک زبردست اور طاقت ور آواز کا اُٹھنا ضروری ہے۔ انگریزی، روسی، چینی اور فلسطینی ادب جنگی منظ
خلاف لکھے گئے شاہکاروں سے بھرا پڑا ہے۔ بلکہ ایک ایک شاعر نے کئی مثالی نظموں کو اپنے مجموعوں میں اہم
ہے۔ اور ان کے احتجاج کی صورتیں بیشتر تخلیقی رہی ہیں۔ ہمیں بھی یہ کام کسی سیاسی پلیٹ فارم سے یا مخصوص
کے تلے نہیں سرانجام دینا ہے۔ ہم میں سے بعض بلکہ کئی ادیب ایسے ہیں جو حادثات اور واقعات سے متاثر
گئے ادب کو ارادتاً رد کر دیتے ہیں یا اسے ثانوی درجہ کا ادب قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ احتجاج اور مذمت کو
اور افسانوی قالب میں ڈھالنے کو پروپیگنڈہ سمجھتے ہیں۔ دراصل یہ ان شعرا و ادبا کی ایسے موضوعات تک نار
اقبالِ جُرم ہوتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تمام ادیب اور شاعر فرقہ پرستوں یا دہشت گردوں کے خلاف روزا
لکھتے چلے جائیں یا وہ لازماً کسی ہنگامی واردات کو اپنا موضوع بنائیں۔ کوئی ادیب کسی کے فراہم کردہ موضوع
دعوا کر سکتا ہے اور نہ کسی اڈیٹر سے اس بات کا وعدہ کر سکتا ہے کہ وہ اس کے دیے ہوئے موضوع
گا۔ اس موقع پر ایک نصیحت یاد آرہی ہے جو ایک سینیئر ادیب نے کسی نوجوان ادیب کو لکھ بھیجی تھی "یہ
مجھے موضوع بتائیے۔" یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ "مجھے آنکھیں عطا کیجیے۔"

یہاں صرف اس بات کی جانب اشارہ مقصود ہے کہ جب تک ایک معاشرے کو کھوکھلا اور بے

باب زندہ رہتے ہیں۔ ہمیں ان کے سدّباب کے لیے قلم کو ہتھیار بنائے رکھنا چاہیے، ان اسباب کی بیخ کنی
روالے ادب کی تخلیق کے لیے فکر مند رہنا چاہیے اور اس فکر کی نوعیت یقیناً اس رسم کی سی نہیں ہونی چاہیے
عادتاً اُردو شاعر اپناتے ہیں۔ دراصل اُردو ادیب اور شاعر نے اپنے لیے بعض موضوعات منتخب کر کے ایک
خود کو رسومات اور تقلید کی آسانیوں کا غلام بنا ڈالا ہے اور دوسری طرف نئے پن کے دروازے اپنے لیے
رڈالے ہیں۔ وقت کے تقاضے سمجھے بغیر نہ ادیب فرض شناس ہو سکتا ہے اور نہ کسی معاشرتی تبدیلی سے کوئی
نیز اور پُرمعنی رشتہ جوڑنے کی سعادت حاصل کر سکتا ہے۔ مشاہدہ، تجربہ اور تخیّل کی کارفرمائی سے جو ایک
بات کی رنگارنگی پیدا ہو سکتی ہے۔ تخلیق کاروں کی توجہ اس پر جتنی زیادہ ہوگی وہ اتنا ہی متنوع ادب
جا کو دے سکیں گے۔ ساحر لدھیانوی کی ایک نظم "تاج محل" کو لیجیے۔ اس نظم نے تخلیق کاروں اور ناقدوں کو
ال متاثر کیا۔ محبت، حُسن اور سرمایے کے روابط پر یہ ایک نیا زاویہ بنا گئی۔ ساحر کی ایک دوسری نظم "چکلے"
ن کی ہمدردی میں کہی گئی زبردست اور چونکا دینے والی تخلیق تھی۔ جس نے قوم کے نام نہاد رہبروں کے
نا ایک صدائے احتجاج بلند کی۔ اسی طرح طوائف اور طوائفیت سے متعلق قتیل شفائی نے نظموں کا ایک
د "مطربہ" شائع کرایا۔ اگر شاعری طوائف اور اس کے کوٹھے سے ترنگ اور تحریک حاصل کر سکتی ہے تو
لا اور گھریلو ماحول سے متعلق بھی کبھی کوئی شاعر چند اچھی اور مثالی تخلیقات دے سکتا ہے۔ یا ماحولیاتی
ودگی سے پیدا ہونے والے نئے مسائل کی طرف توجہ کر سکتا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ بعض نئے شعرا نے اپنے تازہ ترین کلام میں انسانی ہمدردی سے وابستگی اور
رکی اور ہنگامی تقاضوں کی تکمیل و احترام کا ثبوت پیش کرنا شروع کیا ہے۔ اور جابجا اچھے نمونے ان کی
ظمات اور غزلیہ اشعار میں نظر آئے ہیں۔ لیکن ابھی یہ کوششیں اونچے اور نئے تخلیقی مدارج کو نہیں چھو پا رہی
یہ مثالی نمونے پیش کرنے کے لیے تخلیق کاروں کو ابھی اور گہرائیوں میں جانا ہوگا۔ یقیناً سچے موتی انتہائی
ہرائیوں میں ہی پائے جاتے ہیں۔

ہنگامی موضوع کی جانب خود تخلیق کاروں کا رویّہ کیا ہے۔ اس طرف بھی کچھ اشارے کیے جائیں تو بہتر
۔ میرٹھ کے فسادات نے ڈاکٹر قمر رئیس جیسے معتدل مزاج نقاد اور شاعر کو مہرِ سکوت توڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔
انہوں نے شاعری میں ایک نقاد کا پیغام منظوم کیا۔ ان کا ادیبوں اور شاعروں سے منظوم خطاب "کیوں چُپ
سے رہتے ہو، کچھ بولو کچھ بات کرو" کئی اخبار و رسائل میں شائع ہوا۔ لیکن کسی کی کوئی اپیل کوئی خاص تحرک
یدا کر سکی۔ تھوڑے بہت اشتعالی جذبات شاعری میں ضرور دیکھے گئے۔ اکثر ہوتا ہے کہ شاعر لوگ کسی نقاد کی
بات کا کچھ اثر نہیں لیتے لیکن مشاعرے میں جب کسی شاعر کو سامعین کی بے پناہ داد ملنے لگتی ہے تو وہ بھی
ن موضوعات کو باندھنے لگتے ہیں ورنہ پیشہ ور شعرا کی مارکیٹ ٹھنڈی ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح اخبار و رسائل میں
کہا اور پی اے سی کے تعاون کو لے کر کچھ کہانیاں اور افسانے بھی شائع ہوئے۔ لیکن یہ چیزیں اس لیے شائع

ہوا کرتی تھیں کہ اڈیٹر فسادات کے خلاف رائے عامہ اُبھارنے کے لیے انھیں چھاپ دیا کرتے تھے چاہے کوئی تخلیا
معیاری ہو یا غیر معیاری۔ ایسی کسی کہانی میں کہانی کار کسی کرب سے گزرتا ہوا نظر نہیں آیا۔ اسی طرح دہشت گرد
کا پبلسٹی ویلو (VALUE) حاصل کر کے کئی نو واردانِ ادب مشہور ہو گئے اور پھر ان کے ناموں پر دھول جم گئ
مزے کی بات یہ کہ نقاد ایسے وقت میں چُپ لگائے بیٹھے رہے۔ ابھی راجیو گاندھی کی ہلاکت پر ادیبوں میں اس نہ
بھی زیادہ خاموشی پائی گئی۔ اس بے حسی کو توڑنے میں نقاد نے ادیب کی کوئی مدد نہیں کی۔ کیوں کہ کسی کی بے حسی
توڑنا نقاد کی ڈیوٹی نہیں ہے۔ حالانکہ نقاد اگر ادب کے ساتھ وقت کا بھی مزاج داں ہو تو ادیب کو آہستہ نہ
احساس ضرور دلا سکتا ہے کہ دیکھو اس موقع پر تمھیں کچھ کہنا چاہیے تھا اور تم چُپ رہ گئے۔ ادیب کو ادب کے
نہیں وقت کے سانچے میں ڈھالنا بھی تو ایک کارِ عظیم ہے۔ اس وقت ہندستان میں مغربی بنگال واحد ریا
ہے جہاں مثالی ترقی پسند حکومت قائم ہے۔ ابھی سال بھر پہلے کلکتہ شہر نے نیلسن منڈیلا کو وہ پُر جوش استق
دیا جو انھیں زندگی میں کہیں اور نہیں ملا۔ اس موقع پر ٹیگر ادیبوں کی رہنمائی میں اُردو اسکولوں کے بچّے بھی
کرتے ہوئے میدان پہنچے تھے۔ لیکن راجیو گاندھی کے قتل پر یہاں کے ادیب بالکل چُپ رہے جبکہ وزیرا
کامریڈ جیوتی باسو نے اس قتل پر اپنے گہرے دُکھ کا اظہار کیا۔ لیکن جوں ہی اسمبلی کے نتائج برآمد ہو
اور دوبارہ کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی مغربی بنگال اُردو اکیڈمی سے وابستہ چند شعرا نے جیتنے والے
بہی خواہ مسلمان / اردو ممبران اسمبلی کی شان میں قصیدے اور قطعات لکھ ڈالے۔ بلکہ دو ایک فتح مندوا
خود اکیڈمی نے جشن منایا!۔ اس صورت حال پر "آزاد ہند" کے مدیر احمد سعید ملیح آبادی نے اپنی مایوسی او
کا اظہار ایک مکمل اداریہ میں کیا۔

یہ سب برسبیل تذکرہ بیان ہوا۔ مقصد صرف یہ تھا کہ اس کی طرف اشارہ کر دیا جائے کہ اردوا
کہاں جا رہا ہے اور ادب کس سمت میں رواں ہے۔ وابستگی کا معیار اور اس کی نوعیت کیا ہو گئ
ادیب محدود سے لامحدود کا سفر کرنے کی بجائے محدود سے محدود تر کی منزل کا مسافر بن گیا ہے۔

جو ادیب نئے موضوعات لے کر آگے آتے ہیں ناقدوں کو ان کی کوششوں کو سراہنا چاہیے
مین تخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اگست ۱۹۹۱ء کے شمارہ "کتاب نما" میں 'تخلیق کار اور ناقد' کے عنوان سے
مہمان اداریہ علی جواد زیدی صاحب نے تحریر کیا ہے اس میں بجا طور پر انھوں نے لکھا ہے کہ تخلیق کار شروع
ناقد کی رائے کا طلب گار تھا۔ انھوں نے رفعت سروش کی بحث کو آگے بڑھانے کی سعی کی ہے کہ جو فن کار مس
سے مصروفِ سفر ہیں اور جنھوں نے اپنے فن کے بل بوتے پر اپنے لیے جگہ بنالی ہے ان کی طرف ناقدین کا رو
ہو۔ لیکن ناقدین کا اپروچ ایسے تخلیق کاروں کی جانب کیا ہونا چاہیے اس پر خود زیدی صاحب نے
اشاریہ میں واضح اشارے نہیں کیے۔ انھوں نے دو تین ادبی رسائل کے مقام و مرتبہ کا اعتراف کیا ہے
اچھے ناقدوں کی اچھی خدمت انجام دیتے آئے ہیں نیز شعری مجموعوں کی بہتات کے آگے ناقدوں کی بے بس

لا انتقادیاتی مصروفیات کی بنا پر کچھ نہ لکھ پانے کے لیے انھیں جواز مہیا کر دیا ہے۔ اور کسی کے لحاظ خاطر میں
بدولت سفارش پر کچھ لکھنے کو بھی ناقد کی مجبوری سے تعبیر کیا ہے کہ پنڈ چھڑانے کے لیے جو کچھ لکھا جاتا ہے اس
تنقید کا معیار گرتا ہے۔ کیا اس سے اس رائے کو تقویت نہیں ملتی کہ تخلیق کار کو اب ناقد کی رائے کا طلب گار نہیں
ہونا چاہیے؟ آج ناقدوں کی تعداد امید افزا نہیں کہی جا سکتی۔ ایسے نقاد تو بہت کم ہیں جو ادب کے عصری رجحانات
دلچسپی لیتے ہوں اور جدید قلمکاروں کی تازہ کار چیزوں کو اپنے مضامین کا موضوع بناتے ہوں۔ آج تنقید نگاروں
اپنے لیے اسپیشلائزیشن بزنس کھول رکھا ہے۔ کوئی لسانیات تو کوئی ساختیات کی دنیا میں نام کما رہا ہے۔ زیادہ
زیادہ تصنیفات اقبال اور غالب ایسی ہی گزری ہوئی شخصیتوں کے بارے میں شائع ہوتی ہیں جو کالجوں اور
نیورسٹیوں میں داخل نصاب ہیں۔ ہمارے یہاں تخلیق کار بھوکا ہے جبکہ ناقدین کی حالت بری نہیں کہی جا سکتی۔ بالخصوص
نقادوں کی جو تعلیمی پیشے سے وابستہ ہیں۔ بہر حال ان کی محنت پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ علی جواد زیدی صاحب کا یہ
رانا "اچھا صاحب ناقد نے محنت کر کے کچھ لکھا اور بھیجا اور وہ شائع کہاں ہوا جس کا سرکولیشن بہت محدود ہے" کافی
رت ہے لیکن جب کوئی ناقدِ عالی مرتبت اپنی کتاب شائع کراتا ہے تو اس کی تعداد اشاعت کتنی ہوتی ہے اور سو
دو بلکہ پانچ پانچ سو روپے کی قیمت کی کتاب کو وہ کتنی خوبصورتی سے اور کتنی جلد ٹھکانے لگا دیتا ہے اور اپنے نئے
ایسں منہمک ہو جاتا ہے جس میں پچھلی کتاب پر اِدھر اُدھر سے انعامات حاصل کرنا بھی شامل ہے۔ ہمارے بیشتر ناقد زندہ
نئے تخلیق کاروں سے وہ سروکار نہیں رکھتے جو انھیں رکھنا چاہیے۔ اگر نئے تخلیق کار اپنے موجودہ مقام و مرتبہ سے
لا نہیں ہو پاتے اور اپنے لیے کسی صحیح سمت کا تعین نہیں کر پاتے تو اس کا ایک سبب ان سے ناقدین کی غفلت بھی ہے۔
دی صاحب کہتے ہیں کہ نقادوں کی نظر رفتارِ ادب پر بحیثیت مجموعی رہتی ہے۔ لیکن ہماری ناقص رائے میں رفتارِ ادب سے
ف ہونا اور ادب کو رفتار اور ایک نئی سمت دینا یہ دو الگ باتیں ہیں۔ ادب کو نئے موضوعات دینے کے لیے
یوں میں شعوری اور ذہنی کشادگی پیدا ہونا چاہیے۔ اس کی طرف انگشت نمائی بلکہ اس کی صورت گری میں پہل نقاد ہی
سکتے ہیں۔ نامور ترقی پسند شاعر اور افسانہ نگار جو بامِ عروج تک پہنچے یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں اپنے موافق نقاد
دلے جو انھی کی طرح اپنے کام میں سرگرم رہا کرتے تھے۔ جب تک عصری ادب اور عصری تنقید کی کوششیں یک جہت
ایک دوسرے کے لیے فکر مند رہیں دونوں اصناف ایک دوسرے سے مستفید ہوتی رہیں۔ لیکن ادھر نئی تنقید نئی تخلیق
حال سے بے خبر ہے اور خود غرضی کی راہ پر چل رہی ہے۔ گذشتہ چھے ماہ کے ادبی رسائل اُٹھا کر دیکھ لیجیے۔ کتنے
یاں کا افسانے، ناول، ڈرامے، مزاحیہ اور سنجیدہ مضامین ان میں شائع ہوئے معلوم ہو جائے گا۔ شاعری پھر
ناال سے کسی بہتر مقام پر کھڑی ملے گی۔ لیکن تازگی اور تنوع کا احساس دلانے والا ادب بہت کم ہاتھ آئے گا
بر ادیوں کی یہ کسرت کمہاروں کی محنت سے ملتی جلتی نظر آتی ہے جو آج بھی مٹی کے ویسے ہی برتن بنا رہے
ہا جیسے سو پچاس برس پہلے بنائے جاتے تھے۔ حسن کا معیار کس طرح بدلے گا اور کون بدلے گا؟

بچوں کی نئی دلچسپ کتابیں

ننھے منے بچوں کے لیے

کتاب		قیمت
بتاشے		۶/۵۰
جاں نثار دوست		۵/:
چاند کی بیٹی	(با تصویر)	۵/:
دم کٹی لومڑی	"	۶/۵۰
جادو کی ہنڈیا	"	۵/:
شیرا اور بکری	"	۶/۵۰
کوے کا خواب	"	۶/۵۰
بھیڑیے کا گانا	"	۶/۵۰
چالاک بلی	"	۶/:
گدھے نے بجائی بانسری	"	۶/۵۰

بڑے بچوں کے لیے

کتاب	قیمت
نزدولی کا آدم خور	۴/=
غریب لکڑہارے کی کہانی	۶/=
خلائی مسافر	۶/-
ہمت کے کرشمے	۶/-
مونٹی کرسٹو کا نواب	۹/:
ہمارے عظیم سائنس داں	۸/:
سام پر کیا گزری	۳/۵۰
غذا کی کہانی	۳/-
زیور	۶/-
شہنشاہ نے کہا میں مفلس ہوں	۶/-
ایک غوطہ خور کی آپ بیتی	۶/-
سنہرے اصول	۳/-
نرالے گویے	۴/-
باتونی کچھوا	۴/-
بدر شہزادی	۶/-

کتاب	قیمت
مولانا آزاد کی کہانی	۱۸/:
تنہا سیاح	۷/-
ابو خاں کی بکری	۱۵/-
پرواز کی کہانی	۳/-
سمندری طوفان اور تین لڑکے	۶/-
خالی ہاتھ	۹/:
حاجی بابا کی ڈائری	۶/۵۰
بہادر علی	۷/۵۰
کھلونا نگر	۷/:
ایک وحشی لڑکے کی آپ بیتی	۶/:
قصہ اژدہا پکڑنے کا	۵/:
ننھا سراغ رساں	۵/:
ابو علی کا جوتا	۵/:
چند مشہور طبیب اور سائنس داں	۹/-
چور پکڑو	۳/-
چالاک خرگوش کے کارنامے	۷/۵۰
جادو کی سارنگی	۳/-
جادو کا چھلا	۳/-
پانچ جاسوس	۸/۵۰
جنگل کی ایک رات	۶/:
ہرن کا دل	۲/:
اچھی کہانیاں	۲/۵۰
دریا کی رانی	۲/:
گوہر شہزادی	۳/:
تین اناڑی	۶/:
چوری کی عادت	۳/۵۰
شرارت	۳/:
دلی کی شادی	۴/:
گاندھی جی دکنی افریقہ میں	۲/:
بندر اور نائی	۳/۵۰
رنگوں کی بستی	۴/:

- پراسرار غار
- عرب دیسوں کی عوامی کہانیاں
- بچوں کے ذاکر صاحب
- ننھا ٹٹو
- آؤ ڈراما کریں
- سلامہ صمصامہ
- مچھیرا اور اس کی بیوی
- ایک کھلا راز
- بھوتوں کا جہاز
- صحت کی الف بے
- لومڑی کا گھر
- بچوں کی کہانیاں
- بابا ناصح
- ہار کی تلاش
- سرخ جوتے
- اندرا گاندھی
- ننھا فرشتہ
- جوہر قابل
- بھیڑیے کے بچے
- ننھا جھبرو
- پلک نہ مارو
- بچوں کے افسر
- شریر شیرا
- پری رانی
- خطرناک سفر
- پرندوں سے جانوروں تک
- ٹوٹے کھلونے
- اندھے کا بیٹا
- پانچ بونے
- بچوں کے چار بزرگ دوست
- سہانے ترانے

نابِ علی سردار جعفری کے تاثرات

کمیونزم کی ناکامی؟

کمیونزم روس میں ختم ہوا ہے ہمارے یہاں نہیں، کمیونزم دراصل ایک تصور ہے بہتر زندگی کا۔ جو کچھ سودیت
یں تھا وہ کمیونزم نہیں تھا بلکہ کمیونزم کی طرف جانے کا صرف ایک راستہ تھا۔ ۱۹۱۷ء میں انقلاب روس نے سامراجی
توں کو ہرا دیا تھا اور پھر روس ایک نئے نظام زندگی کی طرف گامزن ہوا جس میں اس کو کامیابی حاصل ہوئی۔ ۱۹۲۴ء
بعد سے تعمیر شروع ہوئی۔ اس نظام کو بہتر اور زیادہ خوب صورت نظامِ زندگی دیا۔ بھوک کا علاج کیا۔ موٹی جھوٹی
ٹی سب کو ملنے لگی۔ موٹا ہی سہی لیکن کپڑا بھی ملنے لگا، تعلیم عام ہوئی اور حفظانِ صحت کا سب کے لیے انتظام ہوا۔
عمل میں ایک دوسرا منفی عمل بھی موجود تھا اور وہ یہ تھا کہ روس ایک پچھڑا ہوا ملک تھا اور پچھڑے ہوئے ملک میں
وشلزم آیا وہ بھی نسبتاً پچھڑا ہوا تھا اور اس کی وجہ سے روس نے جو صنعت کاری کی اس میں بہت مظالم ہوئے اور
ول بے گناہوں کا خون بہا۔ اس کے علاوہ دوسری چیز یہ ہوئی کہ پارٹی کی جو تنظیم بنائی گئی تھی وہ زارشاہی دور کی
لااس میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کو اکثریت کی رائے سے مخالفت کرنے کا حق نہیں تھا۔ عام اخبارات پارٹی کے
ہ اس طرح تحریر اور تقریر کی آزادی پر پابندی کی وجہ سے جو مظالم اس اسٹالنی دور میں ہو رہے تھے ان کے
ف کوئی آواز نہیں اٹھائی جا سکی۔ اور چیزیں اس حد تک پہنچ گئیں کہ ایک جبر اور خوف کا نظام بن گیا اور وہ نظام
ایک برکت بن کر آیا تھا، اپنی سیاسی تنظیمی کمزوریوں کی وجہ سے لعنت میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے ساتھ جو عمل
روع ہوا وہ دوسری جنگِ عظیم سے تعلق رکھتا ہے۔

اس میں سودیت یونین نے بڑی بے جگری اور بہادری کے ساتھ فاشزم کا مقابلہ کیا۔ دو کروڑ سے زیادہ لوگ
ے گئے۔ بیواؤں، یتیموں کی تعداد لاکھوں کروڑوں میں پہنچ گئی لیکن انسانیت کو فاشزم کے جبر و استحصال سے
ھانے میں روس نے ایک شان دار کردار ادا کیا۔ جنگی تباہی کے ساتھ معاشی تباہی آئی۔ روس کا عالمی وقار اور دبدبہ
گیا لیکن اندر سے معیشت کمزور ہوتی چلی گئی۔ جنگ کے فوراً بعد سامراجی طاقتوں کے ہاتھ میں "ایٹم بم" آ گیا۔ اس کے
بلے میں روس نے بھی ایٹمی ہتھیار بندی شروع کر دی۔ اس میں روس امریکہ کے ساتھ دوسری بڑی طاقت
کر ضرور ابھرا لیکن صرف فوجی طاقت اور اسلحہ کی طاقت کے اعتبار سے، معاشی اعتبار سے وہ اور زیادہ کمزور ہو گیا۔

اور ۱۹۸۵ء تک بحران کے آثار زیادہ گہرے ہوگئے۔
خرشیوف نے ۱۹۵۶ء میں استالنی مظالم کا پردہ چاک کیا تھا جس کے مزید انکشافات گورباچوف نے
لیکن معیشت کا سدھار نہ ہوسکا اور اس کے ساتھ مغربی دنیا کی صارفین سوسائٹی (CONSUMER) کی چمک دمک
سوویت عوام پر یلغار کی۔ اس معاشی نظام کی درستی میں اور جمہوری حقوق کو بحال کرنے میں گورباچوف نے بہت
کارنامہ انجام دیا ہے لیکن گورباچوف سوویت سماج کو مغربی سامراجی یلغار سے بچانے میں ناکام ہوگیا اور اس وقت
بحران ہے وہ اتنا خطرناک ہے کہ سوویت یونین میں خانہ جنگی بھی شروع ہوسکتی ہے اور مغربی طاقتوں کی اس
نظر سوویت یونین کی ایٹمی طاقت پر ہے جس کو وہ تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ جس طرح عراق میں انھوں نے ایٹمی طاقت
تباہ کیا سوویت یونین میں اس طرح تو نہیں کرسکتے لیکن مغربی سامراجی نیت صاف نہیں ہے اور سوویت اس
سے کمزور ہوگیا اور روسی آسانی سے اپنی مدافعت نہ کرسکے۔ ہم تیسری دنیا کے لوگ ہیں۔ ہمارے سامنے افلا
جہالت، بے روزگاری، تعلیم جیسے مسائل ہیں۔ ان کا حل تلاش کرنے میں ہمیں اپنے آپ کو ان غلطیوں سے بچانا
گا جو سوویت یونین کے دور میں ہوئی۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اشتراکی نظام نے جو خواب دیکھے تھے ان میں
کچھ خوابوں کو سرمایہ داری نظام نے اپنے نظام میں شامل کرلیا جو آج خلائی ریاست کا تصور ہے وہ سوشلسٹ نظا
دین ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ صارفین کی سوسائٹی ایک طرح کا سرطانی مزاج رکھ
وہاں کا اخلاقی اور سیاسی اور معاشی بدعنوانیاں سارے عالم انسانیت کے لیے خطرہ ہیں۔ سوویت عوام اس سے وا
ہوں گے تو ان کو اندازہ ہوگا کہ حالات نے ان کو کس جہنم میں دھکیل دیا ہے۔ ہم توقع ضرور کرتے ہیں کہ سوویت کے ا
اقتدار کی کش مکش ہے اس میں گورباچوف کا ہاتھ مضبوط رہے۔ ان کے مقابلے میں جو لیڈرشپ ہے وہ قابلِ اعتبار
خود مغربی ممالک اس کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔ میں نے اپنے ان احساسات کو دو سال پہلے ایک نظم
کیا تھا جس کا ایک شعر اس بیان میں شامل کر رہا ہوں ؎

خدا معلوم کس کس کے لہو کی لالہ کاری ہے
زمینِ کوئے جاناں آج پہچانی نہیں جاتی

سوویت یونین سے سرخ پرچم کو اتار دیا گیا ہے اور اس کے مقابلے پر زار کے زمانے کا ترنگا لہرایا
ہے جس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نیشنلزم کی انتہاپسندی کمیونزم سے زیادہ طاقتور بن گئی ہے۔
آخر میں میں بڑے ادب کے ساتھ ہندستان کی کمیونسٹ پارٹیوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب الگ
کام کرنے کا وقت نہیں ہے۔ بائیں بازو کی ساری طاقتوں کو متحد ہونا چاہیے اور ان کا مزاج ہندستانی اور روح
ہونا چاہیے۔ اپنے ماضی کے شاندار جمہوری اور انقلابی ورثہ کو جو ہزاروں برس کی تاریخ میں پھیلا ہوا ہے۔ اپنی جدو
سے پرچم بنالینا چاہیے۔ سوویت یونین کی ٹریجڈی سے سبق سیکھنا آج کا سب سے بڑا انقلابی عمل ہے۔

سردار جعفری
بیتا محل۔ برمن جی
روڈ، بمبئی

نئی روسی ریپبلک نے کرملن سے سُرخ پرچم کو ہٹا دیا ہے اور زار کے شاہی دور کے تین رنگ کے پرچم کو اختیار کیا ہے۔ سُرخ پرچم سوویت یونین کا قومی پرچم ضرور تھا لیکن یہ روسی انقلاب سے پہلے کا پرچم ہے اور ساری دُنیا کے مظلوموں اور محنت کشوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کا پرچم ہے۔ یہ عالمِ انسانیت کا تنہا پرچم ہے جو قومی اور ملکی سرحدوں سے بلند ہے۔ سیکڑوں برس پُرانا ہے۔ سردار جعفری

الوداع اے سُرخ پرچم الوداع
اے نشانِ عزمِ مظلومانِ عالم الوداع

اے لباسِ آبروے ابنِ آدم السّلام
اے ردائے سر برہنہ بنتِ مریم الوداع

اے فراتِ تشنہ کامانِ جہادِ زندگی
قلزمِ تشنہ لبی کی موجِ برہم الوداع

اے جلالِ کاوۂ آہن گرِ ضحاک کُش
اے زوالِ نخوتِ اسکندر و جم الوداع

آفتابِ بطنِ گیتی کی شعاعِ شب شکن
اے متاعِ انقلابِ دورِ عالم الوداع

اے خس و خاشاکِ گلشن کے لیے برقِ تپاں
روئے گُل پر تابشِ خورشید و شبنم الوداع

اے غرورِ دستِ محنت اے شکوۂ بے نوا
حشر تک دنیا کرے گی تیرا ماتم الوداع

تو نے دیکھا ہے عروج اور تو نے دیکھا ہے زوال
کاش پھر آئے نہ خونباری کا موسم الوداع

دیدۂ پُرنم سے کل دل نے کہا تھا "مرحبا"
کہہ رہی ہے آج لیکن چشمِ پُرنم "الوداع"

جس کی چنگاری کا اک شعلہ تھی انگڑائی تری
دل میں روشن ہے وہ آتش خانۂ غم الوداع

رزم گاہِ خیر و شر میں یاد آئے گی تری
ہم ہیں اب اور لشکرِ ابلیس اعظم الوداع

۱۔ کے شاہنامے میں ایک خونخوار بادشاہ ضحاک کا ذکر ہے جس کے شانوں پر دو سانپ تھے وہ روزانہ دو انسانوں کا مغز کھاتے تھے۔ اس (بادشاہ کی سفاکی کے خلاف ایک لُہار نے بغاوت کی جس کا نام کاوہ تھا۔ وہ کاوہ آہن گر کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے اپنے پیر پر بندھے چمڑے کو بھرے دربار میں نوچ کر اپنا پرچم بنایا تھا جو ایران کا قومی پرچم بن گیا اور درفشِ کاویانی کے نام سے مشہور ہوا۔ ضحاک کو قتل کرنے کے لیے جو لشکر گیا تھا اس کا پرچم کاوۂ آہن گر کا پرچم تھا۔

۲۔ اقبال کے شعر کی طرف جو انقلابِ روس کی تہنیت کا شعر ہے ؎

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ
پت جھڑ کی آواز	(افسانے)	قرۃ العین حیدر
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں
قلندر بخش جرأت	(خطبہ)	جمیل جالبی
عجائب گھر	(بچوں کی سائنسی کتاب)	قاسم صدیقی
تاریخ اودھ	(تاریخ)	ترجمہ و ترتیب شاہ عبدا
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	(ادب)	ظ انصاری
تنقید اور جدید اردو تنقید	(تنقید)	ڈاکٹر وزیر آغا
مشقی تدریس، کیوں اور کیسے؟	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں
آوازوں کا میوزیم	(افسانے)	ساگر سرحدی
اپنی ہواؤں کی خوشبو	(خاکے)	کشمیری لال ذاکر
دلی کی چند عجیب ہستیاں	(خاکے)	اشرف صبوحی
چند تصویر بتاں	(تاثرات)	مولانا عبدالسلام قدوا
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	(ادب)	پروفیسر آل احمد سرور
صاحب جی سلطان جی	(تذکرہ)	ڈاکٹر اسلم فرخی
نظام رنگ	(ادبی خاکہ حضرت نظام الدین اولیا)	" "
شہید جستجو	(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)	ضیاء الحسن فاروقی
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست	(مذہب)	مشیر الحق
ہمارے دینی علوم	(مذہب)	مولانا اسلم جیراجپوری
تحقیقی مضامین	(تحقیقی)	مالک رام
آسان اردو، ورک بک	(تعلیم)	شکیل اختر فاروقی

ڈاکٹر عصمت جاویدؔ
۲۷ پنچول بندا لماڑی پورہ
مین، اورنگ آباد (مہاراشٹرا)

فنِ تاریخ گوئی

"کتاب نما" کے حالیہ شماروں میں فن تاریخ گوئی پر عزیزی حسینی جاوید کا مضمون اور اس سے متعلق محترم شان الحق حقی صاحب کا مراسلہ دونوں نظر سے گزرے یہ امر واقع ہے کہ تاریخ گوئی ایک مخصوص صلاحیت کا طالب ہے جسے تخلیقی صلاحیت کی طرح خداداد کہنا مناسب ہے لیکن یہ فن تیزی سے ناپید ہوتا چلا ہے۔ موجودہ نسل تو اس فن کے بارے میں بہت کم جانتی ہے اس لیے نوجوانوں کی معلومات میں اضافے کی خاطر اور کلاسیکی ادب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے حافظے کو تازہ کرنے کے لیے فن تاریخ گوئی پر ایک مبسوط مقالے کی ضرورت آج بھی باقی ہے۔ اس موضوع پر بہت کم رسالے ملتے ہیں لیکن اول تو یہ رسالے آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے اور پھر ان میں کچھ ایسے متنازعہ فیہ مسائل بھی پائے جاتے ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے۔ اس لیے خاکسار نے اس موضوع پر قلم اٹھانے کی جسارت کی ہے۔

غالباً جب گنتی کے لیے اعداد ایجاد نہیں ہوئے تھے، حروف ہی سے اعداد کا بھی کام لیا جاتا ہوگا۔ مثلاً رومن رسم الخط میں مندرجہ ذیل سات حروف سے اعداد کا کام لیا جاتا تھا۔

I	(آئی)	ایک
V	(وی)	پانچ
X	(ایکس)	دس
L	(ایل)	پچاس
C	(سی)	سو
D	(ڈی)	پانسو
M	(ایم)	ہزار

انہیں حروف کو آگے پیچھے کر کے یا ان کی تکرار سے ہزار سے اوپر تک کے اعداد ظاہر کیے جاتے تھے۔ مثلاً دو کے لیے دو آئی II اور تین کے لیے تین آئی III لکھتے ہیں۔ البتہ چار کے لیے IV اور چھ کے لیے VI لکھا جاتا ہے اسی طرح نو کے لیے IX اور گیارہ کے لیے XI

لکھا جاتا ہے۔ چونکہ رومن رسم الخط میں صرف یہی سات حروف عدد کا اظہار کرتے ہیں اس
رومن حروف کی مدد سے تاریخ گوئی کا کام بڑے پیمانے پر لینا ممکن بھی نہیں ہے اور ن
کا چلن رہا ہے۔ البتہ عربی میں کم کم اور فارسی اور اس کے زیر اثر اردو میں تاریخ گوئی کی
خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ زندگی کے کسی اہم واقعے کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کے لیے چاہے اس
تعلق نوحۂ غم سے ہو یا نغمۂ شادی سے اس فن کا استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ تاریخ گوئی کی بنیاد
پر ہے جس میں ہر حرف کی گنتی مقرر ہے۔ یہ عربی رسم الخط کے اٹھائیس حروف ہیں جن کی ترتیب
حروف ہجا کی ترتیب سے مختلف ہوتی ہے۔ کیونکہ اس ترتیب میں اعداد کی ترتیب ملحوظ
جاتی ہے۔ اِن حروف کو مندرجہ ذیل آٹھ مہمل الفاظ میں ترتیب دیا جاتا ہے۔

(۱) ابجد (۲) ہوز (۳) حطی (۴) کلمن (۵) سعفص (۶) قرشت (۷) ثخذ اور (۸) ضظغ

ان میں چار الفاظ (۱) ابجد (۲) کلمن (۳) سعفص اور (۴) قرشت چہار حرفی ہیں اور ا
الفاظ سہ حرفی۔ چونکہ چہار حرفی الفاظ دو صوت رکنی (DISYLLABIC) ہیں اس لیے سہ حرفی ا
تلفظ میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے مشدد کر دیا جاتا ہے تاکہ یہ بھی تلفظ میں دو صوت رکنی
اور انھیں آسانی سے یاد کیا جا سکے۔ ان الفاظ کو معنی پہنانے کی بھی کوششیں کی گئی ہیں۔ تو
لیے دیکھیے غیاث اللغات لیکن ان کوششوں کا تعلق محض قیاس آرائیوں سے ہے جن کی
سند نہیں۔ ابتدائی تین الفاظ ایک سے دس تک کی گنتی ظاہر کرتے ہیں۔

(۱) ا ↓ ۱، ب ↓ ۲، ج ↓ ۳، د ↓ ۴
(۲) ہ ↓ ۵، و ↓ ۶، ز ↓ ۷
(۳) ح ↓ ۸، ط ↓ ۹، ی ↓ ۱۰

بعد کے دو الفاظ — کلمن اور سعفص بیس سے نوّے تک کی گنتی ظاہر کرتے ہیں۔

(۴) ک ↓ ۲۰، ل ↓ ۳۰، م ↓ ۴۰، ن ↓ ۵۰ اور (۵) س ↓ ۶۰، ع ↓ ۷۰، ف ↓ ۸۰، ص ↓ ۹۰

اور آخر کے تین الفاظ یعنی قرشت، ثخذ اور ضظغ سو سے ہزار تک کی گنتی بتاتے ہیں۔

(۶) ق ↓ ۱۰۰، ر ↓ ۲۰۰، ش ↓ ۳۰۰، ت ↓ ۴۰۰
(۷) ث ↓ ۵۰۰، خ ↓ ۶۰۰، ذ ↓ ۷۰۰
(۸) ض ↓ ۸۰۰، ظ ↓ ۹۰۰، غ ↓ ۱۰۰۰

یہ تمام الفاظ عربی کے حروف ہجا کو محیط ہیں۔ اس لیے جب ایرانیوں نے تاریخ گ
کیا تو جس طرح انھوں نے اپنی زبان کے ان صوتیوں کے لیے جو عربی میں نہیں تھے قریب المخرج
ظاہر کرنے والے حروف سے ملتے جلتے حروف وضع کیے جیسے بائے تازی کے قیاس پر
فارسی پ، جیم تازی کے قیاس پر جیم فارسی چ کاف تازی کے قیاس پر کاف فارسی
ز کے قیاس پر ژ اسی طرح ان قریب المخرج آوازوں والے حروف کی گنتی بھی وہی رکھی ج
حروف کی تھی جو مکتوبی شکل میں قریب ترین تھے یعنی طریقہ ابجد میں ب کا دو عدد
تو انھوں نے پ بھی دو عدد مقرر کیا۔ اسی طرح ج کے قیاس پر چ کے تین۔ ز کے
ژ کے سات اور کاف کے قیاس پر گ کے بیس عدد مقرر کیے۔ اہل اردو نے اپنی زبا

ازول (یا صوتیوں) کے لیے جو نہ تو عربی میں پائی جاتی ہیں، نہ فارسی میں، اہلِ فارس کی تقلید میں
طرح ٹ، ڈ اور ڑ کا اپنے حروف ہجا میں اضافہ کیا، اسی طرح طریقۂ ابجد میں ت کے قیاس پر
کے لیے چار سو، د کے قیاس پر ڈ کے لیے چار اور ر کے قیاس پر ڑ کے لیے دو سو
اعداد مقرر کیے اور مخلوط آوازوں کی نمایندگی کرنے والے حروف بھ، جھ، ڈھ وغیرہم میں دو
ھ کے پانچ عدد کا اضافہ کیا جانے لگا یعنی ب کا عدد دو ہے تو بھ کا ۷، ۵ + ۲ و قس علیٰ ہٰذا۔
مندرجہ بالا تمام حروف جن کی گنتی مقرر ہے۔ "حروف ابجد" بھی کہلاتے ہیں
حروف ابجد کی گنتی یاد رکھنے کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ آٹھ الفاظ جن میں یہ حروف
ہیں مقررہ ترتیب میں یاد کر لیے جائیں اور ہر لفظ کے پہلے حرف کی گنتی حافظے میں محفوظ
لی جائے یعنی الف کا ایک، ہ کے پانچ، ح کے آٹھ، ک کے بیس، س کے ساٹھ، ق کے سو
کے پانسو اور ض کے آٹھ سو تو تمام حروف کی گنتی بوقت ضرورت مستحضر ہو سکتی ہے مثلاً اگر آپ
یاد ہو کہ س کی گنتی ساٹھ ہے اور لفظ سعفص بھی یاد ہو تو آپ ع، ف اور ص کی گنتی بھی
سکتے ہیں۔

تاریخ گوئی میں انھیں اعداد سے کام لیا جاتا ہے۔ اُسے طریقۂ ابجد یا حساب جمل، زُبُر یا زُبُر کہتے
لیکن تاریخ گوئی میں عدد شماری کے دو اور طریقے بھی رائج ہیں جو علم جفر سے مستعار ہیں، ہمارے
لخط میں ہر حرف کا نام بھی ہوتا ہے جیسے "الف"، جیم، دال، میم، نون وغیرہ انھیں اسم حرف
ہیں اگر ہم ان ناموں کے سر حرف یعنی الف کا 'ا'، جیم کا 'ج'، دال کا 'د'، میم کا 'م' اور نون کا 'ن'
نظر انداز کر دیں تو "لف"، "یم" "ال" "ون" باقی رہتے ہیں۔ لف کے اعداد (۳۰ + ۸۰) یعنی
سو دس یم کے اعداد (۱۰ + ۴۰) پچاس، ال کے اعداد (۱۰ + ۳۰) چالیس اور ون کے
اد (۶ + ۵۰) چھپن ہوتے ہیں۔ عدد شماری کے جس طریقے میں حروف کے ناموں کے سر حرف کو
انداز کر کے ان کے بچے ہوئے حروف کی گنتی شمار کرتے ہیں اسے اصطلاح میں "بیّنات"
تے ہیں جس کا واحد "بیّنہ" ہے۔

بیّنات میں الف کے اعداد ایک سو دس، جیم کے پچاس، دال کے چالیس میم کے
اس اور نون کے چھپن لیے جاتے ہیں کچھ حروف ایسے بھی ہیں جن کے ناموں کے آخر میں
طریقہ تلفظ کے لحاظ سے حرف آ آتا ہے جیسے با، تا، ثا، حا، خا، را، زا، فا، ہا اور یا بیّنات میں
نام حروف میں ہر حرف کا عدد صرف ایک ہے کیونکہ اس طریقہ عدد شماری میں یی کے دس
لینا غلط ہے۔ ناموں کے سر حرف کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ ان حروف کے ناموں
اردو تلفظ یعنی بے تے رے وغیرہ کو بنیاد بنا کر ایک اور طریقہ عدد شماری بھی مستعمل ہے
میں زُبُر اور بیّنات دونوں کا استعمال ہوتا ہے یعنی ہر حرف کے نام میں آنے والے حروف
مجموعی تعداد شمار کی جاتی ہے۔ اسے اصطلاح میں زبر و بیّنات کہتے ہیں طریقہ زبر میں الف
عدد ایک ہے۔ طریقہ بیّنات میں اس کا عدد ایک سو دس ہے اور طریقہ زبر و بیّنات میں
ہو گیارہ (۱۱، ل + ف = ۱ + ۳۰ + ۸۰)

اسی طرح زبر کی رو سے ج کا عدد تین، بینات کی رو سے پچاس اور زبر و بینات کی تریپن (۵۳) ہے۔ جن حروف کے ناموں کے آخر میں الف آتا ہے، اس میں ایک کے ا سے زبر و بینات کا عدد برآمد ہوتا ہے مثلاً ب کا عدد دو ہے، بینات میں ایک ہے اور زبر میں ۲ + ۱ = تین ہے۔ جب کوئی شاعر تاریخ گوئی میں اس طریقہ و عدد شماری کو استعمال کرے تو وہ اس کی طرف اشارہ بھی کر دیتا ہے۔ مثلاً ایک شاعر کہتا ہے۔

زبر و بینہ میں فکر جو کی۔ ہوئی تاریخ "وفاتِ تسلیم"

۱۲۹۹

اس کا تجزیہ حسب ذیل ہے۔

وفات = واؤ + فاء + الف + تاء

۱۴ + ۸۱ + ۱۱۱ + ۴۰۱ = ۶۰۶

تسلیم = تاء + سین + لام + یا + میم

۴۰۱ + ۱۲۰ + ۷۱ + ۱۱ + ۹۰ = ۶۹۳

۱۲۹۹

فیضی نے ایک رباعی میں دو لفظ "اکبر" اور "آفتاب" سے ایک ہی عدد نکالا ہے زبر کی رو سے 'اکبر' کے اعداد ۲۲۳ ہوتے ہیں اور بینات کے حساب سے آفتاب کے بھی ۲۲۳ ہوتے ہیں۔ الف + فا + تا + الف + با

۱۱۰ + ۱ + ۱ + ۱۱۰ + ۱ = ۲۲۳

اس لیے فیضی کہتا ہے

'اکبر' گر ز 'آفتاب' دارد نسبت ۔ این نکتہ ز بیناتِ اسما پیداست

ایک صاحب نے بینات میں اس طرح تاریخ کہی ہے۔

سال تاریخش محقق زد رقم در بینات ـــــ نظم دلکش، راحت افزا جانفزا و باوقار

۱۳۰۰

زبر و بینات کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔

یہ کہا ہاتف نے جو تہرے بہ زبر و بینات ـــــ ہائے افسوس اور اک بزم سخن کا شہ اٹھا

مصرع ثانی کے اعداد بحساب زبر ۱۹۴۹ ہوتے ہیں جو سال سمت ہے اور بحساب بینات ۱۳۰۹

تاریخ گوئی میں حساب زبر عام ہے اور اسی کو طریقہ ابجد بھی کہتے ہیں۔ تاریخ کی بالعموم حروف متعلقہ کی میزان دیکھی جاتی ہے لیکن تاریخ گوئی کا ایک طریقہ ایسا بھی ہے حروف کے اعداد اکائی، دہائی، سیکڑہ اور ہزار کی ترتیب میں رکھے جاتے ہیں۔ انھیں جمع جاتا اس تاریخ کو اصطلاح میں تاریخ تعداد کہتے ہیں مثلاً لفظ طوبا کے اعداد حروف کی ترتیب سے لکھیں یعنی ط و ب ا

۹ ۶ ۲ ۱

تو ۱۲۶۹ برآمد ہوتا ہے۔

تاریخ تعداد میں دہائی اور سیکڑہ ظاہر کرنے والے اعداد کے صفر ظاہر نہیں کیے جاسکتے اگر کسی حرف کا عدد بیس ہو جیسے کاف کا ہے تو دہائی کے خانے میں صرف ۲ لکھنا ہوگا اسی طرح ق کا عدد سیکڑے کے خانے میں صرف ۱ لکھنا ہوگا شاعر اس اشکال کو دور کرنے کے لیے صفر ہٹانے کا اشارہ بھی کرتا ہے مثلاً ناسخ تاریخ تعداد اس طرح کہتے ہیں۔

چوں زوالِ آمد عدد بے صفر شد | در حکیم از حا و کاف و یا و میم
پائے او آمد ز عبرت زیر سر | اندریں مشکل است تاریخ حکیم

"حکیم" کے پیر یعنی م کے چالیس کو ح کے آٹھ کے بعد لکھیے۔ کاف کے بیس اور ی کے دس۔ ان اعداد جو لکھے جائیں گے وہ ۸، ۴۰، ۲۰۱ اور ۱۰ ہوں گے۔ ہدایت یہ ہے کہ ان کو بے صفر ہونا چاہیے اس لیے ان کے صفر درمیان سے ہٹا دیجیے تو ۱۲۴۸ باقی رہ گئے۔ نہ لہ

تاریخ گوئی کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ مطلوبہ سن کا اظہار عبارت کے ذریعے ہوتا ہے اسے تاریخ ملفوظی" یا تاریخ صوری کہتے ہیں۔ مثلاً ابن نشاطی اپنی تصنیف پھولبن کی تاریخ تصنیف عبارت کے ذریعے اس طرح ظاہر کرتا ہے۔

اتھا تاریخ تو لایا بہ گلزار | اگیارہ سوں کوں کم تھے تیس پر چار

یعنی گیارہ سو میں چونتیس کم = ۱۰۶۶

اگر بحساب طریقہ ابجد تاریخ برآمد ہو تو اسے "تاریخ معنوی" کہتے ہیں۔ بعض شعرا ایک ہی مصرعے میں تاریخ صوری اور تاریخ معنوی دونوں کا التزام کرتے ہیں مثلاً

ایں صوری و معنویت تاریخ وصال | ہشتاد و چہار و یک ہزار و دو صد

ہشتاد و چہار یعنی ۸۴ اور ایک ہزار و دو صد یعنی ۱۲۰۰ یعنی ۱۲۸۴ طریقہ ابجد سے اس عبارت کے حروف کے مجموعی اعداد بھی ۱۲۸۴ ہوتے ہیں۔

ہشتاد = ۷۱۰، و = ۶، چہار = ۲۰۹، و = ۶، ایک = ۳۰، ہزار = ۲۱۳، و = ۶، دو = ۱۰، اور صد = ۹۴، میزان کل ۱۲۸۴

اسے "صنعِ الصنع" بھی کہتے ہیں۔ ڈاکٹر ظہیر صدیقی نے ایک تاریخ کا ذکر کیا ہے جس میں تاریخ ظاہری سے سن عیسوی برآمد ہوتا ہے۔ ؎

جو پوچھے کوئی حال ان حادثوں کا | تو کہہ دو کہ تیرہ سو اٹھارہ ہجرت

۱۹۰۱ء

کبھی شاعر ایک ہی مصرع میں دو تاریخیں کہتا ہے جیسے امیر مینائی کی یہ تاریخ

ع گوہر تاج ریاست ، ابر رحمت ظل حق

۱۸۸۹ء ۱۳۰۶ھ

لہ منقول از "دلچسپ تاریخیں" از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی مطبوعہ "آواز" ستمبر ۱۹۷۹ء
ٹہ ایضاً

کبھی ایک ہی مصرع یا جملے میں ایک فقرے سے ہجری یا عیسوی اور پورے مصرعے یا جملے سے عیسوی یا ہجری تاریخ نکالتے ہیں جیسے

شد طبع "غرائب الجمل ملک پسند"

۱۳۱۷ھ

۱۹۰۸ء

جس مصرع سے دو تاریخیں برآمد ہوں اسے اصطلاح میں "ذو تاریخین" کہتے ہیں۔ ذوتاریخین کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو جس میں مصرع اولیٰ سے عیسوی سن اور مصرع ثانی سے ہجری سن برآمد ہوتا ہے۔

عید اضحیٰ ہو مبارک اے شہ عالی وقار　　عید قرباں ہو مبارک اے شہ دریا نوال

۱۹۱۱ء　　۱۳۲۹ھ

تاریخ ایک حرف یا لفظ یا فقرے یا پورے مصرعے یا پھر پورے شعر سے بھی نکالی جاتی ہے۔ اگر پورے مصرعے سے یا پورے شعر سے تاریخ نکالی جائے تو اسے "تاریخ کامل" کہتے ہیں "اگر حرف سے تاریخ نکالیں تو اسے "تاریخ مفرد" کہتے ہیں۔ تاریخ مفرد کی مثال ناسخ کی وہ تاریخ جو انھوں نے حکیم مہدی کے وزارت سے معزولی ہونے پر کہی تھی جس کا ذکر آب حیات میں آیا ہے۔

افتاد حکیم از وزارت　　تاریخ بطرز نو رقم کن
از جائے حکیم ہشت برگیر　　سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

حکیم کے "ح" کے آٹھ عدد ہیں۔ اسے تین مرتبہ نصف کر کے ترتیب سے لکھنے پر ۱۲۴۸ برآمد ہوتا ہے۔ یہ تاریخ صنعت تعداد میں ہے۔ چونکہ اس تاریخ میں اعداد کو نصف کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اس لیے اسے "تاریخ تنصیف" بھی کہتے ہیں۔

تاریخ کامل کی مثال

کی عطا انگشتری تاریخ نکلی اے جلیل　　دی شہ یکتا نے یہ مہر سلیمانی مجھے

۱۳۲۸

ظ انصاری کی وفات پر شان الحق حقی صاحب کی مندرجہ ذیل تاریخ کامل اس لیے دلچسپ ہے کہ پورے شعر سے تاریخ برآمد ہوتی ہے اسے "تاریخ اکمل" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

زندہ محفل میں رہی اک ان کی یاد

۱۵ + ۳۰ + ۵۱ + ۲۱ + ۲۱۵ + ۱۰۰ + ۱۵۸ + ۶۶

۶۵۶

واقعہ ہے ہو گئے افسانہ "ظ"

۹۰۰ + ۱۹۷ + ۳۰ + ۱۱ + ۱۵ + ۱۸۷

۱۳۲۵

۶۵۶ + ۱۳۳۵ = ۱۹۹۱ء

کبھی کبھی ایک فقرہ سے بھی تاریخ نکلتی ہے

گئے جو خلد بریں میں تو ان کی تربت پر　　جلیل نے یہ لکھا روضۂ جناب امیر

۱۳۱۸ھ

شناخت کے لیے اس طرح کے لفظ یا عبارت کو جس سے مادۂ تاریخ نکلے خط کشیدہ کر دیتے ہیں اور تاریخ متعلقہ ہندسوں میں مع سال ہجری یا عیسوی یا فصلی لکھتے ہیں خط مادۂ تاریخ کے اوپر کھینچتے ہیں اب نیچے بھی کھینچنے لگے ہیں۔

صنعت کے اعتبار سے تاریخ کی کئی قسمیں ہیں. چند اہم قسمیں درج ذیل ہیں.

(۱) صنعت منقوط یا معجمہ۔ خط کشیدہ فقرے یا مصرع کے صرف حروف منقوط کے اعداد سے مطلوبہ تاریخ برآمد کی جائے تو اسے تاریخ در صنعت منقوط یا معجمہ یا صرف "تاریخِ منقوط" کہتے ہیں مثلاً جلیل مانک پوری کی مندرجۂ ذیل تاریخ صنعت منقوط میں ہے۔

جلیل اچھی کہی تاریخ یہ منقوط میں تم نے　　چراغِ کعبۂ علم و عمل محمود شاہ آئے

مصرع ثانی میں حروف نقطہ دار چ ، غ ب ، ش یا ہیں

۳ + ۱۰۰۰ + ۲　+ ۳۰۰ + ۱۰

ان کی حاصل جمع ۱۳۱۵ ہے

(۲) صنعت غیر منقوط یا مہملہ۔ فقرے یا مصرعے کے صرف حروف غیر نقطہ دار (مہملہ) سے تاریخ نکالنے کو کہتے ہیں۔

(۳) صنعت تنقیط

بے نقطہ حروف کو منقوط فرض کر کے ان کے اعداد کی حاصل جمع سے تاریخ نکالنے کو صنعت تنقیط کہتے ہیں مثلاً

صنعت تنقیط میں ہے اس کا سال　　ایک کو نقطہ لگا کر دس کیا

مصرع ثانی میں ط ، ر ، دال اور سین غیر نقطہ دار حروف ہیں۔ انھیں نقطہ دار یعنی ظ ، ز ، ذ اور ش فرض کر کے تاریخ نکالی ہے ۱۹۰۷ء

(۴) صنعت سلب تنقیط

نقطہ دار حروف کو غیر نقطہ دار فرض کر کے ان کے اعداد کی حاصل جمع سے تاریخ نکالنا یہ صنعت تنقیط کی ضد ہے۔ ایک ہی مصرع میں تنقیط اور سلب تنقیط دونوں کو جمع کیا جا سکتا ہے۔

(۵) صنعت سجع : مصرع تاریخ میں کسی کے نام کو اس طرح لانا کہ وہ اسم خاص نہ رہے مثلاً کسی الٰہی بخش کی رحلت پر یہ تاریخ کہی گئی ہے ع الٰہی بخش دے اپنے کرم سے

۱۳۵۶

(۶) صنعت توشیح : اس صنعت کو کہتے ہیں جس میں ہر مصرع میں شاعر پہلا حرف ایسا لاتا ہے

کہ ہر مصرعے کے اوّل حروف کو اسی ترتیب میں رکھیں جس ترتیب میں وہ مصرعوں میں آئے ہیں تو شخص مطلوب کا نام بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہر مصرع کے پہلے حروف کو بحساب جمل جمع کر لیا جائے اور اس سے سال مطلوبہ بھی برآمد ہو تو اسے 'تاریخ درصنعت توشیح' کہتے ہیں۔

(۷) صنعت تضارب: جب کسی لفظ یا فقرے کے اعداد کو دوسرے لفظ یا فقرے کے اعداد سے ضرب دے کر مطلوبہ تاریخ برآمد ہو تو اسے 'تاریخ درصنعت تضارب' کہتے ہیں۔

مثلاً ؎ اوج را بر قال زن تا سال نو آید پدید

۱۳۱ ۱۰

'اوج' کے اعداد دس ہیں اور قال کے ایک سو اکتیس دونوں کا حاصل ضرب ۱۳۱۰ ہے جو مطلوبہ تاریخ ہے۔

مہتاب داغ کی تاریخ صنعت تضارب میں ملاحظہ ہو۔

سال فصلی یوں بھی نکلے اے الم تین چکر گر لگائے روزگار

۴۳۴

روزگار کے اعداد چار سو چونتیس کو تین سے ضرب دینے سے ۱۳۰۲ ہوتے ہیں جو مطلوبہ تاریخ ہے۔

(۸) صنعت تضاعف: اگر لفظ یا فقرے کے اعداد کو دوگنا کرنے سے مطلوبہ تاریخ نکلے تو اسے 'صنعت تضاعف' میں لکھی ہوئی تاریخ کہیں گے۔

ضیا نے عرض کی جلوے کی تاریخ مضاعف ہو گیا نورِ علیٰ نور

۱۳۴ = ۲ × ۶۲۲

صنعت تنصیف کی مثال تاریخ کے صنعت تعداد میں لکھی ہوئی تاریخ کے تحت گزر چکی ہے جس میں جائے حطی کو تین بار نصف کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مصرع تاریخ یا مادۂ تاریخ کے اعداد مطلوبہ تاریخ سے کچھ کم یا زیادہ ہو جاتے ہیں اس لیے کسی لفظ یا حرف کے اعداد گھٹا بڑھا کر مطلوبہ تاریخ کے اعداد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اہلِ ایران اسے عجز بیان کی دلیل سمجھتے تھے اور بقول آزاد "اصول فن کے بموجب ۹ سے زیادہ کمی دبیشی جائز نہیں" (آبِ حیات) لیکن اساتذہ اردو نے اسے محسنات میں داخل سمجھا ہے اور نہ ۹ کی قید کی پابندی کی ہے۔

اگر مصرع تاریخ کے اعداد میں سے کسی لفظ یا حرف کے اعداد گھٹا کر مطلوبہ تاریخ حاصل کی جائے تو اسے اصطلاح میں "تخرجہ" یا "تعمیہ خارجی" کہتے ہیں۔ اور اگر کسی لفظ یا حرف کے اعداد جوڑ کر مطلوبہ تاریخ حاصل کی جائے تو اسے "تعمیہ" یا "تعمیۂ داخلی" کہتے ہیں تاریخ گو شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ خوبصورتی سے اس لفظ کی طرف اشارہ کر دے جسے گھٹانا یا بڑھانا ہے۔ مومن کی مندرجہ ذیل تاریخ "تخرجہ" کی عمدہ مثال ہے۔

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے۔ کہی تاریخ "دفترِ مومن"

دفترِ مومن کے اعداد ۱۳۴۰ ہیں اور لفظ نال کے ۸۱۔ اگر نال کے اعداد دفترِ مومن سے خارج
دیے جائیں تو مطلوبہ تاریخ ۱۲۵۹ برآمد ہوتی ہے۔ چونکہ یہ تاریخ ولادت ہے اس لیے لفظ
نل کا استعمال برمحل ہوا ہے اور اس کے "کٹنے" کا ذکر کر کے شاعر نے یہ اشارہ دیا ہے کہ اس لفظ
کے اعداد منہا کیے جائیں۔ تخرج کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں۔

بولے منصف دور کر پائے عناد ــ شاعرانِ ہند کا سرور گیا

یہ سودا کی تاریخ وفات ہے۔ مصرعِ ثانی سے ۱۱۹۹ برآمد ہوتے ہیں جب کہ سودا کی تاریخ وفات
۱۱ہے اس لیے چہار کا عدد منہا کرنا ضروری تھا۔ شاعر نے پائے عناد یعنی دال کو دور کرنے کا مشورہ
اور دال کے عدد چار ہوتے ہیں شعرا عموماً لفظ "سر" کے اشارے سے یہ بتاتے ہیں کہ فلاں ابتدائی
ف کو نکال دیجیے یا شامل کیجیے اسی طرح پا سے مراد ہوتی ہے لفظ کا آخری حرف۔ بے سروپا سے
ہے مرف درمیانی حرف کا رہ جاتا جیسے قلم کا لام تعمیہ یا تعمیۂ داخلی کی مثالیں

مومن نے اپنے والد غلام نبی کی مندرجۂ ذیل تاریخ وفات میں تعمیہ کا استعمال کیا ہے۔

بمنِ الہام گشت سالِ وفات ــ کہ غلام نبی بحق پیوست

مصرع ثانی میں غلام نبی کے اعداد ۱۱۳۳ میں "حق" کے ۱۰۸ عدد شامل کر دیں (جس کی
ت لفظ پیوست میں ملتی ہے) تو مطلوبہ سن وفات ۱۲۴۱ برآمد ہوتا ہے۔

سالگرہ شاہ کی تاریخ در صنعت تعمیہ ملاحظہ ہو

ادب کے ساتھ یہ دے نذر مصرع تاریخ　　گرہ کشائے زمانہ ہے شہ کی سالگرہ

۱۳۲۵ + ۷ ، ۱۳۳۲

تاریخ گوئی کی بنیاد صرف حروف کی مکتوبی شکل پر ہوتی ہے۔ ان کے تلفظ پر نہیں۔ جس طرح
ا کا عدد ایک ہے اسی طرح الف ممدودہ آ کا عدد بھی ایک ہے۔ اگرچہ الف کا تلفظ آ سے الگ

تاریخ گوئی میں تشدید کے دو حروف نہیں لیے جاتے اگرچہ تلفظ میں ایک ہی آواز کی
ہوتی ہے۔ مثلاً لفظ قصّہ میں ایک ص کے ۹۰ عدد لیے جائیں گے دو ص کے نہیں۔ البتہ چونکہ
اللہ میں دو مرتبہ لام لکھا جاتا ہے اس لیے اس میں دو لام کے اعداد ۳۰ + ۳۰ لیے جائیں گے اس
لفظ کے اعداد ۶۶ محسوب ہوتے ہیں۔

اسی طرح اضافت کسرہ اور اگر ہمزہ اضافت کا کام کرے تو اسے بھی نظر انداز کیا جاتا
ہے گلِ رعنا میں زیر اور جادۂ راہ میں ہمزہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہمزہ کا شمار حروف تہجی
نہیں ہوتا اس لیے اسے الف کا قائم مقام سمجھ کر اس کا ایک عدد لینا بالاتفاق غلط قرار دیا
ہے۔

الف مقصورہ جیسے الفاظ عیسیٰ، موسیٰ اور لیلیٰ میں غیر محسوب ہوتا ہے۔
تنوین بھی غیر محسوب ہوتی ہے مثلاً آناً فاناً مثلاً اور فوراً میں الف کا ایک عدد لیا جاتا

نون کی طرح نون غنہ کے بھی پچاس عدد محسوب ہوتے ہیں۔ عربی رسم الخط میں تا (تے) تین شکلوں میں لکھی جاتی ہے۔

(۱) تائے دراز جیسے الفاظ آیات اور کائنات میں (۲) تائے دامندار جیسے الفاظ رحمۃٌ یا رحمۃً اجابتۃٌ یا اجابتۃً وغیرہ میں یہ طرز املا صرف عربی رسم الخط کے لیے مخصوص ہے۔ اردو میں فارسی کی تقلید میں انھیں تائے دراز سے لکھتے ہیں جیسے رحمت، اجابت، (۳) تائے مدورہ عربی رسم الخط میں الف، دال، ذال راء زا اور واؤ ایسے حروف ہیں جو حروف ماقبل سے تو متصل ہو سکتے ہیں لیکن حروف مابعد سے نہیں، ایسے حروف کے بعد تا آئے تو تائے دامندار کی جگہ تائے مدورہ (گول تے) کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے مرأۃٌ، اعادۃٌ، ادارۃٌ، اجازۃٌ، اخوۃ حیوۃً عربی صوتیات میں جب تائے دامندار یا تائے مدورہ پر وقف کرتے ہیں تو تے کی جگہ ہ کی آواز نکلتی ہے۔ جسے تائے موقوفہ کہتے ہیں چونکہ تائے موقوفہ کی آواز ہ ہوتی ہے اس لیے جب ایسے الفاظ فارسی میں آئے تو اہلِ ایران تائے موقوفہ کو بعض صورتوں میں ہائے مختفی کی طرح لکھنے لگے جیسے حادثۃٌ کو حادثہ، مدرسۃٌ کو مدرسہ اور درجۃٌ کو درجہ اہلِ اردو نے بھی اس معاملے میں اہلِ ایران کی تقلید کی، اہلِ ایران نے تو اس طرح کے الفاظ میں سے بعض کو تائے دراز کے ساتھ بھی استعمال کیا اور تائے موقوفہ کے ساتھ بھی مثلاً بقیہ اور بقیت وسیلہ اور وسیلت، اشارہ اور اشارت، اجازہ۔ اجازت، ارادہ اور ارادت وغیرہ لیکن اہلِ اردو نے زیادہ تر تائے موقوفہ ہی کو قبول کیا۔ صرف چند الفاظ میں تائے دراز کو اختیار کیا۔ بہر حال قاعدہ یہ ٹھہرا کہ تائے دراز کی طرح تائے مدورہ اور تائے دامندار کے بھی ۴۰۰ عدد محسوب ہوں مثلاً صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں چونکہ ان کی شکل ہ سے ملتی ہے اور ہ کے پانچ عدد ہیں۔ اس لیے کچھ علمائے فن اصرار کرتے ہیں کہ تائے مدورہ اور تائے دامندار کے ۵ عدد شمار کریں چار سو نہیں لیکن اکثریت ایسے اساتذہ کی ہے جو تائے مدورہ اور تائے دامندار کے ۴۰۰ اعداد ہی محسوب کرتے ہیں البتہ اگر یہ تائے موقوفہ ہائے مختفی کی طرح لکھی جائے جیسے مدرسہ، درجہ ارادہ وغیرہ میں تو اس تائے موقوفہ کو ہائے مختفی قرار دے کر صرف ۵ عدد شمار کرتے ہیں اور یہی مسلک درست ہے۔ اگر تائے مدورہ پر دو نقطے لکھے ہوں جیسے صلوٰۃ میں تو اس کے چار سو اعداد محسوب ہوں گے۔ لفظ رحمت اللہ کو تائے دراز کے بجائے قرآنی املا کی متابعت میں اگر رحمۃ اللہ لکھا جائے اس صورت میں بھی تائے دامندار کے چار سو اعداد محسوب ہوں گے لیکن جلیل مانک پوری صاحب غرائب الجمل کا اصرار ہے کہ تائے دامندار کے صرف ۵ عدد محسوب ہوں [1]

چونکہ ہمزہ ء حروف ہجا میں شامل نہیں ہے اس لیے مندرجہ ذیل صورتوں میں غیر محسوب ہوتا ہے۔

---

[1] منقول از جلیل مانک پوری حیات و فن از ڈاکٹر عبد الخالق ذکی انصاری ص ۲۱۱-۲۱۰

(۱) اگر ہمزہ واؤ پر مکتوب ہو جیسے کیکاؤس، آؤ، طاؤس اور لکھنؤ وغیرہ میں [1]
(۲) ہائے مختفی کا ہمزہ جیسے کشتۂ یاس میں

چونکہ تاریخ گوئی میں صرف حروف کی مکتوبی شکل دیکھی جاتی ہے اس لیے ہمزہ کو غیر محسوب
بالکل درست ہے لیکن ہمارے اساتذۂ فن اس ہمزہ کو جیسا نے تحتانی پر آئے نظر انداز نہیں
تے اور صوتی بنیاد پر اسے ی کا قائم مقام سمجھ کر الفاظ آئی اور لائی میں دو ی (ی + ی) قرار
کر "ی" کے بیس عدد لیتے ہیں اسی طرح تائید، تزئین اور آئین میں دو ی محسوب کرتے
. ایسا صرف صوتی بنیاد پر کیا جاتا ہے حالانکہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے تاریخ گوئی میں حروف کی صرف
شکل دیکھی جاتی ہے ان کا صوتی وظیفہ نہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مکتوبی بنیاد پر الف
دہ کا صرف ایک ہی عدد لیا جاتا ہے حالانکہ صوتی اعتبار سے یہ کم از کم بحور میں دو الف کے
ہوتا ہے اور آؤ اور طاؤس وغیرہ میں ہمزہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو پھر آئی اور گئی میں ہمزہ
انداز کر کے ی کے عدد دس کے بجائے بیس کیوں لیے جاتے ہیں؟ یہ تضاد ہے لیکن
ہے چلن یہی ہے کہ ی کے بیس عدد ہی لیں ناسخ، اسیر سے لے کر داغ و جلیل تک سبھی
" کے بیس عدد لیتے ہیں، شاید فارسی میں بھی یہی چلن ہو کیونکہ فارسی میں لفظ آئی کے معنی ہیں
"آتا ہے" ع اے خوشا وقت کہ آئی و بصد ناز آئی بہر حال چلن کو تسلیم کرنا ضروری بھی ہے
ئے کے بھی بیس عدد لیے جاتے ہیں۔ بعض حضرات "گئے" میں ایک "ی" فرض کر کے گئے کے
عدد لیتے ہیں چالیس نہیں جیسا کہ شان الحق حقی کے اس مصرع میں ع واقعہ ہے ہو گئے
"ز" "ظ" جو میری ناقص رائے میں اصولی طور پر درست ہے۔

ہمارے اساتذہ فن نے تاریخ گوئی میں صوتیات کو درمیان میں لا کر ایک اور پیچیدگی
کی ہے ان کا کہنا ہے کہ یائے معروف، یائے مجہول اگر بہ اشباع یعنی بروزن فعلن ہوں
ان میں دو ی فرض کر کے بیس عدد لیے جائیں لیکن جب بلا اشباع یعنی بروزن فاع ہوں تو
ی فرض کر کے دس عدد محسوب ہوں۔ یہی مسلک داغ، امیر مینائی اور منیر شکوہ آبادی کا
ہے، منیر شکوہ آبادی نے ایک تاریخ میں آئی کے گیارہ (جب وہ بروزن فاع آیا ہے) اور دوسری
میں اسی لفظ آئی کے جب وہ شعر میں بروزن فعلن بندھا ہے اکیس عدد لیے ہیں۔

(۱) انگشتر زمرد پاکیزہ آئی آج
(۲) چھٹی کمال شکوہ سہانی سے آئی

---

[1] یہ نظم طباطبائی کا قول ہے لیکن میر اوسط علی رشک نے جو ناسخ کی تاریخ وفات اس مصرع سے نکالی ہے ع
دلا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے
تو اس میں لکھنؤ کے واو کے بارہ عدد لیے ہیں جیسے نہیں کیونکہ ناسخ کی تاریخ وفات ۱۲۵۴ھ ہے اور
یہی وقت حاصل ہوتا ہے جب لکھنؤ کے واؤ کو دو واؤ فرض کر کے بارہ عدد لیں۔

داغ کا بھی یہی مسلک تھا۔ انھوں نے ایک مادہ تاریخ میں ہوئے (بروزن فاع) کے ۲۱ عدد لیے ہیں (۵ + ۶ + ۱۰) ہ

داغ نے تاریخ اس کی یہ کہی　　معتمد صاحب ہوئے زیبا خطاب

لیکن مندرجہ ذیل تاریخ میں "آئے" کے اکیس عدد (بجائے گیارہ) اس لیے شمار کیے ہیں کہ مصرع میں آئے، بروزن فعلن آیا ہے ع ساز گار آئے الٰہی متفق لیل و نہار

۲۸۹ + ۲۱ + ۴۶ + ۶۲۰ + ۳۳۲

۱۳۰۸

امیر مینائی کا بھی اسی پر عمل تھا۔ مندرجہ ذیل مصرع تاریخ میں لفظ 'ہوئی' میں ایک ہی طرح ہوئی ہے

لب بر امیر مصرع تاریخ آ گیا　　اقبال شاہ سے ہوئی صحت وزیر کو

اساتذہ فن کے اس اصول کو تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا اگر مصرع تاریخ ی دب کر آئے تو ی غیر محسوب کرنا ہوگا۔ معقول رائے تو یہی ہے کہ لفظ 'آئی' یا 'آئے' میں ہمزہ کو نظر انداز کر کے ی کے دس عدد ہی محسوب ہوں لیکن اگر چلن کے آگے ہتھیار ڈالیں تو اس کے بیس عدد بھلے ہی لیے جائیں لیکن خدارا یہ قدغن لگائی نہ جائے کہ ی بہ اشباع ہو تو اس کے بیس عدد ہوں گے اور بلا اشباع ہو تو دس ہماری رائے یہ ہے کہ نئے اور گئے میں ہمزہ کو نظر انداز کر کے دس عدد محسوب ہوں لیکن لیے اور کیے میں دو ی محسوب ہوں اور ی کے بیس عدد لیے جائیں (لیے ل+ی+ی) اسی طرح 'آیئے' اور 'فرمایئے' میں ہمزہ کو نظر انداز کر کے صرف دو ی محسوب ہوں حالانکہ اساتذہ ان الفاظ میں تین ی فرض کر کے تیس عدد لیتے ہیں۔

چونکہ تاریخ گوئی کا دار و مدار صرف مکتوبی اشکال پر ہے اس لیے اگر بائے مصاحبت 'بہ' منفصل لکھی جائے تو اس میں ہ کے پانچ عدد یعنی ب کے سات عدد لیے جائیں لیکن اگر کسی لفظ کے ساتھ متصل آئے جیسے "بشہادت" میں تو ب کے صرف دو عدد لیے جائیں احیا سخن لکھیں تو ہمزہ کو نظر انداز کر دیں لیکن احیائے سخن لکھیں تو ی کے دس اعداد محسوب کریں۔ اگر کسی لفظ میں اعراب بالحروف ہوں جیسے اُس کی جگہ روس یا اٹھا کی جگہ اوٹھا تو واؤ کے عدد محسوب کرنے ہوں گے۔ اسی طرح اگر "پانسو" لکھا جائے تو اس کے عدد پانچسو کے برابر نہیں لیے جا سکتے کیونکہ تاریخ گوئی کی کسوٹی املا ہے تلفظ نہیں جس طرح تقطیع شعر کی کسوٹی تلفظ ہے املا نہیں۔

امام قاسمی
شعبۂ اردو، مسلم یونی ورسٹی
گڑھ

نیاز فتح پوری کی ادبی اہمیت

نیاز فتح پوری کی علمی، ادبی اور صحافتی کاوشوں کا سلسلہ نصف صدی کے عرصے پر پھیلا ہوا
یاز ان قاموسی علما میں سے ایک رہے ہیں جن کی ہمہ جہت علمیت اور ذہانت، علم و فضل
نمایندوں سے ماورا ہوا کرتی ہے۔ پرانے یونانی مدبروں اور حکما میں جس طرح کی
کی خصوصیات ایک ساتھ جمع ہو جایا کرتی تھیں، نیاز فتح پوری کی شخصیت اس نوع
د کمیاب مثالوں میں سے ایک تھی۔ نیاز نے اپنی علمی اور تخلیقی سرگرمیوں کا آغاز
صدی کے اوائل میں کر دیا تھا۔ وہ اپنی صحافت اور رسالہ 'نگار' کے ساتھ اپنی وابستگی
ث بالعموم جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ مگر 'نگار' کی اشاعت سے بہت پہلے وہ ایک
گار اور انشائے لطیف کے نمایندے کی حیثیت سے اپنی ادبی قدر و قیمت متعین کرا چکے
انے اور افسانہ نگاری کے علاوہ مذہبی مسائل و معاملات اور دوسرے علوم و فنون سے
کو ساری زندگی شغف رہا۔ رسالہ 'نگار' سے نیاز فتح پوری کی علمی و ادبی شخصیت کا بھرپور
کا پتہ بھی ہوتا ہے کہ یہی رسالہ دراصل ان کی ہمہ جہت علمی دلچسپیوں کے اظہار کا معتبر ترین
ترین وسیلہ تھا۔

نیاز فتح پوری نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعرانہ نثر اور انشائے لطیف سے کیوں کیا؟
ب اور مذہب کے رسمی نمایندوں کی طرف شروع سے ہی ان کا رویہ معاندانہ کیوں تھا؟
احب کی شخصیت اور ادبی و تخلیقی اظہار میں رومانی رویّے کا عمل دخل کیوں کر نظر
؟ اس قسم کے سوالوں کے جواب دیے بغیر نیاز صاحب کی شخصیت اور اس شخصیت
ادبی سیاق و سباق کو پورے طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ انیسویں صدی کی آخری
ں میں سرسید تحریک نے مسلمانوں کی ہزیمت اور شکست خوردہ ذہنیت کے تدارک کے
ے وسیلے اختیار کیے۔ سماجی، علمی اور تعلیمی سطحوں پر مسلمانوں کو ان کے کھوئے ہوئے
بحالی کے لیے آمادہ کیا جا رہا تھا۔ اور علم و فن کو بھی افادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھا
گیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ سرسید اور ان کے رفقا نے بامقصد ادب تخلیق کرنے
کی اور ادبی و تخلیقی سرگرمیوں کو بھی زندگی اور سماج کے لیے مفید اور کارآمد کاوشوں

کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید تحریک کی مقصدیت کے سبب اس
تحریک کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا۔ اور ادب اور زندگی کو ہم رشتہ کر کے دیکھنے کا چلن بھی
ہوا۔ مگر سرسید تحریک کے مقبولِ عوام ہونے کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ ادیبوں اور دانشو
کی ایک متعد بہ تعداد اس تحریک کے افادی پہلو کو اپنے جذبات و احساسات اور انفرادیہ
پر قدغن تصور کرنے لگی۔ چونکہ اس نوع کے ادیب اور دانشور، افادیت پسند ادب کے خلا
شدید ردِّعمل کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں اد
لطیف کے نام سے بہت سی ایسی تحریریں منظرِ عام پر آنا شروع ہوگئیں۔ جو تخیل کو بے محابا و
انفرادی جذبات و احساسات کا آزادانہ اظہار کرنے اور ماضی پرستی یا خواب پرستی کا انداز
کرنے جیسے رومانی رویوں کی نمایندگی کرتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ سرسید اور ان
رفقائے کار کے 'ادب برائے زندگی' والے رویے سے یکسر مختلف تھا۔ علم و ادب کے اس باغیـ
طریقِ کار کے علم برداروں میں جہاں سجاد حیدر یلدرم، ناصر علی، سلطان حیدر جوش اور مہدی ا
کی کاوشوں کو اہمیت دی گئی　وہیں نیاز فتح پوری کی اس باغیانہ روش کو بھی خاصی مقبول
حاصل ہوئی۔

اس پس منظر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نیاز فتح پوری کی بغاوت درحقیقت ایک
ردِّعمل کا بھرپور اظہار تھی، جس کا شخصی جواز بھی موجود تھا۔ اور جس کی سماجی یا عمرانیاتی قدر وقیمـ
بھی مسلّم تھی۔ نیاز فتح پوری اس نقطۂ نظر سے ایک جینوئن علمی اور ادبی شخصیت کے مالک
اور مناسب ترین موقف کے علم بردار ادیب قرار پاتے ہیں۔ نیاز نے ناول بھی لکھے اور اف
بھی، انھوں نے انشائیے کا مضمون بھی لکھے اور رومانی تحریروں کے ترجمے بھی کیے۔ مگر جو با
ان کی تمام تحریروں میں مشترک ہے، وہ اُن کا باغیانہ اور رومانی طریقِ کار ہے۔ 'شہاب
سرگزشت' اور 'ایک شاعر کا انجام' کے عنوانات سے معنون ان کے ناول یا ناولٹ، ترقی پ
تحریک سے پہلے کی نمایندہ تحریروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اور ان کے افسانوں میں
دن بمبئی میں'، 'ایک قافلۂ صحرا کو دیکھ کر'، 'حسن کی عیاریاں'، 'چنگاری'، 'نقاب اٹھ جانے کے
یا 'دو خط'، جیسے افسانے یا افسانہ نما انشائیے، نیاز کی غیر معمولی شخصیت، تخلیقی قوت
شاعرانہ لب و لہجہ، جذبات نگاری پر قدرت، اور تخیل کی بے محابا پرواز، کی بہترین مثالیں
نیاز کی نثرِ لطیف میں ان تمام شعری طریق ہائے کار کی کارفرمائی دیکھی جا سکتی ہے۔ جو بالعموم
کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے رہے ہیں۔ نیاز نے نہ صرف یہ کہ اپنی نثر میں تشبیہہ اور استع
کا التزام کیا بلکہ اپنی مقفیٰ و مسجع نثر میں دلکشی اور رنگینی کے وہ سارے عناصر بھر دیے جن کے
سے کسی بھی نثر میں عظمت اور ارتفاع کی کیفیت پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ اس قسم کی تحریر در
نیاز صاحب کی جزئیات نگاری نقطۂ عروج پر ہے۔ نیاز کے انشائیے محض افسانے یا انشا
نہیں۔ ان میں خواب و خیال کا التباس بھی ملتا ہے۔ اور ڈرامائی لب و لہجہ کا سحر کارانہ انداز
نیاز کے افسانوں اور ناولوں کا انجام بالعموم ٹریجڈی پر ہوتا ہے۔ فنی تخلیق کو المیہ میں تبد

۔انداز بھی رومانی ادیبوں سے مخصوص رہا ہے۔ کہ المیہ میں رنج و غم کے ساتھ ساتھ
زی اور میٹھی سی کسک کی کیفیت بھی پائی جاتی ہے۔ نیاز فتح پوری کی نثر لطیف
ب اور نیاز کی انفرادیت کی شناخت کے لیے ان چھوٹی چھوٹی مثالوں سے مدد لی
ہے:
رت ایک رومانیت ہے قابل لمس، نورانیت ہے صاحبِ نطق، ایک روشنی ہے جسے ہم
ہیں۔ ایک حلاوت ہے جو ہاتھوں سے چکھی جاتی ہے، ایک موسیقی ہے جو آنکھوں سے
ہے۔

یہ نمونہ کہ :۔ "وہ تیرا لحن گلو ساز، وہ ساز میں ڈوبی ہوئی آواز، ایسی ڈوبی ہوئی کہ یہ
نہیں ہو سکتا کہ تیری آواز صدائے ساز ہے، یا صدائے ساز تیری آواز ہے۔ وہ تیرا ایک
بر جا کر دوسرے پاؤں کی ایڑی اٹھا کر صرف پنجہ سے زمین کو ٹھکرانا اور پھر تیرے
کے اندر پہلے آہستہ آہستہ اور پھر باقاعدہ وقفوں کے ساتھ اسی ٹھوکر کا ایک مسلسل
سکل اختیار کر لینا۔"

پھر اس اقتباس کو دیکھیے :۔

> وہ آنکھیں جن کی گہرائی میں سمندر کا عمق ڈوب سکتا ہے۔ وہ نگاہیں جن کے
> بسط میں فضا کی وسعت گم ہو سکتی ہے۔ وہ کمر کا لوچ جو دنیا کو عشر انداز
> کر سکتا ہے۔ وہ گردن کی جنبش جو دنیا کی نیندوں میں تھرتھری پیدا کر سکتی
> ہے۔ وہ نصف سر پر ترچھا آنچل رکھ کر ایک خاص انداز سے اپنے ہاتھ
> کی چھوٹی انگلی کی نوک کو ٹھوڑی پر رکھ کر کھڑا ہو جانا، جو ساری دنیا پر تیری
> حکومت کرا سکتا ہے۔"

کیف و سرور اور تخلیقی لب و لہجے میں ڈوبی ہوئی نیاز فتح پوری کی یہ نثر، نیاز کی اسلوبیاتی
نا کا بھی پتہ دیتی ہے۔ اور اس سے ادب لطیف کے اہم تخلیق کاروں میں ان کے امتیازات
بھی ملتا ہے۔ ایک افسانہ نگار اور ادب لطیف کے نمایندہ انشاپرداز کے علاوہ نیاز
اپنی ادبی صحافت کی وجہ سے نسبتاً زیادہ ممتاز، دانشور اور عالم کی حیثیت سے غیر معمولی اہمیت
مل ہے۔ یوں تو نیاز نے اپنی صحافیانہ کاوشوں کا آغاز 'رسالہ زمین دار' کی نامہ نگاری سے
اور 'زمین دار' کے علاوہ بھی بعض دوسرے رسائل و اخبارات سے وابستہ رہ چکے تھے۔
کی اپنی مخصوص شناخت کے طور پر رسالہ 'نگار' نے سب سے اہم کردار ادا کیا۔ نیاز فتح پوری
کے مدیر بھی رہے اور مالک بھی۔ اس رسالے کے ساتھ نیاز صاحب کا نام کچھ اس طرح لیا
اور آج بھی لیا جاتا ہے، گویا نگار اور نیاز ایک ہی شخصیت کے دو پہلو ہوں۔ نیاز صاحب
سے اپنی وابستگی ۱۹۲۲ء میں قائم کی اور اس رسالے سے ان کا تعلق ۱۹۶۶ء تک، تا دمِ حیات
۔ نیاز صاحب نے ابوالکلام آزاد کی طرح علمی اور ادبی صحافت کو ایک فن بنا دیا۔ اور اپنی
نگار کے ایسے ایسے مخصوص نمبر اور عام شمارے نکالے جن کی علمی اور تحقیقی اہمیت

آج تک مسلم سمجھی جاتی ہے۔ نگار کے خاص شماروں میں اردو شاعری نمبر، مومن نمبر، نظیر اکبر آبادی نمبر، جدید اردو شاعری نمبر، ماخذ قرآن نمبر، انتقاد نمبر، فرمانروایانِ اسلام نمبر، علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر، خدا نمبر، اصنافِ سخن نمبر، انشائے لطیف نمبر، اور ہندی شاعری نمبر کو علمی اور ادبی دستاویز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ نگار میں نیاز کے اداریہ علاوہ ان کے کئی مخصوص کالم قارئین کے ایک بڑے طبقے کی دلکشی کا باعث رہے۔ یہی سبب کہ نیاز صاحب نے اپنے رسالے کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ اپنے علم و فضل کی دھاک لوگو دلوں پر بٹھادی بلکہ ایک بہت بڑے طبقے کو عرصۂ دراز تک اپنے زیر اثر رکھا۔

نیاز فتح پوری کی ہمہ جہت شخصیت کا دائرۂ علم اس قدر وسیع تھا کہ وہ اپنے زمانے بیش تر علمی، مذہبی اور سماجی سرگرمیوں میں تحریری طور پر شریک رہے۔ رسالہ نگار مختلف موضوعات پر جب قارئین کے استفسارات کے جواب میں، نیاز صاحب اظہار خیا کرتے تھے تو اندازہ ہوتا تھا کہ نیاز صاحب کی علمی دلچسپیاں کس حد تک متنوع اور ز ہیں۔ نگار کی تحریروں کے علاوہ نیاز صاحب مذہبی مباحث میں بھی اپنی ذاتی رائے ر تھے۔ اور قرآن و حدیث کو روایتی علما کے خیالات سے ماورا ہو کر سمجھنے کی وکالت کرتے چونکہ وہ مشرقی اور مغربی علوم سے ایک ساتھ بہرہ ور تھے۔ اس لیے عربی، فارسی اور مغر سے متعلق بنیادی حوالوں کی بنیاد پر اظہار خیال کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ نیاز صا بچپن کی تربیت کے سبب یا اپنی کسی نفسیاتی مجبوری کے باعث رسمی اور روایتی مولویوں خلاف تھے۔ اس لیے اس ضمن میں جب بھی کوئی تحریری بحث چھڑ جاتی تھی اس میں ا لب و لہجہ نہایت تند و تیز بلکہ تلخ و ترش ہو جایا کرتا تھا۔ وہ اجتہاد کو درست سمجھتے اور مذہب کے رسمی تصورات سے بلند ہو کر نئے مسائل و معاملات میں قرآن و حدیث بر کی گئی باتوں کی بنیاد پر اجتہاد کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔

نیاز فتح پوری کے دائرۂ علم کی وسعت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکا کہ انھوں نے جہاں افسانے اور صحافیانہ مضامین لکھے وہیں ادبی نقاد کی حیثیت سے بھی مخصوص پہچان قائم رکھی۔ وہ تنقید میں بھی تخلیقی شان پیدا کرنے کے قائل تھے۔ اور ا رویّے کی وجہ سے تنقید کے تاثراتی دبستان کی نمائندگی کرتے تھے۔ وہ اپنے ایک میں لکھتے ہیں کہ:۔

> "لٹریچر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسانی جذبات کو حرکت میں لائے اور اسی لیے ادبیات میں اہم ترین اس کی جذباتی قیمت ہے۔ جو تصنیف ہمارے جذبات کو ابھار سکتی ہے وہ یقیناً ادبیات میں داخل ہے۔ خواہ اس کی کوئی اخلاقی قیمت ہو نہ ہو"

ان چند جملوں سے تاثراتی نقاد کی حیثیت سے نیاز صاحب کے تصورِ ادب و شعر بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ انتقادیات، مالہٗ و ما علیہ، مختارات نیاز اور نیاز صاحب

ین، ادب کے افہام و تفہیم میں نیاز صاحب کے تخلیقی اور تاثراتی رویّے کی نشاندہی
ں۔ ادبی و تنقیدی مضامین کے علاوہ ترغیبات جنسی، فراست الیہ، مجموعۂ تمدن
یزداں جیسی کتابوں کے موضوعات و مباحث سے نیاز فتح پوری کے علمی تنوع کا
ا جاسکتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ادب، صحافت، دانشوری، مذہبیات اور تخلیقی
یدانوں میں نیاز صاحب کی عبقریت اور ان کے امتیازات نیاز صاحب کو بیسویں صدی
روزگار لوگوں میں شمار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور ادبی تخلیق میں ان کی فن کاری
ے بے مثال فن کار کے منصب پر فائز کرتی ہے۔ ●●

تحقیقی مضامین مالک رام

اُردو کے ممتاز محقق اور ماہرِ غالبیات مالک رام صاحب کے منتخب تحقیقی مضامین کا نیا مجموعہ۔ ۶۰/=

باتیں کچھ سُریلی سی داؤد رہبر

عہدِ حاضر کے موسیقاروں کی مختصر سوانح اور فنِ موسیقی پر ایک بسیط مقالہ، موسیقی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک قیمتی تحفہ۔ ۳۶/=

خُسرو نامہ (تحقیق) حبیب رضوی

امیر خسرو وہ واحد شاعر ہیں جنھوں نے ہندی زبان میں یہ صلاحیت پیدا کی کہ ایک ایک لفظ میں جہانِ معنی پنہاں ہو سکیں۔ اس کتاب میں خسرو کے اسی کارنامے کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ۲۱/=

ریت کی دیواریں (ناول) رفعت سروش

رفعت سروش صرف شاعر ہی نہیں ناول نگار بھی ہیں۔ ریت کی دیواریں آپ کا کامیاب رُومانی ناول ہے۔ ۲۱/=

بنجر بادل (ناول) کشمیری لال ذاکر

کشمیری لال ذاکر کا شمار اب صفِ اوّل کے ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ موصوف کا یہ نیا ناول ایک اچھوتے اور دل ہلا دینے والے موضوع پر ہے ۳۳/=

تذکرہ (ناول) انتظار حسین

قدیم زمانے کی آہستہ روی اور جدید دور کی تیز رفتاری کو زبان کے دو مختلف پیرایوں کی مدد سے گرفت میں لے کر انتظار حسین نے ناول کے ایک نئے اسلوب کی طرح ڈالی ہے۔

مُسلمانانِ ھند سے

وقت کے مطالبات پروفیسر ریاض الرحمٰن

پروفیسر شروانی نے یہ اہم خطبہ ڈاکر حا
میموریل ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ہونے والے جلسے
جنوری ۷۸۰ء میں دیا تھا۔ اس خطبے میں ان مسائل
حاصل بحث کی گئی ہے جن سے آج کا ہندستانی
دوچار ہے۔

ہندستانی مُسلمانوں کی

قومی تعلیمی تحریک شمس الر

قومی تعلیمی تحریک، قومی تعلیمی ادارے
ملیہ اسلامیہ کی پچاس سالہ زندگی کے نشیب
داستان۔ ایک اہم تاریخی دستاویز۔

دُنیا کے بڑے مذہب عماد الحسن آ

اس کتاب میں دنیا کے آٹھ بڑ
ہندو مت، بدھ مت، جین مت، زرتشت
یہودیت، عیسائیت اور اسلام کو جدید
مطابق ہمدردانہ لیکن غیر جانب دارا
انداز سے متعارف کرایا گیا ہے۔

حَرف حَرف روشنی حمایت

حمایت علی شاعر کی شاعری
سی گرمی بھی ہے پھول کی نرمی بھی
کا کرب بھی ہے اور مستقبل کی طرب
بھی۔

محمد سحر
۲، مالویہ نگر۔ بھوپال ۔۳

کام ہر زخم نے مرہم کا کیا ہو جیسے
اب کسی سے کوئی شکوہ نہ گلہ ہو جیسے

عمر بھر عشق کو غم دیدہ نہ رکھے کیونکر
حادثہ وہ کہ ابھی کل ہی ہوا ہو جیسے

ایک مدّت ہوئی دیکھا تھا جسے پہلے پہل
تیرے چہرے میں وہی چہرہ چھپا ہو جیسے

حُسن کے بھید کا پالینا نہیں ہے آساں
ہے یہ وہ راز کہ رازوں میں پلا ہو جیسے

دُور تک ایک نگہ جا کے ٹھہر جاتی ہے
وقت کا فاصلہ کچھ ڈھونڈ رہا ہو جیسے

یادِ ماضی سے یہ افسردہ سی رونق دل میں
آخرِ شب کوئی دروازہ کھُلا ہو جیسے

ہزل کو لوگ سحر آج غزل کہتے ہیں
ذوقِ شعری پہ بُرا وقت پڑا ہو جیسے

تسنیم فاروقی
تلسی داس مارگ لکھنؤ ۳

سُروں کے پھول کھلے دل جو باغِ نغمہ ہوا
نشاطِ لمسِ رخِ گُل دماغِ نغمہ ہوا

یہی نہیں ہے کہ دل آتشِ غزل سے جلا
سُلگ کے سینۂ ہر ساز داغِ نغمہ ہوا

کچھ انگلیوں نے مجھے جل ترنگ کہ کے چھُوا
میں اب سادہ تھا لیکن ایاغِ نغمہ ہوا

وہ اک گلاب سا چہرہ جو مثلِ شعلہ اُٹھا
اتر کے شیشۂ دل میں چراغِ نغمہ ہوا

تو ہم بھی لفظوں کا سرگم سجائیں گے تسنیم
اگر نصیب ہمیں کچھ فراغِ نغمہ ہوا

ابراہیم اشک
۳۲۰، سائی نواس، شانتی نگر
کرلا (ویسٹ) بمبئی ۰۰

پردۂ دل سے کوئی نغمۂ دل دار اُٹھے
سازِ خاموش ہے کیوں ساز سے جھنکار اُٹھے
کوئی آندھی، کوئی طوفاں، کوئی سیلاب تو ہو
منزلِ شوق سے پہلے کوئی دیوار اُٹھے
مانگ لیں میں نے دُعاؤں میں وفائیں ساری
اب نہ اس جنسِ گراں کا کوئی حقدار اُٹھے
اُوب جاؤں نہ غمِ دہر کے سناٹوں سے
کوئی محفل تو سجے، شعلۂ بیدار اُٹھے

راز اندمانی
ا۔ مہاتما گاندھی روڈ
پورٹ بلیئر۔ ۷۴۴۱۰۱

روح تو اس گھر کی اک مہمان ہے
جسم کی اپنی بھی اک پہچان ہے
حال کچھ ایسا زمانے نے کیا
آئینہ چہرے پہ خود حیران ہے
اس طرح بدلی ہے قدرِ عاشقی
اب وفاداری بھی اک بہتان ہے

خالد یوسف
57 Mansons Ro
Headington Oxf
U.K.

غزل

نہ ہو تو نمائش کی ضرورت نہیں رہتی
پوشیدہ کبھی زندہ حقیقت نہیں رہتی

بے رحم حسینوں کی بھی رہ جاتی ہے کچھ بات
بعد امیروں کی حکومت نہیں رہتی

اتھوں سے کمائی ہو کہ قسمت سے ملی ہو
زنیک عمل کوئی بھی دولت نہیں رہتی

ج نہیں تخلیق کیسے لعل و جواہر
نکار کو مرنے کی بھی فرصت نہیں رہتی

ر جاتا ہے امداد سے کچھ کام بھی لیکن
نگے ہوئے شعلوں میں حرارت نہیں رہتی

اے زباں بند رہے خلق کی لیکن
ممان کی پھر کوئی ضمانت نہیں رہتی

بر ہو تو راس آتا ہے تنقید کا موسم
ز میں سدا چاند کی صورت نہیں رہتی

مانا بیداد جو ہم عصر تو غم کیا
نہ کے سینے میں کدورت نہیں رہتی

ریاض الدین ریاض
۵/۲۷ کھنڈو پاڑہ۔ بھیونڈی

فکر کی لو میں دل نے جلنا سیکھ لیا
جذبوں نے اشعار میں ڈھلنا سیکھ لیا

چلنے سے پہلے تک یہ خوش فہمی تھی
میں نے انگاروں پہ چلنا سیکھ لیا

سیکھ لیا سناٹوں نے باتیں کرنا
تصویروں نے رنگ بدلنا سیکھ لیا

رفتہ رفتہ ہر بیسا کھی چھوٹ گئی
دھیرے دھیرے میں نے چلنا سیکھ لیا

مفلس کے دل میں بھی ہیں ارمان ریاض
غنچوں نے کانٹوں میں پلنا سیکھ لیا

رؤف جاوید
راؤجی پتھ سرونج وودیشہ۔ ایم۔ پی

شفیع اللہ خاں راز
ایس۔ این کالج کٹرا پر دل خاں، اٹاوہ۔ یوپی

اب جھوٹا کوئی قصہ سنانا نہیں بھاتا
بے بات یونہی ہنسنا ہنسانا نہیں بھاتا

دل کھول کے رکھ دیتے تھے پہلے تو مگر اب!
ہر شخص کو آئینہ دکھانا نہیں بھاتا

یوں بیٹھنے دیتی نہیں آوارہ مزاجی
دن رات مگر ڈھول اڑانا نہیں بھاتا

دنیا سے میاں شکوہ شکایت تو بہت ہے
لیکن ہمیں دربار لگانا نہیں بھاتا

ملک زادہ جاوید
۷ فلور، جواہر بھون۔ لکھنؤ

اب اور اس سے زیادہ زوال کیا ہوگا
ہمارے بعد کی نسلوں کا حال کیا ہوگا

گئی رُتوں کا کلنڈر مجھے سمجھتا ہے
مرے بچھڑنے کا اُس کو ملال کیا ہوگا

وہ دھوپ بانٹتا رہتا ہے صرف اپنوں کو
اُسے ہمارا تمھارا خیال کیا ہوگا

دل و دماغ پہ چھائے گا خوف کا آسیب
ہر آدمی کو ستائے گا خوف کا آسیب

لپک رہی ہیں اندھیرے میں تیز تلواریں
بشر کا خون بہائے گا خوف کا آسیب

اُبھر رہا ہے گھروں سے مہیب سناٹا
تمام شہر پہ چھائے گا خوف کا آسیب

تمام رات اندھیرا رہے گا بستی میں
ہر آدمی کو ڈرائے گا خوف کا آسیب

حیات حشر بداماں دکھائی دیتی ہے
اب اور کتنا ستائے گا خوف کا آسیب

جو مشکلاتِ زمانہ ڈر گیا کوئی
تمام عمر ڈرائے گا خوف کا آسیب

جدید طرز کے پہرے تلاش کرتا ہے
نئی بساط بچھائے گا خوف کا آسیب

سنبھل سنبھل کے رہِ زیست پر چلو اے راز
قدم قدم پہ ڈرائے گا خوف کا آسیب

ور بینائی
ین ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ
ولار،

ُوراپنی چاہتوں کو اس طرح ساکار کرنا ہے
زاپنے آپ سے سب سے زیادہ پیار کرنا ہے

ناہے شانتی کی اپسرا کا گھر ہے اُس جانب
رہ خون کا دریا تو مجھ کو پار کرنا ہے

ئی خوں ریز منظر مجھ سے اب دیکھا نہ جائے گا
زود اپنی ہی زندہ لاش کا دیدار کرنا ہے

زکر اپنے ہی اندر تجھے پاتا ہے اب مجھ کو
ن رشتوں کی دیواروں کو خود مسمار کرنا ہے

رکر تیر سب ترکش میں اپنے رکھ لیے میں نے
ہاں جب سب اپنے ہوں تو کس پر وار کرنا ہے

ساحل احمد
شعبۂ اردو۔ ایونگ کرسچن کالج
الہ آباد۔ یوپی

سر میں سودا عشق کا پیدا کرو
درد دل میں ہے تو کیوں شکوا کرو

تم کو اندازہ نہیں ہے شہر کا
باندھ کر سر سے کفن نکلا کرو

منکشف تم پر ہو ساری کائنات
آئینوں میں آئینہ دیکھا کرو

ایک چٹکی خاک لے کر ہاتھ میں
اپنے بارے میں کبھی سوچا کرو

سچ یہاں پر بولنا اچھا نہیں
اب نہ خود کو اور تم رسوا کرو

دل کو اپنے تم بنالو آئینہ
ایک رشتہ پھر نیا پیدا کرو

ساجد حنیف
معرفت: محمد شریف۔ سرائے پٹیا
شیموگہ

مختار اسعدی
۹۳ ایس۔ ایس ہال ساؤتھ
اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ

نورِ صدا ہے میرے اندر
کون؟ خدا ہے میرے اندر

چندا صورت، خوشبو موسم
گونج رہا ہے میرے اندر

آئینہ سا اک لڑکا تھا
ٹوٹ گیا ہے میرے اندر

سانسوں کی مہکار ہے دائی
پھول کھلا ہے میرے اندر

دیکھو اس دریا کو ساجدؔ
جو بہتا ہے میرے اندر

اسی کی ذات میں رنگینیاں تلاش کرو
وہ مہرباں ہو کہ نامہرباں تلاش کرو

غریبِ شہر سے ملنے کی آرزو ہو اگر
امیرِ شہر کا پہلے مکاں تلاش کرو

شکستِ خواب کا منظر جو دیکھنا چاہو
جہاں کے نقشے میں ہندوستاں تلاش کرو

یہ لرزہ خیز سی چیخیں کدھر سے آتی ہیں
یہ کس مکان سے اٹھا دھواں تلاش کرو

شکست خوردہ در و بام پر نگاہ رکھو
کھنڈر کی تہہ میں دبی داستاں تلاش کرو

محمد رفیع انصاری
۱۵ درگاہ روڈ۔ بھیونڈی۔ تھانہ

خاکِ وطن

اے وطن،
اے مرے خوابوں کے چمن
مرے اجداد کے مدفن، مرے بچوں کی امیدوں کے گلگت
قصہ مشہور ہے۔ کہتے ہیں عزیزانِ وطن
مرے پرکھوں نے غلامی کی سیہ راتوں میں
شمعِ آزادیِ افکار فروزاں کر کے
اپنے پیاروں کے لیے، خون کے آنسو رو کو
آشیاں جلتا ہوا چھوڑا تھا،
ہم خطا کاروں سے منہ موڑا تھا۔
حادثہ نصف صدی کا ہے پرانا لیکن
مرا لڑکا بڑی معصومی سے
کبھی تہوار کے موقع پہ،
کبھی میلے میں
کبھی مکتب، کبھی ٹی وی کے قریب
پوچھا کرتا ہے، یہ ہجرت کیا ہے؟
اور آزاد کسے کہتے ہیں! ؟
میں بصد عزم و یقیں
اس سے کہتا ہوں مرے نورِ نظر
ان سوالوں میں الجھنے کی ضرورت کیا ہے!
وسوسے دور کرو، ایک سخن یاد رکھو
خاکِ صحرائے وطن تختِ سلیماں سے بہت بہتر ہے
اور ہے خارِ وطن سنبل و ریحاں کے مقابل افضل

جاوید اکرم
۱۶۰/۱ سول لائنز فتح گڑھ (یوپی)

میں ہر عرشِ بریں، زیرِ زمیں ہوں موجود
زندگی تو ہے جہاں میں بھی وہیں ہوں موجود

میری حسّاس طبیعت ہی گراں ہے مجھ پر ـ!
سوچتا رہتا ہوں میں ہوں کہ نہیں ہوں موجود

سر پہ تلواریں ہیں آنکھوں میں گڑے ہیں نیزے
اور میں سینہ سپر خندہ جبیں ہوں موجود ـ!

چشمِ احساس کھُلی رکھ تو نظر آؤں گا ـ!
سُن صدائے رگِ جاں تیرے قریں ہوں موجود

دیکھتا جا مری آنکھوں میں دیئے روشن ہیں
لوٹ آ اپنے سفر سے میں یہیں ہوں موجود

پرکاش تیواری
١٩٩ / سیکٹر ١٢، آر۔ کے پورم
نئی دہلی ٢٢

دردِ ہستی

گردشِ زندگی سے میں تھک ہار کر
جب کبھی
اپنی تنہائیوں میں اماں لیتا ہوں
درد کی ہلکی سی روشنی میں
نظر آتے ہیں
زخمی کاندھوں پہ بیٹھے ہوئے
کھٹے میٹھے
وہ بیتے ہوئے
زیست کے دن
جو غم میں سسکتا ہوا چھوڑ کر مجھ کو
چپ چاپ چلتے بنے
اب مرا کوئی اپنا نہیں
دردِ دل کے سوا
دہشت و خوف کے
اس قیامت بھرے
وقت میں
میری ہستی بھی
میری نہیں !!

سردار سوز
DEN LANE PIAINSBORO N.J. 08536
U.S.A

غزل

کوشش بھی کی تو دل سے نہ اس کو بھلا سکے
اور اس میں راز کیا ہے، ابھی تک نہ پا سکے

میری سنو کہ چاہ نہیں بے دلوں کا کام
وہ جائے اس گلی میں جو خوں میں نہا سکے

قیدِ قفس میں طاقتِ پرواز بھی گئی
چھٹ تو گئے پہ سوئے نشیمن نہ جا سکے

آہوں سے کچھ ہوا، نہ تڑپنے سے کچھ بنا
آنسو بھی دل کی آگ نہ اب تک بجھا سکے

گزرے بھی پاس سے تو حیا سے سمٹ گئے
سرکا سکے نقاب نہ آنچل ہٹا سکے

وہ پیار کرکے ہم سے ہمیں بھول بھی گئے
ہم بھول کر بھی ان کو نہ دل سے بھلا سکے

کیا آپ سے کہیں دلِ مضطر کا اپنے حال
اس کی تو چارہ گر نہ کبھی تاب لا سکے

خودداریاں بھی عشق میں زنجیرِ پا تھیں سوز
اس آستاں پہ ہم نہ جبیں کو جھکا سکے

یرارم
بلی کیشنز، بارہ دری، مرادآباد۔ یوپی

سبنی مر کر ریختی کی مانگ سونی کر گیا

کبھی ریختی کا بھی زمانہ تھا۔ کیا ادائیں تھیں، کیا جوانی تھی، کہ اچھے اچھے ہوش
ے اس کے آگے پانی بھرتے۔ بقاؔ، ذلیلِ مخلوقؔ، نسبتؔ، امجد علی خاںؔ عصمتؔ
ن، علی بیگ دہلوی نازنینؔ، تصورؔ، آفاقؔ، نکتہ چیںؔ، نازکؔ، عابدؔ، مرزا آبیگمؔ، محمد محسن
منقاؔ، شیداؔ، خانم خاںؔ، آشفتہؔ، بے چینؔ، قدرتؔ، بہادرؔ، ثریاؔ، پریؔ، رقاصہؔ
تمکینؔ، جولاںؔ، دگانہؔ، حزیںؔ، آشوبؔ، راحتؔ، عشرتؔ، کمسنؔ، عاشقؔ، یک رنگؔ
ردلوؔ، رنجورؔ، مجیدؔ، عارفیؔ، غواصؔ، اشرفؔ، رحیمؔ، رحمنؔ، انشاؔ، یہ تو تھے وہ سب
کھلا ریختی کے دیوانے تھے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو بظاہر تو زاہد خشک
خالص و بحیثیرین، لیکن یہ باطن اسی گوشت پوست کی جذبات سے چھلکتی مچلتی
کے دیوانے تھے۔

لیکن اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس حسینہ پر ایسی جوانی پھوٹی کہاں سے اور
چلی کہاں گئی؟ ایک طرف سعادت یار خاں رنگینؔ[1] کا یہ دعوا کہ وہ ہی اس کو منظرِ عام
لائے ہیں اور دوسری طرف اس کو رحیمؔ[2] کا شاخسانہ قرار دیا جاتا ہے۔

دوسری دلیل ہی چاہے درست ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ رنگینؔ نے ہی
ن کو اس کی بے مہار جوانی کا احساس کرایا اور اس کی صبح و شام کو قوس و
ح کے رنگوں سے بھر دیا۔ یہاں ہم میر یار علی جانؔ کی جانبازیاں بھی فراموش
ں کر سکتے۔ جنھوں نے اس کو اور ہوشربا بنا دیا۔ قدم قدم پر جان و دل صدقے
ے۔ جب وہ اس کو پہلو سے لگا کر رُوسا اور نوابین کی مخصوص محافل میں، اس کی
جولی بن کر پورے ساج سنگھار کے ساتھ غرارہ دوپٹے میں ٹھمک ٹھمک کر

---

[1] رنگینؔ نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں یہ دعوا کیا ہے۔ (دیوانِ رنگینؔ و انشاؔ، مرتبہ نظامی بدایونی)
[2] "خزینۃ العلوم فی متعلقات"

ناچا کرتے تھے تو چلمن کے پیچھے بیٹھی بیگمات لوٹ پوٹ ہو جاتیں۔ ریختی کے نئے
اور چال ڈھال نے کچھ ایسا جادو پھونکا کہ واجد علی شاہ کی بیگم رشک محل تک اس
سحر میں آگئیں۔ اور ریختی گو بن بیٹھیں، لیکن جو مزہ اور رس لوگوں کو جان کی ریختی
محسوس ہوتا تھا وہ بھلا اور کہاں تھا۔ بقول آغا صاحب ؎

مزا ہے ریختی میں مردوں کے شعر کہنے کا
'موا' اپنے موافق جانؔ صاحب خوب کہتا ہے

یہ صنف اردو منظومات میں ایک عرصہ تک اپنا لوہا منواتی رہی قصیدے او
کی طرح یہ بھی درباروں میں پلی بڑھی، جوان ہوئی تھی۔ اسی لیے اس کا زمانہ بھی د
کے ساتھ ختم ہو گیا۔ بقول جان صاحب ؎

ماتھا دُکھا، نہ خون بہا، ناف ٹل گئی
ایّام کی خرابی سے گدی نکل گئی

یہ مطلع تو ۱۸۵۷ء میں واجد علی شاہ کے معزول ہونے پر کہا گیا تھا۔ لیکن وا
کی گدی کیا گئی کہ ریختی کے بھی قدم اُکھڑ گئے۔ اور بالآخر اس کی بلا خیزی
کمر ڈھنے لگی۔ شاہوں کی مُنہ چڑھی، نوابوں کے مُنہ لگی، درباریوں کے سر چڑھی
پر گردش کا گڑیا ایسے یکایک چھن سے نیچے گری کہ تمام سہاگ کی چوڑیاں تو
طمطراق جاتا رہا۔ سر پر سفیدی چھانے لگی، چہرے پر جھرّیاں اُبھر آئیں۔ اور اپ
ہیئت کذائی کے ساتھ یہ گوشہ نشین ہو کر رہ گئی۔ اب کوئی پلٹ کر پوچھنے والا
کہ بوا کس حال میں ہو۔ نوج! یہ بیوگی کیوں طاری کر لی تم نے؟ اٹھو
اس موئے زمانے کی ناک میں پھر سے نکیل ڈال دو۔)

پتہ نہیں کب تک ریختی یونہی کسمپرسی کے عالم میں پڑی رہتی کہ اچا
اسی آسمان سے (کہ جہاں عین عالم شباب میں اس کا سورج ڈوبا تھا) ایک ن
طلوع ہوا۔ ایک انقلاب اٹھا۔ جہاں پیدا ہوئی تھی اور اب جہاں ایڑھیاں رگڑ
تھی اسی زمین سے ایک چشمہ پھوٹا۔ ایک مسیحا نمودار ہوا اور پھر ابو البشر
طرح اس نے بھی ریختی کی دنیا دوبارہ بسادی۔ اس کی کشتی کو پار لگانے کا
سر میں لیے ہوئے اس کو پستی سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس نے
یہ کہ ریختی کو نیا جیون، نئی زندگی سے ہمکنار کیا، اس کی مانگ میں نیا سندور
اپنے محلات شاعری کی دلھن بنایا بلکہ اس کو سوقیت، جنس زدگی، ابتذال اور
سے بچانے کے لیے اس کے بدن پر اپنے لطیف اور باوقار اندازِ بیان کی
ڈال دی۔ اور اس طرح ریختی کو اس لائق بنا دیا کہ مخصوص قسم کی محفلوں کی
گھٹن سے نکل کر یہ ایک عزت دار خاندان کی وارث اور ولی بن گئی۔

وہ مسیحا تھا ساجد لکھنوی۔ جو ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوا۔ اور اچھی خاصی غزل سے
آشنائی چھوڑ کر اس کے فراق میں ۱۹۵۳ء میں ساجد سے سجنی بن گیا۔ ریختی میں
لفت کا یہ زمزمی انداز کہاں کہاں تھا پہلے

دیا اللہ نے آج آمنہ کو چاند سا بیٹا
میں واری جاؤں اس کا جشنِ پیدائش مناؤں گی
کوئی عطار کی دوکان سے لادے مجھے گھٹی
میں اس پہ نذر دے کر اپنے مُنّا کو پلاؤں گی

ایسا نہیں ہے کہ ساجد سجنی کے یہاں دو معنی بات بالکل نہیں ہے۔ یا اشارے
کنائے نہیں ہیں۔ ریختی کے خمیر میں جو شامل کیا گیا تھا وہ تو عین اس کی فطرت تھا
اپنی مٹی کی صداقت سے وہ کیسے مکرتی۔ اس کے بغیر تو ریختی ریختی ہی نہ رہتی۔
لیکن یہ دو معنویت، یہ اشارے کنائے، ابتذال اور سوقیت سے دور ہیں۔ اس کے
باوجود ساجد سجنی کے اشعار میں ریختی کا تمام تر حسن و شباب ہے۔ بھرپور نسائیت
ہے۔ سجنی کی ریختی درباری رقاصہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ عصرِ حاضر کی ماں ہے۔ بہن
ہے، بیٹی ہے، بیوی ہے، بہو ہے، اور اسی دور کے مسائل سے دوچار بھی ہے
وہ سیاست میں بھی دلچسپی لیتی ہے، اسکول اور دفتر بھی جاتی ہے۔ اور ساتھ ہی بھرے
پُرے کنبے کی فرد بھی ہے۔ جس پر شوہر، بچّوں، بھائیوں، بھابیوں، بہنوں، دیوروں
اور نندوں وغیرہ کے فرائض بھی عائد ہوتے ہیں:

فرض کیوں کر نہ ہو شوہر کی اطاعت مجھ پر
یہ بہن دوسرے درجہ پہ خدا ہوتا ہے

بچّوں کی دیکھ بھال، بھرے گھر کا کام کاج
رہتی ہوں بدحواس، سویرے سے شام تک

کہیں نازو بھی اپنے گھر کی ہو لے
یہی ہے فکر صبح و شام بھابی!

دیورانیاں، جٹھانیاں، نندیں ہیں، ساس ہے
سسرال آکے گھر گئی کتنی بلاؤں میں

میری بچی رو رہی ہے، میں ابھی سُلا کے آئی
ذرا بھابی دیکھے رہنا، کہیں دودھ اُبل نہ جائے

جب سے گھر میں ساس نندوں کی حکومت ہو گئی
زندگی باجی مری ناسور ہو کر رہ گئی

رات کو دفتر سے گھر پہنچی تو بھابی نے کہا
کچھ بتاؤ تو مری جان، دیر سے آنے کا راز

کل کوئی کھاتا نہ تھا جن کے جھوٹے دو بیر بھی
آج نیتا بن گئی ہیں وہ موئی مشٹنڈیاں

مردوں نے رقیب کو قدم قدم پر کوسا ہے۔ اور ریختی رقیبن کے د
آزار ہیں۔ اس خاص رشتے اور کیفیت کی عکاسی میں ریختی طاق ہی نہیں بے
بھی ہیں۔ یہ کٹیلا پن ریختی کو پہلے کہاں نصیب تھا:

وہ رقیبن کے گھر جا کے سوئے
رات بھر میں نے تکیے بھگوئے

تیر کی مانند کیوں میرے دل میں چبھ گئی
ان کے بستر پر جو اک چوڑی ملی ٹوٹی ہوئی

دعا یہ اپنی پڑوسن کو آج دی میں نے
کہ اُن کی شکل کا اللہ بچہ کو بھائی دے

میری مہندی رچی دیکھ کر
ہاتھ سوتن نے کیا کیا ملے

میں اِک آگ سی لگ گئی تن بدن میں
سویرے جو آ کر وہ گھر میں نہائے

ہائے رے بیلیں پاپڑ تو ہم
اور نگوڑی رقیبن تلے

رقیبن کو ہوئی دق کیوں میں صحت کی دعا مانگوں
موئی وہ کل کی جو مرتی ہوئی ہو آج مر جائے

سبحی کے یہاں ریختی کو تکرار کا ایک نیا اب و لہجہ ملا ہے۔ جو کانوں میں
یاں بھی کرتا ہے۔ اور جا کر سینے میں لوٹتا بھی ہے:

اب نہ مانوں گی نہ مانوں گی کوئی آپ کی بات
کہے دیتی ہوں کہ کل سے مرا روزہ ہوگا

چار کر کے وہ اترائے ہیں
دس کروں میں اگر بس چلے

اب ایک جو کہے گا تو ستر سناؤں گی
اب تک جو کچھ کسی نے کہا ٹالتی رہی

جیسے بزار سے دلوا کے لائے ہو ٹافی
یں جانتی ہوں وہ صورت حرام کس کا تھا

گھورتا ہے عورتوں کو کیوں موئے
تیرے گھر تیری نہیں ہیں مائیں کیا

جو پیٹے درزی نے سب کپڑا مٹا کر رکھ دیا
نوج! سلوائے کوئی شلوار تیرے شہر میں

تمھیں نوازہ ہے سب میرے میکے والوں نے
تمھارے گھر میں یہ سب تام جھام کس کا تھا

ساجد سبحی نے ریختی کو انتہائی خود اعتمادی کے ساتھ برتا اور اس کی ازلی
بیت اور معنویت میں کہیں کمی نہ آنے دی۔

بدگمانی کی کوئی حد ہے الٰہی توبہ!
دولھا بھائی سے وہ کہتے ہیں کہ پردہ ہوگا

وہ اب بھی میرے دوپٹے کی تہہ میں رکھا ہے
جو اس نے پیش کیا تھا گلاب عید کے دن

اتفاقاً سبحی کی ریختی اب وہ پہلے جیسی ریختی نہ تھی جو دوسروں کے اشاروں

پر ناچتی۔ اس کی سوجھ بوجھ اور موقع فہمی نے اب اس کے ذہن کے کینو
حد درجہ وسیع کر دیا تھا:

میرے بستر پہ تم نہ سو بھابی
ان کو میرا گماں نہ ہو جائے

وہ اپنے گھر میں خوش، میں اپنے گھر
میں جاؤں تو چ پاکستان باجی!

اللہ میں دو دو کو کس طرح نباہوں گی
اک وہ ہے مرا عاشق، اک اس کا بڑا بھائی

طلاق دے تو رہے ہو عتاب و قہر کے ساتھ
مرا شباب بھی لوٹا دو میرے مہر کے ساتھ [1]

سرخ چولی، سرخ ساڑھی، سرخ چپل، سرخ پرس
اوئی اللہ تم تو بھابی کا میریڈ ن ہو گئیں۔

لیکن زمانہ کب ایک سا رہتا ہے۔ ریختی کی قسمت ایسی کہاں تھی ک
بنی رہتی۔ بالآخر اک طوفان بلا آیا اور بھوپال کے گیس اخراج سانح
کی مانگ سونی کر دی۔ ایک عرصہ تک اس زہریلی گیس کے اثرات
رہنے کے بعد آخر کار ۱۵ اگست ۱۹۸۹ کو ریختی کا یہ محسن دار فانی سے
ایک بار پھر اس بھرے جہان میں ریختی تن تنہا رہ گئی۔ لیکن وہ ایک ش
ریختی ہے۔ اسی لیے تو ببانگ دہل کہہ رہی ہے۔

رکھوں گی زندگی بھر میں سہاگ اپنے بڑھاپے کا
بہیں گی جھریاں ہاتھوں کی میرے چوڑیاں ہو کر

---

[1] ساجد سجنی لکھنوی کے اس شعر کو اکثر ادیب و شعرا پروین شاکر یا کسی دیگر
شعر سمجھتے ہیں۔ اور QOUTE کرتے ہیں۔ یہ پوری غزل ساجد سجنی
"نگوڑیات" صفحہ ۳۰ پر موجود ہے۔

ورما
بان - امرتسر ۶-۱۹۴۳

پولیو

بستر پر پڑا کمرے کی دیواروں کو دیکھ رہا تھا۔ جو اس کے ذہن کی طرح خالی
پتی گھی بنانے والی ایک مشہور کمپنی کا وہ کلینڈر جس میں ایک جوان عورت کو نیم
ت میں کسی پہاڑی جھرنے پر دھوپ میں نہاتے دکھایا گیا تھا، اس نے
رکھ دیا تھا۔ بہت سوچنے پر بھی وہ بناسپتی گھی اور عورت کی عریانیت میں
قائم نہیں کر سکا تھا۔
ن میں کھلنے والے دروازے کے پیچھے سرلا کے گنگنانے کی آواز تھی۔ سرلا کے
تو یوں بھی عجیب سی آواز آتی رہتی تھی۔ جیسے برتن میں پانی اُبل رہا ہو۔ ابھی کچھ
وہ اس سے چھتر پتی شیواجی کے بارے میں پوچھنے آئی تھی۔ کہ اسے پہاڑی،
کہا جاتا ہے۔ سرلا کا جغرافیہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ لیکن ہسٹری اسے پریشان رکھتی
ماید وہ ایسا ظاہر کرتی تھیں۔ اسی لیے وہ اسے سمجھاتے ہوئے اکثر نا سمجھی کی باتیں
لگتا۔ اور برٹش ہسٹری اور انڈین ہسٹری کو خلط ملط کرنے لگتا۔ سرلا شرماتی بھی
کراتی بھی۔
تم بے وقوف ہو" اس کے ذہن میں یہ کڑوا جملہ گونجا۔ اس کی کڑواہٹ وہ پی
دیوار پر ٹیوب لائٹ کے پاس ایک چھپکلی ساکت ہو گئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ
اس کے دوست نے اس لمحہ کہا تھا، جب اس نے اسے سرلا کے جغرافیہ
کے بارے میں بتایا تھا" یار، یہ لڑکی بڑے اُلٹے سیدھے سوال کرتی ہے۔
دوست نے مسکرا کر کہا تھا" تم بے وقوف ہو، جو لڑکی صرف سیدھے
رے وہ عشق کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔" اور اس نے سوچا تھا کہ وہ
کرنے کی حیثیت میں نہیں تھا۔ سرلا کی ماں کو کمرے کا کرایہ، بجلی پانی کا
کر اس کے پاس صرف چنتا اور اُداسی بچتی تھی اور اس حالت میں عشق نہیں
سکتا تھا۔ سرلا کی ماں نے تو دیواروں پر گرد اور جالے دیکھ کر حیرت سے
" تم بھی عجیب آدمی ہو۔ یہ بھی کوئی رہنے کا ڈھنگ ہے۔" اُس نے سوچا

تھا ۔ کہ وہ عجیب ہے تو عجیب ہی سہی ۔ سرلا کی ماں جیسے مایوس سی چلی گئی
اس نے دیکھا ۔ چھپکلی چند انچ آگے بڑھ گئی تھی ۔ پھر سرلا ہسٹری کی کتاب
آ گئی تھی۔

" ماں کہہ رہی تھی کہ تم کم اصاف نہیں رکھتے" اس نے یوں اس کے چہرے
دیکھا جیسے وہاں اس بات کا جواب رکھا ہو ۔ " میں کر دوں گی" ۔ اچھا ایک
بتاؤ، کیا مغل بادشاہوں کی بیٹیاں نہیں ہوتی تھیں یا وہ ان کی شادیاں نہیں کر
تھے۔ ہسٹری اس بارے میں بالکل خاموش ہے۔"

" مورخ قاضی نہیں ہوتا"

وہ غیر مطمئن سی چلی گئی

وہ بھی کمرے سے نکل آیا

نومبر کی خنک شام اپنے ٹھنڈے سایوں کے ساتھ دھرتی پر دھیرے
اتر رہی تھی۔ اس نے سوچا ۔ اس شام کا سلونا ہاتھ تھام کر دور نکل جائے او
واپس نہ آئے۔ ایسا وہ پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا۔ لیکن ہمیشہ تھکا، ٹوٹا سا
کمرے میں پہنچ جاتا ۔ اس کا دوست سنجیدگی سے کہتا " تم بے وقوف ہو، "
کر لو، سرلا کا ہاتھ تھام لو، وہ انکار نہیں کرے گی۔ وہ شیواجی اور مغل شہزاد
زیادہ تم میں انٹرسٹیڈ ہے۔ اسے سمجھنے کی کوشش کرو ۔ ، وہ دور افق میں
لگا۔ ۔ ' نہیں یار، شادی ہوتے ہی لڑکی کا ہاتھ بدل جاتا ہے، میرا مطلب
کا ہاتھ ہو جاتا ہے۔ اور بیوی کا ہاتھ صرف محبت کے نام پر تھاما نہیں جا سکتا
اتنی کمائی مانگتا ہے کہ اطمینان سے گھر چلا سکے ۔ نہیں تو پتھر ہو جاتا ہے
میرے پاس نہ گھر ہے نہ اتنی کمائی کہ اس ہاتھ کی نزاکت 'نرمی' اور کوملتا
وہ چلتا چلتا رک گیا۔ اس کی نظر ایک نئے، خوب صورت اشتہاری بور
گئی تھی۔ لمبا چوڑا، رنگین بورڈ ۔ سبزہ درخت، گھاس پر کھیلتے بچے، عمارتوا
کھڑی موٹر کاریں، فلیٹس میں ہلکی سی روشنی اور جلی حروف میں لکھی عبارت
آسان شرائط پر اپنا گھر حاصل کیجیے۔ اپنے گھر کے چکر میں وہ کتنی ہی کنسٹرکشن
دفاتر میں آیا گیا تھا ۔ یہ آسان شرائط دو چار لاکھ کی رقوم پر پھیلی ہوئی تھ
بار وہ منہ لٹکائے، پہلے سے بھی زیادہ اداس اور احساس کمتری میں مبتلا،
آ جاتا ۔ اور کمرے میں پہنچ کر، گرد، جالے، مکڑی، اور کیڑوں کے پیچھے بھا
کو دیکھتا ہوا سو جاتا ۔ کتنی حکومتیں بدل گئیں، کتنے مینی فیسٹوز کا اعلان،
کیسے وعدے اور خواب ۔ نتیجہ ۔ وہی اداسی، بے بسی، اور دربدری ۔
سیاست ہے کہ لوگوں سے صرف اور صرف جھوٹ بولا جائے ۔ دھیرے دھیر
نے اپنے ذہن سے گھر کی تصویر کھرچ کر صاف کر دی ۔ سرلا لڑکی نہ

ال بن کر رہ گئی تھی ۔ غزنوی نے سترہ حملے کیوں کیے ۔ شاید یہ قوم اور چنگیز کے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے ہی امن و امان سے رہ سکتی ہے ۔
اس نے بورڈ سے نظریں ہٹائیں ۔ اور آگے بڑھ گیا ۔ ایک بس اس کے منے آکر رُکی ۔ وہ لپک کر اس میں سوار ہو گیا ۔ مسافر اپنی اپنی منزل کا ٹکٹ لے آگے بڑھ رہے تھے ۔ اس نے سوچا ' اسے کہاں جانا ہے ۔ یہ اُسے کیا جاتا ہے ۔ بنا سوچے سمجھے چل دیتا ہے ۔
" یہ بس کہاں جا رہی ہے ؟ "
" مدراس ہوٹل "
" ٹھیک ہے وہیں کا ٹکٹ دے دو "
بس رُکتی ' چلتی ' آگے بڑھتی رہی ۔ وہ راڈ تھامے آگے کھسکتا رہا ۔ جہاں کوئی خالی ہوتی ' کھڑے ہوئے مسافر ادھر لپکتے ' جو پہلے بیٹھ جاتا ' اپنی پھرتی اور چستی پر فخر سے مسکراتا ۔ مدراس ہوٹل ٹرمینل پر بس خالی ہو گئی ۔
اب کدھر ۔ اس کے اندر سے کسی نے پوچھا ۔ زیبرا کراسنگ پر بہت لوگ رُکے ہوئے تھے ۔ ٹریفک کا تانتا بندھ گیا تھا ۔ ہری بتی ہوئی ۔ ٹک رُک گیا اور وہ بھیڑ کے ساتھ سڑک پار کر گیا ۔ عجیب بات ہے ۔ اس نے طعی نہیں سوچا تھا کہ وہ سڑک پار کرے گا ۔ اس کے لیے یہ فیصلہ ہری بتی بھیڑ نے کیا تھا ۔ اب کہاں ؟ پھر وہی سوال اُس کے سامنے تھا ۔ اس ضدی ال سے نجات حاصل کرنے کے خیال سے وہ کافی ہاؤس میں جا بیٹھا ۔
" بہت دن بعد آئے " ایک شناسا چہرہ اس کے سامنے تھا ۔ " کہاں رہتے "
" کہیں نہیں "
" یہ ہمارے دور کا المیہ ہے کہ ہم کہیں نہ کہیں ہوتے ہوئے بھی کہیں ہونے کے احساس کا دُکھ جھیلتے ہیں ۔ "
وہ چُپ چاپ کافی پیتا رہا ۔
" ہمیں شراب پلاؤ ' نعمت کدہ ' میں کھانا کھلاؤ ۔ صبح ہم تمھیں صف اوّل کا سانہ نگار بنا دیں گے ۔ " بائیں طرف والی میز پر بیٹھا ایک ثقہ نقاد ایک نوعمر افسانہ گار سے کہہ رہا تھا ۔
" تم ہمارے گروپ میں شامل ہو جاؤ ۔ پھر دیکھنا کتنی جلدی مشہور ہوتے ہو " یں طرف والی میز پر ایک گنجا ' عینک والا ادیب کسی نوجوان شاعر کو سمجھا رہا تھا ۔
ادب میں بھی NATO اور SEATO قسم کی تنظیمیں ہیں ۔ اس شناسا چہرے نے کہا ۔
وہ کافی ختم کر کے وہاں سے اُٹھ آیا ۔ کناٹ پلیس کے برآمدوں میں لوگوں

کا سیلاب تھا۔ چمکتے چہرے، جدید لباس، عریانیت، خوشبوئیں، شور، دھکے، ایک بیکری سے آنے والی اشتہا انگیز مہک ۔۔۔

"بابو، بھوک لگی ہے!"

اُس نے دیکھا۔ دس بارہ سال کا پولیو زدہ ایک بچہ گھسٹتا ہوا اُس کے قدموں تک آگیا تھا۔ ملکۂ فرانس نے کہا تھا۔ بھوک لگتی ہے تو یہ لوگ کیک کیوں نہیں کھاتے ۔۔۔ اور وہاں انقلاب آگیا تھا۔ اور یہاں ۔۔۔ مسلا وہیں بنائیں گے، ۔۔۔ کا نعرہ لگاتے ہوئے چند جوشیلے نوجوان اس کے قریب سے گزر گئے تھے۔

وہ آگے بڑھ گیا۔ ایک سوکیس میں شیروانی اور رفری ٹوپی پہنے ایک پتلا کھڑا رہتا تھا۔ اب وہاں نہیں تھا۔ آگے کیا ہوگا۔ ایسی ہی دکانیں، ریستوران، بھیڑ، پورا چکر لگا کر وہ اسی جگہ لوٹ آئے گا۔ کناٹ پلیس کا نقشہ بنانے والا کتنا ذہین اور دور اندیش ہوگا۔ یہاں آگے پیچھے کچھ نہیں۔ صرف چکر۔ بس گھومتے رہو ۔۔۔ وہ آدھے چکر میں ہی تھک گیا تھا۔ بور ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے، پہیا جام ہو گیا ۔۔۔؟" اس کا جرنلسٹ دوست تھا۔

"نہیں ہوا تو ہو جائے گا۔ یوں بھی یہ ہڑتالوں اور جلوسوں کا دور ہے۔ NUISENSE اور NEGATIVE ویلیوز کا یگ ہے۔

"میاں یہ کناٹ پلیس ہے، رام لیلا گراؤنڈ نہیں ۔۔۔ ویسے تمہارا مسئلہ کیا ہے اس وقت ۔۔۔؟"

"سمجھ میں نہیں آرہا کہ کہاں جاؤں"

"جی۔ بی روڈ چلے جاؤ۔ ایسی حالت میں وہی موزوں اور مناسب جگہ رہے۔

وہاں جا کر کیا کروں گا۔

"شیرز کے بھاؤ معلوم کرنا۔ گلف اور پر تبادلۂ خیالات بھی کر سکتے ہو ۔۔۔ مجھے اپنے اخبار کے لیے فیچر لکھنا ہے۔ کیوں پر مار

اس سے کیا ہوگا ۔۔؟

"اخبار بکے گا، مجھے پیسے ملیں گے، گھر میں راشن آئے گا۔"

"یعنی تمھیں ان عورتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"ہے یار، پوری ہمدردی ہے لیکن میں اس سے زیادہ ان کے لیے کچھ اور کر نہیں سکتا ۔۔۔ میں نے ایک دھندا کرنے والی سے ہمدردی جتائی تو کہنے لگی ۔۔۔ بسا لو مجھے گھر میں ۔۔۔، اب یار، یہ کوئی فلمی کہانی ہوتی تو ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ میں لٹکا کر آگیا اور وہ گاہک لے کر کیبن میں گھس گئی ۔۔۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ اور حقیقت میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

"خیر اس وقت میرا یہ مسئلہ نہیں ہے۔"
"میاں، مجھے تو راشن ڈپو تک پہنچنے کے لیے اسی بازار سے ہو کر جانا پڑے گا۔
...ارے اخبار کے مالک اور اڈیٹر مہاشہ جی کی زبردست خواہش ہے کہ
...عورتوں پر ایک زبردست فیچر اس سنڈے اڈیشن میں چھپنا چاہیے۔ وہ
...عورتوں کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے تم مہاشہ جی کی نیک بھاوناؤں کی تکمیل کے لیے اس مہم پر نکلو،
...اس کناٹ پلیس کے چکر سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈتا ہوں۔"
وہ سڑک پر آ گیا۔
کمرے میں پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ وہ قبر میں اتر گیا ہے۔ صحن میں کھلنے
...لے دروازے کے پیچھے سرلا کی آواز تھی۔ دروازہ کھول کر وہ کمرے میں آ گئی۔
"آج دیر کر دی، اکیلی میں ڈر رہی تھی، ماں ایک مرگ پر گئی ہے۔" اس
...اس کی طرف دیکھا۔ وہ ٹیوب لائٹ کے قریب ان دو چھپکلیوں کو دیکھ رہا تھا جو
...ی کیڑے کی طرف رینگ رہی تھیں۔
"ہسٹری میں کتنے بے وقوف ہوئے ہیں۔" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔
...گلش ہسٹری میں تو جیمز اوّل تھا اور انڈین ہسٹری میں محمد تغلق کے بارے میں یہ کہا
...ہے۔ اور کوئی۔؟
اس نے سرلا کے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ گورا، نرم و نازک، لمبی، پتلی،
...لیاں۔ پھر بولا۔
"ایک میں بھی ہوں، لیکن ہسٹری سے باہر۔"
...بھی باہر والے دروازے پر دستک ہوئی۔
"...ماں آ گئی۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "۔ مجھے بھی
...ن لگتا ہے۔"
وہ سر تھام کر بستر پر بیٹھ گیا۔

پرویز یداللہ مہدی
بی-۲۶- چوتھی منزل- بہرام- باندرہ
(ویسٹ) بمبئی۔

چھتری تیرے رنگ ہزار

ہم اپنے مشاہدے بلکہ تجربے کی بنا پر یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ ازل دم تا دم بنی نوع انسان نے اس آباد خرابے کو جتنی بھی ایجادات سے سرفراز فرمایا ہے ان میں چھتری کا یقیناً ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ غیر معمولی اس لیے کہ چھتری کا شمار سامان تعیش میں ہرگز نہیں ہوتا، اور کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ اس کار آمد شے پر صرف پیسے والوں ہی کی اجارہ داری نہیں، بلکہ غریب سے غریب آدمی بھی اسے خریدنے کی جرأت کرسکتا ہے۔ گویا دنیا کا ہر خاکسار جو کسی صورت مال دار کا دعویدار نہیں ہوسکتا، چھتری بردار یقیناً ہوسکتا ہے۔ چنانچہ جتنے بھی مفلس و قلاش بندے اس دارِ فانی کو لبیک کہتے ہیں تب ایک طرف تو سکندرِ اعظم کی طرح ان کے بھی دونوں ہاتھ باہر کفن سے نکلے ہوتے ہیں۔ دوسرے اپنے پیچھے اپنی اکلوتی بیوہ، کے سر چھپانے کو، چھت کی جگہ چھتری چھوڑ جاتے ہیں، پس اس سے ثابت ہوا کہ چھتری وہ واحد صلح کل کشادہ دل شے ہے جو مسلمان اللہ اللہ یا برہمن رام رام، کے مصداق چھوٹے بڑے امیر غریب، کالے گورے بلا تخصیص اپنی چھایا میں پناہ دیتی ہے۔!

یہ درست ہے کہ مضبوط سے مضبوط چھتری بھی موسلا دھار بارش کا تا دیر مقابلہ نہیں کر آپ کے بیشتر اعضائے رئیسہ و غریبہ کو بارش کی مسلسل یلغار سے بچا نہیں سکتی، لیکن کم ہے کہ آپ کے وجود کے سب سے اہم اور فعال حصے یعنی سر عزیز کو بچانے کی خاطر اپنی لڑا دیتی ہے۔ غالباً یہی وہ خوبی، یہی وہ ادا ہے جس کی وجہ سے عوام الناس کی اکثریت چھتری میں بلا تکلف اپنا سر چھپاتی ہے اور یوں ایک معمولی چھتری کو چھتر پتی کا رتبۂ بلند عطا کرتی ہے برسات میں جب، بھانت بھانت کی رنگ برنگی ساختہ خود ساختہ بے ساختہ، آٹومیٹک اور ہم مقصدی، ہمہ ڈیزائن چھتریاں ایک خاص سُر اور تال کے ساتھ، ایک ساتھ کھلتی ہیں تو نظر کے قوسِ قزح سی کھل جاتی ہے۔ دھوپ گھاٹ پر رسیوں سے ٹنگے، نیلے نیلے، اودے اودے پیلے پیرہنوں کا گمان ہوتا ہے، شہر کے مطلع پر جیسے رنگا رنگ پھولوں کی چادر سی لہرانے لگتی سارا منظر دو آتشہ ہوجاتا ہے، ظاہر ہے کہ جب ایک ساتھ دو دو مطلع تلے اوپر چھائے ہوں، ایک ابر آلود، دوسرا اکلر آلود، تو سارا ماحول کسی رنگین غزل میں ڈھل جاتا ہے ایک ایسی

ں میں مطلع بھی ہو اور حسنِ مطلع بھی۔

چھتریوں کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور مانگ کے پیشِ نظر ان کی ساخت، ہیئت اور وضع
طع میں سائنٹفک تبدیلیاں ناگزیر تھیں، نتیجتاً دورِ حاضر کی فولڈنگ چھتریاں وجود میں آئیں ہمارا خیال
ہ کہ ان مخصوص وضع کی چھتریوں کی ایجاد مہا نگروں کی لامحدود آبادی، اور محدود ذرائع حمل و نقل
ذہن میں رکھ کر کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جن ذرائع حمل و نقل میں آدمی صرف اسی صورت میں صحیح سلامت
فر کرسکتا ہو جب تک کہ اپنے وجود کو تہ بہ تہ نہ کر لے، ایسے عالم میں چھڑی کی طرح ایستادہ چھتری
سدا ایک ہی حالت میں رہتی ہو، بھلا کس کام کی، چنانچہ فولڈنگ چھتریوں کی معرکتہ الآرا ایجاد مہا نگر
ے باشندوں کے حق میں بلی کے بھاگوں چھینکے کے مصداق ٹوٹی، ان تازہ بہ تازہ نو بہ نو چھتریوں کی
رتِ حال کی مناسبت سے پھیلنے اور سکڑنے کی خاصیت نے بڑے شہروں کے زنانے،، کو تو خیر
ااثر کیا ہی، مردانے پر بھی جادو کر دیا، نتیجتاً اب ہر شخص بڑے اطمینان سے فولڈنگ چھتری بغل
ں دبائے گھر سے نکلتا ہے، چھتری کی چھتر چھایا میں بارش کی پھوار سے بچتا بچاتا، نزدیک ریلوے
سٹیشن یا بس اسٹاپ کا فاصلہ طے کرتا ہے، پھر پہلے مرحلے میں چھتری کو فولڈ کرتا ہے اور دوسرے
رحلے میں اپنے آپ کو فولڈ کر کے مطلوبہ سواری میں سوار ہو جاتا ہے۔ فولڈنگ چھتریوں میں دوسری
سہولت یہ ہوتی ہے کہ یہ بٹن والے چاقو کی طرح بٹن سے کھلتی ہیں، اور اس کی ترکیب استعمال بھی
ڑی آسان ہے یعنی بٹن کو ہلکے سے دباتے ہی، چھتری کی ایک ایک تہ اس سرعت کے ساتھ کھل جاتی
ہ جیسے اگلے وقتوں کی گھریلو خواتین کے مخملی بٹوے ریشمی ڈوریوں کو کھینچتے ہی کھل جایا کرتے تھے،
لبتہ کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ بلکہ سفاکانہ استعمال کے نتیجے میں چھتریوں کے بٹن ڈھیلے بھی پڑ جاتے
یں جس کی وجہ سے چھتری بردار اچانک مضحکہ خیز صورتحال سے دوچار ہو جاتا ہے۔ یعنی جب اُسے
تری کی چھتر چھایا کی شدید ضرورت لاحق ہوتی ہے تب چھتری کی تہیں کسی حد سے زیادہ شرمیلی
ئی دلہن کی طرح اپنا گھونگھٹ کھولتی ہی نہیں، اور جب چھتری کا کھلنا بھرے بازار میں عزت کے
ر جانے کے مترادف ہوتا ہے۔ تب ہی چھتری، کسی بازارو عورت کے مغلظات اگلتے منہ کے
رح بلانوشش کھل جاتی ہیں، ایسی سچویشن سے عموماً وہی لوگ گزرتے ہیں جو چھتریوں کو بیویوں
کی طرح بیدردی سے استعمال کرتے ہیں، تاہم جو لوگ چھتریوں کے ساتھ محبوباؤں جیسا سلوک
رتے ہیں۔ ان کی چھتریاں انھیں کبھی دغا نہیں دیتیں، سدا ان کے حکم کی تابعدار
تی ہیں۔

ایک عام سروے کے مطابق، ہمارے ہاں این کو لنز عرف برساتیوں کی بہ نسبت، چھتریاں
یادہ استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ چھتریاں، برساتیوں کے مقابلے میں سستی
تی ہیں، دوسری وجہ یہ کہ فولڈنگ چھتریاں ہاتھ میں آسانی سے لٹکائی یا پھر "بغلیں در بغلیں" کے
مداق بغل میں دبائی جا سکتی ہیں جب کہ برساتیوں کو ناکردہ گناہوں کے بوجھ کی طرح ڈھونا پڑتا ہے
ور یہ بوجھ اس وقت دوچند ہو جاتا ہے جب برساتیاں بھیگ کر کسی گودڑی کی طرح
زنی ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ برساتی ہر حال میں سمٹے تو دلِ عاشق کے مصداق ہوتی ہے۔

لیکن چھتری پھیلے تو زمانہ، کی جیتی جاگتی تصویر ہوتی ہے۔ یعنی ایک برساتی وقت واحد میں صرف ایک شخص کے لیے کافی ہوتی ہے جبکہ ایک چھتری تلے سنگل پسلی کے کم سے کم دو آدمی بہ یک وقت پناہ لے سکتے ہیں گویا چھتری میں کسی بھی وقت کوئی بھی بے چھتری دوست یا شناسا لفٹ (Lift) لے سکتا ہے لیکن برساتی میں چاہنے پر بھی آپ کسی اور ہستی کو لفٹ نہیں دے سکتے، چاہے بھیگنے والی ہستی بیوی ہو یا محبوبہ ـــــ جو ناعاقبت اندیش لوگ برساتی کی محدودسمائی میں بیوی یا محبوبہ کو لفٹ دینے کی حمایت کرتے ہیں بھری برسات میں تماشا بن جاتے ہیں۔ بیوی کو لفٹ دینے کی صورت میں ان کے جذبات پر اوس پڑ جاتی ہے اور محبوبہ کو لفٹ دینے کی صورت میں جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں تاہم انجام دونوں صورتوں کا وہی ہوتا ہے جو چھری کے خربوزے پر اور خربوزے کے چھری پر گرنے کا ہوتا ہے اس کے برخلاف چھتریاں ان جوڑوں کے لیے شرطیہ پیغام مسرت لاتی ہیں جو گھروں میں ایک دوسرے کی صورت سے اس حد تک بیزار ہوتے ہیں کہ ایک ہی چھت کے نیچے، دو اجنبیوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، موسم برسات چھتریوں کے توسط سے ان صورت بیزار جوڑوں کو پھر سے نزدیک لے آتا ہے اور یوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہنے والے ایک ہی چھتری کے نیچے پہنچ کر پہلے تو نیلی چھتری والے کا شکریہ ادا کرتے ہیں پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں پچھلے قول و قرار اس طرح دہراتے ہیں ؎

کبھی ہم میں تم میں بھی پیار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اور دیکھتے ہی دیکھتے بارش کے شفاف پانی میں اگلی تمام رنجشیں، پچھلے سارے گلے دھل جاتے ہیں اور بہ فیض چھتری نقشا یہ ہوتا ہے کہ ؎ تم گلے سے کیا ملے سارا گلہ جاتا رہا۔

پس اس موازنہ چھتری اور برساتی سے ثابت ہوا کہ جو بات چھتری میں ہے وہ برساتی میں کہاں۔!!

اگرچہ چھتری اور برسات میں وہی تعلق ہوتا ہے جو تانگے اور گھوڑے، ڈاکٹر اور مریض، کپڑا اور جھوٹ میں ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ چھتری صرف موسم برسات ہی میں کام آتی ہے اور برسات کے وداع لیتے ہی، اسے بھی لپیٹ کر طاق پر رکھ دیا جاتا ہے، جیسا کہ ہم نے پہلے ہی عرض کیا کہ چھتری بھی زندہ طلسمات، کی طرح ہمہ مقصدی شئے ہے چنانچہ ہر آڑے وقت ہر موسم میں مددگار ثابت ہوتی ہے، مثال کے طور پر موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ میں جبکہ چیل انڈا چھوڑتی ہے۔ یہ آپ کے وجود خاکی کو نہ صرف دھوپ سے بلکہ چیل کے چھوڑے ہوئے انڈے کی زد سے بھی بچاتی ہے۔ گلابی جاڑوں میں جب سڑک چھاپ کتوں پر عشق کے دورے پڑتے ہیں اور وہ جنون کے عالم میں کتے سے شیر اور آپ کا راستہ روکتے ہیں، تب بھی چھتری جادو کی چھڑی کا کام کرتی ہے، یعنی اسے ہوا میں گھماتے ہی شیروں کی طرح دہاڑتے ہوئے کتے بھیگی بلیوں کی طرح دم دبا کر غائب ہو جاتے ہیں، بسا اوقات تو کسی راہ گیر کے ہاتھ میں لٹکتی ہوئی چھتری کو دیکھ کر ہی بعض ڈرپوک کتوں کے عشق کا بخار سوڈے کے جھاگ کی طرح خود بخود ہوا ہو جاتا ہے۔ یہ تو خیر کتوں کی بات ہوئی فرض کیجیے آپ اپنی دھن میں مست کسی تنگ گلی سے گزر رہے ہیں کہ اچانک جو گلی باٹلیاں، چلنی شروع ہو جائیں اور دیکھتے ہی

بچنے فرار کے سارے راستے مسدود ہو جائیں تو ایسے میں حواس باختہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں فوراً چھتری کھول لیجیے ایک مضبوط ڈھال بن جائے گی جن سے ٹکرا ٹکرا کر بجلیاں عرف بائلیاں خود حیران رہ جائیں گی یعنی دم توڑ دیں گی اور آپ چھتری کے طفیل موت کے مُنہ میں سے اس طرح صحیح سلامت نکل آئیں گے جیسے مکھّن میں سے بال ۔۔۔ چھتری صرف اس قسم کی ناگہانی آفات بلیات ہی سے آپ کو محفوظ نہیں رکھتی بلکہ اکثر غیر متوقع طور پر پیش آنے والی رنتار کسے بھی بچاتی ہے۔ مثلاً آپ کو گھر یا دفتر پہنچنے کی جلدی ہے اور ایسے میں اچانک سر راہ کوئی چیکو قسم کا شناسا بازمن خواہ کسی بلائے بے درماں کی صورت دکھائی دے جاتا ہے اب آپ کے لیے سچویشن یہ ہے کہ نہ جائے رفتن ہے نہ پائے ماندن۔ لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ذرا حاضر دماغی سے کام لیجیے چھتری کھول کر اسے ذرا سا ترچھا کیجیے اور سینہ تان کر نا پسندیدہ شخص کے برابر سے نکل جائیے اسے خبر بھی نہیں ہو گی کہ جسے وہ ڈھونڈھتا تھا گلی گلی، وہی اس کے پہلو سے اپنا پہلو بچا کر نکل گیا۔ اس لیے تو کہتے ہیں سہ

چھتری ترے رنگ ہزار
کرتی سب کا بیڑا پار

شعری مجموعے

جن کی صرف ایک ایک، دو دو کتابیں اسٹاک میں موجود ہیں۔

کتاب	مصنف	قیمت
امکان	ساحرہ بیگم	۱۰/-
آنچل اور پرچم	سروش یزدانی	۲۲/-
ابد	مظفر ایرج	۳۰/-
بادۂ خیام	پروفیسر غلام دستگیر شہاب	۲۵/-
برگ زرد	طالب چکوالی	۱۵/-
برگ آوارہ	حبیب جالب	۱۰/۵۰
بحر بیکراں	اختر بستوی	۵/-
باقیات اقبال	مرتبہ سید عبدالواحد معینی	۲/۵۰
برق تبسم	تبسم علی پوری	۱۰/-
برگ سبز	طالب چکوالی	۴/-
باغ تازہ	نقوی مصطفیٰ آبادی	۱۰/-
بازگشت	ڈاکٹر نریش	۷/-
بوئے گل نالۂ دل	حسرت سہروردی	۴/۵۰
بزم خیال	سیدہ فرحت	۱/-
بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا	مخمور سعیدی	۲۵/-
بے چین لمحوں کا تنہا سفر	ویریندر پٹواری	۴۰/-
برف شجر آواز	حمید الماس	۳۰/-
برگ سرسبز	ناجی انصاری	۱۰/-
باقیات شہباز	ڈاکٹر سید صابر حسن	۲۵/-
بھیگی رتوں کی کتھا	شہناز نبی	۲۷/-
پہلا پتھر	طاہر تلہری	۱۰/-
پیمانۂ امروز	نعیم صدیقی	۲۰/-
پرواز خیار	فیاض بخشی	۱۰/-
پیام مشرق	اقبال	۵/-

کتاب	مصنف	قیمت
پاک زمین ناپاک قدم	عشرت کرتپوری	۵
پنکھڑی گلاب کی	تبسم	۵.
پیکر خیال	اختر بستوی	
پنکھڑیاں	سید سہروردی	
پس دیوار شب	سکندر رحمٰن	
پرچھائیں اور اس کا دوسرا رخ	آصف علی	
پھول	محشر فیض آبادی	
پرندوں بھرا آسمان	بلراج کومل	
پیوند خستہ باد باں	خمار قریشی	
پچھلے پہر کا خواب	راج کھیتی	
پرچھائیوں کا جلوس	جگن ناتھ پرساد داس	
پہچان کا درد	حمید الماس	
تابوت	مقدر حسین	
ترنگیں	رانا پرتاپ سنگھ رانا گنوری	
تصویر وفا	حکیم احمد علی خاں وفا	
تکون کا کرب	آزاد گلاٹی	
ترانہائے خیام	مرتب۔ آغائی سید غیب حسین	
تردید	محبوب راہی	
شیشے کا سفر	رضا اشک	
ترکش بشر	افتخار احمد بشر	
تلاش	پنڈت گوکل چند حسرت شوری	
تیسرا سفر	سلیمان خمار	
تجلیات قمر	جمال احمد صدیقی	
تعارف	طلعت عرفانی	
جب جی صاحب وسکوتی صاحب / خواجہ دل محمد صاحب		
اصل بمع ترجمہ آسان اردو نظم میں		
جام سہ آتشہ	پروفیسر پریم زنگیوری	
جنبش لب	ایاز بلگرامی	

ملنے کا پتا:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئ

ایڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(ماہنامہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

کتاب نما کے جولائی کے شمارے میں
ڑاسعید الظفر چغتائی صاحب نے ڈاکٹر منیب الرحمٰن
غزل مشمولہ کتاب نما بابت جون ۱۹۹۱ء پر "الاو"
ے سلسلے میں جو اعتراض کیا ہے وہ حق بجانب
ے مگر ان کی نظر اسی غزل میں "رنگینیٔ لہو" کی
یب پر نہیں پڑی۔

ہر زخم انتقام ہے اک حرف خونچکاں
رنگینیٔ لہو سے رقم داستاں ہے آج

ہو" ہندی کا لفظ ہے اس کا مخفف "لہو"
ہے۔ رنگینی کے ساتھ اس کی ترکیب صریحاً ناجائز
ہے۔ مشق سخن چھوڑ دینے اور طویل عرصے کے بعد
رگوئی کی طرف راغب ہونے میں اس قسم کا
ہوا کثر ہو جاتا ہے۔ غالباً ڈاکٹر منیب الرحمٰن
ے ساتھ یہی کچھ ہوا ہے۔

نامی انصاری۔ سول لائنز کانپور

نامی انصاری کے خط کے جواب میں
یب میں نے دیکھی تھی، مگر "لہو" ایسا سبک
ہے کہ فارسی نہ سہی، فارسی ترکیب میں
پ جاتا ہے۔ اور اردو بہرحال ایک مستقل
بان ہے۔ اسی لیے میں نے یہ اعتراض نہیں
یا۔

سعید الظفر چغتائی علی گڑھ

کتاب نما ہر ماہ راجہ بک اسٹال پریڈ کانپور سے
دستیاب ہو جاتا ہے اور روشنیٔ قلب و نظر فراہم کرتا ہے۔
اگست کے شمارے میں خاص طور پر نظیر صدیقی
کا مضمون بہت عمدہ ہے شعریات میں بلراج کومل
عبد الاحد ساز، اور شاہد میر پسند آئے

عشرت ظفر

اگست کے کتاب نما میں مہمان مدیر جناب
علی جواد زیدی کا اشاریہ پڑھا۔ یہ جناب رفعت سروش
کے فکر انگیز اشاریہ (کتاب نما فروری ۹۱ء) کے
جواب میں لکھا گیا ہے۔ لیکن جن ٹھوس حقائق کو
رفعت سروش صاحب نے پیش کیا ہے علی جواد
زیدی صاحب اپنی تحریر میں اس کو رد نہیں کر سکے
بلکہ انھوں نے صرف لیپا پوتی سے کام لیا ہے اور
ٹریک بدل بدل کر دوسری تیسری باتیں کہ گئے
جن کا رفعت صاحب کے مضمون سے کوئی ناتا نہیں
ہے۔

زیدی صاحب فرماتے ہیں کہ "ہمارے موجودہ
رسائل کتاب نما، شاعر، اور آج کل کے خریداروں
کا حلقہ وسیع تر ہو، کیونکہ یہ معیاری رسالے ہیں۔
لیکن مجھے حیرت ہے کہ وہ 'ایوانِ اردو' کو کیوں
بھول گئے۔ جبکہ 'ایوانِ اردو' کا معیار 'آجکل' سے
کہیں بہتر ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کتاب نما اور شاعر
جیسے ادبی رسالوں کا (جو غیر سرکاری ادارے سے
شائع ہوتے ہیں) تواتر کے ساتھ چھپتے رہنا فی زمانہ
ایک معجزہ ہے لیکن جب بات "آج کل" کی
ہوگی تو اس سے پہلے 'ایوانِ اردو' کا ذکر ضروری
ہے۔

قیصر اقبال۔ مونگیر

جون ۱۹۹۱ء کے کتاب نما میں، پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کے بارے میں میرا ایک کھلا خط شائع ہوا تھا، جس کے جواب میں ان کے بڑے بھائی سید محی رضا صاحب کا خط کتاب نما کے تازہ شمارہ (اگست) میں شائع ہوا ہے، جس میں اصل مسئلے کے متعلق موصوف نے لکھا ہے کہ "یہ غیر مناسب بات ہے کہ کسی کی موت پر کوئی اپنے تاثرات لکھے اور پھر اس قسم کے اختلافی مسائل کو اٹھائے۔" مجھے موصوف کے اس خیال سے اتفاق نہیں کہ دسنوی صاحب کا یہ مضمون تعزیتی تھا، کیونکہ مرحوم کا انتقال ۳۱ر جنوری ۱۹۹۱ء کو ہوا ہے، جس کی اطلاع کتاب نما کے فروری کے شمارے میں شائع ہوئی ہے اور دوسرے ماہ، یعنی مارچ کے شمارے میں جناب رفعت سروش صاحب کا مضمون اور دہلی کے تیرہ منتخب ادیبوں اور دانشوروں کے تاثرات شائع ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں ان کی اشاعت کے بعد تعزیت کا فرض کفایہ ادا ہو گیا۔ اس کے بعد اپریل کے شمارے میں دلیپ سنگھ صاحب کا مضمون: "ظ میرا یار" اور مئی کے پرچے میں دسنوی صاحب کا مضمون: "ظ بھائی" شائع ہوا۔ میرے نزدیک یہ دونوں مضمون عام نوعیت کے تھے۔ لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ دسنوی صاحب کا یہ مضمون تعزیتی تھا تو مولانا آزاد کی جامع مسجد والی تقریر کے بارے میں ظ مرحوم کے خیالات، ان کے انتقال سے کم و بیش دو سال پہلے، دسمبر ۱۹۸۸ء میں ایوانِ اردو کے آزاد نمبر میں شائع ہوئے تھے۔ اس طویل عرصے میں، مولانا آزاد کے مختلف پہلوؤں پر دسنوی صاحب کے متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں، اگر وہ چاہتے تو اس مسئلے پر بھی لکھ سکتے تھے۔ مگر انھوں نے اس کا ذکر تک نہیں کیا، آخر کیوں؟ خیر سے بھی

چھوڑیے۔ اب میرے کھلے خط کے بعد خدا کا شکر [illegible] انھیں اس طرف توجہ ہوئی، چنانچہ ہفت ر[illegible] ہماری زبان مورخہ ۱۵ر جون کے شمارے میں متنازعہ فیہ مسئلے پر لکھا ہے۔ مگر جو کچھ لکھا وہ نہ لکھنے کے برابر ہے۔ ظ صاحب کے [illegible] سے فرماتے ہیں: "لیکن جب ۱۹۴۸ء کی [illegible] کی جامع مسجد کی تقریر کا ذکر چھڑتا ہے تو [illegible] افسانوی تقریر کہتے ہوئے لکھتے ہیں:" [illegible] بعد ظ صاحب کی تقریر کا ایک مختصر اقتباس کرنے کے بعد، دسنوی صاحب اس [illegible] مسئلے کے بارے میں اپنی رائے لکھتے ہیں [illegible] نیم افسانوی ہونے کا ثبوت پیش نہیں کر[illegible] اور ان لوگوں کا نام بتاتے ہیں جو اس [illegible] پر موجود تھے۔" ملاحظہ فرمایا آپ نے [illegible] اہم مسئلے پر یہ ہے دسنوی صاحب کی را[illegible] اس سے ان کے مطالعے اور ان کے فکر [illegible] اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ماہنامہ کتاب نما کے فاضل مدیر [illegible] شاہد علی خاں صاحب، دسنوی صاحب کے ہمدردوں اور سچے دوستوں میں سے ہیں [illegible] کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ [illegible] جب سید محی رضا صاحب کے زیرِ تذکرہ خط [illegible] بارے میں بات ہوئی تو انھوں نے [illegible] اس رائے سے اتفاق کیا کہ واقعی ایک [illegible] مضمون میں کسی اختلافی مسئلے کے ذکر کا [illegible] تھا۔ اس کے جواب میں میں نے عرض [illegible] یہ محض ایک بہانہ ہے، دراصل اس مسئلے [illegible] کی سرے سے نظر نہیں ہے۔ میری اس گ[illegible] پر انھوں نے میری طرف اس طرح دیکھا [illegible] کو میرے اس خیال سے اتفاق نہیں [illegible] اگر انھوں نے ہماری زبان کے مذکورہ

...ہے تو مجھے معلوم نہیں کہ اس کے بارے
...ن کی کیا رائے ہے؟ بہرحال اس مضمون کو
...نے کے بعد مجھے اپنی رائے پر پہلے سے زیادہ
ہوگیا۔ اگر واقعی دسنوی صاحب آزاد شناسوں
...ے ہیں، جیسا کہ ان کے اعزہ اور شاگردوں کا
...ہے تو اس مسئلے پر ان کو اپنی ذاتی رائے
...چاہیے تھی کہ آیا یہ تقریر مولانا کی ہے یا بقول
...ب محض فرضی ہے۔ لیکن اس قسم کے اظہار
...کے لیے جس وسیع مطالعے کی ضرورت ہے،
...ے اس سے دسنوی صاحب محروم ہیں۔
دسنوی صاحب کے اس چند سطری تبصرے
...ایک غلطیاں ہیں۔ پہلی غلطی یہ کہ اس
...تقریر کا سنہ دسنوی صاحب نے ۱۹۴۸ء
...ے اور دو مرتبہ لکھا ہے، حالانکہ صحیح ۱۹۴۷ء
...خطبات آزاد میں نومبر ۱۹۴۷ء لکھا ہے۔ دوسری
...کر دسنوی صاحب نے زیر بحث تقریر کو
...مانوی" لکھا ہے۔ اس کا ارتکاب بھی دو
...ہوا ہے۔ حالانکہ ظ صاحب نے اپنے تبصرے
...لفظ کہیں استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ ذیلی
...میں "مفروضہ" کا لفظ لکھا ہے اور متن
...فرضی" تیسری غلطی زبان کی ہے۔ لکھتے ہیں:
...ز ان لوگوں کا نام بتاتے ہیں جو اس
...پر موجود تھے"۔ لوگوں کی مناسبت سے
...کے بجائے "کے" ہونا چاہیے۔ ظ مرحوم
...تبصرے میں اور بہت سی خامیاں ہیں،
...کے بارے میں دسنوی صاحب بھلا کیا لکھتے۔
...نے ایک طویل مضمون میں ان کی نشان دہی
...، جو عنقریب شائع ہوگا۔
دسنوی صاحب کے خود ان ہی کے
...میں "محترم و مکرم پروفیسر عبدالمغنی رضا"
...نے اصل موضوع سے ہٹ کر کچھ غیر متعلق
باتیں بھی لکھی ہیں، مگر ان کے بارے میں موصوف
کو براہ راست لکھنے کا ارادہ ہے، کتاب نما کے
صفحات کو خواہ مخواہ کے لیے گراں بار کرنا نہیں چاہتا۔

عبداللطیف اعظمی، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

تازہ شمارے میں ہمیشہ کی طرح سنجیدہ
مضامین اور ترقی پسندانہ غزلیں پسند آئیں۔
مگر یوسف ناظم صاحب کے مضمون "کتابوں کے
بارے میں" کا جواب نہیں۔ یوسف صاحب آج کل
کے سب سے بڑے مزاح و طنز نگار ہیں۔ شفیق الرحمٰن
کے بعد نظریں انہی پر ٹھہرتی ہیں۔

عفت موہانی، حیدر آباد

"کتاب نما" اگست ۹۱ء کو اگر بمبئی نما یا بمبئی نامہ
کہا جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ بطور مہمان مدیر
... جہاں ایک طرف علی جواد زیدی صاحب نے
تخلیق کار اور ناقد کے قدیمی رشتے اور سلگتے ہوئے
موضوع پر اپنی مدبرانہ نگاہ ڈالی ہے اور بہت
حد تک اس مسئلے کا حل بھی تلاش کیا ہے وہیں
دوسری طرف یوسف ناظم صاحب نے کتابوں کے
بارے میں اپنے شگفتہ افکار قلمبند کرکے ہمارے
لیے کچھ ہنسنے (نہیں بلکہ رونے) کا جواز فراہم کیا ہے۔
ویسے بھی میں موصوف کی تحریر کا شیدائی ہوں لیکن
اس مضمون کی بات ہی کچھ اور ہے۔ شمیم طارق
صاحب نے حسن نعیم مرحوم کی شاعری پر بڑے
ہی سلیقے سے اظہارِ خیال کیا ہے کاش یہ مقالہ
سیر حاصل ہوتا۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ایک گراں قدر
مضمون لے کر حاضر ہوئی ہیں جو ان کی کاوشوں کے
طفیل اور زیادہ قیمتی ہوگیا ہے۔ احمد وصی کی نظم
"سامری" نے بلاشبہ متاثر کیا۔ ڈاکٹر سیفی پریمی،
نسیم سحر، شاہد میر اور اختر ضیائی کی غزلیں اچھی

لگیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی کی غزل کا مطلع اور پھر پانچواں
شعر مدتوں یاد رہے گا۔

مناظر حسن شاہین گیا، بہار

نہ جانے کس الہامی کیفیت میں انجم صاحب
کو ہوسٹل کے بیرے نے انجمن صاحب کا لقب عطا
کیا ہوگا اس ناخواندہ کا مشاہدہ اور قیافہ شناسی
کتنی غضب کی ہوگی کیونکہ انجم صاحب واقعی خود ایک
انجمن ہیں ان کی زندگی مختلف مشاغل میں منقسم ہونے
کے باوجود ایک جامع شخصیت ہے۔

راجیندر بہادر موج نیج گڑھ۔ یوپی

تازہ شمارہ میں گوشۂ خلیق انجم میں ایم حبیب خاں
اور رفعت سروش کا مضمون بہت پسند آیا۔
خلیق انجم نے پچیس سال میں اردو ادب کے لیے جو کچھ کیا
ہے۔ اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انجمن ترقی اردو
کے لیے ملک کا کونا کونا چھان مارا۔ آج یہ ادارہ
خود کفیل ہے۔ کیا یہی ایک کام ایسا نہیں جسے ہمیشہ
یاد رکھا جائے۔

۔ حافظ شمس، آغا بیگ اسکول، آسنسول

علی جواد زیدی مہمان مدیر کا اشاریہ حقائق
کی خوب ترجمانی کرتا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی
کا مضمون نے مجھے بہت متاثر کیا۔ انھوں نے بڑی
محنت ولگن سے اقبال کے کلام سے ابراہیمؑ و
اسماعیلؑ کی طرز زندگی کے جواہر پارے نکال کر
قارئین تک پہنچائے۔ شاید ڈاکٹر صاحبہ پہلی محقق
ہیں جنھوں نے کلام اقبال پر اس زاویے سے تحقیق کی۔

خواجہ رحمت اللہ جری (سعودیہ)

علی جواد زیدی صاحب نے مہمان ہوتے
کا پورا فائدہ اٹھالیا۔ نظریاتی تنازعوں کے
میں کتاب نما غیر جانب دار ہے۔ اس بور
، کا ہر مہمان فائدہ اٹھاتا ہے جس کا فائدہ
لوٹتے ہیں۔
مجموعی طور پر کتاب نما نے قاری کا حق ا
ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، پروفیسر نظیر صدیقی، شمیم
اور یوسف ناظم بازی لے گئے۔

فاروق نشتر مسو

جولائی کے شمارہ میں گوشۂ خلیق انجم
کہنا زیادتی بلکہ ستم ظریفی ہے۔ بہت خ
اس کے لیے خلیق انجم کو بہت بہت مبارکبا
کہ اس کو پڑھ کر بے اختیار یہ منہ سے
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنے قصور تھا اور ایک
خلیق انجم سے ملاقات ہوئی۔ یہ اچھی بات ہے
بعض ادیب اپنی حیات ہی میں ایسا کچھ کر کے
کروا کے جاتے ہیں کہ وہ یاد رہیں خدا ان کی عمر
کرے۔
اس کام کے لیے حبیب خاں سے ز
موزوں اور معتبر کوئی اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔
پھر اگست کے شمارے میں متعدد
کے اس کی پسندیدگی کے خطوط مسو
تک کا اپنے انداز میں اس پر تبصرہ گوپی چند
کا خراج تحسین۔
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہ
گی۔ اس کو پڑھ کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ
میں جب ہر طرف سے شدید قسم کے دباؤ
جیسا کھرا آدمی بھی کہیں نہ کہیں
کر ہی لیتا ہے۔ یہ آپ کی بھی مجبوری ہے۔

صغرا مہدی
عابد ولا، جامعہ نگر، نئی د

نما
کتاب نما" بابت اگست ۱۹۹۱ء میں جناب
زیدی کا اداریہ باصرہ نواز ہوا۔ اپنے اداریے
ؤں نے تخلیق کار اور ناقد دونوں کو
ھ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس
ے کو پڑھ کر میرے ذہن میں کچھ سوالات
نے ہوئے۔ ادب کا ہر طالب علم یہ بات
ہے کہ تنقید کا کام کھرے کھوٹے کو پرکھنا ہے
ں تعریف یا تنقیص نہیں ہے مگر ہیں دیکھتا
اردو تنقید صرف تعریف یا تنقیص بن کر رہ
ہے۔ زیدی صاحب نے لکھا ہے کہ
"ایک نقطۂ نظر یہ ہو سکتا ہے کہ تحریر
ثنا ہے تو اس کی طرف توجہ ہی کیوں
ئے؟ کیا اس سے بیگانہ وار گزر جانا بہتر نہ
!

یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ
ہ نگار واقعی ہر تحریر کو پڑھتا ہے جب
اس تحریر کو پڑھے گا ہی نہیں تو وہ
ے گا کہ وہ تحریر قابلِ اعتنا ہے یا نہیں
مظہری کی شاعری قابلِ اعتنا نہ تھی مگر
نا احمد اس سے بیگانہ وار گزر گئے۔
م عاجز
"انھیں (جمیل مظہری) اس بات کا بجا
م تھا کہ کلیم الدین احمد نے "اردو شاعری
پر ایک نظر" اور "اردو تنقید پر ایک
ئزہ" کتابیں لکھیں مگر ان میں ان کا نام
بھی نہ آیا" (مقدمہ جمیل مظہری کی شعری
تخلیقات ——— از سید نعمت اللہ
صاحب نے لکھا ہے کہ
"اگر ان نئے لکھنے والوں کا انداز
ہ، طرزِ فکر وغیرہ صلاحیتوں کا پتا دیتے

ہیں تو ان کی ہمت افزائی اور رہنمائی اور
ان کی صلاحیتوں کی ایسی نشاندہی جو خود
ان کے لیے اور قاریوں کے لیے نتیجہ
خیز ہونا ضروری ہے۔"

یہاں پر میں یہ سوال کروں گا کہ نئے لکھنے والوں
کو موقع کون دیتا ہے۔ آج کل کے مدیروں کا تو یہ
حال ہے کہ نئے لکھنے والوں کی تحریر کا وہ جواب
تک نہیں دیتے اور اگر بڑی مہربانی کی (وہ بھی
اس صورت میں جب اس نے جواب کے لیے ڈاک
ٹکٹ لگا ہوا لفافہ ارسال کیا ہو) تو اسے اس کی
تخلیق واپس بھیج دی۔ بعض رسائل تو اپنے ہر
شمارے میں یہ معذرتی اعلان شائع کرتے رہتے
ہیں کہ براہ کرم غیر طلبیدہ نگارشات نہ بھیجیں
اب وہ قابل اشاعت نگارشات کس سے طلب
کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ چند گنے چنے نام ہیں
جو ہر شمارے میں نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ
اندازہ ہوتا ہے غالباً اب نئے لکھنے والے آنا
بند ہو گئے ہیں جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

اقبال حسن آزاد
شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر

خلیق انجم صاحب کے بارے میں آپ نے
بہت کم وقت میں بہت اچھا کام انجام دیا ہے۔
یہ آپ کے خلوص کا آئینہ دار ہے۔ سب سے
زیادہ خوشی مجھے اس بات کی ہوئی کہ آپ انجمن
کے کاموں میں انجم صاحب کے معاون تو تھے ہی
اب ذاتی طور پر بھی ان کے کام آرہے ہیں۔ آج
کل ہر شخص اپنا ڈھول پیٹتا ہے، لیکن آپ
دوسروں کے کام آرہے ہیں۔ اس کتاب کے
یوں تو سبھی مضامین اچھے ہیں لیکن سب سے

اچھا آپ کا مضمون ہے۔ مضمون نہیں یہ شخصی خاکہ ہے
آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے انجم صاحب
کی شخصیت کے خدوخال اجاگر کیے ہیں۔ آپ کو
خاکہ نگاری سے خاص مناسبت ہے۔ اس سے پہلے
اختر انصاری مرحوم پر آپ کا خاکہ پڑھ چکا ہوں۔
وہ بھی بہت اچھا شخصی مطالعہ تھا۔ اس جہت میں
کام جاری رکھیے۔ آپ نے بہت سے لوگوں کو قریب
سے دیکھا ہے' اُن کے بارے میں اسی انداز کے
مضامین لکھیے اور ایک مجموعہ مرتب کر لیجیے۔ لیکن زندہ
لوگوں پر فی الحال نہ لکھیے۔ زندوں پر لکھنے میں
نقصان یہ ہے کہ بہت سی باتیں مروت کی وجہ سے
تحریر میں نہیں آپاتیں۔ (بنام مہمان مدیر)

مشفق خواجہ
۳ ڈی ۹/۵ ناظم آباد۔ کراچی

خلیق انجم نمبر آپ نے بہت خوب مرتب کیا۔
یہ امر واقعہ ہے کہ ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی گراں قدر
ادبی کاوشوں اور اردو کے لیے ان کا اپنے شب و روز
وقف کر دینا اس امر کے متقاضی تھے کہ ان کا اعتراف
کیا جائے اور اُنھیں خراجِ تحسین پیش کیا جائے۔
آپ نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدماتِ
جلیلہ کو جس انداز میں خراجِ تحسین ادا کرنے والا یہ
وقیع کام کیا ہے' اس کا کریڈٹ تو آپ کو جاتا ہی
ہے' ساتھ ساتھ ہم سب اردو لکھنے پڑھنے والوں
کی جانب سے آپ نے جو قرض اور فرض ادا کیا ہے' وہ
بھی اپنی جگہ لائقِ تحسین ہے۔ آپ نے فی الواقعہ بڑا کام
کیا ہے۔ مبارکباد۔ آپ کا خاکہ "انجمن صاحب" مزہ دے
گیا۔ مزید مبارکباد۔
محترم و مکرم شاہد علی خاں صاحب بھی ہم سب کے
شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کام میں اپنی
نیازمند طبیعت اور علمی ادبی کاموں میں اپنی
قلب اور حسبِ روایت تعاون فرمایا از:

عتیق احمد
صدر شعبہ انگریزی اُردو
کراچی

"کتاب نما" جولائی کا شمارہ دیکھا۔ اد
میں پہنچ کر آپ سے تمام ملاقاتیں تازہ ہو گ
آکھڑے ہوئے سامنے کر دیے "دریا سمٹ
کے کنارے میں" یا کا PORTRA IT بن جائے
صاحب نے اس پر گوشہ شائع کر کے اور
نے اس گوشہ کو ترتیب دے کر آپ کے
پرا ...انِ عظیم فرمایا ہے۔ ایسی ہمہ صفات، ہ
دلنشیں شخصیت کا انتخاب کیا ہے ان حضر
سب سے پہلے انھیں ہی مبارکباد دینے کو
تمام مضامین جامع ـــــ اور خوبصورت ہیں۔

قمر قدیر ارم
مراد آباد۔ یوپی

آپ کا رسالہ جب بھی آتا ہے سب سے پہلا
وادی کی سیر کرتا ہوں چنانچہ اس شمارے کی
سب سے پہلے کیا۔ ان میں ہندستان کے مخ
غزل گو تو ہیں ہی، ساتھ ہی ساتھ بیرون
غزل گو ہیں چنانچہ نسیم سحر (جدہ) اشتیاق
اختر ضیائی اور اکبر حیدر آبادی (لندن) بھی شامل
دراز علاقوں میں رہنے کے باوجود ان کی غ
نیا تجربہ کوئی نئی بات، کوئی نیا انداز نہیں ملتا
رنگ کی غزلیں نظر آتی ہیں یا تو یہ بات ہے کہ شاعر
میں رہے غزل اپنا رنگ جما کر رہے گی۔ یا اپنے دا
نہیں دے گی یا ہمارے غزل گو شعرا کچھ اس طرح
وہ جدہ میں رہیں یا لندن میں امریکہ یا یورپ
تجربات بیان کریں گے جو برسہا برس سے بیان
سید ...

کتاب نما، اپنی نوعیت سے رسالہ نہیں، کتاب کہے جانے کی صف میں آتا ہے۔ اس لیے کہ اس
پر موجودہ دور کے یگانۂ روزگار افراد اور ادبی مسائل پر گفتگو اس انداز سے کی جاتی
ہر تاریخی، ادبی، ثقافتی اور معاشی، ہر اعتبار سے، بہتر کہہ سکتے ہیں۔ اور کسی کتاب کی خوبی
ہے کہ اس کے مندرجات کو یاد رکھا جائے۔ اور اسے سند کے طور پر پیش کیا جائے:
ان ۹۱، شمارہ: خلیق انجم: کے نام سے، اُن کے کام سے، اور اُن کی اہلیت کی فہرست سے معمور ہے۔
اس وقت صرف ایم۔ حبیب خاں صاحب کے مقابلے پر گفتگو کریں گے۔ جو ان دنوں انجمن
اردو ہند کے جنرل سکریٹری کے ہمراہیوں میں بھی ہیں اور کتاب نما کے اس شمارے
خصوصی بھی، ۔ ان کا مضمون صفحہ ۴۰ سے صفحہ ۴۰ تک پر محیط ہے۔ جس میں قاری کو ہر طرح
مل جائے گا۔
خلیق انجم۔ جب علی گڑھ کے طالب علم تھے، جو تجربے انھوں نے یہاں کیے، یا حاصل کیے،
یہاں بھی کسی حد تک صاحب مضمون نے تحریر کر دی ہے۔ مگر شاید ان شرارتوں اور تفریحات
بابا ان کا ذکر مناسب نہیں خیال کیا۔ جو سرزد ہوئیں۔ مگر سچ ہے کہ علی گڑھ میں جو کچھ
کی خوشبو ہنوز ان میں باقی ہے۔ خلیق صاحب جس وقت علی گڑھ میں تھے، وہ دور اختلال
کو شام کی تبدیلی کا سرنامہ کہے جانے والی بات تھی۔ مگر ایک جماؤ ایسا تھا جس کے زیر سایہ
احب، تربیت ذہنی پا رہے تھے جس کا اعتراف وہ خود کر سکتے ہیں۔ باقی تو پالنے والی
کی بات ہے۔
ہاں خلیق انجم کے تعلیم سے تعلم تک کی داستان کی جھلکیاں میری نگاہوں میں بھی ہیں اور ان
ضبط کی داد بھی، صرف میں ہی دے سکتا ہوں۔ اسی طرح ان کے؛ انجمن صاحب بننے
دور در پیش آتے اور جس گرم و سرد لہر سے ان کو گزرنا پڑا۔ اس کے شاہد وہ خود ہیں۔
اس پوری کہانی میں وہ نام سرے سے موجود ہی نہیں یا شاید اس کی ضرورت نہیں سمجھی
شخص کا نام اب لیا جائے، جو اس دنیا سے کوچ کر چکا ہے۔ ورنہ اس مردِ حق شناس سے
انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری کے عہدے کا فیصلہ کر کے، واپس ہو رہا تھا۔ دریافت کیا کہ
رہا؟ — تو کمالِ خاموشی سے کہا — خلیق انجم کا — پھر فرمایا — بوڑھے لوگ کہاں تک
اس گفتگو کے بعد:

بس اک خاموشی ترے سب کے جواب میں

نزل کیا۔ وہ بزرگ بھی تو امیدواروں میں تھے؟ خاموشی بکار چلتی رہی۔ فاصلے طے ہوتے رہے۔
رہ آیا چاہتی تھی احساسِ محرومی نہیں، کہ ہم اس کے عادی تھے، بلکہ لگن۔ شوق اور تجسس کا
اور رہا نہ گیا۔ اس سوال کو پھر اس طرح سے پوچھا — خلیق صاحب علی گڑھ کے طالب علم ہیں اور
جناب گویائی نے زبان کھولی — نوجوانوں میں یہی کام کے نکلے، کیا کیا جاتا — اس کیا، کیا جاتا
تبصرہ اور تقرر سب پوشیدہ ہے۔ اردو گھر کی تعمیر کا مسئلہ اہم اور ضروری تھا۔ اسی
ایسا امور تھے جن پر: انجمن: کو اپنی گرفت شروع ہی میں سخت کرنی تھی۔ اس وقت حمایتی اور ہمدرد،

مُنہ دیکھے کی محبت والے بھی موجود تھے۔ ایک دن سبھدرا جوشی سے بھی اس ذیل میں گفتگو ہوئی
اہلِ علم اور بینش سے بھی باتیں کیں۔ قلم اور روشنائی سے بھی مدد کرنی چاہی کہ اردو۔ کا بھلا ہو، انجم
رہے۔ وہ خود رہیں، نہ رہیں، اردو کو دوام ملے۔ خدا علم ہے، علم صاحب نے انجمن: یا انجمن
سے اختلاف عمل کے باوجود بھی، کبھی حق تلفی کی بات نہیں سوچی تھی۔ یہ ان کا ایک وصفِ خاص تھا
حالت میں بھی، یاد نہ رکھنا تذکرہ نہ کرنا، پھر انجمن ترقی اردو ہند کی بات ہو اور زبان قلم پر
کا نام نہ آئے۔ ان کی خدمات کا اعتراف نہ سہی، جو کارگردگی ہو، عمل دخل ہو، وہاں پر بھی سکوت اف
تو سلو جہ۔ بر محل کہلائے گی۔

حاجی سید مرتضیٰ حسین
علی گڑھ

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تلاشِ آزاد

مصنف : عبدالقوی دسنوی
صفحات : ۱۴۰
قیمت : ۴۰/-
مبصر : ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار
جامع مسجد دہلی ۶۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی ساری زندگی شخصی ذہانت اور ادب سے غیر معمولی
گی کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ غالب سے ابوالکلام آزاد تک ایک سلسلہ ہے جس میں
ر اختصاصی حیثیت حاصل ہے۔ ابوالکلام آزاد پر ان کی سات کتابیں قبل منظر عام
چکی ہیں۔ آٹھویں کتاب "تلاش آزاد" ہے۔ جس میں تحقیق سے کام لیتے ہوئے انھوں
آزاد کی حیات، ان کی شخصیت اور خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ دراصل اس میں شامل
امین مختلف اوقات میں رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اب یہ یکجا شائع ہوئے
عبدالقوی دسنوی کے "پیش لفظ" کے علاوہ اس مجموعہ میں درج ذیل مضامین
ل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد — مختصر حالات زندگی
مولانا آزاد — وادیِ صحافت میں ۱۹۰۸ء تک
نوعمر صحافی — ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی
مولانا ابوالکلام آزاد اور ہفتہ وار پیغام
مولانا ابوالکلام کا سیاسی سفر (پہلی گرفتاری تک)
مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر بندی
مولانا آزاد — پہلی بار قید فرہنگ میں
مولانا ابوالکلام آزاد، وادیِ شاعری میں

زلیخا بیگم کی کہانی، مولانا ابو الکلام آزاد اور دوسروں کی زبانی
مندرجہ مضامین سے نہ صرف ابو الکلام آزاد کے حالات و خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کی شخصیت اور خیالات کے متعدد گوشوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب بیان کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں۔ بلکہ مولانا آزاد کے ناقدین زیر بحث آتے ہیں۔ اس طرح ایک وسیع دائرہ نظر فراہم ہوجاتا ہے۔ آزاد کی تصنیفات اور ان کی علمی خدمات ملکی و ملی جذبے کو پانے اور اسے جدید زندگی سے ہمکنار کرنے کے لیے صرف ہوئیں۔ انھوں نے ہمہ گیر تمدن کے خدوخال ابھارنے کی کوشش کی۔ عمرانی تغیر کا احساس دلایا جس میں ایک تہذیب کے ساتھ ساتھ دوسری نئی اور ترقی پذیر تہذیب ابھرتی ہے۔ اور جس میں زمانے کے چلنے کا واضح شعور ملتا ہے۔ اس عمرانی تغیر کی جھلک مولانا آزاد کے پورے ادب اور ان کی زندگی کے تمام سفر میں ملتی ہے۔ خواہ وہ ادبی ہو، سیاسی ہو، تعلیمی یا صحافتی ہو یا ازدواجی ہو۔

عبد القوی دسنوی کی تحریر صاف، شستہ اور رواں ہے۔ ان کے تنقیدی بیانات خلاصۂ کلام کا انداز لیے ہوئے ہیں۔ لیکن اس سے نہ خیال کی وضاحت میں کمی آتی ہے۔ اور نہ ژولیدہ فکری یا ژولیدہ بیانی کے آثار نظر آتے ہیں۔ کی تحریر کی تحقیقی اور علمی آن اور معروضی شان شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ اسی لیے "تلاشِ آزاد" آزاد شناسی کی ایک نئی جہت ہے۔ نئے اور مثبت نقطۂ نظر کا اظہار ہے۔ اور نئی منزل کی طرف اشارہ یا حقیقت کو پانے کی بھرپور کاوش ہے۔

کتاب آفسیٹ پر بے حد خوبصورت چھپی ہے۔ مولانا آزاد کی تصویر بھی کتاب میں شامل ہے۔

پیراہنِ جاں

نام مصنف ۔ اصلی محمد لیسین
قلمی ، منظر شہاب
قیمت : پچاس روپے
ناشر ، حسینی اشاعت گھر، آزاد نگر۔ جمشید پور ۸۳۱۰۱۱

مبصر : کلام حیدری

منظر شہاب نے ساٹھ سال کی عمر میں پہلا شعری مجموعہ شائع کرایا ہے۔ ان سے لوگوں نے تقاضا کر کے شائع کرانے پر مجبور کیا ہے۔ ساٹھ سال کے بعد بچھڑا ہوا شعری مجموعہ گویا شہاب کے شاعری کی بظاہر سبک رفتاری ہے لیکن میں ذاتی طور پر یہ جانتا ہوں کہ یہ سبک روی نہیں بلکہ مہین کام کا نتیجہ ہے۔ شہ

ب پڑھنے اور ادب تخلیق کرنے، دونوں میں بے حد (اکثر ضرورت سے زیادہ)
یں اور نرم و نازک اطوار کے قائل ہیں۔

"وراثت میں ملی زمینداری کا کشکول خالی ہوچکا تھا
سانس لینے کا دارومدار صرف والد صاحب کی
تنخواہ پر تھا۔ جو بے حد قلیل تھی۔ عسرت اور
تنگ دستی کا سامنا تھا۔ دل کی بربادی کے بھی
سامان موجود تھے۔"

ان چند نثری سطور سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ منظر شہاب کی زبان پُرلطف
۔ اس میں شعلگی اور لپلپاتی آگ کی لپٹیں نہیں ہیں۔ مگر ہڈیوں تک کو پگھلا دینے
لی وہ آگ ہے جو اوپر سے راکھ ہے۔

منظر امام کے لیے اتنا تہہ دار جملہ کہیں نہیں دیکھا!

"ان کا ماضی انتہائی معصوم تھا اور کوئی موسم
نہیں گذرا جس میں کھلے ہوئے کسی 'پھول' کی
یاد ذہن میں محفوظ ہو۔"

منظر شہاب نے دوستوں کے ذکر میں خاصی بخالت کو راہ دی ہے۔ مگر اپنے
لیے منظر امام اور اپنی بیوی پر بہت زور دیا ہے۔ حالانکہ اس کے بہت سے دوست
ے ہیں جو 'منظر امام' سے زیادہ اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کے بہت سے
ت بھی ہیں۔ بہرحال ساری خدائی ایک طرف ـــــ اس کے بہت پیار
ATTITUDE ہے

بذ دیکھیے:
یہی اچھا ہے کہ دھیمی رہے احساس کی آنچ
یہی اچھا ہے کہ کچھ تیز کریں سوز دروں
شعلۂ غم نہ بجھاؤ کہ یہی بہتر ہے
جب تلک جیتے رہیں، تم بھی جلو میں بھی جلوں

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ سبک روی مہین کام کے لیے ضروری ہے۔
ند شاعر کی طبیعت کی کتنی کھلی مگر کس قدر شعریت سے لبریز ہے۔

بے زبانی بنی، زباں میری
اس سعادت کو کیا کرے کوئی

بے زبانی کو زبان دینے کی سعادت ہر شاعر کے بس میں نہیں ہوتا اس کے لیے
ر شہاب ہی بننا ہوگا۔

نرم لہجہ بھی جب آگ لگاتا ہے شہاب
آگ دھیمی ہی سہی دل سے لپٹ جاتی ہے

منظر صاحب کی پوری شاعری مدھم آگ ہے۔ شعریت بہت کم مجروح ہوئی ہے۔ وہ بھی ترقی پسندی کے ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء وغیرہ کے خارجی اثرات کی بنا منظر شہاب کو وہاں تلاش کرنا شناخت کرنا غلط ہوگا وہ تو یہاں ہے:

دوست پتھر نہ اٹھاؤ، یہ ہے غیروں کا چلن
زخم پھولوں کے لگاؤ کہ سنبھل بھی نہ سکوں

غرض منظر صاحب اپنے اس اکیلے مجموعے کے باعث ہی ایک درجن مجموعے والے شاعروں کے مقابلے میں منفرد ہے اس کی شناخت بنی ہے اور کی جدید شاعری کو یہ بڑا ہدیہ ہے۔ ●●

ایک اور سپر اسٹار

(تین ایکٹ کا مکمل ڈراما)

ڈرامانگار:۔ قاضی مشتاق احمد
ناشر/تقسیم کار: شاہین پبلی کیشنز، شاہو نگر جلگاؤں مہاراشٹر
قیمت : پچیس روپے
مبصر:۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

قاضی مشتاق احمد کا پیش نظر ڈراما ہماری فلمی اور سیاسی زندگی کے بہت سارے تاریک گوشوں کو روشنی میں لاتا ہے۔ یہ ایسے گوشے ہیں جو روشنی میں آتے ہی دیکھنے والوں کی تفریح طبع کا سامان بنتے ہیں۔ اور ان کی آنکھیں بھی نم کر دیتے ہیں۔ ڈرامے کا مرکزی کردار پرساد ہے۔ جو دیہات میں رہنے والا "بھینسوں کا بیوپاری" ہے۔ چونکہ دولت مند ہے اس لیے فلموں میں آنا چاہتا ہے۔ اور فلم پالٹکس میں جانے کا شارٹ کٹ سمجھتا ہے۔ حالات کچھ ایسے ہو جاتے ہیں بنائے جاتے ہیں کہ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب بھی ہوتا ہے اور بھینسوں کی تجارت سے فلم کی اداکاری اور پھر پارلیمنٹ کی ممبری تک کے مرحلے آسانی سے طے کرتا ہے۔ پھر وہ ہر طرح کا غلط کام کرتا ہے۔ تعمیرات کے ٹھیکے لیتا ہے اور اس کا بنوایا ہوا کوئی پل چند برسوں میں ٹوٹ جاتا ہے تو انکوائری کمیٹی کے صدر کو خرید لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے کے لیے سب کچھ کر گذرتا ہے مگر آخر کار وقت کی زد پر آجاتا ہے۔ وقت جو سب سے بڑا منصف ہے اس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اور اس کی ساری بداعمالیاں نہ صرف نمایاں ہو جاتی ہیں بلکہ اس کو سزا دلوانے کا سامان بھی فراہم کرتی ہیں۔

بنیادی طور پر یہ ڈراما اپنے ملک کے بعض اہم سیاسی واقعات کے گرد گھومتا ہے جن سے ہم سبھی واقف ہیں۔ ایسا کرنا غلط بھی نہیں ہے مگر جو واقعات اس ملک کے ایک بڑے فلم اداکار کے ساتھ پیش آئے اور کچھ رد و بدل کے

س ڈرامے میں پیش ہوئے ہیں، دراصل کسی ناول کے لیے زیادہ موزوں تھے
ڈراما میں تصادم کی واضح شکل نہ ابھرے تو مزہ نہیں آتا۔ ڈرامے میں ایک FACTUAL MISTAKE
بھی ہے۔ سپر اسٹار پرساد جس آدمی کو ہرا کر الیکشن جیتا ہے اس کا نام
پر "ایڈووکیٹ جیلانی" درج ہے جب کہ مشٹ پر یہ "گیتا جی" بن جاتا ہے۔
ڈراما نگار نے غالباً ازراہِ احتیاط ملک کی اس سربرآوردہ فلمی ہستی کا نام الگ سے
یا ہے۔ تاکہ اس پر کسی طرح کی انتقامی یا قانونی کارروائی نہ ہو سکے۔ لیکن ڈرامے کے
اقعات خود بخود قاری کا ذہن ایک خاص سمت میں لے جاتے ہیں۔ کہیں کہیں تو
ڈراما نگار کے ہاتھ سے بھی احتیاط کا دامن چھوٹ گیا ہے۔ مثلاً: "آپ نے کہا
اوٹ کرو، میں نے کیا۔ آپ نے کہا آدھی رقم آپ کے بھائی کے نام سوئزر بینک میں
......" ظاہر ہے کہ اس طرح کی باتیں ڈراما نگار کے مدعا ظاہر کر دیتی ہے۔ لیکن
ڈرامے میں صرف یہی نہیں ہے۔ ہر دوسرے تیسرے صفحے پر ہمیں بعض پُر لطف
معنی اور ذہانت سے بھرے ہوئے جملے ملتے ہیں۔ جو بذاتِ خود خیالات کی ایک دنیا
آباد کر دیتے ہیں۔ جیسے:

"انڈیا میں اناج کا فصل کم کرو اور لیکچر کا فصل زیادہ۔ یہاں کا لوگ لیکچر اتنا
ہند کیوں کرتا۔"

"پارلیمنٹ کا ممبر پارلیمنٹ میں صرف دو بار جاتا ہے۔ ایک راشٹرپتی کا بھاشن
سننے اور دوسری بار ایک تاریخ کو تنخواہ لینے۔"

"ہماری غلطی یہی ہے کہ کسی بڑے اسٹار کے گھر پیدا نہیں ہوئے۔ بڑے
سٹار کے گھر پیدا ہوتے تو پیدا ہوتے ہی ایکٹر بن جاتے۔"

"ہیروئن کے فلم میں تین کام ہوتے ہیں۔ ایک گانا، دوسرا ناچنا اور تیسرا
بارش میں بھیگنا۔"

"سپر اسٹار ہی ہو کہ فلم بری طرح پٹ گئی۔ ایوارڈ ایسی ہی فلموں کو ملتا ہے۔"
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سپر اسٹار پرساد کے وسیلے سے ڈراما نگار
ہمیں فلمی، سیاسی اور سماجی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دکھانا چاہتا ہے
اور اس میں کامیاب ہے۔ ہمیں یہاں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو خود ڈٹ کے
شراب پیتے ہیں۔ اور شراب بندی کے لیے ٹرسٹ بناتے ہیں۔ خود
اپنے دیگر فلم بنواتے ہیں خود ہی اداکاری کرتے ہیں اور خود ہی ہال کے سارے
ٹکٹ خرید کر ہاؤس فل بھی کرواتے ہیں۔ جن کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی
مگر جھوٹی شان برقرار رکھنے کے لیے لاکھوں کے لین دین کی بات کرتے ہیں۔
پھر پر انکم ٹیکس کا چھاپا پڑ جائے تو خوش ہوتے ہیں کہ بگڑی ہوئی ساکھ بن
گئی۔ غرض یہ کہ یہاں ہر طرح کے چہرے ہمیں نظر آتے ہیں۔

ہمیں شکر گذار ہونا چاہیے اپنے ملک کی جمہوریت کا جس نے ہمیں آزادیٔ رائے کی دولت دی ہے۔ بغیر اس کے شاید قاضی مشتاق احمد یہ ڈراما نہ لکھ سکتے اور لکھ بھی دیتے تو میں اتنی آسانی سے اس کی تعریف کرتے ہوئے اسے پڑھنے کی سفارش نہ کر سکتا۔ ●●

پگڈنڈی۔ جنگل سے کھیت تک (دو حصوں میں)

مصنف: غلام حیدر
صفحات: حصہ اول ۱۴۴، حصہ دوم ۱۶۸
مبصر: صغرا مہدی　　قیمت: ۸۰ روپے
ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

غلام حیدر کا نام بچوں کے ادیب کی حیثیت سے ایک جانا مانا نام ہے۔ یہ ایک عرصے سے بچوں کے لیے لکھ رہے ہیں اور ان کی تصانیف بچوں کے ادب میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں اور اکثر تصانیف کو حکومتِ ہند کے مختلف اداروں کی طرف سے انعامات بھی ملے ہیں۔

زیرِ نظر تصنیف موصوف کی تازہ تصنیف ہے یہ ناول ہے جو بارہ سے پندرہ سال کے بچوں کے لیے ماقبل تاریخ کے اس دور سے واقفیت فراہم کرتا ہے جب انسان تہذیب کے ارتقا کی بالکل ابتدائی منزلوں کو طے کر رہا تھا اس میں غلام حیدر نے کہانی کے دلچسپ انداز میں یہ بات بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان نے تلاش و تجسس یا مہم جوئی کے نتیجے میں رونما ہونے والے اسباب کو اپنی زندگی میں کس طرح اپنایا ہے۔ تہذیب انسانی کی مختلف تہیں، الگ الگ علاقوں کے استعمال کی نئی نئی چیزیں، ایجادات و اختراعات جو اس کے گرد و پیش کے جغرافیائی اور طبعی حالات، آب و ہوا، پیداوار اور اس کی زندگی سے جڑی ہوئی ہیں۔ اس ناول میں نظر آتی ہیں۔ ناول کا موضوع خاصا مشکل ہے کیوں کہ اس میں مصنف کو حتی المقدور معلومات کی صحت کا خیال رکھنا تھا۔ پھر زبان و بیان میں اس بات کا لحاظ بھی کہ اس ناول کے قاری بارہ سے پندرہ سال کی عمر کے ہیں اور یہ ناول ہے۔ اس میں قصے کی دلچسپی بھی برقرار رکھنا ہے۔ مگر خوشی کی بات ہے کہ غلام حیدر نے بہت کامیابی سے ان مشکلوں سے نبرد آزما ہو کر ناول کو ایک طرف معلوماتی بھی بنایا۔ دوسری طرف انھوں نے یہ بھی فراموش نہیں کیا کہ ناول کی پہلی خوبی اس کی دلچسپی ہے۔ یہ ساری کہانی ایک خاندان کے تین لڑکوں (جن کی عمر سات سے دس سال ہے)، ایک پانچ سال کی بچی اور بوڑھے دادا کے گرد گھومتی ہے۔ جو ایک انجان قبیلے کے حملے سے بچنے کے لیے اپنے ٹھکانے سے بھاگے اور پھر بھٹک کر ان سے بچھڑ گئے اور پھر یہ لوگ کن کن تجربات اور حادثات سے گزرتے ہیں اور ان سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ نئی معلومات حاصل کرتے ہیں اس طرح یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک چلتا رہتا ہے۔ بڈھا ختم ہو جاتا ہے۔ بچے جوان ہو جاتے ہیں اور پھر ایک دن وہ اپنی منزل کو پا لیتے ہیں۔

ناول میں روانی بیان ہے درمیانی حصّے میں کچھ رفتار سست معلوم ہوتی ہے مگر آخر میں کہانی تیز رفتاری سے آگے بڑھتی ہے اور انجام جاننے کی خواہش قاری کے اشتیاق کو بڑھاتی ہے۔ اس میں بالواسطہ طور پر بچّوں کو تعمیری لگن بہادری، حالات سے مقابلہ کرنے کا عزم، ایک ساتھ مل جل کر رہنے کا جذبہ اپنی زمین یا اپنے وطن کی محبت کا سبق بھی دیا گیا ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر بخوبی اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنّف کو بچّوں کی نفسیات اور انھیں کس طرح کا ادب چاہیے اس کی مکمّل واقفیت ہے۔ کتاب کی طباعت، ٹائٹل، پورا گیٹ اپ دیدہ زیب ہے قیمت یقیناً بہت زیادہ ہے اور عام بچّوں کے لیے اس کا خریدنا ممکن نہیں ہے اس لیے یہی ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ تعداد میں لائبریریوں میں خریدی جائے اور ان کے ذریعے بچّوں تک پہنچائی جائے۔

غلام حیدر ان معدودے چند لوگوں میں ہیں جن کا خیال ہے کہ بچّوں کی کتاب خوبصورت اور دیدہ زیب ہونا بھی ضروری ہے اور یہ بات ہے بھی صحیح تو ابھی ہمارے یہاں لوگوں کی توجہ اس طرف نہیں ہے۔ بہر حال یہ کتاب بچّوں کے ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے اور بقول صالحہ عابد حسین "ناول کے پیرایے میں اس بے انتہا کٹھن اور پھیلے ہوئے موضوع کو اس طرح سمیٹ لینا کہ تاریخ سے قبل کے واقعات سے بچّے اور بہت سے انجانے بڑے لوگ بھی واقف ہو جائیں آسان کام نہ تھا اور پھر جب یہ بھی لگن ہو کہ واقعات بڑی حد تک سچّائی پر مبنی ہوں۔ یہ مصنّف کا کمال ہے کہ اس نے کہانی کے تانے بانے میں اس مشکل موضوع کو بڑی خوبصورتی سے پرو دیا ہے۔"

میں اس کتاب کی اشاعت پر اردو اکادمی دہلی کو مبارکباد دیتی ہوں کہ اس نے اس کتاب کی اشاعت کی ذمّے داری لے کر بچّوں کے لیے ایک خوب صورت کتاب فراہم کی۔

شب گزیدہ کا سحر

شاعر: رفعت شمیم
ناشر: قلم پبلی کیشنز، بمبئی۔
قیمت: ۴۰ روپے
مبصّر: عبدالاحد ساز

شب گزیدہ سحر رفعت شمیم صاحب کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے اگرچہ یہ تاثر قائم ہو سکتا ہے کہ رفعت شمیم شاید جواں سال شاعر ہوں گے، لیکن ڈراما نگاری کی دنیا میں اور ریڈیو، ٹی وی اور تھیٹر کے توسط سے ادبی حلقوں میں ان کی شخصیت بہر حال اتنی جانی پہچانی ہے کہ ایسا کوئی قیاس پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ذہنی اور زمانی طور پر ان معتبر ترقی پسند شعرا کے قریب رہے ہیں۔ جن کی شاعری پانچویں سے ساتویں دہائی تک اپنے عروج پر رہ چکی ہے۔

رفعت شمیم کا یہ شعری مرقع تین اصناف سخن یعنی نظموں، غزلوں اور گیتوں پر مشتمل ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری کا لب ولہجہ کہیں کہیں روایتی اور زیادہ تر ترقی پسندانہ ہے۔ جن مختلف شعرا سے وہ متاثر رہے ہیں۔ ان کے اسٹائل اور انداز ترسیل کی چھاپ ان کی نظموں میں اکثر جگہ براہ راست تلاش کی جا سکتی ہے۔ مثلاً موضوعاتی نظموں پر اقبال اور جوش کے مخاطبانہ اسلوب کی تقلیدی شکلیں ۔

بحر گرداب بلا میں موج آشفتہ ہے تو — تیرا ہر تار نفس ہے محرم راز شرر
تو اگرچہ ہے اسیر دام بازار ہوس — صبر تیرا ہے نوید صبح آزادی مگر

(نظم صنف نازک)

دامن شام پہ ہے کس کے لہو کی سرخی — شانۂ صبح پہ ہے کس تن کشتہ کا کفن
سرنگوں عظمت آدم ہو خدایا نہ کبھی — روے امروز پہ اندیشۂ فردا سے شکن

(نظم: خون مظلوم)

فیض کا لہجہ، طریقۂ تنظیم اور رویہ ان کی نظموں کے بڑے حصے پر مسلط ہے۔ خصوصاً ان نظموں میں جو موضوع کے ساتھ ایک جمالیاتی برتاؤ اور مصرعوں کی دروبست میں ایک غنائی آہنگ رکھتی ہیں، فیض کے اثرات نظر آتے ہیں ۔

بارہا دل کو یہ لگتا ہے کہ شاید جیسے — شہر غربت میں بھی یاران وطن سے امسال
مژدۂ ذکر ملاقات سنائے گا کوئی — خواب فردا کے مہ وسال سجائے گا کوئی

(سال نو)

ہاں البتہ ان لہجوں اور رویوں کی بازگشت کے بیچ کہیں کہیں رفعت شمیم کا الف طرز ادا سر ابھارتا ضرور ہے۔ ایسی نظموں میں Treatment بھی دیگر ہے اور صفات سے پیدا ہونے والی فضا بھی مختلف ہے مثال کے طور پر ۔

اس سے بہتر ہے یہی
یورش ادراک سے ہم
بڑھ کے اب جنگ بغاوت کرلیں۔
مصحف دل کے یہ بکھرے ہوئے تنہا اوراق۔!
ان میں آباد کوئی لمحۂ فرصت کرلیں۔

(تنہا اوراق)

جہاں تک اس کتاب کی غزلوں کا تعلق ہے، یہ عرض ہنر، زبان وبیان، الفاظ انتخاب اور رکھ رکھاؤ کی رو سے ایک پختہ کلام شاعر کی غزلیں ہیں۔ مصرعے ڈھلے ڈ

اور شعر بسے رچائے ہیں۔ موضوع البتہ وہی ہے جو ترقی پسند غزل کا تھا۔ گزشتہ دو دہائیوں میں کہی جانے والی جدید اردو غزل کی فکر، مزاج اور ذائقہ ان غزلوں میں کہیں نہیں ہے۔ ہاں ہنرمندی اور فن کاری ضرور متاثر کرتی ہے ؂

کہاں گئی سر ہنگام صبح آنکھوں سے　　وہ روشنی جسے نذر سواد شام کیا

جذبۂ شوق ہے عالم کی حقیقت کا وجود　　عشق و ادراک میں اب رنجش و تکرار کہاں

کتاب کا آخری حصہ گیتوں سے مزین ہے۔ ان گیتوں میں شاعر نے اپنے جذبات و محسوسات کو پھیلی ہوئی دنیا کے دکھ درد کے ساتھ بخوبی ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اس طرح یہ گیت SOCIAL LYRICISM کی اچھی مثالیں بن گئے ہیں اور ان میں تفریح و دلبستگی کے ساتھ ساتھ سماجی و عصری ذوق کی آسودگی کا بھی سامان کسی قدر مہیا ہے۔

مجموعی طور پر رفعت شمیم کی شاعری ہم عصر شعری تنقید کے معیار کی رو سے زیادہ وسیع نہ سہی، مگر اس اعتبار سے بہت اہم بھی ہے کہ ایک درد مند دل اور وسیع ذہن رکھنے والے فنکار اور زندگی و انسانیت کی جانب ایک مثبت و رجائی رویہ رکھنے والے شاعر کے پرخلوص تاثرات ہیں۔ قیمت چالیس روپے زیادہ ہے نہ کم۔

غمزہ بہ غمزہ

(مجموعۂ غزلیات)

مصنف و ناشر : آر۔ پی۔ شوخ
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ دہلی۔ بمبئی ۳۔ علی گڑھ ۲
قیمت : پچاس روپے
مبصر : خالد کفایت

"غزل ہماری سب سے قدیم اور پھر بھی سب سے جدید صنف سخن ہے۔ نئی غزل نے جہاں نئے لفظ، نئے احساس اور پرانے تجربات کو دوبارہ نئے رنگ میں پیش کرنے کی سعی کی ہے وہاں اس نے اس بات کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ بدلتے ہوئے ماحول اور شکستہ ہوتے ہوئے عقائد و اقدار کے درمیان غزل کی دنیا ایک طرح سے ناتغیر پذیر رہے۔" ان خیالات کا اظہار جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے آر۔ پی۔ شوخ کے پہلے مجموعۂ کلام "غمزہ بہ غمزہ" کے فلیپ پر کیا ہے۔ جناب فاروقی کی رائے نے جہاں نام شوخ کو وقعت کی سند بخشی ہے وہیں اس حقیقت کو بھی آشکار کیا ہے کہ زیر نظر مجموعہ جدید و قدیم کا ایک حسین اور پر وقار امتزاج ہے۔ جسے جدیدیت اور روایت کے جملہ فنی محاسن کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ "غمزہ بہ غمزہ" نئی جہتوں میں جہان دیگر کی تلاش کا دوسرا نام ہے۔ جس میں ہمارے عہد کے پیچیدہ ہوتے مسائل فرقہ پرستی

مذہبی جنون خیزی، افلاس و بے چارگی کے ساتھ ساتھ کرب ذات، محرومی ود
داخلی انتشار و انخلاء، تنہائی اور بے چہرگی کا بیان کلاسیکی طرز ادا اور رکھ رکھاؤ کے
جدید اسلوب اور منفرد لب و لہجہ میں ہوا ہے۔ اپنے گہرے مطالعے اور عمیق مشا
کی مدد سے شوخ حیات و کائنات کے راز ہائے سربستہ اور روزمرہ زندگی کے
پہلوؤں کی عکاسی اس انداز سے کرنے کا ہنر جانتے ہیں کہ کرب ذات اور غم کا
میں گہری ہم رشتگی کا احساس تیز تر ہو جاتا ہے۔ اس طرح سے شوخ کو ترقی پ
خیالات کا حامل، جدید احساس کا کلاسیکی شاعر کہا جا سکتا ہے۔

ہمارے جدید شعراء میں بیشتر ایسے ہیں جنھوں نے چند مخصوص کلیدی ا
کے سہارے اپنی شناخت کروانے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ بعض دوسرے
ناصر کاظمی ابن انشا فیض اور خلیل الرحمن اعظمی کی صدائے باز گشت ہو کر رہ
ہیں۔ لیکن شوخ کا شمار ان گنے چنے شاعروں میں کیا جا سکتا ہے جنھوں نے جا
کی روایت کا دائرہ وسیع تر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور زبان و محاورے
خوب صورت تصرفات اور نئے شعری تجربات کی مدد سے غزل کو نئی رمزیت وا
نئی لفظیات اور نئے مطالب و مفاہیم سے آشنا کرایا ہے۔ اساتذہ سے اکتسا
کی مثالیں غمزہ بہ غمزہ میں خوشبو کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ مگر کہیں بھی شوخ نے
ہم آہنگ ہو کر اپنی آواز کا تیکھا پن نہیں کھویا ہے۔ بلکہ الگ شناخت قا
کی کوشش کی ہے۔ نیز وارداتِ ذات اور عصری حسیات کو ایک دوسرے میں بن کر
طرح پیش کیا ہے کہ قاری بے اختیار چونک پڑتا ہے۔

اس مجموعے کی ہر غزل ایک نئے فکری احساس جولانی طبع اور
کی حامل ہے۔ بیشتر غزلوں کی ردیفیں تازگی کا احساس دلاتی ہوئی ایک ایسی
سے ہم کنار کرتی ہیں کہ صرف اسی کے حصول کے خاطر بھی غمزہ بہ غمزہ کے
سفارش کی جا سکتی ہے۔ ●●

مضامین محمد منظور احمد

مصنف: محمد منظور احمد
پبلشر: ادبی مرکز۔ اعجاز پرنٹنگ پر
چھتہ بازار، حیدرآباد ۲ آندھرا پردیش
قیمت: بیس روپے
مبصر: ڈاکٹر سیفی پریمی

محمد منظور احمد کی زندگی اور صلاحیت دو دائروں میں جلوہ سامانی کا باعث ہیں۔ ا
۲۔ جرائد اور ثقافتی تنظیم۔ ان کے مضامین اور انٹرویوز مضامین محمد منظور احمد" اردو اکیڈ
پردیش کے مالی تعاون سے اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔
انٹرویوز میں ولی قادری، پروفیسر تقی علی مرزا، محمد اکبرالدین صدیقی، پروفیسر عب

ہیں۔ مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔
امجد حیدرآبادی۔ مہاراجا کشن پرشاد، مولانا ابوالکلام آزاد اور مکتوب نگاری، صفی اورنگ آبادی، ڈاکٹر زور، معاشرے میں ادیب کی ذمہ داری، یادگار سفر، پروفیسر سید علی اکبر، کہاوتیں، ڈاکٹر راجیندر پرشاد، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، زندگی — غالب کی نظر میں۔ آخر میں مصنف کی زندگی، علمی و ادبی معروفیت اور ثقافتی سرگرمیوں کا بیان ہے۔

سید احمد حسین امجد حیدرآبادی کی رباعیوں اور معمولات پر بھرپور تبصرہ کیا گیا ہے۔ نمونے درج ہیں۔

مہاراجا کشن پرشاد کو بھی بھر کر لکھا ہے۔ وہ اردو، فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ فارسی کلام میں علامہ شوستری، ضیا یار جنگ، مولانا عمادی، مسعود علی محوی اور ترکی سے مشورہ کرتے تھے۔ اردو میں بچو لال تمکین، عبدالعلی والہ، مظفرالدین معلّی سے مشورہ سخن کیا۔ ہندی زبان میں بھی شاعری کی ہے۔ شاعری کے کینوس میں غزل، رباعی، قصیدہ، مسدس اور مثنوی کی جلوہ ریزی ہے۔ شاد کی مثنوی "پریم درپن" کافی معروف ہے۔ اس کی وقعت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ حضرت علامہ نیاز فتحپوری نے مقدمہ رقم فرمایا ہے۔

شاد کی غزلیات کے چار نقوش منظر عام پر آچکے ہیں۔ ۱۔ باغ شاد ۲۔ خم کدۂ رحمت بہ ہدیہ شاد، ۳۔ نغمۂ شاد ۴۔ بیاض شاد۔

شاد نے اردو ادب میں ناول نگاری کی حیثیت سے بھی اضافہ کیا ہے۔ پہلا ناول "مطلع خورشید" شائع ہوا۔ دوسرا چنچل نار اور تیسرا بزم خیال قارئین تک پہنچے۔ اس کے علاوہ ۱۵ اہم مکاتیب کی اشاعت ہوئی۔ ۱۔ رقعات شاد ۲۔ جمالِ یار ۳۔ شاد۔ اقبال ۴۔ اکبرالہ آبادی اور مہاراجا کشن پرشاد کی خط و کتابت ۵۔ مکاتیب یمین السلطنت۔

مضامین میں صفی اورنگ آبادی کی تصویر نامکمل ہے اور ڈاکٹر راجندر پرشاد سے متعلق مضمون تاثراتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اردو ادب کی لائق تحسین خدمت کی۔ تنقید، تحقیق، لسانیات وغیرہ پران کا کام مشتعل راہ ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کا قیام، "سب رس" کا اجرا، کلیات محمد قلی قطب شاہ کی ترتیب و اشاعت ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ پروفیسر سید علی اکبر نے اصول تعلیم طریقۂ تدریس، نصاب تعلیم وغیرہ امور پر متوجہ ہو کر تعلیمی معیار کو بڑھایا۔ محمد اکبرالدین صدیقی نے نصابی کتب، دکنی مثنویات، دیوان شعرا، سرسید کی کتاب قدیم نظام" اور میر تقی میر کے فارسی دیوان کو حیات نو بخشی۔

محمد منظور احمد کا مضمون "کہاوتیں" اہم ہے۔ جس میں مختلف زبانوں کا مطالعہ کر کے مختلف زبانوں کے رشتے میں انسانی تجربہ، ہم آہنگی، فیض عوام اور وسیلۂ ابلاغ کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔

مصنف نے ادارہ ادبیات اردو (حیدرآباد) کے سلسلۂ مطبوعات کی (۳۲۸ ویں) کتاب "منتخب مضامین سید علی اکبر" مرتب کی اور ۱۹۸۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ منظور احمد شاعر بھی

ہیں۔ پہلا نقش غزل "حرف شوق" مکتبہ شعر و حکمت (حیدرآباد) نے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا
یہ اور دیگر امور خلوص دل اور خدمت اردو ادب کی پہچان ہیں۔
زیر نظر کتاب سادہ مگر عمدہ چھپی ہے۔

کاسنی گلپوش دریچے

شاعر۔ احمد صغیر صدیقی
ناشر۔ کتابیات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۲۳، کراچی
قیمت۔ دس روپے
مبصر:۔ ڈاکٹر سیفی پریمی

صغیر احمد صدیقی کی شاعری کا پہلا نقش ۱۹۷۲ء میں "سمندر آنکھیں" منظر عام پر آیا۔
۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۲ء تک کی غزلیں "کاسنی گلپوش دریچے" میں شائع ہوئی ہیں۔ اس شاعر
بچوں کے لیے بھی اپنے فن شعری کو وقف کیا ہے۔ "بوجھو تو جانیں" منظوم پہیلیاں اشاعت
پذیر ہو چکی ہیں۔ ایک پہیلی :۔

بارہ کا ہندسہ مجھے کرتا ہے نصف نصف
بارہ کا ہندسہ مجھے کرتا ہے دوگنا
رہتا ہے انتظار مجھے، دن کا اور پھر
آتا ہے وہ تو پھر مرا چلتا نہیں پتا
جلدی بتاؤ کون ہوں میں کیا ہے میرا نام
جانے کو ہوں میں، مرغ لگانے کو ہے صدا

صغیر احمد صدیقی کی شاعری کے متعلق اخباروں کی رائے دیکھیے۔

(۱) "ان کے ہاں ٹھہراؤ نہیں، ہم ان کے فکر و فن کو نظم اور غزل دونوں میدانوں میں
بڑھتا دیکھتے ہیں۔" (روزنامہ جنگ کراچی)

(۲) جو لوگ شاعری میں زبان و بیان کے نئے تجربوں سے آشنا ہونا چاہتے ہیں انھیں
مجموعۂ کلام کو پڑھ کر یقیناً خوشی ہوگی۔
(جناب عبدالرؤف عروج۔ روزنامہ حریت)

محاسن شعری، تخییل، تجربہ، مشاہدہ اسلوب کی پرکھ کے لیے چند شعر پڑھ لیجیے

تیری طلب میں دل کی خموشی گواہ ہے
اوروں کا ذکر کیا ہے خدا سے نہ کچھ کہا

نئی رتوں کو نئے رنگ کی ضرورت ہے
مجھے لہو کا سمندر پکارتا ہے بہت

اٹھا کے سب چراغ ہم نے راستوں پہ رکھ دیے
بلا سے پھر ہمارے گھر میں روشنی نہیں رہی

میں کہیں جاؤں چار سو رہِ شوق
پاؤں اٹھیں تو وسعتیں ہیں بہت

قریہ قریہ میں عبث ایماں لیے پھرتا رہا
معتقد اس شہر میں سارے اسی کافر کے

شاعر نے نظمیں اور گیت بھی کہے ہیں۔ مگر غزل کا شاعر اپنی انفرادیت کے اشارے
ہے۔ اس کا ذہن اور تجربہ، سماج اور زندگی سے صحت مند اقدار کی روشنی پاتا ہے۔

...میں وہی تنہائی دروں بینی اور ذاتی کرب کی "رام چرت مانس" کتھا ہے۔
"دعا" ایک ایسی نظم ضرور ہے جس میں رجائی رنگ ہے۔

تری خوشبو
یونہی اڑتی رہے قریہ قریہ
اور میں بے نام ونشاں
تیرے حوالے سے بنوں
سرخیِ افسانۂ دل

اے مرے دشمنِ جاں
میرے سکوں کے قاتل

...ہیں اس ٹکڑے سے پہلے کا تمام سرمایۂ نظم کوئی اچھوتی دعا دینے پر آمادہ نہیں۔ مجاز ردولوی نے ...شراب اور زیادہ، شباب اور زیادہ) میں خونِ جگر بھر دیا ہے۔ اضافہ ناممکن!
"کاسنی گلپوش دریچے" سے 'جون ایلیا' پروفیسر شاہد عشقی' انور سدید اور شہزاد منظر بھی جھانکا ہے۔
سرورق گلپوش ہے۔ کتابت و طباعت پسندیدہ۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

اردو میں بچوں کے ادب پر ورکشاپ اکتوبر میں

نئی دہلی ۲۱ اگست ہریانہ اردو اکیڈمی کے ایک اعلانیہ کے مطابق اردو میں بچوں کے ادب کی پیش رفت کا جائزہ لینے کے لیے ایک میٹنگ کی گئی جس میں انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی اردو اکیڈمی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور ہریانہ اردو اکیڈمی کے سربراہ شریک ہوئے۔ میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ بچوں کے ادب پر خصوصی کتابیں لکھی جائیں اور ان کو بچوں میں دلچسپی کا باعث بنایا جائے۔ اس کے لیے متذکرہ تمام ادارے سلسلہ وار اپنے یہاں ورکشاپوں کا انعقاد کریں گے جن میں بچوں پر لکھنے والے ادیبوں کو مدعو کیا جائے گا۔ اس سلسلے کا پہلا ورکشاپ ۱۲، ۱۳، اکتوبر کو ہریانہ میں سونی پت کے مقام پر منعقد کیا جائے گا۔ جس کا عنوان بچوں کا ادب۔ ماضی، حال اور مستقبل تجویز کیا گیا ہے۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی ایم۔ پی اردو اکادمی کے سکریٹری مقرر

حکومت مدھیہ پردیش نے پروفیسر عبدالقوی دسنوی کو مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا سکریٹری مقرر کیا ہے۔ پروفیسر دسنوی نے ۲۲، اگست، ۱۹۹۱ کو بحیثیت سکریٹری اپنی ذمے[داری] سنبھال لی ہے۔

پروفیسر دسنوی نے گذشتہ ۳۰ برس[وں میں] شعبۂ اردو سیفیہ کالج کے سربراہ کی حیثیت اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا شمار اردو کے نامور ناقدین اور محققین میں ہوتا ہے۔ ا[ب تک] ۳۰ سے زیادہ تحقیقی تنقیدی کتب شائع [ہو چکی] ہیں۔ بہار اردو اکیڈمی، مدھیہ پردیش ا[ردو] اکادمی اور آل انڈیا میر اکادمی نے ان[عامات] دے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ پروفیسر دسنوی کے تقرر سے مدھیہ پردیش [کے] علمی ادبی حلقوں میں خوشی کا اظہار کیا جا رہا [ہے]۔

عبدالوحید صاحب کو ڈاکٹریٹ

ڈاکٹر عبدالوحید کو ناگپور یونیورسٹی [نے] ان کے تحقیقی مقالے "اردو زبان و ادب [پر ...] کے اثرات" پر پی ایچ ڈی کی سند تفویض [کی] ہے۔ یہ مقالہ ڈاکٹر منشا الرحمن منشا اور [ڈاکٹر] سید عبدالرحیم صاحبان کی نگرانی میں مکمل ہوا۔

شعری بھوپالی اور کیف بھوپالی کو خراجِ عقیدت

اردو کے مشہور و معروف شاعر حضر[ات کیف] بھوپالی اور شعری بھوپالی کو خراجِ عقیدت [پیش] کرنے کے لیے ادبی سبھا بانسواڑہ نے [ایک] ادبی نشست منعقد کی جس میں بانسواڑہ [کے] شعرا اور ہندی کویوں نے حصہ لیا۔ [نشست کی] صدارت پروفیسر مہیش چندر پروہت نے [کی۔] نظامت کے فرائض ظہیر آتش نے انجام [دیے۔]

یر، ابیکارت، سہیل نقشبندی، اور مظفر صدیقی
م عقیدت پیش کیا۔

لف میں پہلا اردو مشاعرہ

گزشتہ دنوں سعودی عرب کے شہر طائف
فورم کے نام سے ایک ادبی انجمن کا قیام
لایا گیا اور ادبی سرگرمیوں کی شروعات
پر ادبی فورم کے سرگرم عہدیداروں نے ایک
مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں جدہ کے
عرائے کرام کو خصوصی طور پر دعوت دی
فورم کے جنرل سکریٹری اور روح رواں
م اقبال نے جناب سید محمد احمد نقوی کے اور
شمار دوستوں اور ادب دوستوں کے حوالے
قریب کے انعقاد کے لیے شاندار انتظامات
ب کا اہتمام طائف میں انڈین اسکول کے
گیا۔ جہاں باذوق سامعین کی ایک کثیر تعداد
قت سے پہلے ہی پہنچ کر اپنی سخن فہمی کا
ے رہی تھی۔ ہال سے متصل کمرے میں
کے لیے بھی مشاعرہ سننے کا اہتمام تھا اور
ی بھی قابلِ ذکر تعداد شریکِ محفل تھی۔
ے انتظامات اور مہمان شعرا کے خیر مقدم
کے لیے دوسرے سرگرم احباب میں خوشنود حسین
شفاعت صدیقی نمایاں تھے۔

جدہ سے یوں تو بہت سے شعرا مدعو
امید بھی یہی تھی کہ وہ سب طائف کے اس
ناز مشاعرے میں شرکت کریں گے،
راہداریوں اور کچھ بیماریوں نے چند
ام کو اس سفر کی اجازت نہیں دی اور
شرکت کا وعدہ کر کے سرخرو ہونے والوں
ر مہدی، سجاد بابر، یاد صدیقی اور
رہ گئے۔ سید محمد احمد نقوی مشاعرے
سے پہلے طائف میں مقیم تھے اور مشاعرے کے
بعد ان کی ٹرانسفر جدہ ہو گئی اس لیے وہ
بیک وقت میزبان تھے اور مہمان بھی۔

وقت مقررہ پر ادبی فورم کے جنرل سکریٹری
جناب انجم اقبال نے مائیک سنبھالا اور تالیوں کی
گونج میں خیر مقدمی کلمات کے ساتھ ابتدا کرتے
ہوئے جناب شرف الدین پاشا کو تلاوت کلام
پاک کے لیے پکارا۔ اس کے بعد انھوں نے
جناب ظفر مہدی کو مسند صدارت پر رونق
افروز ہونے کی دعوت دی اور یکے بعد دیگرے
دوسرے مہمان شعرا کو بھی اسٹیج پر بلایا۔
ابتدائے مشاعرہ نعتِ رسول پاک سے ہوئی
جو ڈاکٹر فتح محمد صابری نے پیش کی۔

مکے کی فضاؤں میں، طیبہ کی ہواؤں میں
ہم نے تو جدھر دیکھا سرکار نظر آئے

اس کے بعد طائف سے جن اصحاب نے اپنا کلام
پیش کیا ان میں لطیف احمد خاں، پرویز صدیقی،
سید خوشنود حسین انجم، شفاعت صدیقی انجم،
سید مظہر علی نجم اور انجم اقبال شامل تھے جن
کے بعد سید محمد احمد نقوی (جدہ یا مکہ؟) اور جدہ
سے آنے والے دیگر مہمان شعرا نے کلام پیش
کیا۔ مشاعرے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ سامعین
بڑے جوش و خروش سے شعر سماعت کر رہے،
اور ہر اچھے شعر پر داد دے رہے تھے جس
سے شعرا بھی مزید جوش و خروش سے اپنی تخلیقات
پیش کر رہے تھے۔ جن اشعار پر بے حد داد
دی گئی ان کا انتخاب ملاحظہ فرمائیے۔

لطیف احمد خان۔

کل تلک صرف درندے ہی لہو پیتے تھے
آج انسان کا دستور ہوا جاتا ہے

خوشنود حسین انجم

اُٹھا لاؤ خنجر تمہارا کہاں ہے
دکھاؤ ذرا ہاتھ کیسا رواں ہے
شفاعت صدیقی انجم

آزمائش قدم قدم پر ہے
زندگی امتحان سی لگتی ہے
انجم اقبال

کھو نہ جائے کہیں بچھڑا ہوا ساتھی انجم
شہرِ دل کے سبھی چوراہوں کو روشن رکھنا
وہ سمجھ لے گا میری مجبوری
جانے کیوں دل کو احتمال سا تھا
سیّد محمد احمد نقوی

رنگِ تعمیر ہیں اشعار میں تصویروں میں
عکسِ محرومیِ اربابِ ہنر تو دیکھو
دبائے ہونٹوں میں تلوار گفتگو ہو گی
سمجھ کے مجھ کو خطاوار گفتگو ہوں گی
نسیم سحر

سرخ کرنی ہیں تو حنا سے کر
آگ پر یوں ہتھیلیاں مت رکھ
چوڑیاں ٹوٹ بھی گئی ہیں تو کیا
سونی اپنی کلائیاں مت رکھ
یاد صدیقی

اپنے لیے لوگوں سے سنا اور ہی کچھ ہے
ہم سے تری آنکھوں نے کہا اور ہی کچھ ہے
ہمارا کون ہے اس شہر میں جو گھر آئے
ہم اس خیال سے دروازہ بند کر آئے
سجاد بابر

درد کے احوال میں بھی رنگ بھرنا پڑ گیا
کاغذوں پر موت لکھی اور مرنا پڑ گیا
جانے کس کی یاد آتی ہے ساحل جاکر
ریت پہ زخمی پوروں سے اشکال بناتے رہنا
سیّد ظفر مہدی۔

عکس آنکھوں میں دیکھے جاتے ہیں
آئینوں میں یہ آب و تاب کہاں
اکثر رُخ ہوا کے مخالف سفر کیا
مشکل ترین کام بطرزِ ہنر کیا

(رپورٹ نسیم سحر۔ جدہ)

مطیع اللہ حیدر نہیں رہے

بھیونڈی کے طنزیہ اور مزاحیہ شاعر جناب مطیع اللہ حیدر کا ۱۵ر اگست ۱۹۹۱ کو شب میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کینسر میں مبتلا تھے۔

حیدر صاحب عرصۂ دراز تک اپنی نگارشات سے ملک کے گوشے گوشے میں سامعین سے داد تحسین حاصل کرتے رہے۔ ہمیشہ ہنسنے ہنسانے والا شاعر آخر میں سب کو رُلا گیا۔

مطیع اللہ حیدر انتہائی مخلص، ملنسار، نیک طبع واقع ہوئے تھے۔ موصوف جناب بسمل پرتاب گڑھی کے شاگرد رشید تھے۔ بزم مساوات کے ممبر بھی رہے۔ خدا انھیں غریقِ رحمت کرے آمین

رونق افروز۔ سکریٹری بزم مساوات بھیونڈی

برصغیر ہند و پاک سے باہر کے ممالک میں اردو کانفرنس

انگلستان، انڈو پاکستان کے بعد اردو کا تیسرا مرکز گنا جاتا ہے۔ لندن کے علاوہ بڑے بڑے شہر میں مشاعروں اور ادبی نشستوں کی رونق رہتی ہے۔ اس سال انٹرنیشنل اردو کانفرنس لنکاشائر (بریڈ فورڈ میں) جون کے مہینے میں ہوئی۔ اس کا موضوع تھا "برصغیر ہند و پاک کے ممالک میں اردو" اس کانفرنس میں ہندوستان

ہر جگن ناتھ آزاد۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی اور
احمد شریک ہوئے تھے۔ پاکستان سے پروفیسر
احسان اور اسد خان۔ یہ کانفرنس برطانیہ کے دو
اردو ادبی اداروں۔ انجمن فکر و فن اور بزم اردو کے
تعاون سے منعقد ہوئی۔

"جگن ناتھ آزاد کے ساتھ ایک شام"
سینٹر برطانیہ کے زیر اہتمام جگن ناتھ آزاد
کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ جس میں آزاد نے
زندگی بھر کے ادبی سفر پر روشنی ڈالی۔ اور
ان شخصیتوں کو بھرپور خراج تحسین ادا کیا جن
کی صحبتوں میں انھیں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔
اقبال اکادمی برمنگھم اور انجمن ترقی اردو برمنگھم
کی مشترکہ دعوت پر جگن ناتھ آزاد برمنگھم گئے۔
علامہ اقبال پر لیکچر دیا۔ بریڈ فورڈ میں جگن ناتھ
کی صدارت میں ایک عالمی مشاعرہ ہوا۔
مانچسٹر میں ۔ستمبر کو ایک عالمی مشاعرہ منعقد
ہوا۔

سینٹر بریڈ فورڈ: یہ برطانیہ کی اردو کتابوں کی
دکان کا نام ہے۔ یہ دکان تین منزلوں پر محیط ہے
جگن ناتھ کا کہنا ہے کہ میں نے زندگی میں اردو
کتابوں کی اتنی بڑی دکان ہندوستان میں دیکھی نہ
پاکستان میں۔ ورنہ کسی اور ملک میں۔ یہ کتابوں کی
صرف ایک دکان نہیں بلکہ مغربی دنیا میں اردو کا ادارہ
ہے۔

جدہ میں مہمان شعرا کے اعزاز میں مشاعرے

گذشتہ دنوں جدہ میں راقم الحروف کے ہاں یکے
بعد دیگرے دو ادبی شخصیات کے اعزاز میں شعری
نشستوں کا اہتمام کیا گیا۔ پہلی شخصیت انجمن ترقی
اردو پاکستان کے مشیر علمی و ادبی ڈاکٹر اسلم فرخی
کی تھی اور اس میں سامعین کے علاوہ شرکت کرنے
والوں میں رشید عالم صدیقی، نعیم بازید پوری،
اعتماد صدیقی ظفر مہدی وغیرہ شامل تھے۔ ایک اور
ایسی ہی محفل جناب سبطین شاہجہانی کے اعزاز میں
سجائی گئی جو حال ہی میں پاکستان سے جدہ کے
قونصل خانے میں تعینات ہوئے ہیں۔ اس محفل میں
مہمان خصوصی کے علاوہ ظفر بدایونی، اعتماد صدیقی،
ظفر مہدی اور چند دوسرے دوستوں نے شرکت کی
ان دونوں محفلوں میں شعرائے کرام نے اپنا تازہ
کلام سنایا اور جدہ کی ادبی سرگرمیوں کے حوالے
سے خاصی گفتگو رہی۔

دونوں شعری نشستوں میں جو کلام پیش کیا
گیا اس کا انتخاب پیشِ خدمت ہے۔

ڈاکٹر اسلم فرخی:

مدحتِ سرورِ کونینؐ تو کیا لکھی ہے
میں نے اپنے لیے بخشش کی دعا لکھی ہے
ہوگئی مجھ پہ حرام آتشِ دوزخ اسلم
میں نے سرکارِ دو عالمؐ کی ثنا لکھی ہے

سبطین شاہجہانی:

جذبہ بحترِ خوبی وہ ایثار لے گیا
ہم کو کسی کا عشق سرِ دار لے گیا
اس قریۂ جمیل میں جانا محال تھا
فیضان التفات کئی بار لے گیا

سید ظفر مہدی:

خود کو پا سکنے کی حسرت رہ گئی
آئینہ ٹوٹا تو حیرت رہ گئی
آدمی میں ارتقا کے باوجود
آج بھی پہلی سی وحشت رہ گئی

اعتماد صدیقی:

ہجرت کی تمنا میں کیا شام و سحر رہنا
اک گاؤں بسا لینا اور چین سے گھر رہنا

مرعوب نہیں ہوتا جنگل کی ہواؤں سے
جس پیڑ کو آتا ہے بے برگ و ثمر رہنا

نسیم سحر:
میں جس کے دھیان میں تھا جس کی ذات میں گم تھا
وہ شخص اپنی ہی مصروفیات میں گم تھا
وہ جانتا نہ تھا ناممکنات کا حاصل
کہ آدمی تو فقط ممکنات میں گم تھا

نعیم بازید پوری:
یہ طلسم حسن نظر اگر نہیں ٹوٹتا
سر آئینہ دل شیشہ گر نہیں ٹوٹتا
مرا رابطہ جو نہ ٹوٹتا غم عشق سے
غم زندگی مری جان پر نہیں ٹوٹتا

رشید عالم صدیقی:
کتنے سر کتنے تراشے ہوئے پتھر ہوتے
ہم نہ ہوتے تو کئی شہر میں آزر ہوتے
صرف اک شعلۂ احساس محبت کا مزاج
ورنہ منصور بھی ہم سب کے برابر ہوتے

ظفر بدایونی:
سر جھکا کے جیئے تو خاک جیے
اپنے دامن کے جب نہ چاک سیے
شہر لیلا کی روشنی کے طفیل
جل رہے ہیں یہ روشنی کے دیئے

مولانا سید عبدالقادر خنداں ٹونکی کے انتقال پر تعزیتی جلسہ

راجستھان کے مشہور شاعر و ادیب صحافی و عالم سید عبدالقادر خنداں ٹونکی کا انتقال ۷ ستمبر ۹۱ء کو ٹونک میں ہوگیا۔ مولانا خنداں کے انتقال پر ملال پر ۱۵ ستمبر ۱۹۹۱ء کو "حبیب الرحمٰن میموریل سوسائٹی ٹونک" کی جانب سے تعزیتی جلسہ مہدی عباس ایڈوکیٹ کے مکان پر منعقد ہوا جس میں سید قاضی الاسلام، مولوی سعید صاحب، صاحبزادہ شوکت علی خاں اور معزز ادباء و شعراء نے شرکت فرمائی۔ جلسہ کی نظامت عمر جہاں لکچرار اردو نے فرمائی۔ مولانا خنداں مرحوم کی ادبی خدمات پر مندرجہ ذیل حضرات نے منظوم خراج عقیدت اور مقالات پڑھے۔

(۱) سید مختار ٹونکی ۔ (منظوم خراج عقیدت)
(۲) صاحبزادہ شوکت علی خاں۔ مقدمہ گلہائے خنداں
(۳) محمد صادق بہار ۔ خنداں آئینہ وصفات
(۴) ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی۔ (خنداں کی شاعری میں تاریخی شعور)
(۵) مسعود اختر (خنداں پردے کے پیچھے کا آدمی۔
(۶) عبدالمجید ٹونکی۔ (خنداں اپنے کلام کے آئینہ میں
(۷) عبدالغفار ٹونکی۔ مولانا خنداں کی صحافتی خدمات

آخر میں مولوی جمیل، عمر جہاں اور سید منظور الحسن برکاتی نے مولانا مرحوم کی ادبی شخصیت اور صحافتی خدمات پر اظہار خیال فرمایا۔

شاہد علی خاں صاحب کو صدمہ

آج طبیعت بجھی بجھی سی ہے
تیری محفل میں کچھ کمی سی ہے

یہ خبر انتہائی افسوس کے ساتھ شائع کی جارہی ہے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل منیجر اور کتاب نما کے اڈیٹر جناب شاہد علی خاں صاحب کی والدہ محترمہ کا انتقال ہوگیا مرحومہ تقریباً ڈیڑھ ماہ شدید بیمار رہیں بالآخر ۶ ستمبر ۹۱ء (مطابق ۲۶ صفر ۱۴۱۲ھ) کو بروز جمعہ ۵ بجے شام جنت الفردوس کو رخصت ہوگئیں۔ جناب شاہد علی خاں صاحب نے اپنی ماں مرحومہ کی بے مثال خدمت انجام دی۔ ادارہ دعاگو ہے اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اعلا درجات سے نوازے اور شاہد صاحب کو اور ان کے اہل خاندان کو صبر و سکون عطا کرے۔
(ادارہ)

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

نومبر ۱۹۹۱ء جلد ۳۱ شمارہ ۱۱

فی پرچہ	6/=
سالانہ	55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے	75/=
غیر ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک)	120/=
" (بذریعہ ہوائی ڈاک)	240/=

ایڈیٹر

شاہد علی خاں

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

TELEPHONE 630191

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۱۱۰۰۰۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برلا آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

مضامین

نظمیں/غزلیں

افسانہ:

طنز و مزاح

کھلے خطوط

جائزے اور ادبی تہذیبی خبریں

حواب اور خلش (شعری مجموعہ) آل احمد سرور ۶۶/-
فرید و فرد فرید (تذکرہ) ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۷/-
خوب سیرت (ترجمہ احادیث) حکیم محمد سعید ۷/۵۰
چالاک خرگوش کی واپسی (بچوں کا ناول) معراج ۱۵/-
عجائب گھر (بچوں کی سائنسی کتاب) قاسم صدیقی ۱۰/-
علاج میرا دشمن " " " ۶/-
کیوں اور کیسے " " محمد ابراہیم شاہ ۶/-
توازن (سہ ماہی) اڈیٹر عتیق احمد عتیق ۱۲/۵۰
آئینہ پورنیہ (تذکرہ تاریخ) ڈاکٹر عبدالرقیب ۵۰/-
آتش سنگ (افسانے) ابراہیم اختر ۲۰/-
ہمارے پسندیدہ افسانے (افسانے) اطہر پرویز ۳۰/-
جرنل پٹنہ (رسالہ) خدا بخش لائبریری ۱۵/-
ترقی پسند تحریک تاریخ و تجزیہ (تاریخ) ڈاکٹر قمر امیسری ۴۰/-
دامان فطرت (شاعری) قمر نعمانی ۱۲۵/-
مجاہدین اسلام (مذہب) سید عبدالصبور طارق ۲۵/-
سہ رلیے (طنز و مزاح) مسعود مفتی ۶۰/-
پکاری (افسانے) سطوت زہرا سطوت ۲۵/-
غالب نامہ (رسالہ) مدیر و علامہ پروفیسر نذیر احمد ۴۰/-
کنور اپنی دشنویوں کی روشنی میں (شخصیات) ڈاکٹر ابوبکر جیلانی ۵۰/-
حیات طیبہ تالیف محمد شفیع ۱۰/-
حرف و صدا (شعری مجموعہ) فراز سلطان پوری ۱۰۰/-
پتھروں کا صلیب (افسانے) ستیہ پال آنند ۶۰/-

سرِورق :- اجمل اجملی

مطبوعات خدا بخش لائبریری، پٹنہ

جنید احمد کی آٹوگراف بک جنید احمد ۲۰/-
ہندستان کی جنگِ آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین ۰۰/-
ہندو تیوہاروں کی دلچسپ اصلیت منشی رام پرشاد ماتھر /-
دیوان مصحفی مرتبہ اسیر لکھنوی، امیر مینائی ۰/-
اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر ڈاکٹر اوم پرکاش ماتھر /-
ایک نادر روزنامچہ مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی /-
ہندستان میں قومی یکجہتی کی روایت، بی این پانڈے /-
تواریخ نادر العصر، مؤلفہ نول کشور ۵/-
من موہن کی باتیں شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی /-
معیار تحقیق (مجلہ) ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ /-
کانٹے (کشمیری انشائیے) ڈاکٹر محمد زماں آزردہ /-
فرہنگ زفان گویا جلد اول تالیف بدر ابراہیم /-
مغربی تعلیم کا تصور رشید احمد صدیقی /-
انتخاب ماہنامہ "ادیب" ۱۹۱۰-۱۳ نوبت رائے نظر /-
طلسم ہوشربا اول تا ہفتم (حصہ پنجم دو حصوں میں ہے۔) /-
مقدمہ طلسم ہوشربا /-
باقیات طلسم ہوشربا حصہ اول (زیر)
" " حصہ دوم (زیرِ)
پیغام (ہفتہ وار) مولانا ابوالکلام آزاد /-
باقیات عظیم الدین احمد ادارہ تحقیقات اردو پٹنہ /-
رسالہ "زبان" مدیر خوشتر منگروی /-
تذکرہ کاملانِ رامپور مولفہ حافظ احمد علی شوق
دیوان رضا عظیم آبادی قاضی عبدالودود
بہار اردو لغت (جلد اول) سید یوسف الدین احمد بلخی
انتخاب ماہنامہ "العصر" (۱۹۱۳-۱۷) پیارے لال شاکر
انتخاب ماہنامہ "صبح امید" (۱۹۱۸-۲۱) برج نرائن چکبست

مہمان مدیر

ل احمد
او کھلا۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اشاریہ

کچھ سوالات زبان کے بارے میں

کتاب نما کے مہمان مدیر عموماً اپنے اشاریوں میں ادب کے کسی ایک مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال رتے رہے ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں برادر محترم علی جواد زیدی صاحب نے تخلیق کار اور ناقد کے موضوع پر اور اکتوبر کے شمارے میں محترمی ف۔ س۔ اعجاز نے ہنگامی اور سنئے موضوعات کے تعلق سے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ زیدی بھائی نے خاص طور پر تخلیق و تنقید کے باہمی رشتوں کو لے کر اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں بہت سی چونکا دینے والی باتیں کہی ہیں اور دبی دبی زبان میں ہی سہی تخلیق کار اور قاری کے باہمی رشتے کو بھی بحث میں بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹ لیا ہے کہ آخر کار ناقد بھی تو ایک ذہین اور باذوق قاری ہی ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ناقد کو اپنی پسند ناپسند کا تجزیہ کرنے اور اپنے مخصوص ردّعمل کی وجوہات بیان کرنے پر قدرت حاصل ہوتی ہے جبکہ عام قاری کم و بیش اس صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔

مگر میں کتاب نما کے قارئین سے معذرت کے ساتھ اس روایت سے انحراف کرنا چاہتا ہوں۔ اوّل تو ادب کے کسی مسئلے سے بحث نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس زبان کے بارے میں گفتگو کرنی چاہتا ہوں جس کی کوکھ سے ہمارے ادب نے جنم لیا ہے۔ پھر یہ کہ میری بات چیت زبان کے کسی ایک مسئلے یا گوشے تک محدود نہیں۔ گذشتہ سالوں اپنی زبان کے واسطے سے میرے ذہن میں بہت سارے سوالات اٹھتے رہے ہیں۔ میں ان میں سے بعض سوالات آپ کے سامنے پیش کرنے اور ان کے بارے میں اپنے معروضات عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

زبان کے سلسلے میں جو پہلا سوال مجھے ایک عرصے سے پریشان کرتا آرہا ہے، اس کا تعلق اردو کی موجودہ صورت حال اور اس کی آیندہ ترقی کے ایک خاص پہلو سے ہے۔ میں یہاں نہ اردو والوں کی جائز شکایتوں سے بحث کروں گا نہ ان ریاستوں کی جہاں اردو بولنے والے ایک خاصی بڑی تعداد میں موجود ہیں اور ان کی سرکاروں کی غیر جمہوری روشوں کی کہ ان پر تو برابر گفتگو ہوتی رہتی ہے اور غالباً اس وقت تک

ہوتی رہے گی جب تک اپنے حقوق کے لیے اردو والوں کی لڑائی جاری ہے۔

تاشقند یونی ورسٹی میں اردو کے ایک نامور استاد ہیں ڈاکٹر تش مرزا خان مرزا ئیف. موصوف نے "آزاد کے بعد ہندستان میں اُردو زبان" کو اپنی تحقیقات کا موضوع بنایا اور بڑی عرق ریزی کے ساتھ اپنا تحقیقی مق تیار کیا۔ اس مقالے میں انھوں نے اپنی تحقیقی کاوشوں کا جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ اُردو کو اپنی مادری زبان بنا والوں کے لیے خاصا عبرت انگیز ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اردو زبان کا جو آزادی سے قبل ایک ہمہ گیر ترقی یافتہ زبان تھی، ہر علم وفن کا خزانہ جس میں موجود تھا، سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر میں جس کا چلن تھا، الیہ ہے کہ اب وہ صرف مسلمانوں کی زبان بنتی جارہی ہے اور صرف شاعری اور افسانہ نگاری تک محدود ہوتی جا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اُردو زبان ہندستان میں موجودہ عہد کے سماجی، سائنسی اور تکنیکی تقاضوں اور ضرد کو پورا نہیں کر رہی ہے۔ اس کی نہ تو کوئی جامع قواعد ہے نہ جامع لغت ہے۔ انھوں نے گزشتہ ربع صدی کے اخباروں کا مطالعہ کر کے کم وبیش ایک ہزار ایسے الفاظ جمع کیے ہیں جو اُردو اخبارات میں کثرت سے استعمال ہیں مگر اُردو کے کسی لغت میں موجود نہیں۔ انھیں اصرار ہے کہ بول چال کی نئی اُردو اور اخبارات کی نئی زبان کے بغیر اُردو کا کوئی جامع لغت مرتب نہیں ہوسکتا۔

یوں تو خان مرزا ئیف نے جتنے بھی سوالات اپنے تحقیقی مقالے میں اٹھائے ہیں وہ سبھی اپنی اپنی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ مگر ایک سوال ایسا ہے جسے ہم زبان کی موت اور زندگی کا سوال کہہ سکتے ہیں، اس کا تعلق ہماری زبان میں تصنیف وتالیف کی سمٹتی ہوئی وسعتوں سے ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہماری زبان شاعری اور افسانوی ادب کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ اگر آپ اُردو کے چھوٹے بڑے اشاعت سے شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست پر نظر ڈالیں تو ان الفاظ کی صداقت اُبھر کر سامنے آجائے گی۔ یقین پچھلے دنوں اردو میں شائع ہونے والی کتابوں میں ۸۰ فی صد کا تعلق کسی نہ کسی لحاظ سے ادب کے ساتھ رہا ہے میں سب سے زیادہ شعری مجموعے، افسانوں اور تنقیدوں کے مجموعے اور ناول چھاپے گئے ہیں۔ اس کے بعد فی صد کتابیں رہ جاتی ہیں ان میں سب سے زیادہ جگہ مذہبی مطبوعات اور سب سے کم جگہ سائنسی مطبوعات ہے۔ سائنس، معاشیات، سیاسیات، عمرانیات، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی اور دوسرے جدید علوم وفنون پر ہونے والی طبعزاد کتابوں کا تو فقدان ہی ہے۔ حالانکہ اگر ہم واقعی اپنی زبان سے محبت کرتے ہیں تو ہمیں ثابت ہوگا کہ اس کا دامن اتنا وسیع ہے کہ جدید علوم کی زبان بن سکتی ہے کیونکہ آج کوئی بھی زبان جدید علوم وفنون کٹ کر خود کو صرف شعر وشاعری اور قصہ کہانی کی زبان بنا کر نہ تو زندہ رہ سکتی ہے اور نہ زندہ زبانوں کی برا میں اپنی جگہ بنا سکتی ہے۔

یہاں اس بات کا اعتراف کرتے چلیں کہ خامی ہماری زبان کی نہیں، اوّل تو اس کا ذخیرۂ الفاظ اور اسلوبِ نگارش کے اعتبار سے اس کا دامن بے حد مالامال ہے۔ دوسرے اس میں اتنی لچک اور ...

ں کے الفاظ اور اصطلاحیں سمیٹ لینے کی اتنی صلاحیت ہے کہ جیسا کہ ہمارے بزرگوں کا تجربہ بتاتا ہے کسی
ع موضوع پر طبعزاد مقالات لکھنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ کوتاہی ہماری اپنی ہے۔ ہم لوگ خود کو اُردو کا
سنار کہتے نہیں تھکتے۔ زبانی جمع خرچ کا موقع آئے تو جوشِ خطابت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ مگر عمل کا ہنگام آتا ہے تو
بڑھانے کے تصور سے ہی ہم پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔ ویسے یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے معاشر
جدید علوم و فنون میں مہارت رکھنے والے ایسے دانش وروں کی اب بھی کمی نہیں جو اُردو کے ہنڈولے میں پلے
اُردو کے مزاج میں ڈھلے ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ اپنے اپنے میدان کی مستند ہستیاں ہیں بلکہ ان میں سے
بیشتر لوگ اردو میں لکھنے پڑھنے کا تجربہ بھی رکھتے ہیں تو کیوں نہ ان سے یہ امید کی جائے کہ وہ اپنی زبان کا
ن اپنے اپنے مضامین کی کچھ معرکتہ الآرا طبعزاد تصانیف سے مالا مال کر دیں اور یوں اپنی زبان کا وزن
بلند کر دیں۔

ہماری ایک اور خوش قسمتی یہ ہے کہ کم از کم دو تین یونی ورسٹیاں ایسی ہیں جہاں اُردو بولنے والے
ش وروں کا جمگھٹ نظر آتا ہے اور نظم و نسق کی سطح پر بھی بہت کچھ ان کا عمل دخل ہے، اسی لیے وہ چاہیں
پنی زبان کا دامن جدید علوم سے مالا مال کرنے کا ایک اور راستہ بھی اپنا سکتے ہیں۔ میری تجویز یہ ہے کہ
دستان کی تمام یونی ورسٹیوں میں جدید علوم و فنون پر لکھے جانے والے تحقیقی مقالوں کی زبان جہاں تک
کے انگریزی کی جگہ طالب علموں کی مادری زبان بنادی جائے۔ اس سے جہاں طالب علم اپنی تحقیق کے
ئج زیادہ اعتماد کے ساتھ تحریر کر سکے گا وہیں ان زبانوں کو اپنا وزن بڑھانے کے لیے طبعزاد تصانیف ملنے
لگیں جن میں ہر سال برابر اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اس سلسلے میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی
جامعہ ہمدرد کو اُردو میں تحقیقی کام کے لیے مخصوص کیا جا سکتا ہے۔ اپنے طور پر الٰہ آباد، لکھنؤ، گورکھ پور، عثمانیہ،
تی اسمرآباد، حیدرآباد، پونہ اور میسور یونی ورسٹیاں بھی اُردو میں تحقیقی کام کا بیڑا اٹھا سکتی ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ اُردو زبان سے محبت کرنے والوں کو اس بات کا احساس نہیں کہ ہماری زبان
دامن جدید علوم کے خزانے سے خالی ہو چکا ہے یا ہوتا جا رہا ہے۔ ادھر کچھ برسوں سے یہ کمی ترجموں کے
ے پوری کی جا رہی ہے۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ گو طبعزاد تصانیف والی بات تو نہیں پھر بھی
کا زبان کا وزن بڑھانے میں ترجمے بھی مددگار ہوتے ہیں اور اس زبان کے بولنے والوں کا ذہنی
ن وسیع کرتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہی ترجمے مستقل تصانیف اور مکاتیبِ فکر کی بنیاد بن جاتے ہیں۔ مسلم
فہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ یونانی اور رومی مفکّروں کی تصانیف کا ترجمہ کرتے کرتے اور ان پر
ئی نوٹ لکھتے لکھتے الکندی اور الفارابی جیسے لوگوں نے نہ صرف یہ کہ مفکّروں کی حیثیت سے اپنا قد
کیا بلکہ عالمی فکر کی ایک ایسی شاخ بھی معرضِ وجود میں لے آئے جسے مُسلم فلسفہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔
لکی بات ہے کہ ہمارے یہاں بھی ترقی اُردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ اور مختلف ریاستوں کی اردو اکادمیوں

کے قیام کے بعد ترجموں کا کاروبار بہت بڑے پیمانے پر چل رہا ہے مگر افسوس اس کا ہے کہ یہ کام جتنے محتا
انداز میں ہونا چاہیے تھا نہیں ہو پا رہا ہے۔ بحیثیت مجموعی ہمارے ان اداروں سے اس دور کے بعض بہترین د
وابستہ ہیں۔ لیکن چونکہ ترجمے کے فلسفے، اصول اور قواعد پر ہمارے یہاں ابھی سنجیدگی کے ساتھ کوئی خاص کا
نہیں ہو پایا ہے اسی لیے بڑی افراتفری کا احساس ہوتا ہے۔ کوئی ترجمے میں تعبیر و تشریح کو بھی شامل کر
ہے اور کسی کے نزدیک ترجمے کی ذمے داریوں سے اُس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا جب تک مکھی پر مکھی نہ بٹھا
جائے۔ یادش بخیر میرے ایک عزیز دوست تھے جنھوں نے خدا جھوٹ نہ بلائے سیکڑوں کتابوں اور کتابچو
کے ترجمے تو کیے ہی ہوں گے۔ مرحوم سے ترجمے کے فلسفے کو لے کر اکثر بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ فرمایا کرتے تھے
بہترین ترجمہ وہ ہے کہ جب اس کا دوبارہ ترجمہ اصل زبان میں کیا جائے تو عبارت کا وہی ڈھانچہ تیا
ہو جائے جو ترجمہ کرتے ہوئے مترجم کے سامنے تھا۔ یہ اسی افراتفری کا نتیجہ ہے کہ ہمارے یہاں ترجمے
کسی کم سے کم معیار کا تعین بھی نہیں کیا جا سکا ہے اور وہ پوری طرح آج بھی مترجم کی انفرادی علمیت، ذہان
صلاحیت اور رویّہ کا اسیر ہو کر رہ گیا ہے۔ ظاہر ہے ہم کسی بھی کارپرداز سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ ذا
طور پر سبھی مترجموں سے واقف ہوگا۔ اس لیے دھوکا کھانے اور غلط فہمیوں کا شکار ہو جانے کی بھرپور گنجائش
موجود ہے۔ یہ بات میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔

کوئی دو سال قبل میرے پاس ایک معزز ادارے کی ایک کتاب کا مسودہ ویٹنگ کے لیے آیا۔ آ
یقین جانیں کہ ویٹنگ کی جگہ مجھے تقریباً پورے مسودے کا دوبارہ ترجمہ کرنا پڑا کیونکہ مترجم صاحب نے نہ
لغت دیکھنے کی زحمت کی تھی اور نہ ہی متن کا مفہوم سمجھنے کی۔ موصوف کے ترجمے کے کچھ گراں قدر نمونے آج
مجھے یاد ہیں۔ مثلاً North کو موصوف نے ہر جگہ جنوب لکھا تھا اور حد یہ ہے کہ ایک جگہ جہاں چین کو نارد
پڑوسی لکھا گیا تھا وہاں بھی موصوف نے یہی لکھا تھا کہ چین ہمارا جنوبی پڑوسی ہے۔ اس کے علاوہ نہ جانے کتنی
کا پورے اعتماد کے ساتھ ارتکاب کیا گیا تھا۔

ترجمے کے کام کا ایک پہلو اصطلاح سازی بھی ہے۔ مگر یہ کام ترجمے سے بھی زیادہ احتیاط
اور کشادہ ذہنی کا طالب ہے۔ دوسری صورت میں وہی حشر ہوتا ہے جو ہندی میں رگھویر سہاے کی گڑھ
اصطلاحوں کا یا جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحوں کا ہوا۔ اس وقت ہماری مختلف ریاستوں میں مقامی زبانوں نے سر
زبانوں کی حیثیت حاصل کر لی ہے جو انتظامیہ کی زبانیں بن گئی ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں بولی جانے
متعدد بڑی زبانیں آزادی کے بعد نشاۃ ثانیہ کے دور میں داخل ہوئی ہیں اور ان میں بیک وقت اصط
سازی کا عمل جاری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی ایک عالمی اصطلاح کی جگہ ہمارے یہاں کم سے کم چود
اصطلاحیں تیار ہو رہی ہیں۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ ہم اصطلاحوں کا ایک غیر قومی بینک بناتے اور عالمی اص
مدِ نظر رکھتے ہوئے ملک کی تمام زبانوں کے لیے یکساں اصطلاحات وضع کرتے جو کشمیر سے لے کر کنیا کم

نہ ہر جگہ مشترکہ طور پر استعمال کی جاتیں، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ہر زبان اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رہی ہے اور لسانی شاونزم نے ہمیں اتنا اندھا کر دیا ہے کہ تمام زبانوں کے مشترکہ مفاد سے زیادہ ہمیں اپنی زبان کا انفرادی مفاد عزیز ہے۔ یہ صورت حال ہمیں عجیب و غریب منزل کی طرف لے جا رہی ہے جہاں ہمارے اپنے لوگ اپنے ہی دیس میں بیگانے ہو کر رہ جائیں گے۔ فرض کیجیے کل کسی صنعتی پروجیکٹ پر ملیالم، بنگلہ، تامل، مراٹھی اور کچھ دوسری زبانیں بولنے والے اور ان زبانوں میں انجینیرنگ کی ڈگریاں لے کر آنے والے انجینیر کام کر رہے ہوں۔ اب ان میں سے ہر ایک ایک ہی کام کے لیے ایسی اصطلاح استعمال کرے گا جس سے دوسرا نا واقف ہوگا۔ ایسی صورت میں نہ تو تندہی اور رفیقانہ کارکردگی کا جذبہ پیدا ہو پائے گا، نہ کام کا وہ آہنگ بن پائے گا جو پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ان پروجیکٹوں کی کامیابی کے لیے ہمیں یا تو یہ اہتمام کرنا ہوگا کہ ایک پروجیکٹ پر کسی ایک زبان والے انجینیر ہی کام کریں جو ہماری قومی وحدت کے تصور کے منافی ہے یا پھر ایسے انٹرپریٹر تیار کرنے ہوں گے جو ہماری بیش تر زبانوں سے واقف ہوں اور یہ بھی کوئی آسان کام نہیں۔

زبان کے سلسلے میں ایک اور مسئلہ ہماری فوری توجہ کا مستحق ہے۔ میں اسے زبان کی نشر و اشاعت کا مسئلہ کہوں گا۔ اس وقت ہمارے ملک میں تعلیم بالغاں کا اندولن سرکاری اور غیر سرکاری سطحوں پر بڑے منظم ڈھنگ سے چل رہا ہے۔ پورے ملک میں دیہی اور شہری علاقوں میں سرکاری اسکیموں کے تحت خواندگی کے مرکز قائم ہیں جہاں بڑوں کو منصوبہ بند انداز میں حرف اور اعداد شناسی کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ حکومت نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ریاستی ریسورس سنٹر قائم کیا ہے جو اُردو اور ہندی میں اس کام کا اہتمام کر رہا ہے اور اس کے لیے کتابیں وغیرہ تیار کرا رہا ہے۔ یہ موقع ایسا ہے کہ ہم اپنی زبان کو نئے نئے علاقوں اور نت نئے طبقوں تک لے جا سکتے ہیں اور اس سلسلے میں کچھ کوششیں بھی کی جا رہی ہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق کرناٹک، مغربی بنگال، بہار، آندھرا، جموں اینڈ کشمیر، اتر پردیش اور بمبئی میں مختلف رضاکار تنظیموں نے اس طرف توجہ دی ہے۔ مگر دلی کا حال بہت پتلا ہے۔ یہاں اردو اکادمی اکیلی تنظیم ہے جس نے دلی اور نئی دلی کے مختلف علاقوں میں تعلیم بالغاں کے مرکز کھول رکھے ہیں۔ باقی جو تنظیمیں ہیں انھیں اُردو کی نشر و اشاعت سے کوئی دلچسپی نہیں، رہے اُردو والے تو ان میں تو جیسے فلاحی اور رضاکارانہ خدمات کی روایت ہی ختم ہو گئی ہے۔ حد یہ ہے کہ انجمن ترقی اُردو نے بھی اپنے کو دور دور ہی رکھا ہے، کم سے کم اسٹیٹ ریسورس سنٹر جامعہ ملیہ کی اطلاع تو یہی ہے۔

اُردو میں تعلیم بالغاں کے فروغ کی بات آتی ہے تو ذہن ان تجاویز کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جن کا مقصد اُردو زبان اور املا کو آسان بنانا ہے۔ اس سلسلے میں محترم دوست رشید حسن خاں نے اُردو املا لکھ کر ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے مختلف الفاظ کی کتابت کے طریقے میں جو اصلاحات تجویز کی ہیں، وہ یقیناً ابتدائی سطح پر اور حرف شناسی کے مرحلے پر اُردو پڑھنے والوں کی راہ میں آسانیاں پیدا کریں گی۔ مگر نئے پڑھنے

والوں کا مسئلہ صرف املا نہیں، ان کی پریشانی کا اصل سبب ایک آواز کے لیے دو یا بسا اوقات دو سے زیادہ علامتوں کی موجودگی ہے۔ خاں صاحب نے اس مسئلہ کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "کچھ لفظ ایسے ہیں جو ت اور ط دونوں سے لکھے جاتے ہیں۔ ان کی صرف ایک لکھاوٹ کو اختیار کرنا چاہیے اور ایسے سب لفظوں کو ت سے لکھنا چاہیے۔ اس میں سادگی بھی ہے اور آسانی بھی جیسے توتا، تماچا اور تپش وغیرہ"
(اُردو املا۔ صفحہ ۱۲۴)۔

مگر خاں صاحب اس سے آگے جانے کے لیے تیار نہیں۔ حالانکہ وقت اور ضرورت کا تقاضا یہی ہے۔ خود خاں صاحب نے لسانیات کے ایک ماہر ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا ایک اقتباس اُردو املا میں درج کیا ہے۔ مسعود صاحب لکھتے ہیں: "مصوتوں کے سلسلے میں ان زائد حروف کا ذکر بھی ضروری ہے جو عربی سے لیے گئے ہیں اور جو ہمارے حروف تہجی اور نظام درس کے لیے پیر تسمہ پا بنے ہوئے ہیں، میری مراد ذ، ض، ظ، ط، ث، ص، ح وغیرہ سے ہے۔ صوتی نقطۂ نظر سے یہ سب مُردہ لاشیں ہیں جنھیں اُردو رسم خط اُٹھائے ہوئے ہے صرف اس لیے کہ ہمارا رشتہ عربی سے ثابت رہے۔" (اُردو املا۔ صفحہ ۳۱۹)

خاں صاحب نے اسے املا میں تبدیلی کی تجویز قرار دیا ہے اور یہ سوال اٹھایا ہے کہ انقلاب کون لائے گا؟ خاں صاحب سے ہم جیسے نیاز مند بحث کی بات سوچ بھی نہیں سکتے البتہ انھیں امریکی انگریزی میں لائی جانے والی تبدیلیوں کی یاد دلانا اور یہ عرض کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اُردو زبان کے لیے نئی دنیائیں ہاتھ آنا یقینی ہو جائے تو مسعود صاحب کی تجویز پر غور کرنے میں کوئی قباحت نہیں جب کہ یہ تبدیلی آپ کے اپنے میلان سے ہم آہنگ بھی ہے۔

سوالات اور بھی ہیں مگر طولِ کلام کے اندیشے سے اپنی بات ختم کر رہا ہوں، طوالت کے لیے معذرت کے ساتھ کہ عظر "لطیف بود حکایت دراز تر گفتم"

ان الحق حقی
خیابانِ تنظیم ڈیفنس سوسائٹی. کراچی پاکستان

غالب کے دو شعر

یرا مشاہدہ ہے کہ شارحینِ غالب ایک سرے سے شرح لکھنی شروع کرتے ہیں تو اپنی رَو میں بعض
کات کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور مضمون کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اس سادہ سے شعر میں :

سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا

اس تلازمے کو سبھی نے نظر انداز کیا جو جنس اور قیمت سے لے کر "صدا" تک پہنچا ہے، یعنی سستے
واز لگا کر بیچنا "سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا سُن!" بھی گاہک کو روکنے کا انداز ہے جو مال کی بے قدری
ہا رہا ہو۔ ایک شارح نے یہاں تک لکھا کہ غالب کو قیمت کی جگہ شیشۂ دل کہنا چاہیے تھا۔
یں نے ایسے کوئی ساٹھ شعروں پر حواشی لکھے ہیں جن کا مفہوم میرے خیال میں شارحینِ غالب کے
ے مختلف ہے۔ تیس اشعار کی شرح میرے مجموعۂ مضامین نکتۂ راز (۱۹۷۲ء) میں شامل تھی۔ باقی جستہ جستہ
شائع ہوتے رہے ہیں۔ ذیل میں ایسے ہی دو مزید اشعار کے بارے میں اپنی ناچیز رائے پیش کرتا ہوں۔

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ
وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

وال یہ ہے کہ پیمانۂ جمشید کی تلچھٹ سے کیا مراد ہے۔ ظاہر ہے کہ ان الفاظ کے صرف لفظی معنی نہیں
لے۔ اصطلاح نہیں صریحاً مجاز کا پیرایہ ہے، ورنہ کہاں جمشید اور اس کا پیمانہ اور کہاں ہم۔ نہ وہ
اس کی تلچھٹ جسے پیتے ہی چلے جائیں۔ لہٰذا مجازی مفہوم تلاش کرنا ہوگا اور دیکھا جائے گا کہ اس
کہاں ہوتا ہے۔

وسرا سوال یہ ہے کہ "ہم لوگ" کون ہیں۔ کیا شاعر اور اس کے قاری یا ہم قوم؟ مگر ایسا تو نہیں
ب کیسے مانیں گے کہ وہ اس طرح کی دُرد نوشی کے عادی ہیں۔
ان دونوں نکات کو شارحین نے نظر انداز کیا ہے اور شعر کے لفظی مفہوم پر اکتفا کی ہے، جس کو

آغا محمد باقر نے خلاصۂ یوں لکھا ہے،

"دُردی کش۔ تلچھٹ پینے والے۔ صاف اور دُرد میں رعایت لفظی ہے۔ شرابِ انگوری جمشید کی ایجاد ہے۔ کہتے ہیں کہ شراب نوشی میں ہم جمشید کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ بات تقلید جمشید کے خلاف ہے کہ ہم ادنا درجے کی شراب پییں۔ پس ہم کو اس شراب پر افسوس ہے جو شرابِ انگوری نہ ہو۔" (بیانِ غالب)

یہاں دُردی کش کے اصلی معنی مقلد لیے گئے ہیں، تقلید سے مراد شراب نوشی میں جمشید کا اتباع، ہم سے مراد گروہِ رنداں، اور یہ فرض کیا گیا ہے کہ رند گھٹیا شراب پینے والے ہیں یا کہ یوں سمجھیے کہ غالب کے حلقے رند گھٹیا شراب پیتے ہیں ورنہ تمام رندوں کی بابت تو یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ گھٹیا شراب ہی پیتے ہیں۔

دراصل "ہم لوگ" کی نسبت جب تک کہ واضح طور پر قارئین یا معاشرے کی طرف نہ ہو شاعر اور اُ کے گروہ کی طرف کرنی پڑے گی۔ پھر چونکہ لفظی معنی کفایت نہیں کرتے، دُرد نوشی کے مجازی معنی ہی لینے گے۔ چونکہ جمشید موجود ہے نہ اس کا پیالہ، اس لیے اُسے بھی نظر انداز کرنا پڑے گا۔ وہ آمدِ سخن کے طور ایک مثال یا علامت قرار پائے گا۔ مضمون کا خلاصہ تو اتنا ہی ہے کہ چیز اس کی اصل سے حاصل کی جائے بات ہے، بچی کھچی باسی نہیں، وہ بھی صدیوں کی باسی۔ اب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ دُرد کش سے کیا مُراد لی جا ہے اور دُرد نوش کون ہوئے۔ یہ شرابِ سخن ہی کا ذکر ہوسکتا ہے جس میں قدماے ایران کی تقلید جاری اس کنایے اور قدامت کے مفہوم کو پیمانۂ جم کا نام لے کر تقویت دی ہے۔ "ہم لوگ" کہ کر غالب نے خود کو حلقے میں شامل کیا ہے۔ لیکن اس کی بات تہ دار ہوتی ہے۔ یہ دراصل خود ستائی کا شایستہ پیرایہ ہے اپنی تازہ کاری پر توجہ دلاتا ہے، جو مقدر ہے مذکور نہیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ خوشۂ انگور یعنی فطرت سے اخذِ معانی ہونا چاہیے۔

(دیگر) ہوں زخود رفتۂ بیداے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

حسرت: میں صحراے خیال کا از خود رفتہ ہوں اور از خود رفتگی ہی میری نشانی یا پہچان ہے یعنی سیدِ مشفق۔

"طباطبائی: خیال سے خیال احباب مراد ہے، اور اسے میدان فرض کیا ہے، اور اپنے تیئں اس میدان کا از خود رفتہ کہا ہے۔ یعنی خیالِ احباب سے میں نکل جاتا ہوں، اور احباب کا مجھے بھول جانا ہی میری نشانی ہے۔ (طباطبائی، بیخود، آسی)" منقول از بیانِ غالب

طباطبائی نے "از خود رفتہ" کے معنی صرف رفتہ لیے ہیں۔ اصل معنی غافل، بے ہوش، دیوانہ۔ بیداے خیال کو بھی احباب کے خیال کا صحرا فرض کیا ہے۔ صحراے خیال شاعر اپنے خیال کو تو کہ سکتا ہے

ے خیال کو نہیں۔ شارحین نے نشان اور نشانی میں بھی فرق نہیں کیا۔ نشان کے معنی سُراغ یا پہچان صحیح۔ نشانی
چیز ہوتی ہے جو جانے والا اپنے پیچھے بطور یادگار چھوڑ جاتا ہے جیسے نشانی کا چھلّا۔ یا موتی مٹّی کی نشانی۔
غالب کا کہنا یہ ہے کہ میں اپنے عالمِ خیال میں خود سے بھی بیگانہ ہوں اور تمھارے پاس اپنی یاد نہیں
ول ہی کو بطور نشانی چھوڑ آیا ہوں۔ جو خود کو بھولا ہو اس کی نشانی بھول ہی ہو سکتی ہے۔ مراد یہ کہ جب اپنا ہی
ش نہیں تو کسی کے یاد کرنے سے کیا دلچسپی یا نہ کرنے سے کیا احساسِ محرومی ہو سکتا ہے۔ لطیف نکتہ یہ کہ
ل کو نشانی کہا ہے جو یاد دلانے کے لیے ہوتی ہے۔ اسی طرح ذیل کے شعر میں ؎

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

افل" کہہ کر بھولنے والے ہی کو مخاطب کیا ہے۔ کچھ تنبیہہ کا لہجہ نہیں جیسے کہ او غافل موت کو نہ بھول یا ظر
میر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں"۔ عام تصور میں دو ہی عالم ہیں، عدم اور وجود۔ غالب نے اپنے لیے ایک
ر عالم ایجاد کیا ہے جو عدم سے بھی پرے ہے، جیسے کہ اپنے لیے عرش سے بھی پرے ایک اور مقام کی تلاش
کی۔ یہ ندرت اور بلندیِ تخیّل اِلٰہی سے مخصوص ہے۔

مکتبہ پیامِ تعلیم کی دلچسپ اور سائنسی کتابیں
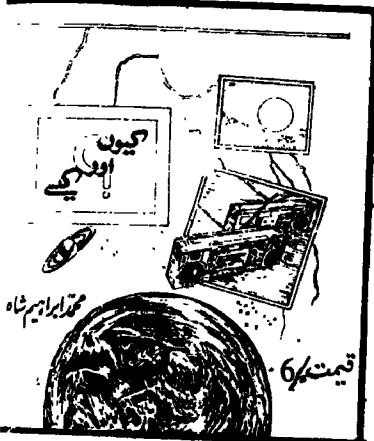
ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی
شعبۂ اُردو، پنجاب یونی ورسٹی اورینٹل کالج، لاہور-۱

مطالعۂ خطبات

اقبالیات کا ایک نیا رجحان

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"خطبات (یا تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ) حضرتِ علامہ کا فکری شاہکار ہے۔ یہ کتاب جتنی مقبول ہے، اتنی ہی مشکل اور دقیق بھی ہے۔ اس کتاب کی مشکلات کئی طرح کی ہیں: اوّل یہ کہ اس کی زبان حکیمانہ ہے، جو اس لیے ناگزیر تھی کہ حضرتِ علامہ نے جو مطالب اپنے خطبات میں پیش کیے ہیں وہ قدیم و جدید حکمت سے متعلق ہیں۔ لہٰذا قدرتی طور سے ان میں قدیم و جدید مصطلحاتِ علمی کے علاوہ، قدیم و جدید نظریات و تصورات سے متعلق اصطلاحیں اس کثرت سے موجود ہیں کہ خاص اہلِ علم کے سوا بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہیں۔ قدیم حکمت کی اصطلاحات و مطالب تو جدید دور کے قارئین میں سے، معدودے چند افراد کی دسترس میں ہیں، لیکن جدید حکمت کے الفاظ و اشارے بھی صرف صاحبِ اختصاص فلسفیوں کے بس کی بات ہے۔ ہر کوئی ان پر قادر نہیں۔

"ان لیکچروں میں مذہب، فلسفہ اور سائنس تینوں ہی کبھی ایک دوسرے کے مقابل، کبھی ایک دوسرے کے متوازی، اور کبھی ایک امتزاجی رنگ میں، ہمارے زبانِ بیان کا ایک ایسا اسلوب رکھ رہے ہیں، جس سے صحیح فائدہ اُٹھانے کے لیے، اور جس کی اندرونی تہوں اور گرہوں کو کھولنے کے لیے بااستعداد اور ذی علم قارئین کی ضرورت ہے۔

"اور چونکہ اس خاص منطقے میں بااستعداد اور ذی علم قارئین قدرتی طور سے کچھ زیادہ نہیں، اس لیے عام افہام کے لیے ان خطبات کو اطمینان بخش شرحوں اور قطعی و صحیح حواشی کے بغیر زیرِ مطالعہ نہیں لایا جاسکتا۔"

اقتباس کی ابتدائی سطور میں سید صاحب نے خطباتِ اقبال کی جس مقبولیت کا ذکر کیا ہے، وہ محلِ نظر ہے۔

اقبال کے شعری مجموعوں کی بیسیوں اشاعتوں کے مقابلے میں خطبات کے چھپنے کی نوبت نو دس مرتبہ ہی آ ہے۔ اور اُس کے ترجمے کی ایک ہی کوشش کامیاب ہوسکی، اور وہ بھی اب تک صرف دو بار زیورِ طبع آراستہ ہوسکا۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔

مندرجہ بالا طویل اقتباس کا مقصد تفہیمِ خطبات میں درپیش مشکلات و مسائل کی طرف توجہ مبذ کرانا ہے۔ جب ڈاکٹر سیّد عبداللہ جیسا عالم نقاد اور اقبال شناس، مطالعۂ اقبال کی مشکلات اور دقتو کا اعتراف کرے، تو گویا مشکلات فی الواقع موجود ہیں۔ یہی سبب ہے کہ خطبات کی اشاعت کے تقریباً نصف صدی بعد تک ان کے سنجیدہ مطالعے اور تفہیم کی جانب کوئی خاص اعتنا نظر نہیں آتا۔ نذیر نیازی کے تر (تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۸ء) اور محمد شریف بقا کی ترجمہ نما تشریح (خطباتِ اقبال پر ایک لاہور، سن ن) سلسلۂ تفہیمِ خطبات کی ابتدائی کوششیں تھیں۔ مگر ترجمے اور تشریح سے آگے بڑھ کر، جیسا کہ ڈ سیّد عبداللہ نے متذکرہ بالا اقتباس میں متوجہ کیا ہے، خطبات کی اطمینان بخش شرحوں اور تعلیقی حواشی اُن کے تجزیے اور تنقید کی ضرورت تھی۔ ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی کے موقع پر اس ضرورت کا احساس اُ سامنے آیا اور اسی کے نتیجے میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے ایک قابلِ قدر کتاب "متعلقاتِ خطباتِ اقبال" مرتب مگر اقبال صدی کے بعد کئی برسوں تک مطالعۂ خطبات کے سلسلے میں کوئی سنجیدہ کاوش سامنے نہیں آسکی۔

گزشتہ پانچ، سات برسوں میں خطباتِ اقبال کے مطالعے اور انھیں سمجھنے اور فکرِ اقبال میں اُن کی اہم کا تعین کرنے کا رجحان نمایاں ہوا ہے — اور سال بہ سال اقبالیات کا یہ نیا رجحان بڑھ رہا ہے۔ دلچسپ بات یہ حالیہ برسوں میں اس رجحان کا آغاز بھارت سے ہوا۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ سری نگر نے اس موضوع پر مولانا سعید اکبر آبادی کے توسیعی لیکچروں کا اہتمام کیا ہے۔ یہ لیکچر اب کتابی صورت میں بھارت کے علاوہ پاکستان سے بھی ہوچکے ہیں (اقبال اکادمی، پاکستان لاہور، ۱۹۸۷ء) مولانا سعید اکبر آبادی نے خطبات کی تشریح و توضیح کی ہے اُن کا تجزیاتی مطالعہ بھی۔ انھوں نے خطبات کے مجموعی جائزے کے علاوہ اُس کے اہم موضوعات (تصورِ باری وحدت الوجود، نماز باجماعت، حیات بعد الموت، حشر و نشر اور جبر و قدر وغیرہ) پر الگ الگ بحث بھی کی ہے۔ اُ خیال میں علامہ کی کئی بحثیں تشنہ اور بعض آرا محلِّ نظر ہیں۔ مولانا سعید احمد نے خطبات کے بعض کمزور پہلو تاویل کی ہے اور بعض معاملات میں علامہ کی فروگذاشتوں کا اعتراف کیا ہے۔ تاہم اُن کے خیال میں اس کی عظمت و اہمیت کم نہیں ہوتی۔

خطباتِ اقبال کی تفہیم و تشریح کی ایک اور کوشش پروفیسر محمد عثمان نے کی: (فکرِ اسلامی کی تشکیل نو ۱۹۸۵ء) انھوں نے ہر خطبے کی علاحدہ علاحدہ شرح کی ہے۔ کہیں کہیں وہ تبصرے اور تجزیے کا انداز اختیار سعید احمد اکبر آبادی کے برعکس وہ علامہ کی کلی تائید و تحسین کرتے ہیں۔ انھوں نے کسی مسئلے پر اقبال کے خیال اختلاف کیا ہے اور نہ کوئی اعتراض۔ بہرحال خوب صورت اور دل نشین اسلوب اور عام فہم انداز میں

لاصہ نما تشریح ایک کارآمد اور قابلِ قدر کوشش ہے۔ اسی برس ڈاکٹر خالد مسعود کی تصنیف "اقبال کا تصوّرِ اجتہاد"
(راولپنڈی) اس میں اگرچہ پورے خطبات اور اقبال کے مجموعی افکار زیرِ بحث آئے ہیں، تاہم اصل موضوع وسیع
ی پس منظر میں چھٹے خطبے (اجتہاد فی الاسلام) کا مطالعہ ہے۔ یہ کوشش خطباتِ اقبال کے تفصیلی مطالعے
ورت کو جزوی طور پر پورا کرتی ہے۔

"تسہیلِ خطباتِ اقبال" کے عنوان سے ایک کوشش علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کے شعبۂ اقبالیات
کی ہے۔ سات اہلِ قلم نے سات خطبوں کو نہایت آسان زبان میں پیش کیا ہے۔ ان میں بعض
فلسفے کے استاد ہیں۔ اس لیے ان کا فلسفیانہ انداز خطبات کو سمجھنے میں قدرے مشکل پیدا کرتا ہے۔
خیال میں خطبات کو سمجھنے میں علامہ کی شاعری اور اُن کے مکاتیب بہت مفید و معاون ہو سکتے
ڈاکٹر ابصار احمد، ڈاکٹر محمد ریاض اور پروفیسر رحیم بخش شاہین کے ہاں ایک حد تک شاعری سے مدد لینے
شش نظر آتی ہے۔

خطبات کو سمجھنے کی کوششیں بھارت میں بھی جاری ہیں۔ اس سلسلے میں شعبۂ فلسفہ، جامعہ عثمانیہ کے
استاذ پروفیسر وحید الدین کی دو کتابیں چھپی ہیں۔ پہلی کتاب "فلسفۂ اقبال، خطبات کی روشنی میں" (دہلی، ۱۹۸۰ء
پاکستان میں بھی شائع ہو چکی ہے) سینیئر طلبہ اور ریسرچ اسکالرز کی ضروریات کے مدِّنظر لکھی گئی ہے۔
دین صاحب نے خطبات کی تلخیص کی ہے، اور اُن کا فلسفیانہ پس منظر اُجاگر کرنے کے لیے انھوں نے
فلسفیانہ روایت"، "عہدِ وسطیٰ کا مسلم مفکر: ابن خلدون" اور "عہدِ جدید کے فلسفی" کے عنوانات کے تحت
اہم مشرقی اور مغربی مفکروں اور فلسفیوں اور اُن کے افکار کا اجمالی تعارف کرایا ہے۔ اس کتاب کے آخر
حید الدین صاحب نے اقبال کے فلسفیانہ فکر پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ وہ کہیں کہیں اقبال سے
کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک "اقبال عالمی فلسفے کی کوئی تاریخ ساز شخصیت تو نہیں کہے جا سکتے، مگر وہ
کے فلسفیانہ فکر کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک مفکرِ اسلام، اقبال نے اسلامی فکر اور جدید فکر کے پس منظر
زانی فکر کے طریقۂ اظہار کو اپناتے ہوئے اسلامی الٰہیات کا، جو تصور پیش کیا، اس کی کہیں نظیر نہیں ملتی
کی دوسری کتاب، اقبال انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر، سری نگر یونی ورسٹی میں کی گئی تین تقریروں پر مشتمل
رِ اقبال"، سری نگر، ۱۹۸۰ء)۔ ان تقریروں پروفیسر موصوف نے خطباتِ اقبال کے بعض مباحث پر کلام
ان کا خیال ہے کہ اقبال کے پہلے چار خطبوں کے الٰہیاتی مسائل (زمان و مکان، وجودِ باری، بقاے
رہ) ایسے ہیں جن میں قطعیت کبھی نہیں آ سکتی۔ اس لیے ان خطبوں میں علامہ سے اختلاف کی
موجود ہے اور اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہاں انھوں نے کوئی "انقلابی قدم" اٹھایا ہے لیکن
جائز ہے کہ پہلی بار بحیثیت ایک اسلامی مفکر کے، انھوں نے اسلامی فکر کو جھنجھوڑا" اور سوچنے پر مجبور کیے
زبان میں ادا کیا جس کو غیر بھی سمجھ سکیں"۔ وحید الدین صاحب نے کہا کہ آخری دو خطبے ہمارے علما اور

راہنماؤں کی خاص توجہ کے مستحق ہیں۔

خطباتِ اقبال کے موضوع پر پاکستان اسٹڈی سنٹر کراچی کی سہ روزہ مجلس مذاکرہ (۲ر تا ۴ر اپریل
بھی اقبالیات کے اس نئے رجحان کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اقبالیات کی تاریخ میں یہ پہلی بار ہے کہ خاص خطبہ
کے موضوع پر بالاہتمام ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں جسٹس قدیرالدین احمد، پروفیسر کرار حسین، پروفیسر مرزا
ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال، مولانا محمد طاسین، پروفیسر محمد عثمان اور ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے دانش وروں اور عالموں
حصہ لیا۔ اس کی روداد اور مقالات کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ("اقبال فکرِ اسلامی کی تشکیل نو، کراچی،
اسں کتاب کو خطباتِ اقبال کی تفہیم میں ایک پیش رفت قرار دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ بعض بزرگوں کے
سے اختلاف کی ایک صورت پیدا ہوتی ہے، مثلاً پروفیسر محمد عثمان کا خیال ہے کہ علامہ اقبال جمہوریت کی ترقی
صورت (سوشل ڈیموکریسی) کو اپنے تصورات سے زیادہ قریب پاتے تھے، اس لیے آج مسلمان اسے
سوشل ڈیموکریسی کے تعاون سے اپنے مسائل حل کر سکتے ہیں (عثمان صاحب نے سوشل ڈیموکریسی کا ترجمہ
جمہوریت" کیا ہے) اب سوال یہ ہے، کیا اسلام اور سوشل ڈیموکریسی کے تعاون سے کوئی نتیجہ خیز صورت
ہو سکتی ہے؛ پروفیسر عثمان مرحوم ہو چکے۔ اگر وہ روس اور مشرقی یورپ کی "اشتراکی جمہوریتوں" کا انجام اپنی آ
سے دیکھ لیتے تو نہ معلوم، وہ اقبال کے اس (مبینہ) اجتہاد کی تعبیر کس انداز اور کن الفاظ میں کرتے؛ اخ
کی گنجایش بعض دیگر مضامین سے بھی نکلتی ہے، مگر بحیثیتِ مجموعی بیشتر مضامین بہت اچھے، عالمانہ او
سے لیس (WELL DOCUMENTED) ہیں۔ جو دو تین سرسری اور تاثراتی نوعیت کے مضامین ہیں، جی
ہے کہ کاش وہ بھی ایسے ہی ہوتے۔

حال ہی میں مکتبہ جامعہ، دہلی کی شائع کردہ ڈاکٹر عبدالمغنی کی تصنیف "اقبال کا نظریۂ خودی" میں
خطبات کا تفصیلی مطالعہ شامل ہے، جو ایک پوری کتاب کے بہ قدر ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ خطبات
علامہ اقبال نے مشرقی حکمت و تصوف اور مغربی فلسفہ و سائنس کی ساری ترقیات کو سامنے رکھ کر، اور ا
حوالے سے اسلام میں مذہبی فکر کی ایک ایسی نئی تعبیر پیش کی جو اُن کے خیال میں اسلام کا اوّلین،
اور بنیادی تصورِ دین ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خطبات میں اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں
اجتہاد و اعتماد کے ساتھ حکمائے مشرق اور فلاسفۂ مغرب کے قدیم و جدید نظریاتِ خرد کو قرآن کے اصو
کی کسوٹی پر پرکھ کر، فکرِ انسانی کے مسلسل ارتقا کا سراغ لگایا ہے اور اس طرح ایک ایسا مربوط نظا
ترتیب دیا ہے، جو جامع، وسیع، عمیق اور نتیجہ خیز ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی صاحب نے ہر خطبے کی علاحد
توضیح اور تعبیر کی ہے اور آخر میں کہا ہے کہ اگرچہ اقبال کے یہ فلسفیانہ خیالات قرآن پر مبنی ہیں، مگر ان کا
عصرِ حاضر کی ان اصطلاحات و محاورات میں ہوا ہے، جو جدید ترین علوم و فنون کے مباحث میں مروج
اُن کے خیال میں اقبال کی ان فلسفیانہ تحریروں کی حیثیت ان کے افکار کے ماخذ کی ہے اور یہ ماخذ

ان خیالات کے حوالوں کا مرکز ہیں۔ چنانچہ اُردو اور فارسی کلام میں اقبال نے خودی کے موضوع پر جو کچھ کہا ہے
اُن کے مذکورہ خطبات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ مطالعۂ خطبات کے سلسلے میں حالیہ برسوں میں بعض مضامین بھی چھپے ہیں جو
توجہ ہیں، مثلاً:

۱۔ علم اور وارداتِ روحانی پر اقبال کا خطبہ: مختار صدیقی۔ "ماہِ نو"۔ لاہور۔ اپریل ۱۹۸۴ء

۲۔ IQBALS ANALYSIS OF MUSLIM CULTURE : A CRITICAL STUDY: شہزاد قیصر:
"اقبال ریویو" لاہور۔ اکتوبر ۱۹۸۴ء

۳۔ اسلامی ثقافت کی روح: رحیم بخش شاہین۔ "اقبالیات" لاہور۔ جنوری ۱۹۸۷ء

۴۔ خطباتِ اقبال: چند بنیادی سوالات: محمد سہیل عمر۔ "اقبالیات" لاہور۔ جولائی ۱۹۸۷ء

۵۔ اسلامی ثقافت کی روح: سعادت سعید۔ "کریسنٹ" لاہور۔ ۱۹۸۷ء

۶۔ اقبال کا تصورِ جنت و دوزخ: محمد رفیق چودھری۔ ترجمان القرآن" لاہور۔ نومبر ۱۹۸۸ء

۷۔ سائنس اور اقبال، مظفر حسین۔ "اقبال" لاہور۔ اپریل ۱۹۸۹ء

۸۔ تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ: اسلامی افکار کے تناظر میں، پروفیسر اکرم انصاری۔ مشمولہ "اقبال
عہد آفریں"، ملتان، ص ۱۲۸ تا ۱۴۴

۹۔ اقبال کی شاعری کا ایک بنیادی گوشہ: شمیم اسعد۔ "برگِ گل" اقبال نمبر، سمندری

مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں حالیہ برسوں میں شائع ہونے والی کتابوں اور مضامین کا یہ ایک مختصر اور
سرسری جائزہ ہے، مگر یہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک خطبات کے اُس اڈیشن کا ذکر نہ کیا جائے جسے
[illegible] محمد سعید شیخ (سابق استاذ فلسفہ، گورنمنٹ کالج، لاہور) نے کئی برسوں کی تحقیق اور محنت شاقہ کے بعد تیار کیا
(ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۵ء) پروفیسر موصوف نے THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS
THOUGHT IN ISLAM کے ۱۹۳۴ء کے لندن اڈیشن (علامہ نے اپنی زندگی میں شائع ہونے والے اس
[آخ]ری اڈیشن میں بعض ترامیم اور تبدیلیاں کی تھیں۔ تفصیل دیکھیے: تصانیفِ اقبال کا تحقیقی اور توضیحی مطالعہ: ڈاکٹر
[ر]فیع الدین ہاشمی، ص ۳۰۲ تا ۳۱۳) کی بنیاد پر خطبات کا معیاری متن تیار کیا ہے، جس میں اہتمام رموزِ اوقاف
[کے] علاوہ اسماء واعلام، انگریزی اقتباسات اور اشعار صحیح صورت میں درج کیے گئے ہیں۔ مرتب نے بتایا ہے کہ علامہ
[نے] خطبات میں ۱۳۳ مغربی مصنفین کے حوالے دیے ہیں، جن میں سے ۲۸ اُن کے معاصرین ہیں۔ مرتب کا حاصلِ تحقیق
آخری [۱۰۰] سے صفحات ہیں۔ خطبات کے متن پر ان کے تحریر کردہ تعلیقات اور حوالے ۷۰ صفحات پر محیط ہیں۔ یہ [تعلیقات] [ش]رح
[طل]ب ہیں۔ علامہ نے بعض مشرقی اور مغربی مصنفین یا ان کی کتابوں کا نام لیے بغیر اُن کے اقتباسات خطبات میں شامل

کیے ہیں، مرتّب نے ایسے حوالوں کا کھوج لگا کر اُن کی مکمل نشان دہی کی ہے۔ علامہ کے بعض حوالوں کی تصحیح بھی کی گئی ہے، جیسے: خطبۂ دوم میں برٹرنڈ رسل کا ایک بیان درج ہے۔ پروفیسر شیخ سعید صاحب نے وضاحت کی ہے کہ یہ رسل کا نہیں، کار کا بیان ہے ــــ علامہ نے خطبات میں عربی، فارسی، جرمن اور ترکی کتابوں کے (ترجمہ شدہ) انگریزی اقتباسات دیے ہیں۔ فاضل مرتّب نے اصل عربی، جرمن، فارسی اور ترکی متون تلاش کر کے حواشی میں درج کیے ہیں ــــ فاضل مرتّب نے کسی خاص نکتے یا مسئلہ پر علامہ کی بحث کے علاوہ دیگر علما کے مباحث کی طرف بھی اشارے کیے ہیں اور حوالے دیے ہیں۔ مرتّب کی تحقیق کے بہت سے پہلو قابلِ ذکر ہیں لیکن یہاں ان کا تفصیلی ذکر ممکن نہیں ہے ــــ مختصر یہ کہ اُن کی محنت و جانکاہی کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے ــــ متنِ اقبال کی تحقیق تدوین کے سلسلے میں یہ ایک معیاری، مثالی اور درجۂ اوّل کا کام ہے ــــ اور اقبالیات کی تاریخ میں ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی بنا پر پروفیسر سعید شیخ کا نام ہمیشہ احترام سے لیا جاتا رہے گا۔

مطالعۂ خطباتِ اقبال کے زیرِ بحث رجحان کو اگر کتابوں اور مضامین کے اس تعارف تک ہی محدود رکھا جائے تو غالباً بات ادھوری رہے گی ــــ چنانچہ اِس ضمن میں بعض ایسے پہلوؤں کا ذکر ضروری ہے، جن سے خطبات پر کام کرنے والے مختلف اصحاب کے زاویہ ہائے نظر کا اندازہ ہوتا ہے ــــ ایک احساس تو سب حضرات کے ہاں مشترک ہے کہ مطالعۂ اقبال کی طرف اب تک کما حقہٗ توجہ نہیں دی جا سکی اور اب اس کا زیادہ تفصیل کے ساتھ اور گہرائی میں اتر کر مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے ــــ پروفیسر اسلم انصاری نے تو خطبات کو علامہ کی ایک نا دریافت شدہ (UN-DISCOVERED) تصنیف قرار دیا ہے۔

خطباتِ اقبال کی معنویت اور فکرِ اقبال میں ان کی حیثیت کے بارے میں ہمارے اسکالر مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں:

۱۔ کچھ حضرات شاعری کے مقابلے میں خطبات کو زیادہ اہم اور اوّلین حیثیت دیتے ہیں، جیسے:

"فکرِ اقبال جس طرح اُن کے خطبات میں روشن ہے، اس طرح اُن کی شاعری میں نہیں۔"

(پروفیسر آلِ احمد سرور، دیباچہ "فکرِ اقبال"، ص ۵)

"کچھ عجب نہیں کہ آیندہ چل کر یہی کارنامہ اقبال کا عظیم ترین کارنامہ تسلیم کیا جائے۔"

پروفیسر محمد عثمان، "فکرِ اسلامی کی تشکیلِ نو"، ص ۱۹)

"فکرِ اقبال کی تلاش میں بھی اب تک اُن کی شاعری ہی پر زیادہ توجہ ہوئی ہے، حالانکہ اقبال کی اصل فکر مربوط طور پر اُن کے خطبات میں ملتی ہے۔"

ضیاء الحسن فاروقی، ابتدائیہ: "فلسفۂ اقبال خطبات کی روشنی میں")

علامہ کی شاعری میں بیان کردہ افکار کو، علامہ کے "وسیع مطالعہ، گہری فکر، منظم، منضبط اور مربوط تعلیمات پر مبنی" اس "کلیدِ اقبال" (خطبات) کی رہنمائی اور روشنی میں سمجھا جائے، جو اُن کے مستقل اور پائیدار کا مجموعہ ہے۔"

(ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ، "نوائے وقت" لاہور ۲۴ اگست ۱۹۸۱ء)

پاکستان اسٹڈی سنٹر جامعہ کراچی کے مقالاتِ مذاکرہ میں بھی خطبات کو اقبال کی شاعری سے اہم تر قرار دینے کا رجحان جھلکتا ہے۔

۲۔ ایک گروہ نے علامہ کے بعض بیانات کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے انھیں غلط قرار دیا ہے مثلاً اُن کے خیال میں جنت و دوزخ کے بارے میں اقبال کے تصورات قرآنی آیات اور اُس کے نصوص کے صریحاً خلاف ہیں۔ چند برس پہلے مکہ مکرمہ سے شائع ہونے والے ڈاکٹریٹ کے ایک مقالے میں یہی رائے ظاہر کی گئی ہے، جو ایک طرح سے بہت سے عرب علما کی نمائندگی کرتی ہے۔ مولانا سید احمد اکبر آبادی نے اس ضمن میں مصری مصنف ڈاکٹر البہی کے اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے بعض معاملات میں علامہ کی فروگذاشتوں کا اعتراف کیا ہے، اور خطبات کے بعض کمزور پہلوؤں کی تاویل بھی کی ہے۔

۳۔ کچھ لوگوں کے خیال میں خطبات میں علامہ کے نتائجِ فکر حتمی نہیں ہیں۔ وہ محض اُن سوالات اور فکری مسائل کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں، جو اُس وقت علامہ کو پیش تھے۔ محمد سہیل عمر کا خیال ہے کہ خطبات کی تحریر کے وقت جو مسائل سامنے آرہے تھے خطبات میں اُن کے جوابات قیاسی تھے، اور شاعری کی طرح اقبال کے خطبات میں بھی "نئے شوالے" موجود ہیں۔ علامہ کے تصورِ اجتہاد کے سلسلے میں پروفیسر محمد منور کا خیال ہے کہ اُن کے خیالات مسلسل ارتقا پذیر رہے ہیں لہٰذا یہ کیوں فرض کر لیا جائے کہ ۱۹۲۸ء، ۱۹۲۹ء میں انھوں نے جو کچھ کہا اور اُن کی سوچ کا جو رُخ وفات سے آٹھ نو برس پہلے اُن کے خطبات میں نظر آتا ہے، وہ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۸ء تک کے عرصے میں جوں کا توں برقرار رہا؟ — (اگرچہ پروفیسر عبد المغنی کے خیال میں علامہ اقبال نے اپنے خطبات میں جو کچھ کہا وہ ان کی پختہ عمر کے نتائجِ فکر ہیں۔ اقبال کا نظریۂ خودی: ص ۲۲۶)

۴۔ پروفیسر اسلم انصاری کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان خطبات نے احیائے اسلام کی جدید تحریکوں میں استحکام پیدا کیا اور اُن پر قابلِ لحاظ اثرات مرتب کیے (اقبال عہد آفریں: ص ۱۳۲) مگر راقم کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔

خطبات کے سلسلے میں مندرجہ بالا آرا مختلف اور متضاد نقطہ ہائے نظر کی ترجمان ہیں۔ ہم نے اُن کی طرف سرسری اشارے کیے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مطالعۂ خطبات کے مختلف رجحانات کا جامع اور مفصل مطالعہ و تجزیہ کیا جائے۔ ہمارا خیال ہے زیادہ متوازن رویّہ یہ ہوگا کہ خطبات کو علامہ کے فکری سفر کی ایک منزل سمجھا جائے کیوں کہ یہ وفات سے آٹھ برس پہلے مرتب کیے گئے تھے، مطالعۂ اقبال میں بلاشبہ خطبات کی بہت

اہمیت ہے اور انھیں نظر انداز کرنا غلط ہے مگر یہ سمجھنا بھی صحیح نہیں کہ اقبال کا فکر تمام و کمال، خطبات ہی پر منحصر اور محیط ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ سید سلیمان ندوی، ابوالحسن علی ندوی اور ابوالاعلیٰ مودودی جیسے روشن خیال اور جدید علما بھی، جو اقبال کے پُرجوش مدّاح تھے، خطبات کے بارے میں کچھ تاملات و تحفظات (HESITATIONS AND RESERVATIONS) رکھتے تھے؟

بحیثیت مجموعی مطالعۂ خطباتِ اقبال کا روز افزوں رجحان خوش آیند ہے۔ مزید باعثِ مسرت یہ ہے کہ پاکستان کے علاوہ بھارت اور بیرونی دنیا میں بھی اس سے اعتنا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ہسپانوی زبان میں اس کا ترجمہ شائع ہوا ہے، حالانکہ ہسپانوی میں اقبال کے کسی شعری مجموعے کا ترجمہ تا حال نہیں کیا جا سکا ہے ـــ یہ بات تو اقبالیات کے بیشتر قارئین کے علم میں ہوگی کہ اب تک خطبات کے ترجمے اُردو، پنجابی، پشتو، سندھی، بنگالی، انڈونیشی، فارسی، عربی اور فرانسیسی زبانوں میں ہو چکے ہیں ـــ نذیر نیازی مرحوم کے علاوہ اُردو میں اِکا دُکا خطبوں کے ترجمے کئی حضرات نے کیے ہیں۔ اب خطبات کا ایک اور ترجمہ جناب شہزاد احمد نے کیا ہے، جو اِن دنوں زیرِ اشاعت ہے۔

●

مارت وتبصرہ: انیس الرحمٰن
بۂ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

امریکی شاعری

کارل سینڈبرگ: دو نظمیں

۱۸۷۸ء - ۱۹۶۷ء

کارل سینڈبرگ (CARL SANDBURG) کا ذکر آتے ہی بزرگ امریکی شاعر والٹ وہٹمین (WALT WHITMAN) کی یاد آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سینڈبرگ بھی وہٹمین کی طرح شاعری کو عوام سے رشتہ قائم انے کا ایک وسیلہ جانتا تھا۔ شاعری میں عوامی زبان کے استعمال، غیر شاعرانہ موضوعات کے انتخاب اور آزاد ثری اظہار کے تجربات نے اسے ایک عرصے تک متنازعہ بنائے رکھا اور جب نئی تنقید نے ان تجربات کو کسی قدر ذلیت بخشی تو یہی اس کی شناخت کا ذریعہ بن گئے۔

سینڈبرگ ILLINOIS میں پیدا ہوا۔ تیرہ برس کی عمر میں ہی اُسے اسکول چھوڑنا پڑا۔ پھر زندگی بھرہ سادہ حالات کا شکار رہا۔ اُس نے گھروں میں رنگ و روغن کے کام کیے، سامان برداری قلی کے کام انجام دیئے، دودھ والوں کے ساتھ رہا، برتن دھوئے، اینٹ سازی کی، سیلزمین رہا اور اخبارات میں نامہ نگار کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ یہ سارے تجربے اس کی شعری توانائی کا وسیلہ بن گئے۔

سینڈبرگ کا پہلا شعری مجموعہ CHICAGO POEMS ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا۔ پھر دوسرے مجموعے
'CORNHUSKERS (1918) SLABS OF SUNBURNT WEST (1922) SMOKE AND STEEL (1920)
THE PEOPLE YES (1936) شائع ہوئے۔

اس نے ابراہم لنکن کی معرکۃ الآرا سوانح THE PRAIRIE اور THE WAR YEARS (1926-39) YEA چھ جلدوں میں مکمل کیں اور اس کارنامے کے لیے ۱۹۴۰ء میں PLUTIZER انعام ملا۔

اپنے مشہور قومی رہنما ابراہم لنکن اور اپنے ملک اور قوم سے اسے بے پناہ محبت تھی۔ اُسے اُن کی توانائی اور تابناک تقبل میں یقین تھا جس کا اظہار اس کی شاعری میں بار بار ہوتا ہے۔

بندرگاہ

بدنما، بے ترتیب دیواروں سے گزرتے ہوئے،
ان دروازوں سے گزرتے ہوئے جہاں عورتیں
بھوکی گہری نظروں سے تک رہی تھیں
جہاں بھوکے ہاتھوں کے کالے سائے
بدنما اور بے ترتیب دیواروں سے جھانک رہے تھے،
میرا پیچھا کر رہے تھے،
میں ان سب سے گزرتے ہوئے،
یکایک، شہر کے اِس کنارے نکل آیا ہوں
جہاں نیلی، شفّاف جھیل جھک جھک کر رہی ہے
جھیل کی لہریں آفتاب کے سائے میں بل کھا رہی ہیں،
جھاگ سے ڈھکے ہوئے ساحل پر
زیروزبر ہو رہی ہیں
جہاں آزاد پرندوں کے غول پھڑپھڑاتے ہوئے اُمڈ آئے ہیں
اپنے خوبصورت پروں کے شامیانے پھیلائے ہوئے،
اپنی سفید چھاتیاں کھولے ہوئے،
آسمان کی وسعتوں میں
ناچتے، جھومتے پھر رہے ہیں۔

۱۹۱۶ء

میں عوام النّاس — میں انبوہ

میں عوام النّاس ہوں — اَنبوہ ہوں — ازدحام ہوں — جمِ غفیر ہوں۔
کیا تم جانتے ہو کہ دنیا کے سارے بڑے کام میرے وسیلے سے ہوتے ہیں؟
میں مزدور ہوں، موجد ہوں، دنیا کی ساری غذائیں پیدا کرنے والا اور سارے کپڑے بنانے والا ہوں۔

، تاریخ کا گواہ ہوں کہ میں نے سب دیکھا ہے۔ مجھ سے سارے نپولین پیدا ہوئے ہیں اور مجھ ہی سے سارے لنکن
وہ سب کے سب فنا ہو جاتے ہیں۔ پھر میں دوسرے نپولین اور دوسرے لنکن پیدا کرتا ہوں۔
، بیج والی زمین ہوں، گھاس سے بھرا وہ خطّہ ہوں جو زیادہ ہل چلنے سے زندہ ہوتی ہے۔ مجھ پر خوفناک آندھیاں چلتی
ہیں۔ لیکن میں سب بھول جاتا ہوں۔ میرا سب سے قیمتی سرمایہ میرے اندر سے چوس لیا جاتا ہے، خارج کر دیا جاتا
ہے ـــــ لیکن میں سب بھول جاتا ہوں۔ موت، صرف موت میرے پاس آتی ہے اور مجھے محنت کشی پر آمادہ
کرتی ہے، جو کچھ میرے پاس ہے، سب نچھاور کر دینے پر راضی کرتی ہے۔ اور میں سب بھول جاتا ہوں۔
، کبھی غراتا ہوں ـــــ کبھی غصّے میں کانپتا ہوں، اور زمین پر سُرخ بوندیں چھڑک جاتا ہوں کہ تاریخ یاد رکھے۔ پھر میں
سب کچھ بھول جاتا ہوں۔
ر میں، کہ عوام النّاس ہوں، یہ یاد رکھنا سیکھوں؛ اگر میں، کہ عوام النّاس ہوں، گزرے ہوئے کل سے سبق لوں اور
ان پر عمل کروں اور یہ نہ بھولوں کہ پچھلے برس مجھے کس نے لوٹا تھا، کس نے مجھے بے وقوف بنایا تھا ـــــ تو یہ
لفظ "عوام النّاس" زبان پر لانے والا بھی ساری دنیا میں کوئی نہ ہوگا اور اس کی آواز میں استہزا کا کوئی شائبہ
یا تضحیک کا کوئی سُراغ بھی نہ ہوگا۔
بھر وہ انبوہ، وہ اژدحام، وہ جمّ غفیر یہاں آن دھمکے گا۔

سنہ ۱۹۱۶ء

چند اہم کتابیں

انوکھی مسکراہٹ (افسانے) سید محمد حسن -/۶
آگ الاؤ صحرا " قمر احسن -/۲۵
اسی دیوار کے سائے میں (منظوم ڈرامے) رفعت سروش -/۲۵
الف سے قطب مینار (طنزیہ مزاحیہ مضامین) ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی -/۱۰
الف لام میم (افسانے) کلام حیدری -/۳۰
انسان اور شیطان (ناول) محمد فراز -/۴۰
ارتقاد سریز ادب (افسانے) نگراں کلام حیدری -/۱۶
الیکشن ری پلے (ڈرامے) اسلم واحدی -/۲۵
آخری سلام (افسانے) شکیلہ اختر -/۳۰
اندھیری گلی میں صبح " فیروز عابد -/۱۶
اردو کے مختصر افسانے " ڈاکٹر حسن آرزو -/۵
آخری دن (ڈرامے) ویریندر پٹواری -/۳۵
آتش سنگ (افسانے) ابراہیم اختر -/۲۰
انتخاب افسانہ ۸۹ " رئیس امروہوی -/۶۰
آدھے ادھورے " خورشید عالم -/۱۵
آوارہ بگولے " فاطمہ حسن -/۵
آنگن آنگن " ظفر حبیب -/۱۲
الیوژن " ملراج ورما -/۲۵
النور ناول فیاض علی ایڈوکیٹ -/۸
آس کا جگنو " انیس مرزا -/۲۲
انیسہ " فیاض نیازی -/۱۵
اردو کے تیرہ افسانے (افسانے) اطہر پرویز -/۳۰
ان داتا " کرشن چندر -/۲۰
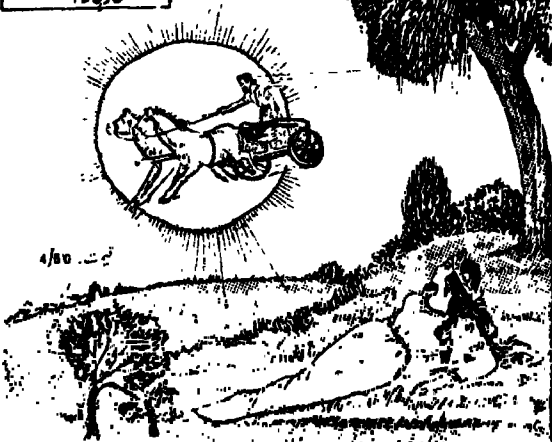
افسانے (افسانے) مغربی بنگال اردو اکیڈمی -/۱
آدمی اور سکّے (ناول) زلیخا حسین -/۲۹
آوازوں کی صلیب (افسانے) کوثر چاندپوری -/۱۲
انمول رتن (کہانیاں) وید راج ٹھوٹلیچہ -/۲۵
ایک ندی دو پاٹ (ناول) گلشن نندہ -/۱۵
امر کرن (ناول) شنکر سروپ بھٹناگر -/۱۲
اہل قلم کی شوخیاں عطش درانی -/۳۰
ادیب (ناول) شانتی نارائن -/۲۰
ابھرتی ڈوبتی لہریں (افسانے) عشرت ظہیر -/۱۰
ایک کعبہ اور سہی (ناول) یاسمین صوفی -/۳۰
آبلے (کہانیاں) احمد ندیم قاسمی -/۴
اندھیروں کے سفیر (ناول) مظہر الحق علوی -/۴۴
انارکلی (ڈراما) امتیاز علی تاج -/۱۰
ایک لڑکی سپنوں کی (افسانے) م۔م راجیندر -/۴۸
اور تلوار ٹوٹ گئی (ناول) نسیم حجازی -/۳۰
آخری رات (ناول) سلمان زیدی -/۶
اسیر حرص " آغا حشر کاشمیری -/۱۲
ابھی سویرا ہے " ارشاد امروہوی -/۳۲
آدھا انسان " " ۶/۲۵
انوکھی الفت (ڈراما) عبدالقادر سوداگر -/۲
آزادی (ناول) قاضی مشتاق احمد -/۳۰
آوارہ گرد کی ڈائری (سفرنامہ) ابن انشا -/۱۵
آگ کی گاڑی (ڈراما) تاجور سامری -/۱۵
اڑتے لمحے (افسانے) ستیش بترا -/۲۵
اللہ میاں جی (ناول) بشریٰ رحمٰن -/۳۰
اگن برہا تی " عفت موہانی -/۴۲
ایک ہی ڈگر " زلیخا حسین -/۰
ارمانوں کا خون " مسرور جہاں -/۲
انیس لبیس (افسانے) ڈاکٹر حبیب ضیاء -/[illegible]

ن بھوپالی
۵/۱۰۲ اے، نظام آباد، کراچی ۷۴۶۰۰

غزل

موت مشکل ہے، جینا دوبھر ہے
سانس ہے یا شکستہ خنجر ہے

صرف احساس کا ہے کھیل یہاں
علم بھی جہل کے برابر ہے

کیا خبر لَو بجھانے والے کو
روشنی تو دِیے کے اندر ہے

میری کمزوریوں سے ہے واقف
میرا بدخواہ مجھ سے بہتر ہے!

کیا نظر آئے آئینے کے اُدھر
چشمِ حیرت اسیرِ منظر ہے

تم مری عاجزی سے مِلتے ہو
میرا قد کب مرے برابر ہے

کٹ رہی ہے اِسی آس پر محسن
روشنی صبح کا مقدّر ہے

سید المظفر چغتائی
یمن منزل، بدر باغ، علی گڑھ

مکھیاں

میں کتنی مکھیاں ماروں!
بھنکتی پھرتی ہیں ہر سُو
نہیں دیتا انھیں کھانے کو کچھ
گھر صاف رکھتا ہوں
ہیں دروازے بھی دُہرے
ایک شیشے، ایک جالی کا
مگر جب دیکھو تب مکھی کوئی موجود ہوتی ہے
ذرا سی روشنی پھوٹی کہ مکھی آ گئی چھپ کے

اندھیرے میں دُبک جاتی ہیں
آپس میں بتاتی ہیں
وہ کالے چھتے
جن میں شہد جیسی شے نہیں ہوتی
نہیں ہے ڈنک اِن میں بھڑ کا جیسا
شہد مکھی کا
مگر پیر اور پنکھ ان کے
غلاظت کی امانت ہیں
کروڑوں مکھیاں ماریں
مگر وہ کم نہیں ہوتیں
جنوبی افریقا میں تھک گئے گورے دلندیزی
کئی صدیوں سے کالی مکھیاں تھے مارتے پھرتے
فلسطینی نہیں کالے
مگر ہیں مکھیوں جیسے
جنھیں یورپ نے، امریکا نے، اسرائیل نے مارا
پڑوسی ملک کے عربوں نے بھی ڈالا تو کم چارا
مگر اب وہ بھی بھگتے جا رہے ہیں جارحیت سے

کبھی طفلانِ اسرائیل بھی تھے مکھیوں جیسے
کبھی یورپ کبھی امریکا میں بھنبھناتے تھے
جسے موقع ملے وہ مارتا تھا جھاڑ دیں لے کر
دوا کوئی چھڑک دیتا تھا
کر دیتا تھا ڈی ڈی ٹی
مریں تو مکھیاں لاکھوں
مگر نسل اُن کی باقی ہے

کچھ ایسا لگتا ہے
یہ سرزمیں تو مکھیوں کی ہے
یہاں مچھر، بہائم، مکھیاں، امراض کے کیڑے
پلیں گے اور
عفونت کے سبھی ناسور پھیلائیں گے
انساں اِن سے اِک مدت سے لڑتا ہے
شکستوں پر شکستیں کھاتا ہے
ظلم و ستم کرتا ہے
آفت بن کے چھاتا ہے
قیامت بنتا ہے
آفت میں گھر جاتا ہے
پھر باہر نکل آتا ہے
سب کچھ ہے
مگر اتنا بتا
یہ مکھیاں
ماروں کہ رہنے دوں
ہمیں اور اِن کو
کیا دونوں کو
زندہ ساتھ رہنا ہے؟

ملکہ نسیم
۱۲، فارسٹ کالونی
اہلی۔ بھوپال

...وں کا حساب

...بھی تم نے گذاری ہے
...ہجر کی شام
...تنہا در و دیوار سے
...کی ہیں
...دیواروں پہ لکھا ہے
...نام کبھی
...وں سے کبھی کیا تم نے کر دی ہے میسر
...جو عہد گذشتہ کی تھی آئینوں پہ
...تصویر کوئی
...نے بنائی کہ نہیں
...کے دالانوں میں
...کے کسی گوشے میں
...لی ہوئی خوشبو سے
...ت ہوئی
...ادوں کے پلکوں سے سمیٹے کہ نہیں!
...ن در سے در آتے
...ے ان سے
...گشتہ تمناؤں کے
...ا بھرو
...گذرے ہوئے کل کی
...کے طلسم
...گن میں کبھی
...ت بھی کرو

نسرین آفتاب
اے-۴- رابعہ وارث مین یونیورسٹی روڈ،
کراچی - ۳۲

انتظارِ موسمِ گل
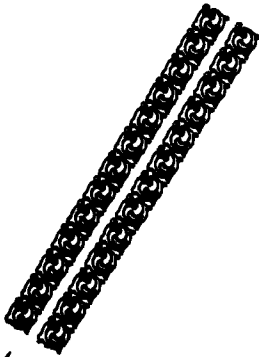
وادیٔ قدس پہ چھایا ہوا افسردہ سکوت
کسی طوفان کے آنے کی علامت جیسے

ہر طرف ڈھیر یہ ملبے کے یہ سونی گلیاں
اور ہر سمت یہ جھلسے ہوئے خیموں کی قطار

بربریت کے نشاں ظلم کی انمٹ تصویر
اور یہ ارضِ فلسطیں کے شہیدوں کا لہو

منتظر ہے کہ کبھی تو کوئی فاروقِ عظیم
روح اور جسم کے ہر زخم کا مرہم بن کے
دل یہ کہتا ہے کہ آئے گا ضرور آئے گا

ہے انھیں ایک نئے عہدِ بہاراں کا یقیں
وہ حسیں عہدِ بہاراں جو بہت دور نہیں

ضمیر کاظمی
۱۳۴/۱۲۹، پائپ روڈ
کرلا (ویسٹ) بمبئی ۷۰

باز پرس

یہ روزانہ سمٹنے کا عمل اچھا نہیں ہوتا!
خود اپنے خول میں جینا
وہ اپنے ہوں کہ بیگانے
ہر اک سے فاصلہ رکھنا
سوالوں کے بھرے آنگن میں خود کو قید تنہائی
کہ پتھریلی زمینوں کے شجر کا کوئی پھل اچھا نہیں ہوتا!
میں تم کو تم سے زیادہ جانتا ہوں
خودی کا فخر ہے تم میں ——— نہ بے جا ناز
انانیت
نہ کوئی برتری کا زعم
تو پھر ہر دن
نئی دیواریں اپنے گرد آخر کیوں اٹھاتے ہو
سمجھتے کیوں نہیں کہ اس طرح
تم خود کو دیواروں میں چنتے ہو
مگر تم کس کی سنتے ہو
مرا اک دوستانہ مشورہ مانو
کہ دیواریں اٹھائی ہیں تو میرے دوست
اک دروازہ رکھنا
زمانے کے ہر اک موسم سے اپنا رابطہ رکھنا
کسی جانب نکلنے کے لیے اک راستہ رکھنا

شفیق عباس
انجمن اسلام ہائی اسکول،
۹۲۔ ڈی۔ این روڈ، بمبئی ۱

میں ہر زمانے میں بکھرا رہا ہوں ہر اک قدر عذاب
کبھی تو شہروں کی ہوں کائنات، کبھی میں جنگل کا غبار

الم نصیب تھی خود پرستی کہ مصلحت سے نباہ کیا
مری متاعِ ہنر تو دیکھو کہ نقد جاں تک ادھار میں

میں نقش پائے ہوا ہوں اڑتا ہوا ملوں گا تمھیں
جو بن پڑے تو تلاش کر لو مجھے کہ اپنے غبار میں

ہوا تلون کی لے اڑی پھر ٹھہرتا کیسے مزاج
نہ دل کے قابو میں آ رہا ہوں، نہ ذہن کے اختیار میں!

شفیق ویسے تو مجھ سا چھوٹا نہ کوئی تم کو کہیں
مقابلہ ہو گیا تو سمجھو بڑے بڑوں کے شمار میں

احمد کمال پروازی
مکان نمبر ۲۸ - بی - ایل نمبر ۲
نیا بازار - کانکی نارہ - ویسٹ بنگال

احمد کمال حشمی
۴/۲۸ - مالوا اسٹریٹ فیکٹری
توپ خانہ روڈ - اجین - ایم - پی

یں اُسکے حکومت صدا آگے نہیں جاتی
کے بالا خانوں سے ہوا آگے نہیں جاتی

کہ اسی درجے پہ تار ٹوٹ جاتا ہے
بات ایسی ہے اَنا آگے نہیں جاتی

ا ہے یہ دہر کتنا چھوٹا خنجر ہے
تا اپنی گردن سے قضا آگے نہیں جاتی

روم بتی لے کے اپنے گھر تک آتا ہوں
روز مرہ سے ہوا آگے نہیں جاتی

جھوٹے سارے خون کے بندھن رشتوں کا پیمانہ سکہ
اماں، ابا، دادی، دادا اور ہے نانی، نانا سکہ

قتل کرو گھر بار جلاؤ، پھر بھی تم نردوش رہوگے
حسبِ روایت دے دینا تم منصف کو نذرانہ سکہ

مفلس تشنہ کام رہے ہیں اہل زر سیراب ہوئے ہیں
ساغر سکہ، مینا سکہ، ساقی اور پیمانہ سکہ

تاریکی میں ہم کو لوٹا اور اجالے میں لے آئے
جھوٹی تسلی، رسمی دلاسے، تھوڑا سا ہرجانہ سکہ

ظفر ہاشمی
۱۰۴/این فائیو۔ روڈ ۳
بی۔ایچ ۔ایریا۔کدما۔ جمشید پور

غزل

زندگی ہر طرف، کارواں ہر طرف، تواسے مان لے تواسے مان لے
روشنی ہر طرف، اور دھواں ہر طرف، تواسے مان لے تواسے مان لے

دھوپ کی فکر کیا پیش ہے جب سفر چلتا جا چلتا جا چھوڑ دے تو منزلیں
چاندنی ہر طرف، سایباں ہر طرف، تواسے مان لے تواسے مان لے

گر رہی جو بھی ہو جب زمیں تنگ ہو بھرتا جا رنگ و بو دیتا جا تو لہو
آگہی ہر طرف، آسماں ہر طرف، تواسے مان لے تواسے مان لے

ہے کوئی جب خدا دے مجھے یہ سزا، زندگی کر سکوں، میں بھی کچھ کہہ سکوں
بندگی ہر طرف، اور زباں ہر طرف، تواسے مان لے، تواسے مان لے

سختیاں ہی نہیں سنگ اور خار کی شاخ گل کی لچک پر نظر بھی رہے
نازکی ہر طرف، گل فشاں ہر طرف، تواسے مان لے تواسے مان لے

آئینہ بھی ہے چپ عکس بھی لب سیے، کون کس کو کہے کون کس کی سُنے
چہرگی ہر طرف اور نشاں ہر طرف، تواسے مان لے، تواسے مان لے

پھیکی پھیکی ہنسی اور ادھوری طلب ہر بشر تشنہ لب کے ورق پر لیے
تشنگی ہر طرف، شعلہ جاں ہر طرف، تواسے مان لے، تواسے مان لے

شاہد عزیز
۱۴۷/۹، ملاہ تالے، اودے پور۔ ملہ

زیست کے مکانوں میں
جانے کتنی صدیوں سے
ایک طویل تنہائی
ایک گہرا سناٹا
رات ہے نہ دن کوئی
وقت ہے نہ سایہ ہے
کھڑکیاں نہ دروازہ
زیست کے مکانوں میں
پھر بھی لوگ رہتے ہیں

ں خان
P.O. Box 8105,
Qatar, Arabia

اوشا شفق
ستبا داؤ ۔ کالج روڈ ۔ ایونیو
مدراس ۲۸

رکہ دعا مقبول ہوئی

زمانہ قبل
نے تجھ سے کچھ مانگا تھا اے خدا
ر عاشق تھا
اُس سے عشق نہ تھا

دعا قبول کی
ہے لے کر اب تک
ہیں کسی کے قریب ہوا
ہوا

بانے زائد کیا
ے کم کیا گیا۔

شکر
انکوں
نے اور مل جانے کے بعد
ہاہوں

ب جاتا ہے

ں میں
نا ہے

غزل

آج اِن آنکھوں سے مے خانہ بھی ٹکرانے دو
خونِ دل چھلکے ہے میرا تو چھلک جانے دو

آج پھر اس نے نوازا ہے غموں سے مجھ کو
یہی تہذیبِ غمِ عشق ہے، دُہرانے دو

جھریوں نے جو چھپا رکھی ہے خواہش دل کی
یادِ ماضی ہیں، یہ چہرے پہ اُبھر آنے دو

مجھ کو پھولوں کی ترازو ہی میں تولا نہ کرو
دلِ بیتاب کو کانٹوں سے بھی بہلانے دو

دشمنوں کو بھی محبت ہی سے دیکھا جائے
التجا ہے یہ مری، دہر میں پھیلانے دو

میرے بکھرے ہوئے الفاظ سجا لیتا ہے
کتنا نادان ہے یہ دِل، اسے سمجھانے دو

خوب واقف ہوں میں پھولوں کی سیاست سے شفق
مسکراتا ہوا، اِک پھول ہوں مرجھانے دو

نشتر اکبرآبادی
۱۳۲ سیٹر اسٹریٹ، کوڑکلی، پونا

میری شہرت کو مرے قد کو بڑھانے کے لیے
لوگ بے چین ہیں احسان جتانے کے لیے
میں نے الفاظ و معنی کو پلایا ہے لہو
اپنی پہچان کتابوں میں بنانے کے لیے
آپ کیوں کار سیاست سے خفا ہو بیٹھے
ہم نے سرکار بنائی تھی گرانے کے لیے
میر کے بعد غزل کو کوئی مجنوں نہ ملا
عشق کے نام پہ جاگیر لٹانے کے لیے
درد نے یہ اثر عشق دکھایا آخر
کھو دیا خود کو جو نکلے تجھے پانے کے لیے

○

کمال الدین کمال
رحمت نگر، برہان پور

الجھا ہوا دماغ خیالوں میں قید تھا
تنہا وجود کتنے سوالوں میں قید تھا
سہمی ہوئی گمراہی تھی کہیں شام آرزو
شب کا غرور دن کے اجالوں میں قید تھا
منزل تو ہر قدم پہ بھی تلووں کی قدر دار
ذوق سفر بھی پاؤں کے چھالوں میں قید تھا
تم بھی ادھر اسیر غم روزگار تھے
اور میں بھی اپنے چاہنے والوں میں قید تھا
الجھا ہوا تھا میں بھی مسائل کے در پر
اور دل کمال گھر کے خیالوں میں قید تھا

○

شمیم انجم وارثی
میم ۱۰ وادھ لی لائن، شیام نگر

کیفیت پھول سے چہروں کی بدل جائے گی
جب ہوا گھر کے دریچوں سے نکل جائے گی
اس قدر دھوپ ہے تپتی ہے زمیں آنگن کی
چاندنی پاؤں جو رکھے گی تو جل جائے گی
قصۂ شعلہ بھی ٹھنڈی سلوں پر نہ لکھو
برف پگھلے گی تو تحریر پگھل جائے گی
لا کے رکھ دیجیے کچھ غم کے کھلونے گھر میں
زندگی بچوں کی مانند بہل جائے گی
میں تھکا ماندہ سر شام جو گھر لوٹوں گا
میری ماں دیکھ کے حسرت سے مچل جائے گی

حسامی اظہری
این۔ آر۔ آر روڈ، آسنسول

منظر ہے دل خراش مگر کتنا صاف ہے
شہروں میں اب گناہ کبیرہ معاف ہے
سوچا تھا وقت اس کو سکھا دے گا
اس کی زباں پہ اب بھی وہی لام کاف ہے
محفل میں بات کرتا ہے امن و سکون کی
وہ جس کے گھر میں روز نیا اختلاف ہے
اس شخص میں نہیں ہے اگر اور کچھ
حسامی کو ہر خطا کا مگر اعتراف ہے

مرزا پوری
گی واسلیگنج، مرزاپور- یوپی

مناظر حسن شاہن،
ڈیو. پوسٹ. بارا وایا چکند، گیا (بہار)

ر خاموش خزاؤں کی ڈگر لگتی ہے
ب یہ ہستی بھی کوئی خشک شجر لگتی ہے
ے کے چلیے کہ ہر گام پہ ہے دام فریب
ب تو ہر بات سیاست کی خبر لگتی ہے
ان بھی دیتے ہوتے کہتے ہیں یہی اہل وفا
رے دل کو یہ زمیں لعل و گہر لگتی ہے
ار ہستی لیے چلنا ہے تو شکوہ کیسا
خارزاروں سے بھری راہ سفر لگتی ہے
اس زمانے میں جسے بوجھ سمجھ لیتے ہیں
اور زینت بھی وہی گھر کی ظفر لگتی ہے

○

ورشید افسر بسوانی
بازار، بسوان، سیتاپور، یوپی

وہ جب آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہے
سماں کچھ اور بوجھل ہو گیا ہے
درندے وندناتے پھر رہے ہیں
ہمارا شہر جنگل ہو گیا ہے
زمینوں کے ابھی تک لب کھلے ہیں
کہاں روپوش بادل ہو گیا ہے
کہاں پر پاؤں ہم اپنے جمائیں،
کہ سارا شہر دلدل ہو گیا ہے
زمانے میں کہاں پاؤ گے شاہیں،
وفا کا لفظ مہمل ہو گیا ہے

○

ہوئی ہے وہی تہذیب بچائی جائے
تو گرتی ہوئی دیوار سنبھالی جائے
کے باہر تو کئی اور بھی راتیں گزریں
ک شب ہو تو کوئی بات بنائی جائے
زور دولت لیے پھرتی ہے کھلی آنکھوں میں
ہیں ایسا نہ ہو رستے میں چرائی جائے
ہ یہ فرمان ہے آئے نہ اگر فریادی
وہی انصاف کی زنجیر ہلائی جائے
جس کی عطا ہے اُسے واپس کر دے
لئے افسر یہ امانت نہ سنبھالی جائے

سلیم انصاری
۵۹، موتی نالا، جبل پور (ایم پی)

شکست خوردہ

جگنوؤں کے قتل میں ناکام ہو گے۔
جب
وہ اپنے ہاتھ میں خنجر لیے لوٹا
تو
اس کے گھر کے سارے پھول
زخمی ہو چکے تھے۔

غزلیں

فیاض رشک
دلاور پور مونگیر، بہار

ہے وفا تو کبھی جفا بے کل
دل میں کیا کیا نہ ہے ادا بے کل
کیسے کیسے نقوش اُبھریں گے
ہے کلاکار کی کلا بے کل
ہے تمہارا ہی عکس آنکھوں میں
دل تمہارے لیے سدا بے کل
جس کی دنیا ہی لوٹ لے کوئی
کیوں نہ ہو جائے وہ بھلا بے کل
دل پریشاں ہو تو اے فیاضؔ
لمحہ لمحہ گزرتا ہے بے کل

ایم۔ اے مشتاق
مقام و پوسٹ بشکری، ضلع مدھوبنی (بہار)

آپ کی جلوہ نمائی بندگی میرے لیے
آپ کی ہر اک مسرت سے خوشی میرے لیے
کس قدر دشوار ہے فرقت میں جینا اے صنم
لگتا ہے اک پل ہو جیسے اک صدی میرے لیے
سوچتا ہوں آپ جب ہو جائیں گے مجھ سے جدا
بوجھ بن جائے گی اپنی زندگی میرے لیے
تم خفا جب سے ہوئے پوچھو نہ اپنا حالِ دل
اپنے بیگانے سے لگتے ہیں سبھی میرے لیے
کس قدر مجبور ہوں مشتاق کہہ سکتا نہیں
شادمانی ان کا حصہ، بے بسی میرے لیے

رفیق جعفر
۱۲/۶۱ مالوانی کالونی، بمبئی ۹۵

پھر کوئی شعر کہوں یا ایک فسانہ لکھوں
سوچتا ہوں کہ تیرے نام پہ کیا کیا لکھوں
یہ مرا شہر نگاراں ہے فقط شہرِ نظر
جی میں آتا ہے اسے درد کا دریا لکھوں
عصرِ حاضر پہ کہوں شعر یہ منظور مگر
شعر کے نام پہ کیا جبر کا قصہ لکھوں
کوئی حرکت کی تڑپ ہو نہ دلوں میں جن کے
ایسی قوموں کے لیے سنگِ سویدا لکھوں
وہ بھٹکتا ہی رہے گا یونہی راہوں میں رفیق
تیرے احساس کو میں ایک تماشا لکھوں

عبدالشکور شکورؔ
کرشنانند پور، ۳۵ کٹک (اڑیسہ)

ہم نے جس شخص کا بھلا چاہا
اس نے نقصان برملا چاہا
میرے ہاتھوں کو ڈس گئے کانٹے
میں نے جب گل کو توڑنا چا
بزم امکان میں آکے آدم
ایک ساتھی کا آسرا چا
پڑ گئے مصلحت کے لب پر قفل
جب بھی کچھ منہ سے بولنا چا
دہر میں فکر غیر ہے کس کو
سب نے اپنا ہی فائدہ چا
وہ میری زندگی ہے قسمت سے
اے شکور اس کو میں نے کیا چا

سید لیسین قدرت
۴/۶۴ - فرید ٹاؤن، ساہیوال (پاکستان)

○

نفرتیں ساری وہ تھیں مجھ سے فضا کی صورت
اس کی آنکھوں میں شرارت تھی حیا کی صورت
وہ تو رنگین سی تتلی تھی کہیں اُڑ بھی گئی
ہم تڑپتے رہے گنبد میں صدا کی صورت
کیسے ملتے تھے، بچھڑتے تھے، ہم ہوتے تھے
سب مناظر گئے، اک موج ہوا کی صورت
اس کے رُخسار گلابی وہ نشیلی آنکھیں
ابر برساتا تھا کبھی رنگ حنا کی صورت
جو بھی سوچا اُسے کر ڈالا ہے قدرت یعنی
وسوسے میں نہیں ہم، بیم و رجا کی صورت

اکٹر محبوب راہی
ری ٹالکی، ضلع اکولہ (ایم۔ ایس)

○

یاد ہے جس کی ذہن ہمارا روشن ہے
جانے کہاں وہ چاندسا مکھڑا روشن ہے
شب، تاریکی، تیرا تصور، سونا گھر
جگ مگ جگ مگ کونا کونا روشن ہے
تیرے روپ کے پرتو سے اے رشک چمن
پتا پتا بوٹا بوٹا روشن ہے
جگنو اس کا جھل مل جھل مل کرتا ہے
جس سے اپنا رہن بسیرا روشن ہے
تو ہے پس پردہ لیکن اے پردہ نشیں
عکس جبیں سے تیرے پردا روشن ہے
میر و غالب سے راہیؔ تک کتنوں کے
خون جگر سے رود غزل کا روشن ہے

گوہر شیخ پوروی
۴۸/۴۸ تیلیا باغ، بنارس ۱

○

کوئی کسی غریب سے یہ کس طرح کہے
اپنی ہتھیلیوں پر مقدر اتار لے
کب تک اندھیری رات کا نوحہ پڑھے گا تو
بڑھ کر خود آج تاروں کی جھالر اتار لے
تجھ سے تقاضے کرتے ہیں حالات آج کے
گوہر غزل میں میرؔ کے تیور اُتار لے

○

شاداب مرزا
لیکچرار شعبۂ انگریزی۔ اروناچل یونی ورسٹی

کربِ بے حسی

سیاہ رات میں خاموشیوں کا پہرہ ہے
نہ کوئی چاپ، نہ آہٹ نہ کوئی دستک ہے
ہے کائنات پہ چھایا عجیب سناٹا
چہار سمت مکمل سکوت طاری ہے
دل و دماغ پہ تنہائیوں کے جالے ہیں
کہ اب صدائے تنفس بھی ڈوبی جاتی ہے
بہت دنوں سے ان آنکھوں میں کوئی خواب نہیں
نہ حسرتیں، نہ امیدیں، نہ خواہشیں دل میں
چلا گیا ہے وہ احساس کی حدوں سے پرے
حصار فہم و فراست عبور کر بھی چکا
نہ انتظار کسی شخص کا نہ خوف کوئی
اسے کسی سے گلہ ہے نہ کچھ شکایت ہے
وہ اب کسی کا نہیں، کوئی بھی نہیں اس کا
وہ توڑ بیٹھا ہے بندھن سبھی، سبھی رشتے
خیالِ ماضی، غمِ حال، فکر مستقبل
وہ اس سکون سے باہر چلا گیا کب کا
کہ اس کے دل سے نکل کر چلے گئے جذبات
بہت دنوں سے وہ اس کربِ بے حسی میں ہے

غزلیں

حسرت مونگیری
دلاور پور "حمزادی گلی، مونگیر

آشوبِ زمانہ کی میں تصویر ہوا ہوں
ناکام ہوا شومیِ تقدیر ہوا ہوں
شبنم کی طرح سرد، تو شعلہ کی لپک بھی
بزدل نہیں ہوں تابشِ شمشیر ہوا ہوں
پرواز کی خواہش تھی، سدا پر شکار ہا ہوں میں
اور آج اسی خواب کی تعبیر ہوا ہوں
ہر شہر میں رقصاں ہے کوئی نازِ حسرت
گلرنگ ہوا شوخیِ تحریر ہوا ہوں

فراز بندہ نواز
نزد جامع مسجد مین لبتی روڈ
بدای

کتنے حسیں وہ درد دیے
امرت بھی اور زہر پیے
آئے مزہ دکھ سکھ میں نہ جیوں
درد دیے اور درد لیے
یہ بھی ان کا طور سہی
عہد کیے اور توڑ دیے
آیا زباں پہ نام ترا
موسم کے جب نام لیے
دم ہی بھرے ہیں ہم تو فراز
ان کے ستم کو یاد کیے

اثر نظامی
کٹک

لفظوں کو رعنائی دے
شعروں کو گہرائی دے
تیری فطرت مہکے گی
ہونٹوں کو سچائی دے
سورج جیسی عادت رکھ
ذرّوں کو برنائی دے
اپنی گھر کی تلسی کو
چاہت کی انگنائی دے
جس سے شہرت بڑھ جائے
ایسی کوئی رسوائی دے
اپنی طرزِ نگارش کو
کچھ تو اثر دانائی دے

سیفی سرونجی
سہ ماہی انتساب سیفی لائبریری، سرونج۔ ایم پی

کوئی دلی نہ دیکھ نہ کوئی نظیر دیکھ
گر دیکھنا ہے تجھ کو تو دیوان میر دیکھ
کھوٹا سا ایک سکہ دیا تھا ہے مگر
وہ دے رہا ہے پھر بھی دعائیں فقیر دیکھ
مجھ کو نہ سبز باغ خدا کے لیے دکھا
ہاتھوں میں اب نہیں ہے خوشی کی لکیر دیکھ
تو بھی نہ بچ سکے گا خدا کے عذاب سے
مجھ پر نہ پھینک آج تو لفظوں کے تیر دیکھ
کب تک جیے گا شہر میں جھوٹی انا کے ساتھ
سیفی نہ بیچ بھول کے اپنا ضمیر دیکھ

ایم عزیز الحسن
ارکز تعلیمات اطفال و بالغان
انجمن ترقی اردو بہار، پٹنہ

گوپی چند نارنگ کی اُردو پرائمر

پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو دنیا کے ممتاز ادیب اور دانشور ہیں۔ حکومت ہند نے پدم شری کا اعزاز دے کر آپ کی عزت افزائی کی ہے۔ نارنگ صاحب کی ادبی خدمات اور فکر و فن محتاج تعارف نہیں۔

ہمیں یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ قومی پیمانے پر قومی کونسل برائے تعلیمی تحقیقات و ٹریننگ نئی دہلی نے اردو کی درسی کتابوں کی ترتیب و تدوین کا ایک پروجکٹ بنایا ہے اور ملک کے مختلف حصوں سے اردو اساتذہ اور ماہرین تعلیم کے تعاون سے یہ کام شروع کیا گیا ہے۔

اردو رسم الخط کو تعلیم و تدریس کے جدید ترین طریقوں کی مدد سے سکھانے اور سہل الحصول مختلف پرائمر مرتب کرنے کے لیے مورخہ ۸ تا ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو این، سی، آر، ٹی نئی دہلی میں ایک ورک شاپ منعقد کیا گیا۔ اس ورک شاپ میں پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر محمد صابرین پروفیسر ثریا حسین، حسینہ بانو، پروفیسر حنیف کیفی، خالد محمود، ریاست حسین فاروقی، ڈاکٹر سید عزت حسین، ڈاکٹر سیفی پریمی، ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ اور محمد قریشی جیسے تجربہ کار نامی گرامی اردو اساتذہ اور درس و تدریس کے ماہرین نے شرکت کی۔ ظاہر ہے کہ نارنگ صاحب نے یہ پرائمر ورک شاپ میں طے کیے گئے رہنما اصولوں کے تحت ہی مرتب کیا ہوگا۔

توقع تھی کہ اردو پرائمر مرتب کرنے میں نارنگ صاحب اپنی لسانی بصیرت اور اعلا علمی صلاحیت کا ثبوت دیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے اس پرائمر (اردو کی نئی کتاب پہلا حصہ) میں بہتری لسانی غلطیاں اور متعدد فنی خامیاں ہیں۔ آپ نے پرائمر لکھنے میں اپنی ذاتی اپج، فنی سوجھ بوجھ اور لسانی برتری کی ایک بھی مثال پیش نہیں کی۔

ابھی تک اردو کا دمیاں، مختلف تنظیمیں اور شخصیتیں مقامی طور پر پرائمریں شائع کرتی آرہی ہیں۔ اس طرح کی پرائمروں کی خوبیوں اور خامیوں سے محدود حلقہ ہی متاثر ہوتا رہا ہے۔ لیکن نارنگ صاحب کی پرائمر پہلی بار قومی سطح پر آئی ہے۔ سارے ملک میں اس پرائمر سے اردو کی تعلیم

ہوگی اور اس کی خوبیوں اور خامیوں سے ملک کی ساری اردو آبادی متاثر ہوگی۔ حیرت ہے کہ آج تک اس پرائمر پر کسی طرح کا تبصرہ نہیں کیا گیا۔ میں نے بڑی امیدوں کے ساتھ نارنگ صاحب کی پرائمر کا مطالعہ کیا اور چاہتا تھا کہ اس پرائمر کی خوبیاں اور خامیاں منظر عام پر لاؤں لیکن اپنی مسلسل علالت اور ضعیف العمری کے باعث میں بڑی مشکل سے آج اس پرائمر پر مختصر تبصرہ کر سکا۔

تعلیم کے سفر میں سب سے دشوار گزار نا قابل فہم اور مشکل منزل کسی زبان کے رسم الخط میں لکھنا پڑھنا سکھانا اور اس کے لیے سہل الحصول، قابل فہم اور سائنٹفک پرائمر تیار کرنا ہے۔ نونہال معصوم بچوں کی تعلیم میں پہلا سال، پہلی کتاب اور پہلے معلم کی بڑی اہمیت ہے۔ ثانوی اور اعلا تعلیم کی کتاب لکھنا اور بات ہے لیکن ناسمجھ معصوم بچوں کے لیے پرائمر لکھنا بڑی مہارت، فنی سوجھ بوجھ اور کافی تحقیق و تلاش کا کام ہے۔ بچوں کی پرائمر مرتب کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے کہ مصنف کو بچوں کی نفسیات اور متعلقہ زبان کی بنیادی لسانیات خصوصاً صوتی ڈھانچوں کا صحیح علم ہو۔ جب تک مصنف کو ابتدائی تعلیم کا ذاتی یا کم از کم اپنی نگرانی میں پہلا کلاس چلانے کا دیرینہ تجربہ حاصل نہ ہو، اس نے مانٹیسوری، کنڈر گارڈن اور منصوباتی اسکولوں میں زبان پڑھانے والی پہلی کتاب نہیں دیکھی ہو نیز اپنے ملک اور ترقی یافتہ ممالک کی پرائمروں کا تقابلی جائزہ نہیں لیا ہو وہ تمام پرائمروں کے پس منظر میں سب سے بہتر پرائمر مرتب نہیں کر سکتا۔

نارنگ صاحب کی پرائمر کے قبل بہار میں ہندی کے لیے رانی مدن امر اور اردو کے لیے دارا داور روزی نام کی پرائمریں استعمال ہوتی تھیں۔ میں نے دارا داور روزی سے بہتر آج تک دوسری پرائمر نہیں دیکھی گرچہ ہمارے یہاں اردو، ہندی اور انگریزی پرائمروں کا انبار ہے۔ دارا داور روزی میں حروف کیا، الفاظ، یا املوں سے بھی نہیں بلکہ جیتی جاگتی گھریلو کہانیوں سے پڑھائی شروع کی گئی ہے۔ اس قاعدے سے پڑھائی شروع کرنے کے لیے اساتذہ کی تربیت کا بھی نظم کیا گیا تھا اور ان کی رہنمائی کے لیے پرائمر کا ایک علاحدہ ضخیم ٹیچرس اڈیشن بھی شائع کیا گیا تھا۔ اس اڈیشن میں ہر سبق کے پڑھانے کا باتصویر مفصل طریقہ بتایا گیا تھا۔

اس قاعدے سے اردو پڑھانے کے لیے مدرس کو گھر سے تیار ہو کر آنا، ہمیشہ چوکنا اور چست و چوبند رہنا پڑتا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ معلمین نے رانی مدن امر اور دارا داور روزی کا قاعدے سے ہندی اور اردو پڑھانے میں اپنا فرض ادا نہیں کیا بلکہ وہ در پردہ روایتی قاعدوں سے حروف تہجی رٹاتے رہے۔ حکام نے بالآخر مجبور ہو کر ان پرائمروں کی جگہ دوسری پرائمریں تیار کرنے کا پروگرام بنالیا۔

ابھی تک بہار میں پرائمر سے لے کر ریاضی، سائنس اور علم سماج وغیرہ کی درجہ بدرجہ تو اردو اور ہندی کتابیں شائع کی جاتی رہی ہیں ان میں مواد، حجم اور خوبصورتی کے اعتبار سے کسی طرح کا بھید بھاو نہیں برتا جاتا رہا ہے۔ جب رانی مدن امر کے بدلے "بال بھارتی" نام کی نئی

پرائمر سامنے آئی تو میری اُمیدوں پر پانی پھر گیا "رانی مدن امر" پرائمر تیار کرنے میں جس رکھ رکھاؤ پر عمل کیا گیا تھا اس کا شائبہ برابر بھی "بال بھارتی" کی طباعت میں اہتمام نہیں کیا گیا۔ بال بھارتی پرائمر دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ ٹھیک اسی نہج پر اردو پرائمر شائع کی جائے گی۔ جب میں نے نارنگ صاحب کی اردو پرائمر دیکھی تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی کہ یہ پرائمر بال بھارتی نہج پر نہیں لکھی گئی ہے اور ان دونوں میں فنی اعتبار سے زمین آسمان کا فرق ہے۔ بال بھارتی نے بڑی حد تک معلّمین کا کام ہلکا کر دیا ہے اور وہ الفاظ کی پہچان کرنے کے بعد اس کا تجزیہ کر کے حروف کی شکل اور آواز برآمد کریں گے۔ لیکن اس پرائمر میں یہ حکمت عملی نہیں اپنائی گئی۔

ایسا لگتا ہے کہ ورک شاپ میں ایسے حضرات کی بھاری کمی تھی جس نے کسی اسکول یا کالج میں بچوں کی نفسیات، اصول تدوین نصاب، اصول تعلیم، طریقہائے تعلیم اور تاریخ تعلیمی اصلاحات کا بطور مضمون مطالعہ کیا ہو۔ کمیٹی نے اردو پرائمر تیار کرتے میں اردو کی سابقہ اور ہندی کی موجودہ پرائمر کو پیش نظر نہیں رکھا۔ پرائمر میں اردو رسم الخط کے پیچیدہ صوتی ڈھانچے کو بچوں کے نازک شیشۂ دماغ پر آسانی کے ساتھ منعکس کر دینے کی اچھی تکنیک پیش نہیں کی گئی۔ اردو کے مختلف حرکات جزم، تشدید نیز تنوین پڑھانے کا قابل فہم موقع پیدا کر کے ان کے استعمال کی مشق نہیں کرائی گئی۔

قبل اس کے کہ میں اس پرائمر کی فنی خامیوں کی نشاندہی کروں میں یہ چاہوں گا کہ پرائمر کی اُن لسانی غلطیوں پر ہی روشنی ڈالوں جن کے نارنگ صاحب شہرت یافتہ عالم ہیں۔

نارنگ صاحب نے "دادا دادی آم دو" املا سے پڑھائی شروع کی ہے۔ بلاشبہ کافی مشق کے بعد بچے ان چاروں الفاظ کو حروف اور حرکات کی کہنیات جانے بغیر پہچان جائیں گے۔ لیکن آپ کا یہ دعوا سراسر غلط ہے کہ "ان چاروں الفاظ کو فرداً فرداً پہچان لینے کے بعد بچے ا، د، ی، م اور و" حروف سے واقف ہو جائیں گے" کہتے ہیں ہر سبق میں سیکھے گئے حروف چوکھٹوں میں بتا دیے گئے ہیں" ان چاروں الفاظ کو پہچان لینے کے بعد بھی ا، د، ی، م اور" و" حروف بچوں کے ذہن میں معمّا بنے رہیں گے۔ اگر چینی زبان کی طرح ہر لفظ کو الگ الگ پہچاننا بتایا جائے تو بچے ایسی حالت میں حروف اور اعرابوں کی کہنیات سے واقف ہو کر خود بخود ان کی مدد سے نئے نئے الفاظ بنانا نہیں سیکھیں گے۔

صوتیاتی ڈھانچے والا رسم الخط سیکھنے کا سائنٹفک طریقہ یہ ہے کہ بچے پہلے جانے پہچانے کل الفاظ کو پہچانیں لیکن رفتہ رفتہ ان میں استعمال کیے گئے حروف اور حرکات کو بھی سمجھتے چلیں اور سوچ سمجھ کر دماغی ورزش سے وہ کھیل کی طرح نئے نئے الفاظ خود بخود بنا سکیں۔ اس سے بچوں میں ابتدا سے ہی سوچنے سمجھنے اور حالات کو پرکھ کر نتیجہ نکالنے کی عادت پیدا ہوگی۔ اگر پرانے طریقوں سے بغیر سمجھے بوجھے الف، بے، جیم، ..... الف زبر آ۔ بے زبر بَ، الف بے زبر اب، الف بے زبر اب .... وغیرہ سے پڑھائی شروع کرنے والا مدرّس دعوا کرے کہ وہ الفاظ سے پڑھائی شروع کرنے والے مدرّس سے نسبتاً کم وقت میں (جو ناممکن ہے) اردو لکھنا پڑھنا

سکھا سکتے ہیں تو بھی ہم یہ طریقہ نہیں اپنا سکتے کیونکہ اس سے لکھنے پڑھنے یا بولنے والا شخص بھلے ہی پیدا ہو جا
لیکن مسائل کو سمجھ کر ان کا حل تلاش کرنے والا دانشور ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔

اگر روایتی اردو پرائمر کے بدلے معصوم بچوں کی پڑھائی یسرنا القرآن سے شروع کی
اور بغیر سمجھے بوجھے اس بچے نے پارہ عم اور کلام مجید بھی ناظرہ پڑھ لیا اور اس کو مدرسے
احاطے میں ہی رکھا گیا تو تین سال کی تعلیم کے بعد بھی دماغی طور پر وہ بن مانس بن کر نکلے گا
وہ ریاضی کا عام فہم مسئلہ حل کر سکے گا اور نہ ہی وہ حفظان صحت، جغرافیہ، علم سماج اور دیگر مضا
کا الف بے جان سکے گا۔ غنیمت ہے کہ مدرسوں کے بعد بچے ہاٹ بازار، کھیت کھلیان اور کل کارخا
میں آتے جاتے اور غیر رسمی طور پر مشاہدہ کے ذریعہ بہت سی کارآمد باتیں سیکھتے رہتے ہیں۔

الفاظ کے ذریعہ کم سے کم مدت میں پڑھنا لکھنا سکھانے کی آسان اور قابل فہم تکنیک یہ
کہ بچے الفاظ جیسے "اُنار" کو پہچانیں۔ کافی مشق کے بعد اُنار کو دو ٹکڑوں میں بول کر اور الگ الگ
ٹکڑوں میں لکھ کر اُ...... نار پڑھیں۔ اور "نار" کو پہچان کر نار کو دو ٹکڑوں میں بول کر پھر دو ٹکڑ
میں دور دور لکھ کر جیسے نا...... ر لکھیں اور پڑھیں۔ ان جز کلموں یا صوت رکنوں کو جوڑ جوڑ
نئے نئے الفاظ بنائیں۔ جیسے اَنار، نانا، نار، اَنا اور اُرنا۔ معلم یہ الفاظ رنگین کھریے کے ذریعہ تختہ
پر لکھ کر بچوں کے نازک شیشہ دماغ پر منعکس کریں۔ واضح رہے کہ تکرار سے ہی بچوں کی سمجھ
پختگی آ سکتی ہے۔ معلم سیکھے گئے الفاظ کو خوبصورت حروف میں کارڈوں فیتوں اور چارٹوں پر لک
انہیں پڑھنے کا دلچسپ موقع فراہم کر سکتے ہیں۔

بچوں کے پاپا بازار سے انار لائے ہیں۔ پاپا والے انار اور حروف میں لکھے ہوئے
کے متعلق بچوں کے دماغ میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہوں گے اور وہ بڑی الجھن میں
پڑ جائیں گے۔ اس موقع پر معلم کو بتا دینا چاہیے کہ بازار والے انار کو ہم آنکھ سے دیکھتے
سے چھوتے اور منہ سے کھاتے ہیں لیکن تمھاری کتاب کی ساری لکھاوٹ، ہماری بولیوں
تصویریں ہیں جن کو ہم لوگ منہ سے بولتے، کانوں سے سنتے لیکن آنکھ سے آوازوں کو
دیکھتے۔ پس کتاب میں لکھا ہوا اُنار ہماری بولیوں کی تصویر ہے۔

(۲) نارنگ صاحب کہتے ہیں: "زبر کا آسان لفظوں میں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔" اعر
کا فقدان اردو رسم الخط کا معمول ہے۔ اعراب کی غیر موجودگی کو کسی آواز کی نمایندگی کرنے کا
حامل نہیں ہو سکتا۔ ساکن حروف سے کسی طرح کی آواز نہیں بنتی بغیر اعراب اگر "بن" کو "بَ
پڑھنے کا اصول مان لیا جائے تو بِن اور "بُن" پر اعراب دینا لازمی ہو جائے گا جو اردو ر
کی مختصر نگاری کے خلاف ہے۔

اردو کے صوتیاتی ڈھانچے کا مقتضا ہے کہ پہلی بار بچوں کو پوری صحت کے ساتھ لک
بَن، بِن اور بُن پڑھایا جائے تاکہ بعد میں اگر حرکات حذف کر دیے جائیں تو بچے سیاق د
سے صحیح صحیح پڑھ سکیں اور یہ سمجھ جائیں کہ اردو کی مختصر نگاری کا احترام کرتے ہوئے کاتب

حرکات حذف کر دیے ہیں۔

خفیف حرکات یا اعراب (زبر، زیر، پیش) الفاظ کے جز بدل نہیں بلکہ اوپر نیچے ہوتے ہیں جیسے "غفلت" چنانچہ خارجی حرکات حذف کر دینے سے الفاظ کی صورت نہیں بگڑتی (غفلت) الف واو اور یاے سے بنی ثقیل حرکتیں (جیسے چا، چی، چو) الفاظ کے جز بدن ہوتی ہیں۔ ان کو حذف کر دینے سے الفاظ کی صورت بدل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ثقیل اعراب حذف نہیں کیے جاتے۔

(۳) حروف تہجی میں نون غنّہ کی شمولیت۔

نارنگ صاحب کہتے ہیں "راقم الحروف کا معروضہ ہے کہ جس صوتی اصول کے تحت اردو تہجی میں ہمزہ اور دوچشمی کا اضافہ جائز ہے اسی اصول کے تحت نون کے بعد نون غنّہ کا اضافہ بھی ضروری ہے۔ (شاعر جلد ۶۰ شمارہ ۲) افسوس ہے کہ لسانیات کا اتنا بڑا عالم ہمزہ دوچشمی اور نون غنّہ کو اردو تہجی میں شامل کرنے کی وکالت کر رہا ہے۔ اس مقالے میں نارنگ صاحب نے قدم قدم پر فاش غلطیاں کی ہیں۔ شاعر اردو کے اعلا علمی حلقے میں مقبول ہے۔ حیرت ہے کہ لسانیات کے کسی بھی عالم نے آج تک ان غلطیوں کی نشاندہی نہیں کی۔

اردو تہجی کے سارے حروف ساکن یا گونگے ہیں۔ یہ سارے گونگے حروف حرکات یا اعراب قبول کر کے مختلف آوازیں پیدا کرتے ہیں جیسے الف سے اَ، اِ، اُو، آ، اِی، اے، اَو وغیرہ۔ اسی طرح ساکن "ب" سے بَ، بُ، اب، بَا، بی وغیرہ۔ پس اگر ہمزہ (ء) دوچشمی (ھ) اور نون غنّہ (ں) بھی حرکات قبول کر کے مختلف صوت رکن یا جز کلمہ (SYLLABLE) بنالیں تو انھیں بھی حروف تہجی میں شامل کیا جاسکتا ہے، ورنہ نہیں۔ لیکن یہ تینوں حرکات قبول کر کے صوت رکن یا جز کلمہ نہیں بناتے۔ جیسے ءَ، ءِ، ءُ، وغیرہ ھَ، ھِ، ھُ، ھا، ھو، ھی، ںَ، ںِ، ںا وغیرہ ظاہر ہوا کہ تہجی میں رہنے کا ان کو کوئی حق نہیں ہے۔ لہٰذا جس صوتی اصول کے تحت اردو تہجی میں ہمزہ اور دوچشمی کا اضافہ ناجائز ہے اسی اصول کے تحت نون کے بعد نون غنّہ کا اضافہ بھی ناجائز ہے۔ یہ کسوٹی راقم الحروف کی وضع کردہ ہے۔ کیا نارنگ صاحب اردو تہجی میں ایسا ایک حرف بھی بتا سکتے ہیں جو حرکات قبول کر کے مختلف آوازیں نہ پیدا کرے؟ یا لسانیات کے کسی عالم نے اس کسوٹی کی نشاندہی کی ہو؟ ہندی نے بھی حرکات کو تہجی کے آخر میں رکھا ہے۔ جدید انگریزی میں بھی کسی حرف میں بارہ واول اور آٹھ دیپھانگ کی آوازیں شامل کرنے کے لیے لغات میں نئی نئی علامتیں مقرر کی گئی ہیں۔

قدیم زمانے میں جو چیز جیسی ہے اس کو ویسا ہی ثابت کر دینے کی آج کی طرح لسانیات کی نعمت غیر مترقبہ نہ تھی۔ راقم الحروف کا لسانی شعور مقتضی ہے کہ اردو تہجی کے بعد اعرابوں اور علامتوں کی ایک فہرست ہوتی جس کا استعمال کر کے مدرس ان کی لسانی اہمیت بچوں کو بتلاتے۔ تشدید، جزم اور تنوین کے استعمال کی مشق کراتے۔

(۴) ہائیت: نارنگ صاحب کہتے ہیں "ہائیت ایک امتیازی عنصر ہے۔ مثلاً بال۔ بھال۔ پل۔ پھل، تال، تھال، ٹاٹ، ٹھاٹ، دول، ڈھول۔ پڑ، پڑھ وغیرہ الفاظ میں معانی کا فرق صرف ہائیت

کی وجہ سے ہوا ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں "یہ آوازیں اردو میں باقاعدہ فونیم ہیں اور اردو۔
معنوی نظام کا ان کے بغیر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔" (شاعر جلد ۶۰ شمارہ ۱۲ ۱۲)

نارنگ صاحب کا یہ دعوا پڑھ کر میں انگشت بدنداں ہو کر رہ گیا۔ ہائیت (دو چشمی) اردو کا
امتیازی عنصر نہیں۔ بال، بھال، پل۔ پھل اور تال، تھال وغیرہ میں معنی کا فرق "ھ" کی بدولت نہیں بلکہ
کے ثقیل نقش بھ، پھ، اور تھ وغیرہ سے ہوا ہے اور یہ ہندی کی طرح اردو کے آزاد صوتے ہیں
مذکورہ بالا الفاظ میں ہائیت سے معنی کا فرق تو تب ہوتا جب ہم بال، ھال، پل، ھل۔ تال، ھال،
ٹاٹ، ھاٹ وغیرہ لکھتے اور ان سے معنی پیدا ہوتا۔ دو چشمی عربی میں ہائے ہوز کے طور پر بھلے ہی
ہوتی ہے لیکن اردو میں اس کی حیثیت ایک علامت کی ہے۔ جو ہندی کے خفیف نفسی کو
کے ٹھیک بعد آنے والے ثقیل نفسی میں بدل دیتا ہے۔ مثلاً कि : ک لیکن " खि " کے بعد کا खि "
आ ؛ گ لیکن आ کے ٹھیک بعد کا ثقیل نفسی घ ؛ گھ وغیرہ

ہمارے بزرگوں نے ہندی کے ٹ، ڈ اور ڑ صوتیوں کے لیے اردو میں حروف وضع کر
لیکن ثقیل نفسی حروف کی صوتی حیثیت تسلیم کرنے کا یہ طریقہ نکالا کہ اس کے لیے دو چشمی کا اسم
مخصوص کر دیا جائے۔ چنانچہ عربی میں دو چشمی ہائے ہوز کے طور پر استعمال ہوتی ہے لیکن
ہم کو ہم، ہے کو ہے، اور ہوا کو ھوا نہیں لکھ سکتے۔ اس کو علامت ہندی یا دو چشمی کہہ سکتے ہیں

(۵) اردو ہجا۔ لغات میں ہجا کا مطلب حروف کو حرکات سے ملا کر پڑھنا ہوتا ہے
بغیر حرکت اردو تہجی کے تمام حروف جس میں الف واو اور یائے بھی شامل ہیں گونگے یعنی بے
ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ساکن حروف کے خمیر میں کسی طرح کی آواز ہی نہیں۔ فی القوی
(Potentially) ساکن حروف میں ان کی مخصوص آوازیں موجود ہوتی ہیں لیکن یہ آوازیں حرکت
بغیر قابل ادا نہیں ہوتیں یہی وجہ ہے کہ گونگے حروف کو آوازوں کے بدلے ناموں سے الف
بے جیم وغیرہ پڑھتے ہیں لیکن جوں ہی ان کو حرکت دے کر متحرک بنا لیا جائے ان کو حرکت
ساتھ رواں اَ، اِ، اُ پڑھنا چاہیے۔ الف زبر اَ بے زیر بِ اور بے پیش بُ نہیں۔

ساکن حروف کی طرح حرکتیں گونگی نہیں ہوتیں۔ ہر حرکت میں اپنی مخصوص آواز ہوتی ہے
باآواز حرکات کو گونگے حروف کی طرح ناموں سے پڑھنا بڑی بے انصافی ہے۔ اگر ہم صرف ان
حرکات کو ناموں سے سادہ زبر، کھڑا زبر، کھڑی زیر، سادہ زیر، الٹا پیش، سادہ پیش، الف مد
یائے معروف، یائے مجہول، یائے لین، واو معروف، واو مجہول اور واو لین کو ناموں کے بدلے آوازوں
پڑھنا شروع کر دیں تو اردو کا صوتیاتی نظام نہایت سائنٹفک ہو جائے گا۔ غیر اردو والوں کو اردو
پڑھنا بالکل سہل اور قابل فہم بن جائے گا دوسری زبان سیکھنے والوں کو آسانیاں ہوں گی۔ باآواز حرکات
آوازوں کے بدلے ناموں سے پڑھنے کی اصلاح ہو جائے گی۔

پس! آگے اب ہم مذکورہ بالا حرکات کو ناموں کے بدلے آوازوں سے (اَ ...) اُ، اِ خفیف
اِ (خفیف اِ ی) ہ ا' (خفیف ɜ) اُ (خفیف ʊ) اُ (الف ماقبل زبر کو آ) اِي (ثقیل ئ) ا۔

اُے ([illegible]) اُو ([illegible]) اُو ([illegible]) اور اُو ([illegible]) پڑھنا شروع کردیں۔ بلاشبہ ابتدا میں یہ
طریقہ اجنبی لگے گا لیکن رفتہ رفتہ ہم آواز سے پڑھنے کے عادی ہو جائیں گے اور ہمیں
سیدھا راستہ مل جائے گا۔ اس طرح اردو کے صوتیاتی ڈھانچے میں چار چاند لگ جائیں
اردو تحریر کے تلفظ میں اس سے شاندار طور پر قطعیت پیدا ہو جائے گی۔ ہم صرف
الفاظ کا صحیح تلفظ کرانے کے لیے صرف پہلی بار ہی اس کو پوری صحت کے ساتھ لکھیں گے
اردو کی مختصر نگاری کا احترام کرتے ہوئے بعد میں حذف کر دیں گے۔

جب تک ساکن حروف پر حرکت نہ ہو ان کو آوازوں سے پڑھنا ممکن نہیں۔ لہٰذا انھیں
بے اور جیم وغیرہ ہی پڑھیں گے لیکن ان پر جوں ہی حرکت کی آواز دے دیں گے یہ
یعنی اُ، اِ، اُ، ای، اور او وغیرہ ہو جائیں گے انھیں پڑھنے کا سائنٹفک طریقہ یہ ہے کہ
طرح حلیہ بیان کیے بغیر صرف حلیہ دیکھ کر کسی شخص کو ہم جوان یا بوڑھا کہہ دیتے ہیں اسی
متحرک باآواز حروف کا حلیہ دیکھ کر ہی حلیہ بیان کیے بغیر بَ، بِ، بُ، بَا، بی، بے، بُو اور
وغیرہ رواں پڑھ دینا چاہیے۔ اعرابوں کو آواز سے پڑھنے کا قاعدہ مان لینے کے بعد ہم
کا ہجے بے، اَ، با، بو کا ہجے بے اُو، بو اور بی کا بے، ای، بی کریں۔ بے الف زبر
بے واو پیش بُو نہیں۔

اے کاش! اردو اساتذہ اور اردو زبان کے بااثر رہنما اس سائنٹفک طریقے کو مان
اعرابوں کو آوازوں سے پڑھنے کے بعد اردو کا صوتیاتی ڈھانچہ اوج ثریا تک پہنچ جائے گا۔ یہ
ہمارے صوتیاتی ڈھانچے میں کسی طرح کا اضافہ نہیں بلکہ یہ اردو صوتیاتی نظام کے راز ہائے
آشکارہ کرے گا۔ اور یہ متاع گم شدہ کو حاصل کرنا ہوگا۔

(۶) واو اور یائے کے تلفظ میں قطعیت۔

اردو میں یائے اور واو بطور ثقیل حرکت تین تین آوازوں کے لیے (یائے معروف، یائے
یائے لین۔ واو معروف، واو مجہول اور واو لین) استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن جب یہ خود حرکت
کرتے ہیں (اُو، یہ [illegible]) تو یہ ان کا معنی کردار ہوتا ہے۔

نارنگ صاحب نے اپنی پرائمر میں ان کے لیے یک رنگی کے بدلے سہ رنگی پالیسی اپنائی
جیسے کبھی یائے کے دونوں نقطوں کے نیچے کھڑی زیر اور واو پر الٹا پیش دے کر
چاہیں اور کا چور املا مقرر کیا گیا ہے۔ یہ طریقہ اردو رسم الخط کے صوتی ڈھانچے کے بالکل
ہے۔ اردو رسم الخط کا یہ اصول ہے کہ حرکت کی آواز جس حرف میں شامل ہوگی اسی حرف پر
استعمال کریں گے۔ چین لکھنے سے 'ین' اور چور لکھنے سے 'ور' کی آواز بنے گی چی اور چو کی
یائے پر کھڑی زیر اور واو پر الٹا پیش دینے سے ان کے قابل کے دونوں چاہے ساکن
گے جو اردو کے صوتی نظام کے بالکل خلاف ہے۔ اردو میں ایسا ایک بھی لفظ نہیں جس
حرف ساکن ہو۔ اگر پہلے حرف پر ہی حرکات دے کر چین اور چور لکھا جاتا تو یہ املا اردو

کے صوتی نظام کے عین مطابق ہوتا جیسا کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے کہا ہے۔

نارنگ صاحب نے یائے مجہول (ے) اور واو مجہول کی آوازیں پیدا کرنے کے لیے یائے اور واو کے ماقبل اور مابعد یعنی تینوں حروف کو ساکن رکھ کر بھین کا ... املا مقرر کیا ہے۔ یہ طریقہ ہندی، انگریزی اور اردو تینوں زبانوں کے صوتی نظام کے برعکس ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر دو یا چند ساکن حروف (جیسے st، sts) یکجا ہو جائیں تو بھی ان سے کسی طرح کی آواز نہیں بنے گی۔ کسی بھی لفظ کی آواز پیدا کرنے کے لیے کم از کم ایک متحرک حرف ہونا لازمی ہے۔

نارنگ صاحب نے یائے لین اور واو لین (تو) کی آواز پیدا کرنے کے لیے بجائے دونوں کے ماقبل فتح استعمال کیا ہے۔ نارنگ صاحب کہتے ہیں: "خدا بھلا کرے بابائے اردو عبدالحق اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کا کہ اردو اعراب کی بعض صورتوں میں قاعدہ بندی کی صورت ہوگئی۔ ان میں کم از کم یائے معروف کے لیے یائے پر کھڑی زیر اور واو معروف کے لیے واو پر پیش۔ لیکن ابو محمد سحر کی لسانی بصیرت کو یہ بھی گوارا نہیں۔ فرماتے ہیں: "یائے معروف کی طرح معروف کے لیے جو علامت اخبار کی گئی ہے وہ بھی قباحت سے خالی نہیں۔ یہاں بھی کھڑی زیر یائے معروف کے نیچے الٹا پیش واو معروف پر لگانے کے بجائے حرف ماقبل یعنی اس حرف پر لگائے جائیں جس پر وہ پڑھے جاتے ہیں۔"

(رشاع جلد ۷، شمارہ ۱)

نارنگ صاحب آگے فرماتے ہیں: "اگر یہ بیان انتشار پھیلانے کی بدترین مثال نہیں تو کیا ہے؟ ڈاکٹر ابو محمد سحر کے پاس کوئی سسٹم نہیں اور اگر کوئی سسٹم ہے تو اس کی بنیاد ... غور فرمائیں جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے یائے معروف اور واو معروف کی آوازیں پیدا کرنے ... نارنگ صاحب ہی انتشار پیدا کر رہے ہیں۔ سحر صاحب کے پاس سائنٹفک سسٹم ہے اور یہ صوتیات کی مضبوط بنیاد پر قائم ہے۔

بابائے اردو، اردو کے شیدائی تھے۔ آپ کو ہر اعتبار سے اردو کو دنیا کی بہترین زبان ... کا دھن سوار تھا، آپ اردو تحریر کے تلفظ میں قطعیت پیدا کرنے اور اردو کے دیگر املائی ... درس مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے سرگرداں تھے۔ ان دنوں سب سے پہلے اردو کی اصلاح کی آواز ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اٹھائی تھی۔ آپ فارسی اور عربی زبان کے شہرت کے عالم تھے۔ بس کیا تھا۔ بابائے اردو کو جس کی تلاش تھی وہ مل گیا۔ آپ نے ڈاکٹر ... کی سرپرستی اور دتاتاریہ کیفی جیسے نامی گرامی معاصرین کی ایک املا کمیٹی بنا دی۔ بابائے اردو ... جزئی اصلاح کے بعد سفارشات کو انجمن کے ناگپور کے اجلاس میں منعقدہ ۱۹۴۲ء میں پاس کرالیا۔

ان دنوں املائی مسائل حل کرنے کی آج کی طرح لسانیات کی کسوٹی پر پرکھ کر حق ...

ذ پیدا کرنے کی نعمت غیر مترقبہ نہ تھی۔ چنانچہ املا کمیٹی کی بیشتر سفارشیں ناقابلِ عمل ثابت
ئیں۔

حیرت تو یہ ہے کہ نارنگ صاحب جیسا لسانیات کا عالم علم و دانش کی لسانی کسوٹی پر
یز کو پرکھ کر ماننے یا نہیں ماننے کے بدلے صرف اس لیے مان لیا ہے کہ یہ کسی مسلم الثبوت
پایہ کے بزرگ کی باتیں ہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب نے اپنی رپورٹ میں کھڑا زبر
زبر، کھڑی زیر، سادہ زیر، الٹا پیش اور سادہ پیش کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ اگر وہ
تے تو ان کا صحیح استعمال کر کے اردو تحریر کے تلفظ میں شاندار طور پر قطعیت پیدا کر دیتے۔
ہی لفظ کے صحیح تلفظ سے متعارف کرانے کے لیے پہلی بار اس لفظ کو تمام حرکات اور
متوں کے ساتھ لکھتے لیکن بعد خارجی حرکات اور علامتوں کو حذف کر دیتے۔

(۷) جزم کی علامت۔

نارنگ صاحب کی پرائمر میں جزم کی مروّجہ علامت (د) کے بدلے ایک نئی (۸) علامت
تعمال کی گئی ہے جب کہ عربی اور فارسی رسم الخط میں تا حال جزم کی مروجہ علامت (د) ہی استعمال
ہی ہے۔ فارسی، عربی اور اردو رسم الخط کی بنی بنائی یکسانیت توڑ کر جزم کے لیے نئی
ت وضع کرنا مناسب نہیں۔

راقم الحروف ایسا محسوس کرتا ہے کہ اردو رسم الخط کے بانیوں نے اپنے سامنے آدمی کھڑا
کے یا خود سامنے آئینہ رکھ کر حرکات کا تلفظ کیا اور اپنے مشاہدہ کی بنیاد پر حرکات کی شکلیں،
کے مقام اور نام متعین کیے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ زبر اور پیش دونوں حروف کے اوپر ہی دیے
تے ہیں لیکن ایک کا زبر یعنی بالائی اور دوسرے کا پیشین یعنی پیشین نام رکھا اور ایک کی صورت
ٹ لیکن دوسرے کی مدوّر (و) بنائی۔

زبر سے "اَ" کی آواز پیدا ہوتی ہے اور اس کا تلفظ کرنے میں بالائی جبڑا اوپر اٹھتا ہے۔
پر اس کا نام زبر یا بالائی سپاٹ اشارہ رکھا گیا۔ پیش (اُ) کا تلفظ کرنے میں اگلے دونوں ہونٹھ
رہو جاتے ہیں اس لیے پیش کی صورت گول (اُ) مقرر کی گئی اور اس کا نام اگلا (پیشین) مدور
ر رکھا گیا۔ اسی طرح زیر کی خفیف (اِ) آواز پیدا کرنے کے لیے نچلے جبڑے کو نیچے گرانا پڑتا
اور اس سے مدوّر کے بدلے سپاٹ آواز پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اس اشارے کو
ور زیرین اشارہ کہا گیا۔

بس طرح بچے لوہے کی گول رنگ ہک (د) سے پکڑ کر دوڑاتے رہتے ہیں اسی طرح دائیں
کے متحرک حرف کو کھینچ کر اگلے ساکن حرف کے ساتھ ملا کر پڑھنے کے لیے ہک نما (د) جزم
مت مقرر کی گئی۔ جزم (د) سے بائیں طرف کھینچنے کا اشارہ پیدا ہوتا ہے۔

آج سے تیس سال قبل ۸ دسمبر ۱۹۶۰ء کے ہماری زبان، نئی دہلی میں ایک یا چند ساکن
ف کو اگلے متحرک حرف کے ساتھ دبا کر جڑواں حرف بنانے کے لیے میں نے ساکن حرف

پرو حمثان (۸) اشارہ دینے کی تجویز رکھی تھی۔ چمٹے ہک کی طرح کھینچے نہیں بلکہ دو یا چند حروف کو
کر ایک ساتھ ملا دیتے ہیں۔ اس قیاس پر ہم نے انگریزی کے [illegible] ستاف [illegible] پر
اور [illegible] کا ہما تما اردو املا مقرر کیا تھا۔ یہ چمٹے ساکن حروف پر ہیں جو اگلے متحرک حرف
ملا کر جڑواں حرف بنانے کا اشارہ پیدا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں اس علامت (۸)
کے لیے نہیں بلکہ جڑواں حرف بنانے کے لیے استعمال کروں گا اور اس کو سکون کہوں گا
میں نے ہک اور چمٹے کا استعمال کیا ہے لیکن بچوں کو بنا دیا جائے گا کہ پڑھے لکھے ہک
اور چمٹے کو سکون کہتے ہیں۔

(۸) جڑواں مصمتے Consonant cluster ([illegible])

ہندی اور انگریزی میں کثرت سے مصمتی خوشے استعمال ہوتے ہیں۔ بابائے اردو
تھے جو چاہتے تھے کہ جہاں کہیں ضرورت ہو ایسے انگریزی اور ہندی الفاظ کو مصمتی خوشے
ہی لکھا جائے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر گیان چند جین مصمتی خوشے استعمال کرنے
صف اول کے مبلغ ہیں لیکن بدقسمتی سے آپ دونوں حضرات خود ہی مصمتی خوشوں کے وقوع
متعلق غلط فہمی کے شکار ہیں۔

نارنگ صاحب کہتے ہیں "اردو میں مصمتی خوشے اکثر الفاظ کے بیچ میں اور خال خال
آخر میں آتے ہیں۔ موصوف کا یہ دعوا سراسر غلط ہے۔ اردو میں مصمتی خوشے الفاظ کے
درمیان یا آخر میں کہیں بھی نہیں بنتے۔ اردو میں مصمتی خوشے بنا کر لکھنے کا سرے سے رواج
ہے۔ لیکن ہندی اور انگریزی کے ایسے الفاظ کو جن میں کلسٹر بنتے ہیں اردو میں بھی مصمتی
کا رواج پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

آگے چل کر کہتے ہیں کہ جڑواں مصمتے جزم سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ جیسے چشم، بخت اور
وغیرہ۔ موصوف کا یہ دعوا بھی سراپا غلط اور گمراہ کن ہے۔ چشم، بخت اور وقت میں مصمتی
نہیں بنے ہیں۔ بلاشبہ ان الفاظ کے آخر میں دو دو ساکن حروف یکجا ہو گئے ہیں۔ اگر جزم
نہیں ہوتا تو ہم آخری دونوں ساکن حروف کو ملا کر مصمتی خوشے بنا لیتے۔ جیسے ہم ج...
خت اور س...... خت وغیرہ۔ لیکن شامت تو یہ ہے کہ جزم نے مصمتی خوشوں کے بنے
انضمام کو منتشر کر دیا۔ جزم دینے کے بعد ان کا تلفظ چش...... م، بخ...... ت اور
ہوگا اور جزم کی بدولت مصمتی خوشے بننے کا امکان ختم ہو جائے گا۔ جزم متحرک حرف کے بعد
پر دیا جاتا ہے۔ جیسے پُر لیکن مصمتی خوشہ ساکن حرف کے بعد متحرک حرف آنے پر بنتا ہے

(ساتھ و دھیان) [illegible] پرساد [illegible] پُردا [illegible] = پڑ [illegible] = پڑ

نارنگ صاحب نے اپنی کتاب "املا نامہ" کے صفحہ " پر ہندی کے [illegible]
کا اردو املا جڑواں حروف بنانے کو اپنی مجوزہ علامت پہلے ساکن حروف پر نہیں بلکہ
متحرک یائے (یا یا یو) پر دے کر ترتیب وار پیار، کیاری اور نیولا مقرر کیا ہے۔

ش غلطی ہے جس کی نارنگ صاحب سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ پتا نہیں کتنے اردو اساتذہ
طلبہ اس دعوے سے گمراہ ہوچکے ہیں۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ آپ نے اسی صفحہ پر [illegible] کا اردو املا پہلے
ن حروف پر یہی علامت دے کر براہمن، پریت اور ویراگیہ مقرر کیا ہے۔ اردو میں جڑواں حروف
کے مذکورہ بالا متضاد وقوع اردو طلبہ اور اساتذہ کے لیے ہمیشہ معما بنے رہیں گے۔ ایسا
تا ہے کہ مصمتی خوشہ بننے کے معاملے میں موصوف خود ہی غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں۔

(۹) ہندی الفاظ کا اردو املا

اردو مختلف زبانوں کے میل سے بنی ہے۔ اب تو شعوری طور پر اردو میں کثرت سے
ی کے اصطلاحی اور غیر اصطلاحی الفاظ استعمال ہونے لگے ہیں اور اردو کے اس رجحان کو روکا
نہیں جاسکتا۔ اردو جس ماحول میں پرورش پا رہی ہے اس کا مقتضا ہے کہ ہم جن ہندی
اظ کو اردو میں لکھتے پڑھتے ہیں انھیں جہاں تک ممکن ہو ہندی لہجے کے مطابق لکھا کریں۔
۳ اگست ۱۹۸۳ء کو آدی باسی ہوسٹل رانچی میں پروفیسر ابوذر عثمانی ہمارے شاگردوں کا
حان لینے آئے تھے۔ موصوف گھوم گھوم کر طلبہ کی تحریر کا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ کچھ دیر بعد
ے آپ نے مجھے بلا کر کہا، "حیرت ہے! آپ کے شاگردوں نے روزانہ ایک گھنٹہ پڑھ کر محض
دہ گھنٹوں میں اتنی صلاحیت پیدا کر لی ہے کہ وہ ہندی لہجے کے عین مطابق آدی واسی، ہا، ہئی
دھیان لکھتے ہیں جب کہ ہم لوگ ہی انھیں غلط طور پر آدی باسی، ہوا، ہوئی اور دھیان لکھتے
تے ہیں۔

نارنگ صاحب کو بھی اپنی پرائمر میں کم از کم پہلی بار ساکن حروف پر مصمتی خوشہ بنانے
پنی یا راقم الحروف کی مجوزہ علامت دے کر [illegible] کا دھیان [illegible] کا دھیان [illegible] کا ہا
[illegible] کا ہئی اردو املا متعین کرنا چاہیے۔ ایک بار ایسے الفاظ کو پوری صحت کے ساتھ لکھ کر بعد
اردو کی مختصر نگاری کا لحاظ کرتے ہوئے خارجی حرکات اور علامتیں حذف کی جاسکتی ہیں۔ آپ
ہندی کے کا اردو املا "رت" استعمال کیا ہے۔ ہندی لہجے کے مطابق اس کا فطری اردو املا
رت" ہونا چاہیے لیکن اردو رسم الخط کا معمول ہے کہ کسی بھی لفظ کے آخری حرف میں اگر خفیف
ت ہو تو وہ حرکت ثقیل ہو جاتی ہے جیسے [illegible] کو اردو میں ثقیل ای سے شکتی لکھیں گے۔
رعایت سے ہم کو ثقیل او [illegible] کو "رتو" لکھ سکتے ہیں۔

(۱۰) مشکل الفاظ کے معنے

نارنگ صاحب نے ہر سبق میں استعمال ہوئے مشکل الفاظ کو سبق شروع ہونے کے پہلے
جلی حروف میں لکھ کر انھیں پڑھوا دینے اور معنی بتا دینے کا طریقہ اپنایا ہے۔ یہ طریقہ غیر نفسیاتی اور
تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔
کسی سبق میں استعمال ہوئے مشکل الفاظ کے معنی بتانے کا طریقہ یہ ہے کہ جس جملہ میں وہ
استعمال ہوا ہے اس کا وہیں سیاق و سباق سے مفہوم بچوں کو ذہن نشین کرا دیا جائے اگر ضرورت

ہو تو مختلف مثالوں تشبیہوں اور استعمالوں سے ان کا مطلب واضح کیا جائے۔ البتہ اس لفظ کو
جہاں وہ استعمال ہوا ہے وہیں جلی حروف میں لکھنا بہتر ہے۔ سبق ختم ہونے کے بعد ایسے الفاظ
سے جملے بنانے کی مشق کرانا ضروری ہے۔ ایک اچھا معلم تو جب تک طلبہ لکھنا پڑھنا نہ سیکھ جائے
نئے نئے الفاظ کو کارڈوں، فیتوں اور چارٹوں پر خوبصورت حروف میں لکھ کر کمرے میں ایک
ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ طلبہ دیوار پر ٹنگے چارٹ، کارڈ پر لکھے ہوئے الفاظ اور فیتوں پر
دکھائے گئے الفاظ برابر دیکھیں اور پڑھیں۔

(۱۱) نارنگ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر مدرس چاہے تو وہ روایتی طریقوں سے بھی اس
قاعدے سے پڑھا سکتے ہیں۔ اول تو بغیر سمجھے بوجھے حروف تہجی رٹوانا ان دنوں بچوں پر بہت بڑا
جرم سمجھا جاتا ہے۔ دوم یہ بھی کہ ایسی حالت میں یہ پرائمر بالکل بے کار ثابت ہوگی۔ انھیں تو
پہلے حروف تہجی، پھر الف زبر اَ، بے زبر بَ، الف زیر اِ، بے زیر بِ۔ اور اَب وغیرہ پڑھانے
والے قاعدے کی ضرورت پڑے گی اور موصوف کا قاعدہ بالکل بے کار ثابت ہوگا۔

(۱۲) نارنگ صاحب نے حروف تہجی کی فہرست میں یائے معروف اور یائے مجہول پر
نقطے استعمال نہیں کیے ہیں۔ ایسی حالت میں شوشوں کے طور پر استعمال کرنے سے ہمیں ان پر نقطے
دینے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ حروف تہجی میں سارے حروف کو ان کی صحیح صورت میں پیش کرنا چاہیے
یہ دوسری بات ہے کہ جب یہ الفاظ کے آخر میں استعمال ہوتے ہیں تو بغیر نقطے بھی انھیں پڑھنے
میں کسی طرح کا اشتباہ نہیں ہوتا۔ لیکن تہجی میں ان پر نقطے دینا لازمی ہے۔

(۱۳) برصغیر ہند و پاک کے جید علماء لسانیات میں سے کسی بھی عالم نے آج تک اردو رسم الخط
کے اپنے مخصوص صوتی نظام کے رازہائے سربستہ کو اجاگر کرنے کے بدلے سب کے سب رو
رسم الخط کا چشمہ لگا کر اردو تحریر میں غلط طور پر انگریزی کے واول، نیم واول، کانسوننٹل کلسٹر،
ڈپتھانگ اور گلائیڈس وغیرہ وقوع ثابت کرتے ہیں۔ حالانکہ جس طرح رومن رسم الخط میں ارد
کے زبر، زیر، پیش، جزم، تشدید اور تنوین وغیرہ نہیں ہیں اسی طرح رومن رسم الخط کی مذکو
بالا اصطلاحوں کے ہم پلہ اردو مترادفات نہیں ہیں۔ اردو رسم الخط کا اپنا شاندار صوتی نظام ہے۔ ارد
صوتیات کا راز حرکات نما جھنڈیوں پر قائم ہے۔ اس کاونٹس کی طرح ان جھنڈیوں سے تلفظ کرنے
اشارہ پیدا ہوتا ہے۔

میں نے بہار اردو اکادمی کے زبان و ادب میں "لسانی مغالطے" عنوان سے (اکتوبر تا
۱۹۸۲ء) ایک مقالہ شائع کیا تھا۔ بدقسمتی سے کسی وجہ سے اس کا کچھ حصہ حذف کر دیا گیا۔ انشا
اگر صحت نے ساتھ دیا تو میں باقی ماندہ مغالطوں کی نشان دہی کروں گا۔

(۱۴) نارنگ صاحب کی پرائمر کا آغاز ہی غیر نفسیاتی طور پر کیا گیا ہے۔ دائیں سرو
پر چار چار سال کے دو بچوں کو کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ جب کہ یہ کتاب چھے سال کے بچوں
لیے لکھی گئی ہے۔ سرورق کی تصویریں دیکھ کر بچوں میں پڑھنے کے بدلے کھیلنے کا شوق پیدا
نفسیاتی طریقہ تو یہ ہوتا جب سرورق پر چھے سال کے بچے اور بچیوں کے اسکول جانے کی تصو

ہیں۔ اس سے بچوں کو تصویر دیکھ کر خود بھی اسکول جانے کا شوق پیدا ہوتا۔ اردو پرائمر کے دائیں سرورق کی تصویریں بائیں سرورق سے زیادہ دلکش ہوتی ہیں تاکہ بچے دائیں طرف سے ہی پرائمر کھولیں۔ اس کے برعکس نارنگ صاحب کی پرائمر کے بائیں سرورق کی تصویریں نسبتاً زیادہ دلکش ہیں۔

نارنگ صاحب کی پرائمر میں عام طور پر غیر نفسیاتی اور متعلق تصویریں استعمال کی گئی ہیں۔ مثلاً صفحہ ایک پر چھ سال کے بدلے دو نوجوان لڑکے اور لڑکیوں اور دادا کی غیر نفسیاتی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ صفحہ پانچ پر ہائی اسکول جانے والے سولہ سے اٹھارہ سال کی عمر والے دو لڑکوں کی تصویریں غیر ضروری اور غیر نفسیاتی ہیں۔ صفحہ آٹھ پر صرف ایک ہی لفظ "ڈول" سکھانے کے لیے "ڈول" کے بدلے بالٹی سے پانی بٹاتے ہوئے بچوں کو دکھایا گیا ہے۔ ڈول کا استعمال کنوں سے پانی کھینچنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ صفحہ سترہ پر ڈاکیہ کسی شخص کو خط دیتے ہوئے دکھایا جاتا تو اور بات تھی لیکن ڈاکیہ کو چھوڑ کر وہاں کی ساری تصویریں بے کار ہیں۔ صفحہ اٹھائیس پر خواہ مخواہ اٹھارہ سال کی لڑکی کی تصویر بنائی گئی۔ صفحہ ۴۰ پر چھ سال کے حامد اور زید کو آگ کے گرد بیٹھ کر دادی اماں سے کہانی سننے کا منظر کیا خوب ہے۔ صفحہ ۴۵ پر گھومتے ہوئے تین بچوں اور درختوں کا سبق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ●●

ڈاکٹر حمیرا خاتون
مذ یونی ورسٹی پٹنہ

ڈاکٹر عندلیب شادانی کے خطوط قاضی عبدالودود کے نام

ڈاکٹر عندلیب شادانی اور قاضی صاحب میں گہرے روابط تھے ایک مدت سے دونوں میں مراسلت کا سلسلہ جاری تھا اور یہ خطوط خاصی تعداد میں قاضی صاحب کے پاس محفوظ تھے شادانی صاحب اپنے خطوط میں جہاں علمی باتیں کرتے، تحقیقی نکات درموز پیش کرتے، لفظوں پر بحث کرتے۔ شعروشاعری کی باتیں کرتے تنقیدی نظریہ پیش کرتے وہاں زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی لکھا کرتے۔ اپنی زندگی کی مایوسیاں، محرومیاں، کامیابیاں، ناکامیاں یہ ساری باتیں ہوتیں۔ اپنی صحت کا رونا ہوتا لوگوں سے ملنے جلنے کا حال ہوتا، فقرے بازیاں ہوتیں، ظریفانہ چوٹیں ہوتیں۔ ان ساری چیزوں سے اُن کی شخصیت، اُن کے طرز فکر اور اُن کے اسلوب پر روشنی پڑتی ہے ادب میں ایسے خطوط کی اہمیت ہے۔

قدرت نے اُردو کو شادانی صاحب جیسی ایک بڑی ادبی دولت عطا کی وہ شاعر بھی تھے نقاد بھی، افسانہ نگار بھی تھے اور محقق بھی۔ یعنی ان کی شخصیت کئی جہتوں سے سامنے آئی۔ ان کی تصانیف میں "کچھ کہانیاں" "تحقیقات" وغیرہ اہم مرتبہ رکھتی ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام بھی چھپا اور ان مضامین کا مجموعہ جو جدید اردو غزل کے عنوان سے "رسالہ ساقی" میں شائع ہوئے تھے یہ سب اُردو ادب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔

قاضی صاحب کے ساتھ خط وکتابت میں اکثر شادانی صاحب اپنے افسانوں کے بارے میں قاضی صاحب کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے جو غزلیں کہتے تھے وہ لکھ بھیجتے تھے قاضی صاحب کے مضامین پڑھ کر اپنے تاثرات کا اظہار کیا کرتے تھے افسوس کی بات یہ ہے کہ شادانی مرحوم کے سارے خطوط قاضی صاحب کے پاس محفوظ نہ رہ سکے۔ ہوا یہ کہ ایک شخص جو شادانی صاحب سے قریب تھے اور ان کی شخصیت اور فن پر کام کر رہے تھے وہ انہی خطوط کو حاصل کرنے کی غرض سے قاضی صاحب کے پاس پہنچے۔ وعدہ کیا گیا کہ یہ سارے خطوط واپس کر دیے جائیں گے

لیکن بعد میں ان کا ایک خط آگیا کہ راہ میں بریف کیس کی چوری کا حادثہ پیش آیا جس میں اور چیزوں کے ساتھ خطوطِ شادانی جیسا قیمتی خزانہ بھی لٹ گیا۔

اب قاضی صاحب کے کاغذات کی چھان بین میں کچھ خطوط ملے ہیں ان میں دو خطوط اشاعت کے لیے بھیج رہی ہوں۔

Kamál, Aqa Kamál 'alyyy of Gyannapur resides at Dighba (or Dhirha) in ... Bihar, writes Persian and Rekhta verses, J. He was a man of learning and wrote a large work called الحکمۃ on Philosophy, and one called "دیوان جہاں" on the Imams, Died in 1215, the chronogram on his death is دریغا

۷/اپریل ۱۹۶۴ء بیگم بازار روڈ۔ ڈھاکہ

مجی تسلیم۔ شام آپ کا خط ملا۔ کمال کا ترجمہ اشپرنگر نقل کر کے بھیج رہا ہوں۔ یہاں ابھی تک فساد کی آگ بھڑک رہی ہے۔ کل بھی ۱ کیس ہوئے۔ ۳ مقتول اور ۴ مجروح۔ آتش زنی کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔ شہر سے بڑھ کر اب یہ وبا دیہات تک پھیل گئی ہے۔ حالت تشویش ناک ہے۔ اس فتنہ کو شروع ہوئے آج پورے تین ہفتے ہو گئے مگر ہنوز بحالی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

طپش کا کلیات صرف (۱۱۹۹ھ تک کا کہا ہوا کلام) ۱۱۹۹ھ میں مرتب ہوا جیسا کہ طپش نے خود دیباچہ میں کہا ہے اور گلزارِ مضامین اس کا نام رکھا اور یہ نام تاریخی ہے یہ دیوان یا کلیات نواب آصف الدولہ کی تحریک پر جہاں ندار شاہ کے ایماسے طپش نے ردیف وار مرتب کیا تھا۔ وتاسی کا مطلب جو آپ نے سمجھا وہی صحیح ہے۔ لیکن ارباب نثرِ اردو لکھتے ہیں کہ ۱۸۱۱ء میں ان کا (طپش کا) کلیات بھی کالج کی طرف سے شائع ہوا۔" پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

"۱۸۱۲ء میں اُن کے کلیات کا ایک نسخہ کالج نے خرید لیا اور ان کی شاعرانہ قابلیت کے اعتراف میں گراں قدر صلہ دیا۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کالج کی جانب سے یہ کلیات شائع ہوا تھا مگر اب اس کے نسخے بالکل ناپید معلوم ہوتے ہیں۔"

صاحبِ ارباب نثرِ اُردو نے اس مطبوعہ کلیات کا کوئی نسخہ یا کلیات کا کوئی قلمی نسخہ اپنی نظر سے دیکھا۔ معلوم نہیں ان کا یہ بیان کہ کلیات کالج کی طرف سے شائع ہوا کس کا غذ پر مبنی ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ کالج نے کلیات خریدا تو ۱۸۱۲ء میں اور شائع اس سے ایک سال پہلے ہی کر دیا۔ شاید کاتب کی غلطی ہو۔ اشپرنگر نے لکھا ہے کہ "مجوسی کے زمانے میں یوسف و زلیخا لکھی۔" بظاہر اس کا یہ بیان قاسم کے تذکرے سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ اگر قاسم کا تذکرہ آپ کے پاس ہو یا پٹنہ لائبریری میں ہو تو ذرا اس امر کی تحقیق کر لیجیے گا۔ کیا "دیوان جہاں" کا کوئی نسخہ آپ کے پاس یا پٹنہ لائبریری میں موجود ہے؟ صاحبِ ارباب نثرِ اردو نے لکھا ہے کہ "یہ تذکرہ بالکل نایاب ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں ہے اور غالباً یہی نسخہ محفوظ ہے۔"

خدا کرے تذکرۂ عشقی کے وہ اوراق ضائع نہ ہوں جو طپش سے متعلق تھے۔ اگر موجود ہوں تو طپش کا حال نقل کرکے بھیج دیجیے۔

آپ کی رائے سے مجھے اتفاق ہے یعنی اس وقت طپش کے مفصل حالات لکھنے کا خیال نہیں ہے۔ شمس البیان کی اشاعت کے بعد دیوان طپش کا انتخاب آپ کے مشورہ کے مطابق شائع کیا جائے گا۔ میرے نسخہ میں گلزار مضامین کا دیباچہ موجود ہے اور اس کی اشاعت ازبس ضروری ہے۔ نہایت مفید چیز ہے۔ اس کے متعلق میں نے اس وقت بھی آپ سے ذکر کیا تھا، جب میں بیماری کے زمانہ میں آپ کے یہاں مقیم تھا۔

سراج عفیف کی فارسی کے بارے میں اپنی رائے آیندہ خط میں لکھوں گا۔

شمس البیان کے متعلق صاحب ارباب نثر اردو لکھتے ہیں کہ "ہمارے عنایت فرما مولوی عمر یافعی کے ہاں میر احمد علی صاحب عصر مرحوم حیدرآبادی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ موجود ہے جس کی کتابت ۱۲۸۲ھ کی ہے گویا یہ نسخہ تاریخ تالیف سے ۶۷ برس بعد کا لکھا ہوا ہے۔"

اُن کے بیان سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ شمس البیان کا یہ نسخہ ناقص ہے مگر آگے چل کر لکھا ہے کہ شمس البیان میں ۲۷۵ محاوروں کو ردیف وار مرتب کیا ہے۔ حالانکہ میرے نسخہ میں مصطلحات کی تعداد ۴۲۶ ہے۔ غالباً مطبوعہ نسخہ بھی صاحب ارباب نثر اردو کی نظر سے نہیں گزرا۔ تعجب ہے کہ یہ لوگ کتابیں اور تاریخ ادب کے متعلق کتابیں لکھتے ہیں لیکن اتنی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ جو مواد موجود ہے اُسے فراہم کریں۔

والسلام شادانی

۷؍اپریل ۱۹۴۱ء

۱۸ جنوری ۱۹۴۰ء		۴، بیگم بازار روڈ۔ ڈھاکہ

مجبی، تسلیم آپ کا لفافہ اور پوسٹ کارڈ دونوں یکے بعد دیگرے وصول ہوئے۔ شمس البیان کی نقل میں اپنے ہاتھ سے کر رہا ہوں اور چونکہ ہاتھ میں ایک مدت سے درد رہتا ہے اس لیے تاخیر ہوئی۔ انشاء اللہ چھے سات دن میں نقل تمام ہو جائے گی۔ اس وقت میں یہ نسخہ آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ اور نقل کے دوران میں جو جو باتیں شمس البیان کے متعلق میرے ذہن میں آئی ہیں۔ وہ بھی آپ کو لکھوں گا۔ س البیان کا مطبوعہ نسخہ اگر بانکی پور میں ہو تو مستعار لے کر ایک ہفتہ کے لیے بھیج دیجیے تاکہ میں اس سے مقابلہ کر لوں اور بہتر یہ ہو کہ مقابلہ کرنے کے بعد آپ کو بھیجوں گا کہ جو مقام مشکوک رہ جائیں اُن کے متعلق آپ سے مشورہ کر سکوں مطبوعہ نسخے اس قلمی نسخے سے جو طپش کے ہاتھ کا لکھا ہوا بیان کیا جاتا ہے۔ مقابلہ کرنے کے بعد پھر کسی مزید نسخہ سے مقابلہ کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

عشقی کے تذکرہ کا کوئی نسخہ یہاں موجود نہیں۔ ہوش کا جو دیوان (قلمی) میرے پاس ہے اس میں مندرجہ ذیل قطعات تاریخ ہیں؛

تاریخ تہنیت عید الفطر جہتہ نواب حسن رضا خاں بہادر

ہو خوبی دُنیا ہی جہاں تک تجکو + تہنیت اور عیدی ہر ایک تجکو۔ نقل مطابق اصل

تاریخ دو دعا ہی یہ ہو یہ اقبال + صد عید الفطر ہی مبارک مجکو

[قطع تاریخ مراجعت مہربان خاں بہادر از دہلی بفرخ آباد
[اس قطعہ میں ۵ شعر ہیں مصرعۂ تاریخ یہ ہے۔ وہ آیا مہربان خان بہادر

[قطعہ تاریخ علم کہ سرفراز الدولہ نواب حسن رضا خاں بہادر ظفر جنگ ۱۱۸۴ نذر حضرت عباس ساختہ
[اس قطعہ میں بھی ۵ شعر ہیں۔ مصرعۂ تاریخ یہ ہے۔ بر منت سایۂ زمین علم بادا

۱۱۵۴
قطعۂ تاریخ چاہ کہ مہاراجا ملکیت راسۂ ساختہ

ساخت چاہ نو مہاراجا بنا — آنکہ فیاض است چوں ابر مطیر
از برائے سال تاریخش بدل — فکر و غور سے داشت ہر روشن ضمیر
گفت ہاتف از پئے تعمیر او — سال تاریخش کہ چاہے بے نظیر

قطعۂ تاریخ مسجد شاہ منور۔ (مصرعۂ) از سر مسجد بگو عفو گنہ جرم خلق

۱۱۹۴

قطعۂ تاریخ وفات ملک الشعرائے ہند مرزا محمد رفیع سودائے مغفور

خلد کو جب حضرت سودا گئے — رنج میرے دل کو بھی بے حد ہوا
بولی منصف دور کر پائے عناد — شاعران ہند کا سرور گیا

خان کا ترجمہ ہنوز وصول نہیں ہوا۔ خدا کرے آرزو جلیلی صاحب اب بالکل اچھے ہوں اُنھیں میرا اسلام کہہ دیجیے۔

فانی کا شعر جو آپ نے نقل کیا ہے اس کا مطلب وہی صحیح معلوم ہوتا ہے جو آپ نے لکھا میرے دوسرے خط کی ایک ضروری بات کا آپ نے جواب نہیں دیا۔ وہ یہ کہ اب آپ کی صحت کیسی ہے۔ براہ کرم پوری تفصیل لکھیے۔ اس مرتبہ نہ بھول جائے گا۔ مسز وددی کی مزاج پرسی۔ سید صاحب کو میرا اسلام پہنچے۔

والسلام آپ کا شادانی

۱۸ جنوری ۱۹۴۱ء

یوسف ناظم
الهلال۔۱۳۔باندرہ ریکلیمشن
بمبئی۔۵۰

غالبؔ کی خطوط نگاریؔ جاریؔ ہے

مرزا اسد اللہ خاں غالب و اسد کو جتنی قدرت شعر گوئی پر حاصل تھی اتنی ہی بلکہ اس سے دو فیصد زیادہ مکتوب نگاری پر حاصل تھی۔ (اُن کی مکتوب نگاری مقبول بھی بہت ہوئی کیونکہ ان کے سمجھنے کے لیے کسی شرح کی ضرورت نہیں تھی) مکتوب نگاری اصل میں اُن کی عادت تھی۔ روزانہ وہ غزل کہتے ہوں یا نہ کہتے ہوں لیکن ایک نہ ایک خط ضرور لکھتے تھے۔ وہ جس زمانے میں قیدِ حیات و بندِ غم میں اسیر تھے اُس وقت کے اُن کے مخاطب اور مکتوب الیہ تو ظاہر ہے اُن کے ساتھ ہی وہیں کہیں ہوں گے لیکن اسد اللہ خاں غالب معلوم نہیں کیسے اور کس طرح نئے نئے نام اور اُن کے ڈاک کے پتے حاصل کر لیتے ہیں۔ اُن کے وسائل یہاں بھی کم نہیں تھے وہاں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ قیاس کہتا ہے کہ موصوف نام اور پتے حاصل کرنے کا کام نکیرین سے لیتے ہوں گے۔ یہی دو حضرات یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ اب نکیرین سے غالب کی دوستی بھی ہو چکی ہوگی کیونکہ غالب اب بادۂ دوشینہ سے شوق نہیں فرماتے اور نکیرین اِن کے پاس سے گھبرا کے بھاگ نے پر مجبور نہیں ہوتے۔ یہی نکیرین اپنی فرصت کے اوقات میں زندہ لوگوں کے نام اور پتے جمع کرتے اور انھیں پہنچاتے ہوں گے۔ غالب کو دنیا سے رخصت ہوئے ایک صدی سے زیادہ کی مدّت ہو گئی لیکن اِن کی مکتوب نگاری کی عادت اب بھی برقرار ہے۔ یوں کہنے کو سودا کے پاس بہت بڑا قلمدان تھا لیکن سودا غالباً اسے ساتھ نہیں لے جاسکے اور یہ ان کی تحویل میں تھا بھی کب۔ غنچہ شاید ان کے ساتھ وہاں پہنچا بھی نہیں۔ سودا اس قلمدان سے کام بھی کیا لیتے۔ بہشت میں انھیں کوئی ایسا شخص دستیاب ہی نہیں ہوتا جس کی ہجو کہی جا سکتی۔ خط انھوں نے کسی کو یہاں نہیں لکھے تو وہاں بیٹھ کر کیوں لکھتے۔ غالب نے البتہ اپنا قلمدانِ ظرافت ہمیشہ زیرِ استعمال رکھا۔ اچھی اور عمدہ اسٹیشنری استعمال کی۔ اُن کی تحریر میں اب بھی وہی شوخی اور شگفتگی ہے جو اُس وقت تھی جب وہ زندہ و سلامت تھے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ انھوں نے اب تک اپنا تعلق اہلِ زمین سے برقرار رکھا ہے اور انھیں علم ہے کہ ان کے خطوں کی یہاں کتنی قدر و منزلت ہو رہی ہے اور یہی وجہ ہوگی کہ وہ آج بھی یہاں کسی نہ کسی کے نام خط بھیجتے رہتے ہیں۔ میرے نام اُن کا اب تک کوئی خط نہیں آیا لیکن

اتفاق ہے کہ میرے ایک محترم دوست کا موصولہ خط غلطی سے ڈاکیا مجھے دے گیا۔ اب اسے امانت میں خیانت کہیے یا باضابطہ ڈاکہ۔ یہ خط میں نے مکتوب الیہ کو نہیں پہنچایا۔ غالب نے اپنے آپ کو فرماں روائے کشورِ ہندوستان کہا تھا اور فرماں روا کا خط تو فرمان ہوتا ہے۔ جو سب کے لیے ہوتا ہے۔ خط (جو مطابق اصل ہے) پیش ہے۔

۱۷ر کہکشاں۔ فلک ہفتم

عزیز القدر سیّد محمی رضا طول العمرہٗ۔ دعائیں

تم میرا خط پا کر بوکھلا جاؤ گے۔ فطری بات ہے اور تم تو ہو ہی دھان پان۔ تمھارا نام اور پتا بھی حال ہی میں ملا۔ پچھلے دنوں بمبئی کے کچھ لوگ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ ہر روز کوئی نہ کوئی ملنے آتا ہی ہے۔ انھی میں سے کسی نے تمھارا ذکر کیا۔ تمھارے کچھ مراسلے بھی سُنائے۔ خطوں اور مراسلوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ تم ہی کہو سبزے اور کائی میں کیا فرق ہے۔ ہاں مراسلوں کو سبزہ مت سمجھ لینا۔ ان لوگوں نے تو مجھے تمھارے کچھ مراسلے بھی سُنائے۔ انھیں زبانی یاد تھے۔ تم تو خوش قسمت ہو۔ ہمارے تو شعر بھی لوگوں کو یاد نہیں ہوتے تھے۔ ہمارے یہ دو شعر بھلا کسے یاد ہیں:

لکد کوبِ حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب
بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

تم تو کالج میں معلّم رہے ہو اور مجھے بتایا گیا کہ تم کلاس میں ہمیشہ خوش و خرّم رہا کرتے تھے اور اشعار کا بھی حتی المقدور صحیح مطلب بیان کرتے تھے۔ اب جو لوگ اُدھر سے اِدھر آرہے ہیں لکد کوب اور اوضاع کے معنے بھی نہیں جانتے اور سچ پوچھو تو میں بھی اکثر الفاظ کے جو میرے زیرِ استعمال رہے ہیں، معنے بھول گیا ہوں اور لغات کشوری یہاں ہے نہیں۔ مجھے بھی کاغذ قلم یوں سمجھو مروّتاً فراہم کر دیا جاتا ہے اور شعر گوئی تو یہاں بالکل منع ہے ہاں کلام خوانی پر پابندی نہیں ہے۔ اس میں بھی شرط یہ ہے کہ کلام ترنّم سے نہ پڑھا جائے۔ شروع شروع ترنّم کی بھی اجازت تھی لیکن کچھ شاعروں نے ترنّم کو تمھارے مہدی حسن اور نور جہاں کی موسیقی کا رنگ دے دیا تو اس کی ممانعت ہوگئی۔ تم یہ بات اپنے کسی مراسلے میں لکھ دینا۔ بعد میں آنے والے ابھی سے تحت میں پڑھنے کی مشق کر لیں گے۔ ہاں میں جب تک دلّی میں تھا رہائشی مکان کے لیے پریشان رہا۔ یہاں سکون اور آرام سے ہوں لیکن مجھے اب تک علاحدہ مکان الاٹ نہیں ہوا ہے۔ یہاں بھی وہی گرم بازار فوجداری ہے۔ زلف کی سررشتہ داری تو نہیں ہے لیکن تھوڑا تھوڑا اشک باری کا حکم جاری ہے۔ میرے بعد آنے والوں کو اچھی اچھی جگہیں مل گئیں اور مجھ سے بس یہی کہا جا رہا ہے کہ آپ تو فرماں روائے کشورِ ہند

تم آپ کے لائق اور آپ کے شایان شان مکان کا مسئلہ زیرِ غور ہے تب تک آپ اسی اقامت گاہ میں قیام فرمائیں۔ میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے یوں از راہِ تلطف اپنا مہمان بنانے کی پیش کش سے محظوظ و مسرور کیا لیکن تم جانتے ہو ہم تو عرش سے پرے اک مکان کے آرزو مند ہیں اور شاید یہی سبب ہے کہ ہیں اپنے اشعار کی داد اس طور سے مل رہی ہے۔ ہمیں کیا ضرورت تھی کہ یہ شعر کہتے:

ستایش گر ہے زاہد! اس قدر جس باغ رضواں کا

وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

لیکن اپنے کسی مراسلے میں ان باتوں کا ذکر نہ کر دینا۔ مجھ کم بخت نے تو اس سے بھی بُرے شعر کہے تھے جنت و دوزخ کے بارے میں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ان سارے اشعار کا محاسبہ نہیں ہوا۔ یوں بھی یہاں صرف اعمال دیکھے جاتے ہیں اشعار نہیں دیکھے جاتے اور میرے ساتھ تو وہ رعایتیں ہوئیں کہ میرے اعمال بھی نہیں دیکھے گئے۔ مجھے یہاں وہی مراعات ملیں جو تمھارے یہاں کسی فریڈم فائٹر کو ملتی ہیں ۔ کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اب ہمارے 'کشورِ ہندستان' میں فریڈم فائٹر تو نہیں' فائٹر بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ سب کچھ شاید فلموں کی دین ہے۔ اُردو کی فلموں میں جن پر ہندی کا سرٹیفکٹ ہوتا ہے۔ فلم تو شاید ہوتی ہی نہیں ہے صرف فائیٹنگ ہوتی ہے ۔ اور ہاں تم جس عمارت میں رہتے ہو اس میں کیبل لگا یا نہیں۔ نہ لگا ہو تو اب لگوا لو۔ کیبل بہت ضروری چیز ہے اس کے بغیر آدمی نہ تو متمدن ہو سکتا ہے نہ محبِ وطن ۔ خلد میں اِن چیزوں کی البتہ ضرورت نہیں۔ یہاں دل مدعا کا رواج ہے اور تم تو جانتے ہو ہم تو وہیں اپنا دل گُم کر آئے تھے۔

تمھارے وہاں کی ادبی سرگرمیوں کا حال بھی سُنتا رہتا ہوں۔ یہ آزاد غزل کیا چیز ہے۔ غلام آزاد ہوتے ہیں ملک آزاد ہوتے ہیں، قفس سے بلبلیں آزاد ہوتی ہیں لیکن یہ غزل کیسے آزاد ہو گئی۔ پھر وہ نثری نظمیں۔ جو ہو کرو لیکن انھیں ادبی سرگرمیوں کا نام نہ دو۔ اور بہت سے نام ہیں۔ ہتھکنڈ کیسا رہے گا۔ تم اُردو کے اُستاد رہے ہو ان ادبی سرگرمیوں کے بارے میں تمھیں کچھ لکھنا چاہیے تھا۔ اب بھی وقت ہے۔ تمھارے کتنے مراسلے ہو گئے؛ کوئی سو تو ہو ہی چکے ہوں گے۔ کوئی مجموعہ کیوں نہیں چھپواتے۔ ہم نے سُنا ہے کہ وہاں "کئی ادیب اور خاص طور پر مزاح نگار موجود ہیں جو ہر سال اپنی ایک کتاب چھپوا لیتے ہیں۔ دیکھو انھیں دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ اس زمانے میں شیفتہ جیسے لوگ وہاں ہوں گے نہیں لیکن اپنے ہی کسی شاگرد سے کہو کہ وہ ایک انتخاب مرتب کرے۔ اس کی بھی حوصلہ افزائی ہو جائے گی۔

یہاں کبھی کبھی اچھی محفلیں ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال سے بھی ملاقات ہوتی رہتی ہے لیکن وہ الگ مذاق کے آدمی ہیں۔ یا یوں سمجھ لو ہماری اُن سے جمتی نہیں ہے۔ ایک معمولی سی بات پر ہمارا اُن سے جھگڑا ہو گیا۔ ہمارا شعر تھا:

سبزہ و گُل کو دیکھنے کے لیے چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

اور انھوں نے کہا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

اب تم ہی بتاؤ یہ تا اختلاف کی بات۔ لیکن ہیں وہ بڑے دلدار آدمی۔ اُن کی صحبت میں کچھ نہ کچھ ملتا جدید علوم پر انھیں دسترس حاصل ہے۔ خود ان کی رہائش گاہ پر جگمگتا رہتا ہے۔ وہاں انگریزی بھی بولی جاتی ہے جب کہ ہم پُرانوں کی محفلوں میں اب بھی فارسی دانی کو اعزاز سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں کی یہ یہیں کھلتی ہے لیکن یہ سب ہم لوگوں کے چونچلے ہیں۔ تم نئے لوگوں کو فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ اب اُردو پر بھی پھپھوند لگ رہی ہے۔ ہاں یہ بتاؤ وہاں اُردو ہے کس حال میں۔ تمھارے عظیم آباد سے آتا ہے روتا ہوا آتا ہے۔ دوآبے کے لوگ بھی بسورتے ہی رہتے ہیں۔ خیر۔ مجھے کون سا ہندستان میں کا مستقبل کے عنوان پر مقالہ لکھنا اور اُسے کسی سیمنار میں سُنانا ہے۔ تم جانو اور تمھارا کام۔ ہم تو ہیں اُسی کے نام کے۔ یعنی اُردو کے نام۔

مومن خاں مومن سے بھی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ وہ بھی تھوڑے بہت پریشان رہتے ہیں مشکل یہ ہے کہ لوگوں کی کوئی بابی نہیں ہے۔ اُن کی بابی تھی ستارہ شناسی اور یہاں ستارہ شناسی کی گنجائش نہیں ہے۔ تاہم زندہ دل آدمی ہیں۔ محفلوں سے ذرا دور ہی رہتے ہیں لیکن جب بھی کسی محفل میں آجاتے ہیں محفل پُر رونق ہوجاتی ہے۔ میں نے کہا نا کہ یہاں اشعار کا محاسبہ نہیں ہوا۔ مومن خاں اسی لیے بچ گئے ورنہ تم جانتے ہو انھوں نے جنّت کے بارے میں کیا کہا تھا۔ نہیں تمھیں وہ شعر یاد ہوگا۔ اچھے شعر نصاب میں تو تھوڑے ہی شامل کیے جاتے ہیں وہ شعر ہے:

نہ جاؤں گا کبھی جنّت کو میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہووے گا نقشا تمھارے گھر کا سا

۔ ٹھہرو، خوب یاد آیا۔ ہمیں کسی نے بتایا تھا کہ ہم دلّی میں جس مکان میں رہا کرتے تھے اُس مکان میں اب ہیزم سوختنی کی دُکان ہے۔ جس نے بھی یہ بات بتائی اُس نے دکان کے لیے کوئی نہایت ہی غیر مانوس نا زیبا لفظ استعمال کیا تھا۔ ٹال وال کچھ ایسا ہی لفظ تھا۔ ٹال خود تابع مُہمل ہے اس میں وال کا کیا ہے۔ ہمیں تو اس خبر سے خوشی ہوئی۔ مکان برقرار ہے اور آباد ہے یہ کیا کم ہے۔ ہم بھی تو جب تک رہے ہیزم سوختنی کی طرح جلتے رہے۔ ثبوت میں ہماری پوری غزل موجود ہے جس کا مطلع ہے:

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند جل گیا

اور ہمیں عمر بھر آتش نفسوں ہی کی تلاش رہی۔ ایسے آتش نفس مغنی کی جس کی آواز برق فنا ہو۔
تمھیں اب پہلے کے مقابلے میں فرصت زیادہ ہے۔ جی لگا کر خوب مراسلے لکھو لیکن ذرا طویل۔

ہ کہ انگریزی زبان میں تو مراسلے اتنے طویل لکھے جاتے تھے کہ باضابطہ قسط وار چھپتے تھے۔ مجھے کسی نے یہ بھی
یا تھا کہ ایک انگریز یا فرانسیسی شوہر نے اپنی بیوی کو خط لکھنا شروع کیا تو چار سال تک یہ خط لکھتا رہا۔
نا خوش نصیب شوہر تھا اس کا مطلب تو یہی ہوا نا کہ اس کی بیوی چار سال تک میکے میں یا کسی اور جگہ
ا۔ تم جب اپنا مجموعہ تیار کر لو تو اسے مقدمہ نگاروں کی نظروں سے بچا کر رکھنا۔ مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگ
ال ایسے بیٹھے ہیں جو کسی بھی مجموعے کی تاک میں رہتے ہیں کہ ہاتھ لگے تو مقدمہ لکھ ڈالیں۔ بلکہ کچھ لوگ تو کہ
نا کر کسی نوجوان طالب علم سے کتاب بھی لکھوا لیتے ہیں۔ ان کا مقدمہ بھی چھپ جاتا ہے۔ میں تو تمھیں یہ مشورہ
اور دیتا کہ تم میرے اس خط کے کچھ جملے اپنی کتاب کے فلیپ پر چھپوا لو لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ کسی کو یقین
نہیں آئے گا کہ یہ میرے لکھے ہوئے ہیں۔ میرے فلیپ کی وجہ سے تمھاری جگ ہنسائی زیادہ ہوگی۔ کتاب
پ جائے تو اس کی رونمائی کی تقریب کا ضرور اہتمام کرنا۔ اس میں پس و پیش نہ کرنا۔ میری دعائیں
ارے ساتھ ہیں۔

دعاگو اسد اللہ خاں غالب عفی عنہٗ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ
پت جھڑ کی آواز	(افسانے)	قرۃ العین حیدر
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں
قلندر بخش جرأت	(خطبہ)	جمیل جالبی
عجائب گھر	(بچوں کی سائنسی کتاب)	قاسم صدیقی
تاریخ اودھ	(تاریخ)	ترجمہ و ترتیب شاہ عبدا
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	(ادب)	ظ انصاری
تنقید اور جدید اردو تنقید	(تنقید)	ڈاکٹر وزیر آغا
مشقی تدریس، کیوں اور کیسے؟	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں
آوازوں کا میوزیم	(افسانے)	ساگر سرحدی
اپنی ہواؤں کی خوشبو	(خاکے)	کشمیری لال ذاکر
دلی کی چند عجیب ہستیاں	(خاکے)	اشرف صبوحی
چند تصویر بتاں	(تاثرات)	مولانا عبدالسلام قدوائی
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	(ادب)	پروفیسر آل احمد سرور
صاحب جی سلطان جی	(تذکرہ)	ڈاکٹر اسلم فرخی
نظام رنگ	(ادبی خاکہ حضرت نظام الدین اولیا)	" " "
شہید جستجو	(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)	ضیاء الحسن فاروقی
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست	(مذہب)	مشیر الحق
ہمارے دینی علوم	(مذہب)	مولانا اسلم جیراجپوری
تحقیقی مضامین	(تحقیق)	مالک رام
آسان اردو، ورک بک	(تعلیم)	شکیل اختر فاروقی

...زحت
...ا، پروفیسرز کالونی۔ بھوپال

ٹکٹ اپنا نام پرایا

کرنے جاتے ہیں ہم سفر بہ زبان اردو اور بن جاتا ہے وہ انگریزی کا وانگریزی
ایک وجہ ہے!) ہماری قسمت کی فائل بھی کچھ ایسے ٹیڑھے قلم سے خطا سکشت میں لکھی
کر Dealing فرشتے صاحب الٹا سیدھا پڑھ لیتے ہیں۔ اور پھر اس پہ جیسا عمل ہوتا
تو ہمارے حالِ زار سے ظاہر ہی ہے۔
فیراں جہانی اڈمینسٹریٹو ڈپارٹمنٹ کی اندوہ ناک ستم ظریفیوں کے ذکر کے لیے تو الگ
کی ضرورت ہے۔ یہاں آپ کے ذوق پہ بھروسا کرتے ہوئے محض نمونۂ کلام کی طرح
بذر ہے۔

بھاگم بھاگ ہم دلی پہنچے۔ کہ زمانہ ہی بھاگنے دوڑنے کا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ
زی سے واپسی پہ کمر باندھی۔ ریزرویشن کیو کو جو دیکھا تو کچھ طول شبِ فراق، فہم کے
آنے لگے اور نجومی کی مدد کے بغیر محرومیِ قسمت، کا اندازہ وقت سے کچھ پہلے
ا۔

ابھی ہم اس محرومیِ قسمت کی شکایت کے لیے مناسب مقام اور راگ کی فکر میں غلطاں
سے بھی زیادہ بدحواس ایک صاحب نے کیو میں فورس لینڈنگ کی کوشش کی۔
ایئر کریش کے صدمے سے جانبر ہوئے تو ایک پُر شور طوفانی آہ بھری۔ اپنی ہی برادری
پلے تو ہم نے ایک دوسرے کو ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔ پھر دکھ کو جان کے اور درد کو پہچان
انی ٹھانی۔

ا برتھ چاہیے تھی اور انھیں ریزرویشن کینسل کروانا تھا۔ طالب و مطلوب دونوں موجود۔
ہاتھوں کو کام پہ لگایا۔ یعنی اس ہاتھ دیا اور اس ہاتھ لیا۔ وہ خوشی خوشی کچھ ایسی
نے گویا اگلے مقابلے میں P.T. سے میڈل چھین ہی لیں گے۔
لو ہماری بھی ساڑھے پانچویں رہس جاگی۔ ان کے پیچھے ہم لپکے اور پوچھا میاں اپنا
بائکٹ کا نام پتا بتاتے جاؤ کچھ گُر سمجھاتے جاؤ کہ دھوکا دھڑی کے جرم میں گرفتاری سے

سے بچ جائیں۔ کہ بڑی گھڑی دعوت نامہ بھیج کے نہیں آتی۔

پیسا ہاتھ لگتے ہی ان کے تیور بدل چکے تھے (پیسا ہے ہی اتنی بڑی بلا ۔!) اب وہ مظلوم کی صف سے نکل کر ظالموں کے گروپ میں شامل ہو چکے تھے۔ بڑی بے اعتنائی سے تھانے میں رپورٹ لکھوانے والے انداز میں اطلاع دی۔

"پران ناتھ — عمر ساٹھ سال —"

اور یہ جا وہ جا۔ یعنی۔ آن واحد میں ہم عمر کی کئی منزلیں پھلانگ گئے اور ہمارا وجود ہی ختم ہوگیا۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے۔

عمر عزیز کے یوں سر سر گزر جانے کا کیا غم کہ ایک نہ ایک دن تو ہمیں قبر میں پاؤں لٹکا کے بیٹھنا ہی ہے۔ اور اپنی موت کا ماتم فضول کہ دنیا کی تین چوتھائی آبادی روز مر مر کے جیتی ہے مگر یہ 'مسٹر' والا چکر اڑے ہوئے ہوش اڑائے دے رہا تھا۔ خیر اس کا توڑ ہم نے یوں سوچا کہ کوئی دشمن جاں ہمارا اسم گرامی خود ہماری زبانی سننے کا متمنی ہوا تو سُر کے ان دو بولوں میں علم موسیقی کا نچوڑ بھر دیں گے۔ اور فن موسیقی کا وہ شاندار مظاہرہ کریں گے کہ 'سُر سنگیت' ایوارڈ ہمارے علاوہ کسی کو دیا ہی نہ جا سکے۔ یعنی 'پُران ناتھ' کو کھینچ تان کے زور زبردستی اجبراً 'مسٹر' کے ساتھ جوڑ دیں گے۔ وہ بھی اس طرح کے 'مسٹر' نیچے سُر میں اور 'پران ناتھ' اونچے سُر میں۔

دن بھر ہم اپنے اُن دیکھے اُن جانے 'سُر نیم' والے کے نام کی مالا جپتے رہے۔ ویسے بھی ہندستانی فلموں اور دھارا واہک 'رامائن' (جس کا دھارا الٹا نظر آتا ہے ۔!) کی برکت سے یہ نام سو فیصد 'اپنا' ہی لگ رہا تھا۔

یوں بھی ہر واردات، ہر معرکے اور ہر جنگ کی طرح یہاں بھی خوف 'غیر' یعنی ٹی ۔ ٹی ۔ آئی کا نہ تھا بلکہ خطرہ 'اپنوں' ہی سے تھا۔ اہل وطن سے اہل بھوپال سے یہ ٹکٹ تھا بھوپال بوگی کا۔ یہ ریلوں میں مخصوص بوگیاں جیسے امرتسر بوگی۔ بھوپال بوگی۔ مدراس بوگی۔ وغیرہ وغیرہ غالباً اس لیے لگائی جاتی ہیں کہ ایک شہر اور ایک صوبے کے باشندے دوسرے شہر اور دوسرے صوبے کے باشندوں سے بالکل نہ ملیں تاکہ کسی قسم کی قومی یک جہتی کے امکانات پیدا نہ ہو سکیں۔ شاید مار دھاڑ اور فتنہ فساد سے بچنے کا یہی مؤثر طریقہ مؤثر ثابت ہو رہا ہو۔

دوسرے یہ کہ وہ جو ایک ہی شہر اور ایک ہی محلے میں رہ کر بھی ایک دوسرے کو جانے انجان بنے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے کٹے کٹے رہتے ہیں۔ خیر خبر سے بیگانہ۔ اچھے برے سے بے پروا۔ اتنے کہ اکثر جانی ہوئی صورتیں بھی پہچانی نہیں جاتیں۔ لہٰذا یہ اپنی جیب میں شناخت کے لیے ہر وقت حلف نامہ بہ اسم خود عرف ممنت جو رکھتے ہیں (افسوس اعلیٰ دستخطوں نے ان کا بھرم بھی کھو دیا ۔!) تو یہ ایک ہی شہر۔ ایک ہی صوبے اور ایک ہی محلے جگری دوست گاڑھی چھاننے کی خاطر چند گھنٹے ایک ڈبے میں ساتھ ساتھ۔ قریب قریب رہ سکیں

یک دوسرے کی بازیافت پہ جشن منا سکیں۔
تو لرزہ ہم پر انھیں ہم وطن اجنبیوں کی وجہ سے طاری تھا۔ کہ جو انھوں نے ہمارا نیا نام
میں ایک نیا رشتہ اور نیا تعلق چھپا تھا سن لیا تو خیر نہیں۔ کہ اسے تو وہ سوغات، چٹ پٹی
۔ ہٹ بیسٹ ٹاپ سیکرٹ کی طرح بھوپال لے جائیں گے اور اڑن تشتریوں کی طرح اڑیں گے
انگ وادیوں کی گوپیوں کی طرح داغیں گے۔ کہ
" دیکھا یہ گل کھلا رہی ہیں۔ ہم نہ کہتے تھے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ یہاں تو پوری دال
لی نکلی۔ اسی لیے ان دنوں دلّی کے کوڑی پھیرے ہو رہے تھے۔"
پھر ہمارے ماضی کی بازیافت ہوگی اور اسے نئے منظر نامے میں دیکھا پرکھا اور جانچا جائے
ور نئے فیصلے صادر کیے جائیں گے۔ جو ماضی کے ہر فیصلے سے زیادہ لرزہ خیز اور زلزلہ انگیز
گے۔

کچھ موسم کا تقاضا تھا، کچھ حوالات کا۔ سو ایک لرزہ ہم پہ طاری ہوگیا۔ عافیت اسی میں
اگر چادر اور کمبل کی لمبائی کا خیال رکھتے ہوئے پیر پھیلائے سر ڈھانک لیٹ رہیں۔ ڈبّا تیزی
بار ہونے لگا اور "بھوپال بند" کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگے اور ہماری رسوائی کے
تا مزید روشن ہوگئے۔
ٹی۔ ٹی۔ آئی نیا پنچھی تھا۔ پھیروں پھڑ پھڑاہٹ میں تیزی بھی تھی اور دم خم بھی۔ گر چہ
اور حملہ آوروں کے نرغے سے نکلتے بچتے وہ ہم تک تشریف لائے۔ ٹکٹ دیتے میں دست و بازو
ش مرتب کردہ اسکیم سے کچھ زیادہ ہوگئی۔
دیگر خصوصیات کے علاوہ آپ جاسوسی ادب کے بھی دلدادہ تھے۔ پوچھا
"آپ کا نام؟"
ہم اس سوال کے جواب کے لیے لمحہ اوّل سے تیار تھے۔ "مسز پران ناتھ" بالکل اسی تیور
جس میں عزیزہ مدعو بالا عرف انار کلی نے اعلان کیا تھا "جب پیار کیا تو ڈرنا کیا!"
ویسے بھی ہمارے "پران ناتھ" رومان کی حدوں سے گزر چکے تھے۔
"لیکن اس میں تو مسٹر پران ناتھ ہے۔"
"کھانا پینا ہر ڈپارٹمنٹ کا حق ہے۔ 'ایس' کھا گئے ہوں گے یعنی Typing Mistake
ب پڑوسی چوکنا ہو چکے تھے۔ اور صورتِ حال کا اندازہ لگا کے رنگینیِ مستقبل کے منتظر۔
ٹی نے دُکھتی رگ پہ چلنے کی کوشش کی۔ "عمر ساٹھ سال لکھی ہے۔"
"کوئی اعتراض ہے آپ کو؟"
"اٹھ سال کی لگتی تو نہیں آپ" اس نے بھرپور قاتلانہ اور بیوٹی کنسٹ کے بوڑھے
تھرانہ نظر ڈالی۔
"نظر کا فرق ہے۔"

By the way thanks for the Compliment

" ہم وطنوں کے اجتماعی بھرپور قہقہے نے مزید ہمت بندھائی ۔ لہٰذا ہم نے بھی خوباں ، سے چھیڑ کا سلسلہ جاری رکھا۔

" دیکھیے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایک بار اسی ٹرین کے اسی ڈبے میں ہم ۲۸ سالہ ٹکٹ پر سفر کر چکے ہیں۔ دونوں کو جوڑ کے ایوریج نکال لیجیے ۔ کمپیوٹرائزڈ قسم کی صحیح عمر آجائے گی "

فرض کے جوش میں اس کی ساری حسِ مزاح روپوش ہو چکی۔

" یہ جرم ہے ۔ ہم آپ کو جیل بھیج سکتے ہیں " وہ گرجے۔

" یہ ہماری ذات پہ احسان ہوگا " ہم گڑگڑائے ۔ کہ جس تنہائی اور سکون کے لیے ہم گھر پہ ترستے رہتے ہیں ۔ وہ ہمیں جیل میں میسّر آجائے گا اور آپ کو معلوم ہے دنیا کا بہترین ادب جیل میں تخلیق ہوا ہے ۔ یہ آپ ہم پہ نہیں ۔ دنیائے ادب پر اور آنے والی نسلوں پہ احسان کریں گے ۔ جس کی قیمت ہم تو اس وقت ادا کر ہی نہیں سکتے۔

وہ غصّے میں بل پہ بل کھا رہے تھے ۔ اور ہم اڑوس پڑوس کے سہارے بولے چلے جا رہے تھے۔

" لیکن خیر آپ گھبرائیے نہیں ۔ خلوص اور محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی ۔ ہماری سوانح حیات میں آپ کا ذکر بھی سنہری حرف میں لکھا جائے گا ۔

کہ آپ ہی تو ہماری حیات بے برکات کی شہرت کا سبب بنیں گے ۔ دس ہزار کلو کے قہقہوں سے ڈبے کا ایک بٹا چھے حصہ ریل کی گڑگڑاہٹ کے باوجود گونج رہا تھا ۔ سو وہ پیر پٹختے بل کھاتے نو دو گیارہ اور ہم بارہ بجا کر چین کی نیند سو گئے ۔

ہر چرن چاولہ
Molletaret 50A,
0750 OSLO-7, Norway

بھوک

میں صبح اٹھتے ہی ایک پیالہ بیڈ ٹی پیتا ہوں۔ بارہ بجے دفتر جانا ہوتا ہے۔ اس لیے
دس بجے دلیہ، گرم گرم چائے کے ساتھ جیم اور توسوں کا ہلکا ناشتہ کرتا ہوں۔
دفتر میں تھوڑا سا فروٹ اور شام کو بس دو روٹی اور ایک لذیذ سا سالن میری تسلی
کر دیتا ہے۔ جس دن بیوی ساتھ سلاد کی پلیٹ بنا دیتی ہے یا لسّی کا ٹھنڈا میٹھا
گلاس یا خود میں ایک پیگ وسکی یا بیئر کی بوتل کھول لیتا ہوں تو عیاشی ہو جاتی ہے
میری بیوی کو شکایت ہے کہ میری بھوک ٹھیک نہیں مگر سچ یہ ہے کہ مجھے بھوک
بہت تیز لگتی ہے۔ مگر جب اپنے کھانے کے مندرجہ بالا مینو کو دیکھتا ہوں تو
مجھے بھی شک ہونے لگتا ہے کہ شاید میری بھوک کم ہے۔

ہمارے ہاں اکثر شام کو کسی نہ کسی بہانے دعوتیں ہوتی رہتی ہیں۔
اسی طرح ہم بھی دوستوں کے ہاں مدعو کیا جاتا ہے۔ وہاں بھی سب کو میری بھوک
کی کمی کی شکایت رہتی ہے۔ ایسی دعوتوں میں مہمانوں کو پہلے کوئی ہاٹ یا کولڈ
ڈرنک پیش کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی بھنے ہوئے کاجو، پستہ یا چپس وغیرہ رکھے جاتے
ہیں۔ کوئی دو اڑھائی گھنٹے گپ شپ ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بعد ہاؤس وائف
میزبان کو کوئی اشارہ کرتی ہے۔ اور وہ تالی بجا کر سب کو اپنی طرف متوجہ کرتا، بڑے
فدویانہ انداز میں ڈائننگ ٹیبل پر آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اگر ٹیبل پر آٹھ کرسیاں
ہیں اور کھانے والے بھی آٹھ افراد ہوں تو وہ سب کو ان کی کرسیاں بتا بتا کر بٹھاتا
جاتا ہے۔ بصورت دیگر بوفے سسٹم کی طرح وہ سب کو ایک ایک پلیٹ اور نیپکن
پکڑاتا ہوا، کھانے کے ڈونگوں کی طرف خوش آمدید کہتا جاتا ہے۔ کھانے میں چاول
پراٹھے، تنوری روٹیاں یا نان کے علاوہ چار پانچ قسم کے سالن، رائتا، گوشت اور
لذیذ ہوتا ہے۔ اور پینے کو بیئر، کولا، سولو، سیون اپ یا فارس۔ کھانے کے بعد پھر
گپ شپ کا دور چلتا ہے۔ پھر سویٹ ڈش سرو ہوتی ہے، پھر گپ شپ، ساتھ ویڈیو
پر کوئی ہندوستانی فلم دیکھی جاتی ہے۔ پھر فروٹ اور آخر میں چائے یا کافی۔ رات

کوئی ڈیڑھ دو بجے جا کر چھٹی ملتی ہے۔ ایسی پارٹیوں میں بھی میرا مینو حسب معمول مندرجہ بالا حدوں تک محدود رہتا ہے نتیجتاً چاروں طرف سے اپنی بھوک کی کمی کی شکایتیں سن سن کر مجھے سچ مچ اپنی بھوک پر شک ہونے لگتا ہے۔

میں ایک عرصہ سے ڈھونڈ رہا ہوں کہ بھوک آخر رہتی کہاں ہے۔ اور میرے نزدیک کیوں نہیں پھٹکتی۔ لوگ تو کھا نے کھاتے اپنی پتلونوں کے اوپری بٹن تک توڑ بیٹھتے ہیں۔ مجھے کیا بیماری ہے کہ میں ایک آدھ لذیذ سالن، دو روٹیوں اور تھوڑے سے سلاد سے مطمئن ہو جاتا ہوں۔

میں چھے سال بعد اگلے مہینے انڈیا جا رہا ہوں۔ ابھی بھی میں سنتا رہتا ہوں کہ ہندستان بھوکا ملک ہے۔ امید ہے مجھے بھوک وہاں ضرور مل جائے گی اور وہ خود میری بھوک کو بھی چمکا دے گی۔ پندرہ سال کی خود ساختہ جلاوطنی میں ایک صرف ایک بار وطن جا سکا تھا۔ مگر کئی سال پہلے بھوک کا ایک نمونہ خود چل کر میرے پاس ناروے آ گیا تھا۔ سیٹھ رن چھوڑ لال سیٹھی یوریا) کے سستے ٹکٹ پر اپنی بیوی کے ساتھ یورپ کی سیر پر نکلا ہوا تھا۔ ناروے دیکھنے کے لیے وہ میرے ایک دوست کے سفارشی خط کے ساتھ میرے ہاں آ گیا تھا۔ وہ دہلی میں اپنی بڑی بڑی کوٹھیوں، کاروں، نوکروں چاکروں اور بزنس کی ڈینگیں مارتا تھا۔ جب وہ ادھر سے جرمنی جانے لگا تو یہاں کے ریزرویشن آفس سے ٹرین میں دو سیٹیں ریزرو کرانا چاہتے تھے۔ کلرک نے کہا ۔ "یہاں سے تو کوئی سیٹ خالی نہیں ہے۔ سیٹھ کے بہت زیادہ منت سماجت کرنے پر اس نے کہا ۔ ڈنمارک سے فون کر کے کوشش کرتا ہوں، شاید وہاں سے مل جائیں۔ مگر آپ کو تھوڑا سا فون کا خرچہ ادا کرنا ہوگا۔ میرے ماننے پر کلرک نے کوپن ہاگن فون کر کے سیٹیں حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ مگر وہاں سے بھی اُسے نفی میں جواب ملا ۔ " ساری سیٹیں وہاں بھی فل ہو چکی ہیں۔ آپ فون کے دس کرونے ادھر کاونٹر پر ادا کر دیجیے۔" وہ بولا۔

میزبان کے ناتے ادائیگی کے لیے میں ہی کاونٹر کی طرف بڑھ گیا ۔ مگر سیٹھی صاحب نے میری بانہہ تھام لی۔

"سیٹیں تو ریزرو ہو نہیں سکیں ۔ ادائیگی کس بات کی، چلو ادھر دوسرے دروازے سے کھسک چلیں۔" سیٹھ نے کلرک کو اپنے کام میں مصروف دیکھ کر کہا۔

"ہماری درخواست اور کہنے پر ہی اس نے ڈنمارک فون کیا تھا۔" میں نے کہا۔ مگر اور اس سے بانہہ چھڑواتے ہوئے اپنی آستین کا بٹن ہی تڑوا بیٹھا۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ بھوک وہاں رہتی ہے۔ مگر دہلی جا کر جب میں نے اس کا کار، کوٹھی اور نوکر چاکر دیکھے۔ تو میں نے اپنی بھوک کے معنی بدل لیے۔

کیونکہ میں نے دیکھا کہ اس کے ہاں دعوت میں کھانا پینا اور عیش و عشرت ہماری یہاں ناروے کی دعوتوں سے کسی بھی طرح کم نہ تھا۔ مگر یہ ضرور تھا کہ وہ ایک بزنس دعوت تھی۔

مگر یہ کافی پرانی بات ہے۔ اب کئی سال بعد میں پھر بھوک کی کھوج میں سرگرداں ہی بیوی کے ساتھ ایئر انڈیا سے دہلی جا رہا تھا۔ ہم اوسلو سے بذریعہ یونیتھا انسہ دوپہر ایک بجے فرینکفرٹ پہنچے تھے۔ آگے دہلی کے لیے ہماری ایئر انڈیا کی فلائٹ رات دس بجے روانہ ہونی تھی۔ ٹرانزٹ میں بیٹھے بیٹھے ہی اچانک ہماری نظریں بورڈ پر پڑ گئی تھیں۔ فلائٹ رات دس بجے کی بجائے ایک بجے پرواز کر رہی تھی۔ یعنی تین گھنٹے لیٹ۔ شام آٹھ بجتے بجتے سب مسافروں کے پیٹوں میں بھوک کے چوہے اُچھل کود کرمچانے لگے تھے۔ کچھ لوگوں نے انفارمیشن کاؤنٹر پر شکایت بھی کی تھی کہ جب ان کی فلائٹ اتنی لیٹ ہو گئی ہے تو اُن کے کھانے پینے کا بندوبست یہیں پر ہی کروینا چاہیے۔ کاؤنٹر پر جرمن اٹنڈنٹ گرل نے اُن سے کہا تھا۔ آپ ایئر انڈیا کے ممبر ہیں۔ آپ کے کھانے وغیرہ کا انتظام انہیں ہی کرنا چاہیے۔ آخر ایک بچے والی عورت کے بار بار جا کر پوچھنے پر اور اصرار کرنے پر تنگ آ کر اس نے شہر سے ایئر انڈیا کے کسی ملازم کو بلوا لیا تھا۔ اور وہ صرف بچے والی عورت کو گیارہ مارک کا ایک کوپن دے کر جانے لگا تھا کہ میں نے اُسے روک کر کہا تھا: "ہم بھی تو ایئر انڈیا کے یاتری ہیں۔"

"آپ کو پلین میں کھانا ملے گا" اس نے لاپروائی سے جواب دیا تھا۔

پلین رات کو ایک بجے اڑے گا اور کھانا کہیں جا کر دو اڑھائی بجے سرد ہو گا" میں نے شکایت کی تھی۔

سوری، میں کچھ نہیں کر سکتا۔" وہ مڑنا ہی چاہتا تھا کہ میری بیوی نے اسے گھیر لیا تھا۔ "کیسے کچھ نہیں کر سکتے۔ جہاز ہم نے تو لیٹ نہیں کیا۔ ہم بھی آپ کے یاتری ہیں۔ ہمیں رات ڈھائی تین بجے تک بھوکا رکھنا کہاں تک جائز ہے۔"

"آپ چلائیے مت۔ یہ یورپ ہے انڈیا نہیں" وہ بولا تھا۔

"تو انڈیا میں چلانا جائز ہے" میری بیوی نے اور زیادہ زور سے چلاتے ہوئے کہا تھا "آپ نے ہی اسے انڈیا بنا رکھا ہے۔ آئی ول رپورٹ ٹو اتھارٹیز۔"

وہ چلا گیا تھا مگر آدھے گھنٹے بعد پھر خود ہی واپس آ کر سب مسافروں کو ریسٹورنٹ سے کھانے کے کوپن بانٹ گیا تھا۔ تب میں سوچتا رہ گیا تھا۔ بھوک کہاں تھی۔ میری بیوی کے دماغ میں 'جس کا پرس کرونر' مارک اور ڈالروں سے بھرا تھا یا دنیا کی بہترین ایئرلینوں میں گنی جانے والی ایئر انڈیا میں جو کرایے میں ملنے کے پیسے چارج کر کے بھی اپنے مسافروں کو بھوکا مارنا چاہتی تھی یا اس

کے جنم جنمانتر سے بھوکے اس عملہ میں۔ جنھیں بھرتی کرتے وقت ان کے ذہنی دیوالیہ
کی بھوک کو مدِ نظر نہیں رکھا جاتا تھا۔

دہلی میں اس دن میں گھر کے دروازے پر ہی کھڑا تھا۔ جب ایک فقیر نے
گلی کے دائیں سرے سے صدا لگانی شروع کی تھی۔ اس کی آواز میں بلا کا درد تھا
"بابو لوگو، دولتاں والیوں۔ بھگوان تمہارا تھان مکان قائم رکھے۔ تمہاری اولاد
پھلیں پھولیں۔ بچی کی ماں بیمار پڑی ہے۔ بچی بھوکی ہے۔ میں لاچار ہوں۔ آپ
کی مدد کا طلب گار ہوں۔ آپ ایک دو گے، بھگوان آپ کو لاکھ دے گا۔"

اب میری جیب میں لاکھوں تو نہیں، ہزاروں ضرور تھے، مگر نہ جانے یہ میرے
اندر فقیر کی دعاؤں کے طفیل لاکھوں حاصل کر لینے کی بھوک تھی یا فقیر
سچی ہمدردی۔ جو مجھے فقیر کے پاس لے گئی تھی۔ میں نے پانچ کا نوٹ نکال کر ا
کی طرف بڑھانا چاہا ہی تھا کہ ادھر سے اس کی گود کی تین چار سالہ بچی کا ہاتھ میکا
انداز میں نوٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔ ہمدردی کی ایک لہر میرے دل کے ایک کو
سے دوسرے کونے تک تیر گئی تھی۔ میں نے ہاتھ روک لیا تھا اور کہا تھا۔ "اند
پہلے خود اور بچی کو کھانا کھلا لو، پھر کسی اچھے ڈاکٹر کو لے کر تمہارے ساتھ چلوں
اور تمہاری بیوی کا معائنہ کرواکر علاج معالجہ کا تمام خرچہ اٹھاؤں گا اور کچھ نقد
بھی دوں گا۔

"نہیں بابو جی۔" اس کی نظریں نوٹ پر ٹکی ہوئی تھیں۔ "بیوی تو اسپتال میں دا
ہے۔ علاج ہو رہا ہے۔ یہ تھوڑا سا کھانا ادھر پہلے والے گھر سے مل گیا ہے۔ بچ
بھر ہی جائے گا۔"

میری مدد سے اس کا انکار، اس کے جھوٹ کو ننگا کرنے لگا۔ وہ
کو ٹھکرا کر نقد پانچ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میری ماں پانچ کا نوٹ میرے ہاتھ
دیکھ کر بولی تھی۔ "نہ وہ بھوکا ہے اور نہ ہی اسے اتنے روپیوں کی ضرورت ہے
اسے ایک روپیہ دے دو۔"

"ہاں، بھوکا تو وہ ہے اور اسے پانچ سے کچھ زیادہ کی ہی ضرورت ہے۔"
نے نوٹ بچی کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا تھا۔ "ہاں وہ امیر لوگ جو لا
کی ڈھیری پر بیٹھ کر بھی کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں، ان سے تھوڑا کم بھو
نوٹ حاصل کرتے ہی فقیر جلدی جلدی ہماری گلی سے کھسک گیا
کہیں میرا ارادہ نہ بدل جائے اور میں اسے پیچھے سے آواز نہ دے دوں۔ مگر
ہمارے محلے کی پانچویں گلی سے اب بھی اس کی دردناک آواز خالی کشکول بن
کی ہمدردیوں کی بھیک مانگ رہی تھی۔

دو دن بعد دہلی کے اپنے دوست کی بیٹی کی شادی میں میں بھی حاضر تھا۔ ۲۱

مجھ سے تیس ہزار روپے اُدھار لیے تھے۔ میں جانتا تھا کہ کبھی واپس نہیں کیے جائیں گے اور اگر کبھی میں نے ان کی واپسی کی بات کی تو مجھے اپنے دوست کی یاری سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں گے۔

بارات کے لیے پارک میں شاندار رنگ برنگے تنبوؤں کا محل کھڑا کیا گیا تھا جس میں سبز غالیچوں پر فوم کے ملائم صوفے بچھے تھے اور سارے میں رنگ برنگے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ اس کونے سے اس کونے تک انواع و اقسام کے کھانوں کا بندوبست تھا۔ قسم قسم کا گوشت، کھوئے، پستے، اور بادام کا خالص گھی سے تر تراتا گرم گرم حلوہ پھلوں کی ڈھیریاں، مشروبات، جگہ جگہ چاٹ کلفی، آئس کریم، چائے یا کافی اور پان سگریٹ کے اسٹال لگے تھے۔ جو جی چاہے کھاؤ، جہاں جی چاہے بیٹھو۔ ہلکی پھلکی موسیقی، جس میں آرکسٹرا پر مکیش، لتا، محمد رفیع، کشور کمار، اور آشا بھونسلے کے گیتوں کی دھنیں بجتی تھیں۔ دروازے پر میرا دوست، ہاتھوں میں ڈبے اور لڑو ے لیے فقیروں اور محتاجوں کی بھیڑ کو دھتکارتا ہوا بھگاتا پھرتا تھا۔

دوست کی بیٹی اپنی ہی بیٹی ہوتی ہے۔ میزبانی کا بہت سا کام میرے ذمے بھی تھا اس لیے میں ایک مہمان کا ساتھ دینے کے لیے ایک پیالی چائے اور ایک سنترہ کے علاوہ اور کچھ نہیں کھا سکا تھا۔ رات دو بجے سب مہمانوں کے جانے کے بعد ہم نے دیکھا تھا کہ ڈھیروں کھانا بچ گیا ہے۔ میرے دوست نے کہا تھا "سات سو مہمانوں کے کھانے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مگر آئے تھے صرف پانچ سو۔ یہاں لوگ آنے یا نہ آنے کی اطلاع نہیں دیتے۔" اس نے بتایا تھا۔ "اس لیے آپ جلتے جوابی کارڈ بھیجتے ہیں۔ ان سے کچھ زیادہ کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔"

"مگر لگتا ہے کھانا تو تقریباً آدھا باقی پڑا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہ شادیوں کا موسم۔ لوگوں کو ایک ہی دن میں کئی کئی شادیاں بھگتانی اور دوستیاں نبھانی ہوتی ہیں۔ کہیں سگریٹ پی، کہیں سنترہ چھیلا اور کہیں صرف چہرہ دکھایا، ہاتھ ملایا۔ آپ کی نظر چوکی اور وہ اگلے اڈے۔ جہاں انھیں اس سے کچھ زیادہ کھانے، کسی بہتر تعلق یا کسی مفاد کا لالچ گھسیٹ رہا ہوتا ہے۔"

یورپ میں تو لوگ آنے یا نہ آسکنے کی فون یا خط کے ذریعے پہلے سے ہی اطلاع دے دیتے ہیں۔ اس لیے آپ کا ایک بھی مہمان کم یا زیادہ نہیں ہوتا۔ مگر یہ وہاں کے مقامی لوگوں کی بات ہے۔ اپنے مشرق کے لوگ تو وہاں بھی کوئی اطلاع نہیں دیتے اور اچانک آدھمکتے ہیں یا غیر حاضر ہو جاتے ہیں۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنے کا وعدہ کر کے، وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے کوئی بہانہ بنا کر فون پر معذوری ظاہر کر دیتے ہیں۔ اور میزبان کی بھری میزیں کھانے والوں کے منہ کو ترستی رہ جاتی ہیں۔ وہاں فقیر نہیں ہوتے اور جو ہوتے ہیں وہ کھانا نہیں، پیسا مانگتے ہیں۔ کتوں

بلیوں کو بھی ڈالنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس لیے کھانا کئی کئی دن تک فریج میں پڑا سڑتا رہتا ہے۔

نئی دہلی کناٹ پیلیس جس کی مہنگائیاں کبھی میرے جیسے درمیانہ طبقہ کے شخص کو اپنے کوریڈوروں سے گذرنے تک کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ اب میری فارن کرنسی سے بھری جیبوں کو بہت سستی محسوس ہوتی تھیں۔ اگر جہاز پر بیس کلو سے زیادہ وزن لے جانے کی اجازت ہوتی تو میرے جیسے بھوکے انسان سارا کناٹ پیلیس اور تمام صوبوں کے اسٹیٹ ایمپوریم کے بہترین ڈیکوریشن پیسز خرید کر اپنے یورپ کے گھروں میں الٹ دیتے۔ اس دن میرے ساتھ کناٹ پیلس کی اس مٹھائیوں کی دکان پر محلہ والوں اور رشتہ داروں کے دس بچے بھی تھے۔ جنھیں میں اپنی کسی اندر کی بھوک کی تسلی کے لیے ٹیکسی میں لاد کر دہلی کی سیر کرانے کو نکلا ہوا تھا۔ انھیں ان کی پسندیدہ مٹھائیاں، نمکین اور چھولے وغیرہ کھلاتے ہوئے میں اپنے اندر کوئی خاص قسم کی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ تبھی دو تین ادھ ننگے یتیم بچے ہمارے پاس آ کھڑے ہوئے تھے۔ اور اپنے ننگے پیٹوں پر ہاتھ مار مار کر کہنے لگے تھے۔ "بابوجی آپ کے بچے جیتے رہیں۔ ہم بھی تین دن سے بھوکے ہیں۔"

میں نے انھیں بھی ساتھ شامل کر لیا تھا۔ اور ان کی پسند کی چیزیں انھیں سیر ہو کر کھلوائی تھیں۔ جاتے وقت ان کے گڑگڑانے پر انھیں دو دو روپے بھی پکڑا دیے تھے۔ کھا پی کر ابھی ہم تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ مجھے اپنی بھولی ہوئی کتاب یاد آگئی۔ اس کی تلاش میں میں واپس پلٹا تھا تو میں نے دیکھا تھا۔ وہ تینوں اب اور لوگوں کو اپنے ننگے پیٹ دکھا دکھا کر اور ہتھیلیوں سے بجا بجا کر تین دن سے بھوکے ہونے کی فریادیں کر رہے تھے۔ کتاب اٹھا اور ان کی نظریں بچا کر میں الٹے قدموں لوٹ آیا تھا۔ کہ مجھے اصلی بھوک کی ہلکی سی جھلک وہیں نظر آگئی تھی مگر لگتا تھا کہ ابھی کہیں کوئی کسر ہے۔

ایئر انڈیا کی فلائٹ میں واپسی پر مجھے وہ سیٹ ملی تھی جو دو گوری اور جوان میموں کے ساتھ تھی۔ اور ان کے ساتھ تھے چار بچے۔ سانولے سلونے، کر دور اور ہر زاویے سے ہندستانی۔ جن میں دو لڑکے چار چار سال کے، ایک لڑکی ساڑھے تین سال کی اور ایک بچی اڑھائی سال کی تھی۔ لڑکے تو کھلونوں سے لدے پھندے کھڑکیوں سے باہر اڑتے بادلوں کو دیکھنے میں مگن تھے۔ بادل جو ان کے اپنے گاؤں میں ان سے میلوں دور اونچے آسمانوں پر پھیلے رہتے تھے۔ اب بالکل ان کے پاس آگئے تھے۔ اور کھڑکیوں کے شیشوں کو چومتے ان کے قریب سے گذر رہے تھے۔ بالکل ان کے اپنے ماں باپ کی طرح، جو انھیں بیچنے کے لالچ میں گاؤں سے آئے کسی گورے صاحب یا میم کی کار کے شیشوں کو چومتے، تھپتھپاتے دور تک

ساتھ دوڑتے چلے جاتے تھے۔ ننھے منے بچے خود بھی ان کے ساتھ کاروں کے پیچھے بھاگتے اور کچھ ہی فاصلے کے بعد گر کر اور اپنی بے ارادہ دوڑ دھوپ کو بھول کر راستے کی دھول مٹی میں کھیلنے بیٹھ جاتے تھے۔

تنگ جگہ طویل سفر اور اجنبی چہروں میں بچے جب کھڑکی سے باہر بادلوں کو دیکھتے دیکھتے اکتا جاتے تو ان کے چہروں کچھ یادوں کی اداسیوں سے لپ جاتے اور کچھ دیر بعد انھیں میموں کے اجلے کپڑوں اور چمکتے چہروں کا حسن بھی اپنی طرف راغب نہ کر سکتا اور وہ ریں ریں شروع کر دیتے۔ اچانک تینوں بچوں نے تو اپنی بانہیں لہرا لہرا کر میری گود آ جانا چاہا تھا۔ ایک میم اشارہ سمجھ کر میرے ساتھ والی سیٹ خالی کر کے اگلی سیٹ پر چلی گئی تھی۔ اور میں نے تینوں بچوں کو اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ شاید میرے اور میم کے ذہن میں بیک وقت ایک ہی خیال کوند گیا تھا۔ میرے گندمی رنگ اور کالے بالوں کا۔ میموں نے اپنے جدا رنگ کی مجبوری --- وقتی آرام اور بچوں کی تسکین کی خاطر انھیں میرے چارج میں سونپ دیا تھا۔

کھانے کی سروس بہت لیٹ شروع ہوئی تھی اور بچے سب کچھ بھول بھال کر اپنے ننھے ہاتھوں کو تھپڑے خود آپ اور میموں کے ہاتھوں سے بھوکے بندروں کی طرح لپا لپ اپنے پیوٹے بھرنے میں مصروف تھے۔ دوسری میم اڑھائی سالہ بچی کو خود اپنے ہاتھوں سے کھلانے میں مصروف تھی۔ وہ جب بھی ایک نوالہ اپنے منہ میں ڈالنے کے لیے لمحہ بھر کی دیری کرتی بچی رونے لگ جاتی۔ وہ اپنی پلیٹ کا پورا کھانا ختم کر کے اب میم کی پلیٹ پر بھی ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ میم مجھ سے یا شاید ہواؤں سے کہہ رہی تھی "سمجھ نہیں آتا، اتنی چھوٹی بچی اتنا کھانا جانے کس کونے میں غائب کرتی جا رہی ہے۔" ●●

شعری مجموعے

جن کی صرف ایک ایک، دو دو کتابیں اسٹاک میں موجود ہیں۔

جذبات و نغمات — تاج النساء تاج — ۱۵/=
جام جم — محمد ذوالنورین — ۳/=
جلتے کنول — شمس فرخ آبادی — ۲/=
جذباتِ رضی — ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی — ۱/۵۰
جسموں کا بن باس — آزاد گلابی — ۶/=
جنگل — صلاح الدین پرویز — ۲۵/=
جوشِ جنوں — شوریدہ کاشمیری — ۱۵/=
جوہر ظرافت — جوہر سیوانی — ۱۵/=
جسارت — عزیز وارثی — ۱۰/=
جا بجا دل — ڈاکٹر ذکی کاکوروی — ۱۸/=
جواہراتِ انیس (سوم) مرتب مرزا امیر علی جونپوری — ۲۵/=
جامِ فردوزان۔ سید بشیر حسین بشیر الہ آبادی — ۳۵/=
جوش کی انقلابی نظمیں مرتبہ ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی — ۲۰/=
جذبات و احساسات — حکیم مرزا حیدر بیگ حیدر — ۳/=
چپ کی داد چپ کی فریاد مرتبہ۔ رفیق مارہروی — ۱۵/-
چنار کے پھول — جگدیش مہتہ درد — ۵/=
چمنستان — رام رتن مضطر — ۱۵/=
چین چلو — علامہ نور صابری — ۱/=
چند نظمیں — اختر انصاری — ۲/=
چمن جاگے — نقوی مصطفےٰ آبادی — ۱۰/=
چاک سحر — اثر قادری میناگری — ۳/=
چمن چمن مرتبہ۔ جگدیش مہتہ درد — ۱۵/=
چہرے — شاکر بانکوٹی — ۲۵/=
چراغ سے چراغ — شاہد الوری — ۳۵
چراغ اور کنول — اختر حمید خاں — ۴۵
حرف زیر لب — عفت بانو زیبا کاکوروی — ۶/=

حرفِ راز — مہیندر پرتاپ چاند — ۱۰/=
حرفِ مکرّر — یعقوب راہی — ۱۳/=
حیرت زار — عطا کوکوی — ۱۲/=
حرفِ خودی — انیس امام — ۱۰/=
حرف حرف — شرر فتحپوری — ۲۴/=
حرفِ شوق — محمد منظور احمد — ۳/۲۵
حرف و صدا — ہیرالال فلک دہلوی — ۲۰/=
حرفِ مکرّر — علیم سرور — ۱۴/=
حکایاتِ نے — رئیس امروہوی — ۱۵/=
حرفِ ناتمام — عمر انصاری — ۲۰/=
خواب زار — حسنیٰ سرور — ۶/=
خونِ جگر — دھرم پال عاقل — ۳۰/=
خامۂ دل — ابنِ احمد تاب — ۲/۵۰
خلش — خار دہلوی — ۲۵/=
خیمۂ خواب — اسعد بدایونی — ۲۰/=
خوشبو (مراٹھی نظموں کے اردو ترجمے) بدیع الزماں خاور — ۴/=
خط غبار — قیصر حیدری دہلوی — ۳۰/=
دشتِ نوا — وقار روبانی — ۲۵/=
دشتِ گل — زبیدہ تحسین — ۱۴/=
دستِ تہ سنگ — فیض احمد فیض — ۶/=
دل کی گیتا اردو نظمیں — خواجہ دل محمد ایم۔اے — ۲/۵۰
دکھتی رگیں — شاد عارفی — ۵/=
دائرہ — عابد عالمی — ۵/=
دستِ تمنا — زبیدہ تحسین — ۳/=
دیدۂ نم — وحید النساء — ۱۵/=

باقی آئندہ

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(ہمارا نمائندگی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

اگست ۹۱ء کا شمارہ پیش نظر ہے۔
زیدی صاحب کا اشاریہ، نظیر صدیقی
کا ایک سیکنڈ ہینڈ مطالعہ اور ڈاکٹر رفیعہ شبنم
صاحبہ کا قصہ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ پڑھ چکا
یہ سارے مضامین جدو وسیع اور اہم ہیں۔
صدیقی صاحب نے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں،
کے مغربی ادب کے مطالعے کے نتیجے میں
کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اردو ادب کے طلبہ
یہ تبرکات غنیمت ہیں۔

قیصر اعجاز۔ مظفر پور

کتاب نما کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا
عبدالستار دلوی کا اداریہ بصیرت افروز
الحسن نقوی کا مضمون "سید حامد" خاکہ
کی اچھی مثال ہے۔ عبدالقوی دسنوی کا مضمون
آزاد" میں ایک اہم اضافہ ہے۔ حمایت علی
اور رخسانہ نکہت کی نظموں نے متاثر کیا
نے مایوس کیا۔

ڈاکٹر اقبال حسن آزاد۔ مونگیر

"کتاب نما" جولائی ۹۱ء میں حسینی جاوید
کا مضمون "فن تاریخ گوئی اور تقاضے"
نے کچھ حوالے دے کر اس فن کی
کا ذکر کیا ہے۔

میں ایک ایسی مثنوی کا ذکر کرنا چاہوں گا۔
جس میں بیک وقت پانچ تاریخیں ہم فارسی میں
ہم فصلی میں۔ بکرمی۔ عیسوی۔ ہجری میں ہیں۔
کتاب کا نام سنگھاسن متی منظوم از رنگ لال
چمن لکھنوی ہے۔ ۱۸۶۴ء میں لکھی گئی۔ نول کشور
پریس سے ۱۸۶۹ء میں پہلی بار، اور ۱۸۷۱ء میں
دوسری بار چھپی۔ بڑے سائز کی اس کتاب کے
۱۴۹ صفحات ہیں۔

رام لعل نابھوی۔ نابھا

●

حمایت علی شاعر کی نظم "ہوا کا اعتبار کیا" بہت
عمدہ ہے۔ شجاع خاور صاحب کی غزل کا تیسرا
شعر بڑا چونکا دینے والا ہے۔ میدان سخنوری
میں شجاع صاحب کی یہ شجاعت واقعتہً قابل داد ہے۔

محمد رفیع انصاری۔ بھیونڈی

●

"کتاب نما" ایسا رسالہ ہے، جو بہت حد تک
پوری اردو دنیا کا آئینہ دار ہے۔ چوٹی کے لکھنے
والوں کی نگارشات اس میں شائع ہوتی ہیں۔
ہماری خصوصی دلچسپی ان تحقیقی اور تنقیدی
مضامین یا مباحث سے ہے، جو ادبیات اردو کے
مختلف اصناف و رجحانات پر شائع ہوتے ہیں۔
البتہ سب سے پہلے اوروں کی طرح خامہ بگوش
کے ادب اور ادیب سے متعلق مزاحیہ کالم کا انتظار
رہتا تھا لیکن یہ سلسلہ کچھ عرصہ سے منقطع ہے۔
کیوں؟ شاید صحیح طور پر کسی کو معلوم نہیں، سوائے
خامہ بگوش کے اور ان کے چند قریبی دوستوں کے
بہر حال، جتنی جلد وہ کالم دوبارہ شروع ہو، اتنا
ہی اچھا ہے۔ اس کا نعم البدل نہیں ہے۔ لوگوں کی
آنکھیں اس کے لیے ترستی ہیں۔
نامور ادیب، شاعر اور فنکاروں کے لیے

کتاب نما میں مخصوص گوشے کی روایت! یہ گوشے نہایت معلومات افزا ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے ہم عصروں کے بارے میں پوری شخصیت پر حاوی متنوع چیزیں اردو ادبیات سے لگاؤ رکھنے والوں کے لیے بہت ہی مفید اور کارآمد ہوتی ہیں۔ جولائی ۹۱ کے شمارہ میں ڈاکٹر خلیق انجم پر بڑا ہی اچھا گوشہ پیش کیا گیا۔ اس گوشے کو اس قدر تفصیل سے ترتیب دیا گیا کہ اسے خلیق انجم نمبر کہا جاتے تو ہمارے خیال میں زیادہ مناسب ہے۔ بہر حال، ماشاءاللہ۔ خلیق انجم، چہ دل پسند و دل پزیر آں صاحب جمال و کمال! مہمان اداریوں کا مزہ الگ ہے۔ مختلف مراسلہ نگاران پر اچھی رایوں کا اظہار کر چکے ہیں۔ ان ہی وجوہ کی بنا پر 'کتاب نما' کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ جب ہاتھ آجاتا ہے تو جیسے اچھی مٹھائی رکھ رکھ کر تھوڑا تھوڑا کرکے کھائی جاتی ہے۔ تاکہ مزہ جلد نہ ختم ہو جائے۔ وہ رسالہ بھی آہستہ آہستہ رک رک کر پڑھا جاتا ہے، تاکہ اس کا لطف زائل نہ ہو جائے بلکہ تادیر قائم رہے۔

ابوسعید نورالدین۔ ڈھاکہ

●

'تازہ کتاب نما' ملا۔ ہمیشہ کی طرح تازہ اور منتخب تخلیقات پڑھنے کو ملیں میں نے حسن نعیم مرحوم پر شمیم طارق کا مضمون بڑی توجہ سے پڑھا شاید اس لیے بھی کہ جرائد اور کتابوں کی ملاقات کے علاوہ مرحوم سے کوئی پندرہ برس پہلے کراچی میں دس بارہ دن تک اکثر ملاقاتیں رہی تھیں۔ اور یہ ملاقاتیں خاصی تفصیلی تھیں۔

حسن نعیم کو بجا طور پر نا قدری کا احساس تھا۔ ان سے کمتر درجے کے شاعر اکادمی اور مشاعروں کے ذریعے زیادہ پوچھے بلکہ پوجے جاتے تھے۔ جب کہ تخلیقی اور فنی سطح پر حسن نعیم مسلسل لکھتے رہے۔ یوں کہیے کہ وہ ادب کے MAINSTREAM میں، لیکن پچھلی کمائی پر بسر کرنے والے بساط شعرا پر دندناتے رہے (اور دندناتے رہے ہیں)

حسن نعیم کا کلام ہمارے یہاں کم ہی پہنچا۔ لیکن جس قدر دستیاب ہے وہ بلاشبہ انھیں صف کے اہم شعرا میں شمار کرانے کے لیے کافی ہے بشرطیکہ ان پر کام کیا جائے۔ زیر نظر مضمون شمیم طارق نے بڑی کاوش اور وابستگی ساتھ لکھا ہے اور حسن نعیم کے شعری رویوں اور مختلف جہتوں کو مناسب اور موزوں اشعار سے مزین کرکے پیش کیا ہے۔ مگر ان کی تحریر میں ایک مقامات ایسے ہیں جن کی نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "انھوں نے نئے تلازمے اور ترکیبیں وضع کی ہیں۔ خط غبار فہمی، موجۂ رشک، مکان جاں ۔ ۔ ۔ (ص ۵۹)

خط غبار۔ ترکیب ان کی وضع کردہ نہیں، بلکہ خط کوفی، خط نسخ کی طرح خط غبار بھی ایک طرز خط ہے جو فن خطاطی میں مدتوں سے ہے۔ آگے چل کر شمیم طارق صاحب نے نظر اضافیت کی تشریح (اپنے طور پر) کرتے ہو جس مطلع کو مثال میں درج کیا ہے وہ فنی اعتبار سے کمزور مطلع ہے:۔

مری مژہ پہ جو قطرہ دکھائی دیتا ہے
تری پلک پہ ستارہ دکھائی دیتا ہے

اس مطلع میں قطرہ کا قافیہ ستارہ باندھا ہے جو غلط ہے۔ بے شمار اچھے سفر کرنے والے کے ہاں فنی سقم رکھنے والا ایک آدھ شعر کوئی نہیں رکھتا بہر حال وہ اس کمزور شعر کو ہر کوٹ ہی نہ کرتے تو بہت ہوتا۔

محسن بھوپالی۔ کراچی۔

تازہ شمارہ میں ف۔ س۔ اعجاز کا اشاریہ
پسند آیا۔ علی سردار جعفری کا مضمون دلچسپی کا باعث
ا۔ انجنی مرکر ینٹی کی مانگ سونی کر گیا۔۔۔ قمر قدیر
م کا یہ مقالہ میں دو تین سال پہلے کے یاد ور میں
ڑھ چکا ہوں۔ برائے کرم شائع شدہ چیزوں
اشاعت سے پرہیز کریں۔ غزلیں بس ٹھیک ہیں۔
راشد انور راشد۔ رانچی

جولائی ۹۱ء کے شمارے میں طارق سعید
وابستگی کے چند نئے مظاہر" مختصر سہی مگر
ی قدر بہتر مضمون ہے۔ اس شمارے میں
ل شفائی کی غزل روح عصر کے مطابق لگی۔ مجھے
ی پر شاعری کے تعلق سے یہ کہنے دیجیے کہ
ردو شاعری میں معاصر انسانی صورت حال
الی حدود ہے چند شاعروں کے ہاں ملتی ہے۔
ر زیادہ تر تو ادھر ادھر کی باتیں کہتے ہیں۔
ان کے شعروں سے نہ تو روح کو تازگی ملتی ہے
ی فکر کو روشنی۔ شاعر تو پال ایلیوا لوئی اراگاں
ظم حکمت، پابلو نرودا، والٹ وٹ مین محمود درویش
یم القاسم، توفیق زیاد بھی ہیں جن کی حد درجہ
کوشش یہ ہوتی تھی اور ہے کہ اپنے خیالات اور
بات کی ترسیل آسان اور موثر زبان میں کریں
عوام سے ان کا رابطہ قائم رہے۔ انہی شاعروں
پوری دنیا کے محروم طبقات کے جذبات و احساسات کو دنیا کے
سامنے پیش کیا اور انسانی ضمیر کو للکارا۔ اس
نہ کے انسانی انقلابی شاعروں کی تعداد
اردو میں کتنی ہے؟
ہندستان کی موجودہ فسطائی صورت حال
میں نظر شاعر و ادیب کا بنیادی فرض تو یہ تھا
مذہبی لذہبیت (Religiosity) کے خلاف طنزیہ
نظمیں لکھتے مگر نہ جانے کیوں یہ مخلوق غیر ضروری اور
اور غیر افادی ادب کے ذریعے اپنا اور قارئین کا
وقت ضائع کرنے پر تلی ہوئی ہے۔
حقانی القاسمی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

● "کتاب نما" ایک طویل عرصے سے میرے زیر
مطالعہ ہے۔ اس کا ہر شمارہ ایک مکمل تصنیف
کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے خیال میں اس وقت
بھارت میں "کتاب نما" اپنی نوعیت کا واحد
علمی و ادبی رسالہ ہے جس کی خوبیوں کو بیان کرنے
کے لیے ایک داستان چاہیے۔ مختصر لفظوں
میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اعلا درجے کا ادب پیش
کرنے اور اردو دوستوں کے علمی و ادبی ذوق
کو فروغ دینے میں "کتاب نما" نے اہم رول ادا
کیا ہے۔ دعا گو ہوں کہ خدا اسے عمر خضر عطا کرے
(آمین)
ڈاکٹر ظہیر ناشاد، دربھنگوی۔ کلکتہ ۲۳

● جولائی ۹۱ء کا کتاب نما ملا۔ ڈاکٹر خلیق انجم
صاحب پر ایک خصوصی شمارہ نکال کر آپ نے بڑا
کام کیا ہے۔ زیر نظر شمارہ میں ڈاکٹر خلیق انجم پر لکھے گئے
تقریباً سبھی مضامین دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔
ڈاکٹر محمد فاروق اعظم۔ بھاگلپور۔

● "کتاب نما" کا شمارہ بابت ماہ جولائی ۹۱ء پیش
نظر ہے۔ اسی شمارے میں گوشۂ خلیق انجم "خاصے
کی چیز" ہے۔ خلیق انجم کے رفیق کار ایم۔ حبیب خان
نے اس گوشے کو جس سلیقہ مندی اور خوش اسلوبی
سے ترتیب دیا ہے اس کے لیے مرتب اور کتاب نما
کا ادارہ دونوں مبارکباد اور ہمارے شکریے
کے مستحق ہیں۔
"گوشۂ خلیق انجم" میں شامل سارے مضامین

اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں اور وہ خلیق انجم کی شخصیت کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں مگر ایم حبیب خاں کا مضمون "انجن صاحب" اور شمیم جہاں کا مضمون "کردار کا غازی" خاص طور پر لائق ستایش ہیں۔ ممتاز ہاؤس کے جس ناخواندہ بیرے نے خلیق انجم کو "انجن صاحب" کا نام دیا اس کی مردم شناسی یقیناً قابل داد ہے۔

راقم سطور کو "انجن صاحب" سے ملنے کے کئی مواقع ملے۔ ان مختصر اور عموماً کاروباری ملاقاتوں میں ان کی ذہانت اور شایستہ مزاجی کی جھلک تو ملی مگر اس کا اندازہ نہ ہوا کہ اس نوجوان ادیب، محقق اور نقاد کی شخصیت کتنی متحرک، فعال اور دل نواز ہے اس کے مشاغل اور آداب زندگی کتنے متنوع اور پرکشش ہیں اور کاروباری زندگی میں خود اس کی اپنی زندگی کیسی کثیرالجہات اور مختلف الالوان ہے۔

خلیل الرب۔ الہ آباد۔

● اکتوبر کے "کتاب نما" میں جناب ف، س اعجاز کا اشاریہ پڑھا۔ موصوف کی پوری تحریر کا لب لباب یہ ہے کہ آج کا ادیب اور شاعر لکیر کا فقیر بنا ہوا اپنے ارد گرد رونما ہونے والے واقعات (مثلاً، ظلم زیادتی اور بڑھتی ہوئی دہشت گردی) سے بے اعتنائی برت رہا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ادبی ماہنامہ کے مدیر ہونے کے باوجود اعجاز صاحب نے عصری ادب کا باریک بینی سے مطالعہ نہیں کیا ہے، ورنہ وہ یہ نہیں کہتے کہ "آج تخلیق کے پیڑ بے ثمر ہونے لگے ہیں"۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج کے ادب میں عصری مسائل کی عکاسی مناسب انداز میں ہو رہی ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ یہ ساری باتیں لطیف پیرایے میں تخلیق کا حصہ ہوتی ہیں، کسی کھوکھلے نعرے کی شکل میں نہیں۔ کیوں کہ سیاست کی طرح ادب میں ہونے والی نعرے بازی سے قاری پہلے ہی اوب چکا ہے۔ اور پھر ادب کا مفہوم یہ تو نہیں کہ جو زبان پر آیا بک گئے یا جو ذہن میں آیا لکھ مارا۔ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے سے قبل تخلیق کار اس موضوع کا گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے۔ مثلاً اگر اسے دہشت گردی کے خلاف کچھ کہنا ہے تو اس کی نظر دہشت گردی کے صرف ظاہری اسباب تک ہی محدود نہیں رہے گی بلکہ باریک بینی سے حالات کا جائزہ لینے کے بعد وہ یہ بھی جاننا چاہے گا کہ اس دہشت گردی یا انتہا پسندی کے اصل اسباب و علل کیا ہیں اور ان کے سدِّ باب کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔

اعجاز صاحب اگر عصری ادب کا بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو جا بجا انھیں ایسی تخلیقات مل جائیں گی جن میں ان اسباب و علل کی نشاندہی کی گئی ہے "زندہ باد، مردہ باد" والی زبان میں نہیں، بلکہ لطیف پیرایے میں۔

ارشد کمال، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دلی

● "کتاب نما" ستمبر ۹۱ء کا شمارہ ملا، اس سے قبل کے دونوں شمارے بھی دلچسپ تھے، خصوصاً گوشۂ خلیق انجم۔ ستمبر کے شمارے میں پروفیسر عبدالستار دلوی کا اشاریہ "اردو اور لسانی منصوبہ بندی" فکر انگیز اور بحث طلب ہے۔

عبدالستار دلوی صاحب نے اشاریے میں جن خیالات کا برملا اظہار کیا ہے وہ اردو ادب کے حق میں نشان راہ ہیں۔ موجودہ عہد میں عالمی ادب کی تیز رفتار ترقی کو دیکھتے ہوئے اردو ادب

سرمایہ وسیع ہونے کے باوجود کم مایہ نظر آتا ہے
اردو زبان کی لسانی، علمی، ادبی اور
ثقافتی ترقی کے لیے انھوں نے جو لائحہ عمل مرتب
کیا ہے اور اس کی عمل پذیری کے لیے جن
علمی و ادبی شعبوں کو ذمہ داری دی ہے، اس سلسلے
میں کچھ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ان علمی و
ادبی اداروں کی سمت و رفتار نیز طریقہ کار
اور لائحہ عمل ہم سبھوں پر روشن اور عیاں ہیں۔
ہمارے علمی ادارے اور یونی ورسٹیاں اور
اردو کے اساتذہ اور ادیبوں کو اس جانب
بے فکری ہے۔ جب علمی و ادبی شعبوں میں اجارہ داری
اور جانبداری کا دور دورہ ہو تو سب کہنا عبث ہے۔

تیصر زماں۔ گریڈیہ، بہار

کل کتاب نما کا تازہ شمارہ ملا۔ اس شمارے
میں سب سے زیادہ قابل توجہ نظم اور نثری تحریر
جناب علی سردار جعفری کی ہے۔ ان کی یہ تحریریں
فکر کے دروازے کھولتی ہیں۔ جعفری صاحب نے
طور پر کہا ہے کہ "کمیونزم روس میں ختم ہوا ہے۔
ہمارے یہاں نہیں۔ کمیونزم دراصل ایک تصور
ہے بہتر زندگی کا۔" اور اس کے بعد انھوں نے
انقلاب روس کے مثبت اثرات کو روسی معاشرے
کا حسین اور جامع الفاظ میں پیش کیا ہے۔ پھر
سٹالن کے مظالم کا اعتراف بھی کھل کر کیا ہے
خرشچیف اور گورباچوف کے حوالے سے —
یہاں تک بات سمجھ میں آتی ہے کہ جعفری صاحب
کمیونزم کی پیروی کر رہے ہیں اور اسے بہتر زندگی
کا تصور سمجھ رہے ہیں — مگر آخر میں انھوں نے
اپنی تحریر کو ایک عجیب موڑ دیا ہے۔ ہندستانی
کمیونسٹ پارٹیوں کو یہ مشورہ دے کر کہ وہ اپنا
وجود ختم کر دیں یعنی "بائیں بازو کی ساری
طاقتوں کو متحد ہو جانا چاہیے"۔ (اول تحریر بھی تشریح
طلب مسئلہ ہے کہ کوئی طاقت کب "بائیں" اور
کب "دائیں" ہو جاتی ہے) جعفری صاحب نے
یہ بات شاعرانہ لاگ لپیٹ کے ساتھ
کہی ہے کہ کمیونسٹ پارٹی اپنا پرچم ترک کر دے
اور کوئی دوسرا پرچم اپنا لے — اس دوسرے
پرچم کے خد و خال بھی ان کے اس جملے میں ابھر
آتے ہیں — "اپنے ماضی کے شاندار
جمہوری اور انقلابی ورثہ کو جو ہزاروں برسوں کی
تاریخ میں پھیلا ہوا ہے، اپنی جد و جہد کے
لیے پرچم بنا لینا چاہیے۔ سوویت یونین کی ٹریجڈی
سے سبق سیکھنا آج کا سب سے بڑا انقلابی
عمل ہے" — کہیں اس کا یہ مطلب تو نہیں
کہ جو کمیونزم ابھی ہمارے یہاں ختم نہیں ہوا ہے۔
اسے ختم کرنے کے لیے جعفری صاحب ہندستانی
کمیونسٹ پارٹیوں کو آواز دے رہے ہیں۔

جعفری صاحب بلاشبہ ایک عظیم لیڈرانہ
مزاج رکھتے ہیں، اگر وہ خود ہی اس "متحدہ بائیں
باز و محاذ" کی قیادت فرمائیں تو یہ ان کی زندگی
کا شاندار کارنامہ ہوگا۔ بس اس میں ایک
ہی خدشہ ہے کہ ان پر کمیونسٹ پارٹی کے
سرخ پرچم کو اتارنے کا الزام آجائے گا۔
اچانک کیفی اعظمی کی ایک نظم کے اشعار یاد آگئے۔

لال جھنڈا پھینک دو اے وکیش جگتو کیا کہا
یہ تو ہے سرمایہ داروں اور لیٹروں کی صدا
یہ صدا ان کی ہے جو برطانیہ کے ہیں غلام
یہ صدا ان کی ہے جو سنگھانیہ کے ہیں غلام

جعفری صاحب کی نظم "الوداع" بہت خوبصورت
نظم ہے نہایت رقت آمیز لہجے میں سرخ پرچم
کے اترنے کا ماتم کیا گیا ہے — مگر اس میں
جذباتیت بہت ہے۔ "سرخ پرچم" صرف کریملن

سے اترا ہے۔ ابھی جگہ جگہ لہرا رہا ہے۔ خود امریکا میں صدارتی انتخاب کے لیے "سرخ پرچم" بھی میدان الیکشن میں اترنے والا ہے (اخباری خبروں کے مطابق) اور دور کیوں جائیے ہندستان میں ہی کب اترا ہے۔ جہاں جہاں تھا وہاں سے لہرا رہا ہے اور کون جانتا ہے کہ اس جدید انقلاب کے بعد روس میں بھی کوئی اور جدید تر انقلاب آجائے اور لینن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے پھر سرخ پرچم بلند کر دیا جائے۔

ایک بات اور جعفری صاحب نے اپنی نظم الوداع، میں سرخ پرچم تلے صرف محاسن کا ہی ذکر کیا ہے۔ ان مظالم کا ہلکا سا بھی ذکر نہیں جو اسی سرخ پرچم تلے اسٹالن کے دور میں کیے گئے۔ (جبکہ اس امر کا اعتراف ان کی نثری تحریریں موجود ہے)۔

خالص ادبی نقطۂ نظر سے ایک سوال ذہن کو پریشان کر رہا ہے اور یہ سوال جعفری صاحب کی محولہ بالا نظم اور نثر سے ہی پیدا ہوا ہے ہم ترقی پسندوں نے سرخ پرچم تلے اپنی اپنی بساط کے مطابق سرخ پرچم اور سرخ ستارے اور سرخ نظام کی جو مدح سرائی کی ہے اس کا کیا ہوگا۔ گزشتہ ساٹھ سال کی نظموں کو ہی لے لیجیے۔ مجاز نے خواب سحر دیکھا۔ لال جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں۔ کلکتہ میں یہ نغمے گایا مخدوم سرخ سویرا آتا ہے۔ کا مژدہ سناتے سناتے چلے گئے۔ اور اپنی بلند آہنگ نظم چھوڑ گئے۔ اسٹالن نے بلایا ہے مجھے۔ مجروح نے غزل کو سرخ رنگ میں رنگ دیا۔

مری نگاہ میں ہے ارض ماسکو مجروح
وہ سرزمیں کہ ستارے جسے سلام کریں

کیفی تو اردو شاعری کا "سرخ پھول" بن کر ہی کھلے۔ اور سردار جعفری کی شاعری پر سرخ رنگ رگوں میں خون کی طرح موجود ہے جاں نثار اختر نے "سرخ ستارہ" جیسی مثنوی اور ہم جیسے چھٹ بھیّوں کا تو کہنا ہی کیا — میرے بھی کشکول میں انقلاب روس "لالگاؤ گنگا" اور کئی اور نظمیں ہیں — سرخ پرچم نہ جانے کتنوں کو بانس پر چڑھا دیا اب سرخ پرچم اترا ہے یا اتر رہا ہے تو کون کون منہ کے بل گرے گا، اس کا تصور کر کے جی الجھتا ہے اس دور کی شاعری کا نیا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے اور وقت کا تقاضا ہے کہ کوئی نوجوان محقق کسی بالغ نظر دانشور کی نگرانی اور گائڈنس میں تحقیقی مقالہ لکھے تا کہ اس دور کی صحیح تفہیم ہوسکے اور خود متعلقہ شعرا سے بھی (جو زندہ ہیں) پوچھنا چاہیے کہ اب اپنی شاعری کے بارے میں ان کی رائے ہے وہ اپنا سرخ کلام "مسترد کرنے" حق میں ہیں؟ ان سوالات پر آج غور کرنے کی ضرورت ہے۔

رفعت سروش۔ نئی دلی

چھینٹے چھینٹے

عصمت چغتائی کا انتقال

بمبئی۔ ۲۴؍اکتوبر۔ اردو کی ممتاز افسانہ نگار عصمت چغتائی کا آ
بمبئی میں ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ ان کی موت
نیند میں ہوئی وہ ۸۰ سال کی تھیں۔

عصمت چغتائی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پروان چڑھنے والی
نسل کی انتہائی طاقت ور آواز تھیں۔ ایک زمانے میں منٹو
اور بیدی کے ساتھ عصمت کا نام افسانوی ادب کے لیے خلا
شناخت نامے کا ایک اہم جز تھا وہ لحاف جیسے افسانے سے
ادب کے آسمان پر ایک نہایت تابندہ ستارے کی طرح نمودار ہوئیں۔
افسانے کی بیباکی نے جو عصمت کے ادبی رویے کی بیباکی کی علامت
چند حلقوں کو برافروختہ بھی کیا لیکن آگے چل کر یہی بیباکی
مستقل ادبی رجحان کی شکل میں ایک افسانوی روایت کی بنیا
بھی بن گئی۔ ادارہ کتاب نما اردو کی ممتاز افسانہ نگار کی موت
پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم

مصنف : ڈاکٹر سلامت اللہ
اشاعت : نومبر ۱۹۹۱ء، قیمت : ۵۱ روپے
ناشر : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
مبصر : عبداللہ ولی بخش قادری

یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر ایک کا عنوان اپنے موضوع کی غمازی
رتا ہے۔ اور اس کے نیچے درج جملے یا جملوں سے مرکزی خیال یا نقطۂ نظر پر روشنی
تی ہے۔ پہلا باب 'تمہید' ہے جس کے نیچے درج ہے کہ "زنجیر کی مضبوطی کا اندازہ اس
ب سے کمزور کڑی ہی سے ہوتا ہے"۔ یہاں تعلیم کا منصب واضح کرتے ہوئے
ہا گیا ہے کہ "موجودہ زمانے میں مادّی ترقی اور تہذیبی نشو و نما دونوں کے لیے
لیم کی اہمیت مسلّم ہے" اور "اس وقت ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم پر
ص توجہ دینے کا جواز یہ ہے کہ اوّل مسلمان تعلیم کے میدان میں دوسرے مذہبی
رقوں کے مقابلے میں سب سے پیچھے ہیں۔ ..... دوم یہ کہ مسلمان ملک کی سب سے
ڑی اقلیت ہیں ... ۔ اتنی بڑی آبادی کا تعلیم میں پچھڑاپن پورے ملک کی ترقی کی
اہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے"۔ اس ضمن میں فاضل مصنف نے بجا طور پر فرمایا ہے
کہ ہر جگہ مسلمان بچوں اور نوجوانوں کی تعداد اس کے مقابلے میں کم ہے جتنی کہ ان کی
بادی کے تناسب کے مطابق ہونی چاہیے"۔ اور پھر انھوں نے ایک ایسی دکھتی
گ پر ہاتھ رکھ دیا ہے جسے عموماً نظر انداز کیا جاتا ہے کہ "اس سے بھی زیادہ تشویش ناک
ات یہ ہے کہ جوں جوں تعلیم کی منزل اونچی ہوتی جاتی ہے یا ٹریننگ کا معیار بلند ہوتا
اتا ہے، مسلمانوں کی نمایندگی کا تناسب گھٹتا جاتا ہے"۔ اس کے بعد ماضی پر نظر
التے ہوئے اُن تاریخی اسباب و عوامل کا ذکر کیا گیا ہے جن کی بنا پر انگریزی راج
کے قیام سے لے کر اختتام تک مسلمان اس دوڑ میں حالات کی ستم گاری اور اپنی
ون حالی کی بدولت تعلیم کی برکتوں سے کما حقہٗ فیض یاب نہیں ہو سکے۔ پھر حصولِ

آزادی کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی کیفیت کا اندازہ لیا گیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا۔ "گہری نظر سے دیکھیے تو مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی پس ماندگی اس پورے ماحول کی پیداوار ہے جو آزادی کے بعد ملک کی تقسیم کے نتیجے کے طور پر قائم ہوا"۔ یہاں مسلمانوں کی تعلیم میں پس ماندگی کے مسئلے کو خالص قومی نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ جس میں ایک بالغ نظر ماہرِ تعلیم کی بصیرت بھی کارفرما نظر آتی ہے کہ "مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی صرف مسلمانوں کے مفاد کے منافی نہیں بلکہ اس سے پوری قوم کی رفتارِ ترقی متاثر ہوتی ہے۔ دراصل یہ ایک قومی خسارہ ہے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی کی تخلیقی صلاحیتیں پورے طور پر ملک کے ترقیاتی پروگراموں میں کام نہیں آتیں"۔ اس پس منظر کے ساتھ اُن اہم مسائل کو اٹھایا گیا ہے جن پر آیندہ اوراق میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

دوسرا باب 'تاریخی پس منظر' کا مطمحِ نظر ہے کہ "تاریخ سے سبق لینا دور اندیشی کا تقاضا ہے"۔ یہاں پر مسلمانوں کی تعلیمی اساس، ہندستان میں مسلم حکمرانوں کے عہد میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار سے لے کر انگریزی حکومت کے اختتام تک جملہ اہم مراحل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور ما حصل یہ بیان کیا گیا ہے کہ "اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اوّل انگریزی دورِ حکومت کے خاتمہ سے پہلے مسلمانوں نے ہندوؤں کے مقابلے میں اپنی تعلیمی پس ماندگی پر قابو پالیا تھا اور وہ اپنی آبادی کے تناسب کے مطابق عام تعلیمی مواقع سے برابر فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ سرکاری نظامِ تعلیم یا مغربی تعلیم کے مخالف نہیں رہے تھے۔ دوم یہ کہ اب مسلمانوں میں خالص دینی تعلیم کی کشش کچھ کم تو ہوئی تھی مگر اب بھی وہ خاصی تعداد میں دینی مدارس میں زیرِ تعلیم تھے۔"

تیسرے باب کا عنوان ہے 'موجودہ صورتِ حال اور گفتگو کا محور ہے کہ "کسی فرقے کی پس ماندگی قومی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں ہے"۔ یہاں مسلمانوں کی تعلیم کے موجودہ مسائل و مصائب پر حقیقت پسندانہ نظر ڈالتے ہوئے انھیں عالمانہ بصیرت کے ساتھ سیاق و سباق میں پیش کیا گیا ہے۔" اور جو نتائج برآمد کیے گئے ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ "تعلیم سے متعلق مسلمانوں کو ایک اقلیت کے ناتے جو آئینی تحفظات اور ضمانتیں حاصل ہیں اور اس سلسلہ میں وقتاً فوقتاً سرکاری اور نیم سرکاری طور پر جو فیصلے کیے گئے ہیں، عمل میں ان کی عکاسی بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ حکومت میں سیاسی ارادے کی کمی ہے یا وہ اس معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے"۔

چوتھے باب کا عنوان 'اصلاحی تدابیر' ہے۔ جس کے نیچے مرکزی خیال کے طور پر درج ہے کہ "نابرابروں کے ساتھ برابری کا سلوک ویسا ہی غیر منصفانہ ہے جیسا برابروں کے ساتھ نابرابری کا سلوک"۔ یہاں یہ بات صاف طور پر کہی گئی ہے کہ

ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ملک کے مختلف طبقے اور فرقے اس وقت ترقی کی مختلف منزلوں پر واقع ہیں۔ ایسی صورت میں اگر سب کو ترقی کی برابر برابر سہولتیں دی جائیں تو ملک میں موجودہ نابرابری بدستور قائم رہے گی۔" اس باب میں قومی تعلیمی پالیسی (۱۹۸۶) کا جائزہ لیتے ہوئے اس پروگرام پر روشنی ڈالی گئی ہے جو مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی دور کرنے کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ اور صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ "ساتویں پلان کے اختتام تک جو پروگرام تجویز کیے گئے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ ان میں کوئی بھی ایسا پروگرام نہیں جس کی بنا پر یہ توقع کی جا سکے کہ وہ مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی پس ماندگی کو براہِ راست دور کرنے کی جانب ایک موثر قدم ہوگا۔" یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ "نئے اسکول کھولتے وقت ان اضلاع پر خاص توجہ دینی چاہیے جہاں مسلمانوں کی گھنی آبادی ہے۔"

پانچواں باب 'مسلمانوں کی تعلیم کی تشکیل نو' ہے جس کے نیچے درج ہے کہ "تعلیم سماجی تعمیر کا ایک موثر آلۂ کار ہے" یہاں سوال اٹھایا گیا ہے کہ "اب مسلمانوں کی تعلیم کا کیا نقشہ ہو۔ وہ ایک جماعت کی حیثیت سے اپنی پہچان یا تشخص اور اپنی تہذیب کو کس طرح برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ صدیوں کے باہمی میل جول سے جو ایک ملواں تہذیب اجاگر ہوئی ہے، اسے پروان چڑھانے کے لیے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ یہاں پر مصنف کے تبحرِ علمی اور کرب دروں کی کارفرمائی متاثر کرتی ہے۔ اور اس کے خیالات ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں۔ یہ بات صاف طور پر کہی گئی ہے کہ "مسلمانوں کی تعلیم میں جہاں سائنسی رویہ پر زور دیا جائے وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اخلاقی اور مذہبی اقدار کے دامن کو مضبوطی سے پکڑا جائے۔" اور اس بات پر بھی اصرار کیا گیا ہے کہ "ہندستان کی آئینی ضمانتوں سے تعلیم اور اس کی اشاعت میں پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

چھٹے باب کا عنوان ہے 'اردو کا مسئلہ'، اس کے نیچے لکھا ہوا ہے کہ "اردو محض ایک ذریعہ ابلاغ نہیں۔ یہ تو ایک کمیونٹی کی تاریخ، تہذیب اور نفس کا خلاصہ ہے۔ ایک زبان والے کائنات کے جس نظریہ کے حامل ہوتے ہیں، وہ نتھر کر ان کی زبان میں پیوست ہو جاتا ہے۔ یوں تو جگہ بہ جگہ اردو کا ذکر آیا ہے لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ اس کو ہی موضوع قرار دیا گیا ہے۔ اردو کے ماضی و حال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس کے ذریعے تعلیم دینے والے اساتذہ کی تربیت کی اہمیت جتائی گئی ہے۔ نیز تعلیم بالغان کا ہم میں اردو سکھانے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مزید برآں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ ہم نے اردو زبان کی افادی حیثیت کو قائم رکھنے اور فروغ دینے کی غرض سے جو تجاویز پیش کی ہیں، ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جو ہمارے ملک کے آئین سے متصادم ہو یا قومی یک جہتی کے مقاصد کے خلاف ہو یا ناقابل عمل ہو۔"

آخری باب کا عنوان 'مذہبی اخلاقی تعلیم' ہے۔ اور اس کی ذیلی سرخی ہے کہ 'مذہب تمام اخلاقی اور روحانی اقدار کا سرچشمہ ہے'۔ یہاں یاد دلایا گیا ہے کہ "اسلام نے دنیا کی مذہبی تاریخ میں پہلی مرتبہ دنیوی اور دینی قدروں کو ہم آہنگ کیا" اور اس ضابطۂ حیات کے تحت گھر اور مدرسے کے رول کی وضاحت کی گئی ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں زیر تبصرہ کتاب کا خاکہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اہم نکات میں سے چند کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اس سے کسی قدر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ "مسلمانوں کو درپیش اہم تعلیمی مسائل کا کس طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک بروقت تصنیف ہے۔ اور مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کو عبرت، نصیحت، خدمت، تینوں کا سامان فراہم کرتی ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر سلامت اللہ، ہمارے دور کے چند ممتاز ماہرانِ تعلیم میں سے ایک ہیں ان کی عمر عزیز اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے۔ ان کی قیادت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا استادوں کا مدرسہ، ملک گیر شہرت کا مالک بنا۔ اور فیکلٹی تعلیم کے مرتبے پر پہنچا۔ انھوں نے تعلیمی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اور انگریزی کے علاوہ بہت کچھ اردو میں پیش کیا ہے۔ ان کے خیالات ہر طور مستند اور معتبر کہلانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ اپنے عہد بافراغت میں بھی تعلیمی خدمت میں بدستور لگے رہتے ہیں۔ اس کتاب کو انگریزی زبان میں بھی شائع ہونا چاہیے۔ اس کا زور اسکول کی تعلیم پر ہے۔ اچھا ہو کہ اعلا تعلیم کے مسائل کا بھی کما حقہ احاطہ کر لیا جائے۔ خدا کرے ان کی صحت برقرار رہے اور ان کے پختہ تعلیمی افکار سے تعلیمی دنیا برابر فیض یاب ہوتی رہے۔

تاریخی اسباب اور سیاسی حالات کی بدولت مسلمانوں کی توجہ تعلیم کی طرف کم رہی ہے۔ اور ان کے تعلیمی مسائل کی طرف اہل فکر و دانش نے اور بھی کم دھیان دیا لہٰذا اس کتاب کو شائع کرنے کے لیے مکتبہ جامعہ ہماری دلی مبارکباد کا مستحق ہے۔ اور اطمینان کا باعث ہے کہ صاف ستھری کتابت، طباعت اور جلد کے ساتھ یہ گراں قدر کتاب، کچھ ایسی گراں قدر بھی نہیں ہے۔

معترضین ابوالکلام آزاد

مصنف : عبداللطیف اعظمی
اشاعت : ۱۹۹۰ء، قیمت : ۳۶ روپے
تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی
مبصر : عبداللہ ولی بخش قادری

جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے اس کتاب کا ردے سخن معترضین آزاد کی طرف۔ مصنف نے اس کی غرض و غایت اپنے پیش لفظ میں یوں بیان کی ہے کہ "بعض لوگوں

نے ان کے افکار و خیالات کی شدید مخالفت کی اور ان کی ذات پر اور ان کے بعض
بزرگوں پر بے بنیاد الزامات لگائے۔ خاکسار نے مختلف اوقات میں ان اعتراضات اور
الزامات کے جوابات لکھے تھے۔ جو ملک کے موقّر رسالوں میں شائع ہوئے اور بالعموم
پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے۔ ان مضامین میں ایسے بھی ہیں جو اس کتاب میں پہلی
مرتبہ شائع ہو رہے ہیں۔"

اس کتاب کا پہلا اور سب سے طویل مضمون "انڈیا ونس فریڈم" ایک تحریری
مباحثہ ہے۔ جس کے شرکا مولانا غلام رسول مہرؔ، جناب عبدالباقی، مولانا محمد اجمل خاں
مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی، حضرت میکشؔ اکبرآبادی اور ڈاکٹر ریاض الرحمان
خاں شیروانی ہیں۔ بحث کی بنیاد مولانا مہرؔ کا ایک اکیس سال پرانا مضمون قرار پایا ہے
اور زیر بحث یہ مسئلہ رہا ہے کہ آیا یہ کتاب مولانا آزادؔ کی ہے یا مولانا کے سابق سکریٹری
اور اس کتاب کے املا نویس پروفیسر ہمایوں کبیر کی ہے۔ مولانا مہرؔ کی رائے ہے کہ
"کتاب کے اہم مطالب بے شک مولانا کے ہیں مگر عبارت ان کی نہیں۔ لہٰذا کتاب
بہیئت موجودہ ان کی نہیں"۔ اسی ضمن میں انھوں نے متعدد ایسی غلطیاں بھی گنائی
ہیں جو اصل مصنف سے سرزد ہونے کا شاذ ہی امکان رکھتی ہیں۔ اعظمی صاحب کے علاوہ
دیگر تمام شرکائے مباحثہ مولانا مہرؔ کی رائے سے کم و بیش متفق نظر آتے ہیں۔ میرے نزدیک
مولانا مہرؔ کی رائے نہایت صائب ہے۔ اور ان کا محتاط رویّہ ان کے خلوص اور بالغ نظری
پر دلالت کرتا ہے۔ اعظمی صاحب کو یہ بھی گراں گذرا ہے کہ مولانا مہرؔ نے مولانا آزادؔ
کو زیب شہر، کیوں گردانا۔ اگرچہ تقسیم ہند کا المیہ خود گواہی دے رہا ہے کہ مولانا مہرؔ
نے مولانا آزادؔ کے لیے بالکل درست اصطلاح استعمال کی تھی جو ایک عقیدت مند کے
قلب اور اپنے ممدوح کی دلی کیفیت کی بہتر ترجمانی کہی جا سکتی ہے! نہ کہ مولانا آزادؔ
اور ان کے احباب گرامی پر ضرب۔ مزید برآں یہ سب شرکائے مباحثہ کسی طور پر بھی
مولانا آزادؔ کے افکار و خیالات کے مخالفین کی فہرست میں شمار نہیں کیے جا سکتے بلکہ
اعظمی صاحب کی طرح معتقدین ہی کہلانے کے مستحق ہیں۔

دوسرے مضمون کا عنوان ہے "مولانا ابوالکلام آزادؔ پر چند اعتراضات اور ان کے جوابات"
جو ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے ایک حالیہ مضمون کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے جس میں
میں جناب ماہر القادری اور مولانا نسیم احمد فریدی کے برسوں پرانے نجی حیثیت کے
الزامات کی صدائے بازگشت سنائی دی تھی۔ اعظمی صاحب کے نزدیک ڈاکٹر فاروقی
کے مضمون میں "کسی دعوے پر کوئی ثبوت پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اور نہ ہی کہیں
دلائل دینے کی زحمت کی گئی ہے"۔ انھوں نے اپنے جوابات اور تصریحات کو دلائل
اور وافر حوالہ جات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تیسرا مضمون 'مولانا آزادؔ کی عربی دانی اور
ان کا پروپیگنڈہ' عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔ جس میں اعظمی صاحب نے وثوق

کے ساتھ جتایا ہے کہ مولانا کو عربی پر عبور حاصل تھا۔ چوتھا مضمون مولانا آزاد کا وطن اور خاندان ہے۔ یہاں اعتراضات کا جواب 'تذکرہ'، 'آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی' بہ روایت ملیح آبادی اور 'انڈیا ونس فریڈم' کے حوالے سے دیا گیا ہے۔ اور آغا شورش کاشمیری، مولانا مہر کے پچھلے مضامین سے تائید مزید حاصل کی گئی ہے۔ اس کتاب کا آخری مضمون 'مولانا ابوالکلام آزاد اور شاہ عبدالقادر کا 'ترجمہ قرآن' عنوان رکھتا ہے۔ مولانا آزاد نے اپنے ایک نجی خط میں شاہ صاحب کے ترجمے کی تعریف کے ساتھ اس پر کچھ تنقید بھی کی ہے۔ جو شاہ صاحب کے ایک عقیدت مند مولانا اخلاق حسین قاسمی کو ناگوار گذری اور انھوں نے ایک مضمون لکھا جس پر اعظمی صاحب نے خاصی دلچسپ بحث کر ڈالی ہے۔ اور مولانا کی تائید میں اپنا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

اعظمی صاحب نے اپنے ہر مضمون کے آخر میں حوالہ جات کی اچھی خاصی فہرست شامل کی ہے۔ وہ تحقیق و جستجو کے شائق ہیں اور قلم کے دھنی۔ یہ مضامین ان کے شغف مطالعہ اور دیدہ ریزی کی بخوبی غمازی کرتے ہیں۔ اور مولانا آزاد سے والہانہ عقیدت کا اظہار بھی۔ انھوں نے اپنے 'پیش لفظ' میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ "اگر میری اس ناچیز کوشش سے مولانا آزاد کی صاف شفاف شخصیت کے کچھ داغ دھبے دور ہو جائیں اور اگر سب کی نہیں تو کچھ لوگوں کی بھی غلط فہمیاں دور ہو جائیں تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت اور اپنی اس کوشش کو کامیاب سمجھوں گا۔" مجھے ان کی اس خواہش کے پورا ہونے میں کوئی شبہہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ پوری توقع ہے کہ ان کی یہ کتاب نہ صرف معترف و معترض کی توجہ کا باعث ہو گی بلکہ مولانا آزاد کے بارے میں عام قاری کی دلچسپی میں بھی اضافہ کا موجب ہو گی۔

یادِ وجیہ

مرتبہ: ڈاکٹر شعائر اللہ خاں

مبصر: بدر الفریدی

قیمت: غیر مجلد ۳۰/- مجلد ۵۰/- روپے

ناشر: مکتبہ وزیریہ۔ محلہ انگوری باغ رام پور

زیر تبصرہ کتاب "یادِ وجیہ" مرتبہ ڈاکٹر شعائر اللہ خاں، حضرت خطیب اعظم مولانا وجیہ الدین احمد خاں علیہ الرحمہ کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ جس میں تدریسی خدمات تصنیفی کارنامے اور اصلاحی و تبلیغی کاموں پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے کل چار حصے ہیں۔ حصہ اول حیات و خدمات کے عنوان سے، حصہ دوم علم و فن کے اعتبار سے حصہ سوم شاعری کے لحاظ سے اور چوتھے حصہ میں تعزیتی خطوط اور منظوم منقبت وغیرہ شامل ہیں۔

پہلے حصے کے اہم اہم مضمون نگاروں میں محمد نظر علی خاں، ڈاکٹر عابد علی خاں، مولانا ابوالليث اصلاحی، مسرت حسین آزاد، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مولانا سردار شاہ خاں دہمی، شبیر احمد خاں غوری مفتی عبدالقیوم لطفی، حکیم محمد حسین خاں شفا، مولانا عبید الرحمٰن خاں شیروانی، مفتی سید نجم الحسن رضوی،

دلدار نصری، مولانا عبدالوحید فتح پوری اور پروفیسر اسلم وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں خطیب اعظم کے علم و فن پر مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ ان میں جناب ایم۔ سلیم خاں کا مضمون "مولانا وجیہہ الدین احمد خاں ایک مفکرِ تعلیم" اس مضمون میں فاضل مقالہ نگار نے حضرت مولانا کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کرکے ہر دور علمی کارناموں کا جائزہ لیا ہے اور حضرت کے ذریعہ چلائے گئے مختلف تعلیمی اسکیموں اور اداروں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

حضرت خطیب اعظم کی شخصیت ایک عالم دین کے علاوہ صوفی باصفا کی حیثیت سے بھی متعارف ہے۔ اس موضوع پر معروف صحافی اور مورّخ جناب دلدار نصری نے "وجیہہ الدین احمد خاں صاحب اور ان کا نظریۂ تصوّف" کے عنوان سے حضرت خطیب اعظم کی صوفیانہ شخصیت کو اُجاگر کیا ہے۔

حضرت مولانا کی دو کتابوں "تفسیری اصول" اور "حدیثی اصول" کا مفصل تعارف بالترتیب جناب سید بہار الحق رضوی اور مولانا مفتی محبوب علی وجیہی نے دلنشین انداز میں پیش کیا ہے۔

حضرت مولانا کی شخصیت ہندستان کے عظیم مشرقی فلسفیوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اور رام پور کو اس علم کا قدیم مرکز ہونے کا فخر حاصل ہے۔ مشرقی فلسفہ کا فروغ جس قدر یہاں سے ہوا ہے، ہندستان کی کسی دوسری جگہ سے اس کی اشاعت اس قدر نہیں ہو سکی۔ چنانچہ اس موضوع پر معروف ہسٹورین جناب فرخ جلالی صاحب نے "مشرقی فلسفہ کا رامپوری مدرسۂ فکر اور مولانا وجیہہ الدین احمد خاں" کے عنوان سے ایک مختصر مگر جامع معلومات مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔ جس سے حضرت مولانا کی فلسفیانہ مرتبہ کا تعین ہوتا ہے۔

کتاب کا تیسرا حصہ حضرت مولانا کی شاعرانہ عظمت کو متعارف کراتا ہے۔ حضرت مولانا کا تخلص وجیہ ہے جو نام کا ایک جز ہے۔ انھوں نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ حضرت کا ایک نعتیہ مجموعۂ کلام "جذباتِ وجیہ" کی شکل میں طبع ہو کر قبولیت عامہ حاصل کر چکا ہے۔ مولانا کی عربی نعتیہ شاعری پر ڈاکٹر حامد علی خاں نے نہایت عمدہ اور مفصل طور پر "مولانا وجیہہ الدین احمد خاں بحیثیت عربی گو شاعر" کے عنوان سے مضمون سپرد قلم کیا ہے جو اس حصہ میں تحقیقی اور علمی نقطۂ نظر کا حامل ہے۔

حضرت مولانا کے فارسی کلام کا جائزہ جناب شبیر علی خاں شکیب اور جناب کبیر احمد جائسی صاحبان جیسے ماہرین ادبیات فارسی نے بہت عمدہ انداز میں لیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ مولانا کے فارسی کلام کا ایک قابل قدر انتخاب بھی پیش کیا ہے۔ مولانا کے اردو کلام کو متعارف کرانے کا سہرا بزرگ شاعر مولانا ابو المجاہد زاہد اور مولانا عبدالہادی خاں کاوش کے سر جاتا ہے۔ جنھوں نے مولانا کے پورے اردو کلام کے انتخاب کو اپنے مضامین میں سمیٹ لیا ہے۔ اس حصہ میں رام پور کے مشاہیر شعرا کرام کے ایک تذکرہ بعنوان "تذکرہ طور کلیم" مؤلفہ عتیق الرحمٰن خاں کلیم سے مولانا کی شخصیت اور تعارف والے حصہ کو لے کر شامل کر دیا گیا ہے۔

"یادِ وجیہ" کے چوتھے حصے میں مشاہیر کے تعزیتی خطوط شامل کیے گئے ہیں۔ جن سے معاصرین میں مولانا کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان مشاہیر میں حضرت مولانا ابوالحسن زید فاروقی،

قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا ابوالحسن علی ندوی لکھنؤ، پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں حیدرآباد سندھ، قاضی وحیدی الحسینی بھوپال، مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محل، پیر سید ضامن نظامی دہلی، مفتی عبدالحئی بنارس، کنور اعظم علی خاں خسروی کراچی، پروفیسر محمد اسلم لاہور، مفتی نجم الحسن خیرآبادی، مفتی نسیم احمد امروہوی، پروفیسر نثار احمد فاروقی دہلی، علامہ اخلاق حسین دہلوی وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔

اس کے بعد حضرت مولانا کی شان میں منظوم منقبت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس حصہ میں جناب خیال رامپوری، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، مولانا ابوالمجاہد زاہد، فردوسی ہند حضرت بدر تسلیمی، اظہر عنایتی ساغر جیلانی، عرشی الہ آبادی، دل عارفی، وغیرہ مشاہیر شعرا کرام کی نظمیں قابل ذکر ہیں۔

کتاب کے آخر میں مولانا کی شخصیت اور علمی خدمات پر مشتمل انگریزی میں ایک مختصر خاکہ بھی غیر اردو داں حضرت کے لیے شامل کر دیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں مرتب نے "ابتدائیہ" کے عنوان سے ایک معلوماتی مقدمہ لکھا ہے جس کے مطالعہ سے جہاں اس کتاب کا مجموعی تعارف سامنے آتا ہے وہیں شمالی ہندستان کے خطۂ روہیل کھنڈ کے علمی ماحول کا ایک خاکہ بھی سامنے آجاتا ہے جو دو صدیوں سے زائد تک علما و فضلا کا مرکز رہا ہے۔

ابتدائیہ میں حضرت خطیب اعظمؒ کی علمی، تبلیغی اور سماجی خدمات کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے جو اس لیے منفرد ہے کہ کسی مقالہ نگار نے اسے اس انداز میں پیش نہیں کیا جیسا کہ مرتب نے لکھا ہے۔ کاش علما حاضر اپنی روز مرہ کی خدمات کے علاوہ عوام کی بھلائی اور بہبود میں کچھ وقت لگاتے! جیسا کہ حضرت خطیب اعظمؒ نے اپنی حیات مبارکہ میں ملی فلاح و بہبود کے لیے کام کیا ہے۔ مرتب کتاب جناب ڈاکٹر شعائراللہ خاں صاحب علم و ادب کے بے لوث خادم ہیں۔ رام پور کی جامع مسجد، مدرسہ عالیہ رام پور اور رام پور کے قدیم عربی مدارس پر تحقیقی مقالات لکھ کر اہل علم سے داد تحقیق حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی تخلیقات برصغیر ہند و پاک کے مختلف رسائل میں برابر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حال میں انھوں نے انیسویں صدی کے اردو رسائل کی تاریخ پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ہے۔ ڈاکٹر شعائراللہ حضرت خطیب اعظم علیہ الرحمہ کے نواسے ہیں ان کی پوری تربیت حضرت ہی کی نگرانی میں ہوئی ہے ظاہری و باطنی علوم سے مالا مال ہیں۔ صحیح سوچ فکر رکھتے ہیں ان سے ہماری درخواست ہے کہ حضرت خطیب اعظم کی غیر مطبوعہ نگارشات کو جلد از جلد شائع فرمانے کی کوشش کریں۔

کتاب کی پشت پر پروفیسر نثار احمد فاروقی نے مرتب کتاب ڈاکٹر شعائراللہ خاں صاحب کا عمدہ تعارف پیش کیا ہے۔

تحریک آزادی اور مملکت حیدرآباد

مصنف: ڈاکٹر معین الدین عقیل
محفل علم و ادب، کراچی ۱۹۹۰ء
مبصر: سید الظفر چغتائی
۱۸۱ صفحات، قیمت: ۳۰ روپے

کتابچہ ان ملکی حالات پہ ہے جو آج ہم آنکھ سے دیکھتے ہیں اور کل تاریخ کہلاتے ہیں۔ دو مقالوں پہ مبنی ہے، پہلے میں زور ریاست حیدرآباد پہ ہے، دوسرے میں مجلس اتحاد المسلمین پہ کتابوں کے

سے حوالے ہیں، جن کی تصدیق میں نے نہیں کی۔ نقطۂ نظر پاکستانی ہونا ہی تھا۔ مصنف "حیدر آباد کی مسلم ریاست کے باشندے تھے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ آج کے ہندستان کا وسیع القلب طالب علم پڑھے نہیں یا پڑھ کے کچھ سیکھے نہیں۔ یہ بات اور کہ دوسرے اندرونی و بیرونی شواہد کے علاوہ ہم نے "ایسی بلندی ایسی پستی" اور واجدہ تبسم وغیرہ کا ادب پڑھا ہے۔ اُس حیدر آباد کو "مثالی مسلم مملکت" نہ مانیں گے اور وہاں کی "اسلامی و ہند اسلامی ثقافت کی عمدہ روایات" کو دیکھیں گے تو تنقیدی نگاہ سے بھی (جس کے معنی تنقیص نہیں ہوتے۔)

سلطنتِ مغلیہ کے زوال پہ ہندستان میں نئی ریاستوں کے قیام کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ اس ذکر کے بعد ریاستِ حیدر آباد کے امتیازی اوصاف بیان ہوتے ہیں:

رقبہ کے اعتبار سے انگلستان کے برابر۔

مسلم آبادی ۱۳ فیصد

قدرتی وسائل کی بہتات۔ معاشی ذرائع کی فراوانی۔ صنعتی و مادّی ترقی آخری دور میں آمدنی ۲۶ کروڑ سالانہ

نظم و نسق کئی طرح برطانوی ہند سے بہتر ـــــ عدلیہ انتظامیہ سے الگ

سرکاری زبان اردو۔ جامعۂ عثمانیہ۔ اسلامی ممالک کے اداروں، ملکی ادیبوں، شاعروں کو امداد اور وظیفے ـــــ یہاں فاضل مصنف کو دارالترجمہ کی سنجیدہ علمی خدمات کا عثمانیہ رصدگاہ کا بھی ذکر کرنا چاہیے تھا جہاں صدی کی چوتھی دہائی میں اپنے منطقے کا پورا آسمان ناپ ڈالا گیا۔ بیان ہوتا ہے کہ انگریزی عہد میں ملکی ریاستیں ہندستان کے نصف رقبے اور چوتھائی آبادی پہ پھیلی تھیں۔ گویا منقسم ہندستان انگریزی ہند سے کم نہیں زیادہ منظم اور وسیع ہے۔ انگریزوں نے ان ۶۲ دریاستوں کو اپنے چنگل میں جکڑ تو لیا تھا، مگر اس سے یہ فائدہ بھی تھا کہ خانہ جنگی ممکن نہ تھی۔ میرے ذہن میں ایک اور دلچسپ بات یہ آرہی ہے کہ ٹیپو کے میسور سے حیدر آباد کا تصور کریں تو دوسری ہی تصویر اُبھرتی ہے، جبکہ شیر میسور شیر ہی رہتا ہے چاہے اسے انگلستان ہی کیوں نہ دیکھیں!

مصنف نے برطانوی ہند میں ریاستوں کے قیام اور بقا کے مسائل پہ اچھی روشنی ڈالی ہے۔ بتایا ہے کہ انگریزوں نے قانون اور حکمتِ عملی سے کس طرح مجبوری درجہ انھیں برطانوی سامراج کے آلۂ کار میں تبدیل کیا اور ڈھالا۔ مگر یہ بات برملا کہی جانی چاہیے تھی۔ اس معاملے میں پاکستانی کو انگریز کی کوئی تیخ نہیں کرنی چاہیے۔ پھر یہ باتیں سامنے آتی ہیں کہ دیسی ریاستوں کے وجود سے آزاد ہندستان کے مسائل میں کیا کیا گتھیاں پڑیں۔ جنھیں آخراس "مردِ آہن" سردار پٹیل نے سلجھایا۔ یہ بات افسوسناک ہے کہ ان معاملات میں بھی لیگ اور کانگریس نے جو کیا اسے فرقہ داری سے وابستہ کیا گیا۔ شاید اس لیے بھی کہ ہمارے بدبخت دیس میں انسان کم بستے تھے، ہندو اور مسلمان سارے کے سارے۔

والیانِ ریاست کونسل کے آخری چانسلر کی حیثیت سے نواب بھوپال سامنے آتے ہیں اور پھر حیدر آباد کے خصوصی مسائل چل نکلتے ہیں۔ بہادر یار جنگ کو بہت سراہا گیا ہے اور ان کی زبان ـــ قاسم رضوی کو "جنونِ مجسم" کہلاتا ہے کیونکہ مجلس کے لیے وہ گھر لٹا دینے والے جوش میں ہوش

مستقبل کی بصیرت یا حال کے عملی تقاضوں سے کوسوں دور تھا۔

۱۷ستمبر ۴۸ء کو وہ دن کی فوجی کارروائی کے بعد حیدرآباد دکن کا "سقوط" جس پہ میں نے عبدالماجد دریابادی کو گلوگیر دیکھا ہے، اس سے پہلے دہلی سے مذاکرات کا بیان ہے۔ محمد علی جناح کا ذکر آیا ہے کہ انھوں نے مسلم حیدرآباد سے پوری قربت کے باوجود کبھی کوئی گھٹیا مشورہ نہیں دیا۔

کتاب کے صفحہ ۳۶ پہ ایک بہت مثبت بات ملتی ہے، جو مجبوروں، ستم رسیدوں کے ہمیشہ کام آتی رہے گی۔ معاشی ناکہ بندی میں یہ ہمت اور استقلال کہ پٹرول کی جگہ پاور الکحل استعمال ہو جائے اور ڈیزل کے بجائے ارنڈ اور مونگ پھلی کے تیل کا آمیزہ۔ کلورین بننے لگے اور دوائیوں کے کارخانے قائم ہوں۔ کتاب کے دوسرے باب میں مجلس اتحاد المسلمین کی تاریخ ہے۔ ایک مذہبی تنظیم ۱۹۲۸ء میں قائم ہوئی۔ ۵ سال بعد اس کے دستور میں ایک سیاسی شق کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۳۷ء سے دوسرا سماجی و سیاسی دور شروع ہوا، پھر آزادی ہند کے بعد تیسرا سیاسی وعسکری دور آیا، جس کے لیے سعد ہاشمی مرحوم ایک اور جذباتی بات کہتے تھے کہ رضاکار بے تیغ تو تھے، مومن نہ تھے۔ مصنف نے رضاکار تحریک کو ہندو احیاء پسندی کا دماغ ٹھہرایا ہے۔ ہندو سماج میں آریہ سماج قسم کی اصلاحی تحریکیں مسلم اور سکھ اقلیتوں میں ہمیشہ شبہ کی نگاہ سے دیکھی گئی ہیں اور انگریزوں نے انھیں ملکی انتشار اور تصادم کے لیے استعمال بھی کیا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ آزاد ہندستان میں حالات اتنے بدلے مگر "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی حکمتِ عملی نافذ رہی۔

گرچہ اسکندر رہا محرومِ آبِ زندگی —— فطرتِ اسکندری اب تک ہے گرمِ ناؤنوش (اقبال)

یہ تبصرہ نگار ۱۹۷۳ء میں حیدرآباد کے ایک سن رسیدہ ہندو بزرگ کے گھر گیا، چار مینار کے پاس ہی رہتے تھے۔ ان کے صاحبزادے ایک بڑے پولیس آفیسر تھے اور نواسے فزکس کے لکچرر۔ بزرگوار نے میر عثمان علی کو اچھا حکمراں کہا، جنھیں اپنی رعایا کا بڑا خیال تھا۔ صرف وہ ہندوؤں کو ترقی نہ دیتے تھے، جو جہاں تھا۔ اُسے وہیں رکھتے تھے۔ لائق علی کو اسم بامسمّی بتایا اور ریاست کے سارے ادبار کی ذمہ داری قاسم رضوی پہ ڈالی۔ یہ باتیں زیرِ نظر کتاب سے بھی یوں ہی ابھرتی ہیں

آزاد ہند میں مسلم حیدرآباد بادشاہت قائم رکھنا، چاہے جتنی جذباتی بات کیوں نہ رہی ہو، اقلیت کی حکومت کو فروغ دینے سے زیادہ نہ تھی، جو یورپ اور امریکہ کی پوری شاطرانہ تائید کے باوجود جنوبی افریقہ میں بھی آج قریب قریب دم توڑ چکی ہے۔

مرضیات

مؤلف: حکیم نعیم الدین زبیری
ناشر: بیت الحکمت، ہمدرد فاؤنڈیشن بمبئی
اڈیشن: طبع دوئم تاریخ اشاعت: ۱۹۹۱ء
قیمت: ۴۵ روپے

مرض کیا ہے اور کون سے ممکنہ عوامل واسباب ہیں جن سے امراض پیدا ہو سکتے ہیں۔ مرض کی حالت میں جسم کی ساختوں میں ترکیبی اور فعلیاتی تبدیلیاں پیدا ہوتی

نیز مرض کن کن شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے، یہ وہ موضوعات ہیں جن کا احاطہ علم طب
ہم ترین شاخ علم الامراض میں کیا جاتا ہے۔ طب کا طالب علم اس علم کے بغیر ازالہ مرض کی
تدابیر اختیار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ علم الامراض طبی نصاب کا ایک اہم مضمون گردانا
ہے۔ زمانہ قدیم سے آج تک تمام طبی نظاموں کے نصاب میں یہ مضمون شامل رہا ہے۔
مشرق کے نصاب میں بھی یہ مضمون ہمیشہ سے شامل رہا ہے اور کچھ کتابیں اس مضمون پر بھی
گئیں لیکن اوّل تو وہ اب دستیاب نہیں اور دوئم یہ کہ یہ کتابیں اب اپنے طرز بیان کے
طالب علم کے لیے زیادہ کارآمد نہیں رہی ہیں۔ نیز یہ طبیہ کالجوں کے نصاب کے مطابق
ہیں۔ جیسا کہ کتاب کے تعارف میں محترم حکیم محمد سعید صاحب نے فرمایا ہے، ایک
اس موضوع پر "ماہیت الامراض" کے نام سے حکیم محمد شریف جامعی صاحب نے تصنیف
تھیں۔ گو کہ یہ کتاب بہت ضخیم و جامع ہے لیکن اس کی زبان طلبہ کے لیے بہت مشکل
نصابی کتاب کے لیے ضروری ہے کہ وہ طالب علم کے فہم کو مدنظر رکھ کر آسان اور عام فہم زبان میں لکھی جائے۔
معاملے میں زیر تبصرہ کتاب "مرضیات" کے مؤلف جناب حکیم نعیم الدین زبیری صاحب قابل ستائش ہیں کہ
نھوں نے اپنی اس تصنیف میں طلباء کی دقتوں کو مدنظر رکھا ہے، اپنی اس کوشش میں حکیم صاحب کامیاب
ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ ایک قابل اور فاضل استاد بھی ہیں لہٰذا طلبہ کی نصابی ضرورتوں اور تدریسی دقتوں سے واقف ہیں۔
کتاب "مرضیات" بیت الحکمت نے شائع کی ہے جو ایک علمی و سائنسی ادارہ ہے۔ ہمدرد
طبی و سائنسی اور علمی کتب کی اشاعت کے لیے محتاج تعارف نہیں اور نہ ہی کتاب
ضیات" کے مؤلف محتاج تعارف ہیں۔ آپ نے متعدد طبی اور علمی موضوعات پر تصانیف
ت و تراجم پیش کیے ہیں۔ فاضل مؤلف کی یہ کتاب طبی نقطہ نگاہ سے خاص اہمیت
ہے۔ کیونکہ یہ طبی نصاب کو زمانۂ حال کی ضروریات سے ہم آہنگ کرنے اور ایک
اج و متحد قومی نظام طب و علاج کی ترویج کی جانب ایک اہم قدم ہے۔
"مرضیات" نصاب طب میں شامل علم الامراض کے تمام جدید موضوعات پر مشتمل
جامع، مکمل مگر مختصر اور معیاری کتاب ہے جس میں اردو اصطلاحات کے ساتھ ساتھ
یزی مترادفات بھی درج ہیں۔ نیز اصطلاحات پر ضروری اعراب بھی لگائے گئے ہیں۔
طلباء ان کا درست تلفظ کر سکیں۔ سادہ اور رنگین تصاویر کے ذریعے نہ صرف علمی
ریات کو پورا کیا گیا ہے بلکہ اسے خوبصورت بھی بنایا گیا ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی
ہے کہ اگرچہ طبی کالجوں کے طلباء کے لیے تصنیف کی گئی ہے لیکن اس سے دیگر نظام
مثلاً ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کے طلباء بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔ نیز ایک عام پڑھا
شخص بھی اپنے علمی ذوق کو پورا کرنے کے لیے اس کتاب سے استفادہ کر سکتا ہے۔
کتاب "مرضیات" کا یہ دوسرا ایڈیشن بعض ضروری اضافوں کے ساتھ مرتب کیا
ہے نہ صرف یہ اپنے مضامین و طرز تحریر کے اعتبار سے بہتر ہے بلکہ کمپیوٹر کمپوزنگ
نے بہت خوبصورت بنا دیا ہے اور یقیناً اردو زبان کی طبی تصانیف میں کمپیوٹر میں
ہونے والی یہ پہلی کوشش ہے

ادبی اور تہذیبی خبریں

یوسفی لائبریری ۔ مالیگاؤں

بہ اعزاز ادیب الاطفال ایم یوسف انصاری صاحب شہر مالیگاؤں کے مشہور سوشل ورکر بچوّں کے ادب کے ہمدرد ' اور سکریٹری انجمن تعلیم جمہور ڈاکٹر افتخار احمد صاحب نے ۵ ستمبر ۹۱ یوم اساتذہ کے موقع پر 'یوسفی لائبریری' کا اجرا اپنے ذاتی خرچ سے کیا۔

ڈاکٹر موصوف نے اس لائبریری کو مہاراشٹر کے مشہور ادیب الاطفال جناب ایم ۔ یوسف انصاری ۔ ایم ۔ اے ۔ کے نام سے منسوب کیا ہے۔ بچوّں کے ادب میں جن کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں ۔ ایم یوسف انصاری صاحب کے گولڈن جبلی شاہکار "طلسمی گھوڑا" پر امسال مہاراشٹر اردو اکادمی نے انعام عطا کیا ہے۔ یہ ان کی پچاسویں کتاب ہے۔ انصاری صاحب بچوّں کے ادب کے میدان میں چالیس سال سے گھوڑے دوڑا رہے ہیں ۔ بقول سلیم شہزادہ "مالیگاؤں میں بچوّں کے ادب کی تخلیق کا اجارہ اطفال والوں (ایم ۔ یوسف انصاری ۔ بختیار سعید، حفیظ الرحمٰن : اردو کومک ٹیم) نے لے رکھا ہے۔

ادب نواز حضرات، بچوّں کے پرانے رسائل اور کتب بطور عطیہ دے کر بھی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

مکتبۂ اطفال، ۳۶۸ نیو وارڈ ۔ مالیگاؤں

دو روزہ ' کل ہند سیمنار

داتا دیال مہرشی شیو برت لال (ورمن) • حیات اور خدمات

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام، تقدس مآب مالوَدیا[illegible] ایشور چندر شرما اور عالی جناب موہن[illegible] کے اشتراک سے داتا دیال مہرشی شیو[illegible] لال ورمن کی علمی خدمات کا تحقیقی و[illegible] جائزہ لینے کے لیے ۱۸، ۱۹ اگست ۹۱ کینیڈی ہال آڈیٹوریم میں دو روزہ کل ہند سیمنار منعقد ہوا۔

۱۸ اگست کو افتتاحی جلسہ ہوا[illegible] قرآن پاک کے بعد صدر شعبۂ اردو پر[illegible] منظر عباس نقوی نے اپنے خطبۂ اس[illegible] میں فرمایا کہ مہرشی جی نے اپنی بیوی[illegible] فرمائش پر ہندو خواتین کی تعلیم و[illegible] کے لیے اردو میں کتابیں لکھنی شروع[illegible] تھیں ۔ اس سے اس عام خیال کی [illegible] ہو جاتی ہے کہ اردو ہندو خواتین کی [illegible] نہیں رہی ہے ۔ انھوں نے مہرشی [illegible] متعلق تحقیقی کام کی رفتار اور تفصیلا[illegible] کیں اور یہ بتایا کہ اب تک اس سلسلے [illegible] ڈاکٹر محمد انصار اللہ کتنا کام کر چکے ہی[illegible] سیمینار کے کنوینر ڈاکٹر محمد[illegible] نے اپنے تمہیدی خطبہ میں کہا کہ [illegible] دیا شنکر نسیم اور پنڈت رتن ناتھ [illegible]

کردار بھی ایسا پیش نہیں کر سکتے تھے
ہند د کہا جا سکے، البتہ مہرشی شیوبرت
ورمن کے نمایاں ہونے کے بعد
(اڈیٹر) چکبست (شاعر) سدیرام (تذکرہ
ہیں) اور پریم چند (ناول و افسانہ نویس)
ی بے مثال شخصیتیں ابھر کر سامنے آنے
ں اور زبان اردو صحیح معنوں میں ہندوؤں
لمانوں کی مشترک زبان بن گئی۔

مالو دیال صاحب نے زبانِ اردو
ے اپنے غیر معمولی شغف کا ذکر کرتے ہوئے
ایا کہ میرے والد بھی پنجاب کے اردو
اروں میں اہمیت رکھتے تھے۔ داتادیال
دبرت لال ورمن کا تعارف کراتے ہوئے
زدیال صاحب نے بتایا کہ ملکی اور غیر ملکی
ند زبان کے عالم ہونے کے باوجود
شی جی نے تصنیف و تالیف کے لیے اپنے
ہ کی سب سے زیادہ مقبول اور شیریں
یازبان اردو کا انتخاب کیا تھا اور کہتے تھے
قدرت نے مجھے اردو داں طبقہ میں رکھا
ہے۔

وائس چانسلر پروفیسر محمد نسیم فاروقی
صدارتی تقریر میں خوشی کا اظہار کیا کہ
اس سیمینار کے ذریعہ اردو کے ایک ایسے
ر التصانیف صاحبِ قلم کو پہلی بار متعارف
رایا جا رہا ہے جس نے ہندستان میں قومی
ہی کا ماحول پیدا کرنے کے لیے خود کو وقف
دیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں فخر ہے
مہرشی جی سے متعلق مطالعہ کی ابتدا
گڑھ میں ہو رہی ہے۔

آخر میں پروفیسر نعیم احمد نے
مام مہمانانِ گرامی کا شکریہ ادا کیا۔

سیمینار کا دوسرا اجلاس شام کو چار بجے ہوا جس میں دس مقالات پڑھے گئے۔

سرور ساجد اور انیس رفیع کے کے ساتھ ایک شام

دہلی کی ایک نئی ادبی تنظیم "احباب" کی جانب سے ۳ ستمبر ۹۱ء کو افسانہ نگار طارق چھتاری کی قیام گاہ نیو فرینڈس کالونی، نئی دہلی میں ایک ادبی شام کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں پہلے سرور ساجد نے اپنی پانچ غزلیں سنائیں پھر انیس رفیع نے اپنا افسانہ کٹھی بہوتی پڑھا۔ پھر ان دونوں فنکاروں پر دو ٹوک گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا جس میں قمر احسن، انیس رفیع، ڈاکٹر خورشید احمد، پیغام آفاقی، مہتاب حیدر نقوی، ڈاکٹر ابن کنول اور فرحت احساس نے حصہ لیا۔

ادیب اور آزادیٔ فکر: ایک مذاکرہ

گذشتہ دنوں دہلی کے ایک ادبی ادارے "اردو فاؤنڈیشن" کے زیر اہتمام 'ادیب اور آزادیٔ فکر' کے موضوع پر ایک مذاکرہ ہوا۔ ابتدا میں ادارے کے سکریٹری رفعت سروش نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ آج تمام دنیا میں نظریاتی سطح پر اہم تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور اس تناظر میں یہ موضوع ہر دانشور کو دعوت فکر دے رہا ہے۔ جوگندر پال نے 'ادب برائے ادب' اور ادب برائے زندگی" کی بحث کو آج کے ماحول میں غیر ضروری کہا اور فرمایا کہ ادب کی تخلیق کے لیے تحریکات اور محاکمے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اصل

چیز ہے اس کے اندر کا جذبہ۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے ان سے اتفاق کرتے ہوئے فرمایا کہ جمالیاتی قدروں کے بغیر اچھا ادب تخلیق نہیں ہوتا۔ ابوالفیض سحر نے کہا کہ نظریات سے یکسر انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ رفعت سروش نے کہا کہ اچھا ادیب اور شاعر اپنا لوہا منوا کر رہتا ہے۔ مقصدیت نے ہمیں حالی، اقبال، جوش مجاز اور فیض جیسے شاعر دیے ہیں۔ پیغام آفاقی نے کہا کہ ادیب کے یہاں ایک اپنی ذہنی تنظیم ہوتی ہے۔

اس ادبی جلسے کی صدارت مہمان امریکی شاعر عظمت علی شاداں نے کی۔ دیگر شرکا کے بزم میں بیکل اتساہی، ممتاز مرزا ڈاکٹر رضیہ حامد شبانہ نذیر اور عشرت کرتپوری وغیرہ شامل تھے۔

اپنے سائے کے سوا

برصغیر کے معروف، منفرد اور ممتاز شاعر ڈاکٹر اختر بستوی کی ایک سو ایک مختصر نظموں کا مجموعہ، زمین کی خوشبو کلاسیکیت اور جدیدیت کے امتزاج سے پیدا شدہ ایک نئے ذائقے اور نئے رنگ و آہنگ کی حامل ایک دل نشین کائنات، دیدہ زیب کتابت اور طباعت کے ساتھ شائع ہو گئی قیمت ۵۰ روپے، ملنے کا پتہ: روشن منزل گاندھی نگر، بستی (یو۔پی)

پروفیسر آزاد کے لیے قومی یکجہتی ایوارڈ

لکھنؤ (ڈاک سے) ۷ار ستمبر ۹۱ء" حسینی ایوارڈ برائے قومی یک جہتی سو لکھنؤ نے ۱۹۹۱ء کا حسینی ایوارڈ برا قومی یک جہتی پروفیسر جگن ناتھ آز دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس ایوارڈ کا فیصلہ حسینی ایو برائے قومی یک جہتی سوسائٹی کی کی ہوئی ایک اکیس رکنی کمیٹی نے کیا جس کے صدر لکھنؤ ہائی کورٹ کے جج جسٹس سید حیدر عباس رضا ہیں۔ (ناہ

قتیل شفائی، شہزاد احمد اور بیگم مم کے اعزاز میں

جلسۂ استقبالیہ

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی زیر اہتمام قتیل شفائی، شہزاد احمد اور محترمہ بیگم ممتاز مرزا (دہلی) کے ا میں جلسہ استقبالیہ منعقد کیا گیا۔ ابتدا پروفیسر جاوید خاں (وزیر و چیرمین اکادمی) نے فرمائی۔ جوائنٹ سکر فیاض احمد فیضی نے مہمانوں کا تعا اور خیر مقدم کیا۔ علی سردار جعفری نے کی گل پوشی کی اور فرمایا کہ قتیل اور شہ اس عہد کے اہم اور معتبر شاعر ہیں۔ ا استقبال کرتے ہوئے مجھے مسرت ہے۔ بیگم ممتاز مرزا بہ حیثیت شاعر مقام رکھتی ہیں۔ پروفیسر جاوید خا اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا کہ ادی اور شاعروں کے خیالات اور تخلیقا روشنی حاصل کرنے کے لیے ایسی تقر کا اہتمام ضروری ہے۔ اس کے بعد

زمرزا، شہزاد احمد اور قتیل شفائیؒ
اپنی غزلیں سنائیں۔ سامعین کے اصرار
ں سردار جعفری نے اپنی تازہ نظم
دانا اے سرخ پرچم' پیش کی۔
محترمہ نورالعین علی (جوائنٹ سکریٹری)
شکریے پر اس پر لطف محفل کا
نام ہوا۔

ادبی مجاور بھی تو کچھ کریں

بتر" بابت ۲۴ اگست ۱۹۹۱ء پیش نظر ہے
یہ پڑھ کر حق گوئی کی داد دینا چاہتا ہوں
ترا حضرات مشاعرے کا بائیکاٹ کر دیں
تو اردو کے نام پر روٹی کون سینکے گا۔
دی خدمت کے نام پر اپنی خدمت کرانے
ں کا گذارہ کہاں سے ہوگا۔ یہ کالج کے
فیسر جو ایک ماہ میں بمشکل تمام دو تین
ھنٹوں کو چہرہ دکھاتے ہیں۔ اور باقی
ری کے جوہر دکھا کر اپنی تجوریاں
تے ہیں۔ ان کے مستقبل کا کیا ہوگا۔
رسائل نمایاں انداز سے ان کا کلام
ئع کرتے ہیں۔ کبھی انھوں نے خریداری
کی ہے۔ کچھ خریدار بھی فراہم کیے ہیں۔
ت اور بناوٹ میں بہت فرق ہے۔ غیر
دی جرائد بند ہو رہے ہیں۔ اگر یہ ادبی
تھوڑی زحمت گوارا کر لیں۔ تو ہزاروں
فراہم کر سکتے ہیں۔ میرے والد
ابو العروج زیدی مرحوم اپنی تخلیق
یتے تھے اور سالانہ چندہ بھی معاوضہ
متعلقین کے پتے ارسال کر کے
جاری کرا دیتے تھے۔ اخبارات
ئل جلد کی شکل میں آج بھی ان کی
لائبریری میں محفوظ ہیں۔ حکومت سے تعاون
کے ساتھ ساتھ اردو کے قاری بڑھانا بھی
ہمارا فرض ہے۔ اس کام کے تحریک چلانے
کی ضرورت ہے۔

عرفان زیدی۔ (بدایوں)

ضلع رائے گڑھ میں دو روزہ تعلیمی سیمینار

تاریخ یکم اکتوبر ۱۹۹۱ء
نقش کوکن ٹیلنٹ فورم بمبئی
اور مہاراشٹر اردو اکادمی کے اشتراک سے
دہور ضلع رائے گڑھ میں اردو اساتذہ
کا دو روزہ تعلیم سیمینار اور ورکشاپ
منعقد ہوا۔

۲۸۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۹۱ء کو منعقدہ اس
تعلیمی سیمینار میں کوکن میں واقع اردو
ہائی اسکولوں کے اردو پڑھانے والے
اساتذہ نے شرکت کی۔ پروفیسر
اکبر رحمانی نے دسویں جماعت کے اردو
کے پرچہ پر سیر حاصل بحث کی جبکہ غنی غازی
اور عبدالرحیم نشتر نے عملی اسباق پیش کیے۔
اساتذہ کرام نے ورکشاپ میں
ایس۔ ایس۔ سی کا اردو پرچہ تیار کیا نیز
اپنے مسائل پر گفت وشنید کی۔ شب میں
طلبہ کے مابین بیت بازی کا مقابلہ ہوا۔
پروگرام کی صدارت ڈاکٹر عبدالکریم
نائیک نے فرمائی جبکہ مہمان خصوصی پروفیسر
اکبر رحمانی، الحاج عبدالغنی مجندار تھے۔ ایچ۔ بی
مقدم اور ابراہیم سندیلکر صاحبان نے رسم
گل پوشی انجام دی۔ جبکہ نقش کوکن کے مدیر
فقیر محمد مستری صاحب نے پروگرام کی غرض

و غایت پر روشنی ڈالی۔ جناب مبارک کاپڑی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

حضرت دل شاہجہاں پوری پر ایک تحقیقی مقالہ

جناب حامد علی خاں شعبۂ اردو بریلی کالج روہیلکھنڈ یونی ورسٹی کو ان کے مقالے "دل شاہجہاں پوری شخصیت اور فن" پر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے۔ دل شاہجہاں پوری منشی امیر احمد مینائی لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔

پروفیسر شعیب اعظمی اور پروفیسر محمد اجتبا ندوی کو پریزیڈنٹ ایوارڈ

پروفیسر شعیب اعظمی صدر شعبۂ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور پروفیسر محمد اجتبا ندوی صدر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد (سابق استاد شعبۂ عرب ایرانین اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ) کو فارسی و عربی میں ان کی علمی خدمت کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے سرٹیفکٹ آف آنر کا اعزاز دیا گیا ہے۔ ادارہ ہر دو حضرات کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد اشرف عارف کو پی، ایچ، ڈی

ڈاکٹر ہری سنگھ گورو شو ودیالیہ ساگر نے جناب محمد اشرف عارف کو ان کے مقالے "جگت موہن لال داں اور ان کی شاعری" پر پی، ایچ ڈی کی ڈگری تفو[یض] کی۔

سہ ماہی۔ انتساب

دس سال سے پابندی سے شا[ئع] ہو رہا ہے۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں پیش کر رہے ہیں۔ ۲ فاضلی نمبر جو تقریباً دو سو [صفحات] پر مشتمل ہے۔

قلم کار حضرات توجہ فرمائیں۔

رابطہ: سیفی سرونجی، سیفی لائبریر[ی] سرونج۔ ۴۶۴۲۲۸۔ ایم۔ پی

اردو کے فروغ کے لیے ایک اہم اپیل

جناب سید جعفر حسین صاحب سرونج میں احمد سعید اردو لائبریری ق[ائم] کی ہے۔ موصوف ریٹائرڈ پر د[...]سنگھ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے [بعد] سے اردو کے فروغ کے لیے کوشا[ں] ہیں۔ یہاں سرونج کے طلبہ کو کتا[بیں] پڑھنے کے لیے بلا کسی فیس کے د[ی جاتی] ہیں۔ اس وقت لائبریری میں اسلام[ی] اور درسی کتب کا خاصا ذخیرہ ہے اور [اس] کے ساتھ ہی بچوں کے لیے "پیام تعلیم" دلچسپ کتابیں بھی ہیں۔ اس سے طلب[ہ میں] بھی اردو پڑھنے کا شوق تیزی سے [بڑھ] رہا ہے۔　　(سرونج)

ایک چراغ اور بجھا

شاہجہاں پور۔ ادبی حلقوں میں یہ خبر بڑے دکھ کے ساتھ سنی جائے گی کہ ملک گیر شہرت یافتہ شاعر جناب تبسم شاہجہاں[پوری]

ہر ۱۹۹۱ء بروز بدھ بوقت ۹ بجے صبح ایک
دورہ قلب کی تاب نہ لاکر اس دارِ فانی
ح کر گئے۔

نبسم شاہجہاں پوری نے اپنا ادبی سفر
۱۹۹ء سے شروع کیا تھا۔ موصوف
نے سخن داوری سے نوازا تھا جس
لے میں عوام و خواص نے بھی انھیں
و شہرت اور انعام و اکرام سے خوب
سرفراز کیا۔ پسماندگان میں بیوہ ایک
ز ایک شادی شدہ لڑکی ہیں۔

رو۔ ہندی اور اردو کے نقاش
اوّل

ہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی میں پروفیسر فضل الحق
ہ اردو کی نگرانی میں سال رواں کا پہلا سمینار
۱۹۹۱ء کو فیکلٹی آف آرٹس میں منعقد ہوا۔
ما اردو کے ممتاز نقاد اور ماہر لسانیات
ر گوپی چند نارنگ نے امیر خسرو کی ہندی
ری پر توصیفی خطبہ پیش کیا۔ جلسہ کی کارروائی
بن کنول نے چلائی اور صدارت ڈاکٹر
شارب ردولوی نے فرمائی۔

کے ادب پر دو روزہ ورکشاپ

اردو اکیڈمی کا شاندار کارنامہ

ل۔ ہریانہ اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام ۱۲ ر ۱۳ اکتوبر
ں کا ادب۔ ماضی، حال اور مستقبل" کے موضوع
شاندار سمینار منعقد کیا گیا۔ اس کا افتتاح
اردو نواز اور ہریانہ سرکار کے کمشنر برائے تعمیرات
نہایت شستہ اردو میں کیا۔ موصوف نے بچوں
سے متعلق نہایت اہم اور کارآمد مشورے
ہریانہ اردو اکیڈمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال

ذاکر اور اکیڈمی کے کارکنان کے اس نیک اہم اور
بنیادی کام کو دل کھول کر سراہا۔ اس سمینار میں
ہریانہ اردو اکیڈمی کے علاوہ ترقی اردو بیورو، انجمن
ترقی اردو، نیشنل بک ٹرسٹ، اردو اکیڈمی دہلی، مکتبہ
جامعہ لمیٹڈ اور چلڈرن بک ٹرسٹ کے نمائندوں نے
شرکت کی۔ کشمیری لال ذاکر نے مہمانوں کا استقبال
کرتے ہوئے فرمایا کہ اس ورکشاپ میں صرف اردو
کے ناشرین اور ادیبوں کو ہی مدعو نہیں کیا گیا بلکہ
دوسری زبان کے ادیبوں، اساتذہ اور طالب علموں
ریڈیو۔ ٹی وی کے نمایندوں اور صحافیوں کو بھی
شرکت کی دعوت دی گئی ہے اور یہ ہمارے لیے خوشی
کی بات ہے کہ یہ سب ہمارے درمیان موجود ہیں۔

جن حضرات نے اس ورکشاپ میں اپنے
زریں خیالات کا اظہار کیا ان میں ڈاکٹر خلیق انجم،
پروفیسر اشتیاق عابدی، شریف الحسن نقوی، ڈاکٹر
اسلم پرویز، پروفیسر شمیم حنفی، غلام حیدر، جمال صفی
ایس۔ اے رحمان، ڈاکٹر خوشحال زیدی اور شیخ
سلیم احمد نمایاں تھے۔ جن حضرات نے بحث میں حصّہ
لیا ان میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند، مادھو کوشک، ڈاکٹر
کملیش موہن اور ڈاکٹر ہارون ایوب شامل تھے۔
دوسرے دن کے اجلاس کا افتتاح وائس چانسلر گروکل کے

ڈائرکٹر جناب انوپ مہاجن، سابق کمشنر جناب این
کھوسلہ، کالج آف آرکیٹیکچر کے پرنسپل جناب ایس
ایس بھٹی۔ دینک ٹریبون کے اڈیٹر جناب وجے سہگل
پنجابی ٹریبون کے اڈیٹر جناب ہربھجن ہلوارہ، پنجاب
یونی ورسٹی کے ڈاکٹر ہارون ایوب اور ڈاکٹر ایس۔ پی
آنند نے شرکت کی۔ اس دن یعنی ۱۳ اکتوبر کو کئی
اہم تجاویز اتفاق رائے سے منظور کی گئیں جن پر
عمل کرانے کی ذمے داری ڈاکٹر خلیق انجم اور جناب
کشمیری لال ذاکر کے سپرد کی گئی۔ اس جلسے میں
ہندی کے بچوں کے ممتاز ادیب، صحافی مادھو

کوشش اور مکتبہ جامعہ کے نمائندے کے درمیان دلچسپ نوک جھونک بھی ہوئی۔ لیکن بعد میں دونوں گلے ملتے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دیکھے گئے کاش، اردو ہندی بھی اسی طرح گلے ملے تو ہندستان کی کایا ہی پلٹ جائے۔

اس ورکشاپ کی کامیابی کا سہرا اکیڈمی کے کارکنان خصوصاً ناشر نقوی اور شمس تبریزی کے سر ہے۔

عاشق لائبریری میں بچوں کا گوشہ

سنبھل۔ عاشق لائبریری کے اعزازی سکریٹری ماسٹر خلیق احمد کی اطلاع کے مطابق ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی بلاک میں بچوں کے لیے ایک علاحدہ گوشہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کی ذمے داری جلال افسر کو دی گئی جو بچوں کے رسائل اور کتب کو سلیقے سے رکھوانے کا بندوبست کریں گے۔

نظریاتی تنازعوں کے دور میں ایک غیر جانب دارانہ روایت کا نقیب

کتاب نما

دسمبر ۱۹۹۱ء جلد ۳۱ شمارہ ۱۲

فی پرچہ 6/=
سالانہ 55/=
سرکاری تعلیمی اداروں کے لیے 75/=
ممالک سے (بذریعہ بحری ڈاک) 120/=
(بذریعہ ہوائی ڈاک) 320/=

اڈیٹر
شاہد علی خاں

صدر دفتر:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵
TELEPHONE 630191

شاخیں:
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ بمبئی ۴۰۰۰۰۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونی ورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

پرنٹر پبلشر سید وسیم کوثر نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ سے شائع کیا۔

اس شمارے میں

تذکرۂ ماہ وسال (تذکرہ) مالک رام ۱۲۵/-
تحقیق نامہ (تحقیق) مشفق خواجہ ۱۲۵/-
فریدو فرد فرید (تذکرہ) ڈاکٹر اسلم فرخی ۲۷/-
خواب وخلش (شعری مجموعہ) آل احمد سرور ۴۴/-
بچوں کے اسماعیل میرٹھی (بچوں کے لیے) حکیم نعیم الدین زبیری ۲۶/-
مولانا شبلی نعمانی (بچوں کے لیے) ڈاکٹر اسلم فرخی ۴/۵۰
رسول اللہ کی صاحبزادیاں " فضل قدیر ندوی ۴/۵۰
اسلامی ریاست مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ۹۹/-
غائب مشین (بچوں کا ناول) سراج انور ۱۴/-
آئینی پیکچر وقومی الیکشن کے بنیادی اصول (چینی حب) ڈاکٹر محمد ظہیر الدین ۱۲/-
ڈارون اور اس کا نظریۂ ارتقاء (سائنس) افتخار عالم خاں ۵/۵۰
شکاری شکار اور جنگل سے پیار (کہانیاں) رضیہ محسن ۱/-
فوائد الفواد (نیا اڈیشن) ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاءؒ ۱۰۰/-
طبقات سخن (تذکرہ) ڈاکٹر نسیم اقتدار علی ۱۵/-
اردو شاعری میں نعت گوئی (تذکرہ نعت گو) ڈاکٹر شاہ شاد عثمانی ۷۵/-
جن اور شیاطین کی دنیا ترجمہ عبدالسلام سلفی ۳۵/-
الہام (شاعری) ابراہیم اشک ۴۰/-
زندگی نامہ (مضامین) ساجد رشید ۴۰/-
متحرک منظر کی فریم (افسانے) معین الدین عثمانی ۲۶/-
رباعیات (شاعری) زیڈ۔ ایچ خاں زاہد ۲۰/-
اسد اللہ خاں غالب مرد (مضامین) مرتبہ کالی داس گپتا رضا ۸۰/-

سرورق : یوسف ناظم

انشاء (ڈاکٹر قمر رئیس نمبر) مجلہ مرتبہ ف۔س۔اعجاز ۴۰/-
ہمے ولی پوشیدہ (مضامین) ڈاکٹر اشفاق محمد خاں ۱۰/-
ولی سے آتش تک جلد اول (نیا اڈیشن) (تنقیدی مضامین) ایم حبیب خاں ۵۰/-
غالب سے اقبال تک (جلد دوم) نیا اڈیشن تنقیدی مضامین ایم حبیب خاں ۵۰/-
حسرت سے فراق تک جلد سوم (نیا اڈیشن) (تنقیدی مضامین) ایم حبیب خاں ۵۰/-
صحرائے اعظم (طبع زاد ڈراما) زاہدہ زیدی ۱۰/-
تلامذۂ صفی اورنگ آبادی (تذکرہ) محبوب علی خاں اخگر ۵۰/-
عالمی اردو ادب نمبر ۱۹۹۱ء مدیر نند کشور وکرم ۴۰/-
ہومیو پیتھک گائیڈ (ڈاکٹری) محمد مسعود ۵/-
انبیاء کرام کوئز (مذہبی معلومات) علی اصغر چودھری ۵/-
منزل نہ ملی (کہانیاں) عبدالقادر سوداگر ۵/-
ٹوٹے بند حصن (افسانے) رضیہ بٹ ۱۰/-
انوار خیال (علمی وتحقیق) ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم ۱۰/-
غبار فکر (مجموعہ غزلیات) گوہر شیخ پوری ۳/-
تلاشِ فن (ادب) ڈاکٹر یونس اگاسکر ۰/-
منزل نہ ملی (افسانے) عبدالقادر سوداگر ۵/-
مرقع جامعۂ اردو (بیادگار جشن زریں) مرتبہ مرزا خلیل بیگ ۱/-
ریخ میرٹھی حیات، شخصیت اور کارنامے مقصود حسن ۱
جذبوں کی آگ (کہانیاں) امروز جہاں ۸/-
مجلہ انجمن طلباء مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ
عصری فارسی شاعری اور شعرا سید حسن اختر ۲۵/-
ذہن جدید (سہ ماہی شمارہ ۵) ترتیب زبیر رضوی ۲/-
جام صوفیا (ماہنامہ) اڈیٹر محمد یٰسین ۲/-

مہمان مدیر
یوسف ناظم
الہلال ۱۳۰۔ باندرہ ریکلیمیشن
بمبئی ۔ ۵۰

اشاریہ ۱

حضرتِ ناصح جو آئیں

پہلے تھوڑی سی تمہید برداشت کر لیجیے۔ وہ یہ کہ دنیا میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی دور آتا رہا ہے۔ ان ادوار کے نام البتہ بعد میں تجویز کیے گئے مثلاً پتھروں کا دور، ذخیرہ وغیرہ۔ اب ہم جس دور سے بحُسن و خوبی گزر رہے ہیں وہ مسائل کا دور ہے۔ پتھر ہم نے پیدا نہیں کیے تھے۔ لیکن مسائل ہم ہی پیدا کرتے ہیں۔ یہ ہمارا محبوب مشغلہ ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ ہم پہلے اسلحہ بناتے ہیں اور بعد میں ان پر تحدید عائد کرتے ہیں کیونکہ اگر ہم ایسا نہ کریں تو پھر ہمارے پاس کرنے کے لیے کوئی ایجنڈا نہیں ہوتا۔ سطح عالمی ہو یا ملکی، بین قومی ہو یا صرف قومی۔ مرکزی ہو یا ریاستی، عوامی ہو یا خالصتاً نجی، ہمارے حساب سے ہر سطح پر ایک نہ ایک مسئلہ ضرور ہونا چاہیے۔ خلفشار اور انتشار کے لیے۔ (کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح ہم لوگ سطحی ہو گئے ہیں لیکن یہ نظریہ ڈارون کے نظریے کی طرح غلط ہے) منی پیمانے پر اسی قسم کے مسائل زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی پیدا کیے جاتے ہیں۔ ان شعبہ ہائے حیات میں ایک شعبہ فنونِ لطیفہ کا ہے جس میں شعر و ادب کا نام سرِ فہرست ہے۔ ادب میں جو مسائل پیدا کیے جاتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے 'ہائے' ضرور کہنا پڑتا ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں اس ہائے کی ضرورت اگر پڑتی بھی ہے تو کم۔ ادب کے مسائل کے بارے میں یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس میں دو ٹوک فیصلہ ممکن نہیں ہے۔ ہم لوگ اسی دو ٹوک۔ قولِ فیصل کے اندھیرے میں آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ ہمارے سمپوزیم، سیمی نار، شامیں، نشستیں محفلیں سب اسی قول کی توثیق کے لیے منعقد ہوتی ہیں۔

میں شاید اس سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ زن، زر، اور زمین کے مسائل چونکہ ہمارے لیے کم پڑ رہے تھے۔ اس لیے ہم نے ازراہِ اخلاق حرف 'ز' سے طلوع ہونے والے مسائل میں مزید ایک 'زمینی مسئلہ' یعنی زبان کا مسئلہ پیدا کر لیا ہے اور اس مسئلے سے ہم لوگ کماحقہٗ غافل رہنا پسند کرتے۔ اول الذکر مسائل کے بارے میں عرض ہے کہ عورتوں نے خوش قسمتی سے اس دہے میں اپنا مسئلہ خود حل کرنا

شروع کر دیا ہے۔ (مردوں کے بھروسے پر آخر کب تک رہتیں) زر کے مسئلے میں ہم نے یہ کامیابی حاصل کر لی ہے کہ اب ہمارا روپیا، پیسے کی قدر و قیمت کے برابر ہے۔ ۱۰ پیسے کا نیا سکہ (جو مائیکرو فون کی مدد سے نظر آتا ہے) اس قیمت کا اشاریہ ہے۔ رہا زمین کا مسئلہ تو یہ ہمارے بس کا رہا ہی نہیں ہے۔ یہ دن بہ دن تنگ ہوتی جارہی ہے۔ بڑے شہروں میں تو زمین سب کے پاؤں تلے سے نکل گئی ہے۔ کیا تعجب دو گز زمین کے لیے رنگون جانا پڑے۔

زبان کے مسئلے میں، شکر ہے کہ ہمارا رویہ یہ ہے کہ ہم اناج پیدا کیے بغیر روٹی پکانا چاہتے ہیں۔ یعنی ہمیں ادب زیادہ مرغوب ہے اور خوش قسمتی سے ہمارے یہاں ادیب اور شاعر تو پیدا ہو رہے ہیں جن میں قابل ذکر بھی ہیں، قابل قدر بھی، اہم بھی ہیں اور بڑے بھی، لیکن جہاں تک طالب علموں اور قاریوں کا تعلق ہے یہ پیدا ہونے میں دقت محسوس کر رہے ہیں اور جو پیدا ہو رہے ہیں وہ ملک کی آبادی کے تناسب سے قطرۂ شبنم کے برابر ہیں۔ (شبنم کی زندگی کی مدت پر غور فرمائیے، کشاکش حیات کی دھوپ انھیں طالب علم بھی نہیں رہنے دیتی) میں سوچ رہا ہوں کہ میں اگر اسی طرح الجھا الجھا رہا تو کوئی معقول بات پیش ہی نہیں کر سکوں گا۔ کیوں نہ تنقیحات کا سہارا

۱۔ اردو مدرسے: بجز ریاست مہاراشٹر، اردو مدرسے دوسری ریاستوں میں خال خال نظر آتے ہیں جو ہیں وہ مدرسین سے خالی نظر آتے ہیں۔ اردو کی تعلیم و تدریس کے لیے ہندی معلمین مامور ہیں۔ یعنی اردو داں طبقے کی روزی کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ کسی بھی اردو داں کو اگر کسی دوسری زبان کی تعلیم دینے کے لیے مامور کیا جائے تو اس کا نتیجہ بہت جلد سب سامنے آ جائے گا۔ اردو کی تعلیم کے لیے ہندی داں معلمین کا تقرر اس لحاظ سے تو خوش آئند ہے کہ کم سے کم ایک خاندان کی کفالت کا بندوبست تو ہو ہی گیا۔ ورنہ یہ جگہ خالی ہی پڑی رہتی۔ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اردو کی جماعت قائم کرنے کے لیے اردو کے طالب علموں کی کم سے کم تعداد مقرر ہے وہاں (بقول شخصے) مقررہ تعداد میں طالب علم جمع نہیں ہوتے جب کہ ان کے اسکولوں میں (اگر قائم ہیں) تو وہ جمگھٹا رہتا ہے کہ کئی امیدوار داخلے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ طرفہ تماشا کیا ہے۔ یہ موضوع ایسا ہے کہ جس پر مجھے نہیں کسی سنجیدہ شخص کو ہی سے قلم اٹھانا چاہیے۔

۲۔ سرکاری امداد: حال حال میں راجیہ سبھا کے ایک معزز رکن جناب م افضل کے استفسار پر مرکزی حکومت کی متعلقہ وزارت نے اس رقم کی تفصیلات بتائیں جو اردو اخبارات کو اشتہار کی مد میں اور مختلف اردو انجمنوں اور اداروں کو ترقی اردو بیورو کے فنڈ سے دی گئی۔ یہ نسبتاً کم ہے یا مناسب اس بحث سے قطع نظر میں شخصی طور پر اس بات کا قائل ہوں کہ ان اداروں کو سرکاری امداد حاصل کرنے میں تامل نہیں کرنا چاہیے۔ اردو زبان کو بھی عوامی خزانے سے (جس کا غلط العوام نام سرکاری خزانہ ہے) امداد ملنی ہی چاہیے۔ اور اردو پر اگر کمزور۔

کی زبان، کی ترکیب کا اطلاق ہوتا ہے تو رقم کو رقوم اور رقوم کو رقومات کی حد تک پہنچنا چاہیے۔ یعنی ترقی اردو فروغ کے لیے الگ رقم اور سابقہ نقصان کی بحالی کے لیے الگ۔ یوں بھی گو کہ اردو کسی ریاست کی علاقائی زبان نہیں ہے۔ لیکن اس کا علاقہ سب سے ہے۔ اس لیے اس کا حق مرجح ہو تو کیا حرج ہے۔

۳۔ اردو کی نایاب کتابوں کی بازیافت: یہ کہنا کہ اردو کی کتابیں فروخت نہیں ہوتیں اعداد وشمار کی روشنی میں اس لحاظ سے غلط ہے کہ اردو کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد سابق کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہے۔ ان میں ہر قسم کی کتابیں شامل ہیں۔ یعنی برائے فروخت بھی اور ناقابلِ خرید بھی۔ ان کی فروخت کی رفتار ضرور سست ہو گئی ہے اور ۵۰۰ کتابوں کے اڈیشن کی فروخت کے لیے دو چار سال لگ جاتے ہیں لیکن اہم مسئلہ ان کتابوں کا ہے جو ادبِ عالیہ کا حصہ ہیں یا ان کا اشاریہ یہ علمی کتابیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ مکتبہ جامعہ دلی نے چند سال پہلے ان کتابوں کے سستے اڈیشن چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا تھا جس کا خیر مقدم کیا گیا۔ یہ سلسلہ بند نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس مسئلے میں رموز مصلحت کا مقولہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ مکتبہ جامعہ نہ سہی کوئی اور سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ لبیک کہہ سکتا ہے۔ دار الکتاب کا ثواب حاصل کرنے کا حق ہر کسی کو ہے۔

۴: عوامی رابطہ: ادبی جلسے اور مشاعرے بہر حال ضروری ہیں لیکن شاعری کی حد تک اس بات کی احتیاط ضروری ہے کہ اردو کا شاعر اردو رسم الخط سے بہر حال واقف ہو۔ سامعین اور شاعروں میں یہی ایک فرق تو باقی رہ گیا ہے۔ شاعر اس معاملے میں کسی رعایت کے اس لیے مستحق نہیں ہیں کہ ان کے پاس رسم الخط سیکھنے کے لیے وقت ہے اور دوسرے یہ کہ ایک ہی مشاعرے کا نذرانہ انھیں اتنا ادا کر دیا جاتا ہے کہ وہ رسم الخط سیکھنے پر کچھ رقم صرف کر سکتے (کر سکتی) ہیں۔

ادبی جلسوں کی حد تک تحسین باہمی کی نشستیں، آپسی ملاقات کا موقع تو ضرور فراہم کرتی ہیں۔ لیکن ان کے فائدہ مند ہونے کے مقابلے میں نقصان دہ ہونے کا خدشہ زیادہ ہے۔ یہ رسم دنیا کی حد تک ٹھیک ہے۔ لیکن تہنیتی جلسوں میں جو کچھ کہا جاتا ہے۔ اسے صحت مندانہ تنقید سمجھ کر گلے کا تعویذ بنا لینا، ممدوح کے لیے جو کچھ ہے، ہے۔ لیکن ادب کے لیے بہر حال 'گرد' ہے۔ اس ڈگر پر چل پڑنا، خود فریبی ہے اور اس طرح خود احتسابی کا موقع ہاتھ سے جاتا رہتا ہے۔ (یہ نصیحت نہیں ذاتی تجربہ ہے) ویسے تعارفی نشستیں منعقد ہوتی رہنی چاہئیں۔ بس یہ ہے کہ تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر نہ ہو۔

۵۔ قوتِ خرید: یہ شکایت عام ہے کہ اردو داں طبقے کی قوتِ خرید کمزور پڑ گئی ہے۔ بہ نظر یہ اس لیے غلط معلوم ہوتا ہے کہ جب ہماری فلمیں بنتی ہیں تو پروڈیوسر صاحبان اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ فلم بیں طبقے کے احساسات اور جذبات مجروح نہ ہوں۔ یہ اخلاقی نقطۂ نظر سے زیادہ کاروباری نقطۂ نظر ہے اس لیے آپ دیکھیں گے کہ

فلموں میں (بالعموم) وہ زہر نہیں ہوتا جو سیاسی مقرّروں کی تقریروں اور نصابی کتابوں کے اوراق میں ہوتا ہے۔ اردو داں طبقے کی قوتِ خرید کا اندازہ کسی دوسرے آفس سے نہیں فلموں کے باکس آفس سے تو ہو ہی سکتا ہے۔ قوتِ خرید بعض صورتوں میں دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ ہماری قوتِ خرید اصل میں چند مدات کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اس نوع کی باتوں کے ذکر میں تلخی کا عنصر آجاتا ہے یا نصیحت کا جس کا حق کم سے کم مجھے نہیں پہنچتا۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ اگر ہمارے روزمرّہ کے بجٹ کسی طور سے جرمانہ ہی سمجھ کر ایک 'اردو اخبار' ایک 'اردو رسالہ' یا کسی اردو لائبریری اور دارالمطالعہ کی ماہانہ فیس بھی شامل ہو جائے تو قوتِ خرید میں کوئی خاص نقاہت نہیں پیدا ہو گی۔

۶۔ دعوت نامے: میرے ایک نادیدہ دوست ہیں انل ٹھکّر۔ اردو کے معروف ادیب ہیں۔ پچھلے دنوں ان کے بیٹے یا بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ مجھے موصول ہوا۔ یہ اردو میں تھا۔ ویسے سری نواس لاہوتی اور اس قبیل کے کچھ اور لوگ ہیں جو اپنے گھر کی تقاریب کے دعوت نامے اردو ہی میں چھپواتے ہیں لیکن ان کا تعلق اس ریاست سے ہے جہاں سرکاری زبان اردو تھی۔ انل ٹھکّر کا معاملہ جداگانہ ہے۔ ان کے پاس کا دعوت نامہ میرے لیے مسرّت سے زیادہ خجالت کا باعث ہوا۔ مشکل یہ بھی آن پڑی کہ مبارکباد کا تار بھی اردو میں نہیں بھیجا جا سکتا تھا ۔۔۔ ایک واقعہ بیان کروں۔ ابھی حال میں مراٹھواڑہ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر نے مجھ سے ایک غیر رسمی گفتگو کے دوران کہا کہ اردو بہت مالدار زبان ہے (URDU IS VERY RICH LANGUAGE) میں نے فوراً تردید کی کہ (TO DAY URDU IS POOR LANGUAGE) آج تو اردو بہت غریب زبان ہے ملک میں بافراط پھیلی ہوئی غریبی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی غریبی بھی ہٹنی چاہیے اور ذرا جلد کیونکہ ۳ نسلیں تو گزر ہی چکیں۔ اردو کی مرفہ الحالی کے لیے صرف اردو کے حلقے کو وسیع کرنا کافی ہے۔ اور یہ کام ہر سطح پر ہو سکتا ہے۔

۷۔ ادبی منافشات:۔ خوشی کی بات ہے کہ ہماری نثر اب تک تجربات سے محفوظ ہے اس میں بس ایک ہی نقص ہے کہ ادبی منافشات کی ترویج و اشاعت کا کام نثر ہی سے لیا جاتا ہے۔ ہجو گوئی تو ختم ہو چکی۔ ادبی منافشات اس لیے ضروری مانے گئے ہیں کہ یہ ادب کو منجمد نہیں ہونے دیتے۔ جمود کے لیے اس سے بہتر کوئی تریاق نہیں۔ مراسلہ نویسی اور مکتوب نگاری اسی لیے قبول مشاغل ہیں۔ ایک مخصوص نقطۂ نگاہ کا دوسرے مخصوص زاویۂ نگاہ سے ٹکراو مفید ہوتا ہے بس شرط یہ ہے کہ "ادب پہلا قرینہ ہو لڑائی کے قرینوں میں" ۔۔۔ اور اس میں بھی موسم معتدل رہنا چاہیے۔ مراسلوں میں بارود بھرنا اور خطوں کو اَشک آور گیس میں متبدل کرنا، (غالب نے یہ لفظ یوں استعمال کیا ہے "متبدل بہ دمِ سرد ہوا") بازارِ فوج داری کو گرم کرنے کے مترادف ہے۔ اپنے دانشوروں

کے کارناموں اور ان کے افکار پر مباحث تو ٹھیک ہیں لیکن سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے ان کی تاریخ ولادت وغیرہ کے بارے میں زبانی اور تحریری نبرد آزمائی ہمہ دانی کا نہیں ہیجانی کا ثبوت ہے۔ ادبی منافشات اس سے بہتر رویّے کے متقاضی ہیں۔

۸۔ انٹرویو (جسے معاجہ کا نام دیا جا رہا ہے):۔ یہ نہ ہوں تو کون سی آفت آجائے گی۔ اور اب تو مصاحبہ کار حضرات' بزرگ ادیبوں سے یہ بھی پوچھنے لگے ہیں کہ کیا آپ نوجوان ادیبوں کے نام کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔ یہ بزرگ ادیب شاید یہ نہیں جانتے کہ نوجوان ادیب ان کے انٹرویو پر بااتفاق ہرا اتنے نالاں نہیں ہوتے جتنے کہ ان کے پیغام سے افسردہ بلکہ برگشتہ ہو جاتے ہیں۔ اس افسردگی اور برگشتگی کا علاج میرا یہی سوال ہے کہ انٹرویو نہ ہوں تو کون سی آفت آجائے گی۔ ● ●

کیوں اور کیسے
محمد ابراہیم شاہ
قیمت 6/-
علاج میرا دشمن
قاسم صدیقی
قیمت 6/-
عجائب گھر
قاسم صدیقی
قیمت 10/-

خوب سیرت
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنیاں
حکیم محمد سعید نے خوب سیرت
کے نام سے ایک بہت خوب صورت کتاب
لکھی ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چالیس
احادیث کا ترجمہ اور آسان و دل نشیں
زبان میں ان کی تشریح لکھی ہے
قیمت 7/50
ایک ایسی کتاب جس کو ہر گھر میں ہونا چاہیے
چالاک خرگوش کی واپسی
خرگوش کی شرارت اور ذہانت کے مزیدار قصے
جسے پڑھنے والے ہنسی سے لوٹ پوٹ
ہو جاتے ہیں
معراج
قیمت 15/-

اس شہر میں
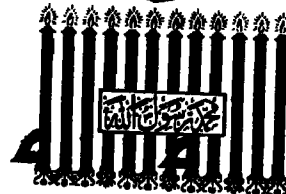
فہمیدہ ریاض
۲۰۶ جی بلاک ۲ پی ای سی ایچ ایس
کراچی

○

ں شہر میں ' میں اجنبی ' یوں تو نہ تھی میرے خدا
ں کی زمیں اس کے فلک اس کی ہوا کو کیا ہوا ' یہ کیا ہوا
ں میں آتا نہیں
ں بھی پاتا نہیں مجھ کو کوئی
ہوا سارا سماں
روشنی اتنی مگر کچھ بھی نظر آتا نہیں
رتے یہاں
تے جس میں کچھ مکیں
پیڑ تھا اس جا کھڑا
لا پڑا تھا ڈال پر
دوست رہتا تھا یہاں
مٹ گئے سارے نشاں
تو فقط ہر موڑ پر ' ہر گام پر بازار ہے
ہے
ی ہر روز عید
فروخت فوری خرید
پھرتے ہیں جہاں
ں پہ بوڑھی نائکائیں وعظ کرتی ہیں بیاں
شور اٹھا ہے کہیں

بول پڑے گاہک نئے
خنجر ' چھری ' پستول نکلے بم پھٹا پھیلا دھواں
دوڑا پولیس کا آدمی
سیٹی بجی
بازار کے اوپر تنا ہے آسماں
نیلم جڑا
کھلا ستارہ شام کا
اور چاند ہے پیلا پڑا
ابھری سمندر سے ہوا
نقار خانے میں مگر
فرصت کسے دیکھے ادھر
جب ہر طرف بازار ہے
بازار ہے
ساگر کے تٹ تک چھا گیا
آنکھوں کی حد تک آگیا
سینے کے پنجر میں نہاں
اک سرخ پنچھی پَر پھڑکتا تھا جہاں
اک دل دھڑکتا تھا جہاں
اب اس جگہ بازار ہے
بازار ہے

بلبل کاشمیری

1 BYRON AVENUE
CRANFORD, HOUNSLOW,
MIDDX, LONDON

انگلستان میں

حور انگلستان میں۔ غلمان انگلستان میں — جنتِ ارضی کا ہر سامان انگلستان میں

اونٹ ریگستان میں۔ کوہان انگلستان میں — تیل مسقط میں مگر سلطان انگلستان میں

آنکھ نیلی۔ بال نقلی۔ چست پاجامہ مست چال — دلبروں کی ہے یہی پہچان انگلستان میں

میں ولی سمجھوں گا اس انسان عالی ظرف کو — جس کا سالم رہ گیا ایمان انگلستان میں

ہو گیا ہے سانولا گوروں کا قالینِ سفید — آگیا ہے جب سے کالا خان انگلستان میں

میرے چہرے پر نہیں سرخی تو پھر میں کیا کروں — ہو گیا ہے پونڈ کو یرقان انگلستان میں

رفتہ رفتہ ہو گئیں نابود تو آبادیاں — رہ گیا لے دے کے انگلستان انگلستان میں

ہے یہ اردو کا تصدق ہو گئے شیر و شکر — آ کے پاکستان و ہندستان انگلستان میں

چھوٹ کر اپنے چمن سے آہ کس آفت میں ہے
بلبلِ بے بال و پر کی جان انگلستان میں

پر آغا
سول لائن سرگودھا
(پاکستان)

رولاں بارت کی فکری جہات

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے مجھے ایک سوال نامہ ارسال کیا جس فرانس کے مشہور ساختیاتی نقاد رولاں بارت کی متعدد فکری جہات میں سے اکریوین ecRIVAN اکریونت ecRIVANT کے بارے میں بھی ایک سوال شامل تھا۔ جواباً میں نے انھیں جو تحریر اس کا ایک اقتباس درج ہے:

"رولاں بارت نے لکھنے والوں کو دو طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ ایک طبقہ اُن لکھنے والوں کا ہے جو ادب کو محض "ذریعہ" سمجھتے ہیں۔ وہ دراصل ادب کے ذریعے اپنا پیغام یا نظریہ دوسروں تک منتقل کرنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادبی تخلیق کی حیثیت اُس چھاگل کی سی ہے جس میں پانی بھر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جاتا ہے۔ جب چھاگل منزل پر پہنچ جاتی ہے تو اُس میں سے پانی نکال لیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو رولاں بارت نے اکریونت کا نام دیا ہے۔ ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو ادب کو "ذریعہ" قرار نہیں دیتے بلکہ اسے مقصود بالذات سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو بارت نے اکریوین کہا ہے۔ وہ انھیں "مصنف" کہہ کر بھی پکارتا ہے جبکہ اکریونت کو محض محرّر کا نام دیتا ہے۔ محرّر ادیب زبان کے حوالہ جاتی پہلو Referential Aspect سے منسلک ہوتے ہیں جب کہ مصنفین زبان کے جمالیاتی پہلو سے! ہمارے یہاں ادب کی "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" میں تقسیم بھی ایک حد تک رولاں بارت کی تقسیم ہی سے مشابہ ہے۔ "ادب برائے زندگی کے علمبردار اکثر و بیشتر ادب کو غیر ادبی مقاصد کے لیے استعمال کرنے پر زور دیتے ہیں۔

(مثلاً کسی معاشی/مذہبی یا فلسفیانہ نظریے کی شعوری طور پر تشہیر یا تبلیغ کے لیے)
جب کہ "ادب برائے ادب" والے ادب کو مقصود بالذات گردانتے ہیں۔ ہیئت اور مواد
کی بحث بھی اسی تقسیم کی روشنی میں واضح ہوتی ہے۔ اکریونت (محرر) ہیئت اور مواد
میں تقسیم کو روا رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک دونوں میں وہی رشتہ ہے جو لفافہ
(Envelope) اور اس میں ملفوف "چیز" میں ہوتا ہے جب کہ اکریوین (مصنف)
کا یہ موقف ہے کہ "لفافہ" اور "چیز" دو مختلف اشیا نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سکّے کے
دو رُخ ہیں۔ اگر چھاگل اور پانی کی مثال کو سامنے رکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اکریونت کے
نزدیک فارم (چھاگل) اور مواد (پانی) کا رشتہ Container اور Contained
کا ہے جب کہ اکریوین کے مطابق ہیئت اور مواد کا رشتہ وہ ہے جو برف کی سل اور
پانی میں ہوتا ہے۔ پانی برف کی سل کے اندر بند نہیں ہوتا (جیسے لفافے کے اندر رقم
بند ہوتا ہے) بلکہ برف کی سل بجائے خود پانی ہے۔ لہٰذا اکریوین کے مطابق
تخلیق کی ایک اپنی مقصود بالذات حیثیت ہے جو جمالیاتی حظ حتیٰ کہ جنسی لذت تک مہیا
کرنے پر قادر ہے۔ رولاں بارت نے اسے لباس کی درز یا چاک میں سے ننگے بدن
کی جھلک پانے کا نام دیا ہے اور اس سے حاصل ہونے والی لذت کو Jouissance
کہہ کر پکارا ہے۔"

واضح رہے کہ رولاں بارت نے اکریوین اور اکریونت کے اس فرق کو اپنے مضمون RIVAINS ET ECRIVANTS میں پیش کیا تھا۔ بعد ازاں یہ مضمون اس کی تصنیف Critical Essays
شامل کر لیا گیا۔ رولاں بارت کی بعد کی تحریروں میں بظاہر الفاظ کا یہ جوڑا غائب ہو گیا مگر حقیقت
کو اس کے فکری نظام میں یہ شکلیں بدل بدل کر بار بار اُبھرتا رہا۔ دراصل رولاں بارت ایک نہا
خلاق شخصیت تھا۔ اس کے ہاں بے پناہ تخلیقی توانائی تھی۔ وہ جب کسی مسئلے پر اپنا نقطۂ نظر
کر دیتا اور اس سلسلے میں اصطلاحات وضع کر لیتا تو پھر کچھ ہی عرصے بعد وہ مسئلے کے کسی اور پہ
اُبھار دیتا جس کے لیے وہ نئی اصطلاحات رائج کرنے کی کوشش کرتا، اسی لیے جو تھن مکرنے اپ
بعنوان Barthes میں لکھا ہے:

BARTHES is a seminal thinker but he tries to uproot his seedlings as they sprout. When his projects flourish, they do so without him or despite him. (p12)

اس اقتباس سے شاید یہ گمان گزرے کہ رولاں بارت گا ہے ایک نظریے کو

ے دوسرے نظریے کو حرزِ جاں بنا لیتا مگر بغور مطالعہ کریں تو سطح پر دکھائی دینے والے اضطراری
ے کے عقب میں رولاں بارت ایک منضبط اور مربوط سوچ کا مالک دکھائی دیتا ہے ۔ ایک ایسی سوچ
بتدریج پھول کی طرح کھلتی چلی گئی ہے ۔

اس سلسلے میں بات ۱۹۶۰ء سے شروع ہوتی ہے جب رولاں بارت نے اکریوین اور اکریونٹ
فرق کو واضح کیا تھا - ظاہر ہے کہ اُس نے بات لکھاری کے حوالے سے کی تھی اور دو قسم کے لکھاریوں
نشان زد کیا تھا - یہ رولاں بارت کا ابتدائی زمانہ تھا جب وہ ابھی مصنّف (AUTHOR) کے وجود کا قائل
مگر ۱۹۷۰ء تک پہنچتے پہنچتے جب اُس نے S/Z لکھی تو مصنف کے بارے میں اُس کے تصوّرات تبدیل
چکے تھے - موجودیت سے رولاں بارت شروع ہی سے متاثر تھا - اور Existance Precedes
Essence کے مقولے کا گرویدہ تھا - اصلیت (ESSENTIALISM) کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ ہر شخص کے اعماق
باہر موجود ہوتا ہے جو تبدیل نہیں ہوتا - دوسری طرف موجودیت (EXISTENTIALISM) اس بات کی
لاتی کہ فرد تبدیلی سے ہم کنار ہونے کے معاملے میں قطعاً آزاد ہے ۔ دوسرے لفظوں میں وہ فیصلہ کرنے
عمل میں مختار ہے اور ماضی کے جبر کی زد پر بالکل نہیں ہے - رولاں بارت ابتداً سارترے سے بھی
اور اصلیت (ESSENTIALISM) کے نظریے کا مخالف تھا اور فرد کو وحدت کے بجائے کثرت کا نمائندہ
ر دیتا تھا تاہم یوں لگتا ہے جیسے وہ ابھی لکھاری کے وجود کا بہر حال قائل تھا -

مگر ۱۹۷۰ء تک پہنچتے پہنچتے رولاں بارت مصنّف کی کارکردگی بلکہ اُس کے وجود تک سے منکر ہو چکا
S/Z لکھنے سے پہلے بھی اُس نے ۱۹۶۸ء میں لکھا تھا :

"اب ہمیں اس بات کا علم ہے کہ لکھت کسی واحد الہیاتی معنی (Author-
God کا پیغام) سے عبارت نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک ایسی تہ در تہ SPACE ہے جس میں
بہت سی تحریریں ایک دوسرے سے ٹکراتی اور باہم آمیز ہوتی ہیں ۔"

کا مطلب یہ تھا کہ وہ اب مصنفین کے بجائے لکھتوں کے مطالعہ کی سفارش کر رہا تھا اس موقف پر کچھ
اثر "نئی تنقید" کے بھی نظر آتے ہیں جس نے "تصنیف بغیر مصنّف" کا نعرہ لگایا تھا مگر زیادہ اثرات
ثیات کے ہیں جس نے "مرکز گریز" ساخت کا تصور پیش کیا تھا - ساختیات کا یہ تصور نطشے اور ہائیڈیگر
والے سے ساخت کے قدیم "مرکز آشنا" نظریے کی نفی سے تو عبارت تھا ہی (اور اس کا ذکر بہت
چکا ہے) مگر میری رائے میں اس پر کوانٹم طبیعیات کا وہ نظریہ بھی اثر انداز ہوا تھا جو ساخت کو
شتوں کا جال (WEB OF RELATION) سمجھتا ہے ۔ نطشے نے اس ضمن میں "خدا کی موت" کا اعلان
ہوا تھا جو اصلاً جوہر یا واحد معنی کو مسترد کرنے کی ایک کاوش تھی ۔ اس سلسلے میں جب رولاں بارت
مصنّف کو Author-God کا لقب عطا کر کے اس کی موت کا باضابطہ اعلان کیا تو گویا اس نے نطشے

کے قول ہی کو دہرایا۔ بہرحال رولاں بارت نے اب لکھاری کے حوالے سے اکریوین اور اکریونت کے
کو موضوع بنانے کے بجائے تحریر کو (Lisible) Readerly اور (Writerly (SCRIPTIBLE
تقسیم کر کے پیش کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں وہی بات جو پہلے لکھاری کے حوالے سے کہی گئی تھی اب لکھت
کے حوالے سے کہہ دی گئی ہے۔

رولاں بارت نے لکھت کی دو اقسام کو اپنی کتاب S/Z میں موضوع بنایا ہے۔ ان میں سے ا
کو اس نے Readerly اور دوسری کو Writerly کا نام دیا ہے۔ مقدم الذکر وہ تحریر ہے جسے قاری
از اول تا آخر ایک سانس میں پڑھ جاتا ہے ـــ اس پیاسے شخص کی طرح جو مشروب کا گلاس غٹاغٹ
جانے کا مظاہرہ کرتا ہے ایسی تحریر قاری کو صارف یعنی Consumer میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس کے
موخر الذکر تحریر قاری کو ایک تخلیق کار میں بدل دیتی ہے۔ وہ مشروب کا گلاس غٹاغٹ پی نہیں جاتا بلکہ مز
مزے سے رک رک کر اسے چکھتا، سُڑکتا، اس کی خوشبو، ذائقہ، اس کی ٹھنڈک یا گرمی، اس کے رنگ
روپ سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ گویا مشروب کے جملہ پہلوؤں اور اوصاف سے تجربے کی سطح پر متعا
ہوتا ہے اور یوں مشروب کو ایک "چیزے دیگر" میں بدل دیتا ہے۔ تحریر کے حوالے سے ہم کہیں گے
قاری (کنزیومر) اسے از سر نو لکھتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے بحیثیت پروڈیوسر ابھر آتا ہے۔ derly
تحریر وہ ہے جو ایک خاص منزل کی طرف سفر کرتی ہے اور قاری بھی ایک سحر زدہ انسان کی طرح اس کے
سے بندھا ہوا چلے جاتا ہے مگر Writerly تحریر میں قاری کو قدم قدم پر منزل کا گمان ہوتا ہے۔ بلا
سٹورک Readerly تحریر میں قاری کا سفر افقی (HORIZONTAL) ہوتا ہے جب کہ Writerly تحریر
میں عمودی یعنی Vertical ہے

دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ۱۹۶۰ء میں رولاں بارت نے لکھاری کو حوالہ بنایا تھا تو دو طرح کے
لکھاریوں کا ذکر کیا تھا ـــ ایک اکریونت جو کمتر درجے کا لکھاری تھا، دوسرا اکریوین جو اعلا درجے کا لیکھک
تھا۔ مگر اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں جب وہ لکھاری کے وجود کو مسترد کر چکا تو اس نے لکھت کی بھی دو ا
کی نشان دہی کی ـــ ایک عام سی تحریر یعنی Readerly دوسری خاص تحریر یعنی Writerly غور کیجیے
بات وہی تھی جو اس نے ۱۹۶۰ء میں لکھاری کے حوالے سے کی تھی مگر جسے وہ ۱۹۷۰ء میں لکھت کے حوالے
کر رہا تھا۔ اگر سوال کیا جاتا کہ کیا Readerly اور Writerly کا فرق اصلاً ان کے عقب
موجود ECRIVANT لکھاری اور ECRIVIAN مصنف کا فرق نہیں ہے تو رولاں بارت کے پاس ا
کوئی جواب نہیں تھا بجز اس کے کہ وہ کہتا کہ اس کے سامنے اب لکھاری کا نام تک نہ لیا جائے۔ اگر ا
سے کچھ پوچھنا ہے تو صرف لکھت کے حوالے سے پوچھا جائے۔

تحریر کے ان دو نمونوں میں سے Writerly تحریر کو رولاں بارت نے Text کا نام دیا

...ی ہے کہ اگر Text کا امتیازی وصف نہ تو اس کا معنی ہے اور نہ اس کے مصنف کا منفرد طرزِ احساس
...یسا کہ رولاں بارت کا موقف ہے) تو پھر Text کو کیسے پڑھا جائے؟ اس سلسلے میں رولاں بارت کہتا ہے
Text ایک ایسی ساخت یا سٹرکچر ہے جس میں ہمہ وقت تغیرات آ رہے ہوتے ہیں مگر یہ تغیرات اُن
Cod... یا Conventions کے تابع ہوتے ہیں جن سے سٹرکچر عبارت ہے۔ بارت نے اسی سلسلے میں مختلف
Codes پر بھرپور بحث کی ہے جس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔ فقط اس قدر کہنے پر اکتفا کروں گا کہ بارت نے
T... کو مقصود بالذات قرار دیتے ہوئے اس کی تخلیق سے مصنف کی کارکردگی کو منہا کر دیا ہے۔ اس کے بجائے
...نے لکھت کو تمام تر اہمیت دیتے ہوئے "لکھت لکھتی ہے لکھاری نہیں" کا اعلان کیا ہے۔ گویا یہ کہا ہے کہ
...ت کی ایک اپنی بوطیقا، ایک اپنا سسٹم یا نظام ہے جس میں مصنف کوئی حصہ نہیں لیتا۔ یوں لگتا ہے
...بارت کا یہ نظریہ براہِ راست سوسئر کے اُس نظریے سے ماخوذ ہے جو پیرول (گفتار) کی ساری بوقلمونی
...یئر کے عقب یا بطن میں زبان (LANGUE) کے نظام کی نشان دہی کرتا ہے۔ رولاں بارت نے بھی
...ت کے پس پشت Codes کا ذکر کیا ہے۔ ایک تہ در تہ Space کا ذکر جو Codes سے عبارت
...ا ہے۔ یہ تہ در تہ Space اصلاً ایک ساخت یعنی Structure ہے جو یونگ کے آرکی ٹائپ کی
...اندر سے خالی ہے تاہم یہ ایسی تہوں Codes اور Conventions سے یقیناً عبارت ہے جو دائمی
...بارت یہ کہنا چاہتا ہے کہ تحریر ایک ایسی ساخت ہے جو پیاز سے مشابہ ہونے کے باعث پرتوں کا
...سلسلہ ہے لیکن جس کے اندر کوئی پیغام یا معنی ملفوف نہیں ہے۔ اس نے اسے ایک ایسا لفافہ
Enve... بھی قرار دیا ہے جس کے اندر خط موجود نہیں ہے۔ اسی حوالے سے اس نے جاپانی ثقافت
...کا ذکر کیا ہے جو بقول اس کے تمام تر اہمیت لفافے کو دیتی ہے نہ کہ لفافے میں بندھی چیز کو۔

...میں Text کی بحث کو طول دینا نہیں چاہتا۔ فقط اس نکتے کو اُبھارنے کا متمنی ہوں کہ بارت نے
...ا لکھاری کو ècRIVAIN اور ecRIVIANT میں تقسیم کیا ہے وہاں Text کی بھی دو اقسام کا ذکر
...ہے یعنی Writerly اور Readerly کا۔ ان میں سے ècRIVIAN اور Writerly کو
...ا خانے میں اور écRIVIANT اور Readerly کو دوسرے خانے میں رکھنا چاہیے کیوں کہ
...ری کے حوالے سے جو اوصاف ècRIVIAN کے ہیں وہی لکھت کے حوالے سے WRiTerly کے ہیں۔
...نوں کو بارت نے افضل اور برتر جانا ہے) اسی طرح لکھاری کے حوالے سے جو نقائص écRIVANT
...یں وہی لکھت کے حوالے سے Readerly کے ہیں (بارت نے ان دونوں کو کم تر اور فروتر مانا
...اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بارت کا اصل موقف تبدیل نہیں ہوا۔ فقط اُس کا Stress تبدیل
...ہے۔ کیوں تبدیل ہوا ہے یعنی لکھاری کو اُس نے کیوں مسترد کیا ہے۔ اس کی وضاحت میں اوپر کر چکا ہوں۔

دیگر

اب آئیے قاری کی طرف، جس طرح رولاں بارت نے لکھاری اور لکھت کو دو دو میں تقسیم کیا، اسی طرح قاری کو بھی دو میں بانٹ دیا ہے (دیکھیے کہ بارت جوڑے بنانے کا کس قدر شائق ہے) اس میں ایک تو اُس نے ایسے قاری کو نشان زد کیا ہے جو Text سے عام سی لذت کشید کرتا ہے (لذ کے لیے بارت نے Plaisir کا لفظ استعمال کیا ہے) اور دوسرے اُس قاری کو جو Text سے انبساط حاصل کرتا ہے (اس کے لیے اُس نے لفظ Jouissance برتا ہے)

درصل رولاں بارت نے لکھت کو جسم متصور کرکے اُس سے لطف اندوز ہونے کے عمل کو محبت کے دائرے میں سمیٹ لیا تھا۔ بارت کے مطابق قاری کی حیثیت اُسی lover کی سی تھی محبوبہ (تحریر) کے جسمانی حسن کا والہ وشیدا ہوتا ہے اور محبوبہ کی ہر ادا، اس کی گفتگو کی چاشنی، کے رنگ روپ کی چاندنی، اُس کی خوشبو، لباس، بدن کا گداز، اس کے پیکر کی خنکی یا گرمی، ان سب لذت کشید کرتا ہے۔ تاہم بارت نے لذت کشید کرنے کے عمل کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ایسا کرتے ہوئے لذت کوش قاری (PLEASURE-SEEKER) اور آنند کوش قاری -STACY SEEKER) کے مابہ الامتیاز کو بھی آئینہ کر دیا ہے۔ بارت کے الفاظ میں:

On the one hand, I need a general pleasure ----- and on the other hand I need a particular pleasure a simple part of the pleasure as a whole, whenever I need to distinguish euphoria, fulfillment comfort from shock, disruption, even loss which are proper to ecstacy

(8/2/34/19)

بظاہر رولاں بارت نے سارا زور عمومی لذت کے حصول پر دیا ہے۔ موقف اُس کا یہ ہے جس طرح بدن مقصود بالذات ہے اور کسی نظریے، آدرش یا معنی کا حامل ہونے کے باعث دل ہیں، اس طرح تحریر بھی اپنا مادی وجود رکھتی ہے اور اپنے مادی اوصاف کی بنا پر بھی قابلِ تو دوسرے لفظوں میں جس طرح محبوبہ کا پورا وجود، اس کے بدن سے مَس ہونے والی اشیا مثلاً روما انگوٹھی یا لباس نیز محبوب کے جسم کے بعض حصے مثلاً آنکھیں اور عارض اور بال وغیرہ لذت کوشی کے ہیں، اسی طرح تحریر بھی اپنی خوبصورت لفظی تراکیب، اپنی تشبیہوں، استعاروں، تضمین، تصرف اور وغیرہ کے ذریعے قاری کو لذت بخشتی ہے۔ اس سلسلے میں بارت نے چار مراحل یعنی (۱) ishist Hysteric (۴) Paranoid (۳) Obsessional (۲) کا ذکر کیا ہے۔ ان کی متوازی تحر لطف اندوز ہونے والا قاری بھی ایسے ہی چار مراحل سے گزرتا ہے۔ مگر رولاں بارت کہتا ہے کہ سے لطف اندوز ہونے کا یہ عمل ایک عمومی وظیفہ ہے جب کہ بعض اوقات تحریر کو پڑھتے ہوئے

عمومی لذت حاصل کرنے کے عمل کو ملتوی کر دیتا ہے۔ کہ یعنی کہ خود تحریر جب Writerly نوع کی ہو تو قاری کے ہاں ایک متوازی نفسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس میں وہ لذت کے حصول کو ملتوی کرتے ہوئے جابجا Gaps چاک اور درزیں پیدا کرتا ہے جو ایک طرح کی محرومی کی مظہر ہوتی ہیں۔ ان Gaps اور درزوں کے نمودار ہونے سے قاری کو جو لذت ملتی ہے وہ عام قسم کی لذت سے مختلف ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں بارت نے لکھا ہے کہ برہنہ بدن اُس غایت انبساط (ECSTACY) کو پیدا نہیں کر سکتا جو لباس کے چاک میں سے لو دیتے ہوئے بدن سے پیدا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بارت نے قاری کو دو میں تقسیم کر دیا ہے۔ یعنی وہ قاری جو عمومی لذت کشید کرتا ہے اور وہ قاری جو غایت انبساط حاصل کرتا ہے۔

آیئے اب اس ساری بحث پر ایک مجموعی نظر ڈالیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ رولاں بارت کا فکری نظام ایک تثلیث پر استوار ہے۔ یہ تثلیث ــ "لکھاری، لکھت اور قاری" سے مرتب ہوئی ہے۔ بارت نے سب سے پہلے لکھاری کا ذکر کرتے ہوئے ecRIVANT اور ecrivain کی نشاندہی کی ہے اور کہا ہے کہ مقدم الذکر کم تر اور موخر الذکر برتر ہے۔ اس کے بعد اس نے لکھت کا ذکر کرتے ہوئے اسے Readerly اور Writerly میں تقسیم کیا ہے اور یہ موقف اختیار کیا ہے کہ مقدم الذکر عام مگر موخر الذکر خاص ہے۔ آخر میں اُس نے قرأت پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے قاری کو لذت کوش (PLAISIR-SEEKER) اور آنند کوش (ECSTACY-SEEKER) میں تقسیم کر دیا ہے اور یہ تاثر دیا ہے کہ ہر چند تحریر سے لذت کوشی کا عمل ہی صحیح عمل ہے نہ کہ تحریر کو کسی معنی کی ترسیل کا ذریعہ بنانے کا عمل تاہم قرأت کے دوران آنند اور غایت انبساط کے جو لمحات آتے ہیں وہی قرأت کا ثمر شیریں ہیں۔ چنانچہ رولاں بارت کا نظام فکر جن دو خانوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے وہ یہ ہے:

(ا) PLAISIR —— READERLY —— ecRIVANT

(ب) JOUISSANCE —— WRITERLY —— ecRIVAIN

حقیقت یہ ہے کہ ابتدا ہی سے رولاں بارت کے ہاں ایک بے حد توانا اور "زرخیز خیال" موجود تھا جو آخر تک اُس کا ہم سفر رہا۔ اپنے سفر کے دوران بارت ہر منزل پر چند لمحوں کے لیے رُکا اور منزل کو اپنے "خیال" کے آئینے میں سے دیکھنے کے بعد اگلی منزل کی طرف چل پڑا۔ لکھاری لکھت اور قاری اس سفر کی تین منازل تھیں۔ تاہم دیکھنے کی بات یہ ہے کہ بارت نے اپنے اس سارے سفر کو ایک Text تصور کرتے ہوئے اس سے لذت کشید کرنے کی جو کوشش کی وہ Disentaugle کرنے پر منتج ہوئی نہ کہ Decipher کرنے پر! چونکہ بارت معنیٰ یا جوہر کو مانتا ہی نہیں تھا لہٰذا اُسے کچھ Decipher کرنا نہیں تھا اُسے تو صرف Disentangle کرنا تھا چاہے وہ اس Dientanglement کا پیاز کے پرت

اتارنے میں مظاہرہ کرتا یا جراب کو اُدھیڑنے میں! بارت کہتا ہے کہ اصل لطف کھولنے میں، بے نقاب کرنے میں ہے۔ اس لیے نہیں کہ بے نقاب کرنے پر اندر سے کوئی شے برآمد ہوگی (کیوں کہ شے تو ہی نہیں ہے) مثلاً جراب کے معاملے میں جب دھاگے کو گرہوں اور پرتوں سے آہستہ آہستہ نجات ملے گی تو آخر میں دھاگے کے سوا باقی کچھ نہیں رہے گا۔ بارت کے نزدیک یہ دھاگا ہی اصل سٹرکچر ہے اور دھاگا مختلف صورتیں اختیار کرتے چلے جانا اُن code کے تابع ہے جس سے یہ دھاگا مرتب ہوتا ہے۔ ناظر، شاعر، رقاص یا موسیقار (لکھاری یا قاری) اس جراب (لکھت) کو ادھیڑنے کی کوشش میں لطف حاصل کرتے ہیں۔ اگر وہ یہ کہیں کہ اُدھیڑنے کے اس عمل سے انھیں بالآخر کسی معنی یا جوہر تک رسائی حاصل ہوگی یہ اُن کا خیال خام ہے۔ ہمارے ہاں پنجاب میں یہ مثل مشہور ہے کہ کھدو (کپڑے کا گیند) کو کھولیں تو اس میں سے لیریں (یعنی کپڑے کی کترنیں) ہی برآمد ہوں گی۔ مُراد یہ کہ کچھ برآمد نہ ہوگا۔ اس مثل کا اطلاق رولاں بارت کے مرکزی خیال پر بخوبی ہوسکتا ہے۔ اپنی کتاب Image, Music, Text میں بارت لکھتا ہے:

> In the multiplicity of writing, every thing is to be disentangled, nothing deciphered, the structure can be followed, 'run' (like the thread of a stocking) at every point and at every level but there is nothing beneath ; the space of writing is to be ranged over not pierced ; writing ceaselessly posits meaning ceaselessly to evaporate it, carrying out a systematic exemption of meaning in precisely that way literature by refusing to assign a secret, an ultimate meaning, to the text (to the world as TEXT) liberates what may be called an ante-theological activity, an activity that is truly revolutionary since to refuse to fix meaning is in the end, to refuse God. (P/ 147)

دیکھیے کہ رولاں بارت کی اس تحریر میں نطشے کی آواز کیسی صاف سنائی دے رہی ہے! بارت جب کہتا ہے کہ Text میں کوئی معنی نہیں ہوتا تو وہ دوسرے لفظوں میں یہ کہتا ہے کہ کائنات کے Text میں بھی کوئی حقیقتِ عظمٰی بطور معنی نہیں ہے۔ اس معاملے میں نطشے تو خیر اس کا جدّ امجد ہے ہی، میرا خیال ہے کہ اُس نے کوانٹم طبیعیات سے بھی اس سلسلے میں کچھ روشنی حاصل کی ہے۔ کوانٹم طبیعیات کے مطابق "حقیقت" بیک وقت Wave بھی ہے اور پارٹیکل بھی! تاہم جب ہم اس کا "ویورُوپ" دیکھتے ہیں تو اس

ٹیکل روپ نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور جب "پارٹیکل روپ" دیکھتے ہیں تو ویو روپ غائب ہوجاتا
جب دونوں کو بیک وقت دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو دونوں نظر نہیں آتے۔ مگر کیا اس اجتماعی
ے نظر نہ آنے سے اجتماعی روپ کی نفی ہوجاتی ہے؟ — اصل بات یہ ہے کہ حقیقتِ عظمیٰ کے ہزاروں
لاکھوں اوصاف، کروڑوں صورتیں اور اربوں پیکر ہیں اور اُسے Disentangle کرنے کی کوئی بھی
شش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ وجہ یہ کہ لامحدود و لازوال کی پوری موت حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ البتہ
وری کا امکان ہوسکتا ہے اور یہ حضوری ہی وہ غایت انبساط (ECSTACY) مہیا کرتی ہے جسے رولاں
ت نے Jouissance کا نام دیا تھا مگر رولاں بارت کا یہ کہنا کہ کائنات کے Text میں کوئی معنی
ں ہے، محلِ نظر اس لیے ہے کہ کائنات پیاز نہیں ہے جس کے پرت اتارتے ہوئے آپ اُس مقام
پہنچ جاتے ہیں جس کے آگے کوئی اور پرت نہیں ہے۔ کائنات کے پرت تو لامتناہی ہیں اور کبھی سارے
سارے اُتارے نہیں جاسکتے۔ اگر اُتارے نہیں جاسکتے تو پھر کوئی بھی رولاں بارت پورے وثوق کے
اتھ کیوں کر یہ اعلان کرسکتا ہے کہ پرتوں کے نیچے معنی موجود نہیں ہے؟ اصل بات یہ ہے کہ جب بھی
ں مغربی مفکر کو حقیقتِ عظمیٰ کے سابقہ روپ کو عبور کرنے کی توفیق ہوئی ہے تو اُس نے حقیقتِ عظمیٰ ہی
نفی کردی ہے اور اس بات کو فراموش کردیا ہے کہ عبور کرنے کے بعد جو نئی "حقیقت" اُس پر منکشف
ئی ہے وہ بھی تو حقیقتِ عظمیٰ ہی کا ایک روپ ہے۔ مغرب میں اُنیسویں صدی کے اختتام تک جو سٹرکچر
ئج اور مقبول تھا وہ نظامِ شمسی سے مشابہ ہونے کے باعث Centre-Oriented تھا۔ ایک ایسا سٹرکچر
میں ایک سورج یا ایک معنی کا ادراک ہوتا تھا۔ مگر بیسویں صدی کے طلوع ہوتے ہی مرکزہ کی جگہ پیٹرن
نے لی۔ لہٰذا ایک Pattern-Oriented سٹرکچر کا تصوّر رائج ہوگیا جو کسی ایک معنی یا ایک مرکز کا داعی نہیں
بلکہ پورے سٹرکچر کے ہر نقطہ کو مرکز کی صورت میں دیکھتا تھا (کوانٹم طبیعیات کا بوٹ سٹریپ نظریہ اسی
کو پیش کرتا ہے) مشرق میں یہ نظریہ متعدد صوفیانہ مسالک میں پہلے ہی پیش کیا جاچکا ہے۔ لہٰذا مغرب
ول نے کوئی نئی بات دریافت نہیں کی ہے۔ مشرق والے تو ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کے نظریوں
ا بھی حقیقتِ عظمیٰ کے وجود ہی کا اعتراف کرتے آئے ہیں۔ مختصراً یہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں کہ
لاں بارت کے ہاں اکریوین Writerly اور Jouissance کے زاویے قابلِ قبول ہیں اور کھت
ئنات کو سٹرکچر قرار دینے کا زاویہ بھی غلط نہیں ہے مگر اس سے معنی یا جوہر یا حقیقتِ عظمیٰ کی نفی کا کوئی
و پیدا کرنا قطعاً قابلِ قبول نہیں ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

کتاب	صنف	مصنف	قیمت
تحریریں	(تنقید)	ڈاکٹر اسلم پرویز	/-
پہچان اور پرکھ	(تنقید)	پروفیسر آل احمد سرور	/-
ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم	(تحقیق)	ڈاکٹر سلامت اللہ	/-
پت جھڑ کی آواز	(افسانے)	قرۃ العین حیدر	/-
اقبال کا نظریہ خودی	(تحقیق)	عبدالمغنی	/-
سمندری خزانہ	(ناول)	ماریہ رحمان	/-
جدید افسانہ اور اس کے مسائل	(تنقید)	وارث علوی	/-
فی الحقیقت	(طنز و مزاح)	یوسف ناظم	/-
مٹی سے ہیرا	(ناولٹ)	سید مقبول احمد	/-
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو	(ناولٹ)	صغرا مہدی	/-
الجھاوے	(ڈرامے)	ابراہیم یوسف	/-
غبار منزل	(شعری مجموعہ)	غلام ربانی تاباں	/-
قلندر بخش جرأت	(خطبہ)	جمیل جالبی	
عجائب گھر	(بچوں کی سائنسی کتاب)	قاسم صدیقی	
تاریخ اودھ	(تاریخ)	ترجمہ و ترتیب شاہ عبدالسلام	
مولانا آزاد کا ذہنی سفر	(ادب)	ظ انصاری	
تنقید اور جدید اردو تنقید	(تنقید)	ڈاکٹر وزیر آغا	
مشقی تدریس، کیوں اور کیسے؟	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں	
آوازوں کا میوزیم	(افسانے)	ساگر سرحدی	
اپنی ہواؤں کی خوشبو	(خاکے)	کشمیری لال ذاکر	
دلی کی چند عجیب ہستیاں	(خاکے)	اشرف صبوحی	
چند تصویر بتاں	(تاثرات)	مولانا عبدالسلام قدوائی	
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	(ادب)	پروفیسر آل احمد سرور	
صاحب جی سلطان جی	(تذکرہ)	ڈاکٹر اسلم فرخی	
نظام رنگ	(ادبی خاکہ حضرت نظام الدین اولیا)	" " "	
شہید جستجو	(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)	ضیاء الحسن فاروقی	
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست	(مذہب)	مشیر الحق	
ہمارے دینی علوم	(مذہب)	مولانا اسلم جیراجپوری	
تحقیقی مضامین	(تحقیق)	مالک رام	
آسان اردو ورک بک	(تعلیم)	شکیل اختر فاروقی	

پروفیسر عنوان چشتی
۱۱بی، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

میکش اکبرآبادی

آگرے کا ذکر آتا ہے تو میرے ذہن کی سطح پر یادوں کا ایک نگارخانہ آباد ہو جاتا ہے
یادیں اپنی تمام تر برنائیوں کے ساتھ ذہن کے آئینہ خانے میں چراغوں کی طرح جلنے
بجھنے لگتی ہیں۔ اس لیے اگر یہ کہوں کہ آگرہ میرے تحت الشعور میں اپنی بعض صفات کے
ساتھ تحلیل ہو گیا ہے۔ یا میرے ذہن و ضمیر میں خوشبو کی طرح بس گیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔
یادیں ماضی کے نہاں خانے میں کسی پُراسرار شاہراہ کی طرح دور تک چلی گئی ہیں۔ اور
شاہراہ پر آگرے میں گزارے ہوئے لمحات کرنوں کی طرح نور افشاں ہیں۔ مجھے آگرے
کے ادبی، تعلیمی، اور ثقافتی ماحول نے خاص طور پر متاثر کیا۔ یہاں آکر مجھے پہلی بار
احساس ہوا کہ آگرے میں صرف تاج محل ہی نہیں ہے بلکہ ایک ایسا شخص بھی ہے
جس کے بغیر آگرے کا ذکر مکمل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص آگرے جائے اور تاج محل
اور میکش اکبرآبادی سے ملے بغیر واپس آجائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس نے آگرہ کے
در و دیوار تو دیکھے مگر آگرے کا جلال و جمال نہیں دیکھا۔ آگرے آکر مجھے جن دوستوں
نے اپنے اخلاص سے متاثر کیا، ان میں خلش اکبرآبادی، اسرار اکبرآبادی، معین فریدی
اور عزیز اکبرآبادی کا نام شامل ہے۔ بزرگوں میں علامہ میکش اکبرآبادی اور پروفیسر
سنت پرکاش مدہوش کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اساتذہ میں جناب ابو محمد قریشی، پروفیسر
بس۔ این فریدی، سید ریاض احمد اور "اچھے بھائی" کو فراموش کرنا ممکن نہیں۔ ہاں تو
میں عرض کر رہا تھا کہ آگرے آتے ہی مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ میکش اکبرآبادی ایک
ایسی شخصیت کا نام ہے جس میں علم و ادب، تہذیب و تصوف اور عظمت و شرافت کی
اعلیٰ قدروں کا سنگم ہیں۔ آگرے میں جہاں جاتا وہاں میکش صاحب کا ذکر سنتا۔ جس
سے بات کرتا اس کو میکش صاحب کا مداح پاتا۔ میکش صاحب کے بے رحم نقاد بھی
ان کے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہتے جو انسانیت اور تہذیب و شرافت کے خلاف
ہوتی۔ اس لیے ان محرکات نے میرے شوقِ ملاقات کو مہمیز کیا۔ ایک شام میں میکش
صاحب کے بالاخانے پر پہنچ گیا۔

انداز کی حویلی ہے۔ جو میکش صاحب اور ان کے اعزا کو ترکے میں ملی ہے میکش صاحب اس حویلی کے بازار سے ملحقہ حصے میں رہتے ہیں جس کا ایک حصہ مردان خانے یا ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ میکش صاحب کی نشست گاہ ایک ماڈرن فقیر کی تکیہ معلوم ہوتی تھی۔

اس میں وہی سادگی و بے تکلفی اور قلندری و بے نیازی دکھائی دیتی تھی جو فقیر کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے۔ میکش صاحب کی جلوہ گاہ میں فرشی نشست ہوتی۔ ان کے فروکش ہونے کی ایک مخصوص جگہ ہوتی۔ احباب اور مہمان سامنے بیٹھتے۔ میکش صاحب خود متوٗدب ہوتے۔ حاضرین و سامعین بھی موٗدب رہتے۔ میکش صاحب سے پہلی بار مل کر جی بہت خوش ہوا۔ موصوف خندہ پیشانی سے ملے۔ میری ذاتی اور منصبی مصروفیات کے بارے میں استفسار فرمایا۔ چائے سے تواضع کی۔ ادب و شعر پر گفتگو کی۔ اور میں تھوڑی دیر بعد واپس آگیا۔ مجھے ان سے مل کر احساس ہوا کہ وہ معنیٔ لفظِ آدمیت تو ہیں ہی بلکہ اگلی شرافتوں کا نمونہ بھی ہیں۔ میکش صاحب کی شخصیت میں بلا کی وجاہت تھی۔ میں نے کبھی ان کی شخصیت کا مرقع اس طرح لکھا تھا۔

"مائل بہ درازی قد، توانا قامت، گندمی رنگ۔ میکش صاحب کی شخصیت کو نزاکت سے زیادہ وجاہت اور دبدبے سے زیادہ محبت کا پیکر بنا دیتا ہے۔ اوسط درجے کی آنکھیں، جن میں دودھ کی جھیلوں کا گمان ہوتا ہے اور ان کی چمک آئینۂ دل کی براٗتی کا پتا دیتی ہے۔ پتلے پتلے سرخ ہونٹ اور ان کے درمیان بڑے بڑے چمکدار دانت صانعِ قدرت کی صناعی کا عمدہ نمونہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور پان نوشی کے شوق کی نفی کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ مناسب کھڑی کھڑی ناک۔ کشادہ اور صاف پیشانی، میکش صاحب کے گہرے علمی و ادبی شعور کا اشاریہ معلوم ہوتی ہے۔ بولنے میں لکنت ہے مگر باتوں میں وہ نمک اور لہجے میں وہ خلوص ہوتا ہے کہ ان کی ہر بات مخاطب کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ اندازِ بیان میں بکھراو سے زیادہ سلجھاو اور طوالت سے زیادہ جامعیت نظر آتی ہے گویا میکش صاحب "اطناب" پر "ایجاز" کو اور "انتشار" پر "اختصار" کو ترجیح دیتے ہیں۔ ادب اور فلسفہ پر بے تکان و بے تکلف گفتگو کرتے ہیں۔ مگر شعرا پر تنقید نہیں کرتے۔ ہم عصروں پر اظہارِ خیال کرنے میں بے حد محتاط ہیں۔ کبھی کبھی ایسا گمان ہوتا ہے کہ وہ بھی رشید احمد صدیقی صاحب کی طرح " زندوں سے ڈرتے ہیں"۔ پھر بھی یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ "مردوں پر شیر" نہیں ہیں۔ ان کا اپنا زاویۂ نظر یہ

شاعروں کو نہیں۔ فلسفیانہ موضوعات پر اعتماد کے ساتھ کھل کر بات کرتے ہیں۔ اور تصوّف پر تو اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے کہ مصداق غالب کی "گل افشانیٔ گفتار" کا لطف "پیمانہ و صہبا" کے بغیر ہی آجاتا ہے۔ ذو معنی ادبی فقرے، مہذب لطیفے اور پر خلوص قہقہے میکش صاحب کی متین اور سنجیدہ محفل کو دلکش بنا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی گفتگو میں بھولا پن رسمساتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ میکش صاحب ایک دردمند شخصیت کے مالک ہیں۔ اپنا غم بھول کر یا چھپا کر دوسروں کا غم بھلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ "مزاج پرسی" اور "عیادت رسی" ان کی عادت نہیں، بلکہ جبلّت ہے۔ تالیفِ قلوب کا ملکہ آرٹ کے مقام پر پہنچ چکا ہے۔"

("عکس و شخص" [۱۹۶۹ء] ص ۲۰۲ - ۲۰۱)

غالبؔ کی طرح میکش صاحب کو بھی اپنی شخصی وجاہت کا احساس تھا۔ غالبؔ نے اپنے ایک خطوط میں اپنے حسن و جمال اور شبابِ گریزاں پر اظہارِ تاسّف کیا ہے۔ میکش صاحب نے بھی اپنے ایک مکتوب میں اپنے چمپئی رنگ، دلکش خد و خال اور مردانہ قد و قامت کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

"مجھے اپنی صورت پر بڑا ناز تھا۔ خلوتوں اور جلوتوں میں اس کے چرچے ہوتے تھے۔ رنگ و روپ ایسا کہ جو دیکھتا، وہ مجھے مغربی ملک کا باشندہ سمجھتا تھا۔ جاذبیت اور کشش ایسی کہ اس کے سانحات و حادثات لکھوں تو افسانے اور داستانیں بن جائیں۔ وہ سب آہستہ آہستہ قصۂ پارینہ ہو گئے۔ جیسے سارا کھیت ہی چڑیاں چگ گئی ہوں۔"

(اقتباس مورخہ ۲؍ نومبر ۷۶ء)

میکشؔ صاحب کی ظاہری شخصیت جتنی پرکشش تھی۔ داخلی شخصیت اس سے بھی زیادہ ممتاز اور مؤثر تھی۔ موصوف سے جو بھی ملتا ان کی شخصی شرافت، مہمان نوازی، علم و تدبر اور معاملہ فہمی کا قائل ہو جاتا۔ وہ ایک ذہین اور باشعور انسان تھے۔ مخاطب کی نفسیات اور مزاج کو پہچان لیتے تھے۔ طبعاً غیبت اور عیب جوئی سے نفرت کرتے تھے۔ اس لیے ان کی زبان کبھی کسی شخص کی برائی سے آلودہ نہ ہوتی۔ اگر وہ کسی پر تنقید کرتے تو سات پردوں میں چھپا کر اپنا مافی الضمیر ادا کرتے۔ اس احتیاط کا محرک غالباً یہ تھا کہ ان کی شریعتِ انسانیت میں دل آزاری گناہِ کبیرہ تھی۔ اگر میکش صاحب کسی کی تعریف کرتے تو اس میں بھی شدّت نہ ہوتی۔ غرض گفتگو میں شائستگی، نفاست، توازن اور احتیاط کا اصول کارفرما ہوتا۔ میکشؔ صاحب اگرچہ کبھی کبھی ادب و فلسفہ کے اہم نکات کی تشریح میں بے تکان بولتے۔ مگر اکثر موقعوں پر کم سخنی سے کام لیتے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں

میں بڑی بڑی باتیں کہتے۔ سادہ الفاظ میں پُرکار باتیں ہوتیں۔ غرض میکش صاحب کی گفتگو میں بلاغت و جامعیت کے جوہر ہوتے۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ میکش صاحب کی شخصیت ظاہری وجاہت اور باطنی اوصاف کی ایک معنی آفریں اور تہذیب آگیں کہکشاں تھی تو غلط نہ ہوگا۔

کسی شاعر نے کہا ہے:

ان کے کوچے سے اک شام گزرے تھے ہم پھر تو یہ روز کا مشغلہ ہوگیا

ایک بار کی ملاقات بہت سی ملاقاتوں کا پیش خیمہ بن گئی۔ میں ہفتے میں کئی شامیں میکش صاحب کے ساتھ گزارنے لگا۔ ہر ملاقات میں کسی نہ کسی اہم موضوع پر گفتگو ہوتی۔ عام طور پر ادب، تہذیب اور تصوّف کے نِکات اور گوشے زیرِ گفتگو آتے۔ کبھی کبھی میں انھیں چھیڑتا۔ مگر میکش صاحب بُردباری، سنجیدگی اور احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے۔ انھیں غیر مہذب انداز اور غیر شریفانہ حرکات سے نفرت تھی۔ جو اشخاص ایسے اوصافِ رذیلہ سے متصّف ہوتے ان کے ذکر سے برہم ہوجاتے چہرہ سرخ ہوجاتا۔ مگر زبان کو بُرائی سے آلودہ نہ کرتے۔ ایسے موقعوں پر مخاطب کی بات پر جی ہاں جی ہاں کہہ کر آگے بڑھ جاتے۔ اور کسی دوسرے موضوع کی طرف گفتگو کا رخ موڑنے کی کوشش کرتے۔ میکش صاحب اگرچہ ایک عملی صوفی تھے ان کا اندازِ فکر خالص وحدت الوجودی تھا۔ لیکن وہ دوسروں کے نظریے، عقیدوں اور بسا اوقات روّیوں کا احترام کرتے۔ دل شکنی نہ کرنے کے خیال سے اختلافی امور میں دو ٹوک بات کہنے سے گریز کرتے۔ بلکہ اختلافی مسائل سے کلیتاً انحراف کرنے کی کوشش کرتے۔ انھوں نے ایک جگہ اپنے مزاج اور روّیے پر خود ہی اظہارِ خیال فرمایا ہے۔

"ذاتی حیثیت سے میں نے نہ کسی مسلک کو ترجیح دینے کی کوشش کی اور نہ کسی مخصوص سلسلہ یا گروہ کی نمایندگی کی ہے۔ استدلال کی بات اس سے الگ ہے۔ اور وہ کسی کے بھی موافق اور کسی کے بھی خلاف ہوسکتا ہے۔ لیکن میں گزرے ہوئے بزرگوں کا ادب اور اُن کی خدمت میں حسنِ ظن، اختلافِ خیال کے باوجود ضروری سمجھتا ہوں۔ اور ان کے باہمی اختلاف کو آزادیِ خیال اور صداقت کا مظہر سمجھتا ہوں کوئی قوم اور ملک ایسا نہیں ہے جہاں ہادی اور پیغمبر نہ آئے ہوں۔ عرب اور عراق ہو یا ایران اور ہندوستان خدا کی رحمت اور تعلیم سے کوئی محروم نہیں رہ سکتا۔ لیکن ان پیغمبروں کی تعلیمات ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں ہمارے فہم اور معتقدات و روایات نے بھی تصرف کیا ہے۔ جو کبھی تحریف اور کبھی تاویل کی شکل اختیار کرتا آیا ہے۔ اور یہیں سے

اختلاف شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ اختلاف جس طرح ایک ہی مذہب کے ماننے والوں میں باہم ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے مذاہب کے مقلدین سے بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں اپنے مزاجوں، صورتوں اور آب و ہوا کے اختلافات کی طرح ان اختلافات کو بھی فراخ دلی سے برداشت کرنا چاہیے اور جب ہم ساری دنیا کے ہم خیال نہیں ہو سکتے تو ہمیں بھی ساری دنیا سے اپنا ہم خیال ہو جانے کی توقع نہیں کرنا چاہیے یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ بعض چیزیں وقت کے ساتھ بدل جاتی ہیں۔ اور کل کا صحیح آج غلط اور آج کا صحیح کل غلط ہو سکتا ہے۔"

("نقدِ اقبال" (دہلی۔ ۱۹۸۲ء) ص ۸، ۹)

میکش اکبر آبادی نے سطورِ بالا میں اپنے مسلک، عقیدے اور نظریے کا اظہار ہے۔ انھوں نے واضح الفاظ میں تسلیم کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے ہر خطے اور ہر دور پیغمبروں کو مبعوث کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندستان بھی اللہ کی اس برکت و رحمت محروم نہیں رہا ہوگا۔ اس معاملے میں میکش صاحب میرزا مظہر جانِ جاناں اور رے علما کے ہم خیال ہیں۔ راسخ العقیدہ، قدامت پسند اور کٹر علما کے نہیں۔ داز فکر اگرچہ نیا نہیں۔ لیکن اس میں جو وسعت، ہمہ گیری اور لچک ہے، وہ عالم گیر انیت بقائے باہم اور امنِ عالم کی بنیاد بن سکتی ہے۔ میکش صاحب اس دور کے انی اور مذہبی دانشور تھے۔ انھوں نے اس نقطۂ نظر کو پیش کر کے "دانشِ نورانی" ق ادا کر دیا ہے۔ اس میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ انسان کو اپنے مخالف کے خیالات ترام بھی کرنا چاہیے۔ مہذب انسانوں میں سب سے زیادہ مہذب انسان وہ ہے اپنے حریف یا مخالف کے عقیدے، نظریے اور جذبات کا احترام کرتا ہے۔ وہ حریف الف خواہ زندگی کے کسی میدان میں ہو۔ یہ فراخ دلی اور وسیع النظری انسانیت کی اسی قدر ہے۔ میکش صاحب اس قدر کا مثیل تھے۔

اس اندازِ فکر نے میکش اکبر آبادی کو تعصب، تنگ نظری اور تنگ دلی سے دور ما۔ میکش اکبر آبادی کی نظر میں زبان، تہذیب، مسلک اور مذہب انسان کے خادم یا مخدوم نہیں۔ چونکہ وہ بنیادی طور پر وحدت الوجودی صوفی تھے۔ اس لیے انسان کائنات میں سب سے زیادہ مقدم، مقدس، افضل اور اہم سمجھتے ہیں جس کا لازمی یہ ہے کہ وہ بتانِ رنگ و نسل کو باطل تصور کرتے ہیں۔ انسانی زبان اور کلچر کے اختلافات اصولی نہیں فروعی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نظامِ فکر میں انسان کو کائنات میں ایک بڑی اور ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت الفاظ میں کی ہے:

" محبت اور خودی کا حسین ترین موصوف اگر عقل و دانش میں نہ آئے

تو خدا اور دل و نگاہ میں سما جائے تو انسان ہے۔ اس لیے وہ کون سا فرد ہوگا جسے اپنے آپ سے محبت نہ ہوگی۔ کائنات اور اس کی تمام تفصیلات، آخرت اور اس کے تمام اذعانات کا مرکز یہی محبت ذات ہے۔ یہ لازمی ہے کہ جو ہماری محبت کا موضوع ہو وہ ہماری فکر کا بھی موضوع ہو۔ کیونکہ فکر ہی ایک ایسا رابطہ اور وسیلہ ہے۔ جو محبت سے عرفان تک پہنچاتا ہے۔ لہٰذا جاہل ہو یا عالم، شاعر ہو یا فلسفی ہر شخص یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ ہم اور یہ عالم کیا ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور آخر کیا ہو جائیں گے۔ ہمارے سارے فلسفے، تہذیب، اور مذہب و اخلاق اسی سوال کے گرد چکر کھاتے رہتے ہیں۔"

("نقدِ اقبال" [۱۹۶۴ء] ص ۱۵)

اس اندازِ فکر نے میکش صاحب کی زندگی اور فن کو شدید انداز میں متأثر کیا ہے۔ انھوں نے اس بات پر خاص زور دیا ہے کہ انسان کا جذبۂ محبّت اور موضوعِ فکر دونوں کا ایک ہونا ضروری ہے۔ یعنی ایک سالم، فعّال اور متحرک شخصیت کے ذہن و دل، جذبہ و فکر اور ظاہر و باطن کا یکساں ہونا ضروری ہے۔ یا کم از کم ان دونوں پہلوؤں میں کامل ہم آہنگی اور مطابقت ہونی چاہیے۔ میکش اکبرآبادی کی شخصیت صفات اور ان کا اظہار اس جذبۂ محبّت اور فکرِ محبت کا گہوارہ ہے۔ جس کی بنیاد وحدت الوجودی اندازِ فکر پر ہے۔ اس نظریے نے میکش اکبرآبادی کی شاعری میں خاص رنگ آمیزی کی ہے۔

یہ کائناتِ زمان و مکاں سفر ہی سفر — نہ عاشقی مری منزل نہ حسن تیرا مقام

چھا گیا عالم پہ تیرا رنگ و بو میری طرح — ہو گیا سارا زمانہ تو ہی تو میری طرح

میری رندی، تیرا بہکا ہوا اک غمزۂ شوخ — میری ہستی، ترا اک رازِ نہاں ہے ساقی

رازِ خلوت کو عیاں کیوں سرِ محفل نہ کروں — میرے مذہب میں عیاں، عین نہاں ہے ساقی

ہر اک سمت ترا رخ ہے ہر اک رخ تری ذات — کروں میں کس کی طرف پشت کس کی سمت سجود

ہر اک حجاب سے نکلی نوائے الا اللہ — کمالِ کفر نے چھیڑا جو سازِ لا موجود

ان اشعار میں وحدت الوجودی اندازِ فکر جاری و ساری ہے۔ یہ محبت کا فکری پہلو ہے۔ اب چند ایسے اشعار بھی پڑھیے، جن میں "جذباتی پہلو" غالب ہے۔

اس ادا سے مجھے برباد کیا ہے۔ اس نے
کہ گیا کچھ بھی نہیں، اور رہا کچھ بھی نہیں

وہ مجھ کو ڈھونڈتے ہیں، مگر دیکھتے نہیں
پلکوں پہ اک نگاہ مکرر لیے ہوئے

رکھتا ہوں سو معاملے تجھ سے بہ نیض دل
اپنی نظر سے بھی تجھے پنہاں کیے ہوئے

تیری محفل سے کچھ اس حال میں ہم آتے ہیں
جیسے مقتل سے شہیدوں کے علم آتے ہیں

تیری نظروں میں تو کچھ تحریر ہے ظالم، ورنہ
اپنے قابو میں بھی مشکل ہی سے ہم آتے ہیں

یہ بات کیا ہے کہ آغوش میں تجھے لے کر
تمام عمر ترا انتظار میں نے کیا

یہ مانا زندگی میں غم بہت ہیں
ہنسے بھی زندگی میں ہم بہت ہیں

میکش اکبرآبادی دنیائے ادب اور تصوف کی ایک ممتاز شخصیت کا نام ہے۔ انھوں نے ۱۹۰۲ء میں اس عالم رنگ و بو میں آنکھ کھولی اور ۱۹۹۱ء کو وصال فرمایا۔ شاعر کی حیثیت سے میکش اکبرآبادی نے میکدہ، حرفِ تمنا اور "داستانِ شب" جیسے یادگار شعری مجموعے چھوڑے ہیں۔ نقاد کی حیثیت سے انھوں نے "نقدِ اقبال" اور مسائلِ تصوف جیسی بصیرت افروز کتابوں کا تحفہ دیا۔ چونکہ میکش اکبرآبادی کو ۱۹۱۹ء میں درسِ نظامی کی سند اور خلعت مل گئی تھی۔ اس لیے عالم کی حیثیت سے انھوں نے "شرک و توحید" نغمہ اور اسلام، نیز غوث الاعظم جیسی روح پرور تحریریں دی ہیں۔ افسوس کہ اب یہ یادگار زمانہ شخصیت ہمارے درمیان نہیں ہے۔ بقول میکش

جو فرشِ گل پر سو نہ سکا جو ہنس نہ سکا جو رو نہ سکا
اس خاک پہ اس شوریدہ سر نے آج آخر آرام کیا

شعری مجموعے

جن کی صرف ایک ایک دو دو کتابیں اسٹاک میں موجود ہیں

کتاب	مصنف	قیمت
دو قدم۔ ایک منزل	شایاں قدوائی	۴/-
دیدۂ نم	وحیدالنساء	۱۵/-
دکھتی رگیں	شاد عارفی	۵/-
دائرہ	عابد عالمی	۵/-
دشت تمنا	زبیدہ تحسین	۳/-
دشت آرزو	غنی اعجاز	۲۰/-
دلکش نظمیں	ابرار کرت پوری	۶/-
دو دواوین غزلیات	مرتبہ۔ ڈاکٹر نعیم احمد	۲۵/-
دیوان غنی	ملا محمد طاہر غنی کاشمیری	۲۲/۵۰
دست زلیخا	سلمیٰ جاوید	۱۲/-
دستخط	صادق	۱۰/-
دھنک احساس کی	راج نرائن راز	۴۵/-
دریچے حیات کے	وسیم غنی وسیم	۱/۵۰
دیوان نیاز بریلوی	مرتب: انوارالحسن	۵۰/-
دل و نظر	ناظم میواتی سہسرامی	۱۲/-
دست نارسا	ڈاکٹر یعقوب عامر	۲۵/-
دھوپ کی سرحد	اسعد بدایونی	۱۰/-
دھنک رنگ	نوبہار صابر	۲۲/-
دھوپ کا آخری ٹکڑا	سیّد عارف	۳۰/-
ذوق نظر	نظر برنی	۱۰/-
ردّ تبلیغ نو	اثر بن یحییٰ انصاری	۱۰/-
زحل نظر	مہدی نظمی	۲/-
رقص روح	اصغر مرزاپوری	۶/-

کتاب	مصنف	قیمت
راز	راز یزدانی	۷/-
روحانی غزلیں	اندرجیت لال	۲۰/-
رنگِ سیاہ	ذکاءالدین شایاں	۵/-
راہگذر	دل ایوبی	۲/۵۰
رت سنگھار	اردو روپ۔ عرفان صدیقی	۱۵/-
ریت کے پھول	آدم نصرت	۲/۵۰
رقص گرداب	نشاط سعید	۱۰/-
ریزہ ریزہ	ظفر حمیدی	۱۰/-
رنگ ترنگ	کرشن مراری	۵۰/-
روشنی کے پھول	انور بینائی	۱۵/-
رنگارنگ	محبوب راہی	۶/-
رنگ شکستہ	فضیل جعفری	۱۲/-
رباعیات اختر	بخشی اختر امرتسری	۲۰/-
دوپہر کا پھول	تابش سلطان پوری	۰/-
رشتۂ کلام	محسن زیدی	۰/-
رشک قمر	قمر جلال آبادی	۲۰/-
روشن کائنات	روشن بنارسی	۲۵/-
رنگ تماشہ	حمیدالماس	۲۰
روپ کی کرنیں	روپ بھاردواج	۰
زمزمہ	صفدر آہ	۲
زخم احساس	یونس قنوجی	۰
زخموں کے گلاب	صلاح الدین نیّر	۵۰
زمزمۂ ساقی	ماسٹر نیپ راج بھاٹیہ ساقی	۵۰
زندگی سے زندگی کی طرف	نازش پرتاپ گڑھی	
زنداں میں ایمان	جمال احمد امین آبادی	
زخموں کے سلسلے	عبدالصمد تپش	
زندگی زنجیر کی	گنیش بہاری طرز	
زخموں کے پھول	فیض نظامپوری	
زخموں کے آنگن	سوہن راہی	

ملنے کا پتا: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳

ف. س. اعجاز

مدیر ماہنامہ انشاء ۱/۶ بی ۱ے
کنائی سیل اسٹریٹ، کلکتہ ۳۰،۷

مستعار شمعوں سے ہم ہوتے ہیں شرمندہ
ان سے ایک شب اپنا گھر ہوا نہ تابندہ

تم پہنچ کے ساحل پر کشتیاں جلا دینا
آملیں گے تم سے ہم بچ گئے اگر زندہ

کس طرح ملائے گا کل کی آنکھ سے آنکھیں
منہ چھپائے پھرتا ہے حال کا نمایندہ

بھول کر اسے اب تک ہم ذرا نہیں بھولے
عشق سے زیادہ ہے دردِ عشق پایندہ

بے جگہ وہ بے مصرف دھن نہیں بجاتا ہے
لے کا پاس رکھتا ہے ہوشیار سازندہ

پھر رہا ہے آنکھوں میں لے کے خشک بے چینی
بے اماں جزیرے کا بے قرار باشندہ

صرف ایک لذت سے تیرے ہونٹ جلتے ہیں
تو ہوس کے عالم کا بے لباس کارندہ

کرامت بخاری

اے-۷۰۰۲، فیصل ٹاؤن، لاہور
جی۔او۔آر ۲۔ لاہور
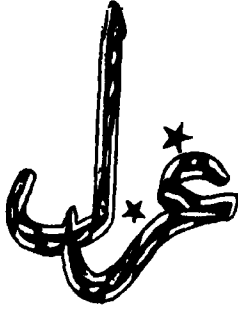
دل پہ مایوسیوں کے ڈیرے تھے
ہر طرف پھیلتے اندھیرے تھے

راستہ بھی بڑا اجاڑ سا تھا
ساتھ ساتھ بھی سب لٹیرے تھے

چھاپ تھی اُن پہ بھی سیاہی کی
لوگ سمجھے جنھیں سویرے تھے

ہر طرف تھی تلاش چھاؤں کی
شہر میں پیڑ بھی گھنیرے تھے

زخم خوردہ تو ایک اکیلا تھا
سانپ کے ساتھ تو سپیرے تھے

اصل میں عکسِ خونِ ناحق تھا
ظاہراً رنگ تھے پھریرے تھے

اقبال متین

غزل

کچھ اتنا بے نیاز ہوں جینے کے باب میں
جس طرح دریا خود کو چھپائے سراب میں

آ زندگی تلاش کریں کوئی اور زہر
تیرے لیے تو کچھ نہ رہا اب شراب میں

وہ عالمِ فراق تھا اللہ کی پناہ
ہر شے جُھلس رہی تھی شبِ ماہتاب میں

تجھ کو ہی دیکھتی رہیں آنکھیں تو کیا کریں
اک تو ہی بس گیا تھا جہانِ شباب میں

میں بھی جہاں سے اس طرح اُٹھ جاؤں گا متینؔ
جس طرح ترک رکھ کے اُٹھا ہوں کتاب میں

شاہد میر
صدر شعبہ نباتیات گورنمنٹ کالج بانسواڑہ

دوہے

ہم نے بھی سنسار سے مانگے تھے کچھ پھول
گھیرے ہیں اب جسم کو کانٹوں بھرے ببول

ہنسنا، رونا، سوچنا سب کچھ ہے گردو
سانسیں اپنی قرض تھیں چکا رہے ہیں سو

فقط "سلاموں" سے رہا اس کا گھر آباد
پھٹے حال جیتا رہا اک بوڑھا "اُستاد"

گونج چکیں سب سیٹیاں ختم ہو گیا کھیل
آنسو پونچھو دوستو گزر گئی ہے ریل

چلتے نہیں دماغ پر اب من کے قانون
جیون سے بھی جٹل ہیں جیون کے قانون

سطوت رسول
جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

سرِّ حق

ۂر مندر بجے منجیرے، سندھیا کی ہو پوجا
ر خیال سلگتا کھنڈر، جس میں کوئی نہ دوجا

ی گلی میں حق جاگے اور سارے راز ہیں کھوئے
ی گلی میں سارے بندے پیا کے نام پہ روئے

بکھرتا رہے ہمیشہ، جاگے ترا گلیارا
ے در پہ کھڑا ہے جوگی، دل کا لیے اک تارا

نے کب یہ ڈور کٹے، یہ روح کی اُلجھی سانسیں
یں تیری یاد کی ہوں گی، کتنی گہری پھانسیں

ی گلی میں وجد و کیف و حال سماں قوّالی
ا گلی میں کتنے شناور، جن کا رنگ جمالی

ی گلی میں ہو حق اللہ، تیری گلی میں شور
ی گلی میں شردھا جاگے، ناچے من کا مور

ی گلی کے رنگیں منظر، تیری گلی میں رنگ
ی گلی میں راز ہویدا، کتنے شوخ و شنگ

ی گلی میں اللہ جاگے، جاگے اسم محمدؐ
ہے تعریفیں اُس بندے کی جس کا نام ہے احمدؒ

اُحمد عبدالحق ردولوی کی بارگاہ میں گلہائے عقیدت۔

راشد ندیم
بالو زئی اوّل شاہجہاں پور
(یوپی) ۲۴۲۰۰۱

لمحے لمحے میں اک اک صدی بند تھی
جن دنوں شہر میں میکشی بند تھی

جس سے گزرے تھے ماضی کے لمحے کبھی
آج دیکھا تو وہ بھی گلی بند تھی

ہنستے چہروں کو دیکھا تو ایسا لگا
جیسے در پردہ اک بے بسی بند تھی

پھر بتاؤ دکھاتا بھی کیسے تمہیں
جس قبا میں مری مفلسی بند تھی

میرے آنسو بھی راشدؔ تھے اک مدعا
اک کہانی پسِ خامشی بند تھی

ذکا صدیقی
K.F.U.P.M
MAIL BOX 435
DHAHRAN
(SAUDI ARABIA)

ساحل احمد
لیٹریری بک سینٹر ۱۲۶ چوک
الٰہ آباد ۔ ۲۱۱۰۰۳

دید تو دو پل کی تھی مگر دل کو اب تک حیرانی ہے
صدیاں جو خاطر میں نہ لاتا لمحوں کا زندانی ہے

ذہن کے گوشوں میں خوابیدہ کوئی پرانی یاد جگاؤ
دل یوں بھی سنسان تھا لیکن آج بہت ویرانی ہے

کوئی آس نہ کوئی آنسو کوئی یاد نہ کوئی خواب
شام سے یہ سناٹا ہے اور ساری رات بتانی ہے

کچھ یادوں کے جلتے خیمے کچھ وعدوں کی بجھتی راکھ
خوابوں کے بے سمت سفر کی ہر منزل پہ نشانی ہے

اب بھی یادوں کے آنگن میں اُڑتا ہے کاغذ کا جہاز
نیم کے بوڑھے پیڑ کے نیچے اب بھی ہوا دیوانی ہے

ہجر کی دیوار اپنی کیا گری
درد چمکا روشنی سی کیا گری

جل اُٹھے کاغذ پہ کتنے ہی دیے
آنسوؤں کی بوند میری کیا گری

حرف سارا ہی لہو اب ہو گیا
زندگی تو رقص کرتی کیا گری

اک چھناکا دور تک پہنچا مگر
ٹوٹ کر زنجیر ایسی گری

جل گیا ساحل شبستانِ یاد کا
سینۂ غم پر یہ بجلی کیا گری

قاضی حسن رضا
ن پورہ، کھنڈوا۔ ۴۵۰۰۱

شکاری نے رکھا ٹھکانہ بلند
ہدف پست قامت نشانہ بلند

جہاں ظلم کی ہیں کمندیں دراز
وہاں تک کریں آشیانہ بلند

ترے سامنے سر بسجدہ ہیں لوگ
ترا نام ہے غائبانہ بلند

بڑی تیز رفتار ہے عمر کی
سدا را نہ کر آشیانہ بلند

مری چیخ بھی کھو گئی ہے رضا
ہوا ہر طرف سے ترانہ بلند

رخسانہ نکہت لاری: "ام ہانی"،
مقبول لاری منزل۔ نزد سٹی اسٹیشن۔ لکھنؤ

مشغول کار و بار تھے ہم نزد و دور تک
دبتے گئے خسارے دلِ ناصبور تک

زاہد تمام عمر رہا محوِ وعظِ خشک
لیکن وہ اختتام پہ آ پہنچا ہے حور تک

لب سے دعا و دل سے ندامت جدا نہ کر
ہوتی رہیں گی لغزشیں یومِ نشور تک

اس نے مری شناخت میں صدیاں گذار دیں
ایسا جنون تھا کہ جو لایا شعور تک

ہانی کلیمِ عشق سے سجدے میں گر گیا
معشوق نے کو خاک کیا کوہِ طور تک

ماجد الباقری
۱۱۔ وحدت کالونی، گوجرانوالہ
پاکستان

غزل

وسعتِ عہدِ رواں کو مرے سر میں رکھا
کس قیامت کا دفینہ تھا سفر میں رکھا

ماں کو معلوم تھا جب کچھ بھی نہیں ہے گھر میں
صرف تعویذ مرے رختِ سفر میں رکھا

جو اثاثہ مرے بچپن کا تھا ہمراہ مرے
گانو میں اس کو رکھا مجھ کو نگر میں رکھا

اب تو اخباروں میں چھپتے ہیں اسی کے خاکے
گھر کا نقشا جو چھپا کر کبھی گھر میں رکھا

جو بھی دیکھے وہی چہرہ تھا مرے لفظوں میں
رنگ پانی کی طرح میں نے ہنر میں رکھا

اپنی مرضی کے مطابق مجھے گمراہ کیا
جب سے آباد کیا تب سے سفر میں رکھا

ڈال کر گود میں ماں کی مجھے ماجد اس نے
خود کو روپوش کیا مجھ کو نظر میں رکھا

مختار شمیم
ایف ۲۔ گورنمنٹ گرلس پی جی کالج کیمپس
(موتی طویلہ روڈ) اندور۔ ۴

غزل

(سردار جعفری کی نذر)

ہجرتیں بے سایباں ہیں اور گھر نا آشنا
شہرِ نا پرساں کے بھی دیوار و در نا آشنا

ہے تعلق کا گماں جس شخص پر، نا آشنا
وہ ہمارا آشنا تو ہے مگر نا آشنا

ایک شامِ انتظار آنکھوں میں ڈھل کر رہ گئی
آج تک جویائے غم ٹھہرے سحر نا آشنا

وسعتِ غم کے لیے تو دشت و صحرا اک قدم
حیف اس دیوانگی پر ہے سفر نا آشنا

اک صدائے دشت نے ہم کو پکارا ہے شمیم
گویا اپنے واسطے ہے اپنا گھر نا آشنا

رؤف خیر
۱۹/۲/۴۲-۱۰-۹
دلاور شاہ نگر، رسالہ بازار
گولکنڈہ، حیدرآباد۔۵۰۰۰۰۸

ماں/باپ کی قبر پر

تمہاری قبر کہاں ہے مجھے نہیں معلوم
مگر گماں یہی ہے یہیں کہیں ہو گی

ہوا ہے شہر خموشاں بھی کس قدر آباد
کچھ اور ہی تھا یہ ما قبل کچھ ہوا ما بعد

تمہاری قبر پہ کتبہ نہیں، نشان نہیں
کہ اس جگہ کی نشانی ہی بے نشانی ہے

یہ وہ مکان ہے جس میں مکیں نہیں رہتا
کہ آسماں کبھی زیر زمیں نہیں رہتا

تمہاری قبر پہ کتبہ نہیں تو کیا غم ہے
تمہارا نام رواں ہے مرے رگ و پے میں
تمہارا نام تو زندہ مری زباں پہ ہے

کھڑا ہوں ہاتھ اٹھائے میں آسماں کی طرف
پکڑ رہے ہیں ادھر تتلیاں مرے بچے
چمک رہے ہیں ادھر میری آنکھ میں جگنو
اداس ہو گئے بچے مری اداسی سے

تمہیں خبر ہو دیے سے دیا جلے گا ہی
ہمارے بعد بھی یہ سلسلہ چلے گا ہی

خواجہ رحمت اللہ جری
عرعر، سعودیہ

نظر نے ان کی محبت کے گھر پہ دستک دی
تو در کے ہونٹ تبسم کو ساتھ لے کے کھلے

ہمارے جسم کے اندر بھی کوئی رہتا ہے
ہم اپنے ساتھ گواہی میں اس کو لے آئے

نہیں ہے سوچ کسی شخص کا بھی بچکانہ
ہمارے شہر میں، تتلی کے پر نہیں ہوتے

نہیں اگر ہے گوارا، جو ہو رہا ہے یہاں
شجر کی آنکھ سے دنیا کو دیکھتے رہیے

برش کا ہاتھ پکڑ کر کسی کے خاکے میں
مرے خیال کی باریکیوں نے رنگ بھرے

انیس سلطانہ
۶۳، موتی مسجد کے پیچھے، بھوپال

کاوش پرتاپ گڑھی
ٹی۔ ۱۹۰ بلجیت نگر نئی دہلی ۸

آئینوں کے سامنے جس وقت لائے جائیں گے
خود مسیحا اپنے چہرے کو چھپائے جائیں گے

نفرتوں کا زہر پی کر میں امر ہو جاؤں گی
ارچنا کے پھول مجھ پر بھی چڑھائے جائیں گے

جس پڑوسی نے دیا ہے آج اذنِ سرخوشی
کل مرے خنجر سے اس پر ظلم ڈھائے جائیں گے

وقت نے دھندلا دیے ہیں چاہتوں کے سب چراغ
تیرگی کی بزم میں کیا گیت گائے جائیں گے

لو وہ پھر روشن ہوئی قندیلِ ماتم آج شب
پھر ستارے توڑ کر دامن سجائے جائیں گے

میں فقط اپنے جنوں میں ان کو دشمن جان کر
یہ سمجھ بیٹھی کہ اب پردے ہٹائے جائیں گے

صرف اتنا فیض ہے فصلِ بہاری سے مجھے
دامنِ بوسیدہ سے کانٹے چھڑائے جائیں گے

شہر کو خون میں لتھڑا دیکھا
چرخ کو اشک بہاتا دیکھا

رات تھی لٹ چھٹکائے سوئی
چاند سے پوچھو تو کیا دیکھا

زورِ باراں میں گردوں پر
ایک پرندہ اڑتا دیکھا

رگ رگ آگ بھڑک اٹھی تو
ہم نے خود کو تنہا دیکھا

وہ بھی خود سے پوچھ رہے ہیں
کاوش جیسا پگلا دیکھا

ظفر امام
ری منزل بتیا ۸۴۵۴۳۸۰

غزل

اری رات کی بستروں میں نکلتی ہے
ر خدا کی قسم مشکلوں سے کٹتی ہے

رات کتنے گناہوں کو راز رکھتی ہے
رات، ہائے! طوائف کی کوئی بیٹی ہے

رب لوگ تو مجبوریوں کے راجا ہیں
لا خدا کی زمیں ان کی راج گدی ہے

کس گمان پہ اترا رہا ہے بولو نا!
واکے رُخ پہ کہاں لَو تری ٹھہرتی ہے

ہارے ہاتھ پہ کچھ آنسوؤں کے سکے ہیں
امام عمر کی شاید یہی تو پونجی ہے

صبا بلگرامی
۱۵۵۲، سیکٹر ۱، دہیکل اسٹیٹ
جے پور - ۹ - ۳۰۲۰۰

غزل
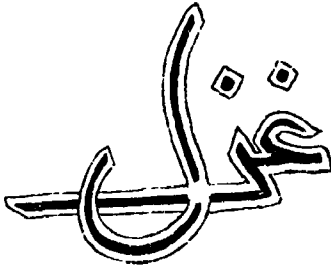
مرے ہم سخن، مرے ہم سفر، مری زندگی، بھی نکھار دے
مری دھڑکنوں میں دعائیں ہوں میری شاعری کو سنوار دے

مری زندگی تیری اک نظر، تری اک نظر دم پا
کہ مجھے بھی ہو مرا کچھ یقیں مرے ہر یقیں کو قرار دے

مری فرحتیں، تری چاہتیں، مری حسرتیں، تری قربتیں
میں بھی خوشبوؤں کا امیں رہوں مرے فن کو اتنا وقار دے

تو ہی عظمتوں میں عظیم ہے، تو ہی رحمتوں سے رحیم ہے
میں خزاں رسیدہ سا پیڑ ہوں تو مجھے بھی لمس بہار دے

تری سادگی ہے حد افزوں، تری دلکشی بھی ہے دل نشیں
تو صبا کے فن کا ہے رہنما تو اسے بھی نقش و نگار دے

اخلاق سہسوانی
سہسوان۔ ضلع بدایوں
یو۔ پی

ڈا۔ رزاق اثر
خورشید محلہ، شاہ آباد۔ ۵۸۵۲۲۸
ضلع گلبرگہ

میں نے اشکوں کو روکا تو ظاہر ہوا
ضبطِ غم کو بھی اک حوصلہ چاہیے

تیرے دامن کو زخموں سے بھر تو دیا
اے دلِ زار اب تجھ کو کیا چاہیے

اس کے لٹنے میں پھر کوئی شک ہی نہیں
کارواں کو بس اک رہنما چاہیے

جن کی فطرت ہے مکر و ریا ان کو بھی
دوسروں سے خلوص و وفا چاہیے

آپ نے کچھ غموں سے نوازا تو کیا
اب مجھے غم کا اک سلسلہ چاہیے

اب تو اخلاق برسات بھی ہے خجل
اپنے اشکوں کو اب روکنا چاہیے

جو نشاں منزلوں کے پتھر تھے
ان کو رہبر اکھاڑ آیا ہے

سربلندی پہ ناز کرتا تھا
آج نیچے پہاڑ آیا ہے

وہ خطا کو معاف کرکے پھر
دشمنوں کو پچھاڑ آیا ہے

نرم پودے تو بچ گئے طوفاں
پیڑ سرکش اکھاڑ آیا ہے

ہو گیا بے لباس جب گلشن
اے اثر کب اساڑ آیا ہے

رفعت عزمی
حبیب کدہ ۳۵۸۰۵، قاضیانہ
رودولی۔ ضلع بارہ بنکی

غزل

خوب تم نے کہی مثل بابا
زندگی جھاگ کا محل بابا

سخت دھرتی ہے روپ، دل دل کا
پانو رکھنا سنبھل سنبھل بابا

جھوٹ بولو مگر عقیدت سے
ہاتھ میں لے کے گنگا جل بابا

اس نئے دور کی فضاؤں میں
سانس لینا نہیں سرل بابا

تم برا مانتے ہو مانا کرو
بات کہتا ہے برمحل بابا

جس کے قصے ہمیں سناتے ہو
آخر کب آئے گا وہ کل بابا

تم بھی کچھ خیریت بتاؤ تو
حال اپنا ہے سب کشل بابا

پرکاش تیواری
۱۹۹، سیکٹر۔۱۲ آر کے پورم،
نئی دلی۔ ۲۲

نہ جانے کیوں؟

بے بسی کی خامشی
وجود کو نگل رہی ہے
آتما تڑپ رہی ہے
اور
ہوس کے کنویں میں
ایک بوند بھی نہیں
نہ جانے کیوں
بہک گیا ہے آدمی
یہ آسماں یہیں رہے گا
یہ زمیں یہیں رہے گی
پھر بھی
جل رہا ہے شہر
مر رہی ہے آتما
نہ جانے کیوں

علیم صبا نویدی
۲۶۔ امیر النساء بیگم اسٹریٹ۔ مدراس ۲۰

غزل
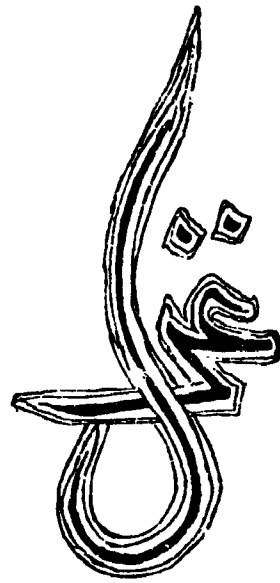
نہ روشنی نہ اندھیرا، نہ دود ہوتا تھا
مجھے بھی تیری طرح نا وجود ہونا تھا

ہر ایک شے کو یہاں لا حدود ہونا تھا
گرفتِ شب سے نکل کر نمود ہونا تھا

گھٹن کی دھوپ، کشاکش کی آنچ میں بھی اسے
دیارِ ربط میں محوِ سجود ہونا تھا

لبِ نگاہ کا کچھ ذائقہ بدلنے کو
سرِ فلک بھی کوئی کہیں کود ... تھا

یہ فیضِ فکرِ اسد پھیلتا گیا ہے صبا
وگرنہ اس کو بھی نذرِ جمود ہونا تھا

بدر نظیری
معروف پور بنیا پوکھر۔ گیا ۸۲۳۰۰۱۔ بہار

(ایک غزل حسن نعیم مرحوم کے نام)

لباسِ عقل میں کوئی ملنگ تھا کیا تھا
کہ سادہ لوح تھا وہ یا ترنگ تھا کیا تھا

زمیں سے تا بہ افق بادلوں سا چھایا ہوا
شفق تھا خون تھا یا سرخ رنگ تھا کیا تھا

نگل رہا تھا ہر اک زندگی کی خوشبو کو
وہ تیرتا سا فضا میں نہنگ تھا کیا تھا

عجیب ڈھنگ سے دیکھا اسے تہ و بالا
وہ میرے دل کے فلک پر پتنگ تھا کیا تھا

وہ میری لاش میں چبھ رہا تھا رہ رہ کر
نگاہِ یار کا کوئی خدنگ تھا کیا تھا

وہ لوز و نغمہ ابلتا ہوا بدن اس کا
بشکلِ عشق وہ مہتاب رنگ تھا کیا تھا

گھرا تھا اس کا تبسم نظر کی سلوٹ میں
وہ اپنا یار بھی آمد بہ جنگ تھا کیا تھا

جگر پہ چوٹ پڑی اور چمن کھلا ہر سو
وہ بدرِ چہرۂ گلرنگ سنگ تھا کیا تھا

ل الرب
۱۵۱- کریلی ہاؤسنگ اسکیم- الہ آباد

سازِ لرزاں سے غبارِ منزل تک

(ایک تاثر)

غلام ربانی تاباں ترقی پسند شعراء کی صفِ اوّل سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک مستند و معتبر بزرگ شاعر کی
ے اردو ادب میں وہ اپنا ایک ممتاز مقام بنا چکے ہیں۔ ان کی شاعری نصف صدی کو محیط ہے۔ اس
کم و بیش دس دس سال کے وقفہ سے ان کے پانچ شعری مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ زود گوئی اور
ن کے شعری مزاج سے میل نہیں رکھتی۔ وہ شعر محض شعر کہنے کی خاطر نہیں کہتے۔ ان کے تجربات زندگی جب تخیل
ن تب کر واردات بن جاتے ہیں تب شعری سانچے اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی لیے شاعر کی نظر میں اس کا ہر
داستان ہے۔ یہ تخلیقی عمل وجدان کا رہینِ منت نہیں ہے۔

میں نے کب دعوئے الہام کیا ہے تاباں
لکھ دیا کرتا ہوں جو دل پہ گزرتی جائے

یہ اور بات ہے یاروں نے کم سخن جانا
مرا یہ حال کہ ہر لفظ داستاں سا لگے

تاباں کے شعری مجموعوں کے نام محض اتفاقیہ نہیں ہیں۔ وہ ایک خاص معنویت کے حامل اور شاعر کی افتاد
غماز ہیں۔ ان کے شعری سفر کا پہلا مرحلہ "سازِ لرزاں" کی اشاعت (۱۹۵۰) پر ختم ہوا۔ سازِ لرزاں کا استعاراتی
حقیقت کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ اس کے خالق نے رامش و رنگ کے طلسماتی ماحول سے برگشتہ ہو کر
جھجکتے اور لرزتے ہوئے تند و تلخ حقائق سے پُر وادیِ پُرخار میں قدم رکھا ہوگا۔ جاگیردارانہ نظام حیات اپنی
ت اور مکروہات کے باوجود آسائشوں، مسرتوں اور عشرت سامانیوں کے لوازمات فراہم کرتا ہے۔ ایسے سماجی
پرورده شخصیت کے لیے یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہوتا کہ عیش کوش زندگی کے مقابلے میں طوق و سلاسل
کش زندگی کو ترجیح دے۔ ایسی صورت میں سازِ حیات سے لرزاں نغموں کا نکلنا ایک فطری امر ہے۔
تاباں کے شعری سفر کے دوسرے مرحلے میں ہمیں "حدیثِ دل" (۱۹۶۰) کی بشارت ملتی ہے۔ لغوی
ے حدیثِ دل کے اظہار کے امکانات لامحدود ہیں لیکن جب شعر کے تعلق سے حدیثِ دل کا ذکر چھڑتا ہے
تا حسن و عشق تک بات پہنچتی ہے جو ہمارے جذبات، احساسات اور واردات سے تعلق رکھتے ہیں۔ حدیثِ

دل کے عنوانات لامحدود اور ان کی تشریحات و توضیحات بے شمار ہیں. ان کے رنگ روپ بے پایاں
اظہار کے اسالیب و پیرایے بے کراں ہیں. غزل جو سرور صاحب کے الفاظ میں بڑی کافر صنف سخن ہے، د
دل سنانے کے لیے موزوں ترین وسیلہ ہے۔ اس لیے کہ غزل کم و بیش تین سو سال سے عجمی لے اور
ہندی کی شعری روایات سے تو منداصلاً حدیث دل ہی سناتی رہی ہے. تاباں نے بھی اسی وسیلے کو اپنا
اسی کا استعمال کمال ہنرمندی سے کیا۔ جدید تنقید کی رو سے اگر حدیث دل کے ساتھ حدیث دیگراں، غم دوست
ساتھ غم روزگار اور ذات کے ساتھ کائنات کی بات نہ چھڑے تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بات بنی نہیں. ایک
سے یہ ٹھیک بھی ہے۔ حدیث دل اپنے وسیع دائرے میں ان سب کو سمیٹے ہوئے ہے. تاباں کی شاعر
ان موضوعات کا فن کارانہ اظہار ملتا ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیش ہیں ؛

حدیث دل بھی نہیں، حرف مدعا بھی نہیں — ہماری بات سزاوار اعتنا بھی نہیں

جذبۂ شوق کو اظہار کی فرصت نہ ملی — لفظ و معنی کا فسوں ٹوٹ گیا کیا کرتے

چند لمحوں کو ہی آ تو گیا دل میں ملال — کھل گیا دعوائے تمکیں کا بھرم کیا کیجے؟

تمھیں بتاؤ پکارا ہے بار بار کسے — عزیز رکھتے ہیں غم اے روزگار کے

اسی مٹی سے سب کچھ ہے فرازِ عرش تک تاباں — نہ دل آیا، نہ غم آیا، نہ سر آیا، نہ در آیا

سبک روی سے حدیث دل سناتے ہوئے تاباں کا شعری سفر آگے بڑھتا رہا. سفر کے تیسرے
میں "ذوق سفر" کی اشاعت (۱۹۷۰) عمل میں آئی. اس تخلیقی سفر میں شاعر کو شاید یہ گمان ہوا کہ وہ جس
کی طرف گامزن ہے وہاں تک رسائی میں اس کی شاعری سازگار نہیں ہو رہی۔ اس کی نوعیت نوائے برا
کی سی ہے۔ ہو سکتا ہے یہی گمان "نوائے آوارہ" کی وجہ تسمیہ ہو. "نوائے آوارہ" کی اشاعت کے بعد تا
کے شعری تخلیق کی رفتار بہت دھیمی پڑ گئی اور یک موضوعی صحافت ان کے فکر و عمل کا محور بن گئی. انھوں نے
قلم کو فرقہ پرستی اور انتشار پسندی کے خلاف جدو جہد کے لیے وقف کر دیا. اب ۱۰ سال کے طویل وقفے
ان کا ایک اور شعری مجموعہ "غبار منزل" کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔

یہ مجموعہ کل ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے. اس میں پچھلے مجموعوں کے مختصر انتخابات اور "نوائے آوارہ" کے
کی کہی ہوئی غزلیں شامل ہیں. پچھلے مجموعوں سے انتخاب کرتے وقت ترک و قبول کے عمل میں کچھ ضرورت سے
ہی سختی سے کام لیا گیا ہے. کم و بیش ایسی تمام شعری کاوشیں جو وقتی تاثرات کا نتیجہ تھیں یا جو وقت کے تقا

معنویت کھو چکی ہیں وہ نئے مجموعے میں شامل نہیں کی گئیں حالانکہ کچھ چیزیں ایسی تھیں جن کو نئے مجموعے میں شامل کر لینا بہتر ہوتا۔ اس سے شاعر کے ذہنی ارتقا کے سمجھنے میں آسانی ہوتی۔ "غبارِ منزل" کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ پچھلے شعری مجموعوں کے عرق سے کشید کیا ہوا عطر ہے۔

اس وقت دنیا جس انقلابی نوعیت کے ہنگامی حالات سے دوچار ہے، اس کے پس منظر میں "غبارِ منزل" ایک نئی معنویت کا اشاریہ ہو سکتا ہے۔ شاعر نصف صدی سے جس منزل کی آرزو و جستجو میں سرگرداں نے نشان ڈھونڈ رہا ہے جس راہ پر وہ رواں دواں تھا وہ گرد و غبار میں گم ہو گئی ہے۔ ردِّ اشتراکیت کی سماج کی تشکیل کے آدرشوں کی شکست و ریخت اور خود شاعر کے اپنے ملک میں انتشار، تنگ نظری پرستی، مذہبی جنون، نفرت و کدورت، لسانی و تہذیبی تعصبات اور طبقاتی تفرقات کا دور دورہ منزل کی علامت نہیں تو اور کیا ہیں۔

یہ تھا مختصر جائزہ تاباں کے شعری مجموعوں کا۔ اب آیئے ذرا ان کی شاعری کے کیف و کم پر نظر ڈالیں۔

تاباں اپنے تخلیقی سفر کے آغاز سے ہی ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اس لیے ان کے بنیادی نظریات سے خاص طور پر جن کا تعلق ادب و سماج کے رشتوں سے ہے اثر قبول کرنا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اشتراکی نظریۂ حیات سے بھی ان کی وابستگی (کمٹ منٹ) ہو گئی۔ ایسا کمٹ منٹ منفی اثرات ڈالتا ہے یا مثبت یہ ایک علاحدہ بحث ہے۔ لیکن تاباں کا کمٹ منٹ تاریخی تناظر رکھتا ہے۔ ان کا اعتراف ہے کہ ترقی پسندی ایک نظریہ، ایک اندازِ فکر ہے۔ ایک باشعور فن کار کا جامد نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے تاباں کے شعری نظریے میں ارتقا پذیری نمایاں ہے۔ ان کے کلام میں بہت کسی ڈھلے ڈھلائے فارمولے کی پابند نہیں ہے۔ شاید اسی سبب سے "سازِ لرزاں" پر اپنے میں ڈاکٹر سلامت اللہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ تاباں کہیں کہیں ترقی پسندی کی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔ اچھی شاعری کسی جامد فارمولے کی پابندی کی متحمل ہو بھی نہیں سکتی۔ تاباں کے یہاں عصری حسیت کا خوبصورت پیرایے میں ملتا ہے۔ یہ شعر دیکھیے ؂

خواب یاروں نے بہت دیکھے تھے لیکن تاباں
آج آیا ہے تو ایسے کہ وہی کل سا لگے

ایک غزل جس کا مطلع ہے ؂

منصوبۂ بہار چمن ہو کے رہ گیا
سو بار ذکر سرو و سمن ہو کے رہ گیا

سے آراستہ پوری غزل، آزادیٔ ملک کے بعد کے سیاسی منظر نامہ کا ایک دل کش مرقع ہے۔

ترقی پسند ادبی تحریک کا ایک عام رویہ روایتی اقدار سے انحراف واحتجاج کا تھا۔ اسی لیے چوتھے
پانچویں دہے کے ترقی پسندوں کے یہاں خاص طور پر انحراف واحتجاج کی لے نے کہیں نعرہ بازی کی شا
اختیار کرلی اور کہیں شعلہ نوائی کی حد تک تند وتیز ہوگئی۔ ترقی پسند ادب کی ایسی ہی کاوشیں سنجیدہ تو
ہدف ملامت بنیں۔ لیکن کچھ شعرا ایسے بھی تھے جن کے لہجے میں ایسا اعتدال تھا جسے شعری پیرہن قبول کر
تاباں شعرا کے اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ترقی پسند ادبی سرمایے سے مسلّمہ اقدار سے انحراف کی بے اثر
مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر اختصار کے ساتھ یہاں صرف ایک نمایندہ مثال پر اکتفا کی جاتی ہے۔ مثلاً
ایک جمالیاتی قدر ہے "حُسن ابدی مسرت کا سرچشمہ ہے"۔ اس سے انحراف کی مثال جذبی کی نظم "فطرت ا
مفلس کی نظر میں"، کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی کی نظم "تاج محل" اور تاباں کی نظم "دیو..." میں دیکھیے۔

جذبی کی نظم کا بنیادی تصوّر یہ ہے کہ ایک مفلس کی نظر میں نہ گلزاروں میں کوئی حُسن ہے، نہ پھولا
اور خاروں میں کوئی رعنائی ہے، نہ فطرت کے حسین مناظر اس کے لیے کوئی معنی رکھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں جب جیب میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ ذرہ ہیرا ہے اس وقت یہ قطرہ موتی ہے

تاج محل کے بیان میں کیفی نے نہایت خوبصورت بصری وسماعی پیکر تراشے ہیں مگر تاج کو
جمال میں انھیں مذاقِ تفریق جگمگاتا نظر آتا ہے۔ ان کا ذہن لاشوں کی طرح سڑکوں پر پڑے ہوئے ا
کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ ملکۂ معبودِ مزاج کی آرامگاہ کو دیکھ کر انھیں فرہاد کی قسمت کا خیال آجاتا ہے
نظم ہتھوڑے کی ضرب کے مانند اس شعر پر ختم ہوتی ہے۔

پھیل جائے جو اسی روضے کا سمٹا دامن
کتنے جاں دار جنازوں کو بھی مل جائے مزار

تاج محل پر ساحر کی نظم نقشِ ثانی کی حیثیت رکھتی ہے۔ شاعر اپنے محبوب سے تاج محل کی
رنگیں کی پُرکیف وسحر آگیں فضا میں ملنا روا نہیں رکھتا کیونکہ اس کے خیال میں تاج محل کی راہوں
سطوتِ شاہی کے نشان ثبت ہیں۔ اس کی بنیاد میں شاعر اور اس کے محبوب کے اجداد کا خون ہے
تاج کی صنّاعی اور پُرعظمت جمال کو دیکھ کر وہ احتجاج کرتا ہے ؎

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبّت کا اڑایا ہے مذاق

کچھ اسی قسم کا انحراف تاباں کی نظم "دیوالی" میں ملتا ہے۔ اس نظم میں ان کا لہجہ تند ہوگیا
شاعر کی نظر دیوالی کے خوشنما اور دلکش منظر کی طرف نہیں اُٹھتی، ماحول کی صفائی ستھرائی، اندھ
میں دیپوں کی ضیا پاشی اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک نہیں پہنچاتیں، وہ فرحت بھی محسوس نہیں کرتا بلکہ

مگر۔ یہ رات کی گردن میں دیپ مالائیں
سیاہیوں میں اُجالے کے بدنما دھبّے
غریب حبشی کو جیسے جذام ہوجائے
یہ ٹمٹماتے دیے
یہ ٹمٹماتے دیے صبح کا بدل تو نہیں

خیال کی اسی رَو میں شاعر کا ذہن چین و برما کے محاذوں کی طرف منتقل ہوجاتا ہے جہاں اس کے ایں جواں خون کی بوندیں گر کر میں بن کر نئی صبح کا پیغام لائیں گی۔ اس نظم میں شاعر نے بصری اور لمسی دل سے کام لیا ہے مگر جذام کے تصور نے ان پیکروں کو بدہیئت بنادیا ہے۔ یہاں پر اس بحث کے چھیڑنے کا نہیں ہے کہ جمالیاتی اقدار سے متعلق ان شاعروں کے جذباتی رویّہ میں کتنا خلوص و صداقت ہے۔ خلوص و داقت ہے بھی یا نہیں یا محض ایک روایت کی پیروی ہے۔ یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر ایک واقعہ کا ذکر کرنے چاہتا ہے۔ میرے استاد محترم رشید احمد صدیقی نے کیفی کی نظم کو سن کر فرمایا تھا "مجھے ترقی پسند شاعروں ذوقِ نظر سے محرومی پر ترس آتا ہے۔ یہ تاج محل کے حُسن سے بھی لطف اندوز نہیں ہوسکتے۔"

تاباں کی شاعری میں انحراف کے رویّے میں شدّت نہیں ملتی بجز اس نظم کے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے وبیشتر انحراف و احتجاج کا اظہار اس انداز سے ہوا ہے کہ شعری پیکر مجروح نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ہاری گیت" کے یہ اشعار دیکھیے ؎

اپنے اسلاف کی عظمت کو زمانے کا گلا
شومیِ بخت کا ابنائے وطن کا شکوہ
ڈیڑھ سو سال کی مجہول سیاست کے نقوش
کس طرح اجنبی ہاتھوں نے کیا ہے تاراج
ہر چمن زار، یہ پُرکیف بہاروں کا وطن

ہم جانتے ہیں کہ غزل متفرق اشعار کا گلدستہ ہوتی ہے مگر ردیف و قافیہ غزل کے اشعار کو ایک خارجی ہم آہنگی عطا کرتے ہیں مگر اس میں شاعر کا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ وصف غزل کی ہیئت میں پوشیدہ ہے۔ مگر اچھے شعرا نے کسی خاص موڈ یا کیفیت کے تحت ایسی غزلیں کہی ہیں جو ایک خوش آیند وحدتِ تاثر رکھتی ہیں۔ یہ کوشش کرکے کہی گئی غزل مسلسل سے مختلف ہوتی ہیں۔ تاباں کی اکثر غزلوں میں وحدتِ تاثر ملتا ہے۔ چند خوبصورت غزلوں کے مطلعے یہ ہیں ؎

کوئی کرے گا خطاؤں سے درگذر کب تک   حیاتِ لغزشِ پیہم سہی مگر کب تک

کیا فغانِ شوق پھر صرفِ اثر ہونے لگی	پرسشِ حالات اب تو بیش تر ہونے لگی

سرتا بہ قدم ایک چمن زار کا عالم	اللہ رے اک نقشِ گریزاں کا عالم

کوچۂ شوق رہِ فکر و نظر سے گزرے	نقشِ پا چھوڑ گئے ہم تو جدھر سے گزرے

حیاتِ نرم دھندلکوں میں کھو گئی ہوگی	سوادِ زلف میں اب شام ہو گئی ہوگی

کسی شعری تخلیق کا درجہ متعین کرنے میں تعمیم یا ذوقی و موضوعی طریقۂ کار کے مقابلے میں ا
تجزیہ زیادہ معروضی، معتبر اور کارآمد ہوتا ہے۔ اس تجزیہ میں موضوع سے زیادہ بیان کی اہمیت ہوتی ہ
شناسی اور ان کے خلاقانہ استعمال کی صلاحیت پر نظر ہوتی ہے۔ وجہ ظاہر ہے۔ لفظ ہی معنی ہے اور معنی
ہے۔ لفظ سے باہر معنی کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اسلوبیاتی تجزیہ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ الفاظ کے انتخا
ان کے برتنے میں شاعر کا عمومی رویہ کیا رہا ہے۔ وہ سامنے پڑے ہوئے الفاظ اور فرسودہ تشبیہ وا
سے کام چلا لیتا ہے یا شمس الرحمٰن فاروقی کی لغت کے مطابق جدلیاتی الفاظ کی تلاش و تجسس کرتا ہے
جودتِ فکر سے نئے معنی آفریں مرکبات لفظی خلق کرتا ہے۔ جو شاعر جس حد تک الفاظ کے استعمال میں ا
برتتا ہے، ان کا خلاقانہ استعمال کرتا ہے، الفاظ کی صحیح نشست اور صوتی اثرات سے مرصع محل کے م
آہنگ پیدا کر سکتا ہے اسی حد تک وہ کامیاب تخلیق کار ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ تاباں کے کلام کا ا
تجزیہ کیا جائے تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس معیار پر پرکھنے میں ان کی شاعری کھری اُترے گی۔ انھیں
الفاظ کے انتخاب اور ان کے خلاقانہ استعمال کا ہنر آتا ہے۔

اسلوب کے تجزیہ میں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ شاعر کے یہاں ایسے الفاظ کون سے
جو کلیدی حیثیت رکھتے ہیں جن کی تکرار شاعر کے یہاں زیادہ ملتی ہے اور جن سے شاعر جہانِ معن
کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک لفظ دشت کو لیجیے۔ غالب کے یہاں اس لفظ سے
ایک دفترِ امکاں کھل جاتا ہے۔ شاعر کے شاداب اور تازہ کار تخیل نے اس لفظ سے جو نقش و نگار بنا
اور متوالی تراکیب کے ذریعہ جیسے خوب صورت اور معنی آفرینی شعری پیکر تراشے ہیں ان کی مثال اُردو شا
نہیں ملتی۔ تاباں کے یہاں ایسا ہی ایک کلیدی لفظ شوق ہے۔ لفظ عشق کا استعمال تاباں کے یہاں
ہے۔ لفظ شوق اور اس کے انسلاکات کا استعمال زیادہ کیا ہے اور بڑی نزاکت اور دل آویزی
معنی خیز تراکیب کے ذریعہ ایسے شعری پیکر تراشے ہیں جو ہمارے حواسِ خمسہ کو متاثر کرتے ہیں۔ اس تخلیق
میں انھوں نے کسی بڑے شاعر کی تقلید نہیں کی، اپنی راہ خود نکالی ہے۔ شوق کے انسلاکات اپنی معنوی ا

ہیں محبت، آرزو، تمنّا، حسرت، پیمانِ وفا، وحشت، دشت، سراب، بیاباں، تشنگی، صحرا، گل و خار، آبلہ پائی، آشفتہ سری، جیب و گریباں، رہگذر، سفر، گردِ سفر، منزل، غبارِ منزل جیسے الفاظ کو ورت لڑیوں میں پروتے ہوئے جہانِ معنی آباد کیے ہوئے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

شوق نارسا میرا، عشق معتبر میرا — دورِ کم عیاری ہے کچھ پتا نہیں چلتا

طلسمِ بزم، فسونِ جمال، سحرِ شباب — نگاہِ شوق کا دامن گلوں سے بھر تو گیا

ہوس کو جلوۂ بارِ دگر کا شوق سہی — نظر کو فرصتِ بارِ دگر ملے نہ ملے

مزہ تو جب ہے کہ آوارگانِ شوق کے ساتھ — غبار بن کے چلے اور رہگذر گم ہو

تشنہ کاموں کو خبر دو کہ مرے ساقی نے — مے کدہ کھول دیا گلشنِ مژگاں کے قریب

گو میں بیاباں کے تشنگی بھی ہوتی ہے — دور تک سرابوں کے سلسلے بھی ہوتے ہیں

تاباں نے روایتی ادبی علامات کا استعمال بہت کم کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بیشتر مروجہ ت کثرتِ استعمال کے سبب اپنی علامتی معنویت کھو چکی ہیں۔ تاہم دیر و حرم، مسجد و مندر، مے خانہ، واعظ الفاظ کہیں کہیں ملتے ہیں۔ ان کا استعمال بالعموم روایتی انداز سے ہوا ہے۔ شوخیِ بیان سے بعض پُرلطف ضرور ہو گئے ہیں۔ چند مذہبی تلمیحات جو ادب میں بطورِ علامت رائج ہیں، بڑی خوبی سے استعمال ہیں۔ چند مثالیں:

اب اس کے آگے وہ مسجد ہے کہ مے کدہ تاباں — یہاں تلک تو کسی پارسا کا ساتھ دیا

تاباں شراب خانے میں کچھ روشنی تو ہے — مسجد بھی سو گئی ہے شوالا بھی سو گیا

دستِ عیسیٰ بھی وہی بازوئے قاتل بھی وہی — کتنا نازک ہے چراغوں سے ہوا کا رشتہ

تاباں عتابِ ناز سے دل کا معاملہ — اک حادثہ پھر آج سرِ طور ہو گیا

میں کہ جس راہ سے گزروں وہ بنے راہِ صلیب　　تو کہ جس چیز کو چھو لے بُتِ مریم بن جائے

تاباں کے کلام کی ایک خصوصیت فکر و نظر کا حسین امتزاج ہے۔ انھوں نے اپنے کلام سے نہایت شا
و شگفتہ بزمِ سخن آراستہ کی ہے جسنِ خیال اور حسنِ بیان نے شیر و شکر ہو کر رنگ و آہنگ اور کیف و انبساط
آئیند فضا پیدا کر دی ہے۔ اس فضا میں وارفتگی و سرشاری کی کیفیت تو نہیں ہے مگر شدتِ احساس ضرور
اس فضا میں قاری کو گھٹن، پستی اور دل گرفتگی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ قلب و نظر کی کشادگی اور طہ
محسوس کرتا ہے۔ تاباں اعلا اقدارِ حیات کا احترام کرتے ہیں۔ ادب میں اقدار کے مسئلے سے بحث کرتے
سرور صاحب نے ایک کتاب FUTURE OF THE VALUES کے حوالے سے دو قسم کی اقدار کا ذکر کیا ہے
وہ جو اوپر لے جانے والی ہوتی ہیں، دوسری وہ جو نیچے لے جانے والی تاباں کی شاعری میں ہمیں اوپر لے
والی قدریں ملتی ہیں۔ یہ ہمیں انسانی عظمت، انسان دوستی، عالی ظرفی، خودداری، ذہنی کشادگی اور زند
طرف اثباتی رویّہ کا احساس دلاتی ہیں۔ تاباں ان اقدار کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے مگر ان کے کلام میں ان ا
رو محسوس کی جا سکتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تاباں جبیں پہ کج ہی رہی بانکپن کے ساتھ　　کانٹوں کا زندگی نے پنھایا ہمیں جو تاج

یہ دور دورِ سعادت ہے آدمی کے لیے　　کہ ایک خاک نشیں بامِ عرش پر جائے

شیشۂ نازک ہے ذرا ٹھیس لگی، ٹوٹ گیا　　حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں گلہ کیا کرتے

وحشت سے عیشِ فراواں کا تقاضا ہے کسے　　سر چھپانے کے لیے کوئی شجر تو ہوگا

غریب جلتا رہا ہے ہوا کی راہوں میں　　یہ دل چراغِ حرم ہے، نہ شمعِ بت خانہ

ایک نارمل انسان کی طرح تاباں کی زندگی بھی مختلف نشیب و فراز اور پیچ و خم سے گزری اور تلخ و شیر
تجربات کا ذائقہ چکھا۔ شاعر کے دل و دماغ پر ان کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ زندگی کے اس سفر
بے یقینی، تشکیک اور مایوسی کے لمحات بھی آئے اور حوصلہ افزا مقامات بھی جہاں سے شاعر نے زندگی کی عظ
اور آب و تاب کا مشاہدہ کیا اور پھر ایک نئی رجائیت، عزم و حوصلہ اور امید و یقین کے ساتھ اپنی منزل
جانب سرگرم سفر ہو گیا۔ ان تمام کیفیات کا بھرپور احساس شاعر کے یہاں ملتا ہے۔ نمونے کے چند اش
پیش ہیں ؎

میرا احساس ابھی تک ہے تذبذب کا شکار　　ایک بے ربط سے ماحول کا آئینہ دار

پھر یوں ہوا کہ پھول کھلے دل کے آس پاس ایسا لگا کہ دشت چمن زار ہوگیا

منزلوں سے بے گانہ آج بھی سفر میرا رات بے سحر میری، درد بے اثر میرا

خوشا یہ عشق کی تہذیب، شوق کے آداب کہ ہر شکست کو عنوان آرزو جانا

تاباں ہے زندگی کی ہمیں ہر ادا عزیز محرومیوں کا رنج نہ بربادیوں کا غم

اس وقت تو شاعر کی منزل مقصود غبار کے دھندلکے میں گم ہے لیکن شاعر نے امید و یقین کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ تاباں نے "غبار منزل" کا انتساب ان الفاظ میں کیا ہے:

"انسان کے روشن مستقبل کے نام

جسے

میں نہ سہی میرے بعد آنے والی نسلیں ضرور دیکھیں گی"

انتساب لکھتے وقت شاعر کے تحت الشعور میں فیض کا یہ شعر ضرور گونج رہا ہوگا:

نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
بڑھے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
کی اہم کتابیں

پہچان اور پرکھ — پروفیسر آل احمد سرور

اس مجموعے میں پروفیسر آل احمد سرور کے جو مضامین شامل ہیں ان کا تعلق زیادہ تر شاعروں اور شاعری کی خصوصیات سے ہے میر، غالب، انیس، حسرت، فانی، جوش اور فراق کی شخصیات اور شاعری پر بھرپور مضامین کا اہم مجموعہ۔ قیمت : ۵۱/-

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیم
ڈاکٹر سلامت اللہ

اس کتاب میں مسلمانوں کی تعلیم کے جن مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے وہ مصنف کے نزدیک سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے کہ اس کے تاریخی اور حالیہ شواہد موجود ہیں۔ ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کی اہم ترین تصنیف۔
قیمت : ۵۱/-

اقبال کا نظریۂ خودی — عبد المغنی

اس کتاب میں نظریۂ خودی کو مرکزی نقطہ فرض کر کے اقبال کے پورے نظام فکر کی تلاش کی گئی ہے تاکہ ایک طرف دنیا کی سب سے بڑی شاعری کی حقیقی جہت واضح ہو اور دوسری طرف آج کی انسانیت کو اپنے ارتقا کی صحیح سمت دریافت کرنے میں سہولت ہو۔ قیمت : ۱۵۰/-

پت جھڑ کی آواز — قرۃ العین حیدر

برصغیر کی ممتاز ترین افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کی اہم کہانیوں کا مجموعہ۔ یہ کہانیاں دلچسپ بھی ہیں اور زندگی کی صحیح عکاسی بھی کرتی ہیں۔ نیا اڈیشن قیمت : ۷۵/-

جدید افسانہ اور اس کے مسائل — وارث علوی

اردو کے ممتاز نقاد وارث علوی کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ جدید اردو افسانہ کے متعلق ایک اہم دستاویز۔ قیمت : ۳۶/-

لکھنؤ تہذیب کا نمائندہ شاعر

قلندر بخش جرأت (خطبہ) — جمیل جالبی

اردو کے نامور عالم اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی کا ایک نہایت اہم خطبہ جو موصوف نے ۸ رنومبر ۱۹۸۹ء کو ڈاکٹر سید عابد حسین میموریل ٹرسٹ کے سیمنار میں پیش کیا۔
قیمت : ۱۰/-

غبارِ منزل (شعری مجموعہ) — غلام ربانی تاباں

اردو کے ممتاز شاعر جناب غلام ربانی تاباں کی غزلوں، نظموں اور قطعات کا تازہ مجموعہ جس میں سازِ لرزاں "ذوق سفر" اور "نوائے آوارہ" کا انتخاب بھی شامل ہے۔ قیمت : ۴۵/-

تاریخ اودھ — قاسم علی نیشاپوری

"تاریخ اودھ" معروف بہ "تاریخ شاہیہ نیشاپوریہ" اودھ کی اہم تاریخ ہے۔ قاسم علی نیشاپوری نے اسے فارسی میں لکھا تھا ڈاکٹر شاہ عبد السلام نے نہایت محنت سے اس کو اردو کا جامہ پہنایا۔ قیمت : ۲۷/-

فی الحقیقت — یوسف ناظم

طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں یوسف ناظم کو ایک مقام حاصل ہے۔ ان کی تحریریں نہایت ذوق شوق اور توجہ سے پڑھی جاتی ہیں۔ "فی الحقیقت" ان کے تازہ ترین طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔
قیمت : ۴۵/-

اکٹر محمد حسن
بسرچ ایسوسیٹ
بۂ فارسی، بہار یونی ورسٹی، مظفر پور

نیما یوشیج ۔ شاعر انقلاب

انیسویں صدی کے آخر تک ایشیا کے مختلف ممالک ۔ کے ہمدوش ایران میں بھی مغربی
ج کے خلاف انقلابی تحریک پیدا ہو چکی تھی ۔ اس تحریک کا نصب العین ملک کو مغرب کی
مالی کارروائیوں سے نجات دلانا تھا. ردِ عمل کے طور پر مشروطیت کا قیام عمل میں آیا۔ ساتھ
جدید فارسی ادب وجود پذیر ہوا۔ اور قومیت ۔ کے نئے احساس کی بدولت " عام انسان" کے
سے سماج روشناس ہوا۔ اس انقلاب کو فارسی شعرا نے بہت زیادہ تقویت دی. اور
شاعری کو نئی اقدار سے روشناس کرایا۔ چنانچہ دورِ حاضر کی فارسی شاعری قدیم اور جدید
یزش اور انفرادی و اجتماعی اقدار کے بدلتے ہوئے ماحول کی عکاس ہے۔ جدید فارسی شاعری
م شعرا کے دو بڑے طبقوں سے روشناس ہوتے ہیں ۔ ایک طبقہ میں وہ شعرا ہیں جن کی نظریں پرانے
ب شاعری کے موجودہ تقاضوں کو پورا کرنے کے اہل ہیں ۔ اس طبقے میں ملک الشعرا بہار،
ن اعتصامی، عارف قزوینی، لاہوتی، حبیب یغمائی، لطف علی صورتگر، محمد حسین مصیری اور شہریار
م قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا نے قدیم ہیئتوں کو قائم رکھتے ہوئے نئی دنیا کے تقاضوں کو پورا
ے۔ یعنی سیاسی اور سماجی ادراکات کی ترجمانی کی ہے ۔ دوسرے طبقے کے شعرا موضوع
یلی کے ساتھ ساتھ ہیئت کی بھی نمایاں تبدیلی کے خواہاں ہیں ۔ انھوں نے نئے اور رنگارنگ
ۂ قالب پر تجربے کیے ہیں۔ اور وزن و قافیہ سے آزاد شاعری کی وکالت کی ہے۔ شعری
کو توڑنے کی مختلف شکلیں اختیار کی ہیں ۔ جس کے نتیجہ میں مختلف شاخیں پیدا ہو گئی ہیں۔
شاخ کے حامی شعرا نے مصرع چھوٹے بڑے کیے لیکن عروض و اوزان کا خیال رکھا
ی شاخ کے شعرا نے عروض و اوزان کی پابندی کا خیال نہ رکھا لیکن شعرا کے آہنگ
کا خیال ضرور رکھا۔ اب ایک تیسری شاخ (موج شعر نو کے حامی شعرا کی) بھی
ہو گئی ہے۔ جس نے آہنگ سے بھی پیچھا چھڑا لیا ۔ پہلی اور دوسری شاخ کے شعراء
" شعر نو" کے حامی کہلاتے ہیں۔ جس کے میر کارواں نیما یوشیج ہیں ۔

علی اسفندیاری نیما یوشیج (۱۸۹۷ - ۱۹۵۹) قصبۂ مازندران کے ایک دور افتادہ دیہات
" میں پیدا ہوا ۔ جہاں اس کی ابتدائی تعلیم ہوئی ۔ پھر اعلا تعلیم کے لیے تہران آ گیا ۔ یہاں

اس نے فرانسیسی زبان میں مہارت حاصل کی۔ فرانسیسی زبان میں مہارت اور یورپین شو
کے تعارف سے اس کے اس خیال کو تقویت ہوئی کہ فارسی شاعری میں تبدیلی لانے کی ضرو
ہے۔ چنانچہ اس نے ایک مخصوص انداز بیان بلکہ ایک نئے مکتب شعری کی بنیاد ڈالی جو سبک
یا نیمائی اسلوب کے نام سے مشہور ہے۔ فارسی میں غیر مقفیٰ اور آزاد نظم کو رواج دینے میں
وہ پیش پیش رہا ہے، "جیساکہ مہدی اخوان ثالث "شعرنو" کی حقیقی تاریخ پیدائش سے
متعلق کیے گئے سوال کے جواب میں نطق پرداز ہیں کہ درحقیقت "شعرنو" فارسی زبان میں
اس وقت پیدا ہوا جبکہ نیمایوشیج نے شعرگوئی شروع کی اور شعری قالب میں تغیر و تبد
کی خواہش کو عملی جامہ پہنایا۔ اس سلسلے میں موصوف کی درج ذیل عبارت ملاحظہ کریں

"با اطمینان قاطع ویقین می گویم کہ شعرنو راستین زبان فارسی از وقتی پیدا شد کہ نیم
یوشیج بسرودن شعر کرد و بفکر تغیر و تحول افتاد و فکرش را ہم عملی کرد...... بہرحال
از قیود رانیما بوجود آورد و راہ را نشان داد' بی بیع شکی عہ۲

اس تمہید کے بعد اب حسب موضوع نیمایوشیج کو ایک انقلابی شاعر کی حیثیت سے
پیش کیا جاتا ہے۔ گر پسند افتد زہے عز و شرف "نیما نے اپنی زندگی کے تقریباً چالیس
رضا شاہ پہلوی کے دور میں گذارے۔ یہ زمانہ پہلوی حکومت کا شرمناک زمانہ ہے۔ بلا
نیما ان چند شاعروں میں ہے جنھوں نے اپنی زندگی کے تمام لمحات اس خاندان کے زوال
آرزو میں صرف کیے عہ۳۔ اس موقف میں وہ اپنے ماحول کے ساتھ ہمیشہ برسرپیکار رہا۔ ا
کے ہنر کا انقلابی پہلو اس کی شاعری کے آسمان کا تازہ افق ہماری آنکھوں کے سامنے
کرتا ہے۔ اس کی تخلیقات کا اہم ترین پہلو استبدادی اور استعماری ماحول کے س
نبرد آزمائی میں مضمر ہے۔ اس کی ابتدائی منظومات کا تعلق ایرانیوں کی استبدادی حکو
کے خلاف تحریک کے عروج سے ہے۔ یہ تحریک رضا شاہ پہلوی کے خود غرضانہ رویوں
ردِعمل کے نتیجے میں رونما ہوئی۔ ان دنوں انگریزی امپریالیزم ایران میں اپنی بنیاد مست
کرنے میں سرگرم تھی۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے رضا شاہ کا انتخاب کیا
تاکہ وہ ملک کے گوشہ وکنار میں رونما ہونے والی "ضد استبدادی" یا "اسلامی تحریک" کو خ
کرے۔ اور خود استبدادی رویوں کی بنیاد ڈالے۔ نیما کی مشہور نظم "افسانہ" اسی سال
میں آئی۔ "افسانہ سے پہلے "قصۂ رنگ پریدہ" اور "ای شب" سے ہی اس کے انقلابی رجحا
کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ "قصۂ رنگ پریدہ" اس کی پہلی کوشش ہے۔ اور اسی سے اس کی آ
شاعری کے خدوخال واضح ہونے لگتے ہیں۔ اس کے پاس زدہ رومانوی کیفیت میں درد و

عہ۱ عصری فارسی شاعری و شعراء۔ از سید احسن الظفر صفحہ ۱۸۵

عہ۲ "از این اوستا" صفحہ ۳۸ انتشارات مروارید تہران

عہ۳ کیہان فرہنگی۔ خیابان فردوسی تہران صفحہ ۲۰ شمارہ ۔ ۸

ا تصور ملتا ہے جو انیسویں صدی کے یورپین ادب میں کارفرما تھا۔ اس کا موضوع اپنے
ر کی سماجی خرابیاں، آزادیٔ رائے پر پابندی اور شہری حقوق کی پامالی ہے۔ نیما کی نظم "قصۂ
ب پریدہ" ایک باشعور نوجوان کا قصہ بیان کرتی ہے۔ جو عوام اور غربا کی کشمکش زیست
امی اور ان کے حقوق کا پاسدار ہے۔[۲] "ای شب" جدید فارسی شاعری میں سب سے پہلی مثال ہے
س میں جذبے اور منظر کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔" "افسانہ" کے متعلق
ا کے شاگرد نادر نادرپور نے لکھا ہے۔ "افسانہ" نے مشروطیت کے بعد شاعری کی سرنوشت
ا بدل ڈالی۔" "افسانہ" کے درج ذیل اشعار میں انقلابی پہلو ملاحظہ کریں۔

هرکجا فتنهٔ بود شب کین — مردمی مردمی کرده نابود
برسر کوهها کپاچین — نقطهٔ سوخت در پیکر دود
طفل بیتابی آمد بدنیا

نیما نے "محبس" کو خارجی ترجمانی کا موضوع بنایا ہے۔ اور سماج کے جور و ستم اور ظلم
نا انصافی پر رائے زنی کی ہے۔ قرین قیاس ہے کہ اس کی تخلیق کے وقت شاعر کے ذہنی
س منظر میں اس عہد کے ایران کے حالات رہے ہوں۔ جن سے وہ دو چار تھا۔ یہاں
ید خانہ علامت ہے۔ اس کے وطن کی جہاں انسان اسارت اور بدبختی کی زندگی بسر کرنے پر
بور تھا۔ "خانوادۂ سرباز" میں بھی "محبس" کی طرح شاعر نے خارجی حالات اور
شاہدات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ ان کی پہلی چند نظموں میں سے ہے جو لڑائی سے متعلق
فارسی شاعری میں تحریر ہوئیں۔ اس نظم میں نیما نے ایک غریب عورت کی دل انگیز کیفیات
کا موثر خاکہ کھینچا ہے۔ جس کا شوہر میدان کارزار میں گیا ہوا ہے۔ اور وہ اپنے بچوں کے
ساتھ عسرت اور فاقہ کشی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

شاعری میں وزن و قافیہ کی اہمیت سے نیما کو انکار نہ تھا۔ وہ وزن کو لباس سے تعبیر
کرتا ہے۔ اور قافیہ کے بغیر تو اس کے خیال میں شاعری بے استخوان شخص کی مثال ہے۔ لیکن وہ
س بات کے خلاف تھا کہ وزن و قافیہ شاعر کی رہبری کریں۔ بجائے اس کے کہ شاعر خود اشعار
آہنگ متعین کرے۔ نہ صرف یہ کہ شاعری کی ہیئت بدلنے میں نیما یوشیج نے پیش قدمی کی
ہے بلکہ خارجی دنیا سے اس کے فنی رشتے زیادہ مضبوط ہو گئے ہیں۔

تازه مرده است زنم
گرسنه مانده دو تهائی بچه هام
نیست در کپه مامشت برنج
بکنم با چه زبانشان آرام؟ (کار شب پا)

---

[۱] جدید فارسی شاعری رحمٰن صفحہ نمبر ۵۸
[۲] قلم، بمبئی کتاب ۵ صفحہ ۲۲

"ای آدمہا"، نیما کی ایک مشہور نظم ہے۔ جو بحر رمل میں ہے۔ لیکن ہر مصرع کامل طور سے ارکان شعر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے۔ مصرعوں کی کوتاہی اور بلندی کے مطابق ارکان ٹوٹتے رہتے ہیں۔ یہ نظم موضوع و ہیئت میں انقلاب آفرینی کی نمایاں ترین مثال ہے۔ یہ ایک ایسے آدمی یا کچھ لوگوں کی فریاد ہے جو مسموم زہریلی سوسائٹی کے دریا میں غرق ہو کر ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ اور آسودہ حال ساحل نشینوں کو آواز دے رہے ہیں۔ جن کے پاس عمدہ فرش ہے۔ جن کے دسترخوان پر روٹیاں ہیں۔ لیکن اس فریاد کا کوئی ردِّ عمل نہیں۔

نیما رضا شاہی دور میں "جغدی پیر" کی مانند ہے۔ جو "شب فرق" میں تماشا کرنے بیٹھا ہے۔

..... این زمان بالش در خوشش فرو
جغد بر سنگ نشسته است خموش
هیس! مبادا سخن! جغدی پیر
پای در قیر، به ره دارد گوش.....

نیما ظلم و استبداد کی تاریک راتوں میں ناامید گوشہ نشین نہیں ہے کہ خواب زمستانی کا مزہ لے بلکہ ایک بیدار دل فنکار بلکہ مجاہد ہے، جو عقل و دانائی کی مشعل فروزاں لیے ہوئے صبح بیداری کا منتظر ہے۔

در ساحت دہلیز سرای من و تو
مرد لیست نشستہ از بر ش مشعل نور
روزان و شبان وی از برای من و تو
در بر بگشادہ نقشہ ای زین شب دور.......

نیما اس نقطہ سے اچھی طرح واقف ہے کہ اگر ایران کے تمام مظلوموں اور ستم زدوں کی صفیں باہم آراستہ ہو جائیں تو استبدادی حکومت کی بنیادیں متزلزل ہو جائیں گی "شب فرق" کی دربندی سے نجات مل جائے گی۔

دست برادر زروی دیوار
شب فرق باشد بیمارستان
اگر از خواب برآید بیمار
کرد خواہند کاری کارستان

(شب فرق)

نیما یوشیج کی شاعرانہ عظمت اور اس کے فن کی انفرادیت کے نقوش مظلوم عوام کی ظلم و استبداد کے خلاف پیہم جہد و پیکار میں نمایاں ہے۔ اس نے اپنے انقلابی نظریات اور فن پاروں کے ذریعہ نہ صرف اپنے عہد کے مظلوم ایرانی سماج کی وکالت کی بلکہ ہر ظلم رسیدہ

کے خلاف نبرد آزما ہونے میں انتہائی ہمت اور پامردی کا ثبوت پیش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ نیما کی آواز اس عہد کے سیاسی انتشار میں ایک انقلاب آفریں نغمہ ثابت ہوئی۔ حقیقی شاعر وہ ہے جو باوجود تمام مخالف حالات کے قلمی جہاد کا علم بلند رکھتا ہے۔ اور ظالموں کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ امید کا پیغامبر ثابت ہوتا ہے۔ نیما ایسا ہی شاعر ہے جو پہلوی خفقان کے زمانے میں امید کا نغمہ اس طرح الاپتا ہے۔

..... او بانوای گرمش دارد
حرفی کہ می دہد ہمہ را با ہمہ نشان،
تا با ہم آورد
دل ہای خستہ را
دل بردہ است و ہوش ز مردم کشان کشان
واندر نہاد آنان
جان می دہد بہ قوت جان نوای خود.....
(ناقوس)

نیما نے اس احساس کے ساتھ کہ دور مذکورہ کے واقعات و حالات کی حسین عکاسی روایتی شاعری کے قالب میں ممکن نہیں، ایک نئے شعری پیکر کے ایجاد کی ضرورت محسوس کی۔ ابتدا میں اس نے عارف، ایرج، اور بہار کی طرح عصری مسائل کو روایتی شاعری کے قالب میں ہی پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن رفتہ رفتہ جدید موضوعات اور عصری مسائل کی ترجمانی کے لیے اس نے روایتی شاعری سے منہ موڑ کر نئے قالب کو فکر و فن کی جولانگاہ بنایا۔ شاعری کے مروجہ اصولوں سے ہٹ کر اس نے نئے نئے ہیئتی تجربات کیے۔ اس کی شاعری سے فارسی شاعری کی ہیت اور قالب میں ایک حیرت انگیز انقلاب رونما ہوا۔ روایت سے بغاوت کوئی آسان کام نہ تھا۔ نیما کو اس کے بدلے طبقۂ خواص اور امرا کے غیض و غضب اور شیب و ستم کا نشانہ بننا پڑا لیکن اس مخالفت کی پروا کیے بغیر وہ اپنے فن کو اپنے قیمتی تجربات سے مالا مال کرتا رہا کیونکہ اس کا عقیدہ تھا۔

"در ہند آنکہ دست بر کاری تازہ می زند، مقامی نظیر مقام شہادت را می پذیرد" ۱۰

بر ساختہ ام نہادہ کوری
انگشت کہ عیب است با آن
دارد بہ عتاب کور دیگر
پرسش کہ چرا است این چرا آن!
....

---

۱۰ کیہان فرہنگی شمارہ ۹ ص ۲۱

ویگو نہ بہ خشت می نہم خشت
در خانہ کور دیدگانی
تا از تف آفتاب فردا
بنشانمشان بہ سایبانی

جدید فارسی شاعری کی طرح ریزی کا مقصد خطابی اور توصیفی شاعری کی فراہمی ہے۔ اور اوزان کی بنیاد آسان قواعد پر ہے۔ تاکہ معانی کے ابلاغ و ترسیل میں زیادہ سے زیادہ افراد شریک ہوں۔

نیما کی شاعری افسردہ دلوں کی پکار ہے۔ نہ کہ نام و نمود کے تمنائی کی آواز لیکن اس کی شاعری میں آہنگروں کے ہتھوڑے کی ضرب کاری ہے۔ غلاموں کے زنجیر کی صدا ہے۔ فریاد ای آدمہا ہے۔ بلکہ دعائے نجات ہے۔ اس نے انقلاب کو روشنی کی مانند اپنی آنکھوں کے سامنے عیاں دیکھا اور اس کی آواز کو دور دست سے سنائی دینے والی آواز دریا کی طرح سنا۔ اس کا کلام دنیا کے مظلوموں کا مظلوموں کے نام پیغام ہے۔ نیما کی شاعری ایسا پیام ہے جو دنیا کے جابرانہ نظام کو درہم برہم کرنے کی بشارت دیتا ہے۔ یہ بشارت اور نوید اس کی نظموں میں سطر بہ سطر دیکھی جا سکتی ہے۔

ناقوس دلنواز
جا بردہ گرم در دل سرد سحر بہ ناز
آوای او بہ ہر طرفی راہ می برد
....
در ہر کجا کہ مردہ باداغی ست
یا دل فسردہ ماندہ چراغی ست
تاثیر می کند

نیما کے اشعار کے مطالعہ سے ایک دوسرا نکتہ یہ واضح ہوتا ہے کہ ایمان و پرہیز گاری کے کوہ باشکوہ حضرت علیؓ سے اس کی شدید وابستگی ہے۔ وہ جس طرح ناساز گار زمانے میں اصحاب سیم و زر اور مطلب پرستوں کے سامنے اپنے شدید غم و غصّے کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے برعکس نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ حضرت علیؓ کے آستانے پر بھی سجدہ ریز ہوتا ہے۔ ایک بیدار روایت شکن ہونے کے باوصف نہایت ہوشیاری کے ساتھ ہزار سالہ قدیم روایت کا لحاظ کرتے ہوئے خاندان اہلبیت کی مدح سے فارسی شاعری کو رونق افروز کرتا ہے۔ اسلامی افکار و خیالات جو چند قصائد قطعات اور رباعیات میں پیش کیے گئے ہیں۔ نیما کی شہرت و عظمت کے شئون نہیں ہیں۔ بلکہ اس کی شہرت اور عظمت میں اس کے اسلوب بیان اور جدت طرازی کا خاصا دخل ہے۔

پیش نظر مقالہ میں میں نے نیما کو ایک شاعر انقلاب کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ البتہ اس

ہیں اور بہت سی باتیں آگئی ہیں۔ جن سے اس کی دیگر شاعرانہ خصوصیات کی بھی وضاحت
ہے ۔ اب آخر میں منوچہر آرین پور کے مضمون، جدید ایرانی ادبیات" کا ایک اقتباس
پیش کیا جاتا ہے ۔ جس سے نیما کی شاعری کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی بخوبی وضاحت
ہے۔

"یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ "شعر نو" کے ارتقا میں نیما کا کتنا دخل ہے لیکن
یہ حقیقت ہے کہ نئے شعرا کی ایک بڑی تعداد روایتی شاعری سے اپنا رشتہ
توڑ کر نیما ہی سے بصیرت اور فیضان حاصل کرتی ہے ۔ پھر اگرچہ تمام لکھنے
والے انھیں راہوں پر گامزن نہیں جو نیما نے بنائی ہیں لیکن نئی ہیئتوں
کی تشکیل و توسیع میں اس کی جراُت و استقلال شمع راہ ضرور رہے اور واقعہ یہ
ہے کہ "شعر نو" کے فنکار اُسے جدید شاعری کا مقتدی تسلیم کرتے ہیں" ۱۰۔

مختصر یہ کہ نیما موضوع اور ہیئت دونوں لحاظ سے ایک کامیاب انقلابی شاعر ہے جس نے
شاعری کو ایک نئی جہت عطا کی ہے ۔ اور جدید فارسی شعرا کی آیندہ نسل کو بے حد متاثر
ہے ۔ لیکن صد افسوس کہ نیما یوشیج جیسی شخصیت ایران میں وجود پذیر ہو، زندگی گزارے
اپنے اشعار کے ذریعہ ایک عظیم، عمیق، اساسی، سودمند اور لازم انقلاب سے شعر فارسی کو
ے اور اس کے انتقال کے بعد ابھی تک افغانستان، ہندوستان میں اس کے مقام اور اسلوب
شایانِ شان بحث و تحقیق کی مجلس کا انعقاد نہ ہو۔

کتاب نما
ڈاکٹر مجیب الاسلام
مکان نمبر ۴۳، کیا بیان اسٹریٹ
جامع مسجد دہلی ۶۔

دوسرا شجر۔ ایک بھولی بسری طویل نظم

آج سے تقریباً بیس بائیس سال قبل ایک شعری کتاب منظر عام پر آئی تھی یہ شجاع
کی اوّلین تخلیق، طویل نظم "دوسرا شجر" تھی۔ اس کتاب کی اشاعت کے برسوں بعد گز
چند برسوں میں شجاع خاور کے قلم نے روانی کا وہ جوہر پیش کیا جو ہمارے عہد کے
شعرا کو میسّر آیا۔ اس میں فکر کا سفر نمایاں ہے۔ شجاع خاور صاحب طرز غزل گو ہیں
کم اہم نہیں ہے لیکن ان کی پہلی شعری کتاب چھ سو سے زائد مصرعوں والی طویل
نظم تھی۔ یہی نہیں متذکرہ بالا کلام میں نظم کی تینوں مروجہ ہئیتیں (پابند۔ معرّیٰ اور
اور) آٹھ مختلف بحریں و اوزان استعمال کیے گئے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں یہ طویل نظم منظر
آئی۔ پروفیسر انور صدیقی نے جو اس وقت لکچرار تھے اس غیر معمولی نظم پر (غیر معمولی ا
لیے کہ شجاع خاور اس وقت ایک مبتدی شاعر تھے اور عرف عام میں ایسے شاعر
قسم کی مہارت کی توقع نہیں کی جا سکتی) اپنے ایک تنقیدی مضمون میں لکھا:

"زوال آدم کے واقعے سے اس نظم کی ابتدا ہوتی ہے مگر یہ زوال شجاع خاور
کی نظر میں زوال نہیں، آگہی اور متوازی یا متبادل جنت کی تخلیق کا دوسرا
نام ہے۔ ...... اس کے بعد انسان اور خدا کے درمیان یہ خوب صورت
مکالمہ شروع ہوا جسے شجاع خاور نے مکالمہ سے زیادہ مقابلہ بنا دیا ہے!
بعض مغربی فلسفیوں نے بھی اس زوال کو FORTUNATE FALL کا نام
دیا ہے۔ غالباً اس خیال نے شجاع خاور کی نظم کی معنوی منطق کا تعین
کیا ہے۔ اور ان سے قدرے بلند آہنگ شاعری کرائی ہے۔"

انور صدیقی عصری ادب۔

دوسرا شجر پر انور صدیقی کے اس مضمون کی تلخیص ڈاکٹر محمد حسن نے عصری اد
۲ اپریل ۱۹۷۰ء کے شمارے میں تبصرے کی شکل میں شائع کی تھی۔ یہ بات
قابل ذکر ہے کہ شجاع خاور کی تخلیق کے اس وقت کے مبصروں میں شمس الرحمٰن فار
بھی تھے۔ جنھوں نے "شب خون" میں اس شعری کتاب پر ایک تبصرہ خود کیا تھا۔

جیسے سخت گیر نقاد نے آج سے بیس سال پہلے اس وقت کے شجاع خاور کے زوربیان کا احساس کرتے ہوئے اور نظم کے کئی مصرعے نقل کرتے ہوئے یوں اعتراف کیا تھا۔

"اس شاعری میں ظاہری طمطراق ہے لیکن کوئی اصل بات نہیں، اگر غیر ضروری لیکن ظاہری چمک دمک سے مملو مصرعے نکال دیے جائیں تو نظم بہتر ہو سکتی ہے" شب خون اگست ۱۹۷۲ء۔

ایک پرانے کتاب نما میں شجاع خاور کی اس نظم پر شائع شدہ تبصرے کے یہ الفاظ بھی قابل ذکر ہیں۔

"نظم میں آدم اور خالق کائنات کا مکالمہ زوردار اور آرٹ کی خوبی لیے ہوئے ہے" کتاب نما اگست ۱۹۷۰ء

ماہنامہ آجکل میں دوسرا شجر پر تبصرہ کے یہ الفاظ بھی قابل حوالہ ہیں۔

"زیر نظر تخلیق میں کسی حد تک "شکوہ جواب شکوہ" کا انداز پایا جاتا ہے۔" آجکل اکتوبر ۱۹۷۰ء

یہ سب تاریخی حوالے دلچسپ تو ہیں ہی اس لیے بھی ضروری ہیں کہ شجاع خاور کی پہلی شعری تخلیق غزلوں کا مجموعہ نہیں بلکہ طویل نظم "دوسرا شجر" تھی جو انھوں نے ۱۹۶۸ء میں بعمر ۲۰ سال تخلیق کی تھی گو اس سے قبل کچھ غزلیں اور نظمیں "پیام مشرق دہلی" "صبح نو پٹنہ" "آجکل دہلی" اور "سب رس" حیدرآباد" وغیرہ میں شائع ہو چکی تھیں شعرگوئی خصوصاً نظم نگاری کے ابتدائی دور میں اتنی پختگی کی مثالیں خال خال ہی ہوں گی۔ ذیل میں نظم "دوسرا شجر" کے بنیادی خیال پر سیر حاصل تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

عام اسلامی عقیدے کے مطابق یہ دانۂ گندم تھا جسے نہ چھونے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اور اس کی خلاف ورزی پر آدم کو جنت سے نکالا گیا تھا۔

شجاع خاور نے اسلامی عقیدے کے بجائے مسیحی یقین کی بنیاد پر "دوسرا شجر" کے بنیادی استعارے کی تشکیل کی ہے۔ کیونکہ انجیل مقدس میں اس درخت کو شجرِ آگہی Tree of Knowledge کہا گیا ہے۔ شجاع خاور اسے تسلیم کریں یا نہ کریں لیکن واقعہ یہ ہے کہ طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے انگریزی کے رزمیہ شاعر ملٹن کی شہرۂ آفاق نظم Paradise Lost کا مطالعہ کیا اور اس سے متاثر ہوئے۔ اس میں انجیل مقدس کے مطابق ملٹن شجر ممنوعہ کی تخصیص کرتے ہوئے اسے شجر آگہی Tree of Knowledge ہی کہتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں شجاع خاور یونی ورسٹی میں انگریزی ادب کے طالب علم تھے۔ ملٹن کی نظم کے وسیلے سے انھوں نے بطور شاعر مسیحی عقیدے کا اثر ضرور لیا ہوگا۔ یا یہ کہ اس عقیدے میں انھیں زیادہ تخلیقی اور شعری امکانات نظر آئے۔ دوسرا شجر کا بنیادی خیال اسی مسیحی عقیدے کا مرہونِ منت ہے۔

ملاحظہ کیجیے۔

آگہی ۔ وہ مری قلوپطرہ
کبھی جس کے در شبستاں سے
میں نے پردہ اٹھا کے دیکھا تھا
اور میرے خدا نے جنت سے
مجھے باہر نکال پھینکا تھا
میری معصومیت کی یہ
سرکشی کا گناہ ہو جیسے ۔ ... مصرع ۵ تا ۱۱ ۔

ممکن ہے شاعر نے یہیں سے اپنی اس طویل نظم کا بنیادی استعارہ اختراع کیا ہو یہاں نے ممنوعہ شعر آگہی کے اس حوالے کے بعد آگہی کو قلوپطرہ کی تلمیح کے سہارے اولاً دلکش اور مسحور کن اور آخراً ایک تباہ کن انسانی تجربے کی صورت میں دیکھتے ہوئے آدم کی جنت بدری کا ایک معنوی اور تخلیقی پس منظر تشکیل دیا ہے۔ نظم جنت بدر آدمی کی خودکلامی سے شروع ہوتی ہے۔ جو ۱۱۱ مصرعوں پر مشتمل نظم معرای کی ہیئت میں ہیں۔ جس میں انسان جنت بدری کے واقعے پر اظہار ماتم کرنے کے بجائے اس میں اولاد آدم کے لیے دور رس امکانات کی نشاندہی کرتا ہے۔ لہٰذا ترقی یافتہ اور جدید انسانی معاشرے کا اشارتاً حوالہ دیتے ہوئے آدمی کا مدعا یہ ہے کہ وہ ایک جنتِ غیر سے نکل کر اپنی جنت میں آگیا ہے۔ جس کا وہ مالک و مختار ہے۔ اور جہاں علم و آگہی کے در روز بروز اس پر وا ہوتے جارہے ہیں۔

جنتِ گم شدہ کا غم کیوں ہو
میں نے کبھی ایک بہشت ڈھائی ہے
خواب زادوں کی بات کیا معنی
میری جنت ہے چشم وا کی طرح .... ۲۰ تا ۲۳

ہائے یہ بے بہا فسوں کاری
یہ مری کاوشوں کی تیاری
یہ مری فتح مندیوں کا نشاں
جن پہ ہوتا ہے بس مرا ہی گماں .... ۴۰ تا ۴۳
وہ بھی جنت تھی یہ بھی جنت ہے
پھر بھی ایک فرق اک فاصلہ ہے
وہ جو جنت تھی خواب زادوں کی
میں تو جزوِ حقیر تھا اس کا ....

اور یہ جنت تمام میری ہے۔۔۔۔۔ ۴۸ تا ۵۲
اب مری خود سیری یہ تند رخی
کیسے نادم ہو کیوں خجل ہو جائے
وہ قلوپطرہ میری ہم آغوش
جس کے نا آشنا شبستاں میں
ایک بے نام سے تقاضے پر
کبھی جنت بدر ہوا تھا میں۔۔۔۔۔۔ ۸۵ تا ۹۰
آفریں ایسے پائے لغزش پر
جس کی معتوب لڑکھڑاہٹ بھی
آگہی کے محل میں لے جائے
آگہی ــ ہاں مری قلوپطرہ۔۔۔۔۔۔ ۱۰۸ تا ۱۱۱

مگر اس خارجی فتح کے اعلان کے باوجود آدمی کی اندرونی شورش اور آگہی کے جاں کن تجربے کی طرف بھی شاعر نے قلوپطرہ کی تلمیح کے ذریعے ہی یوں اشارہ کیا ہے۔

صبح نازائیدہ کے پرتو میں
میں جب اپنا مآل دیکھتا ہوں
آگہی، یہ مری قلوپطرہ
مجھ سے کچھ اور کھلنے لگتی ہے
اور میں پھر ذرا جواں ہو کر
اس کی سانسوں میں ڈوب لیتا ہوں
اس کی سانسوں کا زیر و بم مجھ کو
ایک احساسِ فتح دیتا ہے
اور کچھ ڈوبتا ہوں میں لیکن
اس کی سانسوں کی تہہ نہیں ملتی
مثلِ حیوان ہو کے نا اندیش
آگے ہوئی ہوئی غذا پر میں
بے قراری سے ٹوٹ پڑتا ہوں
اور میرا خدا سمجھتا ہے
آج تک کشتۂ عتاب ہوں میں

داستانی قلوپطرہ ایک شب کی ہم بستری کے بعد صبح اپنے ہم بستر کو قتل کروا دیتی تھی۔ اس لیے انسان کے لیے آگہی کی تباہ کن رفاقت کی طرف قلوپطرہ کی تلمیح کے ذریعے بڑے بلیغ طریقے سے اشارہ کیا گیا ہے۔

وہ میرا پندارِ بے نیازی
ابھی تنومند جیسے پہلے تھے
آج بھی ہیں
نہیں کسی کی نظر نہیں مل سکی ابھی تک مری نظر سے
نہیں ۔ نہیں ۔
آدمی ؟
یہ کرمِ حقیر تھا
"تھا"۔ ؟!
نہیں ابھی تک مری نظر میں حقیر ہے یہ .... ۴۶۸ تا ۸۵

اس حصے کے آخر میں نظم کا بنیادی خیال ظاہر ہوتا ہے جب خدا خود کلامی کے ...
میں یہ اشارہ کرتا ہے کہ انسان کی مادّی (ایٹمی توانائی سے پیدا شدہ) ترقی ہی ...
کی تباہی کا سبب بن جائے گی ۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ پہلی بہشت سے تو صرف آدمی کو
نکالا گیا تھا اور آسمانی بہشت اپنی حالت میں قائم رہی تھی ۔ اس مرتبہ بہشت سے
(بہشتِ ارضی) نہ صرف آدمی خود نکلے گا بلکہ یہ بہشت بھی اسی عمل میں تباہ
نیست و نابود ہو جائے گی ۔

بس اب وہی لمحہ آ رہا ہے
کہ رفعتوں کا ہی پیر پھسلے
اسی بلندی کے نقطۂ ارتفاع سے
آدمی گرے اور اپنے ملبے میں دب کے رہ جائے
اس حرارت سے آپ جل جائے
روشنی کی جو کھان ہے اب
جو اس بلندی جو اس حرارت کا سب سے اونچا نشان ہے اب
زمین جنت تو ہو گئی ہے
مگر ابھی اس میں اک کمی ہے
ہمارے ہاتھ اس زمیں کی تکمیل اب کریں گے ..... ۵۱۳ تا ۲۲

یہی گھڑی ہے
کہ آدمی کے قد آور اثبات کی نفی ہو
کہ اس کا سویا ہوا تلوّن بھی جاگ جائے
یہی گھڑی ہے
کہ ہم زمیں کی ادھوری جنت کو
حسنِ تکمیل سے نوازیں

بلندیوں کا یہ نقطۂ ارتفاع خود
اس ادھوری جنت کا شجر ممنوعہ بن کے رہ جائے ۔ ۵۸۴ تا ۵۸۶

نظم کے پانچویں حصے میں آدمی کی خود کلامی گفتگو کا رنگ تیسرے حصے کے خاتمے کے بلند بانگ آواز سے کافی مختلف ہے یہاں نظم کے بنیادی خیال کی مزید وضاحت کی گئی ہے ۔ انسان کی مادی ترقی اور تمدنی عروج "شجر آگہی" کے سرخ پھولوں کا فیض ہیں جبکہ اسی "شجر آگہی" میں کالے پھل بھی لگے ہوئے ہیں ۔ اور اگر انسان نے اپنی متلون مزاجی اور تخریبی فطرت سے ترغیب پاکر ان کالے پھلوں کو چکھ لیا تو یہ ارضی بہشت ایک ساعت میں برباد ہو جائے گی ۔ نظم کے بنیادی خیال کو اس نظام میں شجر آگہی کے سرخ پھول ایٹمی توانائی کی دریافت اور اس کے مثبت استعمال کی علامت ٹھہرتے ہیں ۔ جبکہ اسی شجر آگہی کے کالے پھلوں سے مراد ایٹمی توانائی کا بم کی شکل میں منفی اور تباہ کن استعمال ہے ۔ پانچویں حصے کی اس خود کلامی کے آخر میں آدمی کے اس اندرونی جمود اور اضطرابی ذہن پر ارتکاز کیا گیا ہے ۔ جو زمین پر اس کی مادی آسائشوں اور خارجی وسائل کے رد عمل کی دین ہے ۔ آدمی اپنے اس جبلی تلون اور اپنے خمیر میں موجود اس بنیادی تخریب کاری کے عنصر کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ جس کی وجہ سے اسے آسمانی جنت سے نکلنا پڑا۔

تو جاگ اٹھا وہ تلون ۔ مری بلیغ ادا
جو ایک جنت خاموش چھوڑ آئی تھی
شجر کے سائے میں کالے پھلوں سے ملنے کو
تلاش و شوق میں وہ اٹھ رہا ہے میرا ہاتھ ۵۸۰ تا ۵۸۳

مگر آدمی اپنی اس مایوس کن صورتحال اور ناگزیر طور پر قریب آتی ہوئی ایٹمی تباہی پر ایک فلسفیانہ انداز اختیار کرنے لگتا ہے :-

ادھر بہشت بدری ہونا میری قسمت ہے ۔
نئی زمیں نئی دنیا ادھر مراحق ہے
مجھے بہشت تو ملتی ہے لیکن اس کے ساتھ
میری بہشت میں ہوتا ہے شجر ممنوعہ
شجر کھڑا ہے یہ جنت ہے اور میں زندہ ہوں
مگر نگاہ تو ساکت ہے اک زمانے سے
شرار ہے کہ لگا ہوں سے لے رہا ہے خراج
طلسم ہے کہ دماغوں کا خون کرتا ہے
وہی بہشت وہی ہیں بہشت کے منظر
نہ جانے کتنے زمانے کا خون چوسے ہوئے
نظر جو اب بھی نہ اکتائے تو نظر کیا ہے ۔

تو پھر کھلا وہ تلون وہی بلیغ ادا .... ۵۸۸ تا ۹۶

یعنی اس تیسری خود کلامی کے آخر میں آدمی اپنے متجسس ہاتھوں کے شجر آگہی کے کالے پھلوں (ایٹمی توانائی کے منفی استعمال) کے نزدیک پہنچنے کا ادراک اور ان پھلوں کو چکھنے کی ناگزیریت کا اعتراف تو کرتا ہے مگر اس تمام منفی منظر نامے پر ایک ایک مثبت فلسفیانہ اور رجائی خول چڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے کہ آدمی کا کہنا یہ ہے کہ کیونکہ ارضی جنت کی آسایش اور مادی ترقی بھی اب معمول بن کر جمود اور کسالت کی انسانی کیفیات پیدا کرنے لگی ہیں اس لیے یہ منظر نامہ بھی اب بدلنا چاہیے۔ خواہ اس ارضی جنت کی تباہی کے بعد جو نئی زمین ملے وہ پھر سے اتنی ہی نادار کیوں نہ ہو۔ جتنی زمین اس وقت تھی جب آدمی آسمانی جنت سے نکالا گیا تھا۔

وہ اس بہشت کی تخریب کے دھماکے ہوں
کہ اس زمین کی ناداریوں کے ویرانے
کسی بھی طور کوئی شکل مختلف تو ملے .... ۶۲۲ تا ۴۲

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ طویل نظم اسی مصرعے پر ختم ہو سکتی تھی مگر اس کا آخری حصہ اس کے بعد ہے یہ چھٹا حصہ مختصر ترین ہے۔ یہاں آدمی اور خدا کی باری باری خود کلامی کے سلسلے کی ترتیب ٹوٹتی ہے۔ اور خدا کی متوقع خود کلامی کے بجائے اس چھٹے اور آخری حصے میں (جو صرف بیس مصرعوں پر مشتمل ہے) آدمی کی ہی خود کلامی پانچویں حصے کے تسلسل میں پھر نمودار ہوتی ہے۔ نظم آدمی کے اس مسلسل تذبذب پر ختم ہوتی ہے۔ جو ابھی تک اس کے اور ایٹمی تباہی کے درمیان موجود ہے۔ آدمی کی آخری خود کلامی پر مبنی بیس مصرعے یوں ہیں :۔

خیال گاہِ مقدس میں
نوید تھی کہ طلسم کہن بس اب ٹوٹا
بس ایک لغزشِ پائے حیات
بس ایک جنبشِ دستِ گناہ
پہنچ رہا ہے جو کالے پھلوں کے پاس
پھر اس کے بعد
نیا جنوں نئی راہ
نئی زمین نئی دنیا
اٹھے ہوئے ہیں ابھی ہاتھ
پہنچ رہے ہیں جو کالے پھلوں کے پاس
خیال گاہ میں ایک شور سر اٹھاتا ہے
خیال گاہ مقدس میں

یہ ایک چھوٹا خیال
یہ ایک خدشۂ ناپاک ناخلف
کہاں سے آیا یہ منحوس وسوسہ
کہ اس بھی ہوئی جنت کے خون سے آگے
وہاں۔ ادھر۔
کسی شے کا اگر
نشاں ملا ہی نہیں
نئی زمیں نئی دنیا اگر ملی ہی نہیں

یہ ہماری ادبی دنیا کی بوالعجبی ہی تو ہے کہ شجاع خاور کی اس انوکھی اور تاریخی اہمیت کی طویل نظم کی طرف شاید ۱۹۷۰ء میں توجہ نہیں دی گئی کہ وہ اس وقت عمر کے لحاظ سے ایسے شاعر تھے جسے ہم مبتدی کہہ کر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ۷۲۴ مصرعوں پر مشتمل آٹھ (۸) مختلف بحروں میں نظم کی تینوں ہیئتوں سے مزین اس قماش کی نظم اس لیے بھی لائق توجہ ہونی چاہیے کہ اس کا شاعر اس وقت بیس اکیس سال کا نوجوان شاعر تھا۔
"دوسرا شجر" کا بنیادی خیال ایک Fantasy سے زیادہ مستحکم نہیں اس میں واقعاتی اور منطقی کمزوریاں بھی ثابت کی جا سکتی ہیں۔ زبان و بیان میں بھی تراش خراش کی گنجایش ہے۔ مگر بحیثیت ایک طویل نظم "دوسرا شجر" ندرتِ خیال ندرِ بیان فنکارانہ اثرانگیزی کی ایک مثال ہے۔ یہ نظم کتابی صورت میں جنوری ۱۹۷۰ء میں سامنے آئی اغلب ہے کہ ۱۹۶۸/۶۹ میں تخلیق کی گئی ہوگی۔ اس وقت شجاع خاور کی شعری عمر بمشکل پانچ چھے سال رہی ہوگی۔
شجاع خاور نے اپنے مبتدیانہ دور کی اس طویل نظم میں روائتی بیان کا حیران کن مظاہرہ کیا ہے اور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں نہیں تو مستقبل بعید میں اس نظم کی مزید خوبیاں واضح ہوں گی۔ خاص طور سے اس پہلو کے پیش نظر کہ ایسی پختہ شاعری (جسے شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی اپنے لفظوں میں "ظاہری طمطراق" والی شاعری کہا) شجاع خاور نے بیس سال کی عمر میں کی تھی۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ رہے گی کہ اقبالی زبان (جس میں جا بجا فارسیت ہے) سے مماثل سات سو مصرعے جوان عمری میں تخلیق کرنے کے بعد اس شاعر نے غزل پر زور دیا تو یہاں بھی اپنی دنیا آپ پیدا کی کے مصداق اس نے غزل میں فارسیت سے مبرا اور قطعاً غیراقبالی طرز کو اپنی شناخت بنا لیا۔ اس طرح "دوسرا شجر" آج کے ایک صاحب طرزِ غزل گو کے تعین مطالعہ میں ایک دلچسپ پہلو کا اضافہ کرتی ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں طویل نظم کی تاریخ شجاع خاور کی نظم "دوسرا شجر" کے تذکرے کے بغیر نامکمل بھی رہے گی اور نامعتبر بھی۔ ••

از: نصر ملک

...naser Malik, Journalist
Vanrebrovej 20/4-3
2860 Bagsværd
Denmark
Tel 02 98 25 71

(ایک ایشیائی تارکِ وطن کی کہانی جس نے مغرب میں گھر بسانا چاہا۔)

تنہائی کا کرب

بہار کی ایک خوب صورت دوپہر!

اس نے حیرت کے ساتھ اردگرد دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے سرگوشی کی "لیکن میں جا کہاں رہا ہوں؟" ______

اپنے اس سوال سے جتنا وہ خود کو پریشان سمجھ رہا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنے احساس سے بھی کہیں زیادہ پریشان ہے۔ وہ سوچ رہا تھا اور اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیر رہا تھا ______ "ہوں" اس نے یکبارگی بڑے اطمینان کے ساتھ زیرِ لب کہا اور اپنے دائیں پاؤں کو زمین پر زور سے دے مارا جیسے وہ اپنے خیال ہی خیال میں کسی قطعی فیصلے تک پہنچ چکا ہو۔ ______ "یہ تو طے ہے" وہ پھر زیر لب بڑبڑایا ______ "لیکن کیا درحقیقت ایسا ہی ہوگا؟" وہ بے ساختہ اچانک اور از خود اپنے ہی فیصلے کے متعلق بڑی بے چینی سے اپنے لیے کسی بدشگونی کا احساس محسوس کرنے لگا ______ اور پھر ______ اس کے اعصابی تناؤ میں کھینچاؤ آنے لگا ______ اذیت ناک اور بے انتہا اکیلے پن اور اجنبی پن کا غمناک احساس اچانک اس کے دل پر شعوری طور سے طاری ہوگیا تھا لیکن شہر کے اس خوب صورت ترین، جھیلوں سے بھرے پارک میں پھولوں پہ مچلتی تتلیوں کے درمیان وہ اپنے دلی جذبات کے اذیت ناک احساس کی بدبو پھیلانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اپنی صورتِ حال کی وجہ سے وہ اپنے لیے ایک بھی انسانیت آمیز لفظ تک تلاش نہیں کر پا رہا تھا ______ "یہ سب کچھ میرے اپنے ______ اعمال کا نتیجہ ہی تو ہے۔" اس نے پھر خود سے سرگوشی کی ______ ایک ______ ملک میں ______ سولہ برس قیام کے باوجود ______ میں آج بھی لوگوں کے لیے اجنبی ہوں ______ کیا میں واقعی یہاں ابھی تک اجنبی ہوں ______" وہ مسلسل زیر لب بڑبڑا رہا تھا ______ "نہیں یہ محض میرا قیاس ہی ہو سکتا ہے۔ یہ میرا واہمہ ہے ______ میں کسی بھی طرح یہاں اجنبی نہیں ہوں" اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا خود کو اجنبی تصور کرنا کسی بھی طرح درست نہیں ٹھہرتا ______ اسے اپنے کئی مقامی دوستوں کے نام اور ٹیلی فون نمبر تک یاد آنے لگے دفتر میں اس کے شریکِ کار، اس کے محلے میں اس کے ساتھ رہنے والے کئی شناسا چہرے جن ______

ساتھ اس نے کتنی ہی بار شراب کے جام اڑائے تھے۔ اور پھر اس کے اپنے ملک کے کتنے ہی دوسرے لوگ جو یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ ان میں سے اکثر کو تو وہ گھر کے آدمی کی ہی طرح جانتا تھا ـــــ "تو پھر وہ اجنبی کیسے ہوا؟" مجھے بہار کی چھٹیوں سے لطف اندوز ہونا چاہیے" اچانک اسے اپنے فارغ ہونے کا احساس ہوا۔ وہ بینچ پر سے اُچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک لمبی انگڑائی لی اور چل پڑا۔ "کیا سچ مچ وہ بہار سے لطف اندوز ہو سکے گا؟" وہ پھر اپنی ہی سوچ کی گرفت میں جکڑ گیا تھا۔

اب وہ مسلسل چلنے لگا تھا ـــــ "گھر واپس چلا جائے" اس خیال سے اچانک اس کی طبیعت پھر گئی ـــــ "گھر" وہ اپنے خیال پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا ـــــ "وہ بھیانک الماری نما کمرہ ـــــ" "گھر کا نعم البدل نہیں ہو سکتا" یہ سوچتا ہوا اب وہ ایک طرح سے ناک کی سیدھ میں چل رہا تھا۔

اس کے اعصابی تناؤ میں کھنچاؤ بڑھنے لگا تھا۔ اس نے لاشعوری طور پر ایک ـــــ کوشش سی کر کے، کسی اندرونی خلش کے تحت، خلش سے کہیں زیادہ غالباً ضرورت کے تحت دیکھنا شروع کر دیا ـــــ ارد گرد کی ہر چیز کو، اپنے آگے پیچھے ـــــ وہ ہر چیز کو بڑی اچھی طرح ـــــ جاذبیت کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا ـــــ "لیکن وہ تلاش کیا کر رہا تھا" ـــــ یہ تو غالباً وہ خود بھی نہیں جانتا تھا اور اگر اس سے آگاہ بھی تھا تو یہ محض اس کے تحت الشعور میں دبی ہوئی کوئی ایسی چیز ہو سکتی ہے جو ابھی نہ تو پوری طرح خیال بن کر اس کے ذہن میں آئی تھی اور نہ ہی ایسے احساس میں ڈھلی تھی جسے وہ محسوس کر سکتا ـــــ وہ بار بار اپنے خیالات میں غرق ہو جاتا تھا۔ اور پھر جب چونکتا، سر اٹھاتا اور قدرے رک کر چاروں طرف نگاہ دوڑاتا تو فوراً ہی بھول جاتا کہ ابھی ابھی کیا سوچ رہا تھا۔ اسے تو یہ خیال بھی نہ رہتا کہ وہ ہے کہاں اور جا کہاں رہا ہے ـــــ اپنی اسی حالت میں وہ اپنے خیال میں پارک سے باہر نکل آیا ہوا تھا ـــــ لیکن ـــــ یہ کیا! اتنا چلنے اور وہ بھی ناک کی سیدھ میں وہ ابھی تک اسی پارک کے وسط میں تھا ـــــ "تو گویا میں ویسے ہی چکر لگاتا رہا ہوں" اس نے اپنے ارد گرد ہریالی اور پھولوں کی تازگی پر نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا ـــــ کھلے ہوئے پھولوں کے شگفتہ رنگ اس کی تھکی ہوئی آنکھوں کو بھلے لگے۔ وہ ان رنگوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے پھر چلنے لگا ـــــ لیکن جلد ہی یہ نیا اور خوشگوار احساس بھی ختم ہو گیا ـــــ اسے اپنی ٹانگیں بھاری محسوس ہونے لگیں اور کندھوں پر انجانا سا بوجھ بھی۔ اب وہ گھر لوٹ جانا چاہتا تھا ـــــ "گھر" اس کے ذہن میں خیال ابھرا ـــــ "الماری نما بھیانک کمرہ" وہ چلتا چلتا ـــــ خوب صورت پھولوں کی کیاریوں سے ہٹ کر جھیل کے کنارے کنارے، خودرو جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کے قریب پہنچ گیا اور گھاس پر لیٹ گیا ـــــ یہاں گھٹن نہیں تھی بلکہ جھیل کے اوپر سے ہو کر آتی ہوئی خنک ہوا جو پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی ـــــ اسے بڑی بھلی لگی۔ اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں ـــــ نیند اس پر غالب آگئی تھی اور وہ فوراً ہی وہیں سو گیا تھا۔

بے چارگی واذیت ناک صورتِ حال سے دوچار ——— جب کوئی سو جاتا ہے تو اسے اپنی نیند پر اختیار نہیں ہوتا اور ایسی نیند میں دیکھے ہوئے اکثر خوابوں کی خصوصیت بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ ان کے واقعات، وضاحتوں اور حقیقتوں میں غیر معمولی مشابہت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ خواب بھیانک اور عجیب الخلقت تصویروں میں بدل جاتے ہیں۔ تو کبھی ان خوابوں کے ماحول اور انسانی تخیل کا سارا عمل اتنا قابلِ یقین ہوتا ہے اور اتنی عمدہ نفیس اور غیر متوقع لیکن بھرپور تفصیل یوں رچی بسی ہوتی ہے۔ کہ خود خواب دیکھنے والا جب بیدار ہوتا ہے تو خواہ وہ کتنا ہی بڑا فنکار کیوں نہ ہو کبھی بھی اپنے خواب کے تصور کو حقیقت میں روبرو نہیں دیکھ سکتا حالانکہ خواب میں اس نے شاید کتنی ہی چیزوں کو چھوا بھی ہو ——— لیکن بیداری کے بعد وہ ان چیزوں کو پالینا تو درکنار دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اس طرح کے خواب، خواب نہیں رہتے ——— وہ ایک ایسا تصور بن جاتے ہیں جو کسی کی زندگی کا جز بن کر ہمیشہ بہت دنوں تک، برسوں تک یاد رہتے ہیں اور بعض خواب تو انسان کے مرنے تک اس کے ذہن میں یوں تازہ ہوتے ہیں گویا ابھی ہی دیکھے ہوں۔ ایسے خواب ہیجان سے بھرے ہوئے انسان کے پریشان و پراگندہ جسمانی نظام پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ کس طرح کوپن ہیگن کے ہوائی اڈے پر جہاز سے باہر اتر رہا تھا۔ لیکن یہ تو سولہ برس پرانا واقعہ تھا۔ لیکن خواب میں، جہاز سے باہر اترنے کا منظر وہ بالکل ویسے ہی دیکھ رہا تھا جیسا کہ اس کے حافظے میں محفوظ رہ گیا تھا۔ لیکن ——— نہیں، ——— یہ منظر تو حافظے میں محفوظ رہ جانے والے منظر سے بھی کہیں زیادہ صاف تھا ——— پھر یکے بعد دیگرے ڈنمارک میں اس کے پچھلے سولہ برس کی فلم اس کی آنکھوں کے سامنے یوں چلنے لگی گویا وہ واقعی ہی کسی ایسی ویڈیو فلم کو دیکھ رہا ہو جو کسی نے اسے بتائے بغیر اسی کے اپنے ہی شب و روز کے متعلق اس کا پیچھا کر کے بنائی ہو ——— اس نے دیکھا کہ نو برس پہلے کیسے وہ ایک لڑکی سے یونی ورسٹی کمپاؤنڈ میں ملا اور پھر ان دونوں کی ملاقات پہلے گہری دوستی میں اور بعد میں ایک دوسرے سے شادی میں بدل ——— گئی۔ ——— اور پھر اس کے سامنے خواب میں جو ——— منظر بدلا تو اپنے پانچ سالہ بچے ——— کا بازو تھامے کپڑوں کی ایک دکان میں داخل ہو رہا تھا ——— اس نے اپنے بیٹے کی خواہش کے مطابق اس کے لیے انہی رنگوں والے کپڑے خریدے جس کے لیے بچے نے اصرار کیا تھا ——— اس نے دیکھا کہ دکان پر کام کرنے والی عورت ان دونوں باپ بیٹوں کی معصوم شرارتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی ——— "خدا ہر خاندان کو تمہاری طرح خوش رکھے" ہاں یہی دعا جو اب وہ خواب میں سن رہا تھا ——— اس عورت نے کی تھی ——— اس نے دکان سے باہر نکل کر اپنے بیٹے کو خوشی سے ——— بازوؤں میں لے کر پہلے ہوا میں اچھالا اور پھر اپنے کندھوں پر بٹھا لیا۔ لیکن اسی دوران ——— ہاں ——— اسی دوران بچے کے ایک پاؤں سے اس کا جوتا زمین پر گر گیا تھا۔ جسے اٹھانے کے لیے جونہی وہ جھکا ——— تو ——— تو ——— وہاں زمین پر نہ تو کوئی جوتا پڑا تھا اور نہ ہی اس

کے کندھوں پر اس کا بیٹا موجود تھا ـــــ اس کی آنکھ کھل چکی تھی وہ نیند سے بیدار ہو چکا تھا ـــــ "خواب" ـــــ کیا میں محض خواب دیکھ رہا تھا" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑایا ـــــ "نہیں یہ خواب نہیں تھا یہ تو میری زندگی کی عکس بندی کا حقیقی منظر تھا ـــــ" وہ اب پنے ارد گرد سے بے نیاز گردن جھکائے ہاتھ کی انگلی سے گھاس پر لکیریں کھینچ رہا تھا ـــ ایک دو، تین، چار، ... تیرہ، چودہ، ... پندرہ سولہ، ـــ "سولہ" برس! ـــ تو کیا میں سولہ برسوں سے یہاں بیٹھا ہوں"؟ اس نے خود سے سوال کیا اور خود ہی تمسخرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے گھاس پر یوں ہتھیلی پھیرنے لگا گویا اپنی زندگی کے سولہ برسوں کو جو اس کے سامنے لکیروں کی صورت میں تھے، مٹا دینا چاہتا ہو۔ یا زندگی سے خارج کر دینا چاہتا ہو۔

وہ اپنے خیالات اور سوالات پر دیر تک جھنجھلاتا رہا ـــ اب وہ خواب میں دیکھے ہوئے اپنی زندگی کے مختلف مراحل پر غور کرنے لگا تھا۔ "ہاں، ہاں! بالکل ـــــ میں نے خواب نہیں دیکھا یہ تو میرے تحت الشعور کا ظہور تھا" وہ خود ہی بھنبھنایا ـــ "گزرے ہوئے سچے واقعات کا تصور بھی بعض اوقات کتنا گھناؤنا اور اذیت ناک ہوتا ہے" وہ ابھی تک سوچ رہا تھا ـــ "اب اس کی بیوی کو اس سے الگ ہوئے دو برس ہونے کو آئے تھے۔ اور وہ یہ بھی نہیں بھولا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کو کچھ نہیں تو چھ ماہ پہلے تب نئے ـــــ کپڑے خرید کر دیے، جب اس کی چوتھی سالگرہ تھی۔ اور اس کی ماں نے خاص مہربانی سے کام لیتے ہوئے اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ کچھ وقت گزار سکتا ہے۔ اسے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی تنہائی کے احساس کو ایک نئے رخ سے دیکھنے کی اگرچہ تحریک ہوئی لیکن وہ شاید اب پیچھے مڑ کر دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ کس طرح پچھلے مہینے، سرِ راہ بازار میں ـــــ ـــــ جب وہ اپنی ہی سوچوں میں گم کہیں جانے کے خیال میں ایک طرح سے بڑی تیز رفتاری کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ تو کس طرح اچانک ایک بچے نے لپک کر اس کے لمبے اور کوٹ کو پکڑ لیا تھا ـــــ "پاپا ـــ پاپا ـــ، تم کہاں بھاگے جا رہے ہو؟" یہ اس کا اپنا بیٹا ہی تو تھا۔ جو اپنے ننھے پاؤں کے بل کھڑا بازو دا پر اٹھائے اس کا بوسہ لینے کو بے تاب ہو رہا تھا ـــ "ارے تم ـــ میرے ننھے یار، تم کہاں ـــ یہاں کس کے ساتھ گھوم رہے ہو ـــ کیا تمہاری امّی ـــــ؟" اور ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ کسی نے اچانک اسے اپنے بازوؤں میں پکڑ کر اپنے ساتھ چمٹ لیا ـــــ یہ اس کی سابقہ بیوی اس کے اپنے بیٹے کی ماں تھی۔ "میں تو تمہیں دیکھ ہی نہیں پائی تھی لیکن اس چھوٹے "شیطان" نے اتنی بھیڑ میں تمہیں پیچھے سے بھی پہچان لیا۔" ہاں اس نے یہی تو کہا تھا ـــ اسے سب کچھ یاد آنے لگا تھا

"یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے ـــــ کچھ سوچو تو ـــ اپنے لیے تو زندہ رہنا سیکھو" یہی تو وہ کہہ رہی تھی۔ اور اس کا بیٹا جسے اس نے اب اٹھا رکھا تھا۔ ابھی لمبے ترتیبی سے بڑھے ہوئے اس کے بالوں کو اپنی ننھی انگلیوں سے سلجھانے کی

کوشش کر رہا تھا ـــــ" وہ خود تو اس موقع پر خاموش ہی رہا تھا ـــــ ہاں اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے کچھ بھی تو نہیں کہا تھا۔ اور پھر وہ دونوں ماں بیٹا اسے خدا حافظ کہ کبھی فون کرنے کا کہتے ہوئے اس کی نظروں کے سامنے سے دور ہوتے گئے تھے ـــــ اس کا بیٹا کتنی ہی دیر خدا حافظ کہنے کے انداز میں اپنا ننھا سا ہاتھ ہلاتا رہا تھا ـــــ لیکن اس کی ماں نے تو ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا تھا ـــــ" وہ مڑ کر کیوں دیکھتی بھلا ـــــ لیکن میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہا ہوں؟" اب وہ پھر ایک نئی سوچ میں اُتر گیا۔

وہ ابھی تک ٹانگیں زمین پر پھیلائے وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اور اپنے آپ کو کُڑھا رہا تھا۔ اپنے آپ سے اپنے ہی سوالات اس کے لیے اذیت ناک جھنجھلاہٹ پیدا کر رہے تھے۔ اگرچہ وہ وہاں بیٹھا بیٹھا اس خواب کو دہرا رہا تھا۔ جو اس نے وہیں نیند میں تھوڑی دیر پہلے دیکھا تھا۔ لیکن آخر اسے ایسے ہی خواب کیوں دکھائی دیتے ہیں ـــــ" جب اس کا اب کسی سے ربط ہی نہیں رہا" تو کوئی خواب میں آکر اس طرح کا تاثر کیوں دے کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ اس نے جو خواب میں دیکھا وہ صحیح ہی ہے۔ اور اگر صحیح ہی ہے تو پھر یہ حقیقت میں اس کے سامنے اس طرح کیوں نہیں آتا کہ وہ اس خواب کے کرداروں کو چھو سکے انھیں اپنے ہاتھوں سے محسوس کر سکے۔

اب دوپہر شام میں ڈھل رہی تھی اور پارک میں ایک عجیب طرح کا ماحول چھانے لگا تھا۔ اچانک شاید وہ جیسے ہوش میں آگیا ہو ـــــ اس نے یکدم کھڑے ہو کر ایک لمبی انگڑائی لی اور اپنی پتلون کے پائنچے درست کیے اور چلنے لگا ـــــ کہاں ـــــ اس سے شاید وہ خود بھی بے خبر تھا ـــــ اب وہ ایک طرح سے بے خیالی میں بھاری قدموں کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ چلنے لگا تھا ـــــ "ہاں یہ تو طے ہے!" اس نے زیرِ لب خود سے سرگوشی کی۔ اور جھیل میں اترتے ہوئے پرندوں کو کھڑا ہو کر دیکھنے لگا ـــــ لیکن جلد ہی اس کی نظر جھیل کے کنارے ایک دوسرے پر گردنیں جھکائے، پیار کرتے دو آبی پرندوں پر ٹھہر گئیں ـــــ وہ زیرِ لب مسکرایا ـــــ اور اپنا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈال کر کچھ ٹٹولنے لگا ـــــ اس کے ہاتھ پچیس پیسے کا ایک سکہ لگا ـــــ جسے اس نے آگے بڑھ کر بڑی احتیاط کے ساتھ کہ شور نہ ہو ـــــ جھیل کے پانی میں پھینک دیا۔ "تم زندگی بھر اسی طرح پیار کرتے رہو" یہ دعا دیتے ہوئے اس کی نظریں پھر آبی پرندوں کو تلاش کرنے لگیں جو ابھی وہاں پیار کر رہے تھے۔ لیکن ـــــ اب ان پرندوں کی جگہ محض ایک بگلا کھڑا ہوا تھا اور وہ بھی ایک ٹانگ پر ـــــ" میں بھی تو اک بگلا ہی ہوں ـــــ بگلا اور اس پر بھی۔" اس نے ایک تمسخرانہ انداز میں سوچا۔ اسے خیال آیا کہ ـــــ کہ اس آوارگی کا آخر کیا ہے؟ ـــــ کیا وہ محض وقت گزار رہا ہے یا وقت ہی اس کے ہاتھوں سے خود بخود جا رہا ہے ـــــ اب وہ پھر چلنے لگا تھا۔ پھولوں کی کیاری کے کنارے کنارے ـــــ اس

نے اچانک ہاتھ بڑھا کر ایک پھول کو شاخ سے توڑا اور ـــــ کوٹ کے کالر میں
نے کے لیے سوچا ـــ لیکن یہ کیا“ میں نے کوٹ تو آج پہنا ہی نہیں“ وہ سرگوشی
ے سے انداز میں بولا ـــ وہ تو محض ایک سویٹر پہنے ہوئے تھا ـــ ”مجھے پھول نہیں
ڑنا چاہیے تھا“ اس نے خود اپنے آپ سے بات کی ـــ اور ادھر ادھر دیکھنے لگا ـــ ایک
ڑھیا اس کی توجہ اس بورڈ کی طرف دلا رہی تھی جہاں لکھا تھا ـــ ”پھول توڑنا منع ہے“
س نے آگے بڑھ کر توڑا ہوا پھول نہایت انکساری کے ساتھ بڑھیا کو پیش کر دیا
ڑھیا نے بڑی خندہ پیشانی سے پھول قبول تو کر لیا لیکن بڑھیا کی مسکراہٹ میں چھپی
نز اسے دل میں اترتے ہوئے تیر کی طرح لگی ـــــ

اب وہ پھولوں کی کیاریوں سے دور نکل آیا تھا ـــ اس نے دیکھا کہ کئی
بڑے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے قہقہے لگاتے جا رہے تھے ـــ چھوٹے
بچے جو اپنے والدین کے ساتھ تھے. خوش رنگ لباسوں میں اچھلتے کودتے کتنے بھلے لگ
رہے تھے ـــ ”کبھی ہم تینوں بھی تو یہاں اسی طرح آیا کرتے تھے“ اسے وہ دن یاد آگیا
جب وہ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ شہر کے اسی پارک میں دوپہر سے شام تک پکنک مناتا
رہا تھا“ اسے اپنے آپ پر غصے سے زیادہ رحم بھی آ رہا تھا اور وہ ابھی تک مسلسل چل رہا
تھا لیکن کہاں ـــــ یہ وہ شاید ابھی خود بھی نہیں جانتا تھا. ”یہ میرے غرور اور
تکبر ہی کا کیا دھرا ہے“ اسے خود پر غصہ آیا“ آخر میں اس پر اتنا یقین کیوں کرتا تھا ـــ
ـــ میں یہ کیوں بھول گیا تھا کہ مشرق، مشرق ہی ہے، اور مغرب آخر مغرب ہی“ وہ پھر
اپنی سابقہ بیوی کے متعلق سوچنے لگا ـــ ”لیکن اب کیا دھرا رہ گیا ہے. جب وہ ہی نہ رہی
اور بچہ بھی باپ سے جدا ہو گیا ـــ تو پھر باقی کیا رہ گیا ہے“ وہ عجیب طرح
کے خیالات اور ان خیالات کے سبب وسوسوں میں الجھتا جا رہا تھا ـــ لیکن عجیب
بات یہ تھی کہ وہ اپنی سابقہ بیوی کی بے وفائی پر اپنی تمام تر دلیلوں کے باوجود اس کو
مورد الزام نہیں ٹھہرا سکا تھا ـــ وہ کچھ بھی سوچتا ـــ نہ جانے الزام اپنے ہی سر لیتا
”میری تنہائی کی وجہ بھی تو میں خود ہی ہوں، کیا میں بھی کوئی اور ساتھی نہیں ڈھونڈ سکتا ـــ
ـــ شریک حیات، بیوی کے طور پر نہ سہی ـــ وقت گزاری ہی کے لیے، جز وقتی ہی سہی
ـــ آخر سماج میں یہ سبھی کچھ تو ہے ـــ میں بھی تو ڈینش سماج ہی کا اب حصہ ہوں“
وہ قدرے جھنجھلایا اور اپنا پاؤں زمین پر پٹخ دیا ـــ ”نہیں نہیں، یہ ڈینش سماج مجھے اپنا
حصہ کب سمجھے گا. اس نے پھر خود سے سرگوشی کی ـــ ”ان غیر ملکیوں کے سبب ملک میں
بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے ـــ ڈینش اقتصادیات میں خسارہ غیر ملکیوں کی طرف
سے بھاری رقوم اپنے ملک بھجوانا ہے ـــ یہ غیر ملکی ہماری معاشیات پر بوجھ ہیں“ اسے
پچھلے دنوں شائع ہونے والی اخبارات کی سرخیاں یاد آنے لگیں تھیں ـــ ”سب بکواس ہے
یہ محض غیر ملکیوں کو بدنام کرنے کے متعصبانہ ہتھکنڈے ہیں“ اس کے دل سے آواز

اٹھی ـــ "ہم غیر ملکیوں نے اس ملک کی ترقی میں کیا کچھ قربان نہیں کر دیا ـــ اپنی جوان باہوں کی قوت، اپنے سر کے بال اپنے بدن کے خدوخال اور ـــ اور ـــ اور اب خاندان کی قربانیاں بھینٹ کر چکے ہیں۔ اور یہ ڈینش سماج ـــــــ!" اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا ـ اور آگے چلتا گیا ـــــــ

اب وہ جھیل کے کنارے آخیر پر پہنچ چکا تھا ـــــ "وقت بھی عجیب چکر کے لگاتا ہے" اس نے جھیل کے پانی میں ڈوبتے ہوئے سورج کا عکس دیکھتے ہوئے سوچا ـــــ "دن بھر کی آوارگی کے بعد ـــ ڈوبے گا نہیں تو کیا کرے گا؟" اس نے سورج کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے کہا ـــ "میں تو سورج نہیں ہوں! ـــ نہیں نہیں! میں نہیں ـــ ڈوبوں گا ـــ ! ہرگز ـــ ہرگز نہیں ـــ !" اس نے اپنی حالت کا سورج سے موازنہ کرتے ہوئے، ایک طرح سے اپنے بارے میں خود ہی فیصلہ دے دیا تھا۔

اب وہ پارک سے نکل کر سڑک پر پہنچ گیا تھا اور آگے بڑھنے کے لیے "سبز بتی" کے انتظار میں کھڑا تھا ـــ اتنا اسے یاد تھا۔ پھر اچانک ہی اسے اپنا وہ خواب یاد آگیا جو اس نے تھوڑی ہی دیر پہلے پارک میں جھاڑیوں کے قریب سوتے میں دیکھا تھا ـــ "آخر ایسے خواب میرا پیچھا کیوں کرتے رہتے ہیں؟" اس نے خود سے سوال کیا ـــ ! وہ سبز بتی دیکھتے ہوئے، سڑک پار کر رہا تھا ـــــ "بہر حال یہ کوئی نئی بات بھی نہیں۔" اس نے اپنے سوال کا خود ہی جواب بھی تلاش کر لیا ـــ "یہ خواب جو آج میں نے دیکھا ہے ـــ اچانک بھی تو نہیں دیکھا ـــ" اب وہ اپنے جواب کی خود ہی دلیلیں بھی دینے لگا تھا ـــ "یہ اُنہی پرانے، اذیت ناک حالات کا ہی نتیجہ ہے جو مجھے پچھلے ڈھائی برسوں سے گھیرے ہوئے ہیں" وہ یہ سوچ کر نہایت اداس ہو گیا۔ اسے قدم اٹھانا محال لگنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ آج وہ جس صورتِ حال سے دوچار ہے اور یوں کڑھ رہا ہے دراصل یہ تو پچھلے کئی مہینوں اور خاص کر پچھلے چند ہفتوں سے اُسے کوفت پہنچ رہی ہے۔ اور اسے پریشان رکھے ہوئے ہے ـــ اور آج اس میں جو بھیانک ناکی اور اذیت ناک پہلو ابھر آیا ہے اور اس کے دل و دماغ کو اذیت پہنچا رہا ہے شاید یہ اذیت و کربناکی اس کے لیے کسی فیصلے کا تقاضا کر رہی ہے ـــــ "فیصلہ!" اس نے سوچا ـــ "وہ تو طے ہی ہے! نہ ادھر کا رہا ہوں نہ ادھر کا ـــ اب تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہو گا ـــ ورنہ ورنہ" اب وہ سڑک کے کنارے بھیڑ بھاڑ سے ہوتا ہوا آگے بڑھتا اور سوچتا جا رہا تھا

اب اچانک بس اسٹاپ پر پہنچ گیا تھا ـــ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت دیکھا ـــ شام کے چھ بجنے والے تھے ـــ "میں سات بجے تک گھر پہنچ جاؤں گا" اس نے سامنے سے آتی ہوئی بس کو دیکھتے ہوئے سوچا ـــ بس آئی تو وہ اس میں سوار ہو کر ایک خالی جگہ پر ایک طرح سا جا گرا ـــــ "خواہ مخواہ سارا دن ضائع ہو گیا ہے۔" اس نے بس کی کھڑکی سے باہر دیکھا اور آنکھیں بند کر کے غالباً سستانے لگا تھا ـــ لیکن

اور ان سے پیدا ہونے والے سوالات کی مکھیاں اس کے ذہن میں پھر بھنبھنانے
— راضی خوشی اپنے مقدر کو قبول کر لو، جیسا بھی ہے — اب ہمیشہ کے لیے ایک
ہے — تم اس کا اعتراف کیوں نہیں کر لیتے ہو — اپنی زندگی اب تم کو خود بسر کرنی
—" وہ سوچے جا رہا تھا — ہچکولے کھاتی ہوئی بس اپنے مقررہ اسٹاپوں پر کھڑی
کچھ مسافر اترتے اور کچھ نئے، اس میں سوار ہوتے لیکن وہ ان سب سے بے خبر تھا
اس کے ذہن میں ایک طرح سے تلاطم بپا تھا — 'اپنے اندر کے احساس کا گلا گھونٹ دو —
ہنے، عمل کرنے اور محبت کرنے اور کسی کی طرف سے اپنا لیے جانے کے حق سے انکار
' یہ مشورے اسے کون دے رہا تھا وہ یہ جاننے سے قاصر تھا اس کی سوچ کیا واقعی
کی اندرونی ذات کے کرب کا نتیجہ اور اظہار تھی وہ اس معاملہ کو سلجھانا چاہتا تھا
الجھتا جا رہا تھا۔ "جب کہیں جانے کا ٹھکانہ ہی نہ رہ جائے تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"
بار پھر چونک پڑا" اس کا مطلب تو ایک ہی ہو سکتا ہے — " ہر شخص کے لیے کہیں
جانا ممکن ہو — کہیں بھی، کسی بھی جگہ — " ہاں — میں بھی تو اب جا رہا ہوں۔
طرف وہ بھیانک الماری نما کمرہ —" اس نے اپنے اعصاب پر تناؤ محسوس کرتے
ے سوچا — "خیال اچھا ہے — گھر —!"

اس نے اپنی ساری قوت سے خود کو مضبوط کرتے ہوئے پہلو بدلا اور کسی بھیانک
ہانی مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا — اسے محسوس ہوا کہ
رکی سوچ بچار اور بھرے بازاروں کی رونق اور اس کی آوارگی میں "تلاش کا پہلو"
اس کی تنہائی کا مداوا نہیں کر سکا — " بہار کی چھٹیاں" یہ سوچتے ہوئے
کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھری — اپنے بارے میں اس کا سارا غرور
پاش ہو گیا تھا — وہ حالات سے خود کو بے خبر رکھنے کی کوشش میں اندھی
کے کسی فیصلے کے مطابق تباہ ہو چکا تھا — اور یہ ضروری خیال کرنے لگا
اسے اپنے آپ کو سکون مہیا کرنے کے لیے اب اپنے کسی فیصلے کی نامعقولیت"
سامنے بھی ذلیل و خوار ہونا ہی پڑے گا۔ یہ سوچ کر اس نے ایک لمبی سانس
— اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں — " آخر یہ بھی تو زندگی ہے — "پچھتاوا
لستا ہوا پچھتاوا — اس نے اپنے آنسو پی لیے — "پچھتاوے کے ان
ذل پر اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔

بس ایک جھٹکے کے ساتھ رکی تو ڈرائیور نے "آخری اسٹاپ" کا اعلان کیا —
دوسرے مسافروں کے ساتھ ہی بس سے اتر آیا — اور گھر کی طرف جانے
ے — ایک بار کی طرف ہو لیا — " ٹھنڈے بیئر کی بوتل — " اس نے
لبوں پر ذائقہ محسوس کیا — " آخر میں گھر کے آدھے راستے پر ہی کیوں ٹھہر دوں؟"
نے سوچا اور بار میں جانے کی بجائے — گھر کی طرف ہو لیا۔ اسے اپنا یہ انداز

بے تکا تو ضرور لیکن احمقانہ نہیں لگا تھا — "مجھے خود کو یہ قدم اٹھانے کی اجازت دینے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کہ میں یوں زندگی بسر کرنے لگا ہوں" وہ سر جھکائے — اب اپنے گھر — چوتھی منزل پر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔

وہ ابھی گھر میں داخل ہو کر اپنے جوتے اتارنے والا ہی تھا کہ دروازے کی گھنٹی بڑے زور سے بجی۔ وہ اچانک چونکا تو ضرور، لیکن پھر سنبھلتے ہوئے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا — یہ اس کا اپنا بیٹا تھا — جو آگے بڑھ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا — "بابا! تم اکیلے کہاں گھومتے رہتے ہو — تم مجھے ساتھ کیوں نہیں رکھتے ہو — میں کب سے تمہارے انتظار میں تھا —" اس کا بیٹا ایک طرح سے شکایت جتانے لگا تھا — اس نے بے ساختگی سے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ہی کھڑی اپنی پڑوسن کو ایک لمحہ کے لیے بھول ہی گیا تھا۔

"میں نے آج اس کی ماں کو اپنے ایک کام کے لیے گھر بلایا تھا وہ جانے لگی تو یہ ضد کرنے لگا کہ اپنے باپ سے ملے بغیر نہیں جائے گا — وہ اسے میرے پاس چھوڑ گئی —" پڑوسن توتے کی طرح بولے جا رہی تھی — "آج لورا اور پیٹر بھی گھر پر نہیں تھے وہ دونوں اپنے اپنے باپ کے پاس گئے ہوئے ہیں — لیکن اس نے کچھ تنگ نہیں کیا — ٹی وی پر بچوں کے لیے ایک فلم تھی بس وہ دیکھتا رہا — کھانا میں نے پوچھا تھا — کہنے لگا — باپ کے ہی ساتھ مل کر کھائے گا —" پڑوسن بولے ہی جا رہی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے اس کے گالوں پر بوسے دے رہا تھا — جن پر نمکین آنسو بہہ رہے تھے — "بابا! اب اس طرح اکیلے کہیں نہیں جانا" بیٹا اس کے گالوں پر بوسے دے رہا تھا — "اچھا ہوا میرے ننھے یار تم آ گئے — اندر چلتے ہیں میں تمہارے لیے خود کھانا بناتا ہوں" یہ کہتے ہوئے اس نے پڑوسن کا شکریہ ادا کرنے کے لیے، بیٹے کو نیچے اتارا — لیکن — یہ کیا، وہ تو — خدا حافظ کہہ کر جا بھی چکی تھی — اس کا اسے خیال ہی نہیں رہا تھا۔

اڈیٹر کتاب نما کے نام

کھلے خطوط

(مراسلہ نگاروں کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

فن تاریخ گوئی پر ڈاکٹر عصمت جاوید
…ب نے کیسا جامع مضمون تحریر فرمایا ہے
…ان اللہ! دریا کو کوزے میں بند کرنا اسی کو
… ہیں. افسوس کہ ہمارے ہاں معیار بندی
…توجہ نہیں۔ املا تک ہنوز انتشار کا شکار
… فن تاریخ گوئی کی عملی یعنی تاریخی افادیت
…پیش نظر مختلف فیہ مسائل کا طے ہو جانا
…روری ہے. مگر کیونکر ہو؟ اردو کے اتنے
…از معتبر ادارے وجود میں آچکے ہیں۔
…نے اپنے طور پر افراد اور اداروں نے املا
…ے لے کر اصطلاحات تک بہت سے مسائل
…مغز زنی کی ہے. لیکن انتشار کے دور
…نے کی صورت نہیں پیدا ہوتی. کوئی ادارہ
…ئی طبقہ یا جماعت اس حیثیت میں نہیں کہ
…ائل کو طے کرے اور اصولوں کو نافذ کر سکے.
…ارھویں صدی تک انگریزی املا میں
…ی انتشار موجود تھا. لیکن بیسویں صدی
…تے آتے چند امریکی مستثنیات کو چھوڑ کر
…ار قائم ہو چکا تھا، جو شائستہ زبان کے لیے
…روری ہے.

ہمارے ناشرین کو معیار طباعت پر
…ی زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے. کتابت
و طباعت کی اغلاط بھی اردو کی ایک پختہ روایت
بن گئی ہے. اس کی وجہ سے بھی انتشار میں اضافہ
ہو رہا ہے. آپ کے پرچے میں خاصی احتیاط
برتی جاتی ہے. پھر بھی حسب روایت فروگزاشتیں
ہو جاتی ہیں. میرے مکتوب مطبوعہ ستمبر میں کئی
اغلاط تھیں مثلاً صفحہ ۶۳ پر آخری سطر میں "برتاؤ"
کی جگہ "افتاد".

جناب جنید احمد نے بجا طور پر فرمایا
کہ اصغر گونڈوی کو اس دور میں وہ توجہ نہیں
ملی جس کے وہ مستحق تھے. ناقدین کی یہ چشم
پوشی خاصی تعجب خیز ہے. جبکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر
نئے موضوعات نکالے جا رہے ہیں اور ان پر
خوب خامہ فرسائی ہوتی ہے. اصغر کا کلام مختصر
لیکن اردو غزل کا بیش قدر سرمایہ ہے اور غزل
کا موضوع ان کے ذکر کے بغیر تشنہ رہتا ہے
دراصل پچھلی چند دہائیوں میں انہی شاعروں کو
زیادہ اعتبار حاصل رہا ہے جو بڑے بڑے مشاعروں
میں شرکت کرتے اور برقیاتی میڈیا پر سنے
جاتے رہے. ناقدین نے بھی ان کی شہرت
عام سے متاثر ہو کر انہی کو لائق اعتنا سمجھا. اس کا
یہ مطلب نہیں کہ مشاعروں میں نظر آنے والے
شاعر نہ صرف جگر بلکہ اور بھی لائق اعتنا نہ تھے.
مگر ظاہر ہے کہ ان پر جتنا لکھا گیا، اصغر پر نہ لکھا
گیا. حالانکہ خود جگر انھیں اپنا پیر و مرشد
مانتے تھے. مولانا ابو الکلام آزاد نے اصغر کو
بہت سراہا مگر ان کے مقدمے میں داد
کے سوا ایک بھی تنقیدی نکتہ نہیں ملتا.
تعریف ہے. تنقید نہیں.

میں نے جگر کو بہت دیکھا اور قریب
سے دیکھا. اصغر کو بالکل نہیں دیکھا لیکن پچاس
کی دہائی میں اصغر کی غزل کا ایک مطالعہ پیش کیا

تھا جو میرے مجموعۂ مضامین "نکتہ راز" (۱۹۷۲ء)
میں بھی شامل تھا۔ یہ مجموعہ اب نایاب ہو گیا ہے
اس کے چند اقتباسات شاید دلچسپی کا باعث
ہوں۔ اور موضوع کو چھیڑا جاتے تو بحث کچھ
آگے بڑھے۔ میں نے لکھا تھا۔ "اصغر کی شاعری
کا امتیاز شگفتہ گوئی ہے۔ یہ شگفتگی ان کے انداز
میں بھی موجود ہے اور مضامین و مطالب میں
بھی۔ یہ ان کے کلام کی تعریفِ تمام ہے۔ اس
بات سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہو کہ اصغر
کی شاعری بڑی شگفتہ شاعری ہے مگر جس
عجلت کے ساتھ میں نے اس کو ان کی شاعری
کی تعریفِ تمام کہا اس کو تحسینِ ناتمام ضرور
کہا جا سکتا ہے اور مجھے اعتراف ہے کہ اس طرح
کے کلیے ناتمام ہی ہوا کرتے ہیں۔ . . اصغر
کے کلام کو اپنے دور میں رکھ کر دیکھیے یا اردو
شاعری کے تمام دائرے میں یہ ان کے
کلام کا مسکراتا ہوا انداز ہی ہے جو اسے
اردو شاعری کے پس منظر کی عام سوداویت
سے بھی ممتاز کرتا ہے اور انفرادی رنگوں
کی بوقلمونی سے بھی۔ ان رنگوں میں متانت،
ظرافت، شوخی، سرمستی، شکر خند اور زہر خند
بہت سے انداز ہیں۔ مگر وہ متانت آمیز
متبسمانہ انداز اور فقط ایک تبسم شکر، جو اصغر
کا رنگ ہے، اتنی ہمواری کے ساتھ اور کہیں
نہ ملے گا۔ یہی ایک بات کہ اصغر کی شاعری پر
گفتگو کرتے وقت رنگ اور ذائقے کی اصطلاحیں
زیادہ قابلِ فہم معلوم ہوتی ہیں اس کے مزاج
کی طرف کچھ نہ کچھ اشارہ رکھتی ہے۔
خالص حسنِ گفتار پر اصغر سے ذرا
پہلے یا اصغر کے زمانے میں کسی کی نظر اس
قدر نہ تھی جتنی کہ اصغر کی۔ فانی نے غالب

کی فارسیت کو اس کے کمال کا جزو
اپنے ہاں برقرار رکھا۔ اصغر نے
کی فارسیت کو کم کر کے بڑی شیر
کے ساتھ شستہ غزل کہی جس نے
کی توجہ کو زیادہ تر لطافت و متانت
اسی حسین امتزاج کے زور پر کھی
حرارت بہت کم ہے مگر مرمر کا سا
اور گلدستے کی سی شگفتگی ضرور
اصغر نے محبوب اور محبت کے
تصورات پر بھی نظر ثانی کی۔ بعض اس
میں ان کا کام بھی دشنہ و خنجر کے
چلا ہے۔ مگر قاتل اور رقیب کو سب
انہی نے شہر بدر کیا۔ ناصح بھی کہیں
جگہ ہی تشریف لاتے ہیں۔ وا
چند بار آئے ہیں مگر اصغر کی متانت
کو رسوا ہونے سے بچا لیا ہے۔ انھو
بڑے سنجیدہ اشعار میں جگہ پائی ہے
حسن کے تصور میں بھی اصغر
نہ صرف خوش مذاقی بلکہ انفرادیت
ہے۔ ہماری غزل میں حسن کا تصو
کار رہا ہے۔ ایک مرض سے خالی ہے
جو ہر سے خالی۔ ایک طرف اگر کر
تو دوسری طرف تمام سراپا غائب او
خالص اعتباری۔ اصغر کے ہاں تق
رجحان کے باوجود حسن محض ایک مو
نہیں خاصا معلوم ہے۔ اس کے رُ
اور چہرے پر تبسم نظر آتا ہے۔ مگر
پر پورا اعتبار پھر بھی تمام نہیں ہوتا
بہت کم ہیں۔ . . حسن سے زیادہ
محقق اور اہم ہے۔
اصغر کو اعتراف ہے کہ انھوں

(حقیق)ت نہیں پہنچائی . . . تاہم جو خصوصیات
(انھ)وں نے حسن سے منسوب کی ہیں ان میں بعض
(گہ)رے مطالب موجود ہیں۔ اس کی بے نیازی
(و)کم آمیزی کو وہ اپنی جستجو کا ایک سبب یا
(با)نہ سمجھتے ہیں اور تمام زندگی حسن کے تصور
کے سہارے گزاری نظر آتی ہے۔

عشق ہی سعی مری عشق ہی حاصل میرا
یہی منزل ہے یہی جادۂ منزل میرا

کارفرما ہے فقط حسن کا نیرنگِ کمال
چاہے وہ شمع بنے چاہے وہ پروانہ بنے

ازل میں کچھ جھلک پائی تھی اس آشوبِ عالم کی
ابھی تک ذرے ذرے میں ہے حالت رقصِ پیہم کی

نظامِ دہر کیا بیتابیوں کے کچھ مظاہر ہیں
گدازِ عشق گویا روح ہے اجزائے عالم کی

بیخود و محو جسم و جاں مست زمین و آسماں
حسن نے دستِ ناز سے چھیڑ دیا ہے سازِ عشق

یہ تصوف کے خاص مطالب ہیں جنھیں اصغر نے بے شک بڑی خوبی و استواری سے نظم کیا ہے۔ تاہم . . . ان کی شاعری کے اس پہلو نے غزل پر کوئی خاص اثر چھوڑا . . . اصغر کا رجحان کلاسیکی تھا۔ جدید ذہانی مذاق کو یہ شاعری بہت پُر تکلف معلوم ہوتی ہے اس میں ایک آنچ کی کمی اور ذرہ بھر تلخی کی کمی ہے . . . بناوٹ ہے بانکپن نہیں . سرمستیاں بھی قاعدے کے حدود میں ہیں۔

شان الحق حقی
خیابانِ تنظیم، کراچی (پاکستان)

پیش نظر شمارے میں ڈاکٹر عصمت جاوید کا مضمون "فنِ تاریخ گوئی" بڑے کام کی چیز ہے اور جی لگا کر قلمبند کیا گیا ہے۔ موصوف کو میری طرف سے مبارکباد۔ اپنی والدہ اور اپنے استاد کی وفات پر میں نے جو نظمیں کہی تھیں ان میں شامل تاریخ ہائے وفات اس لیے خاص طور پر مشہور ہوئی تھیں کہ یہ تاریخیں کامل مصرعوں میں تھیں جو طویل بحروں پر مشتمل تھے نیز حادثے سے مناسبت اور شعری لطافت و رعایت لفظی کے حامل تھے۔ جانے کیوں عصمت جاوید صاحب کی نگاہِ التفات ان اشعار پر نہیں پڑی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع پر بات چلی ہے تو ادبی حلقوں کو مذکورہ بالا تاریخیں یاد دلا دی جائیں۔

استاذی مرحوم شادؔ عارفی کے انتقال بعد میں نے اپنی تعزیتی نظم "برزدلی" میں آخری شعر کہا تھا:

یہ کوئی طریقہ ہے، طنز لکھیں نہیں کرتے شادؔ عارفی صاحب
یہ بھی طنز ہی ہوگا، مر کے بھی نہیں مرتے شادؔ عارفی صاحب

اور والدہ مرحومہ کی لوحِ مزار کے لیے جو تاریخی قطعہ کہا تھا اس کا مقطع ہے۔

وفات کا سن انھیں میں پنہاں ہے اے مظفر
مزارِ خاتونِ فاطمہ پر جو پھول برسے

مظفر حنفی
اقبال پروفیسر، کلکتہ یونیورسٹی۔

فن تاریخ گوئی پر "کتاب نما" میں مضامین کا سلسلہ نیک فال ثابت ہوا، جس کی وجہ سے الحمد للہ اس فن کے مستور گوشے مشہود ہو گئے اور نہاں پہلو عیاں ہوئے۔ دس گیارہ سال قبل میں نے "ہماری زبان دہلی یا "پاسبان" چنڈی گڑھ میں ایک مضمون بعنوان "قلمی نسخوں کی تاریخ تصنیف کا تعین" لکھا تھا۔ اس میں اشارہ

کہا گیا تھا کہ قدیم مخطوطات میں تاریخ تصنیف کے استخراج کے لیے صوری و معنوی مادۂ تاریخ کا استعمال کیے جانے کے باوجود بعض نسخوں کی تاریخ اخذ کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس کی کئی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی تھی کہ اکثر اوقات ان میں مادۂ تاریخ گنجلک، نہایت مبہم اور غیر واضح ہوتے ہیں۔ مثالوں میں سے ایک مثال محمد عادل شاہ (۱۰۳۷ھ۔۱۰۷۶ھ) والیٔ دکن کے دور کے شاعر صنعتی کی دو مثنویوں کی دی گئی تھی۔ اس کی دونوں مثنویوں میں مادہ تاریخ غیر واضح ہونے کی وجہ سے سو سال کا بُعد پیدا ہو گیا ہے اور آج تک یہ مسئلہ لاینحل رہا ہے کہ آیا یہ ایک ہی شاعر کی تخلیقات ہیں یا ایک ہی تخلص کے دو شاعروں کی۔ صنعتی کی پہلی مثنوی قصۂ بے نظیر کا مادۂ تاریخ "ہزار ایک پر سال پنجم و پنج" ہے اور دوسری مثنوی "گلدستہ" یا قصۂ "فغفور چین" کے مصرع تاریخ "یو صدیہ دیا دل لگت صنعتی" سے گیارہ سو انسٹھ مستخرج ہوتے ہیں۔ دونوں مثنویوں کے درمیان ۱۰۴ سال کا فرق ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے صنعتی تخلص کے دو شاعر مانے ہیں۔

مولانا نجیب اشرف ندوی مرحوم نے اس بُعد کو ختم کرنے کے لیے "گلدستہ" کا مادۂ تاریخ بجائے پورے مصرع کے "دل لگت صنعتی" کو سمجھا ہے اور محترم اکبر الدین صدیقی صاحب سابق ریڈر جامعہ عثمانیہ نے اس کی توثیق کی ہے۔ میں نے بھی اس معاملے میں اپنی رائے پیش کی تھی جس کی تفصیل مضمون میں ہے۔ یہاں اس کی وضاحت غیر ضروری ہے۔

اب جب کہ یہ مضامین نظروں سے گزر[ے] تو مندرجۂ بالا مسئلہ کے حل کی ایک صورت [نظر] نکل آئی۔ جو یہاں پیش کرنے کی جسارت کر [رہا] ہوں۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔

فن تاریخ گوئی میں "صنعت تخرجہ" [یا] صنعت ریاضی جمع و تفریق" کا بھی استعمال ہوتا [ہے]۔ اول الذکر پر الحمد للہ محترم ڈاکٹر عصمت جاو[ید] صاحب کے مضمون میں تفصیل سے روشنی ڈا[لی] گئی ہے۔ اس صنعت کے ذریعہ اگر "یو صدیہ دیا دل لگت صنعتی" سے تاریخ تصنیف مستخرج کر[یں] تو "یو صدیہ" کے چالیس عدد "دل لگت صنعتی" کے ۱۱۰۴ سے منہا کرنے پر ۱۰۶۴ حاصل [ہوتے] ہیں۔ اس طرح دونوں مذکورہ مثنویوں [کی] تاریخ تصنیف میں صرف ۹ سال کا بُعد باقی ر[ہے] گا۔ ایک شاعر کی دو تخلیقات میں اتنا فرق ق[رین] قیاس ہو سکتا ہے۔

بہر حال! استخراج تاریخ میں ایسی دشوا[ریوں] سے بچنے کے لیے فنکاروں نے چند بنیا[دی] اصول اس فن کے لیے منضبط کیے ہیں۔

(۱) مادۂ تاریخ واضح ہو۔

(۲) بھرتی کے الفاظ نہ ہوں۔ بالخصوص ما[دۂ] تاریخ میں تو اس سے اجتناب ضروری [ہے]۔ مثلاً "آج اب نجم نفیس ملا" یہاں آج اور [اب] دونوں الفاظ بھرتی کے ہیں۔ اس سے ش[عر کا] حسن بھی مجروح ہوتا ہے اور استخرا[ج] کی صنعت بھی۔

(۳) واقعات مادۂ تاریخ کے شعر یا [مصرع] تاریخ سے متشرح ہوتے ہیں۔ جیسے "[ہائے] افتاد شہریار[ا] شاہ آصف جاہ" نے "یہ تاریخی واقعہ کا غماز ہے۔ ایسے اشعار [یا] فن تاریخ گوئی میں نہایت مستحسن ما[نے] جا[تے ہیں]

(۴) تعمیہ و تخرجہ سے پاک ہوں۔ البتہ اچھا پہلو نکلے تو صنعت میں شمار ہوگا۔

(۵) مادۂ تاریخ واقعات و حالات کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً دیوان داغ کی تاریخ کا مصرع ہے۔ ع <u>باب ہے رحمت کا</u> یہ "عشرت لکھنوی کہتے ہیں کہ "یہ تاریخ اگر کسی پھاٹک کی ہوتی تو موزوں تھی، مگر دیوان مہتاب داغ سے اس تاریخ کو کیا نسبت"۔ [1]

(۶) پورے مصرع سے استخراج تاریخ مطبوع سمجھی گئی ہے۔

(۷) الفاظ کا دروبست تخرجہ و تعمیہ کے مطابق ہو۔

(۸) تخرجہ ۱۰ عدد تک کراہتاً جائز ہے، زیادہ کا معیوب۔ وغیرہ وغیرہ۔

دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ ابھی تک کے مضامین میں تاریخ گوئی کی دیگر دو اصناف پر کسی نے توجہ نہیں دی۔ ان میں سے ایک صنف "نادر" اور دوسری صنعت "ریاضی جمع و تفریق" ہے۔

"صنعت نادر" منشی دھنپت رائے خیرآبادی کی ایجاد بتائی جاتی ہے۔ اس صنعت میں ابجد کے اعداد کو لفظوں میں منتقل کر کے پھر ان کے عدد نکالے جاتے ہیں اور پھر انھیں جوڑ کر تاریخ نکالی جاتی ہے۔ اس طرح اس صنعت میں الف کی قیمت بجائے ایک کے تیس ہوتی ہے۔ "ب" کی بجائے دو کے دس، ج کی بجائے تین کے ۴۵ اسی طرح غ کی بجائے ہزار کے ۲۱۳ ہوتی ہے۔ مثال کے لیے صنعت نادر میں نکالی ہوئی جوہر کی تاریخ کا یہ شعر ملاحظہ ہو

[1] عشرت لکھنوی، "شاعری کی چوتھی کتاب"۔ لکھنؤ تاریخ ندارد ص ۴۶

آرزو تھی بصنعت نادر		حال رحلت کا کیجیے ترقیم
ہاتف غیب نے کہا جوہر		<u>باغ جنت سے مل گیا تسلیم</u>

ب ا غ ج ن ت ت س ل ی م

۲ یک ہزار سہ پنجاہ چہارصد چہارصد شصت سی دہ چہل

۱۰+۳۰+۲۱۳+۴۵+۹۱+۳۰۴+۱۴۳+۷۹+۷+۹+۳۸۵ = ۱۸۹۲ء

دوسری صنعت "ریاضی جمع و تفریق" کی ہے۔ اس میں مصرع کے معنی و مفہوم کے مطابق جمع و تفریق کی جاتی ہے۔ مثلاً

جب سے تسلیم سخنور ہائے دنیا سے گئے
روح ان کی باغ جنت میں پس بخشش گئی
ہوگئی تاریخ <u>بے حظ</u>، ناشری میں آیا <u>نقص</u>
نظم سے خوبی اٹھی، اشعار سے بندش گئی

۳۵۴-۵۷۰+۶۱۸-۹۹۰		۲۱۰+۷۹۱+۹۰۸-۱۲۱۱

۲۱۶ + ۳۷۲ + ۱۰۰۱ + ۳۰۳

۵۸۸ + ۱۳۰۴

۱۸۹۲ء

اس شعر میں "ہوگئی" "اٹھی" اور "گئی" الفاظ تخرجہ کی علامات ہیں اور "آیا" تعمیہ کی۔ پس "تاریخ" کے اعداد سے "بے حظ" کے عدد منہا ہوئے "ناشری میں "نقص" کے عدد منہا کر لیے گئے۔ پھر باقی سارے اعداد کی جمع کرنی گئی اور حاصل جمع سے تاریخ ۱۸۹۲ء نکل آئی۔

دیگر اصناف کے بالمقابل محولہ بالا دونوں اصناف نہایت دشوار ہیں۔ لیکن چونکہ صنعت میں شمار ہوتی ہیں، اس لیے یہاں ان کا تعارف کرا دیا گیا۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، قلعہ مسجد وارڈ، دارو ہ

● عجیب اتفاق ہے کہ مجھے کتاب نما کا وہی شمارہ تادم تحریر نہیں ملا جس میں فن تاریخ گوئی پر میرا مضمون شائع ہوا ہے۔ بہرحال میرے

ایک نادیدہ کرم فرما اور کتاب نما کے قاری جناب خمار رمل نیری نے بھیونڈی سے میرے نام ایک خط لکھ کر چند تسامحات کی طرف میری توجہ دلائی ہے۔ میں ان کا شکرگزار ہوں اور چاہتا ہوں کہ قارئین بھی درست فرمالیں صفحہ ۱۵ پر دو مقامات پر "ال" کے اعداد بے خیالی میں چالیس لکھ دیے گئے ہیں حالانکہ ۱ + ۳۰ اکتیس ہوتے ہیں چالیس نہیں۔ اسی طرح صفحہ ۲۲ پر جہاں چالیس لکھا ہوا ہے۔ اسے پچاس سمجھیں کیونکہ "ن" کے عدد پچاس ہیں اور صفحہ ۲۰ اور ۲۱ پر جہاں جہاں دفترمومن چھپا ہے اس میں دفتر کی جگہ دختر ہونا چاہیے۔ دخترمومن کے اعداد ۱۳۴۰ ہوتے ہیں۔ دفترمومن کے نہیں یہ میرے قلم کا سہو ہے۔ کاتب کا قصور نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مضمون میں کتابت کی غلطیاں ہیں ہی نہیں۔ کتابت کی چھوٹی موٹی غلطیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں میں انھیں نظر انداز کر دیتا لیکن (جب کتاب نما کا شمارہ ایک صاحب سے منگوا کر پڑھا تو پتا چلا کہ) ص ۱۵ پر ایک عبارت کتابت ہونے سے رہ گئی ہے جس کی وجہ سے جملے کا مفہوم ہی خبط ہوگیا ہے قارئین اسے درست کرلیں۔ چھپا ہوا جملہ اس طرح ہے۔

"یاد رہے کہ ان حروف کے ناموں کے اردو تلفظ یعنی بے۔ تے رے وغیرہ کو بنیاد بنا کر ایک اور طریقۂ عدد شماری بھی مستعمل ہے۔ اصل جملہ یوں تھا۔

"یاد رہے کہ ان حروف کے ناموں کے اردو تلفظ۔ یعنی بے تے رے وغیرہ کو بنیاد بنا کر ی۔ کے دس عدد دینا غلط ہے۔ ایک اور طریقۂ عدد شماری بھی مستعمل ہے۔

ص ۱۸ پر خود تاریخیں کے ضمن میں میں نے جو دو مثالیں دی ہیں۔ ان کے بارے میں خمار صاحب نے یہ سوال اٹھایا ہے جو منطقی اعتبار سے بالکل درست ہے کہ پہلی مثال میں غرائب الجمل کے اعداد ۱۳۱۷ ہوتے ہیں جو سن ہجری ہے اور پورے مصرعے کے اعداد ۱۹۰۸ ہوتے ہیں جو سن عیسوی ہے۔ یہ دوسری مثال میں پہلے مصرع کے اعداد ۱۹۱۱ ہیں جو سن عیسوی ہے۔ اور دوسرے مصرعے کے اعداد ۱۳۲۹ ہیں جو سن ہجری ہے۔ جب سن عیسوی یعنی ۱۹۱۱ اور ۱۹۰۸ میں تین سال کا فاصلہ ہے۔ تو ۱۳۱۷ اور ۱۳۲۹ میں بھی تین سال ہی کا فاصلہ ہونا چاہیے۔ حالانکہ ان دونوں کے درمیان بارہ سال کا فاصلہ ہے۔ ظاہر ہے کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہوئی ہے۔ کیونکہ اعداد کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ حساب جمل سے یہ چاروں اعداد صحیح ہیں ان میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں لیکن غلطی پہلی مثال میں سرزد ہوئی ہے کیونکہ دوسری مثال میں سن عیسوی ۱۹۱۱ اور سن ہجری ۱۳۲۹ میں مطابقت سن بالکل صحیح ہے لیکن پہلی مثال میں ۱۳۱۷ھ اور ۱۹۰۸ء میں مبیّنہ مطابقت غلط ہے۔ اگر ۱۳۱۷ ہجری کو سن عیسوی میں منتقل کریں تو ۱۸۹۹ سال عیسوی برآمد ہوتا ہے ۱۹۰۸ نہیں جبکہ مذکورہ مصرعے سے بحساب جمل ۱۹۰۸ ہی برآمد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تاریخ گو کی غلطی ہے۔ اس لیے قارئین صفحہ ۱۸ پر جہاں ۱۹۰۸ لکھا ہے اس کے آگے لفظ "غلط" بڑھا دیں ورنہ ذہن میں وہی اشکال پیدا ہوگا جس کی طرف خمار صاحب نے بجا طور پر اشارہ کیا ہے۔ اگرچہ نقل کفر کفر نباشد لیکن میں تو یہی کہوں گا۔

گناہ گرچہ نبود اختیارِ ما حافظؔ
تو بر طریقِ ادب باش و گو گناہِ منست

"کتاب نما میں اشاعت کے لیے اپنا مضمون بھیجنے کے بعد کسری منہاس صاحب کا ایک مضمون تحقیقات امیر مینائی (خطوط کی روشنی میں) مطبوعہ نقوش، سالنامہ (سال اشاعت ندارد. ممکن ہے سرورق پر درج ہو لیکن میرے سامنے جو جلد ہے اس کا سرورق ہی غائب ہے) نظر سے گزرا جسے پڑھنے کے بعد ایک نئی بات یہ معلوم ہوئی کہ امیر مینائی پہلے لفظ آئے، جائے، وغیرہ میں "ئے" کے دس عدد محسوب کرتے تھے. بعد میں بیس عدد شمار کرنے لگے۔ ایک خط بنام مولوی نعیم الحق میں امیر مینائی فرماتے ہیں۔

"(آئی اور آئے) (گئی اور گئے) سب میں دوہری ”ی“ خیال کی جاتے اور بیس عدد دیے جائیں پہلے میرا خیال تھا کہ ”آئے“ میں دس عدد اور ”آئی“ میں بیس عدد شمار کیے جائیں مگر اب بعض وجوہ سے یائے معروف اور یائے مجہول دونوں کے بیس عدد قرار دیے ہیں" پھر لکھتے ہیں۔

"جو مورخ "آئی" کے گیارہ عدد لیتے ہیں ان کا مشرب ضعیف ہے البتہ "آئے" کی قیمت عددی کے متعلق اساتذہ کے دو مسلک ہیں (۱) ایک یہ کہ جب "آئے" بر وزن فاع ہو تو اس کے گیارہ عدد لیے جائیں (۲) دوسرے یہ کہ جب "آئے" بر وزن فعلن ہو تو اس کے اکیس عدد لیے جائیں اور ایسی یائے مجہول شوشہ دار لکھی جائے اس بنا پر کہ تاریخ میں حروف مکتوبی معتبر ہیں"

کسری منہاس صاحب نے اہم اطلاع دی ہے کہ اس خط کے تحریر کرنے سے قبل والی "حضرت امیر" کی جتنی تاریخیں ہیں دستیاب ہوتی ہیں ان میں یائے مجہول (مشبع یعنی بر وزن فعلن) اور غیر مشبع (یعنی بر وزن فاع) دونوں کے دس عدد شمار کیے گئے ہیں، مثلاً۔

ع گل کھلائے یہ داغ نے کیسے ۱۲۹۶ یائے مجہول مشبع
ع قمر دو آئے ہیں برج شرف میں - ۱۳۱۱ یائے مجہول غیر مشبع (اقتباس ختم)

تاریخ کہنے والے حضرات کو خاکسار کا یہ مشورہ ہے کہ وہ ہمزہ دار ”ی“ کو، چاہے وہ معروف ہو یا مجہول، مشبع ہو یا غیر مشبع صرف دس عدد ہی محسوب کرنے کا چلن ڈالیں اصولی طور پر یہی درست ہے کیونکہ بقول امیر مینائی تاریخ میں حروف مکتوبی معتبر ہیں۔ اس لیے ان کا یہ مشورہ بھی محل نظر ہے کہ ایسی یائے مجہول (یعنی مشبع) شوشہ دار لکھی جائے۔ یہ خواہ مخواہ کا تکلف ہوگا۔ میری ناقص رائے میں اگر ”ی“ کے دس عدد شمار کرنے کا چلن عام ہو گیا تو اس غلطی کا سدّباب ہو سکے گا جو اساتذہ سلف سے سرزد ہوئی ہے۔

ڈاکٹر عصمت جاوید
اورنگ آباد۔ ایم۔ ایس

تقریباً بارہ سال بعد آپ سے مخاطب ہوں۔ ستمبر اور اکتوبر کے کتاب نما کے شمارے مل گئے ہیں جس کے لیے شکریہ قبول کیجیے۔ ۸ سال تک آندھرا پردیش اردو رسالہ کا مدیر رہا اور چار سال قبل اچانک مستعفی ہو کر گھر بیٹھ گیا اور پھر ایک دن کانگریس پارٹی سے بھی ناتا توڑ لیا اور ۴۴ سال کی وابستگی کو ختم کر لیا ——:
یہ سمجھیے کہ ان دنوں گوشہ نشیں ہوں ——!
اردو کی ترقی و ترویج میں مکتبہ جامعہ کا

جو حصہ رہا ہے اس کی تعریف کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی حال انجمن ترقی اردو ہند کا ہے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب بس یہ سمجھیے کہ اردو کا ایک دیوانہ اردو کی بوسیدہ عمارت کو تھامے ہوئے ہیں۔ حیدرآباد میں عابد علی خاں صاحب ہیں جو اردو صحافت کی آبرو بنے ہوئے ہیں اور اردو ٹرسٹ کے ذریعہ اردو زبان کو سہارا دیے ہوتے ہیں۔

شاہد صاحب! گھریلو شاعری، دیوان خانوں کی شاعری، مشاعروں کی شاعری ترقی پسند شاعری۔ جدید شاعری، قدیم شاعری اور آزاد شاعری کی باتیں پھر کبھی ہوں گی میں آپ سے صرف یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ملک بھر میں آٹھ یا دس اردو اکیڈیمیاں قائم ہیں اور ان اکیڈیمیوں پر ریاستی سرکاریں ایک کروڑ روپیے سے زائد رقم خرچ کر رہی ہیں اتنی خطیر رقم سے اردو کی ترقی میں کیا پیش رفت ہوئی ہے اور گذشتہ پندرہ سالوں میں کتنے ہزار غیر اردو والوں کو اردو لکھنا پڑھنا سکھایا گیا ہے؟

آپ یہ کہیں گے کہ اردو اکیڈیمیاں ادیبوں اور شاعروں کو مالی مدد فراہم کر رہی ہیں، انعامات اور اعزازات دے رہی ہیں سمینار اور مشاعرے منعقد کرتی ہیں کتابوں کی اشاعت کا انتظام کرتی ہیں وغیرہ وغیرہ! تو کتابوں کی اشاعت کا کام تو خانگی ادارے تو کئی ایک ہیں جو انجام دے رہے ہیں تو اردو اکیڈیمیاں یہ کام کر رہی ہیں تو کوئی لائق تعریف بات نہیں ہے سمیناروں اور مشاعروں سے اردو کی ترقی و ترویج ممکن نہیں ہے تو پھر اردو اکیڈیمیوں سے اردو والوں کا کیا فائدہ؟

آندھرا پردیش میں اردو میڈیم کے سیکڑوں سرکاری مدارس ہیں اور ہزاروں طلبہ ان مدارس میں پڑھتے ہیں اور ان طلبہ میں ایک بھی ہندو طالب علم نہیں ملے گا۔ یہی حال ہندوستان بھر کا ہے مرکزی حکومت اور ریاستی سرکاروں نے اردو کو مسلمانوں کی زبان بنا کر محدود کر دیا ہے۔ اور اردو ہندوستان کے چند لاکھ مسلم گھرانوں کی مادری زبان بن کر رہ گئی ہے جبکہ کسی بھی ریاست اور مرکز میں اردو کی کوئی سرکاری حیثیت باقی نہیں رہی ہے۔ اور اگر ہے بھی صرف سرکاری نافون تک محدود ہے۔ سرکاری دفاتر سے اردو کو باہر نکال دیا گیا ہے۔ اردو کتابیں اور اخبارات خریدنے والوں میں ہر روز کمی ہوتی جا رہی ہے۔ دیہی علاقوں میں اردو خط یا قدیم دستاویز پڑھنے کے لیے کسی مسجد کے مولوی صاحب کو تلاش کرنا پڑتا ہے اور آ کی نئی نسل اردو سے بے بہرہ ہے۔ یہ حقیقت ہے اور اس تلخ حقیقت کو ایک عام اردو بولنے والا تسلیم کرتا ہے۔

اردو بولنے والے لاکھوں افراد میں سے صرف چند ہزار ایسے ملیں گے جو اردو کے افسانوں اور تنقیدی مضامین کو پڑھنا گوارا کریں گے۔ ایک آم بیچنے والا، پیاز اور املی فروخت کرنے والا۔ ٹھیلہ چلانے والے کو تنقیدی کتابوں سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے۔ تو پھر یہ تنقیدی کتابوں تحقیقی مقالوں یہ شاعری و ادب کے بزرگ سے ایک عام اردو بولنے والا کیا استفادہ کر سکتا ہے ــــ؟ نام نہاد خادمان ا

ورارددے سیاسی بازیگروں سے دریافت
باجاسکتا ہے کہ اردو کی ترقی وترویج کا پیمانہ
با ہے۔؟ اردو کی سرکاری حیثیت کیا ہے۔
درارددو مسلمانوں سے ہٹ کر دوسرے
بقات میں کہاں تک مقبول ہے اور دوسرے
بقات کے کتنے ہزار لڑکے اور لڑکیاں
ردو لکھنے پڑھنے میں مصروف ہیں ۔۔؟
نقلاب، قومی آواز، شمع، کتاب نما، ہماری زبان
سیاست، ہمارا قدم، رہنمائے دکن، نئی دنیا،
ٹر اردو وغیرہ یہ اردو کے چراغ ہیں اور
ن کو جلائے رکھیے جب تک آپ لوگوں میں
ہمت ہے کیونکہ اردو زبان ہندستان کے
ستور میں چودھویں نمبر پر ہے اور ترقی کے
لیے یہ نمبر کب آئے گا پتا نہیں ہے۔
اردو اکیڈیمیوں کے مشاعروں،
سیمینارز وغیرہ میں تقاریر کو سن کر ایسا
لگتا ہے کہ سارا ملک اردو داں ہے مگر ان
مقررین کو یہ پتا ہی نہیں ہے کہ ان کے گھر کے
باز و پڑوسی کے بچے بھی اردو سے نابلد ہیں
مشاعروں کی واہ واہ سے ہٹ کر غیر مقدمی
جلسوں کی رنگارنگی سے ہٹ کر اردو والے
حقائق کا سامنا کریں اور یہ تسلیم کر لیں کہ اردو
فارسی کی طرح ختم ہو رہی ہے۔ اور آیندہ
پچاس سال میں یہ زبان محدود ہو کر رہ جائے گی
کیونکہ اردو کا مستقبل ہندستان میں تاریک
ہے اور اس کی ذمّے داری اردو کے محبان اور
اردو کے نام نہاد خادموں پر عائد ہوتی ہے
جو سرکاروں نے مقرر کر رکھے ہیں۔!

ملک محمد علی خاں۔ جرنلسٹ
۹۲-۱-۱ اُدپل حیدرآباد ۲۹

(تبصرہ نگار کی رائے سے اڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں)

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

تحریریں

مصنف: اسلم پرویز
مبصر: سید الظفر چغتائی۔
ناشر: نئی آواز۔ جامعہ نگر نئی دہلی۔ ۲۵
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵۔
صفحات: ۱۵۲۔ قیمت: ۵۱ روپے۔

کتاب بائیس تحریروں کا مجموعہ ہے۔ زیادہ تر تاثراتی تنقیدی مضامین ہیں۔ ایک لسانیاتی ہے اور چھ کتابوں پر تبصرے۔ زیادہ تر سوچ کے تجزیہ کرکے مواد مہیا کرکے لکھے ہیں۔ رویہ مورخ کا ترقی پسندانہ ہے۔ زبان پر عبور، تحریر میں چاشنی۔ موضوع پر پہلے تنقیحات قائم کر لیتے ہیں۔ پھر ان پر مضمون اٹھاتے ہیں۔ اچھے نظریے کی پہچان ہوتی ہے کم سے کم اصولوں پہ زیادہ سے زیادہ مشاہدات کی تشریح، لیکن صورتِ حال اتنی جداگانہ ہو سکتی ہے کہ طبیعیات و ریاضی تک میں ایک اصول نہ لگے۔

اردو رسم خط کا تجزیہ معلوماتی اور مفید ہے۔ حروف کو پندرہ بنیادی شکلوں میں گھٹا لائے ہیں۔ انھیں ابتدائی، درمیانی اور آخری شکلوں میں بانٹا ہے اور صوتی رشتے بھی سمجھائے ہیں۔ نونِ غنہ اور ہکاری آوازوں سے بھی بحث کر لینی چاہیے تھی۔

اردو کے "احتجاج سے انقلاب" تک جانے میں انفرادی آزادی کے مسئلے پہ بھی لکھنا چاہیے تھا کیوں کہ اس کی سیاسی نہ سہی، سماجی اہمیت بڑی ہے۔ "احتجاج جب تک روایت نہیں بن جاتا اس میں سر اٹھانے کی ہمت تو ہوتی ہے لیکن سر بچانے کی طاقت نہیں ہوتی۔" یہ نفسیاتِ قیادت کا مسئلہ خوبی سے پیش کیا ہے جس پہ عبدالماجد دریا بادی نے ۱۹۱۳ میں کتاب لکھی تھی۔ حالی کے سیاسی (و سماجی) شعور کو بجا طور پہ سراہا ہے جس پر جذبی نے کوئی پینتیس سال پہلے اپنا تحقیقی مقالہ مرتب کیا تھا۔

آغا حشر بلاشبہ اپنے دور کے بہت اہم اردو ڈراما نگار تھا۔ مگر تھیٹر کا منصب کھیل تماشے میں عوامی تعلیم بھی ہے اور سماج کو اوپر اٹھانا بھی۔ ڈراما نگاری افسانہ و ناول لکھنے

زیادہ پابند لہٰذا مشکل اور خالص تر کام ہے، زیادہ موثر بھی۔ اس میں جان بوجھ کے
دل کی کشیدگی کم کرنے اور جاذبیت برقرار رکھنے کی خاطر کہیں کہیں مسخرہ پن داخل کر دیا جاتا ہے۔
نیاز فتح پوری، خواجہ حسن نظامی، داغ اور اردو میں رپورتاژ یہ تحریریں مُدَلّل اور پُر مغز
گو کہ خواجہ صاحب کے بارے میں شروع شروع خاصا مبالغہ ملتا ہے۔ "انتہائی" اور "بے پناہ"
کے الفاظ احتیاط طلب ہیں۔ پیش کردہ نثر کے نمونوں میں تکرار ہے اور مبالغہ بھی۔ نیند کی
ہی ضرورت نظر انداز کرنے کے بجائے، بیداری کا پورا وقت کام میں لانے کی تلقین کرتی
ہے۔ بدایوں کے للاّ کی فارسی کے ذکر پہ ذہن چیخ پڑتا ہے "اور جو ہمارے آج کے
دو لکھنے والے انگریزی میں سوچتے ہیں؟"۔
بہادر شاہ ظفر پہ تین مضمون ہیں۔ مگر ان سے ظفر کی شاعری میں کوئی خاص بات نہیں نکلتی۔
الی کیتکی" والا مضمون مصنف کے عام معیار سے نیچا ہے۔
غالب کی شاعری اتنی بڑی ہے کہ اس پہ لکھیے تو لطف آ ہی جاتا ہے۔ دونوں مضمون
ھنے والے ہیں۔ لیکن مصنف مومن کو جہاں "اپنے نہاں خانۂ عشق میں واپس لاتے ہیں،
ہوں گا وہاں سے مومن ابھرے ناظم نہ رد کے شاعر ہوتے ہیں۔ غالب "ایک ساتھ رند
تھے، اچھے خاصے دنیادار بھی اور صوفی منش بھی" یہ جملہ اسلم پرویز صاحب سے تجزیے کا
البہ کرتا ہے جو وہ بخوبی پورا کر سکتے ہیں۔ "بڑا شاعر اپنے لیے ایک نئی راہ ضرور منتخب کرتا
صرف شعوری یعنی غیر ارادی طور پر۔
زبان تو بجائے خود علامتوں ہی کے نظام کا نام ہے۔ بڑے پتے کی بات ہے مگر مضمون
غالب کے کئی داغدار اشعار آ گئے ہیں: "وا اٹھے پھر آئے ہیں۔" جو یہ کہتے (جو ہے کہے) ہنرمانے
عاشق جنون" سب میں عیب ہے۔ اس کے برعکس "ہے خبر گرم ان کے آنے کی + آج ہی گھر میں
بانہ ہوا" کے مفہوم کو ظالم نے اپنے وکیلانہ استدلال میں بہت محدود اور پست کر دیا ہے۔
کتابوں پہ تبصرے خوب ہیں اور حق ادا کرتے ہیں۔ "لاشریک" پڑھ کے کسی ڈپٹی صاحب
مرزا مجوش پہ رشید احمد صدیقی کا تعارف یاد آتا ہے۔ ممتحنوں کے صفحے ڈپٹی صاحبوں کے قصے
کرتے گئے اور آخر میں "ہم نشیں" ردیف والی غزل کے چند شعر نقل کر دیے تھے۔ "سر کے
نا" اچھی ہجو ملیح ہے۔
کتابت کی ایک دو غلطیاں رہ گئی ہیں: سرہانے میر کے آہستہ بولو صفحہ ۱۸۰ اخلاط صفحہ ۱۳۰۔
پرویز صاحب آئیڈیل (مثالی اور مقصد دو معنوں میں)، کامک (ہنسانے والی) کمٹ منٹ
دی، وابستگی)، ڈسپلن (نظم و ضبط)، ایتھک (اخلاقیات)، ویولنتھ (لہر لمبائی)، کمیونیکیشن
(رابطے کی کمی) جیسے انگریزی الفاظ کے بھی اردو مترادفات دے سکتے تھے جیسا کہ انھوں نے
ہر جگہ بجا طور پر کیا ہے۔ اطالوی ادیب کا نام میں "البرتو مُراویا" لکھتا ہوں اور صفحہ ۳۰ "پہ ڈکھر"
سے مشتق ہے۔ یہ بھی خیال ہے کہ فاعلی آواز Active voice سے کام لے کے ہوا ہوتے،
بار وغیرہ سے بچ سکتے ہیں۔

اورنگ زیب

ایک نیا زاویۂ نظر

مصنّف: ڈاکٹر اوم پرکاش پرساد
مترجم: فیضان رشید
مبصر: سعید الظفر چغتائی
ناشر: خدابخش لائبریری، پٹنہ قیمت ۱۵/-
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی ۲۵

اورنگ زیب کو فرشتہ کہنے والے بھی اتنی ہی بڑی غلطی کرتے ہیں جتنی شیطان کہنے والے کوئی انسانی تصویر نہ صرف سیاہ ہوتی ہے اور نہ محض سفید۔ اورنگ زیب اتنا ظالم، سخت گیر ہندو دشمن، ہندستانی سلطنت کے زوال اور انگریزی حکومت کے قیام کا ذمے دار نہیں جتنا بتایا جاتا ہے۔" ہر تاریخی واقعہ براہ راست یا بل واسطہ اقتصادی وجوہ سے متاثر ہوتا ہے اورنگ زیب کو اپنے مخالفوں سے دشمنی تھی خواہ وہ باپ ہو یا بھائی، بیٹا، یا بیٹی، ہندو یا مسلمان۔ وہ آرام و آسایش کی زندگی سے دور رہا اور اس نے سرکاری خزانے کو زیر بار نہیں ہونے دیا، جس سے ملک کے غیر ملکی استحصال میں مدد ملتی۔ اس نے خراب حالات میں بھی خزانے سے زیادہ رعایا پر دھیان دیا۔ اور خرچے گھٹائے۔ اس کے زمانے کا ہندستان اشوک، سمندر گپت یا ہرش کے ہندستان سے کہیں زیادہ وسیع اور مکمل تھا۔ آپسی اختلاف کے باوجود خاص معاملوں میں اختلاف نہ تھا، اس لیے اس کے زمانے میں انگریزوں سے ہندو اور مسلمان کندھے سے کندھا ملا کے لڑے اور جس اتحاد کی بنیاد اشوک نے ڈالی اور اکبر نے مضبوط کی، وہ اورنگ زیب کے زمانے میں انتہا کو پہنچی۔"

یہ ہے خلاصہ پرساد صاحب کے زیر نظر مقالے یا کتابچے کا۔ ان کا کہنا ہے کہ جیسے اشوک کی بڑائی کے سامنے ہم اس کے ابتدائی زمانے کی زبردست مار کاٹ اور سرکاری خزانے کا پورے وقت مذہبی پرچار پہ خرچ بھول جاتے ہیں۔ ویسے ہی تاریخ میں اورنگ زیب پر بھی اکہری نظر نہیں ڈالنی چاہیے۔ اس نے صرف بادشاہ ہونے کے بعد چند برس اقتدار مضبوط کرنے کے لیے کٹر پن اپنایا اور سومناتھ کا مندر تڑوایا۔ ورنہ اپنے پچاس سال کی بادشاہت اور دس برس کی گورنری میں ہمیشہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ساتھ یکساں سختی اور نرمی کرتا رہا۔ اس لیے اسے مسلمان بادشاہ کے بجائے صرف بادشاہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے جس نے ملک کی سالمیت اور وسعت کے لیے کام کیا اور اسے بانٹنے یا کمزور کرنے کی ہر کوشش، چاہے وہ کسی طرف سے ہوئی ہو، سختی سے کچل دی۔

کتاب میں مختصر تمہید کے بعد چھے باب ہیں۔ (۱) حالات زندگی (۲) نظریہ (۳) مرکز کی مخالفت (۴) جزیہ وغیرہ (۵) سلطنت کا زوال (۶) آخر میں۔ خاتمے پہ آٹھ صفحے کے مفصل حوالے ہیں۔

مصنف نے اورنگ زیب کو حلیم و بردبار بنایا ہے، جس نے کئی بار موسیقی وغیرہ کے معاملے میں محتسب وغیرہ کو سختی کے خلاف روکا۔ مندروں، گرجا گھروں کی حفاظت کے

کے لیے فرمان جاری کیے۔ پرانے مندروں کی مرمت کرائی اور انھیں جگہ جگہ جاگیریں دیں، مگر نئے مندر کم بننے دیے۔ کاشی وشوناتھ مندر پر اس لیے کارروائی کہ وہاں پجاریوں نے بہت سی یاتری عورتیں غائب کرلی تھیں جن میں کچھ کی ایک رانی بھی شامل تھی اور بعد میں ان کی سڑی ننگی لاشیں برآمد ہوئیں۔ شرپسندی کی سزا میں مسجدیں بھی توڑی گئیں جیسے گولکنڈہ میں۔ بعض محکموں میں ہندو و مسلمان ملازموں کا تناسب برابر مقرر کیا۔ وہ فارسی، ترکی اور ہندی اچھی طرح بولتا تھا اور عرضیوں پہ حکم اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا۔

راجپوتوں اور افغانوں پہ اس نے حکمت عملی سے قابو رکھا۔ سکھوں کے معاملے میں گرو تیغ بہادر، گرو گوبند سنگھ اور ان کے دو بچوں کے دیوار میں چنن کے قتل کرانے کو مصنف ثبوت کا محتاج بتاتا ہے اور اس پہ پرانی سکھ تحریروں سے بحث کی ہے۔

جزیہ سے بحث کر کے مصنف نے لکھا ہے کہ مالدار ہندوؤں سے ۲½ فی صد جزیہ کا اوسط پڑ سکتا ہے۔ اسی قدر مسلمانوں سے زکات لی گئی۔ مگر یہ دونوں وصولیابیاں پورے زمانۂ حکومت میں نہیں ہوئیں۔ کچھ ہندوؤں نے سزا کے ڈر یا کسی لالچ سے اسلام قبول کیا، دوسروں نے کوئی رعایت قبول نہیں کی اور مسلمان نہیں ہوئے۔ اس معاملے میں زور زیادتی کا ثبوت نہیں ملتا۔

کتاب میں کلکتہ، بنارس، الہ آباد اور علی گڑھ مکتبۂ خیال کے مؤرخوں کے وافر حوالے ہیں اور اپنے موضوع کا صحت مند اور متوازن جائزہ ملتا ہے، جو بہت پڑھنے کے لائق ہے۔

تحریکِ ہجرت (۱۹۲۰ء)

مرتّب شاہد حسین خاں

صفحات: ۱۴۱ قیمت: ۵۴ روپے

پتا: ادارۂ تحقیقاتِ افکار و غیرہ، کراچی۔

مبصر: سعید الظفر چغتائی

ہجرت ایک مذہبی اصطلاح ہے جو خاص طور پہ ۶۲۱ء میں محمد الرسول اللہ کے مکے سے مدینے چلے جانے کو کہتے ہیں۔ کیوں کہ مکہ میں ان کا اور ان کے ساتھیوں کا رہنا مشکل ہو گیا تھا، جب کہ مدینے والے ان کے لیے آنکھیں بچھائے تھے۔ اس سے پہلے دو مرتبہ رسولؐ نے ساتھیوں کو پناہ لینے حبشہ بھیجا تھا اور بعد میں بہت سے بدوی بھی آ کے مدینے میں رہنے لگے تھے۔ ان معیاری مثالوں پہ اسلامی قانون بنانے والوں نے ہجرت، دار حرب اور دارِ اسلام کی اصطلاحوں کی تعریف کی اور دار حرب سے دار اسلام ہجرت کر جانے کے مسئلے سے بحث کی۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ۱۸۰۹ء سے کچھ پہلے یہ سوال انگریزوں کے مقبوضہ ہندستان کے بارے میں اٹھایا۔ پھر ۱۸۴۱ء اور ۱۸۵۷ء میں کچھ عالم اور

دوسرے مسلمان ان خیالات کے تحت حجاز ترک وطن کر گئے۔

۱۹۱۷ء میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف ریشمی رومال کی خفیہ باغیانہ تحریک چلائی تھی۔ خواجہ منظور احمد نے غالب کے بہت سے والہانہ اشعار پہ جن کا اثر بنایا ہے۔ سو برس بعد پہلی جنگ عظیم کے آخری زمانے میں علی برادران وغیرہ نے گاندھی جی کی پوری حمایت سے ترکِ موالات Non - Cooperation چلائی جو ملک میں بہت مقبول ہوئی۔ حکومت نے مطالبے نہیں مانے اور اس مایوسی کے ماحول میں "دارحرب" ہندستان سے مسلم حکومت والے "دار اسلام" افغانستان ہجرت کر جانے کی تحریک چل پڑی اور امان اللہ شاہ امیر افغانستان نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

جواں سال عزیز ہندی تحریک ہجرت کے روح رواں تھے۔ مرکزی خلافت کمیٹی کی مخالفت کے باوجود علی برادران ساتھ رہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی صحافت نے طاقت بخشی۔ گاندھی جی نے تائید کی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور شیخ الاسلام مولانا محمود الحسن دیوبندی نے مذہبی سند جواز عطا کی۔ لیکن محمد علی جناح، اقبال، حسرت موہانی، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر کچلو، آصف علی، خلیق الزماں جیسے سربرآوردہ سیاسی رہنما خلاف تھے، اور جمیعت العلماء ہند بھی۔ مولانا آزاد نے بیعت کی شرط پہ تائید کی اور شمالی ہندستان بھر میں اپنے انتظامی مرکز قائم کیے۔

زیادہ زور صوبہ سرحد، سندھ اور یوپی ہی رہا۔ جولائی سے ستمبر ۱۹۲۰ء تک کم ازکم ساٹھ ہزار لوگ افغانستان پہنچ گئے۔ اپنے گھر اجاڑ کے، ملازمتیں چھوڑ کے، جایدادیں اونے پونے بیچ کے، کھڑی پکی فصلیں چھوڑ یا جلا کے۔

اس دوران مرکزی خلافت کمیٹی نے خود ہندستان میں رہ کے انگریزوں کے خلاف آزادیِ وطن کے لیے اور خلافت کی حمایت میں جدّوجہد کا لائحۂ عمل بنایا تو مولانا آزاد تحریک ہجرت سے الگ ہوگئے۔ دوسری طرف انگریزوں نے مہاجروں کا راستہ تو نہیں روکا کہ اس سے جوش بڑھتا۔ مگر خود افغانستان میں سیاسی تدبیریں اختیار کیں۔ امیر پہ دباؤ ڈالا اور افغان باشندوں کو آنے والوں کے خلاف بھڑکایا۔ ترک وطن کرنے والے پریشان ہوئے اور قصہ مختصر کسان میں سے چوتھائی اس طرح گرتے پڑتے واپس آگئے جیسے گئے تھے۔ باقی کہیں ہندستان کے باہر بس گئے یا راستے میں کام آئے۔ انگریزی حکومت نے واپس لوٹنے والوں سے بہت اچھا سلوک کیا اور ان کے دوبارہ بسنے میں عملی مدد کی۔

اُس وقت ہندستانی برِّصغیر میں سات کروڑ مسلمان تھے۔ تحریک ہجرت کے رہنما چاہتے تھے کہ سات لاکھ بھر تیلے لوگ ہندستان کے باہر جا بسیں۔ تاکہ وہاں سے انگریز اقتدار کے خلاف زور وشور سے کارروائی کر سکیں۔ اس تحریک کی ناکامی سے سوراج ترکِ موالات اور خلافت کی تحریک کو فائدہ پہنچا یا مگر مسلمانوں کا باغیانہ جوش ٹھنڈا

یا۔ دورس نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا برکت اللہ سندھی اور راجا مہندر پرتاپ کی کابل میں
ری ہندستانی حکومت کے توسط سے یا اور طرح، نئی انقلابی روسی حکومت نے ہندستانیوں
رابطہ قائم کیا۔ ۱۹۲۰ء میں بمقام تاشقند ام ان رائے نے ہندستانی کمیونسٹ
ٹی قائم کی اور ماسکو ہندستانی معاملات میں دلچسپی لینے لگا۔

یہ ساری داستان تاریخی اسناد اور دستاویزوں کے ساتھ شاہد حسین خاں نے
کتابچے میں مرتب کی ہے۔ ڈاکٹر معین الدین خاں عقیل کا تحقیقی اور ڈاکٹر ابوسلمان
ہجہاں پوری کا فکر انگیز تجزیاتی مقالہ اس کی بنیاد ہیں۔ کتاب کے آخر میں ایک طویل
بہ ہے جس میں دوسری تاریخی دستاویزوں کے علاوہ اس موضوع پر مولانا عبیداللہ
ی اور مولانا آزاد کی تحریریں جمع کر دی گئی ہیں۔ کتابچہ محنت سے مرتب ہوا ہے۔
موضوع پر سیر حاصل ہے۔

ابوسلمان شاہجہاں پوری کے مقالے میں آزاد ہندستان پر بعض ایسی صحت مند
بدی بحثیں ملتی ہیں، جنھیں ہماری حکومت کو ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ
کے بڑی تعداد میں تقسیم کرنا چاہیے۔

ادبی اور تہذیبی خبریں

اردو تعلیمی میلہ

۱۳ نومبر ۹۱ء: دہلی اردو اکیڈمی نے "اردو تعلیمی میلے" کے موقع پر اردو کتابوں کی نمائش کا اہتمام بھی کیا اس نمائش میں دہلی اردو اکیڈمی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ترقی اردو بیورو، بچوں کا ادبی ٹرسٹ اور نیشنل بک ٹرسٹ نے اپنی کتابوں کی نمائش کی، دہلی کے زیادہ تر اسکولوں نے اپنے سائنسی کاموں کی جھلکیاں پیش کیں۔ یہ میلہ تین دن رہا۔

مکتبہ پیام تعلیم کی نئی کتاب

بچوں کے اسماعیل میرٹھی کی رسم رونمائی

۱۳ نومبر ۹۱ء: دہلی اردو اکیڈمی نے اردو تعلیمی میلے کے موقع پر "بچوں کے ادب پر ایک ورک شاپ منعقد کیا جس میں پروفیسر اشتیاق عابدی، ڈاکٹر خلیق انجم، کشمیری لال ذاکر، شیخ سلیم احمد اور شاہد علی خان نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اس کے بعد اردو کے ممتاز شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے پروفیسر اشتیاق عابدی کی خواہش پر حکیم نعیم الدین زبیری کی کتاب "بچوں کے اسماعیل میرٹھی" کی رسم رونمائی کی یہ کتاب اسی وقت چھپ کر آئی تھی۔ پروفیسر اشتیاق عابدی نے مرتب اور پبلشرز کی خدمات کو سراہا۔ اس کے بعد اردو کے ممتاز افسانہ اور ناول نگار کشمیری لال ذاکر کو تعلیم بالغان کے سلسلے میں نیشنل ایوارڈ ملنے پر نہ صرف مبارکباد دی بلکہ دہلی اردو اکیڈمی کی طرف سے ایک شال اور سپاس نامہ بھی پیش کیا گیا۔ پروفیسر اشتیاق عابدی نے کشمیری لال ذاکر کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

احسن حامد صاحب کو صدمہ

جناب حامد علی خاں سابق منیجنگ ڈائرکٹر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی اہلیہ اور احسن حامد صاحب کی والدہ کا یکم نومبر ۹۱ء کی شب میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ادارہ کتاب نما مکتبہ جامعہ، حامد علی خان کے صاحبزادوں احسن حامد، تحسین حامد، مستحسن حامد اور صاحبزادیوں، نفیس اکرام صاحبہ، شوکت صاحبہ اور انیس صاحبہ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ اور دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مہاراشٹر اردو اکیڈمی

پروفیسر جاوید خان چیئرمین مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی و وزیر حکومت مہاراشٹر نے اردو اکادمی کی بورڈ میٹنگ کے دوران ایڈوکیٹ ضیاء الدین (ممبر اردو اکادمی) کے اردو اسکولوں کی منظوری سے متعلق ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ ریاست مہاراشٹر

میں دیگر ریاستوں سے زیادہ اردو اسکول قائم ہیں۔ لہٰذا یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ حکومت مہاراشٹر کی، اردو اسکولوں سے متعلق پالیسی فراخ دلانہ ہے، اس لیے تعلیمی اداروں بالخصوص اردو اداروں کو شکایت کی گنجائش نہیں تاہم اگر کسی ادارے کو اسکول کھولنے کی اجازت نہیں ملی ہے، تو وہ تمام ضروری کاغذات کے ساتھ کی گئی کارروائی کی ایک نقل دفتر مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی، اٹھارواں منزلہ، منترالیہ، بمبئی۔ ۴۰۰۰۳۲ پر روانہ فرمائیں، تاکہ محکمۂ تعلیمات سے منظوری دلانے میں تعاون کیا جا سکے۔

مرحومہ عصمت چغتائی کو خراج عقیدت

محترمہ عصمت چغتائی کے انتقال کی افسوسناک خبر سن کر مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے دفتر میں ایک تعزیتی نشست ہوئی جس میں اکیڈمی اور اقبال مرکز کے کارکنان کے ساتھ ساتھ کتابت مرکز کے طلبہ واساتذہ بھی شریک ہوئے۔ سکریٹری اکیڈمی نے محترمہ عصمت چغتائی کے حالات زندگی پر مختصر روشنی ڈالی۔ آخر میں دو منٹ کھڑے ہو کر مرحومہ کو خراج عقیدت پیش کیا۔

شفیع منیری نہیں رہے

سب دغا باز ہیں بچپن کہ جوانی ہو شفیع
عمر بھر ساتھ نہیں دے گا بڑھاپا اپنا

ادبی حلقوں میں یہ خبر بڑے دکھ کے ساتھ سنی جائے گی کہ مشہور مزاحیہ شاعر حضرت شفیع منیری یکم نومبر ۱۹۹۱ء بروز جمعہ بوقت مغرب پٹنہ میڈیکل کالج اسپتال، پتھوا وارڈ میں دار فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم ۸۰ برس کے تھے۔

مرحوم پر کچھ دنوں قبل کانکی نارہ ۲۴ پرگنہ میں فالج کا حملہ ہوا تھا۔ مرحوم باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ مرحوم کی تجہیز و تکفین آبائی قبرستان پیرو ضلع بھوجپور میں ہوئی۔

ایم حبیب خاں پبلیکیشن کمیٹی کے ممبر منتخب

اردو کے مشہور ادیب اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے اسسٹنٹ سکریٹری جناب ایم. حبیب خاں کو غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دلی کی پبلیکیشن کمیٹی کا ممبر منتخب کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ سمینار کمیٹی کے ممبر بھی ہیں۔

اردو ادب کے نامور ادیب اور صحافی
قیوم خضر سخت علیل

پٹنہ: جناب اظہار خضر شعبۂ تعلیمات بہار اسٹیٹ ٹکسٹ بک پبلشنگ کارپوریشن پٹنہ نے خبر دی ہے کہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۱ء سے ان کے والد جناب قیوم خضر کو اچانک قلب کا جان لیوا دورہ پڑنے کی وجہ سے پٹنہ اندرا گاندھی انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیولوجی، پٹنہ میڈیکل کالج اسپتال میں بغرض علاج داخل کیا گیا ہے۔

تقریباً دو ہفتے علاج کے بعد ماہرین معالجین قلبی امراض نے مورخہ ۲۸ اکتوبر کو اسپتال سے گھر جانے کی اجازت دے دی، لیکن حد درجہ کمزوری اور پیشاب کی نلی میں ایک نئی بیماری کی وجہ سے ابھی بھی قیوم خضر صاحب بستر

علالت پر ہیں اور ماہر معالجین کے زیرِ علاج ہیں۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ موصوف کی ساری زندگی اردو ادب اور اردو صحافت کی خدمات سے بھری پڑی ہے۔ وہ کئی اہم دستاویزی کتابوں کے خالق ہیں جن میں:

اردو ورپن

اردو اور قومی ایکتا

خضرِ راہ (تصوف)

تعبیرات (مضامین) قابل ذکر ہیں۔

ان کے زیر ادارت شائع ہونے والا ماہنامہ "اشارہ" سے اردو دنیا بخوبی واقف ہے۔ جناب قیوم خضر صاحب شدید تبلی دورہ سے قبل تک تصنیف و تالیف میں ہمہ تن مصروف و مشغول تھے۔

تمام اعزہ، احباب اور مخلصین کے علاوہ اردو کے پرستاروں سے التماس ہے کہ موصوف کی صحت یابی کے لیے دعا فرمائیں۔

مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ

جناب ایم سلیم، سکریٹری جوہر اکیڈمی کے مطابق گزشتہ سالوں کی طرح امسال بھی اکیڈمی نے پانچ سرکردہ افراد و ادارے کو ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جن افراد اور ادارے کو ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ان کے نام یہ ہیں۔ راجیش پائلٹ، علی محمد خسرو، خشونت سنگھ، رئیس رامپوری اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یہ ایوارڈ ۱۰ دسمبر ۱۹۹۱ کو سابق صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ دیں گے۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر فاروق عبداللہ کریں گے۔ یہاں یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل مینجر جناب شاہد علی خاں کو سوشل ویلفیئر اینڈ کلچرل سوسائٹی دہلی اردو کی خدمت اور اس کی نشر و اشاعت میں نما کارکردگی کے اعتراف میں ۲۵ جولائی ۱۹۹۱ کو ا... سے نوازا تھا۔ یہ ایوارڈ جناب اجیت پانجہ وزیر اطلا... نشریات نے دیا تھا۔

پروفیسر آزاد اور سید مظفر حسین برنی قرطبہ (...)

پیرس (فرانس) کی بین الاقوامی انجمن (... اور مغرب) کی دعوت پر ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد، پر... ایمیرٹس جموں یونی ورسٹی اور سید مظفر حسین... چیئرمین اقلیتی کمیشن، حکومتِ ہند اقبال انٹر... کانگریس میں شرکت کے لیے عنقریب قر... (ہسپانیہ) روانہ ہو رہے ہیں جہاں ۱۰ر نو... ۴۴ر نومبر ۱۹۹۱ تک ہسپانوی ادارے ... ثقافتوں کے مابین تبادلۂ خیالات کے انسٹی ٹیو... اور فرانسیسی ادارے "اسلام اور مغرب"... باہمی تعاون سے مذکورہ اقبال انٹرنیشنل کا... منعقد ہو رہی ہے۔

اقبال انٹرنیشنل کانگریس کا افتتاح ... عالم مسجدِ قرطبہ میں ہوگا جس کے متعلق علامہ ا... کی غیر فانی نظم "مسجدِ قرطبہ" کی بدولت اردو ... کا مرتبہ آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچا ہے۔

امید فاضلی کے اعزاز میں نشست کا انعقاد

الہ آباد۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی ... شاخ نے گزشتہ ۲۸ر اکتوبر کی شام پاکستا... مہمان شاعر اور مرثیہ گو امید فاضلی کے اعز... ایک خصوصی ادبی نشست کا انعقاد کیا۔ جنا... خورشید نقوی کے شوکت علی روڈ واقع مکا... ہونے والی اس تقریب کی صدارت پرو... سید محمد عقیل نے فرمائی۔ ابتدا میں جناب ...

نے "جدید اردو مرثیہ۔ سمت و رفتار" اور جناب حسن انتظار خاں نے "امید فاضلی کی مرثیہ گوئی" عنوانات پر اپنے مقالے پیش کیے۔

پروفیسر عقیل رضوی نے اپنے صدارتی خطبے میں جدید مرثیہ نگاری کے فن اور اصولوں کے تعلق سے ایک سیر حاصل گفتگو کی، اس موقع پر امید فاضلی صاحب نے اپنے مشہور مرثیے "علم و عمل" کے بعض حصے پڑھ کر سنائے۔

اس سے قبل انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے امید فاضلی صاحب کا تعارف کراتے ہوئے الٰہ آباد میں انھیں خوش آمدید کہا۔

فیاض احمد فیضی۔ اکیڈمی کے ممبر سکریٹری

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈمی کی بورڈ میٹنگ منعقدہ ۵ر اکتوبر ۱۹۹۱ء میں ممبران نے متفقہ طور پر جناب فیاض احمد فیضی کو ممبر سکریٹری منتخب کیا۔ اس سے قبل سابق ممبر سکریٹری جناب یوسف ناظم نے خرابی صحت کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ جناب فیاض احمد فیضی نے ممبران کو یقین دلایا کہ اکیڈمی کے پروگراموں کو تیزی سے روبہ عمل لایا جائے گا، اور اس کے دائرہ کار کو مزید وسعت دی جائے گی۔

انجمن ترقی اردو ہند شاخ کوسہ ممبرا کا افتتاحیہ جلسہ عام

۲ر اکتوبر کو کوسہ میں انجمن ترقی ہند شاخ کوسہ ممبرا کے زیر اہتمام ایک شاندار افتتاحی جلسہ عام منعقد ہوا جس کی صدارت جناب مجروح سلطانپوری صاحب نے فرمائی، اور جناب ہربنس سنگھ نے، شمع روشن. کی اردو کے بہی خواہوں کی ایک بڑی تعداد جس میں ہر شعبہ کے دانشور موجود تھے، آخر تک جلسہ میں شریک رہے ہربنس سنگھ نے اپنی تقریر میں اردو کی ترقی اور بہبود کے لیے انجمن کے قیام پر دلی مبارکباد پیش کی، اور فرمایا کہ میں اتر پردیش کی اسی نسل سے تعلق رکھتا ہوں جو اردو سے قطعی نابلد ہے مگر میرے بزرگ صرف اردو ہی لکھتے پڑھتے اور بولتے تھے۔ آپ نے انجمن کے مستقل دفتر کی جگہ اور عمارت کے لیے تعاون کا بھی وعدہ کیا۔

ریاستی انجمن کے جنرل سکریٹری یوسف ناظم نے انجمن ترقی اردو کی کارکردگی اور آئینی حدود میں اس کی جدوجہد کی ستائش کی، اور افتتاحیہ جلسہ کے نظم و ضبط سے متاثر ہوکر فرمایا کہ شاخ کوسہ ممبرا زیادہ فعال اور متحرک دکھائی دیتی ہے، اور امید ظاہر کی کہ مستقبل میں زیادہ امور انجام دے گی۔

جناب معین الحق چودھری نے انجمن کو مبارکباد پیش کی، اور ہر موڑ پر صوبائی انجمن کے تعاون کا یقین دلایا۔

ڈاکٹر آدم شیخ نے انجمن کے دفتر کی ضرورت پر اظہار خیال کیا، اور فرمایا کہ لائبریری، تعلیم بالغان، کتابت اسکول، یہ ساری فلاحی اسکیمیں اس وقت تک ناقابل عمل ہیں جب تک جگہ فراہم نہ ہو۔ انھوں نے اپنے اسی یقین کا اظہار کیا کہ یہ انجمن اس ابھرتی ہوئی آبادی میں خصوصی تعاون حاصل کرے گی اور آئندہ ہم انجمن کے ذاتی دفتر میں ملاقات کریں گے، جناب سراج مرزا نے اپنی پرجوش تقریر میں فرمایا کہ ہم کمزور ہیں اسی لیے مخالفین اردو مضبوط ہیں، اتحاد اور جزیۂ عمل پیدا ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اپنے حقوق حاصل کرنے میں کوئی دیوار حائل نہیں ہے، شرط صرف یہ ہے کہ راہ عمل درست ہو،
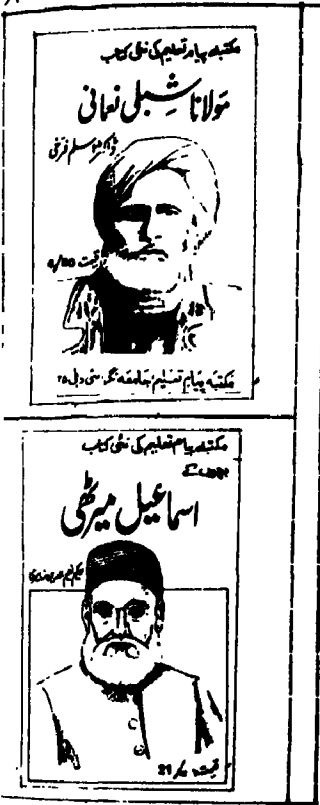
آخر میں صدر جلسہ جناب مجروح سلطانپوری نے فرمایا کہ اردو ہندو بھی ہے اور مسلمان بھی۔ ہم جہاں سجاد حسین اور مولانا آزاد کو پڑھتے پڑھاتے ہیں وہیں بال گنگا دھر تلک اور جواہر لال نہرو کو بھی، انھوں نے اس محرومی پر اظہار تاسف کیا کہ ہمارے بزرگوں نے جو ورثہ جس انداز سے ہم کو دیا تھا، ہم اپنی نئی نسل کو نہیں دے سکے ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اس سلسلے سے کچھ ہو، آپ نے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ رنگارنگ تہذیب اور قومی یکجہتی کا فروغ اسی وقت ممکن ہے جب اردو کو غیر نہ سمجھا جائے۔

جناب قیصر الجعفری، نائب صدر نے اپنی تقریر میں انجمن کے لائحۂ عمل پر روشنی ڈالی اور دفتر کے حصول کو بنیادی پتھر قرار دیا۔

جناب ڈاکٹر مجید آذر، جنرل سکریٹری انجمن شاخ کوسہ ممبرا نے رپورٹ پیش کی، اور جلسہ کی نظامت بھی کی،

اسی جلسہ کے لیے جناب یوسف خان (دلیپ کمار) سرپرست شاخ مہاراشٹر اور جناب جاوید خاں وزیر ـــــ اوقاف مہاراشٹر کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے۔

سفید چھڑی کا پہلا شمارہ شائع ہوگیا

اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا جریدہ جو پاکستان بھر میں بے چشم افراد کا ترجمان ہوگا۔ اس جریدے میں نابیناؤں کے متعلق مضامین و منظومات کے علاوہ عام موضوعات پر بھی مضامین شائع کیے جائیں گے۔ فی شمارہ دس روپے۔

پتا: ایڈیٹر ماہنامہ "سفید چھڑی"
۱۳۱، رحمت پارک، نزد فاطمہ ہسپتال۔

l. No. D[SE] 50/91
ıce No. U[SE]-22 to Post without pre-payment of postag
Kitab Numa
NEW DELHI - 110025

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی نئی اور اہم کتابیں

مولانا آزاد کا ذہنی سفر	(ادب)	ظ انصاری
تنقید اور جدید اردو تنقید	(تنقید)	ڈاکٹر وزیر آغا
مشقی تدریس، کیوں اور کیسے؟	(تعلیم)	ڈاکٹر محمد اکرام خاں
آوازوں کا میوزیم	(افسانے)	ساگر سرحدی
اپنی ہواؤں کی خوشبو	(خاکے)	کشمیری لال ذاکر
دلی کی چند عجیب ہستیاں	(خاکے)	اشرف صبوحی
چند تصویر نیکاں	(تاثرات)	مولانا عبدالسلام قدوائی
ہندستانی مسلمان اور مجیب صاحب	(ادب)	پروفیسر آل احمد سرور
صاحب جی سلطان جی	(تذکرہ)	ڈاکٹر اسلم فرخی
نظام رنگ	(ادبی خاکہ حضرت نظام الدین اولیا)	"
شبیہ جستجو	(سوانح ڈاکٹر ذاکر حسین)	ضیاء الحسن فاروقی
مذہب اور ہندستانی مسلم سیاست	(مذہب)	مشیر الحق
ہمارے دینی علوم	(مذہب)	مولانا اسلم جیراجپوری
معاشیات کے اصول	(معاشیات)	عزیز احمد قاسمی
آسان اردو ورک بک	(تعلیم)	شکیل اختر فاروقی
کچھ مولانا آزاد کے بارے میں	(ادب)	مالک رام
تحقیقی مضامین	(تحقیق)	"
پرانی بات ہے	(شاعری)	زبیر رضوی
ساز سخن	(")	ادا جعفری
غزل نما	(انتخاب غزلیات)	مرتبہ ادا جعفری
فی الفور	(مزاحیہ)	یوسف ناظم
گول مال	(")	شفیقہ فرحت